کلیاتِ اِقبال اردو

متن، اردو ترجمہ، تشریح



مکتبۂ دانیال

متن، اردو ترجمہ، تشریح

شرحِ کلیاتِ اقبال



مکتبہ دانیال

محمد ابوبکر صدیق

نے یہ کتاب

ندیم یونس پرنٹرز لاہور

چھپوا کر

شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور

سے شائع کی

مجلد: -/540 روپے

بلا جلد: -/360 روپے

شیخ محمد بشیر اینڈ سنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور فون: 7660736

متن و شرح

بانگ درا

اقبالؒ

شارح: جناب اسرار زیدی

تشریح الفاظ: جناب نثار اکبر آبادی

شیخ محمد بشیر اینڈ سنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور فون: 7660736

فہرست

حصہ سوم

دیباچہ

از شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لاء سابق مدیر مخزن

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا' جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالہ اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے' اور اردو ادب کے فروغ کا باعث ہوں گے' مگر زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھئے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا' جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا' اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

جب شیخ محمد اقبال کے والد بزرگوار اور ان کی پیاری ماں ان کا نام تجویز کر رہے ہوں گے تو قبول دعا کا وقت ہو گا کہ ان کا دیا ہوا نام اپنے پورے معنوں میں صحیح ثابت ہوا اور ان کا اقبال مند بیٹا ہندوستان میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر انگلستان پہنچا۔ وہاں کیمبرج میں کامیابی سے وقت ختم کر کے جرمنی گیا اور علمی دنیا کے اعلیٰ مدارج طے کر کے واپس آیا۔ شیخ محمد اقبال نے یورپ کے قیام کے زمانہ میں بہت سی فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کا خلاصہ ایک محققانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا' جسے فلسفہ ایران کی مختصر تاریخ کہنا چاہئے۔ اسی کتاب کو دیکھ کر جرمنی والوں نے شیخ محمد اقبال کو ڈاکٹر کا علمی درجہ دیا۔ سرکار انگریزی کو جس کے پاس مشرقی زبانوں اور علوم کی نسبت براہ راست اطلاع کے ذرائع کافی نہیں' جب ایک عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری نے عالمگیر شہرت پیدا کر لی ہے' تو اس نے بھی ازراہ قدردانی سر کا ممتاز خطاب انہیں عطا کیا۔ اب وہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن ان کا نام جس میں یہ لطف خداداد ہے کہ نام کا نام ہے اور تخلص کا تخلص ان کی ڈاکٹری اور سری سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے۔

سیالکوٹ میں ایک کالج ہے جس میں علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولوی سید میر حسن صاحب ☆ (25 ستمبر 1925ء کو حضرت کا وصال ہو گیا ہے) علوم مشرقی کا درس دیتے ہیں۔ حال میں انہیں گورنمنٹ سے خطاب شمس العلماء بھی ملا ہے۔ ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔ اقبال کو بھی ابتدائے عمر میں مولوی سید میر حسن سا استاد ملا۔ طبیعت میں علم ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی سونے پر سہاگا ہو گیا۔ ابھی اسکول میں ہی پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زبان

دانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ شعرائے اردو میں ان دنوں مرزا خان صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا اور نظام دکن کے استاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ جو ان کے پاس جا نہیں سکتے تھے' خط و کتابت کے ذریعہ دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں ان کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے۔ پچھلے زمانہ میں جب ڈاک کا یہ انتظام نہ تھا کسی شاعر کو اتنے شاگرد کیسے میسر آ سکتے تھے۔ اب اس سہولت کی وجہ سے یہ حال تھا کہ سینکڑوں آدمی ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انہیں اس کام کے لئے ایک عملہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لئے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ گو اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی مگر جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے' جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔

سیالکوٹ کے کالج میں ایف اے کے درجہ تک تعلیم تھی۔ بی اے کے لئے شیخ محمد اقبال کو لاہور آنا پڑا۔ انہیں علم فلسفہ کی تحصیل کا شوق تھا اور انہیں لاہور کے اساتذہ میں ایک نہایت شفیق استاد ملا۔ جس نے فلسفہ کے ساتھ ان کی مناسبت دیکھ کر انہیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ پروفیسر آرنلڈ صاحب جو اب سر ٹامس آرنلڈ ہو گئے ہیں اور انگلستان میں مقیم ہیں' غیر معمولی قابلیت کے شخص ہیں۔ قوت تحریر ان کی بہت اچھی ہے اور وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریق جدید سے خوب واقف ہیں۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرز عمل سے حصہ دیں اور وہ اس ارادہ میں بہت کچھ کامیاب ہوئے۔ پہلے انہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانہ میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اب انہیں یہاں ایک اور جوہر قابل نظر آیا۔ جس کے چمکانے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی اور جو دوستی اور محبت استاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی وہ آخر شاگرد کو استاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گئی اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا اور آج تک قائم ہے۔ آرنلڈ خوش ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا شاگرد علمی دنیا میں میرے لئے بھی باعث شہرت افزائی ہوا اور اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا اس کے آخری مرحلے کی آرنلڈ کی شفقانہ رہبری سے طے ہوئے۔

اقبال کو اپنی علمی منازل طے کرنے میں اچھے اچھے رہبر ملے اور بڑے بڑے علماء سے سابقہ پڑا۔ ان لوگوں میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ' براؤن' نکلسن اور سارلی قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر نکلسن

تو ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اقبال کی مشہور فارسی نظم "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ کر کے اور اس پر دیباچہ اور حواشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو اقبال سے روشناس کیا۔ اسی طرح ہندوستان کی علمی دنیا میں جتنے نامور اس زمانہ میں موجود تھے۔ مثلاً مولانا شبلی مرحوم' مولانا حالی مرحوم' اکبر مرحوم' سب سے اقبال کی ملاقات اور خط و کتابت رہی۔ اور ان کے اثرات اقبال کے کلام پر اور اقبال کا اثر ان کی طبائع پر پڑتا رہا۔ مولانا شبلی نے بہت سے خطوط میں اور حضرت اکبر نے نہ صرف خطوں میں بلکہ بہت سے اشعار میں اقبال کے کمال کا اعتراف کیا ہے اور اقبال نے اپنی نظم میں ان باکمالوں کی جابجا تعریف کی ہے۔

ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ 1901ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انہیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ اس بزم میں ان کو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے اور انہوں نے کہہ سن کر ایک غزل بھی پڑھوائی اس وقت لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی۔ سادہ سے الفاظ' زمین بھی مشکل نہ تھی۔ مگر کلام میں شوخی اور بیساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرہ میں انہوں نے غزلیں پڑھیں اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔ مگر یہ شہرت پہلے پہلے لاہور کے کالجوں کے طلبہ اور بعض ایسے لوگوں تک محدود رہی جو تعلیمی مشاغل سے تعلق رکھتے تھے۔ اتنے میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی۔ جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے۔ اور نظم و نثر کے مضامین کی اس میں مانگ ہوئی۔ شیخ محمد اقبال نے اس کے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم جس میں "کوہ ہمالہ" سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے' اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی۔ مذاق زمانہ اور ضرورت وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے۔ مگر شیخ صاحب یہ عذر کر کے کہ ابھی نظرثانی کی ضرورت ہے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی۔ اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ادب اردو کی ترقی کے لئے رسالہ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے حصہ نظم کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انہوں نے کہا ابھی کوئی نظم تیار نہیں۔ میں نے کہا۔ "ہمالہ والی نظم دے دیجئے اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھئے۔ انہوں نے اس نظم کے دینے میں پس و پیش کی کیونکہ انہیں یہ خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوئی اس لئے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی۔ اور مخزن کی پہلی جلد کے پہل نمبر میں جو اپریل 1900ء میں نکلا شائع کر دی۔ یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا اور 1905ء تک جب وہ ولایت گئے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں وہ عموماً مخزن کے ہر نمبر کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے اور جوں جوں لوگوں کو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوتا گیا' جابجا مختلف رسالوں اور اخباروں سے فرمائشیں آنے لگیں۔ اور انجمنیں اور مجالس درخواستیں کرنے لگیں کہ ان کے سالانہ جلسوں میں لوگوں کو وہ اپنے کلام سے محظوظ کریں۔ شیخ صاحب اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے اور دن رات علمی

مشاغل اور مشاغل میں بسر کرتے تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بیشمار شعر ہو جاتے تھے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اس زمانہ میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اس طرح زبان سے نکلیں اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہوتے ہیں، جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے۔ اور درمیان میں خود وہ انہیں قلمبند بھی نہیں کرتے۔ مجھے بہت سے شعرا کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا ہے۔ مگر یہ رنگ کسی اور میں نہیں دیکھا۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونی طبع وہ حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے۔ مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسب فرمائش وہ کچھ لکھ سکے۔ یہ قریب قریب ناممکن ہے اسی لئے جب ان کا نام نکلا اور فرمائشوں کی بھرمار ہوئی تو انہیں اکثر فرمائشوں کی تعمیل سے انکار ہی کرنا پڑا، اسی طرح انجمنوں اور مجالس کو بھی وہ عموماً جواب ہی دیتے رہے۔ فقط لاہور کی انجمن حمایت اسلام کو بعض وجوہ کے سبب یہ موقع ملا کہ اس کے سالانہ جلسوں میں کئی سال متواتر اقبال نے اپنی نظم سنائی جو خاص اسی جلسہ کے لئے لکھی جاتی تھی اور جس کی فکر وہ پہلے سے کرتے رہتے تھے۔

اول اول جو نظمیں جلسہ عام میں پڑھی جاتی تھیں۔ تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں اور اس طرز میں بھی ایک لطف تھا۔ مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسہ عام میں شیخ محمد اقبال سے یہ اصرار کیا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند ہے۔ طرز ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ ان کے لئے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہو گیا۔ جب کبھی پڑھیں لوگ اصرار کرتے ہیں کہ لے سے پڑھا جائے اور دوسرا یہ کہ پہلے تو خواص ہی ان کے کلام کے قدردان تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے۔ اس کشش کے سبب عوام بھی کھنچ آئے۔ لاہور میں جلسہ حمایت اسلام میں جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہوتے ہیں اور جب تک نظم پڑھی جائے لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو ہوتے ہیں۔

1905ء سے 1908ء تک اقبال کی شاعری کا ایک دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جو انہوں نے یورپ میں بسر کیا۔ گو وہاں انہیں شاعری کے لئے نسبتاً کم وقت ملا اور ان نظموں کی تعداد جو وہاں کے قیام میں لکھی گئیں تھوڑی ہے۔ مگر ان میں ایک خاص رنگ وہاں کے مشاہدات کا نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں دو بڑے تغیر ان کے خیالات میں آئے۔ ان تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے جن میں میرا بھی وہیں قیام تھا اور اکثر ملاقات کے موقعے ملتے رہتے تھے۔ ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں۔ اور قسم کھائیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی

شاعری ایسی شاعری نہیں ہے، جسے ترک کرنا چاہئے۔ بلکہ انکے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لئے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہو گا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ ان کے لئے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لئے بھی مفید ہے۔ ایک تغیر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا اس کا تو یوں خاتمہ ہوا۔ مگر دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا۔ یعنی اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعہ اظہار خیال بنالیا۔

فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہو گی اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب حالات تصوف کے متعلق لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیر مذاق میں دخل ہو گا۔ اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں، اس لیے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔ مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔ انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔ جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا۔ یہ ان کی شاعری کا تیسرا دور ہے جو 1908ء کے بعد سے شروع ہوا اور جو اب تک چل رہا ہے۔ اس عرصہ میں اردو نظمیں بھی بہت سی ہوئیں اور اچھی اچھی، جن کی دھوم مچ گئی۔ مگر اصل کام جس کی طرف وہ متوجہ ہو گئے۔ وہ ان کی فارسی مثنوی "اسرار خودی" تھی۔ اس کا خیال دیر تک ان کے دماغ میں رہا اور رفتہ رفتہ دماغ سے صفحہ قرطاس پر اترنے لگا اور آخر ایک مستقل کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا، جس سے اقبال کا نام ہندوستان سے باہر بھی مشہور ہو گیا۔

فارسی میں اقبال کے قلم سے تین کتابیں اس وقت تک نکلی ہیں۔ "اسرار خودی" "رموز خودی" اور "پیام مشرق"۔ ایک سے ایک بہتر۔ پہلی کتاب سے دوسری میں زبان زیادہ سادہ اور عام فہم ہو گئی ہے اور تیسری دوسری سے زیادہ سلیس ہے۔ جو لوگ اقبال کے اردو کلام کے دلدادہ ہیں، وہ فارسی نظموں کو دیکھ کر مایوس ہوئے ہوں گے۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ فارسی نے وہ کام کیا جو اردو سے نہیں ہو سکتا تھا

تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی کم و بیش متداول ہے' اقبال کا کلام اس ذریعے سے پہنچ گیا اور اس میں ایسے خیالات تھے جن کی ایسی وسیع اشاعت ضروری تھی۔ اور اسی وسیلے سے یورپ اور امریکہ والوں کو ہمارے ایسے قابل قدر مصنف کا حال معلوم ہوا۔ "پیام مشرق" میں ہمارے مصنف نے یورپ کے ایک نہایت بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "سلام مغرب" کا جواب لکھا ہے اور اس میں نہایت حکیمانہ خیالات کا اظہار بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اس کے اشعار میں بعض بڑے بڑے عقدے حل ہوئے ہیں' جو پہلے آسان طریق سے بیان نہیں ہوئے تھے۔ وقت سے بعض رسائل اور اخبارات میں ڈاکٹر محمد اقبال کو "ترجمان حقیقت" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کتابوں کے خاص خاص اشعار سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس لقب سے ملقب ہونے کے مستحق ہیں اور جس کسی نے یہ لقب ان کے لئے پہلے وضع کیا ہے اس نے کوئی مبالغہ نہیں کیا۔

فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کے اردو کلام پر یہ ہوا ہے کہ جو نظمیں اردو میں دور سوم میں لکھی گئی ہیں ان میں سے اکثر میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشہب قلم جو فارسی کے میدان میں گامزن ہے اس کی باگ کسی قدر تکلف کے ساتھ اردو کی طرف موڑی جا رہی ہے۔

اقبال کا اردو کلام جو وقتاً" فوقتاً" 1901ء سے لے کر آج تک رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا اور انجمنوں میں پڑھا گیا اس کے مجموعے کی اشاعت کے بہت کم لوگ خواہاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے احباب بارہا تقاضا کرتے تھے کہ اردو کلام کا مجموعہ شائع کیا جائے۔ مگر کئی وجوہات سے آج تک مجموعہ اردو شائع نہیں ہو سکا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر اب شائقین کلام اردو کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی۔ اور اقبال کی اردو نظموں کا مجموعہ شائع ہوتا ہے جو دو سو صفحوں پر مشتمل ہے اور تین حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اول میں 1905ء تک کی نظمیں ہیں۔ حصہ دوم میں 1905ء سے 1908ء تک کی اور حصہ سوم میں 1908ء سے لے کر آج تک کا اردو کلام ہے۔ یہ دعوئی سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے' جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو۔ اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں اور کیوں نہ ہو' ایک صدی کے چہارم حصے کے مطالعے اور تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہے۔ بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ ایسا ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ یہ مختصر سا مضمون جو بطور دیباچہ لکھا گیا ہے اس میں مختلف نظموں کی تنقید یا مختلف اوقات کی نظموں کے باہم مقابلہ کی گنجائش نہیں۔ اس کے لئے اگر ہو سکا تو میں کوئی اور موقع تلاش کروں گا۔ سردست میں صاحبان ذوق کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اردو کلیات اقبال ان کے سامنے رسالوں اور گلدستوں کے اوراق پریشاں سے نکل کر ایک مجموعہ دلپذیر کی شکل میں جلوہ گر ہے اور امید ہے کہ جو لوگ مدت سے اس کلام کو یکجا دیکھنے کے مشتاق تھے' وہ اس مجموعہ کو شوق کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور دل سے اس کی قدر کریں گے۔

آخر میں اردو شاعری کی طرف سے میں یہ درخواست قابل مصنف سے کرتا ہوں کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق اور محتاج ہے۔ خود انہوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں جن میں ایک شعر میں اردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے!

ہم ان کا یہ شعر پڑھ کر ان سے یہ کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر ان سے نکلوایا تھا' اس کام لے کر اب وہ پھر کچھ عرصہ کے لئے گیسوئے اردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں موقع دیں کہ ہم اسی مجموعہ اردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے' ایک دوسرے کلیات اردو کا پیش خیمہ سمجھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصہ اول

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندوستاں ہے تو
مطلع اول فلک جس کا ہو، وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامن موج ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برق سر کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشہ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانہ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کو کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو۔

*

اس نظم پر بات کرنے سے قبل اس امر کی نشاندہی ناگزیر ہے کہ جس طرح "بانگ درا" علامہ اقبال کی شاعری کا اولین مجموعہ ہے اسی طرح "ہمالہ" ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے اور "بانگ درا" کی بھی پہلی نظم ہے۔ "بانگ درا" کی پوری شاعری کے بارے میں مختصراً اس شرح کے دیباچے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اسی حوالے سے ہمالہ کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس میں اقبال اپنی مخصوص فکری سطح کی بجائے فطرت اور ایک پہلو سے وطنیت کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دوسرے اردو شاعری کے مجموعوں اور "بال جبریل اور ضرب کلیم" میں اقبال نے جو فلسفیانہ اور فکری نقطہ نظر پیش کیا ہے اجتماعی سطح پر "بانگ درا" کی شاعری اس سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ چنانچہ "ہمالہ" کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

پہلا بند معنی: ہمالہ: برف کا گھر (مراد پہاڑ)۔ **دیرینہ روزی:** لمبی عمر۔ **کلیم:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب۔ وہ کوہ طور پر خدا سے باتیں کرتے تھے۔ **طور سینا:** پہاڑ کا نام۔ **چشم بینا:** دیکھنے والی آنکھ۔

مطلب: جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں نشاندہی کی گئی ہے کہ اس نظم کا پورا منظر نامہ "فطرت نگاری اور وطنیت" کے جذبے سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ اس بند میں اقبال "کوہ ہمالہ" کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو وہ بلند و بالا پہاڑ ہے جو نہ صرف یہ کہ مملکت ہندوستان کے محافظ اور فصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ تیری چوٹیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان بھی جھک کر چوم رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری بلندی آسمان سے بھی قربت رکھتی ہے۔

اے ہمالہ! تیرا وجود ہرچند کہ ابتدائے آفرینش سے قائم ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ تو اس شام و سحر کی گردش کے مابین اسی طرح زندہ و ایستادہ ہے جس طرح کہ ابتداء میں تھا اور لاتعداد صدیاں بیت جانے کے باوجود تجھ میں کسی کمزوری کے آثار نہیں پائے جاتے۔

اس شعر میں اقبال "حضرت موسیٰ علیہ السلام اور کوہ طور کے جلوے کی علامتوں کے حوالے سے ہمالہ سے کہتے ہیں کہ تیرا وجود تو ان کے لیے بھی ایک خصوصی حیثیت کا حامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر چشم بینا کے لیے تو ایک تجلی کا مظہر ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری بلندی اور سرسبز وادیاں انسان کے لیے ایک عجوبہ کی طرح ہیں۔

دوسرا بند معنی: دیدۂ: آنکھ۔ **دامن کش:** دامن کھینچنے والا۔ **دستار فضیلت:** بزرگی کی پگڑی۔ **کلاہ مہر عالم تاب:** دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی ٹوپی۔

مطلب: یہ درست ہے کہ اے ہمالہ تو بظاہر ایک پہاڑ ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ تو ہمارا محافظ بھی ہے اور ہندوستان کے لیے بھی ایک حفاظتی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر تجھے ایک شاعر کا دیوان تصور کر لیا جائے تو اس کا مطلع یعنی اولین شعر آسمان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ تیرا وجود تو ہر انسان کے لیے باعث کشش ہے جس کی قربت اسے سکون فراہم کرتی ہے۔ تیری شخ اور چوٹیوں پر جو برف پڑی رہتی ہے وہ اس سفید رنگ کی دستار فضیلت کے مانند ہے جو بزرگوں کے سروں پر احتراماً باندھی جاتی ہے۔ یہ دستار فضیلت تو سورج کی زریں کلاہ پر بھی خندہ زن نظر آتی ہے۔ اس بند میں بھی علامہ نے مناظر فطرت کی خوبصورت منظر کشی کے ساتھ بلند پایہ علامت نگاری کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

کوہ ہمالہ کو کسی شاعر کے دیوان سے تشبیہ دینے کے علاوہ اس پر برفباری کے مناظر کو کسی بزرگ کی دستار فضیلت قرار دینے کے ساتھ سورج کی زریں کلاہ پر اس دستار کا خندہ زن ہونا یقیناً خوبصورت علامت نگاری کے مظاہر میں سے ہیں۔

تیسرا بند معنی: ثریا: وہ سات ستارے جو بہت فاصلے پر ہیں' پروین۔ **پہنائے فلک:** آسمان کی وسعت۔ **آئینہ سیال:** بہنے والا' رواں۔

مطلب: اے ہمالہ! تیری عمر رفتہ کا دور اس قدر طویل ہے کہ عہد ماضی کی شان و شوکت کا مظہر بن گیا ہے۔ تیری بلند و بالا چوٹیوں کا سایہ تیرے گردوپیش کی وادیوں پر اس طرح پڑ رہا ہے جیسے وہاں خیمے آویزاں ہوں۔ یہی بلند و بالا چوٹیاں یوں لگتا ہے جیسے آسمان پر موجود ستاروں سے باتیں کر رہی ہوں۔ یہ درست ہے کہ تو زمین پر ایستادہ ہے لیکن تیری بلندی آسمان کی وسعتوں سے ہم کنار نظر آتی ہے۔ تیرے دامن میں پانی کے جو چشمے رواں دواں ہیں وہ اس قدر شفاف ہیں جس طرح سیال آئینے ہوں۔ اور یہاں جو ہوا چلتی ہے وہ ان چشموں کے پانیوں کو مزید شفاف بناتی ہے۔

چوتھا بند معنی: رہوار ہوا: ہوا کا گھوڑا۔ **کوہسار:** پہاڑ۔ **بازی گاہ:** کھیل کی جگہ۔ **فیل:** ہاتھی۔

مطلب: علامتیں اور استعارے اپنے کلام میں اقبال نے جس خوبی اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کیے ہیں یہ اس کی ایک خوبصورت مثال کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمالہ! تیرے گردوپیش اور ماحول کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ یہاں جو ہوا رواں دواں ہے وہ ایک تیز رو گھوڑے کی مانند ہے۔ اس کی رفتار کو مزید تیز کرنے کے لیے تیری چوٹیوں پر چمکنے والی بجلیوں نے بادلوں کے ہاتھوں میں ایک تازیانہ دے دیا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ تیرا دامن بھی ایک کھیل کے میدان کی طرح ہے۔ ایسا میدان جسے قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی صناعی کے ساتھ بنایا ہے۔ یہاں کس جوش و مسرت کے ساتھ بادل اس طرح محو پرواز ہیں جیسے وہ بے زنجیر ہاتھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پانچواں بند معنی: جنبش موج نسیم: ہوا کی لہر کی روانی۔ **گہوارہ:** جھولا۔ **برگ:** پتا۔

مطلب: نظم کا یہ بند بھی سابقہ بند کے ساتھ موضوعاتی سطح پر مربوط ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ ایسا ماحول ہے جس صبح کی ہوا کی جنبش ایک گہوارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا گہوارہ جہاں کلیاں زندگی کے نشے میں جھومتی نظر آتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کلیوں کی خامشی اپنی پتیوں کی زبان سے یوں کہتی ہو کہ میرا تو پھول توڑنے والے سے بھی کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ مراد یہ ہے کہ ہمالہ کی اس بلندی تک انسان کی رسائی

ممکن نہیں۔ جہاں یہ کلیاں کھل رہی ہیں۔ اس بند کے آخری شعر میں ہمالہ زبان حال سے یوں گویا ہوتا ہے کہ میری خامشی یہی دراصل میری داستان حیات کی مظہر ہے اور قدرت کا بخشا ہوا یہ گوشہ ہی دراصل میری پرسکون آماجگاہ ہے۔

چھٹا بند **معنی**: **فراز کوہ**: پہاڑ کی بلندی۔ **شاہد قدرت**: معشوق۔ **عراق**: موسیقی کا ایک راگ۔

مطلب: اس بند میں بھی اقبال نے ایک طرح کی منظر کشی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمالہ کی بلندیوں سے ندی کی شکل میں جو پانی لہریں مارتا نیچے آتا ہے اس کی آواز سننے والوں کو یوں محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی گا رہا ہو۔ ندی کا منظر اس درجے خوبصورت ہوتا ہے کہ کوثر و تسنیم کی موجیں بھی اس سے شرما جائیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ندی مناظر فطرت کے مشاہدہ کرنے والے کو آئینہ دکھاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس کا انداز کچھ یوں ہوتا ہے کہ راہ میں آنے والے سنگریزوں سے کبھی بچ کر نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو کبھی ان سے ٹکرا بھی جاتی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال ندی کو ایک مسافر کے طور پر تصور کر کے اس سے کہتے ہیں کہ تو اسی طرح دل لبھانے والی موسیقی کے ساز کو چھیڑتی جا کہ میرا دل تیری اس صدا کی معنویت سے پوری طرح آشنا ہے۔

ساتواں بند **معنی**: **لیلئی شب**: لیلیٰ یعنی کالی رات۔ **غازہ**: پوڈر۔

مطلب: یہاں بھی اقبال' ہمالہ پر رات کی آمد اور تاریکی کی خوبصورت منظر کشی کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں کہ جب رات کی محبوبہ اپنی لمبی لمبی زلفیں دراز کرتی ہے تو ان لمحات میں آبشاروں کی صدائیں انتہائی دلکش اور دلنواز محسوس ہوتی ہیں کہ ان لمحوں کی خامشی پر گفتگو بھی قربان کی جا سکتی ہے۔ اس لمحے تو یوں لگتا ہے کہ درخت بھی کسی سوچ میں مبتلا ہیں مراد یہ ہے کہ پورا منظر خامشی اور سکوت سے ہم کنار ہے۔

اس بند کے آخری شعر میں ہمالہ پر سرشام شفق کا منظر پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ فطرت شاید اس کے چہرے پر رنگا رنگ غازہ مل رہی ہے اور یہ غازہ بے حد خوشنما محسوس ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب شام کے وقت شفق کی سرخی ہمالہ پر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے فطرت نے اس کے چہرے پر غازہ مل دیا ہو۔

آٹھواں بند **معنی**: **مسکن**: رہنے کی جگہ۔ **آبائے انساں**: انسان کے باپ دادا۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اپنے کلام کو تمام کرتے ہوئے اقبال ہمالہ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ "اے ہمالہ! ذرا مجھے اس وقت کا احوال تو بتا جب ہزارہا سال قبل باوا آدم نے یہاں آ کر تیرے دامن میں پناہ لی تھی۔ ظاہر ہے کہ تو ان لمحات کا رازداں ہے۔ ان ایام کی زندگی کس قدر سیدھی سادی ہو گی جس میں کسی نوع کا تکلف نہ تھا۔ اے ہمالہ! ذرا ان دنوں کے بارے میں ہمیں واقعات و حقائق سے آگاہ کر کہ وہ لمحات تو ہر طرح کے تکلفات سے نا آشنا تھے۔ آخری شعر میں اقبال ہمالہ کی خامشی سے مایوس ہو کر خود اپنی تخیلی اور تصوراتی کیفیت کا سہارا لیتے ہوئے اس سے ہی فرماتے ہیں کہ ان ایام کا نقشہ تم ہی مجھ سے بیان کر دو کہ یہ پہاڑ تو آخر ایک خاموش پتھر ہی نکلا۔ جب کہ تم میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ گزرے ہوئے ماضی کو پلٹا کر اس کی پوری داستان منظر عام پر لے آؤ۔

گل رنگیں

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں — اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں — یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں، میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں — یہ نظر غیر از نگاہ چشم صورت بیں نہیں
آہ! یہ دست جو اے گل رنگیں نہیں — کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گل چیں نہیں

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے — راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگ ریاض طور ہے — میں چمن سے دور ہوں، تو بھی چمن سے دور ہے

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو — یہ جگر سوزی چراغ خانہ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایہ قوت نہ ہو — رشک جام جم مرا آئینہ حیرت نہ ہو

یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے
توسن ادراک انساں کو خرام آموز ہے

*

یہ نظم بڑی حد تک نازک اور حساس کیفیات و جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ جس میں اقبال نے ایک انسان اور پھول کی فطرت کا موازنہ کیا ہے۔ عملاً یہ نظم بھی ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے۔ تاہم اقبال کی اولین نظم "ہمالہ" سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ اس میں اپنے اپنے مقام پر پھول اور انسان کی نفسی کیفیات کی جانب اشارے کیے گئے ہیں۔ لیکن اول و آخر جملہ مسائل کے باوجود انسان کی افضلیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلا بند معنی: **شناسا:** واقف، جاننے والا۔ **عقدۂ مشکل:** وہ گتھی جسے سلجھانا آسان نہ ہو۔ **گل رنگیں:** رنگین پھول۔ **زیب محفل:** محفل کی زینت۔ **فراغت:** مہلت، فرصت۔ **گداز:** نرم، گھلنا۔

مطلب: یہاں اقبال، پھول سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں کہ تجھے اس حقیقت کا کیا علم کہ زندگی کے مسائل کون کون سے ہیں۔ اس لیے کہ یہ معاملات تو وہی جان سکتا ہے جس کے پہلو میں دل ہو اور شاید یہی چیز تیرے پاس موجود نہیں ہے۔ ہر چند کہ تیرے وجود سے محفل کی زینت میں تو اضافہ ہوتا ہے تاہم عملی سطح پر وہاں جو ہنگامے برپا ہوتے ہیں ان میں تیری شرکت کسی طور پر بھی ممکن نہیں کہ یہی تو انسانی سطح پر عملی جدوجہد کا حصہ ہے جس سے تو بہرحال محروم ہے۔ تو جس انداز سے ساکن و ثابت رہتا ہے وہ۔۔

انسانی فطرت سے کسی طور پر بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ کہ انسان تو ہر لمحے زندگی کی گوناگوں مشکلات و مسائل سے دوچار رہتا ہے۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے گل رنگیں! اس دنیا میں جہاں میں اور تو دونوں بودوباش رکھتے ہیں' وہاں میری طرح ہر انسان اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مضطرب اور پریشانیوں سے دوچار رہتا ہے جب کہ تیری زندگی میں تو سرے سے ایسی خواہش اور مقصد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ اس نوع کی خواہش اور تمنا تو صرف اہل دل کو ہی ہوتی ہے اور بس!

دوسرا بند **معنی:** دیدۂ حکمت: تدبیر والی آنکھ۔

مطلب: اس بند میں اقبال اپنی ذات کے حوالے سے پھول کو بتاتے ہیں کہ میرا یہ دستور نہیں کہ تجھے اپنی چھوٹی موٹی خوشیوں اور ضروریات کے لیے شاخ سے جدا کر دوں کہ یہ شیوہ تو محض ظاہر پرستوں کا ہے۔ جب کہ میں تو صورت اور سیرت دونوں کے حسن کا قائل ہوں۔ میرا ہاتھ کسی سنگدل گلچیں کا بھی نہیں ہے جو تحقیق اور ذاتی مقاصد کے لیے تجھے شاخ سے علیحدہ کر کے پتی پتی میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس میں تو اسی طرح تجھ کو پسند کرتا ہوں جیسے بلبل اپنی چاہت کا اظہار کرتی ہے۔

تیسرا بند **معنی:** مستور: چھپا ہوا۔

مطلب: اگر تیری پتیوں کو زبانوں کے مانند سمجھ لیا جائے تو اس کی کیا وجوہات ہیں کہ تو ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ اس خاموشی کا سبب وہ کون سا راز ہے؟ اے پھول! جو تیرے سینے میں چھپا ہوا ہے اور جس کو تو افشا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تو بھی میری طرح بہشت کا ایک فرد ہے لیکن آدم کی طرح میری طرح تجھے بھی وہاں سے نکالا مل چکا ہے۔ اس کے باوجود تو اس زندگی پر مطمئن ہے۔ جب کہ میں اپنی منزل کو پانے کے لیے بدستور جدوجہد کر رہا ہوں۔

چوتھا بند **معنی:** جام جم: جمشید کا پیالہ۔ من: گھوڑا۔ ادراک: عقل۔

مطلب: اے پھول! تیرے برعکس میں جو ہر لحہ پریشان و مضطرب رہتا ہوں' کہیں یہی پریشانی میرے لیے وجہ سکوں نہ بن جائے۔ کہ یہ جگر سوزی اور کچھ پانے کی جدوجہد ہی انسان کی دانش و حکمت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کائنات کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لیے اکساتی ہے۔ پھر میں جو خود کو کمزور و ناتواں سمجھ رہا ہوں شاید یہ کمزوری اور ناتوانی ہی میرے لیے قوت کا سرچشمہ بن جائے اور مجھ میں جو کچھ پانے کی جستجو ہے وہی حصول مقاصد کا ذریعہ بن جائے۔ کہ اس طرح کی مسلسل جستجو پورے زمانے کو روشنی عطا کرتی ہے اور یہی انسانی عقل و شعور میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

عہد طفلی

تھے دیار نو زمین و آسماں میرے لیے — وسعت آغوش مادر اک جہاں میرے لیے
تھی ہر اک جنبش نشان لطف جاں میرے لیے — حرف بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لیے
دور طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے

شورش زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر وہ پھٹے بادل میں بے آواز پا اس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر اور وہ حیرت دروغ مصلحت آمیز پر
آنکھ وقف دید تھی، لب مائل گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا

*

صرف دو بند پر مشتمل یہ مختصری نظم عملاً ایک باشعور اور صاحب فکر و نظر شاعر کی ابتدائی داستان حیات کا ایک حصہ ہے۔ اس نظم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے عہد بلوغیت میں جب شاعر اپنے بچپن پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں اور وہ ان تاثرات کو کس انداز میں بیان کرتا ہے۔

پہلا بند معنی: دیار نو: نیا شہر۔ آغوش مادر: ماں کی گود۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ اپنے ایام طفلی میں زمین اور آسمان تو میرے لیے قطعی اجنبی حیثیت کے حامل تھے۔ میری حقیقی پناہ گاہ تو ماں کی آغوش تھی جو فی الواقع ایک وسیع کائنات کے مانند محسوس ہوتی تھی۔ ہر متحرک شے میرے نزدیک دلچسپی کا باعث ہوتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ میری زبان سے بھی جو صدائیں برآمد ہوتی تھیں ان کا مفہوم میں خود بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اگر کسی تکلیف کے سبب رونے لگتا تو دروازے کی زنجیر کے کھٹکھٹانے سے ہی بہل جاتا تھا۔

دوسرا بند معنی : آواز پا: پاؤں کی آہٹ۔ دروغ مصلحت آمیز: اچھا نتیجہ پیدا کرنے والا جھوٹ۔ وقف دید: دیکھنے میں مصروف۔

مطلب: رات آتی تھی تو میں آنکھ جھپکے بغیر آسمان پر روشن چاند کو تکتا رہتا تھا۔ چاند جو بادلوں کے ٹکڑوں کے پیچھے بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہوتا تھا۔ اپنے عزیز و اقارب سے جب میں چاند کے بارے میں سوالات کرتا تو اپنی لاعلمی کے سبب وہ مجھے اس کے بارے میں ایسی باتیں بتایا کرتے تھے' اب جن کے بارے میں سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ لیکن ان دنوں میں حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو جاتا۔ ان دنوں ہر شے کو تکتا رہتا اور میں اپنے دل میں ہی سوال کرتا رہتا تھا۔

مرزا غالب

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزم سخن پیکر ترا زیب محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار
تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشت فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں

تاب گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[1] میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں آہ! اے نظارہ آموز نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

✱

یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ اردو زبان نے اب تک غالب جیسا شاعر پیدا نہیں کیا۔ عصرِ جدید میں بھی جب کہ اردو شاعری بے شمار تجرباتی مراحل سے گزر چکی اور گزر رہی ہے۔ اس کے باوجود جدید غزل کے شعراء بھی غالب کے اثر سے باہر نہیں نکل سکے۔ بلکہ اس عظیم شاعر نے غزل کی جو قندیل روشن کی تھی وہ اس کو آج بھی روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اقبال کی زیرِ تشریح نظم مرزا غالب ایک بڑے شاعر کی جانب سے دوسرے بڑے شاعر کی عظمت کا اعتراف ہے۔ اقبال نے اس نظم میں جس طرح مرزا غالب سے اظہارِ عقیدت کیا ہے' اس سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر میں اس عظیم شاعر کا کیا مقام تھا؟

پہلا بند معنی: تاکجا: کب تک۔

مطلب: اقبال یہاں غالب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرے وجود نے فکرِ انسانی پر یہ بات واضح کر دی کہ خیالات کی رو کس بلندی تک پرواز کر سکتی ہے۔ یعنی تیری متخیلہ کی بلندی تک رسائی کے لیے انتہائی فکر کی ضرورت ہے۔ شاعری کی بزم میں تیری ذات اس کی روح معلوم ہوتی ہے اور تیرا وجود اس کی رونق بھی رہا اور ان معنوں میں اس سے پوشیدہ بھی رہا کہ تیرے ہم عصر لوگ فی الواقع تیری شاعرانہ عظمت تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

دوسرا بند معنی: بربط: سارنگی' ایک باجے کا نام۔ **کشتِ فکر:** سوچ کی کھیتی۔ **مضمر:** چھپا ہوا۔

مطلب: جس طرح رواں دواں گاتی گنگناتی ندی پہاڑوں کے سکوت میں ارتعاش پیدا کرتی ہے' اسی طرح اس کائنات میں تیری متخیلہ نے اہلِ ذوق کا دامن حکمت و دانش سے بھر دیا۔ تیرے خیالات نے فطرت کے مظاہر کو بھی بہار آشنا کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ تیری شاعرانہ فکر نے ایسی دنیائیں تخلیق کیں جو انسانی ذہن کو تازگی اور سرشاری سے ہمکنار کر گئیں۔

[1] جرمنی کا شہر [illegible]

تیری شعری تخلیقات میں حکمت کے ساتھ ایسی شوخیاں بھی موجود ہیں جو ساکت و جامد تصاویر کو بھی لب کھولنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک غالب کی شاعری میں خیال و فکر اور آہنگ کا طلسم پوشیدہ ہے۔

تیسرا بند معنی: **نطق:** بولنا، گویائی۔ **لب اعجاز:** وہ لب جس کی باتیں معجزہ ہوں۔ **آرامیدہ:** آرام پائے ہوئے۔

مطلب: تیرے کلام میں ایسے اعجاز پوشیدہ ہیں جو انسانی قوت بیان کے لیے باعث فخر و ناز قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اور تیرے تخیل کی بلندی پر آسمان کا سب سے زیادہ بلند اور درخشندہ ستارہ بھی حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ شاعری میں تیرا انداز بیان اس قدر منفرد اور دلنشین ہے جس پر مضامین خود نثار ہونے پر آمادہ رہتے ہیں۔ تیرے کلام میں ایسی تازگی اور مٹھاس ہے کہ اس کے بالمقابل شیراز کے حافظ اور سعدی جیسے بلند پایہ شعراء کا رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا ہے۔ مراد یہ کہ غالب دوسرے باکمال شعراء سے بھی عظیم ہے۔

لیکن کتنا اندوہگیں انقلاب ہے کہ تو اب اس دلی میں مدفون ہے جو انحطاط و زوال کا نمونہ ہے اور تخلیقی و تہذیبی اعتبار سے اجڑ چکا ہے۔ غالب! تیرے ہم عصر شعراء میں عالمی سطح پر تجھ سا بلند پایہ شاعر تو جرمنی کا گوئٹے ہے جو وہاں کے مشہور اور زندہ شہر "ویمر" میں دفن ہے۔

چوتھا بند معنی: **نظارہ آموز:** دیدار سکھانے والا۔

مطلب: اے شاعر عظیم! جب تک کوئی تیرے فکر و تخیل کی بلندی سے آشنا نہیں ہوتا وہ تیری ذات سے کس طرح واقف ہو سکتا ہے اور تیرے انداز بیان کی برابری کا کیسے حقدار ہو سکتا ہے؟ نہ جانے تیرے بعد ہندوستان کی سرزمین تخلیقی سطح پر کیوں بنجر ہو گئی اور اب وہاں تجھ سا عظیم شاعر اور دانشور کیوں پیدا نہیں ہو رہا؟

حالانکہ اردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہے اور اس کے عروج و ارتقاء کے لیے تجھ ایسے بلند پایہ شعراء درکار ہیں۔

پانچواں بند معنی: **گہوارہ:** جھولا۔ **گہر:** موتی۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال دہلی سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو جو ابتداء سے ہی علم و ہنر کا گہوارہ رہی ہے۔ اب تیری وہ عظمت کیا ہوئی؟ تیرے گلی کوچے کیوں حکمت و دانش سے خالی نظر آتے ہیں؟ حالانکہ تیری خاک میں بے شمار ایسے ماہرین علم و حکمت دفن ہیں جن کی شہرت و عظمت سے خود تیرا وجود روشن اور درخشندہ ہے۔

لیکن اتنا بتا دے کہ کیا تیری خاک میں غالب سا بھی کوئی بلند پایہ شاعر دفن ہے جو علم و حکمت، تخیل اور شاعرانہ لطافت میں یکتائے روزگار ہے۔

ابر کوہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظو ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا
ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا
بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہون
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

*

اقبال کی یہ نظم بھی مناظر فطرت کی آئینہ دار ہے۔ یہاں انہوں نے جو خوبصورت منظر نگاری کی ہے وہ انتہائی طور پر قابل داد ہے۔ پوری نظم بلند و بالا پہاڑوں پر چھائے ہوئے بادلوں کے مکالموں کی آئینہ دار ہے۔ بادل برستے ہیں تو کھیت سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ کاشتکاری کے عمل میں کسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔ باغوں میں پھلوں اور پھولوں کی کاشت بھی ان کے بغیر ممکن نہیں۔

پہلا بند معنی: فلک بوس: آسمان کو چومتا یعنی بلند۔ گل پاش: پھول برسانے والا۔

مطلب: نظم کے تمام اشعار میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں ابر کہسار مکالمہ کرتا ہے کہ میری مستقل بود و باش تو آسمانوں کو چھونے والے بلند و بالا پہاڑوں پر رہتی ہے۔ لیکن زمین پر پھول بکھیرتا رہتا ہوں یعنی جب تک نہ برسوں پھولوں کی نمود ممکن نہیں۔ کبھی صحرا میں برستا ہوں اور کبھی باغوں پر بارش برساتا ہوں۔ اس اعتبار سے شہروں کے علاوہ ویران مقامات اور کبھی جنگل پر بھی میرا تسلط رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب بادل برستے ہیں تو زمین پر موجود تمام مقامات کو سیراب کرتے ہیں۔

ابر کہسار کہتا ہے کہ کبھی پہاڑوں کی وادیوں میں برستا ہوں تو وہاں اگا ہوا سبزہ جو مخمل کی مانند ہوتا ہے وہی میری آماجگاہ بن جاتا ہے۔

دوسرا بند معنی: دُر افشاں: موتی بکھیرنے والا۔ ناقۂ

مطلب: اس بند میں بھی ابر کہسار پہلے بند کے تسلسل کے ساتھ یوں مکالمہ کرتا ہے کہ قدرت نے مجھے بارش کی بوندوں کی شکل میں زمین پر موتی برسانا سکھایا ہے کہ یہ بوندیں موتیوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ میں جب برستا ہوں تو ان لمحات میں بوندوں کے گرنے سے جو خوبصورت اور دلکش آوازیں پیدا ہوتی ہیں ان کو رحمت باری کے لیے نغمہ سرائی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور جب خشک و بنجر کھیتوں پر برستا ہوں تو ان کی آبیاری سے کسانوں کے پژمردہ دل مسرتوں اور خوشیوں سے لبریز ہو جاتے ہیں اور جب باغوں پر برستا ہوں تو وہاں پھلوں اور پھولوں پر تازگی اور شباب جھلک اٹھتا ہے۔

میرا وجود تو حیات و کائنات کے لیے ایک دل خوش کن حیثیت کا مالک ہوتا ہے اور جب ہوائیں چلتی ہیں تو مجھے یکجا ہو کر زمین پر برسنے اور اسے نکھارنے میں مدد دیتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بادل جب برستے ہیں تو نہ صرف یہ کہ فصلوں کی کاشت میں اضافہ ہوتا ہے' باغات میں پھل پھول کو زندگی اور نمو بخشتے ہیں بلکہ زمین کے حسن و زیبائش کا سبب بھی بنتے ہیں۔

تیسرا بند معنی: **مزرع نوخیز:** نئی اگی ہوئی کھیتی۔ **زادۂ بحر:** جو سمندر سے پیدا ہوا ہو۔

مطلب: اس بند میں ابر کہسار یوں مکالمہ کرتا ہے کہ پہلے بیان کے باوصف اگر میں کسی بستی پر سے برسے بغیر گزر جاتا ہوں تو جو کسان اور باغبان میرے برسنے کے منتظر ہوتے ہیں وہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس عالم میں رحمت باری کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ ان کی امیدیں تشنہ رہ جاتی ہیں اور میرے برسنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ پھر جب کسی ندی پر زور شور کے ساتھ برستا ہوں تو اس کے پانی میں بھنور سے پڑنے لگتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرے دم سے تازہ اگی ہوئی فصلیں اور باغوں کے سبزہ زار قائم ہیں۔ میں ان کے لیے امید و آس کی حیثیت رکھتا ہوں۔ میں سمندر سے پیدا ہوا ہوں اور سورج نے میری پرورش کی ہے۔ فطری اور سائنسی اصولوں کے مطابق سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے پھر بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے اس نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

چوتھا بند معنی: **چشمۂ کوہ:** پانی کا سوتا۔ **قم:** اٹھ' کھڑا ہو۔ **شبستانوں:** امیروں کے سونے کی جگہ۔

مطلب: اس آخری بند میں ابر کہسار یوں گویا ہے کہ پہاڑوں سے برآمد ہونے والے چشموں کو میں نے ہی سمندر جیسا جوش و خروش عطا کیا۔ میرے سبب ہی گرمی کے مارے پرندے سکھ کا سانس لے کر نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ میری وجہ سے ہی پامال اور مرجھایا ہوا سبزہ پھر سے لہلہانے لگتا ہے اور یہ میں ہی ہوں کہ جب باغوں پر برستا ہوں تو غنچے چٹک کر خوشنما اور خوشبودار پھولوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یعنی میرے بغیر یہ سب کچھ ممکنات سے نہیں ہے۔

میرے ہی فیض و برکت سے پہاڑوں کے دامن میں کسانوں کے جھونپڑوں میں بھی رونق آ جاتی ہے اس لیے کہ میرے سبب ان کی کھیتیاں لہلہاتی ہیں اور انہیں خوشحالی عطا کرتی ہیں۔ میں ان کے لیے مسرتوں کا باعث بنتا ہوں۔

ایک مکڑا اور مکھی

(ماخوذ)

(بچوں کے لیے)

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا
لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے — اپنوں سے مگر چاہیے یوں کھنچ کے نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری — وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی — حضرت! کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا، پھر نہیں اترا

مکڑے نے کہا واہ! فریبی مجھے سمجھے — تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہو گا
منظور تمہاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ — کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا
اڑتی ہوئی آئی ہوئی خدا جانے کہاں سے — ٹھہرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں برا کیا!
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں — باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے — دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے — ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا
مکھی نے کہا: خیر یہ سب ٹھیک ہے لیکن — میں آپ کے گھر آؤں، یہ امید نہ رکھنا

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں، سنی بات جو اس کی — پھانسوں اسے کس طرح یہ کمبخت ہے دانا
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں — دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا
یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی — اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا
ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت — ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں — سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی! — پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا
مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی — بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں — سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے — پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

*

"بانگ درا" کے حصہ اول میں سات ایسی نظمیں شامل ہیں جو علامہ اقبال نے خصوصی طور پر بچوں کے لیے تخلیق کیں۔ ان نظموں کا بنیادی مقصد اقبال کے نزدیک بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت تھی۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال بچوں کے معاملات میں کس قدر دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان سات نظموں میں سے بیشتر موضوعاتی سطح پر مغربی ممالک کے بعض شعراء کی تخلیقات سے ماخوذ ہیں۔ تاہم اہم بات یہ ہے کہ ان نظموں کی روح مشرقی ہے۔

پہلا بند **معنی**: کٹیا: جھونپڑی۔ نادان: بے وقوف۔

مطلب: زیر تشریح نظم "ایک مکڑا اور مکھی" بھی مغربی شاعری کی نظم سے ماخوذ ہے جس کے مطابق ایک مکڑا کسی مکھی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم ہر روز ادھر سے گزرتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی تم نے میرے غریب خانے میں قدم رکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ یہ درست ہے کہ اگر غیروں سے نہ ملا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اپنوں کے ساتھ اس طرح کی لاتعلقی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ اگر تم میرے گھر میں آؤ تو میری عزت افزائی ہو گی۔ میری یہ دعوت منظور کر لو تو سامنے جو سیڑھی ہے اس سے آ جاؤ! مکھی نے مکڑے کی بات کو بغور سنا پھر گویا ہوئی کہ حضرت! یہ دھوکا کسی احمق کو دیجیے! اس لیے کہ میں تو اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہوں کہ جو آپ کی سیڑھی پر چڑھا پھر واپس نہیں آیا۔

دوسرا بند **معنی**: فریبی: دھوکہ باز۔ کٹیا: جھونپڑی۔

مطلب: اس مرحلے پر مکڑے نے بڑی نخی کے ساتھ مکھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ تم مجھے دھوکے باز سمجھ کر نادانی کا ثبوت دے رہی ہو۔ میں نے جو تمہیں یہاں آنے کی دعوت دی تو محض تمہاری خاطرداری منظور تھی جب کہ اس میں میرا کوئی فائدہ نہ تھا۔ تم جانے کتنی دور دراز سے اڑتی ہوئی آ رہی ہو۔ اس میں برائی کیا ہے کہ چند لمحوں کے لیے یہاں رک کر سانس لے لو۔

ہرچند کہ میرا گھر باہر سے بالکل معمولی نظر آتا ہے لیکن اس میں کئی ایسی نادر اشیا موجود ہیں جنہیں دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ گی۔ اندر جو دروازے موجود ہیں ان پر میں نے خوش رنگ پردے لٹکائے ہوئے ہیں۔ اور جو دیواریں ہیں ان پر شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مہمانوں کے آرام کے لیے بستر بھی حاضر ہیں۔ تم جانتی ہی ہو کہ ہر شخص کو ایسی آسائشیں میسر نہیں ہوتیں۔ مکھی نے جواباً کہا بے شک تمہاری بات درست ہو گی۔ پھر بھی میں اچھی طرح اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ان بستروں پر اگر کوئی بدقسمت سو جائے تو پھر قیامت تک نہیں اٹھ سکتا۔ لہٰذا مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے تمہارے گھر آ جاؤں گی۔

تیسرا بند **معنی**: کھٹکا: ڈر، خوف۔ مکھی کو اڑایا: مکھی کو کھایا۔

مطلب: مکھی کا جواب سن کر مکڑا حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ کم بخت تو بڑی ہوشیار نکلی۔ چنانچہ سوچنے لگا کہ

اس کو پھانسنے کے لیے کونسا حربہ آزمایا جائے؟ پھر چند لمحوں تک خاموش رہ کر یوں گویا ہوا کہ بی بی! بے شک اللہ نے آپ کو بڑا مرتبہ عطا کیا ہے۔ جو کوئی نظر بھر کر دیکھ لیتا ہے۔ آپ سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک ہے اور سر پر اللہ نے کلغی سجائی ہے۔ آپ کی خوبصورتی' لباس اور نفاست میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ اور جب پرواز کے دوران جب آپ نغمہ سرا ہوتی ہیں تو قیامت کا سماں بندھ جاتا ہے۔

مکھی نے مکڑے کی جب یہ خوشامدانہ باتیں سنیں تو پسیج گئی اور کہنے لگی مجھے آپ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی اس طرح کی دعوت دے تو میں انکار کو خود بہت برا سمجھتی ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھا فعل تو نہیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اڑ کر جیسے ہی مکڑے کے پاس پہنچی تو اس نے اچھل کر مکھی کو دبوچ لیا۔ یوں بھی وہ کئی روز سے بھوکا تھا۔ چنانچہ کسی توقف کے بغیر مکھی کو ہڑپ کر گیا۔

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

بچوں کے لیے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم' تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
ذرا سی چیز ہے' اس پر غرور! کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ' یہ شعور! کیا کہنا!
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں! جانور غریب کہاں
کہا یہ سن کے گلہری نے' منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا' کوئی چھوٹا' یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

*

یہ نظم بھی ایک مکڑا اور مکھی کی طرح بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا بنیادی خیال ایمرسن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ یہاں اس رائے کا اظہار غیر ضروری نہ ہو گا کہ اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں تخلیق کی ہیں' ان میں خصوصیت کے ساتھ اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ لفظی اور نفسیاتی سطح پر بچوں کی سوچ اور معیار کے مطابق ہوں۔ یہ ایک سادہ سی نظم ہے لیکن بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لیے بھی سبق آموز ہے۔ فرماتے ہیں۔

① کسی پہاڑ نے زبانِ حال سے گلہری سے کہا کہ میرے مقابلے پر تو اتنی چھوٹی اور مختصر چیز ہے کہ اگر تجھ میں معمولی سی شرم بھی ہو تو کہیں جا کر ڈوب مرے۔

② ہر چند کہ تو مختصر سی شے ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کس برتے پر اتنا غرور کرتی ہے۔ تو نے تو یہ سمجھ رکھا ہے کہ تجھ سے زیادہ نہ کسی اور میں عقل اور سمجھ موجود ہے بلکہ خود کو ہر شخص سے زیادہ باشعور تصور کرتی ہے۔

③ تجھے دیکھ کر تو خدا کی شان نظر آ جاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کتنی عجیب بات ہے جو بے حیثیت سے خود کو باحیثیت! اور جو بے شعور ہے وہ خود کو باشعور سمجھنے لگ جائے!

④ اے گلہری! میری شان و شوکت کے بالمقابل تیری تو حیثیت کچھ بھی نہیں جب کہ زمیں بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

⑤ جو عز و جاہ مجھ کو نصیب ہے وہ بھلا تیرے مقدر میں کہاں ہے؟ میں تو ایک بلند و بالا پہاڑ ہوں اور تو ننھی سی گلہری! تیری حیثیت میرے نزدیک بے معنی سی ہے۔

⑥ پہاڑ کی باتیں سن کر گلہری کو بھی طیش آ گیا وہ بڑے غصے سے یوں گویا ہوئی کہ تو نے جو کچھ کہا میں نے سن لیا۔ تیرے لیے مناسب تو یہ تھا کہ منہ سنبھال کر بات کرے مگر تو تو خوا مخواہ احساس برتری کا شکار ہے۔ تو نے جو کچھ باتیں کہی ہیں تجھ پر لازم ہے کہ انہیں اپنے دل سے نکال پھینک ورنہ خراب و خستہ ہو گا۔

⑦ اے پہاڑ! غور سے سن لے کہ اگر میں تیری طرح بلند و بالا نہیں تو اس حقیقت سے کیسے انکار کر سکے گا کہ تو بھی تو میری مانند چھوٹا نہیں ہے۔

⑧ اس حقیقت سے کس طرح انکار کر سکے گا کہ کائنات میں جو شے بھی تخلیق کی گئی ہے اس سے قدرت خداوندی ہویدا ہے۔ اور اگر قد و قامت کے اعتبار سے بڑا یا چھوٹا ہے تو اس امر کا تعلق اسی کی حکمت و دانش سے ہے۔

⑨ اس بات کو کیوں بھولتا ہے کہ خدا نے اگر تجھے بڑا بنا دیا تو اس امر سے اختلاف ممکن نہیں تو یہ بتا کہ قدرت نے جہاں تیرے قد کو اس قدر بلند کیا تو مجھے بھی تو درخت کی بلندیوں پر چڑھنا سکھا دیا ہے۔

⑩ یہ بھی جان لے کہ صرف بلندی ہی کوئی خوبی نہیں ہے کہ تو تو اس قدر مجبور و معذور ہے کہ اپنی جگہ سے ایک قدم آگے کی طرف بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

(11) اے پہاڑ! اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تو واقعی بڑا ہے تو میں ایک معمولی سی شے چھالیہ تیرے پاس رکھے دیتی ہوں اگر تجھ میں کوئی ہنر اور طاقت موجود ہے تو اس کو ہی توڑ کر دکھا دے۔

(12) تو اپنی بلندی پر اس قدر غرور نہ کر بلکہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ خدائے عز و جل نے اس عالم رنگ و بو میں جن چیزوں کو بھی پیدا کیا ہے ان میں سے کوئی شے بھی بیکار نہیں بلکہ ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد لیے ہوئے ہے۔

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں ہر طرف ندیاں تھیں صاف رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندی کے پاس اک بکری چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی
جب ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھا پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جھک کر اسے سلام کیا پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں! گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
کٹ رہی ہے بری بھلی اپنی ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آ بنی ہے، کیا کہیے اپنی قسمت بری ہے، کیا کہیے
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں رو رہی ہوں بروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے
دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے ہوں جو دبلی، تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے کن فریبوں سے رام کرتا ہے
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ برائی ہے میرے اللہ! تری دہائی ہے
سن کے بکری یہ ماجرا سارا بولی، ایسا گلہ نہیں اچھا
بات سچی ہے بے مزا لگتی میں کہوں گی مگر خدا لگتی
یہ چراگہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی قید ہم کو بھلی، کہ آزادی؟
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا واں کی گزر ان سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
گائے سن کر یہ بات شرمائی آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا برا اس نے اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

*

یہ نظم اٹھارھویں صدی کے مشہور برطانوی شاعر ولیم کاؤپیر کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ یہ نظم بھی پہلی دو نظموں کی طرح ایک مکالمے پر مشتمل ہے لیکن اس بار مکالمہ "گائے اور بکری" کے مابین ہے۔ نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کو بلاجواز کسی دوسرے سے گلہ مند نہیں ہونا چاہیے۔

اس نظم کے ابتدائی چار اشعار میں اقبال ایک سرسبز چراگاہ کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس چراگاہ میں ہرے بھرے درختوں اور پودوں کی فراوانی' بہار کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہر جانب شفاف پانی کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اناروں کے پھل دار اور پیپل کے بے حساب درخت موجود تھے۔ چراگاہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ہر جانب پرندے چہچہا رہے تھے۔

(1) اسی چراگاہ میں ایک ندی کے پاس ہی کہیں سے ایک بکری چرتے چرتے آ گئی۔ ادھر ادھر نظر آئی تو دیکھا کہ قریب ہی ایک گائے بھی اپنا پیٹ بھرنے میں مصروف ہے۔

(2) بکری نے پہلے ادب و احترام کے ساتھ گائے کو سلام کرتے ہوئے اس کی خیر و عافیت کے بارے میں پوچھا پھر بولی! یہ تو فرمایئے' آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

(3) گائے نے قدرے بیدلی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اچھے ہیں۔ بری بھلی کٹ ہی رہی ہے۔ البتہ عملی طور پر زندگی مصائب سے دوچار ہے۔

(4) اے بکری! کیا حال پوچھتی ہے۔ جان پر بنی ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قسمت ہی بری ہے۔ ہر جانب خدا کی شان کا مظاہرہ کرتے ہوئے بروں کی جان کو رو رہی ہوں۔ مقدر میں جو لکھا ہے وہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ آخر غریبوں کا زور ہی کس پر چل سکتا ہے؟ اب تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آدمی کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرنا چاہیے۔ خدا کرے اس سے کسی کا واسطہ نہ پڑے۔

(5) یہ آدمی تو ایسا احسان ناشناس ہے کہ اگر دودھ کم دوں تو ہر لحہ گلے شکوے کرتا رہتا ہے۔ دبلی ہو جاؤں تو مجھے قصابوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا ہے۔ میرے ساتھ طرح طرح کے ہاتھ کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بچوں کی پرورش کر رہی ہوں۔ میرا دودھ نہ ہو تو وہ بھوکوں مر جائیں۔ لیکن اس نیکی کا بدلہ وہ برائی ہی سے دیتا ہے۔

(6) گائے کی زبانی یہ احوال سن کر بکری نے کہا کہ اس انداز کی شکایت اور گلہ مناسب نہیں ہے۔ ہر چند کہ سچی بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے لیکن سچ کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔ یہ تو بتایئے کہ جو ہری ہری گھاس آپ چر رہی ہیں اور یہاں جو سایہ دار درخت موجود ہیں جن کے پتوں سے چھن چھن کر ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں کیا یہ محض آدمی کی محنت اور مشقت کے سبب سے وجود میں نہیں آئیں اور کیا ہم غریب اور بے سروسامان مویشی ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ یہ آدمی ہی ہے جس کے دم سے ہمیں ایسی سہولتیں میسر

آئی ہیں۔ پھر آپ کا گلہ قطعی بے جا نظر آتا ہے۔

(7) بکری کی حقیقت بیانی سے گائے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ شرماتے ہوئے بولی' تم مجھ سے بے شک چھوٹی ہو لیکن تمہاری باتیں سچی ہیں اور دل کو بھی لگتی ہیں۔

بچے کی دعا

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

*

اقبال کے بقول اس نظم کا مرکزی خیال مغرب کے ایک شاعر کی نظم سے لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود صرف چھ اشعار پر مشتمل دعائیہ نظم بچوں کی مقبول ترین نظم ہے۔ پاکستان کے تو ہر سکول میں دن کی تعلیم کا آغاز اسی نظم سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی متحدہ ہندوستان کے سکولوں میں بھی یہ دعا بڑی باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔

خدائے عزوجل کی بارگاہ میں بچہ دعا کرتا ہے کہ میرے لبوں پر یہ دعا آرزو بن کر مچل رہی ہے کہ میری زندگی شمع کی مانند ہو۔ شمع جو گھور اندھیرے کو منور کر دیتی ہے لیکن خود جلتی رہتی ہے۔ دنیا میں جہالت کی جو تاریکی چھائی ہے' بار الٰہ! وہ میرے علم کی بدولت دور ہو جائے۔ جس طرح پھول چمن کی زیبائش اور زینت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح میری ذات میرے وطن کی زیبائش کا سبب بن جائے۔

خداوندا! جس طرح پروانہ شمع پر نثار ہو کر زندۂ جاوید ہو جاتا ہے اسی طرح مجھ کو بھی صلاحیت عطا کر کہ اپنی جدوجہد اور قربانی سے وطن کو سنوار سکوں۔ میری ذمہ داری یہ ہے کہ ہر شخص سے محبت کروں' غریبوں' کمزوروں اور ضرورتمندوں کے کام آؤں۔

میرے مولا مجھے ہر طرح کی برائی سے بچا کر نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کر۔

ہمدردی
(ماخوذ از ولیم کوپر)
بچوں کے لیے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

*

علامہ اقبال نے خود بتایا ہے کہ بچوں کے لیے اس نظم کا مرکزی خیال انہوں نے برطانیہ کے ایک شاعر ولیم کوپر کی نظم سے لیا ہے۔ بچوں کے لیے اقبال کی دوسری نظموں کی طرح "ہمدردی" بھی ایک سیدھی سادی نظم ہے جس میں ایک بلبل اور جگنو کے مابین مکالمہ ہے۔ اس میں جو اشعار شامل ہیں ان کے مطالعہ سے ہی اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم کس قدر سبق آموز ہے۔

نظم میں بتایا گیا ہے کہ کسی درخت کی شاخ پر ایک بلبل تنہا اور اداس بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ سارا دن تو دانہ دنکا چگنے میں گزر گیا اور اب رات سر پر آگئی ہے۔ ساری فضا پر تاریکی چھا گئی ہے۔ ایسے میں کس طرح اپنے گھونسلے تک پہنچ سکوں گا؟

بلبل کی یہ دکھ بھری داستان قریب کے درخت پر بیٹھے ہوئے ایک جگنو نے بھی سن لی۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا' کہنے لگا۔ بے شک میں ایک حقیر سا کیڑا ہوں۔ اس کے باوجود تمہاری مدد کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔ اے بلبل! اس بات کا غم نہ کرو کہ رات تاریک ہے۔ اور ہر سمت اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ تاہم مجھ میں قدرت نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ اپنی روشنی سے تمہارے راستے کی تاریکی دور کر دوں۔ باری تعالیٰ نے تو میرے جسم کو روشنی عطا کر کے دیئے کے مانند بنا دیا ہے۔ چنانچہ تمہاری رہنمائی کا فریضہ اپنے ذمے لیتا ہوں۔ نظم سے یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو مشکل میں دوسروں کے کام آتے ہیں۔

ماں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب / بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں / اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال / قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی / تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے / دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں / خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر / مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا / دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں / مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار / پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی / گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب / دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری / نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا / دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

*

نظم ماں کا خواب بھی بچوں کی دیگر نظموں کی طرح ایک نظم ہے۔ یہ نظم بھی کسی مغربی شاعر کی نظم سے ماخوذ ہے جو ایک ایسی ماں کے خواب پر مشتمل ہے جس کا بچہ وفات پا چکا ہے۔ اس کے غم میں وہ مسلسل آہ و زاری کرتی ہے۔ دوسری نظموں کی طرح بچوں کے لیے یہ نظم بھی ایک پس منظر لیے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں:-

ایک ماں اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ رات کو سوتے ہوئے کیا دیکھتی ہوں کہ میں کہیں جا رہی ہوں لیکن اس قدر تاریکی ہے کہ راستہ نظر آتا ہے۔

اس منظر سے میری بے چینی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ خوف کے مارے کانپنے لگی اور قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔

کچھ حوصلہ کر کے آگے بڑھی تو دیکھا لڑکوں کی ایک لمبی قطار ہے جو ایک جانب رواں دواں ہے۔ ان کے لباس سبز ہیں اور وہ ہاتھوں میں جلتے ہوئے چراغ لیے ہوئے ہیں۔ بڑی خاموشی کے ساتھ چل رہے تھے۔ نہ جانے ان کی منزل کونسی تھی؟ اس قطار میں مجھے میرا بیٹا بھی نظر آیا جو قطار کے آخر میں قدرے

آہستگی سے چل رہا تھا۔ اس ہاتھ میں بھی اگرچہ ایک چراغ تھا لیکن بجھا ہوا تھا۔
اس نے بیٹے کو پہچان کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ تو کہاں چلا گیا تھا۔ تیری جدائی میں میری حالت تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہوں۔ اس لمحے بیٹے نے قدرے دکھ کے ساتھ منہ پھیر لیا اور جواب میں کہا کہ آپ کی آہ و زاری سے میرا چراغ بجھ کر رہ گیا ہے اور اس سے مجھے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

پرندے کی فریاد

(ماخوذ)

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ باغ کی بہاریں وہ چڑیوں کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھکو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

*

بچوں کے لیے اقبال کی یہ نظم برطانیہ کے شاعر "ولیم کوپر" کی ایک نظم کا آزاد اردو ترجمہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آزادی خواہ انسان کے خواہ پرندے کے لیے بھی ایک نعمت سے کم نہیں۔ غلامی تو ایک لعنت ہے۔ اسی موضوع پر علامہ نے ایک پرندے کے مکالمے کو ان اشعار میں پیش کیا ہے۔ یہ پرندہ پنجرے میں محبوس ہے اور زبان حال سے کہتا ہے۔
آج مجھے وہ گزرا ہوا زمانہ یاد آ رہا ہے، جب میں باغ میں دوسرے پرندوں کے ساتھ مل کر چہچہایا کرتا تھا۔ اب وہ آزادی کہاں نصیب ہے جب میں اپنی مرضی سے گھونسلے میں آیا جایا کرتا تھا۔ جس لمحے ماضی کی باتیں یاد آتی ہیں تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ وہ لمحات بھی یاد آتے ہیں جب کلیوں پر شبنم گرتی تھیں اور وہ کھل کر پھول بن جایا کرتی تھیں۔ اب تو میرے ساتھی بلبل کی نہ صورت نظر آتی ہے نہ ہی اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہی تو میرا ہم سفر تھا۔ جس کے دم سے میرا گھر آباد تھا۔ میں پنجرے میں بند ہوں۔

اس کی آواز تک کانوں میں نہیں آتی۔ اے کاش! یہاں سے رہائی میرے بس کی بات ہوتی۔

میں کس قدر بد نصیب پرندہ ہوں جو گھر کے لیے ترس رہا ہوں۔ میرے تمام ساتھی وطن میں ہیں اور میں یہاں قید میں پڑا ہوا ہوں۔ باغ میں بہار آئی ہوئی ہے اور کلیاں مسکرا رہی ہیں جب کہ میں اس تاریک پنجرے میں گرفتار اپنے مقدر کو رو رہا ہوں۔ اس قید کا دکھڑا سننے والا بھی کوئی نہیں۔ مجھے تو اب یہ خدشہ ہے کہ آزادی کے غم میں کہیں اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں!

صورت یہ ہے کہ جس وقت سے اپنا وطن اور گھر چھٹا ہے تو غموں سے نڈھال ہو رہا ہوں۔ ہر وقت دل گرفتہ رہتا ہوں۔ میں جس لے میں فریاد کر رہا ہوں اسے گانا سمجھ کر سننے والوں کو لطف اندوز نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ تو ایک دکھے ہوئے دل کی فریاد ہے۔ اے مجھے قید کرنے والے! خدارا اس پنجرے سے آزاد کر دے کہ میں ایک بے زبان قیدی ہوں تو مجھے چھوڑ کر دعا قبول کر لے۔

خفتگان خاک سے استفسار

مہر روشن چھپ گیا اٹھی نقاب روئے شام — شانہ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے — محفل قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لب گفتار پر — ساحر شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر
غوطہ زن دریائے خاموشی میں ہے موج ہوا — ہاں، مگر اک دور سے آتی ہے آواز درا
دل کہ ہے بیتابی الفت میں دنیا سے نفور — کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور
منظر حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں!
ہم نشین خفتگان کنج تنہائی ہوں میں

تھم ذرا بیتابی دل! بیٹھ جانے دے مجھے — اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے
اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم! — کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟ — اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟ — اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا؟ — اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟
یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل — شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگل جاتا ہے دل؟
رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں — اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں؟
اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے — روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟
کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے خرمن بھی — قافلے والے بھی ہیں، اندیشۂ رہزن بھی ہے؟
تنکے؟ چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟ — خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟
واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟ — امتیاز ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟
واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں؟

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے؟ — یا رخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے؟
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟ — آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے؟
کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے؟ — موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں' کیا راز ہے؟
اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے — علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟
دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی؟ — لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟ — واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا؟
آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟ — یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

*

چھبیس اشعار کی یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصے میں صرف چھ اشعار ہیں۔ دوسرے میں بارہ اور آخری حصے میں آٹھ اشعار ہیں۔ پہلے حصے میں اقبال شام کے اوقات میں ایک قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے حصے میں حیات و کائنات کے بالمقابل حیات بعد از ممات کا تقابلی جائزہ ہے جب کہ تیسرا حصہ بھی کم و بیش اسی نوعیت کے جائزے پر مشتمل ہے۔

① **معنی**: **خفتگان خاک**: خاک میں سوئے ہوئے۔ **استفسار**: سوال۔ **مہر**: سورج۔ **روئے شام**: شام کا چہرہ۔ **ساحر**: جادوگر۔ **غوطہ زن**: غوطہ لگانا' ڈبکی لگانا۔ **نفور**: نفرت کرنے والا۔

مطلب: شام ڈھل رہی ہے اور سورج غروب ہو چکا ہے۔ چاروں طرف شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت اپنے تمام مناظر کے ساتھ ڈوبنے والے سورج کے غم میں ماتم کناں ہے۔ یوں تو نہیں کہ آسمان نے گفتگو کرنے والے لبوں پر سحر پھونک دیا ہے اور رات کا کردار ایک ایسے ساحر کے مانند ہے جو زندہ انسانوں پر خواب طاری کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ہوا بھی ساکت ہو کر رہ گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس کیفیت میں بھی ایک ایسی آواز سنائی دے رہی ہے جیسے کسی سرگرم سفر قافلے میں ہراول دستے کے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز ہو۔

یہی وہ عالم ہے جس نے مجھے (یعنی اقبال کو) اس عالم فانی سے متنفر کر دیا ہے اور اس کو ترک کر کے اس قبرستان میں آ گیا ہوں جہاں زندگی سے گزر جانے والے کنج تنہائی میں خاموش سو رہے ہیں۔ یہاں میں بھی ان کا ہم نشیں ہوں۔

② **معنی**: **مے غفلت**: غفلت کی شراب۔ **امروز و فردا**: آج اور کل۔ **پیکار عناصر**: عنصروں کی لڑائی۔ **افتاد**: مصیبت' آفت۔ **امتیاز ملت و آئیں**: قوم اور شرع کا فرق۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال بڑے دکھ بھرے اور اضطراب انگیز لہجے میں اہل قبور سے استفسار کرتے ہیں کہ تمہاری اس غمناک اور اندوہگیں بستی پر میں اشک افشانی کرنے پر مجبور ہوں لیکن اتنا تو بتاؤ کہ جس بستی میں تمہاری بود و باش ہے اس کی کیفیت کیا ہے؟ کیا یہ بستی بھی میری دنیا کی مانند ہے جہاں ہر لحظہ انسان' انسان سے برسرپیکار رہتا ہے۔ کیا یہاں بھی تم میری دنیا کے باشندوں کی طرح مجبور و معذور ہونے کے ساتھ ہر طرح کی محرومیوں کا شکار ہو؟

اے اہلِ قبور! کیا تمہاری بستی میں بھی شمع کی روشنی پر پروانہ اپنی جان، نثار کر دیتا ہے؟ پھول اور بلبل کے بارے میں جو روایتی داستانیں ہماری دنیا میں موجود ہیں کیا تمہاری بستی بھی اسی نوعیت کی داستانوں سے مزین ہے۔ میری دنیا میں تو شاعر کا ایک مصرعہ ہی دل کو تڑپانے کا موجب ہوتا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ تمہارا دل بھی شعر کی حدت سے پگھل جاتا ہے۔

جس طرح اس دنیا میں انسانی رشتے باہمی نفرتوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ کیا تم لوگ بھی اسی صورت حال سے دوچار ہو؟ اس دنیا کی معیشت تو بے شمار جھمیلوں میں گھری ہوئی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ ہمارے معاشرے کی طرح کیا تمہارے بھی بجلی، کسان اور کچے گھروندے ہیں۔ کیا وہاں بھی اہلِ قافلہ کو رہزنوں سے لٹ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ کیا وہاں کے پرندے بھی اپنے گھونسلوں کے لیے تنکے چنتے ہیں اور کیا ہماری طرح تم لوگ بھی مکانوں کی تعمیر کے لیے اینٹ اور گارے کا استعمال کرتے ہو۔ یہ بھی بتا دو کہ جس طرح ہمارے لوگ اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور ذاتی عقیدوں کے جنون میں مبتلا ہیں۔ کیا تمہارے ہاں بھی یہی معاملات ہیں؟ ہمارے معاشرے میں ظلم و جبر کے خلاف جس طرح آواز بلند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کیا تمہاری دنیا کی صورت حال بھی یہی ہے؟

③ **معنی: معصیت سوزی**: گناہوں کو جلانا۔ **تادیب**: سزا، گوشمالی۔ **ہست و بود**: ہستی اور وجود مراد زندگی۔ **مہجور**: ہجر، جدائی۔ **لن ترانی**: تلمیح ہے۔ مطلب ہے کہ اے موسیٰ! تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ **قتیل**: مارا ہوا۔ **گنبد گرداں**: گھومنے والا گنبد۔

مطلب: یہ اشعار بھی دوسرے حصے کا تسلسل ہیں جن میں اقبال خفتگانِ خاک سے سوال کرتے ہیں کہ یہ تو بتاؤ! تمہاری دنیا میں جس خطے کا نام بہشت ہے کیا وہ کوئی باغیچہ ہے یا آرامگاہ ہے یا پھر اس مقام پر حسنِ ازل بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا ہے؟ جہنم جو ہے کیا اس کے شعلوں میں گنہگاروں کو ڈال کر سزا دیتا ہے یا پھر یہی شعلے گناہوں کو بھسم کرنے کا ذریعہ ہیں؟ اس دنیا میں تو انسان اپنے مادی جسم کے باوجود محوِ پرواز رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن تمہاری دنیا میں بھی کیا یہی صورت ہے؟ یہ بھی بتاؤ! کہ ہم جس شے کو موت کہتے ہیں کیا تم اس راز سے آگاہ ہو؟

اے اہلِ قبور! ہماری دنیا میں تو زندگی اور موت کا مسئلہ انتہائی اضطراب کا سبب ہے۔ کیا تمہاری دنیا میں بھی علم اتنا ہی محدود ہے؟ محبوب کی ایک جھلک سے کیا وہاں بھی سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے یا پھر کوہِ طور پر اس دنیا میں حضرت موسیٰ کو خدا نے اپنا جلوہ دکھانے سے انکار کیا تھا کیا وہاں بھی ایسا ہوتا ہے؟ کیا تمہاری دنیا میں بھی تحقیق و جستجو سے روح کو آسودگی نصیب ہوتی ہے اور کیا وہاں بھی فرد عقل و فہم کا ادراک رکھتا ہے؟ مجھے اتنا بتا دو کہ تمہاری محبت کی تجلی سے نور کا سراپا بنی ہوئی ہے یا وہاں بھی نفرتوں کی تاریکی چھائی ہوئی ہے؟ کائنات کا سب سے بڑا راز موت ہے جو منکشف نہ ہونے کے سبب قلبِ انسان میں کانٹے کی طرح معلق ہے۔

شمع و پروانہ

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع! پیار کیوں؟ یہ جانِ بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے
آداب عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟
کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برق نگاہ کا؟
آزار موت میں اسے آرام جاں ہے کیا؟
شعلے میں تیرے زندگی جاوداں ہے کیا؟
غم خانہ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو
اس تفتہ دل کا نخل تمنا ہرا نہ ہو
گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذت سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو' یہ ذرا سا کلیم ہے
پروانہ اور ذوق تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

٭

معنی: **سیماب وار:** پارہ کی طرح بیقرار۔ **آزار موت:** مرنے کا دکھ۔ **تفتہ دل:** جلا ہوا دل۔ **نخل تمنا:** تمنا کا درخت۔

مطلب: اس نظم میں اقبال' شمع سے مکالمہ کرتے ہوئے استفسار کرتے ہیں کہ تجھ میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ پروانہ تجھ سے اتنی والہانہ محبت کرتا ہے۔ وہ تو اس قدر تیرے لیے بیتاب رہتا ہے کہ اپنی جان بھی تجھ پر قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ حیرت ہے کہ تیرے گرد یہ ہر لحہ طواف کرتا رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تیری محبت اسے پارے کی طرح بیقرار رکھتی ہے۔ تو ہی بتا دے کہ عشق و محبت کے یہ آداب کیا تو نے اسے سکھائے ہیں؟ اور گویا تیری برق نظر نے اسے جلا کر راکھ کر دیا ہے؟ کیا تیرے شعلے میں اسے اپنے لیے حیات جاوداں نظر آتی ہے جو اس طرح موت کو قبول کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

اے شمع! یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر دنیا کے اس غم کدے میں تیری روشنی موجود نہ ہو تو پروانے کا دل ناصبور کبھی بھی آسودہ نہیں ہو سکتا۔ نا ہی اس کو سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے ننھے سے دل میں عشق و محبت کا سوز و گداز اتنا شدید ہے کہ تجھ پر فدا ہونے کو یہ عبادت تصور کرتا ہے۔ اے شمع! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پروانے میں ماضی کے روایتی عشق کا جذبہ بھرپور انداز میں موجود ہے اور اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ تیرا وجود ایک چھوٹے سے کوہ طور کے مانند ہے اور یہ پروانہ ایک ننھے سے کلیم کی حیثیت رکھتا ہے کہ جلوہ دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائے۔ یہ پروانہ ہر چند کہ ننھا سا کیڑا ہے تاہم اس میں روشنی پر نثار ہونے کا بلند جذبہ اور ذوق بہرحال موجود ہے۔

عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر' گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثل خضر خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی
مظہر شان کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرت لعل بے بہا ہوں میں

دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے پر مجھے بھی تو دیکھ، کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا طائر سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

*

تیرہ اشعار پر مشتمل، یہ نظم عملی سطح پر عقل اور دل کے مابین ایک مکالمہ ہے جس میں عقل اور دل اپنی اپنی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ یہ مکالمہ علامہ اقبال نے تخیلی بنیاد پر یہاں منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔ نظم کے تیرہ میں سے پانچ اشعار عقل کی زبانی بیان کیے گئے ہیں جب کہ باقی کے آٹھ شعروں میں دل اپنی خصوصیات بیان کرتا ہے۔

عقل

(ایک تا پانچ): معنی **خضر:** ایک پیغمبر کا نام۔ **خجستہ:** مبارک۔ **مفسر:** تفسیر کرنے والا۔

مطلب: نظم کا آغاز عقل کی زبانی ہوتا ہے جو دل سے ایک دن یوں گویا ہوتی ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو یہ جان لے کہ میں ان لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہوں جو اپنے صحیح راستے سے بھٹک کر غلط راہ پر چل پڑے ہیں۔ بے شک میرا وجود زمین پر قائم ہے۔ اس کے باوجود میری پہنچ آسمان تک ہے کہ میں اپنی قوت استدلال کے سبب زمین پر رہتے ہوئے بھی آسمان کی وسعتوں اور ان کے عوامل سے پوری طرح آگاہ رہتی ہوں۔ اس دنیا میں میرا کام تو ان لوگوں کی صحیح رہبری کرنا ہے جو اپنی راہ سے بھٹک چکے ہیں۔ یوں میری حیثیت حضرت خضر کی سی ہے جن کے ذمے قدرت نے یہ فریضہ لگایا ہے۔ اگر زندگی کو ایک صحیفہ تصور کر لیا جائے تو یہ جان لے کہ میں اس کی تفسیر کی اہلیت رکھتی ہوں۔ یہی نہیں بلکہ شان خداوندی کا اظہار بھی میرے ہی دم سے ہوتا ہے۔ تیری حیثیت تو اے دل بس اتنی ہی ہے کہ تو خون کی ایک بوند کے مانند ہے جب کہ میرا وجود ایک نایاب لعل کی طرح سے ہے جس کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔

دل

(6-9) **معنی: معرفت:** خدا کی پہچان۔ **خدا نما:** خدا کو دکھانے والا۔

مطلب: عقل کی زبان سے یہ الفاظ سن کر دل نے جواب میں کہا' تو نے جو کچھ کہا ہے بے شک درست ہو گا لیکن تو نے میری حقیقت کو جاننے کی بھی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اس امر کا تجزیہ کر سکی کہ فی الواقع میں کیا شے ہوں؟ مانا کہ زندگی کے اسرار کا تجھ کو ادراک ہے لیکن یہ نہ بھول کہ میں تو ان کو خود اپنی نگاہ بصیرت سے دیکھنے کا اہل ہوں۔ تیرا واسطہ تو محض ظاہری اشیاء سے ہے جب کہ میں داخلی سطح پر ہر شے کے باطن میں شنا رہتا ہوں۔ اس حقیقت کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تیرا دائرہ کار علم ہے۔ تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کائنات کے جملہ اسرار کی پہچان کا منبع میں ہوں۔ خدا کو شناخت کرنے کا عمل بھی تیری بجائے میرے وجود سے وابستہ ہے۔

(13-10) معنی: سدرہ: وہ مقام جو جبرائیل کی پرواز کی آخری حد ہے۔

مطلب: اے عقل! یہ بھی جان لے کہ علم جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا ردعمل اضطراب اور بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ تو محض ایک عارضہ ہے۔ چنانچہ میری ذات ہی اس مرض کے لیے مسیحا کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو اگر سچائی کی محفل میں شمع کے مانند ہے تو میں بھی حسن کی بزم میں ایک روشن دیے کی حیثیت رکھتی ہوں۔ اگر شعر میں دل یوں گویا ہوتا ہے کہ اے عقل! اگر تیری رسائی زمان و مکان تک ہے تو یہ حقیقت نہ بھول کہ میری پرواز ان مراحل تک ہے۔ جہاں زمان و مکان کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ بس اس سے زیادہ اور میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ میرا مرتبہ انتہائی بلند ہے۔ بس اتنا جان لے کہ میرا وجود توریت جلیل کے عرش کی مانند ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے عقل تو بڑی حد تک خوش فہمیوں کا شکار ہے جب کہ میں فطرت کی حقیقتوں سے پوری طرح آشنا ہوں اور ان کا مکمل ادراک رکھتی ہوں۔

صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

دانہ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں

حسن ہو کیا خود نما' جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب' جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

*

پہلا بند معنی: محیط: گھیرنے والا' گھیرا۔ خرمن: غلے کا انبار' کھلیان۔ اختلاط: میل جول۔

مطلب: نو اشعار پر مشتمل اس نظم کے دو بند ہیں۔ پہلے بند میں پانچ اشعار ہیں اور دوسرے میں چار شعر ہیں۔ "بانگ درا" کی یہ نظم پوری کی پوری وطن پرستی کے جذبات سے عبارت ہے۔ اس میں قومی درد کی وہ جھلک دکھائی دیتی ہے جو خصوصیت کے ساتھ "بال جبریل" "ضرب کلیم" اور اقبال دوسرے مجموعوں میں نظر آتی ہے۔ اس نظم کے پہلے بند کا آغاز وہ اس طرح سے کرتے ہیں۔

ہندوستان کے باشندوں کے مابین نفاق کا جو عالم ہے اس نے مجھے جلا کر رکھ دیا ہے۔ اسی دکھ کے سبب مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اضطراب سے نجات نہیں ملتی۔ اسی دکھ سے میں لحہ بہ لحہ تڑپ رہا ہوں۔ اس سے شاید یوں نجات مل جائے کہ میں دریائے گنگا میں ڈوب کر مرجاؤں۔ شاید یہی عمل میرے سکون کا سبب بن سکے اور اس کرب سے نجات حاصل کر سکوں۔ افسوس کہ میرا وطن عدم اتفاق اور نفاق کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ یہاں جو مختلف قومیں آباد ہیں وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات کا زور ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جس میں امن و اتحاد کی گنجائش کا قطعی امکان نہیں ہے۔ ایک ساتھ رہنے کے باوجود نفرتوں کا یہ عالم ہے کہ کوئی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

③ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں اتفاق اور باہمی یگانگت کا مظاہرہ ہوتا۔ اس کے برعکس اس سرزمین پر موجود ہر شخص دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ اقبال بڑے دکھ کے ساتھ اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک ہی سرزمین پر بود و باش رکھتے ہوئے باہمی سطح پر نفاق اور عداوت کا یہ انداز انتہائی درد انگیز ہے۔ یہاں کی فضاء محبت و اخوت کے جذبوں سے خالی ہے۔ سو میرا جیسا دردمند شاعر ایسی فضا میں کس طرح شعر کی تخلیق کر سکتا ہے؟ کس طرح اپنے نغمے یہاں بکھیر سکتا ہے۔ میں تو ہندوستان کے باشندوں کے مابین حقیقی قرب اور اتحاد کا خواہاں ہوں جب کہ موج اور ساحل کے مابین جو ٹکراؤ اور تصادم کی فضا ہوتی ہے وہ کم از کم میرے لیے اضطراب و بے چینی کا سبب بن جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے یہ نظم واضح رہے کہ تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل اس وقت کہی جب ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ یقیناً یہی وہ صورت حال تھی جس کے پیش نظر انہوں نے بعد میں تقسیم ہند اور پاکستان تصور پیش کیا۔ علامہ نے یقیناً اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شدید نفرت کی ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے جس کو پاٹنا مشکل ہے۔ اس کا حل مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ ہی ہو سکتا ہے۔

دوسرا بند معنی: دانہ خرمن: وہ دانہ جو کھلیان کا پتہ بتائے۔ **خود نما:** اپنے آپ کو نمایاں کرنے والا۔ **آتش پیکار:** لڑائی کی آگ۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ایک دانے سے پورے کھلیان کی حقیقت اور اس کے معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے اسی طرح شاعر اور اس کا کلام کسی قوم کا آئینہ ہوتا ہے لیکن خرمن کی تباہی سے دانے کا وجود بھی برقرار نہیں رہتا اسی طرح قوم ہی یکجا اور باہم نہ ہو تو پھر حقیقی شاعر کا وجود ہی ممکن نہیں ہوتا۔

اقبال اسی خیال کو دوسرے شعر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی توجہ کرنے والا ہی موجود نہ ہو تو

اپنے حسن کی افادیت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ شمع تو محفل کو منور کرتی ہے اور جب محفل کا کوئی وجود ہی نہ ہو تو شمع کے جلنے کا کیا فائدہ! مراد یہی ہے کہ جب متحد و متفق قوم ہی موجود نہ ہو تو کوئی شاعر ایسی صورت میں اپنے فن کا اظہار کیسے کر سکے گا۔

آخری دو اشعار میں اقبال انتہائی یاس و اضطراب کے عالم میں کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت حال میں نہ جانے میں عرضِ ہنر سے گریز کی راہ کیوں نہیں اختیار کر لیتا۔ نہ جانے مجھ میں جو تخلیقی صفات موجود ہیں ان کا خاتمہ کیوں نہیں ہو جاتا۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس لمحے شعر گوئی کا آغاز کیا ہے جب کہ ہندوستان افتراق و نفاق کی آگ میں جل رہا ہے اس حالت میں میرے نغمے کون سنے گا۔

آفتاب

(ترجمہ گایتری)

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو — شیرازہ بند دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا — ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے — ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے — تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے — دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے — چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو — یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیار کمال ہستی ہر جان دار میں — تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قید اول و آخر ضیا تری

*

اس نظم کی تشریح سے قبل یہ امر ضروری ہے کہ گایتری کی اصطلاح کو واضح کر دیا جائے۔ "گایتری" اہل ہنود کی مقدس کتاب "رگ وید" کا مشہور و معروف منتر ہے۔ اس نظم میں اقبال نے سنسکرت زبان سے گایتری منتر کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ گایتری منتر کو اہل ہنود "رگ وید" کی روح سمجھتے ہیں۔ عالم نزع میں اس منتر کا جاپ کیا جاتا ہے۔

معنی: شیرازہ: انتظام۔ ثبات: قیام، پائیداری۔ خرد: عقل۔ کوہسار: پہاڑ۔

مطلب: علامہ اقبال نے اس نظم کو پہلی بار شائع کراتے وقت جو نوٹ تحریر کیا تھا اگر اس کو یہاں شامل کر دیا جائے تو اس سے نظم کی معنویت کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں "ذیل کے اشعار "رگ وید" کی نہایت ہی قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں۔ جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا عبودیت کی صورت میں ان تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مشاہدے سے اول اول انسان

ضعیف البیان کے دل میں ہجوم کیا ہو گا۔ اس قسم کی تحریروں کا مطالعہ علم ملل والنحل کی عالموں کے لیے انتہائی درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے۔ اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ السنہ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی لغوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنہ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو لفظ نہ ملنے کے باعث ہم نے لفظ "آفتاب" رکھا ہے۔ لیکن اصل میں اسی آفتاب سے مراد اس آفتاب سے ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیاء کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ "اللہ نور السموت والارض" اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ افلاطون الٰہی کے مصری پیرووں اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمے کی مشکلات سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں دقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں نقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعراء ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں نقل ہونا ناممکنات سے ہے۔

اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اپنشد نے گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مین نے پوپ کے ترجمہ ہومر کو پڑھ کر قائم کی تھی۔ یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔

① تا ② اس پس منظر میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ زیر تشریح نظم "آفتاب" ایک طرح سے "گایتری" کا آزاد ترجمہ ہے جس میں اقبال، آفتاب سے یوں مخاطب ہیں تو ہی ہے جو اس جہاں کی روح رواں ہے اور تیرے ہی دم سے اس کائنات کا نظام قائم و دائم ہے۔ تو نہ ہو تو یہ نظام درہم و برہم ہو کر رہ جائے۔ یہاں موت اور زندگی کا جو سلسلہ ہے اس کا اظہار تیرے ہی دم سے ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ اس دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ بھی تجھ سے ہے۔

③ اے آفتاب! آگ، پانی، مٹی اور ہوا چاروں عناصر کے مابین جو ربط اور شیرازہ بندی ہے اس کی بنیاد بھی تو ہی ہے مزید براں کائنات میں جو بھی جاندار اشیاء موجود ہیں ان میں زندگی کی لہر تیرے ہی دم سے دوڑتی ہے۔

④ عالم رنگ و بو میں جو چیز بھی نظر آتی ہے اس کا وجود تیرے سبب سے ہی قائم ہے تیری شہادت کے بغیر یہ چیزیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خود تیرے وجود میں جو روشنی اور حرارت ہے وہی ان اشیاء کے لیے حیات کا سبب ہیں۔

⑤ تیرے وجود سے ہی پوری کائنات روشن اور منور رہتی ہے اور اسی روشنی کے سبب دل، عقل اور روح مسرور و شادماں رہتے ہیں۔

⑥ اس شعر میں اقبال ایک دوسرے انداز سے آفتاب سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنے نور سے خرد اور شعور کی روشنی عطا کر اور اسی نور سے ہماری عقل اور خرد کو بھی منور کر دے۔

⑦ اس دنیا کی ترتیب اور نظم و ضبط تیرے بغیر ممکن نہیں۔ تو ہی ہے جو ان کا اہتمام کرتا ہے اس کائنات میں نظم پیدا کرنے والی ذات تیری ہے یہی نہیں بلکہ یہاں جو بھی ادنیٰ و اعلیٰ ہے، چھوٹا بڑا ہے اس کی تخلیق تیرے دم سے ہی ہے۔

⑧ کائنات کی ہر شے تیرے کمال فن کی آئینہ دار ہے یہاں تک کہ پہاڑوں کے جو سلسلے ہیں وہ بھی تیرے فن کا شاہکار ہیں۔

⑨ اے آفتاب! تو تو ہر چیز میں موجود زندگی کا خالق ہے اور دنیا میں جتنی بھی روشن و منور چیزیں ہیں ان کا سرتاج بھی تو ہی ہے۔

⑩ کوئی بھی نہیں جانتا کہ تیری ابتداء اور انتہا کیا ہے۔ تیرا نور تو ان حدود سے قطعی آزاد ہے جن کا تعلق ازل اور ابد سے ہے۔ یہ امر پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ گائتری کے مطابق اس نور (آفتاب) سے مراد خالق کون و مکاں ہے۔

شمع

بزم جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع درد مند   فریاد در گرہ صفت دانہ سپند
دی عشق نے حرارت سوز دروں تجھے   اور گل فروش اشک شفق گوں کیا مجھے
ہو شمع بزم عیش کہ شمع مزار تو
ہر حال اشک غم سے رہی ہمکنار تو
یک بیں تری نظر صفت عاشقان راز   میری نگاہ مایہ آشوب امتیاز
کعبے میں بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا   میں امتیاز دیر و حرم میں پھنسا ہوا
ہے شان آہ کی ترے دود سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں؟
جلتی ہے تو کہ برق تجلی سے دور ہے   بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں   بینا ہے اور سوز دروں پر نظر نہیں
میں جوش اضطراب سے سیماب وار بھی   آگاہ اضطراب دل بے قرار بھی
تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار / خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے / گل میں مہک، شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق / آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق
یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ / ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی / شام فراق، صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا / زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں / غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں
یاد وطن فسردگی بے سبب بنی!
شوق نظر کبھی، کبھی ذوق طلب بنی

اے شمع! انتہائے فریب خیال دیکھ / مسجود ساکنان فلک کا مآل دیکھ
مضموں فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں / آہنگ طبع ناظم کون و مکاں ہوں میں
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود / تحریر کر دیا سر دیوان ہست و بود
گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے / بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے
چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے / عالم ظہور جلوۂ ذوق شعور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے / طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں / اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں
صیاد آپ، حلقہ دام ستم بھی آپ / بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ سراپا گداز ہوں / کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

*

پہلا بند معنی: فریاد در گرہ: جس کی گرہ میں فریاد ہو مراد فریادی۔ دانہ سپند: کالا دانہ، حرمل۔ شفق گوں: شفق کی مانند، سرخ۔

مطلب: علامہ اقبال کی یہ نظم چھ بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں وہ شمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے شمع! تیری طرح میں بھی غم زدہ اور دکھیا ہوں۔ میری کیفیت بھی ہرمل کے اس دانے کی مانند ہے جو آگ کی تپش سے چٹخنے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ میرا دل جب سوز غم سے بھڑک اٹھتا ہے تو اس میں سے درد انگیز نالے اٹھتے ہیں۔ جس طرح عشق نے تجھے داخلی کرب کی آگ میں جلنے پر

مجبور کر دیا ہے بعینہ مجھے بھی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ تو کسی عشرت کدے میں روشن ہو یا کسی مزار پر جلے دونوں صورتوں میں تیری آنکھ سے آنسو ٹپکتے رہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ شمع خواہ خوشی کی محفل میں جلے یا کسی غم کدے میں اس کے پگھلنے سے بہر حال موم کے قطرے ٹپکتے رہتے ہیں۔ اقبال نے انہی کو آنسوؤں سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرا بند **معنی:** یک بیں: ایک دیکھنے والی۔

مطلب: اے شمع! جس طرح قدرت کے بھید جاننے والے عشاق ہر شے کو کسی جانب داری کے بغیر مساوی سطح پر دیکھتے ہیں تیری کیفیت بھی ان سے ملتی جلتی ہے جب کہ میں اشیاء کے مابین فرق و امتیاز کا جائزہ لیتا ہوں۔ تیری روشنی تو خواہ کعبہ ہو یا بت خانہ' دونوں کو یکساں طور پر منور کرتی ہے جب کہ میری نظر دیر و حرم کے مابین جو فرق ہے اس کی مماثل ہے۔

تیرے جلنے سے جو دھواں اٹھتا ہے اس کی کیفیت قلب انسان سے برآمد ہونے والی آہ کی سی ہے۔ لگتا ہے کہ تیرے اندر بھی انسان کی طرح کوئی دل چھپا ہوا ہے۔

تیسرا بند **معنی:** بینا: دیکھنے والا' بینائی۔

مطلب: شاید تو اس غم میں جل رہی ہے کہ تو روشنی کے حقیقی منبع سے دور ہے لیکن تیرے اس عمل کو بیدرد لوگ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے جلنے کا لفظ اس بند میں دونوں طرح سے استعمال کیا ہے۔ روشنی کے حوالے سے اور کڑھنے کے حوالے سے! چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ تو جل رہی ہے تاہم حیرت اس امر پر ہے کہ تجھے اپنے جلنے کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ اس قدر چشم بینا رکھتے ہوئے بھی تو اپنی داخلی جلن سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں اضطراب و بے چینی کے سبب پارے کی طرح تڑپ رہا ہوں۔ اور اس اضطراب و بے چینی سے میرا دل پوری طرح آگاہ ہے۔ شاید مجھے رب اعلیٰ نے جلنے اور پگھلنے کا احساس عطا فرما دیا ہے۔

چوتھا بند **معنی:** آگہی: واقفیت۔ کشاکش: کھینچا تانی' چھینا جھپٹی۔

مطلب: مجھے اپنی ذات کی شناخت کا جو شعور عطا کیا گیا ہے بظاہر یہ ایک معمولی سی چنگاری کے مانند ہے تاہم اس میں بے شمار آتشکدے پوشیدہ ہیں۔ بلندی و پستی میں امتیاز کی خصوصیت اسی کے سبب پائی جاتی ہے۔ آگہی کا یہی وہ شعور ہے جس کے سبب پھولوں میں خوشبو اور شراب میں نشہ کا عنصر برقرار ہے۔ یہی آگہی بلبل' پھول اور اس کی خوشبو کے علاوہ بندہ و آقا کے مابین فرق کا سبب بن جاتی ہے۔

پانچواں بند **معنی:** دلستان عشق: عشق کا دل لینے والا۔

مطلب: اس بند کے چھ اشعار بظاہر پوری نظم کے موضوع سے کچھ علیحدہ نظر آتے ہیں لیکن چوتھے اور چھٹے بند کے آخری اور ابتدائی حصے کے حوالے سے ان میں گہرا ربط نظر آتا ہے۔ زیر تشریح بند میں اقبال نے فلسفہ وجود کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب خالق کون و مکاں نے "کن" کی صدا کے ساتھ کائنات کی تخلیق کی تو حسن عملاً عشق کا گرویدہ ہوا اور اسی کیفیت نے عاشق کے دل میں ایک تڑپ اور اضطراب پیدا کر دیا۔ اس لیے انسان کو حکم دیا گیا کہ اسی جذبے کے تحت کائنات کے مظاہر کا جائزہ لے اور یہ دیکھ کر اس عالم موجودات میں تیرے لیے کن کن اشیاء کو تخلیق کیا گیا ہے۔

خالق ارض و سما نے انسان کو پیدا کر کے اس کے وجود اور جسم کو ایک ایسے حصار میں ڈال دیا جس کے سبب وہ اپنی حقیقت اور وجود سے بے خبر اور بڑی حد تک بے نیاز ہو گیا۔ چنانچہ یہی لمحہ تھا جب تخلیق کے ساتھ ہی حقیقت ازل سے وجود کے ہجر کا آغاز ہو گیا۔ بالفاظ دگر پہلے انسان ان قیود سے آزاد تھا جب کہ اب قدرت نے اس پر بیشتر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال کر اسے ایک محدود حصار میں بند کر دیا۔ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا جب انسانی وجود کا مسکن کوہ طور کے ایک درخت پر تھا۔ اس لمحے تو وہ کسی حجاب کے بغیر نور کبریائی کا نظارہ کیا کرتا تھا۔

اب تو صورت حال یہ ہے کہ انسان اپنے وجود میں ہی محصور ہو کر رہ گیا ہے اور المیہ یہ ہے کہ وہ اس قید خانے کو ہی ایک باغ تصور کر بیٹھا ہے۔ اس کے علاوہ جس مقام پر وہ ایک اجنبی کی طرح بود و باش اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی وطن کی یاد میں افسردہ و پریشان رہتا ہے اور اس خالق حقیقی کی طلب دل و نظر کو مضطرب رکھتی ہے جس سے کبھی اس کا براہ راست رابطہ تھا۔

چھٹا بند معنی: مسجود: جسے سجدہ کیا جائے۔ **آہنگ:** آواز۔ **کمند:** رسی جس کے ذریعے کوٹھے پر چڑھا جاتا ہے۔ **طوق:** حلقہ، پٹا۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال پھر سے شمع سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس پس منظر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کس قدر فریب خوردہ ہے جو اپنے فانی وجود کو ہی ایک مستقل حقیقت سمجھ بیٹھا ہے حالانکہ ساکنان فلک کو سجدوں کا مال بھی اس کے روبرو ہے۔ ہرچند کہ میرا مقام بہت بلند ہے پھر بھی ہجر کا ستایا ہوا ہوں۔ پھر بھی خالق کون و مکاں کی مشیت سے ہم آہنگ ہوں۔ اس نے مجھ پر جو پابندیاں عائد کیں غالباً ان سے مقصد یہی تھا کہ ان سے زندگی کے ارتقائی مراحل طے کروں۔ اسی سبب رب اعلیٰ نے مجھے حیات و ممات کا عنوان بنا دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ابدی ہے کہ نایاب موتیوں کا مسکن بھی مٹی اور خاک کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اس کے باوجود وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اب جو گہرائی میں اتر کر دیکھتا ہوں تو اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصور میری بصارت اور بصیرت کا ہے و حقائق کو ان کے صحیح منظر نامے میں دیکھنے سے گریزاں ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ کائنات تخلیقی شعور کی مظہر ہے۔ یہ فریب نہیں تو کیا ہے کہ تمام حقائق کو نظر انداز کر کے فرد اپنے شعور کی نمائش کا خواہاں ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں افتراق و امتیاز کی خلیج وسعت پذیر ہو رہی ہے۔

زمان و مکان کا سلسلہ انسانی حیات کے گرد ایک حصار کے مانند ہے۔ ہرچند کہ اپنی راہ گم کر بیٹھا ہوں۔ پھر بھی منزل تک رسائی میرا مطمع نظر ہے۔ فریب نظر میں مبتلا ہونے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ حقائق کا سامنا کروں۔ لیکن صورت یہ ہے کہ خود ہی صیاد بن چکا ہوں اور اس کے دام میں گرفتار بھی خود ہی ہوں۔ یہ کیا ستم ہے کہ خود کو حرم کی بلندی بھی سمجھتا ہوں اور اس پر ایستادہ پرندہ بھی! فی الواقع میں تو اس حقیقت سے بھی آگاہی نہیں رکھتا کہ حسن ہوں یا عشق کا گداز! مجھ پر تو یہ بھید بھی نہیں کھلتا کہ محبوب ہوں یا میری حیثیت عاشق کی ہے چنانچہ میرے لیے یہ خدشہ بے جا نہیں کہ اپنی زبان پر وہی راز قدیم لے آؤں جس کا نتیجہ پھانسی کے پھندے کے سوا اور کچھ نہیں کہ سچ کا نتیجہ ہمیشہ تلخ ہی ہوتا ہے۔

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں' عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا!
شرمائے جس سے جلوت' خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل' وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہمنوا ہوں' وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں!
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو' نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

*

یہ نظم بیس اشعار پر مشتمل ہے۔ حمید احمد خاں کے بقول اس نظم کو اگر سیموئیل راجرز کی نظم Wish کا آزاد ترجمہ بھی سمجھ لیا جائے اس صورت میں بھی "ایک آرزو" عملاً ایک شاہکار نظم ٹھہرتی ہے۔ نظم کے ابتدائی دو تین اشعار میں اگرچہ یاسیت کی ایک جھلک ملتی ہے لیکن بعد کے کم و بیش تمام اشعار رجائیت کے آئینہ دار ہیں جن میں اقبال اپنی دلی خواہش کا کمال چابکدستی سے اظہار کرتے ہیں چنانچہ نظم کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے۔

معنی: دل ہی بجھ گیا: دل اداس ہو گیا۔ شورش: شور۔ عزلت: گوشہ نشینی۔ جلوت: جہاں تنہائی نہ ہو۔ درا: جرس' گھنٹی۔

مطلب: اقبالؔ رب ذوالجلال کو مخاطب کر کے اس طرح سے گویا ہوتے ہیں کہ اب دنیا کی محفلوں اور ان کے جھمیلوں سے میری طبیعت اکتا گئی ہے اس لیے کہ جب حوادث زمانہ سے دل ہی بجھ کر رہ جائے تو ایسی محفلوں کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب تو دنیا کے شور و شر سے طبیعت بیزار ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ مجھے ایسی خامشی اور سکوت کی تلاش ہے جس پر تقریر کو بھی رشک آ جائے۔

میں تو اب پر سکون زندگی پر فدا ہونے کا خواہاں ہوں اور اتنی ہی آرزو ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک مختصر سا جھونپڑا میسر آ جائے جہاں ساری دنیا سے الگ تھلگ پر سکون زندگی پر فدا ہونے کا خواہاں ہوں اور اتنی ہی آرزو ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک مختصر سا جھونپڑا میسر آ جائے جہاں ساری دنیا سے الگ تھلگ پر سکون زندگی بسر کر سکوں۔ صورت یہ ہو کہ انتہائی تنہائی میں دن گذارنے کے باوجود ہر قسم کے فکر و فاقے سے آزاد ہو جاؤں اور یہاں دنیا کا ایسا کوئی غم نہ ہو جو میرے سکون کو برباد کر سکے۔

میرے مسکن کے گرد و پیش کی کیفیت یہ ہو کہ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں نغمے بکھر رہے ہوں اور بہتے ہوئے چشموں کی صداؤں میں باجا سا بجتا محسوس ہو رہا ہو۔ کلیاں جب چٹکیں تو یوں لگے جیسے وہ کسی کا پیغام مجھ تک پہنچا رہی ہیں۔ کلیوں اور پھولوں کے شگفتہ دہانے میرے لیے ایسے ساغر کی حیثیت اختیار کر لیں جن میں تمام مناظر فطرت کا جائزہ لے سکوں۔

اس جھونپڑے میں جب آرام کی خواہش ہو تو فرش زمین کی سبز سبز گھاس میرا بچھونا ہو اور سرہانا خود میرا ہاتھ ہو۔ اس لمحے ایسی تنہائی کا عالم ہو جو انجمن آرائی سے کہیں دلنشیں محسوس ہو۔ وہاں موجود بلبل اور دوسرے ننھے ننھے پرندے مجھ سے اس طرح مانوس ہو جائیں جس طرح کہ ان کے دل سے ہر طرح کا خوف دور ہو گیا ہو۔

یہی نہیں بلکہ ہر جانب سرسبز پودے پوری شان و شوکت سے ایستادہ ہوں۔ سامنے ندی کا شفاف پانی ایسے بہہ رہا ہو جس طرح کہ اس میں ان پودوں کی تصویر منعکس ہو رہی ہو۔ یہاں موجود پہاڑوں کا نظارہ بھی اتنا دلکش ہو۔ ندی اور چشموں کا پانی موجوں کی صورت میں بلند ہو کر جس کو دیکھ سکے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی بھی غیر ضروری نہ ہو گی کہ کم و بیش پوری نظم میں اقبال نے مناظر فطرت کے بیان میں جو امیجری پیش کی ہے وہ بے مثال ہے۔ چنانچہ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ سرسبز گھاس اس طرح سے ایستادہ ہو جیسے کہ وہ زمین کی آغوش میں محو خواب ہو۔ اور جہاں تک بہتے ہوئے پانی کا تعلق ہو وہ جھاڑیوں میں سے گزرتا ہوا شفاف آئینے کے مانند چمک رہا ہو۔ پھر اس بہتے ہوئے پانی کو پھولوں کی ٹہنیاں اس طرح سے چھو رہی ہو جیسے کوئی خوبرو حسینہ آئینہ دیکھ رہی ہو۔

انتہائی خوبصورت منظر نگاری کرتے ہوئے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ وقت غروب جب سورج کی سرخ اور سنہری کرنیں شام کے وقت عکس ریز ہوں تو یوں محسوس ہو جیسے دلہن کو مہندی لگائی جا رہی ہے۔ پھولوں کی کیفیت بھی ایسی ہو جیسے وہ سرخ اور سنہرے رنگ کی قبا پہنے ہوئے ہوں۔ بلاشبہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی عکس ریزی کے حوالے سے اس سے زیادہ خوبصورت منظر کشی ممکن نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر اقبال کہتے ہیں کہ رات کے راہی جب سفر کرتے کرتے تھک کر رہ جائیں تو میرے جھونپڑے کے دیئے کی دھندلی روشنی ان کے لیے امید کی علامت بن جائے اور جب آسمان پر ہر طرف بادل چھائے ہوئے ہوں اور راستہ نظر نہ آئے تو بجلی اس طرح سے چمک اٹھے کہ اس کی روشنی میں ان

تھکے ہوئے مسافروں کو میری کٹیا نظر آ جائے۔

یہی نہیں جب رات کے آخری لمحات میں صبح کے موذن کی طرح کوئل کی صدا بلند ہو تو میں اس کا ساتھ دوں اور اسی طرح وہ میری ہم نوا بھی ہو۔ مسجدوں اور مندروں سے سحر کے عبادت گزاروں کو مطلع کرنے کے لیے جو اذانیں بلند ہوتی ہیں اور ناقوس کی صدا آتی ہے۔ مجھے ان کی ضرورت نہ ہو بلکہ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں میری جھونپڑی کے روزنوں سے اندر داخل ہو کر مجھے بیداری کا پیغام دیں۔

اور جس لمحے صبح دم شبنم پھولوں پر اس طرح برسے جیسے انہیں وضو کرا رہی ہو تو اس لمحے میری آہ و فغاں میرے لیے وضو اور دعا کا کام دے۔ اس خاموشی کے عالم میں میری آہ و فغاں اتنی بلند ہو جائے کہ تاروں کے قافلوں کے لیے آغاز سفر کا سبب بن جائے۔ یوں میرا رونا اس قدر موثر ثابت ہو کہ ہر دردمند دل بھی میرے ہمراہ گریہ کناں ہو جائے اور میری آہ و فغاں سے جو صدا بلند ہو ممکن ہے کہ ان لوگوں کی بیداری کا سبب بن جائے جو ایک عرصے سے مست و بے ہوش پڑے ہیں۔

آفتاب صبح

شورش میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو — زینت بزم فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
ہو در گوش عروس صبح، وہ گوہر ہے تو — جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو
صفحۂ ایام سے داغ مداد شب مٹا
آسماں سے نقش باطل کی طرح کوکب مٹا

حسن تیرا جب ہوا بام فلک سے جلوہ گر — آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر
نور سے معمور ہو جاتا ہے دامان نظر — کھولتی ہے چشم ظاہر کو ضیا تیری مگر
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

شوق آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے — زندگی بھر قید زنجیر تعلق میں رہے
زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے — آرزو ہے کچھ اسی چشم تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیاز ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں — نوع انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
دیدۂ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں — ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

صدمہ آ جائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر — اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
دل میں ہو سوز محبت کا وہ چھوٹا سا شرر — نور سے جس کے ملے راز حقیقت کی خبر
شاہد قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو

سر میں جز ہمدردی انساں کوئی سودا نہ ہو

تو اگر زحمت کش ہنگامہ عالم نہیں ۔۔۔ یہ فضیلت کانشاں اے نیر اعظم نہیں
اپنے حسن عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ۔۔۔ ہمسریک ذرہ خاک در آدم نہیں
نور مسجود ملک گرم تماشا ہی رہا
اور تو منت پذیر صبح فردا ہی رہا

آرزو نور حقیقت کی ہمارے دل میں ہے ۔۔۔ لیلی ذوق طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
کس قدر لذت کشود عقدۂ مشکل میں ہے ۔۔۔ لطف صد حاصل ہماری سعی بے حاصل میں ہے
درد استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے راز قدرت کا شناسا تو نہیں

*

سات بند پر مشتمل اس نظم میں علامہ اقبال نے صبحدم طلوع ہوتے ہوئے سورج سے مکالمہ کیا ہے اور اپنی ذات کے حوالے سے آفتاب کے ساتھ نوع انسانی کے تعلق اور موخر الذکر کی امتیازی حیثیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی یہ نظم بھی امیجری اور منظر نگاری کے اعتبار سے انتہائی بلند مرتبے کی حامل ہے۔

پہلا بند معنی: در گوش: کان کا موتی' ایک زیور جو کان میں پہنا جاتا ہے۔ **سیمائے افق:** افق کی پیشانی۔ **مداد شب:** رات کی سیاہی۔

مطلب: اس ابتدائی بند میں علامہ اقبال طلوع ہوتے ہوئے آفتاب سے یوں مخاطب کرتے ہیں کہ بے شک تو انسانی دنیا کے ہنگاموں سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے اس اعتبار سے بلند ہے کہ تیرا وجود انسانی دنیا سے بہت زیادہ دور ہے اور تیرا تعلق آسمان سے ہے۔ تیرے ہی دم سے وہاں کا حسن اور رونق برقرار ہے۔ اگر صبح کو دلہن کے مانند تصور کر لیا جائے تو اے آفتاب تجھے اس کے کان کو زینت بخشنے والا موتی تصور کیا جائے گا۔ تو ایسے حسین زیور کی طرح ہے جو افق کی پیشانی کے لیے بھی باعث ناز و فخر ہے۔ اے آفتاب! تیرے طلوع ہونے کے ساتھ ہی دنیا سے رات کی تاریکی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آسمان پر ستارے بھی حرف غلط کی مانند غائب ہو جاتے ہیں۔

دوسرا بند مطلب: تو جس لمحے طلوع ہوتا ہے اور تیری حسین اور خوبصورت شعاعیں زمیں پر عکس ریز ہوتی ہیں تو دنیا بھر کے لوگوں کی نگاہوں سے نیند کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے اور ان کی نظریں تیری روشنی سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ تیری روشنی بظاہر آنکھوں کو نور عطا کرتی ہے تاہم امر واقع یہ ہے کہ میں وہ منظر دیکھنے کا خواہاں ہوں جس کی بدولت کائنات کے پوشیدہ اسرار مجھ پر وا ہو جائیں اور میں حقیقت کا ادراک کر سکوں۔

تیسرا بند معنی: زیر و بالا: اوپر نیچے۔ **سرشک آباد:** آنسوؤں کا گھر۔ **امتیاز ملت و آئیں:** قوم اور شرع کا فرق۔

مطلب: اے آفتاب! ہر چند کہ میں ہمیشہ سے آزادی کا خواہاں تھا لیکن میری یہ طلب پوری نہ ہو سکی

اس کے برعکس ساری زندگی دنیوی تعلقات کے جھمیلوں میں پھنسا رہا جب کہ تیری روشنی یہاں ہر ادنٰی و اعلٰی شخص کے لیے اور ہر کوئی بلا امتیاز اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مجھے بھی ایسی نگاہ درکار ہے جو تیری مانند ہر پست و بلند اور اپنے بیگانے کو کسی امتیاز کے بغیر دیکھنے کی حامل ہو۔ میں تو ایسی آنکھ چاہتا ہوں جو ہر کہہ و مہ کے دکھ درد میں آنسو بہانے کی قائل ہو۔ یہی نہیں بلکہ مختلف اقوام اور وہاں کے قوانین سے منفی انداز کی تکلیف دہ روش سے آزاد ہو۔

چوتھا بند **معنی**: بستہ رنگ خصوصیت: خصوصیت کے رنگ میں بندھی ہوئی۔ عقدہ: مشکل بات، معمہ۔

مطلب: میرا لب و لہجہ اور زبان ایسی ہو کہ کسی مخصوص جماعت یا گروہ کے اثرات سے ہم آہنگ نہ ہو۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ پوری انسانیت میری قوم ہو اور پوری دنیا میرے وطن کی مانند ہو۔ مجھ پر قدرت کی نعمتوں کے راز سربستہ افشاء ہو جائیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا تخیل آسمان کی بلندیوں تک بھی رسائی رکھنے کا اہل ہو۔

اے آفتاب صبح! میری یہ دلی آرزو ہے کہ مجھے اس عالم فانی کے تفرقے اور جھمیلے پریشان نہ کریں۔ اس کے برعکس مجھے ہر شے میں ایسا حسن اور خوبصورتی نظر آئے جو میرے عشق جنوں خیز میں لحہ لحہ اضافہ کردے یعنی ہر شے سے بے نیاز ہو کر محبت اور وفا کو ہی اپنا مسلک سمجھوں۔

پانچواں بند **معنی**: شاہد: معشوق۔

مطلب: اے آفتاب صبح! میں تو اس قدر گداز طبع ہوں کہ اگر کسی پھول کی پتی کو بھی کوئی تکلیف پہنچے تو میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں یہی نہیں بلکہ میرے دل میں محبت کی ایسی آگ روشن ہو گئی ہے جس کی روشنی سے مجھ پر راز حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ جہاں تک میرے دل کا تعلق ہو وہ فطرت کے آئینے کی مانند ہو کہ اس میں سب کچھ نظر آجائے۔

چھٹا بند **معنی**: نیر اعظم: بڑا ستارا مراد سورج۔

مطلب: اے آفتاب! اگر تو دنیا کے ہنگاموں اور مصائب کو برداشت کرنے کا اہل نہیں ہے تو یہ امر قطعی فخر و مباہات کا سبب نہیں جب تو اپنے حسن کی حقیقت سے ہی آگاہ نہیں جو پوری کائنات کا منور کرنے کا باعث ہوتا ہے تو اس صورت میں انسان کی ہمسری اور برابری کا اہل نہیں۔ انسانی نگاہ تو اے سورج تجھ کو دیکھتی رہی لیکن تو تھا کہ آنے والی کل کا منتظر ہی رہا۔

ساتواں بند **معنی**: سعی: کوشش۔ استفہام: سوال۔

مطلب: ہم تو حقائق کے نور کی خواہش دل میں لیے ہوئے ہیں۔ جو کائنات کے رازوں کو بے نقاب کر دے کہ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے تو اس حقیقت سے قطعی طور پر بہرہ ور نہیں ہے کہ مشکل مسائل کو حل کرنے میں کس قدر لطف موجود ہے اور اسی کوشش میں وہ کیفیت موجود ہے جو کچھ پانے کی جستجو سے تعلق رکھتی ہے۔ اے آفتاب! آگاہی کے اس جذبے سے تو قطعی محروم ہے اس لیے کہ فطرت کے اسرار کو پانے کی طلب تجھ میں موجود ہی نہیں ہے۔

دردِ عشق

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آب دار تو نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو
پنہاں تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے ظاہر پرست محفلِ نو کی نگاہ ہے
آئی نئی ہوا چمنِ ہست و بود میں اے دردِ عشق! اب نہیں لذت نمود میں
ہاں! خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو منت پذیر نالۂ بلبل کا تو نہ ہو
خالی شرابِ عشق سے لالے کا جام ہو پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو
پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا
گویا زبانِ شاعرِ رنگیں بیاں نہ ہو آواز نے میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو
یہ دور نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ
غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ جویا نہیں تری نگہِ نارسیدہ دیکھ
رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو
جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز
ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

معنی: گہرِ آب دار: چمکدار موتی۔ ظاہر پرست: چیزوں کے ظاہر پر مرنے والا۔ ہست و بود: ہستی اور وجود۔ نے: بانسری۔

مطلب: ①② اس نظم میں اقبال عشق کے جذبے میں جو کسک ہوتی ہے اس سے مخاطبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو ایک انتہائی چمکدار موتی کے مانند ہے لہٰذا تجھ پر لازم ہے کہ جو اس جذبے سے آگاہی نہیں رکھتے ان کے روبرو اپنے وجود کو آشکار نہ کرے۔ تیری کیفیت تو اس حسین چہرے کی سی ہے جو نقاب میں چھپا ہونے کے باوجود بھی اپنی تابندگی مظہر ہوتا ہے۔ میں تجھے اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ عہد نو کے لوگ محض ظاہری چیزوں کو ہی اہمیت دیتے ہیں اور باطن تک ان کی نظر نہیں پہنچتی۔

③④ اے دردِ عشق! اس کائنات میں تو ایسی ہوا چل پڑی ہے کہ باشعور لوگ اب اپنے روبرو ظاہر اشیا سے لطف نہیں اٹھا سکتے چنانچہ تیرے لیے لازم ہے کہ اپنے وجود کو ظاہر کرنے کی جستجو نہ کرے اور خود کو اسی طرح ظاہر بیں نگاہوں سے محفوظ رکھے یوں بھی تیرے لیے کیا ضروری ہے کہ خود کو نالہ بلبل کی احسان مندی قبول کرے۔ کہ اس طرح تو تیری ہیئت ظاہر ہونے کا امکان ہے۔

⑤⑥ اے دردِ عشق! موجودہ صورت حال میں تو ایسی کیفیت ہونی چاہیے لالے کے پھول کے حوالے سے بھی جذبہ محبت کے اظہار کا امکان نہ ہو۔ اور انسان پانی کی بوندوں کو بھی شبنم کے قطرے تصور

کرے۔ تیرا راز بدستور سینے کے کسی گوشے میں پوشیدہ رہنا ضروری ہے نا ہی تجھ سے منسوب آہ بھی سنائی دے جو سننے والے کے جگر کو تڑپا کر اور گداز کر کے رکھ دیتی ہے۔

⑦⑧ بالکل اسی طرح سے جیسے کہ شاعر رنگیں نوا اپنے نغموں کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے یا کوئی بانسری بجانے والا اپنے سروں میں جدائی کی کیفیت کا اظہار کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اے درد عشق! تجھ پر بھی یہ لازم ہے کہ اس عہد نکتہ چیں سے خود کو کہیں روپوش کرے۔ تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ جو دل تیری آماجگاہ ہے وہیں مستقل طور پر اپنا مسکن بنا لے! مراد یہ ہے جذبہ عشق کی کسک اظہار کے ساتھ ہی اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ لہٰذا اس باطن تک ہی محدود کرنا لازم ہے۔

⑨⑩ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اے درد عشق! تیرے وجود سے اہل علم و دانش آگاہ نہیں اور تیری کسک کا بھی انہیں ادراک نہیں! لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے تو ان اہل علم و دانش کو اسی طرح سے حیرت زدہ ہی رہنے دے اور جو لوگ خود کو حکمت و آگہی کا مظہر سمجھتے ہیں انہیں بدستور عدم واقفیت کا شکار ہی رہنے دے۔

(12-11) یہ ماحول ایسا نہیں ہے جو تیرے سبب بہار آفریں بن سکے۔ اس لیے کہ یہ تو ایسی جگہ ہے جہاں تیری نمود کی گنجائش ہو۔ مراد یہ ہے کہ اس عالم رنگ و بو کے لوگ عملی طور پر بے حس ہو چکے ہیں اور لطیف جذبوں سے محروم ہیں۔ یہ پورا ماحول باطنی اسرار کی آگہی سے قطعی طور پر نا آشنا ہے جب کہ تیرا ادراک تو وہی کر سکتا ہے جو باطن میں جھانکنے کی صفت کا حامل ہو۔ آج کل کے لوگوں کی کیفیت تو بس ایسی ہے کہ وہ اپنے اپنے خیالات میں گم رہنے والے ہیں اس طرح عصر موجود کے باسیوں کے طور طریقے ہی ماضی کی نسبت بڑی حد تک تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ آج کا دور محض اک مادی دور ہے جس میں باطنی سطح پر معاملات کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ ظاہری حقیقتوں کا ادراک ہی ان کی فطرت ہے سوائے عشق کی کسک تیری اہمیت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے کہ اپنے وجود کو ایسے لوگوں سے پوشیدہ رکھے۔

گل پژمردہ

کس زباں سے اے گل پژمردہ تجھ کو گل کہوں! کس طرح تجھ کو تمنائے دل بلبل کہوں
تھی کبھی موج صبا گہوارۂ جنبل ترا نام تھا صحن گلستاں میں گل خنداں ترا

تیرے احساں کا نسیم صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلہ عطار تھا

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا ہے نہاں تیری اداسی میں دل ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو
ہمچو نے از نیستان خود حکایت می کنم بشنو اے گل! از جدائیہا شکایت می کنم

٭

علامہ اقبال کی زیر تشریح مختصر سی نظم محض دو بند پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کے مندرجات سے اس

امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی نظر زندگی کے کم و بیش تمام مسائل پر تھی۔

پہلا بند معنی: گُل پژمردہ: مرجھایا ہوا پھول۔ **گہوارۂ جنباں**: ہلنے والا جھولا۔ **طبلہ عطار**: عطر فروخت کرنے والے کا صندوقچہ۔

مطلب: اس بند میں اقبال کا مکالمہ ایک ایسے پھول سے ہوتا ہے جو مرجھا چکا ہے اور اس طرح اپنی تازگی کے علاوہ آب و تاب بھی کھو چکا ہے چنانچہ وہ اس مرجھائے ہوئے پھول سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں اب تیری ہیئت ہی تبدیل ہو چکی ہے اس صورت میں تجھے پھول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کیفیت میں تو تو بلبل کے لیے بھی کشش کا سبب نہیں ہو سکتا۔ میں اس دور کو یاد کرتا ہوں کہ موجِ صبا تجھے ہلکارے دیا کرتی تھی اور اس کی آغوش تیرے لیے ہلتے ہوئے گہوارے کی مانند ہوا کرتی تھی اور باغ میں تیرا وجود مسکاہٹوں کا آئینہ دار رہتا۔ صبح کی نسیم تری خوشبو سے معطر ہوتی تھی اور یہ خوشبو پھر سارے گلستاں کو معطر کر دیتی تھی۔

دوسرا بند معنی: نیستان: سرکنڈوں کی جگہ (مراد ہے وطن)۔

مطلب: آج تیری صورت دیکھ کر اے مرجھائے پھول ہوئے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ تیری اداسی میں میرا دل ویران پوشیدہ ہے۔ دیکھا جائے تو تیرا وجود میری بربادی کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس شے کی میری زندگی ایک خواب تھی بظاہر یوں لگتا ہے کہ تو اس خواب کی تعبیر ہے۔

اے مرجھائے ہوئے پھول (غور سے سن کہ میں تجھے اپنی اس کیفیت کا گلہ کر رہا ہوں جو ہجر و فراق سے عبارت ہے۔

سید کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر — اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ — شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی — صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں! — ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں — چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے — دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا — ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے　　نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے
ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم　　شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو　　ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

*

علامہ اقبال کے ہم عصر دانشور اور بعض شارحین کے نزدیک یہ نظم عملی سطح پر "سرسید احمد خاں" کے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں سرسید کے نظریات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے چار بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند　معنی: گرویدۂ تقریر: تقریر کا شیدائی۔

مطلب: اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ان اشعار میں بتایا ہے کہ سرسید احمد خاں کی تربت کا کتبہ زبان حال سے ہندوستان کے باشندوں سے یوں گویا ہے کہ تم زندگی کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو اور تمہاری روح بھی شب و روز کے عوامل میں مقید ہے۔ ذرا ان لوگوں کی جانب بھی نظر کرو جو یہاں آزادی سے نغمہ پیرائی تو کر رہے ہیں لیکن یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ میں نے تو اپنی جدوجہد اور فکری کاوشوں سے اس ویرانے میں ایک شہر بسا دیا ہے۔

سن لو کہ جو محفل میرے خوابوں کی ما حصل تھی وہ اپنی تعبیر کی حیثیت سے تمہارے روبرو ہے۔ میں نے جس صبر و استقلال کے ساتھ اپنی جدوجہد سے جو کھیتی کاشت کی تھی اس کا پھل سامنے آ چکا ہے۔ چنانچہ میری لوحِ تربت جن الفاظ میں تجھ سے عالم خیال میں مخاطب ہے اپنی چشم باطن سے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرو۔

دوسرا بند　معنی: وا نہ کرنا: نہ کھولنا۔

مطلب: اے لوگو! اگر دنیا میں تمہارا مقصد دین کی تعلیم پھیلانا ہے تو خدارا اپنی قوم کو رہبانیت یعنی دنیا کو ترک کرنے کا سبق نہ دینا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ فرقہ بندی کی حمایت میں کبھی اپنی زبان نہ کھولنا۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی لعنت ہے جو ملک و ملت کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس کے برعکس تمہاری ہر تحریر اور تقریر سے اتحاد و اتفاق کا عنصر نمایاں ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی ایسی گفتگو کرنا جو دوسروں کے لیے دل دکھانے کا سبب بن جائے۔ مزید یہ کہ آج کے ترقی پذیر معاشرے میں ماضی کی روایات کو دہرانا درست نہیں۔ اس لیے کہ اب اس نوع کی افسانہ طرازی ماحول میں کوئی رنگ نہیں بھر سکتی نا ہی اس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو گا۔

تیسرا بند　معنی: مدبر: تدبیر کرنے والا۔ اربابِ سیاست: سیاسی لوگ۔

مطلب: سرسید کی لوحِ تربت اس بند میں یوں گویا ہے کہ تم لوگوں سے جو مدبر اور سیاستدان ہیں وہ بطور

میرا پیغام سن لیں کہ جراءت مندی اور دلیری ان کا شعار ہونا چاہیے کہ وہ ملک و ملت کے مفاد میں حقیقت پسندی اور راست گوئی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر پیش کریں۔ اور سچائی کے اظہار میں کسی قسم کی جھجک کسی طور پر بھی مناسب نہیں اس لیے کہ اگر ملت درست ہو تو اپنی بات کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ یوں بھی نیک اور حق گو انسان کا دل کسی بھی جھجک اور تذبذب کا شکار نہیں ہوتا اور حکمران خواہ کتنے بھی جابر ہوں ان کے روبرو اپنے نقطہ کا اظہار پوری بیباکی اور جراءت مندی کے ساتھ کرتا ہے۔

چوتھا بند **معنی:** خامہ معجز رقم: ایسا قلم جس کی تحریر معجزہ ہو۔ تلمیذ رحمانی: خدا کا شاگرد (مراد ہے خدا سے فیض پانے والا)۔

مطلب: اگر تم میں سے کوئی ادیب یا شاعر ہے تو تیرا دل ہر طرح کی منافقت اور ریاکاری سے پاک ہونا ضروری ہے اس لیے کہ تم لوگ فطرت کے شاگرد ہو لہٰذا تمہارا لب و لہجہ کسی حالت میں بھی بے آبرو نہیں ہونا چاہیے! اپنے اشعار کے اعجاز سے ان لوگوں کو بیدار کر دو جو ایک عرصے سے غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ جھوٹ اور باطل کو اپنی حق گوئی اور راست بازی سے فنا کر دو!

اقبال نے اس نظم میں سرسید احمد خاں کی لوح تربت کے مکالمے کے حوالے سے بعض ایسی حقیقتوں کا اظہار کیا ہے جو سرسید اور خود اقبال کی فکر سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی ہی انقلابی کارکردگی کے سبب معاشرے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ایسی نظم ہے جو ہر پہلو سے غور طلب اور بے حد اہم ہے۔

ماہ نو

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

قافلہ تیرا رواں بے منت بانگ درا
گوش انساں سن نہیں سکتا تری آواز پا
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو
ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟
ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے
خار حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے
نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں میں

❁

پہلا بند **معنی:** طشت گردوں: آسمان کا تھال (مراد ہے آسمان)۔ خون ناب: خالص خون یعنی سرخی۔ سیم خام: خالص چاندی۔

مطلب: اس انتہائی مختصر سی نظم میں اقبال نے حسب معمول نہایت خوبصورت استعاروں کے ذریعے ماہ نو کے کردار کا جائزہ لیا ہے اور ان حوالوں سے اپنی بات بھی کی ہے۔ اس بند میں شام کا منظر بیان کرتے

ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جب سورج اپنا سفر تمام کر کے شام کے دھندلکے میں غرق ہو گیا تو یوں محسوس ہوا کہ اس کے نور کا ایک ٹکڑا سطح آسماں پر ہلال نو کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس لمحے کا منظر بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہ لمحہ وہ ہے کہ شفق کی سرخی اپنی انتہا پر پہنچ چکی ہے بالفاظ دگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فطرت نے سورج کی سرخی انڈیل کر رکھ دی ہے۔ ہلال نو کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے شام ایک دلہن کی مانند ہے اور ہلال نو اس کے کانوں کی بالی ہے یا پھر شفاف پانی میں چاندی کے رنگ جیسی مچھلی تیر رہی ہو۔

دوسرا بند معنی: سیارۂ ثابت نما: وہ سیارہ جو حرکت کرتا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ کھڑا نہیں ہوتا ہے۔

مطلب: اس بند میں اقبال "ہلال نو" کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں تیرا قافلہ گھنٹیوں کے بغیر بڑی خاموشی سے رواں دواں ہے۔ یہ ایسا سکوت ہے جو انسانی کانوں تک جس کی رسائی ممکن نہیں۔ کبھی تو اپنے حجم میں کم ہو جاتا ہے اور کبھی زیادہ! قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ تیرا سفر کس جانب رواں ہے اور تیری قیام گاہ کہاں ہے؟ اے رواں دواں رہنے والے سیارے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چل۔ اس لیے کہ میں خود بھی اس ماحول سے پریشان ہوں جو میرے گرد و پیش موجود ہے۔ میں تو تاریکی کی بجائے روشنی کا طالب ہوں اور ایسے بچے کی مانند ہوں جو مدرسے کے نامناسب ماحول سے گھبراتا ہے۔

انسان اور بزم قدرت

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے
بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پر تو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا
سیم سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی، درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز، کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
مے گلرنگ خم شام میں تو نے ڈالی

رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
زیر خورشید نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیوں کر؟

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بام گردوں سے یا صحن زمیں سے آئی

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزار وجود

انجمن حسن کی ہے تو تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے

نورِ خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
اور بے منتِ خورشید چمک ہے، تیری

ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا
منزلِ عیش کی جا، نام ہو زنداں میرا

آہ! اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دامِ تمنا میں الجھنے والے

ہائے غفلت! کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
نازِ زیبا تھا تجھے، تو ہے مگر گرمِ نیاز

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر، نہ سیہ کار رہے

*

پہلا حصہ معنی: **معمورۂ ہستی:** زندگی کی بستی یعنی دنیا۔ **پرتو مہر:** سورج کی روشنی۔ **سیم سیال:** بہتی ہوئی چاندی۔ **سورۂ والشمس:** قرآن پاک کی ایک سورت جو والشمس سے شروع ہوتی ہے۔ **سطوت:** رعب۔

مطلب: اس نظم کا اگر گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا اندازہ ممکن ہے کہ علامہ نے یہاں پہلی بار فلسفہ خودی کی نشاندہی کی ہے اور یہی فلسفہ آگے جا کر ان کی شاعرانہ فکر کا بنیادی مرکز بنا۔ چنانچہ نظم کے پہلے شعر میں فرماتے ہیں کہ چمکتے ہوئے سورج کے لمحات میں جب میں نے صبح کے وقت کا نظارہ کیا تو اس کائنات سے استفسار کیا جس میں خود میری ذات بھی موجود ہے کہ تجھ میں جو اجالا ہے وہ اسی سورج کی روشنی کے سبب ہے اور تیرے دریاؤں کا چاندی کے مانند شفاف پانی بھی اسی کے دم سے ہے۔ یہ سورج ہی ہے جس نے تجھے نور کا زیور پہنایا ہے اور اسی سورج کا وجود تیری بزم میں ایک روشن شمع کے مانند ہے جس کی روشنی سے ہر شے منور دکھائی دیتی ہے۔ اے کائنات یہ جو تیرے دامن میں گل و گلزار ہیں وہ بہشت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سب قرآن کریم کے سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں۔ مذکورہ باغات میں جو پھول اور اشجار موجود ہیں، علی الترتیب ان کا لبادہ سرخ اور سبز رنگ کا لگتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ تیری محفل میں کوئی سبز پری اور کوئی لال پری ہو۔

اے دنیا تیرا جو آسمان ہے وہ ایسے خیمے کی طرح سے ہے جس کے گرد سنہری جھالر لٹک رہے ہوں اور افق پر جو سرخی مائل بدلیاں دکھائی دیتی ہیں ان کے ساتھ شفق کی سرخی بھی انتہائی بھلی لگتی ہے جس کے سبب شام کا وقت بھی سرخی مائل دکھائی دیتا ہے۔ اے دنیا تیرا مرتبہ بہت بلند ہے اور تیری شان بھی بڑی ہے۔ اسی لیے تیرے دامن میں جو بھی چیز موجود ہے وہ نور کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ صبح کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی تیری عظمت کے گیت گا رہی ہے اور جہاں تک خورشید کا تعلق ہے تو اس کے منظر نامے میں تاریکی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تیری اس نور کی بستی میں ہر چند کہ میں بھی رہائش پذیر ہوں لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ میری قسمت کا ستارہ روشنی سے محروم ہے تیری ان روشنیوں سے دور ہوتے ہوئے میرا وجود ظلمت کے محبس میں ایک قیدی کے مانند ہے چنانچہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ پھر کیا وجہ ہے کہ میں ہی تیرے دامن میں رہتے ہوئے بدنصیبی اور بدقسمتی کا شکار ہوں؟

دوسرا حصہ معنی: **بود و نبود:** ہونا نہ ہونا۔ **صحیفہ:** آسمانی کتاب۔

مطلب: نظم کے اس حصے کا آغاز اقبال پہلے استفسارات کے جوابات کی صورت میں یوں کرتے ہیں کہ میں ابھی اپنے انہی خیالات میں گم تھا کہ معاً کہیں سے میرے کانوں میں آواز آئی تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا

کہ یہ آواز آسمان سے یا پھر زمین سے بلند ہوئی۔

اے انسان! اس حقیقت کو جان لے کہ کائنات کا عدم یا وجود صبح دم طلوع ہوتے ہوئے سورج کے دم سے نہیں بلکہ تیری ذات سے ہے کہ تیری ہی ذات ہے جو میرے گلستان کے لیے ایک باغبان کی مانند ہے۔ اے انسان! تیرا وجود ہی ہر نوع کی خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو ان خوبصورتیوں اور مظاہر فطرت کے عکس کی طرح سے ہوں تو ہی عشق کا وہ صحیفہ ہے جس کی تفسیر میری ذات ہے۔ تو ہی ہے جس نے میرے بگڑے ہوئے کاموں کی مثبت انداز میں تکمیل کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کارکردگی کے ضمن میں جو بوجھ میں نہ اٹھا سکی وہ تو نے ہی اٹھایا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے دیکھا جائے تو وہ سورج کی روشنی کی محتاج ٹھہرتی ہے جب کہ تجھ میں جو چمک اور تابندگی ہے اس کے لیے سورج کی روشنی قطعی طور پر درکار نہیں۔ اگر سورج کا وجود نہ ہو تو میرا گلستان اور میری ہستی ایک ویران صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے اس کے برعکس تیری ذات سورج کے کسی جوہر کی محتاج نہیں۔ سورج کے بغیر تو میرے تمام عشرت کدے، عملاً زندانوں میں تبدیل ہو کر رہ جائیں۔

افسوس! اے انسان تو اس راز کو بھی نہ سمجھ سکا جو عملاً بالکل واضح ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تو خود ہی اپنی خواہشوں کے دام میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ یہ کیسی غفلت ہے اور مقامِ افسوس بھی ہے کہ تیری آنکھ محض ظاہر پرست ہے اور اس کے ساتھ ہی حقائق سے نا آشنا بھی ہے تیری حیثیت تو محبوب و مطلوب کی ہے جب کہ اپنی کج فہمی کے سبب تو طالب بن کر رہ گیا ہے آخری بات یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقتوں کا پوری طرح ادراک کر لے تو اس کے بعد تیری بدبختی اور بدنصیبی ختم ہو کر رہ جائے۔

پیامِ صبح
(ماخوذ از لانگ فیلو)

اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا — نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا
جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں — کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا
طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنور سے توڑا — اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا
پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری — برہمن کو دیا پیغام خورشیدِ درخشاں کا
ہوئی بامِ حرم پر آ کے یوں گویا مؤذن سے — نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا
پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر — چٹک او غنچۂ گل! تو مؤذن ہے گلستاں کا
دیا یہ حکم صحرا میں، چلو اے قافلے والو! — چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے — تو یوں بولی نظارا دیکھ کر شہرِ خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگاؤں گی

٭

معنی : **افشاں:** ستارے سے جو عورتیں آرائش کے لیے اپنے بالوں پر چھڑکتی ہیں۔ **دہقاں:** کسان۔ **سورۂ والنور:** یہاں مراد ہے سورج کا اجالا۔ **خوابیدگانِ دیر:** بت خانے میں سونے والے۔ **شہرِ خموشاں:** چپ رہنے والوں کی بستی یعنی قبرستان۔

مطلب : نو اشعار پر مشتمل یہ نظم مشہور زمانہ امریکی شاعر "لانگ فیلو" کی تخلیق (Day Break The) دی ڈے بریک کا آزاد ترجمہ تو نہیں کہی جا سکتی البتہ بقول علامہ اقبال اس سے ماخوذ ضرور ہے اس نظم میں اقبال نے جس نوع کی امیجری اور فطرت نگاری سے کام لیا ہے وہ ان کی فن پر مکمل گرفت اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جب آسمان پر ستارے ڈوب گئے اور شب کا اختتام ہوا تو ہنستی کھیلتی زندگی پیغام سحر لے کر نمودار ہو گئی یعنی صبح اپنے اجالے کے ساتھ وارد ہو گئی اور اپنے عمل میں اس طرح مصروف ہوئی کہ بلبل جو اپنے گھونسلے میں محو استراحت ہوئی پہلے اسے جگایا اس کے بعد کسان جو کھیت کے کنارے پر محو خواب تھا اسے بھی بیدار کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے سورۂ والنور کی قوت سے ظلمت شب کا طلسم توڑ ڈالا اور عشرت گاہوں میں روشن ہونے والی شمعوں کو بھی بجھا دیا۔ جو برہمن مندروں میں سو رہے تھے ان کو بھی بیدار کیا اور طلوع ہونے والے سورج کا پیغام بھی دیا۔ دوسری جانب اس نے موذن سے مسجد میں پہنچ کر یوں مکالمہ کیا کہ سورج نکلنے کے بعد نہ اذان کا وقت باقی رہے گا نا ہی نماز کا! اس لیے بیدار ہو کر اذان بھی دے اور نماز بھی ادا کر۔ پھر وہ باغ میں آئی اور غنچوں کو چٹکنے کی طرف راغب کیا۔ اس کے بعد صحرا کی جانب نکل گئی اور تھکے ماندے قافلوں کو پھر سے آغاز سفر کے لیے آمادہ کیا کہ اب دھوپ نکلنے والی ہے اس لیے روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد وہ قبرستان میں جا پہنچی تو وہاں سناٹے کو دیکھ کر اہل قبور سے یوں گویا ہوئی کہ ابھی تم آرام سے لیٹے رہو کہ میں بعد میں پھر یہاں آؤں گی اور زمانے بھر کو بیدار کرنے کے بعد تمہاری بیداری کا اہتمام کروں گی۔

عشق اور موت
(ماخوذ از ٹینی سن)

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی — تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا — عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے — ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے — کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا — ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو — خودی تشنہ کامِ مئے بیخودی تھی
اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی — کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر یہ نظارا تھا پیارا — کہ نظارگی ہو سراپا نظارا
ملک آزماتے تھے پرواز اپنی — جبینوں سے نور ازل آشکارا
فرشتہ تھا اک، عشق تھا نام جس کا — کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا
فرشتہ کہ پتلا تھا بیتابیوں کا — ملک کا ملک اور پارے کا پارا
پئے سیر فردوس کو جا رہا تھا — قضا سے ملا راہ میں وہ قضارا
یہ پوچھا "ترا نام کیا؟ کام کیا ہے؟ — نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا"
ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ — اجل ہوں، مرا کام ہے آشکارا
اڑاتی ہوں میں رخت ہستی کے پرزے — بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے — پیام فنا ہے اسی کا اشارا
مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی — وہ آتش ہے، میں سامنے اس کے پارا
شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں — وہ ہے نور مطلق کی آنکھوں کا تارا
ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو — وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا
سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی — ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر — اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا؟
بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی، شکار قضا ہو گئی وہ

*

یہ نظم ممتاز برطانوی شاعر ٹینی سن کی نظم "Love and Death" سے ماخوذ ہے۔ اقبال نے نظم کے مرکزی اور بنیادی خیال کو پوری مہارت کے ساتھ اپنے مخصوص خوبصورت انداز میں اپنے ہاں منتقل کیا ہے۔ یہ نظم عملاً دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں اقبال نے آغاز کائنات کے حوالے سے مختلف عناصر کی صورت حال کو پیش کیا ہے جب کہ دوسرے بند میں عشق اور موت کے مابین جو مراحل ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پہلا بند **معنی:** تبسم فشاں: مسکراتی ہوئی۔ تشنہ کام: پیاسی۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں اقبال آغاز کائنات کے ان لمحات کا ذکر کرتے ہیں جب تخلیق کے عمل کا آغاز ہوا تھا اور زندگی کی کلی کھل رہی تھی۔ ان لمحات میں خالق لم یزل کی جانب سے کہیں آفتاب کو کائنات پر دھوپ اور روشنی بکھیرنے کی صلاحیت مل رہی تھی اور کہیں ماہتاب کو چاندنی پھیلانے کی قوت عطا ہو رہی تھی۔ شام کے وقت کو سیہ لباس فراہم کیا جا رہا تھا جب کہ ستاروں کو چمک کا تحفہ دیا جا رہا تھا۔ کرۂ ارض پر زندگی اور تخلیق کے جذبوں سے نوازا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں فرشتے شبنم کو آنسو بہانے کی تربیت دے رہے تھے اور کہیں پہلی بار کلی چٹک کر پھول کے لبوں کو خندہ زن کر رہی تھی۔ شاعر کے دل میں درد کی لذت بھی اسی لیے فراہم کی گئی اور خودی کو بھی بے خودی کے جذبے سے مسحور کیا جا رہا تھا۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہلی بار کالی کالی گھٹاؤں کی اس طرح آمد ہوئی کہ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی حور اپنے گھنیرے بال کھولے ہوئے کھڑی ہے۔

دوسرا بند **معنی:** نظارگی: دیکھنا، نظارہ کرنا۔ قضارا: اتفاق سے۔

مطلب: آغاز کائنات کے لمحات بقول اقبالؔ اس قدر خوبصورت اور نظر فریب تھے کہ یہ مناظر سراپا ایک دیکھنے کی چیز بنے ہوئے تھے۔ ان لمحات میں آسمانوں پر فرشتے بھی اس قدر مسرور تھے کہ چاروں جانب اس طرح رواں دواں تھے جیسے اپنی قوت پرواز کی آزمائش کر رہے ہوں۔ ان کی پیشانیوں سے نور ازل آشکار ہو رہا تھا۔ ان میں ایک فرشتہ عشق کے جذبے کا بھی تھا جو دوسرے فرشتوں کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔ اس فرشتے میں اضطراب کا عنصر اس طرح نمایاں تھا جیسے اس کے وجود میں پارا متحرک ہو۔

عشق کا یہ فرشتہ جنت کی سیر کو جا رہا تھا کہ اچانک اسے راستے میں موت کا فرشتہ یعنی ملک الموت مل گیا۔ عشق کے فرشتے نے اس سے استفسار کیا کہ بتاؤ تو سہی! تو کون ہے اور تیرا کام کیا ہے؟ تجھے دیکھ کر مجھے کچھ ناگوار سی کیفیت محسوس ہو رہی ہے۔ اس مرحلے پر ملک الموت نے جواباً کہا! حیرت ہے کہ تو میری ذات سے واقف نہیں۔ میں ہی تو وہ ہوں جو ہر زندہ شے کو فنا کے گھاٹ اتارنے پر قادر ہوں۔ میں ہی زندگی کے پرزے اڑاتی ہوں اور اسے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیتی ہوں۔ میری آنکھوں میں وہ جادو ہے جو وجود کو عدم وجود سے آشنا کرتا ہے اور جس کا پیغام فنا ہے۔ مگر ایک ہستی ایسی بھی ہے جو اس دنیا میں آگ کی مانند ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے مقابلے میں پارے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یہ ہستی قلب انسان میں ایک شعلے کی مانند پوشیدہ رہتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہی خدائے لم یزل کی آنکھوں کا تارا ہے۔ مراد یہ کہ خداوند عالم اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔

یہی ہستی یعنی عشق انسان کے دل میں موجزن رہتا ہے اور اس کا وجود اس کے لیے تلخ ہونے کے باوجود ایک خوش گوار حیثیت رکھتا ہے۔

عشق کے فرشتے نے جب ملک الموت کی گفتگو سنی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور اس کا یہی تبسم بجلی بن کر موت کے فرشتے پر گرا۔ اس لیے کہ روشنی کے روبرو تاریکی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ عشق تو زندگی کا مظہر ہے۔ ظاہر ہے موت اس کے روبرو کیسے ٹھہر سکتی تھی۔

زہد اور رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی — تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا — کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت — جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مے زہد سے تھی دل کی صراحی — تھی تہ میں کہیں درد خیال ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی — منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے — تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبالؔ کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا؟ — گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا تفضیل علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
مجموعہ اضداد ہے اقبال نہیں ہے دل دفتر حکمت ہے، طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی ہو گا یہ کسی اور ہس اسلام کا بانی
القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے تادیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے یہ آپ کا حق تھا زرہ قرب مکانی
خم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت پیدا نہیں کچھ اس سے قصور ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے؟
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

*

زہد اور رندی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک جانب تو علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت اور واضح انداز میں اپنے عقائد کا ذکر کیا ہے اور دوسری جانب ان تضادات کی نشاندہی بھی کی ہے جو ملا ازم اور پاپائیت کے تعصبات کی پیداوار ہیں۔ اس نظم کے عملی سطح پر دو کردار ہیں۔ ایک مولوی اور دوسرا ایسا آزاد خیال مسلمان جو اسلام کو انتہائی وسیع المشرب مذہب تصور کرتا ہے جب کہ مولوی اسے اپنے ذاتی تعصبات کی عینک سے ہی دیکھتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں!

معنی: صوفی منشی: صوفی مزاجی۔ اعالی: اعلیٰ کی جمع، بڑے لوگ۔ ورد خیال: تلچھٹ۔ ہمہ دانی: سب کچھ جاننا۔ کلیم ہمدانی: ایران کے شہر ہمدان کا ایک شاعر۔ قرب مکانی: مکان کی نزدیکی یعنی پڑوس۔ تمسخر: مذاق۔

مطلب: میں یہاں آپ کو ایک مولوی صاحب کی داستان سنانے لگا ہوں۔ میرے اس عمل کا مقصد قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ محض اپنی طبع کی تیزی کا اظہار کروں بلکہ کچھ ایسے حقائق ہیں جن کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جن مولوی صاحب کی داستان سنائی جا رہی ہے ان کے بارے میں یہی شہرت تھی کہ وہ تصوف کے فلسفہ سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اسی سبب ہر چھوٹا بڑا موصوف کا بہت احترام کرتا تھا۔

ان مولوی صاحب کا عقیدہ یہ تھا کہ تصوف کے فلسفے میں شریعت اس طرح پوشیدہ ہے جیسے کہ الفاظ میں معانی چھپے ہوتے ہیں۔ ان کا دل بھی کہا جاتا ہے کہ زہد سے لبریز تھا یوں بھی وہ خود کو بہت حیرو عاقل تصور کرتے تھے۔ اور کسی دوسرے کو خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے۔ ان کے اس رویے کا بنیادی مقصد فی الواقع اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اپنے مریدوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ مولوی صاحب عرصہ دراز سے میرے پڑوس میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ میں تو خیر رند ہی تھا لیکن زہد کے ان دعویدار سے پڑوسی ہونے کے ناطے میری پرانی واقفیت تھی۔ ایک روز انہوں نے میری بجائے میرے ایک واقف کار سے استفسار کیا کہ یہ شخص اقبال جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بلند پایہ شاعر ہے اس کے متعلق سنا گیا ہے کہ ہندو کو کافر نہیں سمجھتا اس نوع کا عقیدہ تو محض ایسے شخص کا ہو سکتا ہے جو محض فلسفے پر یقین رکھتا ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اقبال اگرچہ شاعر تو بہت اچھا ہے تاہم احکام شریعت کی پابندی بھی کرتا ہے یا نہیں؟

مزید براں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال کی فطرت میں شیعت کے عقیدے کا بھی کچھ عمل دخل ہے۔ اس لیے کہ وہ خلفاء میں حضرت علیؓ کو افضل تصور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ راگ رنگ کو بھی عبادت کا ایک حصہ خیال کرتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ مذہب کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو طوائفیت کو بھی برا نہیں سمجھتا۔ مگر محض اقبال سے ہی یہ شکایت نہ ہونی چاہیے اس لیے کہ ہمیشہ سے ہمارے شعراء کا یہی وطیرہ رہا ہے۔

وہ یہی تو کرتے ہیں کہ رات کو گانے سے محظوظ ہونا اور صبح دم قرآن کریم کی تلاوت کرنا! یہ صورت حال بہرحال ایک ایسا راز ہے جس کی تعبیر سے کم از کم ہم ابھی تک آگاہ نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے مریدوں سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ عالم شباب میں بھی بے داغ کردار کا مالک ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال اضداد کا مجموعہ ہے یعنی اس کا دل تو حکمت و دانش کا خزینہ ہے جب کہ طبیعت میں قدرے جنون کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔: مولوی صاحب اپنے استفسارات کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھ پر اس شخص کی حقیقت واضح نہیں ہوتی کیا وہ کسی نئے اسلام کا بانی تو نہیں ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ ان کی لمبی چوڑی تقریر کافی دیر تک جاری ہے چونکہ اس شہر میں کوئی بات چھپی نہیں رہتی اس لیے مولوی صاحب کے ارشادات کا ہر طرف چرچا ہوا اس کی داستان مجھ تک بھی پہنچی۔

اقبال کہتے ہیں کہ بعد میں ایک روز مولوی صاحب سر راہ اچانک مل گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے برا نہ منانا! وہ باتیں جو تم تک پہنچیں دراصل وہ تو محبت کے سبب کہی گئی تھیں۔ میرا مقصد تو تمہیں محض شیعت کی راہ سے آگاہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اقبال کہتے ہیں اس مرحلے پر میں نے جواباً کہا کہ پڑوسی ہونے کے ناطے آپ نے جو کچھ فرمایا وہ یقیناً آپ کا حق تھا مجھے اس پر کوئی گلہ اور شکایت نہیں!

مولانا! میں تو آپ کا نیازمند ہوں۔ ویسے بھی آپ میرے بزرگ ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ اگر آپ میری حقیقت سے آگاہ نہیں تو اس پر حیرت بھی نہیں ہوتی نا ہی اس میں کسی دانش کا دخل ہے۔ اس لیے کہ میں تو خود بھی اپنی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتا۔ میرے خیالات میں جو گہرائی ہے اس کا علم تو مجھے بھی نہیں۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ اقبال کو خود بھی دیکھوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیا شے ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال خود بھی اقبال کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ اور اس معاملے میں کسی طرح کے طنز و مزاح کی گنجائش نہیں ہے۔

شاعر

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم　　منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم　　شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، رہتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

*

① **معنی:** رہ پیما: راستہ چلنے والے۔ عضو: حصہ۔

مطلب: تین اشعار پر مشتمل یہ نظم اقبال کی انتہائی خوبصورت جامع اور مختصر نظموں میں سے ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے انتہائی جاندار الفاظ میں شاعر کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق قوم کو اگر ایک جسم تصور کر لیا جائے تو افراد کو اس کے اعضاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان افراد میں سے جو لوگ صنعت و حرفت کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عملاً قوم کے دست و بازو کی حیثیت کے حامل ہیں۔

② اس کے علاوہ جو لوگ نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہوئے نظام حکومت چلاتے ہیں وہ قوم کے چہرے پر حسن و خوبصورتی کے مظہر ہوتے ہیں۔ مراد یہ کہ جس طرح کسی شخص کی خوبصورتی کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہوتا ہے اسی طرح کسی قوم کی خوبیوں کو بر سر اقتدار طبقے کی صلاحیت اور کردار سے پرکھا جا سکتا ہے تاہم شاعر کی حیثیت ان سب سے بلند ہے کہ وہ قوم کے لیے دیدۂ بینا کی طرح سے ہے۔

③ مشاہدے اور تجربے کے مطابق یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جسم کے کسی حصے کو بھی تکلیف پہنچے تو اس کا اظہار آنکھ سے ہی ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ اس تکلیف کے سبب آنکھ میں ہی آنسو آ جاتے ہیں۔ اس امر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ آنکھ جسم کی کس قدر ہمدرد ہوتی ہے مطلب یہ کہ شاعر کو اگر قوم کی آنکھ تسلیم کر لیا جائے تو پوری قوم کو اسے غم گسار بھی ماننا پڑے گا۔

دل

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل　　التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل
یا رب! اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی　　جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا رب!　　جل گئی مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل
حسن کا گنجِ گرانمایہ تجھے مل جاتا　　تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکا اس پر　　کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل
اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا　　دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو　　رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل
خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے　　وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل
عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے

برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

*

معنی: بازی طفلانہ: بچوں کا کھیل۔ مزرع: کھیتی۔ حسن: محبوب۔ خاک کے ڈھیر: مراد انسان ہے۔

مطلب: اقبال اس نظم کے دل کے محاسن و خصائص بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عام لوگوں کے لئے اپنی جان پر کھیل جانا بے شک ناممکنات سے ہے لیکن جو اہل دل ہیں یعنی عشاق ہیں ان کے لیے یہ عمل بچوں کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دل کی ماہیت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بس اتنا ہی ہے کہ خدائے عزوجل کا جلوہ دیکھنے کی خواہش اس داستان کا عنوان بنتا ہے۔

① تا ③ اقبال نے اس شعر کی دوسرے مصرع میں کوہ طور کے واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ کہ یہ عمل تو دل کے لیے ایک سہل کام ہے۔ اور ایسا دل جو معرفت کی شراب سے لبریز ہو۔ سوچئے تو سہی اس کی قیمت کیا ہوگی؟ کہ یہ تو انسان کے لیے بقائے دوام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر انسان دل کو اپنا رہبر بنا لے تو جذبہ عشق اسے بقائے دوام عطا کر دیتا ہے۔ دراصل اقبال کے نزدیک عشق ایسا جذبہ ہے جس کا تعلق دل سے ہے۔ نہ جانے یہ ابر رحمت تھا یا عشق کی بجلی کہ آخر الذکر کا کام جلانا اور فنا کر دینا ہے جب کہ ابر رحمت تو تخلیق کی علامت ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ عشق کے جذبے نے تو زندگی کو فنا کر کے رکھ دیا تھا پھر یہی جذبہ ابر رحمت کی صورت میں ظاہر ہوا اور یوں دل کی تخلیق وجود میں آئی۔

④ یہاں فرہاد سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ تو اگر دل کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتا تو اپنے عشق میں یقیناً کامیاب ہو جاتا پھر تجھے مشروط بنیاد پر جوئے شیر لانے کے لیے پہاڑ کو کھودنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔

⑤ اس شعر میں اقبال عالم حیرت میں کہتے ہیں کہ کبھی تو دل پر عرش کا دھوکا ہوتا ہے اور کبھی یہ کعبہ کے مانند لگتا ہے۔ دوسرے مصرع میں وہ رب ذوالجلال سے استفسار کرتے ہیں کہ تو ہی مجھ پر یہ راز ظاہر کر دے کہ میرا یہ دل آخر کس فرد کی آماجگاہ ہے؟ اس شعر سے باسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر نے یہ اشارہ ذات خداوندی کی جانب کیا ہے کہ وہی انسان کے دل میں مقیم ہوتی ہے۔

⑥ اقبال کے اس شعر میں تغزل پوری انتہا پر پہنچا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں دل اور میں عملی سطح پر دونوں ہی مجنوں اور سودائی ہیں تاہم فرق اتنا ہی ہے کہ یہ دل تو کسی اور کا دیوانہ ہے جب کہ میں دل پر فریفتہ ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ میرا دل کائنات کو پیدا کرنے والے کے عشق میں سرشار ہے۔ لہٰذا اس پر میرا فدا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ عشق کا یہ تعلق بالواسطہ ہے۔

⑦ وہ کہ جسے زہد کا دعویٰ ہے وہ اس حقیقت کا ادراک کیسے کر سکے گا عشق کی ایک لغزش عملی سطح پر سینکڑوں سجدوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔

⑧ عشق میں جلنے والے دل کی راکھ تو ایک ایسی اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے جو مٹی کے ڈھیر پر ڈال دی جائے تو اس کو بھی سونا بنا دے۔ مراد یہ کہ عشق میں وہ کیفیت ہے جو انسان کو بلند مدارج بخشتی ہے۔

⑨ اس شعر میں دل کو متضاد کیفیتوں کا اہل بتایا گیا ہے کہ عشق کے دام میں پھنس جانے کے باوجود وہ خود کو آزاد سمجھتا ہے اور اگر اسے ایک پودا تصور کر لیا جائے اور اس پر بجلی گر جائے تو دل خاک ہونے کی بجائے سرسبز ہو جاتا ہے۔

موجِ دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے — عینِ ہستی ہے تڑپ صورتِ سیماب مجھے
موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے — ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے
آب میں مثلِ ہوا جاتا ہے توسن میرا
خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا
میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے — جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے — کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیِ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

*

پہلا بند **معنی:** پایاب: تھوڑا پانی جس سے آدمی پیدل گذر جائے۔ توسن: گھوڑا۔ خارِ ماہی: مچھلی کا کانٹا۔

مطلب: دو بند پر مشتمل اس نظم میں اقبال نے دریا کی زبان سے ایک مکالمے کو اپنی اس تخلیق کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے بقول پہلے بند میں دریا یوں گویا ہوتا ہے کہ میرا بے چین دل ہر لمحے مجھے مضطرب رکھتا ہے اس لیے کہ پارے کی مانند تڑپ اور متحرک رہنا ہی میری حقیقی زندگی ہے۔ میرا نام موج ہے اور سمندر کا گہرا پانی میرا ذخیرہ ہے جس میں رونما ہونے والے بھنور عملی سطح پر میرے لیے زنجیر نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ میں طبعاً" آزاد ہوں اور کوئی پابندی میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ اسی سبب کوئی شے میری راہ میں کسی طور پر بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ میں پانی میں تیز گھوڑے کی مانند ہوا کی رفتار سے سفر کرتی ہوں۔ اس سفر کے دوران وہ مچھلی بھی میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتی جس کی پشت پر ایک بڑی ہڈی ہوتی ہے۔

دوسرا بند **معنی:** جذب: کھینچنا۔ گریزاں: بھاگنے والی۔ وسعتِ بحر: سمندر کی وسعت۔

مطلب: اس بند میں موجِ دریا یوں گویا ہوتی ہے کہ کبھی تو چودھویں رات کے چاند کی کشش سے مدوجزر سے ہمکنار ہوتی ہوں اور کبھی جوش و خروش کے عالم میں ساحل کے کناروں سے ٹکراتی ہوں۔ میں تو دراصل اس مسافر کے مانند ہوں جس کو منزل ہی راس آتی ہے اور اسی سے اس کا تعلقِ خاطر ہوتا ہے۔ لیکن مجھ میں یہ بے چینی اور اضطراب کیوں ہے اس کو کوئی میرے دل سے ہی پوچھے تو اس کا جواب ممکن ہو سکتا ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ میں جو فطری سطح پر وسیع المشرب ہوں۔ دریا کی تنگ دامانی سے نجات حاصل کرنے کی خواہاں رہتی ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سمندر کی وسعت اور فراخی کو پانے کے لیے میرا دل ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔

رخصت اے بزم جہاں

(ماخوذ از ایمرسن)

رخصت اے بزم جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں
بسکہ میں افسردہ دل ہوں، درخور محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے، میں ترے قابل نہیں!
قید ہے دربار سلطان و شبستان وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیر طلائی کا اسیر
گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے
مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب موج بحر کی صورت رہا
مدتوں بیٹھا ترے ہنگامہ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں
مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں
آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں
چشم حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے
چھوڑ کر مانند بو، تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزم جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
گھر بنایا ہے سکوت دامن کہسار میں
آہ! یہ لذت کہاں موسیقی گفتار میں
ہمنشین نرگس شہلا، رفیق گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایہ بلبل ہوں میں
شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرش سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے
بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دل شاعر کو لیکن کنج تنہائی پسند
ہے جنوں مجھکو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو، کوہ کی وادی میں میں
شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے
طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنج عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل! پیامی بزم قدرت کا ہوں میں
ہم وطن شمشاد کا، قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں
کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے
عاشق عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسند دارا و اسکندر پہ میں
لیٹنا زیر شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہے رہ رہ کر نظر
علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود؟
گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود

*

① تا ⑤ **معنی:** درخور محفل: محفل کے قابل۔ خود آراؤں: خود پسند لوگ۔ موج بحر: سمندر کی لہر۔

مطلب: جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ نظم اقبال کی طبع زاد نہیں بلکہ ایمرسن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ اس کے باوجود اکثر مقامات پر اس نظم میں علامہ کے فکر و نظریات کی جھلک موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو چکا ہے۔ یہ دنیا تو ایک ایسی آبادی کی مانند ہے۔ عملی سطح پر جو ایک ویرانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل اس سے گھبرانے لگا ہے۔ حقیقت ہے کہ میں اتنا افسردہ دل ہو چکا ہوں کہ کسی طرح کی محفل آرائی کو پسند نہیں کر سکتا بس اے دنیا اب تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ ہی تو

میرے قابل ہے اور نا ہی میں تیرے قابل ہوں۔ یہ دنیا امیر و وزیر اور بادشاہوں کے درباروں میں گرفتار ہو کر رہ گئی ہے اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں سانس لینے کا خواہاں ہوں۔

یہ تسلیم کہ تجھ میں جو زندگی اور رونق ہے وہ ہر شخص کے لیے بیشک کشش انگیز ہے اس کے برعکس میرے لیے تو تیرا وجود اجنبی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک عرصے تک ان خود پسند اور متکبر لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں جو تیرے دامن میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ہر ممکن برداشت کے باوجود ان کے مابین اس طرح سے مضطرب اور تڑپتا رہا جس طرح کہ سمندر کی بے چین موج مضطرب اور پریشان رہتی ہے۔ مراد یہ کہ یہ ماحول سدا سے میرے لیے ناقابل برداشت ہی رہا۔

⑥ تا ⑨ **معنی:** **یوسف:** تلمیح ہے حضرت یوسفؑ کی۔ **نرگس شہلا:** نرگس کے پھول کی ایک قسم۔

مطلب: "بزم جہاں" سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک مدت تک تیرے ہنگاموں میں شریک رہا ہوں لیکن یہ عرصہ ایک طرح سے بیکار ہی ضائع ہوا۔ میں نے ہرچند کوشش کی کہ اس ظلمت کدے سے روشنی پالوں لیکن کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ یہ میری راہ کے کانٹے تھے جن میں مدتوں پھول کے نظارے تلاش کرتا رہا لیکن تیرے بازار میں اس یوسفؑ کو نہ پا سکا۔ مراد یہ ہے کہ ہر ممکن سعی کے باوجود میں حصول مدعا میں ناکام رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہو چکی ہے کہ میری آنکھیں ایک اور نظارے کی متلاشی ہیں جو اس امر کی آرزومند ہیں کہ میں جو طوفان میں گھرا ہوا ہوں اس کی ساحل تک رسائی ہو جائے۔ چنانچہ تیرے چمن کو اس طرح سے چھوڑ کر جا رہا ہوں جس طرح سے کہ پھول سے خوشبو رخصت ہوتی ہے۔ اس صورت میں تجھ سے اے بزم جہاں رخصت ہو کر اپنے حقیقی وطن جا رہا ہوں۔

⑩ تا (13) **معنی:** **گوش بر آواز:** جس کے کان صدا پر لگے ہوتے ہیں۔ **عاشق عزلت:** تنہائی کا عاشق۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں اس دوسرے منظر کی نشاندہی کرتے ہیں جو بقول ان کے حقیقی وطن بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس وطن میں رہنے کے لیے جو گھر بنایا ہے وہ دامن کہسار میں واقع ہے اور وہاں ایسا سکوت ہے جس کے مقابلے پر آواز کی موسیقیت میں بھی لطف نہیں ہوتا۔ یہاں میں نرگس اور گلاب کے پھولوں کی ہم نشینی اور رفاقت حاصل ہے۔ یہاں کا گلستاں ہی میرا وطن ہے جہاں بلبل کے گھونسلے کی قربت میں میرا گھر واقع ہے اس خوبصورت ماحول میں چشموں کی مست آوازیں مجھے نیند سے ہم کنار کرتی ہیں اور صبحدم کوئل کی کوک میرے لیے بیداری کا پیغام دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی زندگی میں خواص و عوام ہر لحظے محفل آرائی اور ہنگاموں کو پسند کرتے ہیں اس کے برعکس مجھ ایسے شاعر کو تو ایسا گوشہ مرغوب ہے جو ہر طرح سے پرسکون ہو۔

(14): نظم کے اس حصے میں اقبال ایک بار پھر اپنی کیفیت اور اضطراب کا احوال بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ میں تو شاید سودائی ہو گیا ہوں کہ آبادی سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ بار بار خود ہی اس سوچ میں گم ہو رہا ہوں کہ وہ کون سی ہستی ہے جس کو دامن کوہ میں تلاش کرنے آنکلا ہوں۔ ایسا کس چیز کا

شوق ہے جو مجھے ان سبزہ زاروں میں سرگرداں کیے ہوئے ہے اور جس کے سبب میں چشموں کے کناروں پر محو استراحت ہوتا ہوں۔

اے بزم جہاں! تو مجھے یہ طعنہ دے رہی ہے کہ میں تنہائی کا عادی ہو گیا ہوں حالانکہ تجھے اس حقیقت کا علم ہی نہیں کہ میں تو فطرت اور اس کے مظاہر کو پیش کرنے والا ہوں۔ میں تو صنوبر کے درخت کی قربت سے استفادہ کر رہا ہوں اور قمری کے رازوں سے بھی آگاہی رکھتا ہوں۔ ہرچند کہ یہ چمن جہاں میں مقیم ہوں پر سکوت ہے لیکن اس کی خاموشی میں بھی کچھ ایسی آوازیں ہیں جن کو میں سننے کا اہل ہوں اور یہاں جو کچھ سنتا ہوں اس کو دوسروں تک بھی پہنچاتا ہوں۔ مزید بر آں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ دوسروں کو دکھانے کی سعی بھی کرتا ہوں۔ بے شک میں تنہائی کا عاشق ہوں لیکن میرا دل اپنے اسی گھر پر ناز کرتا ہے۔ اس کے مقابلے پر دارا اور سکندر جیسے شان و شوکت رکھنے والے بادشاہوں کے عشرت کدے میرے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ جب کسی درخت کے زیر سایہ شب کو محو استراحت ہوتا ہوں اور اس عالم میں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں پر نظر پڑتی ہے تو مسحور ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے تو پھول کی پتی سے ہی موت اور زندگی کے پوشیدہ اسرار کا انکشاف ہو جاتا ہے جب کہ علم و فلسفے میں میرے نزدیک یہ خصوصیت ناپید ہے۔

طفلِ شیر خوار

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا! باریک ہے نوک قلم

آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے؟
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

گیند ہے تیری کہاں؟ چینی کی بلی ہے کدھر؟
وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو!
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرار آرزو

ہاتھ کی جنبش میں، طرز دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے

زندگانی ہے تری آزاد قید امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے، چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلون آشنا، میں بھی تلون آشنا

عارضی لذت کا شیدائی ہوں، چلاتا ہوں میں
جلد آ جاتا ہے غصہ، جلد من جاتا ہوں میں

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفل ناداں میں بھی ہوں

*

① تا ③ معنی: نووارد اقلیم غم: غم کے ملک میں نیا نیا آنے والا وجود۔

مطلب: علامہ اقبال ننھے بلکہ دودھ پیتے بچوں کی نفسیات پر بھی کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور اس حوالے

سے اور اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں جو طرز عمل اختیار کرتے تھے اس کا اندازہ زیر تشریح نظم سے ہوتا ہے۔ یہاں وہ ایک دودھ پیتے بچے سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے طفل ناداں! تیرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ چنانچہ میں نے اسے تیرے ہاتھ سے چھین لیا اس پر تو چیخ پڑا اس لیے کہ تجھے اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ اس تیز دھار ہتھیار سے تجھے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے مگر تو نے تو میرے اس عمل کو نامہربانی پر محمول کیا حالانکہ میرا یہ فعل تو خالصتاً مہربانی کا حامل تھا۔

اس کے بعد تو نے قریب پڑا ہوا قلم اٹھا لیا تجھے تو اس امر کا علم بھی نہ تھا کہ اس قلم کی نوک کتنی تیز اور باریک ہے۔ کہیں چبھ گئی تو تکلیف سے رونے لگے گا۔ نہ جانے تو ان تکلیف دینے والی اشیاء کا اتنا گرویدہ کیوں ہے؟ کھیلنا ہی ہے تو اس کاغذ کے ٹکڑے سے کھیل! کہ اس کے لمس سے تجھے قطعی طور پر تکلیف نہیں پہنچے گی۔

④ **مطلب**: پیارے بچے! مجھے یہ تو بتا کہ تیرے کھلونے کیا ہوئے۔ تیری گیند کہاں ہے اور چینی کی وہ خوبصورت بلی کیا ہوئی جس کا سر ٹوٹا ہوا ہے۔ پیدا ہونے سے قبل تو تجھ میں کسی خواہش کا وجود نہ تھا کہیں اس عالم رنگ و بو کی فضا میں آتے ہی خواہشات نے تجھے گھیر لیا۔ لیکن جس طرح تو ابھی اپنی نقل و حرکت میں آزاد نہیں اسی طرح تیری خواہشات بھی ہاتھوں کی حرکت اور دیکھنے کے انداز میں پوشیدہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جو چیز تجھے پسند آ جاتی ہے اسی کو ہتھیانے کی کوشش کرتا ہے کہ تیری خواہشات بھی تیری طرح نئی نئی وجود میں آئی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تیرا وجود ابھی ہر نوع کے اختلاف و امتیاز سے یکسر آزاد ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اب بھی قدرت کے بیشتر اسرار تجھ پر آشکار ہیں۔ ہر چند کہ تو ان کا اظہار اپنی زبان سے نہیں کر سکتا۔

⑧ سے (12) **معنی**: **آزاد غبار آرزو**: آرزو کی گرد سے آزاد۔ **نوزائیدہ**: جو نئی نئی پیدا ہوئی ہو۔ **قید امتیاز**: تمیز کی پابندی سے آزاد۔ **ہویدا**: ظاہر۔ **ہم آہنگ**: ہم نوا، ساتھی۔ **تلون آشنا**: جس کا مزاج ایک حالت پر قائم نہ رہے اور لحظہ بہ لحظہ بدلتا جائے۔

مطلب: اے بچے! جب بھی کسی چیز کے چھینے جانے کی بنا پر مجھ سے بگڑتا ہے اور غم و غصے کی حالت میں گریہ و زاری کے ساتھ چلانے لگتا ہے تو میں تجھے بہلانے کے لیے تیرے ہاتھ میں ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیتا ہوں۔ عجب تماشا یہ ہے کہ اس عمل سے ہی تو بہل کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اے عزیز تیری یہ عادت بالکل میری عادت سے ملتی جلتی ہے یعنی تیری طرح میں بھی تغیر پذیر فطرت کا حامل ہوں۔ میں بھی تو عارضی خوشی میں مست ہو جاتا ہوں اور صورت حال اس کے برعکس ہو تو چیخنے چلانے لگتا ہوں۔ میری بھی کیفیت یہی ہے کہ غصہ بھی جلد آ جاتا ہے اور اس کے بعد جلد ہی من جاتا ہوں۔ میری آنکھوں کو بھی ظاہری حسن پوری طرح مسحور کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری نادانیاں بھی تیری نادانی سے کسی طرح کم نہیں! میں بھی تیری مانند کبھی روتا ہوں تو کسی مرحلے پر ہنسنے اور قہقہے لگاتا ہوں اگر دیکھنے کو بے شک نوجوان ہوں لیکن عملی سطح پر تیری مانند طفل نادان ہوں یعنی میری حالت بھی بالکل ننھے بچوں کی سی ہے۔

تصویر درد

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے' بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اٹھائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑا لی قمریوں نے' طوطیوں نے' عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری
ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں' حسرت بھری ہے داستاں میری
الہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟
حیات جاوداں میری' نہ مرگ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں' خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
"دریں حسرت سرا عمریست افسون جرس دارم
ز فیض دل طپیدنہا خروش بے نفس دارم"
ریاض دہر میں نا آشنائے بزم عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو' میں وہ محروم مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرف زیر لب' شرمندۂ گوش سماعت ہوں
پریشاں ہوں میں مشت خاک' لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گرد کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں' چھپایا مجھ کو مشت خاک صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں' کس کی دولت ہوں؟
نظر میری نہیں ممنون سیر عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں' نہ ساقی ہوں' نہ مستی ہوں' نہ پیمانہ
میں اس میخانہ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
مرا آئینہ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے' ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو' اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے' یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں، چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثال نقش پا تو نے

رہا دل بستہ محفل، مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرون محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں، دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

سراپا نالہ بیداد سوز زندگی ہو جا
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے

صفائے دل کو کیا آرائش رنگ تعلق سے
کف آئینہ پر باندھی ہے او ناداں! حنا تو نے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطر قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بت پندار کو اپنا خدا تو نے

کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

دکھا وہ حسن عالم سوز اپنی چشم پر نم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم کو

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

نہ اٹھا جذبہ خورشید سے اک برگ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو

پھرا کرتے نہیں مجروح الفت فکر درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا
علاج زخم ہے آزاد احسان رفو رہنا

شراب بیخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکست رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثل حباب آبجو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھکو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابان محبت دشت غربت بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے، صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاج گردش چرخ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بیستوں بھی، کوہکن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے؟

سکوت آموز طول داستان درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے

سکوت آموز طول داستان درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے

"نمی گردید کوتہ رشتہ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں، بخاموشی ادا کردم"

*

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اقبال جو نظمیں پڑھتے رہے "تصویر درد" بھی انہی میں سے ایک نظم ہے۔ اس نظم میں انہوں نے عصری صورت حال کے حوالے سے اہل وطن کی بے حسی پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو تباہی ان کا مقدر بن جائے گی۔ لہٰذا ان کے لیے لازم ہے کہ اپنی بہتری کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں۔ فرماتے ہیں کہ

① سے ④ **معنی:** منت کش تاب شنیدن: کوئی سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ دستور زباں بندی: بات کرنے کا حکم نہیں۔

مطلب: مجھے اس امر کا شدید دکھ ہے کہ میں نے جو داستان بیان کی ہے اس پر کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔ اس صورت حال کے سبب میں نے خاموشی اختیار کر لی ہے کہ بعض حالات میں اس نوع کی بے زبانی ہی زبان بن جاتی ہے۔ دوسرے شعر میں وہ قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ تیری بزم میں تو زباں بندی کا دستور اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب یہاں میری زبان کسی سے بات کرنے کے لیے بھی ترس گئی ہے۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ حقیقت بھی قدرے واضح ہے کہ میری داستان کے کچھ اوراق مختلف پھولوں یعنی افراد نے اٹھا لیے جب کہ یہ سارے چمن میں بکھرے پڑے تھے اس طرح کچھ لوگوں نے میرے طرز سخن اور افکار پر ڈاکہ ڈال دیا اور اس طرح میری متاع کو لوٹ لیا۔

⑤ سے ⑧ **مطلب:** اس مرحلے پر اقبال شمع سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو سراپا درد بن کر رہ گیا ہوں اور میری داستان میں اب حسرتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اے شمع! تو ہی میری غم گسار بن جا اور پروانے کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک جا۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح قوم کے درد میں میں آنسو بہاتا ہوں۔ تو بھی میرا ساتھ دے۔ اگلے شعر میں اقبال خدا سے کہتے ہیں کہ یہ بتا! میرے لیے تیری اس دنیا میں قیام کرنے کا کیا لطف ہے جب کہ میرا نہ زندگی پر اختیار ہے نا ہی موت پر! یعنی میں تو عملاً بے دست و پا

فرد ہوں اور یہ صرف میری اپنی فریاد ہی نہیں بلکہ سارے زمانے کی اجتماعی فریاد ہے۔ میں تو ایک ایسے پھول کے مانند ہوں جو پورے چمن کی خزاں اور بربادی کو اپنی خزاں تصور کرتا ہے۔ اس حسرت و مایوسی کی دنیا میں میری ذات تو ایک انتباہ کرنے والی گھنٹی کی طرح سے ہے اس لیے کہ جب تڑپتا ہوں تو اس کا اظہار بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے اشعار میں کرتا ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ انتباہ کے باوجود میری آہ و زاری پر کوئی کان نہیں دھرتا۔

⑨ سے (16) **معنی**: **حرف زیر لب**: آہستہ بات جو سنائی نہ دے سکے۔ **شرمندۂ گوش سماعت**: جو بات کان تک نہ پہنچے۔ **سیر عرصہ ہستی**: زندگی کے میدان کی سیر۔ **صہبا**: شراب۔

مطلب: میں تو باغ دنیا میں ایک ایسی شخصیت ہوں جو مسرت و خوشی سے یکسر محروم ہوں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جن پر مسرت اور خوشی بھی آنسو بہاتی ہے۔ میری تقدیر تو اس قدر بگڑ چکی ہے جس کی کیفیت کا اظہار بھی انتہائی الم انگیز ہے۔ میری آواز تو ہونٹوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور ہر کوئی اس کو سننے سے قاصر ہے۔ میں بظاہر ایک مشت خاک کی مانند ہوں جب کہ آج تک مجھ پر اس امر کا انکشاف نہیں ہو سکا کہ نصف دنیا کو فتح کرنے والے سکندر کی مانند ہوں یا جمشید کا وہ پیالہ جس میں وہ ساری دنیا کے مناظر دیکھ لیتا تھا یا پھر غبار کے مانند بے حقیقت شے ہوں۔ مراد یہ کہ اس دار فانی میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے باوجود خود کو شناخت نہیں کر سکا۔ ان ساری کیفیتوں کے باوجود اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ میرے وجود کو برقرار رکھنا قدرت کے بنیادی مقاصد کا حصہ ہے اور اسی سبب میں خود کو ایک ایسی ظلمت سے تعبیر کر سکتا ہوں جو عملی سطح پر سراپا نور کی حیثیت رکھتی ہو۔ دراصل میں ایک ایسے خزانے کی طرح ہوں جو کسی صحرا کی خاک میں چھپا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میری حقیقت کیا ہے اور میں کس کی متاع ہوں؟ ایسی صورت میں مجھ سے کون استفادہ کر سکے گا۔ میری نظر کو کیا غرض پڑی ہے کہ زندگی کے ساتھ پوری کائنات پر نظر رکھے جب کہ میری ذات تو بذات خود ایک چھوٹی سی دنیا کے مانند ہے اور یہ چھوٹی سی دنیا میں میری اپنی سلطنت کی طرح سے ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نہ تو شراب ہوں نہ ساقی نا ہی مستی اور نا ہی پیمانہ ہوں۔ اس کے برعکس یہ زندگی کا جو میخانہ ہے اس میں موجود ہر چیز کی حقیقت کا مظہر ہوں۔ مراد یہ ہے کہ اس پورے نظام کائنات میں باری تعالیٰ نے انسان کو مختار کل بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے بغیر تو زندگی نامکمل اور ناکارہ شے ہے۔

میرا دل تو ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں دونوں جہانوں کے رازہائے سربستہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں اپنے اشعار میں ان حقائق کو سامنے لاتا ہوں۔ جو عملی سطح پر میرے مشاہدے میں آتے ہیں۔

(17 سے 20) **معنی**: **جنون فتنہ ساماں**: وہ جنون جو فتنہ اٹھائے۔ **رزم آرائیاں**: لڑائیوں کے لیے صفیں باندھنا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جو لوگ بڑے رنگین بیاں تھے فطرت نے مجھے ان میں سب سے علیحدہ ایسی طرز بیاں عطا کی ہے کہ آسمانوں پر جو خوش الحان فرشتے ہیں وہ بھی میرے ہمنوا بن گئے ہیں۔ مجھ میں جو عشق کا جذبہ موجود ہے اس کے سبب میں اپنی شعری تخلیقات میں قضا و قدر کے تمام سربستہ راز پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ اس شعر میں اقبال اپنے عہد کے ہندوستان کا نقشہ کھینچتے ہوئے بڑے افسردہ

لہجے میں کہتے ہیں کہ تیری افسوسناک صورت حال پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اس لیے کہ دنیا کے دوسرے افسانوں میں تیرا افسانہ سب سے زیادہ عبرت انگیز دکھائی دیتا ہے۔ تیری حالت پر میں جو افسردہ ہوں تو یوں لگتا ہے کہ قدرت نے میرا نام تیرے نوحہ خوانوں میں شامل کر دیا ہے۔

(21 سے 24) **مطلب**: یہاں اقبال بڑے دکھ کے ساتھ پھول توڑنے والے یعنی دشمن سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب باغ کے مالی اور رکھوالے ہی آپس میں دست و گریباں ہوں تو اس باغ کو برباد کرنے کے عمل میں تجھے کونسی قباحت محسوس ہو گی۔ یوں بھی آسمان نے اپنے دامن میں بجلیاں چھپا کر رکھی ہیں۔ اس صورت میں اہل چمن کو انہوں نے انتباہ کیا ہے کہ اسی مرحلے پر اگر تم نے غفلت سے کام لیا تو نتیجہ بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ میری آواز کو غور سے سنو! کہ یہ ایسی چیز ہے جس کو غیر وظیفہ جان کر سنتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دوسرے تو میری بات کا بے حد احترام کرتے ہیں جب کہ تم اہل وطن اس سے غفلت برت رہے ہو۔ اے میرے عزیز! تو کتنا نادان ہے کہ اپنے وطن کے تحفظ کا خیال نہیں کرتا جب کہ آسمانوں پر تیری بربادیوں کے مشورے جاری ہیں۔

(25 سے 29) **معنی**: **اسلوب فطرت**: قدرت کا دستور۔ **ہویدا**: ظاہر۔ **مشت خاک**: مٹھی بھر خاک۔ **شغل سینہ کاوی**: تڑپنے میں مشغول۔

مطلب: ذرا اس منظر کا جائزہ لے کہ اب تک یہاں کیا ہو چکا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تو ماضی کی داستانوں میں گھرا ہوا ہے۔ حالانکہ عصر نو میں ان داستانوں کی اہمیت ہی ختم ہو چکی ہے۔ بتا کہ تو اس طرح کب تک خاموش رہے گا۔ اپنی آواز اس طرح بلند کر کہ تیری صدا زمیں سے آسمان تک رسائی حاصل کر لے۔ زیر تشریح اشعار میں اقبال اہل ہند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میرے انتباہ کے باوجود اب بھی تم بیدار نہ ہوئے اور اپنے معاملات کو نمٹانے کے لیے جدوجہد کا آغاز نہ کیا تو جان لو کہ ماضی اور حال سے متعلق داستانوں میں تمہاری داستان کا ذکر تک نہ ہو گا کہ قدرت کا نظام بھی یہی ہے اور فطرت کے اصول بھی اسی طرح کے ہیں کہ جو راہ عمل پر گامزن رہتا ہے خدا اسے ہی محبوب رکھتا ہے۔

(29 سے 32) **معنی**: **مثال نقش پا**: پاؤں کے نشان کی طرح یعنی پست۔ **دل بستہ محفل**: محفل کا شیدائی۔ **سپند آسا**: حرمل کے دانے کی طرح۔ **چلیپا**: صلیب۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال انتہائی رنج و الم مگر جوش اور جذبے کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ آج اپنے چھپے ہوئے زخموں کو نمایاں ہی کر کے چھوڑوں گا۔ میری آنکھوں سے لہو بہے گا جو پورے باغ وطن میں پھیل جائے گا۔ میرے دل میں جو درد چھپا ہے اس کی آنچ ہر دل کی شمع کو روشن کر دوں گا۔ اور اسی شمع سے میں اے وطن تیری تاریک راتوں کو جگمگا دوں گا۔ میں تو اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ تیرے باسیوں کے سینوں میں دل درد آشنا پیدا ہو جائے۔ میرے اہل وطن نفاق اور نفرت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح سے آگاہ ہوں تاہم خود پر اتنا اعتماد بھی ہے کہ اگر یہ کام مشکل ہے تو اس کو آسان بھی کر دوں گا۔

(33 سے 35) **معنی**: **مطلق تھا**: پوری طرح آزاد۔ **بوالہوس**: ہوس میں الجھا ہوا۔ **ریاض**: باغ۔

مطلب: اے میرے ہم نشیں! مجھے اپنے سینے کو کھرچنے کے عمل میں ہی مصروف رہنے دے کہ اس طرح میں ان داغوں کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں جو فی الواقع محبت کے داغ ہیں۔ میری نگاہ حقیقت بیں نے اب تک جو منظر دیکھے ہیں ساری دنیا کو ان کا نظارہ کرا دوں گا۔ تاکہ وہ نفاق اور نفرتوں کو چھوڑ کر اتحاد و یگانگت سے بہرہ ور ہو سکے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمام احساسات اپنی تخلیقات کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دوں گا۔ مجھے اس امر پر مکمل اعتماد ہے کہ جب لوگ میرے مشاہدات' تجربات اور احساسات سے واقف ہوں گے تو دم بخود ہو کر رہ جائیں گے۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہر نگاہ حقیقت بیں کی ان مناظر تک رسائی ہو جاتی ہے جو ابھی تک پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسی حقیقت شناس نظریں اپنے عہد کے تقاضوں کو بھی پوری طرح پہچان لیتی ہیں۔

(36 سے 40) **معنی:** آزاد احسان رفو: زخم سلوانے کا احسان نہ لینا۔ **امتیاز ما و تو:** ایک دوسرے میں فرق۔ **استغنا:** بے پروائی۔

مطلب: اس پورے بند میں اقبال اس عالم بے عمل سے براہ راست مخاطب ہیں جو مذہب کا اجارہ دار بنا ہوا ہے۔ بعض شارحین نے زیر تشریح اشعار کو وطن کے حوالے سے دیکھا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کا مخاطب مذہب کا اجارہ دار وہ برخود تسلط ملا ہی ہے جس نے معمولی اختلافات کو ہوا دے کر دلوں میں نفرتوں کے بیج بو دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تو نے کسی مرحلے پر بھی وسعت قلبی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نا ہی تیری نگاہوں میں وہ رفعت پیدا ہوئی جو فرد کو فرشتے سے بھی افضل بنا دیتی ہے اس کے برعکس تو نے تو تمام عمر نفاق اور نفرت کی پستیوں میں گزار دی۔ ہر چند کہ تیرے دم سے محفلوں میں دل بستگی کا سامان تو پیدا ہوا لیکن تو اس قدر داخلیت پسند تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ محفلوں سے باہر بھی تو بہت کچھ ہے۔ تو دوسروں کی خوبصورتیوں اور اداؤں پر قربان تو ہوتا رہا لیکن تیرے اندر اگر کوئی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی اس کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ خدا کے اپنے متعصبانہ نقطہ نظر سے گریز کر کہ تو جن چیزوں کو برا سمجھ رہا ہے وہ تو اس دنیا کی زندہ حقیقت ہیں۔ وطن اور اہل وطن پر جو ظلم و ستم ہو رہے ہیں ان کے خلاف تو تجھے سراپا احتجاج بن جانا چاہیے تھا لیکن تو نے تو اس صورت حال کے خلاف اپنی زبان اس طرح بند کر رکھی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مراد یہ ہے کہ غیر ضروری اور نفاق انگیز باتوں پر تو تو چیخ چیخ اٹھتا ہے لیکن جن باتوں پر احتجاج کرنا چاہیے ان پر اپنی زبان بند رکھتا ہے اور احتجاج کی جراءت نہیں کرتا۔

(41 سے 45) **معنی:** **بخت خفتہ:** سوئی ہوئی قسمت۔ **وحشت غربت:** بے وطنی کا صحرا۔

مطلب: اگر دل و ضمیر صاف ہوں تو ان کے بارے میں کسی قسم کی رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن تو نے تو اے عالم بے عمل آئینے کی شفاف سطح پر بھی مہندی لگا کر اسے رنگنے کی کوشش کی ہے۔ تو اس قدر کج بیں ہے کہ زمین ہی نہیں بلکہ آسمان بھی تیرے اس رویے کے خلاف مضطرب اور مضمحل ہے کہ تو نے تو قرآن کی آیات کو بھی اپنے زیر مفاد غلط معنی پہنا دیئے ہیں۔ اپنی زبان سے تو تو خدا کی وحدانیت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن عملی سطح پر اپنے مفاد کے تحت کئی بت پال رکھے ہیں۔ اے عالم بے عمل تو نے حضرت یوسف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حدود و قیود سے آزاد چیزوں کو حدود و قیود کا پابند بنا کر رکھ

دیا ہے۔ تیرا مقصود تو محض یہی ہے کہ منبر پر اپنی رنگین بیانی کے جوہر دکھائے۔ حد تو یہ ہے کہ تو جو نصیحتیں کرتا ہے وہ محض افسانہ خوانی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتیں۔

(46 سے 52) **مطلب:** ان اشعار میں اقبال اپنے عہد کے عالم بے عمل کو مشورہ دیتے ہیں کہ اپنی نمناک آنکھوں کو اس حسن سے آشنا کر جو پروانے کے دل میں اضطراب و تڑپ پیدا کرتا ہے اور جس کے سبب شبنم کو اشک آلودہ ہونا پڑتا ہے۔ تو جس انداز سے کائنات کے معاملات کو دیکھتا ہے وہ قدرت کے مقاصد کی نفی کا حامل ہے حالانکہ خدائے عز و جل نے بالآخر سوچ سمجھ کر انسان کی آنکھوں کو بنایا ہے۔ جمشید نے بے شک جو پیالہ تیار کیا تھا اس کے ذریعے وہ پوری دنیا کے مناظر کو دیکھتا رہا اس کے باوجود وہ حقائق کا نظارہ کرنے سے محروم ہی رہا۔ سو اس عمل سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ سن لے کہ فرقہ آرائی ایک ایسے درخت کے مانند ہے جس کا پھل تعصب کے سوا اور کچھ نہیں! مراد یہ ہے کہ فرقہ بندی سے معاشرے کو توڑ پھوڑ اور منافرت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تفرقہ بازی کے سبب ہی یہ صورت بنی کہ حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے۔ اقبال اس شعر میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ فرشتوں اور آدمؑ کے مابین نفرت کی جو فضا پیدا ہوئی اس کے رد عمل کے طور پر آدم جنت سے نکالے گئے۔ اقبال اگلے شعر میں کہتے ہیں کہ سورج اتنی بلندی پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے باوجود وہ ایک پھول کی پتی کو بھی زمین سے اوپر اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس یہ شبنم ہے جو اڑ کر بلند فضاؤں سے جا ملتی ہے اس لیے کہ وہ بلند فطرت کی مالک ہے۔ مزید یہ کہ اہل محبت کو اپنے زخم بھرنے کی قطعی پروا نہیں ہوتی کہ یہ لوگ تو خود ہی اپنے زخموں کے لیے مرہم پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو کسی بھی دوسرے معالج اور دوا کی حاجت نہیں ہوا کرتی۔ یہ محبت کا شعلہ ہی ہے جو عملی سطح پر نور مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محبت ہے جو ایک معمولی بیج کے طور پر اس امر کی اہل ہے جو طور کے باغات کی تخلیق کرے۔ اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ محبت کے جذبے کی بنیاد پر قلب انسانی عملی طور پر باری تعالیٰ کے نور سے منور ہو جاتا ہے۔

(53 سے 61) **معنی:** داستان درد: درد بھری داساں۔ رشتہ معنی: مدعا کا رشتہ۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال عہد کی صورت حال کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی دکھ ہیں ان کا ازالہ محبت کے جذبے سے ہی ممکن ہے کہ کسی زخم کا حتمی علاج اس کو سلوانے میں نہیں بلکہ مرہم کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور انسانی دکھوں کے زخم کا بہترین علاج محبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرے تخیل کی پرواز جو آسمان تک ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے پھولوں کی ماہیت سے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں۔ بے شک پھولوں کا رنگ تو کسی نہ کسی مرحلے پر اڑ جاتا ہے تاہم ان میں جو خوشبو ہوتی ہے وہ فضاؤں کو اکثر و بیشتر معطر کرتی رہتی ہے۔ میں جو وطن اور اہل وطن کی بے حسی اور بے عملی پر ہر دم گریہ کناں رہتا ہوں وہ ایک فطری امر ہے اس لیے کہ میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہر شاعر کے لیے یہ عمل عبادت سے کم نہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے اس صورت حال کا چرچا کرے۔

اس سارے پس منظر میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب وطن اور اہل وطن کی بے عملی اپنے انتہائی عروج پر ہو تو ایک باشعور اور غیرت مند تخلیق کار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جہاں عزت و آبرو کا تصور ہی مفقود ہو کر رہ جائے وہاں بود و باش اختیار کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ آزادی کے حصول کے لیے محبت بنیادی جذبہ ہے اس کے برعکس جہاں تک نفرت کا تعلق ہے وہ تو اسے

غلامی سے ہمکنار کرتی ہے۔

یہ بے نیازی کا طور ہی ہے جو پیالے کو پانی میں ڈبوئے رکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی ندی میں پانی کے بلبلے اوپر نیچے حرکت کرتے رہتے ہیں لیکن ڈوبتے نہیں تیرے لیے بھی لازم ہے کہ شان بے نیازی اختیار کر لے۔ تو نے تو نفرتوں اور افتراق کے ذریعے خود کو دوسروں سے الگ تھلگ کر رکھا ہے۔ تاہم دنیا میں رہنا ہے تو یہ انداز ترک کر دے اور سب سے مل کر رہ۔ اس لیے کہ محبت و یگانگت کے طفیل ہی نوع انساں خوش حال اور مطمئن رہ سکتی ہے۔ میں جو شراب کے بغیر ہی مست و مخمور رہتا ہوں تو اس کا سبب محبت ہے۔ محبت ہی فی الواقع ایسا جذبہ ہے جس کے سبب ذہنی اور نفسیاتی سطح پر بیمار قومیں شفا پاتی ہیں۔ اور اسی کے سبب ان میں بیداری کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ یہاں اقبال کی مراد یہی ہے کہ نفرت اور افتراق قوموں کو تباہی کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ یہ محبت ہی ہے جو انہیں دنیا میں کامیاب و کامران کرتی ہے۔

(62سے69)

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ محبت ہی اس عالم رنگ و بو میں سب کچھ ہے اور اس سے یہ کائنات قائم ہے۔ یہ درست ہے کہ محبت کسی مرحلے پر صحرا اور ویرانے کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے اور کہیں وطن بھی اس کا مظہر بن جاتا ہے۔ کہیں قفس، کہیں ویرانہ، کہیں آشیانہ اور کسی مرحلے پر چمن کا روپ محبت ہی دھار لیتی ہے۔ محبت ہی وہ جذبہ ہے کہ جو منزل اور کہیں صحرا، کہیں اہل کارواں کے لیے آواز جرس کی مانند تو کہیں رہبری بھی کرتی ہے اور کبھی راہزنی بھی۔

یوں تو سب لوگ محبت کو ایک مرض سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ ایسا مرض ہے جس میں کائنات کے جملہ امراض کا علاج پوشیدہ ہے۔ اس جذبے سے جب دل جلتا ہے تو سراپا نور میں ڈھل جاتا ہے اس لیے کہ یہ ایسا پروانہ ہے جو جل کر شمع محفل کی تقویت کا سبب بنتا ہے۔

محبت تو ایسا حسن ہے جو ہر شے میں نظر آتا ہے۔ دیکھا جائے تو شیریں، کوہ جیتوں اور فرہاد میں بڑا فرق ہے تاہم محبت کے جذبے نے ہی انہی ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا ہے۔ نفرت و افتراق نے ہی قوموں کی بربادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن میرے اہل وطن اس حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں۔ انہیں وطن کی کوئی فکر نہیں۔ یہ داستان درد اور بھی طویل ہو سکتی تھی کہ میرے تخیل میں بڑی وسعت ہے۔ نظم کو وہ نظیری کے فارسی شعر پر ختم کرتے ہیں کہ مضمون کا سلسلہ مختصر نہ ہوتا تھا اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ ایسا بیان تھا جو لامحدود تھا۔ لہٰذا اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ خاموشی اختیار کر لوں۔

نالۂ فراق

(آرنلڈ کی یاد میں)

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں ظلمت شب سے ضیائے روز فرقت کم نہیں

"تا ز آغوش وداعش داغ حیرت چیدہ است
ہمچو شمع کشتہ در چشم نگہ خوابیدہ است"

کشتۂ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یادِ ایام سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں بہر تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

شور لیلیٰ کو کہ باز آرائش سودا کند
خاک مجنوں را غبار خاطر صحرا کند

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟

"تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

*

پانچ بند پر مشتمل یہ نظم اقبال اپنے استاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ کی یاد میں اس وقت لکھی جب وہ 1904ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت ترک کر کے واپس انگلستان چلے گئے۔ وہ 1897ء سے اس کالج میں فلسفے کے استاد تھے۔ لاہور آنے سے قبل پروفیسر ٹامس آرنلڈ علیگڑھ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے۔ جہاں بے شمار طلباء کے علاوہ علامہ شبلی نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ واضح رہے کہ علامہ شبلی بھی بحیثیت استاد اس کالج سے وابستہ تھے۔

پہلا بند معنی: چیدہ است: چنے ہیں۔ شمع کشتہ: بجھی ہوئی شمع۔

مطلب: نظم کے پہلے بند میں اقبال لاہور میں پروفیسر آرنلڈ کی قیام گاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تیرا مکیں بالآخر مغرب میں جا بسا۔ افسوس یہ ہے کہ اس کو مشرق کی یہ سرزمین پسند نہ آئی۔ استاد کی جدائی میں آج مجھے اس صداقت پر پوری طرح سے یقین آ گیا ہے کہ بچھڑنے کے لمحات' رات کی تاریکی سے کسی طور پر بھی کم نہیں ہوتے۔ یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں انسان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا اسی طرح کسی سے جدائی کے لمحات میں بھی دل و دماغ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس بند کے تیسرے شعر سے مراد یہ ہے کہ اپنے عزیز استاد آرنلڈ کی جدائی کے صدمے کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری بینائی

رخصت ہو گئی۔

دوسرا بند معنی: **یادِ ایامِ سلف:** گذرے ہوئے دنوں کی یاد۔

مطلب: دوسرے بند میں فرماتے ہیں کہ میں تو پہلے ہی تنہائی کا مارا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ آبادی سے گھبراتا رہا ہوں۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد سے دل کو تڑپاتا رہتا ہوں۔ اور جب کہیں بھی سکون نہیں ملتا تو اے استاد کی قیامگاہ تیری جانب دوڑتا ہوا آجاتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ تیرے در و دیوار سے میری آنکھیں مانوس ہیں اس کے باوجود تیرے مکین کی عدم موجودگی میں یہاں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

تیسرا بند معنی: **خورشید آشنا:** سورج سے فیض پانے والا۔ **عالم نما:** جس میں سارا جہان نظر آئے۔

مطلب: اقبال تیسرے بند میں کہتے ہیں کہ اپنے استاد کی شفقت اور فیضانِ محبت سے میں ذرۂ ناچیز آفتاب کی مانند تابانی سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ مرا دل لاکھ ٹوٹے ہوئے آئینے کے مانند ہے اس کے باوجود اس امر کا قطعی امکان تھا کہ استاد کی تربیت کے طفیل اس شکستہ آئینے میں ساری دنیا کا نظارہ کر سکوں۔ اس امر کی توقع بھی تھی کہ میری آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل ہو جائے۔ کون جانے کہ میں آئندہ ترقی کر کے کیا سے کیا ہونے والا تھا۔ تیسرے فارسی شعر سے مراد یہ ہے کہ بقول اقبال میں نے ابھی اپنے عظیم استاد سے بہت کچھ سیکھنا تھا کہ وہ داغ مفارقت دے گئے۔

چوتھا بند معنی: **ذروۂ:** کنگرہ یعنی چوٹی، بلندی۔ **بادِ نشاط افزائے:** خوشی بڑھانے والی ہوا۔

مطلب: چوتھے اور پانچویں بند کے اشعار میں اقبال آرنلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علم کو اگر کوہ طور سمجھ لیا جائے تو ذات بھی علم و حکمت کے کلیم کے مانند ہے۔ تیری گفتگو سے میرے علم اور مسرت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ تیرے بغیر تو جیسے حصول علم کا شوق ہی ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے کہ تیری موجودگی کے طفیل ہی میرے سر میں حصول علم کا جنون تھا لیکن تیرے جانے کے بعد تو یہ جنون جیسے ختم ہو گیا۔ اب وہ فضا ہی نہ رہی جس سے علم و حکمت کا چرچا تھا۔ اے محترم استاد تو نہیں تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔

پانچواں بند مطلب: اس بند میں علامہ اپنے عزم اور خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک روز یقیناً ایسا آئے گا جب میں حسب خواہش پنجاب کو چھوڑ کر، اے عظیم استاد پھر تیرے سایہ التفات تک رسائی حاصل کر سکوں گا۔ میری نگاہیں تو یہاں بھی تیری تصویر کو بغور دیکھتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو تیری تصویر اور گفتگو سے حاصل ہوتا تھا۔ میں اس امر کا ادراک تو رکھتا ہوں کہ تصویر قوت گویائی سے محروم ہوتی ہے بالفاظ دگر یہ خامشی ہی عملی سطح پر کسی تصویر کی گفتگو ہوتی ہے۔

چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ہے مگر دریائے دل، تیری کشش سے موجزن

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنج رہ منزل سے تو

آفرینش میں سراپا نور تو‘ ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ! میں جلتا ہوں سوز اشتیاق دید سے
تو سراپا سوز داغ منت خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثال گردش پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو‘ حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفل ہستی میں ہے‘ سوزاں ہوں میں

میں رہ منزل میں ہوں‘ تو بھی رہ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے‘ میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا‘ عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو‘ تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغام اجل
محو کر دیتا ہے مجھکو جلوۂ حسن ازل

پھر بھی اے ماہ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو سے اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں‘ سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے‘ جبیں جس سے تری محروم ہے

*

① سے ④ **معنی: موجزن:** لہریں لے رہا ہے۔ **رنج رہ منزل:** لمبے سفر کی زحمت۔ **آفرینش:** پیدائش کے لحاظ سے۔ **سیہ روزی:** بدنصیبی۔

مطلب: اس نظم میں اقبال چاند سے یوں مکالمہ کرتے ہیں کہ اے چاند! ہرچند کہ تیری آماجگاہ میرے وطن سے بہت دور ہے اس کے باوجود میرے دل میں ہر لمحے تیری کشش موجزن رہتی ہے۔ ذرا مجھے اتنا بتا دے کہ تو کس مقام سے آتا ہے اور وہ کون سی جگہ ہے جہاں جا کر قیام کرے گا۔ تیرے چہرے پر جو زردی پھیلی ہوئی ہے یوں لگتا ہے کہ زیادہ مسافت طے کرنے کے ضمن میں اس کی تھکن سے تیرا چہرہ زرد ہو کر رہ گیا ہے۔ تخلیقی سطح پر بے شک تیرا وجود سراپا نور ہے اس کے برعکس میری ذات اندھیرے کے مانند ہے لیکن جہاں تک بدبختی کا تعلق ہے ہم دونوں میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے کہ دونوں کے مقدر میں جلنے کے سوا اور کیا ہے۔ میں اپنے محبوب کے ہجر میں اور تو اس لیے کبیدہ خاطر رہتا ہے کہ روشنی حاصل کرنے کے لیے تجھے سورج کا شرمندۂ احسان بننا پڑتا ہے۔

⑤ سے ⑦ **معنی: گردش پرکار:** ایک ہی دائرہ میں گھومنا۔

مطلب: بے شک اے چاند! یہ درست ہے کہ جس طرح تیرا سفر ایک دائرے کی طرح محدود ہے تو میری حرکت بھی پرکار کے مانند ہے کہ ایک مقام سے چل کر ادھر ادھر گھومنے کے بعد پھر اسی مقام پر واپس آ جاتا ہوں۔ تو اگر اس کائنات میں سرگرداں ہے تو میں بھی حیرتوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ یہ درست ہے کہ تو اس کائنات میں روشن رہتا ہے جب کہ میں بھی آتش عشق سے جلتا رہتا ہوں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ طویل مسافتوں کے باوجود تو بھی راستے میں سرگرداں ہے اور یہی کیفیت میری بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ تو اس صورت حال پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔

⑧ سے ⑩ **معنی: مہر کا پرتو:** سورج کی روشنی۔ **ماہ مبیں:** روشن چاند۔

مطلب: اے چاند! جان لے کہ اگر تو کسی کو چاہتا ہے تو خود میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اگر روشنی تیرا نور ہے تو میرا عشق بھی نور کے مانند ہے۔ میں جس دنیا میں رہائش پذیر ہوں وہاں میرے گرد و پیش انجمن آرائی کے لیے ہزارہا انسان موجود ہیں۔ مگر بے شمار ستاروں میں گھرا ہونے کے باوجود جس طرح تو بھی خود کو تنہا اور بے مثال محسوس کرتا ہے کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی ہے۔ آفتاب کا طلوع ہونا جس طرح تیرے لیے موت کی مانند ہے اسی طرح خالق کائنات کا جلوہ مجھے اپنے وجود سے غافل کر دیتا ہے۔

(11)

مطلب: اے چاند! تجھ میں اور مجھ میں اگرچہ بہت سی باتیں اور خصوصیات مشترک حیثیت کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود عملی سطح پر تو کچھ اور شے ہے میں کچھ اور شے ہوں۔ یعنی تجھ میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے کہ جو پہلو درد کا حامل ہو اس سے تو واقف نہیں جب کہ میں پوری طرح آشنا ہوں اور یہ بھی جان لے کہ بے شک میں سراپا تاریکی کے مانند ہوں اور تیرا وجود نور اور روشنی کا حامل ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ تو اپنی حقیقت سے بیگانہ ہے جب کہ میں اس کا پورا پورا شعور رکھتا ہوں۔ مراد یہ کہ تو اپنی شناخت سے بیگانہ ہے جب کہ میں اپنے وجود سے مکمل آگاہی رکھتا ہوں۔ میں تجھ پر یوں بھی فضیلت رکھتا ہوں کہ مجھے اپنی تخلیق کے مقصد کا پوری طرح سے علم ہے۔ میری انفرادیت یہی ہے جس سے تجھے محروم رکھا گیا ہے۔

بلالؓ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا   حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی   تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے   کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورت سلمانؓ ادا شناس تری   شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثل کلیمؑ سودا تھا   اویسؓ طاقت دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا   ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید   خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جان نا شکیبا پر   کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دست موسیٰؑ پر
تپش ز شعلہ گرفتند و بر دل تو زدند
چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل تو زدند
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری   کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

*

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ بلال حبشیؓ کا شمار حضور سرور کائنات ؐ کے ممتاز صحابیوں میں ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ مسجد نبویؐ میں باقاعدہ طور پر اذان دیا کرتے تھے۔ تاریخی سطح پر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بڑے خوش الحان تھے۔ علامہ اقبال نے یہ نظم ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ پوری نظم تین بند پر مشتمل ہے جس میں تیرا اشعار ہیں۔

پہلا بند **معنی**: آستاں: چوکھٹ۔

مطلب: اس نظم میں اقبال صحابی رسولؐ مقبول حضرت بلال حبشیؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ تیرے مقدر کا ستارہ ہی چمک اٹھا تھا کہ تو حضورؐ کی دید اور خدمت کے لیے حبشہ سے حجاز میں آبسا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت بلال سیہ فام حبشی ہونے کے باوجود اس قدر خوش الحان تھے کہ سرور کائنات ؐ نے انہیں مسجد نبویؐ میں اذان دینے کی خدمت پر مامور کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ اے بلالؓ حبشی تو جو اپنے وطن میں بے کیف زندگی گذار رہا تھا حضورؐ کی غلامی میں پہنچ کر اس سعادت کا اہل ہوا کہ اس غلام پر ہزار آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ پیغمبرؐ اسلام پر اعدائے دیں کی یلغار اور تجھ پر ظلم و ستم کے باوجود تو نے حضورؐ کے آستانے کو تا زندگی ایک لمحے کے لیے نہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ تو اس رمز سے آگاہی حاصل کر چکا تھا جو محبوب کے عشق میں غیروں کی جو جفائیں برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ اہل دل کے لیے جفا نہیں ہوتیں اس لیے کہ ان کے بغیر محبت میں کچھ لطف حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرا بند **معنی**: **سلمانؓ**: عاشق رسولؐ۔ **مثل کلیمؑ سودا**: حضرت موسیٰؑ کی طرح جنون۔ **اویسؓ**: عاشق رسولؐ۔ **جان ناشکیبا**: بے صبر جان۔

مطلب: اے بلالؓ حبشی! امر واقع یہ ہے کہ صحابی رسولؐ حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح تیری نظر بھی ادا شناس تھی اور حضورؐ کی عظمتوں سے پوری طرح سے آگاہی رکھتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ پیغمبرؐ اسلام کی قربت میں تیرا جذبہ وارفتگی مزید فروغ پاتا تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کو دیدار خداوندی کا جنون تھا اور حضرت اویس قرنیؓ جس طرح نبی اکرمؐ کی زیارت کے لیے ترستے رہے اسی طرح تو نے مدینے کو محض اس لیے نور حقیقت تصور کر لیا تھا مزید یہ کہ اس صحرا کو کوہ طور کی مانند سمجھ لیا تھا کہ حضور سرور کائنات ؐ اس شہر بے مثال میں اقامت پذیر تھے۔ تجھے بیشک حضورؐ کا دیدار حاصل رہا اس کے باوجود تیرا ذوق دید تشنگی محسوس کرتا رہا۔ بے شک وہ دل خوش قسمت ہے جو ہمیشہ عشق رسول مقبولؐ میں تڑپتا رہا۔ عشق رسولؐ نے تیری شخصیت کو اس طرح منور کر دیا تھا کہ تیرا سیاہ رنگ حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا پر خندہ زن رہا۔ تیرا دل شعلے کی مانند تھا اور عشق رسولؐ نے تجھ وہ سوز عطا کیا جو تیرا سرمایہ حیات بن گیا۔

تیسرا بند **معنی**: **یثرب**: مدینہ کی ایک بستی کا نام (مراد مدینہ)۔

مطلب: حضور اکرمؐ کے روئے مبارک کی زیارت تیرے لیے سراسر عجز و انکساری کے جذبے پر مبنی تھا

اور دیکھا جائے تو تیرے لیے یہ عمل سراسر نماز اور سجدۂ خداوندی سے کم نہ تھا۔ تیری اذان محض اذان نہ تھی بلکہ اسے عشقِ محبوب کے لیے ترانے سے تشبیہ دی جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اے بلال حبشیؓ! نماز تو حضورؐ کی زیارت کا بہانہ تھی کہ وہ لمحات کتنے باعثِ رحمت تھے جب حضورؐ یثرب میں مقیم تھے اور عام لوگ ان کی زیارت سے استفادہ کرتے تھے۔

سرگزشتِ آدم

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے — بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں — پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو — دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا — کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی — کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا — چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا — کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں — دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی — پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی — بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم — خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو — جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی — اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر — لگا کے آئنۂ عقل دوربیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو، برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی — کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر — تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

*

دیکھا جائے تو زیرِ شرح نظم میں اقبال نے ایک طرح سے ازل سے ابد تک انسان کے عروج و زوال کی داستانیں رقم کی ہیں۔ انہوں نے پیغمبروں اور بعض دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کی عظمت اور قربانیوں کے حوالے سے ایسے نقشے پیش کیے ہیں جن سے انسانیت کا منظرنامہ ترتیب پاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم تخلیقِ کائنات اور اس کے بعد عہد بہ عہد عروج و زوال کی نشاندہی کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے! علامہ فرماتے ہیں!

① سے ③ معنی: پیمانِ اولیں: پہلا عہد (مراد روزِ ازل) جامِ آتشیں: تیز شراب کے پیالے سے مراد

ب۔ خیال فلک نشیں: آسماں تک پہنچنے والا خیال۔

مطلب: یہاں انسان یوں گویا ہوتا ہے کہ میری وطن سے دوری اور غربت کا احوال سنتا ہے تو سنو! کہ جس مرحلے پر میں نے خالق دو جہاں کی ربوبیت کا اقرار کیا اور میری دانش نے مجھے اپنی حقیقت کے طلسم سے آگاہ کیا تو عجیب کیفیت رونما ہوئی کہ میرا دل جنت کی قیام گاہ سے اکتا کر رہ گیا۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب میرا شعور بیدار ہوا تھا۔ اس لمحے دل میں یہ لگن پیدا ہوئی کہ کائنات کی جملہ حقیقتوں سے آگاہی حاصل کروں! اس لمحے میرا دماغ عرش معلیٰ پر تھا۔

④ سے ⑧ **معنی:** تغیر پسند: بدلنے والا۔

مطلب: انسان کہتا ہے کہ کائنات کی حقیقتوں سے آگاہی کے جذبے کے علاوہ میرا مزاج اس قدر تغیر پسند واقع ہوا تھا کہ میں نے زمین پر پہنچنے کے بعد کسی ایک مقام پر قیام کو گوارا نہ کیا۔ چنانچہ کبھی تو پیغمبر خدا حضرت ابراہیمؑ کا وجود اختیار کر کے بتوں سے کعبہ کو پاک کیا اور کبھی آذر بن کر کعبے کو بتوں سے مزین کر دیا۔ کسی مرحلے پر خدائے لم یزل سے مکالمے کا جنون پیدا ہوا تو حضرت موسیٰؑ کی شکل میں کوہ طور پر جا پہنچا اور کبھی آستین میں نور خداوندی کو چھپا لیا۔ کوہ طور پر ید بیضا کے استعارے حضرت موسیٰؑ کی ذات و صفات کے استعارے بنتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ اپنے ہی عزیز و اقارب نے مجھے صلیب پر چڑھا دیا۔ یہاں اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ بھی آیا جب ایک بار پھر زمین سے پرواز کر کے آسمان کی جانب رخ کیا۔ اس مصرع میں اشارہ سفر معراج کی جانب بھی ہے۔ اس شعر میں پیغمبر آخر الزماںؐ کے غار میں پوشیدہ ہونے کے واقعہ کے ساتھ اس امر کی نشاندہی بھی کہ حضورؐ کے ساتھ ہی نبوت ختم ہوگئی یعنی یہ کہ وہ آخری نبیؐ تھے۔

⑨ سے (13) **معنی:** تہ نگیں: زیر نگیں۔

مطلب: انسان ان اشعار میں یوں گویا ہوتا ہے کہ سرور کائناتؐ کے بعد ہندوستان میں خالق حقیقی کے پیغام کی ترسیل کے لیے کرشن اور مہاتما بدھ جیسے اوتاروں کا روپ دھار لیا۔ اور کبھی یونان کی سرزمین پر سقراط جیسے جراءت مند اور سچ بولنے والے فلسفی کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان میں جب مہاتما بدھ کی حیثیت سے وہاں کے باشندوں نے میری صدا پر لبیک نہ کہا تو پھر میں نے جاپان اور چین جا کر وہاں کے لوگوں کو اپنی تعلیم سے آراستہ کیا۔

کبھی میں نے ایک سائنسدان کی حیثیت سے اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کائنات کا وجود مادہ کے ذریعے عمل میں آیا اور روح کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظر ان لوگوں کے نظریات کی نفی کرتا ہے جو مذہب اور دین پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ تعقل پرست اور مذاہب پر یقین رکھنے والے لوگوں میں جنگ و جدل کا بازار ایسا گرم ہوا جس میں لاتعداد لوگوں کے خون سے زمین سرخ ہوگئی۔ پھر یوں بھی ہوا کہ میں نے ستارہ شناسی اور اس کی حقیقت کے ادراک کے لیے نہ جانے کتنی راتوں تک بیدار رہ کر ریاضت کی۔

14- سے 18 **معنی:** مظاہر پرست: قدرت کے مظاہر کو پوجنے والی۔

مطلب: برنیکس نے جب زمین کی گردش کا انکشاف کیا تو مسیحی پادریوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ اس

لیے اکثر مذاہب کی طرح عیسائی بھی اس عقیدے کے حامل تھے کہ زمین ساکن ہے لیکن برنیکس نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دکھایا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔ پھر جب اس نظریے کی مخالفت میں تلواریں نکل آئیں پھر بھی برنیکس نے مزید تحقیقات جاری رکھیں اور وہ اس نوع کی مخالفت کے روبرو ڈٹ گیا۔

انسان کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے بحیثیت سائنس دان اپنی دانش و جستجو سے یہ راز آشکار کیا کہ اشیا جو فضا میں موجود ہیں وہ اوپر کی طرف جانے کی بجائے زمین کی طرف ہی کیوں راغب ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے میں نے شعاعوں اور برق سے سبق حاصل کر کے بجلی پیدا کی جو ہر طرف روشنی کا ذریعہ بنی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے فہم و ادراک سے میں نے ساری دنیا کو تسخیر تو کر لیا لیکن یہ راز نہ پا سکا کہ ہستی کیا شے ہے؟ لیکن میری ظاہر پرست آنکھ جب حقیقت کو پانے کے قابل ہو سکی تو پتہ چلا کہ حسن ازل اور حقیقت زندگی تو خود میرے دل کے اندر مقام کیے ہوئے ہے۔

ترانہ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں ۔۔۔ سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا ۔۔۔ وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں ۔۔۔ گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو ۔۔۔ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ۔۔۔ ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ۔۔۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔۔۔ صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

*

یہ ترانہ اقبال نے اس وقت لکھا تھا جب وہ ایک وطن پرست انسان کے مانند متحدہ ہندوستان کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے ان کا ذہن ان اشعار میں ہر نوع کے اختلافات اور تعصبات سے پاک نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن میں بنیادی مسئلہ اس وقت صرف اور صرف انگریز کی غلامی کا تھا چنانچہ ان اشعار میں بھی کہیں کہیں اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

معنی: پربت: پہاڑ۔ رشک جناں: جنت سے بڑھ کر خوبصورت۔ آب رود گنگا: گنگا کے دریا کا پانی۔ دور زماں: زمانے کی گردش۔

مطلب: ہندوستان ہمارا ایسا وطن ہے جو ساری دنیا سے اعلیٰ اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ اگر اس گلستان تصور کر لیا جائے تو ہماری حیثیت اس میں مقیم ان بلبلوں کی سی ہے جو خوشیوں کے نغمے گاتی رہ

ہیں۔ اقبال دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ اگر ہم سفر میں یا کسی دوسرے ملک میں ہوں تو بھی دل میں وطن کی محبت موجزن رہتی ہے۔ چنانچہ پردیس میں رہتے ہوئے بھی ہم خون کو اپنے وطن میں ہی محسوس کرتے ہیں۔

یقیناً یہ قابل فخر حقیقت ہے کہ ہمالہ جیسا بلند پہاڑ جس کی چوٹیاں آسمانوں کو چھوتی رہتی ہیں وہ ہمارے محافظ اور پاسباں کی طرح سے ایستادہ ہے۔ ہزاروں ندی نالے وطن عزیز کے طول و عرض میں موجزن رہتے ہیں۔ جن کے سبب یہاں کی سرزمین ایسی سرسبز و شاداب رہتی ہے جو جنت کے لیے بھی باعث رشک ہے۔ اس شعر میں اقبال دریائے گنگا کو مخاطب کر کے استفسار کرتے ہیں کہ کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب ہمارا قافلہ تیرے کنارے پر وارد ہوا تھا۔ واضح رہے کہ علامہ کے آباء و اجداد برہمن تھے اور ہزاروں سال قبل جنوبی ایشیا سے نقل وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا اشارہ اسی واقعہ کی جانب ہے۔

اس شعر میں اقبال اپنے عہد کے مذہبی تعصبات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی مذہب بھی آپس کی دشمنی نہیں سکھاتا بلکہ باہمی سلوک و اتحاد کی تلقین کرتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارا وطن ہندوستان ہے اور ہم سب ہندی ہیں یعنی اس کے باشندے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تم بڑی اور قدیم تہذیبیں جو یونان، مصر اور روم کا طرۂ امتیاز تھیں وہ امتداد زمانہ سے بالا خر بٹ کر رہ گئیں جب کہ آج بھی ہر طرح کے تغیر و انقلاب کے باوجود ہم ہندیوں کا نام و نشان باقی ہے اور ہماری تہذیب ماضی کی طرح زندہ و پائندہ ہے۔ آخر ہم میں کوئی ایسی خصوصیت تو موجود ہے جس کے سبب ہمیں زوال نصیب نہیں ہوا جب کہ گردش دوراں صدیوں سے ہماری دشمن چلی آ رہی ہے۔ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال اپنی داخلی کیفیت کو اشارتاً بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمارا کوئی بھی محرم راز نہیں! نا ہی اس درد سے آگاہ ہے جو ہمارے دل میں چھپا ہوا ہے۔

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا؟ — غربت میں آ کے چمکا، گمنام تھا وطن میں؟
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟ — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں؟
حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی — لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں؟
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی! — پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو — گل کو زبان دے کر تعلیمِ خامشی دی
نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی — چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت — پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو — پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی
یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں، ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں وہ چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

*

اقبال کی یہ نظم اس بلند پایہ امیجری کی مظہر ہے جس نے انہیں ایک بڑے شاعر ہونے کی فضیلت بخشی۔ جگنو بظاہر ایک ننھا سا پرندہ ہے لیکن اقبال نے اس کے وجود کو خوبصورت امیجز کے حوالوں سے جس مقام پر پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ نظم پڑھنے سے ہی ممکن ہے۔ عملاً اس نظم کے تین حصے ہیں۔ فرماتے ہیں:

پہلا حصہ **معنی**: کاشانہ چمن: باغ کا صحن۔ سفیر: ایلچی۔ تکمہ: بٹن۔ حسن قدیم: پرانا حسن۔

مطلب: جب کسی باغ میں جگنو اپنی روشنی سمیت محو پرواز ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پھولوں کی بزم سجی ہوئی ہے اور اس میں جگنو کا وجود ایک روشن شمع کی مانند ہے۔ لگتا ہے کہ یا تو آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ یہاں پہنچا ہے جو چاند کی کوئی کرن جگمگا رہی ہے۔ یا ایسے کہ جس طرح سے دن کا کوئی سفیر رات کی سلطنت میں وارد ہوا ہے۔ ہر چند کہ اپنے وطن میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی لیکن یہاں پہنچ کر اس کی شخصیت چمک اٹھی ہے۔ اس شعر سے مراد یہ ہے کہ دن کے وقت جگنو کے پروں کی روشنی اپنے وجود کا احساس نہیں کرا پاتی جب کہ رات کی تاریکی میں یہ اسے فروزاں کرنے میں مدد دیتی ہے۔

شب کے لمحات میں چمکتے ہوئے جگنو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاند نے اگر قبا پہنی ہوئی ہے تو اس کا کوئی بٹن ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ یا سورج نے اگر کوئی لباس پہنا ہوا ہے تو اس پر پڑا ہوا کوئی ذرہ چمک رہا ہے۔ دراصل یہ محض ایک ننھا سا پرندہ نہیں بلکہ یہ تو حسن قدیم کی ایک ایسی جھلک کے مانند ہے جسے قدرت تنہائی سے نکال کر کسی انجمن میں لے آئی ہو۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ جگنو تو ایک چھوٹے سے چاند کے مانند ہے جس میں تاریکی بھی ہے اور روشنی بھی! ایسا چاند جو اسی سبب کبھی گہن سے باہر نکل آتا ہے اور کبھی گہن میں چھپ جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب جگنو محو پرواز ہوتا ہے تو اس کے ننھے ننھے پروں سے لمحے بھر کو روشنی برآمد ہوتی ہے اور لمحے بھر کے لیے تاریکی پھیل جاتی ہے۔ ہر چند کہ پروانہ بھی ایک کیڑا ہے اور جگنو بھی ایک حقیر سا کیڑا ہے لیکن

صورت یہ ہے کہ پروانے کو تو روشنی کی طلب ہوتی ہے جب کو جگنو سراپا روشنی ہے۔

دوسرا حصہ **معنی: رنگیں نوا:** سریلی آواز۔

مطلب: ان اشعار میں پروانے اور جگنو کے وجود کے حوالے سے مختلف اشیاء کی فطرت کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ قدرت نے دنیا میں ہر شے کو کوئی نہ کوئی خصوصیت عطا کی ہے فرق بس اتنا ہے کہ پروانے کو حرارت بخشی گئی ہے اور جگنو کو روشنی سے نوازا گیا ہے۔ اسی طرح بعض بے زباں پرندوں کو دل موہ لینے والے انداز میں نغمگی کا عمل سکھایا اس کے برعکس پھولوں کو پتیوں کی شکل میں زبان عطا کر کے خاموش رہنے کی تعلیم عطا فرمائی۔

اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ شفق کا نظارہ ہمیں یوں اچھا لگتا ہے کہ اس کی مدت محض چند لمحات تک محدود ہے اور اس کی جو مختصر زندگی ہے وہی اس کا حسن ہے پھر سحر کے لمحات کو بھی اتنا خوبصورت پیراہن عطا کیا کہ اسے ایک دلہن سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ طلوع سحر کا منظر سرخی لیے ہوئے ہوتا ہے اسی لیے اگر اس کو دلہن کو سرخ جوڑے سے تعبیر کیا جائے تو مناسب ہوگا اور اس لباس پر شبنم کے قطرے کو آرسی تصور کر لیا گیا ہے۔

یہی نہیں قدرت نے درختوں کو سایہ عطا کیا اور ہوا کو فضا میں اڑنا سکھایا جب کہ پانی کو روانی بخشی اور موجوں کو اضطراب و تڑپ سے نوازا۔ ان سب حقائق کے باوجود اس امتیاز میں ایک خصوصی بات بھی ہے کہ جگنو کے لیے وہی وقت دن کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہم انسان رات سمجھتے ہیں۔

تیسرا حصہ ۔ **معنی: کسک:** کسک۔ **ہنگاموں کا محل:** شور و غوغہ کا مقام۔

مطلب: اقبال پہلے دونوں حصوں کے اشعار کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مختلف اشیا کی جو امتیازی خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو اس امر کا اندازہ لگانے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی کہ یہ اشیاء عملاً رب کائنات کے حسن کی کرشمہ سازی ہیں۔ فرق بس اسی قدر ہے کہ انسان کو بولنا سکھایا ہے تو غنچے کو چٹکنا! اسی طرح چاند اور شاعر کے دل میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں کہ چاند کی روشنی اور شاعر کے دل کی کسک عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ یہ تو محض ایک ایسا دھوکا ہے جو گفتگو کے انداز سے پیدا ہوا۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مختلف اشیاء کے جو مطالب و معانی وضع کر لیے گئے ہیں وہی عام انسان کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ بصورت دیگر نغمہ جو ہے وہ عملاً بلبل کی خوشبو ہے۔ اور خوشبو پھول کی چہک سے مشابہ ہے۔ گویا بلبل کے نغمے کی وہی حیثیت ہے جو پھول کی خوشبو کی ہے۔

یہ نظم بغور دیکھا جائے تو وحدت الوجود کے فلسفے کی بنیاد بنتی ہے۔ جو آخری دو اشعار میں تو بالکل واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ رب کائنات کی ذات اور اس کا راز بیک وقت مختلف اشیا میں ظاہر ہو کر عام نظروں سے چھپ گیا ہے ورنہ بغور دیکھا جائے تو جو حقیقت جگنو میں چمک اور روشنی بن کر نمایاں ہوتی ہے وہی حقیقت پھول کی خوشبو سے بھی ظاہر ہوتی ہے چنانچہ اس حوالے سے جب ہر شے میں رب ذوالجلال کا نور اور اس کا حسن چھپا ہوا ہے تو پھر اختلاف و افتراق میں پڑ کر نئے جھگڑے کس لیے پیدا کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے مختلف اشیاء کے تقابلی کرداروں کے حوالے سے ایک بڑے مسئلے کا حل پیش کیا ہے۔

صبح کا ستارہ

لطف ہمسائگی شمس و قمر کو چھوڑوں   اور اس خدمت پیغام سحر کو چھوڑوں
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی   اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا، عدم آباد وطن ہے میرا   صبح کا دامن صد چاک کفن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا   ساقی موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی   اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی
میری قدرت میں جو ہوتا، تو نہ اختر بنتا
قعر دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا   چھوڑ کر بحر کہیں زیب گلو ہو جاتا
ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر   زینت تاج سر بانوئے قیصر بن کر
ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبا جاگا   خاتم دست سلیماں کا نگیں بن کے رہا
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست   ہے گہرہائے گرانمایہ کا انجام شکست
زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل   کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل
ہے یہ انجام اگر زینت عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر؟

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں رہوں   کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں
اشک بن کر سر مژگاں سے اٹک جاؤں میں   کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں
جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرہ میں مستور   ق   سوئے میدان وغا، حب وطن سے مجبور
یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو   جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو
جس کو شوہر کی رضا تاب شکیبائی دے   اور نگاہوں کو حیا طاقت گویائی دے
زرد رخصت کی گھڑی عارض گلگوں ہو جائے   کشش حسن غم ہجر سے افزوں ہو جائے
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں   ساغر دیدۂ پرنم سے چھلک ہی جاؤں
خاک میں مل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

*

پہلا حصہ   **معنی:** صبوحی: شراب جو صبح کے وقت پی جاتی ہے۔ قعر دریا: گہرائی۔

مطلب: علامہ اقبال کی یہ نظم عملاً تین حصوں پر مشتمل ہے۔ تینوں حصوں میں "صبح کا ستارہ" عالم یاس میں یوں گویا ہوتا ہے کہ اب تو یہ جی چاہتا ہے کہ سورج اور چاند کی قربت سے دست کش ہو جاؤں اور اپنے طلوع ہونے سے آمد صبح کا جو پیغام دیتا ہوں اس ذمہ داری سے بھی جان چھڑا لوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آسمان پر جو ستاروں کی بستی قائم ہے اس میں رہائش کسی طرح مناسب نہیں اس کے برعکس

یہ جو بلندی ہے اس کی نسبت زمین کی پستی میرے لیے زیادہ مناسب ہے۔ میرا وطن آسمان نہیں بلکہ وہ جہانِ فانی ہے جہاں بعد فنا ہر شخص کا پہنچنا مقدر ہے۔ میری کیفیت تو یہ ہے آمدِ صبح کے ساتھ ہی اپنی عمر طبعی تمام کر کے راہیِ ملکِ عدم ہو جاتا ہوں۔

ہر چند جینا اور مرنا میرا مقدر بن کر رہ گیا ہے یعنی ہر روز طلوع ہوتا ہوں اور دن نکلتے ہی فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہوں۔ اس نوع کی ذمہ داری، عزت اور بلندی آخر کس کام کی کہ تھوڑی دیر چمک کر اپنے وجود سے آشنا کرایا اور بس! ایسی روشنی سے تو بخدا تاریکی ہی برتر ہے۔ ستارہ صبح کہتا ہے کہ اگر میرے میں کچھ ہوتا تو ستارہ بننے کی بجائے سمندر کی تہہ میں موتی بن کر رہنا زیادہ پسند کرتا۔

دوسرا حصہ **معنی**: **زیبِ گلو**: گلے کی زینت۔ **سربانوئے قیصر**: قیصر کی ملکہ۔ **خاتم**: انگوٹھی۔ **گہرہائے گرانمایہ**: قیمتی موتی۔

مطلب: اگر سمندر کی تہہ میں بھی موجوں کے ہچکولوں سے دل گھبراتا تو سمندر کو خیر آباد کہہ کر کسی حسین کے گلے کی زینت بن جاتا۔ اس لیے کہ آسمان کی بلندی پر چمکنے میں وہ لطف نہیں جو کسی حسین کے زیور کی چمک میں ہوتا ہے یا کسی شہنشاہ کی ملکہ کے تاج کی آرائش بننے میں ممکن ہے۔ اس لیے کہ وہ جو دیکھنے میں ایک معمولی پتھر تھا لیکن اس کا نصیب جاگا تو حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی کا نگینہ بن گیا۔

لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی اشیاء بالعموم دنیا میں شکست و ریخت سے دوچار ہو کر رہتی ہیں۔ چنانچہ بیش قیمت اور نایاب قسم کے موتی کا انجام بھی بالآخر ریزہ ریزہ ہوتا ہے۔ بے شک حقیقی زندگی تو وہ ہے جو موت سے آشنا نہ ہو۔ وہ جینا تو لاحاصل ہے جس کا انجام موت ہو۔ اگر کائنات کی زینت بننے کے باوجود انجام بالآخر فنا ہونا ہی ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ شبنم کی طرح پھول پر قربان ہو جاؤں۔

تیسرا حصہ **معنی**: **میدانِ وغا**: لڑائی کا میدان۔ **عارضِ گلگوں**: پھولوں جیسے رخسار۔

مطلب: میں تو خود کو اس امر کا اہل سمجھتا ہوں کہ کسی حسین کے ماتھے کی افشاں کا روپ دھار لوں یا پھر کسی مظلوم کی آہوں میں منتقل ہو جاؤں۔ بعد کے اشعار میں کہا گیا ہے کہ میں کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑوں جس کا شوہر زرہ پہن کر عازمِ جنگاہ ہوا چاہتا ہے کہ حبِ وطن کا تقاضا ہی یہ ہے۔ اس لمحے وفادار بیوی امید و بیم کا شکار ہو اور اس کی خاموشی داخلی جذبوں کی ترجمانی کر رہی ہو۔ شوہر سے فرقت اور جدائی کے باوجود وہ مجسم صبر بنی ہوئی ہو۔

بیوی کا پھول جیسا سرخ و سفید چہرہ شوہر کی جدائی کے غم سے زرد ہو جائے لیکن یہ بھی ہو کہ جدائی کا غم اس کے حسن کی کشش کو دوبالا کر دے۔ وہ کتنا ہی ضبط کرے اس کے باوجود میں آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑوں۔ اس لمحے خاک میں مل کر حیاتِ ابدی حاصل کر لوں کہ سوزِ عشق کا حاصل ہی یہی ہے اور یہی حقیقت میں سارے زمانے پر آشکار کرنے کا خواہاں ہوں۔

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
بندے کلیمؑ جس کے، پربت جہاں کے سینا نوحؑ نبی کا آ کر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

*

چار بند پر مشتمل یہ گیت علامہ اقبال نے ایک قوم پرست شاعر کی حیثیت سے اس صدی کے اوائل میں لکھا تھا جس میں ہندوستانی بچوں کی جانب سے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ "بانگ درا" کی نظمیں چونکہ اقبال کے ابتدائی کلام کی آئینہ دار ہیں اس وقت ہندوستان میں فرقہ پرستی کی لعنت تو بہرحال موجود تھی اس کے باوجود تعصبات کی وہ فضا نہ تھی جو بعد میں پیدا ہوئی اور جس کے سبب قائداعظم، علامہ اقبال اور دوسرے مسلمان رہنماؤں کی جانب سے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا چنانچہ اس گیت کو اسی عہد کے تناظر میں دیکھا جائے جس میں یہ لکھا گیا۔

پہلا بند معنی: چشتیؒ: حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری۔ نانک: سکھ مذہب کے بانی۔

مطلب: ہندوستانی بچے اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے جس سرزمین پر رب ذوالجلال کا پیغام لوگوں کو سنایا، جہاں سکھ مذہب کے بانی گورو نانک نے خدا کی وحدانیت کا درس دیا، مغل اگرچہ پہلے پہل ہندوستان میں محض اس لیے آئے تھے کہ اس کو فتح کر کے اپنا تسلط جما لیں لیکن یہ زمین انہیں اس قدر پسند آئی کہ یہیں پر رچ بس گئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ لوگ جو عارضی طور پر ہندوستان آئے تھے اس کی خوبصورتی اور عظمت کو دیکھ کر انہوں نے مستقل طور پر اسے اپنا وطن بنا لیا چنانچہ یہی وہ سرزمین ہے جو ہمارا وطن ہے اور ہمیں اس پر فخر بھی ہے۔

دوسرا بند معنی: زر: سونا۔

مطلب: ہندوستان کے باشندوں نے علم و حکمت کے وہ جوہر دکھائے جو یونان کے فلاسفروں کو بھی حیرت زدہ کر گئے۔ صرف یونان ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ملکوں کو یہیں سے علم و ہنر کی دولت عطا ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سرزمیں کی مٹی کو بھی قدرت نے سونا بنا دیا تھا مراد یہ کہ یہ مٹی اس قدر زرخیز تھی جس کی پیداوار نے مغلوں کو بے حد مالدار اور خوشحال کر دیا چنانچہ یہی سرزمین ہمارا وطن ہے۔

تیسرا بند معنی: ٹوٹے تھے جو ستارے: مراد ہے پارسی قوم۔

مطلب: ایران سے آنے والے امراء اہل حکمت و دانش اور ہنر مند لوگ ہندوستان میں آکر رچ بس گئے تو انھوں نے وہ شہرت و عزت پائی کہ ان کے علم و حکمت کی روشنی دور دور تک جا پہنچی۔ جہاں کرشن نے وحدت کا درس لوگوں کو دیا اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے جہاں سے ایک طرح کی ٹھنڈی ہوا کی آمد کو محسوس کیا وہی سرزمین ہند میرا وطن بھی ہے۔

چوتھا بند معنی: سفینا: کشتی۔

مطلب: وہ سرزمین جہاں کا ہر شخص حضرت موسیٰؑ جیسی عظمت کا حامل ہے اور جہاں کا ہر پہاڑ کوہ طور کی حیثیت رکھتا ہے (ان مصرعوں کو شعری غلو سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے) حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جہاں آکر ٹھہری تھی اور جس سرزمین کی رفعت آسمان کی ہم پایہ ہے یہاں پر زندگی گزارنا جنت میں گذر بسر کرنے کے مصداق ہے وہی سرزمین ہندوستان میرا وطن ہے۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

*

پہلا بند معنی: صنم کدوں: بت خانہ، مندر۔

مطلب: اقبال کی اس نظم اور بعض دوسری نظموں کے مطالعے سے ہی اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی سطح پر ہی ان کا تخلیقی جوہر نئے خیالات اور اجتہاد سے ہم آہنگ تھا۔ زیر تشریح نظم میں اقبال برہمن سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تو برا نہ مانے تو میں حقیقت کا اظہار کر دوں ہر چند یہ حقیقت قدرے تلخ ثابت ہو گی۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ تو جن بتوں کی پرستش کرتا ہے وہ انتہائی فرسودہ ہو چکے ہیں اور عہد نو میں ان کی حیثیت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ انہی بتوں کی پرستش نے تجھے اپنے جیسے انسانوں سے عداوت رکھنا سکھایا۔ اے برہمن محض تو ہی اس لعنت میں مبتلا نہیں بلکہ واعظ بھی اسی

نوعیت کی تفرقہ بازی اور جنگ و جدل میں مصروف ہے۔ اسی لیے میں نے اس صورت حال سے تنگ آ کر کعبہ و بتخانہ دونوں کو چھوڑ دیا ہے نہ اب میں واعظ کی بات سنتا ہوں نا ہی تیرے اشلوک سننے پر آمادہ ہوں۔ اے برہمن! دراصل تیرا عقیدہ محض یہ ہے کہ پتھر کی ان مورتیوں میں (جن کی تو پرستش کرتا ہے) خدا کا وجود پوشیدہ ہے جب کہ میں اپنے وطن کی خاک کے ہر ذرے کو دیوتا تصور کرتا ہوں۔

دوسرا بند معنی: **غیریت:** غیر ہونا' بیگانہ ہونا۔ **نقش دوئی:** دو ہونے کا نشان۔ **تیرتھوں:** ہندوؤں کا مقدس مقام۔ **کلس:** گنبد کے اوپر کی کلغی۔ **شکتی:** طاقت۔ **شانتی:** تسلی۔ **باسیوں:** بسنے والے۔

مطلب: اے برہمن! آ ہم دونوں مل کر ایک بار پھر نفاق اور تفرقہ بازی کا خاتمہ کر دیں اور اہل وطن جو باہمی نفرت اور نفاق کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں ان کے مابین اتحاد و یگانگت کا جذبہ پیدا کر کے ایک بار پھر گلے ملا دیں۔ اسی نفاق کے سبب دلوں کی بستیاں ویران ہو چکی ہیں۔ آ ان میں ایک نئے شوالہ کی بنیاد رکھ دیں۔ یہ شوالہ ساری دنیا کی عبادت گاہوں سے مرتبے میں بلند ہو۔ اس شوالہ میں سب محبت و آشتی کے نغمات گائیں اور تمام اہل ہند میں محبت و آشتی کی فضا پیدا کر دیں۔ امن و قوت کا تصور ایسے گیتوں میں پوشیدہ ہے جو صلح' آشتی اور محبت و یگانگت سے عبارت ہیں۔

داغ

عظمت غالب ہے، اک مدت سے پیوند زمیں — مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر — چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے — شمع روشن بجھ گئی، بزم سخن ماتم میں ہے
بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں — ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں
چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخی طرز بیاں — آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے — لیلی معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز؟ — کون سمجھے گا چمن میں نالہ بلبل کا راز؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں — اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخی دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے — یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی — سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بتخانے سے — مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت — ہوں گی اے خواب جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی! داغ کو روتا ہوں میں

اے جہان آباد اے سرمایہ بزمِ سخن!
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گُلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ! خالی داغ سے کاشانہ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اٹھ گئے ساقی جو تھے، میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

✽

عملی سطح پر یہ نظم ایک مرثیے کی حیثیت رکھتی ہے جو اقبال نے اپنے استاد اور صاحب طرز شاعر نواب میرزا خاں داغ کے سانحہ ارتحال پر لکھا تھا۔ اقبال نے اس مرثیے میں جہاں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے وہاں داغ کی شاعری اور اسلوب پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ اس اعتبار سے داغ کے بارے میں اقبال کی ایک بے حد اہم اور قابل ذکر نظم ہے۔ فرماتے ہیں۔

پہلا حصہ **معنی:** پیوند زمیں: خاک میں دفن۔ مہدی مجروح: مرزا غالب کا شاگرد۔ مینائے امیر: امیر مینائی کی صراحی۔ زیب دوش: کندھوں کی سجاوٹ۔

مطلب: میرزا اسد اللہ خاں غالب تو ایک مدت ہوئی وفات پا چکے۔ اس کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت ابھی تک زندہ و باقی ہے۔ اسی طرح میرزا غالب کے ایک اہم شاگرد جن کا تعلق دہلی سے تھا وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے۔ اسی طرح موت کا سنگدل فرشتہ میر تقی میر کی روح کو بھی چاٹ گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج بھی ان کی شاعری کا کیف و سرور باقی ہے۔ لیکن آج نواب میرزا داغ کی وفات حسرت آیات کے سبب چمن شاعری ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے کہ ان کی شخصیت بزم شاعری میں ایک روشن شمع کی حیثیت رکھتی تھی جو بجھ کر رہ گئی ہے۔ داغ کا وجود تو ایسا تھا جو باغوں میں چہکتے ہوئے بلبل کا ہوتا ہے۔ دہلی کا یہ صاحب اسلوب شاعر افسوس کہ اسی قبرستان میں پہنچ گیا جہاں دوسرے بڑے بڑے شعراء دفن تھے۔ حیف در حیف کہ استاد داغ بھی چل بسے اور ہم لوگ ان کی میت کو کاندھوں پر اٹھا کر مرحوم کی آخری قیام گاہ تک پہنچا آئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دلی کے یہ آخری صاحب طرز و اسلوب شاعر تھے جو وفات پا کر آج ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

دوسرا حصہ **معنی:** کافورِ پیری: کافور کی طرح بڑھاپے میں سفید بال۔ نشیمن: گھونسلا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ نواب مرزا داغ کی وفات کے بعد اب نہ تو شاعری میں بانکپن رہا نہ طرز بیان کی شوخی رہی۔ ضعیفی کے عالم میں بھی وہ عالم شباب کی زندہ اور پرجوش شاعری کرتے تھے۔ یعنی ان کے کلام میں وہی شوخی اور تازگی تھی جو عہد جوانی کی تخلیقات کا حصہ ہے۔ داغ تو ایسے قادر الکلام شاعر تھے کہ ان کی خیال افروز تخلیقات کی آرزو ہر شعر کہنے والے کے دل میں ہے کہ ہم بھی اس معیار کے شعر کہہ سکتے۔ جو باتیں عام لوگ اپنے دل میں رکھتے تھے وہ داغ کی شاعری میں نمایاں ہو کر بالکل سامنے آ جاتی

تھیں۔ وہ تو ایسے تخلیق کار تھے پھولوں کی خامشی میں جو راز پوشیدہ ہے اس کے بارے میں بادِ صبا سے استفسار کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بلبل جس طرح باغوں میں نالہ و فغاں کرتی ہے اس کا پس منظر مرزا داغ کے سوا اور کس پر منکشف ہو سکے گا؟ وہ تو ایسے شاعر تھے جو اپنی تخلیقات میں حقیقتوں کے اسرار و رموز سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ اگر انہیں ایک پرندہ تصور کر لیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ پرواز کے دوران بھی نظر اپنے نشیمن پر رہتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ شاعری میں بھی داغ ہمیشہ اپنے گردوپیش اور حقائق کو مدنظر رکھتے تھے۔

تیسرا حصہ **معنی**: نکتہ آرا: باریک باتیں کرنے والا۔ **فلک پیمائیاں**: آسمان تک اڑانیں۔ ساحر: جادوگر۔ آزر: حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام۔

مطلب: یہ درست ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں ایسے شاعر اور بھی پیدا ہوں گے جن کی شاعرانہ فکر کی باریکیاں اہل ذوق کے مشاہدے میں آئیں گی۔ ان کی فکر میں بے شک بلندی بھی ہو گی اور ندرت بھی۔ یہ لوگ اپنے عہد کے آشوب اور نامساعد حالات کا تذکرہ کر کے ہمیں افسردہ بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کے تخیل میں جو ایک نئی دنیا آباد ہے۔ اس کا منظر نامہ بھی حسب استطاعت پیش کریں گے۔ بے شک اس دنیا میں آئندہ بھی حافظ شیرازی جیسے بلند پایہ شاعر جنم لیں گے۔ جنہیں بلاشبہ صاحب اعجاز شاعر قرار دیا جائے گا۔ اگر بزم شعر کو ایک بتخانہ تصور کر لیا جائے تو اس میں آزر جیسے کئی صاحب فن بت تراش بھی پیدا ہوں گے۔ اگر اس بزم کو ایک میکدہ سمجھ لیا جائے تو کئی نئے ساقی اپنے پیمانوں سے پینے والوں کو مدہوش کریں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آئندہ آنے والے شعراء اپنے اپنے انداز میں کتاب دل کی تفسیر پیش کریں گے اور جوانی کو اگر خواب سمجھ لیا جائے تو یہی لوگ اس کی تعبیریں بھی کریں گے۔ تاہم دیکھنا یہ ہے کہ عشق و محبت کا حقیقی منظر نامہ بھی کوئی پیش کر سکے گا؟ داغ ہی بلاشک و شبہ ایسے تیرانداز کی حیثیت رکھتے تھے جن کا نشانہ دیکھا جائے تو براہ راست دل ہی ہوتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ نواب میرزا داغ کی شاعری براہ راست دل پر جس طرح سے اثرانداز ہوتی تھی یہ خصوصیت کسی دوسرے شاعر میں ممکن نہیں۔

چوتھا حصہ **معنی**: نظم کے اس حصے میں فی الواقع یہ مرثیہ اپنے پورے کلائمکس پر نظر آتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں استاد کی وفات کا سانحہ ایسا دل خراش ہے کہ اس کے رد عمل کے طور پر اشعار میں اپنے آنسو کاشت کر رہا ہوں یعنی آنکھوں سے برآمد ہونے والے آنسو اشعار کی شکل میں ڈھل رہے ہیں چنانچہ میری طرح اے دلی کی خاک تو بھی اس غم میں آنسو بہا کہ تیری سرزمین تو داغ کا وطن عزیز تھی۔ اے دہلی! تو جو اہل سخن کے لیے عظیم سرمایے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کس قدر الم انگیز یہ حقیقت ہے کہ مرزا داغ کی رحلت سے تیرا یہ بھرا ہوا چمن پامال اور ویران ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ تو ایک رنگین پھول تھا جو خوشبو کی مانند اڑ گیا۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اے کاشانہ اردو (دہلی) تو آج داغ سے محروم ہو گیا۔ تاہم شاید میرزا داغ نے اتنی کشش تیری خاک میں محسوس نہ کی کہ دکن کی خاک ان کی آخری قیام گاہ بنی۔ واضح رہے کہ داغ رہنے والے دہلی کے تھے جب کہ ان کی وفات دکن میں ہوئی۔ اس شعر میں اقبال نے اسی امر کی نشاندہی کی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ دلی کے تمام اہم اور قابل ذکر شاعر تو رخصت ہو چکے اب تو صرف الطاف حسین حالی رہ گئے ہیں جن کو اس محفل کی یادگار کہا جا سکتا ہے۔

مطلب: یہاں اقبال کہتے ہیں کہ موت اس قدر سنگدل واقع ہوئی کہ انسانی خواہشات کی راہ میں ہمیشہ حائل رہتی ہے کہ اس کا تیر تو تاریکی میں ہی اپنے ہدف کو نشانہ بناتا ہے لیکن اس کے خلاف شکایت بھی تو لبوں پر نہیں آسکتی کہ خزاں کے بغیر گلشن کی قدر و قیمت کا اندازہ ممکن نہیں۔ قدرت کا یہ قانون یکسانیت کا حامل ہے کہ پھول کی خوشبو کا اڑنا اور پھول توڑنے والے کی موت کا انداز قریب قریب ایک جیسا ہی ہے۔

ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا — سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا
نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر — ہوائے سرد بھی آئی سوار توسنِ ابر
گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا — عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے — قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے — زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

*

معنی: پہاڑ سربن کا: پہاڑ کی ایک چوٹی کا نام۔ **نشاط مدام:** ہمیشہ کی خوشی۔ **مہر کی گرمی:** سورج کی گرمی۔

مطلب: مشرق کی سمت سے سیاہ بادلوں کی یلغار ہو رہی ہے۔ اس کے سبب سربن پہاڑ یوں نظر آتا ہے جیسے کسی دیو نے کالا لباس پہن رکھا ہو۔ واضح رہے کہ سربن پہاڑ ایبٹ آباد کے قریب واقع ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ علامہ نے یہ اشعار ایبٹ آباد میں ہی تخلیق کیے تھے۔ بادلوں کے سبب سورج چھپ گیا ہے اور سرد ہوا کے جھونکے بھی انہی کے ساتھ برآمد ہوئے ہیں۔ لیکن ان بادلوں میں کوئی گھن گرج نہیں بلکہ خاموشی طاری ہے یہ منظر تو ایک ایسے شراب خانے کا ہے جہاں خلاف معمول ہر جانب سناٹا ہو۔ یہ بادل اگر برسے تو باغ کو سرسبز اور شاداب کر جائیں گے اور نئے نئے پھول کھل سکیں گے۔

جو پھول سورج کی حدت سے مرجھانے لگے تھے وہ ان بادلوں کی سرد ہواؤں کے باعث ازسرِ نو تروتازہ نظر آنے لگے ہیں۔ پہلے محسوس ہوتا تھا کہ یہ مرجھائے ہوئے پھول خاک پر گر کر اپنا وجود کھو بیٹھیں گے لیکن آمد ابر نے ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ تیز ہوا کے سبب بادل اڑنے لگے اور آخر کار ان سے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ جس طرح پہاڑوں کے دامن میں اشجار اور پودے اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ایسے خواب آور موسم میں ان سیاحوں کا بھی مستقل بسیرا ہو جائے جو یہاں سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

ایک پرندہ اور جگنو

سر شام ایک مرغ نغمہ پیرا کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے او مرغ نوا ریز نہ کر بے کس پہ منقار ہوس تیز
تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباس نور میں مستور ہوں میں پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چہک تیری بہشت گوش اگر ہے چمک میری بھی فردوس نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیام بزم ہستی ہے انہیں سے ظہور اوج و پستی ہے انہیں سے
ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

*

زیر تشریح نظم عملاً "جیو اور جینے دو" کے اصول پر مبنی اس نظم میں دو کردار ہیں۔ ایک پرندہ اور دوسرا جگنو! اقبال نے پرندے کے رویے پر جگنو کا جو ردعمل ہے اس کی زبانی اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① سے ③ **معنی**: **نغمہ پیرا**: گانے والا۔ **نوا ریز**: راگ برسانے والا' چہچہانے والا۔ **منقار ہوس**: لالچ کی چونچ۔

مطلب: ایک پرندہ شام کے وقت کسی درخت پر بیٹھا ہوا چہچہا رہا تھا کہ اس کی نظر زمین کی طرف گئی جہاں اس نے کسی چمکتی ہوئی چیز کو دیکھا۔ پرندے کو یقین تھا کہ یہ چمک جگنو کی ہی ہو سکتی ہے چنانچہ درخت سے اڑ کر وہ اس مقام کی جانب آیا کہ جگنو کو ہڑپ کر جائے۔ اس لمحے جگنو نے پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو بے شک ایسا پرندہ ہے جو اپنے نغموں سے چمن میں بہار کا سا سماں پیدا کرتا ہے لیکن کسی کمزور اور ناتواں جگنو پر یوں جھپٹنا تیرا شعار نہیں ہونا چاہیے۔

④ سے ⑧ **معنی**: **بہشت گوش**: کانوں کی جنت یعنی دلکش۔ **فردوس نظر**: بہت خوبصورت۔ **منقار**: چونچ۔

مطلب: اے پرندے! میری بات غور سے سن کہ جس خدا نے چہکنا سکھایا اور پھولوں کو مہک دی اسی خدا نے مجھے بھی روشنی عطا کی ہے۔ میرا لباس تو نور ہی نور ہے یعنی قدرت خداوندی سے میرا جسم سرتاپا روشنی سے مزین ہے اور عملاً دنیا میں جو کیڑے مکوڑے ہیں ان میں میں کوہ طور کی حیثیت کا حامل ہوں

یعنی کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ کو جو روشنی دکھائی دی تھی میں بھی اسی کی مانند ہوں۔ تیری چہک اور نغمے اگر دل موہ لینے والے ہیں تو میری چمک بھی نگاہوں کو بھلی لگتی ہے۔ قدرت نے میرے پروں میں روشنی کے دیئے جلا دیئے ہیں۔ اسی طرح تجھے بھی اس مالک دو جہاں نے دل آویز نغمگی عطا کی ہے۔ چنانچہ اگر تجھے گانا سکھایا گیا ہے تو اس حقیقت کو بھی جان لے کہ میرا وجود اس گلزار میں ایک مشعل کی مانند ہے۔

⑨ سے (12) معنی:۔

مطلب: اے پرندے! اس رب ذوالجلال نے اگر مجھے روشنی بخشی ہے تو تجھے بے شک خوش الحانی عطا کی ہے۔ بالفاظ دگر مجھے غم عشق میں جلنا مقدر کیا ہے اور تجھے نغمگی سے نوازا ہے۔ اس حقیقت کو بھی جان لے کہ اگر میں سوز ہوں اور تیری حیثیت ساز کے مانند ہے تو سوز اور ساز دونوں ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتے۔ کہ یہ دونوں عناصر تو اس کائنات میں ازل سے ہم آہنگ رہے ہیں۔

اے پرندے! یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لے کہ سوز اور ساز یعنی درد اور نغمگی دونوں ہی ایسے عناصر ہیں جن سے زندگی کا وجود قائم و دائم ہے۔ اور انہی سے انسان کے مراتب میں عروج و زوال کا اندازہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ باہمی اتحاد و اتفاق کے طفیل ہی یہ دنیا قائم ہے اور انہی کے سبب یہاں رونق رہتی ہے۔ سو تجھے اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو مجھے بھی جینے دے اسی میں دونوں کا بھلا ہے۔

بچہ اور شمع

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلک پروانہ خو — شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو
یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا — روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا؟
اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے
شمع اک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے — آہ! اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے
دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا — تجھ کو خاک تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیر نقاب آگہی — ہے غبار دیدۂ بینا حجاب آگہی
زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بیہوشی ہے یہ
محفل قدرت ہے، اک دریائے بے پایاں حسن — آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن
حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے — مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں — طفلک نا آشنا کی کوشش گفتار میں
ساکنان صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے — ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

چشمہ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن   شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن!
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس   ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس؟
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے
زندگی اس کی مثال ماہی بے آب ہے

*

اقبال کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے گردوپیش کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کیے۔ یوں ان کی تخلیقات میں کسی نہ کسی سطح پر فکر کی رو موجزن نظر آتی ہے۔ زیر تشریح نظم میں بھی ان کی دوسری تخلیقات کے مانند کچھ ایسی ہی صورت حال کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نظم چار حصوں پر مشتمل ہے جن میں ان کا مکالمہ ایک ننھے بچے سے ہوتا ہے جو شمع کی روشنی کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھ رہا ہے۔ یہ مشاہدہ اقبال کے لیے ایک تخلیقی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ ان کی اس نظم کو اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

پہلا حصہ **معنی:** پروانہ خو: پروانے جیسی خصلت والا۔ گھڑیوں: پہروں تک۔

مطلب: اقبال ننھے بچے سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تجھ میں بھی پروانے کی سی فطرت موجود ہے جو شمع پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بھی سامنے رکھی ہوئی شمع کو مسلسل حیرت کے انداز میں تک رہا ہے۔ تو میری گود میں بیٹھا ہوا مسلسل حرکت کر رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شمع سے ہم آغوش ہونے کا خواہاں ہے۔ شمع کا نظارہ تیرے لیے حیرانی کا سبب بنا ہوا ہے اور تو اس سے یوں متحیر ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسے پہلے یہ نظارہ تیرا دیکھا ہوا ہو اور اب اسے از سر نو شناخت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دوسرا حصہ **معنی:** عریاں: برہنہ۔ خاک تیرہ: سیاہ مٹی۔

مطلب: اے ننھے بچے! میرے نزدیک تو شمع محض ایک شعلہ کی حیثیت رکھتی ہے جب کہ تو سراپا نور کے مانند ہے۔ فرق محض اسی قدر ہے کہ شمع کی روشنی تو صاف نظر آتی ہے جب کہ تجھ میں نور کی جو ضو موجود ہے وہ چھپی ہوئی اور ہر کس و ناکس اس کا نظارہ نہیں کر سکتا۔ نہ جانے قدرت نے شمع کی روشنی کو کیوں عریاں کر دیا ہے اور تیرے نور کو محض تیرے جسم تک محدود کر کے عام نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بے شک تیرا نور فطری ادراک کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور احساس و ادراک کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور احساس و ادراک کا یہی پردہ دیدۂ بینا کے لیے ایک طرح کے غبار کی مانند بن گیا ہے۔ دراصل زندگی کی حقیقت فہم و ادراک میں نہیں بلکہ خود کو بھول جانے کے عمل میں ہے۔ زندگی تو ایک خواب، سرمستی اور اپنے وجود سے بیگانہ ہونے کا نام ہے۔

تیسرا حصہ **معنی:** بے پایاں: بے کنارا۔ ضوگستری: روشنی پھیلانا۔ **طفلک نا آشنا:** بچہ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو عالم ہست و بود ہے وہ حسن و خوبصورتی کے ایسے سمندر کی حیثیت کا حامل ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ لیکن اس کو دیکھنے کے لیے چشم بینا ضروری ہے کہ اس صفت کے حامل فرد کو پانی کی ایک بوند میں بھی حسن کا طوفان نظر آئے گا۔ یعنی حسن ہی حسن چاروں جانب بکھرا ہوا ہے۔

دیکھو تو سہی! حسن ان پہاڑوں میں بھی ہے جن کی چوٹیاں ہیبتناک خاموشی کی مظہر ہیں۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ سورج بھی اسی وقت روشنی دیتا ہے جب رات کی سیاہی اپنا وجود سمیٹ لیتی ہے۔ صبح کے لمحات میں جب آسمان نور اور روشنی کے ساتھ نظر آتا ہے تو یہ بھی حسن کا ایک منظر ہے اسی شفق کا نظارہ اور شام کے لمحات میں وارد ہونے والی تاریکی کو بھی حسن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حسن تو ماضی کی عظمتوں کے ان آثار میں بھی موجود ہے جو اب مٹتے جا رہے ہیں اور وہ بچہ جو بولنے کی سعی کرتا ہے اسے بھی حسن کے ایک منظر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ باغوں میں یک آواز ہو کر جو پرندے چہچہاتے ہیں اور یہی ننھے ننھے پرندے جس طرح اپنے گھونسلے بناتے ہیں اس عمل میں بھی حسن موجود ہے۔ حسن تو پہاڑوں سے برآمد ہونے والے چشموں اور تیز رو دریاؤں کے علاوہ شہروں، صحراؤں، ویرانوں اور پھر آبادی میں غرض ہر جگہ حسن ہی حسن بکھرا ہوا ہے۔ ہر جانب حسن کی اس فراوانی کے باوجود انسانی روح کو نہ جانے کیوں کسی گم ہو جانے والی چیز کی تلاش ہے ورنہ وہ صحراؤں میں اس طرح سے سرگرداں و پریشاں کیوں رہتی۔ انسانی روح حیرت ہے کہ حسن کے اس عام جلوے میں بھی پریشاں نظر آتی ہے۔ اس کا وجود تو ایک ایسی مچھلی کی طرح ہے جسے پانی سے باہر نکال کر پھینک دیا گیا ہو۔

کنارِ راوی

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی ۔ نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو ۔ جہاں تمام سواد حرم ہوا مجھ کو
سر کنارۂ آب رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامن شام ۔ لیے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلہ روز تیز گام چلا ۔ شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی ۔ منار خواب گہ شہسوار چغتائی
فسانہ ستم انقلاب ہے یہ محل ۔ کوئی زمان سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے، سرود خموش ہے گویا
شجر یہ انجمن بے خروش ہے گویا

رواں ہے سینہ دریا پہ اک سفینہ تیز ۔ ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرم ستیز
سبک روی میں ہے مثل نگاہ یہ کشتی ۔ نکل کے حلقہ حد نظر سے دور گئی
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی ۔ ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

*

پہلا حصہ معنی : محو سرود: گانے میں مگن۔ زیر و بم: نیچا اونچا۔ سواد حرم: کعبہ کے آس پاس کی

زمین۔

مطلب: اس نظم کا منظر نامہ دریائے راوی کا کنارہ ہے۔ اس مقام پر کھڑے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ہر جانب شام کا سکوت طاری ہے۔ لیکن دریائے راوی کی موجوں کا شور نغمگی کا آئینہ دار ہے۔ اس لیے جو کیفیت میرے دل کی ہے اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ دریا کی موجوں کا زیر و بم میرے لیے تو سجدے کا پیغام بن گیا ہے۔ میں تو اس عالم جذب میں ہوں کہ ساری دنیا مجھے خانہ کعبہ اور اس کے گرد و پیش سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں بہتے ہوئے اس دریا کے کنارے پر کھڑا ہوں تاہم اپنے خیالات میں اس قدر مگن ہوں کہ یہ بھی نہیں جانتا کہاں کھڑا ہوں۔

دوسرا حصہ **معنی:** **دست رعشہ دار:** کانپا ہوا ہاتھ۔ **عظمت فزائے تنہائی:** تنہائی کی عظمت بڑھانے والے۔ **خواب گہ:** سونے کی جگہ مراد مزار۔ **شہسوار چغتائی:** مراد جہانگیر بادشاہ۔

مطلب: ان لمحات میں شفق کی سرخی شراب کی مانند شام کے دامن کو رنگین کر گئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قرن ہا قرن سے گردش میں رہنے والے بوڑھے آسمان کے رعشہ زدہ ہاتھ میں شراب کا یہ جام آ گیا ہے۔ دن کا قافلہ عدم کی جانب تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے۔ مراد یہ ہے کہ آمد شام کے ساتھ دن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے جو شفق پھولی ہوئی ہے اس کے لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس کی نوعیت تو سورج کے پھولوں کی طرح ہے۔ یعنی سورج کا سفر ختم ہو گیا ہے۔

اس منظر نامے میں شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے مینار اپنی عظمت و شان کے ساتھ اس کنج تنہائی میں ایستادہ ہیں۔ یہی وہ مقبرہ ہے جہاں شہنشاہ جہانگیر ابدی نیند سویا ہوا ہے۔ یہ مقبرہ دیکھا جائے تو انقلابات زمانہ اور ان کے ظلم و ستم کا مظہر ہے یہی نہیں بلکہ اسے زمانہ ماضی کی تاریخ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ مقبرہ تو حقیقت میں ایک خاموش نغمے کی طرح ہے اور یہاں جو درخت موجود ہیں وہ ایسی محفل کی طرح ہیں جہاں کسی ہنگامے کا عمل دخل نہ ہو۔

تیسرا حصہ **معنی:** **سفینہ:** کشتی۔ **سبک روی:** تیز رفتاری۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ سامنے دریا میں ایک تیز رو کشتی رواں دواں نظر آ رہی ہے جس کا ملاح لہروں اور تند و تیز موجوں سے بچاتا اسے منزل مقصود کی جانب لیے جا رہا ہے۔ انسانی نگاہ کی رفتار جس قدر تیز ہے اسی رفتار سے آگے بڑھتی ہوئی یہ کشتی بالاخر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

دریائے راوی کے کنارے اور اس کے گرد و پیش کا مشاہدہ کرتے ہوئے اقبال اسے انسانی وجود سے یوں مربوط کرتے ہیں کہ جس طرح یہ کشتی دریائے راوی میں تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے بالکل یہی کیفیت انسان کی ہے کہ اپنی طبعی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی ہر چند کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تاہم فنا نہیں ہوتا۔ مراد یہ کہ اس کی روح بے شک غائب ہو جاتی ہے تاہم وہ مرتا نہیں بلکہ ایک طرح کے منظر سے پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ ایک بڑے تخلیق کار کا کمال ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کے بطن سے بعض ایسی مطلق حقیقتیں برآمد کرتا ہے جن تک کسی دوسرے کی رسائی بلا شک و شبہ نہیں ہوتی چنانچہ یہی امر اقبال کی عظمت اور بڑائی کا بین ثبوت ہے۔

التجائے مسافر

(بہ درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ، دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا — بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم — نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی — مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی — بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا
اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم، گل بہار توام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل — ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھکو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھکو
نظر ہے ابر کرم پر، درخت صحرا ہوں — کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھکو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھکو
مقام، ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھکو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھکو
دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر — تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھکو
بنایا تھا جسے چن چن کے خار و خس میں نے — چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھکو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھکو
وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی — رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں! — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو
وہ میرا یوسف ثانی، وہ شمع محفل عشق — ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھکو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو — ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھکو
ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں — کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جان جاں مجھکو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

*

اقبال کی اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ یورپ روانگی سے قبل وہ دہلی تشریف لے گئے جہاں انہوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دی۔ چنانچہ یہ اشعار انہی کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے ہم سب آگاہ ہیں کہ اقبال ان صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کا ہمیشہ احترام کرتے تھے جو فی الواقع اپنے مراتب اور درجات کے اعتبار سے قربت خداوندی کے اہل تھے۔ چنانچہ یہ نظم التجا اور دعائیہ

لہجے میں کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی: **نظامِ مہر:** سورج کا نظام۔ **گُل بہارِ توام:** تیری بہار کا پھول ہوں۔

مطلب: اے عالی مرتبت! (نظام الدین اولیاء) بے شک تو اتنا عظمت والا ہے کہ فرشتے بھی تیرا نام ادب و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ تیرا دربار بھی بڑی عظمتوں کا حامل ہے جہاں سے ہر کہ و مہ کو فیض حاصل ہوتا ہے۔ جو حاملانِ عشقِ حقیقی ہیں ان کا وجود تیری کشش کے سبب بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جس طرح آفتاب طلوع ہونے پر ساری کائنات کو روشنی عطا کرتا ہے اسی طرح تیری شخصیت بھی روشنی پھیلانے کا سبب ہے۔ آج تیری بارگاہ میں حاضری دی ہے تو یوں لگتا ہے کہ دل و دماغ کو روشنی حاصل ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک حضرت عیسیٰؑ اور حضرت خضر علیہ السلام سے بھی تیرا مقام بلند ہے۔ تو نے ربِ ذوالجلال سے ایسی لو لگائی ہے کہ اس نے بھی تجھے اپنے محبوب ہونے کا مرتبہ عطا کیا چونکہ تو رب العزت کا محبوب ہے اس لیے تیری شان بھی بلند ہے اور اسی باعث تو واجب الاحترام بھی ہے۔ لہٰذا اگر میں بدنصیب اور سیاہ قلب ہوں تو تیرے باغ میں موجود لالے کے پھول کے داغ کی مانند ہوں اور اگر خوش بخت ہوں تو تیرے چمن میں لہلاتے ہوئے پھول کی مانند ہوں مراد یہ ہے کہ میں جیسا بھی ہوں تیرا ہی معتقد ہوں۔

دوسرا حصہ معنی: **نکہتِ گل:** پھول کی خوشبو۔ **فلک نشیں:** آسمان کی بلندی۔ **نردباں:** سیڑھی۔ **خار و خس:** گھاس پھوس۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ اے محبوبِ الٰہی! کہ جس طرح چمن سے خوشبو رخصت ہوتی ہے اسی طرح میں اپنے وطن کو الوداع کہہ رہا ہوں۔ وطن سے دوری میرے صبر کا بے شک امتحان ہے جس میں اپنے آپ کو میں نے خود ہی ڈال لیا ہے۔ یہ تحصیلِ علم کا شوق ہی ہے جو مجھے اپنے خوبصورت وطن سے دور بلادِ غیر میں لے جا رہا ہے۔

اے محبوبِ الٰہی! میرا وجود تو صحرا میں استادہ ایک ایسے خودرو شجر کی طرح ہے جس کی نظر ہمیشہ ابرِ کرم پر ہوتی ہے اور جسے کسی نوع کی غور و پرداخت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا وجود اس عہد میں ایک ایسے فرد کی مانند ہے جس کی نگاہ ہمیشہ آسمان کی بلندی کی جانب ہوتی ہے تاہم تیری ایسی دعا کا طالب ہوں جس کے سبب مجھے وہ راستہ مل جائے جو منزل تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

میرا مقام دوسرے لوگوں سے اس قدر آگے ہو کہ وہ اس مقام کو منزلِ مقصود سے تعبیر کر سکیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں اپنے قلم سے جو تحریر بھی لکھوں وہ کسی کی دل گرفتگی کا سبب نہ بنے اور نا ہی خود مجھ کو اس بھری پری دنیا میں کسی سے شکایت ہو۔ تیری جناب سے مجھے اپنی فریاد میں وہ اثر حاصل ہو جائے جو دلوں کو برنا کر رکھ دے۔ میں نے جس محنت و کاوش سے اپنا گھر بنایا تھا خدا کرے وطن واپسی پر میں اسے اسی طرح آباد و کامراں دیکھ سکوں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جب میں یورپ سے تحصیلِ علوم کے بعد واپس وطن آؤں تو اپنے باپ اور ماں کے قدموں پر اپنی پیشانی رکھ سکوں کہ انہی کے طفیل مجھے محبت و شفقت کے رازہائے درونِ پردہ کا علم حاصل ہوا ہے۔ بعد کے تین اشعار میں اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے خاندان کا وہ چراغ جس کا گھر میرے نزدیک کعبہ کے مانند ہے اس کی عنایت

وقدردانی نے مجھے علم و فضل کے جواہر سے آراستہ کیا۔ ان کے لیے دعا گو ہوں کہ وطن واپسی پر اپنے استاد کو خوش و خرم اور خوشحال دیکھوں۔

اس نظم کے باقی چار اشعار میں سے تین اشعار میں اقبال اپنے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا بھائی مجھے حضرت یوسفؑ کی مانند عزیز ہے اس لیے کہ وہ مجھ سے عشق کی حد تک چاہت رکھتا ہے اور جس کی محبت میرے لیے ہمیشہ سکون قلب کا باعث رہی ہے جس نے میری پرورش کے دوران اپنے لیے عیش و آرام کو حرام سمجھا۔ وہ مجھے بے شک جان و دل سے زیادہ عزیز ہے۔ میری دعا ہے کہ میرا یہ بھائی اس دنیا میں ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ آخری شعر میں اقبال یوں دعا کرتے ہیں کہ میرے دل کی کلی کھل کر پھول بن جائے اور مسافرت کے دوران دعائیہ انداز میں جو التجائیں کی ہیں اے محبوب الٰہی! تیرے توسط سے ان کی پذیرائی ہو۔

غزلیات

(حصہ اول)

اس حصے میں اقبال کی محض تیرہ غزلیں شامل ہیں جن کا تعلق ابتدائی دور کی شاعری یعنی 1904ء تک ہے۔ اقبال نے بعد میں جو غزلیں کہیں وہ "بانگ درا" اور دوسرے مجموعوں میں اسی ترتیب کے ساتھ شامل ہیں۔

غزلیات

(حصہ اول)

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ　　دم دے نہ جائے، ہستیِ ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں　　تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

چار اشعار پر مشتمل علامہ اقبال کی یہ غزل حصہ اول کی ان تیرہ غزلوں میں سے پہلی غزل ہے جو علامہ کے ابتدائی کلام سے تعلق رکھتی ہے۔ حصہ اول کی ان غزلیات کے بارے میں اسی قدر کہنا کافی ہو گا کہ یہ غزلیں اقبال کی بعد کی غزلوں سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح کہ بال جبریل اور ضرب کلیم کی شاعری "بانگ درا" سے مختلف ہے چنانچہ زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال فرماتے ہیں۔

① **معنی:** گلزار ہست و بود: دنیا کے باغ۔

مطلب: کہ فنا و بقا سے مربوط دنیا کو اے باشعور انسان اجنبیوں اور بیگانوں کے انداز میں نہ دیکھ! یہ تو ایک ایسا عالم رنگ بو ہے جسے بار بار دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کے جملہ عناصر پر غور و خوض ہی لطف و مسرت کا سبب بن سکتا ہے۔

② **معنی:** شرار: مراد ناپائیدار ہستی۔

مطلب: غزل کے دوسرے شعر میں بھی انسان کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں تیرا وجود ایک ایسی چنگاری کے مانند ہے جس کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے بے شک تیری زندگی ہی بہت کم ہے ایسا نہ ہو کہ یہ زندگی تجھے فریب دے جائے اور تو اپنے حقیقی مقاصد کی تکمیل سے محروم رہے۔

③ **مطلب:** یہ شعر پہلے دو اشعار سے خاصا مختلف ہے۔ اس میں اقبال اپنے محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک میں تیرے التفات و توجہ کے قابل نہیں۔ پھر بھی میرے شوق اور انتظار کی کیفیت ایسی نہیں کہ بے اعتنائی برتی جا سکے۔

④ **مطلب:** اس امر میں شک کی گنجائش نہیں۔ جلوۂ محبوب کا نظارہ کرنے کے مذاق و شوق نے تیری آنکھیں کھلی رکھیں ہیں چنانچہ اگر اب مجھے ہر گلی کوچے میں نقش کف پائے یار نظر آ جائے تو پھر کوئی حیرت کی بات نہیں۔

(2)

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟
کھنچے خودبخود جانب طور موسیٰؑ — کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

*

① **معنی:** تکرار: اصرار۔ عار کیا تھی: کیا مضائقہ تھا۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں محبوب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ میری دعوت پر بے شک تو نہ آتا نہ ہی ہمیں اس پر کسی بحث و تمحیص کی ضرورت تھی تاہم دل رکھنے کے لیے محض وعدہ ہی کر لیتا تو اس میں کیا قباحت ہوتی۔

② **مطلب:** اس شعر میں اپنے محبوب سے عاشق کہتا ہے کہ میں نے تو تمام معاملات عشق کو دوسروں سے پوشیدہ رکھا تھا اگر اس راز پر سے پردہ اٹھا تو اس کا ذمہ دار تیرا قاصد ہے۔ اس ضمن میں مجھے کسی طرح بھی خطاکار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس شعر میں "بندے اور سرکار" کی رعایت قابل ذکر ہے۔

③ **معنی:** تاڑا: پہچان لیا۔

مطلب: اے محبوب! تو نے تو بھری محفل میں سب کو نظرانداز کر کے صرف اور صرف اپنے عاشق کو ہی تاڑ لیا بے شک تیری آنکھیں مستی اور سرشاری کے باوجود بہت ہوشیار ثابت ہوئیں۔ عاشق کو تاڑنے کا عمل اس حقیقت کا مظہر ہے۔

④ **مطلب:** اس شعر میں عاشق اپنے محبوب کے پاس جانے والے قاصد سے استفسار کرتا ہے۔ بے شک تیرے کہنے کے مطابق اس نے میری دعوت کے بارے میں تامل سے تو کام لیا مگر اتنا ضرور بتا دے کہ اس کے انکار کا انداز کیا تھا۔ تاکہ حقیقت حال کا اندازہ کیا جا سکے۔

⑤ **مطلب:** اس شعر میں اقبال خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ جانے کس جذبے کے تحت کوہ طور کی جانب کھنچتے چلے گئے۔ شاید یہ تیرا جلوہ دیکھنے کی کشش ہی تھی کہ انجام و عواقب سے بے نیاز ہو کر برق طور کی پروا بھی نہ کی۔

⑥ **معنی:** فسوں: جادو۔

مطلب: اے اقبال! اتنا بتا دے کہ تیری گفتگو میں کونسا سحر پوشیدہ تھا کہ محبوب کی بزم میں اب ہر لمحے تیرا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے۔ مراد یہ ہو سکتی ہے کہ اقبال کی شعری صلاحیتوں سے ان کا محبوب اس قدر متاثر

ہے کہ ہر لمحے اس کی بزم میں ان کی شاعری کا چرچا ہی ہوتا رہتا ہے۔

(3)

عجب واعظ کی دینداری ہے یا رب عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں کہاں جاتا ہے' آتا ہے کہاں سے؟
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے! چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
ہم اپنی دردمندی کا فسانہ سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز اذاں سے

٭

① **مطلب:** واعظ جو بزعم خود نیکی و پارسائی اور اخوت و مساوات کا دعویدار بنتا ہے جب کہ اس کا ذاتی کردار قطعی مختلف ہے۔ اس کے قول و فعل میں تضادات کا یہ عالم ہے کہ ہر نوع کی دینداری کے دعووں کے باوجود عملاً اسے اپنے سوا سارے جہان کے لوگوں سے عداوت ہے بالفاظ دگر اس کے دل میں نفرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

② **مطلب:** آج کی دنیا میں بے شک عقلی اور ذہنی سطح پر انسان بے حد ترقی کر چکا ہے۔ بڑے بڑے سائنسدانوں اور موجدوں نے حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کی ہیں تاہم اب تک اس حقیقت کو کوئی بھی نہیں جان سکا کہ یہ جو انسان دنیا میں آتا ہے کہاں سے آتا ہے اور آخر کار جاتا کہاں ہے؟ یعنی تمام تر ذہنی اور شعوری ارتقاء کے باوجود انسان کی حقیقت ابھی تک پوشیدہ ہے۔

③ **مطلب:** یہ نظام قدرت ہے کہ شب کی سیاہی بھی اسی قوت کی ودیعت کردہ ہے جس نے ستاروں کو روشنی عطا کی ہے یعنی یہ رب ذوالجلال کے احکام کا کرشمہ ہے کہ تاروں کو روشنی بھی انہی کے تحت ملتی ہے اور رات کو تاریکی بھی وہیں سے فراہم ہوتی ہے۔

④ **مطلب:** ہم اس قدر درد مند واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے رازوار لوگ ہی اس ہمدردانہ رویے کا احوال بیان کرتے ہیں جو ہمارا دوسروں کے ساتھ رہا ہے جب کہ ہم اسے فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔

⑤ **معنی:** چالیں: مکاریاں۔

مطلب: اس شعر میں اقبال واعظ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اس قدر چالاک و عیار شخص ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی کانپنے لگ جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ عمل محض دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

(4)

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے | بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لیے
وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے | میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لیے
آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و در ملت سے تری | ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے
دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں | لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لیے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو | آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے
پاس تھا ناکامی صیاد کا اے ہم صفیر | ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کے لیے؟

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

*

① **مطلب:** اس غزل کا مطلع اگر کلاسیکی روایت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی لیکن اقبال کی تخلیقی اپج کے حوالے سے جب اس کا جائزہ لیا جائے تو بقول اقبال اپنے گھر کی تعمیر کے لیے ایسے افراد کو جمع کر رہا ہوں جو ہمت اور پامردی کے ساتھ ان عناصر کے خلاف صف آرا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو اس گھر کی تخریب کے درپے ہیں۔ دوسرے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ میری محرومی کا یہ عالم ہے کہ میں نے اپنا آشیانہ بنانے کے لیے جس شاخ کا انتخاب کیا تھا فلک کج رفتار نے اسی شاخ کو مشق ستم بنایا۔

اس شعر میں اقبال افراد کی وسعت قلبی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اگر ہم سب مذاہب کو ایک ہی نظر سے دیکھیں تو اختلاف اور تفرقہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس غزل کا چوتھا شعر بھی معنوی سطح پر مطلع کے مماثل ہے اس لیے اس کی تشریح بھی پہلے شعر کے مانند ہو گی۔ یہ عجیب بات ہے کہ غزل کا اگلا یعنی پانچواں شعر قدرے یہی مفہوم لیے ہوئے ہے جو مطلع اور چوتھے شعر کا ہے۔

معنی: ہم صفیر: ہم آواز' ہم نوا۔

مطلب: دراصل یہ پوری غزل ہی کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار میں جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ بھی روایتی ہیں۔ چھٹے شعر میں اقبال اپنے کسی دوست کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ فی الوقت مجھے اپنے دشمن کی ناکامی کا پاس تھا ورنہ کسی پرندے کی طرح میں محض ایک دانے کی خاطر اپنی آزادی سے کیوں محروم ہوتا۔ آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ میرے وطن کی حالت زار ایسی ہے کہ یہاں آزادی کے ترانے الاپنا بے معنی سی بات ہے۔

(5)

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟ | اور اسیر حلقہ دام ہوا کیونکر ہوا

جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا؟

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا؟

ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا
مرغ دل دام تمنا سے رہا کیونکر ہوا؟

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا؟

حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا؟

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے درد فراق
چارہ گر دیوانہ ہے' میں لادوا کیوں کر ہوا؟

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا؟

پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ' کیا ہوا؟ کیونکر ہوا

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا؟

✽

① **معنی:** حلقہ دام: حرص کے جال میں پھنسا ہوا۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال حضرت آدمؑ کے حوالے سے جنت سے نکالے جانے والے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کا حقیقی وطن تو جنت ہی تھا لیکن وہاں سے جس طرح اسے نکالا گیا اس کے بارے میں حقائق کا اظہار میرے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ بھی بتانا ممکن نہیں کہ زمین پر پہنچ کر انسان حرص و ہوس کے چنگل میں کیسے پھنس گیا۔

② غزل کے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ جب سارا زمانہ انسان کو برا سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ مقام حیرت ہے کہ رب العزت نے اسے اشرف المخلوقات کا خطاب کیوں عطا کیا۔

③ اس شعر میں واقعہ طور کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر خداوند عزوجل سے اس کا جلوہ دکھانے کا جو تقاضا کیا تھا اور کہا تھا "رب ارنی" یعنی اے خدا اپنا جلوہ دکھا دے! تو خدا کی جانب سے اپنے پیغمبرؑ کو جواب ملا تھا کہ "لن ترانی" اے موسیٰؑ تو میرا جلوہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا چنانچہ ہوا بھی یہی کہ حضرت موسیٰؑ کے اصرار پر خدا نے اپنا جلوہ دکھایا تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جلوہ دیکھنے اور دکھانے کا معاملہ کس طرح سے طے ہوا اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

④ قلب انسان ہمیشہ آرزوؤں اور تمنا کا مسکن رہا ہے تاہم اگر انسان اس امر کا خواہاں ہو کہ اس کا دل ہر آرزو اور تمنا سے بے نیاز ہو جائے تو یہ امر کی آرزو اور تمنا کے مترادف ہے۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ قلب انسان آرزوؤں اور تمناؤں سے خالی ہو جائے۔

⑤ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جو نیک بندے معرفت الٰہی کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ تو دنیا میں بھی خدا کا جلوہ کسی نہ کسی طور دیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ خدا نے قیامت کے روز اپنا جلوہ دکھانے کا جو وعدہ کیا ہے یقیناً صبر آزما ہونے کے ساتھ فہم انسانی سے بالاتر ہے۔

⑥ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے ہزار پردوں میں خود کو چھپانے کے باوجود اپنی صفات کے حوالے سے ظاہر اور نمایاں کر دیا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ حسن کامل ہے اور حسن کامل پردوں میں چھپا

نہیں رہ سکتا۔

⑦ محبوب سے ہجر و فراق کا مداوا بے شک میرے چارہ گر کے نزدیک کچھ نہ ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موت اس کا حقیقی مداوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ موت کے ساتھ ہی ہجر و فراق کا مسئلہ بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

⑧ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ دیدۂ عبرت سے دیکھا جائے تو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوگی کہ پھول پیدا تو مٹی سے ہوتا ہے اس کے باوجود اس کی پتیاں خوش نما رنگوں کی حامل ہوتی ہیں۔ یعنی انسان کی صحبت کتنی ہی بری ہو اس میں اچھا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

⑨ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو انسان کے گناہ و ثواب کا معاملہ ہے تو اس کا مقصد اس کی رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جب کہ خدا علیم و بصیر ہوتے ہوئے اس امر سے پوری طرح آگاہی رکھتا تھا کہ انسان سے جملہ گناہ ثواب کیسے اور کیوں سرزد ہوئے۔

⑩ اپنے محبوب سے ملاقات کے لمحات کا اندازہ تو دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے کہ میں اس پر کس طرح سے مرمٹا۔ یہ کیفیت زبان سے بیان کرنا ممکن نہیں۔

(6)

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا' نرالے میرے نالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

*

① اس غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو حاملانِ عشق و محبت ہیں اپنی وضع قطع کے اعتبار سے انہوں نے خود کو باقی دنیا کے لوگوں سے الگ تھلک کیا ہوا ہے ان کو دیکھنے پر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ جانے یہ لوگ کس دنیا کے باشندے ہیں؟ کہ ان کے طور طریقے تو دوسروں سے قطعی طور پر مختلف نظر آتے ہیں۔

② معنی: نوکِ سوزن: سوئی کی نوک۔

مطلب: اپنے دکھ درد کے علاج کے دوران میں اس لذت کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو درد میں ہوتی ہے۔ اسی سبب اپنے پاؤں کے آبلوں میں سے کانٹے نکالنے ہوں تو اس کے لیے بھی سوئی کا استعمال کرتا

ہوں جس سے تکلیف تو بے شک ہوتی ہے لیکن اس میں بھی یک گونہ لذت کا احساس ہوتا ہے۔

③ اے خدائے ذوالجلال! تجھ سے بس اتنی دعا ہے کہ میری آرزوؤں اور تمناؤں کو پھلا پھولا رکھ! اس لیے کہ ان کی پرورش کے لیے میں نے اپنا خون دیا ہے۔

④ راتوں میں جب میں ستاروں کو سناٹے کے عالم میں خاموش دیکھتا ہوں تو یہ صورت حال میرے لیے دل شکستگی اور آہ و زاری کا سبب بن جاتی ہے۔ میرے نزدیک ستاروں کی یہ خامشی کسی دکھ کے سبب ہے یہی وجہ ہے کہ میری سوچ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے کہ اظہار عشق میں میں بھی ہائے وائے کرنے کی بجائے خامشی کا قائل ہوں۔

⑤ **معنی:** خانماں برباد: اجڑے گھروالا۔

مطلب: حقیقت یہ ہے کہ میری تباہی میں کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں۔ اس کے برعکس میں نے تو خود ہی اپنے آپ کو تباہ و برباد کیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے لیے سینکڑوں ٹھکانے بنائے اور بعد میں خود ہی ان کو نذر آتش کر دیا۔ یہ بربادی تو خود لذتیت کی مظہر ہے۔

⑥ غزل کے اس شعر میں اقبال انسان کی عمر فانی کے اختصار کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے ایک چنگاری کے مانند قرار دیتے ہیں کہ جس طرح آگ کی ایک چنگاری لمحے بھر کے لیے اپنے وجود کا احساس دلا کر پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں وہ چنگاری کو خطاب کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ جب ہم انسان اور تو یکساں خصوصیت کے حامل ہیں تو تیرے لیے یہ لازم نہیں کہ ہم سے بیگانگی کا اظہار کرے۔ تیری اور ہم انسانوں کی عمر قریب قریب یکساں ہی ہے۔

⑦ اقبال یہاں کہتے ہیں کہ یہ حضرت واعظ جو بظاہر سیدھے سادے اور بھولے بھالے نظر آتے ہیں عملاً یہ بڑے چالاک اور کائیاں ہیں ان کے ذہن میں تو ہر لمحے جنت کی حوروں کا تصور رقصاں رہتا ہے اور حوروں کے اس تصور نے ہی عملی سطح پر انہیں دنیاوی مسائل کے بارے میں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ ان کی یہ جو خاموشی ہے وہ ایک طوفان کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

⑧ غزل کے مقطع میں اقبال خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے اشعار مجھ کو اتنے پیارے اور جان و دل سے زیادہ عزیز کیوں نہ ہوں اس لیے کہ یہ تو میرے دل شکستہ کے درد انگیز نالوں کی مانند ہیں یعنی مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کا اظہار اپنے اشعار میں کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اشعار کو بے حد عزیز رکھتا ہوں۔

(7)

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن دیکھے مجھے کہ تجھ کو، تماشا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق' ہم نشیں! پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی
اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

*

① **معنی**: وا کرے: کھولے۔

مطلب: زیر تشریح مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اس عالم کون و مکاں پر نظر ڈالنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا اس مقصد کے لیے تو لازم ہے کہ اس نگاہ سے دیکھا جائے جو باطن میں بھی اتر جاتی ہے۔ مراد یہ کہ دنیا پر محض نگاہ غلط انداز ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اسے گہری تجزیاتی نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے۔

② منصور حلاج نے اپنی زبان سے انا الحق کا نعرہ بلند کر کے معرفت خداوندی کی انتہا کر دی لیکن یہ نعرہ جو ایک طرح سے عشق کا دعویٰ تھا اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ سننے والوں نے اسی نعرے کی بنا پرے منصور کو سولی پر چڑھا دیا۔ ایسی صورت میں کسی کے عشق کا دعویٰ موت سے ہمکنار ہونے کے مترادف نہیں تو بھلا اور کیا ہے؟

③ یہ شعر بھی مفہوم کے اعتبار سے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں اقبال کہتے ہیں کہ حقیقت مطلق تک رسائی کی خواہش ہے تو پھر اسے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کی بجائے باطن کی نگاہ سے دیکھو کہ اپنے مقصود کی معرفت کا یہی ایک طریقہ ہے۔

④ اے میرے محبوب! جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو اس کی حدیں عشق کی انتہا سے جا ملتی ہیں اور تیرے حسن کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اب تو یہ بتا کہ ان دو انتہاؤں کے پیش نظر دیکھنے والا مجھے دیکھے کہ تیرا نظارہ کرے۔ اسکے لیے تو یہ صورت حال تذبذب کا باعث بن جاتی ہے۔

⑤ **معنی**: عذر آفریں: بہانہ پیدا کرنے والا۔

مطلب: رب ذوالجلال کے جلوے کا تصور یہاں اس دنیا میں میرے عشق کے جذبے میں مزید شدت پیدا کر رہا ہے لیکن خدشہ اس امر کا ہے کہ روز قیامت بھی وہ اپنی رونمائی کے ضمن میں کوئی اور عذر نہ تراش لے ہرچند کہ خدا نے اس امر کا وعدہ کر رکھا ہے۔

⑥ محبت کی نظر سے اپنے محبوب کو کتنا بھی چھپ کر دیکھا جائے یہ نظر چھپ نہیں سکتی فوراً پہچان لی جاتی ہے۔ اس صورت میں اے میرے ہم نشیں! تو ہی بتا کہ میں اور کس انداز سے اپنے محبوب کو دیکھوں کہ کسی اور پر میری محبت کا راز افشاء نہ ہو سکے۔

⑦ اس غزل کا یہ شعر انتہائی خوبصورت ہے جس میں اقبال اپنے انداز میں کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے کوہ طور پر جلوہ دکھانے کی ضد کیا سمجھ کر کی جب کہ ان میں اتنی قوت برداشت نہ تھی ورنہ جلوہ دیکھتے ہی بے ہوش کیوں ہو تے۔ مراد یہ کہ جلوۂ خداوندی کا دیکھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ نہ جانے حضرت موسیٰؑ نے اس کے لیے اصرار کیوں کیا؟

⑧ **معنی:** **جنبشِ مژگاں:** پلکوں کا ہلنا۔

مطلب: حسن کے نظارے کے لیے تو پلک جھپکنا بھی بار سے کم نہیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ نرگس کے پھول کے مانند مسلسل ایک جانب ہی نگاہ رکھی جائے۔ چشم نرگس کا حوالہ اسی طور پر آتا ہے۔

⑨ **معنی:** **کھل جائیں:** منکشف ہوں۔ ظاہر ہوں۔

مطلب: میرا محبوب اگر میری طرح سے دو چار دن میرے عشق میں مبتلا رہنے کی زحمت گوارا کرے تو اس پر عشق میں جو مرحلے آتے ہیں وہ اس پر منکشف ہو جائیں۔

(8)

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

وہ میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیِ نا مہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بیتابی، سو میرے آشیاں تک ہے

وہ مشتِ خاک ہوں، فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی، زمیں سے آسماں تک ہے

جرس ہوں، نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فغاں تک ہے

جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی، لطفِ تمنا بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

✽

① **معنی:** **آرزوئے بیدلی:** دل دینے کا شوق۔ **زیاں:** نقصان۔

مطلب: میرے لیے اس امر کا انکشاف ناممکنات میں سے ہے کہ میرے دل میں مبتلائے عشق ہونے کی کتنی آرزو ہے۔ یوں بھی یہ حقیقت ہے کہ میں نے زندگی میں ہمیشہ خسارے کا سودا ہی کیا ہے۔ یہ خسارہ خواہ عشق میں ہو خواہ عام معاملات میں! بہر حال یہ خسارہ ہی میری تقدیر کا بنیادی عنصر ہے۔

② میں تو اس نوع کا شراب نوش ہوں کہ جس کا چہرہ نشے کی زیادتی کے سبب خود مانند گلاب سرخ ہو جاتا ہے۔ میرا نامہرباں ساقی جب شراب پلا کر مجھے مدہوش کر دیتا ہے تو میں خود اپنی ذات میں اس قدر محو ہو جاتا ہوں کہ مجھے پھولوں اور گلزار کی طرف دیکھنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

③ **معنی:** **چمن افروز:** باغ کو رونق دینے والا۔

مطلب: زیر تشریح شعر میں اقبال ان آلام و مصائب کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے انسان دوچار رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں چمن میں خوش الحانی سے نغمے گاتا رہوں گا صیاد میری تاک میں رہے گا اور پھر موقعہ ملتے ہی مجھے پابند قفس کر دے گا۔ اسی طرح بجلی بھی اسی وقت تک بیتاب و مضطرب رہے گی جب

تک کہ وہ میرا آشیانہ جلا کر خاک نہ کر دے۔

④ میں ایک ایسی مشت خاک کی مانند ہوں کہ منتشر ہو جاؤں تو صحرا بن جاؤں اور جہاں تک میری وسعت کا سوال ہے تو یوں سمجھ لو کہ زمین سے آسمان تک احاطہ کیے ہوئے ہوں اس شعر میں انسان کی جملہ صلاحیتوں کی ایک طرح سے نشاندہی کی ہے۔

⑤ **معنی**: رحیل: کوچ۔

مطلب: میں قافلے کی ایک ایسی گھنٹی کے مانند ہوں جس کی نس نس میں ایک خاموش فریاد چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ابھی میرا قافلہ (قوم) منتشر اور افتراق کا شکار ہے تو مجھے بھی خامشی اختیار کرنا پڑ رہی ہے جوں ہی میرا قافلہ منظم ہو کر اپنی منزل کی جانب گامزن ہوا میں بھی متحرک ہو جاؤں گا۔

⑥ **معنی**: کشود کار: مطلب حاصل کرنا۔

مطلب: اقبال اس شعر میں اہل قافلہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تم مسائل سے عہدہ برآ ہو کر اپنے لیے سہولتیں اور آسانیاں فراہم کرنے کے خواہاں ہو تو اس امر کی ضرورت ہے کہ اطمینان قلب حاصل کر لو کہ پانی میں گرداب یعنی بھنور اسی وقت تک پڑتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ رواں دواں رہتا ہے اور جوں ہی اس کی روانی ختم ہوئی اور وہ ایک مقام پر ٹھہر گیا تو بھنور پڑنا بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مشکلات بھی انسانی زندگی میں اس وقت تک برقرار رہتی ہیں جب تک وہ منتشر ہو لہٰذا سکون قلب کے حصول کی خاطر یہ امر ناگزیر ہے کہ انتشار اور افتراق کا خاتمہ کیا جائے۔

⑦ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ عشق و محبت میں خموشی موت کے مترادف ہے اس کو زندہ رکھنا ہے تو پھر نالہ و فریاد بھی ناگزیر ہے کہ یہی عشق و محبت کی بنیادی رسم ہے۔

⑧ انسان جب تک عالم شباب کا حامل ہوتا ہے تو محبوب کے دیکھنے کا لطف اور اس کے حصول کی تمنا بھی برقرار رہتی ہے اور جب شباب ہی رخصت ہو جائے تو اس نوع کے جذبے فطری طور پر دم توڑ دیتے ہیں۔

⑨ غزل کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں دنیا بھر میں بدنام اور رسوا ہو چکا ہوں تاہم یہ احمقانہ سوچ میرے ذہن پر حاوی ہے کہ میرے عشق کی داستان محض میرے رازداں کے سوا اور کسی کو بھی معلوم نہیں جب کہ اس کا انکشاف سارے زمانے پر ہو چکا ہے۔

(9)

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں ۔۔۔ وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی ۔۔۔ مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں
اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہ سائی سے ۔۔۔ تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؟ ۔۔۔ کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں ۔۔۔ مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا! کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

تمنا درد دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمن دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں انہیں؟ مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

*

① **معنی:** ظلمت خانہ: اندھیرا گھر۔

مطلب: اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ غزل اقبال کی طویل غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مطلع میں وہ کہتے ہیں کہ خدائے وحدہٗ لا شریک تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں زمینوں اور آسمانوں کو کھنگالتا رہا جب کہ ذرا گہرائی سے دیکھا تو وہ میرے دل میں ہی موجود تھا۔ اس لیے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ خدا تو انسان کے دل میں ہی رہتا ہے تاہم اس حقیقت کے ادراک کے لئے معرفت کا شعور بنیادی شرط ہے۔

② اس شعر کا مفہوم بھی کم و بیش پہلے شعر سے ملتا جلتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب مجھے اس امر سے آگاہی ہوئی کہ میری حقیقت کیا ہے تو اس امر کا علم بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو خود میرے دل میں موجود ہے۔ مراد یہ ہے کہ رب ذوالجلال کو پانے کے لیے اپنی حقیقت تک رسائی بھی ناگزیر ہے۔

③ **معنی:** جبہ سائی: سجدہ کرنا۔

مطلب: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کا وہ پتھر جس کی جانب رخ کر کے ہم سجدہ ریز ہوتے ہیں اگر اس میں بھی یہ جذبہ اور ذوق موجود ہوتا تو متحرک ہو کر خود ہماری پیشانیوں سے ہم آہنگ ہو جاتا۔

④ اس شعر میں مجنوں کو مخاطب کر کے اقبال استفسار کرتے ہیں کہ اتنا بتا دے کہ محض عشق میں مگن رہنے کے سوا کبھی تو نے اپنی ذات میں بھی جھانک کر دیکھا ہے اس لیے کہ میرے نزدیک تو تو بھی اسی طرح پردے میں چھپا ہوا ہے جس طرح کہ تیری محبوبہ لیلیٰ محمل نشین تھی۔ مراد یہ ہے کہ کوئی شخص بھی اس وقت تک خود کو نہیں پہچان سکتا جب تک کہ وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر خود کو نہ دیکھے۔

⑤ اس شعر میں اقبال محبوب سے وصل اور فرقت کے معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب محبوب سے وصال یعنی ملاپ کے مواقع عاشق کو حاصل ہوں تو مہینے بھی پر لگا کر چند لمحوں میں اڑ جاتے ہیں جب کہ اس سے جدائی کے چند لمحات بھی مہینوں پر محیط دکھائی دیتے ہیں۔

⑥ اے ملاح! جب ڈوبنا ہی میرا مقدر ٹھہرا تو سمندر میں کودنے سے بھلا تو مجھے کس طرح روک سکے گا۔ اس لیے کہ ڈوبنے والے تو کشتی میں بیٹھے بٹھائے بھی ڈوب جاتے ہیں۔

⑦ رب ذوالجلال نے بے شک اپنے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر اپنا جلوہ دکھانے سے گریز کیا بلکہ اس کا وجود تو دنیا کی ہر خوبصورت چیز میں پوشیدہ ہے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں میں معرفت الٰہی کی صلاحیت موجود ہے وہ تو اس کا جلوہ ہر حسین شے میں دیکھنے کے اہل ہوتے ہیں۔

⑧ اے رب ذوالجلال! یہ تو بتا کہ اہل دل کے سینوں میں وہ کون سی قوت پوشیدہ ہو سکتی ہے جو اپنی ایک پھونک سے بجھی ہوئی شمع کو پھر سے روشن کر سکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں میں تو نے ایسی کون سی صلاحیت پیدا کی ہے جو ناممکن کو ممکن بنانے کی اہل ہوتی ہے۔

⑨ اگر تجھے جذبہ عشق کے حصول کی تمنا ہے تو پھر ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے ان درویشوں کے پاس جا جو ہر شے سے بے نیاز ہو کر عبادت خداوندی کے علاوہ عام انسانوں کے کام آتے رہتے ہیں۔ یہ جان لے کہ جذبہ عشق ایسا جوہر ہے جو کسی بادشاہ کے خزانے میں نہیں مل سکتا کہ یہ خزانے تو محض ہوس کی آماجگاہ ہیں۔

⑩ **معنی:** خرقہ پوشوں: گدڑی پہننے والے یعنی درویش۔

مطلب: ان گدڑی پوش لوگوں کے بارے میں تحقیق و تجسس بے معنی بات ہے۔ اے شخص! اگر تجھے ان سے کچھ عقیدت و محبت ہے تو یہ راز خود ہی تجھ پر منکشف ہو جائے گا کہ یہ لوگ تو معجزنما ہیں اور اپنی آستینوں میں معجزے چھپائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

(11) یہ شعر بھی دسویں شعر کا ایک طرح سے تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ آنکھیں جن کی حقیقت تک رسائی نہیں وہ ان گدڑی پوشوں کے نظارے کو ترستی رہیں گی حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہی خلوت نشین گدڑی والے بزرگوں سے ہی اس دنیا کی رونق قائم ہے۔ ان کے بغیر تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

(12) . **معنی:** خوشہ چینوں: خوشے چننے والے یعنی فیض حاصل کرنے والے۔

مطلب: اقبال اس شعر میں یوں گویا ہیں کہ اے میرے حبیب تو اس کائنات کی حقیقت جاننے کا خواہاں ہے تو تو اپنے خرمن دل کو ایسی چنگاری سے پھونک دے کہ آفتاب کو بھی تجھ پر رشک آئے اور وہ بھی تیرے خوشہ چینوں میں شمار ہو سکے۔ مراد یہ ہے کہ کائنات کا احوال جاننے کے لیے اس علم کی روشنی حاصل کر جو آفتاب کے لیے بھی رشک کا سبب بن جائے۔

(13) اگر تجھے طلب عشق ہے تو وہ حساس دل تلاش کر جو شکستگی کا آئینہ دار ہو کہ عشق و محبت تو ایسی حقیقتیں ہیں جو انتہائی نازک اور حساس عوامل سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ مراد یہ کہ عشق ہر کہ و مہ کے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو ایسے دل میں جگہ پا سکتا ہے جو نازک آبگینوں کی مانند ہوتے ہیں۔

(14) **معنی:** ماعرفنا: اشارہ ہے کہ ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا۔

مطلب: اے دل! یہ تو بتا کہ اس دنیا کے خوبصورت لوگوں میں کیا کوئی ایسا حسین وجود بھی ہے، جو ان خوبصورتیوں کو دیکھ کر خود بھی سرتاپا حسن میں ڈھل جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا وجود تخیلی حیثیت کا حامل ہی ہو سکتا ہے۔

(15) زیر تشریح غزل میں یہ شعر عملاً نعتیہ ہے جس میں حضور سرور کائنات ﷺ کے اس ارشاد کی جانب اشارہ ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم نے خدائے بزرگ و برتر کو پہچانا تو ضرور! تاہم اس طرح سے نہیں پہچانا جیسا کہ اس کا حق تھا۔ چنانچہ سرکار دو عالم کا یہ عجز خالق حقیقی کو بہت بھایا اور اس نے حضور ﷺ کا مقام و مرتبہ دنیا بھر کے خوبصورت لوگوں سے بڑھا دیا اور ان کے مراتب مزید بلند کر دیئے۔

(16) یہ نعتیہ شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں اقبال حضور سرور کائنات ﷺ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے فلسفی اور دانشور ایک عرصے سے آپؐ کی ذات والا صفات اور مراتب کے حوالے سے تذبذب میں مبتلا ہیں۔ یہ ان پر کرم ہو گا اگر حضورؐ خود ہی ان کو اپنا جلوہ دکھا دیں تو ساری صورتحال ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔

(17) اقبال یہاں کہتے ہیں کہ اے دل ناصبور! تجھے تو اپنے محبوب سے حقیقی عشق کا دعویٰ ہے اس کے باوجود تو بھری محفل میں نالہ و فریاد کر رہا ہے۔ حالانکہ جو لوگ عشق و محبت کے دعویدار ہوتے ہیں انہیں اس حقیقت کا ادراک بھی یقیناً ہوتا ہے کہ محبت کے جو قرینے ہیں ان میں ادب و احترام اولین قرینہ ہے۔

(18) اس غزل کے مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کہ جو لوگ میرے نکتہ چیں اور ناقد ہیں ان کو میں کس طرح برا کہہ سکتا ہوں جب کہ میں تو خود اپنی ذات کے نکتہ چینوں اور ناقدوں میں سے ہوں۔

(10)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی — کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو — کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا — وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل — چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

*

① **معنی:** عشق کی انتہا: انتہائی محبت۔ سادگی: بھولا پن۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ میں تیرے عشق کے ان انتہائی مراحل تک رسائی حاصل کرنے کا خواہاں ہوں جن سے آگے اور کچھ نہیں ہے لیکن یہ خواہش

میری سادگی کے علاوہ بظاہر کچھ اور نظر نہیں آتی۔

② **معنی:** **وعدۂ بے حجابی:** بے نقاب ہونے کا وعدہ۔ **صبر آزما:** صبر آزمانا۔

مطلب: میرے نزدیک ظلم و ستم اور وعدے وعید ایک ہی نوعیت کے ہیں کہ عشق و محبت میں یہی کچھ ہوتا ہے اور اسی قسم کی توقعات رکھی جانی چاہئیں!

③ بہشت کا تصور تو زاہدوں کو ہی مبارک ہو کہ ان کا زہد و تقویٰ اسی مقصد کا حامل ہوتا ہے جب کہ میرے تو اپنے محبوب سے ملاقات ہی کافی ہے۔ یہ ملاقات ہی میرے لیے جنت سے کم نہیں۔

④ **معنی:** **لن ترانی:** تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

مطلب: ہرچند کہ میرا دل مختصر سا ہے لیکن اس میں جو تمنا موجزن ہے وہ یہی کہ اپنے محبوب سے بار بار ملاقات کے وعدے وعید اور پھر ان سے انکار کا تذکرہ سنوں۔

⑤ اے دنیا والو! میں تو اب صرف چند گھڑی کا مہمان ہوں۔ میری کیفیت تو صبح کے چراغ کی مانند ہے جو کسی لمحے بھی بجھ سکتا ہے۔

⑥ **معنی:** **راز کی بات:** معشوق کی مہربانی کا تذکرہ۔

مطلب: غزل کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں تو اس قدر منہ پھٹ واقع ہوا ہوں کہ جو باتیں دوسروں سے چھپا کر رکھنے کی ہوتی ہیں ان کو بھی بھری بزم میں منکشف کر دیا یقیناً یہ عمل ایک جرم کے مترادف ہے۔ مجھے اس کی سزا ملے تو بے شک میں یہ سزا بھگتنے کو ہر طرح سے تیار ہوں۔

(11)

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیازمند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت، وہ بے نیاز کرے

سخن میں سوزِ الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل
جہاں میں وانہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

◆

① **معنی:** **بے نیاز:** مراد ہے خدا۔ **نیازمند:** انسان، بندہ۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ خدائے عزوجل جب انسان پر کرم نوازی کرتا ہے تو وہ جو

بے شک مجبور اور تہی دامن ہے اس انسان کو تو اس کرم نوازی پر فخر و ناز ہونا چاہیے۔

② **معنی: احتراز:** پرہیز کرنا۔

مطلب: اقبال نے اس شعر میں واعظ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نازک مسئلے کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں چھیڑا ہے۔ ان کے مطابق واعظ اپنی تقریروں میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ آسمان پر مقیم ہے۔ اقبال اس مفروضے پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ خدا ہی کیا جو اپنی مخلوق سے احتراز کرتے ہوئے اتنی دور جا بیٹھا ہے حالانکہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا خدا تو وہ ہے جو صرف آسمان پر ہی نہیں ہر جگہ موجود ہے۔ اقبال کے بقول واعظوں نے تو خدا کے وجود کو بھی محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ امر ان کی تنگ نظری کے سوا اور کیا ہے؟

③ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ میرے نزدیک وہ بادہ نوش صحیح معنوں میں بادہ نوش نہیں ہو سکتا جو ہوش اور مستی کی کیفیتوں میں تمیز کرنے کا اہل ہو۔ مراد یہ ہے کہ حقیقی بادہ نوش وہی شخص ہے جو ہر لمحے مست و سرشار رہے حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر دے اور سب کچھ بھول جائے۔

④ اے انسان تیرے لیے لازم ہے کہ ہر لمحے مستعد اور دل کی آواز کی طرف متوجہ رہے کہ جب یہ شکستگی کے عمل سے گزرتا ہے تو پھر اسرار حیات منکشف ہونے لگتے ہیں۔

⑤ کوئی حضرت واعظ سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا کرے کہ اگر رب العزت کسی گناہ گار پر کرم نوازی کرتا ہے تو حضرت! یہ فرمایئے کہ اس میں آپ کا نقصان کیا ہے؟ مراد یہ کہ واعظان کرام کا طرز عمل تو یہی ہے کہ وہ لوگوں کو جرم و گناہ کے حوالے سے اپنی تقریروں میں خوفزدہ کرتے رہتے ہیں جب کہ خدا رحیم بھی ہے کریم بھی۔

⑥ اقبال اس شعر میں خالق کائنات سے استفسار کرتے ہیں کہ شعر و سخن میں جو سوز پیدا ہوتا ہے اس کے محرکات کیا ہیں؟ اس لیے کہ سوز تو ایسی حقیقت ہے جو انسان تو انسان پتھر کو بھی پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔

⑦ بلبل کو گلاب کے پھول سے تو عشق ہے اور لالے کے پھول سے بے تعلق رہتی ہے۔ گلاب کے مرجھانے پر اسی لیے وہ اداس ہو جاتی ہے چنانچہ اگر وہ دوسرے پھولوں کو بھی گلاب کی مانند چاہے تو پھر اس کو نالہ و فریاد کی ضرورت نہ ہو گی مراد یہ کہ اس نوع کا امتیازی سلوک مناسب نہیں ہوتا۔

⑧ **معنی: زباں دراز:** برا بھلا کہنا۔

مطلب: یہ عبادت و زہد کا غرور ہے جو حضرت واعظ کو دوسرے بندگان خدا کے خلاف زبان دراز کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

⑨ غزل کے مقطع میں اقبال اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی ہوا ایسی آئے جو مجھے ہندوستان سے اڑا کر مدینے کی طرف لے جائے! مراد یہ ہے کہ خدا کرے وہ سعادت نصیب ہو کہ ہندوستان سے مدینے کے لیے عازم سفر ہوں۔

(12)

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے' وہ باطل ہوں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی! خزف چین لبِ ساحل ہوں میں

ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

بزمِ ہستی! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

*

① **معنی:** ظالم ہوں میں' جاہل ہوں: قرآن پاک میں ہے کہ انسان ظالم اور جاہل ہے۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اپنے دشمن کی ہر زیادتی کو نظرانداز کر کے میں خود اپنی ذات پر ایک طرح سے جبر کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود اس امر کا طعنہ دیا جاتا ہے کہ میں ظالم اور جاہل ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میری رواداری کا عالم یہ ہے کہ اپنے دشمن کی ہر زیادتی کو نظرانداز کر کے خود اپنی ذات کو ہی ہدف بنائے ہوئے ہوں۔ اس پر بھی یہ الزام تراشی کہ میں ظالم بھی ہوں اور جاہل بھی! یہ رویہ میرے کرم فرماؤں کا کس قدر افسوس ناک اور باعث شرم ہے۔

② اس شعر میں اقبال حق تعالیٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا وجود ان لمحات تک ہی برقرار تھا جب تک کہ تو نے اپنا جلوہ نہیں دکھایا تھا۔ دراصل میری ذات تو ایسے باطل کی طرح ہے جو سچائی کے نمودار ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں نے جلوۂ خداوندی کا ادراک حاصل ہوتے ہی خود کو اس میں ایسے جذب کر لیا جیسے حقیقت کے نمودار ہوتے ہی جھوٹ غائب ہو جاتا ہے۔

③ **معنی:** غوطہ زن: مراد ہے طالبانِ علم۔ گوہر بدست: موتی لے کر۔ خزف: چِنا۔

مطلب: اگر علم کو ایک دریا تصور کر لیا جائے تو اہل طلب اس دریا میں غوطہ لگا کر جب سطح پر برآمد ہوئے تو وہ علم سے مالا مال تھے۔ اس کے برعکس میری کیفیت یہ تھی کہ میں اس دریا کے کنارے کھڑا کنکر چنتا رہا۔ مراد یہ کہ میں نے حصول علم کے لیے کوئی تگ و دو نہ کی چنانچہ یہ فطری امر ہے کہ اس دولت سے محروم رہا۔

④ اس شعر میں اقبال نے حضرت آدمؑ کے جنت سے نکلنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ تذلیل عملاً میری شرافت کی دلیل بن گئی کہ اپنی غفلت کے سبب جب مجھے جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تو اس حکم پر فرشتے بھی گریاں کناں ہوئے تھے۔

⑤ اے دنیا! نہ جانے کس لیے تجھے اپنی آرائش و زیبائش پر اس قدر فخر و غرور ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تو جس محفل کا پرتو ہے وہ محفل میں ہی تو ہوں۔ مراد یہ ہے کہ انسان کا وجود ہی دراصل دنیا کی آرائش و زیبائش کا سبب ہے۔ انسان نہ ہو تو یہ دنیا ایک ویرانہ بن کر رہ جائے۔

⑥ غزل کے مقطع میں اقبال خودشناسی کے عمل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو خود ہی اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں ہوں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں تو خود ہی مسافر اور خود ہی منزل ہوں۔ یہ شعر اپنی معنویت کے اعتبار سے انسانی وجود کے لیے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اگر انسان

خود شناس ہو تو وہی سب کچھ ہوتا ہے۔

(13)

مجنوں نے شہر چھوڑا' تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ' خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مانند خامہ تیری زباں پر ہے حرف غیر
بیگانہ شے پہ نازش بیجا بھی چھوڑ دے

لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں درد عشق
بسمل نہیں ہے تو' تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح پھولوں پہ رو' اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی' حرم بھی' کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں' یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوال مکرر میں اے کلیم
شرط رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

*

① اس غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر مجنوں نے اپنی محبوبہ لیلیٰ کے عشق میں شہر کو چھوڑ کر صحرا میں ڈیرہ جما لیا تھا تو یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ لطف تو جب آتا کہ وہ شہر کی طرح صحرا کو بھی ترک کر دیتا۔ پھر اگر اسے رب ذوالجلال کا جلوہ دیکھنے کی خواہش تھی تو پھر لیلیٰ کے تصور سے بھی دستبردار ہونا ضروری تھا۔ مراد یہ ہے کہ دنیوی عشق کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے عشق کی آرزو ہے تو اس خالق کائنات سے کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

② اس شعر میں وہ واعظ کو خطاب کرتے ہوئے یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ اگر ترک علائق ہی تیرا کمال ہے اور اسی حوالے سے تو دنیا کو چھوڑنے پر مصر ہے تو پھر عقبیٰ کے تصور کو بھی چھوڑ دے کہ خالق کائنات تک رسائی تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنی تمام خواہشات اور تمناؤں کو ترک کر کے اس سے لو لگا لے۔

③ : معنی: تقلید: پیروی کرنا۔

مطلب: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی تقلید اور پیروی سے تو بہتر یہی ہے کہ انسان خودکشی کر لے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے اپنا راستہ بھی تلاش کیے جائے اور وہاں تک رہنمائی کے لیے حضرت خضرؑ کی امداد کا تصور بھی ترک کر دیا جائے کہ اسی صورت میں انسان اپنی ذاتی جدوجہد کے ذریعے منزل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

④ معنی: خامہ: قلم۔

مطلب: زیر تشریح شعر میں اقبال قلم کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قلم سے علم و حکمت کی کیسی کیسی باتیں رقم ہوتی ہیں لیکن یہ کمال دیکھا جائے تو قلم کا نہیں بلکہ اس لکھنے والے کا ہے جو اس قلم کے ذریعے دانش و حکمت کے جواہر بکھیرتا ہے۔ قلم تو محض اظہار کا ایک ذریعہ ہے لہٰذا اگر انسان زندگی میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے لیے خود جدوجہد کرے۔ دوسروں کے عمل کی تقلید پھر اس پر فخر و مباہات تو بے معنی بات ہے۔ یہ رویہ کبھی بھی اپنانا نہیں چاہیے اسی عمل میں انسان سرخروئی حاصل کرتا ہے۔

⑤ اگر دل میں عشق کا درد موجود نہیں تو شعر و سخن میں بھی سوز اور حقیقت کے رنگ نہیں بھرے جا سکتے۔ اس کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ وہی شخص تکلیف اور درد کے باعث تڑپتا ہے جو فی الواقع زخموں سے نڈھال ہو۔ دراصل اس شعر میں اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تخلیقی عمل کو لکھنے والے کے خیالات و جذبات کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اسی کے سبب تحریروں میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکتا ہے۔

⑥ زیر تشریح شعر ترک دنیا کے حوالے سے کہا گیا ہے۔ اس میں اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں قیام انسان کے لیے ایک عارضی حیثیت کا حامل ہے۔ بالآخر چند روزہ زندگی کے بعد جب موت کو گلے ہی لگانا ہے تو پھر اے انسان شبنم کی پیروی کر کہ وہ چند لمحوں تک پھولوں پر آنسو بہا کر باغ سے اڑ جاتی ہے۔ تو بھی یہی طرز عمل اختیار کر لے۔ اور اس چند روزہ زندگی کا جنون چھوڑ دے۔

⑦ عشق و عاشقی کی رسم تو یہی ہے کہ ہر شے کو ترک کر کے انسان گوشہ تنہائی اختیار کر لے۔ لہٰذا تو بھی اسی طرز عمل کی پیروی کرتے ہوئے بتخانہ، کعبہ اور کلیسا سب کو چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسا اور خالق حقیقی سے لو لگا لے۔

⑧ رب ذوالجلال کی عبادت تو صمیم قلب سے کی جانی چاہیے۔ اس عمل کے لیے محض جزا کو پیش نظر رکھنا خلوص دل سے عبادت کے منافی ہے۔ بلکہ بالفاظ دگر یہ تو ایک طرح سے سوداگری کے مترادف ہے۔ یوں بھی عبادت سوداگری نہیں ہوتی۔ اگر دل میں خلوص ہو تو پھر جزاء اور انعام کا تصور بے معنی شے بن جاتا ہے۔

⑨ معنی: پاسبان عقل:

مطلب: یہ امر بڑی حد تک مناسب ہے کہ مسئلہ کوئی بھی ہو اس کو بروئے کار لانے کے عمل میں دل اور عقل کے مابین رابطہ برقرار رہے اس کے باوجود کبھی کبھی یہ بھی مناسب ہوتا ہے کہ عقل کی بجائے محض اس جذبے کے تحت کام کیا جائے جس کا تعلق محض دل سے ہو۔

⑩ ایسی زندگی قطعی طور پر بے معنی ہوتی جس کا انحصار دوسروں پر ہو۔ چونکہ شہرت کا تعلق بھی دوسروں کی امداد و سرپرستی سے ہے اس لیے شہرت کی تمنا ترک کر کے اپنے لیے راستہ خود ہی بنانا چاہیے۔

(11) حضرت موسیٰؑ نے جلوۂ خداوندی کے لیے جو بار بار تقاضا کیا تو ان کا یہ عمل محض شوخی ہی نہیں بلکہ سوئے ادب کے مترادف تھا۔ حق تعالیٰ کی رضا کا پاس تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ جو چاہے اس کے روبرو سر خم کر دیا جائے۔

(12) **معنی:** مے کے جواز میں: شراب پینے کو جائز قرار دینا۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہاں بھی حسب معمول اقبال واعظوں کے کردار سے بری طرح نالاں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ شخص شراب نوشی کے جواز میں کوئی ثبوت بھی لے آئے تو میں اس کی مخالفت کرتے ہوئے شراب پینا ترک کر دوں گا۔ بقول ان کے واعظ کا کردار تو بس یہ ہے۔

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز اذاں سے

حصہ دوم

(1905ء سے 1908ء تک)

"بانگ درا" کے حصے میں اقبال کی وہ تخلیقات شامل ہیں جو 1905ء سے 1908ء تک تین سال کے دوران منصۂ شہود پر آئیں۔ اس حصے کی منظومات میں بھی زیادہ تر کلاسیکی رنگ غالب ہے۔ تاہم بیشتر مقامات پر اقبال کا لہجہ ان کی بعد کی شاعری سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

(شمار، 7)

محبت

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے

قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاق زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے

سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمناء دلی آخر بر آئی سعی پیہم سے

پھرایا فکر اجزا نے اسے میدان امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریمؑ سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیر شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمہ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

مہوس نے یہ پانی ہستی نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کار عالم سے

ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرام ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

*

① اقبال کی یہ نظم اگرچہ ان کی ابتدائی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ تاہم فورم کے اعتبار سے اسے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے تخیلی اور تصوراتی سطح پر محبت کے جذبے کی تشکیل کے لیے بعض اجزائے ترکیبی کو یکجا کیا ہے اور ان کے مرکب کو محبت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ پوری نظم کا سٹرکچر خوبصورت امیجری سے مزین ہے۔ فرماتے ہیں۔

① سے ④ **معنی:** **عروس شب:** رات کی دلہن۔ **لذت رم:** بھاگنے کی لذت۔ **لباس نو:** مراد ہے نئی نئی صورت۔ **آئین مسلم:** فطرت کا قانون۔ **امکاں:** اصطلاحی معنی ممکن۔ **چشم خاتم:** انگوٹھی کی آنکھ۔

مطلب: جب خالق ہردو جہاں نے کائنات کو تخلیق کیا تو اس کے ابتدائی لمحات میں جملہ موجودات کی کیفیات اور صورت حال یہ تھی کہ شب کی دلہن کی زلفیں پیچ و خم سے محروم تھیں۔ آسمان پر ستاروں کی گردش اور ان کے اپنی منزل کی طرف گامزن ہونے کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ چاند کو فطرت نے جو نیا لبادہ فراہم کیا تھا اس میں وہ اجنبی سا محسوس ہوتا تھا۔ وہ بھی ہمہ وقت گردش کے طے شدہ اصولوں سے آگاہی نہ رکھتا تھا۔ اس عالم رنگ و بو کا نیا نیا آغاز ہوا تھا اور اس کے جملہ عناصر ان تقاضوں سے محروم تھے۔ جا کا

تعلق زندگی سے ہے۔ یہ کائنات جو اب پایہ تکمیل کو پہنچ کر ہماری نظروں کے سامنے ہے ابھی اس کی نئی نئی ابتدا ہوئی تھی۔

⑤ سے ⑧ **معنی**: **عرش کے پائے**: کنایہ ہے یعنی محبت پاکیزہ چیز ہے۔ **اکسیر کا نسخہ**: وہ مرکب جس کے لگنے سے دھات سونا بن جائے۔ **اسم اعظم**: اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا اور متبرک نام۔ **میدان امکاں**: ساری کائنات۔ **زلف برہم**: مراد ہے رات کی سیاہی۔

مطلب: قرین قیاس یہ ہے کہ ان لمحات میں آسمان پر ایک ایسے کیمیاگر کا وجود پایا جاتا تھا۔ اس کیمیاگر کو مٹی سے سونا بنانے پر قدرت حاصل تھی اور جس کے پاؤں کی دھول جمشید کے جام سے بھی زیادہ مصفا تھی۔ فی الواقعہ یہ کیمیاگر سوائے آدم کے اور کوئی نہ تھا۔ ان دنوں عرش معلّٰی کے کسی گوشے میں اکسیر کا ایک ایسا نسخہ آویزاں تھا جس کو فرشتے ہر لمحے اس انسان کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہ کیمیاگر یعنی انسان ہر لمحے اس نسخے کی تاک میں رہتا تھا کہ کب فرشتوں کی آنکھ جھپکے اور وہ اس نسخے کو لے اڑے۔ اس لیے کہ یہ انسان تو اس نسخے کو اسم اعظم سے بھی زیادہ اہم اور قیمتی تصور کرتا تھا۔ ایک روز بالآخر وہ ایک حمد باری تعالیٰ کے بہانے عرش کی جانب بڑھا اور بڑی چابکدستی کے ساتھ فرشتوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ نسخہ حاصل کر لیا یوں بالآخر اپنی سعی پیہم کے سبب اس کی دلی مراد بر آئی۔

⑨ سے (12) **معنی**: **چشمہ حیوان**: وہ فرضی چشمہ جس کا پانی پی کر موت نہیں آتی۔

مطلب: نسخے کے حصول کے بعد اب انسان کو اس کے اجزاء کی فراہمی کے لیے سرگرداں ہونا تھا۔ لیکن جو فرد بارگاہ خداوندی کا محرم ہو اس کی نگاہوں سے کوئی شے بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اس نے اس نسخے کے اجزائے ترکیبی کی تلاش میں ساری دنیا کو کھنگال ڈالا اور بالآخر اسے اس سردردی کا صلہ کامیابی کی صورت میں حاصل ہو گیا چنانچہ اس نے ستاروں سے تھوڑی سی چمک حاصل کی چاند میں جو داغ ہے اس کا ایک جزو اور تھوڑی سی رات کی سیاہی بھی جمع کر لی۔

ان عناصر کی فراہمی کے بعد اس کیمیاگر یعنی انسان نے دیگر اجزاء کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور بجلی کی تڑپ کا کچھ حصہ حاصل کرنے کے لیے بعد حوروں کی پاکیزگی اور حضرت عیسیٰؑ کے انفاس کی حرارت بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد بھی اس نے نسخے کی تکمیل کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں بالآخر وہ خداوند عزوجل کی بے نیازی کے علاوہ فرشتوں کا عجز و انکسار اور شبنم کی خاکساری کے حصول میں بھی کامیاب ہو گیا۔

(13 سے 16) اس نایاب اور گراں قدر نسخے کی تکمیل کے لیے اس کے اجزائے ترکیبی کی فراہمی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن انسان نے اپنی ہمت اور حکمت و دانش کے طفیل اس عقدۂ لاینحل کو حل کر کے ہی دم لیا۔ اب معاملہ صرف اسی قدر رہ گیا تھا کہ اجزائے ترکیبی کے حصول کے بعد نسخے کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ تمام اشیاء کو یکجا کر کے اس نے آب حیات میں گھولا اور اس مرکب کا نام محبت رکھا۔

نسخے کی تکمیل کے بعد اس مرکب کو انسان نے ان لمحات میں موجود کائنات کی ہر شے پر چھڑکا اور یوں ساری زندگی حرکت میں آ گئی۔ تمام خوابیدہ ذرات بیدار ہو گئے اور اٹھ اٹھ کر اپنے ہم نفسوں سے باہم گلے ملنے لگے۔ اس مرکب کے چھینٹوں کا اثر یہ ہوا کہ آفتاب نے اپنی گردش کا آغاز کر دیا اور ستارے بھی

منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ باغوں میں غنچے چٹک کر پھول بن گئے اور لالے کو اس کا داغ حاصل ہو گیا۔ مراد یہ ہے کہ یہ محبت کا جذبہ ہی ہے جس کے طفیل کائنات کی ہر شے متحرک ہے اور اس میں زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے۔

حقیقتِ حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا' یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی'اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا' سوگوار گیا

① سے ④ **معنی:** تصویر خانہ: مراد دنیا۔ عدم کا فسانہ: یعنی دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ اخترِ سحر: صبح کا تارا۔

مطلب: اقبال نے اس نظم میں حسن کی حقیقت اور اس کے اسرار پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس حقیقت سے آگہی بقول ان کے ہر زندہ شے کے لیے ایک المیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں حسن نے ایک روز خدائے ذوالجلال سے استفسار کیا کہ ہر شے پر قدرت رکھنے کے باوجود تو نے مجھے لافانی کیوں نہیں بنایا۔ تو خدا نے جواب دیا کہ یہ دنیا ہی میں نے ناپائیدار بنائی ہے۔ یہاں وہی شے خوبصورت اور حسین ہو گی جس کی زندگی مختصر ہو۔ زندگی تو تغیر اور تبدیلیوں کا نام ہے سو ہر زوال پذیر شے حسن سے عبارت ہے۔

④ سے ⑦ جس لمحے حسن اور خدا کے مابین یہ مکالمہ ہو رہا تھا تو چاند بھی کہیں قریب سے سب کچھ سن رہا تھا چنانچہ اس نے فوری طور پر یہ رازہائے درونِ پردہ جو اس پر آشکار ہوئے تھے ستاروں تک پہنچائے۔ جس کے سبب پورے آسمان پر یہ مکالمہ عام ہو گیا۔ صبح کے ستارے نے سحر کو' اور سحر نے ساری بات شبنم کو بتائی۔ یوں جو آسمان کا راز تھا وہ زمین کے باسیوں پر بھی منکشف ہو گیا۔ چنانچہ جس لمحے شبنم نے پھولوں کو حقیقتِ حسن سے آگاہ کیا تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور کلی کا ننھا سا دل بھی اس کو سن کر پارہ پارہ ہو گیا۔ یہی نہیں کہ بلکہ اس کو سن کر موسمِ بہار بھی روتا ہوا چمن سے رخصت ہو گیا اور شباب بھی غم زدگی کے عالم میں منزلِ فنا کی جانب گامزن ہو گیا۔

پیام

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشائی کا
دیر و حرم کی قید کیا! جس کو وہ بے نیاز دے

صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جانگداز دے

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

عشقِ بلند بال ہے رسم و رہِ نیاز سے
حسن ہے مستِ ناز اگر تو بھی جوابِ ناز دے

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں، مجھ کو تو خانہ ساز دے

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزمِ کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مے مجاز دے

*

① **معنی:** ذوقِ تپش: تڑپنے کی لذت۔

مطلب: اقبال کی یہ زیرِ تشریح اپنی ہیئت اور موضوعات کے حوالے سے زیادہ اہم نہیں اس لیے کہ اس نظم میں بھی انہوں نے ان مسائل کو سابقہ انداز میں دہرایا ہے جن کا تذکرہ وہ اپنی متعدد نظموں میں کر چکے ہیں۔ بہرحال وہ آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ اے ہم نشیں! عشق نے تجھے سوز سے نوازا ہے لیکن تیری انفرادیت یہ ہونی چاہیے۔ شمعِ محفل کی طرح اپنے عہد کو روشنی عطا کر! مراد یہ کہ سوزِ عشق میں خود مبتلا ہونا کافی نہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کیفیت سے دوسرے بھی استفادہ کر سکیں۔

② **معنی:** دیر و حرم: بت خانہ اور مسجد۔

مطلب: عشق کو اگر مشکلات کا حل تصور کر لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ دولت رحمت خداوندی کی دین ہے۔ اس ضمن میں دیر و حرم کی پابندی نہیں بلکہ اسے تو وہی بے نیاز عطا کرتا ہے۔

③ شمع کو اگر شعلے کی صورت میں نور کا لباس ملا ہے تو اس کی وجہ شمع کا جلنا ہے مراد یہ کہ کوئی بھی بلند مرتبہ تکلیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

④ **معنی:** سرمۂ امتیاز: امتیاز کا سرمہ۔

مطلب: ستارے، چاند اور طلوعِ سحر میں ربِ ذوالجلال کا جلوہ موجود ہے اس کے لیے کسی امتیاز کی ضرورت نہیں۔ دیکھنے والے کو اپنے رویے میں توازن پیدا کرنا چاہیے۔

⑤ **معنی:** رسم و رہِ نیاز: عاجزی یا غلامی کا طریقہ۔

مطلب: عشق انسان کو عاجزی اور انکساری نہیں سکھاتا چنانچہ اگر حسن ناز و انداز، فخر و غرور کا حامل ہے تو اس کا جواب بھی اسی کے انداز میں دے۔

⑥ **معنی:** پیرِ مغاں: مراد ہے میخانہ کا مالک۔ نشاط: خوشی۔

مطلب: اے ساقی! یہ تسلیم کہ انگریزی تہذیب بظاہر مسرت و انبساط عطا کرتی ہے لیکن یہ امر ضروری

ہے کہ اب اپنی قومی تہذیب سے آشنا کر۔

⑦ اے ساقی! تجھ کو شاید اس امر کا ادراک نہیں کہ قدیم تہذیب بڑی حد تک تبدیل ہو چکی ہے لہٰذا ہمیں ظاہری باتوں کی بجائے جملہ حقائق سے پوری طرح آشنا کر۔

سوامی رام تیرتھ

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو
آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو
مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آزر بنا
نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا
چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیمِ خام ہے
توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

*

① سوامی رام تیرتھ، جن کا اصل نام تیرتھ رام تھا۔ علامہ اقبال کے سیالکوٹی احباب میں سے تھے۔ حصولِ علم کے بعد وہ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد مشن کالج لاہور میں آ گئے۔ چند سال بعد وہ ویدانت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد ہفتوں دریائے راوی کے کنارے ریاضتِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ بعد میں وہ دریائے گنگا میں ڈوب کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اقبال کو ان کی موت کی خبر ملی تو زیرِ تشریح اشعار کہے۔ ملاحظہ ہوں۔

① **معنی:** **ہم بغل:** واصل۔ **دریا:** مراد ہے خدا۔ **قطرۂ:** مراد ہے انسان۔ **گوہر:** مراد ہے روح۔ **غوغا:** شور و غل۔ **شورشِ محشر:** قیامت کا ہنگامہ۔ **لا:** مراد اپنی اور کائنات کی نفی۔ **تسنیم:** جنت کی ایک نہر کا نام۔

مطلب: اے میرے ہمدم و مونس! تو موت کے لیے کس قدر مضطرب تھا کہ دریا میں ڈوب کر جان دے دی۔ زندگی میں تو بے شک تو ایک موتی کی مانند تھا جب کہ موت کے بعد تو گوہرِ نایاب کی صورت اختیار کر گیا یعنی خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ اپنے پردۂ وجود کو ختم کر کے تو نے اس کائنات کی حقیقت کو آشکار کر دیا جب کہ میں ابھی تک اس محبس میں اسیرِ رنگ و بو ہوں۔ اے یارِ ہمنشیں! تیری زندگی کا شور و غوغا اختتام پذیر ہوا تو عملاً قیامت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بالفاظِ دگر تیری زندگی کی چنگاری سے آزر کا آتشکدہ روشن ہو گیا۔ مراد یہ کہ اس طرح وفات پانے سے تیری اہمیت میں بے حد و حساب اضافہ ہو گیا۔ جو شخص معرفتِ حق سے آگاہ ہو جاتا ہے اسے یہ باور کرنے میں تاخیر نہیں ہوتی کہ نفی کے بعد ہی اثبات کا مرحلہ آتا ہے۔ اپنے وجود کو مٹانے سے ہی ربِ ذوالجلال کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ نابینا آنکھ کس طرح سے حقائق کے نتائج کا اندازہ کر سکتی ہے۔ اس کی مثال پارے کی مانند ہے کہ اس میں متحرک اور اضطراب ختم ہو جائے تو پارے کی بجائے محض کچی چاندی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ماننا پڑے گا کہ یہ جذبۂ عشق ہی ہے جو ہوش و خرد کے طلسم کو ختم کر کے انسان کو حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالہ طائر بام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے' اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاوداں' ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور' گردش جام اور ہے

شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز!
غمکدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی' شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

*

① **معنی:** اوروں: دوسروں مراد اہل دانش۔ پیام: مراد عشق کا پیام۔

مطلب: اس نظم میں اقبال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں دوسرے شاعر' ادیب اور سیاسی رہنما تمہیں جو نصیحتیں کرتے رہے ہیں امر واقعہ یہ ہے کہ میرا پیغام ان سے قطعی مختلف ہے۔ اس لیے کہ میرے دل میں عشق حقیقی کا پیدا کردہ درد موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا انداز بیان بھی دوسروں سے مختلف ہے۔

② قبل ازیں تم لوگ دراصل ایسے لوگوں کی باتیں سنتے رہے تھے جو ذہنی طور پر بھی انگریز کے غلام تھے۔ جب کہ میں تو ذہنی اور سیاسی بنیاد پر خود کو ہر طرح سے آزاد و خود مختار تصور کرتا ہوں چنانچہ تم سے جو کہنا ہے وہ ایک آزاد شاعر کے طور پر کہتا ہے۔

③ **معنی:** راز حیات: زندگی کی اصلیت۔ مور ناتواں: کمزور چیونٹی۔

مطلب: پہاڑ تو اپنی جگہ پر قائم و منجمد رہتا ہے اور وہ اسی کیفیت میں سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے اس کے برعکس ایک ننھی سی کمزور چیونٹی کا رویہ پہاڑ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ہر لمحے حرکت میں رہتی ہے اس کے نزدیک حرکت ہی سکون قلب کا سبب بن سکتی ہے۔

④ **معنی:** جذب حرم: مراد ہے عشق رسول ﷺ۔ فروغ: آب و تاب۔ انجمن حجاز: ملت اسلامیہ۔

مطلب: اے عزیز طلباء! میری بات غور سے سنو کہ ملت مسلمہ کا تمام تر وقار و احترام کعبہ کی محبت اور عشق کے سبب ہے۔ اسی جذبے کے سبب یہ امر واضح ہو سکے گا کہ دوسری قوموں اور مذاہب کے مقابلے میں ملت اسلامیہ کا نظام کس قدر مختلف اور منفرد ہے۔ اقبال کنایہ چاہتے ہیں کہ تمہارا تعلق چونکہ اسلام سے ہے اس لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ اسی کی پیروی کی جائے۔ اور دوسرے ادیان کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے باوجود خود اپنی راہ پر گامزن رہا جائے۔

⑤ یہ بھی جان لو کہ انسان کو مستقلاً "عیش و آرام کی زندگی میسر ہو اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی آرزو نہ ہو تو ایسی جامد و ساکت زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ شراب کے پیالے کی گردش اور انسان کی گردش میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جام شراب کی گردش محض چند ہاتھوں تک محدود ہوتی ہے جب کہ انسان اسی نوع کی جدوجہد سے زندگی میں بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔

⑥ **معنی:** سوز: بمعنی عشق۔ غمکدۂ نمود: مراد دنیا ہے۔

مطلب: شمع جو شب بھر جلتی رہی صبحدم بجھتے بجھتے زبان حال سے یہ پیغام دے گئی کہ زندگی کا ارتقاء اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ انسان تمام عمر جدوجہد کرے خواہ اس کے لیے کتنے ہی دکھ اٹھانے پڑیں۔

⑦ **معنی:** نارسا ابھی: ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی۔

مطلب: سرسید احمد خاں کے نظریات سے اتفاق کرتے ہوئے اقبال طلبہ سے کہتے ہیں کہ ابھی تمہیں اپنا مقصد حیات حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی چاہیے اور اس وقت تک انگریز سے متصادم ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک کہ ہر اعتبار سے تمہاری صفوں میں استحکام پیدا نہ ہو جائے۔

اخترِ صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا! ملی نگاہ، مگر فرصت نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دم آفتاب سے ہر شے اماں مجھی کو تہ دامن سحر نہ ملی!
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی
کہا یہ میں نے کہ اے زیور جبین سحر غم فنا ہے تجھے؟ گنبد فلک سے اتر
ٹپک بلندی گردوں سے ہمرہ شبنم مرے ریاض سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثال ابد پائدار ہے اس کی

*

پہلا بند معنی: ستارۂ صبح: صبح کا ستارہ جس کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ بساط: حیثیت۔

مطلب: "بانگ درا" کی یہ مختصر نظم محض دو بند پر مشتمل ہے جس میں اقبال ستارۂ صبح سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اولین بند میں ستارۂ صبح اپنی روداد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خالق کائنات نے بے شک مجھے زندگی اور چمکنے کی صلاحیت تو عطا کی لیکن زندگی کے ان لمحات کو اس قدر محدود کر دیا کہ مناظر فطرت کا پوری طرح جائزہ لے سکوں۔ اس لیے کہ میرے طلوع ہونے کے محض چند لمحات کے بعد سورج اپنی تیز کرنوں کے ساتھ برآمد ہوا جس کے نتیجے میں میرا وجود دھندلا کر رہ گیا۔ ثابت ہوا کہ میری حیثیت بس اتنی ہی ہے جیسے کہ ہوا کسی پانی کے بلبلے میں مقید ہو یا ایک چنگاری جو لمحے بھر کے لیے چمکے اور پھر بجھ کر رہ جائے۔

دوسرا بند **معنی:** زیور جبین سحر: صبح کی دلہن کے ماتھے کا زیور۔ بنا: بنیاد۔

مطلب: اس بند میں اقبال ستارۂ صبح کی شکایت کے جواب میں اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں بے شک تو صبح کی پیشانی پر جھومر کے مانند ہے اور طلوع آفتاب کے سبب تجھے اپنے فنا ہونے کا غم بھی ہے سو میرا مشورہ یہ ہے کہ آسمان سے نیچے اتر اور قطرۂ شبنم کی طرح میرے باغ سخن میں ٹپک پڑ کہ یہاں کی فضا بڑی پر سکون اور زندگی آمیز ہے۔ جان لے کہ میری شاعری روح میں بالیدگی پیدا کرنے کی موجب ہے۔

میں ایک ایسے باغباں کی مانند ہوں اور محبت کا جذبہ میری شاعری میں بہار کی حیثیت کا حامل ہے۔ جان لے کہ میرے گلستان سخن کو زوال نہیں اس کے برعکس اس کا وجود ہمیشگی کا حامل ہے۔

حسن و عشق

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمیں قمر — نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم، نور کا لے کر آنچل — چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم — موجۂ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یونہیں دل میرا

تو جو محفل ہے، تو ہنگامۂ محفل ہوں میں — حسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے، تو مرے اشک ہیں شبنم تیری — شام غربت ہوں اگر میں، تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے — تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا، عشق ہے کامل میرا

ہے مرے باغ سخن کے لیے تو باد بہار — میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال — تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

✽

یہ نظم عملاً تین بند پر مشتمل ہے اس کے مفہوم تک رسائی کے لیے اس حقیقت کا ادراک لازم ہے کہ اقبال اپنے جذبہ عشق کے حوالے سے ان اشعار میں اپنے محبوب سے مکالمہ کرتے ہوئے حسن و عشق کی نفسیات کو واضح کرتے ہیں۔ حسب معمول اس نظم کو بھی انھوں نے خوبصورت امیجز کے ذریعے سنوارا ہے اور ایسے استعارے بھی وضع کیے ہیں جو اس عہد کی شاعری میں نئی جہت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظم کے اولین بند میں اقبال یوں گویا ہوئے ہیں۔

پہلا بند **معنی:** کشتی سیمین قمر: چاند کی چاندنی کی کشتی یعنی چاند۔ نور خورشید: سورج کی روشنی۔ ید بیضائے: ہاتھ کی سفیدی۔ شمیم: خوشبو۔

مطلب: اے میرے محبوب! جس طرح طلوع سحر کے ہنگام سورج کی تیز روشنی میں چاند کی نسبتاً مدھم روشنی مدغم ہو کر رہ جاتی ہے، یا جیسے چاندنی رات میں کنول کا پھول اس کے ہم رنگ ہونے کے باعث

نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے یا جس طرح کوہ طور پر نور خداوندی کی ضو سے حضرت موسیٰؑ کا سفیدی مائل ہاتھ ایک طرح سے ناپید ہو جاتا ہے یا پھر جیسے طلوع سحر کے وقت گلستان میں پھولوں کی اجتماعی خوشبو ایک چھوٹے سے پھول کی انفرادی خوشبو کو اپنے دامن میں لپیٹ لیتی ہے بالکل اسی طرح تیری محبت اور عشق میں میرے دل کا عالم ہے مراد یہ کہ میں اپنے وجود کو تیرے وجود میں ضم کر چکا ہوں۔

دوسرا بند **مطلب:** اے میرے محبوب! اگر تجھے ایک محفل تصور کر لیا جائے تو اس محفل کی رونق یقیناً میرے دم سے ہے۔ اگر تجھے بجلی سمجھ لیا جائے تو میری ذات ایک لیمپ یا بلب کی مانند ہے جو اس بجلی سے جلتا رہتا ہے۔ اگر تجھے صبح کا وقت سمجھ لیا جائے تو میرے آنسو اس لمحے تیرے لیے شبنم کی مانند ہوں گے۔ اس عالم غربت میں اگر میں شام کی حیثیت رکھتا ہوں تو تیرا وجود عملاً شفق کی طرح سے ہے۔ تیری منتشر زلفوں کی طرح میرا دل بھی مضطرب و پریشان رہتا ہے اور جب تیری تصویر کو دیکھتا ہوں تو اس میں بھی مجھے اپنی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اگر تو اپنے حسن کو کامل سمجھتا ہے تو جان لے کہ میرا عشق بھی کامل ہے۔

تیسرا بند **مطلب:** اے محبوب! میری شاعری کے گلستان میں تیرا وجود موسم بہار کی ہوا کے مانند ہے۔ میرے تخیل میں جو بے چینی اور اضطراب تھا تیرے سبب اس میں ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہوا۔ جب سے تیرا عشق میرے دل میں جاں گزین ہوا ہے اس دم سے میرے فن میں بھی نئی تخلیقی صلاحیتیں رونما ہونے لگی ہیں۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک بھی ہوا کہ حسن کے بغیر عشق کی تکمیل کا کوئی امکان نہیں ہوتا تیرے سبب ہی میری آرزوؤں اور امیدوں کو فروغ ملا چنانچہ تجھے پاتے ہی میرا قافلہ منزل تک رسائی میں کامیاب ہو گیا۔

.... کی گود میں بلی دیکھ کر

تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے؟
رمز آغاز محبت کی بتا دی کس نے؟
ہر ادا سے تری پیدا ہے محبت کیسی
نیلی آنکھوں سے ٹپکتی ہے ذکاوت کیسی
دیکھتی ہے کبھی ان کو، کبھی شرماتی ہے
کبھی اٹھتی ہے، کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے
آنکھ تیری صفت آئنہ حیران ہے کیا؟
نور آگاہی سے روشن تری پہچان ہے کیا؟
مارتی ہے انھیں پونہچوں سے، عجب ناز ہے یہ
چھیڑ ہے، غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ؟
شوخ تو ہو گی، تو گودی سے اتاریں گے تجھے
گر گیا پھول جو سینے کا تو ماریں گے تجھے
کیا تجسس ہے تجھے؟ کس کی تمنائی ہے؟
آہ! کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے؟
خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
صورت دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں
شیشہ دہر میں مانند مے ناب ہے عشق!
روح خورشید ہے، خون رگ مہتاب ہے عشق
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی
کہیں سامان مسرت، کہیں ساز غم ہے!
کہیں گوہر ہے کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

٭

زیرِ تشریح نظم کا مرکزی کردار اگرچہ بظاہر ایک بلی ہے لیکن اگر اس کے اشعار کو گہرائی میں جا کر اور نظم کے عنوان کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھا جائے تو اقبال نے بالواسطہ طور پر یہاں اپنی محبوبہ کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ بعض شارحین کے نزدیک یہ نظم عطیہ فیضی اور بعض کے مطابق بمبا دلیپ سنگھ کے بارے میں کہی گئی ہے۔ موخر الذکر خاتون بمبا دلیپ سنگھ واضح رہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی تھی۔ وہ کہتے ہیں۔

① **معنی**: **دزدیدہ نگاہی**: چوری چوری آنکھوں سے دیکھنا۔ **ذکاوت**: عقلمندی۔ **صفت آئنہ**: آئینہ کی طرح۔

مطلب: اے بلی یہ تو بتا تو جس طرح میری جانب کن اکھیوں سے دیکھ رہی ہے نظارے کے اس انداز کی تربیت تجھے کس نے دی ہے یہ عمل تو آغاز محبت سے عبارت ہے۔ یوں بھی تیری ہر حرکت اور ادا سے محبت کا اظہار ہو رہا ہے۔ تیری نیلی آنکھوں سے جس ذہانت کا اظہار ہو رہا ہے اس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ کبھی تو اپنی مالکہ کی جانب دیکھتی ہے اور کبھی شرمیلی نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ کسی لمحے گود میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور کبھی یوں آنکھیں موند لیتی ہے جیسے محو خواب ہو۔

اے پیاری بلی! تیری آنکھیں تو آئینے کی طرح حیرت کا منظر پیش کر رہی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تو پس پردہ حقیقت سے پوری طرح سے آگاہی رکھتی ہے۔ اور مختلف انداز سے جس جذبے کا اظہار بھی کر رہی ہے۔ ناز و انداز کے اظہار کے تو نے یہ عجب طریقے سیکھے ہیں کہ کبھی اپنی مالکہ پر پنجے آزماتی ہے کبھی خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ نفرت اور غصہ ہے یا محبت کا کوئی انداز! شاید تجھے معلوم نہیں کہ اس طرح کی شوخ ادائیں زیادہ دکھائے گی تو تیری مالکہ تجھے اپنی گود سے اتار پھینکے گی اور اگر اس کے سینے پر انکا پھول گر گیا تو تجھے اس کی سزا ملے گی۔

⑦ سے (11): **معنی**: **تجسس**: تلاش۔ **دہر**: دنیا۔

مطلب: نہ جانے تجھ کس شے کا تجسس ہے اور کس جذب کی تلاش ہے اور تیرے دل میں کونسی آرزو پوشیدہ ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تو بھی میری طرح اس فرد کی شیدائی ہے۔ جو میری محبوبہ ہے۔ لگتا ہے تیرے دماغ میں بھی جنونِ عشق کا سودا سمایا ہوا ہے۔ تیرے رویے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عشق کا جذبہ صرف انسان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ حیوانوں کو بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ہر جاندار کے سینے میں دل موجود ہے اور جذبہ عشق کا مسکن دل ہی تو ہوتا ہے۔

میں اس حقیقت کا انکشاف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دل کو اگر پیمانہ تصور کر لیا جائے تو جذبہ عشق اس پیمانے میں شراب کے مانند ہے۔ عشق تو سورج کی روح کی مانند ہے اور چاند کی کرنوں سے بھی عبارت ہے۔ مٹی کے ہر ذرے میں دیکھا جائے تو عشق کی کسک پوشیدہ ہے۔ یہ تو ایسا نور ہے جس کی جھلک ہر شے میں موجود ہے لیکن یہ اپنی متضاد خصوصیتوں میں کہیں مسرت کا سبب ہے کہیں غم و اندوہ کا! کہیں موتی ہے کہیں آنسو اور کہیں مجسم ہے۔

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا کھول دیتی ہے کلی سینہ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

میرے خورشید! کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینے میں عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لیے روشنی ہو تری گہوارہ مرے دل کے لیے
ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوز حیات ہو عیاں جوہر اندیشہ میں پھر سوز حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

*

پہلا حصہ: معنی: عارض: چہرہ۔ سینہ زریں: کلی کے اندر زرد رنگ کا مادہ' مراد سنہرا۔ جلوہ آشام: مراد طالب جلوہ۔ سینہ شگافی: سینے کا کھلنا یا تازگی۔

مطلب: اس نظم میں کہا گیا کہ جس لیے سحر اپنا عارض رنگیں دکھاتی ہے یعنی شب کے خاتمے پر صبح کا چمکیلا روپ ظاہر ہوتا ہے تو اس روپ کو جذب کرنے کے لیے غنچہ چٹکتا ہے اور پھول بن جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ غنچہ صبح کے وقت حقیقی معنوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے اپنا دامن بھر لیتا ہے۔ یہ غنچہ سورج کے روبرو اپنا دل چیر کے اس طرح سے رکھ دیتا ہے کہ عملاً سورج کی کرنوں کے طفیل وہ سینہ شگافی کا لطف بھی اٹھاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایک کلی علی الصبح طلوع آفتاب کے لمحات میں چٹک کر سورج کی کرنوں سے حقیقی معنوں میں یوں لطف اندوز ہوتی ہے کہ انبساط و مسرت سے پھول بن جاتی ہے۔

دوسرا حصہ: معنی: جوہر اندیشہ: قوت فکر۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال سورج کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کبھی تو بھی اپنی حقیقت سے مجھے آگاہ کر کہ میری بیتاب نظریں تیرے نظارے کو تڑپتی رہتی ہیں۔ میری آرزو ہے کہ تو میرے سینے کے اندر جلوہ افروز ہو جائے اور میرے دل کے آئینے میں تیرا عکس موجزن ہو جائے۔ تیرا نظارا میرے دل کے لیے روشنی کی مانند ہو اور یہی روشنی میرے دل کے لیے گہوارہ بن جائے۔ اس صورت میں میری زندگی مسرت و انبساط کی حامل ہو سکے گی تاکہ میری فکر اور سوچ کے ذریعے زندگی کا سوز عطا ہو۔ تو بے شک مجھ سے دور چمکتا ہے پھر بھی میں تیرا نظارہ کرنے کا خواہاں ہوں اور غنچہ کی مانند تیری روشنی سے استفادہ کر سکوں۔ اس صورت میں اپنی مضطرب زندگی کے حقائق دوسروں پر نمایاں کر دوں گا اور جو خیالات میرے دل میں پوشیدہ ہیں وہ بھی سامنے آ جائیں گے۔

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا چلنا، چلنا، مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب تارے، انساں، شجر، حجر، سب
ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟
کہنے لگا چاند، ہم نشینو! اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں! جو ٹھیرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

*

اس نظم کے عملاً دو حصے ہیں جن میں ستاروں اور چاند کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم ان انگریزی نظموں سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی ہے جو فطرت کے مظاہر سے ہم آہنگ ہیں۔ زیر تشریح نظم کے ابتدائی حصے میں ستارے، چاند سے یوں استفسار کرتے ہیں۔

پہلا حصہ: معنی: بیتاب ہے: یعنی متحرک ہے۔

مطلب: طلوعِ سحر کے خدشے کے پیش نظر ستارے، چاند سے پوچھتے ہیں کہ یہ تو بتا کہ ہم جو چمک چمک کر تھک چکے ہیں اس کے باوجود آسمان کے نظاروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کام تو صبح و شام گردش میں ہی رہنا ہے اور یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

اے چاند! اتنا بتا دے کہ اس عالمِ رنگ و بو کی ہر شے تغیر سے کیوں دوچار ہے۔ ان کے اضطراب میں کمی کیوں نہیں آتی جسے سکون کہا جاتا ہے۔ یہاں اس کو آنکھیں ترستی ہیں۔ یہاں تو ہر جانب سب لوگ سفر میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہماری بات تو الگ رہی یہ انسان، درخت اور پتھر سب ہی سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ آخر اتنا تو ہمیں پتہ چلے کہ یہ سفر کبھی اور کسی مرحلے پر جا کر ختم بھی ہو گا اور کبھی ہم اپنی منزلِ مقصود کو بھی دیکھ سکیں گے یا نہیں! مراد یہ ہے کہ ستاروں کے الفاظ میں اس کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے کسی کو بھی سکون حاصل نہیں! سفر جاری ہے اور منزل ناپید!

دوسرا حصہ: معنی: مزرعِ شب: رات کی کھیتی۔ **اشہبِ زمانہ:** زمانے کا گھوڑا۔ **خرام کا حسن:** یعنی

جدوجہد کا نتیجہ۔

مطلب: ان اشعار میں چاند جو بڑی خامشی کے ساتھ ستاروں کی باتیں سن رہا تھا یوں گویا ہوا کہ اے ہم نشینو! بے شک تم نے رات کی کھیتی سے فیض حاصل تو کیا لیکن میری بات غور سے سنو! کہ اس کائنات کا وجود تغیر اور حرکت میں ہی پوشیدہ ہے کہ یہی اس جہان کا قدیم اصول ہے۔ اس زمانے کو اگر گھوڑے سے تشبیہ دی جائے تو یوں سمجھو کہ گھوڑا خواہش کے چابک کھا کھا کر دوڑتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ضرورت عملاً زمانے کو حرکت میں رکھتی ہے۔ یہی اصول ازل سے چلا آ رہا ہے۔

چنانچہ منزل تک پہنچنے کے لیے جو مسافت مقرر ہے اس میں ٹھہرنے کا عمل بے موقعہ اور قطعی نامناسب ہے۔ اس لیے کہ کسی مقام پر ٹھہرے تو یوں سمجھ لو کہ مارے گئے۔ یعنی دوران سفر کہیں رکنا موت سے ہم کنار ہونے کے مترادف ہے۔ جو لوگ عازم سفر اور حرکت میں رہتے ہیں اور منزل کا تعین کر لیتے ہیں وہ ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں اس کے برعکس جو مسافر راہ میں دم لینے کے لیے رک گئے انہیں عقب سے آنے والے روند کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ حرکت اور روانی ہی ہر شے کو بناتی سنوارتی ہے۔ اسی عمل کو حسن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کائنات کی جملہ اشیا عشق کی بدولت حرکت میں رہتی ہیں اور آخر میں سنور کر حسن کا روپ دھار لیتی ہیں۔

وصال

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا، شرماتا تھا میں

میرے پہلو میں دلِ مضطر نہ تھا، سیماب تھا
ارتکابِ جرمِ الفت کے لیے بیتاب تھا

نامرادی محفلِ گل میں مری مشہور تھی!
صبح میری آئنہ دارِ شبِ دیجور تھی

از نفس در سینہ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

غازۂ الفت سے یہ خاک سیہ آئینہ ہے
اور آئینے میں عکسِ ہمدمِ دیرینہ ہے

قید میں آیا تو حاصل مجھکو آزادی ہوئی
دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کر دی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا واسوختی

*

پہلا حصہ ① سے ⑤ **معنی:** **گل:** پھول۔ مراد محبوب۔ **بلبل:** مراد ہمدم دوست۔ **سینہ خوں**

گشتہ: خون سے لبریز سینہ۔ **غوغائے محشر:** قیامت کا شور۔

مطلب: اس نظم میں اقبال پھول کی رعایت سے بلبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح تو پھول کے لیے مضطرب اور بے چین رہتا ہے اپنے محبوب و مطلوب کے لیے میں بھی ایسی طرح مضطرب رہا ہوں۔ یہ میرے مقدر کی خوبی ہے کہ اب میرا مطلوب مجھے مل گیا ہے۔ اس کے ہجر میں تو میں خود بھی تڑپتا رہتا تھا اور اپنے اشعار کے ذریعے دوسروں کو بھی مضطرب اور بے چین رکھتا تھا۔ محبوب کے وصال سے قبل میرے پہلو میں دل کی کیفیت پارے کے مانند تھی جو ہر لمحے تڑپتا رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میرا دل ہمیشہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بیقرار رہتا تھا۔ ان دنوں احباب میں میری نامرادی کا چرچا عام تھا۔ یہاں تک کہ میری صبح بھی اندھیری رات کے مانند تھی۔ ان لمحات میں میرے خون شدہ سینے میں سانس کی آمدورفت اس نوعیت کی تھی جیسے کوئی نشتر چلا رہا ہو۔ جب کہ میری خامشی میں قیامت کے ہنگامے پوشیدہ تھے۔

زیر تشریح نظم کی تفصیل میں جانے سے قبل اس امر کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی تھی بلبل جو پھول پر اپنی جان نچھاور کرنے پر آمادہ رہتی ہے جب اس کی جدائی کے کرب سے آشنا ہونے سے اس کا ملاپ پھول سے ہوتا تو کس کی کفیت سے دوچار ہوتی ہے۔ اقبال نے بھی اسی مماثلت سے اپنے محبوب کے فراق کے بعد وصال کی کیفیت کا خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے۔

دوسرا حصہ: معنی: غازہ: پاؤڈر۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ محبوب سے وصال کے بعد میرے تاثرات میں اضطراب و انتشار کی کیفیت ختم ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں میرے اشعار میں وہ شگفتگی اور مسرت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میرے احباب ماضی کی طرح پریشان ہونے کے برعکس ان اشعار سے بڑی حد تک لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ عشق کی حرارت سے میرے آبلوں میں حرارت پیدا ہو گئی ہے اور میرے نالے اب بجلیوں سے کھیل رہے ہیں یعنی ان میں بجلی کی سی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ محبت کے جذبے نے میرے آئینہ دل میں چمک پیدا کر دی ہے جس میں محبوب کا عکس نمایاں ہو رہا ہے۔ عشق کی قید میں گرفتار ہوا تو میرے دلی جذبات کو حقیقی آزادی حاصل ہو گئی۔ میں نے اپنے دلی جذبات اپنے محبوب پر نچھاور کر دیے تو یوں محسوس ہوا کہ میرا ویران دل صحیح معنوں میں آباد ہو رہا ہے۔ یہ وصال ایک ایسے خورشید کی مانند ہے جو میرے جذبات کے ستاروں کو روشنی اور تابندگی عطا کر رہا ہے اور جس کی راہ میں سرگرداں غبار کے سبب خود روشنی بھی شرمسار ہو رہی ہے۔ آخری شعر فارسی زبان میں ہے جس میں محبوب سے مخاطب ہو کر اقبال کہتے ہیں کہ تو نے مجھ پر ایک نظر ڈال کر عشق میں فنا ہونے کا طریقہ سکھا دیا ہے وہ لمحات خوب تھے۔ جب تیرے عشق نے میرے جسم کے خاشاک کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔

سلیمیٰ

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے　　خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا — شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا — شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر — ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری کمال اس کا

*

معنی: نمود: ظہور۔ چشم ستارہ بیں: ماہر فلکیات۔ **ظلمت کدہ:** اندھیری جگہ۔ پیرہن: کرتہ، لباس۔

مطلب: یہ مختصر سی نظم اگرچہ محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے اس کے باوجود گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے۔ نظم کی مرکزی کردار سلیمیٰ بظاہر علامہ اقبال کی پسندیدہ خاتون ہے یا محبوبہ! اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن نظم کے اشعار میں باری تعالیٰ کی جو خصوصیات کائنات کے جملہ عناصر میں نظر آتی ہیں وہ ان کے بقول سلیمیٰ کی نیلی آنکھوں میں محفوظ ہیں۔

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ خالق کائنات جس کا جلوہ ستاروں کا نظارہ کرنے والی آنکھوں نے دیکھا۔ سورج، چاند اور تاروں کے جھمکٹے میں غور سے دیکھیں تو وہی نظر آتا ہے۔ جس کو صوفی نے اپنے دل کے ظلمت کدے میں پایا۔ اس کے علاوہ شاعر اس کے نور کو فطرت کے بانکپن میں محسوس کرتا ہے۔

وہ باری تعالیٰ جس کا جلوہ شبنم کے قطروں میں اور جس کی خوشبو پھولوں میں موجود ہے وہی جس نے عالم سکوت میں صحرا میں اپنی بستی بسائی ہوئی ہے اور جس کے وجود کے باعث کائنات میں ہمہ وقت ہنگامہ اور رونق برقرار رہتی ہے۔ بے شک وہی ہے جس کا حسن دنیا کی ہر شے میں موجود ہے لیکن اے سلیمیٰ تیری خوبصورت آنکھوں میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام کمالات کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ مراد یہ کہ جلوۂ خداوندی کا مشاہدہ کرنا ہے تو پھر اسے پورے کمالات کے ساتھ سلیمیٰ کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھنا چاہیے۔

عاشق ہرجائی

①

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال! تو — رونق ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا! — زینت گلشن بھی ہے، آرائش صحرا بھی ہے
ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعت پرواز سے — اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے
عین شغل مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگ مشرب مینا بھی ہے
مثل بوئے گل لباس رنگ سے عریاں ہے تو — ہے تو حکمت آفریں، لیکن تجھے سودا بھی ہے
جانب منزل رواں بے نقش پا مانند موج — اور پھر افتادہ مثل ساحل دریا بھی ہے

حسن نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے ۔۔۔ پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے
تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنن پر مدار ۔۔۔ تو کبھی ایک آستانے پر جبیں فرسا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب ۔۔۔ اے تلون کیش! تو مشہور بھی، رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بیتابی کے صدقے، ہے عجب بیتاب تو

②

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے ۔۔۔ مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
ہیں ہزاروں اس کے پہلو، رنگ ہر پہلو کا اور ۔۔۔ سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں
دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز ۔۔۔ کیا خبر تجھکو، درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے ۔۔۔ مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر ۔۔۔ حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں
بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز ۔۔۔ سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں
موجبِ تسکیں تماشائے شرارِ جستجو ۔۔۔ ہو نہیں سکتا کہ دل برق آشنا رکھتا ہوں میں
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش ۔۔۔ آہ! وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں
جستجو کل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے ۔۔۔ حسن بے پایاں ہے، دردِ لادوا رکھتا ہوں میں
زندگی الفت کی دردِ انجامیوں سے ہے مری ۔۔۔ عشق کو آزادِ دستورِ وفا رکھتا ہوں میں
سچ اگر پوچھے تو افلاسِ تخیل ہے وفا ۔۔۔ دل میں ہر دم اک نیا محشر بپا رکھتا ہوں میں
فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب ۔۔۔ تشنۂ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں
مجھکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا ۔۔۔ نقش ہوں، اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں
محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن ۔۔۔ پھر تخیل کس لیے لاانتہا رکھتا ہوں میں
در بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما
موجِ بحریم و شکستِ خویش بر دوشیم ما

*

زیرِ تشریح نظم "عاشقِ ہرجائی" خود علامہ اقبال کی اپنی شخصیت سے متعلق ہے جس میں علی الترتیب دس اور پندرہ اشعار شامل ہیں۔ نظم کی تشریح سے قبل اس کے عنوان کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہرجائی عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس اعتبار سے اس عنوان کا مفہوم "بے وفا عاشق" ہونا چاہیے۔ جب کہ یہاں اس لفظ کی بعض دوسری جہات بھی سامنے آتی ہیں جن کے تحت اس کے معنی ہیں ہر جگہ موجود رہنے والا، ہر ایک سے تعلق رکھنے والا اور ایک ایسا شخص جو کسی ایک مقام سے وابستہ نہ رہ سکے۔ اب نظم کے اولین حصے کے اشعار کی طرف آئیے۔

پہلا حصہ: ① سے ⑩ معنی: مجموعہ اضداد: ایسے اوصاف کا مجموعہ جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ زمیں فرسا: زمین پر چلنے پھرنے والا۔ مانند موج: لہر کی طرح۔ تفنن: گوناں گونی۔ جبیں فرسا: پیشانی گھسنے والی۔ تلون کیش: وہ شخص جو اپنے انداز بدلتا رہے۔

مطلب: اس بند کے اشعار سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ کوئی اور شخص اقبال سے اس کی ذات اور ان کی خصوصیت کے بارے میں استفسار کر رہا ہے لیکن خیال یہی ہے کہ نظم کے پہلے حصے میں اقبال خود ہی اپنے آپ سے مکالمہ کر رہے ہیں جب کہ دوسرے حصے میں ان استفسارات کے جواب دیتے ہیں جو پہلے حصے میں اٹھائے گئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اے اقبال! یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو متضاد صفات کا حامل ہے۔ کبھی تو پوری محفل کی رونق تیرے دم سے ہے اور کبھی تنہائی کا شکار نظر آتا ہے۔ تیرے نغموں نے وہ ہنگامے برپا کیے ہیں جن کے سبب خواہ گلستان ہو خواہ صحرا دونوں میں بہار آئی ہوئی ہے۔ تیرے تخیل کی بلندی نے عملاً تجھے فلک پر درخشندہ ستاروں کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ ہر چند کہ تیری بود و باش تو زمین پر ہی اس کے باوجود آسمانوں تک بھی تیری رسائی ہے۔ تو شراب پیتا ہے اور اسی عالم میں حیرت ہے کہ خالق حقیقی کے حضور سجدہ ریز بھی ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تیرے مسلک میں شراب حرام نہیں بلکہ حلال ہے۔

جس طرح پھول کی خوشبو کسی رنگ اور لباس کی محتاج نہیں کچھ ایسی ہی کیفیت تیری بھی ہے۔ اگرچہ تیرا وجود حکمت و دانش سے بہرہ ور ہے۔ اس کے باوجود تیری شخصیت میں کچھ جنوں کے آثار بھی ہیں جس طرح پانی کی لہر اپنا کوئی نشاں چھوڑے بغیر رواں دواں رہتی ہے اسی طرح تو بھی منزل کی طرف رواں ہے لیکن تمام تر حرکت کے باوجود دریا کے کنارے ایک ہی مقام پر ٹھہرا ہوا بھی ہے۔

تیری فطرت کے لیے حسن نسوانی بجلی کی مانند کشش انگیز ہے۔ اس کے باوجود اس حسن کے لیے تیرے دل میں بے نیازی کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جو کسی روایتی عاشق کے رویے سے قطعی مختلف ہے۔ تیری زندگی کا انحصار عملی سطح پر تغیر اور انقلاب سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کسی ایک مقام اور آستانے سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ حسینوں کی بزم میں تجھے ایک ایسے فرد کی مانند گردانا جاتا ہے جو وفا سے نا آشنا ہوتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ تجھے بے وفا کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ تجھ میں مستقل مزاجی نام کو نہیں۔ اسی باعث تو ہر جگہ بدنام اور رسوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو اس عالم رنگ و بو میں پارے کی سی صفات لے کر آیا ہے۔ تیری مضطرب کیفیت کے قربان جایئے! بے شک تو عجب بے چین اور بے تاب انسان واقع ہوا ہے۔

دوسرا حصہ: ① سے ⑦ **معنی:** **آشفتگی:** پریشانی۔ **رستخیز:** قیامت۔ **شرار جستہ:** تڑپ کر اچھلنے والی چنگاری۔

مطلب: جیسا کہ اس نظم کے ابتدائی حصے میں جتایا گیا ہے کہ دوسرے حصے میں اقبال ان استفسارات کا جواب دیتے ہیں جو پہلے حصے میں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عشق کی آشفتہ سری نے میری شخصیت کو ویران و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور سچ پوچھیے تو زیر لباس جو جسم چھپا ہوا ہے وہ گوشت پوست کا نہیں بلکہ مٹی کا ہے۔ میرے دل کے اسی طرح بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو کا رنگ ایک ترشے ہوئے ہیرے کے رنگوں کی مانند ہیں کہ یہ رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دیکھا جائے تو شاعر کا دل عملاً دل نہیں ہوتا بلکہ یہ تو ایک طرح سے جذبات و احساسات کے ہنگاموں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ اے بے خبر! تجھے کیا پتہ کہ اس سینے میں کیا ہے؟ دل یا کوئی اور شے! کہ یہ سکون سے بالکل بے گانہ ہے۔ میری ہر کیفیت میں ایک نئے جلوے کی آرزو پوشیدہ ہے۔ یہی باعث ہے کہ میرا دل

بے چین رہتا ہے۔ یہی بے چینی میرا سکون برباد کیے ہوئے ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میرے پیش نظر عام طور پر ایک نیا مظہر حسن ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ امر بھی واضح ہے کہ میں نے ہمیشہ حسن سے جو پیمان وفا باندھا ہوتا ہے وہ ہمیشہ مستحکم ہوتا ہے۔

یہ بھی سن لو! کہ میرے حوالے سے جس شے کو بے نیازی کہا جاتا ہے وہی تو میری فطرت میں عجزو انکسار کی آئینہ دار ہے۔ جس طرح صبا تجسس اور سوز و ساز کی آئینہ دار ہوتی ہے میرے دل کا عالم بھی ایسا ہی ہے۔ لمحے بھر کے لیے لو دینے والی چنگاری کا نظارہ میرے لیے کسی طور پر بھی سکون کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ میرا دل تو بجلی کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ ہے جو کسی بھی شے کو خاکستر بنا دینے کی قدرت رکھتی ہے۔

⑧ سے (15) **معنی** : **دردِ انجامیوں** : وہ کیفیت جس کی انتہا درد ہے۔ **افلاس تخیل** : خیال کی ناداری۔ **شبنم آسا** : شبنم کی مانند۔ **تنک جلوہ** : خفیف جھلک دکھانے والا۔

مطلب : اس شعر میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ میں اس مکمل جلوے کے دیکھنے کا متمنی ہوں جس کو دیکھنے کے بعد عشق کا ہر تقاضا پورا ہو جائے۔ باری تعالیٰ کے جلوے کی تلاش و جستجو مجھے دنیا کی مختلف اشیا میں جھانکنے کی طرف مائل کرتی ہے اور جس طرح حسن کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہوتی بالکل یہی کیفیت میرے دل کے درد کی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس درد کا کوئی علاج نہیں۔

چونکہ میری پوری زندگی محبت کی ناکامیوں کے درد سے عبارت ہے اس لیے یہ امر قطعی حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیے کہ میں اپنے عشق کو وفا کی پابندیوں میں محصور نہ کروں۔ اس امر کی وضاحت وہ زیر تشریح شعر میں یوں کرتے ہیں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ وفا عملی سطح پر تخیل کے افلاس کا دوسرا نام ہے اور میرا تخیل چونکہ مفلس نہیں اس لیے میں اپنے دل میں ہر لمحے ایک نیا ہنگامہ برپا رکھتا ہوں۔

میرا دل تو اس قدر وسیع الظرف ہے کہ اس میں دریا بھی سما سکتے ہیں جب کہ میرا ساقی جو شراب دے رہا ہے اس کی مقدار نہایت معمولی سی ہے جب کہ میں تو ایک ازلی پیاسا ہوں۔ یوں لگتا ہے میرے پیروں تلے آگ کا سمندر ہے۔ دراصل میری تخلیق کے باعث دیکھا جائے باری تعالیٰ نے خود ہی اپنا نقاد پیدا کر لیا ہے۔ میں تو فی الواقع ایک ایسی تصویر ہوں جسے اپنے مصور سے گلا ہے کہ جب اس دنیا میں حسن کا جلوہ اتنا ہی محدود تھا تو پھر مجھے وہ فکر و تخیل کیوں دیے جن کی پرواز کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تو تلاش و جستجو کے صحرا میں مسلسل جدوجہد میں مصروف ہوں اور سمندر کی موجوں کی طرح اپنی شکست کا سامان خود اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتا ہوں۔

کوشش ناتمام

فرقت آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح
چشم شفق ہے خوں فشاں اختر شام کے لیے

رہتی ہے قیس روز کو لیلیٰ شام کی ہوس
اختر صبح مضطرب تاب دوام کے لیے

کہتا تھا قطب آسماں قافلہ نجوم سے
ہمرہو! میں ترس گیا لطف خرام کے لیے

موجہ بحر کو تپش ماہ تمام کے لیے　　سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کا ندیوں کو عشق!
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لیے　　حسن ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

*

یہ مختصر نظم محض چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ تاہم اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اقبال نے اپنی مخصوص امیجری استعمال کرتے ہوئے موجودات اور ان کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں بعض رازہائے سربستہ کھولے ہیں جن سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر شے تلاش و جستجو اور حرکت و عشق کے سبب زندہ ہے۔

معنی : فرقت آفتاب: سورج کی جدائی۔ **خوں فشاں**: خون روتی ہے۔ **تاب دوام**: ہمیشہ کی چمک۔ **لطف خرام**: چلنے کا مزہ۔ **خجستہ گام**: مبارک قدم والا۔

مطلب: چنانچہ زیر تشریح اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ سحر' آفتاب عالمتاب کی جدائی میں بے چین و مضطرب رہتی ہے اور چشم شفق' ستارۂ شام کے فراق میں خون کے آنسو بہاتی ہے۔ اگر دن کے وقت کو مجنوں اور شام کو لیلیٰ تصور کر لیا جائے تو یہ مجنوں اپنی لیلیٰ کو پانے کا خواہاں رہتا ہے۔ جب کہ ستارۂ صبح جو تھوڑی دیر کے لیے چمکتا ہے ہمیشہ زندہ رہنے اور چمکنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔

قطب ستارہ و آسمان پر ایک ہی مقام پر چمکتا رہتا ہے۔ زبان حال سے دوسرے ستاروں سے کہتا ہے کہ میں تو کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں اور چلنے کا لطف حاصل کرنے کے لیے بری طرح سے ترس رہا ہوں۔ چشمے ندیوں تک پہنچنے اور ندیاں سمندر میں شامل ہونے کے عشق میں مبتلا رہتی ہیں جب کہ سمندر کی موجیں چودھویں رات کے چاند کی منتظر رہتی ہیں۔ حسن ازل جو لالہ و گل اور دوسرے مظاہر فطرت میں پوشیدہ ہے۔ سنا ہے کہ اپنا جلوہ دکھانے کے لیے مضطرب ہیں۔ اس صورت حال میں اگر کوئی رازہائے زندگی سے آشنا ہونا چاہے تو حضرت خضر سے رجوع کرے۔ وہ یہی جواب دیں گے کہ زندگی کا راز تلاش و جستجو اور حرکت و عشق میں مضمر ہے۔

نوائے غم

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش　　جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربط کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار　　جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستان نوا کا ہے امیں جس کا سکوت　　اور منت کش ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
آہ! امید محبت کی بر آئی نہ کبھی!
چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی
مگر آتی ہے نسیم چمن طور کبھی!　　سمت گردوں سے ہوائے نفس حور کبھی

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تار حیات جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتار حیات
نغمہ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے اشک کے قافلے کو بانگ درا اٹھتی ہے

جس طرح رفعت شبنم ہے مذاق رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

*

پہلا بند معنی: **رباب**: سارنگی کی قسم کا ایک ساز۔ **بربط**: ایک ساز۔ **محشرستان**: نغموں کی قیامت گاہ۔ **منت کش**: احسان مند۔ **مضراب**: ساز بجانے کا آلہ۔

مطلب: دو بند کی اس مختصر نظم میں اقبال اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری زندگی اس رباب کے مانند ہے جو بظاہر خاموش ہے لیکن جس کے تاروں میں ہر انداز کے نغمے پوشیدہ ہیں اور جس کی خامشی پر کائنات کا وہ ساز بھی نثار ہے جس کا ہر سر دل بستگی کا آئینہ دار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس ساز کی خموشی بھی ایسی نواؤں کی مظہر ہے جو اہل دل کے سینے میں حشر برپا کر دیتی ہیں اور جن کی خامشی کسی ہنگامے کی آئینہ دار نہیں ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ میں نے محبت کی جو آرزو کی وہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی اور میرے قلب پر کبھی اس جذبے نے کوئی زخم نہیں لگایا۔

دوسرا بند معنی: **بانگ درا**: قافلہ کی گھنٹی کی آواز۔ **مذاق رم**: اڑ جانے کا ذوق۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ محبت کے جذبے سے محرومی کے باوجود کبھی کبھی طور سینا سے عشق حقیقی کی ایک لہر میرے دل کے دروازے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح آسمان کی جانب سے حوروں کے انفاس کی معطر ہوا کی مجھ تک رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ سب مل کر قدرے آہستگی کے ساتھ میری زندگی کے تار چھیڑ دیتی ہیں جس کے سبب زندگی کے دام میں گرفتار روح آزاد ہو جاتی ہے۔ اس لیے غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی ایک دھیمی سی آواز بلند ہوتی ہے۔ اس آواز کو سن کر میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔

چنانچہ دیکھا جائے تو جس طرح شبنم کے مرتبے کی بلندی سفر اور حرکت سے وابستہ ہے اسی طرح مایوسی اور نامرادی میری فطرت کے لیے مہمیز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

عشرت امروز

نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیام عیش و سرور نہ کھینچ نقشہ کیفیت شراب طہور
فراق حور میں ہو غم سے ہمکنار نہ تو پری کو شیشہ الفاظ میں اتار نہ تو
مجھے فریفتہ ساقی جمیل نہ کر بیان حور نہ کر، ذکر سلسبیل نہ کر
مقام امن ہے جنت، مجھے کلام نہیں شباب کے لیے موزوں ترا پیام نہیں
شباب آہ! کہاں تک امیدوار رہے وہ عیش، عیش نہیں جس کا انتظار رہے

وہ حسن کیا کہ جو محتاجِ چشمِ بینا ہو   نمود کے لیے منت پذیر فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
عقیدہ "عشرتِ امروز" ہے جوانی کا

*

معنی: **شراب طہور:** پاک شراب جو بہشت میں ملے گی۔ **فراقِ حور:** حور کی جدائی۔ **سلسبیل:** بہشت کی ایک نہر۔

مطلب: سات اشعار پر مشتمل اس مختصر نظم میں واعظ کو خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تو میرے سامنے حیات بعد ممات کا جو نقشہ پیش کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ موت تو فی الواقع عیش و عشرت کا پیغام ہے۔ اس کے ساتھ ہی تو مجھے شراب طہور کا جھانسہ بھی دے رہا ہے کہ جنت میں پینے پلانے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اور یہ کہ شراب طہور میں وہ نشہ ہے جو دوسری شرابوں میں نہیں۔

سوائے واعظ! میں تجھ سے واضح طور پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جنت کی حور کے تصور اور اس کی جدائی میں خود کو مایوسی کے کرب میں گرفتار نہ کر! ساتھ ہی دوسروں کے لیے اس پری کو لفاظی شیشے میں نہ اتار! اے واعظ! مجھے اس خیالی اور تصوراتی حسین و جمیل ساقی کے تذکرے میں نہ الجھا۔ نہ میرے روبرو حوروں کا تذکرہ کر۔ نا ہی جنت میں موجود اس نہر کا جسے سلسبیل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بے شک مجھے اس خیال سے اختلاف نہیں کہ جنت میں ہر طرح سے امن و امان ہو گا اور دنیا کی طرح ہنگامے نہیں ہوں گے لیکن اے واعظ! تیری یہ خوش کلامیاں عالم شباب کے لیے ناقابل التفات ہیں کہ جوانی کے نزدیک وہ عیش کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس کے لیے موت کے بعد تک کا انتظار کرنا پڑے۔ شباب کا عقیدہ تو یہ ہے کہ عیش و عشرت وہی ہے جو انسان کو آج حاصل ہو۔ شباب آخر کتنے عرصے تک حور و شراب اور ساقی کا انتظار کر سکتا ہے اس کے لیے تو عیش و عشرت وہی ہے جو اسے کسی انتظار کے بغیر حاصل ہو جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے واعظ! یہ تو بتا کہ اس حسن کی حیثیت کیا ہے جو کسی دیکھنے والی آنکھ کا محتاج ہو اور اپنے وجود کے اظہار کی خاطر مستقبل کا احسان اٹھانے پر مجبور ہو۔ جب کہ میں تو اس حسن کا قائل ہوں جس کو آج میری نگاہیں دیکھ رہی ہوں۔

زندگانی کا احساس تو اس مفروضے سے قطعی مختلف ہے جس کا اظہار اے واعظ تو ہمارے روبرو ہزار بار کر چکا ہے اس لیے کہ میرے نزدیک تو شباب اس عقیدے کا حامل ہے کہ جو کچھ ملنا ہے آج مل جائے' کل کا انتظار کون کرے۔

ان اشعار میں بظاہر اقبال نے حیات بعد ممات کے عقیدے کی نفی کی ہے۔ جنت' حور و غلماں اور شراب طہور کے بارے میں واعظ کو طنز کا نشانہ بنایا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے فرد کے جذبات کا اظہار کیا ہے کہ جو عالم شباب میں ہے۔ کس کا نقطہ نظر واعظ سے خیالات سے کسی طور پر بھی ہم آہنگ نہیں۔ وہ تو زندگی میں اس امر کا قائل ہے کہ عالم شباب میں ہی حقیقی لطف سے ہمکنار ہوا جا سکتا ہے۔

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا! راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟
ہے گرم خرام موج دریا دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اڑا رہی ہے شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے
تارے مست شراب تقدیر زندان فلک میں پا بہ زنجیر
خورشید وہ عابد سحر خیز لانے والا پیام "برخیز"
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر پیتا ہے مے شفق کا ساغر
لذت گیر وجود ہر شے سرمست مے نمود ہر شے
کوئی نہیں غمگسار انساں!
کیا تلخ ہے روزگار انساں!

*

معنی: راز جو: بھید تلاش کرنے والا۔ **گرم خرام**: چلنے میں مگن۔ **جادہ پیما**: جا رہا ہے۔ **پابہ زنجیر**: پاؤں میں زنجیر پہنی ہوئی ہے۔ **لذت گیر**: مزے لینا۔

مطلب: اقبال کی شاعری اور ان کے تصورات میں یہ امر ایک طرح سے بنیادی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے کہ وہ بے شمار مقامات پر ربِ ذوالجلال سے گلہ مند نظر آتے ہیں لیکن اس گلہ مندی میں ایک طرح سے اپنائیت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اس رویے کو تصوف کے حوالے سے بھی دیکھا سکتا ہے بہرحال یہ مقام اس موضوع پر کسی تفصیلی بحث کا نہیں۔ اسی حوالے سے زیرِ تشریح نظم بھی دیکھیے جس میں قدرت سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اے خدائے عز و جل! اس سے زیادہ انسان پر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کو کائنات کے اسرار و رموز سے واقفیت کے لیے اس میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا کیا دوسری طرف کائنات کے تمام اسرار کو بھی پردۂ غیب میں رکھا۔ اب جو میں ان بھیدوں کو جاننے کے لیے مضطرب ہوں اس کے باوجود یہ بھید مجھ پر نہیں کھلتے تو مجھے اپنی جستجو کی ابتداء اور انجام پر حیرانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کائنات تو ایک طرح سے شیشے کا گھر ہے جس میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو اس کے سامنے ہو! یہی وجہ ہے کہ کائنات کے تمام راز انسان کی حیرانی کا سبب ہیں۔

بظاہر کائنات کے مناظر اور ان کی صورت حال یہ ہے کہ دریا کی لہریں تیز رفتاری کے ساتھ محوِ سفر ہیں اور دریا جو ہے وہ اسی رفتار سے سمندر کی جانب گامزن ہے۔ فضاء میں موجود بادلوں کو ہوا اڑا کر بلندی پر لا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں اس نے اپنے شانوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ آسمان پر ستارے اس انداز

سے روشن ہیں جو ازل سے ان کے لیے مقدر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان ایک قید خانہ ہے جس میں ستاروں کو قید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اور ان کے پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔

سورج جو علی الصبح ایک طرح سے کسی عبادت گزار کی طرح طلوع ہوتا ہے ارد تمام عالم موجودات کے لیے مصروف کار ہونے کا پیغام لاتا ہے اس کا مقدر یہ ہے کہ شام کو مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر شفق کے جام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ غروب آفتاب کے بعد مغرب سے شفق نمودار ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر شے اپنے وجود سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور مسرور سرشار ہو کر خود کو ظاہر کرنے کے عمل میں ہے۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر کائنات میں صرف انسان ہی ایسی شے ہے جس کا کوئی ہمدرد و غمگسار نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شب و روز کس قدر تلخ واقع ہوئے ہیں۔

جلوۂ حسن

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب ۔۔۔ پالتا ہے جسے آغوش تخیل میں شباب
ابدی بنتا ہے یہ عالم فانی جس سے ۔۔۔ ایک افسانہ رنگیں ہے جوانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا ۔۔۔ منظر عالم حاضر سے گریزاں ہونا
دور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے ۔۔۔ عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے

آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں؟
خاتم دہر میں یا رب وہ نگیں ہے کہ نہیں؟

❁

معنی: سربہ گریباں: گریباں میں سر ڈالنا۔ ادراک: عقل۔

مطلب: یہ مختصر سی نظم محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال کے مختلف عناصر میں جلوۂ حسن کی موجودگی کے حوالے سے ایک ایسا نتیجہ اخذ کرتے ہیں جو بڑی حد تک تذبذب اور تشکیک سے ہم آہنگ ہے۔ ہر چند کہ بعض عناصر میں اس کے وجود کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اس کے باوجود وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ اقبال کہتے ہیں۔

جلوۂ حسن جو ہماری آرزوؤں اور خواہشات کو مضطرب رکھتا ہے جس کی پرورش کی ذمے داری جوانی نے اپنے تخیل کی آغوش میں لی ہوئی ہے اور جس کے سبب یہ عالم فانی ابدی حیثیت اختیار کیے ہوئے نظر آتا ہے اور جس کے نم سے شباب بذات خود ایک رنگین افسانے کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے یہی جلوۂ حسن جو ہمیں مختلف مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنا سکھاتا ہے اور جس کے سبب ہم اپنے حال اور اس کے مسائل سے کٹ کر رہ جاتے ہیں اور جو ہماری سوجھ بوجھ اور عقل کی خامیوں کو دور کرتا ہے اور جس کی وجہ سے عقل و خرد عملاً تاثر و احساسات کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی جلوۂ حسن کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ کیا وہ حسن موجود بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر دنیا کو انگوٹھی اور جلوۂ حسن کو نگینہ تصور کر لیا جائے تو انگوٹھی میں یہ نگینہ موجود بھی ہے یا نہیں۔

ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بیہوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

*

یہ نظم اقبال نے جرمنی میں ان دنوں لکھی جب وہ 1907ء میں وہاں فلسفے کے مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے گئے تھے۔ میونخ سے وہ ہائیڈل برگ چند روز کے لیے یوں گئے کہ وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کر سکیں۔ دریائے نیکر بھی ہائیڈل برگ کے گردونواح میں بہتا ہے۔ اسی دریا کے کنارے پر بیٹھ کر اقبال نے یہ اشعار کہے۔

معنی: نوا فروش: نغمے گانے والے یعنی پرندے۔ **سبز پوش:** مراد درخت۔ **بے درا:** گھنٹی کے آواز کے بغیر۔ **مراقبے:** گیان دھیان۔

مطلب: فرماتے ہیں کہ عجب منظر ہے۔ چاند کی چاندنی خاموش ہے اور دریا کے کنارے جو درخت ایستادہ ہیں ان کی شاخیں بھی ساکن و ساکت ہیں۔ اس وادی کے تمام چرند پرند اور سامنے پہاڑوں پر اگے ہوئے تمام سرسبز و شاداب پودے بھی اس طرح خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں جیسے تمام مظاہر فطرت اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکے ہوں۔ فطرت شاید مدہوش ہو کر رات کی گود میں سو رہی ہے۔

اس خامشی کا جادو کچھ ایسے چل رہا ہے کہ دریائے نیکر کا بہتا ہوا رواں دواں پانی بھی خاموش نظر آتا ہے۔ آسماں پر ستاروں کا قافلہ انتہائی خامشی کے ساتھ رواں دواں ہے اور کسی شور و شغب کے بغیر اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔ اس وادی کے پہاڑ' صحرا اور دریا اس طرح سے خاموش نظر آتے ہیں کہ ان کی خامشی سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت نہایت انہماک کے ساتھ گیان دھیان اور غور و فکر میں مصروف ہے۔ اس صورت حال میں اقبال اپنے دل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہاں کہ جملہ عناصر کی طرح تو بھی خاموش ہو جا اور غم کی آغوش میں سو جا۔

تنہائی

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟ انجم نہیں تیرے ہمنشیں کیا؟
یہ رفعت آسمان خاموش خوابیدہ زمیں، جہان خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے یعنی، ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

*

معنی: حزیں: غمگین۔ نسترن زار: موتی کے پھولوں کا باغ۔

مطلب: معلوم ہوتا ہے کہ "بانگ درا" میں اس دور کی جو نظمیں ہیں اقبال نے بیشتر مناظر فطرت کے حوالے سے تخلیق کی ہیں۔ ان میں کہیں کہیں ان کے فکر و فلسفے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے تاہم نظموں کی بنیادی خصوصیت ان کی امیجری ہے۔ زیر تشریح نظم "تنہائی" کو بھی انہی معروضات کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ نظم بھی محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے جن میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں۔

اے انسان! شب کی اس تنہائی میں تو خود کو کیوں ملول و افسردہ محسوس کر رہا ہے۔ تو نظر اٹھا کر دیکھتا نہیں کہ ستارے بھی تیرے ہم نشیں ہیں۔ تو ذرا غور کرے تو یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے گی کہ اتنا بلند ہونے کے باوجود آسمان بھی خاموش اور پر سکوت ہے اور یہ زمین تو اس طرح سے خاموش ہے جیسے سوئی ہوئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ پوری دنیا میں سناٹا ہے اور شور و شغب سے خالی ہے۔

اے انسان! ان مظاہر فطرت پر نظر ڈال کہ ان میں چاند، صحرا اور پہاڑ سب کچھ شامل ہیں ان کے باعث یہ کائنات پھولوں سے مزین ہے اور گلستان بنی ہوئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ جو خوش رنگ، خوبصورت اور پیارے پیارے موتی ہیں وہ تیرے آنسوؤں کی مانند ہیں۔ اے انسان! یہ تو بتا کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھلا تجھے اور کس شے کی تمنا اور ہوس ہے۔ جب کہ ساری فطرت اور تمام مناظر فطرت تیرے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر تیرے رفیق بن چکے ہیں۔

پیام عشق

سن اے طلبگار درد پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومنات دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا
نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو، ادا مثال نماز ہو جا
نہ ہو قناعت شعار گلچیں! اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا
گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانند شمع سوزاں میان محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

*

سات اشعار پر مشتمل اقبال کی یہ نظم عملی سطح پر ایک ایسے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے جو ابتدائی ایام میں ان کے فکر و فلسفے کا نمائندہ رہا۔ یہ امر پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ "بانگ درا" اقبال کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ان کی شاعری کے ابتدائی حصے پر مشتمل ہے۔ زیر تشریح نظم میں اقبال اپنے ہم عصر لوگوں کو پیغام دیتے ہیں۔

1

① سے ⑦ **معنی**: **غزنوی**: سلطان محمود غزنوی۔ **ایاز**: سلطان محمود کا مشہور غلام۔ **پیکار زندگی**: زندگی میں جدوجہد۔ **قناعت شعار**: قناعت پسند۔ **وفور گل**: پھولوں کی بہتات۔ **دامن دراز**: لمبے دامن۔ **صحرا نوردیوں**: بیاباں میں گھومنا۔ **آتش زن**: آگ لگانے والا۔ **فرقہ ساز**: فرقے بنانے والا۔

مطلب: اے میرے ہم عصر انسان! اگر تو عشق حقیقی کا طلبگار ہے تو میری طرح محبوب کی شخصیت کو عزیز رکھتے ہوئے تو بھی یہی رویہ اختیار کر۔ اگر دل کو سومنات کا مندر تسلیم کر لیا جائے تو میری شخصیت محمود غزنوی کے مماثل ہے جس نے اس مندر کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا جب کہ تجھے ایاز کا روپ دھار کر عجز و انکسار کا وہی رویہ اختیار کر لینا چاہیے جو ایاز کا خاصہ تھا۔ یہ جان لے کہ کائنات میں حصول عروج و کمال کے لیے سکندر اعظم جیسے فرمانروا کی شان و شوکت ضروری نہیں ہوتی۔ سکندر نے بے شک وہ تاریخی آئینہ ایجاد اور نصب کیا جو بعد میں تاریخ کا حصہ بن گیا لیکن جان لے کہ تیرے سینے میں بھی ایسے کمالات چھپے ہوئے ہیں تو اگر ان کو ظاہر کر دے تو تجھے بھی لوگ سکندر اعظم سے کم مرتبہ کا اہل نہیں سمجھیں گے۔

مسلسل جدوجہد زندگی میں عروج و کمال حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے بے شک تیری شخصیت ابھی پہلی رات کے چاند کی سی ہے تاہم مسلسل جدوجہد کے ذریعے یہ امر ناممکن نہیں کہ تو بدر کامل بن جائے یعنی انتہائی عروج و کمال حاصل کر لے۔ تجھے تو باری تعالیٰ نے ہزاروں برس قبل دنیا میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اسی طرح نماز کی ادائیگی کے لیے مخصوص ضابطوں پر عمل ضروری ہوتا ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین کر لے کہ کبھی کبھی قناعت کا شعار بھی حالات سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اگر خداوند ذوالجلال اپنی نعمتوں میں مزید وسعت پیدا کرتا ہے تو تیری طلب کا دامن بھی دراز ہو جانا چاہیے۔ بصورت دیگر تیرا رویہ کفران نعمت سے تعبیر کیا جائے گا۔

وہ دور تو کبھی کا ختم ہو چکا جب قیس کی طرح عشق میں لوگ صحرا نوردی اختیار کر لیتے تھے اور اپنے شہر کے علاوہ گھر اور عزیز و اقارب سے بھی بے نیاز ہو جاتے تھے اب تو یہ امر لازم ہے کہ شمع کی طرح محفل کو روشنی عطا کر۔ اس شعر میں اقبال نے عملاً رہبانیت کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اب تو لوگوں کے درمیان رہ کر ہی ملک و ملت کے لیے جدوجہد کرنا لازمی امر ہے۔

زیر تشریح شعر میں اقبال ایک اہم نکتہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں فرد کی زندگی تو مجازی اور غیر حقیقی ہوتی ہے جو ناقابل اعتبار ہے۔ کوئی بھی تو یہ نہیں جانتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا۔ جب کہ فرد کے بالمقابل قوم کا وجود حقیقی ہوتا ہے۔ افراد مٹ جاتے ہیں لیکن قومیں زندہ رہتی ہیں چنانچہ یہ امر لازم

ہے کہ ذاتی نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر قوم کی تعمیر کے لیے جدوجہد کی جائے۔

نظم کے اس آخری شعر میں اقبال اپنے عہد میں ہندی مسلمانوں کی فرقہ پرستی کو آزری اور بت تراشی کے علاوہ بت پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کا یہ رویہ افسوسناک ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس نوع کی بت پرستی سے دامن بچا کر مدینہ کی راہ اختیار کی جائے اور وہیں زندگی گزاری جائے۔

فراق

تلاش گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں — یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں
شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال — دعائے طفلک گفتار آزما کی مثال
ہے تخت لعل شفق پر جلوس اختر شام — بہشت دیدۂ بینا ہے حسن منظر شام
سکوت شام جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

یہ کیفیت ہے مری جان ناشکیبا کی! — مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز — صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز
یونہیں میں دل کو پیام شکیب دیتا ہوں
شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

*

پہلا بند معنی: طفلک گفتار آزما: وہ بچہ جو بولنے کی مشق کر رہا ہو۔ **تخت لعل شفق:** شفق کا لعل جڑا ہوا تخت۔ **بہشت دیدۂ بینا:** دیکھنے والی آنکھ کے لیے بہشت۔

مطلب: اقبال کی یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے جن میں سات اشعار ہیں۔ ان اشعار میں وہ محبوب سے ہجر و فراق کے لمحات میں اپنی نفسیاتی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری بے چینی اور اضطراب کا یہ عالم ہے کہ ایسے مقام پر جہاں تنہائی نصیب ہو سکے اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں چنانچہ اسی تلاش کے سبب مجھے ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لینا نصیب ہوا ہے۔ یعنی تنہائی کی تلاش پہاڑ کے دامن تک لے آئی ہے۔

یہاں پہاڑ سے نکلنے والے چشموں کی روانی سے اپنے نغمے پھوٹ رہے ہیں جو دلکشی اور محبوبیت کے حامل ہیں۔ یہ نغمات اس بچے کی آواز کے مانند ہے جو اپنی توتلی زبان میں بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اقبال کہتے ہیں کہ اب لمبے پہاڑ کے دامن سے بوقت شام سورج غروب ہونے کے عمل میں ہے اور اس کے سبب جو شفق پھوٹی ہے اس کے پس منظر میں شام کا ستارہ اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہو رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خوبصورت منظر بہشت کے مناظر کی طرح حسن و جمال سے ہم آہنگ ہے۔ محبوب کے ہجر و فراق میں شام کے وقت کا سکوت اور تنہائی میرے لیے ایک بہانہ ثابت ہو رہے ہیں کہ اپنے محبوب کی یاد میں نغمے گاؤں۔

دوسرا بند معنی: سرود: راگ، گیت۔

مطلب: پہلے بند میں محبوب کے ہجر و فراق کے سبب جو کیفیت پیدا ہوئی ہے اس کے تسلسل میں دوسرے بند کے اشعار میں اقبال اسی کیفیت کو دوسرے انداز میں اعادہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ

میری مضطرب، بے چین اور بے صبر روح کی حالت محبوب کی جدائی میں اس ننھے بچے کی مانند ہے جو کچھ بولنے کی کوشش میں غوں غاں کرتا رہتا ہے اور اس سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے اس کو کسی دوسرے شخص کی آواز سمجھ کر مسرت و خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کلکاریاں مارتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس تنہائی میں میں بھی اس ننھے بچے کی طرح اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہوں اور نغمے گا گا کر ہجر و فراق کی رات کو فریب دینے کی سعی میں ہمہ تن مصروف ہوں۔

مراد یہ ہے کہ محبوب سے جدائی اور فراق کی گھڑیاں ایک عاشق کے لیے اس قدر کرب آمیز اور جانگسل ہوتی ہیں کہ وہ تمام ہنگامہ ہاؤ ہو کو ترک کر کے کوئی ایسا گوشہ تنہائی تلاش کرتا ہے جہاں فراق کے اس کرب سے نجات حاصل ہو سکے وہاں وہ اپنی دھن میں اسی طرح ہجر و فراق کے نغمے گا کر خود کو اس طرح سے فریب دیتا ہے جیسے ایک ننھا بچہ اپنی غوں غاں کو دوسرے کی آواز جان کر خوش ہوتا ہے۔

عبدالقادر کے نام

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہر چہ در دل گذرد وقفِ زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

✱

زیرِ تشریح نظم سے اس امر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال نے یہ اشعار خط کی صورت میں اپنے بہترین اور جگری دوست سر عبدالقادر کے نام لکھ کر بھیجے تھے۔ اقبال اور سر عبدالقادر خیالات و نظریات کے حوالے سے اس قدر ہم آہنگ نظر آتے کہ علامہ کی شاعری کا ایک بڑا حصہ سر عبدالقادر کی زیر

ادارت مشہور زمانہ جریدے مخزن میں ہی شائع ہوا۔ اس امر کی شہادت میں مخزن کی فائلوں اور علامہ کی بعض دوسری تحریروں سے ہوتا ہے۔

معنی: افق خاور: مشرق۔ **شعلہ نوائی**: ایسے نغمے گانا جن سے شعلے نکلیں۔ **اثر صیقل عشق**: سچے عشق کی جلا کا اثر۔ **تپش آمادہ**: تڑپنے کے لیے تیار۔ **آئین نمو**: پھلنے پھولنے کا قانون۔ **سعدی و سلیمی**: عرب لڑکیوں کے نام۔ **در دل گذرد**: جو دل پر گزرتی ہے۔

مطلب: چنانچہ سر عبدالقادر سے مکالمہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یہ خطہ مشرق جو ہمیشہ علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے اور جس سے فہم و دانش کی روشنی ہمیشہ طلوع ہوتی ہے وہاں پر ظلمت، تاریکی اور جہالت نے اپنا تسلط جما لیا ہے۔ ان حالات میں ہم پر لازم ہے کہ اپنی جدوجہد اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اس ظلمت اور جہالت کو فکر و احساس کی روشنی سے منور کر دیں۔ ہم میں اظہار کی قوت تو موجود ہے۔ یہی قوت قوم و ملت کی فرسودہ بساط کو تہہ و بالا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اسی طور یہاں انقلاب کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔

اگر ہم ملت کو یہ باور کرا دیں کہ عشق حقیقی کو ہی تکمیل مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جائے اور حالات کا مقابلہ سچے جذبے اور تڑپ سے کیا جائے تو ہمارے حال کی سنگینی مستقبل کی خوش حالی اور بہتری میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اپنی قوم کو درخشاں ماضی کی جھلک دکھا کر اس کے افراد کے قلوب میں وہی جذبہ اور تڑپ پیدا کر دیں جو یوسفؑ کو دیکھ کر زلیخا کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ مراد یہ کہ حصول مدعا کا تصور بھی انسان کے لیے عمل ارتقاء کا موجب ہو سکتا ہے۔

قوم کو ترقی کے لیے اس طرح آمادہ کریں کہ وہ جدوجہد کر کے انتہائی عروج پر پہنچ جائے۔ اب تک تو ہم دوسروں کی تہذیب کے شیدائی رہے ہیں اور انہی کی نقل کرتے رہے ہیں لیکن اب یہ ضروری ہو گیا کہ ملت کو اپنی تہذیب اور اقدار کی طرف راغب کریں۔ افسوسناک امر تو یہ ہے کہ اب تو مدینے میں یعنی اسلامی دنیا میں بھی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی کہ دوسروں کو متاثر اور گرویدہ کر سکے لہٰذا یہ ضروری ہو گیا ہے کہ انہیں ایسی نئی روایت سے آگاہ کیا جائے جو ہماری بنیادی تہذیب اور اقدار سے ہم آہنگ ہو۔

اے میرے رفیق! اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگوں کو عام نشے سے مدہوش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اب تو ایسے نشے کی ضرورت ہے جو انتہائی جدید اور تیز ہو۔ ایسا نشہ جو آلات مے نوشی کو پگھلا کر رکھ دے۔ یورپ کے دوران قیام ہم ملت اسلامیہ کی تنظیم اور عروج کے لیے جو منصوبے بنایا کرتے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ان منصوبوں کو ان کی تفصیلات کے ساتھ افراد ملت کے دلوں میں منتقل کر دیں۔ بالکل شمع کی طرح کہ شمع خود بھی جلتی ہے اور اپنی روشنی سے بزم کو منور بھی کر دیتی ہے۔ ہمیں بھی شمع کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنی فکر و محسوسات کو اپنی تخلیقات کے ذریعے لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔

صقلیہ

(جزیرۂ سسلی)

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

آہ! اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے
ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیبِ اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگِ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصۂ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

*

ہسپانیہ کا مشہور جزیرہ صقلیہ جسے سسلی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ خلفائے عثمانیہ کے عہد میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پورا ہسپانیہ مسلمانوں کے زیر نگیں تھا۔ اقبال جب بحری جہاز کے ذریعے یورپ سے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو ان کا جہاز صقلیہ کے جزیرے سے بھی گزرا۔ ماضی کی شاندار تاریخ کے حوالے سے اس دم ان کے ذہن پر جو تاثرات مرتب ہوئے ان کا اظہار اس نظم میں کیا گیا ہے۔

پہلا حصہ معنی: خوننابہ بار: خون برسانے والی۔ عصرِ کہن: پرانا زمانہ۔ تیغِ ناصبور: بے صبر تلوار۔

مطلب: سترہ اشعار پر مشتمل یہ نظم عملاً تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اقبال پہلے حصے کے اشعار میں کہتے ہیں کہ وہ سامنے عرب مسلمانوں کی شان و شوکت اور تہذیب کا مزار نظر آ رہا ہے۔ اس کے باقیات کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھ اور پھر خون کے آنسو بہا لے! کبھی یہ جزیرہ ان عرب صحرا نشینوں کے اقتدار کا مظہر ہوا کرتا تھا جن کے لیے سمندر ایک تماشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جن کے خوف سے بڑے بڑے شہنشاہوں کے درباروں میں لرزہ آ جاتا تھا۔ اور جن کی تلواروں میں بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ جو دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر رکھ دیتی تھیں۔

ان مجاہدین کا وجود فرسودہ روایات کا خاتمہ کر کے ایک نئی تہذیب کو جنم دینے کا سبب بنا کرتا تھا۔ ان کی تلواروں نے ماضی کی فرسودہ روایات کو فنا کر کے رکھ دیا تھا۔ جن کے نعروں سے اس وقت کے مردہ عہد میں جان پڑ گئی تھی اور وہاں کے باسی توہمات کی دنیا سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے لگے تھے۔ وہی عرب جن کے نعرے اب تک فضا میں گونج رہے ہیں کیا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے؟

دوسرا حصہ: معنی: بحر پیما: سمندر میں سفر کرنے والا۔ **سبک:** پر لطف رہے۔

مطلب: زیر تشریح نظم کے ان اشعار میں اقبال "جزیرۂ سسلی" کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے ہیں کہ! بیشک اے سسلی! سمندر کا وقار اور عظمت تیرے ہی دم سے ہے اگر اس سمندر کو پانی کا ایک صحرائے بیکراں تصور کر لیا جائے تو تیرا وجود اس صحرا میں بھٹکے ہوئے جہازوں اور مسافروں کے لیے ایک رہنما کی حیثیت کا حامل ہے۔ اے سسلی! تیرا وجود تو اس ماحول میں ایک ایسے تل کے مانند ہے جو خوبصورت چہروں پر زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے۔ رات کے لمحات میں تیری روشنیاں جہاز رانوں کے لیے اطمینان اور رہنمائی کا سبب بنتی ہیں۔

اے سسلی! خدا کرے اس سمندر میں تیرا وجود ہمیشہ برقرار رہے اور اہل مسافرت کے لیے تو ہمیشہ رہنمائی کے فرائض انجام دیتا رہے اور سمندر کی بپھری ہوئی موجیں ہمیشہ تیرے ساحل کی چٹانوں پر رقص کرتی رہیں۔

اے سسلی! یہ مت بھول کہ تو کبھی اس قوم کی تہذیب سے ہم آہنگ تھا جس کے طنطنے سے ساری دنیا لرزتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے زیر تسلط تیری شان و شوکت انتہائی عروج پر رہی۔ آج وہ موجود نہیں پھر بھی تو دنیا کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

تیسرا حصہ معنی: نالہ کش: نوحہ کرنے والا۔ **شیراز کا بلبل:** شیخ سعدی۔ **جہان آباد:** دہلی کا دوسرا نام۔

مطلب: اے سسلی! میں جانتا ہوں کہ بغداد کی تباہی نے سعدی جیسے بلند پایہ شاعر کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کیا۔ داغ مرحوم دہلی کی تباہی پر نالہ کشاں ہوئے۔ جب غرناطہ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور وہاں کی تہذیب کو گھن لگ گیا تو ابن بدروں اس المیے پر نالہ و فریاد کرتا رہا۔ یہ سارے غم اس عہد کے شعراء اور دانشوروں نے اپنے لیے مخصوص کر لیے جب کہ مجھے یعنی اقبال کو قدرت نے تیری تباہی کے دکھ سے نوازا ہے۔ اس لیے کہ میں ہی تیری عظمت و شان سے آگاہی رکھتا ہوں۔

چوتھا حصہ معنی: آثار: کھنڈر۔

مطلب: نظم کے ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ اے سسلی! مجھے زبان حال سے اتنا بتا دے کہ تیری برباد ہونے والی قدیم عمارتوں میں کن لوگوں کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ہر چند کہ تیرا ساحل ساکت و خاموش ہے۔ اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنے کا خواہاں ہے۔ سو میں جو خود بھی سراپا درد کی حیثیت رکھتا ہوں اس سے اپنے دکھ اور کرب کا احوال بیان کر دے۔ یہ جان لے کہ جس قوم نے تجھے اپنی منزل قرار دے کر تیری شان و شوکت میں اضافہ کیا تھا میں بھی اسی قوم کا ایک فرد ہوں۔

اے جزیرۂ سسلی! آج پھر مجھے ایام ماضی کی داستانیں سنا دے اور یہ بتا دے کہ میرے اسلاف کی شان و شوکت کیسی تھی۔ بے شک ان داستانوں کو سن کر میں مضطرب ہو جاؤں گا تاہم اپنے وطن جا کر وہاں کے لوگوں کو بھی یہ داستانیں سناؤں گا اور جس طرح میں یہاں آنسو بہا رہا ہوں وہاں کے لوگ بھی اس انقلاب زمانہ پر خون کے آنسو روئیں گے۔

غزلیات

(حصہ دوم)

محققین کے مطابق حصہ دوم کی چھ غزلیں اقبال نے 1905ء سے 1907ء تک کے عرصے میں تخلیق کیں۔ انہی ایام میں انہوں نے جو نظمیں لکھیں ان کی تشریح گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر غیر ضروری نہ ہو گا کہ حصہ اول کی تخلیقات کے مقابلے میں زیر تشریح غزلیں فکری سطح پر قدرے مختلف ہیں اور اقبال کی شاعری میں جو تبدیلی رونما ہوئی ان کی آئینہ دار ہیں۔

(ادارہ)

غزل ①

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں
گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی' گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم' تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

٭

حصہ دوم میں علامہ اقبال کی زیر تشریح غزل محض چار اشعار پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ حصہ دوم کی نظموں اور غزلوں میں اقبال اپنی پہلی تخلیقات سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں اور یہ ایک فطری امر ہے۔ اس لیے کہ ہر بڑا فنکار تخلیقی سطح پر ارتقاء کے عمل میں رہتا ہے۔ اس کے لیے کسی ایک مقام پر ٹھہر جانا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا اقبال کے آئندہ کلام کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔ زیر تشریح غزل کے مطلع میں وہ یوں گویا ہوئے ہیں کہ

① **معانی**: رم: بھاگنا۔

مطلب: کائنات میں حیات انسانی دیکھا جائے تو ایک سانس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کسی لمحے بھی اس جہان فانی سے رخصت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ سانس بھی کیا ہے محض ہوا کی ایک لہر کے مانند۔ جو ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے کبھی ایک سمت جاتی ہے اور کبھی دوسری سمت میں سرگرم سفر رہتی ہے۔ نتیجتہً" یہ کہنا درست ہو گا کہ دنیا میں انسان کی زندگی ناپائیدار ہوتی ہے

② پھول کے نزدیک زندگی محض مسکرانے کا دوسرا نام ہے۔ جب کہ شمع کے نزدیک اس کی حیثیت غم واندوہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

③ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ زندگی اس وقت ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کہ اس کے رازہائے درون پردہ سے کوئی آگاہی حاصل نہ کر لے لیکن جب اس پر یہ راز منکشف ہو جائیں تو پھر اصل حقیقت اس محرم راز کی بھی ہوتی ہے۔ اس کی کہ راز منکشف ہونے کے بعد اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔

④ **معنی**: زائران کعبہ: کعبہ کی زیارت کرنے والے۔ زمزم: کعبہ کے نزدیک ایک کنواں۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جو لوگ حج یا عمرے کے لیے کعبہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور وطن واپسی پر بڑے فخر سے ہمراہ لائے جانے والے آب زمزم کو دوستوں اور عزیزوں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں جیسے کہ یہاں اس سے بڑا دوسرا کوئی تحفہ نہ تھا حالانکہ وہاں سے لانے کے لیے تو حرارت ایمانی سے بڑھ کر دوسرا کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

②

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سر پیرہن نہیں ہے

ملا محبت کا سوز مجھکو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

*

① **معنی: خجستہ پے:** مبارک قدم والی۔ **سودائے بخیہ کاری:** سینے کا خبط۔ **سر پیرہن:** لباس کا خیال۔

مطلب: اقبال زیرِ تشریح غزل کے پہلے شعر میں رب ذوالجلال سے درخواست کرتے ہیں کہ انسان کے لیے عقل و دانش بے شک باعث افتخار ہوتی ہیں تاہم جب تک اس میں جنون کی آمیزش نہ ہو تو تنہا عقل، عضو معطل کی سی حیثیت رکھتی ہے کہ عقل کا رویہ تو اکثر جذبہ عشق کی نفی کے مصداق ہوتا ہے جو کسی طور بھی فطرت انسانی سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔

② جب مجھے اللہ تعالیٰ نے اس عالم رنگ و بو میں بھیجتے ہوئے محبت کا سوز عطاء کیا تو فرشتوں کو اس نعمت پر حسد ہوا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تیرا وجود تو کسی مقبرے پر روشن ہونے والے دیئے کی مانند ہے اور یہ دنیا ہمیشہ تیرے اس جذبے سے بیگانہ رہے گی۔

③ **معنی: چرخِ کہن:** بوڑھا آسمان۔

مطلب: اے دل! جان لے کہ اس دنیا میں کسی کا کوئی مونس و غمخوار نہیں ہے۔ اس کے باوجود تو کسی ایسے ہمدرد شخص کا خواہاں ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کوشش میں تجھے قطعی طور پر ناکامی ہوگی۔

④ اقبال نے اس شعر میں وطنیت کے تصور کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری ملت دوسری اقوام کے مقابلے میں وطن اور اس کی وحدت کے تصور سے بے نیاز ہے اس کی انفرادیت بھی یہی ہے۔

⑤ یہ کہنا مبالغہ پر مبنی ہے کہ انسان عدم سے وجود میں آتا ہے اور پھر مرنے کے بعد عدم کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ تصور ایک دھوکے کی مانند ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم تو کسی دوسرے مقام کو تو کیا عقبیٰ کو بھی اپنا وطن تصور نہیں کرتے اس لیے کہ ہم تو ہر شے میں موجود ہیں۔

⑥ **معنی: مدیرِ مخزن:** رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر۔

مطلب: مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کوئی سر عبدالقادر (مدیر مخزن) کو میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ دنیا بھر کی قومیں اپنی جدوجہد کے ذریعے بے شک کارنامے انجام دے رہی ہیں اور ترقی کی راہ پر بھی گامزن ہیں لیکن

حقیقت یہ ہے کہ وہ عملاً تخلیقی جوہر کا ادراک نہیں رکھتیں۔

③

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے، گویا مزار ہے حرف آرزو کا

جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھکو سامان آبرو کا

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں؟
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

ریاض ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرط ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھکو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رخت سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثال گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

✱

① سے ③ **معنی:** صدف نشینی: سیپی میں چھپا ہوا۔ کنار جو: ندی کا کنارا۔

مطلب: اقبال کی یہ غزل تیرہ اشعار پر مشتمل ہے جس کے مطلع میں وہ کہتے ہیں کہ بظاہر میں خاموش ہوں اور میری یہ خاموشی ایک طرح سے آرزوؤں اور تمناؤں کے مقبرے کے مانند ہے تاہم زمانہ اس حقیقت سے جلد ہی آگاہ ہو جائے گا۔ جب میری شاعری یہاں ایک انقلاب برپا کر دے گی۔ دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کا حقیقی مفہوم ہر شے کی ضرورت اور تجربے کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ دریا کی موجوں کی شان و شوکت اگر ان کی روانی میں مضمر ہے تو موتی سیپی میں بند رہ کر اپنی شناخت کا ضامن بنتا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال یوں گویا ہوئے ہیں کہ کسی شے میں جوہر قابل ہی نہ ہوں تو اس کی دیکھ بھال اور تربیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا اس کی ایک مثال ندی کے کنارے ایستادہ سرو کی ہے جو اپنی فطرت کے مطابق نمی حاصل کر کے سرسبز و شاداب رہتا ہے جب کہ اس کا عکس ہمہ وقت پانی میں موجود رہنے کے باوجود کسی قسم کی نشوونما کا متحمل نہیں ہوتا۔

④ سے ⑥ **معنی:** نگار خانہ ہے آرزو کا: آرزو کے نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں۔ طلسم ہوس: تمناؤں کا گورکھ دھندا۔

مطلب: اقبال زیر تشریح شعر میں رب ذوالجلال کو متوجہ کر کے کہتے ہیں کہ میں یہاں جس شخص کو بھی

ملا ہوں اس کے دل میں خواہشات اور آرزوؤں کی ایک دنیا آباد پائی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ تیری یہ دنیا آرزوؤں اور خواہشات کا طلسم کدہ ہے۔ بعد از ممات اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ زندگی سراسر ایک طلسم کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حتیٰ کہ عمر بھر جس جسم کو مٹی سے بنا ہوا تصور کرتے رہے وہ بھی فی الواقع آرزو اور خواہشات کی گرد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ غزل کے چھٹے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ کسی ایسی شے کی تلاش میں ہی سرگرداں رہتا ہے جو کہ اس کی نظروں سے چھپی ہوئی ہو اس لیے کہ دل اس شے کا نظارہ کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ بلاشک و شبہ یہ شعر تلاش حق کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

⑦ سے ⑨ معنی: ریاض ہستی: ہستی کا باغ۔

مطلب: اس شعر میں بقول اقبال جب باغ میں پھول توڑنے والے نے شاخ سے غنچے کو تراش لیا تو وہ زبان حال سے گویا ہوا کہ مجھے اتنا بتا دے کہ جب میں کھل کر پھول بن جاتا ہوں تو تو اسے میرے تبسم سے تعبیر کرتی ہے جب کہ یہ عمل تو فنا کی جانب ایک قدم ہے۔ زندگی کو اگر ایک باغ تصور کر لیا جائے تو اس باغ کے ہر ذرے سے محبت ہی محبت کا جلوہ نظر آئے گا۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے اے انسان! تو پھول کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر کہ اس کی اہمیت اس وقت تک یہی ہے کہ اس میں رنگ اور خوشبو کا امتزاج برقرار ہے۔

اس شعر میں اقبال غالباً اپنے بعض نقادوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک میری منظومات کے تمام مضامین قدامت سے ہم آہنگ ہیں اور میری شاعری بھی اغلاط سے پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی نقاد کے لیے اس میں کوئی خوبی ہے تو یہ اس نقاد کی کم علمی کا ثبوت ہے۔

⑩ سے (13) معنی: محزوں: غمگین۔

مطلب: اے خدائے بزرگ و برتر! یہ تیری کرم نوازی ہے کہ تو نے مجھے دل جیسی دولت عطا کی لیکن اتنے مختصر دل میں خواہشات کا جو طوفان موجزن ہے اگر تیرا پاس ادب نہ ہوتا تو میں اسے کرم کی بجائے ستم سے تعبیر کرتا۔ اس شعر میں اقبال ایک سائنسی نظریے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات میں موجود عناصر ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ اگر نوک نشتر سے پھول کو چھیڑا جائے تو نتیجتہً اس میں سے جو لعاب برآمد ہو گا وہ انسانی خون کے مانند ہو گا۔ اسی نکتے کو اقبال ایک اور مقام پر یوں بیان کرتے ہیں!

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ اب نقالی اور دوسروں کی پیروی کرنے کا دور تو ختم ہوا اب خیالی دنیا پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دور تو حقیقت پر مبنی ہے اور جب انسان کو حقیقت کا ادراک ہو جائے تو پھر اس پر کسی قسم کی انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی۔ غزل کے مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے وطن سے دور ہوں یعنی بغرض تعلیم انگلستان میں ہوں تو میرے احباب اور عزیز و اقارب کو غمگین نہیں ہونا چاہیے کہ موتی کی قدر و قیمت سیپی سے باہر نکل کر ہی معلوم ہوتی ہے۔ دیار غیر میں حصول تعلیم کے بعد میری عزت و توقیر میں بھی اضافہ ہو گا۔

④

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

سکوں نا آشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یا رب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

✽

① **معنی:** ہویدا: ظاہر۔ **استعارے:** چھپا کر بات کرنا۔ **گریباں گیر:** گریبان پکڑے۔ **خسارے:** گھاٹا۔ **پھونکا:** جلا دیا۔

مطلب: اس غزل میں مطلع میں کہا گیا ہے کہ اے باری تعالیٰ! تیرا جلوہ، بجلی، آگ اور اس کے شعلے میں پنہاں ہے۔ اس کے علاوہ چاند، سورج اور ستاروں سے بھی تیری جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ ان آسمانوں کی بلندی اور زمین کی پستی بھی تیرے سبب ہی ہے۔ سمندر کی موجوں میں روانی اور ساحل کا ایک ہی مقام پر قیام تیرے ہی دم سے ہے۔ میرے مکالے اور تخلیقی عمل پر اہل شریعت یعنی واعظ و ملا چونکہ معترض ہوتے ہیں اسی لیے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اب تشبیہات اور استعاروں میں کرنے لگا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرا یہ طرزِ عمل ان لوگوں کے لیے نارسائی کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خاموشی اختیار کر جاتے ہیں۔ میں اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہوں کہ درخت، پھول، عام انسان، پتھر اور ستاروں میں وہ صلاحیت اور کیفیت موجود نہیں جو انسان میں ہیں۔ یعنی اول الذکر اشیا ہرچند کہ ایک سی حقیقت کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود ان میں حیات و کائنات کے حوالے سے وہ شعور نہیں ہے جو کہ انسان میں موجود ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مجھے تو محبت کی آگ نے جلا کر خاک کر ڈالا ہے۔ ہرچند کہ محبت کا جذبہ ایک ننھی سی چنگاری کے مانند ہے۔ اس کے باوجود یہ چنگاری تو انسان کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ میں اس دنیا میں باری تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے جو نیکیاں کما رہا ہوں آخرت میں ان کا صلہ پانے کی تمنا بھی مجھ کو نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں تو ایسا سوداگر ہوں جو بالعموم نفع نقصان سے بے نیاز رہتا ہے۔

خدایا! مجھے اتنا بتا دے کہ پارہ جو اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور ٹھہراؤ کا قائل نہیں اس میں تو نے کس دل کی تڑپ اور اضطراب بھر دیا ہے۔ مراد یہ کہ عشق محبوب میں جس طرح سے دل تڑپتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت پارے کی بھی ہے۔ نہ جانے وہ کس کے فراق میں اس طرح مضطرب رہتا ہے۔

زیرِ تشریح غزل کے مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "رب ارنی" یعنی اے خدا مجھے اپنا جلوہ دکھا دے تو جواب ملا تھا "لن ترانی" "موسیٰ! تم ہمارا جلوہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے۔ اسی طرح "لن ترانی" کے الفاظ سن کر میں خاموش ہوں۔ اس لیے کہ مجھے تو باری تعالیٰ کے ہجر و فراق نے اس قدر مضمحل کر کے رکھ دیا ہے کہ اپنے محبوب حقیقی سے قطعی تقاضا نہیں کر سکتا کہ وہ مجھے اپنا جلوہ دکھا دے۔

زیرِ تشریح غزل کے کم و بیش تمام اشعار دیکھا جائے تو ایک مسلسل غزل کے ہیں جن میں سے کم و بیش ہر شعر میں خدائے عزوجل ایک مرکزی کردار کی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔

⑤

یوں تو اے بزمِ جہاں! دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

کس قدر اے مے! تجھے رسمِ حجاب آئی پسند
پردۂ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

میں نے اے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی!

*

① سے ⑤ **معنی** : آسودگی : آرام۔ **حکمت** : فلسفہ۔ ماہ سیماؤں : چاند جیسی پیشانی والے۔ مراد حسین۔

مطلب: مطلع کے بغیر محض پانچ اشعار پر یہ غزل مشتمل ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اے جہان رنگ و بو ہرچند کہ تیری فضا ہنگامہ خیزی اور عیش و مسرت سے بھرپور تھی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان ہنگاموں میں غم و اندوہ بھی کسی حد تک شامل تھے۔ یہ صورت حال بلاشک و شبہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ دنیا ناپائیدار ہے۔ مسرتوں کے ساتھ یہاں غم و اندوہ بھی موجود رہتے ہیں جس سے دنیا کی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو شخص حکمت و دانش کے صحراؤں میں پریشان و مضطرب رہا اور اس صحرا کی خاک چھانتا رہا بالآخر اسے محبت کے دامن میں مسرت و خوشی اور عملاً آسودگی دستیاب ہو گئی۔

اس شعر میں اقبال شراب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شراب عملی سطح پر ایک پردہ نشین شے ہے کہ اولاً انگور کے خوشوں میں چھپی رہتی ہے۔ بعد میں پیالے اور صراحیوں کے دامن میں پناہ گزیں ہو جاتی ہے۔ جب کہ بدمست شرابی اسے پینے اور مدہوش ہونے کے بعد شراب کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ حسن کے ساتھ علم و دانش بھی اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں لیکن حسن میں وہ تاثیر موجود ہے جس پر علم و دانش غالب نہیں آ سکتے بلکہ ایک طرح سے اس کے زیرِ اثر رہتے ہیں اور اسی باعث دنیا بھر کے دانشور حسن کے مقابل نادانی سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

اقبال مقطع میں کہتے ہیں کہ یورپ کے دوران قیام وہ حسن اور تہذیب تلاش کرتا رہا جو ہندوستان کے خوبصورت اور خوب سیرت لوگوں میں موجود ہے۔

⑥

مثالِ پرتوِ مے، طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر، حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

نیا جہاں کوئی اے شمع! ڈھونڈیئے کہ یہاں
ستم کشِ تپشِ ناتمام کرتے ہیں

بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں

غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں!

*

①سے⑤ **معنی:** پرتوِ مے: شراب کا جلوہ۔ ستم کش: ظلم سہنا۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ جس طرح شراب کا عکس رقص کرتا محسوس ہوتا ہے اسی طرح ہم بھی جام شراب کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ یہ عمل ہر روز صبح و شام ہمارے لیے عبادت سے کم نہیں۔ مراد یہ ہے کہ صبح ہو یا شام! وقت کوئی بھی ہو ہمارے لیے مسلسل مے نوشی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

غزل کے دوسرے شعر میں حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ آپ نے کوہِ طور پر حق تعالیٰ سے جو گفتگو کی وہ کوئی کمال کی بات نہ تھی اس لیے کہ یہ کام تو درخت اور پتھروں سے عنایت خداوندی کے طفیل ممکن ہے۔ اے شمع! بہتر یہی ہے کہ کوئی دوسرا جہان تلاش کر۔ اس لیے کہ اس جہان کا ستم تو یہی ہے کہ رونے والے کو رونے بھی نہیں دیا جاتا۔ اگلے شعر میں اقبال نے اپنے عہد کی معاشرتی صورت حال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ یہاں تو جبر کا یہ عالم ہے کہ اگر سچ بولیں تو اس کی سزا ملتی ہے اور سچ بولنے والے کو اس جرم میں پابند قفس کر دیا جاتا ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ شراب کو محض سرمستی اور تفریح کے لیے پیتے ہیں وہ عملاً کم ظرف ہیں۔ اپنے اس عمل سے انہوں نے ایک حلال چیز کو حرام کر کے رکھ دیا ہے۔ تقریباً یہی مضمون میرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں زیادہ خوبصورت انداز میں باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

⑥ سے ⑩ **معنی:** پیرانِ خرقہ پوش: گدڑی پہنے والے پیر۔ رام: گرویدہ بنانا۔ دیر: بت خانہ۔

مطلب: اے واعظ! ہمارا اور تیرا نبھا اس لیے ممکن نہیں کہ ہم تو انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور تو ان میں نفاق پیدا کر کے نفرت کے بیج بوتا ہے۔ اگلے شعر میں اقبال ان گدڑی پوش بزرگوں کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی سحر انگیز باتوں سے نوجوانوں کو مطیع کر لیتے ہیں۔

اس شعر کا مضمون ان عیاش لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جو عیش و نشاط کی خاطر اپنا مال و متاع اور گھر کا سکون بھی برباد کر دیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں تو اس قماش کے تماش بینوں کی محفل کے تصور سے ہی ڈر جاتا ہوں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ اپنا سب کچھ تباہ کرنے کے علاوہ معاشرے کو بھی تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اقبال نے یہ غزل اٹلی کے سفر کے دوران کہی ہے جو اس شعر سے ظاہر ہے۔ کہتے ہیں اے جوزف مازنی جیسے محبِ وطن اطالوی رہنما! تیرے یہ میدان ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔ تیرے ساحل کے قریب سے گزرتے ہوئے میں اپنے جہاز سے تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ جب نماز نہ پڑھنے والوں کو کبھی نماز پڑھنے کا خیال آتا ہے تو وہ مجھے بت خانے سے امامت کے لیے طلب کر لیتے ہیں۔

مارچ 1907ء

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہو گا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے، خوار ہو گا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہو گا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہو گا

جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہو گا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہو گا

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہو گا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سر راہگذار بیٹھا ستم کش انتظار ہو گا

*

سترہ اشعار پر مشتمل یہ ایک مسلسل غزل ہے جو اپنی ہیئت اور معنویت کے اعتبار سے نظم سے زیادہ قریب ہے۔ اس غزل کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اقبال کا فکر و فلسفہ قدرے واضح شکل میں سامنے آتا ہے۔ اس غزل میں اقبال کا انداز بھی قدرے جارحانہ ہے۔ اپنے عہد کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے یہاں انہوں نے مستقبل کی جانب بھی کچھ اشارے کیے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

① سے ③ **معنی**: بے حجابی: چہرے سے پردہ اٹھنا۔ آوارۂ جنوں: دیوانگی کے جوش میں آوارہ پھرنا۔ برہنہ پائی: ننگے پاؤں۔

مطلب: کہ آج جس عہد میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں اس کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ وہ محبوب شخصیتیں جن کا بھرم ہی پردے سے قائم تھا وہ پردہ ترک کر کے عام لوگوں میں اپنے حسن کا نظارہ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہیں اور آنے والا وقت اس امر کی نشاندہی کرنے کو ہے کہ بالآخر ایسا ہی ہو کر رہے گا۔ اور وہ راز کھل کر سامنے آ جائے گا جو شرم و حیا کے سبب ابھی تک پردے میں تھا۔

دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اب وہ عہد ختم ہونے کو ہے جب کہ مے نوشی بالعموم چھپ کر ہوتی تھی۔ اب تو اس امر کا امکان نظر آ رہا ہے کہ سارا معاشرہ ایک شراب خانے کی شکل اختیار کرے گا اور اس میں موجود ہر فرد بادہ خواری کا عادی ہو جائے گا۔

وہ لوگ جو عشق و مستی کے عالم میں صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھان رہے تھے اب وہ پھر سے بستیوں میں آ بسیں گے۔ ہر چند کہ وہ صحراؤں اور جنگلوں میں برہنہ پا تھے۔ یہاں بھی ان کی صورت حال وہی رہے گی۔ فرق اس قدر ہے کہ یہ بستیاں ایک نئے خارزار کے مانند ہوں گی۔

④ سے ⑤ **معنی**: گوش منتظر: انتظار میں لگے ہوئے کان۔ شیر: مراد ملت اسلامیہ۔

مطلب: اقبال اس شعر اور اس کے بعد کے شعر میں ایک نیا رخ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے علاوہ آئندہ کے امکانات تو بظاہر وہی ہیں جن کا ذکر ابتدائی تین اشعار میں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود معروضی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے جدجہد کرنے والے لوگوں تک خاک مدینہ سے یہ پیام جانفزا پہنچنے لگا ہے کہ حق تعالیٰ نے تم لوگوں کی بہبود و آسائش اور ارتقاء کے لیے جو وعدے کیے تھے بلاشک و شبہ ان کی پذیرائی کی جائے گی۔ اور وہ فرزندان توحید جنہوں نے اپنی جراءت اور آہنی عزم کے ذریعے روم کی عظیم الشان سلطنت کو تہہ و بالا کر دیا تھا فرشتوں کی زبانی یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وہ فرزندان توحید ایکبار پھر

اپنی منتشر صفوں کو استوار کر کے دشمن کا منہ پھیر دیں گے۔

⑥ **معنی:** منہ پھٹ: سچی بات بے باکی سے کرتا ہے۔

مطلب: اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میری راست گوئی کا چرچا جب لوگوں میں ہوا تو ان کے سربراہ نے کہا کہ ایسے منہ پھٹ لوگ اکثر خراب و خستہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ سو اس شخص کا حشر بھی کچھ اسی طرح کا ہو گا۔

⑦ سے ⑧ **معنی:**:-

مطلب: غزل کے ان دونوں اشعار میں اقبال مغربی استعماریتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دنیا رب ذوالجلال نے پیدا کی ہے جب کہ تم اسے اپنے مفادات کی منڈی سمجھ بیٹھے ہو۔ اور جس سکے کو تم کھرا سمجھ رہے ہو ذرا غور سے دیکھو کہ وہ تو کھوٹا سکہ ہے۔ یہ بھی جان لو کہ تمہاری وضع کردہ تہذیب ان ہتھیاروں سے خود ہی اپنے آپ کو تباہ کر لے گی جو تم نے دوسروں کو برباد کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔ جان لو کہ جس عمارت کی بنیاد کمزور ہو گی تو وہ عمارت بھی یقیناً ناپائیدار ہو گی۔

⑨ **معنی:** سفینہ برگ گل: پھول کی پتی کو کشتی بنالے۔ مور ناتواں: کمزور چیونٹیاں۔

مطلب: اس شعر میں اتحاد و یگانگت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جس طرح ننھی ننھی چیونٹیاں باہمی رفاقت کے ذریعے اپنی منزل تک جا پہنچتی ہیں اسی طرح سے مسلمان اتحاد و یگانگت پیدا کر کے معمولی ساز و سامان کے ساتھ طاقتور دشمن کے خلاف نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

⑩ اس شعر میں چمن 'لالہ' کلی اور دل جلے وہ استعارے ہیں جو اپنی معنویت کے لحاظ سے علی الترتیب وطن' خود غرض کردار' عوام اور بظاہر قوم پرستی کے حوالے سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جھوٹے رہنما عوام کے خیر خواہ بن کر پوری قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

(11) فلسفہ وحدت الوجود کے حوالے سے کائنات اور اس کے تمام مظاہر کی بنیاد صرف رب ذوالجلال ہے۔ اس فلسفے کے ہمنوا ہونے کے ناطے اقبال کہتے ہیں کہ اہل دنیا نے تو خدا کے وجود کو بھی کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو خدا پر کون یقین کرے گا۔

(12) تخیلی سطح پر اس شعر میں اقبال قمری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے جب قمری کو اس رمز سے آشنا کیا کہ کائنات کے تمام مظاہر جو آزاد تصور کیے جاتے ہیں۔ اس آزادی کے باوصف مقید ہیں تو جو عناصر اس مکالمے کی سن گن لے رہے تھے' بول اٹھے کہ یہ شخص یقیناً ہمارے تمام رازہائے درون پردہ سے آگاہ معلوم ہوتا ہے۔

(13) خدا کے ہزاروں ایسے لوگ عاشق ہیں جو اس سے لو لگائے جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہوں نے باقی دنیا سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ طرز عمل نہ عشق الٰہی کا حامل ہے نہ ہی حقوق العباد کے اصول سے ہم آہنگ ہے۔ میں تو خدا تک رسائی کے لیے خدا کے اس نیک اور پارسا بندے سے عشق کا قائل ہوں جو خدا کے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

(14) اس شعر میں کہا گیا ہے وہ زندگی میں تمام مصائب و مشکلات کو کوئی شکوہ کیے بغیر خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیے۔ اگر ان پر بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کی

توہین ہے۔

(15) **معنی: ظلمت شب:** رات کا اندھیرا۔ **درماندہ کارواں:** بچھڑا ہوا قافلہ۔

مطلب: ہرچند کہ میرا قافلہ منزل سے بھٹک گیا ہے لیکن میں اس تھکے ہوئے قافلے کو رستے کی تمام مشکلات کے باوجود اپنے ہمراہ لے کر منزل کی جانب عازم سفر ہوں گا۔ تاریک شب میں روشنی کے لیے میری آہیں چنگاریاں برسائیں گی اور میری ہر سانس شعلے اگلے گی۔ مراد یہ ہے کہ قوم راہ سے بھٹک چکی ہے۔ منزل کا کچھ اتا پتہ نہیں۔ اس صورت میں اقبال کہتے ہیں کہ میں عزم و حوصلے کے ساتھ اس کی جانب منزل کی رہنمائی کروں گا۔

(16) **معنی: غیراز نمود:** نمود و نمائش کے سوا۔

مطلب: اگر اس دنیا میں تیری تخلیق کا مقصد زندگی کرنے اور نمود و نمائش کے سوا اور کچھ نہیں تو یہ بھی جان لے کہ جس طرح ایک شعلہ لمحے بھر کے لیے بھڑکتا ہے اور پھر بجھ کر رہ جاتا ہے اسی طرح تیری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ کہ دنیا میں حقیقی نمود و نمائش محض خدمت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

(17) **معنی: ستم کش انتظار:** انتظار کے ظلم کی سختیاں۔

مطلب: غزل کے مقطع میں کہا گیا ہے کہ اقبال کا ٹھکانا کیا پوچھتے ہو۔ اس کی کیفیت پہلے کی مانند ہی ہے وہ تو کسی راہگذر پر بیٹھا اپنے محبوب کا انتظار کر رہا ہو گا۔

حصہ سوم

1908ء سے......

اس حصے میں علامہ اقبال کی وہ طویل اور مختصر نظمیں شامل ہیں جو انہوں نے 1908ء کے بعد تخلیق کیں۔ یہ نظمیں مذہبی' سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ آخر میں علامہ کا کچھ ظریفانہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کلام میں وہ کسی حد تک اکبر الہ آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔

(ادارہ)

بلاد اسلامیہ

سرزمیں دلی کی مسجودِ دل غم دیدہ ہے — ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں — خانقاہ عظمت اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار — نظم عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمی محفل کی یاد
جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہ مسلم گو جہان آباد بھی — اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامان ناز — لالہ صحرا، جسے کہتے ہیں تہذیب حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوش ارم — جس نے دیکھے جانشینان پیمبرؐ کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں، وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما، ان کا مدفن ہے یہی

ہے زمین قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور — ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور
بجھ کے بزم ملت بیضا پریشاں کر گئی — اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس سے تاک گلشن یورپ کی رگ نمناک ہے

خطہ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار — مہدی امت کی سطوت کا نشان پائیدار
صورت خاک حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے — آستان مسند آرائے شہ لولاک ہے
نکہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربت ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خواب گاہ مصطفیؐ — دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا
خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانند نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے، وارث مسند جم کے ہوئے
ہے اگر قومیت اسلام پابند مقام — ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام
آہ! یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو — نقطہ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

*

زیر تشریح نظم "بانگ درا" کے حصہ سوم کی اولین نظم ہے جو عملاً پانچ بند پر مشتمل ہے۔ اس امر کی

نشاندہی پہلے ہی کی جا چکی ہے کہ حصہ سوم کی تمام تخلیقات 1908ء کی ہیں اور ان میں اقبال کا وہ فکر و شعور گاہے گاہے نظر آتا ہے جس کے باعث اقبال اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے گئے۔
اس نظم میں انہوں نے دنیا بھر کے ان بڑے شہروں کی عظمت رفتہ کی نشاندہی کی ہے جو ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی عظمت و شوکت کی آماجگاہ تھے۔ ملاحظہ ہو!

پہلا بند **معنی**: **بلاد اسلامیہ**: اس نظم میں دنیا کے پانچ اسلامی شہروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ **مسجود**: سجدہ گاہ۔ **خیر الامم**: بہترین امت۔

مطلب: اس بند میں اقبال ہندوستان کے اہم ترین شہر دہلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اس شہر عظیم کے لیے سجدہ ریز ہوں کہ اس کے زوال کی کہانی دل کو شدید غم سے دوچار کیے ہوئے ہے۔ یہ وہی شہر ہے جس کے ذرے ذرے میں عظمت اسلاف کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ہر چند کہ عظمت اسلام کی مظہر یہ سرزمین آج اجڑ چکی ہے تاہم اس سے جو یادیں وابستہ ہیں وہ بھلائے نہیں بھولتیں۔ دہلی کی خاک میں عالم اسلام کے وہ اعلیٰ مرتبت فرمانروا دفن ہیں جن کی حکومت پوری دنیا کے نظام کو مربوط رکھنے کا سبب بنی۔ ان فرمانرواؤں کے عہد میں جو اس شہر کی عظمت و شوکت تھی اس کے تصور سے ہی دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ ہر چند کہ یہ شان و شوکت اب قصہ ماضی بن چکی پھر بھی اس کی یاد دلوں میں باقی ہے۔

دوسرا بند **معنی**: **زیارت گاہ مسلم**: مسلمان بادشاہ دفن ہیں۔ **کرامت**: بزرگی۔ **ارم**: شداد کی بنائی ہوئی جنت۔

مطلب: زیر تشریح میں اقبال بغداد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک دہلی اپنی جملہ خصوصیات کے سبب اہل اسلام کے لیے ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی اس کے باوجود ہم اسلامی تاریخ کے اہم شہر بغداد کی عظمت و کرامت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بغداد وہ گلشن تھا جس پر کبھی سارا عالم اسلام فخر کرتا تھا۔ عربوں کی تہذیب نے اسی شہر نامدار میں عروج و ارتقا کے مراحل طے کیے تھے۔ اس شہر کو خاک کو یوں بہشت کی ہم منصب ہونے کی سعادت حاصل ہے کہ اس پر پیغمبرؐ آخر الزماں کے پیروکاروں اور جانشینوں کے قدم پڑتے رہے۔ یہی وہ شہر ہے جو اسلامی تدبر و حکمت کا نشان تھا اور یہیں پر وہ عظیم المرتبت تاجدار دفن ہیں جن کی ہیبت و سطوت سے سلطنت روم کے اولوالعزم فرمانروا بھی خوفزدہ رہا کرتے تھے۔

تیسرا بند **معنی**: **قرطبہ**: اندلس کا مشہور شہر۔ **فروزاں**: روشن۔ **تاک گلشن**: انگور۔

مطلب: دہلی اور بغداد کے علاوہ اندلس کا مشہور شہر قرطبہ بھی کسی زمانے میں عالم اسلام کی آنکھ کا تارا رہا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے عہد میں یہ مشہور شہر اپنے علم و فضل اور شان و شوکت کے سبب بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس دور میں پوری تہذیب عملاً دم توڑ رہی تھی جب کہ قرطبہ ان کے لیے ایک ستارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب خلافت عثمانیہ کو زوال ہوا تو اس شہر کی تہذیب بھی دم توڑ گئی جس کے باعث پوری ملت اسلامیہ کو شدید دھچکا پہنچا لیکن اس سے فائدہ یورپی تہذیب کو ہی پہنچا۔ قرطبہ کی سرزمین دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ کی عظمت و شوکت کا قبرستان ہے جس کے باعث یورپی تہذیب کو زندگی ملی۔ مراد یہ کہ اہل یورپ نے قرطبہ میں انتہائی ترقی یافتہ اسلامی تہذیب سے پوری طرح استفادہ کیا۔

چوتھا بند معنی: خطہ قسطنطنیہ: عثمانی سلطنت کا دارالحکومت۔ مہدی: ہدایت کرنے والا۔ سطوت: شان و شکوہ۔ شہ لولاک: حضرت رسول اکرم ﷺ

مطلب: اس بند میں اقبال دہلی' بغداد اور قرطبہ کے بعد ایک اور عظیم الشان شہر قسطنطنیہ کا ذکر کرتے ہیں جو سینکڑوں برس کی محاذ آرائی کے بعد قیصر روم سے سلطان محمد فاتح کے عہد میں تسخیر کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسی کے فتح کرنے والے سالار کو جنت کی بشارت دی تھی۔ صحابی رسول مقبول ﷺ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار بھی یہیں پر واقع ہے۔ قسطنطنیہ جو قیصر خاندان کے زیر نگیں رہا وہ آخر کار سلطان محمد فاتح کی عظمت و شان کا آئینہ دار بن گیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ شہر بھی ہمارے لیے حجاز مقدس کی طرح محترم ہے اس لیے کہ یہ ایک مدت تک ان فرمانرواؤں کا مسکن رہا جنہیں حضور ﷺ کی جانشینی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس خطے کی فضاء میں پھولوں کی خوشبو اور پاکیزگی رچی ہوئی ہے۔ یہاں صحابی رسول ﷺ حضرت ایوب انصاریؓ کا جو مزار واقع ہے یوں لگتا ہے اس سے آج بھی یہ آواز آ رہی ہے کہ مسلمانو! سنو! یہ عظیم المرتبت شہر ملت اسلامیہ کے قلب کی مانند ہے اس لیے کہ ہمارے عظیم المرتبت اسلاف نے اسے سینکڑوں برس کی نبرد آزمائی اور بے شمار جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔

پانچواں بند معنی: حج اکبر: حج دو ہیں۔ ایک حج اصغر' دوسرا حج اکبر۔ ولادت گاہ: پیدائش کی جگہ۔ ماویٰ: پناہ کی جگہ۔ نقطہ جاذب: کھینچنے والا نقطہ۔

مطلب: اوپر کے اشعار میں اسلامی عظمت کے جن چار شہروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے بعد بلادِ اسلامیہ کا باب' مدینہ منورہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ جہاں پیغمبر آخر الزماںؐ کی آخری آرام گاہ آج بھی مرجع خلائق بنی ہوئی ہے اور چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی ہر سال دنیا بھر سے آنے والے کروڑوں مسلمانوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے اس شہر بے مثال کی عظمت کا اندازہ اسی امر سے ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مدفن مبارک اسی مقام پر موجود ہے۔

اقبال اس بند میں مدینہ منورہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے یہ شرف حاصل ہے کہ تو ہمارے نبی ﷺ کی آخری آرام گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے لیے تیرا نظارہ تو حرم کعبہ سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کائنات کو ایک انگوٹھی سے تعبیر کر لیا جائے تو اس انگوٹھی میں تیرا وجود ایک گوہر تابدار کی مانند ہے۔ اسلام کی عظمت و تابندگی نے دیکھا جائے تو اسی مقام سے جنم لیا ہے۔

اے مقدس شہر! اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس شہنشاہ معظم کو تیرے دامن میں ہی راحت ملی جس کے دامن میں بلا شک و شبہ تمام اقوام عالم نے سکون محسوس کیا۔ مراد یہی ہے کہ آنحضرتؐ نے تیری ہی سرزمین کو اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر منتخب کیا۔ آنحضرتؐ کی شخصیت اسقدر عظیم تھی کہ دنیا بھر کے شہنشاہ ان کے پیروکار بن گئے اور پھر یہی لوگ قیصر اور جمشید جیسے عظیم فرمانرواؤں کی جگہ لے سکے۔

ہر چند کہ اسلامی قومیت کا تصور کسی مخصوص خطے تک محدود نہیں پھر بھی اگر اسی حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوایران اور شام کی بجائے مدینہ ہی وہ مقام ہے جو مسلمانوں کا مرکز نگاہ ہے۔ چنانچہ جب تک صبحدم شبنم کی طرح تیرا وجود باقی ہے ہم مسلمان بھی اسی طرح زندہ ہیں۔

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو — مآل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو!
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو؟ — ہے کیا ہراس فنا صورت شرر تجھ کو!
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو — مثال ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر — فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل — عدم، عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

*

اس نظم میں اقبال کا بنیادی تصور تغیر و انقلاب کے علاوہ مسئلہ جبر و قدر کی نشاندہی سے متعلق بھی ہے۔ یہ نظم محض آٹھ اشعار پر مشتمل ہے جن میں علامہ نے کمال فنی چابکدستی کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ ستارہ سے ہم کلام ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

① سے ④ **معنی**: مآل: انجام۔ ہراس: خوف۔

مطلب: اے ستارے! مجھے اتنا بتا دے کہ کیا تو چاند کی روشنی سے خوفزدہ ہے یا پھر تجھے صبح ہونے کا خطرہ ہے کہ چاند کی روشنی میں تیری روشنی زائل ہو کر رہ جائے گی اسی طرح **صبحدم** سورج کے طلوع ہونے کے سبب بھی تجھے کم و بیش اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے اس حقیقت کا پتہ چل گیا ہے کہ حسن کا انجام آخر کیا ہوتا ہے؟ مراد یہ کہ ستارہ میں بھی ایک حسن ہوتا ہے اور زوال بالآخر حسن کا مقدر ہے سو اسی پس منظ ں یہ بات یہاں کہی گئی ہے۔

یا پھر ایسا تو نہیں کہ تجھے اپنے نور کی دولت کے لٹ جانے کا خطرہ ہے یا پھر یہ خیال تجھے کھائے جا رہا ہے کہ چنگاری کے مانند لمحے بھر میں اپنی روشنی سے محروم ہو جائے گا۔ اس انداز سے تجھے خوفزدہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ قدرت نے تجھے سطح زمین سے کافی بلندی پر گھر عطا کیا ہے اور چاند جیسی روشنی بھی بخشی ہے اس کے باوجود حیرت یہ ہے کہ تجھ پر خوف طاری رہتا ہے اور تمام شب تو کانپتا رہتا ہے۔

⑤ سے ... : ولادت مہر: سورج کی پیدائش۔ راز آفرینش گل: پھول کی پیدائش کا راز۔ محال: ناممکن۔ ثبات ایک تغیر: یعنی ہمیشہ رہنے والا عمل ہے۔

مطلب: اے ستارہ تیری روشنی بجا! لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کر کہ یہ کائنات عجیب و غریب شے ہے۔ یہاں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ایک شے کو عروج حاصل ہوا تو زوال دوسری شے کا مقدر بن گیا۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ ... کے طلوع ہوتے ہی لاکھوں ستارے اس کی تیز روشنی کے سبب ناپید ہو جاتے

ہیں۔ یوں سمجھ لے کہ جسے ہم فنا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل زندگی کا ہی ایک دوسرا رخ ہے۔ غنچہ کھل کر اپنی ہیئت کھو بیٹھتا ہے اور بالآخر ایک شگفتہ پھول بنجاتا ہے۔ بالفاظ دگر غنچے کی موت عملاً پھول کی کی زندگی بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس ساری صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ راز آشکار ہو کر سامنے آئے گا کہ ہم جسے موت کا نام دیتے ہیں وہ عملاً موت نہیں ہے اس کے برعکس زندگی کے اظہار کا نام ہے۔

سوائے ستارے! یہ جان لے کہ پوری کائنات میں کسی مرحلے پر بھی سکون و اطمینان کا حصول ممکن نہیں۔ ہاں اگر کسی چیز کو استقلال ہے تو اس کا نام تغیر اور تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس کائنات کی بنیادی خصوصیت ہمہ وقت تغیر اور انقلاب ہے۔ اس نوع کی تبدیلیاں فطرت کے مظاہر کا بنیادی جزو ہیں۔

دو ستارے

آئے جو قِراں میں دو ستارے کہنے لگا ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب انجامِ خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنّا! پیغامِ فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدر ہر ایک کی راہ ہے مقرر
ہے خواب ثبات آشنائی
آئینِ جہاں کا ہے جدائی

*

پہلا بند **معنی:** قِراں: برج۔

مطلب: اقبال نے معمول کے مطابق اپنی بیشتر نظموں میں زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل کا ذکر کسی نہ کسی شے کے حوالے سے کیا ہے یہ نظم بھی اسی نوعیت کی حامل ہے جس میں دو ستاروں کے حوالے سے یہ امر واضح کیا ہے کہ جدائی اور فنا بالآخر ہر شے کا مقدر ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ نظم بھی سابقہ نظم سے ملتی جلتی ہے یعنی دو ستارے آسمان پر ایک برج میں یکجا ہوئے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ ہماری یہ ملاقات مستقل حیثیت اختیار کر لے اور یہ گردش ختم ہو جائے تو کتنی اچھی بات ہو۔ اگر آسمان ہم پر قدرے مہرباں ہو جائے اور ہماری روشنی یکجا ہو جائے تو ہماری قوت میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور ہماری افادیت بھی زیادہ ممکن ہو سکتی ہے۔

دوسرا بند **معنی:** وصال: ملاپ۔ آئین: قانون۔

مطلب: لیکن ہوا یوں کہ دونوں ستاروں کے مابین مستقل وصال کی خواہش لمحے بھر میں فراق اور جدائی

کا پیغام بن کر رہ گئی۔ اس لیے کہ یہ امر تو ستاروں کا مقدر بن چکا ہے کہ ہر لمحے گردش کرتے رہیں اور مسافرت ان کا اوڑھنا بچھونا ہو نیز یہ کہ اس گردش اور سفر میں ہر ستارے کا راستہ متعین ہے جس سے وہ کسی مرحلے پر بھی سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ کہ جدائی تا ہر شے کا مقدر ہے۔

گورستانِ شاہی

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے　　کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں　　صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی　　بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے
آہ! جولاں گاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار　　دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے　　یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دل دادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے
ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں　　ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں
خاکبازی وسعتِ دنیا کا ہے منظر اسے　　داستاں ناکامیِ انساں کی ہے ازبر اسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا　　آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لیے　　فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لیے
رنگ و آبِ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں
خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا　　دیدۂ عبرت! خراجِ اشک گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے　　آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر　　جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں
سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور　　مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک　　جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گسترِ فلک
کیا یہی ہے ان [illegible]　　[illegible] ڈرتا تھا [illegible]
رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری　　ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا! عود کی تقریر کیا   دردمندانِ جہاں کا نالۂ شبگیر کیا
عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا   خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

روح، مشتِ خاک میں زحمت کشِ بیداد ہے   کوچہ گردِ نے ہوا جس دم نفس، فریاد ہے
زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا   شاخ پر بیٹھا، کوئی دم، چہچہایا، اڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم، کیا گئے   زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے
موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار   اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار   یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار
چاند، جو صورت گرِ ہستی کا اک اعجاز ہے   پہنے سیمابی قبا محوِ خرامِ ناز ہے
چرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر   بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر
اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے، جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار   رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار   رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں   دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار   ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو!

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گزر   چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے، باقی نشاں تک بھی نہیں   دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے   عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے
آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
[illegible]

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی   کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی
سینۂ دریا شعاعوں کے لیے گہوارہ ہے   کس قدر پیارا لبِ جو مہر کا نظارہ ہے
محوِ زینت ہے صنوبر، جوئبار آئینہ ہے   غنچۂ گل کے لیے بادِ بہار آئینہ ہے
نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانہ میں   چشمِ انساں سے نہاں، پتوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل، مطربِ رنگیں نوائے گلستاں   جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے — خامہ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے
باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں — وادی کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں
زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے — موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دست طفل خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم، یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں — اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں
اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در — گریہ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادی گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ — خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

*

اقبال کی یہ طویل نظم ان دنوں کی یادگار تخلیق ہے جب بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وہ حیدر آباد دکن کے دورے پر گئے۔ وہاں انہوں نے اور چیزوں کے علاوہ مقامی فرمانرواؤں کے مزار اور مقابر بھی دیکھے۔ انہی کے حوالے سے اس نظم کی تخلیق ہوئی جو خوبصورت امیجری کی ایک درخشاں مثال ہے۔ یہ نظم بارہ بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند معنی: خرقہ دیرینہ: پرانی گدڑی۔ مکدر: کدورت والا یعنی میلا۔ حیرت فزا: حیرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بربط: ساز۔ باطن ہر ذرہ: ہر ذرہ کا دل۔

مطلب: شاہی گورستان کا منظر نامہ کچھ یوں ہے جیسے اس پر ایستادہ آسمان نے کٹے پھٹے بادلوں کا بوسیدہ لباس پہن رکھا ہو۔ انہی بادلوں کے سبب چاند کی روشنی بھی مدھم پڑی ہوئی ہے۔ اس خاموش اور پرسکوت فضاء میں بادلوں کے سبب چاند اور تاروں کی روشنی بھی پھیکی پھیکی سی لگ رہی ہے۔ صبح صادق تو ابھی شب کی آغوش میں ہی محو خواب ہے۔ یہاں جو درخت ایستادہ ہیں وہ اس قدر خامشی اور سکوت کے عالم میں ایستادہ ہیں کہ ان کی یہ خامشی دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ خامشی دیکھا جائے تو فطرت کے کسی ساز موسیقی کی دھیمی سی لے ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس دنیا کا ہر ذرہ سرتاپا باطنی درد اور کرب کا شکار ہے جب کہ یہ خامشی زندگی کے ہونٹوں پر ایک آہ سرد کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسرا بند معنی: جولانگاہ: تگ و دو کا مقام۔ حصار: قلعہ۔ گورستان: قبرستان۔ سکان کہن: پرانے مکین۔ استادہ: کھڑا ہے۔

مطلب: اس بند کے اشعار میں اقبال گورستان شاہی کے قریب ایستادہ اس عظیم الشان قلعہ کی نشاندہی کرتے ہیں جس کو فتح کرنے کے لیے 1687ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ کا

محاصرہ کیا تھا۔ اس قلعے کے گرد و پیش کی زمین میدان جنگ بن گئی تھی۔ صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے یہ قلعہ جو کبھی زندگی کی چہل پہل کا مظہر ہو گا آج اس پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ قلعہ کے چاروں اطراف پھیلی ہوئی ویرانی فی الواقع یہاں کی گزری ہوئی زندگی کے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ قلعہ نہ صرف یہ کہ اپنے قدیم باسیوں کی خاک کا عاشق ہے بلکہ پہاڑ کے اوپر قبرستان کے محافظوں کی مانند ایستادہ ہے۔

تیسرا بند **معنی:** **نجم:** ستارہ۔ **خاکبازی:** مٹی سے کھیلنا۔ **از بر:** حفظ' زبانی یاد۔

مطلب: ایک ستارہ جو آسمان کی بلند فضا میں چمک رہا ہے یوں لگتا ہے جیسے جھک جھک کر بادلوں کے سوراخوں میں سے جھانک رہا ہے دنیا کی وسعت کا نظارہ اس کے لیے ایک کھیل کی مانند ہے کہ اس کو تو انسانی ناکامیوں کی تمام داستانیں پوری طرح یاد ہیں۔ ہر چند کہ یہ ستارہ اپنی منزل کی جانب محو سفر ہے اس کے باوجود وہ آسمان کی بلندیوں سے ان انقلابات کا نظارہ بھی کر رہا ہے جو زمین پر برپا ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ستارے کا مقدر سفر ہے۔ چنانچہ اس کا کسی ایک مقام پر قیام ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک لمحے کے لیے جو یہاں رک گیا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس قبرستان شاہی پر فاتحہ خوانی کر رہا ہے۔ یوں بھی یہ سرزمین زندگی کی چمک دمک کی مظہر ہونے کے علاوہ ایسے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سینکڑوں تہذیبیں دفن ہیں۔

چوتھا بند **معنی:** **حسرت فزا:** حسرت بھرا۔

مطلب: کرب و غم میں اضافہ کرنے والی یہ سرزمین ایسے پر شکوہ حکمرانوں کی آرامگاہ ہے جس کا نظارہ ہی عبرتناک اور خون رلا دینے والا ہے مگر اسے خراج یوں ہی پیش کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ یہ سرزمین لاکھ گورستان سہی! تاہم اس کا مرتبہ آسمان کے ہم پلہ ہے۔ یہ نہ بھول کہ یہ قبرستان اس قوم کا سرمایہ ہے جس کا مقدر بگڑ گیا ہے پھر بھی ان مقبروں کا شکوہ اس قدر حیرتناک ہے کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی اور دیکھنے والا آنکھ جھپکانے کی جراءت بھی نہیں کر سکتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ گورستان شاہی کی یہ فضا ایک سرکردہ قوم کے ماضی کی ناکامی کی ایسی تصویر ہے جس سے ظاہر ہونے والے کرب کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کرب کو فی الواقع احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

پانچواں بند **معنی:** **جبیں گستر:** سجدہ کرنے والا۔ **غنیم موت:** دشمن۔ **یورش:** حملہ۔ **فغفوری:** بادشاہی۔

مطلب: وہ حکمران جن کو ان کی تشنہ تکمیل آرزوئیں اور خواہشات ہمیشہ مضطرب اور بے چین رکھا کرتی تھیں آج وہ آبادی سے کوسوں دور اس ویرانے میں خاموشی سے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ جن کے چہرے سورج کی طرح روشن تھے اب وہ قبر کے اندھیروں سے دوچار ہیں۔ یہی وہ جلیل القدر فرمانروا تھے جن کے دروازوں پر آسمان بھی سجدہ ریز ہوتا نظر آتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے انداز حکومت سے زوال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیا ان شہنشاہوں کی عظمت کا یہی نتیجہ نکلنا تھا کہ تمامتر شکوہ کے باوجود آج زمین ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ خواہ چین جیسی عظیم الشان سلطنت کے فرمانرواؤں کا رعب و دبدبہ ہو یا روم کے پر ہیبت شہنشاہوں کی شان و شوکت ہو۔ موت ایک ایسی دشمن ہے جس کا وار کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ عام شخص ہو یا کوئی بادشاہ! اول و آخر قبر ہی اس کا آخری مسکن ہے اور کیسا ہی عظیم و پر ہیبت شخص ہو اس کی ابدی منزل قبر ہی ہے۔

چھٹا بند **معنی: عود:** بربط کی قسم کا ایک ساز۔ **نالہ شبگیر:** رات کے وقت کی آہ و زاری۔

مطلب: چنانچہ یہ طے ہے کہ اس گورستان میں سونے والے بہادر اور اولوالعزم شہنشاہوں کو نہ تو عیش و عشرت کے ہنگامے ہی جگا سکتے ہیں نہ ساز و موسیقی کی صدائیں ہی بیدار کر سکتی ہیں۔ نہ ان مصیبت زدگان کی آہیں اور متحرک کر سکتی ہیں ان بہادروں کو میدان جنگ میں تلوار زنی کے ہنگامے اور وہاں بلند ہونے والے تکبیر کے پرجوش نعرے بھی جگا نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے ان ہمیشہ کے لیے خوابیدہ لوگوں کو اب نہ تو کوئی آواز ہی اٹھا سکتی ہے نہ ہی انہیں دوبارہ زندگی مل سکتی ہے۔

ساتواں بند **معنی: زحمت کش بیداد:** ظلم کا دکھ اٹھانے والی۔

مطلب: قبر کا عذاب تو ایسا ہے جسے جسم ہی نہیں بلکہ روح بھی برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ جب بانسری میں سانس داخل ہوتا ہے تو یہی فریاد یا نغمے میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح حیات انسانی بھی ایک خوش الحان پرندے کی مانند ہے۔ پرندہ کسی شاخ پر بیٹھا' نغمے الاپے اور پھر اڑ گیا۔ ہم انسان! افسوس کہ اس دنیا میں محض ایک پھول کی مانند آئے۔ شاخ سے نکلے' پھول بنے اور پھر مرجھا کر رہ گئے۔ سو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فقیر ہو یا امیر! کسی چھوٹے بڑے سے رعایت نہیں کرتی اس لیے کہ اس کی نظروں میں تو سب ہی برابر ہیں۔

آٹھواں بند **معنی: خس آتش سوار:** وہ تنکا جو آگ پر سوار ہو۔ **سیمابی قبا:** پارے کے رنگ کا لباس۔ **محو خرام ناز:** اپنی چال میں مست ہے۔

مطلب: زیر تشریح بند میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ حیات انسانی ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جس کا دوسرا کنارہ نہیں ہوتا لیکن سمندر کی طرح اس میں بھی بے شمار لہریں اور مدوجزر ہوتے ہیں جنہیں انسانی مقابر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں زیادہ عرصے تک زندہ رہنے کی تمنا رکھنے والا ہمیشہ خون کے آنسو روتا ہے کہ یہ زندگی بلاشک وشبہ ناقابل اعتبار ہے۔ ناپائیداری کے لحاظ سے اس زندگی کو محض چند لمحوں تک چمکنے والی چنگاری اور آگ کی لپیٹ میں آجانے والے تنکے کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اور یہ آسمان پر جو چاند روشن ہے اسے زندگی کے حوالے سے رب ذوالجلال کا اعجاز قرار دیا جانا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پارے جیسا سفید رنگ اور متحرک لباس پہنے آسمان کی وسعتوں میں اپنے سفر پر ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن اس لمحے جب ستارے روپوش ہو جاتے ہیں تو آسمان کی دہشتناک فضا میں چاند کی بے مائیگی کا اندازہ کچھ اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا بادل نظر آتا ہے جس سے بارش کا آخری قطرہ بھی برس چکا ہو اور جو اپنی عمر طبعی کے مرحلے سے گزر چکا ہو۔

نواں بند **معنی: زیاں خانے:** نقصان کا گھر یعنی دنیا۔ **گردوں وقار:** آسمان جیسے رتبہ والا۔ **بے اعتنائی:** بے پروائی۔ **ذوق جدت:** نئی چیزیں پیدا کرنے کا شوق۔ **آبستن:** حاملہ ہونا۔

مطلب: جملہ عناصر جن کا ذکر نظم کے پہلے اشعار میں کیا گیا ہے انہی کی طرح اقوامِ عالم کا وجود بھی کسی اعتبار کا حامل نہیں ہے۔ ان کا عروج ماضی کے حوالے سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ہر قوم کا مقدر زوال سے عبارت رہا ہے۔ بالفاظ دگر اس کائنات میں کوئی قوم کتنی ہی عظیم الشان اور بلند مرتبت ہو وہ بھی ابد تک قائم و دائم نہیں رہ سکتی اس کی تقدیر میں بالآخر فنا ہونا ہی شامل ہے۔ اب تو یہ کائنات قوموں کے عروج و زوال کے مناظر کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ اس کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اور اس منظر کو ہمیشہ بے اعتنائی سے دیکھتی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی شے ایک ہی شکل میں اور ایک ہی انداز سے برقرار نہیں رہتی۔ زمانہ اتنا جدت پسند ہو چکا ہے کہ ہر روایت میں نت نئی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا میں نئی نئی قوتیں جنم لیتی رہتی ہیں اور عہد کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔

دسواں بند معنی: کوہ نور: مشہور ہیرا۔ ابر آذاری: بہار کا بادل۔

مطلب: یہ کائنات ایک ایسی شاہراہ کے مانند ہے جہاں سے مختلف فرمانرواؤں اور عام انسانوں کے ہزارہا قافلے گزرتے رہے ہیں اور تاریخی حیثیت کا حامل یہ کوہ نور ہیرا نہ جانے کتنے شہنشاہوں کے تاج کی زینت بن چکا ہے۔ آج مصر اور بابل کی عظیم اور انتہائی قدیم تہذیبیں ہمیشہ کے لیے اس طرح مٹ کر رہ گئیں کہ ان کا نشان تک باقی نہیں ہے۔ نا ہی ان کا کوئی نام لیوا موجود ہے۔ ایران جیسے عظیم المرتبت شہنشاہ فنا کے گھاٹ اتر گئے ان کی حکومتیں بھی تباہ و برباد ہو گئیں یہی نہیں بلکہ وقت نے یونان اور روم جیسی اقوام کی عظمت و ہیبت کو بھی خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

انہی تہذیبوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب بھی بالآخر اس طرح حادثاتِ زمانہ کی شکار ہو کر رہ گئی جیسے کہ موسم بہار میں بادل پورے جوش و خروش کے ساتھ آتا ہے' برستا ہے اور پھر ناپید ہو جاتا ہے۔ یہی حال ملت اسلامیہ کی تہذیب کا ہے۔

گیارھواں بند معنی: مطرب: گانے والا۔ **گلستاں زادوں:** مراد درخت اور پودے۔ **خاکداں:** مٹی کا گھر یعنی دنیا۔ **نشاط آباد:** عیش و شادمانی کی بستی۔

مطلب: اس پورے بند میں اقبال کی امیجری اور منظر نگاری انتہائی عروج پر ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ پھولوں پر صبح کے وقت شبنم کے قطرے اس انداز سے پڑے ہوئے ہیں کہ موتی کی لڑی کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ شبنم کے کسی قطرے میں سورج کی کرن الجھ کر رہ گئی ہے۔ سورج کی شعاعوں کے لیے سطح دریا ایک گہوارے کی مانند لگ رہی ہے اور اسی دریا کے کنارے پر طلوع آفتاب کا منظر بڑا پیارا لگ رہا ہے۔

صنوبر کا درخت اس طرح سے اپنی آرائش میں مصروف ہے کہ ندی کا شفاف پانی اس کے لیے آئینہ بنا ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح غنچے کے لیے بہار کی زندگی بخش ہوائیں آئینے کا کام دے رہی ہیں۔ باغ میں اپنے گھونسلے کے قریب کوئل نغمہ سرائی کر رہی ہے تاہم وہ پتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی انسان کی آنکھ سے اوجھل ہے۔ اسی طرح بلبل بھی جو گلستان کی فضاء کو اپنے خوبصورت نغموں سے رنگین بنائے ہوئے ہے جس کے سبب باغ میں آمد بہار کا احساس ہوتا ہے۔

یہ سارا منظر نامہ یوں لگتا ہے جیسے جذبہ عشق کی تصویر سے ہم آہنگ ہے۔ عملی سطح پر اس کو خامہ قدرت کے شوق تحریر سے عبارت قرار دیا جا سکتا ہے۔ رنگا رنگ درخت باغ میں پر سکوت حالت میں ایستادہ ہیں اور پہاڑ کی وادیوں میں گذریوں کے نو عمر بچے کھیل کود اور نعرہ زنی میں مصروف ہیں۔ عملی سطح پر یہ اتنی قدیم دنیا قرنہا قرن گذر جانے کے باوجود زندگی کی رونقوں سے مامور ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو فنا کے گھاٹ کبھی کے اتر چکے ہیں ان کی موت میں بھی زندگی کی تڑپ چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

موسم خزاں کے دوران شگفتہ پھولوں کی پتیاں اس طرح سے اڑ اڑ کر زمین پر گرتی ہیں جیسے سوئے ہوئے بچے کے ہاتھ سے کھلونے گر جائیں۔ ہرچند کہ اس دنیا میں بے اندازہ عیش و نشاط موجود ہے۔ اس کے باوجود ملت کی بربادی کا ایک ایسا غم ہے کہ جو ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔

بارھواں بند **معنی:** دیدۂ گریاں: دیدۂ گریاں کے موتی یعنی آنسو۔

مطلب: چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دل اپنے ماضی کی یادوں سے خالی نہیں ہو سکتے نا ہی یہ امت اپنے عظیم المرتبت بادشاہوں کو فراموش کر سکتی ہے۔ یہ برباد شدہ بام و در فی الواقع ہماری اشکباری کے لیے بہانے بنے ہوئے ہیں ان کی مسلسل یاد سے ہی ہم ابھی تک اپنی سابقہ دانش و حکمت سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کائنات کو بھی اپنے اس طرز علم سے درخشندگی عطا کر رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہم ایک گزرے ہوئے طوفان کے آخری بادل ہیں یعنی اپنے سلف کی عظمتوں کی آخری یادگار ہیں۔ ابھی تو ہمارے دامن میں بے شمار گوہر پوشیدہ ہیں اور ان خاموش سینوں میں بہت سی بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اب بھی ہم دشت و صحرا کو وادی گل میں تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور سوئے ہوئے کسانوں کو بیدار کر سکتے ہیں۔ ہرچند کہ ہماری شان و شوکت اور حکمرانی کا دور ختم ہو چکا ہے اس کے باوجود ادب' فنون اور تہذیبی ارتقا کا ظہور باقی ہے۔

نمودِ صبح

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر
محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر' جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میاں کی ظلمت سے تیغِ آب دار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح
شورشِ ناقوس' آوازِ اذاں سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

*

معنی: دخترِ دوشیزہ: کنواری بیٹی۔ **ورودِ فصلِ انجم**: ستاروں کی فصل کاٹنا۔ **کشتِ خاور**: مشرق کا کھیت۔ **گردوں**: آسمان۔ **شب زندہ دار**: رات بھر جاگنے والا۔ **اختلاط انگیز**: میل جول پیدا کرنے والی۔ **ترنم ریز**: گانے والا' الاپنے والا۔ **قانون**: ایک قسم کا ساز۔

مطلب: زیرِ تشریح نظم میں اقبال نے غروبِ شب اور دن کے طلوع ہونے کے حوالے سے صبح کے وقت کا ذکر کیا ہے۔ پہلے شعر میں صبح کو رات اور دن کی کنواری بیٹی سے تعبیر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ رات ختم ہو رہی ہے اور افق کے دامن سے صبح نمودار ہو رہی ہے۔ آسمان پر جو درخشاں ستارے تھے وہ تمام شب اپنی ذمہ داری نبھا کر ڈوب چکے ہیں۔ اور مشرق کی جانب سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آسمان کو جب آمدِ آفتاب کی خبر ملی تو اس نے تو شب کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس عمل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ستاروں کی روشنی کو اب سورج کی تابندگی میں منتقل کر دیا ہے۔

صبح کا ستارہ اس لمحے اپنا سفر طے کر کے اس طرح منزل کی جانب روانہ ہو رہا ہے جیسے کوئی عبادت گزار ساری رات محوِ عبادت رہ کر سب سے آخر میں عبادت گاہ سے روانہ ہوا ہو۔ مراد یہ ہے کہ باقی ستارے تو پہلے ہی ڈوب گئے ہیں جب کہ صبح کا ستارہ سب سے آخر میں اپنا سفر ختم کر سکا ہے۔ اس لمحے افق سے جس طرح سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ منعکس ہو رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ میان سے کوئی چمکدار تلوار باہر نکال رہا ہے۔ سورج کے طلوع ہونے کے عمل میں صبح کا وجود یوں ظاہر ہو رہا ہے جیسے کہ بوتل سے شراب برآمد ہو رہی ہو۔ صبحدم جو خوشگوار ہوا چل رہی ہے اس میں اذان کی آواز اور مندروں کی گھنٹیوں کے نغمے یکجا ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئل کے نغموں سے تمام دوسرے پرندے بھی بیدار ہو گئے ہیں۔ غرض یہ کہ صبح اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہو گئی ہے۔

تضمین بر شعرِ انیسی شاملو

ہمیشہ صورتِ بادِ سحر آوارہ رہتا ہوں
محبت میں ہے منزل سے بھی خوشتر جادہ پیمائی

دلِ بیتاب جا پہنچا دیارِ پیرِ سنجر میں
میسر ہے جہاں درمانِ دردِ ناشکیبائی

ابھی نا آشنائے لب تھا حرفِ آرزو میرا
زباں ہونے کو تھی منت پذیرِ تابِ گویائی

یہ مرقد سے صدا آئی حرم کے رہنے والوں کو
شکایت تجھ سے ہے اے تارکِ آئینِ آبائی

ترا اے قیس! کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا؟
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی اندازِ لیلائی

نہ تخمِ لا الٰہ تیری زمینِ شور سے پھوٹا
زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی

تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے؟
کنشتی ساز' معمورِ نواہائے کلیسائی

ہوئی ہے تربیت آغوشِ بیت اللہ میں تیری
دلِ شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی

"وفا آموختی از ما' بکارِ دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی"

*

① سے ⑨ **معنی**: **دیارِ پیرِ سنجر**: خواجہ معین الدین کی سرزمین اجمیر شریف۔ **دردِ ناشکیبائی**: بے صبری کا دکھ۔ **منت پذیرِ تابِ گویائی**: تقریر کی طاقت کا احسان اٹھانا۔ **تخم**: بیج۔ **کنشتی ساز**: بت خانہ کا ساز۔

نواہائے کلیسائی: گرجے کے نغمے۔

مطلب: "انیسی شاملو" ایک ترک شاعر جس کا تعلق ایران سے تھا اقبال نے یہ اشعار اس کے ایک شعر کی تضمین کے طور پر کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میری کیفیت یہ ہے کہ جس طرح صبح کی ہوا سرگرداں رہتی ہے اسی طرح میں بھی ہمیشہ آوارہ پھرتا رہتا ہوں اس لئے کہ میرے نزدیک محبت کی انتہا تک پہنچنے سے کہیں بہتر سرگراں رہنا ہے چنانچہ اسی عالم میں پھرتا پھراتا حضرت معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر پہنچ گیا۔ جہاں بے چینی اور اضطراب کا علاج میسر ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے ابھی دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے تھے نا ہی میں حرف مدعا زبان پر لایا تھا کہ قبر سے آواز آئی! کہ حرم کعبہ کو مسلمانوں سے یہ شکایت ہے کہ تم لوگ اپنے مذہبی عقائد کو ترک کر کے ان سے قطعی طور پر بے نیاز ہو گئے ہو۔

تم لوگ تو عشق حقیقی میں مجنوں کے مانند تھے کہ اس کے لیے لیلیٰ کا تصور ہی سب کچھ تھا چنانچہ دینی عقائد تو برقرار ہیں البتہ تم لوگ ہی ان کو نظرانداز کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ تمہارے دل تو بنجر زمین کے مانند ہیں جہاں توحید کا بیج تو بویا گیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا یہی وجہ ہے کہ تمہاری فطرت میں جو بانجھ پن موجود ہے اس کے سبب تم لوگ زمانے بھر میں رسوا ہو کر رہ گئے۔ تمہیں تو اس حقیقت کا علم بھی نہیں کہ تمہاری اصل زندگی کیا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہارے دلوں میں اسلام کی بجائے دوسرے مذاہب کے عقائد بار آور ہو رہے ہیں۔ ہرچند کہ تمہاری تربیت خدا کے گھر میں ہوئی ہے اس کے باوجود تمہارے دل بت خانوں کے شیدائی ہیں۔

تو نے وفا کا سبق تو ہم سے حاصل کیا لیکن اس وفا کو اغیار کے کام میں لایا۔ موتی ہم سے حاصل کیا قربان دوسروں پر کر دیا۔

فلسفہ غم

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کے نام)

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی
موج غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی
ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمہ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدۂ بینا میں داغ غم چراغ سینہ ہے
روح کو سامان زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینہ دل کے لیے گرد ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائر دل کے لیے غم شہپر پرواز ہے — راز ہے انساں کا دل غم انکشاف راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرود بربط ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یا رب!" نہیں — جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جام دل شکست غم سے ہے نا آشنا — جو سدا مست شراب عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوک خار سے — عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفت غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے — زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اے کہ نظم دھر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق — عقل انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شام اجل شرمندہ ہے — عشق سوز زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
رخصت محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر — جوش الفت بھی دل عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں — روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی — آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئنہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور — گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے — یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر، ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی — گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی

پستی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں — یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو — یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامن دل بن گیا ہو رزم گاہ خیر و شر — راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر
خضر ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر — فکر جب عاجز ہو اور خاموش آواز ضمیر
وادی ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو — جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

*

اس نظم کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ اقبال نے اسے قیام پاکستان سے قبل پنجاب کی مشہور شخصیت

اور اپنے ہم جماعت سر فضل حسین کے والد کی وفات پر ایک مرثیے کے طور پر کہی تھی لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ہر مرنے والے کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ طویل نظم بتیس اشعار پر چھ بند کی شکل میں "بانگ درا" کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔ فرماتے ہیں:

پہلا بند **معنی:** **سحاب:** بادل۔ **الم:** رنج و غم۔ قرآن مجید کے پہلے پارہ کا نام۔ **خزاں نادیدہ:** جس نے خزاں نہ دیکھی ہو۔

مطلب: ہرچند کہ حیات انسانی سراپا کیف و عشرت کے علاوہ مسرت و شادمانی کی متقاضی ہے اس کے باوجود اس میں غم و اندوہ اور آنسو بھی موجود ہیں۔ اگر غم و اندوہ کو ایک موج تصور کر لیا جائے اور زندگی کو حباب تو جان لو پانی کا یہ قطرہ موج غم پر رقص کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر زندگی کو ایک کتاب سے تعبیر کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غم اس کتاب کا ایک اہم باب ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کسی پھول میں ایک پتی بھی کم ہو جائے تو اسے مکمل پھول نہیں سمجھا جا سکتا۔ مزید بر آں کسی بلبل کو خزاں سے واسطہ نہیں پڑا تو وہ بلبل کہلانے کی مستحق نہیں۔

دوسرا بند

عملی سطح پر انسانی دل کی داستاں خواہشات اور تمناؤں کے خون سے رنگی ہوئی ہے یعنی انسانی خواہشات کی تکمیل ممکنات سے نہیں اسی طرح انسانی زندگی میں خوشی، غم کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اہل نظر کے لیے غموں کے داغ ان کے سینوں پر چراغوں کے مانند ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب دل سے آہ نکلتی ہے تو وہ روح کی تزئین کا سبب بن جاتی ہے۔ ایک طرح سے حادثات غم کے بغیر فطرت انسانی کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ غم و ملال کی گرد دل کے آئینے پر غازہ کی مانند ہوتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ عالم شباب جو ہمیشہ کیف و سرمستی کے سبب ایک طرح محو خواب رہتا ہے اسے بیدار کرنے میں بھی غم کا بڑا عمل دخل ہے کہ یہ ساز اسی مضراب سے نغمے پیدا کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں اگر دل کو ایک پرندہ تصور کر لیا جائے تو یہ غم کی کیفیت ہی ہے جو اس کی پرواز کے لیے پروں کا درجہ رکھتی ہے اور اگر انسان کے دل کو ایک راز سمجھ لیا جائے تو اس راز کا انکشاف غم کے باعث ہی ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ غم کی کیفیت روح انسانی کے لیے ایک خاموش نغمے کی مانند ہے ایسا نغمہ جو سازوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

تیسرا بند **معنی:** **انکشاف راز:** بھید کا کھلنا۔

مطلب: جو شخص بوقت شام نالہ و فریاد نہیں کرتا اور شب کی تنہائی میں وفور درد کے سبب آنسو نہیں بہاتا جس کا دل غم کے سبب ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا اور ساری عمر عیش و عشرت میں مصروف رہا۔ باغوں کے پھول توڑتے وقت جس کے ہاتھ ان کے کانٹوں سے محفوظ رہے اور جس کا عشق فرقت اور جدائی سے ہم کنار نہیں ہوا ہرچند کہ اس کے روز و شب غموں سے بے نیاز سہی اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس کی نظروں سے زندگی کی تمام حقیقتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ چنانچہ اے دوست! بے شک تجھے نظام کائنات سے پوری طرح آگاہی حاصل ہے اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے لیے غم و اندوہ سے عہدہ برآ ہونا زیادہ مشکل ثابت نہ ہو گا۔

چوتھا بند **معنی**: **یا رب**: خدا کا نام لینا یعنی فریاد کرنا۔ **اشک کے کوکب**: آنسوؤں کے تارے۔ **نظمِ دہر کا ادراک**: زمانے کے کاروبار سے آگاہی۔

مطلب: اس بند میں اقبال ایک دوسرے رخ سے اپنے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابدی سطح پر عشق انسانی بے شک ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ انسانی عقل و دانش تو فنا ہونے والی اشیاء میں سے ہیں۔ صرف جذبہ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ یہی عشق ہے جو موت کی شکست کا باعث ہے لیکن یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ محبوب کی جدائی کا مقصد موت کے مترادف ہوتا اور محبت کا جوش و جذبہ بھی محبت کرنے والے کے دل میں باقی نہیں رہتا تو اس پس منظر میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جانا چاہیے کہ اگر محبوب کی موت واقع ہو جائے تو اس کے سبب عشق تو فنا نہیں ہو جاتا بلکہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس لمحے عشق روح میں غم کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے ختم نہیں ہوتا۔ اس طرح ماننا پڑے گا کہ جب تک عشق باقی ہے محبوب بھی باقی ہے گویا فنا ہونے کے باوجود محبوب زندہ رہتا ہے۔

پانچواں بند **معنی**: **نسخہ دیرینہ**: پرانی کتاب۔ **عدم نا آشنا**: جو عدم سے آشنا نہ ہو۔

مطلب: اس بند میں اقبال جو منظر نامہ پیش کرتے ہیں اس کے مطابق ایک ندی ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے نغمے گاتی ہوئی رواں دواں ہے۔ یہی ندی بلند و بالا فضا میں محو پرواز پرندوں کو گانے کے لیے اکساتی ہے۔ اس ندی کا شفاف پانی ایک حور کے چہرے کی مانند مصفا ہے۔ وادی کی چٹانوں پر جس لمحے یہ پانی آئینے کی صورت میں گرتا ہے تو چور چور ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں پانی کے قطرے موتیوں کی مانند پیارے پیارے لگ رہے ہیں اور کبھی وہ ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔

یہ ندی کی موجیں جو پارے کی مانند تھیں ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو گئیں۔ جن سے ایسی بوندیں نمایاں ہو رہی ہیں جیسے کہ وہ کسی اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہوں۔ تاہم حقیقت یہ کہ ان قطروں کا انتشار عملی سطح پر باہمی ربط کا درس ہے اس لیے دو قدم آگے بڑھنے کے بعد یہ قطرے مربوط ہو کر ایک بار پھر موجوں میں ڈھل جاتے ہیں اور انسانی ہجوم کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں کہ ان کی حقیقت ہی اصل میں یہی ہے۔ دراصل اس کائنات میں ہماری جدائی آئندہ باہمی ارتباط کی آئینہ دار ہے لیکن اس عارضی جدائی پر آنسو اس لیے بہاتے ہیں کہ ہم اسے مستقل سمجھ بیٹھے ہیں۔ گویا انسان جب فنا ہو کر ہم سے بچھڑتا ہے تو عملی سطح پر یہ عارضی جدائی ہوتی ہے۔ اسی جدائی کے غم میں آنسو بہائے جاتے ہیں۔

چھٹا بند **معنی**: **محصور**: گھری ہوئی۔ **رزم گاہ خیر و شر**: نیکی اور بدی کا میدان جنگ۔ **گوشہ گیر**: تنہائی کے کونے میں بیٹھنے والا۔

مطلب: اس پوری نظم میں اقبال "حیات بعد الممات" کے فلسفے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی باعث وہ آخری بند کے اشعار میں واضح طور پر اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بنظر عمیق دیکھا جائے تو جو لوگ موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں درحقیقت وہ فنا نہیں ہوتے اور روحانی سطح پر ہم سے جدا نہیں ہوتے۔ جس گھڑی انسانی عقل و دانش دنیاوی آلام و مصائب میں گھر جائے یا پھر جوانی تاریک رات میں چھپ جائے اور انسان بے بس ہو جائے قلب انسانی نیکی و بدی اور حق و باطل کی جنگ کا میدان بن کر رہ

جائے اور راہ کی تاریکیوں کے سبب منزل کی جانب سفر کرنا بھی دشوار ہو جائے۔ انسان اپنی جراءت و ہمت اور حوصلے کے حوالے آرزوؤں اور تمناؤں سے کنارہ کش ہو جائے یہی نہیں بے بسی کا یہ عالم ہو کہ انسانی فکر اور ضمیر اپنی کارکردگی میں معطل ہو کر رہ جائیں اس کے علاوہ زندگی میں کوئی ہم خیال اور ہم سفر بھی باقی نہ رہے حتیٰ کہ تاریک شب میں رہنمائی کے لیے جگنو کی ننھی روشنی تک موجود نہ ہو تو مرنے والوں کی پیشانیاں تاریکی میں اس طرح سے روشن ہو جاتی ہیں جس طرح کہ اندھیری رات میں تارے چمکتے ہیں اور ان کی روشنی مسافر کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے!
کلی سے رشک گل آفتاب مجھ کو کرے
تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
اٹھا کے صدمہ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا
مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہل نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
کبھی یہ پھول ہم آغوش مدعا نہ ہوا
کسی کے دامن رنگیں سے آشنا نہ ہوا
شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

*

(1) سے (2) اس نظم کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے یہ نظم اپنی اس محبوبہ کے لیے لکھی تھی جس نے انہیں تحفہ کے طور پر پھول بھیجے تھے۔ یہ امر ہمیشہ سے صیغہ راز میں ہی رہا کہ ان کی یہ محبوبہ کون تھی؟ چنانچہ نظم کے پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے ناز و انداز میں مست رہنے والی محبوبہ جب کبھی پھول توڑنے کے لیے باغ میں جا نکلتی ہے تو اس کے لیے وہاں موجود ہر کلی کے لبوں سے دعائیں نکلتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ اس امر کی تمنا کرتے ہوئے رب ذوالجلال سے دعا کرتی ہے کہ یہ دوسری کلیوں کو چھوڑ کر میرا انتخاب ہی کرے۔ اس صورت میں میرا وجود پھول تو الگ رہے سورج کے لیے بھی باعث رشک بن جاؤں۔

(3) سے (4) اس شعر میں اقبال کلی سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ میرا محبوب تجھے شاخ سے توڑ لیتا ہے۔ اس کے اس عمل پر باغ میں جو کلیاں تیری رقیب تھیں وہ یقیناً حسد کے مارے تڑپ کر رہ گئی ہوں گی۔ ہرچند کہ تجھے شاخ سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا لیکن میرے محبوب کے ہاتھوں کے لمس سے تیری عظمت انتہائی کمال تک پہنچ گئی۔

(5) سے (7) معنی: تصدق: قربان۔ ہم آغوش: بغل گیر۔ فسردہ: غمگین۔

مطلب: اے کلی! اس حقیقت کو جان لے کہ میری محبوب بھی کنول کے پھول کی مانند ہے جس کو دیکھتے ہی ہر شخص اس کا والہ و شیدا بن جاتا ہے اور میری جوانی پر یقیناً اس پر فخر کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی

اس کی خواہش کی تکمیل نہیں ہو سکی نا ہی وہ کسی کے دامن رنگین سے اب تک ہم آغوش ہو سکا ہے۔ اس کنول کے پھول کو کبھی بہار یعنی خوشی راس نہ آسکے گی۔ وہ تو ہمیشہ کسی گلچیں کا منتظر رہتا ہے۔

ترانۂ ملی

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا — ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری — تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم — سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھکو — تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اے موجِ دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو — اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم — ہے خوں تری رگوں میں ابتک رواں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا — اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

*

① سے ③ اقبال کہتے ہیں کہ چین، عرب اور ہندوستان یہ سب ہمارے ملک ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور سارا جہان ہمارے وطن کے مانند ہے۔ اس لیے کہ مسلمان اپنے عقیدے کے اعتبار سے کسی مخصوص خطہ زمین کو خود سے وابستہ نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سارے جہان کو اپنا وطن شمار کرتے ہیں۔ ہمارے سینوں میں خدا کی وحدانیت کا تصور ایک امانت کی طرح محفوظ ہے اور اس وحدانیت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اس لیے ہمارا نام و نشان بھی کوئی نہیں مٹا سکتا۔ جن دنوں دنیا بھر میں کفر والحاد پھیلا ہوا تھا اور ہر سمت بت خانے ہی بت خانے تھے اس وقت خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ نے خدائے وحدت کی عبادت کے لیے اولین عمارت تعمیر کی جسے خانہ کعبہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمان خانہ کعبہ کے محافظ ہیں اور یہ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے سبب ملت اسلامیہ میں نظم و ضبط اور وحدت کا تصور برقرار ہے۔ یہ نہ ہوتا تو ہم ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتے۔

④ سے ⑥ **معنی:** خنجر ہلال کا: یعنی اسلامی جھنڈا، جس کا نشان چاند تارا ہے۔

مطلب: یہ حقیقت ہے کہ ہم تلواروں کے سائے میں پل کر عنفوانِ شباب تک پہنچے اور اس امر سے کسے انکار ہو گا کہ ملت اسلامیہ کا سبز پرچم ہلال اور ستارے سے سجا ہوا ہے چونکہ ہلال بڑی حد تک خنجر سے مشابہ ہوتا ہے اس لیے اسے اقبال نے اسی سے تشبیہ دی ہے اور اسے اپنے قومی نشان سے تعبیر کیا ہے۔ ہرچند کہ مسلمان عساکر کا بنیادی مرکز عرب تھا اس کے باوجود ہم اپنی قوت اور ہمت کے طفیل مغربی

ممالک پر یلغار کرتے رہے۔ یہاں ہماری اذانیں گونجتی رہیں۔ یوں یہ امر واقعہ ہے کہ ان علاقوں میں بھی ہمارے عساکر کی یلغار کے سامنے کوئی لشکر بھی نہ ٹھہر سکا اور ہم جو تھے وہ یورپی ممالک میں فتوحات حاصل کرتے رہے۔

⑦ سے ⑧ **معنی : گلستان اندلس**: ہسپانیہ کا ایک شہر۔ **دجلہ** : عراق کا مشہور دریا۔ **ارض پاک** : عرب' حجاز۔

مطلب: اس شعر میں اقبال آسمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے فلک کج رفتار یہ جان لے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو باطل سے خوف زدہ ہو کر رہ جائیں۔ اس ضمن میں تو اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ تو ایک بار نہیں سو بار ہمارا امتحان کر چکا ہے۔ اس کے ثبوت میں اندلس اور دجلہ کو ہماری جراءت و حوصلے کی داستانیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ یہاں کبھی مسلمان سلاطین کا اقتدار پورے عروج پر تھا۔ اور گرد و پیش کی وادیاں ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی زد میں ہوتے تھے۔

⑨ سے ⑩⑪⑪⑨ **معنی**: جادہ پیما: چلنے کے لیے تیار۔

مطلب: اے سرزمین حجاز! کیا تو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ ہم نے تیری عزت و حرمت کے لیے ہمیشہ اپنی جانیں قربان کی ہیں اور آج بھی تیری رگوں میں ہمارا خون رواں دواں ہے۔ اے سرزمین حجاز! تو جانتی ہے کہ تیرا والی و آقا ہمارے قافلے کا سالار اول ہے یعنی حضور سرور کائنات ﷺ کی تعلیمات کی روشنی سے ہم رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہی نام عملاً اسم اعظم کی طرح ہے جو ہمارے بے چین اور مضطرب دلوں کو سکون و اطمینان سے ہم کنار کرتا ہے۔

نظم کے اس مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ میں نے جو یہ ملی ترانہ تخلیق کیا ہے وہ ایک ایسی گھنٹی کی مانند ہے جو دوران سفر ہمیشہ رہنمائی کا سبب بنتی ہے۔ اس الارم کے ساتھ یوں سمجھ لیجیے کہ ہمارا قافلہ ایک بار پھر سے بڑی مستعدی اور نظم و نسق کے ساتھ اپنی منزل کی جانب سرگرم سفر ہو رہا ہے۔

دیکھا جائے تو زیر تشریح ملی ترانہ کے کم و بیش تمام اشعار شاعر کے اس جذبے کے مظہر ہیں جو ملت اسلامیہ کو سرکردہ حیثیت کی حامل بنانے کے لیے اس کے دل میں موجزن تھا۔

وطنیت

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

*

پہلا بند معنی: پیرہن: لباس۔

مطلب: یہ نظم اس اعتبار سے خاصی اہم ہے کہ اس میں اقبال نے وطنیت کے حوالے سے واضح طور پر اپنا سیاسی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ یہ نظم عملاً چار بند پر مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ دور جس میں ہم زندہ ہیں وہ اپنی نئی روایات کے ساتھ بر سر عمل ہے یعنی پرانی اقدار مٹ رہی ہیں اور نئی قدریں جنم لے رہی ہیں۔ تہذیب کے اجارہ دار رہنماؤں نے ایسی روش کو فروغ دیا ہے جو ظلم اور الفات دونوں کیفیتوں سے ہم آہنگ ہے چنانچہ دوسری تہذیبوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اپنی تہذیب کو چھوڑ کر ایک نیا کعبہ بنا لیا ہے یعنی ملت اسلامیہ نے اپنے تہذیب و کلچر کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنا لیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید تہذیب کا مشہور بت تراش آزر اب نئے بت تراشنے میں مگن ہے۔ چنانچہ اس نے اب تک جو بت تراشے ان میں سب سے بڑا اور بلند و بالا بت "وطن" کا ہے۔ اس بت کو جو لباس پہنایا ہے وہ مذہب اور عقیدے کے لیے کفن کی حیثیت رکھتا ہے یعنی وطن کی پرستش مذہب اور عقائد کے منافی ہے۔

دوسرا بند معنی: تہذیب نوی: نئی تہذیب۔ نظارۂ دیرینہ: پرانا نظارہ۔

مطلب: نئی تہذیب سے وطنیت کا تصور عبارت ہے اور یہ ایسا تصور ہے جو آنحضرتؐ کے دین اور ان کی تعلیمات کی نفی کرتا ہے لیکن اے دین محمدیؐ کے پیروکار! توحید ایسی قوت ہے جس نے تجھے ہر مرحلے پر تقویت پہنچائی ہے۔ تیرا وطن کوئی مخصوص خطہ ارض نہیں بلکہ عملی سطح پر اسلام ہی تیرا وطن عزیز۔ تاہم تیری نسبت کسی اور شخصیت سے ہے بلکہ تو تو حضرت محمد مصطفیؐ کا پیروکار ہے چنانچہ تجھ پر لازم ہے کہ چودہ سال کی قدیم شان و شوکت اور جراءت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وطنیت کے تصور کو تباہ کر دے۔

تیسرا بند معنی: قید مقامی: زمین کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں قید۔

مطلب: اقبال اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے ملت اسلامیہ کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے فرزند توحید! اس حقیقت کو جان لے کہ اگر کوئی ایک مخصوص خطہ ارض کا اسیر اور قیدی ہو کر رہ

جائے تو اس کا منطقی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر تو اس کائنات کو ایک سمندر کی مانند جان لے تو یہاں تیری بود و باش ایک مچھلی کی طرح ہونی چاہیے کہ مچھلی پانی کی حدود میں کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتی۔ یہ تیری ذمے داری ہے کہ نبوتؐ کی صداقت کی گواہی دے یعنی فرمان محمدیؐ کے مطابق وطن کے تصور کی نفی کر! یوں سیاسیات کے حوالے سے بے شک وطن کا تصور مختلف ہے لیکن ارشاد نبویؐ کے حوالے سے وطن ایک بے معنی شے ہے۔

چوتھا بند معنی: رقابت: دشمنی۔

مطلب: دنیا بھر کی قوموں کے مابین رقابت کا جذبہ وطنیت کے سبب ہی پیدا ہوا ہے۔ اسی کے سبب تجارت کا مقصد بھی دوسرے ممالک کو تسخیر کرنا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا برائی ہو گی کہ سیاست میں صداقت اور سچائی کا جذبہ اگر ناپید ہے تو اس کا باعث بھی وطنیت کا تصور ٹھہرتا ہے۔ جو لوگ اور قومیں کمزور ہوتی ہیں ان کو تباہ و برباد کرنے میں بھی اس تصور کا بڑا حصہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کے سبب مخلوق خداوندی مختلف قوموں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ اسلامی تصور قومیت کی جڑ کاٹنے کا باعث بھی یہی ہے۔

ایک حاجی مدینے کے راستے میں

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں، اور منزل ہے دور
اس بیاباں، یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دور

ہم سفر میرے شکارِ دشنۂ رہزن ہوئے
بچ گئے جو، ہو کے بیدل سوئے بیت اللہ پھرے

اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی

خنجرِ رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا
"ہائے یثرب" دل میں، لب پر نعرۂ توحید تھا

خوف کہتا ہے کہ "یثرب کی طرف تنہا نہ چل"
شوق کہتا ہے کہ "تو مسلم ہے، بیباکانہ چل"

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا؟
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟

خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز

گو سلامت محملِ شامی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

آہ! یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے
اور تاثر آدمی کا کس قدر بیباک ہے

*

① سے ④ **معنی:** دشنہ: خنجر۔ زہراب: زہر بھرا پیالہ۔

مطلب: علامہ نے یہ نظم ایک حاجی کے بیان کی روشنی میں کہی ہے جو حج بیت اللہ کے بعد زیارت کے لیے اپنے قافلے کے ہمراہ مکے سے مدینے جا رہا تھا۔ راستے میں رہزنوں نے نہ صرف یہ کہ اہل قافلہ کو لوٹ لیا بلکہ جن لوگوں نے مزاحمت کی ان کو قتل بھی کر دیا۔ چنانچہ اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ رہزنوں نے صحرا میں قافلے کو لوٹ لیا ہے اور ابھی ہم منزل سے کوسوں دور ہیں۔ حاجی کہتا ہے کہ میرے کئی ہم سفر رہزنوں کی تلواروں کا نشانہ بن گئے اور ان کے خوف کے سبب جو لوگ بچ گئے تھے وہ واپس بیت اللہ کی

جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن قافلے میں سے ایک بخاری نوجوان نے رہزنوں کے خلاف بڑی جراءت و ہمت کے ساتھ نبرد آزمائی کی اور بالآخر شہادت کا رتبہ حاصل کر لیا۔ ظاہر ہے کہ شہادت موت نہیں بلکہ ابدی زندگی سے عبارت ہے۔ ایک رہزن کا خنجر اس بخاری نوجوان کے لیے ہلال عید کے مانند تھا۔ اس لمحے بھی اس کے لبوں پر مدینہ اور توحید کا نعرہ تھا۔

⑤ سے ⑨ **معنی : مدفون یثرب**: وہ پاک ذاتؐ جو مدینہ میں دفن ہے۔ مراد ہے حضرت رسول اکرم ﷺ۔ **محمل شامی**: غلاف کعبہ لانے والا وہ قافلہ جو شام سے آتا تھا۔ **جانکاہی**: محنت۔

مطلب: حاجی کہتا ہے کہ ان رہزنوں کا خوف مجھے مدینے کی جانب تنہا جانے سے روکتا ہے لیکن شوق زیارت کا تقاضا ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے اپنی منزل کی جانب بڑی جراءت اور بیباکی سے اپنا سفر جاری رکھوں۔ اگر مدینے میں روضہ رسولؐ مقبول کی زیارت کے بغیر ہی واپس مکہ چلا گیا تو ان لوگوں کو کیسے منہ دکھا سکوں گا جو عاشق رسولؐ ہیں۔ یوں بھی دشت حجاز میں سفر کرنے والوں کو جان کا خوف نہیں ہوتا۔ مدینے میں حضورؐ کی ہجرت میں بھی یہی راز پوشیدہ ہے۔ اگرچہ شامی محمل کے ساتھ یہ سفر تحفظ کا احساس دلاتا ہے لیکن عشق کی لذت تو خطروں میں ہی چھپی ہوتی ہے۔ افسوس کہ عقل انسانی ہمیشہ خسارے کے انداز میں سوچتی ہے۔ جب کہ انسان کا جذبہ عشق نڈر اور بیباک ہوتا ہے۔

قطعہ

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

غضب ہیں یہ "مرشدان خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

*

معنی : شوریدہ: دیوانہ۔ **بنائے ملت**: ملت کی بنیاد۔ **مرشدان خود بیں**: صرف اپنی عزت اور منافع پر نظر رکھنے والے۔

مطلب: زیر تشریح قطعہ یوں تو محض چار اشعار پر مشتمل ہے تاہم ان اشعار میں اقبال نے ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جس کو ان کی فکر کے حوالے سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

کل ایک شوریدہ سر یعنی دیوانہ انسان مزار رسولؐ مقبول پر کھڑا ہوا آہ و زاری کرتے ہوئے فریاد کر رہا تھا کہ حضورؐ دیکھیے! یہ جو ہندوستان اور مصر کے مسلمان ہیں ان کا کردار اس قدر منفی ہے جو مسلم قومیت کی تباہی و بربادی کا باعث بن کر رہ گیا ہے۔ یہ مغربی تہذیب و تمدن پر ایمان رکھنے والے لوگ ہمارے رہنما بننے کی کتنی بھی کوشش کریں وہ ہمارے رہبر اس لیے نہیں بن سکتے کہ آپؐ کی تعلیمات سے بے بہرہ ہیں۔

یہ لوگ تو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر خود ساختہ رہنما بنے بیٹھے ہیں۔ خداوند تعالیٰ قوم کو ان کے کردار

سے بچائے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو صحیح راہ سے بھٹکا کر محض اپنے وقار کو بلند کرنے میں سرگرداں ہیں۔ یہی لوگ تو آج ملت اسلامیہ کے زوال کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

آخری شعر میں اقبال اپنے نظریات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ تہذیب بدل گئی ہے اور تم ہو کہ اپنی شاعری کے حوالے سے پرانی باتیں دہرا رہے ہو۔ آج کے دور میں آخر کون ان باتوں کو سنے گا؟

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں؟ فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟
جراء ت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے، خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازخاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ، تو معذور ہیں ہم
اے خدا! شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم پھول تھا زیب چمن، پر نہ پریشاں تھی شمیم!
شرط انصاف ہے اے صاحب الطاف عمیم بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم؟
ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوبؐ کی دیوانی تھی؟

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر؟
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی اہل چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی، وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے، تو جنگوں کی مصیبت کے لیے — اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے — سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے — پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا در خیبر کس نے؟ — شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ — کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟ — اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاں دار ہوئی؟ — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے!
منہ کے بل گر کے **ہو اللہ احد** کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے — مے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے — اور معلوم ہے تجھکو کبھی ناکام پھرے؟
دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

امتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہ گار بھی ہیں — عجز والے بھی ہیں، مست مے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں — سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے' احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں' ہیں ان کے خزانے معمور نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں' ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب
طعن اغیار ہے' رسوائی ہے' ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟

تیری محفل بھی گئی' چاہنے والے بھی گئے شب کی آہیں بھی گئیں' صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے' اپنا صلہ لے بھی گئے آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق' گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

درد لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی' حسن کا جادو بھی وہی امت احمدؐ مرسل بھی وہی' تو بھی وہی
پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولؐ عربی کو چھوڑا؟ بت گری پیشہ کیا؟ بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو' عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟ رسم سلمانؓ و اویسؒ قرنی کو چھوڑا؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلالؓ حبشیؓ رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفت قبلہ نما بھی نہ سہی اور پابندی آئین وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے' کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سر فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے   اک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے   پھونک دی گرمی رخسار سے محفل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں' تجھے یاد نہیں؟

وادی نجد میں وہ شور سلاسل نہ رہا   قیس دیوانہ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے' ہم نہ رہے' دل نہ رہا   گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونق محفل نہ رہا
اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے   سنتے ہیں جام بکف نغمہ کو کو بیٹھے
دور ہنگامہ گلزار سے یک سو بیٹھے   تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ھو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز   لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز   تو ذرا چھیڑ تو دے' تشنہ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر دے   مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کر دے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے   ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرت دیرینہ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینہ ما!

بوئے گل لے گئی بیرون چمن راز چمن   کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غماز چمن
عہد گل ختم ہوا' ٹوٹ گیا ساز چمن   اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پرداز چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں   پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں   ڈالیں پیرہن برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی' نہ مزا جینے میں   کچھ مزا ہے تو یہی خون جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں   کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

جاگ اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہے تو کیا‘ مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

*

اکتیس بند پر مشتمل "شکوہ" اقبال کی ان معرکتہ الارا طویل نظموں سے بے حد اہم نظم ہے جسے اس صدی کی انتہائی مقبول تخلیق سے تعبیر کیا جائے گا تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نظم میں اقبال مکالمہ تو رب ذوالجلال سے کرتے ہیں لیکن ان کا لہجہ معمول سے بھی زیادہ تند و تیز ہے۔ "شکوہ" ہی وہ نظم ہے جس کے حوالے سے اقبال پر کفر کے فتوے بھی عائد کیے گئے اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی اشاعت پر بھی خاصی لے دے ہوئی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے دفاع میں "جواب شکوہ" جیسی نظم بھی لکھنا پڑی۔ جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔ زیر تشریح نظم "شکوہ" فکری سطح پر ہی نہیں فنی اور تکنیکی بنیاد پر بھی ایک بلند پایہ نظم ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

پہلا بند **معنی: زیاں کار:** اپنا نقصان کرنے والا۔ **سود فراموش:** اپنے نفع سے غافل۔ **فکر فردا:** کل کی فکر۔ **غم دوش:** ماضی کا غم۔ **نالے:** رونا۔ **ہمہ تن گوش:** پوری طرح متوجہ۔ **ہمنوا:** دوست۔ **جراءت آموز:** دلیری سکھانے والی۔ **تاب سخن:** قوت گفتار۔ **خاکم بدہن:** میرے منہ میں خاک۔

مطلب: نظم کا آغاز خاصے تند و تیز لہجے میں کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ زندگی میں نقصان اٹھاؤں اور فوائد حاصل نہ کروں۔ یہ بھی بے معنی بات ہے کہ عصر موجود کی فکر میں تو گمشدہ رہوں اور مستقبل کی طرف دھیان نہ دوں۔ کیا یہ مضحکہ خیز امر نہیں ہے کہ بلبلوں کی نالہ و فریاد تک ہی خود کو محدود رکھوں اور اس کی بجائے کسی دوسری جانب ہی خود کو متوجہ رکھوں۔ رب ذوالجلال نے تو مجھے ایسی قوت گویائی عطا کی ہے جو بڑی جراءت اور حاصلے کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "خاکم بدہن" میں اب اپنے پالنے والے سے ہی شکوہ و شکایت کر رہا ہوں۔

دوسرا بند **معنی: شیوۂ تسلیم:** اطاعت کی عادت۔ **ارباب وفا:** اہل وفا‘ وفادار لوگ۔ **خوگر حمد:** خدا کی تعریف کرنے کے عادی۔

مطلب: یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم پیغمبر اسلامؐ کے پیروکار رضائے الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کے عمل میں خاصی شہرت رکھتے ہیں پھر بھی حالات نے اس قدر مجبور کر دیا ہے کہ اپنے درد کا قصہ بیان کرنا اب ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ بے شک ہماری ہستی ایک ساز خاموش کی مانند ہے کہ دل ہے کہ فریاد سے معمور ہے چنانچہ اس صورت میں نالہ و فریاد لبوں تک آ جائے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ تو ایک طرح سے ہماری مجبوری ہے۔

چنانچہ اے رب ذوالجلال! ہم جو ہمیشہ تیری حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ اب انہی وفادار لوگوں سے تھوڑا سا شکوہ بھی سن لے کہ ہم جو ہمیشہ سے تیری حمد و توصیف کے عادی رہے ہیں اب ان سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے۔ کہ یہ ایک دردمند دل سے نکلی ہوئی ایسی آواز ہے جو حقیقت حال سے تعبیر کی جانی چاہیے۔

تیسرا بند معنی : **ازل** : وہ زمانہ جس کی ابتداء نہیں۔ **بوئے گل** : پھول کی خوشبو۔ **جمعیت خاطر** : اطمینان قلب۔

مطلب : اے خدا! بے شک تیری ذات قدیم تو ازل سے ہی موجود ہے اس کے باوجود تیری ذات ایک ایسے پھول کی مانند تھی، ہوا نہ ہونے کے باعث جس کی خوشبو چمن میں پھیلنے کے امکانات نہ تھے۔ اے مہربان و کریم انصاف کا تقاضا تو اس سوچ میں مضمر ہے کہ اگر ہوا موجود نہ ہو تو پھول کی خوشبو باغ میں کسی طور بھی نہیں پھیل سکتی۔ یہ ملت اسلامیہ ہی تھی جس نے تیرا پیغام عام کیا۔ ہم اگر تیرا پیغام لے کر دنیا بھر میں مارے مارے پھرتے تھے تو یہ پریشانی اور سرگردانی ہمارے لیے وجہ تسلی تھی۔ ورنہ تیرے پیغمبرؐ کی یہ امت دیوانی تو نہ تھی کہ دربدر پھرے۔

چوتھا بند معنی : **معبود** : جس کی عبادت کی جائے۔ **خوگر** : عادی۔

مطلب : ملت اسلامیہ سے قبل تو اے خدا! تیری دنیا کی عجیب و غریب کیفیت تھی۔ کہیں تو پتھروں کو اور کہیں لوگوں نے درختوں کو اپنا معبود بنایا ہوا تھا اور یہ لوگ انہی کی پرستش کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ان اشیا کو اپنا خالق سمجھنے کا عادی ہو چکا تھا جس کے وجود کو خود محسوس کر سکے۔ اس صورت میں تجھے کون مانتا کہ جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

یہ حقیقت بھی تیرے علم میں ہے کہ ان دنوں کوئی شخص بھی تیرا نام لینے اور تیری عبادت کرنے کا قائل نہ تھا۔ یہ صرف اہل اسلام کی قوت ایمان اور قوت بازو ہی تھیں جن کے سبب کائنات کے گوشے گوشے میں تیرا نام عام ہو گیا اور ہر طرف تیری عبادت ہونے لگی۔

پانچواں بند معنی : **سلجوق** : سلجوقی خاندان۔ **معمورے** : آبادی۔ **نصرانی** : عیسائی۔

مطلب : اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے قبل اس دنیا میں ترکوں کا قبیلہ سلجوق بھی تھا، اور توران کے طول و عرض میں تورانی بھی موجود تھے۔ چین جیسے وسیع و عریض ملک میں چینی باشندے بھی مقیم تھے اور ایران ساسانیوں کی شوکت و جلال کا مظہر تھا۔ پھر یہاں یونانی بھی رہتے تھے۔ اسی دنیا میں یہودی اور نصرانی بھی رہتے تھے۔ اس کے باوجود تیرے نام کے تحفظ کی خاطر یہ تو بتا تلوار کس نے اٹھائی اور تصور توحید سے بغاوت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کے علاوہ کون نبرد آزما ہوا۔

چھٹا بند معنی : **معرکہ آراؤں** : جنگجو۔ **کلیساؤں** : گرجا۔ **جہانداروں** : بادشاہ۔

مطلب : اے معبود حقیقی ہم مسلمان ہی تھے جو ساری دنیا میں تیرے مخالفین کے مقابل نبرد آزما رہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے کبھی ہم دشمن کے خلاف صحراؤں میں اور کبھی دریاؤں اور سمندروں میں جا کر صف آرا ہوئے۔ کبھی یورپی ممالک کو فتح کر کے وہاں کے کلیساؤں میں جا کر اذانیں دیں اور نغمہ توحید سنایا۔ اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں پہنچ کر آوازۂ حق بلند کیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو بڑے بڑے شان و شوکت والے سلاطین کی عظمت مرعوب نہ کر سکتی تھی اس لیے ہم تو تلواروں کی چھاؤں میں کلمہ پڑھنے کی جراءت اور حوصلہ رکھتے تھے۔

ساتواں بند معنی : **تیغ زنی** : تلوار چلانا۔ **سر بکف** : جان ہتھیلی پر رکھنا۔ **بت شکنی** : بت توڑنا۔

مطلب: اے خدائے ذوالجلال! ہم مسلمان تو اپنے حریفوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے جیا کرتے تھے اور تیرے نام کی عظمت کے لیے زندگی قربان کر دیتے تھے۔ جہاں تک ہماری تیغ زنی کا تعلق تھا وہ محض اپنی حکومتوں کے تحفظ کی خاطر نہیں تھا۔ نا ہی ہم دولت کے لیے دنیا بھر میں اپنا سر ہتھیلیوں پر لے کر پھرتے تھے۔ اگر ہماری قوم مال و دولت پر مرتی تو بت شکنی کیوں کرتی۔

آٹھواں بند **معنی:** سرکش: باغی۔

مطلب: ہم مسلمان تو وہ حوصلہ مند لوگ تھے جب میدان جنگ میں پہنچ گئے تو فتح حاصل کیے بغیر واپس نہ پلٹے۔ انسان تو انسان ہم تو وہاں شیروں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیا کرتے تھے۔ اگر تیرے خلاف کوئی بغاوت پر آمادہ ہوتا تو ہم اس کے خلاف ڈٹ جاتے اور پھر تلوار تو الگ رہی ہم لوگ تو توپ کے مقابل بھی سینہ سپر ہو جاتے۔ اے مالک حقیقی! یہ بتا کہ ہمارے علاوہ توحید کا علم بلند اور کس نے کیا ہم تو تیرا یہ پیغام زیر خنجر بھی سنایا۔ آخری مصرع میں علامہ کا اشارہ نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ کی جانب ہے جنھوں نے میدان کربلا میں حق کی فتح کے لیے اپنا سر کٹوا دیا۔

نواں بند **معنی:** شہر قیصر: روم کی سلطنت۔ یزداں: نیکی کا خدا۔

مطلب: اے خدا اتنا بتا دے کہ یہودیوں کی مشہور بستی خیبر میں القدس کا دروازہ کس نے تن تنہا اکھاڑ پھینکا۔ ایک روایت کے مطابق یہ دروازہ اتنا وسیع و عریض اور مضبوط تھا کہ اسے کم و بیش سو افراد مل کر بند کیا کرتے اور کھولا کرتے تھے۔ تاریخ اسلام کا یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ شیر خدا حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے جنگ خیبر کے دوران تنہا یہ دروازہ اکھاڑ پھینکا تھا۔ جس کے بعد لشکر اسلام نے باسانی اس انتہائی مضبوط قلعے کو تسخیر کر لیا۔ قیصر روم کے عظیم شہر قسطنطنیہ کو کس نے فتح کیا۔ وہ کون تھے جنھوں نے ایسے نافرمان لوگوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جو مخلوق ہونے کے باوجود خالق بن بیٹھے تھے اور یہ بھی بتا دے کہ کفاروں کے لشکروں کو کن لوگوں نے تباہی سے دوچار کیا۔ جس دور میں ایران میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی اور وہاں کے لوگ اسی واسطے سے آتش پرست کہلاتے تھے ان کے آتشکدوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا دینے والے کون لوگ تھے۔ چنانچہ اس عمل کے بعد ذکر توحید کو از سر نو کس نے زندہ کیا؟

دسواں بند **معنی:** زحمت کش پیکار: جنگ و جدل کی تکلیف۔ صنم: بت۔

مطلب: اے خدا! یہ بتا کہ ملت اسلامیہ کے علاوہ اور کون سی قوم تھی جس نے تجھ سے محبت کی اور تیری خاطر ہمیشہ میدان کارزار میں سرگرم عمل رہی۔ وہ کس قوم کی تلوار تھی جس نے ساری دنیا کو تسخیر کیا اور اس پر حکومت کی۔ کس کے نعرۂ تکبیر سے دنیا بیدار ہوئی اور نیک و بد کی تمیز سیکھی۔ وہ کون سی قوم تھی جس کے خوف سے بت بھی سہمے ہوئے رہتے تھے اور ان کو سامنے پا کر سجدے میں گر جاتے اور تیری وحدانیت کا اقرار کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھی۔

گیارہواں بند **معنی:** زمیں بوس: زمین کو بوسہ دینا مراد سجدہ کرنا۔ بندہ: غلام۔ غنی: دولت مند۔

مطلب: اے معبود حقیقی! تو اس امر سے یقیناً آگاہ ہے کہ میدان جنگ میں زبردست نبرد آزمائی کے دوران تیری عبادت یعنی نماز کا وقت آ گیا تو مسلمان عساکر نے دشمن کی تلواروں کی پروا کیے بغیر خانہ کعبہ

کی طرف رخ کر کے اپنی صفیں سیدھی کر لیں اور سجدہ ریز ہو گئے۔ اس دوران ان عساکر میں بندہ و آقا کی تمیز مٹ گئی اور دوران نماز آقا و غلام' امیر اور غریب سب کا فرق ختم ہو گیا اور سب برابر ہو گئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تیری سرکار میں پہنچ کر یہ سب لوگ ایک ہو گئے۔

بارہواں بند معنی: **محفل کون و مکاں**: مراد دنیا۔ **بحر ظلمات**: بحراوقیانوس۔

مطلب: تجھے معلوم ہے کہ ایک عرصے تک مسلمان تیرا پیغام لے کر ہمہ وقت ساری دنیا میں پھرتے رہے اور ہر فرد کو دعوت توحید دیتے رہے۔ تیرا پیغام لے کر تو وہ پہاڑوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے اور اس امر کا تو تجھے علم ہی ہے کہ اس عمل میں کبھی ناکام ہوئے نہ وہاں سے ناکام لوٹ کر آئے۔

اے آقا! تجھے علم ہے کہ صحرا تو الگ رہے ہم نے تو دریا بھی نہیں چھوڑے اور بحراوقیانوس تک میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔

تیرہواں بند معنی: **باطل**: کفر۔ **جبینوں**: ماتھا۔

مطلب: ہم مسلمانوں نے اپنی جدوجہد اور قربانیوں سے باطل کو مٹا کر سچائی کا بول بالا کر دیا۔ اور انسان کو دوسرے انسان کی غلامی سے نجات دلائی۔ تیرے کعبے سے بتوں کو نکال کر اپنی پیشانیوں سے آباد کیا۔ تیرا قرآن اپنے سینوں میں محفوظ کر کے رکھا۔ اس کے باوجود تجھے یہ گلا ہے کہ ہم تیرے وفادار بندے نہیں ہیں۔ مگر یہ جان لے کہ ہم وفادار نہیں تو تو نے ہماری کونسی دل دہی کی ہے؟ یعنی ہم مسلمانوں نے تو تیرے لیے ہر ممکن قربانی دی جب کہ تیرا سلوک نمایاں ہے۔

چودہواں بند معنی: **کاشانوں**: قیام گاہ۔

مطلب: اے خدا! بے شک اس دنیا میں ملت اسلامیہ کے علاوہ اور بھی کئی قومیں آباد ہیں۔ ان میں نیک لوگ بھی موجود ہیں اور گنہگار بھی! ایسے لوگ بھی ہیں جو انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں اور ایسے افراد بھی موجود ہیں جو انتہائی مغرور و متکبر واقع ہوئے ہیں۔ ان میں کاہل بھی ہیں ہوشیار بھی اور غفلت شعار بھی موجود ہیں۔ اور صدہا ایسے لوگ ہیں جو تیرا نام لینا پسند نہیں کرتے اور تجھ سے کد رکھتے ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں پر تو تیری رحمت کا نزول ہوتا ہے لیکن ہم مسلمانوں پر تو عذاب ہی نازل ہوتا رہتا ہے۔

پندرھواں بند معنی: **منزل دہر**: دنیا کی منزل۔ **حدی خواں**: ساربان۔ **خندہ زن**: تمسخر کرنے والا۔

مطلب: چنانچہ اب تو کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے دشمن علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کا تو خاتمہ ہو گیا ان کو بڑی مسرت ہے کہ جو لوگ کعبہ کے نگہبان تھے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ وہ لوگ جو قافلے میں اونٹوں کے ساتھ نغمے گاتے سفر کرتے تھے' چلے گئے۔ صرف یہی لوگ نہیں بلکہ اپنے ہمراہ قرآن کو بھی بغلوں میں دبائے روانہ ہو گئے۔ مراد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی زوال پذیری پر دوسرے حریف بغلیں بجا رہے ہیں کہ یہ قوم تو قرآن کو بھی بغلوں میں دبا کر لے گئی۔ تو جانتا ہے کہ کفار ہماری تضحیک پر آمادہ ہیں لیکن تجھے شاید اپنی توحید کا کچھ بھی پاس نہیں ہے۔

سولہواں بند معنی: **معمور**: بھرے ہوئے۔ **شعور**: تمیز۔ **مدارات**: تواضع۔

مطلب: یہ کوئی شکایت نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ تو نے ان لوگوں کو مال و دولت سے نوازا ہے اور ان کے خزانے بھر دیئے ہیں جنہیں کسی محفل میں بات کرنے کا شعور بھی نہیں ہے۔ افسوس محض اس بات کا ہے کہ کافروں کو تو اس دنیا میں ہی تو نے محلات اور لونڈیاں عطا کی ہیں جب کہ ہم مسلمانوں کو محض وعدۂ حور پر ہی ٹرخا دیا ہے۔ اور وہ حوریں بھی بہشت میں داخل ہونے پر مشروط ہیں۔ آخر ہم سے کیا خطا ہو گئی کہ پہلے کی طرح ہم تیرے لطف و کرم سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

سترھواں بند **معنی**: نایاب: غائب، مفقود۔ **موج سراب**: فریب نظر۔ **طعن اغیار**: غیروں کے طعنے۔ **ناداری**: ذلت۔

مطلب: آخر مسلمانوں نے کون سا جرم کیا ہے کہ وہ دنیاوی دولت سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب کہ تیرے اختیار میں تو اتنا کچھ ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب ہو سکتا ہے۔ تو اتنی قدرت رکھتا ہے کہ چاہے تو دشت و صحرا میں بھی سمندر کی مانند بلبلے رقصاں ہوں اور صحرا میں سفر کرنے والے مسافر کے سامنے تو چاہے تو سراب کی بجائے اتنا سیلاب آ جائے کہ مسافر کو ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ ہم تو اغیار کے طعنوں سے بھی ہم کنار ہیں اور رسوائی و ناداری سے بھی دوچار ہیں۔ اتنا تو بتا دے کہ تجھ پر مرمٹنے کا صلہ کیا خوار و برباد ہونے میں ہی ملتا ہے۔

اٹھارھواں بند **معنی**: اغیار: جمع غیر کی۔

مطلب: ایک زمانہ تھا جب دنیا پر مسلمانوں کا تسلط تھا جب کہ یوں لگتا ہے کہ اب وہ غیر مسلموں کو پسند کرنے لگی ہے۔ ہمارے لیے تو بس ایک خیالی دنیا ہی رہ گئی ہے ہم تو اس منظر سے ہٹ گئے۔ اب دوسروں نے دنیا پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ اس صورت میں یہ گلہ نہ کرنا کہ دنیا سے توحید مٹ چکی ہے۔ ہم تو صرف اس لئے جی رہے ہیں کہ تیرا نام باقی رہے پر اتنا بتا دے کہ ساقی کے بغیر جام کی حقیقت کیا ہے؟۔

انیسواں بند **معنی**: وعدۂ فردا: کل کا وعدہ۔ **رخ زیبا**: خوبصورت چہرہ۔

مطلب: اے مالک دو سرا! اب تو صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ تو نے جو محفل آراستہ کی تھی اس کا خاتمہ بھی ہو گیا اور تیرے چاہنے والے بھی رخصت ہو گئے۔ تیرے عشاق اس محفل میں شب بھی آہیں بھرتے تھے اور صبح کے وقت نالہ و فریاد کرتے تھے لیکن ان کے خاتمے پر اب یہ سب کچھ بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ ان چاہنے والوں نے تجھے اپنا محبوب بنایا اور اس کا صلہ بھی حاصل کر لیا ان کا دور اس قدر مختصر رہا جیسے کوئی محفل میں آ کے بیٹھا ہی ہو تو اس کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ جو چاہنے والے تیرے جلووں کی تمنا لے کر آئے تھے انہیں تو تو نے وعدۂ فردا پر ٹال دیا۔ اب ان کی واپسی مشکل ہے خواہ انہیں کسی طور پر بھی تلاش کیا جائے۔

بیسواں بند **معنی**: **قیس**: مجنوں کا اصلی نام۔ **نجد**: عرب کا ریگستانی علاقہ۔ **دشت و جبل**: جنگل و پہاڑ۔ **غضب**: غصہ۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ لیلیٰ کا درد بھی وہی ہے اور مجنوں کا پہلو بھی وہی ہے۔ صحرائے نجد میں آج بھی ماضی کی طرح ہرن چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ چاہنے والے کا دل بھی پہلے جیسا ہے اور

حسن کا جادو بھی وہی ہے۔ جب کہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی امت بھی وہی ہے اور اے خدا تو بھی ہی ہے کہ جو تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں سے یہ ناراضگی کیسی ہے اور اپنے چاہنے والوں سے برا سلوک کیوں ہو رہا ہے۔

اکیسواں بند معنی : **بت گری** : بتوں کو پوجنا۔ **اویس قرنی** : ایک بزرگ جو حضرت محمد ﷺ سے بہت محبت کرتے تھے۔

مطلب : بس اتنا بتا دے کہ تیری عبادت چھوڑ دی یا حضور ﷺ کی محبت سے روگردانی کی ہے۔ کیا ہم نے اسلاف کی بت شکنی کی روایت ترک کر کے بت تراشی شروع کر دی۔ کیا ہم نے عشق اور عشق کی آشفتہ سری سے کنارہ کر لی۔ کیا ہم نے حضرت سلمان فارسیؓ اور اویس قرنیؓ کی روایات کو ترک کر دیا۔ اگر ایسا نہیں تو ہم سے برگشتگی کی کچھ تو وجہ ہونی چاہیے۔ جب کہ ہمارے سینوں میں آج بھی تکبیر کی آگ محفوظ ہے اور ہماری زندگی عملی سطح پر حضرت بلال حبشیؓ کی مانند ہے۔

بائیسواں بند معنی : **جادہ پیمائی** : راستہ طے کرنا۔ **قبلہ نما** : کعبہ کی سمت۔ **آئین وفا** : وفا کا دستور۔ **شناسائی** : دوستی۔ **ہرجائی** : بے وفا۔

مطلب : ہرچند کہ ہم تیری چاہت میں پہلا والا انداز نہیں رکھتے نا ہی ہم میں تیری خاطر تسلیم و رضا کی وہ خو ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ یہ بھی درست کہ ہمارے دل قبلہ نما کی طرح مضطرب ہیں اور یہ کہ ہم پہلے جیسے وفادار بھی نہیں۔ نا ہی ہم میں وفا کے آئین کی پابندی کا جذبہ پہلے کی طرح موجود ہے۔ اس کے باوجود خود تیرا طرز عمل یہ ہے کہ کبھی ہم سے کبھی دوسروں پر عنایت و مہربانی کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ بات ہرچند کہ کی نہیں! پھر بھی کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ تو بھی تو ہرجائی ہو گیا ہے۔

تئیسواں بند معنی : **سر فاران** : ایک پہاڑی کا نام۔ **آتش اندوز** : جلنے کا مادہ۔ **شرر آباد** : شعلوں سے آباد۔ **سوختہ ساماں** : اپنا سب کچھ فنا کر دینے والا' عاشق۔

مطلب : تو نے فاران کی چوٹی پر دین محمدی ﷺ کی تکمیل کی۔ تو اتنا قادر ہے کہ ایک اشارے پر ہزارہا لوگ تیرے گرویدہ ہو گئے۔ انسانی دلوں کو تو نے اپنے عشق سے مسخر کر لیا۔ اپنے جلووں سے ساری محفل میں حرارت پیدا کر دی۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ آج ہمارے سینوں میں عشق حقیقی کی چنگاری موجود نہیں جب کہ شاید تجھے یاد ہو کہ ہم نے تو تیری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

چوبیسواں بند معنی : **وادی نجد** : عرب کا ریگستانی علاقہ۔ **شور سلاسل** : زنجیروں کا شور۔ **خوش آں روز** : وہ دن کتنا مبارک ہو گا۔ **بے حجابانہ** : بے تکلف' بے جھجک۔

مطلب : اب تو صورت احوال یہ ہے کہ نجد کے صحرا میں زنجیروں کا وہ شور نہیں رہا نا ہی مجنوں لیلیٰ کے نظارے کا دیوانہ نظر آتا ہے۔ یعنی مسلمانوں میں نہ عشق حقیقی کا جذبہ باقی رہا نا ہی جدوجہد کا حوصلہ۔ نا ہی وہ جراءت کردار رہی اور نہ وہ دل رہا جو عشق حقیقی کی حرارت سے مزین ہو۔ شاید ہمارا گھر اتنا برباد ہو چکا ہے کہ تو اب وہاں رونق افروز ہونا پسند نہیں کرتا۔

وہ دن کس قدر مبارک ہو گا کہ تو ہماری محفل میں پورے جلووں کے ساتھ رونق افروز ہو گا اور ہم تجھے حجاب سے باہر دیکھ سکیں گے۔

پچیسواں بند **معنی**: **بادہ کش**: شرابی۔ **لب جو**: ندی کے کنارے۔ **جام بکف**: ہاتھ میں جام لیے۔ **نعرہ زن**: نعرہ لگانے والا۔ **منتظر ھو**: نعرہ مستانہ۔ **فرمان جگر سوزی**: جگر کو جلانے کا حکم۔

مطلب: جو لوگ اے خدا! تیری تعلیمات کی نفی کرتے ہیں اور تیرے دین کو تباہ و برباد کرنے پر تلے بیٹھے ہوئے ہیں ان کو تو نے عیش و مسرت کے تمام سامان فراہم کیے ہوئے ہیں۔ وہ تو رقص و نغمہ کی محفلیں سجائے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں وہ اس قدر بدمست اور مدہوش ہیں کہ باقی دنیا کن ہنگاموں سے دوچار ہے۔ وہ اس حقیقت سے قطعی بے نیاز ہو کر محو نا و نوش ہیں جب کہ تیرے چاہنے والے مسلمان تو خود کو تیری نعمتوں سے محروم سمجھنے لگے ہیں اور تیری عنایات کے اشاروں کے منتظر ہیں۔ سوائے خدا! اپنے چاہنے والوں میں پھر سے عمل کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دے تاکہ وہ پھر فعال ہو کر اس دنیا میں سرخرو ہو سکیں۔

چھبیسواں بند **معنی**: **قوم آوارہ**: بھٹکی ہوئی قوم۔ **عناں تاب**: گھوڑے کی لگام موڑنا۔

مطلب: ملت اسلامیہ ہرچند کہ آج منتشر اور بھٹکی ہوئی ہے تاہم اب اس نے ایک بار پھر اپنا رخ حجاز کی جانب کر لیا ہے تاکہ تیرے حبیبؐ سے رہنمائی حاصل کر اور پھر سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ بے شک وہ ایک ایسے پرندے کی مانند ہے جو اپنے بال و پر سے محروم ہو چکا ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میں ابھی تک پرواز کرنے کا جذبہ ضرور موجود ہے۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا ایک ایک فرد بے چین و مضطرب ہے اور تیری رضا کا خواہاں ہے۔ اب صرف اس امر کی دیر ہے کہ تو ان کی جانب اپنی توجہ کا رخ پھیر دے۔ اس لیے کہ ہر شخص اب اس کے لیے بے چین ہے۔ تیری توجہ کے ساتھ ہی ہر معاملہ درست ہو جائے گا۔

ستائیسواں بند **معنی**: **امت مرحوم**: زوال پذیر مسلمان۔ **مور بے مایہ**: حقیر چیونٹی۔ **جنس نایاب**: کم یاب چیز۔ **دیر نشینوں**: مندر میں بیٹھنے والا۔

مطلب: اے رب کریم! تو نے اپنی جس امت کو ہمیشہ لطف و عنایات سے نوازا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ اب وہ کتنی مشکلات میں مبتلا ہے۔ لہٰذا اس کی مشکلیں آسان کر دے اور وہ قوم جو اس وقت انتشار و بے بضاعتی سے ہم آہنگ ہے اسے ایک بار پھر وہی شان و شوکت عطا کر جس کی وہ ہمیشہ سے مستحق رہی ہے۔ خدایا! ملت مسلم کے ہر فرد کے دل سے محبت کا جذبہ جس طرح مفقود ہوا ہے انہیں پھر سے اس جذبے سے نواز دے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم جو ہندوستان میں بسنے والے محض نام کے مسلمان ہیں اور عملاً غیر مسلموں کی سی خصوصیات کے حامل بن کر رہ گئے ہیں تو ہمیں اپنے دین کی تعلیمات کو اپنانے کی تلقین عطا فرما۔ اب تو ہمارے دل سے آرزوؤں اور تمناؤں کا لہو بہہ نکلا ہے اور نشتروں بھرے سینے میں نالے بیتاب ہو رہے ہیں۔

اٹھائیسواں بند **معنی**: **غماز چمن**: چغلی کھانے والا۔ **عہد گل**: بہار کا موسم۔ **زمزمہ پرداز چمن**: چمن میں چہچہانے والے پرندے۔

مطلب: حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہماری منتشر حالت کے داخلی راز خود اپنوں کے ہاتھوں غیروں تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سے زیادہ قیامت کیا ہو گی کہ ہم خود ہی اپنی جڑیں کھودنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ ملت مسلمہ میں تعمیر و ترقی کے ساتھ مسرتوں کا ساں بھی ختم ہو کر رہ گیا جو لوگ حقیقی طور پر رہنمائی کیا

کرتے تھے وہ بھی قوم سے بدظن ہو کر دل چھوڑ بیٹھے۔ اب تو صرف میں ہی تنہا رہ گیا ہوں جو ہر نوع کی ملی بے حسی کے دوران بھی خاموشی اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے سینے میں تو نالہ و فریاد کا طوفان بھرا ہے۔

انتیسواں بند **معنی** : **قمریاں**: فاختہ۔ **صنوبر**: درخت کا نام۔ **روشیں**: راستے۔ **پیرہن برگ**: پتوں کا لباس۔

مطلب: یہ ضرور ہے کہ جو لوگ ملت کی بہتری کے خواہاں تھے وہ مایوسی کا شکار ہو کر پیچھے جا بیٹھے۔ ملت انتشار کا شکار ہو گئی ہماری قدیم روایات بھی ختم ہو گئیں۔ یوں سمجھیے کہ اب محض نام کے مسلمان ہی رہ گئے ہیں لیکن میں (اقبال) اس ساری تباہی سے مایوس نہیں۔ خدا کرے کوئی میری بات بھی سننے کا چارہ کرے۔

تیسواں بند **معنی**: جوہر: چمک' دمک (مراد صلاحیتیں)۔

مطلب: اب تو نہ مرنے میں مزا رہا نہ جینے میں کوئی لطف باقی رہا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہے کہ اپنے ہی جگر کا خون پیتا رہتا ہوں۔ اس صورت حال کے باوجود میرے سینے میں بے شمار ولولے تڑپ رہے ہیں اور یہی سینہ ہزارہا جلووں کا مسکن بنا ہوا ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ میری قوم کا کوئی فرد بھی چشم بینا نہیں رکھتا جو اس کیفیت کا اندازہ کر سکے۔ یہ ممکن بھی کیسے ہو کہ کسی میں بھی مصائب کا سامنا کرنے کی قوت نہیں۔

اکتیسواں بند **معنی** : **نوا** : آواز۔ **بانگ درا** : قافلے کی گھنٹی کی آواز۔ **بادۂ دیرینہ**: پرانی شراب۔ لے: سریلی مضامین و مطالب۔

مطلب: اقبال اس آخری بند میں بڑی دلسوزی کے عالم میں کہتے ہیں کہ کاش میری فریاد سے ہی ملت کے لوگ اپنی پستی کا احساس کریں۔ اور میرے یہ نغمے ان کی بیداری کا سبب بن جائیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے روایتی عہد وفا کا بھی پاس کریں اور اپنی دیرینہ تعلیمات کو بروئے کار لانے کے لیے آمادہ ہو سکیں۔
یہ درست ہے کہ میرا تعلق عرب سے نہیں بلکہ ایک طرح سے عجم کے ساتھ ہے اس کے باوجود میرا مرکز نگاہ حجاز ہی تو ہے اسی طرح زبان ہندوستان کی صحیح اس میں نغمگی اور کیف تو مدینے ہی کا ہے۔

جواب شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں' طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے' رفعت پہ نظر رکھتی ہے — خاک سے اٹھتی ہے' گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالہ بے باک مرا
پیر گردوں نے کہا سن کے' کہیں ہے کوئی — بولے سیارے' سر عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا' نہیں' اہل زمیں ہے کوئی — کہکشاں کہتی تھی' پوشیدہ یہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا — عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟ — آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟
غافل آباد سے سکان زمیں کیسے ہیں!
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے — تھا جو مسجود ملائک یہ وہی آدم ہے؟
عالم کیف ہے، دانائے رموز کم ہے — ہاں، مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے!
ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا — اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا — کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں — امت باعث رسوائی پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں — تھا براہیمؑ پدر، اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا — نازش موسم گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا — کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کر لو
ملت احمد مرسلؐ کو مقامی کر لو

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے — ہم سے کب پیار ہے، ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے — تمہیں کہدو یہی آئین وفاداری ہے
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو — نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن' تم ہو　　بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن' تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟　　نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟　　میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آباء وہ تمھارے ہی' مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

کیا کہا؟ بہر مسلماں ہے فقط وعدۂ حور　　شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور　　مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰؑ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی' نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبیؐ' دین بھی' ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی' اللہ بھی' قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارک آئین رسولؐ مختار؟　　مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟　　ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں' روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا' تو غریب　　زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا' تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا' تو غریب　　پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمھارا' تو غریب
امرا نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی　　برق طبعی نہ رہی' شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں' روح بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا' تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود　　ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ' تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو' مرزا بھی ہو' افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو' بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک　　عدل اس کا تھا قوی، لوث مراعات سے پاک
شجر فطرت مسلم تھا حیا سے نمناک　　تھا شجاعت میں وہ اک ہستی فوق الادراک
خود گدازی نم کیفیت صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورت مینایش بود

ہر مسلماں رگ باطل کے لیے نشتر تھا　　اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوت بازو پر تھا　　ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

ہر کوئی مست مے ذوق تن آسانی ہے　　تم مسلماں ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم　　تم خطاکار و خطابیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم　　پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم
تخت فغفور بھی ان کا تھا، سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں، کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار　　تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار　　تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے　　بت ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوق پرواز میں مہجور نشیمن بھی ہوئے　　بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے
ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

قیس زحمت کش تنہائی صحرا نہ رہے　　شہر کی کھائے ہوا، بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے، بستی میں رہے یا نہ رہے　　یہ ضروری ہے، حجاب رخ لیلا نہ رہے
گلہ جور نہ ہو، شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

عہد نو برق ہے، آتش زن ہر خرمن ہے　　ایمن اس سے کوئی صحرا، نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے　　ملت ختم رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

امتیں گلشن ہستی میں ثمر چیدہ بھی اور محروم ثمر بھی ہیں' خزاں دیدہ بھی
سیکڑوں نخل ہیں' کاہیدہ بھی' بالیدہ بھی سیکڑوں بطن چمن میں ابھی پوشیدہ بھی
نخل اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سیکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا غیر یک بانگ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
نخل شمع استی و در شعلہ دود ریشہ تو
عاقبت سوز بود سایہ اندیشہ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصر نو رات ہے' دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورش بلغاری کا غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے' یہ ساماں ہے دل آزاری کا امتحاں ہے ترے ایثار کا' خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثل بو قید ہے غنچے میں' پریشاں ہو جا رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ' تو ذرے سے بیاباں ہو جا نغمہ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول' تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو' خم بھی نہ ہو بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو' تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

ت میں، دامن کہسار میں، میدان میں ہے — بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
ین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے — اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

ردم چشم زمیں، یعنی وہ کالی دنیا — وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
رمی مہر کی پروردہ، ہلالی دنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

قل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری — میرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
سوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری — تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

*

یہ تو ایک واضح حقیقت ہے کہ زیر تشریح نظم اقبال نے اپنی پہلی نظم ''شکوہ'' کے جواب میں کہی۔ ''شکوہ'' میں اقبال نے جس بے تکلفانہ انداز میں رب جلیل سے مکالمہ کیا تھا اس وقت اس نظم کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اس تاثر کو کسی حد تک زائل کرنے کے لیے ''جواب شکوہ'' لکھی گئی۔ ''بانگ درا'' میں شکوہ اور جواب شکوہ کے درمیان چودہ نظمیں اور موجود ہیں لیکن میں نے بوجوہ ترتیب بدل کر مذکورہ دونوں نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔ تاکہ قاری کے لیے تسلسل برقرار رہ سکے۔ ترتیب کے اعتبار سے مذکورہ چودہ نظمیں اس کے بعد شامل کی جائیں گی۔ زیر تشریح نظم میں چھتیس بند شامل ہیں۔

پہلا بند معنی: قدسی الاصل: اپنی اصل کے لحاظ سے فرشتہ۔ رفعت: بلندی۔ گردوں: آسمان۔ فتنہ گر: ہنگامہ برپا کرنے والا۔

مطلب: اس بند کی طرح دوسرے کئی ابتدائی بند میں اقبال نے اپنی نظم ''شکوہ'' کی اثر انگیزی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جو بات انسان کے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے وہ دور رس اثرات کی حامل ہوا کرتی ہے۔ خلوص دل سے کہی ہوئی بات وسائل نہ ہونے کے باوجود وسیع تر سطح پر تشہیر کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے کہ یہ سچائی ہمیشہ رفعت اور بلندی پر نظر رکھتی ہے۔ بے شک یہ بات زمین پر کہی جائے تاہم اگر اس میں وزن ہے اور صداقت ہے تو اس کی رسائی آسمان تک ممکن ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ''شکوہ'' میں میرا عشق اور اس کا اظہار بے شک تند و تیز سہی تاہم سچائی پر مبنی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری فریاد نے آسمان اور اس کے باسیوں تک کو ہلا ڈالا۔

دوسرا بند معنی: عرش بریں: آٹھواں آسمان۔ رضواں: بہشت کا داروغہ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب میری فریاد بلند ہوئی تو اس سے متاثر ہو کر بوڑھے آسمان نے کہا لگتا ہے قریب ہی کوئی شخص موجود ہے۔ سیاروں کا خیال تھا کہ غالباً فریادی عرش پر موجود ہے۔ چاند کا استدلال یہ

تھا کہ یہ تو کوئی زمین پر رہنے والا شخص ہے جب کہ کہکشاں کا خیال تھا کہ یہ شخص کہیں ہمارے اردگرد ہی چھپا ہوا ہے۔ تاہم اگر میری فریاد کو کسی حد تک حقیقت کے روپ میں دیکھا تو وہ داروغہ جنت رضوان تھا جو مجھے جنت سے نکالے ہوئے انسان سے تعبیر کر رہا تھا۔

تیسرا بند معنی : **عرش والوں**: ساتویں آسمان والے۔ **تا سر عرش**: عرش کے کنارے تک۔ **پستی کے مکیں**: زمین کے رہنے والے۔

مطلب: فرشتے پر اس امر پر حیرت زدہ تھے کہ یہ فریاد کی جو صدا ان تک پہنچ رہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ جو لوگ عرش پر مقیم تھے وہ بھی اس راز کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا انسان کی رسائی اب آسمان تک بھی ہو گئی ہے؟ اور کیا خاک کی چٹکی میں وہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اس قدر بلندی تک پرواز کر سکے؟ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہے تو ماننا پڑے گا کہ ساکنان زمین آداب محفل سے آگاہی نہیں رکھتے۔ اتنی پستی پر قیام کرتے ہوئے یہ جسارت شوخی اور گستاخی نہیں تو کیا ہے؟

چوتھا بند معنی : **برہم**: ناراض۔ **مسجود ملائک**: جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا (مراد انسان)۔ **نامحرم**: ناواقف۔

مطلب: یہ فریادی تو اس قدر شوخ ہے کہ رب ذوالجلال سے بھی برہمی کا اظہار کر رہا ہے۔ کیا یہ وہی آدم ہے جس کو کبھی فرشتے سجدہ کیا کرتے تھے؟ یہ درست ہے کہ انسان کو زندگی کے بیشتر مسائل کا علم ہے اور وہ اپنی دانش کے ذریعے ہر شے تک رسائی بھی حاصل کر سکتا ہے تاہم لگتا یوں ہے کہ ان خصوصیات کے باوجود عجز و انکسار کے خواص سے قطعی طور پر آگاہ نہیں ہے۔ اس کو اپنی طاقت گفتار پر تو بے شک فخر و ناز ہے لیکن امر واقع یہ ہے کہ اس میں بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں۔

پانچواں بند معنی : **لبریز**: بھرا ہوا۔ **آسماں گیر**: آسمان کی بلندی پر پہنچنے والا۔

مطلب: فرشتوں کی یہ گفتگو جاری تھی کہ عرش بریں سے ایک بلند آواز پیدا ہوئی۔ یقیناً یہ رب ذوالجلال کی آواز تھی اس آواز نے اقبال سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ بے شک تیری داستان غم و اندوز سے لبریز ہے اور تیری آنکھوں سے جو آنسو نکلے ہیں ان کی سچائی میں بھی کلام نہیں۔ تیری یہ شوخ لہجے والی فریاد آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تو ایسے دل کا مالک ہے جو دیوانگی میں انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تو نے اپنے شکوہ کا جس طرح اظہار کیا ہے اس میں شکایت کو بھی شکر کے قالب میں ڈھال دیا ہے یوں اپنے حسن کلام سے تو نے انسانوں اور خدا کے مابین مکالمہ کرایا ہے۔

چھٹا بند معنی : **مائل بہ کرم**: مہربانی کے لیے راغب۔ **گل**: مٹی۔ **شان کئی**: "کے" ایران کے بادشاہ کا ایک مشہور خاندان۔

مطلب: رب ذوالجلال فرماتے ہیں کہ ہم تو ہمیشہ سے مائل بہ کرم رہے ہیں لیکن جب کوئی سائل ہی نہ ہو تو عنایات و کرم کس پر ہیں۔ اے اقبال! تو نے اپنے "شکوہ" میں جو گلے کیے ہیں وہ خلاف حقیقت ہیں۔ دراصل رہنمائی اسی کی کی جاتی ہے جس میں جوہر قابل اور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ تیری قوم میں تو وہ مادہ ہی برقرار نہیں رہا جو قوموں کی تعمیر کا سبب بنتا ہے۔ اگر کسی میں حاصل کرنے

ں صلاحیت ہو تو ہم اسے بادشاہوں جیسی شان و شوکت عطا کرنے کے لیے تیار ہیں اور کولمبس کی مانند جو
وئی نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تو ہم اسے اس دنیا کی راہ بھی دکھا دیتے ہیں۔ اس بند میں کہا گیا ہے کہ ملت
سلمہ جب خود ہی قوت عمل سے محروم ہو کر اپنی بے عملی پر انحصار کیے بیٹھی ہے تو خدا سے التفات و کرم
ں کمی کا شکوہ کیسا؟

ساتواں بند معنی: بے زور: بے طاقت۔ **بت گر:** بت تراش۔ **آزر:** حضرت براہیمؑ کے والد کا نام۔
ادہ آشام: شراب پینے والے۔

مطلب: یہ بھی سن لے کہ اس دور کے مسلمان صرف بے عمل اور قوت تخلیقی اپج سے محروم ہی نہیں
لکہ ان کے دل بھی کفر و الحاد کے عادی بن چکے ہیں۔ یہی وہ امتی ہیں جو آج اپنے پیغمبرؐ کو رسوا کرنے کا
سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو کبھی بت شکن ہوا کرتے تھے وہ تو جا چکے۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ تو
ملی سطح پر بت تراش واقع ہوئے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ باپ کو ابراہیمؑ سمجھ لو جو بت شکن تھے لیکن
ٹا آزر کی حیثیت رکھتا ہے جو بت تراش تھا۔ یعنی تمہارے اسلاف ابراہیمؑ کی مانند تھے جب کہ تم آزر
کے مماثل ہو۔

اب تو کیفیت یہ ہے کہ پرانی اقدار کو فراموش کر کے نئی قدروں کو اپنا لیا گیا ہے حتیٰ کہ نئے کعبے کے
ساتھ تم نے بھی خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے۔

آٹھواں بند معنی: مایہ رعنائی: حسن کا سرمایہ۔ **نازش:** فخر۔ **ملت احمد مرسلؐ:** مراد مسلمان۔

مطلب: وہ زمانہ فراموش نہیں کیا جا سکتا جب کہ مسلمان میری ذات کو ہی باعث فخر سمجھا کرتے تھے اور
یں ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ اس وقت تو جو مسلمان صفحہ ارض پر موجود تھا میرا ہی سودائی بنا پھرتا تھا
اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جسے تو آج ہرجائی قرار دے رہا ہے وہی تم مسلمانوں کا محبوب ہوا کرتا تھا۔
پھر بھی اگر میری صفات سے بد ظنی کا اظہار کرتے ہو تو جاؤ کسی جامد شخصیت کے ہاتھ پر بیعت کر لو اور
آنحضرتؐ کی نبوت کو محدود کر کے کسی ایک مقام سے وابستہ کر لو۔

نواں بند معنی: گراں: بوجھل۔ **جذب باہم:** باہمی کشش۔ **محفل انجم:** ستاروں کی محفل۔

مطلب: تم لوگ شکایت تو کرتے ہو پر اتنا تو بتاؤ کہ نماز فجر کے لیے بیدار ہونا تمہارے لیے کس قدر
تکلیف دہ امر ہو گیا ہے۔ تمہیں دراصل ہم سے محبت نہیں بلکہ اپنی نیند ہی تمہیں پیاری ہے۔ پھر تم لوگ
اس قدر آزاد طبع ہو چکے ہو کہ تمہیں ماہ رمضان کے روزے بھی ایک مصیبت نظر آتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ
کہ ان حالات کے پیش نظر مجھ سے وفاداری کا یہی انداز رہ گیا ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ قوم مذہب
کی بنیاد پر ترتیب پاتی ہے۔ اگر مذہب نہیں تو وہ قوم ہی نہیں۔ تم لوگوں کی حیثیت بھی بے معنی ہے۔
اس کی مثال ستاروں سے دی جا سکتی ہے۔ کہ یکجا ہو کر وہ ایک جھرمٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

دسواں بند معنی: خرمن: کھلیان۔ **اسلاف کے مدفن:** بزرگوں کی قبریں۔ **نکو نام:** نیک نام۔

مطلب: امر واقع یہ ہے کہ جن کو دنیا میں رہتے ہوئے کوئی ہنر اور فن نہیں آتا وہ تم لوگ ہو۔ جس قوم
کو اپنے گھر کی پروا بھی نہیں ہے کہ وہ کیسا ہے کس حال میں ہے وہ قوم تم جیسے لوگوں سے ہی عبارت
ہے۔ تمہارے نشیمن پر تو بجلیاں بھی بڑی آسانی سے گر سکتی ہیں یعنی تم اس قدر کمزور واقع ہوئے ہو کہ

دشمن کسی وقت کے بغیر تمہیں زیر کر سکتا ہے۔ اور تو اور تم لوگ تو اپنے اسلاف کے مقبروں کو بھی بیچ کھاتے ہو۔ ذرا غور تو کرو کہ جب تم اس عمل میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تو تمہیں بت فروشی میں کیا عار محسوس ہو گا۔

گیارھواں بند معنی: صفحہ دہر: مراد دنیا سے۔ آبا: آباء واجداد۔ منتظر فردا: کل کے انتظار میں۔

مطلب: مجھے کم از کم ان سوالات کا جواب تو دو کہ ان دنیا سے کفر و باطل کا نشان مٹانے والا کون تھا؟ پھر یہ بھی بتاؤ کہ دنیا بھر کے انسانوں کو غلامی سے نجات دلوائی! حرم کعبہ کو اپنے سجدوں سے آباد کس نے کیا؟ آخری بات یہ کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے میرے بھیجے ہوئے صحیفے یعنی قرآن کو اپنے سینوں سے لگا کر رکھا؟ بے شک اس سارے عمل کے ذمہ دار تمہارے اسلاف ہی تھے مگر ان کے مقابلے میں تم تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے مستقبل کے منتظر ہو اس کے سوائے اور کچھ نہیں۔

بارھواں بند معنی: شعور: عقل۔ فاطر ہستی: دنیا کو پیدا کرنے والا (مراد خدا)۔

مطلب: یہ تم نے ہی شکایت کی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو محض وعدۂ حور پر ہی ٹال رکھا ہے مگر سوچو کہ اگر کوئی شخص بے جا شکوہ بھی کرتا ہے تو اس کے لیے بھی تہذیب و شعور درکار ہوتے ہیں۔ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد ہم نے تو ازل سے ہی اپنا وطیرہ عدل و انصاف بنا رکھا ہے چنانچہ اگر کافر بھی مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کر لیں تو عدل و نصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان کو حور و قصور سے نوازا جائے ان پر کسی دوسرے کی اجارہ داری تو نہیں ہے۔ تمہارے طرز عمل کے پیش نظر لگتا تو یوں ہے کہ تم میں دراصل حوروں کو چاہنے کی خواہش موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کوہ طور کا جلوہ تو اپنی جگہ موجود ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لیے موسیٰ موجود نہیں۔

تیرھواں بند معنی: منفعت: نفع۔ حرم پاک: خانہ کعبہ۔ پنپنے: ترقی کرنا۔

مطلب: اے مسلمانو! تمہاری جو قوم ہے اس کا نفع نقصان بھی سب کے لیے یکساں ہے۔ سب کا نبیؐ بھی، دین بھی اور اسلام بھی ایک ہی ہے۔ ان کے حوالے سے کسی فرقے یا قبیلے میں امتیاز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تمہارا تو خانہ کعبہ بھی سب کے لیے ایک ہی ہے۔ پالنے والا اور قرآن بھی ایک ہی ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہوتی جو مسلمان سب کے سب ایک ہی ہوتے۔ جب کہ وہ تو گروہ در گروہ بٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے نفع نقصان کے علاوہ نبیؐ، دین، ایمان، حرم پاک، خدا اور قرآن سب کے لیے ایک ہی ہے۔

اس کے باوجود ملت اسلامیہ میں کہیں تو لوگ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کہیں ذاتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا انہی حالات میں کوئی قوم پنپ سکتی ہے۔

چودھواں بند معنی: تارک: ترک کرنے والا۔ آئین رسول مختارؐ: سنت نبویؐ۔ طرز سلف: بزرگوں کے طور طریقے۔

مطلب: پیغمبر اسلامؐ کے دینی اصولوں کو یہ بتاؤ، ترک کرنے والا کون ہے؟ کون ہے جو ذاتی منفعت کے لیے مصلحت کیشی کا شعار اپنائے ہوئے ہے؟ اور غیر مسلموں کی بدعتوں نے کس کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ اس نے انہیں ایک طرح سے اپنا عقیدہ شمار کر لیا ہے اور کس کا دل ہے جو بزرگوں کے طرز عمل

سے بیزار ہو چکا ہے۔

سچ پوچھو تو تم وہ لوگ ہو جن کے دل تپش سے خالی ہو چکے ہیں اور جن کی روح میں جیالوں کی طرح زندگی گزارنے کا احساس نہیں رہا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تمہیں تو آنحضرتؐ کے پیغام کا بھی احساس نہیں رہا یعنی تم پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کو بھی بھلا بیٹھے ہو۔

پندرھواں بند **معنی**: **صف آرا**: صفیں باندھنا۔ **زحمت**: تکلیف۔ **ملت بیضا**: اسلام۔

مطلب: یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ مساجد کا جائزہ لیں تو اس امر کا پتہ چلے گا کہ وہاں نماز کی ادائیگی کے لیے صرف غریب طبقے کے لوگ ہی وارد ہوتے ہیں اور جو روزہ رکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں وہ بھی غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ہمارا (خدا) کا نام لیتا ہے تو وہ بھی غریب ہی ہوتا ہے۔ اور اگر کسی نے اپنے عمل سے تمہارا اور ملت اسلامیہ کا بھرم قائم رکھا ہوا ہے تو وہ غریب ہی ہے۔

جہاں تک دولت مند لوگوں کا تعلق ہے وہ دولت کے نشے میں ہم سے قطعاً غافل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ دیکھا جائے تو ملت مسلم صرف اور صرف غریب اور نادار لوگوں کے دم سے ہی زندہ ہے۔

سولھواں بند **معنی**: **پختہ خیالی**: سنجیدہ خیالات۔ **برق طبعی**: جوش و خروش۔ **روح بلالی**: حضرت بلالؓ جیسا جذبہ۔ **فلسفہ**: عقلی علم۔ **تلقین غزالی**: غزالی کا اخلاقی فلسفہ۔

مطلب: قوم کو جو لوگ وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں دیکھا جائے تو ان میں پختہ خیالی کا فقدان ہے۔ نہ ان کی طبیعتوں میں بجلی کی سی تڑپ ہے نا ہی گفتگو میں کسی قسم کی تاثیر باقی رہی ہے۔ وہ شعلہ بیانی کا جوہر دیکھا جائے تو نابود ہو چکا ہے۔ کیفیت تو یہ ہے کہ اب اذان محض ایک رسم کی طرح باقی رہ گئی ہے جو پانچ وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس میں حضرت بلالؓ کی سی روح اور جذبے کا عمل دخل نہیں رہا یعنی جب بلال اذان دیا کرتے تھے تو آنحضرتؐ خود ان کے لحن کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح فلسفہ تو باقی رہ گیا لیکن امام غزالی کی طرح اس کی توجیہہ کرنے والے باقی نہیں رہے۔ اب تو مساجد اس امر پر مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی باقی نہیں رہے یعنی وہ لوگ بھی موجود نہیں جو حجازیوں کے سے وصف رکھتے تھے۔

سترھواں بند **معنی**: **نابود**: غائب۔ **نصاریٰ**: عیسائی۔ **ہنود**: ہندو۔

مطلب: ہر طرف اس امر کا شور و غوغا عام ہے کہ اس دنیا سے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بحیثیت قوم اب ناپید ہو چکے ہیں جب کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ کیا کہیں کسی مقام پر مسلمان موجود بھی تھے؟ اس لیے کہ اے اسلام کے نام لیواؤ! دیکھا جائے تو تم وضع قطع میں تو عیسائیوں کے اور رہن سہن کے حوالے سے ہندوؤں کے پیروکار نظر آتے ہو۔ سچ پوچھو تو تم ایسے مسلمان ہو جنہیں دیکھ کر یہودی بھی شرما کر رہ جائیں۔

یہ تسلیم کہ ذات پات کے حساب سے تو تم میں سید بھی موجود ہیں مرزا بھی افغان بھی! لیکن ذرا یہ تاؤ کہ سبھی کچھ ہونے کے باوجود کیا تم مسلمان بھی ہو؟

اٹھارھواں بند **معنی**: **بیباک**: بے خوف۔ **لوث**: آلودگی۔ **نمناک**: تازہ۔ **فوق الادراک**: عقل سے بالاتر۔ **خود گدازی**: اپنے آپ کو پگھلانا۔

مطلب: وہ وقت بھی تھا کہ جب خطاب کے دوران مسلمان مقرر کی تقریر صداقت اور جراءت و

بیباکی کی آئینہ دار ہوا کرتی تھی۔ عدل و انصاف کے دوران ہر قسم کی رعایتوں سے گریز کرتے تھے وہ فطری اعتبار سے اس درخت کی مانند تھی جو صدا نم آلود رہتا ہے۔ شرم و حیا اس کے زیور تھے۔ جہاں تک جراءت و شجاعت کا تعلق ہے اس کی صلاحیتوں کا عقل و شعور تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس بند کے آخری شعر میں فی الواقع آنحضرتؐ کے بعد کا جو دور تھا اس کے اولوالعزم اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ باہم ایثار سے کام لیا کرتے تھے۔ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا کرتے تھے۔ ہمیشہ ضرورتمندوں کے کام آتے اور اپنے عمل کو ذاتی مفادات سے آلودہ نہیں کرتے تھے۔

انیسواں بند معنی: رگ باطل: کافر۔ **ازبر:** زبانی یاد۔

مطلب: اس عہد میں صورت یہ تھی کہ ہر مسلمان کفر و باطل کے سینوں میں نشتر کی مانند تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے کردار میں عمل بنیادی جوہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہیں اگر کسی پر بھروسہ بھی تھا تو اپنے قوت بازو پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عصر موجود کے مسلمانوں کو تو محض موت سے ڈر لگتا ہے جب کہ ماضی کے مسلمان تو محض خوف خدا کے قائل تھے۔

سو یہ بتاؤ کہ اگر بیٹے کو باپ کی علمیت کا ادراک نہ ہو اس صورت میں وہ کیسے باپ کا وارث بن سکتا ہے۔

بیسواں بند معنی: ذوق تن آسانی: آرام و آرائش کا شوق۔ **حیدری فقر:** حضرت علیؓ جیسا فقر۔ **تارک قرآں:** قرآن کو ترک کرنے والے۔

مطلب: تم میں سے تو ہر کوئی سل انگار ہے اور محض عیش و آرم کی زندگی کا خواہاں ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہو کیا مسلمانی کا انداز یہی ہے؟ جس کے تم عادی ہو چکے ہو۔ دیکھا جائے تو نہ تمہاری طبیعت میں حضرت علیؓ کا سا فقر اور درویشی ہے نا ہی حضرت عثمانؓ جیسی امیرانہ شان و شوکت ہے۔ اس صورت میں کیا اس امر کی جوابدہی کر سکو گے کہ اپنے اسلاف کے ساتھ تمہاری کیا روحانی نسبت ہے؟

جہاں تک تمہارے اسلاف کا تعلق تھا تو وہ بحیثیت مسلمان معزز و محترم رہے جب کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات ترک کر کے تم دنیا میں خوار اور رسوا ہو رہے ہو۔ ان اشعار میں اقبال نے ماضی اور آج کے مسلمانوں کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

اکیسواں بند معنی: خطا بیں: غلطیاں پکڑنے والے۔ **اوج ثریا:** انتہائی بلندی۔ **فغفور:** چین کے بادشاہوں کا لقب۔

مطلب: جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم تو آپس میں جنگ و جدل کے قائل ہو جب کہ تمہارے اسلاف ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتے تھے۔ تم خود بھی خطا کرتے ہو اور دوسروں کی خطاؤں کے ضمن میں متجسس رہتے ہو۔ جب کہ تمہارے اسلاف دوسروں کی خطاؤں کو نظرانداز بھی کر دیتے تھے اور بخش بھی دیا کرتے تھے۔ یوں تو دنیا میں سب ہی لوگ اس امر کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ وہ انتہائی بلند مدارج پر فائز ہوں لیکن اس کے لیے کوئی ضروری صلاحیت بھی تو پیدا کرے۔

جہاں تک تمہارے اسلاف کا تعلق تھا انہوں نے اپنی ہمت و جراءت سے کم و بیش ساری دنیا کو تسخیر کر لیا جس کے عوض انہوں نے چین جیسے عظیم ملک کے شہنشاہ کا تخت بھی حاصل کر لیا اور ایران کے تخت پر بھی قبضہ جما لیا جب کہ تم تو ان کے مقابلے میں محض باتیں بنانے کے عادی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم میں اسلاف کی سی حمیت نہیں رہی۔

بائیسواں بند **معنی:** **گلستاں بکنار:** جھولی میں باغ۔ **نقش:** لکھی ہوئی ہے۔

مطلب: تمہارا طرز عمل تو فی الواقع خود کشی کے مترادف ہے جب کہ تمہارے اسلاف بلاشبہ غیرت مند اور خوددار تھے۔ تم لوگ بھائی چارے سے گریز کرتے ہو جب کہ وہ بھائی چارے کو انسانی رشتوں کی بنیادی اساس تصور کیا رکھتے تھے۔ تم تو سرتاپا باتونی اور بڑبولے ہو جب کہ وہ کلیتاً" عمل کے قائل تھے۔ تم تو ایک کلی کے لیے ترستے ہو جب کہ باغات ان کی دسترس میں تھے۔ مراد یہ کہ تم بے عملی کا شکار ہو اور تمہارے اسلاف بلند کردار اور باعمل لوگ تھے۔ اسی سبب وہ ساری دنیا پر مختصر عرصے میں چھا گئے۔

آج تک دنیا بھر کی قوموں کو ان کی داستانیں ازبر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی صداقت کے نقوش صفحہ دہر پر ثبت ہیں۔

تئیسواں بند **معنی:** **بت ہندی:** ہندی تمدن۔ **مہجور نشیمن:** آشیانے سے جدا۔

مطلب: تمہاری حالت تو یہ ہے کہ قلیل عرصے کے لیے قومی افق پر ستاروں کی طرح سے روشن ہو گئے پھر ہندوستان کو اپنا وطن تصور کر کے تم اسی کے ہو رہے اور اپنے مذہبی و قومی تقاضوں کو قطعی فراموش کر دیا۔ دوسرے مقامات پر جانے کے لیے پر تولے تو گھر کو بھی تج دیا۔ تمہارے جوجس سال فرزند تمہاری ہی طرح بے عمل تو تھے ہی دیکھا دیکھی دین سے بد ظن بھی ہو گئے۔

یہ وہی لوگ تھے جنہیں جدید تہذیب نے راہ سے بھٹکا دیا اور یہ پھر مادر پدر آزادی کے جویا بن گئے۔ حد تو یہ ہے کہ کعبہ کو چھوڑ کر انہوں نے بت خانے کو آباد کر لیا۔ مراد یہی ہے کہ انہیں نہ اسلاف کی عظمت اور کردار کا پاس رہا نہ ہی وہ مذہبی اصولوں اور تعلیمات کے ہی قائل رہے۔

چوبیسواں بند **معنی:** **زحمت کش تنہائی:** تنہائی کی تکلیف۔ **بادیہ پیمانہ:** صحرا کو طے کرنے والا۔ **حجاب:** پردہ۔ **شکوۂ بیداد:** ظلم کی شکایت۔

مطلب: عصر موجود کے قیس کی مانند عاشق صادق ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن کسی نوع کی بھی سختی اٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔ شہری زندگی کو اس لیے زیادہ پسند کرتے ہیں کہ یہاں کی زندگی عیش و عشرت سے مزین ہے۔ یہ عشق کے دعویدار صحرانوردی کے قریب نہیں پھٹکتے۔ اس کے برعکس اس نظریے کے قائل ہیں کہ قیس تو دیوانہ تھا وہ خواہ شہر میں بودوباش اختیار کرتا یا صحرا کی ریت پھانکتا اس سے اسے کیا فرق پڑ سکتا تھا البتہ لیلیٰ کو اس عشق میں جو صعوبت اٹھانا پڑیں ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ یہ نوجوان تو ایسی زندگی چاہتے ہیں جس میں مشکلات نہ ہوں جس میں عشق کی طرح حسن بھی آزاد ہو۔

پچیسواں بند **معنی:** **عہد نو:** دور جدید۔ **ایمن:** امن میں، محفوظ۔ **ملت ختم رسلؐ:** مسلمان قوم۔ **شعلہ بہ پیراہن:** جس کے لباس میں آگ لگی ہوئی ہے۔

مطلب: عہد نو تو ایک ایسی بجلی کی مانند ہے جو ہر کھلیان کو پھونکنے کے لیے ہر لمحے آمادہ رہتی ہے۔ اس

بجلی سے کوئی صحرا اور کوئی گلستاں محفوظ نہیں ہے اور سچ پوچھیے تو یہ ایک ایسی آگ کی طرح ہے جس کا ایندھن قدامت پرست اقوام کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کے سبب نبیؐ آخر الزماں کی امت کا پیراہن جل کر خاک ہو رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو قدامت پرست اقوام نئے زمانے کا ساتھ دینے سے عاری ہیں وہ ان کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس ساری صورت حال کے سبب مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ آج بھی ان میں اگر حضرت ابراہیمؑ جیسے پیغمبروں کا عقیدہ پیدا ہو جائے تو پھر ان کے عہد کی طرح آگ گلستان میں ہو سکتی ہے۔

چھبیسواں بند معنی: **کوکب**: ستارہ۔ **خس و خاشاک**: گھاس پھوس۔ **گل بر انداز**: پھول برسانا۔ **عنابی**: سرخ۔ **افق تابی**: افق کو روشن کرنا۔

مطلب: ملت مسلمہ کی جو ابتر صورت حال ہے اس کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک یہ چمن اجڑا ہوا ہے تاہم جلد ہی اس میں بہار آنے والی ہے۔ اب یہ چمن گھاس پھونس اور غیر ضروری اشیا سے پاک ہونے والا ہے۔ شہداء کے لہو کی سرخی اب یہاں پھول بکھیر رہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھ کہ آسمان کا رنگ بڑی تیزی کے ساتھ عنابی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ اندھیری شب کے بعد سویرا نمودار ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طلوع آفتاب کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔

ستائیسواں بند معنی: **ثمر چیدہ**: پھلوں سے لدی ہوئی (یعنی کامیاب)۔ **کاہیدہ**: سوکھے ہوئے۔ **بالیدہ**: سرسبز۔

مطلب: اس کائنات میں بے شمار قومیں ایسی ہیں جو اپنی جدوجہد کے طفیل سرخرو ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی اقوام بھی موجود ہیں جو اب بھی محرومی کا شکار ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ خزاں ان کے چمن کا مقدر ہے۔ زندگی کہ ایک باغ کی مانند ہے اس میں بے شمار درخت ہیں جن میں سے بعض کمزور اور مرجھائے ہوئے ہیں جب کہ کچھ درخت شاداب اور سرسبز نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں سینکڑوں درخت تو ابھی باغ کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں شجر اسلام پھلنے پھولنے کے حوالے سے مثالی حیثیت کا حامل ہے کیوں نہ ہو جب کہ یہ صدیوں کی کاوش کا ثمر ہے۔

اٹھائیسواں بند معنی: **گرد وطن**: وطن کی مٹی۔ **کنعاں**: حضرت یوسفؑ کا وطن۔ **نخل**: درخت۔

مطلب: یہ امر باعث اطمینان ہے کہ تیرا دامن وطنیت کے تصور سے پاک ہے۔ تو تو ایسے یوسفؑ کی مانند ہے جس کے لیے مصر کی سرزمین بھی کنعان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان کا کوئی ملک وطن نہیں ہوتا بلکہ ہر خطہ زمین اس کے لیے وطن کی مانند ہے۔ اسی واسطے تیرا قافلہ کہیں رکے بغیر منزل کی جانب رواں دواں رہے گا۔ اس لیے کہ تو نے تو اپنے آپ کو ہر نوع کے ساز و سامان سے بے نیاز رکھا ہے۔

اے مسلمان! تیری مثال تو ایک ایسی موم بتی کی طرح ہے جس میں دھاگہ ایک رشتے کے مانند شعلے میں دوڑتا ہے۔ تیرے فکر و خیال کا عکس بھی اسی طرح دل انسان میں سوز اور تپش پیدا کرے گا۔

انتیسواں بند معنی: **پیمانے**: جام۔ **یورش تاتار**: تاتاریوں کا فتنہ۔

مطلب: زیر تشریح بند میں وطنیت کے تصور کی اسلامی نقطہ نظر سے وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

بالفرض سلطنت ایران کا خاتمہ ہو جائے تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اسلام اور مسلمان ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کی مثال شراب کا نشہ ہے جس کا عملاً پیالے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ نشہ شراب میں ہوتا ہے نہ کہ پیالے میں۔ یہ حقیقت تاتاریوں کے حملوں سے بھی کھل جاتی ہے کہ ایک زمانے میں انہوں نے بغداد اور کئی دوسرے اسلامی ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ پھر یہی تاتاری مغل اور ترکوں کے روپ میں ایشیا' افریقہ اور یورپ میں اسلام کے علمبردار بن گئے۔ جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے کہ سچائی کو زندہ رکھنے کے لیے تیری ذات ہی بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ اور یہ جو عصر نو ہے یہ تو ایک اندھیری رات کی طرح ہے اس میں تو ہی ہے جو ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔

تیسواں بند معنی: **یورش بلغاری:** بلغاریہ کا فتنہ (13-1912ء میں)۔ **صہیل فرس:** گھوڑے کی ہنہناہٹ۔ **نفس:** سانس۔

مطلب: ترکوں پر بلغاریہ کے عساکر نے جو یلغار کر رکھی ہے وہ تم لوگوں کے لیے جو غفلت کی نیند سو رہے ہو بیداری کا پیغام ہے۔ تیرا خیال ہے کہ ان حملوں کے باعث تیری دل آزاری مقصود ہے؟ نہیں! یہ تو دراصل تیرے ایثار اور خودداری کا امتحان ہے۔

نہ جانے تو دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے خوف زدہ کیوں ہو رہا ہے۔ ذرا بنظر غائر دیکھے تو تجھے خود ہی پتہ چل جائے گا کہ دشمنوں کی پھونکوں سے حق کا چراغ نہیں بجھ سکتا۔

اکتیسواں بند معنی: **کوکب:** ستارہ۔ **خلافت:** ۔ **اتمام:** تمام کرنا' تکمیل کرنا۔

مطلب: تو کیا ہے اور تیری حقیقت کیا ہے؟ یہ سب تو ابھی دوسری اقوام کی نگاہوں سے چھپا ہوا راز ہے۔ ورنہ امرواقعہ تو یہ ہے کہ ابھی اس دنیا کو تیری ضرورت ہے تجھ میں جو عمل کی حرارت موجود ہے وہی تو زمانے کو زندہ اور سرگرم رکھے ہوئے ہے۔ تیری خلافت و حکومت اس دنیا کے مقدر کا ستارہ ہیں کہ تو ختم ہو گیا تو یہ بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اے مسلمان! اٹھ سرگرم عمل ہو کہ فرصت کا وقت نہیں رب ذوالجلال نے تجھے جو ذمے داری سونپی ہے اس کی تکمیل تیرا فرض ہے خدا کی وحدانیت کو عام کرنے کا کام بھی باقی ہے۔

بتیسواں بند معنی: **رخت بردوش:** سامان کندھے پر اٹھائے ہوئے۔ **چمنستاں:** باغ۔ **تنک مایہ:** بے مایہ۔

مطلب: تیری مثال تو اس خوشبو کے مانند ہے جو غنچے میں محبوس ہے تیرے لیے لازم ہے کہ اس قید سے رہا ہو کر گلستان کی ہوا کے کاندھے پر سوار رخت سفر باندھ کر سارے عالم میں پھیل جا۔ اگر تو بے بضاعت اور بے مال و منال ہے تو ایسی صلاحیت پیدا کر کہ ذرے سے بیاباں میں تبدیل ہو جائے۔ اور اگر دریا کی موج کے نغمے کے مماثل ہے تو اس حیثیت کو ترک کر کے طوفان کے ہنگامے کی شکل اختیار کر لے۔

تجھ میں جو عشق حقیقی کی قوت موجود ہے اس کی وساطت سے دنیا کی ہر ادنیٰ شے کو بلند کر دے اور اس تاریک زمانے میں آنحضرتؐ کے نام کی روشنی سے اجالا کر دے۔

تینتیسواں بند معنی: **ترنم:** سُر' لے۔ **خم:** شراب کا مٹکا۔ **استادہ:** کھڑا ہوا۔ **تپش آمادہ:** حرارت

پذیر۔

مطلب: آنحضرتؐ کی ذات صفات کو پھول سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ پھول باغ میں نہ ہو تو بلبل نغمے الاپنا چھوڑ دے۔ دنیا کے باغ میں کلیوں کا تبسم بھی باقی نہ رہے۔ اگر آنحضرتؐ مئے حقیقی نہ پلائیں تو نہ پیانہ ہو نہ صراحی! یہ جو وحدانیت کی محفل سجی ہوئی ہے یہ اور تم مسلمان بھی ناپید ہو جاؤ۔ آسمان اسی نام سے قائم ہے اور انسانی وجود میں جو حرارت ہے اس کا سبب بھی یہی نام ہے۔ مراد یہی ہے کہ آنحضرتؐ کے لیے ہی یہ دنیا پیدا کی گئی۔

چونتیسواں بند معنی: بحر: سمندر۔ رفعت: بلندی۔

مطلب: یہ نام اور شخصیت جو پیغمبر آخر الزماںؐ کی ہے اس کا وجود ہر شے میں ہے۔ خواہ صحرا ہو' پہاڑ ہوں' میدان ہوں' سمندر اور اس کی موجوں کی آغوش میں یا طوفان میں سب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ چین کے شہروں میں' مراکش کے بیابانوں میں اور اہل اسلام کے ایمان میں پوشیدہ ہے۔ دنیا بھر کی قومیں قیامت تک یہ منظر دیکھتی رہیں گی کہ رب ذوالجلال نے حضورؐ کا تذکرہ اور مرتبہ بلند رکھنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس انداز میں پورا کیا جاتا رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے نام کے ساتھ توحید اور رسالت بھی ہمیشہ قائم رہے گی اور یہ وعدہ ضرور پورا ہوتا رہے گا۔

پینتیسواں بند معنی: مردم چشم زمیں: زمین کی آنکھ کی پتلی' (مراد افریقہ کی سیاہ فام قوم)۔ گرمی مہر: سورج کی گرمی۔ تپش اندوز: گرمی حاصل کرنے والی۔

مطلب: اس بند میں براعظم افریقہ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ یہ خطہ ارض جسے "کالی دنیا" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس خطہ ارض پر بے شمار شہداء کی پرورش ہوئی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جسے سورج کی حدت نے پرورش کیا ہے اور جو ملت مسلمہ کے پرچم سے متعلق ہے جس پر چاند ستارہ بنا ہے جسے اہل عشق حضرت بلال حبشیؓ سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دنیا! آنحضورؐ کے نام سے ہی پارے کی مانند متحرک اور پرجوش ہے۔ اسی نام کے طفیل آنکھ کی پتلی کی طرح نور اور روشنی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

چھتیسواں بند معنی: سپر: ڈھال۔ ماسوا: اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لوح و قلم: قسمت کی تختی اور تقدیر کو رقم کرنے والا قلم۔

مطلب: اے ملت مسلمہ کے فرزند! عقل تیرے لیے ڈھال کی حیثیت رکھتی ہے اور عشق تیری تلوار ہے۔ اے میرے درویش! بے شک تیری حکومت و خلافت ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تیری تکبیر معبود حقیقی کے سوا اور سب کے لئے آگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تو پکا اور پختہ عقیدہ مسلمان ہو جائے تو تیری تدبیر ہی تقدیر کا روپ دھار لے گی۔

سوائے عزیز! اگر تو نے میرے پیغمبر محمدؐ سے وفا کی اور ان کی تعلیمات کو اپنا شعار بنایا تو جان لے کہ ہم تیرے ہی ہیں اور یہ دنیا تو الگ رہی لوح و قلم بھی تیرے ہوں گے۔

چاند

اے چاند! حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے طوفِ حریمِ خاکی تیری قدیم خو ہے
یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں عاشق ہے تو کسی کا؟ یہ داغ آرزو ہے؟
میں مضطرب زمیں پر، بیتاب تو فلک پر تجھکو بھی جستجو ہے، مجھکو بھی جستجو ہے
انساں ہے شمع جس کی، محفل وہی ہے تیری
میں جس طرف رواں ہوں، منزل وہی ہے تیری

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے بلبل میں نغمہ زن ہے، خاموش ہے کلی میں
آ میں تجھے دکھاؤں رخسارِ روشن اس کا نہروں کے آئینے میں، شبنم کی آرسی میں
صحرا و دشت و در میں، کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

*

یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ زیرِ تشریح نظم ان پندرہ نظموں میں سے پہلی نظم ہے جو "بانگِ درا" میں "شکوہ اور جوابِ شکوہ" کے درمیان درج کی گئی ہیں۔ موخر الذکر دونوں طویل نظموں کے مابین چونکہ ایک ربط اور تسلسل ہے نیز اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی چونکہ ان میں بڑی حد تک یکسانیت ہے لہٰذا یہاں دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے اور مذکورہ بالا پندرہ نظمیں اب جوابِ شکوہ کے بعد شامل کی جا رہی ہیں جب کہ "چاند" ان میں کی پہلی نظم ہے۔

"جوابِ شکوہ" کی تشریح کرتے ہوئے نظم کے آغاز میں پہلے بھی اس صورت حال کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ بہرحال "چاند" اقبال کی آٹھ اشعار پر مشتمل نظم ہے جس میں علامہ نے اپنے مخصوص انداز میں چاند سے مکالمہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

① سے ④ **معنی:** **فطرت کی آبرو:** کائنات کی عزت۔ **حریم خاکی:** مراد ہے دنیا۔ **قدیم خو:** پرانی عادت۔

مطلب: اے چاند! اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے تیرا حسن اوجِ کمال پر ہے اور یہ حسن عملاً ایسا بلند مرتبہ ہے جس پر فطرت فخر و ناز کر سکتی ہے جب کہ زمین کے گرد چکر کاٹنا تیری پرانی عادت ہے۔ تیرے سینے پر جو داغ نظر آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیرے سینے کا یہ داغ کسی کی چاہت اور آرزو کا مظہر ہے اور یہ بھی کہ میری طرح تو بھی کسی کے عشق میں مبتلا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ میں زمین کا باسی ہونے کے ناطے یہاں مضطرب اور بے چین ہوں اور تو چونکہ آسمان پر رہتا ہے اس لیے تو وہاں پر بے چین اور مضطرب ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ تجھے بھی کسی کی تلاش ہے اور میں بھی کسی کو پا لینے کا آرزومند ہوں۔ لگتا ہے کہ انسان جس محفل کے لیے شمع کی حیثیت رکھتا ہے وہی تیری محفل ہے اور میں جس جانب عازمِ سفر ہوں وہی تیری بھی منزل ہے۔

⑤ سے ⑧ **معنی:** **استادہ سرو:** سرو کی صورت میں کھڑا ہے۔

مطلب: اے چاند! یوں لگتا ہے کہ تو جس کو تاروں کے سکوت میں تلاش کر رہا ہے۔ وہ غالباً یہاں کرۂ ارض پر زندگی کے شور اور ہنگاموں میں چھپی ہوئی ہے اس امر کی توجیہہ کچھ یوں ہے کہ وہ چیز کہیں سرو کے درخت میں ایستادہ ہے اور کہیں یہ سرسبز و شاداب سبزے میں موجود ہے۔

پھر یوں بھی ہے کہ کہیں اس شے کا وجود بلبل میں نغمے کی شکل میں جلوہ گر ہے جب کہ کلی کے بطن میں سکوت بن کر چھپا ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ حسن ہی ہے۔ سو اے چاند! میرے پاس آ کہ میں تجھے اس حسن کے جلووں سے روشناس کراؤں۔ دیکھ تو سہی! یہ جلوہ ندیوں کے شفاف پانی میں بھی موجود ہے اور شبنم کے قطروں میں بھی نمایاں ہے۔

چنانچہ یہی نہیں بلکہ اس حسن کا جلوہ تو صحراؤں اور کہساروں میں بھی پوری طرح سے موجود ہے۔ انسان کے دل میں بھی ہے اور تیرے چہرہ میں بھی یہی جلوہ نظر آتا ہے۔ اس نظم میں بنیادی تصور حسن ہے جسے اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں چاند کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

رات اور شاعر

رات

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں ۔۔۔ خاموش صورتِ گُل، مانندِ بو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو ۔۔۔ مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو
یا تو مری جبیں کا تارا گرا ہوا ہے ۔۔۔ رفعت کو چھوڑ کر جو پستی میں جا بسا ہے
خاموش ہو گیا ہے تارِ ربابِ ہستی ۔۔۔ ہے میرے آئینے میں تصویرِ خوابِ ہستی
دریا کی تہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے ۔۔۔ ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سو گئی ہے
بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے ۔۔۔ یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے
شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے فسوں سے

شاعر

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں ۔۔۔ چھپ کے انسانوں سے مانندِ سحر روتا ہوں
دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں ۔۔۔ عزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں
مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو؟ ۔۔۔ تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو؟
برقِ ایمن مرے سینہ پہ پڑی روتی ہے! ۔۔۔ دیکھنے والی ہے جو آنکھ، کہاں سوتی ہے؟
صفتِ شمعِ لحد مُردہ ہے محفل میری ۔۔۔ آہ! اے رات بڑی دور ہے منزل میری

عہد حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اس کو اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو

ضبط پیغام محبت سے جو گھبراتا ہوں

تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

❀

رات

یہ نظم دو بنیادی کرداروں کے گرد گھومتی ہے جن میں کا ایک کردار تو "رات" ہے اور دوسرا "شاعر"! اس اعتبار سے یہ نظم ہر دو کرداروں کے مابین مکالمے پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں رات دوسرے کردار "شاعر" سے بعض استفسارات کرتی ہے۔ دوسرے حصے میں "شاعر" اس کا جواب دیتا ہے۔ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یہ تخیلی گفتگو نظم کی ہے۔

① سے ③ **معنی**: مانند بو: خوشبو کی طرح۔ جبیں: پیشانی۔

مطلب: ان اشعار میں "رات" یوں "شاعر" سے مکالمہ کرتی ہے۔ کہ اے شاعر! کیا وجہ ہے کہ تو میری چاندنی میں کیوں مضطرب اور پریشان پھر رہا ہے۔ تیری کیفیت تو ایک پھول کے مانند ہے جو خود تو ساکت رہتا ہے لیکن اس کی خوشبو آوارہ و پریشان رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تو آسمان پر جو ستارے موتی کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان کا جوہری یا پرکھنے والا ہے بالفاظ دگر میری روشنی کو نور کا دریا تصور کر لیا جائے تو تیری حیثیت ایک مچھلی کے مانند ہے۔ یا پھر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ میری پیشانی کے جھومر سے جو ایک ستارا گر گیا تھا وہ ستارہ تو ہی ہے جو بلندی کو چھوڑ کر اب پستی میں مقیم ہے۔

④ سے ⑦ اے شاعر! میرے وجود سے زندگی کا ایک ساز ساکت ہو کر رہ گیا ہے اور میں وہ آئینہ ہوں جس میں خوابیدہ دنیا کے تمام مناظر واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان مظاہر کا تو کیا ذکر بھنور تک دریا کی تہہ میں محو خواب ہو کر رہ گیا ہے اور جو بیتاب مضطرب موج تھی وہ بھی شاید ساحل سے ہم آغوش ہو کر سو گئی ہے۔ ہرچند کہ زمین پر جو بستیاں آباد ہیں وہ ہمیشہ ہنگاموں سے پر رہتی ہیں لیکن اس لمحے یوں لگتا ہے جیسے ہر جان سناٹا ہے اور وہاں کوئی جاندار شے موجود نہیں ہے۔ اس ساری صورتحال میں اے شاعر! میں دیکھ رہی ہوں کہ تو سکون آشنا نہیں بلکہ پریشان حال ہے۔ مجھے اس امر پر شدید حیرت ہے کہ تو میرے سحر سے کس طرح آزاد رہ گیا۔

شاعر

① سے ③ **معنی**: دن کی شورش: دن کا شور و غل۔ عزلت شب: رات کی تنہائی۔ تپش شوق: عشق کی جلن۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں شاعر یوں گویا ہوتا ہے کہ اے رات! تیرے استفسارات کے جواب میں

یہی کہہ سکتا ہوں کہ تیری چاندنی میں میرے آنسو ایسے موتی کے مانند ہیں جو یہاں بو رہا ہوں اور صبح کی طرح انسانوں سے چھپ کر تنہائی میں سرگرم فغاں رہتا ہوں۔ میرے آنسو جو دن کے ہنگامے میں آنکھوں سے نکلتے ہوئے شرماتے ہیں وہ تیری تاریکی اور تنہائی میں آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ میرے دل میں جو آہیں اور فریاد پوشیدہ ہے وہ آخر کس کو سناؤں۔ مزید بر آں سینے میں جو عشق کی حرارت موجود ہے اس کا اظہار کس کس کے سامنے کروں جب کہ میری حالت پریشاں توجہ دینے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

④ سے ⑦ **معنی**: برق ایمن: طور کی بجلی۔

مطلب: صورت یہ ہے کہ میرے سینے میں تو وہ بجلی بھی بے عمل ہو کر رہ گئی ہے اور اشک افشانی کر رہی ہے کوہ طور پر جلوہ دکھانے والی بجلی جس کے مماثل ہے۔ نہ جانے وہ آنکھیں اب کہاں ہیں جو کسی بھی منظر کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ میری محفل تو اب اس شمع کے مانند ہے جو اجاڑ ویرانے میں کسی مزار پر روشن ہے۔ اے رات! تجھے اس حقیقت کا یقیناً علم نہیں ہے کہ میری منزل ابھی بہت دور ہے۔ اور جو مسافت ہے وہ کڑی ہے۔ اس کو طے کرنا بے حد و حساب مشکل کام ہے۔

تو کیا جانے کہ میری قوم کے لیے عہد حاضر کا ماحول قطعی ساز گار نہیں ہے پھر اس کا کیا کیا جائے کہ اسے تو خود بھی اپنی اس زبوں حالی کا احساس تک نہیں ہے۔

اے رات! حقیقت یہ ہے کہ جب یہ صورت حال اور اس کا تصور میرے ضبط سے باہر ہو جاتا ہے تو مضطرب ہو کر اپنی داستان غم تیرے اجلے ستاروں کو سنانے آ جاتا ہوں۔

بزم انجم

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو — طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی — چمکے عروس شب کے وہ موتی پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامہ جہاں سے — کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں "تارے"
محو فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرش بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو — تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا، جاگ اٹھیں سونے والے — رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں — شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمھاری
رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے
"حسن ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں — جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

کاروان ہستی ہے تیزگام ایسا — قومیں کچل گئی ہیں جس کی روا روی میں
ںکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم — داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
ت عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے — جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

*

یہ نظم علامہ اقبال کی منظر نگاری اور امیجری کا انتہائی خوبصورت نمونہ ہے۔ انہوں نے ان اشعار ں جو تمثیل بنائی ہیں وہ بھی بڑی حد تک انفرادیت کی حامل ہیں۔ پوری نظم تین بند پر مشتمل ہے جن میں رہ اشعار ہیں جن میں شام کا منظر بیان کیا گیا ہے۔

پہلا بند معنی: سیہ قبا: سیاہ لباس۔ طشت: تھال۔ فلک فروزی: آسمان کو روشن کرنا۔ ملک: فرشتہ۔

مطلب: سورج نے غروب ہوتے ہوئے جب دن کو الوداع کہی تو روانگی سے قبل شام کے سرمئی رنگ ونہ صرف یہ کہ اپنے عکس سے لالے کے پھول کی مانند زردی مائل کر دیا بلکہ آسمان پر شفق یوں نمودار ی جیسے کہ ساری فضا سونے کے زیورات پہنے ہوئے ہے۔ اور دن میں جو چاندی کے زیورات تھے وہ ار دیئے ہیں۔ مراد یہ کہ دن کا سارا منظر تو سورج کی روشنی سے سفیدی مائل تھا جب کہ شام کے لمحات ں اس کا عکس سونے کی مانند زردی مائل ہو گیا۔

اس لمحے بڑی خاموشی کے ساتھ فضا پر اندھیرا پھیل گیا اور اس اندھیرے آسمان پر ستارے اس طرح ے جگمگا رہے تھے جیسے موتی چمک رہے ہوں۔ انسان جن کو ستاروں کے نام سے تعبیر کرتا ہے وہ ہم سے تنی دور یعنی آسمان پر رہتے ہیں۔ اس لمحے آسمان کی ساری محفل اپنی سجاوٹ اور تزئین میں مصروف تھی کہ آسمان سے ایک فرشتے کی آواز بلند ہوئی۔

دوسرا بند معنی:۔

مطلب: فرشتے نے ستاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بے شک تم رات کے محافظ ہو اور تمہاری نکنے والی قوم آسمان پر بود و باش رکھتی ہے۔ ایسا نغمہ اور ساز چھیڑو کہ جس کو سن کر سونے والے بیدار ہو ئیں۔ دراصل راہ چلنے والے قافلوں کے لیے تمہاری روشنی رہنمائی کا کام دیتی ہے۔ یہ قافلے والے ہیں اپنے مقدر کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔ اور اس امر کا امکان بھی ہے کہ زمین پر رہنے والے لوگ بھی ہماری صدائیں سن سکیں۔

فرشتے کی یہ صدا سن کر ستاروں کی فضا سے خاموشی ختم ہو گئی اور آسمان کی وسعت میں یہ آواز اس رے سے لے کر اس سرے تک پھیل گئی۔

تیسرا بند معنی: جذب باہمی: ایک دوسرے کو کھینچنا۔ یعنی نظام شمسی۔

مطلب: ستارے جواب میں یوں گویا ہوئے کہ ہماری خوبصورتی سے حسن ازل کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح جیسے شبنم کے شفاف قطروں میں پھولوں کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے۔ سن لو کہ قوموں کی زندگیوں میں وقت بہت کٹھن اور دشوار ہوتا ہے جب انہیں قدیم روایات کو ترک کر کے نئی روایات اور نئے اصول قبول

کرنا پڑیں۔ زندگی دراصل اس قدر تیز رفتار واقع ہوئی ہے کہ اس کے چل چلاؤ میں بہت سی قومیں کچلی گئی ہیں۔ اگرچہ ہماری نگاہوں سے ہزارہا ستارے ہماری نظر سے اوجھل ہیں اس کے باوجود ان کا تعلق تو ہماری برادری ہی سے ہے۔ بے شک ہماری عمر مختصر تھی لیکن جو نتائج ہم اخذ کر سکے وہ اہل زمین نہیں سمجھے کہ باہمی ربط وضبط اور اتفاق سے سارے نظام قائم ہیں۔ یہی نکتہ تاروں کی زندگی میں پوشیدہ ہے۔

سیر فلک

تھا تخیل جو ہم سفر میرا آسماں پر ہوا گزر میرا
اڑتا جاتا تھا' اور نہ تھا کوئی جاننے والا چرخ پر میرا
تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے راز سربستہ تھا سفر میرا
حلقہ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا
کیا سناؤں تمہیں ارم کیا ہے خاتم آرزوئے دیدہ و گوش
شاخ طوبےٰ پہ نغمہ ریز طیور بے حجابانہ حور جلوہ فروش
ساقیان جمیل جام بدست پینے والوں میں شور نوشا نوش
دور جنت سے آنکھ نے دیکھا ایک تاریک خانہ سرد و خموش
طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر کرۂ زمہریر ہو روپوش
میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی حیرت انگیز تھا جواب سروش
یہ مقام خنک جہنم ہے نار سے نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہی مستعار اس کے جن سے لرزاں ہیں مرد عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

*

معنی: **تخیل**: خیال۔ **راز سربستہ**: چھپا ہوا بھید۔ **ارم**: بہشت۔ **خاتم**: ختم کرنے والا۔ **نوشا نوش**: پینا پلانا۔ **کرۂ زمہریر**: زمین کے اردگرد اس حلقہ سے آگے زیادہ سردی ہوتی ہے۔ **سروش**: فرشتہ۔ **تہی آغوش**: خالی جھولی۔ **مستعار**: مانگے ہوئے۔ **عبرت کوش**: نصیحت حاصل کرنے والا۔

مطلب: یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اقبال نے اس نظم میں قرآن پاک کی سورۃ توبہ کی چونتیسویں آیت کی منظوم تفسیر پیش کی ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوا ہے جن لوگوں نے سونا چاندی جمع کیا اور اس کو اللہ کی راہ میں صرف کرنے سے گریز کیا۔ قیامت کے روز ان کی پیشانی' پشت اور پہلو کو اسی گرم کیے ہوئے سونے چاندی سے داغا جائے گا۔ علامہ اقبال نے اسی حوالے سے اور دوسرے زاویے سے یہی بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دوزخ بجائے خود گرم نہیں ہے بلکہ جب بداعمال

ور گناہگار لوگ وہاں بھیجے جاتے ہیں تو ان کی بداعمالیاں ہی شعلے بن کر انہیں جلاتی ہیں۔ چنانچہ نظم میں اقبال کہتے ہیں۔

میں اپنے تخیل کے ساتھ آسمان کی سیر کر رہا تھا اور اس کی وسعتوں میں اڑتا پھر رہا تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ وہاں مجھے جاننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اس لمحے وہاں چمکتے ہوئے ستارے مجھے حیرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اس لیے کہ میرے سفر کا حال تو ایک راز کی مانند تھا جس کی حقیقت سے کسی کو آگاہی حاصل نہ تھی۔ میں اس سفر میں زمان و مکان اور صبح و شام کے دائرے سے نکل گیا۔ یہی نہیں بلکہ کائنات کے اس پرانے نظام کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گیا۔

اے لوگو! تمہیں کیا بتاؤں کو اس سفر کے دوران میں نے جنت کا نظارہ کیا۔ جنت کیسی ہے؟ اس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کو کانوں کی قوت سماعت اور آنکھوں کی بصارت کی تشنگی دور ہو جاتی ہیں اور جملہ عناصر کی آرزوؤں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جنت میں تمام انسانی خواہشات کی تکمیل کا سامان موجود ہے۔

جنت میں جو مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزرے ان کے مطابق میں نے دیکھا کہ شاخ طوبیٰ پر بیٹھے ہوئے پرندے نغمہ سرا ہیں اور حمد باری تعالیٰ میں مصروف ہیں۔ حوریں کسی حجاب اور پردے کے بغیر اپنے جلوے دکھا رہی ہیں۔ انتہائی خوبصورت ساقی حاضرین کو شراب پلانے میں مصروف ہیں اور پینے والوں میں ہر چہار جانب ہاؤ ہو کا ہنگامہ برپا ہو رہا ہے۔

اسی لمحے میں نے جنت سے دور کچھ فاصلے پر ایک جگہ دیکھی جس میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جگہ بے حد پر سکوت اور سرد واقع ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس مقام کی تاریکی قیس کے مقدر اور لیلیٰ کے گیسوؤں کی طرح تھی۔ یہ مقام اس قدر سرد تھا کہ جس کے مقابل زمین کے گرد انتہائی سرد حلقہ بھی نہ تھا۔

میں نے ایک فرشتے سے اس سرد ترین مقام کے بارے میں استفسار کیا تو اس کا جواب بے حد حیران کن تھا۔ فرشتے نے کہا کہ یہی سرد مقام جہنم ہے جو ہر نوع کی جو ہر طرح کی حرارت اور روشنی سے خالی ہے۔ اس کے وہ شعلے جن سے عبرت نہ حاصل کرنے والے لوگ خوفزدہ ہیں عملاً مانگے کے ہوتے ہیں جن میں عملاً کوئی حدت نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو گنہگار یہاں سزا کے طور پر لائے جاتے ہی وہ اپنے دنیا کی آگ اور شعلے بھی ہمراہ لاتے ہیں۔

نصیحت

...نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا	عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز
...بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل	دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکر حجاز
...جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے	تیرا انداز تملق بھی سراپا اعجاز
...تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے	فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز

در حکام بھی ہے تجھکو مقام محمود ۔۔۔ پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے ۔۔۔ پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز
نظر آ جاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن ۔۔۔ اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں ۔۔۔ چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے ۔۔۔ تیری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی ۔۔۔ تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریک تگ و تاز
غم صیاد نہیں، اور پر و بال بھی ہیں ۔۔۔ پھر سبب کیا ہے نہیں تجھکو دماغ پرواز

"عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز"

*

یہ نظم عملاً سیاسی اور مذہبی رہنماؤں پر طنز کی حیثیت رکھتی ہے کہ علامہ اقبال نے آج کی مانند اپنے عہد میں بھی ان لوگوں کا کردار منافقت اور مصلحت کیشی پر مبنی پایا لیکن براہ راست ان پر طنز کرنے کی بجائے یہاں اقبال نے اپنی ذات کو ہی ہدف بنایا ہے۔ نظم کا آخری شعر حافظ شیرازی کا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اسی شعر کی تضمین ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

معنی: ارباب ریا: ریا کار لوگ۔ **تملق:** خوشامد۔ **موجد:** ایجاد کرنے والا۔ **مقام محمود:** پسندیدہ مقام۔ **طرہ:** ان میں باتوں سے بڑھ کر۔ **تشہیر کا ساز:** شہرت۔

مطلب: میں نے اقبال کو نصیحت کرتے ہوئے ایک روز یہ کہا کہ نہ تو تو روزہ رکھتا ہے۔ نا ہی نماز کا پابند ہے۔ تو بھی لگتا ہے کہ منافقت اور ریاکاری میں بعض دوسرے لوگوں کی طرح انتہائی کامل اور پختہ کار ہے۔ ہرچند کہ لبوں پر تو تیرے مدینے کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش پوشیدہ رہتی ہے۔ کہ لندن یاترا کی جائے۔

اے اقبال! تیرے جھوٹ میں بھی مصلحت کی آمیزش ہوتی ہے یعنی ذاتی فائدے کے لیے تو جھوٹ بولنے سے نہیں چوکتا اور تیری خوشامد کا انداز بھی ایسا ہی جیسے معجزے دکھا رہا ہو۔ اور ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تیری تقریر کا خاتمہ بھی سرکار یعنی حکمران طبقے کی خوشامد اور تعریف و توصیف پر ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تیرے تازہ اور روشن خیالات عاجزی اور انکساری کے نئے نئے طریقوں کی ایجاد میں لگے رہتے ہیں۔

حکام کا دروازہ اے اقبال! تیرے لیے گویا مقام محمود ہے۔ اور تیرے سیاسی داؤ پیچ ایاز کی زلف کے مانند ہی ہوتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح تو بھی دنیاوی جاہ و جلال کے حصول کی خواہش کو دین کی خدمت کرنے کے پردے میں چھپا سکتا ہے۔ کم از کم عید کی نماز کے موقعہ پر تو مسجد میں بھی اس طرح نظر آ جاتا ہے کہ واعظ کی تقریر سے تیرا دل بھی پگھلتا محسوس ہوتا ہے۔ یعنی یوں لگتا ہے جیسے واعظ کی تقریر نے تیرے دل پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔ اور تو اس سے بے حد مرعوب ہوا ہے۔

اور تو اور! یہ جو ملک کے اخبارات ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی تیرے بے حد ممنون احسان ہیں کہ جن پر تیری تشہیر فرض ہے بلکہ یہ اخبار تو جائز و ناجائز طور پر تیری قصیدہ گوئی میں ہر لمحے مصروف رہتے

ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تو شاعر بھی ہے اور تخلیق کار بھی! تو اپنی شاعری کے حوالے سے حافظ شیرازی کے مماثل ہے۔

اے اقبال! ایک لیڈر میں آج جتنے بھی اوصاف ہونے چاہئیں وہ تجھ میں بھی موجود ہیں لہٰذا تیرے لیے لازم ہے کہ تو بھی قومی سیاست کی اس دوڑ میں شریک ہو جا۔ مراد یہ کہ ان خصوصیات کے باوصف تو بھی قومی لیڈر بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ بقول حافظ شیرازی۔

آخر کار سب کو مرنا ہے اور مردہ لوگوں کی وادی میں پہنچنا ہے لہٰذا اس گنبد افلاک کے نیچے کچھ تو ہنگامہ کرنا چاہیے۔

رام

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند

یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

*

رام چندر جی اہل ہنود کی تاریخ میں ایک دیو مالائی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہل ہنود کی مقدس کتاب "رامائن" میں ان کے حالات زندگی درج ہیں۔ وہ صوبجات متحدہ کے ایک راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے جن کو سوتیلی ماں کے کہنے پر چودہ سال کا بن باس ملا۔ بن باس سے واپسی پر وطن پہنچ کر انہوں نے اپنی گدی سنبھالی۔ دسہرے کا تہوار اسی حوالے سے منایا جاتا ہے۔ اقبال نے زیر تشریح نظم اسی سلسلے میں لکھی۔

معنی: **فکر فلک رس:** آسمان پر پہنچنے والا خیال۔ **ملک سرشت:** فرشتہ خصلت۔ **روشن تراز:** زیادہ روشن۔ **فرد:** بے مثال۔

مطلب: ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بعض حق پرست لوگوں نے جنم لیا۔ اسی لیے مغرب کے فلسفی اس خطۂ ارض کی عظمت کے قائل ہیں۔ یہ بھی اہل ہند کے بلند تصورات کا اثر ہے کہ یہاں کا مقام آسمان کی طرح بلند ہے۔ اس مصرعے میں کوہ ہمالیہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ تو صوفیوں اور رشیوں کا ملک ہے۔ جہاں ہزارہا فرشتہ خصلت لوگوں نے جنم لیا اور یہی وہ لوگ ہیں کہ آج بھی جن کے دم سے ہندوستان کا نام روشن ہے۔

دیکھا جائے تو رام چندر جی کے نام اور کردار پر اہل ہند بجا طور پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ اور جو صاحبان بصیرت ہیں اگر ان کو ہندوستان کا امام تصور کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات باعث حیرت نہیں۔ کہ وہ تو

ایسے مس چراغ ہدایت تھے جنھوں نے اسی ملک سے تاریکی کو مٹا دیا اور یہاں علم و دانش کی روشنی پھیلائی۔ یعنی یہاں کی شام رام چندر جی کی ہدایت کے طفیل صبح کی روشنی سے بھی زیادہ تابندہ اور درخشاں ہے۔

دیکھا جائے تو یہ فرزند ہند تلوار کا دھنی بھی تھا اور بہادر بھی تھا۔ یہی نہیں بن باس کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو وہ پاکیزگی اور محبت میں انفرادی حیثیت کا حامل تھا۔

موٹر

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی — موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز — مانند برق تیز، مثالِ ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر — ہے جادۂ حیات میں ہر تیزپا خموش
ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس — نکہت کا کارواں ہے مثالِ صبا خموش
مینا مدام شورشِ قلقل سے پابگل — لیکن مزاجِ جام خرام آشنا خموش
شاعر کے فکر کو پرِ پرواز خامشی
سرمایہ دارِ گرمیِ آواز خامشی

*

معنی: ہنگامہ: شور۔ جادۂ حیات: زندگی کا راستہ۔ **تیزپا:** تیز چلنے والا۔ **مینا:** صراحی۔ **قلقل:** بھری ہوئی صراحی کی آواز۔ سرمایہ دار گرمیِ آواز: آواز کی گرمی کا سرمایہ۔

مطلب: اقبال نے بالعموم اپنی تخلیقات میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کیے ہیں۔ زیر تشریح نظم بھی اسی نوع کی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ نواب ذوالفقار علی خاں جو اقبال کے احباب میں سے تھے انہوں نے ایک ایسی کار خریدی جو شور کم کرتی تھی۔ یہ نظم اسی حوالے سے لکھی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

کل دوران گفتگو جگندر نے کتنے کام کی بات کہی کہ دوسری کاروں کی نسبت ذوالفقار علی خاں کی کار بالعموم خاموش رہتی ہے۔ اس کی چال ایسی ہے جس کا ہنگاموں اور شور شرابے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کار، بجلی کی طرح تیز اور ہوا کے مانند خاموش رہتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جگندر کی زبان سے یہ بات سن کر میں نے کہا کہ یہ معاملہ کار پر ہی موقوف نہیں بلکہ زندگی میں ہر وہ شے خاموش رہتی ہے جو تیز رفتار ہو۔ قافلے کی گھنٹی فریاد کے لہجے میں بے شک بہت شور مچاتی ہے جب کہ خوشبو کا قافلہ تیز رفتار ہوا کی طرح ساکن رہتا ہے۔ صراحی شراب انڈیلے جانے کی پابند ہے اس لیے شور پیدا کرتی ہے جب کہ پیمانہ تیزی سے گردش کرتا ہے اس لیے وہ بھی خاموش رہتا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ شاعر کے تخیل کی اڑان کو بھی خاموشی پر پرواز عطا کرتی ہے اور خاموشی کے سبب ہی شاعر کے کلام میں جوش اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

انسان

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا   محروم عمل نرگس مجبور تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو   فطرت ہی صنوبر کی محروم تمنا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں   انسان کی ہر قوت' سرگرم تقاضا ہے
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم   یہ ذرہ نہیں' شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے' بینا ہے' توانا ہے

*

معنی: چمنستاں: باغ۔ زیبا: اچھا۔ نازیبا: برا۔ ہیئت: شکل' وضع قطع۔

مطلب: اس نظم میں دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے انسان کا مظاہر فطرت سے تقابل کیا کہ ان کے کردار میں کیا فرق ہے۔ حسب معمول انہوں نے اس تقابلی جائزے سے بھی ایک نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مظاہر فطرت کتنے بھی قوی اور خوبصورت ہوں حقیقت یہ ہے کہ انسان یہ اشرف المخلوقات ہے۔ وہ جراءت و حوصلہ کرے تو آن واحد میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

باغوں کے مناظر خوبصوت ہوں کہ بدصورت! یہاں بہار آئی ہو کہ خزاں نے اپنا تسلط جمایا ہوا ہو۔ نرگس کا پھول اپنی بے عملی کے سبب ان مناظر کو دیکھنے اور برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ حسب خواہش ان مناظر کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اسی طرح صنوبر جیسے بلند و بالا اور خوبصورت درخت چونکہ تمناؤں اور خواہشات سے محروم ہے لہٰذا یہ اپنے مقام پر ساکت و صامت کھڑا رہتا ہے۔ وہ حرکت کرنے کے لطف سے محروم ہے۔

دیکھا جائے تو دنیا کی ہر شے اطاعت کرنے اور دوسروں کے تابع رہنے پر مجبور ہے۔ ایک انسان ہی ہے جو ہمہ وقت جدوجہد اور محنت و کاوش میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اگر اسے ذرہ قرار دیا جائے تو ایسا ذرہ ہے جو ہردم وسعت کی ہوس رکھتا ہے۔ دراصل یہ ذرہ نہیں بلکہ ایک صحرا ہے جو سمٹ کر رہ گیا ہو۔ اور اب وسعت اختیار کرنا چاہتا ہو۔

دراصل انسان اتنا قوی' دانش مند اور بصیرت رکھنے والا ہے کہ اگر چاہے تو اس باغ یعنی دنیا کی ہیئت کو تبدیل کر سکتا ہے۔

خطاب بہ جوانان اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟   وہ کیا گردوں تھا' تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں   کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا
تمدن آفریں' خلاق آئین جہاں داری   وہ صحرائے عرب' یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں الفقر فخری کا رہا شان امارت میں ۔۔۔ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے ۔۔۔ کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے ۔۔۔ جہاں گیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں ۔۔۔ مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی ۔۔۔ کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ۔۔۔ ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی ۔۔۔ نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی ۔۔۔ جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

"غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا"

*

① سے ③ **معنی**: تدبر: غور و فکر۔ **تمدن آفریں**: تہذیب پیدا کرنے والا۔ **خلاق آئین جہاں داری**: حکومت کے اصول وضع اور ایجاد کرنے والا۔

مطلب: یہ نظم اقبال نے بطور خاص مسلمان نوجوانوں کے لیے لکھی اور غالباً یہ کسی ایسے اجتماع میں ہی پڑھی گئی جس کا تعلق نوجوانوں سے تھا۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے نوجوان مسلم! کبھی تو نے اتنا بھی سوچا ہے کہ تیرا ماضی کس قدر شاندار تھا وہ ماضی جو ایک آسمان کے مانند تھا جس کا تو ایک ٹوٹا ہوا ستارا ہے۔ تجھے اس قوم نے اپنی آغوش محبت میں پالا ہے جس نے ایران کے مشہور ساسانی تاجدار دارا کے تاج و تخت کو روند ڈالا تھا۔ کیا تجھے علم ہے کہ تو کتنی عظمتوں والی قوم سے تعلق رکھتا ہے؟ اگر تجھے اس کا علم نہیں تو میں بتائے دیتا ہوں یعنی یہ وہ قوم تھی جو صحرائے عرب میں اونٹنی چرانے والوں کے گھواروں میں پلی۔ اس کے باوجود اس قوم نے دنیا بھر کے لوگوں کو تہذیب و تمدن اور رہنے سہنے کا ڈھنگ سکھایا۔ اس کے علاوہ حکمرانی کے قاعدے بھی بتائے۔

④ سے ⑥ **معنی**: **الفقر فخری**: فقر میرا فخر ہے۔ **چہ حاجت روئے زیبا را**: خوبصورت چہرہ کو کیا ضرورت ہے۔ **منعم**: امیر، دولت مند۔

مطلب: اتنی کروفر اور شان و شوکت کے باوجود اس قوم کے لوگوں نے دولت مندی اور حکمرانی کے دور میں بھی درویشی اور فقیری کو اپنا طرۂ امتیاز بنائے رکھا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک دلکش اور خوبصورت چہرے کی زیبائش کے لیے ظاہری ساز و سامان ضروری نہ تھا۔ وہ اللہ کے خاص بندے درویش اور فقیری کے عالم میں بھی اس قدر غیرت مند تھے کہ امراء کو اس امر کی جراءت و ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ ان فقراء کو کچھ خیرات کے نام پر کسی قسم کا عطیہ دے سکیں۔ غرض تجھے میں کیا بتاؤں کہ وہ صحرا میں رہنے والے لوگ فی الواقع دنیا کے فاتح اور حکمرانوں کے علاوہ ساری دنیا کے محافظ اور اس کو سجانے والے تھے۔

⑦ سے ⑧ **معنی**: **ثابت**: ایک جگہ ٹھہرا ہوا۔

مطلب: اگر میں چاہوں تو الفاظ میں ان کا نقشہ کھینچ کر رکھ دوں۔ اور اپنی شاعری کے ذریعے ان کا سراپا

بیان کروں۔ تاہم مشکل تو یہ ہے کہ تو اس عہد کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر تیرا اور تیرے اسلاف کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ باسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے اس لیے کہ تو محض باتیں بناتا اور بے عمل ہے جب کہ وہ صاحب کردار' فعال اور متحرک تھے۔ تو جامد و ساکت اور دوسروں کی نقالی کرنے والوں میں سے ہے جب کہ تیرے اجداد عملاً اجتہاد فکر کے عادی لوگ تھے۔ اور اپنی بات پر ہمیشہ ڈٹے رہنے والے تھے۔

⑨ (12) **معنی**: روز سیاہ پیر کنعاں: حضرت یعقوب علیہ السلام کی سیہ بختی۔ نور دیدہ اش: اس کی آنکھوں کا نور یعنی حضرت یوسف علیہ السلام۔

مطلب: دیکھا جائے تو ہم نے اس ورثے کو گنوا دیا جو اسلاف نے ہمارے لیے چھوڑا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہم انتہائی عروج پانے کے باوجود اب پستی کے آخری مرحلے میں ہیں۔ حکومت اور سلطنت کا تو کوئی غم نہیں کہ وہ ایک عارضی چیز اور آنے جانے والی شے ہے آج ایک کے پاس ہے کل دوسرے کے پاس۔ ہمیشہ سے یہی روایت چلی آ رہی ہے۔ مگر اپنے اجداد کی چھوڑی ہوئی وہ نادر اور بیش بہا کتابیں جو اب اہل یورپ کے قبضے میں ہیں اور ان سے وہ استفادہ کر رہے ہیں وہاں ان کو دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ آخری شعر غنی کاشمیری کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ پیارے تو حضرت یعقوبؑ کو تھے مگر زلیخا کو مل گئے اور حضرت یعقوبؑ ان سے محروم ہو گئے۔

غرۂ شوال

یا

ہلال عید

غرۂ شوال! اے نور نگاہ روزہ دار — آ کہ تھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار
تیری پیشانی پہ تحریر پیام عید ہے — شام تیری کیا ہے صبح عیش کی تمہید ہے
سرگزشت ملت بیضا کا تو آئینہ ہے — اے مہ نو! ہم کو تجھ سے الفت دیرینہ ہے
جس علم کے سائے میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم — دشمنوں کے خون سے رنگین قبا ہوتے تھے ہم
تیری قسمت میں ہم آغوشی اسی رایت کی ہے — حسن روز افزوں سے تیرے آبرو ملت کی ہے
آشنا پرور ہے قوم اپنی وفا آئیں ترا — ہے محبت خیز یہ پیراہن سیمیں ترا

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ' اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ — رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر — اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر — اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ — بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر — اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو — امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو — اور جو بے آبرو تھے، ان کی خودداری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا — اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن — اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا — سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

صورتِ آئینہ سب کچھ، دیکھ اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

*

اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم عنوان سے ہی اپنے موضوع کی نشاندہی کرتی ہے تاہم اس موضوع کو بھی علامہ اقبال نے جس انداز سے اپنے افکار میں ڈھال کر تخلیقی عمل سے گزارا ہے وہ ان کی فکری اپج اور فنی چابکدستی کا ثبوت ہے۔ عید کے چاند کے حوالے سے اردو شاعری میں نظموں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ نظر آئے گا لیکن زیر تشریح نظم اس موضوع پر بلاشبہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے اقبال ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔

اس نظم میں بھی اقبال کی روایتی امیجری اور تمثیلیں پورے اہتمام کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کے جن مناظر نے تمام عمر علامہ کو مضطرب اور بے چین رکھا ان کا اظہار اس نظم میں بھی ہے۔ اس امر کی پروا نہ کرتے ہوئے کہ ہلال عید بالخصوص ماہ رمضان کی آزمائشوں کے بعد خوشی اور مسرت کا پیغام لاتا ہے اقبال نے ان اشعار میں بھی ان حقائق کو سامنے رکھا ہے جو مسلمانوں کے زوال کا سبب بنے اور آج بھی ملت اسلامیہ ان سے دوچار ہے۔ عملاً یہ نظم مسرت افزاء نہیں بلکہ ایک مرثیہ ہے ملاحظہ ہو۔

① سے ② **معنی:** غرۂ شوال: شوال کے مہینے کا چاند۔ تمہید: آغاز۔

مطلب: اس نظم میں علامہ اقبال "ہلال عید" کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اے ہلال عید!" یہ امر واقعہ ہے کہ تو روزہ رکھنے والوں کی آنکھ کا تارا ہے۔ اے چاند! جلد نمودار ہو جا کہ روزہ رکھنے والے مسلمان تیرے لیے سراپا انتظار بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ تیرے طلوع ہوتے ہی اس امر کا یقین ہو جائے گا کہ اب عید آگئی ہے اور تمام مسلمان اس روز سعید پر گلے ملیں گے اور مسرت و خوشی کا اظہار کریں گے اس لیے کہ تو بے شک شام کے وقت طلوع ہوتا ہے پھر بھی آنحضرت کے پیروکاروں کے لیے تیرا وجود مسرت کی صبح کا آغاز ہے۔

③ سے ④ **معنی:** ملت بیضا: اسلامی ملت۔ مہ نو: نیا چاند۔

مطلب: اے ہلال عید دیکھا جائے تو تیری حیثیت ملت مسلمہ کی داستان کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتی

ہے۔ جو ہماری عروج و زوال کی آئینہ دار ہے۔ اے نئے چاند! تیرے ساتھ ہماری محبت انتہائی قدیم ہے۔ تجھے یہ بات تو یاد ہو گی کہ ہم مسلمان غنیم کے خلاف جس پرچم کے تلے تیغ آزما ہوتے تھے اس پر ستارے کے علاوہ تو بھی موجود ہوتا تھا۔ ان معرکوں میں ہمارے قبا کے دامن، بالعموم دشمنوں کے خون سے آلودہ ہوتا تھا۔

⑤سے⑦ **معنی:** رایت: جھنڈا۔

مطلب: اے چاند! تو اسی پرچم سے ہم آغوش ہے جس نے فتح کے ہزاروں جھنڈے گاڑے تھے تجھ میں جو خوبصورتی ہے اس سے ملت کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا ہے۔ جس طرح تو وفا شعار ہے اور اس دستور کو بڑی تندہی سے نبھاتا ہے اسی طرح ہماری قوم بھی اپنے شناساؤں سے ہمیشہ محبت و شفقت سے پیش آتی ہے۔ ویسے بھی تیرے سراپا سے ہی محبت ٹپکتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تو نے جو لبادہ زیب تن کیا ہوا ہے وہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اے چاند! تو آسمان کی بلندی پر جگمگا رہا ہے وہاں سے اس دنیا کا نظارہ بھی کر لے۔ اس بلندی سے ہم مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی بھی دیکھ لے۔

⑧سے⑩ **معنی:** رہرو درماندہ: بچھڑا ہوا مسافر۔

مطلب: اے چاند! ان اقوام کے تیز رفتار قافلوں کا جائزہ بھی لے جو بڑے اہتمام و اعتماد کے ساتھ کامیابی و کامرانی کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ ان کے مقابل ہمارے قومی کارواں کی سست رفتاری بھی دیکھ لے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم منزل کے تصور ہی سے بیزار ہیں۔

کبھی وہ دور بھی تھا جب تیرے طلوع ہونے پر ہم عالم مسرت و شادمانی میں موتی لٹایا کرتے تھے جب کہ آج ہم اپنی ناداری اور تہی دستی کے ہاتھوں اس عمل سے معذور ہیں ہرچند کہ تیری ہیئت بھی ایک خالی پیالے کے مانند ہے۔ یہاں خالی پیالے کی تشبیہ نے مصرعے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ادھر ہم مسلمان تو مختلف فرقوں میں اس طرح سے بٹے ہوئے ہیں کہ اس نفاق و افتراق کے باعث ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ اے چاند! تو تو ان بکھیڑوں سے بے شک آزاد ہے جب کہ ہم باہمی اتحاد و اتفاق سے محروم ہو کر محض باہمی تصادم کی لعنت میں اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

(11سے12) **معنی:** رشتہ تسبیح: تسبیح کا دھاگہ۔ **زناری:** وہ دھاگہ جو ہندو لوگ اپنی گردن اور کمر میں مذہبی نشان کے طور پر باندھتے ہیں۔

مطلب: اے آسمان کی رفعت سے نظارہ کرنے والے! ہمارے ذہنی افلاس اور باہمی نفاق کا یہ عالم ہے کہ مساجد میں واعظان کرام نے تسبیح کے اس رشتے کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ جس سے ملت مسلمہ کا تعلق استوار تھا۔ اس کے مقابلے پر بتکدوں میں پوجا پاٹ کرنے والے برہمن ہیں جو اپنی قوم کو اتحاد و اتفاق اور باہمی محبت و شفقت کا سبق دیتے نہیں تھکتے۔

اس شعر میں اقبال نے ایک جانب تو ملا اور واعظ کے کردار کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف برہمنوں کی قوم پرستی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اقبال نے بے شمار مقامات کی طرح یہاں بھی ملت مسلمہ کے مختلف فرقوں کے مابین نفاق کی ذمے داری اول و آخر ملا اور واعظ پر ڈالی ہے جو چھوٹے چھوٹے سے اختلافات کو ہوا دے کر اپنی ہی قوم کو آپس میں لڑاتے ہیں اور نفرتوں کی خلیج میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

اے چاند! یہ عبرت انگیز منظر بھی دیکھ لے کہ کافروں نے کس طرح مسلمانوں کے اصول اور طور طریقے اپنا لیے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمان خود کس طرح اسلام اور اپنے ہم مذہب مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

(13) **معنی**: آئینہ دواری: آئینہ کی طرح کمزور دیواریں ہیں۔ **تملق**: خوشامد۔

مطلب: مسلمانوں پر جس طرح مصائب کی یلغار ہے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے وہ تو شیشے کی دیوار ثابت ہو رہے ہیں کہ ذرا ٹھیس لگی اور ٹوٹ گئی۔ اے چاند دیکھ! کہ وہ مسلمان جو کبھی صاحب عزت و وقار ہوا کرتے تھے۔ اب اپنے حریفوں کے سامنے خوشامد اور چاپلوسی پر اتر آئے ہیں ان کے بالمقابل وہ لوگ جو کبھی حقیر اور پست ہوا کرتے تھے اب وہی صاحب عزت و وقار ہیں۔

اے چاند! ہم نے جن گونگی اور بے زبان قوموں کو بولنا سکھایا آج وہ ہماری حریف کی حیثیت سے پورے جوش و خروش کے ساتھ گفتگو کرنے لگی ہیں اور ہم ان کے روبرو انگشت بدنداں کھڑے رہتے ہیں۔ مغربی ممالک کے محلات میں آج عیش و عشرت کی محفلیں سجی ہوئی ہیں اور ایران جیسی پر شکوہ مملکت جو حکمت و دانش کا سرچشمہ تھی وہاں اپنی بربادی پر ماتم بپا ہے۔

نظام خلافت جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی وحدت کی علامت ہے اسے خود ہی ترکوں نے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اور یہ سب کچھ غیر مسلموں کی عیاری کے سبب ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کس قدر سادا اور نادان ہیں۔ لیکن اے چاند! تو بھی یہ سب کچھ آئینے کی مانند خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہ۔ اور آج کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ماضی میں کھو جا۔

شمع اور شاعر

(فروری 1912ء)

شاعر

دوش می گفتم بہ شمع منزل ویران خویش　　گیسوئے تو از پر پروانہ دارد شانہ
در جہاں مثل چراغ لالہ صحرا ستم　　نے نصیب محفلے نے قسمت کاشانہ
مدتے مانند تو من ہم نفس می سوختم　　در طواف شعلہ ام بالے نہ زد پروانہ
می طپد صد جلوہ در جان امل فرسود من　　بر نمی خیزد ازیں محفل دل دیوانہ
از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی
کرمک بے مایہ را سوز کلیم آموختی

شمع

مجھ کو جو موج نفس دیتی ہے پیغام اجل　　لب اسی موج نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفان اشک
شبنم افشاں تو' کہ بزم گل میں ہو چرچا ترا

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثل چراغ لالہ صحرا ترا

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

اور ہے تیرا شعار' آئین ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے' اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا' محمل ہے بے لیلا ترا

اے در تابندہ! اے پروردۂ آغوش موج
لذت طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

تھا جنہیں ذوق تماشا' وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوز تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں' تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے' آواز درا ہو یا نہ ہو

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی' اس لذت سے بیگانے رہے

رشتہ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے؟

شوق بے پروا گیا' فکر فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے' نہ فرزانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں' وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گرد شمع پروانے رہے

خیر تو ساقی سہی' لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ میکش رہے باقی' نہ میخانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی' لیلا کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے' آبادیاں بن ہو گئیں

سطوت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہو گئیں

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں' نا امید نور ایمن ہو گئیں

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں دل میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہو گئیں
وسعت گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز بجلیاں آسودۂ دامان خرمن ہو گئیں
دیدۂ خونبار ہو منت کش گلزار کیوں اشک پیہم سے نگاہیں گل بدامن ہو گئیں
شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقد خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی پھر دکاں تیری ہے لبریز صدائے ناؤ نوش
ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایان ہند پھر سلیمی کی نظر دیتی ہے پیغام خروش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو، کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں ہے سحر کا آسماں خورشید کے مینا بدوش
در غم دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز گفتمت روشن حدیثے، گر توانی دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے

رہزن ہمت ہوا ذوق تن آسانی ترا بحر تھا صحرا میں تو، گلشن میں مثل جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا، تو جمعیت بھی تھی چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر، بڑی دولت ہے یہ زندگی کیسی جو دل بیگانہ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ یعنی اپنی مے کو رسوا صورت مینا نہ کر
خیمہ زن ہو وادی سینا میں مانند کلیم شعلۂ تحقیق کو غارت گر کاشانہ کر
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجام ستم صرف تعمیر سحر خاکستر پروانہ کر
تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو عین دریا میں حباب آسانگوں پیمانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر
خاک میں تجھکو مقدر نے ملایا ہے اگر تو عصا افتاد سے پیدا مثال دانہ کر
ہاں! اسی شاخ کہن پر پھر بنا لے آشیاں اہل گلشن کو شہید نغمہ مستانہ کر
اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذ گل یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر
کیوں چمن میں بے صدا مثل رم شبنم ہے تو؟
لب کشا ہو جا سرود بربط عالم ہے تو؟

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے — راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا — ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آ کر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی — قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا — مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا — جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے، پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاید ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت — اے تغافل پیشہ! تجھکو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں — کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے — اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل — موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور — خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

*

شاعرِ مشرق کی یہ طویل نظم گیارہ بند پر مشتمل ہے۔ جن کے چھیاسی اشعار ہیں۔ شمع اور شاعر کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا ہے۔ اس مکالمے میں اقبال نے اپنے افکار کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں کہی ہیں۔ پہلا بند فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعر کا شمع سے مکالمہ ہے۔ باقی کے دس بند میں

شمع از خود شاعر کے استفسارات کا جواب دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

شاعر

پہلا بند معنی: منزل ویران خویش: اپنے ویران گھر کی شمع۔ **دارد شانہ**: کنگھی میا ہے۔ **من ہم نفس می سوختم**: میں اپنے نفس کی آگ میں جل رہا ہوں۔ **می طپد**: تڑپ رہے ہیں۔ **بر نمی خیزد**: نہیں اٹھتا۔ **آتش عالم فروز اندوختی**: دنیا کو روشن کرنے والی آگ۔ **کرمک**: کیڑہ۔

مطلب: کل میں نے اپنے ویران اور اجاڑ گھر میں جلنے والی شمع سے استفسار کیا کہ پروانے جو ہمہ وقت تیرا طواف کرتے رہتے ہیں بجا طور پر تجھ پر فریفتہ ہیں۔ جب کہ میری شخصیت تو اس گل لالہ کی مانند ہے جو جلتا تو رہتا ہے تاہم اس کے گرد طواف کوئی نہیں کرتا۔ جس کے مقدر میں نہ تو کوئی محفل ہے نا ہی کوئی ڈھنگ کا گھر ہے۔ حیرت ہے کہ میرا کوئی شیدائی نہیں ہے جب کہ آرزوؤں اور خواہشوں میں صرف ہونے والی میری جان اس عالم رنگ و بو میں ہزاروں جلوے پیدا کر رہی ہے۔

اے شمع آخر تو نے پوری دنیا کو منور کرنے والی یہ روشنی کہاں سے حاصل کر لی۔ جس کے سبب ایک بے حقیقت پروانے کو حضرت موسیٰؑ جیسا سوز مل گیا۔

شمع

دوسرا بند معنی: موج نفس: ہوا کی موج۔ **سوز**: حرارت۔ **سودا**: خبط۔ **بزم گل**: پھولوں کی محفل۔ **گل بدامن**: دامن میں پھول۔ **فردا**: آنے والا کل۔ **سوز دروں**: اندر کی حرارت۔ **چراغ لالہ صحرا**: صحرا کے لالہ کا چراغ۔ **بے صہبا**: بغیر شراب کے۔ **شعار**: طریقہ۔ **زشت روئی**: بدصورتی۔ **شوریدہ**: دیوانہ۔ **محمل**: لیلیٰ کے بیٹھنے کی جگہ۔ **در تابندہ**: چمک دار موتی۔ **نوا پیرا**: گیت گا رہا ہے۔ **برہم**: اجڑ گیا ہے۔

مطلب: شمع اس مرحلے پر شاعر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ ہرچند تیری اور میری کیفیت ایک جیسی ہے تاہم فرق یہ ہے کہ جو موج نفس تیرے لیے نغمہ پیرائی کا سبب بنتی ہے وہی میرے لیے موت کا پیغام بن جاتی ہے۔ میں تو محض اس لیے جلتی ہوں کہ میری فطرت میں مقدر نے جلنا لکھ دیا ہے جب کہ تو اپنی تخلیقات میں اس لیے سوز پیدا کرتا ہے کہ تیرے اشعار کو سننے والے تیرے دیوانے بن کر رہ جائیں۔ میں تو اس لیے آنسو ٹپکاتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا ایک طوفان برپا رہتا ہے جب کہ تو اس لیے روتا ہے کہ سننے والوں میں تیری ہمدردی پیدا ہو اور وہ تجھ سے محبت کا اظہار کر سکیں۔ میں راتوں کو جل جل کر آنے والی صبح کے لیے لاانتہا قربانیاں دیتی ہے۔ جب کہ تیرا مستقبل تیرے حال سے قطعاً واقف نہیں۔ مراد یہ ہے کہ تو مستقبل کی بہتری کے لیے جدوجہد نہیں کرتا۔ بے شک تو بھی میری مانند جلتا رہتا ہے لیکن تیرے دل میں وہ حقیقی سوز نہیں جو میری فطرت میں مضمر ہے۔ لیکن تیرا شعلہ تو لالہ صحرا کے رنگ روپ کی طرح ہے۔ تو خود کو قوم کی مشکلات سے نبرد آزمائی کا دعویدار کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے لیکن ذرا سوچ کہ تیرے لیے یہ لقب کہاں تک موزوں ہے جب کہ نہ تیرے پاس عمل کی قوت ہے نہ

ایسے وسائل کہ قومی معاملات کو کامیابی سے ہم کنار کر سکے۔ تیری قوم تو بے وسیلہ ہے اور تو بھی بے عمل اور خالی ہاتھ ہے۔

اے شاعر! حقیقت یہ ہے کہ تیرے غلط طرز عمل اور اس کے ساتھ بے عملی نے پوری قوم کو بدنام کر دیا ہے۔ اس لیے بھی کہ تیرا طرز عمل ملت کے اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔ بظاہر تو حرم کعبہ کا پرستار ہے جب کہ عملاً تیری فطرت بتکدے سے ہم آہنگ ہے۔ تیری قوم میں اب قیس جیسے عاشق اور دیوانوں کا پیدا ہونا یوں ممکن نہیں رہا کہ نہ تیرے پاس تو وہ جوہر آبدار بھی موجود نہیں رہا جو کبھی سرمایہ افتخار ہوتا تھا۔ تو بے شک ایک ایسے آبدار موتی کی مانند ہے جو تند و تیز موج کی آغوش میں پلا لیکن اس کا کیا جائے کہ جس دریا میں تو نے پرورش پائی ہے وہ طوفان سے آشنا ہے۔ مراد یہ کہ تو اور تیری قوم بے حسی اور بے عملی کے سبب ناکارہ ہو چکی ہے۔ تیری قوم میں دیکھا جائے تو وہ توانائی نہیں رہی جو انقلابوں کو جنم دیتی تھی۔

اب اس نغمہ ریزی کا کیا فائدہ جب تیرا گلستاں برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ تیرے اشعار تو سچ پوچھیے بے وقت کی راگنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو ملت کی بیداری میں قطعی مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔

تیسرا بند معنی: ذوق تماشا: دیکھنے کا سلیقہ۔ شعلہ آشام: شعلہ پینے والا (یعنی شراب پی)۔ آتش بجام: پیالے میں آگ۔ گلشن کی جمعیت: باغ کا شیرازہ۔ بالائے بام: چھت کے اوپر۔ سوز تمام: تمام حرارت۔ آواز درا: کارواں کی گھنٹی کی آواز۔

مطلب: اے شاعر! ملت مسلمہ کے وہ باشعور افراد جو ساری صورت حال کو سمجھنے کا ادراک رکھتے تھے وہ تو اب اس دار فانی سے بے نیل و مرام رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد تو حالات کی بہتری کی نوید لے کر آیا ہے تو اس کا کیا فائدہ۔ اگلے دو اشعار کا مفہوم بھی قریب قریب وہی ہے جو اس بند کے پہلے شعر کا تھا۔ چنانچہ ان اشعار میں الفاظ، تراکیب اور استعارے بدل کر کہا گیا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جو لوگ انتہائی حقیقت پسند تھے ان کے رخصت ہونے کے بعد اگر تو اپنے اشعار میں مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے تو اس سے کیا حاصل ہو گا۔ اس لیے کہ جب گلستاں ہی اجڑ گیا اور اس کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا تو اس لمحے بہار کی تازہ ہوا کے پیام کی نوید بے معنی سی بات ہے۔

اس لیے کہ وہ منظر تو کب کا نظروں سے غائب ہو چکا جب تیری قوم اپنے عروج کے آخری لمحات میں تھی۔ وہ اضطراب اور تڑپ ناقابل فراموش ہے۔ لہٰذا اس کے بعد کوئی بہتری کے امکانات پیدا بھی ہو جائیں تو ان سے کیا مل سکے گا۔ اس لیے کہ ملت کے دلوں میں جدوجہد اور انقلاب کا جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ تو بجھ کر رہ گیا۔ اس کے بعد اگر کوئی اس شعلے کو ہوا دینے آیا بھی تو یہ ایک بے معنی سا عمل ہو گا۔ کہ جس قوم میں عمل اور احساس ذمہ داری کے جذبے مفقود ہو جائیں وہ تو مردہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اے شاعر! اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ تو کتنے ہی نغمے بکھیر دے ملت کے افراد ان پر کان دھرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ یہ قافلہ بے حس ہو چکا ہے۔

چوتھا بند معنی: رشتہ الفت: محبت کا دھاگہ۔ فکر فلک پیما: آسمان پر سیر کرنے والا فکر۔ فرزانے: عقلمند۔ مینا: صراحی۔ دشت جنوں پرور: دیوانگی دینے والا جنگل۔ احساس زیاں: نقصان کا احساس۔

مطلب: شمع کہتی ہے کہ اے شاعر! اگر ملت کو ایک بزم تصور کر لیا جائے تو تیری حیثیت اس بزم میں

ایک شمع کے مانند ہو گی لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ شمع محفل قرار دیئے جانے کے باوجود بھی جب تجھ میں سوز اور تڑپ مفقود رہی تو ملت کے افراد جن کو پروانوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ان میں سوز اور تڑپ پیدا کس طرح ہو سکتی ہے۔ یعنی جب تجھ میں ہی ملت کی بقا کے لیے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ نہیں ہے تو ملت کے عام افراد سے کیا توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔ جب تو یہ صلاحیت رکھتا تھا کہ ملت کے افراد کو رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر تسبیح کے دانوں کی طرح یکجا اور متحد کر سکتا تھا تو پھر یہ بتا کہ یہ لوگ نفاق اور انتشار کا شکار کس لیے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ساری صورت حال کی ذمے داری تجھ پر اور صرف تجھ پر ہی عائد کی جا سکتی ہے۔ اب تو کیفیت یہ ہے کہ ملت کے افراد سے ماضی کی طرح مشکلات سے نبرد آزما ہونے اور بلندی فکر کی خصوصیات ناپید ہو گئیں اور اب ان پر عمل کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔

اب تو افراد ملت میں نہ مشکلات و شدائد کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہے نا ہی جدوجہد اور قربانی کا جذبہ۔ یعنی اپنے مقاصد کے حصول سے انہیں کوئی رغبت نہیں رہی۔ یہ ایسی کیفیت ہے کہ اگر باقی کے چند افراد میں قربانی اور جدوجہد کی تڑپ موجود بھی ہو تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ اگر تجھے ساقی بھی تصور کر لیا جائے تو شراب کیسے پلائے گا جب کہ نہ پینے والے باقی رہے نہ شرابخانے۔ مراد یہ ہے کہ جب افراد ملت بے عملی اور محرومی کو اپنے سر پر مسلط کر چکے ہوں تو اے شاعر! تو کتنی ہی دل سوزی کے ساتھ ان کے لیے نغمات تخلیق کرے۔ ان سے کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ جو قوم ماضی میں انتہائی عروج پر تھی آج وہ انتہائی سطح تک زوال کی شکار ہے۔ اس صورت حال کا ادراک اگر کسی ایک آدھ فرد کو ہے بھی تو اس سے کیا حاصل؟ آج تو وہ سارا منظر ہی تبدیل ہو چکا ہے جو کسی زمانے میں شان و شوکت اور عزت و وقار کا مظہر رہا تھا۔

افسوس تو اس امر کا ہے کہ ملت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی بلکہ اس سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ افراد کے دل سے اس بربادی اور تباہی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔

پانچواں بند معنی: سطوت: دبدبہ۔ عیش دوام: ہمیشہ کی آسودگی۔ سامان شیون: رونے کا سامان۔ تجلی: نور۔ نور ایمن: وہ روشنی جو حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر دیکھی تھی۔ پابند نشیمن: آشیانوں میں بیٹھ گئیں۔ نظارہ سوز: نظارے کو جلانے والی۔ دیدۂ خونبار: خون برسانے والی آنکھ۔ منت کش: احسان مند۔

مطلب: ان اشعار میں مسلمانوں کے پرشکوہ ماضی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جن جوانمردوں نے اپنے جوش عمل اور کارکردگی سے اجاڑ جنگلوں کو بھی پر رونق بستیوں میں تبدیل کر دیا تھا اب ان کی زوال آمادگی کا یہ عالم ہے کہ ان جوانمردوں کے شہر اور آبادیاں مسمار ہو کر ویران جنگل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ان جوانمردوں کی عبادت اور نمازوں سے حقیقت یہ ہے کہ بت پرستوں کے انبوہ میں وحدانیت کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔ آج ان کی حالت یہ ہے کہ برہمن ان کے آقا بنے ہوئے ہیں اور ان کی نمازوں کا سلسلہ بھی انہیں آقاؤں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں انہی اقوام کو عروج حاصل ہوا جنہوں نے اپنے آئین اور نظام کی پابندی کی ورنہ مادر پدر قسم کی آزادی سے تاسف کے بغیر اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اے شاعر! تجھے یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ جو حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر نظر آیا تھا اور جو خود اپنے دیکھے جانے کا آرزو مند تھا وہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو چکا ہے کہ وہ بصیرت افروز نگاہیں ہی نہ رہیں جو

اس نور کے جلوے کو دیکھنے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ وہ دور بھی کبھی تھا کہ ہزار ہا بلبل اس گلستاں میں محو پرواز رہتی تھیں۔ اب نہ جانے ان کو کیا ہوا کہ اپنے گھونسلوں میں چھپ کر بیٹھ گئیں۔ مراد یہ ہے کہ ملت کی بے عملی نے ان کو بھی مایوسی کا شکار بنا دیا ہے۔ جو بجلیاں آسمان پر چمکتی رہتی ہیں اور جن کے نظارے سے دل میں تڑپ پیدا ہوتی تھی اب وہ خرمن تک محدود ہو کر رہ گئیں یعنی ان میں حدت و حرارت اور تڑپ ختم ہو کر رہ گئیں۔ ایسے میں خون برسانے والی آنکھیں پھولوں کے لیے باغ کا احسان ہی کیوں لیں کہ انہوں نے تو اپنے مسلسل بہنے والے آنسوؤں سے دامن کو ہی گلزار بنا دیا ہے۔

اس ساری کیفیت کے باوجود یہ غم انگیز صورت حال مستقل حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ یہ شام غم تو اب مسرت و شادمانی کی صبح کی خبر دے رہی ہے اور تاریکی شب میں بھی امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔ ملت کے زوال کا دور ختم ہونے کو ہے۔ اور آئندہ بہتر صورت حال کی توقع کی جانی چاہیے۔

چھٹا بند معنی: **پیمانہ بردار:** ساقی۔ **خمستان حجاز:** حجاز کا شراب خانہ۔ **نقد خودداری:** خودداری کی دولت۔ **صدائے ناؤنوش:** شراب نوشی کے وقت کا شور و غوغا۔ **ماہ سیمایان ہند:** ہندوستان کی چاند جیسی پیشانی والے۔ **سلیمی:** عرب کے ایک شاعر کی محبوبہ۔ **جزو یست از پیغمبری:** پیغمبری کا حصہ ہے۔ **پیغام سروش:** فرشتہ کا پیغام۔ **سوز جوہر گفتار:** کلام کی گرمی۔

مطلب: اے شہر حجاز کی شان میں نغمہ سرائی کرنے والے شاعر! تجھے خوش خبری ہو کہ ایک عرصے کے بعد تیرے چاہنے والے پھر سے ہوش میں آنے لگے ہیں۔ یعنی ملت اسلامیہ گہری نیند سے ایک بار پھر بیدار ہونے لگی ہے۔ کافی عرصے سے اس قوم نے اپنی غیرت و خودداری کو غیروں کے ہاتھ بیچ رکھا۔ مراد یہ ہے کہ ملت کے افراد اپنے عقیدے اور اصولوں کو خیرباد کہہ کر فرنگیوں اور عجمیوں کے عقائد کے ہم نوا ہو گئے تھے تاہم مقام شکر ہے کہ اب وہ پھر سے اپنے عقائد کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ اب ہندوستان کی چاند جیسی پیشانی رکھنے والی محبوباؤں کا جادو ٹوٹ رہا ہے اور پھر سلیمی کا حسن جہاں سوز مسلمانوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں پر ہندو تہذیب و ثقافت کے جو اثرات تھے ان کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور وہ خود اپنی تہذیب و ثقافت میں از سر نو کشش محسوس کرنے لگے ہیں۔

ایک بار پھر سے شور بلند ہونے لگا ہے کہ غیروں کی تہذیب و ثقافت سے نجات حاصل کر کے اپنی ہی تہذیب و ثقافت کی جانب لوٹ آؤ۔ شمع ایک بار پھر شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ خاموش رہنے کا وقت نہیں۔ تیرے نغمات قوم کی بیداری کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہ وقت سحر ہے اور سورج طلوع ہو رہا ہے جو ملت کے لیے خوش آئندگی کی علامت ہے۔ یہ بڑی اہم بات کی جانب اشارہ ہے کہ دوسروں کے دکھ درد میں جلو اور دوسروں کو بھی سوز عشق میں مبتلا کرو یعنی متحد و متفق ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھو۔ ایک بڑے دانشور یہ نکتہ بیان کر گئے ہیں کہ اچھی شاعری عملاً پیغمبری کا جزو ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اچھی شاعری مسلمانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اے شاعر! ملت کو اپنی شاعری کے ذریعے بیدار کر دے اور مردہ دلوں کو اضطراب اور تڑپ سے نواز دے۔

ساتواں بند معنی: **جمعیت:** اتحاد۔

مطلب: اے شاعر! تو جو ملت کا نمائندہ ہے افسوس ہے کہ مشکلات کا سامنا نہ کرنے اور بے عملی کی عادت نے تیری ہمت اور حوصلے کو پست کر کے رکھ دیا۔ وہ وقت بھی تھا جب تو صحرا میں سمندر کی مانند تھا

لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ گلستان میں پہنچ کر ندی کا روپ دھار لیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مشکلات سے بچنے اور عملی جدوجہد سے گریز کرنے کی عادت اس لیے پڑی کہ صحرائے عرب اور افریقہ کے صحراؤں میں جس جی داری کے ساتھ تیرے عساکر دشمن کے مقابلے پر سینہ سپر ہو گئے لیکن جب بہت سے علاقے فتح کر کے تجھے آرام و سکون اور عیش و عشرت میسر آئے تو بے عملی کا اس قدر عادی ہوا کہ تیری شخصیت سمٹ کر رہ گئی۔ تو جب تک اپنے حقیقی اصولوں اور قواعد پر قائم تھا تو ملت بھی متحد و متفق تھی لیکن ان اصولوں اور قواعد کو فراموش کر کے تیری قوم بھی منتشر ہو کر رہ گئی۔

پانی کا ایک معمولی سا قطرہ دیکھا جائے تو ہمیں زندگی کے رازوں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ قطرہ کبھی منجمد ہو کر موتی بن جاتا ہے۔ کبھی آسمان کی بلندیوں سے شبنم کی صورت واپس زمین پر آتا ہے اور کبھی آنسو جیسی نایاب چیز بن کر آسمان سے ٹپکتا ہے۔ دل ایک بڑی دولت ہے۔ یہاں مراد حوصلے سے ہے کہ حوصلہ ہی باقی نہ رہے تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا میں تیری عزت و آبرو اس وقت تک ہی تھی جب تک کہ تیری ملت متحد و متفق تھی اور انتشار سے دوچار نہ ہوئی تھی۔ اور جب اتحاد نہ رہا تو تیری عزت بھی خاک میں مل کر رہ گئی۔

بغور سن لے! کہ فرد کا وجود اسی وقت تک قائم ہے کہ وہ ملت سے مربوط ہو۔ اسی طرح جیسے موج دریا میں تو اہم ہے دریا کے باہر بے معنی ہے۔

آٹھواں بند **معنی** : **وادی سینا** : وادی طور۔ **شعلہ تحقیق** : علم کی آگ۔ **حباب** : بلبلے کی مانند۔ آسانگوں: التجا۔ **تلمیذ**: شاگرد۔

مطلب: اس بند کی تشریح سے قبل یہاں یہ واضح کرنا غیر ضروری نہ ہو گا کہ بعض شارحین نے چھٹے بند کے بعد کی تمام نظم کو شاعر سے مخاطبت کی بجائے اقبال کے توسط سے ملت مسلمہ سے مخاطبت قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ گذشتہ بند میں کہا گیا ہے کہ شمع نے شاعر کو ملت کا نمائندہ قرار دیا ہے اور اسی حوالے سے اس نے ملت کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن اس گفتگو کا تعلق شاعر یعنی اقبال سے ہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اے شاعر! تیری بہتری اسی میں ہے کہ اپنے عشق حقیقی کو دل کے پردے میں ہی چھپا کر رکھ۔ اس کو قطعاً ظاہر نہ کر۔ ورنہ ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔ اس کی مثال شراب کی صراحی ہے جو شراب کے اخراج میں قلقل کی صدا سے خود شراب کے وجود کی خبر دے دیتی ہے۔ چنانچہ تو اس طرح کی روش اختیار نہ کر۔ اے شاعر! تو اور تیری ملت جو ایک عرصے سے اپنے وجود کی جانب سے بے نیاز ہو چکے ہو۔ کمر ہمت باندھ لو۔ حضرت موسیٰ کی طرح کوہ طور کی وادی میں ڈیرے ڈال دے اور تحقیق کے شعلے کو بلند کر اور اپنے لیے صرف کر۔ مراد یہ کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی تہذیبی، ملی اور معاشرتی اقدار کو فروغ دے۔ بے شک میری مانند شمع رات بھر جلتی رہتی ہے اور اس کے شعلے کے سبب لاتعداد پروانے جل کر خاک ہو جاتے ہیں تاہم شمع سے اس ظلم و ستم کے انتقام لینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جو پروانے جل چکے ان کی خاک سے نئی صبح وجود میں لائی جائے۔ ظاہر ہے کہ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی شمع کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کا وجود غیر ضروری ہو جاتا ہے اور اس کو بجھا دیا جاتا ہے۔

اے شاعر! اگر تجھ میں خودداری اور غیرمندی ہے تو کسی کا احسان نہ لے اور ایسے زندگی گزار جیسے

حباب یعنی بلبلہ پانی میں سرنگوں رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ حباب پانی کی سطح پر موجود رہنے کے باوجود خود کو الٹے پیالے کی طرح رکھتا ہے اور دریا سے کسی قسم کی خیرات نہیں لیتا۔ یہ جو قدیم کوہ و صحرا ہیں ان میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی اب تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی تگ و دو کے لیے نیا میدان تلاش کر۔ اس لیے کہ اب تیرا عزم اور جنون بھی نئے ہیں۔

اگر تجھے حالات نے انتہائی پستی سے ہم کنار کر دیا ہے تو اس کی پروا نہ کر۔ تو بھی حوصلہ کر اور عملی جدوجہد اسی طرح جاری رکھ۔ اس جدوجہد کا نتیجہ اس کسان کی کوشش کے مطابق برآمد ہو سکتا ہے جو زمین میں ہل چلا کر وہاں بیج ڈال دیتا ہے۔ یہ بیج بظاہر مٹی میں مل جاتا ہے لیکن پھر مٹی سے برآمد ہو کر تنے کی شکل میں قائم و استوار ہو جاتا ہے۔ مراد یہ کہ جدوجہد اور محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔

اے شاعر! پھر سے اپنے شاندار اور اصول پرست ماضی کی طرف لوٹ آ۔ کہ اسی حوالے سے تو جو نغمے وضع کرے گا وہی ملت اسلامیہ کے لیے مسرت و شادمانی کا سبب بن جائیں گے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے دو ہی طریقے اور اصول ہیں کہ یا تو مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے یا پھر خاموشی اختیار کر لی جائے۔

سوائے شاعر! تو اس دنیا میں شبنم کی طرح خاموش کیوں ہے تیرے لیے لازم ہے کہ اپنے لب کھول کہ تو کائنات کے ساز کا ایک نغمہ ہے۔

ۤواں بند معنی: باراں: بارش۔ **خاشاک:** گھاس پھوس۔

مطلب: شمع کہتی ہے کہ اے شاعر! تیرا وجود تو اس کسان کے مانند ہے جو عملی سطح پر بیج بھی، کھیتی بھی، بارش بھی۔ اور اس سے حاصل ہونے والی فصل کی طرح ہے۔ نہ جانے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر تو کس چیز کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ جب کہ تو کسی کا محتاج نہیں ہے۔ راستے سے لے کر منزل تک سب تیرے وجود کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح طوفان کے خوف سے تیرا دل نہ جانے کیوں لرزتا ہے جب کہ یہاں بھی ملاح بھی تو خود ہی ہے۔ سمندر بھی، کشتی بھی اور سمندر کا ساحل بھی بالآخر تو ہی ٹھہرتا ہے۔ تیرے وجود کے بغیر یہ عناصر بے معنی ہیں۔

اے شاعر! کبھی عشاق کے اجتماع میں بھی پہنچ کر دیکھ۔ وہاں بھی تجھے پتہ چلے گا کہ قیس اور لیلیٰ بھی تو ہے وہ صحرا جہاں قیس سرگرداں پھرتا تھا وہ بھی سمٹ کر تیرے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔ اسی طرح وہ کجاوہ جس میں لیلیٰ سوار ہوتی تھی وہ بھی تو ہی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تو نے اپنی سادگی کے سبب ساقی کو ہی سب کچھ تصور کر لیا حالانکہ حقیقت مختلف ہے۔ شراب، بوتل، پیمانہ، ساقی اور جس محفل میں دور جام چل رہا ہے وہ سب تو ہی تو ہے۔ تجھ پر لازم ہے کہ مخالفین خدا کو شعلہ بن کر خاکستر کر دے۔ تجھے باطل کا خوف نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ باطل کو برباد کرنے والا بھی تو ہی ہے۔

نہ جانے تو اس قدر بے خبر کیوں ہے جب کہ تو ہی ہے جو زمانے کے آئینے کے جوہر کے علاوہ مسلمان کی حیثیت سے خدا کا آخری پیغام بھی ہے۔

ۤواں بند معنی: شوکت طوفان: طوفان کی شان۔ **ہفت کشور:** سات ولائتیں۔ **تسخیر:** فتح۔ **کوہ فاراں:** مکہ معظمہ کے قریب کے پہاڑ۔ **پردۂ تقریر میں:** گفتگو کے پردے میں۔ **کسوت مینا:** صراحی کا لباس۔ **جلوۂ تقدیر:** تقدیر کا نظارہ۔

مطلب: اے شاعر بے بدل! تجھ پر لازم ہے کہ اپنی اصل حقیقت سے شناسائی حاصل کر لے تو تو اس قدر غفلت شعار ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ معمولی سا قطرہ ہونے کے باوجود اپنی وسعت میں بحر بیکراں کی مانند ہے۔ نہ جانے تو اپنی کم مائیگی کے احساس میں کیوں مبتلا ہے۔ جب کہ تیرے وجود میں نہ جانے کتنے طوفانوں کا جوہر و جلال پوشیدہ ہے۔ تیرا سینہ تو اس معبود حقیقی کے راز کا دفینہ ہے جو اس کائنات میں ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی۔ یعنی یہاں جو مظاہر فطرت ہیں وہ چشم بینا کے لیے خالق حقیقی کے وجود کا پتہ دیتے ہیں جب کہ عملاً اس کی ذات پوشیدہ ہے۔

اے شاعر! تو اس ملت کا فرزند ہے جس نے اپنی قوت ایمان سے بے سروسامانی کے عالم میں بھی ہزاروں فتوحات حاصل کیں اور عظیم الشان سلطنتوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ تو نے آنحضرتؐ سے کیا ہوا وعدہ فراموش کر دیا۔ اس وعدے کی شہادت کوہ فاراں کی خاموشی آج بھی فراہم کر رہی ہے۔ تو نے تو انتہائی نادانی اور سادگی کا ثبوت دیا ہے کہ محض چھوٹی چھوٹی عنایات پر ہی قناعت کر کے انہیں سب کچھ سمجھ لیا حالانکہ ذرا صبر کرتا تو تیرے اور ملت کے مسائل باسانی حل ہو سکتے تھے۔

دل میں جو کیفیات پوشیدہ ہوتی ہیں وہ تو اشعار میں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہ تو اہل ذوق پر منحصر ہے کہ وہ ان اشعار تک کس حد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان کے مفاہیم کا کس حد تک ادراک کرتے ہیں۔ اس شعر میں اقبال خود اپنی ذات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ میں ایک آتش نوا شاعر ہوں ور اسی آتش نوائی نے مجھے جلا کر خاک کر دیا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری زندگی کا ماحصل اور مقصد ہی آتش نوائی ہے۔ چنانچہ اس آتش نوائی کا جو راز ہے وہ میرے سینے میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس آگ نے میرے دل کو ایک ایسے آئینے میں تبدیل کر دیا ہے جس میں مستقبل میں پیش آنے والے مناظر کو باسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

گیارھواں بند **معنی:** آئینہ پوش: منور ہو گا۔ سیماب پا ہو جائے گی: بھاگ جائے گی۔ نکہت خوبیدہ: سوئی ہوئی خوشبو۔ سینہ چاکان: چمن کے سینہ چاک (یعنی مسلمان)۔ طیور: طائر کی جمع (پرندے)۔ شب گریزاں ہو گی: رات بھاگ جائے گی۔

مطلب: زیر تشریح نظم کے ان آخری اشعار میں اقبال بالآخر امید اور رجائیت کے منظرنامے میں مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ جن مصائب سے دوچار رہ چکی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ یہ مصائب ختم ہو کر رہ جائیں گے اس لیے کہ ظلمت شب کا خاتمہ ہو رہا ہے اور نور سحر نے زمین کیا آسمان کا احاطہ بھی کر لیا ہے۔ اب وہ دور آنے والا ہے کہ بہار کی ٹھنڈی ہوا وہ نغمے پیدا کرے گی کلیوں اور غنچوں میں سوئی ہوئی خوشبو بھی نغموں کی صورت میں بیدار ہو گی یعنی ملت اسلامیہ کے تغافل شعار اور خوابیدہ افراد بیدار ہو کر سرگرم عمل ہو جائیں گے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت ایک بار پھر حاصل کر لیں گے۔

ملت کے مختلف فرقوں کے مابین نفاق و انتشار کی جو فضا موجود ہے وہ ختم ہو کر رہ جائے گی اور یہ لوگ ہر نوع کا بغض و کینہ فراموش کر کے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جائیں گے۔ میری شاعری ان لوگوں میں زندہ رہنے کا احساس پیدا کرے گی اور تمام مسلمان اس کیفیت سے آگاہ ہو جائیں گے جو میرے

اور اشعار میں موجود ہے۔ مغربی تہذیب کے طوفان نے جس طرح ہمیں پستی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا ہے اب یہ طوفان بالآخر خود ہی مغربی تہذیب کو لے ڈوبے گا۔

اس لیے کہ وہ وقت آگیا ہے جب ملت اسلامیہ اپنے زندہ عقائد کی طرف لوٹ آئے گی اور اس کی پیشانیاں خانہ کعبہ کی جانب جھک جائیں گی۔ مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان حضورؐ سرور کائنات کی تعلیمات پر پھر سے عمل کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکیں گے۔ اسلام دشمن طاقتیں اب خود اپنے ظلم و ستم کی بنا پر کف افسوس ملیں گی اور نالہ و فریاں پر مجبور ہو جائیں گی اور یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے یقیناً خوش آئند ہو گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں اتنے بڑے انقلاب کا منظر نامہ دیکھ رہا ہوں جس پر مجھے خود بھی حیرت ہے اور اس امر کا اظہار فی الحال میرے لیے ممکن نہیں کہ اس انقلاب کے سبب دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکے گا۔

بس یہ توقع ہے کہ طلوع مہر کے ساتھ ظلمت شب رخصت ہو جائے گی اور ہر طرف نغمہ توحید سنائی دے گا۔ یعنی ملت اسلامیہ کو ایک بار پھر سے عروج حاصل ہو گا۔

مسلم

(جون 1912ء)

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینہ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
نغمہ امید تیری بربط دل میں نہیں
ہم سمجھتے ہیں یہ لیلا تیرے محمل میں نہیں
گوش آواز سرود رفتہ کا جویا ترا
اور دل ہنگامہ حاضر سے بے پروا ترا
قصہ گل ہم نوایان چمن سنتے نہیں
اہل محفل تیرا پیغام کہن سنتے نہیں
اے درائے کاروان خفتہ پا! خاموش رہ
ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش رہ
زندہ پھر وہ محفل دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شب دوشینہ ہو سکتی نہیں

ہم نشیں! مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں
نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لیے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لیے پیدا کیا
دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا
حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا
میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسون سحر شرمندہ ہے
آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرار حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکار حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار
ہاں یہ سچ ہے، چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

*

① سے ③ **معنی** : **مستور** : چھپا ہوا۔ **معمور** : لبریز، بھرا ہوا۔ **بربطِ دل** : دل کا ساز۔ **سرودِ رفتہ** : گذرے ہوئے زمانے کا راگ۔

مطلب : اس نظم میں علامہ اقبال سے مخاطب ہو کر ایک بے عمل اور مایوس مسلمان کہتا ہے۔ اے اقبال! نہ جانے کیا وجہ ہے کہ تیرا ہر سانس آہ و فریاد میں چھپا ہوا ہے اور جو تیرا سینہ ہے وہ بھی نالہ و فریاد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اگر تیرے دل کو ایک ساز تصور کر لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ تیرے نغموں یعنی شاعری میں رجائیت کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔ اور تو جس محمل کا پرستار ہے وہ محبوب سے خالی ہے ہرچند کہ تیری سماعت ماضی کے بھولے بسرے نغموں کو پھر سے سننے کی متقاضی ہے اور تیرا دل عصر موجود کے تمام ہنگاموں سے بے پروا ہے یعنی تو ملت مسلمہ کے عروج کا پھر سے خواہشمند ہے۔

④ سے ⑥ **معنی** : **یاس آفریں** : مایوسی پیدا کرنے والی۔ **شبِ دوشینہ** : گذشتہ (رات)۔

مطلب : اے اقبال تو اپنے اشعار میں اسلام کے دورِ ماضی کی جو تاریخ دہرانے کا خواہاں ہے تیرے ہم عصر آج کے مسلمان اس کو سننا پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا اس مایوس کن صورت حال میں تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تیرے اشعار جو اب مایوسی کو جنم دے رہے ہیں ان کو منقطع کر دے۔ اس لیے کہ ملت کے دلوں میں مایوسی پیدا کرنے سے خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے۔ لہٰذا تو بھی خاموش ہو جا۔ یہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ ماضی میں مسلمانوں کی جو عظمت و شان رہی ہے اب وہ از سرِ نو بروئے کار نہیں آسکتی اور محض تیرے اشعار کے سبب ملت کے وقار میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا۔ مراد یہ کہ قوم بے حس ہو چکی ہے اس میں احساس بیداری پیدا کرنا مشکل کام ہے۔

دوسرا بند ⑦ سے (12) **معنی** : **شاہدِ عادل** : سچا گواہ۔ **جسارت** : بے باکی۔ **ناموس** : عزت۔ **کوکبِ تابندہ** : روشن ستارا۔

مطلب : ان اشعار میں اقبال جواباً کہتے ہیں کہ اے ہم نشیں! یہ نہ بھول کہ میں ایک سچا مسلمان ہوں اور حق تعالیٰ کی وحدانیت کا پوری طرح قائل ہوں اور توحید کی صداقت پر ازل سے ہی میں ایک سچے گواہ کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یہ تصور توحید ہی ہے جس کے سبب پوری کائنات میں حرارت اور عمل کی قوت موجود ہے۔ یہ توحید ہی ہے جس کے سبب ملت کے پیروکاروں میں جراءت و ہمت پائی جاتی ہے۔ اسی صداقت کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے کائنات کی تخلیق کی اور مسلمانوں کو اس صداقت کے تحفظ کی ذمے داری سونپی۔

یہ ملت مسلمہ کے پیروکار ہی تھے جنھوں نے دنیا میں باطل کو فنا کر ڈالا اور اسی لیے سچ تو یہ ہے کہ زندگی اور اس کے ننگ و ناموس کے محافظ ٹھہرتے ہیں۔ یہ میرا وجود ہی تھا جو کائنات کی عریانی کو لبادہ فراہم کرتا رہا ہے۔ اگر میں ہی مٹ گیا تو اس سے بنی آدم کی یقیناً بڑی رسوائی ہو گی۔ یہ بھی جان لے کہ مسلمان

پوری دنیا کے لیے روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا ستارہ جس کی چمک دمک سے صبح کا نور بھی ماند پڑتا نظر آتا ہے۔

(13) **معنی**: دوش: گذرا ہوا کل۔ فردا: آنے والا کل۔

مطلب: میری آنکھوں پر زندگی کے تمام رازہائے سربستہ آشکار ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو عملی جدوجہد سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ میں ملت کے عارضی زوال سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مجھے اس کے تابندہ مقدر پر پورا پورا اعتماد ہے۔ میرے روز و شب ناامیدی اور یاس کے عنصر سے بے نیاز ہیں۔ میں جس معرکے میں ہوں اس کا جوش و خروش مکمل فتح کی نوید دے رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ماضی کی پرشکوہ تاریخ پر میری نظر رہتی ہے اور وہی داستان میں اپنے اشعار میں ہم عصر مسلمانوں کو سناتا ہوں۔ یہی یاد میری خاک کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور اسی شاندار ماضی میں اپنے درخشاں مستقبل کی جھلکیاں دیکھتا ہوں۔

حضور رسالت مآبؐ میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا
قیود شام و سحر میں بسر تو کی، لیکن نظام کہنہ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزم رسالتؐ میں لے گئے مجھکو
حضور آیہ رحمتؐ میں لے گئے مجھکو

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوش جام ولا ہے دل تیرا فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

*

پہلا بند معنی: گراں: ناقابل برداشت۔ رخت سفر: راستے کا سامان۔ آیہ رحمتؐ: رسول اکرم ﷺ کی رحمت کے حضور۔

مطلب: علامہ اقبال نے اس نظم میں طرابلس کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ شہید جو اٹلی سے اس خطہ ارض کو آزاد کرانے کے معرکے میں کام آئے۔ عملاً یہ نظم تین بند پر مشتمل ہے چنانچہ

اقبال کہتے ہیں کہ جب یہ عہد میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو رخت سفر باندھ کر عالم بالا کی طرف روانہ ہو گیا اس لیے کہ یہ دنیا جو صبح و شام کی قید سے عبارت ہے وہاں زندگی جیسے تیسے بسر تو کی تاہم یہاں کے فرسودہ نظام سے قطعی مانوس نہیں ہو سکا۔ چنانچہ جب میں عازم سفر ہوا تو فرشتوں نے میری رہنمائی کی اور مجھے حضورؐ سرور کائنات کی بارگاہ میں لے گئے۔ حضورؐ جو رحمت اللعالمین ہیں۔

دوسرا بند **معنی**: ملائک: ملک کی جمع' فرشتے۔

مطلب: آنحضرتؐ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تو بے شک گلستان حجاز کا بلبل ہے۔ تیرے نغموں یعنی شاعری سے ملت کا ہر فرد بے شک متاثر ہوا ہے۔ یہ کارنامہ جو تو نے انجام دیا بے حد عظیم ہے۔ تیرا دل ہمیشہ ہماری محبت سے سرشار رہتا ہے۔ تیری خاکساری اور انکساری ہزارہا سجدوں کے لیے باعث رشک ہے۔ تو زمین کی پستی سے اڑ کر جو یہاں پہنچا ہے کہ فرشتوں نے تجھے بلند پروازی سکھائی ہے۔

بے شک تو باغ دنیا سے خوشبو کی طرح اڑ کر یہاں آیا ہے مگر ہمارے لیے کیا تحفہ لایا؟

تیسرا بند **معنی**: آبگینہ: شیشہ' صراحی۔

مطلب: آنحضرتؐ کے استفسار پر اقبال نے عرض کی کہ حضورؐ دنیا وہ مقام ہے جہاں آرام و سکون ناپید ہے اور جس زندگی کی تلاش ہو وہ بھی میسر نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس دنیا میں بے شمار انسان بستے ہیں لیکن ان میں حمیت و وفا کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں حضورؐ کی خدمت اقدس میں ایک ایسا آبگینہ لے کر آیا ہوں کہ اس میں جو گرانقدر شے ہے وہ جنت میں بھی نہیں مل سکتی۔

یہ نایاب شے جو اس آبگینے میں موجود ہے وہ طرابلس کے شہیدوں کا لہو ہے۔ جس سے حضورؐ کی امت کی آبرو اور توقیر جھلکتی ہے۔

شفاخانہ حجاز

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانہ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ بے قرار سنتا ہے تو کسی سے جو افسانہ حجاز
دست جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف مشہور تو جہاں میں ہے دیوانہ حجاز
دارالشفا حوالی بطحا میں چاہیے
نبض مریض پنجہ عیسیٰ میں چاہیے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا پایا نہ خضر نے مے عمر دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟
رکھتے ہیں اہل درد مسیحا سے کام کیا؟

*

پہلا بند **معنی**: دارالشفا: شفاخانہ۔ بطحا: مکہ معظمہ۔ پنجہ عیسیٰ: حضرت عیسیٰ کا ہاتھ یعنی ماہر معالج۔

مطلب: دو بند پر مشتمل اس نظم کے اولین بند میں اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز مجھ کو ایک قومی رہنما نے بتایا کہ سعودی عرب کے شہر جدہ میں ہسپتال کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ جب تو کسی شخص سے حجاز کا ذکر سنتا ہے تو تیرے جسم کا ہر ذرہ بے قرار ہونے لگتا ہے۔ اب میں اس سرزمین میں ہسپتال کے قیام کی تجھے جو نوید دے رہا ہوں تو اس سے اظہار عقیدت کے طور پر اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور ہسپتال کی تعمیر میں امداد کے لیے عطیہ دے کہ اس علاقے میں مریضوں کے لیے ہسپتال کا قیام اشد ضروری ہے تاکہ اطباء وہاں بیمار لوگوں کا علاج کر سکیں۔

شفا بند معنی: شفا: صحت۔

مطلب: اقبال اس پیشوائے قوم سے مخاطب ہو کر جواباً کہتے ہیں کہ جس شے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے فی الواقع وہ زندگی کا ایک ایسا رخ ہی ہے جس طرح کہ حقیقت مجاز میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک سچے عاشق کو فنا میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ حضرت خضرؑ اپنی طویل عمر میں بھی حاصل نہیں کر سکے۔ سو جناب زندگی کا یہ پیغام حضور دوسروں کو دیں میں تو سرزمین حجاز پر موت کا تمنائی ہوں۔ آپ میرے پاس شفا کا یہ کیا پیغام لے کر آئے ہیں کہ اہل درد لوگ تو معالجوں سے سروکار نہیں رکھا کرتے۔ کہ تکلیف ان کے لیے راحت ہے۔

زیر تشریح نظم کا پس منظر یہ ہے کہ انگریزوں نے سرزمین حجاز میں ہسپتال تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے رقم درکار تھی۔ ہندوستان میں بھی اس مقصد کے لیے عطیات جمع کیے گئے لیکن اقبال اور بعض دوسرے اکابر اس نوعیت کے ہسپتال کی تعمیر کے خلاف تھے جو انگریز کی زیر سرپرستی قائم ہو۔ لہٰذا اس منصوبے کے خلاف یہاں آواز اٹھائی گئی۔ اقبال کی یہ نظم بھی اس احتجاج کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ساقی

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی

*

معنی: ساقی: شراب پلانے والا۔ بادہ کش: شرابی۔ آبِ بقائے دوام: ہمیشہ زندہ رکھنے والا پانی۔

مطلب: یہ مختصر سی نظم محض تین اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ لگانے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی کہ اقبال نے اس نظم میں اپنے عہد کے بعض ایسے رہنماؤں پر طنز کی ہے جو ذاتی مفاد کے لیے اپنے پیروؤں کو مذہب اور سیاست کے نام پر استعمال کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:
شراب پلا کر ہر کوئی دوسرے کو بدمست اور مدہوش کر سکتا ہے اور اس بدمستی اور مدہوشی میں پینے

والا زمین پر ہی گرتا ہے لیکن ساقی کا کام محض مدہوش کرنا ہی نہیں ہے بلکہ گرتے ہوؤں کو تھامنا بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ذاتی مفاد کے لیے دوسروں کو پستی سے ہم کنار کرنا تو سب کو آتا ہے تاہم حقیقی رہنمائی کا لطف اس عمل میں ہے کہ پستی میں گرنے والے کو سہارا دے۔ پستی سے نجات دلائی جائے جو پرانے لوگ مے نوشی کے عادی تھے وہ تو بتدریج فنا کے گھاٹ اترتے جا رہے ہیں چنانچہ یہ امر اب لازم ہو گیا ہے کہ انہیں آبِ حیات پلا کر بقائے دوام سے ہم کنار کیا جائے۔

اے ساقی! تو نے اپنی ساری عمر تو اسی قسم کے ہنگاموں میں گزاری ہے اب جب کہ تو عمر کے آخری مراحل میں ہے سب ہنگامے چھوڑ کر اللہ اللہ کر لے کہ یہی آخرت میں کام آئے گا۔ مرد یہ ہے کہ خود ساختہ اور مفاد پرست رہنماؤں کا کردار عام لوگوں کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں۔ خدا کرے وہ عبرت حاصل کر سکیں۔

تعلیم اور اس کے نتائج

(تضمین بر شعر ملا عرشی)

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
"تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم زنو
کانچہ کشتیم زخجلت نتواں کرد درو"

*

معنی: الحاد: دین سے پھرنا۔ پرویز: خسرو ثانی (شاہِ ایران کا لقب)۔ تخم: بیج۔

مطلب: حصولِ تعلیم کے ضمن میں نوجوانوں نے جو ترقی کی وہ دوسروں کی طرح ہمارے لیے بھی مسرت و انبساط کا باعث ہے۔ مگر مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے ساتھ ہی فریاد بھی نکل جاتی ہے اس لیے کہ ہم تو یہی سوچتے تھے کہ تعلیم کے سبب قوم کی مشکلات دور ہوں گی لیکن اس کا علم نہ تھا کہ مروجہ تعلیم کے ہمراہ قوم کے نوجوانوں میں فراغت اور آسائش کے ساتھ کفر و الحاد بھی ان کے دلوں میں گھر کر لے گا۔ اس کی مثال تو ایسی کہ پرویز بادشاہ کے محل میں اس کی مطلوبہ محبوبہ شیریں آ تو گئی مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اپنے عشاق فرہاد کا تیشہ بھی ساتھ لے آئی۔ مراد یہ کہ تعلیم نے نوجوانوں کے ذہنوں کو قدرے جلاء تو بخشی لیکن انہیں کفر و الحاد سے بھی متاثر کر کے رکھ دیا۔

آخری شعر ایرانی شاعر ملا عرشی کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اب ہمیں کہیں سے نیا بیج لانا چاہیے اور اسے کاشت کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو بیج پہلے کاشت کیا تھا اس کی فصل کاٹنا باعثِ ندامت بن گیا ہے۔ یہاں ملا عرشی کا مختصر تعارف بے محل نہ ہو گا کہ وہ ایران کے صفوی بادشاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے زود گو شاعر تھے۔ ان کا دیوان دس ہزار اشعار پر مشتمل بتایا جاتا ہے۔

قربِ سلطان

تمیز حاکم و محکوم مٹ نہیں سکتی
مجال کیا کہ گداگر ہو شاہ کا ہمدوش
جہاں میں خواجہ پرستی ہے بندگی کا کمال
رضائے خواجہ طلب کن قبائے رنگیں پوش
مگر غرض جو حصول رضائے حاکم ہو
خطاب ملتا ہے منصب پرست و قوم فروش
پرانے طرز عمل میں ہزار مشکل ہے
نئے اصول سے خالی ہے فکر کی آغوش
مزا تو یہ ہے کہ یوں زیر آسماں رہیے
ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش
یہی اصول ہے سرمایہ سکون حیات
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
مگر خروش پہ مائل ہے تو؟ تو بسم اللہ
بگیر بادۂ صافی، ببانگ چنگ بنوش
شریک بزم امیر و وزیر و سلطاں ہو
لڑا کے توڑ دے سنگ ہوس سے شیشۂ ہوش
پیام مرشد شیراز بھی مگر سن لے
کہ ہے یہ سر نہاں خانۂ ضمیر سروش
محل نور تجلی است رائے انور شاہ
چو قرب او طلبی در صفائے نیت کوش

*

اس دنیا کا نظام ہی اس طرز پر وضع کیا گیا ہے کہ حاکم و محکوم کے مابین جو امتیاز قائم کیا گیا وہ کسی طور پر بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے یہ بات طے ہے کہ کوئی بھکاری بادشاہ کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں غلامی کا کمال ہی یہ ہے کہ آقا کی پرستش کی جائے اور اس کے احکامات بے چون و چرا مان لیے جائیں۔ کہ آقا کی خوشنودی کی صورت میں غلام سرخرو ہو سکتا ہے۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی حاکم کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں ہو تو اسے عہدوں کا لالچی اور قوم فروش کہا جاتا ہے اور لوگ اسے معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

اب دیکھا جائے تو ماضی کے اصولوں پر عمل کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ جدید قواعد اور اصولوں میں فکر موجود ہی نہیں۔ لطف تو اسی صورت میں ہے کہ اس آسمان تلے رہائش کے دوران ہرچند کہ زبان پر ہزارہا باتیں ہوں پھر بھی لب کشائی نہ کی جائے اور خاموشی اختیار کر لی جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی میں سکون و اطمینان کا ایک نسخہ خواجہ حافظ شیرازی نے اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اے حافظ! بے شک تو ترک دنیا کر کے محض ایک گوشے میں پناہ لینے والا درویش ہے اس لیے تجھے شور و ہنگامہ بپا کرنے کی بجائے خاموش رہنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر تو ہنگامہ کرنے پر تلا ہی ہوا ہے تو شوق سے کر۔ مگر اس کے لیے شراب خالص کا حصول ناگزیر ہے کہ سے راگ و رنگ کی محفل میں نوش جاں کیا جا سکے۔ شاہوں، وزیروں اور امیروں کی محفلوں میں شرکت اس طرح سے کر کہ اپنے فکر و شعور کو بھول جا اور محض اہل محفل کی خوشنودی کا خیال رکھ۔

اس ساری صورت حال کے باوجود شیراز کے مرشد کا یہ پیغام بھی بہ قائمی ہوش و حواس سن لے۔ عملاً یہ پیغام ایک ایسا راز ہے جو انسانوں کو خوش خبری دینے والے فرشتے کے ضمیر میں پوشیدہ ہے اور وہ

پیغام یہ ہے کہ شاہوں کی رائے پر تجلیوں کا نور برستا ہے۔ لہٰذا جب تو شاہ کی قربت میں بیٹھے تو ہمیشہ اپنی نیت کو صاف رکھ۔

دراصل یہ اشعار اقبال نے بظاہر تو بندۂ و آقا کے مابین امتیاز کے حوالے سے کہے ہیں لیکن عملاً وہ مسئلہ جبر و قدر کو زیرِ بحث لاتے ہیں کہ فرد کے مقدر میں غلامی لکھی ہے تو اس پر قناعت ہی کی جا سکتی ہے۔

شاعر

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے　　پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مے خرام کا سن تو ذرا پیام تو　　زندہ وہی ہے، کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترِ خوش خرام ابر　　کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خمکدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری　　ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں　　کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری
اہل زمیں کہ نسخۂ زندگی دوام ہے　　خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

*

پہلا بند **معنی:** جوئے سرود آفریں: نغمہ سناتی ہوئی ندی۔ **خمکدے:** شراب خانہ۔

مطلب: اس نظم میں بھی منظر نگاری اور امیجری اپنے کمال پر ہے۔ ندی اپنی تمام تر نغمہ ریزی کے ساتھ پہاڑ کی چٹانوں میں سے گزرتی بل کھاتی نیچے زمین کی طرف آ رہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بہار کے موسم میں گل لالہ جیسی سرخ شراب پی کر مستی و مدہوشی کے عالم میں رواں دواں ہو۔ اس ندی کا پیغام سن۔ جو زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ اس دنیا میں وہی شے زندہ رہتی ہے جو سکون و ثبات کی بجائے حرکت و عمل کی قائل ہو۔

یہ خوبصورت چال والی بادل کی بیٹی ندی۔ اس طرح وادیوں کا طواف کرتی ہے جیسے کہ مرغزار کے سبزے سے عشق لڑا رہی ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ندی کوہسار کے میکدے سے شراب کے جام اڑ کر لاتی ہے اور پھر اونچے نیچے مقامات سے گزار کر کھیتوں تک جا پہنچتی ہے اور یہ شراب انہیں پلا دیتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہاڑی ندی چٹانوں سے گزرتی ہوئی جب وادی میں پہنچتی ہے تو کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔

دوسرا بند **معنی:** مزرع: کھیتی۔ **سخنوری:** مراد شاعری۔

مطلب: اس بند کے اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ندی کے کردار کا ذکر اوپر کے شعروں میں کیا گیا ہے اسی منظر نامے میں اگر کسی دلنواز شاعر کی تخلیقات اور فکر کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اگر شاعر

بھی مبالغہ آرائی کی بجائے سچ کو اپنا شعار بنا لے اور اس سچ کے اظہار میں جراءت مندی سے کام لے تو حیات انسانی کے لیے مفید اور سود مند ثابت ہو سکتا ہے یعنی ندی تو صرف کھیتوں اور باغات کو سیراب کرتی ہے جب کہ شاعری فکر انسان اور کائنات کے لیے افادیت کا سبب بنتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ شاعر اگر حقیقت پسند ہے اور سچائی کے اظہار پر دسترس رکھتا ہے تو ایسے شاعر کے کلام سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی شان ظاہر ہوتی ہے خاص طور پر ان مراحل میں جب کہ اس کی قوم آزر کی طرح بت تراشی اور بت پرستی کی جانب مائل ہو جائے۔ چنانچہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر کے وحدانیت اور حق پرستی کا راستہ دکھایا تھا۔ شاعر بھی اپنی ملت کے لیے یہی کردار ادا کر سکتا ہے جو شاعری سچائی اور خون جگر سے پرورش پاتی ہے وہ سننے والوں کے لیے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے اس گلستاں میں اگر شعر کی ندی نہ ہو یعنی شاعری نہ ہو تو پھر یہاں پھول، کلی، سبزہ اور چمن کا وجود بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

نویدِ صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر   منزلِ ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت   دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات   باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات
مسلمِ خوابیدہ اٹھ، ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق، گرمِ تقاضا تو بھی ہو

وسعتِ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب   دامنِ گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغِ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا، پھر ہو سرگرمِ ستیز   پھر سکھا تاریکیِ باطل کو آدابِ گریز
تو سراپا نور ہے خوشتر ہے عریانی تجھے   اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں! نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ نقاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

*

پہلا بند **معنی:** ہنگامہ در دامن: اپنے دامن میں ہنگامے لیے ہوئے۔ خاموشی سفر: خاموشی رخصت ہو جاتی ہے۔

مطلب: زیر تشریح نظم دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند کا آغاز اقبال اس انداز سے کرتے ہیں کہ جس گھڑی مشرق کی جانب سے صبح اپنے دامن میں ہنگامے لیے آتی ہے اس وقت کائنات سے خاموشی رخصت ہو جاتی ہے۔ ساری فضاء پر جو سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے وہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کائنات میں موجود ہر شے اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے لگتی ہے جوں ہی ہر جانب سے زندگی کا پیغام ملنے لگتا ہے تو پرندے بھی چہچہانے لگتے ہیں اور پھول بھی اپنی شگفتگی سے اپنے وجود سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

سو جب کائنات کی ہر شے سرگرم عمل ہے تو اے مسلمان! تو بھی اپنی نیند سے بیدار ہو جا کہ مشرق میں افق کی روشنی پھیل رہی ہے لہٰذا دوسرے عناصر کی طرح تو بھی مصروف عمل ہو جا۔

دوسرا بند **معنی:** سرگرم ستیز: جنگ میں مصروف۔

مطلب: اے مسلمان! تو بھی سورج کی مانند کائنات کی وسعت میں اپنے سفر کا آغاز کر دے تاکہ آسمان پر بادلوں کے جو داغ احاطہ کیے ہوئے ہیں وہ مٹ جائیں۔ سورج کی کرنوں کی طرح تو بھی اپنے خنجر کو تیز کر لے اور باطل کے خلاف اعلان جنگ کر دے کہ وہ حق کے مقابلے میں فرار پر مجبور ہو جائے۔ آج باطل کے اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگر تو سرگرم عمل ہو جائے تو حق کی فتح لازمی ہے اور اس کی روشنی ہر طرف پھیل سکتی ہے۔ تو کہ سر سے پا تک روشنی ہے تجھے تو اپنے وجود کو نمایاں کرنا چاہیے اور اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنا چاہیے۔

اگر باطل کو چگادڑ یعنی اندھیرا تسلیم کر لیا جائے تو اے مسلمان تو اس پر اپنی روشنی سے حملہ آور ہو تاکہ باطل کی تاریکی ختم ہو کر رہ جائے۔

دعا

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے
پھر وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے — پھر شوق تماشا دے، پھر ذوق تقاضا دے
محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعت صحرا دے
پیدا دل ویراں میں، پھر شورش محشر کر — اس محمل خالی کو، پھر شاہد لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو — وہ داغ محبت دے، جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر — خودداری ساحل دے، آزادی دریا دے
بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو — سینوں میں اجالا کر، دل صورت مینا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا — امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

*

① سے ⑤ **معنی:** فاراں: پہاڑ کا نام ہے۔ دیدۂ بینا: دیکھنے والی آنکھ۔ آہو: ہرن۔ خوگر: عادی۔

مطلب: اس نظم میں اقبال بارگاہ الٰہی میں یوں دعا گو ہیں کہ اے مالک جہاں! مسلمانوں کے دلوں میں ایسی بیدار تمنائیں پیدا کر جو ہر قلب کو مضطرب کر دے اور ان کی روح کو تڑپا کر رکھ دے۔ اے مولا! ایک بار پھر حرم کعبہ کے ایک ایک ذرے کو منور کر دے اور مسلمانوں کے دلوں میں وہ شوق پیدا کر دے جو اس روشنی کو اپنے اندر جذب کرنے کا سبب بن سکے۔ وہ لوگ جو چشم بصیرت سے محروم ہو چکے ہیں انہیں بصیرت کے ساتھ بصارت بھی عطا کر۔ اور میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی

ادے۔ مسلمان آج ایک گم کردہ راہ ہرن کی طرح ہے۔ اسے پھر سے حرم کعبہ کی طرف لوٹا دے اور ں کی فکر کو صحرا جیسی وسعت عطا کردے۔ اس اجڑے ہوئے دل میں پھر سے حشر بپا کردے اس کے ں کجاوے کو لیلیٰ جیسا محبوب عنایت فرما۔

ا سے ⑩ معنی: رفعت: بلندی۔ مینا: شیشہ، صراحی۔

طلب: یہ دور تاریکی کا دور ہے جس میں کسی کو کچھ نہیں سوجھ رہا۔ اسی سبب مسلمانوں کے دل ابتری کا ر ہیں۔ ان دلوں کو ایسا داغ محبت دے جو چاند کو بھی شرما دے۔ ان کے جو مقاصد ہیں ان کو ثریا کی سی دی عطا کر۔ ان کو ساحل جیسی خودداری اور دریا کی روانی جیسی آزادی بخش دے۔ ان مسلمانوں کے ں میں ایسی محبت موجزن ہو جو بالکل بے لوث ہو جس میں لالچ اور ہوس کا شائبہ تک نہ ہو۔ مزید یہ کہ یں بے خوف و خطر سچ بولنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دلوں میں اجالا پیدا کر دے اور دلوں کو وہ احیت دے جو دوسروں کو فیض پہنچا سکے۔ مسلمان آج مصائب و آلام میں گھرے ہوئے ہیں لیکن بے ں کا شکار ہیں۔ خدایا انہیں مصائب سے متنبہ کر اور حال کے ہنگاموں کے پس منظر میں مستقبل کی فکر ا کر۔

اقبال کہتے ہیں اے آقا! میں تو ایک ویران باغ میں نالہ و فریاد کرنے والا بلبل کی طرح ہوں جس کی یہ و زاری میں تاثیر باقی نہیں رہی چنانچہ اے ہر فرد کی حاجت روائی کرنے والے میں تجھ سے اپنی تاثیر کا طلبگار ہوں۔

عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں

شالامار میں اک برگ زرد کہتا تھا . گیا وہ موسم گل جس کا رازدار ہوں میں
پائمال کریں مجھ کو زائران چمن انہیں کی شاخ نشیمن کی یادگار ہوں میں
ا سے پتے نے بے تاب کر دیا دل کو چمن میں آ کے سراپا غم بہار ہوں میں
اں میں مجکو رلاتی ہے یاد فصل بہار خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں
اڑ ہو گئے عہد کہن کے مے خانے گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں میں

پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

*

چھ اشعار پر مشتمل اس مختصر سی نظم میں اقبال ایک مخصوص صورت حال کے پس منظر میں غم والم ں تصویر بنے آتے ہیں۔ یوں بھی عید پر شعر کہنے کی فرمائش کے جواب میں انہوں نے یہاں جو کچھ کہا ہے سے ایک معذرت نامے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

معنی: برگ زرد: زرد رنگ کا پتا۔ زائران چمن: باغ کی سیر کرنے والے۔ ہلال عید: عید کا چاند۔

طلب: مغلوں کے خوبصورت باغ شالامار میں سیر کے لیے گیا تو کسی درخت کے ایک مرجھائے ہوئے زرد پتے نے زبان حال سے کہا کہ وہ بہار اور شان و شوکت کا زمانہ تو رخصت ہو گیا جس کا میں چشم دید گواہ

اور رازدار ہوں۔ باغ میں سیر کو آنے والے لوگ مجھے یوں اپنے قدموں تلے نہ روند ڈالیں کہ میں اس درخت سے شاخ کا جزو ہوں جس پر کبھی ان کا نشیمن ہوا کرتا تھا یعنی میں بھی اس گزری ہوئی شان و شوکت کا مظہر ہوں جو کبھی ملت اسلامیہ کی عظمت کا حصہ تھی۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس ذرا سے پتے کی زبان حال سے فریاد نے میرے دل کو اضطراب سے دوچار کر دیا اور یہاں باغ میں سیر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے مذکورہ فریاد سن کر دل بے چین ہو کر رہ گیا اور قلبی مسرت غم کے سانچے میں ڈھل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں خزاں کے دور میں بہار کے موسم کو یاد کر کے اشک بار ہوتا ہوں۔ اس غم انگیز کیفیت میں مجھے عید کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ میں تو ماضی کی یاد میں پہلے ہی سوگوار رہوں۔ ملت اسلامیہ کی عظمت و شان کا وہ دور ختم ہو چکا جس کی یادگار کے طور پر میں ابھی تک بقید حیات ہوں۔

اس کیفیت میں عید کا چاند عیش و مسرت کا مژدہ سنا کر دراصل ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔

فاطمہ بنت عبداللہ

(عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

1912ء

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی — غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر — ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے — نغمہ عشرت بھی اپنے نالہ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے — ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں — پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں — آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور — دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانہ ایام سے — جن کی ضو ناآشنا ہے قید صبح و شام سے
جن کی تابانی میں انداز کہن بھی، نو بھی ہے
اور تیرے کوکب تقدیر کا پرتو بھی ہے

*

پہلا بند معنی: امت مرحوم: مراد ہے ملت اسلامیہ۔ سقائی: پانی پلانا۔ خاکستر: راکھ۔ آہو: ہرن۔

مطلب: مندرجہ بالا نوٹ میں علامہ اقبال نے خود اس نظم کی شان نزول کی جانب اشارہ کیا ہے۔ زیر

رتیج بند کا آغاز کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں اے فاطمہ بنت عبداللہ تو اس امت کی عزت و آبرو ہے جس اری تعالیٰ نے اپنی رحمت کا نزول فرمایا۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرے جسم کا ذرہ ذرہ تمام گناہوں سے پاک و منزہ ہے۔ اے حور صحرائی! دراصل یہ سعادت تیرے حصے میں ہی آئی تھی کہ دین کی راہ میں جان نثار کرنے وں اور فاتح جوانوں کو میدان کارزار میں پانی پلانے کا شرف حاصل کرے۔

سچ تو یہ ہے کہ تو نے اللہ کی راہ میں کسی تلوار اور ڈھال کے بغیر حیرت انگیز طور پر بڑی جی داری کے تھ جہاد کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق شہادت نے تجھ کس جراءت مند اور بہادر بنا دیا تھا۔ ی مختصر زندگی اور موت کے پیش نظر حیرت زدہ ہو کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدایا! ہمارے اجڑے ے باغ میں ایسی کلی بھی موجود تھی؟ یہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ جو دیکھا جائے تو راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ اس ڈھیر میں ایسی تابناک اور باطل کو جلا دینے والی چنگاری بھی موجود تھی۔

لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے صحرا میں اتنے جیالے آہو ابھی تک چھپے ے ہیں اور جو بادل برس چکا ہے اس میں ابھی تک بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ مراد یہ کہ قوم میں ابھی بھی ہر قابل اور جاں نثاروں کی کمی نہیں ہے۔

سرا بند **معنی**: خانہ ایام: زمانے کا اندھیرا۔

مطلب: اے فاطمہ! ہرچند کہ تیرے غم میں ہماری آنکھیں اشکبار ہیں لیکن آہ و زاری کے ان مراحل ں کچھ طمانیت بخش پہلو بھی موجود ہیں۔ تیری حیات اور موت کے واقعات ہمارے لیے بے حد حوصلہ زا ہیں۔ تیری خاک کا ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے معمور ہے۔ تیری قبر کا سکوت بھی ایک ہنگامے کا پتہ دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس قبر کی آغوش میں ایک نئی اور زندہ قوم پرورش پا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں اس نئی قوم کی وسعت اور اس کے بنیادی مقاصد سے آگاہی نہیں رکھتا۔ تاہم اس قدر یقین ہے کہ اس نئی قوم کی پیدائش اور آغاز تیری ہی قبر سے ہو رہا ہے۔

اے فاطمہ بنت عبداللہ! میری چشم بصیرت افروز اس حقیقت کا نظارہ کر رہی ہے کہ آسمان پر ایک نئے اور تابندہ ستارے کا ظہور ہو رہا ہے۔ ہرچند کہ عام انسان کی نظروں کو اس کا ادراک نہیں ہے۔ یہ فقط ایک ستارہ نہیں بلکہ بہت سے ستارے ہیں۔ یہ ستارے ابھی وقت اور ماحول کے اندھیرے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ ان کی روشنی ابھی تک دن رات اور صبح و شام کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ ملت مسلمہ کے لیے عروج و ارتقا کے نئے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ حال کے ساتھ اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکے۔

اے فاطمہ بنت عبداللہ! یہ جو ستارے نمودار ہو رہے ہیں ان کی روشنی اور چمک دمک میں قدیم اور نئے انداز کے ساتھ تیرے مقدر کے ستارے کا عکس بھی موجود ہے۔

شبنم اور ستارے

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے ۔ ہر صبح نئے تجھ کو میسر ہیں نظارے
کیا جانیے تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے ۔ جو بن کے مٹے ان کے نشاں دیکھ چکی ہے

زہرہ نے سنی ہے یہ خبر ایک ملک سے — انسانوں کی بستی ہے بہت دور فلک سے
کہہ ہم سے بھی اس کشور دلکش کا فسانہ
گاتا ہے قمر جس کی محبت کا ترانہ

اے تارو! نہ پوچھو چمنستان جہاں کی — گلشن نہیں، اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی
آتی ہے صبا واں سے پلٹ جانے کی خاطر — بیچاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر
کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے — ننھا سا کوئی شعلۂ بے سوز کلی ہے
گل نالۂ بلبل کی صدا سن نہیں سکتا — دامن سے مرے موتیوں کو چن نہیں سکتا
ہیں مرغ نوا ریز گرفتار، غضب ہے — اگتے ہیں تہ سایۂ گل خار، غضب ہے
رہتی ہے سدا نرگس بیمار کی تر آنکھ — دل طالب نظارہ ہے، محروم نظر آنکھ
دل سوختۂ گرمیِ فریاد ہے شمشاد — زندانی ہے اور نام کو آزاد ہے شمشاد
تارے شرر آہ ہیں انساں کی زباں میں — میں گریۂ گردوں ہوں گلستاں کی زباں میں
نادانی ہے یہ گرد زمیں طوف قمر کا — سمجھا ہے کہ درماں ہے وہاں داغ جگر کا
بنیاد ہے کاشانۂ عالم کی ہوا پر
فریاد کی تصویر ہے قرطاس فضا پر

*

پہلا بند معنی: زہرہ: ایک مشہور ستارہ۔ اسے رقاصہ فلک بھی کہتے ہیں۔

مطلب: یہ ایک رات کا ذکر ہے کہ ستاروں نے شبنم سے مخاطب ہو کر کہا۔ تجھ کو ہر صبح نئے نئے نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ نہ جانے تو اب تک کتنی دنیائیں دیکھ چکی ہے۔ جو چیزیں عروج پا کر زوال کا شکار ہو چکی ہیں تو نے تو ان کی افتاد کا نظارہ بھی کیا ہے۔ اے شبنم! زہرہ ستارے نے کسی فرشتے سے یہ خبر سنی ہے کہ انسان جس دنیا میں آباد ہیں وہ آسمان سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔

اے شبنم! چونکہ تو انسانوں کی اس دلکش بستی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ چاند بھی جس کی محبت کے نغمے گاتا ہے اس کا احوال سنا۔

دوسرا بند معنی: چمن افروز: باغ کی زینت۔ شعلہ بے سوز کلی: ایک چنگاری ہے جس میں جلن نہیں ہے۔ مرغ نوا ریز: نغمے گانے والے پرندے۔ تہ سایہ گل: پھول کے سائے میں۔ درماں: علاج۔ قرطاس: صفحہ۔

مطلب: ستاروں کی زبانی یہ بات سن کر شبنم نے جواباً کہا کہ اے ستارو! تم انسانی دنیا کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ وہ کوئی شگفتہ باغ نہیں بلکہ ایسی بستی ہے جو آہ و فغاں سے عبارت ہے وہاں صبا محض اس لیے آتی ہے کہ مایوس ہو کر واپس لوٹ جائے اور باغوں میں کلی صرف مرجھانے کی خاطر ہی کھلتی ہے۔ اس کلی کا احوال تم سے کیا کہوں کہ وہ کس طرح باغ کی آرائش کا سامان بنتی ہے۔ وہ تو شاید ایک ایسا ننھا سا شعلہ ہے جو تپش سے محروم ہے۔

اس دنیا میں پھول اس قدر مجبور ہے کہ اسے نالہ بلبل بھی سنائی نہیں دیتا۔ میں خود اس کے دامن

میں موتیوں کی طرح گرتی ہوں لیکن وہ انہیں بھی نہیں چن سکتا۔ اس بستی میں تو نغمے الاپنے والے پرندوں کو بھی قیدی بنا لیا جاتا ہے۔ حیرت تو یہ کہ وہاں پھولوں کے زیر سایہ کانٹے اگتے ہیں۔ نرگس کے پھول نظارے کی تڑپ تو رکھتے ہیں لیکن ان کی آنکھیں بصارت سے محروم ہیں۔ شمشاد کا درخت فریاد کی حدت سے تپش آمادہ رہتا ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہے پھر بھی قیدی کی حیثیت کا حامل ہے۔ خوبصورت ستارے بھی انسان کی زبان میں آہوں کے شرارے ہیں اور اہل گلشن مجھے بھی آسمان کے آنسوؤں سے تعبیر کرتے ہیں۔ چاند جو زمین کی محبت میں گرفتار ہو کر وہاں کا طواف کرتا ہے نادان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جہان فانی کی بنیاد محض ہوا پر قائم ہے۔ اور یہ درحقیقت غم و اندوہ اور نالہ و فغاں کا مرقع ہے۔ اس نظم میں اقبال نے دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کشی کی ہے۔

محاصرۂ ادرنہ

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی　　حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا
گرد صلیب، گرد قمر حلقہ زن ہوئی　　شکری حصار درنہ میں محصور ہو گیا
مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام　　روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا
آخر امیر عسکر ترکی کے حکم سے　　"آئین جنگ" شہر کا دستور ہو گیا
ہر شے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل　　شاہیں گدائے دانہ عصفور ہو گیا
لیکن فقیہ شہر نے جس دم سنی یہ بات　　گرما کے مثل صاعقہ طور ہو گیا
ذمی کا مال لشکر مسلم پہ ہے حرام　　فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا

چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

٭

علامہ اقبال نے یہ نظم اس جنگ کے پس منظر میں تخلیق کی ہے جو ترکی پر 1913ء میں بلغاریہ اور سرویا کے مشترکہ حملے کے سبب وقوع پذیر ہوئی۔ ان دونوں ممالک نے ادرنہ پر حملے کر کے اسے فتح کر لیا لیکن چند ماہ کے بعد ترک سپہ سالار انور پاشا نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ دراصل ادرنہ وہ شہر تھا جو فتح قسطنطنیہ سے قبل ترکی عثمانیہ سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ اسی سبب اس عہد میں ادرنہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

① سے ④ **معنی:** صلیب: سولی۔ آئین جنگ: فوجی قانون یا مارشل لاء۔

مطلب: چنانچہ نظم کا آغاز کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یورپ میں جس لمحے حق و باطل کے مابین جنگ چھڑ گئی تو حق کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ باطل کے خلاف تلوار اٹھائے۔ مراد یہ ہے کہ بلغاریہ اور سرویہ کی افواج نے جس وقت ترکی کے دارالحکومت ادرنہ پر حملہ کیا تو عثمانی سلطنت کے عساکر بھی ان کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ صلیبی یعنی عیسائی افواج نے جب مسلم علاقے کا محاصرہ کر لیا تو ترک سالار اپنی فوجی قوت کو مجتمع کر کے ادرنہ کے قلعہ میں محصور ہو گیا اور دشمن کے خلاف مختصر فوج کے باوجود اس نے

جگری سے مزاحمت کی کہ عیسائی سالار بھی اسے داد دینے پر مجبور ہو گئے۔

اس معرکے نے اتنا طول پکڑا کہ مسلمانوں کے پاس سامان رسد ختم ہو گیا اور فوجی بھوکوں مرنے لگے۔ باہر سے کمک کی کوئی توقع نہیں تھی آخر کار مجبور ہو کر شکری پاشا نے حکم جاری کیا کہ جنگ کے قانون کے مطابق شہریوں سے جبراً سامان خوراک حاصل کر لیا جائے۔ اس حکم کی رو سے اسلامی لشکر نے عام لوگوں سے خوراک کے ذخیرے حاصل کر کے جمع کر لیے۔

⑤ سے ⑧ **معنی:** **منتقل:** ایک جگہ سے دوسری جگہ لانا۔ **عصفور:** چڑیا۔ **فقیہ شہر:** شہر کا مفتی۔ **صاعقہ:** چمکنے والی بجلی۔ **ذمی:** وہ غیر مسلم جس کی حفاظت کا ذمہ مسلم حکومت نے اٹھایا ہے۔

مطلب: جب تمام سامان رسد لشکر کے ذخیرے میں منتقل ہو گیا تو عمومی سطح پر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانے لگا کہ "شاہین جو تھا وہ چڑیوں کی خوراک کا بھکاری بن گیا ہے"۔ مراد یہ کہ مسلمان فوجی جو بے حد جی دار اور جراءت مند ہونے کے ساتھ بلند حوصلہ بھی رکھتے تھے انہوں نے آخر کار بھوک سے مجبور ہو کر عام لوگوں کے کھانے پینے کا سامان بھی قبضے میں لے لیا ہے۔

تاہم جب یہ خبر شہر کے مفتی تک پہنچی تو وہ اس قدر غضبناک ہوا کہ فوری طور پر ترک لشکر کے حکم کے خلاف فتویٰ جاری کیا جس کی رو سے اسلامی آئین کے مطابق پناہ میں آئے ہوئے غیر مسلموں کا مال مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا گیا۔ یہ فتویٰ آناً "فاناً" سارے شہر کے لوگوں کے مابین پھیل گیا۔ حتیٰ کہ ترک سپاہیوں تک بھی یہ خبر پہنچ گئی۔

اس فتوے کی جاری ہونے کے بعد اس پر فوری طور پر عمل شروع ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ترک فوجیوں نے ادرنہ میں رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے مال و متاع کو ہاتھ لگانے تک سے انکار کر دیا۔ اور یوں مسلمان اپنی شدید ضرورتوں کے باوجود اس حکم خداوندی کی پیروی پر مجبور ہو گئے۔ جو مفتی شہر کی وساطت سے ان تک پہنچا تھا۔

غلام قادر رہیلہ

رہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا — نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے
دیا اہل حرم کو رقص کا فرماں ستمگر نے — یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثار محشر سے
بھلا تعمیل اس فرمان غیرت کش کی ممکن تھی — شہنشاہی حرم کی نازنینان سمن بر سے
بنایا آہ! سامان طرب بیدرد نے ان کو — نہاں تھا حسن جن کا چشم مہر و ماہ و اختر سے
لرزتے تھے دل نازک، قدم مجبور جنبش تھے — رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے
یونہیں کچھ دیر تک محو نظر آنکھیں رہیں اس کی — کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بار مغفر سے
کمر سے اٹھ کے تیغ جانستاں آتش فشاں کھولی — سبق آموز تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے
رکھا خنجر کو آگے، اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا — تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشم احمر سے
بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں کے — نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے
پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے — شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا　　کہ غفلت دور ہے شان صف آرایان لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی　　مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

✽

غلام قادر رہیلہ، رہیل کھنڈ کے سردار ضابطہ خاں کا بیٹا اور نجیب الدولہ کا پوتا تھا۔ تاریخی اعتبار سے نجیب الدولہ ان مسلم سرداروں میں سے ایک تھا جنہوں نے مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں نے جو ہزیمت اٹھائی جس کا بدلہ انہوں نے نجیب الدولہ کے انتقال کے فوراً بعد لیا۔ بدقسمتی سے روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہونے اور یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے عمل میں مغلیہ تاجدار شاہ عالم ثانی کی فوجیں بھی مرہٹوں کے ساتھ شامل تھیں۔ غلام قادر رہیلہ اس وقت چھوٹا سا تھا جب جوان ہوا تو اس نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم ثانی کی انتقاماً آنکھیں نکال لیں۔ بعد میں وہ مرہٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

① سے ⑧ **معنی:** رہیلہ: غلام قادر۔ شاہ تیموری: شاہ عالم ثانی۔ سمن بر: چنبیلی جیسے جسم والی۔ بار مغفر: خود، لڑائی میں سر پر پہننے کی فولادی ٹوپی۔ چشم احمر: سرخ آنکھ۔

مطلب: چنانچہ اس تاریخی پس منظر کے حوالے سے زیر تشریح نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ غلام قادر رہیلہ اس قدر ظالم، ستم شعار اور جفاجو تھا کہ مغل تاجدار شاہ عالم ثانی کی آنکھیں انتقاماً خنجر سے نکال لیں۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں اس نے شاہی خاندان کی خواتین کو اپنے روبرو رقص کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم ظاہر ہے کہ انتہائی ظالمانہ اور محشر خیز تھا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس نے یہ سب کچھ انتقاماً کیا اور شاہی خاندان کی ان خواتین کی بے حرمتی کی جن کو سب عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ اور جو کبھی کسی نامحرم کے سامنے بھی نہ آئی تھیں۔ اس ظالم نے اپنی انا کی تسکین کے لیے ان خواتین کو رقص پر مجبور کیا جن کا آنچل تک چشم فلک نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس عمل کے دوران شہزادیوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور شرم و حیا کی شدت سے جسم لرز رہے تھے۔ غلام قادر رہیلہ کچھ دیر تک تو یہ منظر دیکھتا رہا پھر اس کے بعد اس نے گھبرا کر سر سے اپنا خود اتار لیا۔ اور پھر کمر سے تلوار بھی کھول لی۔ اس کے بعد اس نے خنجر کو کچھ سوچتے ہوئے اپنے سامنے قالین پر رکھ لیا۔ اور بظاہر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے کہ اسے غنودگی نے بری طرح سے گھیر لیا ہو۔

⑨ سے (13) **معنی:** اخگر: شعلہ۔ حمیت: غیرت۔

مطلب: یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قدر ظالم اور سنگدل ہونے کے باوجود غلام قادر رہیلہ داخلی طور پر انتہائی شرمسار تھا۔ اس کے بعد وہ تھوڑی دیر تک اسی عالم میں آنکھیں بند کیے ہوئے پڑا رہا لیکن کب تک۔ آخرکار وہ اپنا سر جھٹک کر اس طرح اٹھ بیٹھا جیسے نیند سے بیدار ہو۔

چند لمحے بعد وہ شاہی محل کی خواتین کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ تمہیں اپنے مقدر کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ میں جس انداز میں مسند پر بظاہر محو خواب تھا یہ تو ایک بناوٹ تھی اور دکھاوے کی نیند تھی۔ اس

لیے کہ جنگ جو سرداران لشکر کبھی اس طرح سے غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ میں تو محض یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم تیمور کی بیٹیوں میں کوئی حوصلہ مند ایسی بھی ہو جو مجھے غفلت کے عالم میں موت کے گھاٹ اتار دے مگریوں لگتا ہے کہ جس چیز کا غیرت و حمیت نام تھا وہ تیمور کے خاندان سے رخصت ہو گئی۔

ایک مکالمہ

اک مرغِ سرا نے یہ کہا مرغِ ہوا سے پردار اگر تو ہے، تو کیا میں نہیں پردار
گر تو ہے ہوا گیر، تو ہوں میں بھی ہوا گیر آزاد اگر تو ہے، نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیت ہر صاحبِ پر ہے کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائلِ پندار
مجروح حمیت جو ہوئی مرغِ ہوا کی یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتارِ دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی حد ہے تری پرواز کی لیکن سرِ دیوار
واقف نہیں تو ہمتِ مرغانِ ہوا سے تو خاک نشیمن، انھیں گردوں سے سروکار
تو مرغِ سرائی، خورش از خاک بجوئی
ما در صددِ دانہ بانجم زدہ منقار

*

ہر دانشور کا طرزِ عمل بالعموم یہی ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے نتائج اخذ کرے چنانچہ اقبال کی بے شمار نظمیں اسی طرزِ عمل کی آئینہ دار ہیں۔ وہ معمولی کرداروں اور چھوٹی چھوٹی اشیا کی فطرت اور کارکردگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں پھر ان کا تجزیہ کرکے اظہار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ زیرِ تشریح نظم میں بھی کم و بیش ایک جیسے دو پرندوں کی فطرت اور کردار کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کا مطالعہ و مشاہدہ اس "مکالمہ" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

① **معنی:** **مرغِ سرا:** گھریلو پرندہ۔ **مرغِ ہوا:** فضا میں اڑنے والا پرندہ۔ **مائلِ پندار:** مغرور۔ **مجروح:** زخمی۔ **حمیت:** غیرت۔ **خورش:** خوراک۔ **ما در صددِ دانہ بانجم زدہ منقار:** ہم ستاروں کو دانہ سمجھ کر چونچ مارتے ہیں۔

مطلب: ایک گھر میں پلنے والے پرندے نے اڑنے والے پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی مرتبے میں تجھ سے کم تر نہیں ہوں۔ اس لیے کہ اگر تو پر رکھتا ہے تو میرے جسم میں بھی پر موجود ہیں۔ اگر تو ہوا میں اڑ سکتا ہے تو کیا میں پرواز کا اہل نہیں ہوں۔ جب کہ پرواز تو ہر پرندے کی فطرت میں شامل ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جو پرندے فضاء میں اڑنے والے ہیں وہ اتنے مغرور کس لیے ہیں۔
گھریلو پرندے کی ان باتوں سے فضا میں اڑنے والے پرندے کے دل کو ٹھیس پہنچی تو وہ یوں گویا ہوا بے شک تو بھی پرواز کے عمل میں آزاد ہے لیکن تیری رسائی زیادہ سے دیوار تک ہے۔ دراصل تو فضاء میں اڑنے والے پرندوں کی ہمت و حوصلے سے آگاہ نہیں۔ تو نے تو زمین پر بسیرا کر رکھا ہے جب کہ میں آسمان تک کی خبر لاتا ہوں۔ تو اپنی خوراک مٹی سے حاصل کرتا ہے جب میں تو ستارہ تک کو دانہ سمجھ کر اپنی خوراک کے لیے نشانہ بنا سکتا ہوں۔

میں اور تو

مذاقِ دید سے نا آشنا نظر ہے مری
تری نگاہ ہے فطرت کی رازداں' پھر کیا؟

رہینِ شکوۂ ایام ہے زباں مری
تری مراد پہ ہے دورِ آسماں' پھر کیا؟

رکھا مجھے چمن آوارہ مثلِ موجِ نسیم
عطا فلک نے کیا تجھکو آشیاں' پھر کیا؟

فزوں ہے سود سے سرمایۂ حیات ترا
مرے نصیب میں ہے کاوشِ زیاں' پھر کیا؟

ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیارے
مرا جہاز ہے محرومِ بادباں' پھر کیا؟

قوی شدیم' چہ شد؟ ناتواں شدیم' چہ شد؟
چنیں شدیم' چہ شد؟ یا چناں شدیم' چہ شد؟

بہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست
تو گر بہار شدی' ماخزاں شدیم' چہ شد؟

یہ نظم عملاً ایک عجیب و غریب کیفیت کی حامل ہے۔ معنوی سطح پر اس کے کرداروں میں اگرچہ "میں" مشترک ہے کہ اس کا تعلق ایک عام فرد سے ہے لیکن "تو" کو کم از کم دوہرے کردار کے منظرنامے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا "تو" ایک آسودہ حال سرمایہ دار ہو سکتا ہے جو استحصال پسندی کا قائل ہے۔ دوسرا کردار مغربی استعمار پرستوں پر مشتمل ہے۔ اقبال نے دوسرے کردار کو واضح طور پر پینٹ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو۔ بہرحال وہ فرماتے ہیں۔

① سے ⑦ **معنی: مذاقِ دید:** دیکھنے کی لذت۔ **رہینِ شکوۂ ایام:** زمانے کی شکایت۔ **فزوں:** زیادہ۔ **کاوشِ زیاں:** نقصان کی تکلیف۔ **قوی شدیم' چہ شد:** ہم طاقتور ہوئے تو کیا؟ **گلستاں:** مراد ہے دنیا۔ **قرارے نیست:** قیام ممکن نہیں۔

مطلب: میری آنکھیں تو کسی شے کو اس کے حقیقی منظرنامے میں دیکھنے کا ذوق بھی نہیں رکھتیں جب کہ تیری نگاہ تو فطرت کی رازداں ٹھہرتی ہے مگر اس سے کچھ بھی تو فرق نہیں پڑتا۔ ادھر میری زبان تو ہر لمحے زمانے کے شکوے کرتی رہتی ہے جب کہ آسمان تیری مرضی کے مطابق گردش کرتا رہتا ہے لیکن اس سے بھی کیا ہوا مجھے تو موجِ نسیم کی طرح آوارہ و سرگرداں رکھا گیا ہے اور تجھ کو بود و باش کے لیے قدرت نے گھر عطا کیا ہوا ہے تو اس سے کیا؟ اگر تیری تقدیر میں فائدے ہی فائدے ہیں اور میرے نصیب میں نقصان ہی نقصان تو بھی اس سے کوئی فرق پڑنے کا امکان نہیں۔

اگر تیرے جہاز فضا میں پرواز کرتے رہتے ہیں اور میری کشتی کو بادباں بھی میسر نہیں تو کیا ہوا؟ اگر تو طاقتور ہے تو کیا اور میں کمزور ہوں تو پھر کیا ہوا؟ اس طرح ہو گیا تو کیا؟ اور اس طرح ہو گیا تو کیا ہوا؟ اس کائنات میں کسی طور پر بھی آرام و سکون میسر نہیں ہے۔ اگر تو بہار ہے اور میں خزاں ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ بالآخر انجام دونوں کا یکساں ہے۔

تضمین بر شعر ابوطالب کلیم

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثربؐ کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں

وہ نشان سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح — ہو گئی ہے اس سے اب ناآشنا تیری جبیں
دیکھ تو اپنا عمل تجھکو نظر آتی ہے کیا — وہ صداقت جس کی بیباکی تھی حیرت آفریں
تیرے آبا کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے — ہے وہی باطل ترے کاشانہ دل میں مکیں
غافل! اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر — نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں

"سرکشی باہر کہ کردی رام او باید شدن
شعلہ ساں ازہر کجا برخاستی آنجانشیں"

*

ابو طالب کلیم وہ ہمہ جہت فارسی شاعر ہے جسے ایک بار خوش ہو کر شاہجہاں نے چاندی میں تلوایا تھا۔ پیدا ہمدان میں ہوا۔ جہانگیر کے دور میں ہندوستان آیا اور یہیں آباد ہو گیا۔ بعد میں کشمیر میں مستقل بودوباش اختیار کرلی اور وہیں پر وفات پائی۔ اقبال نے اس کے شعر پر تضمین کی۔ ملاحظہ ہو:

① سے ⑦ **معنی**: صاحب یثربؐ: مراد ہے رسول کریم ﷺ۔ حلقہ خاتم: انگوٹھی۔ نگیں: نگینہ۔ حیرت آفریں: حیرت کا باعث۔

مطلب: اے مسلمان تجھ کو آنحضرت ﷺ کے اصولوں اور سنت کا اچھا پاس ہے؟ تیرا عمل ہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تو توفی الواقعہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ تیری غفلت کے سبب وہ نگینہ تلف ہو گیا جس کے باعث تقدیر خود تیری گرفت میں تھی۔ تیری پیشانی پر سجدوں کے وہ نشان جو ہمیشہ ستاروں کی مانند روشن رہتے تھے اب تو ان سجدوں سے ہی تیری پیشانی محروم ہو چکی ہے۔

اے آسمان! ذرا تو اب اپنے اعمال کا جائزہ لے کہ کیا تجھے اب اپنی زندگی میں وہ صداقت نظر آتی ہے جس کی بے خوفی ایک زمانے میں دنیا بھر کو حیران کر دیتی تھی۔ تیرے اسلاف کی نظر جو کبھی باطل اور جھوٹ کے لیے برق کی حیثیت رکھتی اب وہی باطل اور جھوٹ خود تیرے دل میں اپنے پنجے پیوست کیے بیٹھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اب تو عملاً ایسی زندگی گزار رہا ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ اے غفلت شعار! تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ اپنے قدیم طور طریقوں پر عمل کر۔ غور کر کہ حقیقت کو پرکھنے والا ابو طالب کلیم کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کہتا ہے تو نے جس سے بغاوت کی اب پھر اس کی اطاعت قبول کر لے۔ تو جس مقام سے شعلے کی طرح بلند ہوا تھا پھر اسی پر مرتکز ہو جا۔

شبلی و حالی

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا — دیوان جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد
تیرے سرود رفتہ کے نغمے علوم نو — تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد
پتھر ہے اس کے واسطے موج نسیم بھی — نازک بہت ہے آئنہ آبروئے مرد
مردان کار ڈھونڈ کے اسباب حادثات — کرتے ہیں چارۂ ستم چرخ لاجورد
پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ رازدار — کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد
مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا — غماز ہو گئی غم پنہاں کی آہ سرد

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیت خزاں اوراق ہو گئے شجر زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
"اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟"

*

1914ء اس لیے تاریخ میں بے حد اہمیت کا سال گردانا جاتا ہے کہ اسی سال جنگ عظیم ہوئی اور اس حوالے سے مسلمانوں کے لیے یہ سال خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ برصغیر کے دو عظیم مسلم دانشور اور رہنما مولانا شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی علی الترتیب نومبر 14ء اور دسمبر 14ء میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ اقبال کو ان زعماء کی وفات سے جو گہرا رنج پہنچا اس کا اظہار انہوں نے اس نظم میں اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

① **معنی:** فرد: یگانہ۔ موج نسیم: ہوا کی لہر۔ چرخ لاجورد: نیلے رنگ کا آسمان۔ ہم نبرد: لڑنے والا۔ سوئے فردوس رہ نورد: بہشت کی طرف راہ لی۔

مطلب: ایک روز اقبال نے مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس کائنات میں تیرا وجود یقیناً بڑی انفرادیت کا حامل ہے۔ جو آج نئے مروجہ علوم ہیں وہ تیرے شاندار ماضی کے پیدا کردہ ہیں اور جو آج کی تہذیب ہے یہ بھی تیرے ماضی کی تہذیب کا چربہ ہے۔ یہ تہذیب ایک ایسے نازک اور لطیف آئینے کی مانند ہے کہ موج نسیم بھی اس کے لیے ایک پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی انسان اپنی عزت و آبرو کے حوالے سے ایک نازک آئینے کے مانند ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ہی ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

اے مسلم یاد رکھ! کہ جب لوگوں میں قوت عمل ہوتی ہے وہ نیلے آسمان کے ظلم و ستم کا تدارک کر لیتے ہیں اور حادثوں کے اسباب بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ جو لوگ امت مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ سے آگاہی رکھتے ہیں تو ان سے جملہ مسائل کے بارے میں استفسار کر سکتا ہے جس سے تجھے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ تیرے گلستان میں خزاں کیونکر وارد ہوئی یعنی امت مسلمہ زوال پذیر کس طرح سے ہوئی۔

سو میری بات سن کر وہ مسلمان مضطرب ہو گیا اور ایک سرد آہ نے اس کے سینے میں پوشیدہ غم کو ظاہر کر دیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ اے اقبال تو نے جو امت کے زوال کا ذکر کیا ہے تو وہ کیفیت بھی دیکھ لے جس سے مسلمان دوچار ہیں۔ زندگی کو اگر ایک درخت سے تعبیر کر لیا جائے تو یہ بھی دیکھ لے کہ اس درخت کے پتے مرجھا کر سوکھ چکے ہیں۔

اے اقبال! وہ لوگ جو ملت اسلامیہ کے بہی خواہ اور رازدار تھے اور جن کی پرسوز اور درد بھری آواز ہمارے دلوں کو متاثر کرتی تھی اور پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر گئے۔ شبلی کی وفات نے ہمارے دلوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ابھی ہم اس المیے پر آنسو بہا رہے تھے کہ مولانا حالی بھی اس دنیا سے کوچ کر کے جنت کو سدھار گئے۔

اب یہ جراءت و حوصلہ کس میں ہے کہ باغباں سے استفسار کرے کہ بلبل نے کیا کہا' گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا عمل کیا؟

ارتقا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز سرشت اس کی ہے مشکل کشی' جفا طلبی
سکوت شام سے تا نغمہ سحرگاہی ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی
کشا کش زم و گرما' تپ و تراش و خراش زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشہ حلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی
"مغاں کہ دانہ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

*

① سے ⑦ **معنی: ستیزہ کار**: لڑائی کرنے والا۔ **شرار بولہبی**: ابولہب کا شرر۔ حضرت محمد ﷺ کے چچا کی کنیت۔ **غیور**: غیرت مند۔ **زخاک تیرہ دروں**: ایسی مٹی جس میں جلا نہیں۔ **قطرۂ نیسان**: موسم بہار کی بارش کا قطرہ۔ **آتش عنبی**: انگور کی شراب۔

مطلب: زیر تشریح نظم میں اقبال نے اسلام کے حوالے سے مسئلہ ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے کفر باطل اور حق و صداقت کے مابین آویزش جاری ہے اور کفر اسلام کے خلاف ہمیشہ سے معرکہ آرا رہا ہے۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ زندگی اپنے مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ شعلہ مزاج' غیور اور ہنگامہ خیز رہی ہے۔ اس کی سرشت میں مشکلات اور دشواریاں جھیلتا رہا ہے یعنی آرام و سکون زندگی کی فطرت سے ربط نہیں رکھتے۔ شام کے سکوت سے لے کر طلوع سحر تک رات بظاہر خاموشی سے گزرتی ہے لیکن اس کی خاموشی میں ہزارہا نالے اور آہیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حلب میں تاریک مٹی سے بڑا نفیس اور خوبصورت آئینہ تیار ہوتا ہے لیکن مٹی کو آئینے تک پہنچنے کے لیے ہزارہا مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

موسم بہار میں برسنے والی بارش کے ایک قطرے اور شراب انگور کے مابین بظاہر کوئی فرق نہیں لیکن بارش کا یہ قطرہ انگور کی کاشت اس کے بعد کشیدگی کے عمل اور شراب کی تیاری تک نہ جانے کتنا سفر طے کرتا ہے۔ زندگی میں اسی مسلسل جدوجہد اور کشاکش پیہم کے سبب ہی قومیں زندہ رہتی ہیں اور ملت اسلامیہ کو جو عروج حاصل ہوا اس کا راز بھی یہی ہے۔

شراب بنانے والے بظاہر انگور کو پانی بناتے ہیں جب کہ عملاً وہ ستارے توڑ کر ان سے سورج بناتے ہیں۔

صدیق رضی اللہ عنہ

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے، فرطِ طرب سے عمرؓ اٹھے
اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امیںؐ کے پاس
ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضور سرورِ عالم نے اے عمرؓ
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار
کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوتؐ بھی آ گیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپِ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضورؐ، چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

*

پہلا بند معنی: اصحابؓ: صحابہؓ۔ راہوار: گھوڑا۔ دست نگر: محتاج۔

مطلب: یہ نظم عملاً دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں اقبال اس طرح سے آغاز کرتے ہیں کہ ایک روز آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب اور رفقا سے فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ دولت مند ہوں وہ اپنا مال راہ حق میں عطیہ کے طور پر دیں۔ آنحضرتؐ کی زبان سے یہ الفاظ برآمد ہوئے تو حضرت عمرؓ مسرت و انبساط کے عالم میں جھوم اٹھے۔ اس روز ان کے پاس کئی ہزار درہم موجود تھے۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ آج میں یقیناً حضرت ابوبکرؓ سے بازی لے جاؤں گا۔ چنانچہ وہ اپنی رقم لے کر آنحضرتؐ کے پاس آئے اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دی۔

آنحضرتؐ نے استفسار کیا کہ اے عمرؓ! واقعی تیرا دل جوش حق سے مضطرب ہے۔ لیکن یہ تو بتا کہ اس مال میں سے اپنے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ رکھا ہے یا نہیں؟ کہ مسلمان پر یہ بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے اہل و عیال اور دیگر اعزہ کا خیال رکھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں نے اپنی رقم میں سے نصف اپنے اہل خانہ کے لیے مخصوص کر دی ہے اور باقی ملت مسلمہ پر نثار کر رہا ہوں۔

دوسرا بند معنی: ملک یمین: مراد ہے لونڈی غلام۔ اسپ قمر سم: چاند جیسے سم والے گھوڑے۔ قاطر: خچر۔ حمار: گدھا۔ فروغ گیر: روشنی حاصل کرنے والے۔ تکوین: بنانا، پیدا کرنا۔

مطلب: ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بھی آ گئے اور ساتھ وہ سارا مال و متاع لے آئے جو

ان کے پاس موجود تھا۔ اس میں نہ صرف درہم ہی تھے بلکہ دوسرا ساز و سامان حتیٰ کہ سواری کا گھوڑا' اونٹ اور تلوار تک شامل تھی۔ حضورؐ نے ان سے بھی ارشاد فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی فکر بھی کرنی چاہیے۔ اس مرحلے پر حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی کہ حضورؐ کی ذات والا صفات سے ستارے اور چاند درخشندہ و تابندہ ہیں اور حضورؐ کی ذات ہی کائنات کی تزئین و آرائش کا باعث ہے۔

چنانچہ جس طرح پروانے کو چراغ اور بلبل کے لیے پھول کا وجود کافی ہوتا ہے اسی طرح میرے لیے خدا کا رسولؐ ہی کافی ہے یعنی میں آپ کی ذات گرامی قدر سے زیادہ اپنے عزیز و اقربا اور اہل و عیال کو بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوں۔

تہذیب حاضر

تضمین بر شعر فیضی

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں ۔۔۔ بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
کیا ذرہ کو جگنو' دے کے تاب مستعار اس نے ۔۔۔ کوئی دیکھے تو شوخی آفتاب جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے ۔۔۔ یہ رعنائی' یہ بیداری' یہ آزادی' یہ بے باکی
تغیر آ گیا ایسا تدبر میں' تخیل میں ۔۔۔ ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کیا گم تازہ پروانوں نے اپنا آشیاں لیکن ۔۔۔ مناظر دل کشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا ۔۔۔ رقابت' خود فروشی' ناشکیبائی' ہوسناکی
فروغ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی ۔۔۔ مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

"تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری"

*

① سے ③ معنی: بادۂ تہذیب حاضر: موجودہ تہذیب کی شراب۔ بھبوکا بن کے: شعلہ بن کر۔ تاب مستعار: عارضی چمک۔ بے باکی: مراد ہے گستاخی۔

مطلب: عالمی سطح پر جو تہذیب رائج ہے وہ مغرب کی وضع کردہ ہے۔ اس تہذیب میں اتنی حرارت اور حدت ہے جس نے ملت اسلامیہ کو بھی بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔ مراد یہ ہے مسلمانوں کی اپنی زندہ تہذیب اور مستحکم روایت کے باوجود یورپی تہذیب اس قدر بھرپور انداز میں عام ہو چکی ہے کہ مسلم تہذیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی دیکھیے کہ یورپی تہذیب کو ایسی روشنی عطا کی ہے جس کے ذریعے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک ذرے کو جگنو کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوانوں نے وہی رعنائی' بیداری' آزادی اور بے خوفی کے انداز اپنا لیے جو مغرب کی تہذیب سے عبارت ہیں۔

④ سے ⑤ معنی: ساحر: جادوگر۔

مطلب: اقبال آئندہ چل کر اس نظم میں کہتے ہیں کہ انسانی تدابیر اور تخیل میں اس نوع کی تبدیلی واقع ہو گئی ہے کہ خلوص کے ساتھ انجام دیئے ہوئے کارناموں کو بھی اب مذاق سے تعبیر کیا جانے لگا ہے اور ہر نوع کی قربانی کو محض دکھاوے کا نام دیا جا رہا ہے۔ لیکن تہذیب حاضر کے نوجوانوں پر اثرات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ ماضی کی مستحکم روایات اور اسلام کے وضع کردہ بلند ترین اصول فراموش کر چکے ہیں اور اس راہ سے بھٹک کر اب تباہی کے غار میں گر رہے ہیں۔

⑥ سے ⑧ معنی: کہنہ ادراکی: پختہ سمجھ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب سے مغربی تہذیب مشرق پر اثرانداز ہوئی تو اس کے منفی اثرات رقابت، خود فروشی، بے صبری اور حرص و ہوس کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔ یعنی مسلم نوجوان نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے حسد کرنے لگے ہیں بلکہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے اپنے آپ کو غیروں کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ وہ اس قدر بے صبرے اور ناشکرے بن چکے ہیں کہ لالچ اور حرص و ہوا نے ان کی تمام تر اچھی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ بظاہر اس نئی تہذیب سے مسلمان استفادہ کر کے دوسری قوموں کی برادری میں شامل ہو رہے ہیں لیکن میری ماضی پرست فطرت اس امر کی نشاندہی کر رہی ہے کہ دوسروں سے مستعار لی ہوئی روشنی سے کسی حد تک استفادہ تو ممکن ہے تاہم انفرادیت خود اپنے اصولوں کی حدت میں ہے۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے — پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں — انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں — سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں
نغمۂ بلبل ہو یا آواز خاموش ضمیر
ہے اسی زنجیر عالمگیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں — خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں
قلب انسانی میں رقص عیش و غم رہتا نہیں — نغمہ رہ جاتا ہے، لطف زیر و بم رہتا نہیں
علم و حکمت رہزن سامان اشک و آہ ہے — یعنی اک الماس کا ٹکڑا دل آگاہ ہے
گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں — آنکھ میری مایہ دار اشک عنابی نہیں
جانتا ہوں آہ! میں آلام انسانی کا راز — ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز
میرے لب پر قصۂ نیرنگی دوراں نہیں — دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں
پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ یہ تردید میری حکمت محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیاد جاں پایندہ ہے — درد کے عرفاں سے عقل سنگدل شرمندہ ہے

موج دود آہ سے آئینہ ہے روشن مرا ۔ گنج آب آورد سے معمور ہے دامن مرا
حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا ۔ رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا ۔ عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں ۔ بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخی گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور ۔ دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم ۔ صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ، میرا انتظار؟ ۔ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا ۔ اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا ۔ گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات ۔ تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی ۔ میں تری خدمت کے قابل جب ہوا، تو چل بسی
وہ جواں، قامت میں ہے جو صورت سرو بلند ۔ تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا ۔ وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثل طفلک بے دست و پا روتا ہے وہ ۔ صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ
تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانہ برنا و پیر ۔ آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت ۔ گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں ۔ کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں
کلبہ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت ۔ دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں ۔ ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجال شکوہ ہے، نے طاقت گفتار ہے ۔ زندگانی کیا ہے، اک طوق گلو افشار ہے
قافلے میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں
اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی ۔ ہیں پس نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی
سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا؟ ۔ نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا؟
جھاڑیاں، جن کے قفس میں قید ہے آہ خزاں ۔ سبز کر دے گی انہیں باد بہار جاوداں

خفتہ خاک پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا؟
عارضی محمل ہے یہ مشت غبار اپنا تو کیا؟

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ! غافل! موت کا راز نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تعمیر پر؟
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوت تعمیر پر

فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ! سیماب پریشاں، انجم گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں، ممنون شب ہے جن کا سوز

عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشت نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے

پھر یہ انساں، آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر

جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے

جس کی نادانی صداقت کے لیے بیتاب ہے
جس کا ناخن ساز ہستی کے لیے مضراب ہے

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے

سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردن گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہل جہاں درد اجل ہے لادوا
زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا

دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے

وقت کے افسوں سے تھمتا نالہ ماتم نہیں
وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

سر پہ آ جاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں — اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے — خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے
آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے — اس کی فطرت میں یہ اک احساسِ نامعلوم ہے
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں
رختِ ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے — سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے
آہ! یہ ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلاسائی فراموشی نہیں

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح — داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ — بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے — سیکڑوں نغموں سے بادِ صبحدم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار — ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟

دامِ سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر — کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر
یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے — جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات — جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے — آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے
ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے — سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے
نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں — تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر — خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

*

عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ نظم علامہ اقبال نے اپنی والدہ امام بی بی کی وفات پر لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کی حیثیت اگرچہ ایک مرثیے کی سی ہے تاہم اس میں جابجا انہوں نے اپنے نظریات اور فلسفے کے حوالے سے اہم اشارے کیے ہیں۔ ہرچند کو امام بی بی پڑھی لکھی نہیں تھیں اس کے باوجود علامہ اقبال کی تربیت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ زیر تشریح نظم تیرہ بند اور چھیاسی اشعار پر مشتمل ہے اور یہ علامہ کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔

پہلا بند معنی: دہر: دنیا۔ زندانی تقدیر: تقدیر کا قیدی۔ انجم سیماب پا: پارے کے قدم رکھنے والے ستارے۔ شکست انجام: جس کا انجام شکست ہو۔ آواز خاموش ضمیر: ضمیر کی خاموش آواز۔

مطلب: نظم کا آغاز کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ہر ایک ذرہ عملاً تقدیر کے زنداں میں

قید ہے۔ یعنی ہر لمحے دنیا بھر میں وہی کچھ ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اور جس چیز کو ہم تدبیر کا نام دیتے ہیں وہ فی الواقع اپنی مجبوری اور بے بسی پر پردہ ڈالنے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان بھی مجبور ہے اور سورج کے علاوہ چاند بھی مجبور ہے۔ ان کے علاوہ ستارے جو انتہائی تیز رفتار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اپنی رفتار کی حد تک مجبور واقع ہوئے ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ہر لمحے سفر میں ہی رہیں۔ باغ میں موجود غنچے کا انجام چٹک کر پھول کی وضع اختیار کر لینے میں ہی ہے۔ اسی طرح سبزہ ہو یا پھول یہ سب اس امر پر مجبور ہیں کہ نمو پائیں اور پھلیں پھولیں۔ خواہ بلبل کا نغمہ ہو یا ضمیر کی خاموش آواز۔ یہ سب چیزیں کائنات پر محیط اسی تقدیر کی زنجیر میں قید ہیں۔

دوسرا بند **معنی:** سر مجبوری: مجبوری کا راز۔ زیر و بم: اتار چڑھاؤ۔ **الماس کا ٹکڑا:** ہیرے کا ٹکڑا۔ **اشک عنابی:** خونیں آنسو۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب ہماری آنکھ پر ان مجبوریوں کا راز منکشف ہوتا ہے تو دل سے برآمد ہونے والا آنسوؤں کا سیلاب خود بخود ہی خشک ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایسی صورت میں ان مجبوریوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ بریں وجہ قلب انسانی میں مسرت اور غم کا احساس باقی نہیں رہتا۔ یوں زندگی کا نغمہ تو برقرار رہتا ہے لیکن اس کے سروں کے اتار چڑھاؤ کا لطف باقی نہیں رہتا۔ مراد یہ ہے کہ انسان پر بے حسی اور بے کیفی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ مختلف جذبوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے۔

مختلف اشیاء کے بارے میں معرفت اور دانائی فی الواقع آنسوؤں اور آہوں کے اثاثے کے لیے لوٹ مار مچانے والے ڈاکو ثابت ہوتے ہیں اور ہر نوع کے اسرار و رموز سے آگاہی رکھنے والا دل بالآخر الماس کا ایک ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر چند کہ میرا باغ اس قدر ویران ہو چکا ہے کہ اس میں شبنم کی تازگی تک باقی نہیں رہی۔ یہی نہیں بلکہ میری آنکھوں میں وہ آنسو بھی موجود نہیں جو کبھی خون برسایا کرتے تھے۔ اور جن آنسوؤں کی رنگت عنابی یعنی سرخ ہوا کرتی تھی۔

دراصل میں انسان کے غم و اندوہ کے راز سے پوری طرح سے آگاہ ہوں اسی لیے میں شکوہ شکایت کی جانب مائل نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ میں گردش زمانہ کا گلہ بھی نہیں کرتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ اقبال کے بقول میرے لبوں پر تغیرات زمانہ اور تبدیلیوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل حسب واقعات' حیراں بھی نہیں ہے تاہم نہ خوشی کے موقع پر ہنستا ہوں نہ غم کے موقعہ پر آنسو بہاتا ہوں۔

لیکن اے ماں! جب بھی تیری تصویر کی جانب نظر ڈالتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے مسلسل رونے اور اشک بہانے پر مجبور کرتی ہے۔ افسوس کہ یہ عمل میری حکمت و دانائی کو بھی رد کرتا ہے اور اسے غیر مستحکم بھی بناتا ہے۔

تیسرا بند **معنی:** موج دود آہ: آہ کے دھوئیں کی موج۔ **گنج آب آورد:** پانی کا لایا ہوا خزانہ' آنسوؤں کی حالت۔ **عہد طفلی:** بچپن کا زمانہ۔ بے بہا: قیمتی۔

مطلب: یہاں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے ماں! میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ مسلسل رونے سے زندگی کی بنیاد زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتی ہے۔ درد کے عرفان سے بے شک عقل کتنی بھی سنگدل ہو شرمسار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مراد یہ کہ تکلیف و درد میں جو عرفان پوشیدہ ہے عقل کی اس تک

رسائی ممکن نہیں ہے۔ اے ماں! تیرے غم میں جو آہیں بھرتا ہوں ان کے سبب میرا آئینہ دل مزید صاف و شفاف ہو جاتا ہے۔ اور تیرے غم میں بہنے والے آنسوؤں سے میرا دامن تر ہو جاتا ہے۔

اے ماں! یہ اعجاز تیری تصویر کا ہی ہے جس نے وقت کی پرواز کا رخ بدل ڈالا ہے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس تصویر نے میرے حال و ماضی کو یکجا کر دیا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نے ایک بار پھر مجھے اپنے بچپن سے آشنا کر دیا ہے۔ بے شک مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے۔ جب میرا کمزور جسم تیرے سایہ عاطفت میں پرورش پا رہا تھا اور میں نے ابھی اچھی طرح بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔

جب کہ آج ہر جگہ میری شوخیٔ گفتار یعنی شاعری کے چرچے ہو رہے ہیں اور میری آنکھوں سے بہنے والے آنسو موتی تصور کیے جاتے ہیں۔

چوتھا بند **معنی**: **اوج گاہوں**: بلندیوں۔ **خندہ زن**: ہنسنا۔

مطلب: علم کے حصول اور اس کے بعد سنجیدگی سے گفتگو کرنے کا عمل، اپنی ضعیفی اور عمر کے باعث حاصل ہونے والی دانائی اور حکمت، زندگی میں ملنے والے مراتب اور منصب، اس کے ساتھ جوانی کی عمر کا غرور اور ولولہ۔ بے شک عرف عام میں انہیں انسانی بلندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ ماں کے سامنے ہوتا ہے تو پھر ان تمام بلندیوں سے نیچے اتر آتا ہے اور محض ایک معصوم بچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ماں کے روبرو تو بڑے سے بڑے شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ماں کی محبت میں تو بڑے بڑے لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ سب تکلفات بالائے طاق رکھ کر بلند آہنگ قہقہے لگاتے ہیں اور ہر نوع کے تفکرات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ماں کے سامنے وہ خود کو ماضی کی کھوئی ہوئی دنیا میں محسوس کرتے ہیں جو ایک طرح سے جنت گم گشتہ کی مانند تھی۔

پانچواں بند **معنی**: **دعائے نیم شب**: آدھی رات کی دعا۔ **سرو بلند**: سرو کا اونچا درخت۔ **بہرہ مند**: خوش نصیب۔ **طفلک بے دست و پا**: بے بس بچہ کی مانند۔ **صبح و مسا**: صبح و شام۔ **کشت جاں**: روح کی کھیتی۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ والدہ کے انتقال کے بعد اب وطن میں میرا اور میرے خط کا انتظار کون کرے گا۔ واضح رہے کہ ان دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے وہ کہتے ہیں کہ جب میری وطن واپسی ہو گی تو اے ماں! تیری قبر پر یہ فریاد لے کر آؤں گا کہ نصف شب کے وقت میری بہبودی کے لیے تو جو دعائیں کرتی تھی اب کون کرے گا؟

اے ماں! یہ تیری تربیت اور پرورش کا نتیجہ ہی تھا کہ آج مجھے یہ عزت و وقار حاصل ہوا ہے اور ساری دنیا کی نظروں میں ہمارے خاندان کے احترام میں اضافہ ہوا ہے۔ اس صحیفہ کائنات میں تیری زندگی ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور عملاً تیری زندگی دین و دنیا کے حوالے سے ایک سبق کی مانند تھی۔ ساری عمر تو میری محبت و شفقت سے سرشار میری تربیت میں کوشاں رہی لیکن جب میں تیری خدمت کے قابل ہوا تو کس قدر دکھ کی بات ہے کہ تو داغ مفارقت دے گئی۔

ان اشعار میں اقبال اپنے بڑے بھائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بلند قد جواں سال، خوبصورت اور خوب سیرت شخص جو میرا بھائی اور تیرا بیٹا ہے وہ یہاں موجود رہ کر تیری خدمت میں سرگرداں رہا۔ اور میری نسبت تیری زیادہ دیکھ بھال کرتا رہا۔ یہ شخص جو میرا عزیز بھائی ہے اور شریک کار

ہے وہ میرے لیے عملاً تیری محبت کا بدل ہے۔ وہ میرے لیے قوت بازو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اب یقیناً تیری موت پر بچوں کی طرح روتا ہو گا۔ اسے صبر کس طرح آئے گا۔ ظاہر ہے کہ صبح شام گریہ اس کا کام ہو گا۔ میں تو یہاں یورپ میں مقیم تیری یاد میں غم گسار ہوں۔ میرے لیے یہ کرب ناقابل برداشت ہے جب کہ میرا بھائی تو تیرے موت کے حادثے کو اپنی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

لیکن اے ماں! تو نے ہم بھائیوں کے دلوں میں محبت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اب تیرے غم کے سبب یہ جذبہ اور مستحکم ہو گیا ہے کہ یہ دکھ ہمارے مابین قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

چھٹا بند معنی: پیر: بوڑھا۔ **طلسم دوش و فردا:** ماضی اور مستقبل کا جادو۔ **کلبۂ افلاس:** غریبی کی جھونپڑی۔ **کاشانے:** محل۔ **مجال شکوہ:** شکایت کی طاقت۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ یہ دنیا کیا ہے؟ یہی نا کہ ہر جوان اور بوڑھے کے لیے ماتم کدے کی حیثیت رکھتی ہے جب کہ انسان اس کی حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہا۔ یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی ماضی اور حال کے طلسم میں اسیر ہے۔ زندگی اور موت کا اگر مقابلہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی بسر کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ اور موت اسی قدر سہل ہے جیسے کہ کسی باغ میں نسیم بلا کسی تردد کے رواں دواں رہتی ہے۔ اس زندگی میں تو زلزلے، بجلیاں، قحط اور آلام و مصائب کی بہتات ہے۔ زمانہ کی حیثیت ایک ایسی سنگ دل ماں کی طرح ہے جو اس نوع کی اولاد پیدا کرتی ہے۔ موت تو ایک ایسی حقیقت ہے جو افلاس و غربت کے تنگ و تاریک گھروں کے علاوہ امراء کے دولت کدوں تک جس کی رسائی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیابان و صحرا، آبادیاں، باغات اور ویرانے، بھی موت کی دسترس سے نہیں بچ سکے ہیں۔

موت تو ان پرسکون سمندروں پر بھی محیط ہے جو ہر نوع کے ہنگاموں اور طوفانوں سے محفوظ تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ کہ ایسے سمندروں میں رواں دواں کشتیاں موجوں کی آغوش میں ڈوب جاتی ہیں۔ موت تو ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ اس کے خلاف نہ تو کسی کو شکوہ کرنے کی جراءت ہوتی اور نہ گلہ کرنے کا حوصلہ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ موت تو ایک ایسے طوق کی مانند ہے جس سے پہننے والے کا گلا گھٹ جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو حیات انسانی ایک ایسے قافلے کے مانند ہے جس میں ایک انتہائی گھنٹی کے سوا ہر طرف خامشی طاری ہے۔ یہاں انسانی متاع محض آنکھ ہے جو آنسو بہاتی رہتی ہے۔

ساتواں بند معنی: بادِ بہار جاوداں: ہمیشہ کی بہار کی ہوا۔ **خاکستر:** راکھ۔

مطلب: جان لے کہ یہ مصائب و ابتلا کا دور بھی بالآخر ایک روز ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے کہ تو آسمانوں کے پس پشت ابھی کچھ اور آسمان یعنی ادوار ابھی باقی رہتے ہیں۔ جنہیں کسی نہ کسی مرحلے پر ظہور پذیر ہونا ہے۔ اگر اس دنیا میں لالہ و گل کے سینے چاک ہیں اور بلبل آہ و زاری پر مجبور ہے تو پھر کیا ہوا؟ اس لیے کہ ایسی جھاڑیاں جنہیں خزاں نے تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے انہیں بہار کی ہوا نئے سرے سے تر و تازہ کر کے رکھ دے گی۔

اگر ہماری زندگی ایک پامال اور پژمردہ روح کی مانند ہے اور یہ خاکی جسم محض عارضی حیثیت کا حامل ہے تو کیا ہوا؟ اس لیے کہ زندگی جس آگ سے عبارت ہے اس کا انجام محض خاک نہیں ہے کہ زندگی تو ایک ایسا موتی ہے جس کے مقدر میں شکستگی نہیں ہے۔

آٹھواں بند **معنی** : **دیدۂ قدرت**: فطرت کی نگاہ۔ **حفظِ زندگی**: زندگی کی حفاظت۔ **نقشِ حیات**: زندگی کی تصویر۔ **خلل**: رکاوٹ۔ **جنت نظارہ**: جنت کا جلوہ۔ **بالائے آب**: پانی کا بلبلہ۔ **ہیئتِ تعمیر**: تعمیری صورت۔ **فطرتِ ہستی**: زندگی کی سرشت۔ **پیکر**: جسم۔

مطلب: یوں بھی قدرت کی نگاہ میں زندگی اس قدر پیاری ہے کہ ربِ ذوالجلال نے ہر شے کو تخلیق کرتے وقت اس میں زندگی کے تحفظ کا جذبہ بھی شامل کر دیا تھا۔ اگر موت اتنی طاقتور ہوتی کہ اس کے ہاتھوں حیاتِ انسانی کا نظام زیر و زبر ہو جاتا تو اس کو یعنی موت کو نظامِ کائنات میں یوں عام نہ کر دیا جاتا۔ اگر موت اتنی ارزاں اور سستی واقع ہوئی ہے تو سمجھ لو کہ جس طرح خواب کے عمل سے زندگی میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح موت کی حقیقت بھی معمولی سی ہے۔ انسان تو اس قدر غفلت شعار ہے کہ اس حقیقت کا بھی اسے ادراک نہیں کہ موت کا اصل راز کیا ہے؟ زندگی کی ناپائیداری سے کچھ اور ہی ظاہر ہوتا ہے۔

ذرا غور کیا کہ ہوا کے طرزِ عمل سے تعمیر پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ مضطرب موج بلبلوں کو توڑ کر پھر سے تعمیر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ لیکن ہوا کرتی کیا ہے کہ بلبلوں کو پیدا کر کے موج کے دامن میں چھپا دیتی ہے۔ یعنی خود ہی انتہائی بے دردی کے ساتھ اس نقش کو مٹا دیتی ہے۔ اس عمل کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر ہوا بلبلے کو از سرِ نو پیدا کرنے پر قادر نہ ہوتی تو اس بے پروائی سے اسے توڑتی ہی کیوں؟

ہوا کے اس رویے کا اثر تعمیر کی ہیئت پر کچھ نہیں پڑتا بلکہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہوا کو اپنی قوتِ تعمیر پر کس قدر گرفت حاصل ہے۔

اس ساری گفتگو سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ زندگی ہمیشہ فطرتاً نئی نئی آرزوؤں اور خواہشوں کی متلاشی رہتی ہے اور اس کو بہتر سے بہتر چیز کی جستجو رہتی ہے۔

نواں بند **معنی** : **ممنونِ شب**: رات کا احسان مند۔ **سربزانو**: گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے۔ **سوئے افلاک**: آسمان کی طرف۔ **قدسیوں**: فرشتے۔ **وسعتِ فطرت**: فطرت کا پھیلاؤ۔ **مضراب**: ستار بجانے کا آلہ۔ **کم بہا**: ارزاں۔

مطلب: افسوس کہ یہ پارے کی مانند مضطرب اور چمکدار ستارے جو فضائے آسمان کو منور کرتے ہیں یہ شوخ چنگاریاں جو اپنے وجود کی نمائش کے لیے تاریکیٔ شب کی احسان مند ہیں انسانی دانش جب ان کی عمر کے بارے میں غور و خوض کرتی ہے تو کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے حیران و پریشان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ حیاتِ انسانی ان ستاروں کے مقابلے میں محض چند لمحوں تک محدود ہے۔ مگر انسان جس کی نگاہ ہمیشہ آسمانوں سے بھی آگے نظارہ کرنے کی حامل ہے اور جو اپنے مقاصد میں فرشتوں سے بھی زیادہ پاک و پاکیزہ ہے یہی انسان جو محفلِ کائنات میں ایک روشن شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی فطرت اور صلاحیتوں کے مقابلے میں آسمان محض ایک نقطے کی مانند ہے اس کے باوجود اپنی کم فہمی کے سبب سچائی کی تلاش میں مضطرب اور پریشان ہے جس کا وجود زندگی کے ساز کے لیے ایک مضراب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا وہ گردوں کے ستاروں سے بھی آب و تاب میں کمتر ہے اور کیا اس کا رتبہ سورج کے مقابلے میں بھی کم ہے؟

دسواں بند معنی: تخمِ گل: پھول کا بیج۔ **مستور:** چھپا ہوا۔ **خود نمائی:** اپنے آپ کو ظاہر کرنا۔ **قبائے زندگی:** زندگی کا لباس۔ **قوت آشفتہ:** پریشان طاقت۔ **شیرازہ بند:** جمع کرنے والا۔ **جز سنجیدن پر:** اڑنے سے پہلے پرندوں کا پر تولنا۔

مطلب: اقبال ان اشعار میں یوں سخن طراز ہیں کہ پھول کا بیج زیر خاک بھی بویا جاتا ہے تو وہ نشو و نما کے لیے مضطرب اور بے تاب رہتا ہے۔ اس معمولی سے بیج میں فی الاصل ایک ایسا شعلہ چھپا ہوا ہے جو زندگی سے عبارت ہے۔ یہ بیج اپنے اظہار و نمود کے لیے بے چین رہتا ہے۔ یہ بیج مٹی کی خنکی سے بھی نہیں مرتا اور خاک میں دبائے جانے کے باوجود اس میں زندگی کی حرارت باقی رہتی ہے۔

چنانچہ موقعہ پاتے ہی یہ بیج پھول بن کر خاک کی تہوں سے باہر نکل آتا ہے۔ بالفاظ دگر موت کے ہاتھوں زندگی کا لباس پہن لیتا ہے یعنی مٹی ہی اس کی تخلیق اور نمو کا باعث بنتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبر انسان کو فنا نہیں کرتی بلکہ اس کی ان منتشر قوتوں کو منظم کرتی ہے جو آسمان پر بھی کمند ڈال سکیں۔ یوں موت زندگی کے ذوق کی تجدید کا دوسرا نام ہے۔ بالفاظ دگر عالمِ خواب میں بیداری کا پیغام ہے۔

اس لیے کہ جو پرواز کے عادی ہوتے ہیں ان کو پرواز کا کوئی خوف نہیں ہوتا جب کہ موت اس دنیا میں نئے سرے سے پرواز پر آمادہ کرتی ہے۔

گیارہواں بند معنی: شفا: صحت۔ **حلقہ زنجیر:** زنجیر کی قید۔ **افسوں:** جادو۔ **سرشک آباد:** آنسوؤں کی بستی۔ **تابِ شکیبائی:** صبر کی طاقت۔ **جوہرِ انساں:** انسان کی روح۔ **آگہی:** عقل و شعور۔ **دلاسائی:** دل کی تسکین۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ دنیا والوں کے نزدیک موت کا کوئی مداوا نہیں۔ اس کے باوجود مرنے والے کی جدائی کا غم وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے۔ گویا وقت زخمِ جدائی کے لیے مرہم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل ایک ایسی بستی ہے جو مرنے والوں کے غم کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیتی ہے اور اس پر زمانے کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ گریہ و زاری اور نالہ و ماتم کو وقت کا طلسم بھی نہیں روک سکتا۔ یوں مرنے والے جدائی کا جو زخم دے جاتے ہیں وقت اس کا مرہم نہیں بن سکتا۔ جس لمحے انسان پر اچانک کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

اس کیفیت میں دل کو نالہ و فریاد سے ایک باضابطہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور دل کا خون آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا ہے۔ ہرچند کہ انسان صبر کی قوت سے محروم ہے اس کے باوجود اس کی فطرت میں غیر محسوس طریق پر یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ کہ انسان مرنے کے بعد بے شک ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔ بے شک غم کے شعلے زندگی کو جلا کر خاک تو کر دیتے ہیں تاہم دل کی یہ آگ محض اس احساس کی بدولت ہی بجھتی ہے کہ انسان اس دارِ فانی سے اٹھ جاتا ہے لیکن عملاً فنا نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ احساس ہے جو رنج و غم کی مسلسل کی کا سبب بنتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے کسی عزیز کی وفات پر آہ و فغاں سے گریز کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ غم کے احساس سے غافل ہو چکا ہے اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ وہ موت کے بھیدوں سے آگاہی رکھتا ہے۔

بارھواں بند معنی: دامن آفاق: دنیا کا دامن۔ **آتش قبا:** آگ کا لباس۔ **سرود:** نغمہ۔ **خفتگان:** سوئے ہوئے۔ **عروس زندگی:** زندگی کی دلہن۔ **مرقد:** قبر۔

مطلب: زیر تشریح اشعار میں اقبال پھر سے اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب مشرق کی جانب سے افق پر صبح نمودار ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ کائنات کے دامن سے شب کی سیاہی کا داغ دھو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ باغ میں لالہ کا پھول و تاریکی شب کے سبب افسردہ نظر آتا تھا صبح سورج کی وساطت سے اس کو شعلے جیسا سرخ لباس عطا کرتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ علی الصبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کا عکس لالے کے پھول کو سرخی مائل کر دیتا ہے۔ اور پرندے جو تمام رات اپنے گھونسلوں میں خاموش رہے۔ ان کو چہچہانے اور نغمہ ریزی پر مجبور کر دیتی ہے۔ بلبل بھی اس لمحے نغمے گانے لگتی ہے اور صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پرندے ترنم ریز ہو جاتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ باغوں، پہاڑوں اور دریاؤں میں جو مظاہر شب بھر پر سکون رہے آمد صبح ان میں بھی زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔

سو! یہ اگر قانون قدرت ہے کہ ہر شام صبح پر منتج ہو تو پھر انسانی قبر کی تاریکی کا خاتمہ کس لیے ممکن نہیں۔ صبح اس کا مقدر کیوں نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے ان اشعار میں ایک منطقی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ موت کوئی آخری مرحلہ نہیں ہے اس کے بعد بھی زندگی ہے۔

تیرھواں بند معنی: دام سیمین تخیل: تخیل کا چاندی سا جال۔ **جہانِ بے ثبات:** فانی دنیا۔ **جولاں گاہ:** تیزی دکھانے کی جگہ۔ **بے حاصلی:** کچھ حاصل نہ ہوا۔ **حلقہ افکار انسانی:** انسان کی فکر کا دائرہ۔ **ایوان:** محل۔ **شبستاں:** رات بسر کرنے کی جگہ۔ **سبزۂ نورستہ:** تازہ اگی ہوئی گھاس۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال کہتے ہیں کہ اے ماں! میرے خیالات میں اتنی وسعت ہے کہ ان کی حدود میں تیری یاد کو محفوظ کر لیا ہے۔ میرا غم زدہ دل تیری یاد سے معمور ہے بالکل اسی طرح جیسے حرم کعبہ کی فضائیں دعاؤں سے معمور ہیں۔ زندگی جس چیز کا نام ہے وہ تو ایک طرح سے انسانی فرائض کے تسلسل سے عبارت ہے۔ یہ زندگی لاکھوں ناپائیدار دنیاؤں میں جلوہ گر ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ زندگی کی ہر منزل کا طریق کار مختلف ہے۔ مرنے کے بعد انسان جس جہاں میں جاتا ہے وہ بھی زندگی کا ایک مظہر ہے۔ وہاں موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہاں کا ماحول عمل کے لیے بڑا مناسب اور سازگار ہے۔

اے ماں! وہ جہان تو ایسا ہے جہاں انسان جسم کا قیدی نہیں ہو گا بلکہ وہاں تو محض روح ہو گی اور اس کا نور ہو گا۔ چنانچہ یہ قدرتی امر ہے کہ وہاں فکر انسانی کا دائرہ یہاں کی طرح محدود نہیں ہو گا۔ اے ماں! یہاں پر بھی تیری زندگی چاند کی روشنی سے بھی زیادہ منور تھی اور تیرا سفر حیات صبح کے ستارے سے بھی زیادہ آسودگی کا مظہر تھا۔ اے ماں! خدا کرے صبح کے مانند تیری قبر بھی منور اور روشن رہے اور تیری آخری آرامگاہ نور سے معمور رہے۔

اے عظیم ماں! بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ تیری قبر پر آسمان شبنم برسائے اور اس کی نگہبانی تازہ اگا ہوا سبزہ کرے۔

شعاع آفتاب

صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی — آسماں پر اک شعاع آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب — تیری جان ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب
تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں — کر رہا ہے خرمن اقوام کی خاطر جواں
یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے، کیا ہے یہ؟
رقص ہے، آوارگی ہے؟ جستجو ہے؟ کیا ہے یہ"

"خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستی خاموش میں — پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے — جستجو میں لذت تنویر رکھتی ہے مجھے
برق آتش خو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں — مہر عالم تاب کا پیغام بیداری ہوں میں
سرمہ بن کر چشم انساں میں سما جاؤں گی میں — رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں
"تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے — سونے والوں میں کسی کو ذوق بیداری بھی ہے"

*

اقبال کی یہ نظم بھی "بانگ درا" کی دوسری بعض نظموں کی طرح مناظر فطرت کے حوالے سے تخلیق کی گئی ہے۔ اس نظم میں آفتاب کی ایک شعاع کو انہوں نے اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ نو اشعار کی یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں اقبال کہتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی : سودائی نظارہ : نظارہ کے لیے بیتاب۔ سراپا اضطراب : سر سے پاؤں تک بیقراری۔

مطلب: صبح کے لمحات میں جب میری نگاہیں مناظر فطرت کا جائزہ لے رہی تھیں تو میں نے آسمان پر آفتاب کی ایک کرن کو اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر سرگرداں پایا۔ اس کرن سے میں نے استفسار کیا کہ تو کیوں سراپا اضطراب بنی ہوئی ہے۔ آخر تو اس قدر بے چین کیوں ہو رہی ہے اور اس طرح بے صبری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ کیا تو ایک ننھی سی برق ہے۔ آسمان جسے دنیا کے لیے پرورش کر رہا ہے یعنی اگر اقوام عالم کو ایک کھلیان سے تعبیر کر لیا جائے تو تیری حیثیت غالباً اس کھلیان کو خاک کرنے کے حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے تجھ میں جو اضطراب ہے یا عادت ہے مجھے بتا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ رقص کا انداز ہے یا تجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ اتنا بتا دے کہ یہ سب کیا ہے؟

دوسرا حصہ : معنی : ہستی خاموش: خاموش زندگی۔ مہر عالم تاب: دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔ ذوق بیداری: جاگنے کی لذت۔

مطلب: اقبال کے اس استفسار پر سورج کی وہ کرن زبان حال سے گویا ہوتی ہے کہ اے شاعر ہر چند کہ خامشی اور سکوت پر مبنی ہے اور عملاً میں نے صبح کی آغوش میں پرورش پائی ہے اس کے باوجود نہ جانے کیوں میری تقدیر مجھے مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے ہر لمحے روشنی کی تلاش و جستجو اور لگن رہتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اپنی فطرت کے اعتبار سے میں آگ کی

پیداوار ہوں اس کے باوجود میری عادتوں میں برق جیسا رویہ موجود نہیں ہے یعنی میں بجلی اور آگ کی طرح کسی شے کو جلا کر خاکستر میں تبدیل کرنے کی قائل نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ سورج جو طلوع کے بعد ساری دنیا کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے اس کی جانب سے کائنات کے لیے بیداری کا پیغام لے کر آئی ہوں۔

میرا کردار تو اے اقبال یہ ہے کہ جس طرح سرمہ آنکھوں میں روشنی پیدا کرتا ہے اسی طرح میں بھی انسانوں کی آنکھوں میں سرمے کی مانند سما جانا چاہتی ہوں تاکہ ان سب مناظر کو واضح کیا جا سکے جو رات کی تاریکی کے سبب ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے تاہم تجھ سے بھی ایک سوال ضرور پوچھوں گی کہ اے اقبال! کیا تیرے چاہنے والوں میں کوئی ہوش و خرد کا متلاشی ہے اور کیا ان میں نیند سے بیدار ہونے کی خلش بھی موجود ہے؟

عرفی

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانہ سینا و فارابی

فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشک عنابی

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامہ عالم میں اب سامان بیتابی

مزاج اہل عالم میں تغیر آ گیا ایسا
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغان نیم شب شاعر کی بار گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بیخوابی

کسی کا شعلہ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی "شکوۂ اہل جہاں کم گو
نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی"

*

معنی: عرفی: اکبری عہد کا شاعر۔ **تصدق:** قربان۔ **سینا و فارابی:** دو مشہور مسلمان فلسفی۔ **اشک عنابی:** عنابی رنگ کے آنسو۔ **فغان نیم شب:** آدھی رات کو آہ و فغاں کرنا۔ **بار گوش:** کانوں کے لیے بوجھ۔

مطلب: زیر تشریح نظم کا مرکزی کردار "عرفی" فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ ایران کے شہر "شیراز" کے ایک خاندان میں پیدا ہوا۔ تلاش روزگار کے سلسلے میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں ہندوستان وارد ہوا اور یہاں عبدالرحیم خان خاناں کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اس نے صرف چھتیس سال کی عمر پائی لیکن فن شاعری میں یکتا تھا۔ اس مختصر عمر میں ہی عرفی نے انتہائی شہرت حاصل کی۔

چنانچہ اس نظم میں اقبال ایک طرح سے "عرفی" کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عرفی! تیرے بلند پایہ تخیل نے شاعری اور فلسفے کی ایسی عمارت تعمیر کی ہے جس پر بو علی سینا اور فارابی جیسے عظیم فلسفیوں کے نظریات بھی قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے اشعار میں عرفی نے عشق کے تصورات و خیالات وضع کیے جن پر آج بھی اہل درد خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز میں اس کی قبر پر گیا اور یوں شکوہ سنج ہوا کہ اب دنیا میں وہ اضطراب اور بے چینی کی کیفیت موجود نہیں ہے۔

لوگوں کی طبیعتوں میں ایسا تغیر پیدا ہو گیا ہے کہ اب وہ بالکل پر سکون ہو چلے ہیں۔ اب تو ان کو شاعر کی فغاں نیم شبی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ ان میں وہ جذب و کیف ہی باقی نہیں ہے کہ جو لوگ تاریکی شب کے پرستار ہوں انہیں صبح کی روشنی بھی گراں گزرتی ہے۔

اس لمحے قبر سے آواز آئی کہ اہل دنیا کا شکوہ نہ کر! اگر شعر و نغمہ کا ذوق لوگوں میں مفقود ہو جائے تو اپنی آواز کو زیادہ تلخ اور دردناک بنا لے تاکہ لوگ تیری طرف متوجہ ہو سکیں کہ اونٹنی کے محمل پر وزن بڑھ جائے تو حدی خوانی اور تیز ہو جانی چاہیے۔

ایک خط کے جواب میں

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ و تاز — حصول جاہ ہے وابستہ مذاق تلاش
ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری — ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش
مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز — جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پاش
یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں — کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش
ہوائے بزم سلاطیں دلیل مردہ دلی — کیا ہے حافظ رنگیں نوا نے راز یہ فاش

"گرت ہو است کہ باخضر ہم نشیں باشی
نہاں ز چشم سکندر چو آب حیواں باش"

*

معنی: تگ و تاز: بھاگ دوڑ۔ ریزہ کار: باریک کام کرنے والا۔ سحاب دریا پاش: دریا جاری کر دینے والا بادل۔ ہوائے بزم سلاطیں: بادشاہوں کی محفل میں بیٹھنے کی خواہش۔

مطلب: جس دوست کے خط کے جواب میں علامہ اقبال نے یہ اشعار لکھ کر بھیجے۔ اس حوالے سے مراسلہ نگار اور اس کے ارسال کردہ خط کے متن کے بارے میں اگرچہ مختلف روایتیں ہیں لیکن علامہ کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دوست نے حصول جاہ کے لئے انہیں تحریص دی تھی جب کہ یہ صورت حال اقبال کے مزاج سے قطعی طور پر یکانگت نہیں رکھتی تھی چنانچہ جوابی اشعار میں وہ فرماتے ہیں۔

اول تو مجھے ہر نوع کی شان و شوکت اور منصب و اقتدار کی خواہش ہی نہیں ہے بالفرض ہو بھی تو ان کے لیے جس بھاگ دوڑ اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم از کم اس مقصد کے لیے مجھ میں نہیں ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری فطرت باریک بینی سے ہم آہنگ ہے۔ میں تو اپنی قوت بازو سے ہر شے کے حصول کی خواہش رکھتا ہوں اور یہ بھی باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں حصول منصب کے لیے منافقت اور فتنہ انگیزی کا قائل نہیں۔

مجھے تو اپنے تخلیقی علم پر بھروسہ ہے اور اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ میری شاعری سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو متاثر اور شگفتہ کرنے والی ہے۔ میں تو اس دنیا میں ایسے بادل کی مانند ہوں جس کے برسنے سے ادراک و شعور کے دریا بہتے اور بہتے ہیں۔ اے مراسلہ نگار دوست! سیاست کے یہ

عقدے جن کی طرف تو نے مجھے راغب کرنے کی سعی کی ہے۔ تجھے ہی مبارک ہوں اس لیے کہ عشق حقیقی کے فیض سے میرے ناخن ہی سینہ خراشی میں مصروف ہیں۔ مراد یہ کہ میں تو اپنے ضمیر کی چبھن سے ہم کنار رہتا ہوں۔ بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں تو مردہ دلی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ حافظ شیرازی نے اسی راز کو فاش کرتے ہوئے اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے کہ اگر تیرے دل میں خضر کی رفاقت اور اس کی مصاحبت کی خواہش ہو تو جان لے کہ سکندر کی طرح آب حیات کا چشمہ تیری نظروں سے بھی ہمیشہ پوشیدہ رہے گا۔

نانک

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیمؑ سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

*

جیسا کہ سب کو علم ہے گورو نانک سکھ مذہب کے بانی تھے۔ وہ اہل ہنود کی طرح بت پرستی کے قائل نہ تھے اور وحدانیت پر یقین رکھتے تھے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے گورو نانک کو غالباً اسی وجہ سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں۔

① سے ④ **معنی:** گوتم: مطلب ہے گوتم بدھ۔ گوہر یک دانہ: بے مثال موتی۔

مطلب: یہ مقام افسوس ہے کہ اہل ہند نے گوتم بدھ جیسے بلند مرتبہ انسان کی تعلیمات کی قطعاً پروا نہ کی اور انہیں یکسر نظرانداز کر دیا۔ اہل ہند بدقسمت واقع ہوئے تھے کہ گوتم جیسے انسان کے مرتبے اور مقام کو پہچان نہیں سکے۔ جس طرح اپنے پھل کی مٹھاس سے درخت ناواقف ہوتا ہے اسی طرح اہل ہند بھی گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات سے بے بہرہ رہے۔ یہ گوتم بدھ ہی تھے جنہوں نے زندگی کے اسرار کو آشکار کیا جب کہ اہل ہند تو محض اپنے خیالی فلسفے پر نازاں رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گوتم کے پیغام کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ دراصل یہ وہ بزم ہی نہ تھی جو شمع حق کی روشنی سے منور ہو سکتی۔ ہند کی سرزمین پر ابر رحمت برسا تو ضرور! لیکن یہ زمین شور ثابت ہوئی۔

⑤ سے ⑧ **معنی:** شودر: ہندوؤں کی ایک ذات۔ مردِ کامل: یہاں گورو نانک مراد ہے۔

مطلب: افسوسناک امر یہ ہے کہ شودر یعنی اچھوت طبقے کے لیے ہندوستان ایک غم کدے کی حیثیت

رکھتا ہے۔ یہاں تو کسی کے دل میں انسانی ہمدردی کا شائبہ تک نہیں ہے جب کہ برہمن کو چونکہ اعلیٰ ذات کا ہندو تصور کیا جاتا ہے اس لیے وہ اسی غرور میں مبتلا رہتا ہے اور گوتم بدھ نے معرفت کی جو شمع جلائی تھی اس سے اب غیر استفادہ کر رہے ہیں۔ لیکن گورو نانک کی آمد سے ہند کا جو بتکدہ تھا اس میں ایک عرصے کے بعد وحدانیت کی شمع جلی۔ بالفاظ دگر حضرت ابراہیمؑ کے نور سے بت تراش آزر کا گھر جگمگا اٹھا۔ چنانچہ توحید کی یہ صدا پنجاب سے اٹھی اور ایک مرد کامل نے اہل ہند کو بیدار کر دیا۔

کفر و اسلام

تضمین بر شعر میر رضی دانش

ایک دن اقبال نے پوچھا کلیم طور سے — اے کہ تیرے نقش پا سے وادیٔ سینا چمن
آتش نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز — ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوز کہن؟
تھا جواب صاحب سینا کہ مسلم ہے اگر — چھوڑ کر غائب کو تو حاضر کا شیدائی نہ بن
ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمان خلیلؑ — ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن
ہے اگر دیوانۂ غائب تو کچھ پروا نہ کر — منتظر رہ وادی فاراں میں ہو خیمہ زن
عارضی ہے شان حاضر' سطوت غائب مدام — اس صداقت کو محبت سے ہے ربط جان و تن
شعلۂ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا — "شمع خود را می گدازد درمیان انجمن
نور ما چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است"

*

معنی: آتش نمرود: نمرود کی آگ۔ سوز کہن: پرانا سوز یعنی خدا کی محبت۔ ایمان خلیلؑ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ایمان۔ خیمہ زن: خیمہ نصب کرنا یعنی اسلامی تعلیم کا پابند ہونا۔

مطلب: عرفی کی طرح میر رضی دانش بھی فارسی کے شاعر تھے اور شاہجہان کے دور میں مشہد (ایران) سے آئے تھے۔ انہوں نے ایک مقبرے پر دو ہزار روپے انعام حاصل کیا بعد میں وہ دارا شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ دارا شکوہ کو ان کا ایک شعر اس قدر پسند آیا کہ ایک لاکھ روپے انعام دیا۔ اقبال نے انہی میر رضی دانش کے ایک شعر کی تضمین کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک روز اقبال نے حضرت موسیٰؑ سے استفسار کیا کہ بے شک آپؑ کے نقش قدم کی بدولت "وادی سینا" گلستان بنی ہوئی ہے۔ لیکن اتنا تو بتائیے کہ ابھی تک دنیا میں آتش نمرود بھڑک رہی ہے۔ آخر آپ کا وہ نور کہاں گیا جو کفر و باطل کو جلا کر خاک کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا؟ میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اگر تو مسلمان ہے تو غائب کو چھوڑ کر سامنے موجود چیزوں کا عاشق نہ بن کہ غائب وجود تو ذات باری تعالیٰ کا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی شے بلکہ دونوں جہاں اس کے زیر اقتدار ہیں۔ پھر بھی اگر حاضر اشیاء کا زیادہ ذوق رکھتا ہے تو پھر حضرت ابراہیمؑ جیسے پیغمبر کی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ سطحی نظر سے کسی شے کو دیکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ورنہ تیرا عقیدہ تباہی کا سبب بن جائے گا۔

اے اقبال! اگر تو غائب یعنی خالق حقیقی کا پیروکار ہے تو تجھے ہر شے سے بے نیاز ہو جانا چاہیے بلکہ اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر حالات کے بدلنے کا انتظار کر۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ کائنات میں موجود اشیا کی شان اور افادیت محض عارضی حیثیت کی حامل ہے اور غائب کی شان مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کا تعلق باری تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ بالفرض زمانے میں شعلہ نمرود روشن ہے یعنی کفر و باطل کا دور دورہ ہے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ باطل بھی شمع کی مانند بقول میر رضی دانش پھیل کر ختم ہو جائے گا جب کہ حق و صداقت کا نور پتھر کی آگ کی طرح نظروں سے اوجھل ہے اور اس کا اوجھل رہنا ہی بہتر ہے۔

بلال رضی اللہ عنہ

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے — اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولانگہ سکندر رومی تھا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دنیا کے اس شہنشہ انجم سپاہ کو — حیرت سے دیکھتا فلک نیل فام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر — فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینہ بلالؓ — محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط — کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز — صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے!

پہلا بند معنی: پورس: پنجاب کا ایک مشہور راجہ۔ دارا: ایران کا شہنشاہ۔

مطلب: مغرب کا ایک حقیقت پسند دانشور جو انتہائی قابل احترام گردانا جاتا ہے بقول اقبال کہتا ہے کہ ایشیا روم کے جلیل القدر بادشاہ سکندر ایشیا کو ہمیشہ اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتا رہا۔ مقدونیہ میں پیدا ہونے والا یہ عظیم سپہ سالار اوائل عمری میں ہی ایشیا کے متعدد ممالک فتح کر چکا تھا۔ بظاہر اس کا مرتبہ آسمان سے بھی بلند تھا۔ تاریخ عالم اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ ہندوستان کے پورس اور ایرانی بادشاہ دارا نے اپنی جراءت و ہمت کے دعوے کیے تھے' وہ غلط تھے۔ سکندر کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سکندر دنیا میں ایسا بادشاہ گزرا ہے جس کی فوجوں کی تعداد ستاروں جتنی تھی۔ اسی لیے غالباً آسمان بھی اس کو حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس سطوت و جلال کے باوجود ایشیا میں آج کوئی شخص اسے جانتا تک نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مورخ بھی اس کے کارناموں سے واقف نہیں۔

دوسرا بند **معنی**: **مستنیر**: روشنی حاصل کرنے والی۔ **اسود و احمر**: کالا۔ گورا۔ **اختلاط**: فرق۔

مطلب: لیکن بلال جو ایک معمولی حبشی زادہ تھا جس نے انوار نبوتؐ سے روشنی پائی تھی اور آواز اس کے سینے میں خالق حقیقی کی امانت تھی وہ آج بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب پر حکومت کرتی ہے۔ یہی آواز اذان ہے جس کو سن کر دنیا بھر کے مسلمان سجدے میں جھک جاتے ہیں۔ یہی اذان مسلمانوں میں اخوت اور میل جول پیدا کرتی ہے۔ اور جس کے سبب محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت خداوندی کرتے ہیں۔ وہ صدیوں سے تازگی کی مظہر ہے اور دلوں کو برماتی رہتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ آواز تو نبوت کا فیض عام ہے یعنی سکندر جیسا فاتح فنا ہو گیا جب کہ اسی آواز کے طفیل بلال حبشیؓ کو دائمی زندگی حاصل ہے۔

مسلمان اور تعلیم جدید

تضمین بر شعر ملک قمی

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر — لازم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سامان سفر
بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آ گیا — تھے جو گراں قیمت کبھی، اب ہیں متاع کس مخر
وہ شعلہ روشن ترا، ظلمت گریزاں جس سے تھی — گھٹ کر ہوا مثل شرر تارے سے بھی کم نور تر
شیدائی غائب نہ رہ، دیوانہ موجود ہو — غالب ہے اب اقوام پر معبود حاضر کا اثر
ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آور تری — فرسودہ ہے پھندا ترا، زیرک ہے مرغ تیز پر
اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا — ہے خون فاسد کے لیے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے — واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری — "رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد"

*

ملک قمی بھی فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا تعلق "قم" (ایران) سے تھا۔ اسی مناسبت سے وہ قمی کہلاتا ہے۔ چودھویں صدی میں وہ ہندوستان آیا اور دکن پہنچ کر "ابراہیم عادل شاہ" والی بیجاپور کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اقبال نے زیر تشریح اشعار ملک قمی کے ایک شعر پر تضمین کرتے ہوئے کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

معنی: **ملک قمی**: ایران کا ایک مشہور شاعر۔ **شوریدہ سر**: دیوانہ۔ **متاع کس مخر**: ایسا مال جسے کوئی نہ خریدے۔ **دیوانہ موجود**: موجودہ چیز کا شیدائی۔ **فرسودہ**: پرانا۔ **زیرک**: ہوشیار، چالاک۔ **خون فاسد**: گندہ خون۔

مطلب: مجھے مرشد نے یہ تعلیم دی تھی کہ اے مسلمان! اس دنیا میں ہر راہرو کے لیے لازم ہے کہ ہر لمحے سامان سفر تیار رکھے۔ مراد یہ ہے کہ کسی لمحے بھی اسے موت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اپنا رخت

سفر ہمیشہ تیار رکھے۔ لیکن اب زمانے کی ہوا اس طرح بدلی ہے اور ایسا انقلاب آیا ہے کہ دنیا کی نادر و نایاب چیزیں بھی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھیں۔ تجھ میں جو ایک روشن شعلہ تھا وہ تاریکی کا خاتمہ کر دیتا تھا وہ بتدریج ختم ہوتا رہا۔ اب تو اس میں ستارے سے بھی کم روشنی ہے۔ اب تو قوموں پر موجودہ تہذیب کے اثرات اس طرح سے مسلط ہو گئے ہیں کہ وہ خالق حقیقی سے روگردانی کر کے بت پرستی کی طرف مائل ہیں۔

اے اقبال! لگتا تو یوں ہے کہ اس معاشرے میں تیری انقلابی کوششیں بار آور ہو سکیں اس لیے کہ تیرے نظریات فرسودہ ہیں اور تہذیب جدید زیادہ تیز طرار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد میں تمام معاشرتی نقائص کا علاج تعلیم اور صرف تعلیم کا حصول ہے۔ فی الواقع تعلیم ہی خون فاسد کے لیے نشتر کی مانند ہے۔
چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے مرشد کے ارشاد کے سبب میں نے بھی حصول علم کی خاطر دن رات ایک کر دیئے لیکن ہوا یوں کہ میں حقیقی راہ سے بھٹک کر رہ گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ جدید تعلیم چھوٹے امراض کا علاج تو ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بڑے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے اور انسان حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔

پھولوں کی شہزادی

کلی سے کہہ رہی تھی ایک دن شبنم گلستاں میں
رہی میں ایک مدت غنچہ ہائے باغ رضواں میں
تمہارے گلستاں کی کیفیت سرشار ہے ایسی
نگہ فردوس در دامن ہے میری چشم حیراں میں
سنا ہے کوئی شہزادی ہے حاکم اس گلستاں کی
کہ جس کے نقش پا سے پھول ہوں پیدا بیاباں میں
کبھی ساتھ اپنے اس کے آستاں تک مجھکو تو لے چل
چھپا کر اپنے دامن میں برنگ موج بو لے چل

کلی بولی سریر آرا ہماری ہے وہ شہزادی
درخشاں جس کی ٹھوکر سے ہوں پتھر بھی نگیں بن کر
مگر فطرت تری افتندہ اور بیگم کی شان اونچی
نہیں ممکن کہ تو پہنچے ہماری ہم نشیں بن کر
پہنچ سکتی ہے تو لیکن ہماری شاہزادی تک
کسی دکھ درد کے مارے کا اشک آتشیں بن کر
نظر اس کی پیام عید ہے اہل محرم کو
بنا دیتی ہے گوہر غمزدوں کے اشک پیہم کو

*

پہلا بند معنی: فردوس در دامن: دامن میں بہشت لیے ہوئے۔

مطلب: یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے اس میں شبنم اور کلی کا ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطابق ایک روز باغ میں شبنم کلی سے کہہ رہی تھی کہ میں ایک مدت سے باغوں کے پھولوں کی قربت میں قیام پذیر ہوں لیکن یہ تمہارا جو باغ ہے وہ ایسی مست کر دینے والی اور خوشگوار فضا کا حامل ہے کہ جب اس پر نظر ڈالتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہشت کے کسی منظر میں داخل ہو رہی ہوں۔ میں نے یہ چیز سنی ہے کہ اس باغ کی سربراہ کوئی ایسی شہزادی ہے کہ اگر وہ کسی ویرانے اور صحرا میں بھی چلی جائے تو اس کے

قدموں کے نشان پھول اگاتے چلے جاتے ہیں۔
اے کلی! کبھی تو اپنے ہمراہ اس شہزادی کے پاس لے چل۔ اگر اس میں کوئی قباحت ہے تو اپنے دامن
اس طرح چھپا کر لے چل جیسے تو نے خوشبو کو چھپایا ہوتا ہے۔
ابند معنی: سریر آرا: تخت کو زینت دینے والی۔ افتندہ: پست، حقیر۔
لب: کلی نے شبنم کی گفتگو سنی تو بولی! کہ اے شبنم! واقعی تیری بات بڑی حد تک درست ہے ہماری
ں کی شہزادی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اگر وہ پتھر کو بھی ٹھوکر مارے تو وہ موتی بن کر چمکنے لگتا ہے
تیری اس تک رسائی یوں ممکن نہیں کہ تو ایک ادنیٰ شے ہے اور شہزادی بڑی عالی مرتبت ہے۔ لیکن
ایک ایسا ذریعہ ہے جو تجھے اس شہزادی تک پہنچا سکتا ہے کہ تو اگر کسی مصیبت زدہ کا آنسو بن جائے
زادی تک رسائی ممکن ہے۔
اس لیے کہ غمزدہ لوگوں کے لیے ہماری شہزادی مسرت کا پیغام لاتی ہے اور ان کے آنسوؤں کو موتیوں
ڈھال دیتی ہے۔

تضمین بر شعر صائب

ں اقبال تو نے آ بنایا آشیاں اپنا ... نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامان رسوائی
رے وادی ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن ... نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخم سینائی
ں زور نفس سے بھی وہاں گل ہو نہیں سکتی ... جہاں ہر شے ہو محروم تقاضائے خود افزائی
ت ہے کہ فطرت سو گئی اہل گلستاں کی ... نہ ہے بیدار دل پیری، نہ ہمت خواہ برنائی
آگاہ جب خوابیدہ ہو جاتے ہیں سینوں میں ... نواگر کے لیے زہراب ہوتی ہے شکر خائی
ں ضبط نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستاں سے ... کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی

"ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی"

*

محمد علی صائب فارسی زبان کا نغز گو اور بلند پایہ شاعر تھا۔ تبریز میں پیدا ہوا۔ افغانستان آکر فکر معاش
کابل کے صوبہ دار ظفر خاں کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ آخری عمر میں اصفہان چلا آیا اور یہیں پر
ات پائی۔ اقبال نے اس کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوئے جو اشعار کہے ہیں ان میں خود سے مخاطب
کر فرماتے ہیں۔
معنی: تخم سینائی: کوہ سینا کا بیج۔ تقاضائے خود افزائی: ترقی کی آرزو۔ شکر خائی: میٹھی چیز کھانا یعنی
یں بیانی۔ تنگنائے شہر: شہر کی تنگ جگہ۔
طلب: اے اقبال! تو نے نہ جانے کیا سوچ کر اس شہر میں قیام کیا ہے جہاں شعر تو الگ رہا زبان سے
وئی بات نکالنا بھی ذلت کا سبب بن جاتا ہے۔ بے شک تو اس بنجر زمین سے امن و ارتقا کا تقاضا کر رہا ہے
لیکن اس زمین سے یہ توقعات وابستہ کرنا بے معنی سی بات ہے جہاں افراد میں خود ترقی کرنے اور عملی

جدوجہد کا جذبہ موجود نہ ہو وہاں یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے سانس کی قوت سے کلی کو پھول بنانے کی سعی کی جائے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ملت اسلامیہ اپنی کارکردگی اور عمل سے محروم ہو چکی ہے نہ اس کے بوڑھوں میں بیداری رہی ہے نا ہی جوانوں میں ہمت و حوصلہ موجود ہے۔ جب باشعور لوگوں میں جذبہ احساس ختم ہو جاتا ہے تو شاعر کے لیے نغمہ گری کا عمل تلخ نوائی کا سبب بن جاتا ہے۔ تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ اس بے حس مقام سے کہیں اور چلا جا کہ یہاں سے تو اجاڑ صحرا ہی بہتر ہے۔

صائب کہتے ہیں کہ مردہ دل قوم کے لیے زندہ قوموں کے ترانے بے معنی ہوتے ہیں۔ یہ ترانے تو زندہ قوموں کو ہی زیب دیتے ہیں۔

فردوس میں ایک مکالمہ

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز — حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدیِ شیراز
اے آنکہ ز نورِ گہرِ نظمِ فلک تاب — دامن بہ چراغِ مہ و اختر زدہ باز
کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیاں کر — واماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ و تاز؟
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں — تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیِ آواز؟
باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر — رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحبِ اعجاز
جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا — آئی یہ صدا، پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل — دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی — فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی — دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی — ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو — پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضورِ شہِ یثربؐ میں نہ کرنا — سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

*

① سے ④ **معنی:** ہاتف: غیبی فرشتہ۔ واماندۂ منزل: چلتے چلتے راستے میں تھک کر بیٹھ جانا۔ فلک سوز: آسمان جل جانا۔

مطلب: زیر تشریح نظم ایک تصوراتی مکالمے پر مبنی ہے جس کے دو کردار شیخ سعدی اور مولانا حالی ہیں۔ منظر بہشت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھ سے ہاتف غیبی (غیب سے آواز دینے والا فرشتہ) نے کہا کہ اک روز بہشت میں شیخ سعدی اور مولانا حالی یکجا ہو گئے۔ علیک سلیک کے بعد شیخ سعدی نے استفسار کیا کہ بے شک آپ نے اپنی شاعری سے ہر بلند و پست شے کو منور کر دیا۔ ازراہ کرم مجھے ہندوستان کے مسلمانوں

کے حالات سے آگاہ کیجیے۔ کہ وہ عملی جدوجہد میں مصروف ہیں یا کہیں تھک کر تو نہیں بیٹھ گئے۔ یہ بتایئے کہ وہ لوگ جن کی صداؤں کی حرارت و تپش سے آسمان کے فرشتے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کیا اب ان کی کیفیت وہی ہے؟ کیا ان میں اپنے مذہب کی حرارت باقی ہے۔ کہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہی وہ کامرانی حاصل کر سکتے تھے۔

⑤ سے ⑦ **معنی**: ورقِ ایام: زمانے کی کتاب کا ورق۔ تزلزل: خرابی۔

مطلب: مولانا حالی نے جس وقت شیخ سعدی کی باتیں سنیں تو وہ ان سے متاثر ہو کر حالی کی آنکھوں میں اشک بھر آئے اور جواباً بولے! کہ صاحب اعجاز حقیقت یہ ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوا اور یورپ سے آ کر فرنگی مسلط ہو گئے تو یہ فطری امر ہے کہ اپنی تہذیب، تعلیم اور زبان بھی ہمراہ لے کر آئے۔ تو مسلم زعماء نے سوچا کہ اب اس جدید تعلیم کو اپنائے بغیر ملت کامیابی کے مرحل طے کر سکتی ہے نہ اس معاشرے میں باوقار انداز میں بسر اوقات کر سکتی ہے لیکن اس جدید تعلیم کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہو کر رہ گئے چنانچہ صورت یہ ہے کہ دنیاوی عزّ و جاہ تو کسی حد تک حاصل ہو گیا لیکن مذہب کا تصور دھندلا پڑ گیا۔

⑧ سے ⑨ **معنی**: زمیں گیر: پست۔ زخمہ: مضراب۔ جمعیت: جماعت۔

مطلب: اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مولانا حالی نے کہا "اگر دین باقی رہا ہو تو پھر مقاصد میں بھی بلندی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب دین ہی باقی نہ رہے تو نوجوانوں سے کسی کارِ خیر کی توقع عبث ہے۔ ان میں الحاد کے تاثرات پیدا ہو جائیں تو یہ ایک فطری امر ہے۔ مذہب کے طفیل ہی ملت کے افراد میں اتفاق و اتحاد برقرار رہ سکتا ہے اور اسی کے سبب ملت عملی جدوجہد کے لیے متحرک رہتی ہے۔

⑩ سے (13) **معنی**: خرما: کھجور۔ دینا: اون۔ پشم: مخمل یا ریشم۔

مطلب: چنانچہ یہ جان لینا چاہیے کہ کسی عمارت کی بنیاد لرز جائے تو اس عمارت کے انجام کا آغاز ہو چکا ہے یعنی ملت نے اپنے اصولوں کو چھوڑ کر خود اپنے زوال کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ ملت کا استحکام تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ اپنے اصولوں اور تعلیمات پر مضبوطی سے قائم رہیں۔

تاہم اب صورت احوال یہ ہے کہ جدید تہذیب کے سبب مسلم نوجوانوں نے اپنی تعلیمات کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے تو ان کا الحاد کی طرف مائل ہو جانا کوئی حیران کن بات نہیں۔ شیخ صاحب! میں نے حقیقت آپ کے روبرو رکھ دی ہے لیکن خدا کے لیے آنحضرتؐ کے دربار میں حاضری دیں تو اس صورت حال کا ذکر نہ کرنا ورنہ ہندی مسلمان مجھے چغل خور سمجھیں گے اور آخر میں آپ کے ہی ایک شعر کے حوالے سے کہتا ہوں کہ ہم نے جو کاٹنے بوئے ان سے کھجور حاصل کرنے کی توقع عبث ہے اور جو اون ہم نے تیار کی اس سے حریر و پرنیاں اور ریشم تیار نہیں ہو سکتا۔

مذہب

تضمین بر شعر میرزا بیدل

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ — ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا — ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی — اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام — ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور — مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش

"با ہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہَ بے جنوں مباش"

*

معنی: پیر: عالم، سائنسدان۔ **ہستی غائب:** ذات خداوندی سے مراد ہے۔ **برہمن:** برہمن کی طرح۔ **جنون خام:** جنون کی ابتدائی حالت۔ **انتعاش:** بلند ہونا۔ **مرشد کامل:** میرزا بیدل کی طرف اشارہ ہے۔

مطلب: یہ تضمین جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے پٹنہ (بہار) کے ممتاز فارسی شاعر اور نثر نگار میرزا عبدالقادر بیدل کے ایک شعر پر اقبال نے تخلیق کی ہے۔ روایت ہے کہ میرزا بیدل انتہائی زود گو شاعر تھے انہوں نے کم و بیش ایک لاکھ شعر تخلیق کیے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کے جدید فلسفیوں نے اپنے اس نقطہ نظر کی تبلیغ میں سر پیر کا زور لگایا دیا ہے کہ وہ لوگ نادان اور احمق ہیں جو اس دنیا میں رہتے ہوئے ایسی ہستی کو حقیقت مطلق تصور کرتے ہیں جو ہمیشہ نگاہوں سے غائب رہی ہے اور بظاہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ بر آمد ہوا ہے کہ مسلمان زعماء بھی غیر مسلموں کی طرح خدا کے وجود سے غافل ہو کر ظاہری اشیا یعنی بتوں کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ علوم جدید کی بنیاد حواس خمسہ پر ہے۔ اسی سبب آج دنیا بھر کے مذہبی عقائد ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

مغربی دانشوروں کے نزدیک مذہب ایک ناپختہ جنون کی حیثیت رکھتا ہے۔ بس اسی ناپختہ جنون کی بنیاد پر مذہب پر یقین رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بلند رہتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ ان مغربی دانشوروں کے مقابلے پر میرزا بیدل نے اپنے کمال علم کی بنیاد پر یہ راز فاش کیا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لیے تھوڑا سا جنون اور دیوانگی بھی درکار ہوتی ہے۔ خواہ اس کمال کا تعلق عقل کل سے ہی ہو۔ جنون کے بغیر تو عقل کل بھی بے معنی شے ہے۔

جنگ یرموک کا ایک واقعہ

صف بستہ تھے عرب کے جوانان تیغ بند — تھی منتظر حنا کی عروس زمین شام

اک نوجوان صورت سیماب مضطرب — آ کر ہوا امیر عساکر سے ہمکلام
اے بوعبیدہ رخصت پیکار دے مجھے — لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام
بیتاب ہو رہا ہوں فراق رسولؐ میں — اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضور رسالتؐ پناہ میں — لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ — جس کی نگاہ تھی صفت تیغ بے نیام
بولا امیر فوج کہ "وہ نوجواں ہے تو — پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد — کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہ رسول امیںؐ میں تو — کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پہ کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے"

*

میدان یرموک اردن میں شام کے قریب واقع جہاں ایک زمانے میں شام کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ یہ وہ میدان ہے جہاں پندرھویں ہجری میں حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سپہ سالاری میں صرف بیس ہزار مسلمان سپاہیوں کے لشکر نے روم کے ان عساکر کو شکست فاش دی جن کی تعداد دو لاکھ بتائی جاتی ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح نے اس معرکے بعد فاتح شام کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس جنگ کے آغاز میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا جس کو اقبال نے ان اشعار میں نظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

①سے⑤ **معنی:** حنا: مراد خون ہے۔ **صورت سیماب مضطرب:** شوق شہادت میں بیتاب۔ **امیر عساکر:** سپہ سالار۔ **بو عبیدہ:** ایک صحابیؓ۔

مطلب: میدان جنگ میں رومی افواج کے مقابلے پر عرب افواج کے تیغ و تلوار سے مسلح دستے صف آرا تھے اور شام کی سرزمین پر ہر دو افواج کے سرفروشوں کا خون بہنے والا تھا۔ اس لمحے مسلمان افواج سے ایک نوجوان بڑی تیزی سے اپنی صف سے برآمد ہوا اور امیر لشکر حضرت ابوعبیدہؓ سے دست بستہ درخواست کی کہ میرا صبر و سکوں دشمنوں سے نبرد آزمائی کے لیے رخصت ہو چکا ہے لہٰذا مجھے سب سے پہلے جنگ کی اجازت دیجیے۔ اس لیے کہ میں تو آنحضرتؐ کی جدائی میں بیتاب ہو رہا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ عشق رسولؐ میں ایک لمحے کی زندگی بھی حرام ہے۔ بندہ پرور! میں تو بلا تاخیر آنحضرتؐ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا خواہاں ہوں۔ ہاں اگر آپ ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں تو میں بخوشی حضورؐ تک پہنچا دوں گا۔

⑥سے⑩ **معنی:** تیغ بے نیام: ننگی تلوار۔ **غیور:** غیرت مند۔

مطلب: لشکر اسلام کے امیر ابو عبیدہ ایک لمحے تک خاموش رہے اور اس نوجوان میں راہ حق میں شہادت کا جوش و خروش دیکھ کر شدت جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہرچند کہ ان نگاہوں میں تلوار کی سی کاٹ تھی پھر بھی آنسو بہنے لگے۔ وہ نوجوان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تیری شہادت کی آرزو رب ذوالجلال پوری کرے تاہم یہ ثابت ہو گی کہ حضورؐ سے تیری محبت کا مقام بہت بلند ہے۔

اے نوجوان! جب تو اپنی مراد پالے اور بارگاہ رسالتؐ میں پیش ہو تو اس غلام کی جانب سے بعد از سلام دست بستہ گذارش کرنا کہ ہم پر رب ذوالجلال نے اپنی رحمتوں کی بارش کردی ہے اور حضورؐ نے امت مسلمہ سے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے پورے ہو رہے ہیں۔

مذہب

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

*

معنی: اقوام مغرب: یورپی اقوام۔

مطلب: اس مختصر سی نظم میں اقبال مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے اپنی ملت اور اس کی تعلیمات کا تقابل اقوام مغرب سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اپنی ترتیب و تنظیم کے اعتبار سے آنحضرتؐ کی امت دنیا بھر کی دوسری قوموں سے قطعی مختلف واقع ہوئی ہے۔ مغربی اقوام کا دارومدار تو خطہ ارض اور ان کی نسل و خون کی نسبت پر ہے جب کہ اے مسلمان تیری جمعیت کا انحصار اتحاد اور مذہب کی قوت پر ہے انہی کے سبب ملت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

اے مسلمان! یہ نکتہ ذہن نشین کرلے کہ اگر تو نے دین کو ترک کر کے مغرب کے لوگوں کی طرح مذہب کو ذاتی اور انفرادی معاملہ تصور کرلیا تو تیری جمعیت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور جمعیت کا خاتمہ ہوا تو قوم و ملت کا وجود ختم ہو کر رہ جائے گا۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور
خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

*

معنی: سحاب: بادل۔ زر کامل عیار: بالکل کھرا سونا۔ شاخ بریدہ: کٹی ہوئی شاخ۔ قاعدۂ روزگار:

زمانے کا قاعدہ۔ **استوار:** مضبوط۔ **پیوستہ:** چمٹا رہ۔

مطلب: علامہ اقبال کہتے ہیں کہ موسم خزاں سے اگر کوئی شاخ جھڑ کر درخت سے جدا ہو گئی تو بہار کے موسم میں کتنے ہی بادل برسیں وہ شاخ کسی مرحلے پر بھی شاداب و سرسبز نہیں ہو سکتی۔ خزاں کا موسم اس شاخ کے لیے لازوال حیثیت کا مالک ثابت ہو گا اور اس شاخ کا درخت کے دوسرے پتوں اور شاخوں کے ساتھ کوئی ربط و تعلق نہیں رہے گا۔ جب کہ اے مسلمان تیرے گلستان میں بھی ایک طرح سے خزاں کے دور کا تسلط ہے اور ملت ہر نوع کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہے۔ تیری ملت کے زعماء جن کی رہنمائی سے حالات روبہ اصلاح تھے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

اے مسلمان! درخت کی اس جھڑ جانے والی شاخ سے سبق حاصل کر کہ تو آج بھی زمانے کے دستور سے آگاہ نہیں ہے۔ تیری بہتری اسی میں ہے کہ ملت و قوم کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھے اور خزاں کے بعد متوقع موسم بہار سے تعلقات استوار کرے۔

شبِ معراج

اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

*

معنی: رہ یک گام: ایک قدم کا فاصلہ۔ **عرش بریں:** قرب الٰہی سے مراد ہے۔ **معراج:** لغوی معنی سیڑھی۔

مطلب: ہرچند کہ یہ انتہائی مختصر نظم محض دو اشعار پر مشتمل ہے مگر موضوع کو پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اقبال نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ شب معراج کے ساتھ بحیثیت شاعر خود ان کی فکری عظمت کی دلیل ہے۔ فرماتے ہیں کہ

آسمان کی وسعتوں سے ستارۂ شام کی آواز آ رہی ہے کہ "شب معراج" ایسی عظمتوں والی رات ہے جس کو سحر بھی سجدہ کرتی ہے یعنی اس کا احترام کرتی ہے۔ یہی "شب معراج" مسلمانوں کو سبق دے رہی ہے کہ ہمت تو زمین سے عرش بریں کا فاصلہ صرف ایک قدم کی راہ ہے۔

پھول

تجھے کیوں فکر ہے اے گل! دل صد چاک بلبل کی تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پابگل بھی ہے انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
تنک بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے نہ رہ منت کش شبنم، نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شانِ خودداری، چمن سے توڑ کر **تجھکو** کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے
چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم مذاقِ جورِ گل چیں ہو، تو پیدا رنگ و بو کر لے
اگر منظور ہو **تجھکو** خزاں نا آشنا رہنا جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے
اسی میں دیکھ! مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو **تجھکو** زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے

*

معنی: اے گل: مراد ہے مسلمان۔ **پا بگل:** ایک جگہ گڑا ہے۔ **تنک بخشی:** معمولی بخشش۔ **استغنا:** بے نیازی۔ **خجالت:** ندامت۔ **نگوں:** اوندھا۔ **جہانِ رنگ و بو:** دنیا کی گوناگوں دلفریبیاں۔ **آئینہ رو:** یعنی محبوب۔

مطلب: اقبال زیرِ تشریح نظم میں پھول سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے پھول! بلبل کا دل اگر کسی کے فراق میں ریزہ ریزہ ہوتا ہے تو تجھے اس کی اتنی فکر کیوں ہے کہ تیرے لبادے میں جو چاک ہیں پہلے ان کو رفو کرنے کی فکر کر۔ مراد یہ کہ دوسروں سے ہمدردی جتانے سے پہلے اپنے بریدہ دامن کا جائزہ بھی تو لینا چاہیے۔ اگر اس گلزارِ ہستی میں آبرو اور عزت و وقار کی خواہش ہو تو اس کے لیے یہ لازم ہے کہ کانٹوں کے مابین زندہ رہنے کی عادت بھی اختیار کر لی جائے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی تو بے پناہ مشکلات سے عبارت ہے اس کو باوقار طریقے پر گزارنے کے لیے یہ امر لازم ہے کہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی عادت ڈال لی جائے۔ یہ کامیابی اور کامرانی کا واحد راستہ ہے۔

صنوبر کا درخت ہر نوع کے پھل سے بے نیاز ہے۔ اسی لیے اس درخت کو آزاد تصور کیا جاتا ہے۔ اس آزادی کے باوجود وہ پابند بھی ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں تو بھی صنوبر کی طرح سے آزادی حاصل کر لے کہ وہ آزاد بھی ہے اور ایک حد تک پابند بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مادر پدر قسم کی آزادی تو کسی مرحلے پر بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص تجھے برائے نام فیاضی سے ممنونِ احسان کرنا چاہے تو تیری انا کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی فیاضی کو قبول نہ کرے کہ میرے ایک دوسرے شعر کے مطابق اگر کسی پیاسے کو سمندر سے شبنم کے محض چند قطرے دستیاب ہوں تو یہ رزاقی اور فیاضی نہیں بلکہ انتہائی کنجوسی کا مظاہرہ ہے۔ اگر تیرے پیمانے میں کوئی شراب کے محض چند قطرے ڈالنا چاہے تو ان کو قبول کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنا پیمانہ الٹا کر رکھ دے یعنی شراب کے چند قطروں کو قبول کرنے سے بہتر یہ مناسب ہے کہ پیمانہ خالی ہی رہے۔

یہاں ایک بار پھر اقبال پھول سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ شانِ خودداری تو نہیں کہ باغ میں جا کر کوئی تجھ کو شاخ سے توڑ لے اور پھر کوئی اپنی پگڑی میں لگا لے تو کوئی ہار میں پرو کر گلے کی زینت بنا لے۔ شبنم اس راز کو غنچۂ گل پر منکشف کر کے اڑ گئی کہ اگر تجھے پھول توڑنے والے کے ظلم برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کے لیے اپنے دامن میں رنگ و بو پیدا کر لے مراد یہ کہ گلچیں تو محض پھول کو اسی وقت توڑنے کا خواہش مند ہوتا ہے جب وہ اس میں رنگ و بو محسوس کر لیتا ہے۔ اے پھول اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے کبھی خزاں سے واسطہ نہ پڑے تو پھر رنگ و بو کے حصول سے اجتناب کر۔ بلکہ اس اجتناب سے قبل رنگ و بو کے حصول کی خواہش ترک کر دے۔

اس ساری صورتِ حال کے برعکس اے پھول! تیری زندگی کا کمال اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ

تجھکو کوئی خوبصورت چہرہ اپنے دامن کی زینت بنا لے۔

اس نظم میں اقبال بظاہر پھول سے مکالمہ کرتے ہیں اور اس مکالمے میں کچھ متضاد باتیں بھی آ گئی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے عارفانہ انداز کلام میں کچھ ایسے نکتوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن کا تعلق حیات انسانی سے ہے۔ ان مرحلوں میں پھول کو محض علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

شیکسپئیر

شفق صبح کو دریا کا خرام آئینہ نغمہ شام کو خاموشی شام آئینہ
برگ گل آئینہ عارض زیبائے بہار شاہد مے کے لیے حجلہ جام آئینہ
حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن دل انساں کو ترا حسن کلام آئینہ
ہے ترے فکر فلک رس سے کمال ہستی
کیا تری فطرت روشن تھی مآل ہستی

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا تاب خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشم عالم سے تو ہستی رہی مستور تری اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

*

زیر تشریح فرمائشی نظم دو بند پر مشتمل ہے۔ فرمائشی اس لیے کہا گیا ہے کہ ایک روایت کے مطابق شیکسپئیر کے بارے میں دنیا بھر کے بڑے بڑے شعراء سے نظمیں لکھوانے کی تحریک چلی۔ ان نظموں کے انگریزی تراجم بعد میں کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔ اقبال نے بھی دنیا کے اس ممتاز ڈرامہ نگار اور شاعر کے بارے میں یہ نظم لکھی۔

پہلا بند معنی: شاہد مے: محبوبہ شراب۔ حجلہ جام: پیالے کی جلوہ گاہ۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ علی الصبح جب شفق پھوٹتی ہے اور اس کا سرخ عکس بہتے دریا پر پڑتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شفق کے لیے دریا کا شفاف رواں پانی آئینے کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح شام کے وقت نغمہ ریزی کے لیے اس لمحے کا سکوت آئینے کا کام دیتا ہے۔ بہار کے خوبصورت رخسار کے لیے پھولوں کی پتیاں بھی آئینے کی مثال ہوتی ہیں اور پیمانہ شراب کے لیے آئینے کا کام دیتا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت اور سچائی کے لیے حسن آئینے کی صفت رکھتا ہے۔ اس منظر نامے میں اگر شیکسپئیر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو وہ قاری کے لیے انسانی نفسیات کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے آئینہ ہے۔

اقبال اس شعر میں شیکسپئیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں تیرے بلند فکر کلام نے انسان کو زندگی کے حالات سے روشناس ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ کیا تیری روشن فطرت زندگی کے انجام سے عبارت تھی۔ یا پھر تیرے بعد تجھ سا دوسرا کوئی پیدا نہیں ہوا؟ اس سوال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال

شیکسپیئر کی خلاقانہ صلاحیت کے کس قدر قائل تھے۔

دوسرا بند معنی: **مستور:** چھپا ہوا۔ **حفظ اسرار:** بھید چھپانا۔ **سودا:** جنون۔

مطلب: یہاں اقبال کہتے ہیں کہ اے شیکسپیئر! تو وہ عظیم تخلیق کار ہے کہ جب بھی کسی مداح نے تیرا دیدار کرنا چاہا تو اس طرح محسوس کیا جیسے سورج کی تیز اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی میں سورج کے وجود کو دیکھ رہا ہے۔ ہرچند کہ دنیا کی نگاہوں سے تیرا وجود پوشیدہ رہا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ تیری بصیرت افروز نگاہوں نے ساری کائنات کو عریاں اور بے پردہ دیکھ لیا۔

آخری بات یہ ہے کہ اپنے رازوں کو چھپانے کا فطرت کو ایسا جنون ہے کہ تیرے بعد شاید کوئی شخص تخلیق نہ کیا جاسکے جو تیری طرح فطرت کے رازوں کو افشا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

میں اور تو

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا' نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا — میں ہلاک جادوئے سامری' تو قتیل شیوہ آزری
میں نوائے سوختہ در گلو' تو پریدہ رنگ' رمیدہ بو — میں حکایت غم آرزو' تو حدیث ماتم دلبری
مرا عیش غم' مرا شہد سم' مری بود ہم نفس عدم — ترا دل حرم' گرو عجم' ترا دیں خریدۂ کافری
دم زندگی رم زندگی غم زندگی سم زندگی — غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے "مدار قوت حیدری"
کوئی ایسی طرز طواف تو مجھے اے چراغ حرم بتا — کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشت سمندری
گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے — کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی' نہ حریف پنجہ فگن نئے — وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی' وہی عنتری

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

*

یہ نظم علامہ اقبال کے مخصوص طرز فکر کی آئینہ دار ہے جس میں انہوں نے اپنی ذات اور ملت کے جملہ افراد کے کردار کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اقبال کو دراصل مسلمانوں کے سیاسی اور اخلاقی زوال کا جو دکھ تھا اسے وہ اپنے شاندار ماضی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کی جو صورت حال تھی اس کے پیش نظران کے کرب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کرب کا اظہار ان کی بیشتر نظموں اور اشعار میں ہوتا ہے اس ساری کیفیت کے باوجود وہ بہت کم مایوس نظر آتے ہیں۔ رجائیت کی ایک واضح لہر اقبال کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ چنانچہ زیر تشریح نظم میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

①② **معنی:** **شیوۂ آزری:** آزر کا طریقہ مراد بت پرستی۔ **در گلو:** حلق میں۔ **حدیث ماتم:** ماتم کا افسانہ۔

مطلب: اے عصر جدید کے مسلمان! میں دیکھتا ہوں کہ اپنی تمام تر سخنوری کے باوجود مجھ میں حضرت موسیٰؑ کی کلیمی کا کوئی عنصر موجود نہیں ہے اور جہاں تک تیری ذات اور کردار کا تعلق ہے تو بھی حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی کسی ایک سنت سے بھی بہرہ ور نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں کلیم ہونے کی بجائے

میں بھی سامری جیسے ساحر کے زیر اثر آگیا ہوں۔ اور تو بھی اپنے صحیح راستے سے ہٹ کر آزر کی مانند بت گری اور بت فروشی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں۔ میری مثال دیکھا جائے تو اس بلبل کے مانند ہے جس کی آواز اس کے گلے میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہو۔ اور تیری کیفیت اس پھول کی سی ہے جس کا رنگ بھی اڑ چکا ہے اور خوشبو بھی اس کو داغ مفارقت دے گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں خصوصیات کے بغیر پھول ایک مجہول و مفلوج وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تو اپنی آرزوؤں کے غم کی حکایت بن چکا ہوں اور تو محبوبیت کے ماتم کا مظہر بن چکا ہے۔

③④ **معنی**: سم: زہر۔

مطلب: ان حالات میں عیش و مسرت میرے لیے غم واندوہ کا روپ دھار چکے ہیں۔ میرے لیے اب شہد بھی زہر کی مانند تلخ ہو چکا ہے۔ اس لیے میرا وجود' عدم وجود' زندگی اور موت بتدریج ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح تیرا دل جو حرم کعبہ کی مانند پاکیزہ تھا اب غیر اسلامی عقائد و تصورات کے پاس رہن رکھا ہوا ہے جب کہ تو نے اپنے دین کو کافرانہ خیالات کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ زندگی کا ایک ایک سانس جو گزر رہا ہے زندگی کو کم کر رہا ہے۔ اور اسے خاتمے کی طرف لے جا رہا ہے اور یہ ساری صورت حال ہمیں غم زدہ کر رہی ہے۔ یہ غم فی الواقع ایک زہر کی مانند ہے جو آخر کار ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر کے رکھ دے گا۔ لیکن ہمیں زندگی کے گزارنے اور اس غم کے زہر کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ قلندروں کی شان یہی تو ہے۔

⑤⑥ **معنی**: نان شعیر: جو کی روٹی۔

مطلب: اے مسلمان! اگر تیرے وجود میں غیرت اور حمیت کی کوئی چنگاری باقی رہ گئی ہے تو تجھ افلاس و امارت کا خیال ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ شیر خدا حضرت علیؓ کی تمام تر قوت کا انحصار جو کی روٹی پر تھا۔ یہی ان کی خوراک جو کی روٹی ہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے خیبر کا در اکھاڑ پھینکا۔ اے چراغ حرم! میں تیرے گرد طواف تو کر رہا ہوں لیکن کوئی ایسا طریقہ بتا دے کہ تیرے دیوانے اور شیدائی کو مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا کوئی گر حاصل ہو جائے۔

⑦ سے ⑨ **معنی**: ہری ہری: خدا خدا۔ ستیزہ گاہ: جنگ کا میدان۔ پنجہ فگن: پنجہ آزمانے والے۔ مرحبی: ایک یہودی۔ یہاں مراد ہے اسلام دشمن۔

مطلب: دنیا بھر کے مسلمانوں سے کعبے کو جو شکایت ہے اگر میں اس کا اظہار کسی بت کدے میں کروں تو وہاں رکھے ہوئے بت بھی اظہار ہمدردی کے طور پر توبہ توبہ کرنے لگ جائیں کہ حرم کعبہ جو دین کی عظمت کی علامت ہے ہم نے اس کو قطعاً نظرانداز کر دیا ہے اور مخالف قوتوں کے ہمنوا بن گئے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں بے شمار انقلابات آئے جنہوں نے بے شمار تہذیبوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس کے باوجود دیکھا جائے تو صورت حال میں کوئی بنیادی اور واضح تبدیلی رونما نہیں ہوئی کہ آج بھی معاشرتی سطح پر ساری دنیا میں حق و باطل کے مابین آویزش جاری ہے۔ ایک جانب مرحب و عنتر جیسے لوگ باطل کو فروغ دینے کی سعی میں مبتلا ہیں۔ دوسری جانب شیر خدا حضرت علیؓ مرتضیٰ حق کی حمایت میں تیغ بکف ہیں۔

آخری شعر میں اقبال آنحضرتؐ سے رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عرب و عجم کے مالک ہم پر کرم کر۔ کہ ہم اگرچہ بھکاری ہیں لیکن تیری تعلیمات نے ہمارے مزاج میں سکندر جیسی مملکت پیدا کر دی ہے۔

اسیری

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند　　قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے' اک لہو کی بوند ہے　　مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر　　کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

"شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

*

یہ نظم اپنے پس منظر کے اعتبار سے ان نظموں میں سے ایک ہے جو اقبال نے خالصتاً سیاسی موضوعات کے حوالے سے کہیں اور مختلف سیاسی اجتماعات میں پڑھیں۔ ہرچند کہ یہ نظم تحریک خلافت کے دوران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی گرفتاری اور رہائی کے بعد امرتسر کے ایک جلسہ عام میں سنائی گئی لیکن موضوع اور سچویشن کے اعتبار سے یہ آج بھی اسی قدر تر و تازہ ہے جتنی کہ 1919ء میں تھی۔ اس لیے کہ حکومتوں کے خلاف احتجاج اور گرفتاریوں کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا ہے اور ان کی نوعیت میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اقبال نے اسیری اور زنداں کو کس رخ سے دیکھا ہے۔ ان اشعار سے اندازہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں کہ:

معنی: **اعتبار افزا**: قدر و منزلت بڑھانا۔ **قطرۂ نیساں**: سیپی میں ابر بہار کی بوند۔ **مشک اذفر**: خالص مشک۔ **نافہ آہو**: ہرن کی ناف۔ **شہپر**: بال و پر۔ **زاغ و زغن**: کوا اور چیل۔

مطلب: اگر فطرت بلند ہو تو اسیری اور نظر بندی انسانی وقار میں اضافے کا سبب بنتی ہے اس کی مثال وہ بارش کے ایک معمولی قطرے سے دیتے ہیں جو سیپی میں بند ہو کر ایک نایاب موتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح وہ مشک کے حوالے سے یک دوسری مثال بھی پیش کرتے ہیں کہ خالص مشک خون کا ایک قطرہ ہی تو ہے جو ہرن کی ناف میں منجمد ہو کر خالص مشک کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور نایاب شے بن جاتا ہے۔ لیکن قدرت اس انداز میں ہر کسی کی تربیت نہیں کرتی۔ دنیا میں کم ہی ایسے پرندے ہیں جنہیں جال اور پنجرے میں رکھا جاتا ہے۔ بقول حافظ شیرازی اگرچہ کوے اور چیل بلند پرواز ہیں لیکن انہیں کوئی پنجرے میں بند نہیں کرتا۔ یہ امتیاز تو محض شاہین اور عقاب کو حاصل ہے۔

دریوزۂ خلافت

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تو احکام حق سے نہ کر بیوفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

*

معنی: گدائی: بھیک مانگنا۔

مطلب: گزشتہ نظم "اسیری" میں تحریک خلافت کے ضمن میں اقبال نے جو گول مول رویہ اختیار کیا ہے اس کی توجیح زیر تشریح نظم سے ہو جاتی ہے۔ اقبال تحریک خلافت کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اقتدار کوئی بھیک میں نہیں دیتا بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال پہلی عالمی جنگ میں ترکی پر انگریزوں کا تسلط اور ہندوستانی مسلمانوں سے ان کی بدعہدی تاریخی شواہد کے طور پر عالم کے سامنے تھیں۔ بعد میں حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ ترکی کے ضمن میں اقبال کی سوچ صدفی صد درست تھی اور ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے چلائی ہوئی تحریک خلافت بے جواز تھی۔ بعد میں ترک جرنیلوں نے ہی انگریزوں سے لڑ کر اپنے وطن کو آزاد کرایا۔

زیر تشریح نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ اے ملت اسلامیہ کے فرزندو! بے شک یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ تمہارے ملک پر دوسرے لوگ مسلط ہو جائیں لیکن اگر ملک ہاتھوں سے چلا بھی گیا ہے تو احکام حق سے بے وفائی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ وہ استفسار کرتے ہیں کہ آج تم لوگ خلافت کی گدائی کرنے لگے ہو۔ تو کیا تمہیں تاریخ سے واقفیت حاصل نہیں ہے۔ تاریخ تو واضح طور پر اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ حکومت اور سلطنت مانگنے سے نہیں ملا کرتی بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتی ہے اور یہ کہ جس بادشاہی کو اپنے لہو سے نہ خریدا جائے وہ تو مسلمانوں کے لیے باعث ننگ ہے۔ اقبال کہتے ہیں میرے نزدیک اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے علاج کی خاطر غیروں سے مرہم حاصل کرنا بے غیرتی کی بات ہے۔

ہمایوں

(مسٹر جسٹس شاہ دین مرحوم)

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی
گرچہ تھا تیرا تن خاکی نزار و درد مند تھی ستارے کی طرح روشن تری طبع بلند
کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا شعلۂ گردوں نورد اک مشت خاکستر میں تھا

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں　　شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

*

میاں دین محمد کا شمار پنجاب کے ان زعماء میں کیا جاتا ہے جو بیسویں صدی کے اوائل میں اس خطہ ارض کی عزت و تکریم کا سبب تھے۔ وہ اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ 1918ء میں وفات پائی تو اقبال نے یہ تعزیتی اشعار لکھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جسٹس دین محمد شاعر بھی تھے اور "ہمایوں" تخلص کرتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے اپنے والد کے نام پر ہی بلند پایہ ادبی رسالہ "ہمایوں" جاری کیا۔ خود اقبال کی بیشتر نظمیں اسی جریدے میں شائع ہوتیں۔

معنی: نزار: نحیف، کمزور۔ **شعلہ گردوں نورد:** آسمان کو لپیٹ میں لینے والا شعلہ۔ **مشت خاکستر:** خاک کی ایک مٹھی۔

مطلب: زیر تشریح اشعار میں اقبال فرماتے ہیں۔ اے ہمایوں! تیری زندگی تو ملت کے لیے سراپا سوز کی حیثیت رکھتی تھی۔ تیری ذات ایک ایسے چراغ کے مانند تھی جو ساری محفل کے لیے روشنی کا سبب بنتا ہے۔ ہرچند کہ تیرا جسم ناتواں خاک کا ایک مختصر سا تودہ تھا لیکن تیری روشن طبع تو ستاروں کی طرح سے منور تھی۔

اے ہمایوں! جو لوگ تیری شخصیت سے آشنا تھے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ تیرے ناتواں جسم میں کس قدر بیباک اور نڈر دل موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس مٹھی بھر مٹی میں ایک ایسا شعلہ موجود تھا جس کی لپک آسمان تک جاتی تھی۔

لیکن دانشمند لوگ موت کی قطعی پروا نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ رات کے سکوت میں آنے والی کل کے ہنگامے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ موت کو احمق لوگ زندگی کے خاتمے سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ یہ زندگی کی شام تو انسان کو ہمیشگی بخشنے والی صبح کے مانند ہے۔

خضرِ راہ

شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر　　گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر　　تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار　　موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر　　انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر　　جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل — چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب
دل میں یہ سن کر بپا ہنگامہ محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار — جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
"کشتی مسکین" و "جان پاک" و "دیوار یتیم" — علم موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد — زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ — اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقہ دیرینہ چاک — نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی — فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ — خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
آگ ہے، اولاد ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

جواب خضر

صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟ — یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں — گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام — وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح — یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیلؑ
وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب — جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیلؑ
اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں — اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش — اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل
پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

زندگی

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے

سوئے گردوں نالہ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دلبری

خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی، صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش — اور تو اے بےخبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — "خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول — غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمہ بیداری جمہور ہے سامان عیش — قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا — آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام — دوری جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار — زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

دنیائے اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں — مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل — خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ — جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبور نیاز
لے رہا ہے مے فروشان فرنگستاں سے پارس — وہ مے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند؟

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست — مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بےخبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے ساماں وجود مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر **لا یخلف المیعاد** دار

*

زیر تشریح نظم اقبال کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کی تشکیل حضرت خضر علیہ السلام اور ایک شاعر کے مابین مکالمے سے ہوئی ہے۔ حضرت خضرؑ کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے تاہم ان کے بارے میں جو مختلف روایات مشہور ہیں۔ ان کے مطابق وہ ایک ایسے پیغمبر ہیں۔ حق تعالیٰ نے جن کو طویل عمر عطا کی ہے۔ بالفاظ دگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ازل سے ابد تک دنیا میں موجود رہیں گے۔ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں بے شمار مقامات پر حضرت خضرؑ اور ان کے خصوصی کردار کا ذکر کیا ہے۔ اس مکالمے سے بھی اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت خضرؑ کی رہنمائی کو اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نظم کا آغاز شاعر کے مکالمے سے ہوتا ہے جس میں وہ شاعر کی زبان سے یوں گویا ہوتے ہیں۔

پہلا بند **معنی**: **سکوت افزا**: خاموشی کو بڑھانے والی۔ **گہوارے**: پنگھوڑا۔ **افسوں**: جادو۔ **انجم کم ضو**: کم روشنی والے ستارے۔ **طلسم**: جادو۔ **پیک جہاں پیما**: دنیا کی سیر کرنے والا قاصد۔ **جویائے اسرار**: راز کے متلاشی۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ ایک شاعر رات میں ساحل دریا پر سرگرداں پھر رہا تھا۔ ان لمحات میں نہ جانے میرا دل کس لیے اضطراب اور بے چینی میں مبتلا تھا۔ وہ رات انتہائی سکوت آمیز تھی' ساحل پر خوشگوار ہوا کا دور دورہ تھا اور اسی مناسبت کے ساتھ دریا بھی بڑی آہستگی اور نرم روی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس لیے دریا کا نظارہ کرتے ہوئے مجھے حیرانی اس امر کی تھی کہ یہ دریا ہے یا پھر پانی کی تصویر

ہے۔ دریا کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے گہوارے میں کوئی شیر خوار بچہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہو۔ یا پھر پانی کی مضطرب موج تھک تھکا کر محو خراب ہو۔ ان لمحات میں پرندے اپنے آشیانوں میں رات کے سحر میں گرفتار ہو کر سو رہے تھے۔ اور کم روشنی والے ستارے غالباً چاند کے طلسم میں گرفتار تھے۔

اس لمحے سامنے نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دنیا کی رہنمائی کرنے والا حضرؑ روبرو کھڑا ہے اور اس کی ضعیفی میں بھی صبح کی طرح عالم شباب کا رنگ موجود ہے۔ چند لمحے تک خاموش رہنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا کہ اے شاعر! تو جو ابتدائے آفرینش سے کائنات کے تمام رازوں سے آگاہی رکھنے والا ہے۔ اس حقیقت کو بھی پوری طرح جان لے کہ دل کی آنکھیں روشن ہوں تو پوری کائنات کی تقدیر اور اس کے بارے میں تفصیلات واضح ہو کر پردے سے باہر آ جاتی ہیں۔

حضرت خضرؑ کی زبان سے یہ نکتہ میری سماعت سے ٹکرایا تو دل میں ایک محشر سا بپا ہو گیا۔ میں تو ابتداء سے ہی حقیقت کی تلاش و جستجو میں مگن رہا تھا۔ حضرت خضرؑ سے مخاطب ہو کر بولا۔

دوسرا بند : معنی : **چشم جہاں بیں:** دنیا کو دیکھنے والی آنکھ۔ **کشتی مسکین' جان پاک' دیوار یتیم:** یہ تینوں تلمیحات ہیں۔ **آب زندگی:** (تلمیح) آب حیات۔ **ہاشمی:** ترکوں کی طرف سے مکہ میں شریف مکہ مقرر ہوا۔ **اولاد ابراہیم:** مراد ہے مسلمان۔

مطلب: اے خضرؑ! بے شک تو وہ صاحب بصیرت انسان ہے جس کی نگاہیں ان طوفانوں سے بھی آگاہی رکھتی ہیں جو ابھی خاموشی کے ساتھ دریا میں محو خواب ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تو ان انقلابات سے بھی واقف ہے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ اگلے شعر میں اقبال "سورہ کہف" میں بیان کردہ ایک واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک یتیم و مسکین کی کشتی کو خراب کرنے' ایک بے گناہ بچے کا قتل اور ضیافت سے انکار کر دینے کے باوجود یتیم بچے کی دیوار کو از سر نو تعمیر کرنا اور ان کے بارے میں حضرت موسیٰؑ کے اعتراضات اور سوالات سے اس امر کی غمازی ہوتی ہے کہ نبیؑ ہونے کے باوجود حضرت موسیٰؑ جیسے پیغمبر کا علم بھی تیرے سامنے حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اے خضرؑ! آخر یہ کیا تماشا ہے کہ تو آبادیوں کو چھوڑ کر صحرا نوردی میں مبتلا رہتا ہے اور تیری زندگی دیکھا جائے تو رات دن کے علاوہ آج اور کل یعنی ماضی و مستقبل کے تصورات سے قطعی آزاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری ذات ہر نوع کے سرد و گرم سے بے نیاز واقع ہوئی ہے لیکن اتنا بتا دے کہ یہ جو انسان کی زندگی ہے اس کا حقیقی بھید کیا ہے؟ سلطنت و حکومت کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ جو سرمایہ و محنت کے مابین آویزش ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یعنی سرمایہ دار اور محنت کش کے مابین تصادم کی فضا کیوں قائم ہے۔

اے خضرؑ دانا! آج صورت حال یہ ہے کہ ایشیائی ممالک کی تہذیب و ثقافت دم توڑ رہی ہے اور نئی اقوام ہیں کہ اقتدار حاصل کر رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ نئی نسلیں ان تازہ ترقی پذیر قوموں کے انداز و اطوار اپنا رہی ہیں۔ ہرچند کہ سکندر جیسا اولوالعزم فاتح پوری کوشش اور جدوجہد کے باوجود آب حیات سے محروم رہا اور ہمیشگی کی زندگی نہ اپنا سکا اس کے باوجود آج بھی سکندر کی مانند جنگ و جدل اور فتح و شکست کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ہاشمی جن کے طفیل ساری دنیا میں اسلام وسعت پذیر ہوا آج ناموس رسول مقبولؐ کو داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں اور ترک جو ایک عرصے تک اسلام کے مخالف رہے' اب اس کی بقا کے لیے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔

ماضی کی طرح حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور نمرود کے مابین آویزش جاری ہے یعنی حق و باطل میں بدستور تصادم ہے اتنا بتا کہ کیا اب بھی مسلمان امتحان کے مراحل سے گزر رہے ہیں؟

جواب خضر

صحرانوردی

تیسرا بند : معنی : تگاپوئے : دوڑ دھوپ۔ **دمادم :** مسلسل۔ **رہین خانہ :** خانہ نشیں۔ **بانگ رحیل :** قافلے کی رحلت کی صدا۔ **حضر :** قیام، پڑاؤ۔ **سنگ و میل :** راستہ کا نشان۔ **نمود اختر سیماب :** تیز رفتار ستارہ۔ **خلیلؑ :** حضرت ابراہیمؑ کا لقب۔ **سلسبیل :** جنت کی ایک نہر۔ **زنجیری :** قیدی، اسیر۔ **کشت و نخیل :** کھیت اور باغات۔

مطلب : شاعر کے استفسارات کے جواب میں خضرؑ یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے شاعر! میں جو صحرانوردی کے شغل سے دوچار ہوں تو تجھے آخر میرے اس عمل پر تعجب کس لیے ہے کہ میری یہ مسلسل بھاگ دوڑ اور جدوجہد عملاً زندگی کی دلیل ہے۔ اے گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے والے شاعر! تو نے وہ منظر نہیں دیکھا جب صحرا میں قافلے رواں دواں ہوتے ہیں اور ان کے اونٹوں کی گھنٹیاں عالم سکوت میں نغمے بکھیرتی ہیں۔ ریت کے ٹیلے پر ہرن بڑی بے نیازی کے ساتھ چوکڑیاں بھر رہا ہوتا ہے اور قافلے بغیر سامان کے کسی سنگ میل کی رہنمائی کے بغیر سفر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ ہر نوع کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور صبح کے وقت جب سیمابی فطرت رکھنے والے ستارے طلوع ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان کی بلندی سے حضرت جبرئیلؑ کی پیشانی نمودار ہو رہی ہے۔

اے شاعر! تو اس منظر سے کیسے آشنا ہو سکتا ہے جب کہ شام کے سمے صحرا کے سکوت میں سورج غروب ہو رہا ہو یہی منظر حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی وسعت نظر میں اضافے کا سبب بنا۔ پھر جب قافلے تھک کر پانی کے چشمے پر قیام کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جنت میں سلسبیل کے گرد اہل ایمان جمع ہوں جو لوگ عشق و محبت کے جویا ہوتے ہیں وہ تو نئے نئے صحراؤں کی جستجو میں رہتے ہیں جب کہ تیری ذات محض آبادی تک محدود رہتی ہے۔

اے شاعر! حقیقت یہ ہے کہ مسلسل گردش اور صحرانوردی ہی حرکت اور عمل کی دلیل ہوتے ہیں چنانچہ حقیقی زندگی کا راز ہی یہی ہے۔

زندگی

چوتھا بند : معنی : اندیشہ : فکر۔ **سود و زیاں :** نفع نقصان۔ **تسلیم جاں :** جان قربان کرنا۔ **امروز و فردا :** آج اور کل۔ **سر آدم :** آدم کی تخلیق کا راز۔ **کوہکن :** پہاڑ کھودنے والا (مراد فرہاد)۔ **جوئے شیر :** دودھ کی نہر۔ **بحر بیکراں :** بے کنارا سمندر۔ **تسخیر :** فتح۔ **مانند حباب :** بلبلے کی مانند۔ **شمشیر بے زنہار :** پناہ نہ دینے والی

تلوار۔

مطلب: آغاز نظم میں اقبال نے شاعر کی وساطت سے صحرانوردی' زندگی' سلطنت اور بعض دوسرے عوامل کے ضمن میں جو سوالات اٹھائے تھے ان کا فرداً فرداً جواب دیتے ہوئے صحرانوردی کے بعد اس بند میں خضرؑ اس طرح سے زندگی کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہیں کہ اے شاعر! زندگی تو ایک ایسا عمل ہے جو نفع نقصان کے تصور سے بلند ہوتا ہے۔ کہ زندگی کا صحیح مفہوم اس حقیقت میں ہی مضمر ہے کہ زندگی کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھا جائے اس لیے کہ کسی مرحلے پر تو زندگی جان و مال کے تحفظ کا نام ہے اور کسی مرحلے پر راہ حق میں جان و مال قربان کرنے کا نام زندگی ہے۔

اے شاعر! تو زندگی کو آج اور کل کے پیمانے سے کیوں ماپ رہا ہے۔ یہ تو ہر دم موجود رہنے والی ہے اور ہر دم جوان و زندہ شے ہے۔ اگر تجھ زندہ رہنے والے لوگوں میں شامل ہونے کا شوق ہے تو اس کے لازم ہے کہ دوسروں کی جدوجہد پر قناعت کرنے کی بجائے اپنی دنیا خود پیدا کر۔ اسی صورت میں تو یہ جان سکے گا کہ تخلیق آدم کا راز اور دنیا میں ہر شے کے وجود کا کرشمہ زندگی کے عمل سے ہی عبارت ہے۔

اے شاعر! اگر تو فی الواقع زندگی کی حقیقت جاننے کا خواہاں ہے تو اس ضمن میں فرہاد سے رجوع کر جس نے اپنے مقصد عشق کو حاصل کرنے کے لیے پہاڑ کاٹ کر وہاں سے دودھ کی نہر جاری کرنے کا کام کیا تھا۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو سکے گا کہ زندگی عیش و عشرت کا نام نہیں بلکہ عمل اور سخت کوشی کا نام ہے۔ یہ بھی جان لے کہ زندگی کا عمل غلامی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے جب کہ آزادی میں یہی زندگی وسعت پذیر ہو کر بحر بے کنار کی مانند ہو جاتی ہے۔ ہر چند کہ یہ اس کا تعلق خاک کے عنصر سے ہے لیکن اس میں دوسروں کو تسخیر کرنے کی بے پناہ صلاحیت بھی موجود ہے۔

اے شاعر! اگر ہستی کو ایک سمندر تسلیم کر لیا جائے تو تیرا وجود اس میں ایک بلبلے کی مانند ہے اور سچ پوچھیے تو یہاں یہ زندگی تیرے لیے ایک آزمائش اور امتحان کی حیثیت کی حامل ہے۔

یہ جان لے کہ جب تک تیری زندگی کا عمل ناپختہ ہے تو تیرا وجود محض ایک مٹی کے ڈھیر کی مانند ہے لیکن جب پختہ ہوا تو پھر شمشیر آبدار کی طرح ہے۔

پانچواں بند : معنی : مستعار: مانگے ہوئے۔ خاکستر: راکھ۔ لعل گراں: قیمتی پتھر۔ نالہ شبگیر: رات کو گھیرے میں لینے والی فریاد۔ عرصہ محشر: محشر کا میدان۔

مطلب: خضرؑ کہتا ہے کہ اے شاعر! اس حقیقت کا ادراک بھی تیرے لیے لازم ہے کہ جس دل میں سچائی کے لیے مرنے کی تڑپ موجود ہوتی ہے تو اس کے لیے عمل ناگزیر ہے کہ پہلے وہ اپنے خاکی جسم میں قوت عمل پیدا کرے۔ یہ زمین و آسمان تو ایک طرح سے بنے بنائے ہیں۔ قوت عمل تو اس امر کا نام ہے کہ انسان اپنا زمین و آسمان خود تخلیق کرے۔ مراد یہ ہے کہ مستعار لی ہوئی کوئی شے اتنی کار آمد نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی سطح پر اس کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اس لیے انسان پر لازم ہے کہ جو کچھ حاصل کرے وہ اپنی محنت اور قوت بازو سے حاصل کرے۔ زندگی میں جو قوت پوشیدہ ہے اس کو آشکار کرنا بھی ضروری ہے کہ یہی قوت ابدی حیثیت کی حامل ہتوی ہے۔ کامیابی و کامرانی کے لیے مشرق میں سورج کی مانند چمکنا بھی ناگزیر ہے۔ یہی عمل ماضی کی مثبت کارکردگی کی طرف لے جا سکتا ہے اور یہاں پہلے کی طرح ممتاز دانشور' فلاسفر اور صاحب فن پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ تیری آسمان تک رسائی ہو تیری

گرفت ستاروں پر بھی ہونی چاہیے۔
اے شاعر! یہ نہ بھول کہ تیرا عہد قیامت کی طرح ابتلاء کا عہد ہے جس کے لیے فرد پر لازم ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی اچھا کام اعمال نامے میں موجود ہے تو اسے پیش کیا جائے۔ مراد یہ کہ محض ترقی پانے کی خالی خولی خواہش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ کامیابی کے لیے قوت عمل درکار ہوتی ہے۔

سلطنت

چھٹا بند : معنی : آیہ ان الملوک: سورۂ نمل کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہی فساد برپا کر دیتے ہیں۔ **سلطنت:** یہاں مراد توسیع ملک سے ہے۔ **ساحری:** جادوگری۔ **خون اسرائیل:** حضرت موسیٰؑ جو بنی اسرائیل سے تھے۔ **طلسم سامری:** سامری کا جادو۔ **سروری:** سرداری۔ **ذات بے ہمتا:** ذات بے مثال۔ **مکن:** نہ کر۔ **خواجہ:** آقا۔ **برہمن:** بت پرست۔ **نوائے قیصری:** شہنشاہیت کی صدا۔ **استبداد:** ظلم۔ **پائے کوب:** ناچنے والا۔ **اعضائے مجالس:** قانون ساز اسمبلی کے ایوان عام اور ایوان خاص۔ **الاماں:** خدا محفوظ رکھے۔ **سراب:** دھوکہ۔

مطلب: شاعر نے چونکہ خضرؑ سے استفسارات میں سلطنت کے بارے میں بھی سوال کیا تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ چنانچہ اس کے جواب میں خضرؑ نے کہا کہ اے شاعر! آ میں تجھے اس حوالے سے قرآن پاک کی ایک سورۃ کی معنویت بتاتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ سلطنت صرف اور صرف طاقتور لوگوں کی طرف سے کمزور لوگوں کا استحصال کرنے اور ان پر حکمرانی کرنے کا نام ہے۔ مراد یہ کہ جو قوم طاقتور ہو گی وہ کمزور قوموں پر حکمرانی کر کے ان کا استحصال کرتی رہے گی۔ یہ عمل تو ایک ایسے طلسم کے مانند ہے کہ اگر کوئی کمزور قوم یا فرد اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور استحصالی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے تو طاقتور حکمران اپنے سحر انگیز حربوں سے ان کی قوت مدافعت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح اپنا جابرانہ نظام مسلط کیے رکھتے ہیں۔ اے شاعر! جان لے کہ ایسے حکمران جب غلام قوموں پر اپنا طلسم بکھیرتے ہیں تو وہ طوق غلامی پر بھی فخر کرنے لگ جاتے ہیں۔ محمود و ایاز اور اسی نوعیت کی مثالیں ایک واضح کیفیت کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن یہ صورت حال ایک حد تک قائم رہتی ہے کہ جب غلام قوموں پر حقیقت حال واضح ہوتی ہے تو ان کی غیرت و حمیت جاگ اٹھتی ہے اور جس طرح حضرت موسیٰؑ نے سامری کے طلسم کا توڑ کر کے اپنی قوم کو حقیقت حال سے باخبر کر کے بیدار کر دیا تھا اسی طرح کوئی بھی غلام اٹھ کر استحصالی قوتوں کو ختم کر دیتا ہے اور اپنی قوم کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

اے شاعر! یہ ایک حقیقت ہے کہ حکمرانی تو صرف رب ذوالجلال کی ذات تک محدود ہے۔ صرف خدا ہی حقیقی حکمران ہے باقی سب لوگ مصنوعی حیثیت کے حامل ہیں۔ کہ یہ ان کی حکومتیں عارضی ہوتی ہیں جو کبھی بنتی ہیں اور کبھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا تجھے چاہیے کہ اپنی آزاد فطرت کو غلامی سے رسوا اور بدنام نہ کرے۔ اس کے برعکس اگر تو خدائے واحد کے سوا کسی اور کو اپنا آقا تصور کرے گا تو جان لے کہ تو برہمن سے بھی بڑا کافر ہے۔ مغرب کا نیا نظام جسے دنیا بھر کے سیاستدان اور دانشور جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں فی الواقعہ وہی پرانا نظام ہے جو بادشاہت اور قیصریت سے ہم آہنگ رہا ہے۔ جمہوریت تو ایک

ایسے دیو کے مانند ہے ظلم و ستم جس کا شعار ہے۔ بدقسمتی سے تو اسے انفرادی آزادی کا پیغام لانے والا تصور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ جمہوری نظام میں عوام کی زندگی کو منظم کرنے' ان کی فلاح کے لیے ادارے قائم کرنے اور لوگوں کو رعایتیں اور حقوق دینے کے لیے جو ادارے قائم کیے گئے ہیں وہ مغربی استعماریت کا ایسا نسخہ ہے جس کے اثرات بظاہر شیریں ہیں لیکن لوگوں کو اپنے حقوق سے غافل کر دیتا ہے اور یہ اسمبلیاں اور ان کے ارکان کی پرجوش تقریروں سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ عوامی مسائل چشم زدن میں حل ہو جائیں گے لیکن غور کیجیے تو یہ سرمایہ داروں کی طرف سے مزید دولت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

اے شاعر! یہ جمہوریت کا نظام تو ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں جب کہ تو اسے ملک و ملت کے مفاد کے لیے بہترین طرز عمل سمجھے بیٹھا ہے۔ دیکھا جائے تو اس سراب کو رنگ و بو سے مزین گلستان سمجھا ہوا ہے بلکہ اس قدر نادان ہے کہ قفس کو بھی اپنے آشیاں سے تعبیر کر رہا ہے۔

سرمایہ و محنت

ساتواں بند : معنی : **پیام کائنات** : کائنات کے دل کی آواز۔ **شاخ آہو** : ہرن کا سینگ۔ **برات** : حصہ (مراد ہے رزق)۔ **دست دولت آفریں** : دولت پیدا کرنے والا ہاتھ۔ **مزد** : مزدوری۔ **اہل ثروت** : امیر لوگ۔ **زکات** : مراد بخشش۔ **ساحر الموط** : الموط کا جادوگر (مراد سرمایہ دار)۔ **مسکرات** : وہ چیزیں جو نشہ پیدا کرتی ہیں۔ **سکر** : نشہ۔

مطلب : خضرؑ پہلے سوالات کے جوابات کے بعد سرمایہ و محنت کے بارے میں شاعر نے جو سوال کیا تھا اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے شاعر! تو سرمایہ محنت کے حوالے سے بندۂ مزدور کو جا کر یہ پیغام سنا دے اور یہ امر خود بھی ذہن نشین کر لے کہ یہ پیغام صرف میرا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا پیغام ہے چونکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو مختلف مسائل پر ساری کائنات پیغام دیتی نظر آتی ہے کہ مزدور یہ حقیقت ہے کہ تیری محنت کا پھل بہانے بہانے سے سرمایہ دار کھا جاتے ہیں۔ تیری محنت سے سرمایہ دار ہی فائدہ اٹھاتا ہے اور تجھے اس کا برائے نام معاوضہ حاصل ہوتا ہے۔ تو دولت اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے لیکن اس کا معمولی سا معاوضہ سرمایہ دار اس انداز سے دیتا ہے جیسے تجھے زکوٰۃ کی رقم دے رہا ہو۔ یعنی محنت کش کو اس کی محنت کا پھل اس طرح دیا جاتا ہے جیسے اس پر احسان کیا جا رہا ہو۔

فی الواقعہ دیکھا جائے تو سرمایہ دار حسن بن صباح کی مانند ہے۔ حسن بن صباح اپنے معتقدین کو بھنگ پلا کر مدہوش کر دیتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں دنیا کی بہت بڑی دولت مل رہی ہے۔ سرمایہ دار بھی مزدوروں کو ان کے حقوق سے غافل کرنے کے لیے اسی طرح سے جل دیتا ہے اور بے چارہ محنت کش اپنی ناعاقبت اندیشی کے سبب زہر کو بھی مصری کی ڈلی سمجھ کر نگل لیتا ہے۔ سرمایہ داروں نے نسل' قومیت' عبادت گاہیں' سلطنت' تہذیب اور رنگ کے ایسے ایسے نشے ایجاد کر رکھے ہیں اور محنت کش انہی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے سرمست و سرشار ہو جاتا ہے حالانکہ یہ سب عناصر سرمایہ دار کے استحصالی نظام کے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ عام مزدور انہی عناصر کے نشے کے سبب اپنے ذاتی اثاثے سے بھی

محروم ہو جاتا ہے حالانکہ بغور دیکھا جائے تو مکر و فریب کی چالوں کے سبب سرمایہ دار محنت کشوں کا سب کچھ سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور غریب مزدور اپنی سادگی کی بنا پر ہمیشہ مار کھاتا ہے۔

لیکن اے مزدور اس خواب غفلت سے بیدار ہو کہ یہ استحصالی نظام اب زیادہ دیر جاری نہیں رہنا چاہیے۔ کائنات کی فضا بدل چکی ہے اور اب تو مغرب ہو یا مشرق' ہر جگہ بہرحال ساری دنیا میں تیرے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ مراد یہ کہ حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں جب مروجہ استحصالی نظام بدلے گا اور سرمایہ دار' مزدور کے حقوق غصب نہیں کر سکیں گے۔

اے شاعر! اگر انسان میں بلند ہمتی اور حوصلہ ہو تو وہ شبنم کا قطرہ تو الگ رہا اسے دریا بھی بخش دیا جائے تو وہ اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ جب کہ معمولی مراعات سے اب بھی دھوکہ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ آخر تو ان پر کب تک قناعت کرے گا ذرا بغور دیکھ کہ اصل حقیقت تو عوام کی بیداری میں پوشیدہ ہے۔ آخر سکندر و جمشید جیسے بادشاہوں کے مبہوت کرنے والے واقعات کب تک سنے گا۔ دیکھ کہ زمین کے بطن سے ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آخر ان ستاروں کا ماتم کب تک کرے گا جو عرصہ ہوئے ڈوب چکے ہیں۔ انسانی فطرت نے آج ان تمام زنجیروں کو توڑ ڈالا ہے جو استعماری نظام نے مسلط کی تھیں۔ یہ درست ہے کہ آدم کا جنت سے نکلنا ایک بڑا سانحہ تھا لیکن اب اس سانحہ کو یاد کر کے کیوں ذہنی کرب کا شکار ہوا جائے جس طرح پھولوں کا کھلنا ایک فطری امر ہے اسی طرح محنت کشوں کی بیداری بھی ایک فطری امر ہے۔ اب اس میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

اس شعر میں خضرؑ ایک بار پھر محنت کشوں کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کراتا ہے کہ اپنے معمولی معمولی مفاد کے لیے سرمایہ داروں کے گرد طواف کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا بلکہ اپنی عظمت کا احساس کرو اور اپنے حقوق جس طرح بھی ممکن ہیں حاصل کر لو۔

دنیائے اسلام

آٹھواں بند : معنی : نہاں: چھپا ہوا۔ **تثلیث :** باپ' بیٹا اور روح یعنی عیسائی۔ **میراث خلیلؑ :** مسلمانوں کا ورثہ۔ **خشت :** اینٹ۔ **کلاہ لالہ رنگ :** سرخ ٹوپی۔ **پارس :** ایران۔ **مے سرکش :** تند و تیز شراب۔ **مینا گداز :** صراحی کو پگھلا دینے والی۔ **گاز :** سونا کاٹنے کی قینچی۔ **ارزاں :** سستا۔ **بنائے کہنہ :** پرانی بنیاد۔

مطلب : زیر تشریح نظم میں اقبال نے شاعر کے کردار کے توسط سے مختلف موضوعات کے بارے میں خضرؑ سے جو استفسارات کیے ہیں یہ آٹھواں بند "دنیائے اسلام" کے حوالے سے ہے۔ تیئس اشعار پر مشتمل اس نظم کا یہ آخری اور سب سے طویل بند ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس نظم میں آغاز سے انجام تک ایک ایسی کیفیت موجود ہے جو قاری کو نہ صرف یہ کہ متاثر کرتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے اور شروع سے ہی جس طرح نظم آگے بڑھتی جاتی ہے اس میں زیادہ روانی اور زور پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ طویل نظم ایک طرح سے "بانگ درا" ہی نہیں بلکہ اقبال کی پوری شاعری میں بے حد اہم نظموں میں سے ایک ہے۔

مزید براں اس نظم کے موضوعات اور ان کی تفہیم کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کو اقبال کے فلسفے کے تناظر میں ہی دیکھا جائے۔ اقبال نے یہاں اظہار کے لیے جو موضوعات منتخب کیے ہیں ان میں "صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور اسلام کو بطور خاص پیش نظر رکھا ہے اور جس فنی مہارت، نفسیاتی اپچ اور فکری حوالوں کے ساتھ ایسے مباحث کو شامل کیا گیا ہے جن کا اظہار کم از کم شاعری میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان مباحث سے اس امر کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں رہتا کہ شاعری کے ابتدائی دور میں (بانگ درا کی تکمیل تک) اقبال کے نظریات کیا تھے۔

اقبال "زندگی" کو اول و آخر ہمیشہ مثبت انداز میں دیکھتے اور پرکھتے رہے ہیں۔ سلطنت کے حوالے سے وہ نہ آمریت کے قائل تھے (خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو) نا ہی جمہوریت پر یقین رکھتے تھے۔ سلطنت و جمہوریت والے بند میں انہوں نے جس انداز سے یہ موضوع زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے اس سے اختلاف کی گنجائش تو بے شک ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کا مروجہ جمہوری نظام، اسمبلیاں اور انتخابات پھر ملکی معیشت اور عوام کے مسائل کے پیش نظر ان کی باتیں بڑی حد تک درست نظر آتی ہیں۔

بہر حال یہ طے ہے کہ "خضر راہ" ایک ایسی نظم ہے جو ہمارے مروجہ نظام کے لیے ایک آئینے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "محنت و سرمائے" کی آویزش کے ساتھ محنت کش اور سرمایہ دار کا کردار اقبال نے جس مہارت سے پیش کیا ہے۔ اس پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ نظم کا آخری طویل حصہ اسلام کے بارے میں ہے۔ اس موضوع پر اقبال نے نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مذہب کو وسیع النظری کے حوالے سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیر، ملا، واعظ اور اسی نوعیت کے دوسرے کردار ان کی شاعری میں کسی مرحلے پر بھی مثبت تاثر پیدا نہیں کر سکے۔ بہر حال ان مختصر سی گزارشات کے ساتھ اب نظم کی طرف آیئے۔ وہ فرماتے ہیں:

خضرؑ عالم اسلام کے بارے میں استفسار پر شاعر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے شاعر! تو مجھے ترک و عرب یعنی عالم اسلام کی داستان کیا سناتا ہے؟ کہ میں اس سے پوری طرح سے آگاہ ہوں اور اس ضمن میں مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ورثہ تو اب مسلمانوں کی بجائے عیسائیوں نے حاصل کر لیا اور حجاز کی جو خاک تھی وہ اب کلیسا کی تعمیر میں کام آ رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغرب کی سیاست نے ملت مسلمہ کی شان و شوکت کو زیر و زبر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترک جیسی اولوالعزم قوم کی سرخ ٹوپی جو ساری دنیا میں باعث افتخار سمجھی جاتی تھی اب بدنام اور رسوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوسری طرف اہل ایران اپنی تہذیب و تمدن اور اس کے تشخص سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور مغرب کی نقالی میں مصروف ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ اہل یورپ کی سیاست اور عیاری کے سبب ملت مسلمہ اس طرح پارہ پارہ ہو چکی ہے جیسی قینچی سونے کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی ہے۔ آج تمام دنیا میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح سے بہہ رہا ہے اور اے شاعر تو اس صورت حال پر مضطرب اور بے چین ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے حالات کا پوری طرح تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اے شاعر! مولانا رومی کا قول ہے کہ کسی عمارت کو از سر نو تعمیر کرنا ہو تو پہلے اس کو بنیاد سے اکھاڑ دیتے ہیں اس کے بعد ہی وہ نئے سرے سے بنائی جا سکتی ہے۔

اے شاعر! اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک اور سلطنت پر غیروں نے تسلط جما لیا اور ملت اسلامیہ

اقتدار سے محروم ہو گئی۔ یہ صریحاً ناقابل تلافی نقصان تھا پھر بھی اس نقصان سے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور اب ان کو اپنے نفع نقصان کا احساس ہونے لگا ہے کہ خدا نے اسے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی بخشی ہے۔ اس صورت میں بغور حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انسانی تعمیر کے لیے مانگی ہوئی دواؤں کے حصول سے یہ امر زیادہ بہتر ہے کہ انسان ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے اور عارضی سطح پر شکست کو قبول کر لے۔ اس لیے کہ اگر تیرا وجود ایک معمولی چیونٹی کی مانند بھی ہو پھر بھی تجھے حضرت سلیمان جیسے عظیم فرمانروا کے روبرو حاجت روائی کے لیے دست طلب دراز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ امر تیری اناء کی توہین کے مترادف ہے اور تیری حمیت کی نفی کرتا ہے۔ مشرق کی نجات اسی نکتے میں مضمر ہے کہ ملت بیضا میں ہر چہار جانب اتحاد و یگانگت اور باہمی ارتباط کا سلسلہ از سر نو قائم ہو جائے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ایشیا کے لوگ ابھی تک اس نکتے سے آگاہی نہیں رکھتے۔

اے شاعر! میری بات غور سے سن کہ ملت کی نجات اسی عمل میں پوشیدہ ہے کہ سیاست کو ترک کر کے مسلمان از سر نو اپنے دین کی طرف رجوع کریں۔ اس لیے ملک و دولت کا بنیادی مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ حرم یعنی مذہب اور اپنی اقدار کا تحفظ کیا جا سکے۔ چنانچہ یہ امر ناگزیر ہے کہ حرم اور دین کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ دریائے نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک مسلمان متحد ہو کر صف آرا ہوں یعنی افریقہ سے لے کر ترکی تک مسلمان اپنے تمام اختلاف بھلا کر ایک ہو جائیں اسی اتحاد میں ملت اسلامیہ کی نجات ہے۔

اے شاعر! یہ بھی گوش ہوش سن لے کہ اگر ملت میں اختلافات باقی رہے تو وہ ہمیشہ کے لیے مٹ کر رہ جائے گی اس ضمن میں کوئی تخصیص نہیں کہ اختلاف کرنے والے خواہ شاہی خیموں میں رہنے والے ترک ہوں یا بلند مرتبہ خاندان سے تعلق رکھنے والے عرب ہوں کہ رنگ و نسل کا امتیاز ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے اور یہ امتیاز برقرار رہا تو ملت کا زوال ناگزیر ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ امتیازات کو ختم کر کے دین کی حقیقی بنیاد پر پیروی کی جائے کہ دنیا میں یہی عمل کامیابی و کامرانی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بھی جان لے کہ رنگ و نسل کی لعنت اگر دین پر مغربی اقوام کی طرح مسلط ہو گئی تو ملت اسلامیہ اس طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہ جائے گی جس طرح راہ میں پڑا ہوا غبار باد سموم کے جھونکوں سے اڑ کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔

اے شاعر! یاد رکھ کہ ملت اسلامیہ اسی وقت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر برسر اقتدار آ سکتی ہے جب کہ وہ ہر معاملے میں دین کی پیروی کرے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے اسلاف جیسی ہمت اور حوصلہ پیدا کیا جائے۔ یاد رکھ! کہ اسی صورت میں ساری دنیا میں خلافت کا نظام از سر نو قائم کیا جا سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اسلاف جیسے حوصلے' جراءت' وسیع المشربی اور قوت فیصلہ کے بغیر یہ اہم کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔

اس شعر میں مسلمانوں کے مابین فرقہ بندی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ ابوبکرؓ و علیؓ کی بڑائیاں ثابت کرنے کے چکر میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو اور فرقہ پرستی کو ہوا دے کر اپنی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے ہو۔ تمہیں ہوش و خرد کا دامن ہاتھوں سے تھامنا چاہیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تم پوشیدہ اور ظاہری باتوں میں امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے

تمہیں خبردار ہو جانا چاہیے۔ یہاں اس امر کی بطور خاص نشاندہی کی گئی ہے کہ مسلمان اپنے درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے چھوٹے چھوٹے باہمی اختلاف کی بنیاد پر نفاق کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ یوں اپنی قوت اور توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔

اب آخری مرحلے پر خضرؑ یوں کہتا ہے کہ اے شاعر! ملت پر متوقع مصائب کے بارے میں خدائے ذوالجلال کے حضور جو فریاد کی جانی چاہیے تھی عشق حقیقی کے طفیل وہ فریاد بھی ہو چکی۔ اب اس کے بعد یہی مناسب ہے کہ اس فریاد کے اثرات کا جائزہ لیا جائے کہ بارگاہ ایزدی میں اس فریاد کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ تو نے ابھی تک دریا' اس کی عظمت اور رفتار کی تیزی ہی دیکھی ہے اب ذرا یہ دیکھ کہ دریا کی تیز اور مضطرب موج خود اس کے لیے زنجیر کس طرح سے بنتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے مسلمانوں کو بے شک تہذیبی اور سیاسی سطح پر تو مفلوج کر کے رکھ دیا لیکن اس تہذیب کا اپنا کیا حشر ہو گا یہ حقیقت بھی عنقریب سامنے آ جائے گی۔

تمام دنیا کے لیے جو آزادی اور حریت فکر کا خواب اسلام نے دیکھا تھا وہ اب تعبیر کے مراحل میں داخل ہونے والا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آج بے شک مسلمان زوال سے دوچار سہی لیکن جس طرح ان کا ماضی شان و شوکت والا تھا بے شک آج وہ شاندار ماضی ایک خواب کی مانند ہے تاہم وقت آ گیا ہے کہ یہ خواب پھر سے شرمندۂ تعبیر ہو گا۔ اس کی مثال "سمندر" کی سی ہے۔ سمندر وہ کیڑہ جو آگ میں پیدا ہوتا ہے پھر اسی میں جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی راکھ سے خود ہی جنم لیتا ہے۔ مراد یہ کہ سمندر کا آگ میں جل کر خاک ہو جانا اس کی حیات نو کے لیے ایک پیغام ہے۔ مسلمانوں کی مثال بھی سمندر کے مانند ہے کہ ملت کی نشاۃ ثانیہ کا دور پھر سے متوقع ہے۔ مراد یہ کہ عالم اسلام اپنے انتہائی زوال کے بعد اب ترقی کی راہ پر از سر نو گامزن ہو گا۔

خضرؑ کہتا ہے کہ اے شاعر! میری گفتگو میں تجھے آنے والے دور کی تصویر یقیناً نظر آئے گی ہرچند کہ یہ تصویر فی الحال قدرے دھندلی ہے تاہم رفتہ رفتہ یہ تصویر واضح ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس حقیقت کو نہ بھولیو کہ فلک کج رفتار کے پاس ایک آزمودہ فتنہ بھی ہے جس کا نام تقدیر ہے۔ جان لے کہ تقدیر وہ شے ہے جس کے بالمقابل تدبیر کے سارے حربے ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

زیر تشریح نظم کے اس آخری شعر میں آل عمران کی ایک سورۃ سے اقتباس شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ خضرؑ شاعر سے کہتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس امر پر یقین رکھ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی بجائے اپنی امیدوں اور خوش آئند توقعات سے دل کو آباد رکھ۔ کہ ملت مسلمہ ایک بار پھر عروج سے دوچار ہو گی۔

طلوع اسلام

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی ۔۔۔ افق سے آفتاب ابھرا' گیا دور گراں خوابی

عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا ۔۔۔ سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی"
تڑپ صحن چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی
وہ چشم پاک بیں کیوں زینت بر گستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مرد غازی کی جگر تابی

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ربود آں ترک شیرازی دل تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہانبانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیث سوز و ساز زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمار جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدق سلمانیؓ
ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی

ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ، تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا؟
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دل گرمے، نگاہ پاک بینے، جان بیتابے

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خون شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبار رہگزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانان تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریان آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے، ادھر نکلے، ادھر ڈوبے، ادھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہِ اطلسِ قبایانِ تتاری ہے

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
"پس از مدت گذار افتاد برما کاروانے را"

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد

کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد

سرت گردم توہم قانونِ پیشیں سازدہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد

کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد

بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد

دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نمناک میگردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد

"بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم"

*

تعارف: اس حقیقت سے تو ہر صاحب ذوق اور اقبال شناس پوری طرح سے آگاہ ہے کہ "بانگ درا" علامہ اقبال کا اولین شعری مجموعہ ہے اور اب تک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ اشاعتی رفتار اور تعداد کے حوالے سے اردو زبان شاید ہی اس کے بالمقابل دوسری کوئی کتاب ہو۔

زیر تشریح نظم کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل اس امر کی نشاندہی غیر ضروری نہ ہو گی کہ "بانگ درا" میں نظموں اور غزلوں کی تعدادیوں تو سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے تاہم ان کی انتہائی اہم نظموں میں آٹھ طویل نظمیں شامل ہیں جو بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان میں علی الترتیب "تصویر درد' گورستان شاہی' شکوہ' جواب شکوہ' شمع اور شاعر' والدۂ مرحومہ کی یاد میں' خضر راہ اور طلوع اسلام نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ اقبال کا تفصیلی مطالعہ کیجیے تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ان طویل نظموں میں دوسرے کلام کی نسبت زیادہ زور اور بہاؤ ہے۔ اس سلسلے کی آخری نظم "طلوع اسلام" نو بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند : **معنی:** تنک تابی: مدھم روشنی۔ گراں خوابی: گہری نیند۔ عروق مردہ: مردہ رگیں۔ سینا: شیخ بو علی سینا۔ نطق اعرابی: عربوں جیسی قوت گفتار۔ چشم پاک بیں: پاکیزہ نظر۔ برگستواں: سپاہی اور گھوڑے کا لباس۔

مرکزی خیال: زیر تشریح نظم نو بندوں اور بہتر اشعار پر مشتمل ہے۔ اس امر کی وضاحت قدرے ضروری ہے کہ اقبال ایک دانشور کی حیثیت سے دل دردمند رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے مختلف حصوں میں ملت

سلامیہ کے عروج و زوال کو نہ صرف یہ کہ حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھتے ہیں بلکہ ان کے اثرات بھی
ول کرتے ہیں۔ بانگ درا کی اس آخری طویل نظم میں وہ نسبتاً رجائیت کے حوالے سے سامنے آئے
ں۔ ظاہر ہے کہ جس وقت اس نظم کی تخلیق عمل میں آئی تو ساری دنیا کے مسلمانوں' بالخصوص
ندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی دوڑ رہی تھی جو اقبال کی افتاد طبع اور خواہشات کے عین مطابق
ھی۔ چنانچہ پوری نظم اسی قسم کے تاثرات کی آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں۔

مطلب: شب کے آخری لمحات میں ستاروں کی روشنی جس طرح سے ماند پڑ رہی ہے اس سے اس امر کا
خوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ صبح نمودار ہونے والی ہے۔ جلد ہی افق سے سورج طلوع ہو گا اور پوری کائنات
پنی گہری نیند سے بیدار ہو جائے گی۔ چنانچہ مشرق کی مردہ رگوں میں اسی سبب زندگی کا گرم لہو دوڑنے لگا
ہے تاہم یہ صورت حال ایک ایسے راز سے ہم آہنگ جسے بو علی سینا اور فارابی جیسے دانشور اور فلسفی بھی
نہیں سمجھ سکتے۔ مغرب میں جو تہذیب و تمدن کو فروغ ہوا ہے اور وہاں کے استعمار نے جس طرح کمزور
ملکوں خصوصیت سے مسلم حکومتوں کو زیر نگیں کر لیا ہے اس کا رد عمل بالا خر دنیا بھر کے مسلمانوں میں
رونما ہونے لگا ہے۔ اس صورت حال نے انہیں پھر سے اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع ہونے کی
ترغیب دی ہے۔ اس لیے کہ موجوں کے تند و تیز تھپیڑے ہی ایک معمولی قطرۂ آب کو قیمتی گوہر میں
ڈھال دیتے ہیں۔

اقبال پر امید ہو کر اس توقع کا اظہار کرتے ہیں کہ اب وقت آ پہنچا ہے کہ مرد مسلمان کو ایک بار پھر
ترکوں جیسی شان و شوکت' ہندوستانیوں جیسی فکر اور عربوں جیسی تہذیب اور فصاحت و بلاغت کے جوہر
عطا ہوں۔ اس کے باوجود اگر مسلمانوں میں ذہنی سطح پر زوال کے کچھ اثرات باقی ہیں تو یہ اب شاعروں اور
دانشوں کی ذمے داری ہے کہ وہ انہیں زیادہ بلند آواز کے ساتھ خواب غفلت سے بیدار کریں۔ خواہ اس
آواز میں تلخی بھی شامل کرنا پڑے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ ہر مقام پر قیام بیداری بن جائیں۔ یہ امر پیش
نظر رکھتے ہوئے کہ پارے کی فطرت میں جو اضطرابی کیفیت ہے وہ کسی طور پر بھی نہیں بدل سکتی۔

اہل ایمان کے روبرو تو انتہائی زریں اور بلند پایہ اصول موجود ہیں پھر ان پر کب لازم آتا ہے کہ ان کی
توجہ دوسروں کی تہذیب و تعلیمات پر مرکوز ہیں خصوصاً اس لیے کہ جب انہیں اپنے اسلاف کی فتحمندانہ
فطرت اور دلیری سے بھی آگاہی ہو۔

سو اے شاعر! یہ تیری ذمے داری ہے کہ مسلمانوں کے پژمردہ دلوں میں پھر سے زندگی کی تڑپ بھر
دے۔ آرزوؤں اور امیدوں کے چراغ روشن کر دے یہی نہیں بلکہ تیرے پیغام میں اتنی شدت ہو کہ ملت
کا ایک ایک فرد تحقیق و جستجو کا والہ و شیدا بن جائے۔

دوسرا بند : معنی : سرشک : آنسو۔ نیساں : ایسی بارش کے قطرے جو سیپیوں میں پڑ کر موتی بن
جاتے ہیں۔ ربود : چھیننا۔ جہانبانی : حکومت۔ جہاں بینی : دنیا کا مشاہدہ کرنا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح موسم بہار کے کے بادلوں سے تازگی اور قوت تخلیق کے اثرات
نمودار ہوتے ہیں یہی کیفیت اب مسلمانوں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں موجود دکھائی دیتی
ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی اولاد میں پھر سے وہ قوت عمل
بیدار ہونے لگی ہے جو کبھی ان کے اسلاف کا ورثہ ہوا کرتی تھی اور جس کے سبب انہوں نے اپنی قلیل

تعداد کے باوجود دنیا بھر میں فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ ملت مسلمہ ایک بار پھر سے یکجا و متحد ہو کر باطل کے خلاف صف آرا ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں امت محمدیؐ اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہونے کو ہے۔ ترکی کے عظیم سپوت مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے رفقاء نے اپنی جراءت و ہمت کے طفیل ایران اور افغانستان کے مسلمانوں کے دل جیت لیے اور جس طرح صباء پھولوں کی خوشبو کو اپنا ہم سفر بنا لیتی ہے اسی طرح دوسرے علاقوں کے مسلمان بھی ترکوں کی طرح بیدار ہو گئے ہیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل میں ترکوں کو بے حد قربانیاں دینی پڑیں اور بے حد دکھ اٹھانے پڑے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ لاکھوں ستاروں کی موت ہی نمود سحر کا میاب بنتی ہے یعنی قربانیوں کے بغیر کامیابی اور کامرانی ممکن نہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ گردو پیش کے معاملات اور ان کے بارے میں حقیقت تک رسائی کا عمل کسی ملک پر حکمرانی سے زیادہ مشکل امر ہے۔ اس لیے کہ دل خون ہو کر بہ جائے تو چشم بصیرت وا ہوتی ہے۔ اپنے استدلال کی حمایت میں اقبال نرگس کے حوالے سے ایک تمثیل اس طرح پیش کرتے ہیں کہ نرگس کا پھول جو آنکھ سے مشابہت رکھتا ہے وہ ہزارہا سال بینائی سے محرومی کے کرب میں مبتلا رہتا ہے اس کے باوجود بصارت پھر بھی اس کا مقدر نہیں بنتی کہ اس کا حصول بے حد مشکل ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان آنکھیں رکھنے کے باوجود بصیرت حاصل کرنے کے لیے بڑے مرحلوں سے گزرتا ہے۔

اے شاعر! اب تجھ پر یہ امر پھر سے لازم ہو گیا ہے کہ افراد ملت جو ایک عرصے سے بے عملی کا شکار رہے ہیں۔ تیرے پر جوش نغموں سے ان کے خون میں حدت پیدا ہو جائے اور وہ ماضی کی طرح جراءت و ہمت سے کام لے کر صف آرائی کے لیے تیار ہو سکیں۔

اس مقصد کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ اے شاعر! تیرے سینے میں زندگی کا جو راز پوشیدہ ہے وہ منکشف کر دے اور مسلمانوں کو زندگی کے ان تمام نشیب اور فراز سے آگاہ کر دے جو ان کی نظروں سے بوجوہ پوشیدہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ملت کے افراد اپنی بے حسی کے سبب ماضی کے اصولوں اور تعلیمات کو جس طرح بھلائے بیٹھے ہیں تو ان کو آگاہ کر دے۔

تیسرا بند : معنی : **خدائے لم یزل**: لازوال خدا۔ **چرخ نیلی فام**: نیلا آسمان۔ **حنا بند**: مہندی لگانے والے۔ **عروس**: دلہن۔ **معمار جہاں**: حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تھا۔ **ممکنات زندگانی**: زندگی کی ترقی کے امکانات۔ **جوہر مضمر**: چھپی ہوئی صلاحیتیں۔ **ارمغاں**: تحفہ۔ **نکتہ**: باریکی۔ **ملت بیضا**: ملت اسلامیہ۔

مطلب: اے شاعر! اب وقت آگیا ہے کہ مرد مسلمان کو اس حقیقت سے آشنا کر دے کہ اس دنیا میں تو ہی ازل سے ابد تک رب ذوالجلال کا نائب ہے تو ہی اس کی زبان اور قدرت کاملہ کا مظہر ہے۔ البتہ یہ ہے تو بے اعتمادی کا شکار ہے چنانچہ اپنی حقیقت کو پوری طرح سے جاننے کے لیے یقین و اعتماد حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ تیرا دل شکوک و شبہات کا خزینہ بنا ہوا ہے جس کے سبب تو حقائق کی آگاہی سے محروم رہتا ہے۔ لہٰذا تجھ پر لازم ہے کہ خود میں یقین و اعتماد پیدا کرے۔

اے مسلمان! ذرا غور کر کہ تیری منزل مقصود تو آسمان سے بھی کہیں آگے ہے۔ تیرے بلند مقاصد کے سامنے ستارے بھی گرد کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قدرت نے تیرے مقام کو جو رفعت عطا کی ہے وہ کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ

عالم امکاں فانی ہے اور اس میں موجود باشندے بھی فانی ہیں۔ ان کی ذات آنی جانی ہے صرف ایک تو ہی ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ ازل سے ابد تک جس کی زندگی باقی رہے گی اس لیے کہ ایک تو ہی رب ذوالجلال کا آخری پیغام ہے اسی باعث اے مسلمان تو ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ تیرا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ہے جنہوں نے خدا کا گھر تعمیر کیا تھا لیکن تیری ذمے داری کچھ اور زیادہ ہے یعنی یہ کہ ساری دنیا کی تعمیر کرے اس کو منظم کرے۔ زندگی کے جس قدر امکانات بھی موجود ہیں دیکھا جائے تو تو ان کا امانت دار ہے اس اعتبار سے یہ پوشیدہ امکانات تیری وساطت سے ہی اہل عالم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس عالم فانی سے جو پانی اور مٹی جیسے عناصر سے بنا ہوا ہے جب نبوت ہمیشہ کے لیے عالم جاوداں کے لیے رخصت ہوئی تو صرف اور صرف تیرا وجود ہی اس کے ہمراہ تھا۔

اے مسلمان! سن کہ یہ نکتہ بھی اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہا کہ ملت مسلمہ کی تاریخ اس امر کی مظہر ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے ہمیشہ ایشیائی اقوام کا تحفظ کیا۔ اس صورت حال میں تیرے لیے لازم ہے کہ پھر سے اپنے اسلاف کی تعلیمات کو یاد کرے یعنی سچائی' انصاف اور شجاعت کو اپنائے جو تیرے اجداد کی خصوصیات تھیں اس لیے کہ یہ تو طے ہے اور قدرت نے اس مرتبے کا تجھے اہل قرار دیا ہے کہ بالآخر مستقبل میں دنیا بھر کی رہنمائی اور قیادت کا ذمہ دار تو ہی ہے۔

چوتھا بند : معنی : مقصود فطرت: فطرت کی مرضی۔ **رمز:** حقیقت۔ **جہانگیری:** حکومت۔ **مرغ:** پرندہ۔ **قہستانی:** ایک علاقہ کا نام۔ **قیصر:** روم کے بادشاہوں کا لقب۔ **کسریٰ:** ایران کے بادشاہوں کا لقب۔ **جادہ پیما:** راستہ طے کرنے والا۔ **المانی:** جرمنی باشندہ۔ **انگارۂ خاکی:** مراد انسان۔ **روح الامیں:** حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لقب۔

مطلب: ملت مسلمہ کے جملہ افراد کو مخاطب کرتے ہوئے زیر تشریح اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ اے مرد مسلمان! تیرے لیے لازم ہے کہ تو محبت اور بھائی چارے کے رویے کو ساری دنیا میں عام کر دے۔ بغور جائزہ لیا جائے تو فطرت کا مقصود بھی یہی ہے اور اسلام کی تعلیمات میں بھی انہی رویوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہ جو رنگ اور نسل کے بت ہیں ان کو توڑ کر ہی تو ملت کا ایک جزو بن سکتا ہے۔ یہ رنگ و نسل تو اخوت اور محبت کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں ہیں۔ اتحاد و اتفاق کے لیے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تیری شناخت تورانی' ایرانی اور افغانستانی باشندے کے حوالے سے نہیں بلکہ ملت کے فرد کے طور پر ہو۔ ملت واحدہ کا تصور اسی صورت میں عام ہو سکتا ہے کہ علاقائی حدود کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔

اے مرد مسلمان! تو غیروں کے درمیان کب تک اپنی انفرادیت کو گم کرتا رہے گا جب کہ تیرے بازو میں ایسی قوت ہے کہ تو اپنا جہاں آپ تعمیر کر سکتا ہے تیری ذات تو شاہین جیسی ہے جو دوسرے پرندوں کا مارا ہوا اور پس خوردہ کھانے سے گریز کرتا ہے اور بلند پروازی کے ذریعے اپنے لیے خود ہی شکار کرتا ہے۔ یوں بھی تیری ذات میں یقین و اعتماد کا جو عنصر ہے وہ اس اعتماد و یقین سے خالی دنیا میں ایک روشن چراغ کے مانند ہے اور اس روشن چراغ کی ہیئت اس انداز کی ہے جیسے صحرا کی اندھیری رات میں کوئی دیا جگمگا رہا ہو۔

تو اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ ہو گا کہ ایران و روم کے قیصر و کسریٰ کی ہیبت و سطوت کو حضرت علی مرتضیٰؓ کی قوت و شجاعت' ابوذر غفاریؓ کے فقر اور درویشی کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ کی صداقت نے

ہی تہہ و بالا کر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ تو بھی انہی خصوصیات کا امین اور وارث ہے۔ گویا علیؓ جیسی بے لوث قوت و شجاعت' ابوذر غفاریؓ جیسا بے ریا فقر اور سلمان فارسیؓ جیسی بیباک صداقت ہی ملت اسلامیہ کو کفر و باطل کے ظلم و ستم کے خلاف صف آرائی کا اہل بنا سکتے ہیں۔

اے مرد مسلمان! تیرے بزرگوں کی تاریخ اس امر کی غماز ہے کہ تیرے جراءت مند و بہادر اسلاف کس شان و شوکت سے اپنے دشمنوں کے خلاف صف آرا' ہوئے تھے اور ان کو شکست فاش دی۔ یہ مناظر ابھی تک تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ بھی جان لے کہ ایمان محکم ہی وہ خصوصیت ہے جس کے طفیل زندگی پائیدار و استوار ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال جرمن اور ترک ہیں کہ جرمن ہر طرح کے اسلحہ سے لیس ہونے کے باوجود بے وسیلہ ترکوں کے جذبہ حریت سے شکست کھا گئے۔

جان لے کہ مسلمان میں جب یقین و اعتماد جنم لیتا ہے تو اسے بے سروسامانی میں بھی حضرت جبرئیلؑ جیسی قوت پرواز حاصل ہو جاتی ہے۔

پانچواں بند : معنی : **ذوق یقیں**: ایمان کی قوت۔ **حذر**: ڈر' خوف۔ **چیرہ دستاں**: ظالم۔ **تعزیریں**: سزائیں۔ **ناب**: خالص۔

مطلب: یہ بند اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اقبال نے یہاں یقین و اعتماد کے موضوع کو نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ غلامی کے دور میں اسلحہ اور تدابیر عملاً اس وقت تک مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں جب تک کہ متعلقہ قوم کے افراد یقین و اعتماد کی منزل تک نہ پہنچ جائیں۔ یہی وہ صورت ہے جو غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اگلے شعر میں یوں گویا ہیں کہ جو مرد مومن یقین کامل کا اہل ہو اس کے زور بازو کا اندازہ کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں کہ اس کی نگاہ ہی قوموں کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت کی حامل ہوتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ سلطنت' حکومت اور علمی سائنس جس کے ذریعے انسان ہر نوع کی مادی ترقی حاصل کرتا ہے یہ سب ایمان کے ایک نکتے کی توضیح و تشریح سے ہم آہنگ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگر ایمان پختہ ہو تو جملہ عناصر فطری طور پر انسان کے زیر ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسا یقین کامل اور پر اعتماد نظر عام انسان میں پیدا ہونا ناممکنات سے نہیں تو یہ عمل اتنا سہل بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ انسانی ہوس اور خواہشات اپنے لیے ایسی راہ متعین کرتی ہیں جو ذاتی مفادات کی آئینہ دار ہو۔

قدرت نے تمام انسانوں کو اگرچہ مادی حقوق کا اہل قرار دیا ہے لیکن مفاد پرست اور خود غرض لوگوں نے انہیں آقا اور غلاموں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے اور یہی تفریق خلق خدا کے مابین فساد کا سبب بنی ہے لیکن اس تفریق و امتیاز کے ذمے دار لوگوں کو خبردار رہنا چاہیے کہ وہ باز نہ آئے تو قدرت ان کو سخت سزا بھی دے سکتی ہے ہمیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہر شے خواہ وہ مٹی سے پیدا ہوئی ہو یا نور سے وجود میں آئی ہو ان سب کی حقیقت ایک جیسی ہی ہے یعنی اگر ذرے کا دل چیرا جائے تو اس میں سے سورج کا لہو ٹپکنے کا امکان ہے۔ اقبال نے ذرے اور سورج کے حوالے سے اس مصرعہ میں جو تمثیل پیش کی ہے۔ انتہائی خوبصورت اور زوردار ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مٹی کا ایک ذرہ اور سورج جو منور ہے عملاً ایک جیسے خواص کے حامل ہیں اس کا حوالہ تابکار ذرات بھی بن سکتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی جدوجہد اور اس کی تسخیر میں یقین کامل، مسلسل جدوجہد اور سب سے محبت و شفقت ایسے اسلحہ کی مانند ہیں جو مرد مومن کی فتح کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

ایک مرد کامل کو طبع بلند، مشرب و ملک میں خلوص، دل زندہ حرارت لیے ہو، نگاہ پاکیزہ اور پھر روح مضطرب و بے چین ہو ان سب عوامل کے سوا زندگی میں اور کیا چاہیے۔ مراد یہ کہ مذکورہ خصوصیات ہی ایک فرد کو مرد کامل بنا سکتی ہیں۔

چھٹا بند : معنی: **خون شفق**: شام کے وقت جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو آسمان پر سرخی چھا جاتی ہے۔ **کیمیا**: اکسیر (فن کیمسٹری)۔ **پیر حرم**: مکہ کا محافظ۔ **نوریان آسمان**: مراد فرشتے۔ **پائندہ تر**: بہت مضبوط۔

مطلب: اقبال اپنے عہد کی سیاست اور مستقبل کے تجزیہ نگار کے طور پر کس قدر بالغ نظر اور دور رس نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان امور کا اندازہ زیر تشریح بند کے اشعار سے ہوتا ہے۔ یہاں ان کا اشارہ جنگ عظیم اول کے دوران ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے والی اقوام کی جانب بھی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے کردار کا جائزہ بھی لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو قوم اپنے بے شمار سامان جنگ کے ساتھ اپنے حریفوں کے خلاف نبرد آزما ہوئی اس قدر قوت رکھنے کے باوجود شکست کھا گئی اور یوں لگا کہ وہ تو ایک بے بس قوم کے مانند تھی۔ (اقبال کا اشارہ جرمنی کی طرف ہے) جب کہ وہ قوم جس کے پاس بظاہر وسائل نہ ہونے کے برابر تھے اپنی جنگ آزادی میں بالآخر کامیاب و کامران ٹھہری۔ (اس مصرعہ میں اشارہ ترکی کی جانب ہے) ہر چند کہ اہل جرمنی فنون حرب میں مہارت کے سبب سمندروں کی تہہ میں بھی تیرنے کی صلاحیت رکھتے تھے پھر بھی وہ آخر کار وہیں غرق ہو کر رہ گئے۔ اس کے برعکس ترک جو وسائل اور مہارت کی کمی کے سبب موجوں کے تھپیڑے کھا رہے تھے وہ بالآخر سمندر کی تہوں سے کامیاب و کامران بن کر برآمد ہوئے۔ جن لوگوں کو اپنی سائنسی اور مادی ترقی پر ناز تھا ان کو شکست کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا اور وہ ترک جو زمین پر بڑی عاجزی و انکساری کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے تھے وہ دشمن کے بالمقابل قد آور ثابت ہوئے اور ان کا غرور خاک میں ملا گئے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بے معنی نہ ہو گی کہ جنگ عظیم اول میں انگریز کے خلاف اگرچہ ترکی جرمنی کا اتحادی تھا جنگ میں شکست تو دونوں نے کھائی۔ جرمنی تباہ و برباد ہو گی جب کہ ترکی اپنی سیاسی بصیرت کے سبب وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس جنگ کے دوران شریف مکہ نے ترکوں کے ساتھ غداری کی جس کے نتیجے میں وہ بدنام و رسوا ہوا جب کہ ترکوں نے عالم اسلام میں بھی سرخروئی حاصل کی۔ اقبال نے یہاں اس واقعہ کی نشاندہی کی ہے۔ فرشتے بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ ترک تو زیادہ زندہ دل، زیادہ عزم محکم رکھنے والے اور زیادہ روشن دماغ ثابت ہوئے۔ فی الواقع اہل ایمان دنیا میں اسی طرح سے زندگی کا سفر طے کرتے ہیں جس طرح آسمان پر سورج کہ مشرق میں طلوع ہوتا ہے تو مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور مغرب میں طلوع ہوتا ہے تو مشرق میں غروب ہو جاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ فی الواقع کسی قوم کے افراد میں یقین کی دولت ہی اس قوم کا سرمایہ ہوتی ہے یہی، قوت ہے جس سے ملت کی تعمیر و تنظیم ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ یقین کامل کے بغیر کسی قوم کی تعمیر و عروج ممکن نہیں۔

ساتواں بند : معنی : کن فکاں: خدا نے کن کہا اور دنیا وجود میں آئی۔ رنگ و نسب: ذات پات۔ مرغ حرم: مراد مسلمان۔ حلقہ شام و سحر: صبح و شام کا چکر۔ حریر و پرنیاں: ریشم و مخمل۔ جوئے: ندی۔

مطلب: طویل نظموں میں خصوصیت کے ساتھ موضوع کے علاوہ تکنیک پر اقبال کی گرفت اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ وہ جہاں سے چاہیں اور جس طرح چاہیں بات کا رخ موڑ دینے پر قادر ہوتے ہیں۔ زیر تشریح نظم میں بھی انہوں نے ایک سے زیادہ دفعہ اس عمل کا مظاہرہ کیا ہے چنانچہ نظم کے اس بند میں بھی وہ ایک بار پھر مسلمانوں سے مخاطبت اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اے مرد مسلماں! تیری حیثیت اس عالم رنگ و بو میں قدرت کے ایک راز کی سی ہے۔ تیرے لیے یہ امر لازم ہے کہ اپنی حقیقت سے آگہی حاصل کر لے اور خدائے ذوالجلال کے احکامات کی ترجمانی کرتے ہوئے خودی کی حکمت سے آشنائی حاصل کرے۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ لالچ اور خواہشات نے بنی نوع انسان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ تجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بھائی چارے اور محبت کے رشتوں میں پرو کر ایک بار پھر انسانی برادری کو گروہی تقسیم سے نجات دلائے اور ان میں اتفاق و اتحاد کی ایسی فضا قائم کر دے کہ وہ ہر طرح کی نفرتوں اور رقابتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی ہے وہ خراسانی ہے۔ یہ افغانی ہے اور وہ تورانی۔ غرض لوگ مختلف فرقوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کی مثال ایک سمندر کی موجوں کی طرح ہے جو بے شک الگ الگ اپنا عمل جاری رکھتی ہیں لیکن ایک نقطے پر پہنچ کر آپس میں مربوط ہو جاتی ہیں اور کسی طور پر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں کہ اسی میں ان کی عافیت ہے۔

اے مرد مومن! تو خود اس نوع کے امتیازات میں الجھا ہوا ہے حالانکہ تیرا تعلق حرم کعبہ سے ہے جو اتحاد و یگانگت کی علامت ہے تیرے لیے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد اور عمل ناگزیر ہے تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ گروہی سیاست اور نفاق کی پالیسی کو ختم کر دے۔ اے غفلت شعار اگر تو اپنی حیثیت ہمیشہ کے لیے مستحکم کرنے کا خواہاں ہے تو پھر صبح و شام کے مخمصوں سے نکل کر اپنی خودی میں ڈوب جا کہ یہی حقیقی زندگی کا راز ہے۔ عملی جدوجہد کے مابین جہاں حریفوں سے معرکے درپیش ہوں وہاں تیرا وجود فولاد کی طرح سخت ہونا چاہیے اور جہاں تو اپنوں میں ہو وہاں محبت و شفقت درکار ہے ایسے مقامات پر نرم روی سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب پہاڑوں اور صحراؤں کو عبور کرنا ہو تو سیلاب کی سی تندی و تیزی اختیار کر اور راہ میں کوئی گلستاں آ جائے تو پھر اس ندی کی طرح رواں رہ جو نغمے گاتی ہوئی بہتی چلی جاتی ہے اس شعر کا مضمون بھی گذشتہ شعر کی مانند ہے کہ دوستوں سے محبت و شفقت اختیار کر اور دشمنوں سے سختی۔

اے مرد مسلماں! اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ تیرا علم اور تیرا جذبہ محبت دونوں یکراں ہیں یعنی انتہا پر پہنچے ہوئے ہیں اور مظاہر کائنات میں بھی تیرا وجود سب سے اعلیٰ اور بلند ہے۔

علامہ اقبال نے اس بند کے تمام اشعار میں ملت مسلمہ کو اسکا صحیح مقام یاد دلانے کی کوشش کی ہے اور زیادہ زور ایک طرف تو نفرت و نفاق کو چھوڑ کر اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرنے پر دیا ہے دوسری جانب یہ بھی تلقین کی ہے کہ دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے عملی جدوجہد ناگزیر ہے۔

آٹھواں بند : معنی : صید زبوں: عاجز اور بے بس شکار۔ خیرہ: چکا چوند۔ ریزہ کاری: نگینے اور

اہرات جڑنا۔ فسوں کاری: جادوگری۔ نوری: نور سے بنا ہوا فرشتہ۔ جولانگہ: میدان۔ اطلس: ریشم۔

طلب: اقبال یہاں طبقاتی صورت حال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ دنیا ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا
ں ہے لیکن آج بھی ایک عام انسان ملوکیت اور آمریت کے روبرو انتہائی ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا
رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر المیہ اور کیا ہو گا کہ انسان خود ہی آج بھی انسان کا استحصال کرنے میں فخر
وس کرتا ہے۔ ہرچند کہ عصر حاضر کی تہذیب بظاہر چمک دمک اور تزئین و آرائش کے اعتبار سے
ھوں کو چندھیا دیتی ہے اس کے باوجود بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مصنوعی تہذیب
وٹے موتیوں کی مانند ہے جو چمک تو دیتے ہیں لیکن قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔
اقبال اگلے شعر میں کہتے ہیں کہ وہ حکمت و دانش جس پر مغربی دنیا کے فلسفیوں اور دانشوروں کو ناز
ا ہے دیکھا جائے تو ایک ایسی تلوار کی طرح ہے جس سے اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے خون بہانے کا کام
جاتا ہے یعنی ان حکمت و دانش کو محض اپنے ذاتی مفاد اور کمزور قوموں کے استحصال کی خاطر استعمال کیا
تا ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ جس نظام کی بنیاد سرمایہ داری پر مبنی ہے ایسے فکر و تدبر مستحکم نہیں کر سکتے
۔ اس نوع کے تمدن زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوتا خواہ اس کو کتنا ہی استحکام بخشنے کی کوشش کی جائے۔
اقبال کہتے ہیں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف عمل اور جدوجہد ہی ہے جو زندگی کی تعمیر میں بنیادی
ردار ادا کرتے ہیں۔ انہی کے سبب انسانی زندگی جنت بھی بن سکتی ہے اور اگر عمل درست نہ ہوں تو جہنم
نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے کہ پیدائشی سطح پر انسان نہ تو جنتی ہے نا دوزخی۔ بلکہ اس کے اچھے
ے اعمال ہی ہر طرح کی برائی بھلائی کے ذمے دار ہیں۔
اے مسلمان دانشور! یہ قدرت نے تجھ میں ہی صلاحیت پیدا کی ہے کہ ملت مسلمہ کی صحیح رہنمائی کر
ے اور اس کے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرے تاکہ وہ کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو۔
ر تشریح شعر میں اقبال ایک بار پھر یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ پھر ایک بار ایشیائی باشندے صورت حال
و سمجھنے لگے ہیں۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہی کہ باہمی اتحاد و محبت ہی پر سکون اور خوشحال زندگی کے لیے
ز یر ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے زمین پر ان ترکوں کے وہ گھوڑے دوڑ رہے ہیں جنہوں نے اطلسی لباس
یب تن کیا ہوا ہے۔

زیر تشریح بند کا یہ آخری شعر معمولی سی ترمیم کے ساتھ نظیری کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آ کہ
رے کمزور و ناتواں جسم کا خریدار آ گیا ہے اور ایک مدت کے بعد قافلہ ہمارے قریب سے گزر رہا ہے۔
راد یہ ہے کہ ملت کی بہبودی کے دن نزدیک آ گئے ہیں اور افراد قوم اب متحد و متفق ہو کر اپنی منزل مقصود
جانب چل پڑے ہیں۔

ال بند : معنی : بیا : آ۔ نگار آمد : معشوق۔ از فراز : بلندی۔ سرت گردم : میں تجھ پر قربان ہو
وں۔ خیل : گروہ۔ بانگ ہزار آمد : بلبل کی آواز۔ خواجہ بدر و حنین : حضور سرور کائنات ﷺ
نھوں نے بدر و حنین کے غزوات میں کافروں کو شکست دی۔ دگر شاخ خلیلؑ : حضرت ابراہیم کی اولاد یعنی
سلمان۔ سقف : چھت۔ طرح : بنیاد۔

طلب: نظم کو تمام کرتے ہوئے زیر تشریح بند میں اقبال نے امید و رجائیت کا انداز اختیار کیا ہے۔ وہ
تے ہیں کہ اے ساقی! موسم بہار آ گیا ہے۔ درختوں کی سرسبز شاخوں پر خوشنما پرندے چہچہانے لگے ہیں

اور اپنے لحن میں نغمے گا رہے ہیں۔ آمد بہار کے ساتھ ہمارا محبوب بھی آ گیا ہے اور اس کی آمد کے ساتھ دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ موسم بہار کے بادلوں نے ہر وادی اور صحرا میں اپنے خیمے نصب کر لیے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے آبشاروں نے نغمہ ریزی شروع کر دی ہے۔

اے ساقی! میری زندگی تجھ پر نثار ہو۔ آ اور اپنے انعام و اکرام کا سلسلہ بحال کر دے کہ اب تو نغمہ گروں کے گروہ قطار در قطار چلے آ رہے ہیں۔ تو ان عبادت گزاروں سے کنارہ کر لے کہ جو شراب کے مخالف ہیں اور بے جھجک پینا پلانا شروع کر دے کہ ایک عرصے کے بعد ہمارے اپنے چمن کی شاخوں سے بلبل کی نغمہ ریز صدائیں بلند ہونے لگی ہیں۔

اے ساقی آ! اور بدر و حنین کے آقا آنحضرتؐ کا ذکر خیر ان کے عشاق کو سنا۔ آنحضرتؐ نے جو رازہائے دروں محفوظ رکھے تھے وہ اب مجھ (اقبال) پر ظاہر ہو گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم یعنی ملت اسلامیہ ایک بار پھر ہماری جدوجہد اور قربانیوں کے سبب تر و تازہ ہو گئی ہے اور بازار محبت میں ہماری پونجی کھری ثابت ہوئی ہے میں شہید کی قبر پر لالے کے پھول چڑھا رہا ہوں کہ اس کا خون ملت اسلامیہ کے پودے کو بے حد راس آیا ہے۔ یہاں اقبال کا اشارہ یقیناً واقعات کربلا اور شہادت عظمیٰ کی جانب ہے۔

نظم کو تمام کرتے ہوئے اقبال حافظ شیرازی کے اس شعر کی تضمین کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "آ کہ ہم پھول برسائیں اور اپنے پیالوں میں شراب ڈالیں آسمان کی چھت میں سوراخ کر دیں اور نئے دور کی بنیاد رکھ دیں"۔

(حصہ سوم)

غزلیات

اور

ظریفانہ کلام

اس حصے میں بانگ درا کی وہ غزلیں اور ظریفانہ کلام ہے جو اقبال نے 1908ء کے بعد تخلیق کیا۔ ہرچند کہ غزلوں کا انداز بڑی حد تک کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے اس کے باوجود ان کے متعدد اشعار میں اقبال کا عہد اور ان کی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے ان غزلوں کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ رہا ظریفانہ کلام کا مسئلہ تو اس ضمن میں بات آگے چل کر ہو گی۔

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دور وصالِ بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس! حجابِ محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلا بھی گئی

کی ترک تگ و دو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگی فطرت بھی گئی اور کشمکش دریا بھی گئی

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

*

معنی: بادِ صبا: صبح کی ہوا۔ موجِ پریشاں: بیقرار موج۔ **حجابِ محمل**: محمل کا پردہ۔ **تگ و دو**: بھاگ دوڑ۔

① اس غزل کے اولین شعر میں اقبال بادِ صبا سے مخاطب ہو کر نہایت یاسیت کے لہجے میں کہتے ہیں کہ اے بادِ صبا! آنحضرتؐ کو جن کو کملی والے سے موسوم کیا جاتا ہے ازراہ کرم یہ پیغام پہنچا دینا کہ حضورؐ کی امت کے ہاتھوں دین تو خیر گیا ہی تھا اب دنیا بھی چلی گئی یعنی امت مسلمہ کی بے عملی کے سبب اس پر ہر شعبے میں زوال کی کیفیت ظاہر ہے۔

② غزل کے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ دریا میں جو ایک موج مضطرب تھی اس کو ساحل نے یہ پیغام دیا کہ ابھی سمندر تو بہت دور ہے اور تو اس معمولی سے دریا میں ہی پریشانی سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان آزمائش کی ابتدائی گھڑی میں ہی پریشان ہو جائے تو پھر وہ منزل تک کیسے پہنچ سکے گا۔

③ اے قیس! تیری محبت کا بھرم محض اس لیے قائم ہے کہ حسن پردہ نشین ہے اور اگر یہ پردہ ہی نہ تھا تو پھر تیری عزت و غیرت اور لیلا کا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟ مراد یہ ہے کہ عشق میں جو کشش ہوتی ہے وہ محض حجاب کے سبب ہی ہوتی ہے اگر یہ حجاب ختم ہو کر رہ جائے تو پھر عشق کی تمامتر کشش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

④ پانی کا قطرہ اپنی تمامتر جدوجہد کے بعد جب ایک مقام پر ساکن ہو گیا تو گوہر آبدار بنا اس کا مقدر ہوا یوں ایک معمولی بلبلہ جدوجہد کے بعد بلند مرتبے پر فائز ہو گیا چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس کی فطرت میں آوارگی کا جو عنصر موجود تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور دریا کے ساتھ جو کشمکش تھی وہ بھی اختتام کو پہنچی۔

⑤ ہرچند کہ اقبال کے لبوں سے یہ امید افزا صدا بلند ہوئی ہے تاہم نہ جانے اس کا محرک کون ہے پھر بھی یہ صدا محفل کو تڑپا گئی اور سننے والے بھی پر سکون ہو گئے۔

②

یہ سرود قمری و بلبل فریب گوش ہے — باطن ہنگامہ آباد چمن خاموش ہے
تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مے مغرب اثر — خندہ زن ساقی ہے، ساری انجمن بیہوش ہے
دہر کے غم خانے میں تیرا پتا ملتا نہیں — جرم تھا کیا آفرینش بھی کہ تو روپوش ہے
آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے، وہ دل نہیں — پہلوئے انساں میں اک ہنگامہ خاموش ہے
زندگی کی رہ میں چل، لیکن ذرا بچ بچ کے چل — یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

جس کے دم سے دلی و لاہور ہم پہلو ہوئے
آہ! اے اقبال، وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

*

معنی: سرود: نغمہ، گیت۔ **فریب گوش:** کان کو دھوکہ دینے والا۔ **آفرینش:** پیدائش۔ **مینا خانہ:** صراحی۔

① اس غزل کے ابتدائی دو شعر جو پس منظر رکھتے ہیں وہ اقبال کے عہد اور اس عہد کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے کہے گئے ہیں۔ پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو قمری اور بلبل کی نغمہ گری ہے وہ دیکھا جائے تو سراسر فریب اور دھوکا ہے اس لیے کہ ان نغموں کے پس منظر میں بظاہر ہنگاموں سے بھرا ہوا چمن اور اس کا باطن خامشی اور بے زبانی کا مظہر نظر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغربی حکمرانوں کی دل خوش کن باتوں سے فریب نہیں کھانا چاہیے۔ اس کے بجائے ملک و قوم کی بدحالی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔

② دوسرے شعر کا اشارہ بھی مغربی حکمرانوں کی طرف ہے کہ ان حکمرانوں نے ہندوستان میں جو تہذیب و تمدن مسلط کیے ہیں وہ ہمارے لیے کسی طرح پر بھی سودمند نہیں۔ اس کے باوجود اہل ہند اس تہذیب کے سبب خود کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ جب کہ انگریز ہمیں اس طرح احمق بنانے پر اظہار مسرت کر رہا ہے۔

③ انسان اس دنیا میں آکر اس قدر بے عمل ہو گیا ہے کہ اپنا وجود کھو بیٹھا ہے گویا فطرت نے اس کو پیدا کر کے کوئی جرم کیا تھا جو انسان یوں غائب ہو گیا ہے۔

④ اور یہ دنیا جس چیز کو دل تصور کرتی ہے وہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے دل محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ تو انسان کے پہلو میں ایک عضو معطل کے مانند ہے۔

⑤ زندگی کا سفر طے تو ضرور کرنا ہے لیکن اس سفر کے دوران احتیاط لازم ہے کہ انسان کو بے شمار ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ ذمے داریاں بڑی نازک ہوتی ہیں۔

⑥ جس شخص کی وجہ سے دلی اور لاہور کے مابین رابطہ قائم ہوا وہ بھی وفات پا گیا۔ یہاں اقبال کا اشارہ میرزا ارشد گورگانی کی موت کی طرف ہے۔

③

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناری بت خانۂ ایام ابھی

عذر پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوش انجام ابھی

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات
تیری میزاں ہے شمار سحر و شام ابھی

ابر نیساں! یہ تنک بخشی شبنم کب تک؟
مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردان عجم وہ، عربی میری شراب
مرے ساغر سے **جھجکتے** ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

*

معنی: بلبل شوریدہ: دیوانی بلبل۔ **مصلحت اندیش**: اچھا برا سوچنے والا۔ **فرمودۂ قاصد**: قاصد کی ہدایت۔ **سبک گام عمل**: تیزی سے عمل۔ **دہر آشوبی**: دنیا بھر میں قیامت کا ہنگامہ۔ **سعی پیہم**: لگاتار کوشش۔ **کم و کیف حیات**: زندگی کی مقدار اور کیفیت۔ **تنک بخشی**: کنجوسوں کی طرح بہت تھوڑی چیز دینا۔ **جھجکتے ہیں**: بدکتے ہیں۔

① اے شاعر! تو جس طرح عصری صورت حال میں نا آسودگی کے سبب یوں آہ و زاری کر رہا ہے تو امر واقع یہ ہے کہ اس عمل میں سوز دروں شامل نہیں جس کے سبب تیرے نالے ناپختہ ہیں۔ لہٰذا تجھ پر لازم ہے کہ ان میں مزید سوز اور درد پیدا کر۔

② اس شعر میں اقبال ایک حکیمانہ نکتہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل اگر مصلحت اندیشی کی قائل ہو جائے تو یہ اس کی پختگی کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس عشق میں مصلحت اندیشی جذبے کی خامی کی مظہر ہے۔

③ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ عشق الٰہی کے طفیل انجام کی پروا کیے بغیر نمرود کی آگ میں کود پڑے۔ اس کے برعکس اگر یہ عمل عقل و دانش تک محدود ہوتا تو وہ پہلے تمام حالات کا احتیاط سے جائزہ لیتے اور فوری عمل سے گریز کرتے۔

④ محبوب کی جانب سے پیغام ملتے ہی عشق تو بے دریغ اس پر عمل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے جب کہ اپنی تمام تر تیزی و طراری کے باوجود عقل اس پیغام کو بروئے کار لانے میں تذبذب کا شکار رہتی ہے۔

⑤ عشق کا طرز عمل تو آزادی اور انقلاب سے ہم آہنگ ہے جب کہ تو دعویٰ عشق کرنے کے باوجود ابھی تک اپنے آپ میں گم ہے۔

⑥ اے شخص! تو جو عمل کے سلسلے میں حیل و حجت سے کام لے رہا ہے تو اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ تجھے اس عمل اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج پر یقین نہیں ہے۔

⑦ زندگی کی تمام کیفیات کا دارومدار جدوجہد اور عمل پر ہے جب کہ تو ابھی تک صبح و شام کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔

⑧ اس شعر کا مفہوم یہی ہے کہ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔

⑨ میرے نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے لوگ اس لیے جھجکتے ہیں کہ یہ ان کی فطرت اور افتادِ طبع کے منافی ہے۔

⑩ گلستان میں صبح کی تازہ ہوا یہ خبر لے کر آئی ہے کہ نیا نیا گرفتار ہونے والا یہ شخص اپنے قفس میں مضطرب ہے اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔

④

پردہ چہرے سے اٹھا‘ انجمن آرائی کر چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کب تک بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیرِ حرم دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر
اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر
پہلے خوددار تو مانندِ سکندر ہو لے پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر
مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

✱

معنی: **چشمکِ پنہاں:** چھپ چھپ کر آنکھوں سے اشارے کرنا۔ **دریوزہ گری:** بھیک مانگنا۔ **باندازۂ رعنائی:** حسن و جمال کا اندازہ۔ **بادیہ پیمائی:** جنگل جنگل پھرنا۔

① یہ غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے جس کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ اے میرے محبوب! اپنے چہرے سے پردہ اٹھا کر اس طرح دیکھنے والوں کو جلوہ دکھا کہ وہ مبہوت ہو کر رہ جائیں حتیٰ کہ سورج‘ چاند اور ستارے بھی تیرا جلوہ دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

② اگر تو بجلی کے مانند رخشندہ ہے تو میں اپنے وجود کو چھپاتا کیا؟ اے محبوب! اس صورت میں لازم ہے کہ کسی حجاب کے بغیر میرے دل میں جاگزیں ہو جا۔

③ حیاتِ انسانی میں سانس کی حرارت ایک معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تیرے میں یہ حرارت موجود ہے تو تجھے بھی حضرت عیسیٰؑ کی مانند مسیحائی کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔

④ حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر ربِ ذوالجلال سے جلوہ دکھانے کی جو درخواست کی تھی بے شک وہ تو ایک طرح سے بھیک مانگنے کی حیثیت رکھتی تھی لیکن تیرے لیے لازم ہے کہ اس نوعیت کی درخواست کی بجائے اپنے ہی وجود سے کوہِ طور جیسے جلوے کو برآمد کر۔

⑤ اس شعر میں اقبال براہ راست مرد مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری خاک کے ہر ذرے میں ایسی بھرپور صلاحیت ہونی چاہیے کہ اس سے کعبے کی تعمیر ممکن ہو سکے لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ تو کلیسا کی تہذیب سے چھٹکارا حاصل کر لے اور اپنے ماضی کی طرف لوٹ آئے۔

⑥ اے محبوب! اس عالم رنگ و بو میں حد سے گزرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں کہ تو نے اپنے ناز بھی دکھانے ہیں تو اپنی بساط کے مطابق دکھا۔

⑦ پہلے سکندر کی مانند خوددار تو بن جا اس کے بعد ہی دارا جیسے بادشاہ کی شان و شوکت کی تمنا درست ثابت ہو سکتی ہے۔ ورنہ خودداری اور غیرت مندی کے بغیر اس نوع کی کامرانی ممکن نہیں۔

⑧ اے اقبال آخر کار ایک روز تجھے تیری منزل مقصود ہاتھ آ ہی جائے گی تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ ابھی کچھ مزید جدوجہد کر۔

⑤

پھر باد بہار آئی' اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو! گل ہے' تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹھی ہے' اجزا کی حرارت سے
برہم ہو' پریشاں ہو' وسعت میں بیاباں ہو
تو جنس محبت ہے' قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر' اس دیس میں ارزاں ہو
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے' ہر گوش پہ عریاں ہو
اے رہرو فرزانہ' رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو' صحرا ہے تو طوفاں ہو
ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل' غارت گر ساماں ہو

*

معنی: کم مایہ: کم سرمایہ۔ رہرو فرزانہ: عقلمند مسافر۔

① زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آمد موسم بہار کے ساتھ مست و سرشار ہوائیں چلنے لگی ہیں لہٰذا تجھ پر غزلخوانی لازم ٹھہرتی ہے۔ اگر تو غنچہ ہے تو پھول بن جا اور پھول ہے تو گلستان میں تبدیل ہو جا۔ مراد یہ کہ موسم بہار کی رنگ آمیز فضا میں اپنے وجود کو بھی عمل ارتقاء سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔

② ہرچند کہ تو حقیقت خاک کے مانند ہے اس کے باوجود جملہ عناصر کی حرارت کا منبع ہے اور اگر یہ عناصر منتشر ہو جائیں تو صحرا جیسی وسعت اختیار کر سکتے ہیں۔ مراد یہ کہ جبر کی فضا میں بھی انسان اختیار کا اہل ہوتا ہے۔

③ اے اقبال! تیرا وجود تو جنس محبت کا ہم پلہ ہے اس اعتبار سے تیری ذات انتہائی گراں قیمت رکھتی ہے لیکن تو جس سرزمین کا باشندہ ہے وہاں تو خریداری کرنے والے سوداگر ہی بہت کم مایہ اور بے وسیلہ ہیں جو تجھے موجودہ قیمت میں خریدنے کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذا اگر تجھے ان کا پاس ہے تو خود کو ارزاں کر لے اس صورت میں شاید وہ تیرے خریدار بن سکیں۔

④ تیری آواز اے فن کار کسی ساز کے پردے میں کس لیے پوشیدہ رہے کہ تو تو ایسا رنگیں نغمہ ہے جس کی رسائی ہر فرد کے کانوں تک ہونی چاہیے۔

⑤ بے شک تو ایک دانشمند مسافر کی طرح سے ہے کہ جس کے دوران سفر راہ میں کوئی باغ ہو جائے تو تو اس کے لیے شبنم بن جائے اور اگر صحرا آ جائے تو طوفان کا روپ دھار لے۔

⑥ اے اقبال! اگر تو مسافرت کے دوران ساز و سامان کا آرزومند ہے تو یہ رویہ تن آسانی کے مصداق ٹھہرتا ہے اور اگر مقصد حصول منزل ہو تو پھر کسی طرح کے زادِ راہ کی ضرورت نہیں بلکہ اگر سفر کا کوئی سامان تیرے پاس موجود ہے تو اسے اٹھا کر پھینک دے کہ باہمت لوگوں کو منزل مقصود تک رسائی کے لیے کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اگر ان کے پاس کوئی مددگار شے بھی ہے تو وہ ہمت، جراءت اور بلند حوصلگی ہوتی ہے۔

⑥

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے! ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

*

معنی: حقیقت منتظر: حقیقت جس کا انتظار کیا جائے۔ **طرب آشنائے خروش:** شور و غل اور ہنگامے سے خوشی حاصل کرنے والا۔ **دم طوف:** چکر لگاتا۔ **کرمک شمع:** چراغ کا پتنگا، پروانہ۔ **عفو بندہ نواز:** ایسی معافی جس میں بندے پر لطف و کرم کیا گیا ہو۔

① زیر تشریح غزل کے مطلع میں رب ذوالجلال کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اے مالک حقیقی! تو نے خود کو ابتدائے آفرینش سے حجاب میں چھپا رکھا ہے لیکن تیرے بندے دیدار کے لیے ترس رہے ہیں لہٰذا اب ضروری ہو گیا ہے کہ حجاب سے نکل کر مادی شکل اختیار کر لے کہ میری عجز و انکسار میں ڈوبی پیشانی میں ہزارہا سجدے مضطرب و منتظر ہیں کہ کب تو سامنے ہو اور ہم سجدہ ریز ہو جائیں۔

② تجھے تو اس عالم رنگ و بو کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونا چاہیے کہ تیرا وجود ایک ایسی صدا کے مانند ہے جس کی رسائی عام لوگوں کی سماعت تک ہو۔ یوں بھی ایسے نغمے کی کیا حیثیت ہے جو ساز کے پردے کی خامشی میں گم ہو کر رہ جائے۔ اس شعر کا مفہوم بھی مطلع سے ملتا جلتا ہے۔

③ اے محبوب! تیرا دل بے شک ایک آئینے کی مانند ہے یہ بھی فطری امر ہے کہ تو اسے ٹوٹنے سے

بچا رہا ہے لیکن یہ عمل شاید مفید نہ ہو کہ جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو باری تعالیٰ کی نگاہوں میں زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔

④ شمع کے گرد طواف کرتے ہوئے پروانے نے کہا کہ اے شمع! کہ ماضی کی وہ تاثیر نہ تو تیرے جلنے میں موجود ہے نا ہی میرے جل مرنے کے عمل میں باقی ہے۔ اس لیے کہ اب ہمارے عمل میں خلوص موجود نہیں رہا۔

⑤ اے مولائے کائنات! میرے گناہ گار وجود کو ساری دنیا میں کسی مقام پر بھی پناہ نہیں مل سکی جب کہ اس گناہ نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ پناہ ملی بھی تو محض تیرے دامن رحمت میں۔ جہاں میرے گناہ کو نہ صرف یہ کہ چھپا لیا بلکہ معاف کر دیا۔

⑥ اب تو صورت حال ایسی ہو گئی ہے یعنی زمانے میں اس طرح کا انقلاب رونما ہوا ہے کہ عشق میں بھی پہل کی طرح حرارت نہیں رہی نا ہی حسن میں وہ شوخیاں باقی رہیں اس کی وجہ سے نہ تو غزنوی میں وہ تڑپ ہے نا ہی ایاز کی زلفوں میں وہ پیچ و خم باقی ہیں جو کشش کے آئینہ دار تھے۔ مراد یہ ہے کہ عاشق اور محبوب دونوں اپنی صفات سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

⑦ غزل کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اپنی بے عملی کے باوجود میں اگر کبھی سجدہ ریز ہوا تو زمین سے یہ آواز آتی سنائی دی کہ دل تو تیرا بتوں کا پرستار ہے پھر تجھے اس نماز میں آخر کیا ملے گا کہ خلوص کے بغیر کوئی عمل درست نہیں ہوتا۔

⑦

تہ دام بھی غزل آشنا رہے طائران چمن تو کیا ۔۔۔ جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی
ترا جلوہ کچھ بھی تسلی دل ناصبور نہ کر سکا ۔۔۔ وہی گریہ سحری رہا، وہی آہ نیم شبی رہی
نہ خدا رہا نہ صنم رہے، نہ رقیب دیر و حرم رہے ۔۔۔ نہ رہی کہیں اسد اللہی، نہ کہیں ابولہبی رہی
مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

٭

معنی: طائران چمن: باغ کے پرندے۔ **زیر لبی:** ہونٹوں کے نیچے۔ **ناصبور:** بے صبر دل۔ **اسد اللہی:** حضرت علیؓ کی شان۔ **ابولہبی:** حضرت رسول کریم ﷺ کے چچا کی کنیت جو حضورؐ کے سخت مخالف تھے۔ **ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم:** عجم کے مضرابوں کے ظلم و ستم۔ **نوا مری عربی:** مراد ہے اسلام کا پیغام۔

① غلامی کے دور میں بھی اگر اہل وطن نغمہ ریزی کرتے رہے تو اس سے کیا فائدہ۔ اس لیے کہ حصول آزادی کے لیے دل میں جو تڑپ تھی اس کا اظہار بھی کسی طور پر ممکن نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نغمہ ریزی محض ایک منافقانہ عمل ہے۔

② اے میرے محبوب! تو نے بے شک اپنا جلوہ دکھایا لیکن اس سے مجھے اطمینان قلب حاصل نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ اب بھی پہلے کی طرح میں تیرے فراق میں صبحدم گریہ و زاری کرتا رہا اور وہی نصف

شب کے وقت آہیں بھرتا رہا۔

③ اب تو وہ دور آگیا ہے کہ لوگ خدا سے تو الگ رہے بتوں کے تصور سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں نہ وہ حق اور سچائی کو اہمیت دینے کے لیے تیار ہیں نا ہی جھوٹ اور باطل کے پرستار رہے۔ مراد یہ ہے کہ عہد موجود کا انسان کسی بھی عقیدے کا قائل نہیں رہا جس کا سبب ہر طرح کا انتشار ہے۔

④ اقبال کہتے ہیں کہ ہرچند شاعری میں میرا اظہار اور اسلوب مغربی اثرات سے نجات نہ پا سکا اس کے باوجود یہ ملت سے وفاداری کا تقاضا ہی تھا کہ میں نے خود کو ہمیشہ اسلام سے وابستہ رکھا۔

⑧

گرچہ تو زندانیِ اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر آیہ **لا یخلف المیعاد** رکھ
یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے
"ان وعد اللہ حق یاد رکھ"

*

معنی: **زندانی اسباب:** ظاہری وسیلوں کا پابند۔ **لسان العصر:** زمانے کی زبان۔

① اس حصے کی آخری غزل چار اشعار پر مشتمل ہے۔ مطلع میں کہا گیا ہے کہ ہرچند اے شخص تو حالات کا مارا ہوا ہے۔ اس کے باوجود تجھ پر لازم ہے کہ اپنے دل کو اس قید سے ضرور آزاد رکھنے کی کوشش کر۔

② عقل و دانش تو ہمہ وقت تنقید و اعتراضات میں الجھی رہتی ہے چنانچہ اگر زندگی میں کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ہے تو اپنے عمل کی بنیاد عشق کے جذبے پر رکھ۔ کہ یہی جذبہ جدوجہد اور کامیابی سے عبارت ہے۔

③ اے مسلماں! تیرے روبرو ہر گھڑی قرآن کی یہ آیت ہونی چاہیے کہ اللہ کے وعدے جھوٹے نہیں ہوتے۔ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔ آخری مصرعہ اکبر الہ آبادی کا ہے۔ اقبال نے اس پر تضمین کی ہے۔

بانگ درا
کا
ظریفانہ کلام

اس مجموعے کے آخری چند صفحات میں اقبال کا ظریفانہ کلام شامل کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنے طور پر اکبر الٰہ آبادی سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ ان کا یہ ظریفانہ کلام بھی شاید اسی سلسلے کی کڑی ہے تاہم شاعری کو ظرافت سے ہم آہنگ کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس میں تو وہی تخلیق کار کامیاب ہو سکتے ہیں ظرافت جن کی فطرت میں رچی بسی ہو۔ اقبال ایک سنجیدہ شاعر تھے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے۔ ملاحظہ ہو۔

ظریفانہ

①

رق میں اصول دین بن جاتے ہیں   مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
ہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے   واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

*

نی: مشین بن جاتے ہیں: مشین کی طرح عمل ہوتا ہے۔

① ظریفانہ کلام کے اس قطعہ میں اقبال کہتے ہیں کہ مشرقی ممالک کے لوگ اس قدر سادہ اور امت پرست ہیں کہ زندگی کے عام اصولوں کو بھی دین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی الک میں سب جانتے ہیں کہ صنعتی ترقی اس نہج پر پہنچی ہوئی ہے کہ یہی اصول میکانکی عمل کا حصہ بن تے ہیں۔ نتیجہ بالعموم یہ برآمد ہوتا ہے کہ مشرقی ممالک سے جو نوجوان حصول تعلیم کے لیے مغربی الک میں جاتے ہیں وہ عام طور پر وہاں عیسائیت سے متاثر ہو کر تثلیث کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس عر کا دوسرا مفہوم یہ بھی برآمد ہو سکتا ہے کہ مذکورہ نوجوان مغربی تہذیب میں اس طرح سے گھل مل تے ہیں کہ مقامی لڑکیوں سے شادی رچا لیتے ہیں اور جب ان سے اولاد پیدا ہوتی ہے تو وہ وہیں کے ہو ہتے ہیں۔ یہاں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

②

ڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر   وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

*

معنی: فلاح کی راہ: بہتری کا راستہ۔ روشِ مغربی: یورپ کی طرزِ معاشرت۔ وضعِ مشرق: مشرق کے طور طریقے۔

① یہ قطعہ ایک طرح سے خالص اکبر الہ آبادی کے رنگ میں ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ ندوستان میں اب لڑکیوں میں بھی انگریزی پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ان کے لیے خصوصی کالجوں کا اجراء ہو رہا ہے۔ اقبال ایسی تعلیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ یوں لگتا ہے لڑکیوں کو انگریزی پڑھا کر قوم فلاح پا جائے گی لیکن ہوا یوں ہے کہ لوگوں نے اس طرح سے مغرب کی تہذیب اپنا لی ہے کہ وہ اپنی وضع کو عملی سطح پر گناہ سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ اگر اس صورت حال کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہ ہو گا کہ لڑکیوں میں جو انگریزی زبان عام کرنے کا عمل اپنایا گیا ہے

وہ ایک ڈرامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہو سکے گا جب لوگوں کے سامنے نتائج آئیں گے۔

③

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں — مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف — "پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے"

*

معنی حامی: حمایت کرنا۔ بدظن: ناراض۔

تشریح: اس قطعہ میں کہا گیا ہے کہ ایک عالم دین کی حیثیت سے اگرچہ شیخ صاحب آئے دن پردے کی حمایت میں تقریر کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں کالج کے طلباء انہیں قدامت پرست اور جدید اقدار کا دشمن سمجھتے ہوئے شیخ صاحب کے خلاف ہو گئے ہیں حالانکہ اس مخالفت کی ضرورت نہ تھی جب کہ کل انہوں نے اپنے ایک وعظ میں یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے کہ اب پردے کی قطعاً ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ بناؤ سنگھار کے ذریعے جب نوجوانوں نے ہی خواتین کی سی وضع قطع اختیار کر لی تو پردہ پھر کس سے کیا جائے؟ اس قطعہ کا آخری مصرعہ مردوں پر ایک بلیغ طنز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

④

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند — غیرت نہ تجھ میں ہو گی' نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور' کہ اولاد کے عوض — کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

*

زیر تشریح کے پہلے شعر میں اقبال نے جو مضمون پیش کیا ہے وہ اس سے پہلے قطعے کے مضمون سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں وہ مضمون قدرے مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے ہوش مند انسان! وہ دن اب زیادہ دور نہیں بلکہ بہت قریب ہے جب کہ نہ تجھ میں غیرت باقی رہے گی نا ہی عورت پردے میں مستور رہنا پسند کرے گی اور تو اس بے پردگی پر قطعی طور پر معترض نہ ہو گا۔ اس لیے کہ مستقبل میں وہ دور آنے والا ہے جب عورت کو اولاد کی قطعاً پرواہ نہ ہو گی بلکہ اس کی بجائے کونسل کی رکنیت کے لیے الیکشن میں حصہ لے گی اور لوگوں سے ووٹ مانگتی پھرے گی۔

دراصل اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں مرد کی طرح عورت کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا تو گھر اور معاشرے کا نظام ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے۔

⑤

لیم مغربی ہے بہت جراءت آفریں پہلا سبق ہے' بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
تے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
را یہ حال' بوٹ کی تو چاٹتا ہوں میں ان کا یہ حکم' دیکھ! مرے فرش پہ نہ رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

*

عنی: جراءت آفریں: بہادر بناتی ہے۔ مار ڈینگ: شیخی بگھارنا۔ آغا بھی: مراد ہے افغانستان جیسے پس ماندہ ک کے خان صاحب بھی۔

① یہ چار غیر مربوط اشعار ایک طرح سے غزل کے ہیں ایسی غزل جو اپنے مزاج کے اعتبار سے ظرافت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کی تعلیم انتہائی جراءت نگیز ہوتی ہے اور پہلا سبق جو کسی طالب علم کو کالج میں داخلے کے بعد ملتا ہے وہ ڈینگ مارنے اور شیخی گھارنے کا ہوتا ہے۔

② دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ ہندوستان تو ایک منڈی کی طرح ہے جہاں بیرونجات سے اشیائے ضرورت آکر فروخت ہوتی ہیں۔ اس ملک میں خود اتنی صلاحیت نہیں کہ صنعتی سطح پر اپنے لیے کوئی سامان ضرورت تیار کرے یہاں کی حالت تو اتنی گئی گزری ہے کہ اگر ہینگ جیسی معمولی شے بھی درکار ہو تو وہ کابل جیسے پسماندہ علاقے کے لوگ یہاں لے کر آتے ہیں۔

③ تیسرے شعر میں اقبال اہل ہند کی غلامانہ ذہنیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے آقاؤں کی خوشامد میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے کہ ان کے بوٹ کی نوک تک چاٹنے سے نہیں شرماتے اور ہمارے آقا (انگریز) اس قدر خوشامد کے باوجود ہم سے انتہائی متکبرانہ سلوک کرتے ہیں اور بوٹ چاٹتے ہوئے اپنا فرش خراب ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ غزل کے چوتھے اور آخری شعر میں اقبال نے اونٹ اور گائے' دو کردار پیش کیے ہیں۔ اونٹ سے مراد مسلمان ہیں اور گائے سے ہندو۔ انگریز ہندوستان میں قیام کے دوران مسلمانوں کی ہمیشہ تضحیک کرتے رہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ ہندوستان میں مقیم مسلمانوں نے ان کے اقتدار کے خلاف ہمیشہ نبرد آزمائی کی جب کہ ہندوؤں نے ان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ انگریز اس حوالے سے کہ مسلمان عرب سے آئے تھے اور اونٹ وہاں کا کار آمد ہونے کے باوجود بھدا سا جانور ہے اس کے برعکس ہندو چونکہ گائے کی پرستش کرتے ہیں اس لئے انہیں گائے سے تشبیہ دی ہے۔

⑥

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگدست تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
رد جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

*

معنی: تہذیب نو: نئی تہذیب۔ خم: جھکانا۔

تشریح: اس قطعہ میں اقبال نے ان مفاد پرست واعظوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو محض چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے دین کے بنیادی اصولوں کی تردید سے بھی نہیں چوکتے۔ سو اقبال کہتے ہیں کہ اگر حضرت واعظ ان دنوں معاشی طور پر پریشان ہیں تو انہیں اس کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے لیے وہ بڑے طنزیہ انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسلام میں اصول جہاد تو بعض واعظوں نے غیروں کو خوش کرنے اور مال بنانے کے لیے بہت کچھ لکھا اب اس مقصد کے لیے مناسب موقعہ ہے کہ واعظ حضرت اصول حج کے خلاف بھی کوئی رسالہ لکھ ڈالیں۔

⑦

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ دفع مرض کے واسطے پل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجیے"

✱

نئی تہذیب کے مارے ہوئے کسی مریض کو اگر ڈاکٹر دوا دیتا ہے اور وہ مریض سے کہتا ہے کہ یہ گولی کھا لیجیے تو وہ اس سے متاثر ہونے کی بجائے دفع مرض کے لیے "پل" (گولی) پیش کرنے پر اظہار مسرت کرتا ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ تعلیمی اداروں میں اساتذہ جس شفقت کے ساتھ درس دیتے تھے تو ان کی اس عنایت پر دل پیش کرنے کو جی چاہتا تھا۔ جب کہ اب اس طرح سے زمانہ اور اس کی تہذیب بدل چکی ہے کہ طالب علم استاد سے سبق لینے سے قبل اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ یہ فرمایئے آپ کا "بل" (معاوضہ) کتنا ہے۔

ان اشعار میں اقبال نے اپنے عہد کے تضادات کو ظریفانہ انداز میں بعض علامتوں اور کرداروں کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان و تہذیب نے افراد کو اس طرح اندھی تقلید پر مجبور کر دیا ہے کہ بات اپنی زبان میں کی جائے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن یہی بات اگر انگریزی زبان میں کی جائے تو ان پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ یوں انگریزی زبان پر فخر کیا جاتا ہے۔

⑧

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

✱

معنی: غسال: غسل دینے والے۔

زیر تشریح قطعہ اور بعض دوسرے اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ کوئی ملک اس وقت نہ صحیح معنوں میں ترقی کر سکتا ہے نا ہی حقیقی معنوں میں دوسرے ممالک کے اثرات سے آزاد ہو سکتا ہے تاوقتیکہ وہ معاشی اور صنعتی میدان میں

خود کفیل نہ ہو۔ اسی حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ آخر کسی چیز کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی اشیاء کی منڈی بنا ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ چھتریاں، رومال، مفلر اور لباس جیسی معمولی اشیا بھی جاپان سے در آمد کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

اقبال آگے چل کر کہتے ہیں کہ ہماری غفلت اور بے عملی کا یہی عالم رہا تو اس امر سے کچھ بعید نہیں کہ اگر یہاں کوئی شخص وفات بھی پا گیا تو ہم اس قدر مجبور و معذور ہیں کہ اس کی میت کو نہلانے کے لیے غسال کابل سے اور اس کے لیے کفن بھی جاپان سے منگوانا پڑے گا۔

⑨

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

اے شیخ و برہمن! سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں؟
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

❁

معنی: اہل بصیرت: دل کی آنکھوں سے دیکھنے والے۔

زیر تشریح چار اشعار ظرافت کی بجائے طنزیہ انداز کے حامل ہیں چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم مشرق کے لوگ اب مغربی تہذیب کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب میں جو چمک دمک ہے وہ مشرق کی قدیم تہذیب میں نہیں ہے۔ مغرب میں بڑی تیزی کے ساتھ نظریات اور فکر میں تبدیلی آ رہی ہے جب کہ مشرق کے لوگ اپنی پرانی ڈگر سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ مغربی تہذیب کے اثر و نفوذ سے اگر چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا تو یہ عمل تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اب تو صرف وہی لوگ زندہ رہنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم رہیں گے۔

اس شعر میں اقبال شیخ و برہمن یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سنو اہل بصیرت کیا کہتے ہیں کہ جو قومیں باہم دست و گریبان رہیں اور آپس میں اتحاد و اتفاق قائم نہ رکھ سکیں وہ انتشار و زوال کا شکار ہوئیں اور پستی کی تہہ میں گرتی چلی گئیں۔ وہ زمانہ بھی تھا جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مل کر محفلیں سجاتے تھے لیکن اب ان میں نفرت اور نفاق کا یہ عالم ہے کہ کبھی مل بیٹھنے کا موقعہ بھی ملا تو ان میں یا تو اردو ہندی کی بحث چھڑ جاتی ہے یا قربانی اور جھٹکے کے معاملات پر تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان میں قطعی طور پر قوت برداشت نہیں رہی اور چھوٹی چھوٹی باتیں ان کے مابین سر پھٹول کا سبب بن جاتی ہیں۔

⑩

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکر غیر کیا
کیوں اے جناب شیخ سنا آپ نے بھی کچھ کہتے تھے کعبہ والوں سے کل اہل دیر کیا
ہم پوچھتے ہیں مسلم عاشق مزاج سے الفت بتوں سے ہے تو برہمن سے بیر کیا

*

معنی: شہود: کسی چیز کا ظاہر ہونا۔ شاہد: دیکھنے والا۔ مشہود: دیکھا گیا۔ بیر: دشمنی۔
زیر تشریح تین اشعار بھی اقبال نے طنزیہ انداز میں لکھے ہیں وہ کہتے ہیں کہ غالب نے اپنے مصرعہ میں کہا ہے کہ خدا کی ذات' اس کی ذات دیکھنے والوں اور اس کی ذات کی گواہی دینے والوں میں' یعنی ان تینوں میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ وحدت الوجود کے عقیدے کے مطابق انسان' کائنات اور خدا در حقیقت ایک ہی وجود کی ظاہری شکلیں ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر غالب کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے تو پھر ان مسلمانوں کو جو بتوں سے تو عشق کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ اس صورت میں برہمن سے دشمنی کا مظاہرہ کیوں ہو؟ ان اشعار میں اہل کعبہ سے مسلمان اور اہل دیر سے ہندو مراد ہیں۔ غالب کے قول کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ انسان جب ایک عمل کرتا ہے تو اس سے متعلق دوسرے عمل کو بھی اپنانا پڑتا ہے۔ اس صورت میں ایک جانب تو ہندو دیویوں سے محبت کا اظہار اور دوسری جانب برہمن سے نفرت یہ امر کچھ مناسب معلوم نہیں دیتا۔

(11)

ہاتھوں سے اپنے دامن دنیا نکل گیا رخصت ہوا دلوں سے خیال معاد بھی
قانون وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی پوچھو تو وقف کے لیے ہے جائداد بھی

*

معنی: خیال معاد: آخرت کا خیال۔
اس قطعے میں اقبال مسلمانوں کی ایک مخصوص صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب دنیا ہی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو سمجھ لو کہ ہم نے دین کو بھی بڑی حد تک نظرانداز کر دیا۔ اور ہمارے دلوں میں بے دینی نے راہ پالی۔ ان حالات میں شیخ صاحب قانون وقف علی الاولاد کے لیے آئینی جنگ تو بے شک لڑ رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نوع کے وقف کے لیے جائیداد بھی موجود ہے یا نہیں کہ وہ تو ہم نے اپنی عیاشیوں میں اڑا دی۔

(12)

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے مہذب ہے تو اے عاشق' قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے' نہ خنجر ہے' تو قصد خودکشی کیسا یہ مانا درد ناکامی گیا تیرا گزر حد سے

کہا میں نے کہ "اے جان جہاں کچھ نقد دلوا دو   کرائے پر منگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

*

زیر تشریح اشعار میں اقبال نے مغرب اور مشرق کے مابین محبت کے نفسیات کے بارے میں جو رویہ ہے اس کا ظریفانہ انداز میں تجزیہ کیا یہ اشعار دراصل ایک انگریز دوشیزہ اور ہندوستانی عاشق کے مابین مکالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ نوجوان عاشق کہتا ہے کہ جب اپنی انگریز محبوبہ سے مایوس ہو کر میں نے اس پر خودکشی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ محبوبہ بولی کہ اے مجھے چاہنے والے! تو تو انتہائی مہذب ہونے کا دعویدار ہے پھر اس طرح خودکشی کا ارادہ کر کے آپے سے باہر کس لیے ہو رہا ہے کہ خودکشی تو بزدل اور غیر مہذب لوگ کیا کرتے ہیں۔ یوں بھی اے عاشق نامراد! نہ تو تیرے پاس خودکشی کرنے کے لیے کوئی خنجر یا پستول ہے نا ہی اتنی جراءت اور حوصلہ کہ یہ قدم اٹھا سکے۔ ہرچند کہ محبت میں ناکامی کے سبب تیری مایوسی حد سے بڑھ چکی ہے پھر بھی خودکشی تیرے بس کا روگ نہیں۔ انگریز محبوبہ کا یہ جواب سن کر میں نے کہا۔ اے دل و جان سے عزیز دوشیزہ! یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے لیے تو اجرت پر کسی پٹھان کو سرحد سے بلوا لوں گا تم تو بس یہ کرو کہ اس مقصد کے لیے کچھ نقد رقم دلوا دو۔

(13)

اڑاں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر   حاصل ہوا یہی، نہ بچے مار پیٹ سے
مغرب میں ہے جہاز بیاباں شتر کا نام   ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

*

معنی: جہاز بیاباں: صحرا کا جہاز۔ شتر: اونٹ۔

اس قطعے میں اقبال نے ایک جنگ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ترکی کو محض اس لیے شکست ہو گئی کہ میدان جنگ تک اسلحہ اور رسد نہ پہنچ سکے۔ اس وقت ترکی کے پاس کوئی بحری بیڑہ نہ تھا۔ عربوں سے بھی شدید اختلافات تھے۔ حالانکہ ان کی مدد اور اونٹوں کے ذریعے سامان رسد میدان جنگ تک پہنچ سکتا تھا۔ جب کہ انہیں اس امر کا علم بھی تھا کہ اہل مغرب اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا کرتے ہیں۔

(14)

ہندوستان میں جزو حکومت ہیں کونسلیں   آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
ہم تو فقیر تھے ہی، ہمارا تو کام تھا   سیکھیں سلیقہ اب امرا بھی "سوال" کا

*

معنی: امرا: جمع امیر کی۔

اس قطعے میں کونسلوں اور اقتدار کے حوالے سے امراء کے اس طبقے پر بڑا خوبصورت اور بلیغ طنز کیا ہے جو اس مقصد کے لیے انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اب ہندوستان میں کونسل کا وجود حکومت کا جزو تصور کیا جانے لگا ہے۔ یوں سیاست میں ہم ہندوستانیوں کے انتہائی عروج کا یہ نقطہ آغاز ہے۔ ہم عام ہندوستانی تو خیر فقیر کی مانند اپنے مسائل کے سلسلے میں ہر لمحے دست طلب دراز کرتے رہتے

تھے تاہم اب یہ امراء پر بھی لازم ہو گیا ہے کہ وہ کونسل کے رکن کی حیثیت سے یہاں اپنے مطالبات منوانے کے لیے دستِ طلب دراز کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں کہ اس کے بغیر تو ان کی شنوائی نہ ہو سکے گی۔

اقبال چونکہ ہمیشہ اس طرح کے نظامِ حکومت کے مخالف رہے اس لیے یہاں بھی وہ امراء کے طبقے پر طنز کرتے نظر آتے ہیں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اقتدار تک عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

(15)

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا؟
میرزا غالب خدا بخشے، بجا فرما گئے ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

٭

اس قطعہ میں اقبال نے انتخابات کے ضمن میں ایک ایسی لعنت کی طرف اشارہ کیا ہے جو بیسویں صدی کے آغاز میں بھی موجود تھی اور یہ سلسلہ آج تک رائج چلا آتا ہے۔ اسمبلی اور کونسلوں کے انتخابات میں اس وقت بھی سرمایہ دار طبقہ ہی حصہ لینے کا اہل سمجھا جاتا تھا اور اسی نوے سال گزرانے کے بعد جب ہم اپنی قومی جمہوریت کے مراحل میں داخل ہو چکے ہیں یہ سلسلہ ماضی کی طرح جاری و ساری ہے یعنی امیدوار سرمایہ دار ہوتا تھا جو اپنے اقتدار کے لیے ووٹروں کو خریدتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آج بھی صورت حال پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہو چکی ہے۔

چنانچہ اس قطعے میں اقبال نے متذکرہ قسم کے ایک امیدوار اور ووٹر کے مابین مکالمہ نظم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت بے شک آپ پوری کونسل کی رکنیت کے اہل بھی ہیں اور اپنی انتخابی مہم میں کامیاب ہو کر کونسل میں پہنچ بھی جائیں گے۔ اور انگریز برسرِاقتدار حکومت سے اپنے مفادات بھی حاصل کر لیں گے چنانچہ ہم اس مقصد کے لیے آپ کو ووٹ دینے کے لیے بھی بے شک تیار ہیں لیکن یہ تو فرمایئے کہ اس کا معاوضہ ہمیں کیا دلوائیں گے۔ اگلے شعر میں علامہ نے غالب کے ایک مصرعہ سے استفادہ کرتے ہوئے ووٹر کی زبان سے یہ مصرعہ دوہرایا ہے کہ حضرت! آپ نے ممتاز شاعر حضرت غالب کا یہ مصرعہ تو ضرور سنا ہو گا کہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ بے شک ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ دہلی میں قیام کرنا اپنی جگہ۔ تاہم گذر بسر اور کھانے پینے کے لیے کچھ ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے سو اس کا اہتمام بھی کر دیجیے۔

(16)

دلیلِ مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہو گی نہ ہو حضور سے الفت، تو یہ ستم نہ سہیں
مصر ہے حلقہ، کمیٹی میں کچھ کہیں ہم بھی مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
سند تو لیجیے لڑکوں کے کام آئے گی وہ مہرباں ہیں اب، پھر رہیں، رہیں نہ رہیں
زمین پر تو نہیں ہندیوں کو جا ملتی مگر جہاں میں ہیں خالی سمندروں کی تہیں
مثالِ کشتیِ بے حس مطیعِ فرماں ہیں کہو تو بستہ ساحل رہیں، کہو تو نہیں

٭

معنی: دلیل: ثبوت۔ مصر: اصرار۔ کشتی بے حس: بے حس کشتی۔ مطیعِ فرماں: فرمانبردار۔ بستہ ساحل

ساحل سے چمٹے رہنا۔

زیر تشریح پانچ اشعار میں انتخابات اور اس سے متعلقہ مسائل کے حوالے سے ہی کہے گئے ہیں لیکن ان میں کسی کونسل کی بجائے کمیٹی کی رکنیت کے انتخاب کا تذکرہ ہے تاہم ان اشعار میں مزاح کی جگہ بالعموم طنز سے کام لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک خوشامدی شخص نے انگریز افسر سے کہا۔ ہمیں حضور سے جس قدر محبت ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ہمارے اپنے ہی بھائی آپ سے محبت و وفاداری کی بنا پر ہمیں طعن و تشنیع اور ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی بات حضور سے ہماری وفاداری کی دلیل ہے۔

② دوسرے شعر میں یہی بات قدرے مختلف انداز میں کہی گئی ہے کہ جس حلقے سے ہم کمیٹی کا انتخاب لڑ رہے ہیں وہاں کے لوگ جو ہمارے رائے دہندگان بھی ہیں یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے حقوق کی بات بھی کریں جب کہ ہم اس امر کا اندازہ لگا رہے ہیں کہ ضلع کے حاکم اعلیٰ یعنی کلکٹر کا ان معاملات میں کیا نقطہ نظر ہے اور اس کی مرضی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملانا ہماری مجبوری ہے۔ مراد یہ ہے کہ کمیٹی کے منتخب ہونے والے کونسلر اپنے رائے دہندگان کے حقوق کے ضمن میں حاکم ضلع کا عندیہ معلوم کیے بغیر کوئی بات کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

③ اس شعر میں ایک ایسے مسئلے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو انگریزی دور میں عام روایت بن گیا تھا یعنی متعدد لوگ انگریز افسروں کی خوشامدوں کی بدولت خوشنودی کی سند حاصل کر لیتے اور بعد میں اسی سند کو دکھا کر اس افسر یا اس کے بعد آنے والے افسروں سے اپنے کام نکلواتے۔ بیٹے بھتیجوں کو ملازمتیں دلواتے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک خوشامدی شخص کہتا ہے کہ میں اس افسر سے سند تو حاصل کر لوں۔ تاکہ اپنے کام نکلوائے جا سکیں بعد میں کیا پتہ کہ یہ لوگ اسی طرح مہربان رہیں یا نہ رہیں کہ ہوا کا رخ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آج سالہا سال گزرنے کے باوجود انگریز کی یہ بدعت آج بھی بدستور قائم ہے۔ انتخابات ہوں' رائے دہندگان کے ووٹ خریدنے اور ملازمتوں کے حصول میں ایسی ہی قباحتیں موجود ہیں۔

④ اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انگریزی غلامی کے دور میں یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی باشندوں کے لیے زمین تنگ کر دی گئی ہے اور کسی جگہ پر بھی انھیں عزت و وقار سے نہیں دیکھا جاتا چنانچہ غیرت مندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ سمندروں میں کود کر خودکشی کر لیں کہ ان کی تہوں میں لاشوں کو پناہ تو بہرحال مل ہی جائے گی کہ غلامی میں دکھوں اور تکلیفوں کا علاج موت کے سوا اور کچھ نہیں۔

⑤ ہم ہندوستانی تو اس دور غلامی میں ایک ایسی کشتی کی مانند ہیں جو ساحل پر بندھی ہوئی ہے۔ جب ملاح چاہتا ہے اسے کھول لیتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہے کھینچتا چلا جاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی انگریزوں کے احکام کے اس طرح مطیع ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔

(17)

فرما رہے تھے شیخ طریق عمل پہ وعظ   کفار ہند کے ہیں تجارت میں سخت کوش

مشرک ہیں وہ جو رکھتے ہیں مشرک سے لین دین — لیکن ہماری قوم ہے محروم عقل و ہوش
ناپاک چیز ہوتی ہے کافر کے ہاتھ کی — سن لے اگر ہے گوش مسلماں کا حق نیوش
اک بادہ کش بھی وعظ کی محفل میں تھا شریک — جس کے لیے نصیحت واعظ تھی بار گوش
کہنے لگا ستم ہے کہ ایسے قیود کی — پابند ہو تجارت سامان خورد و نوش
میں نے کہا کہ "آپ کو مشکل نہیں کوئی — ہندوستاں میں ہیں کلمہ گو بھی مے فروش

*

معنی: سخت کوش: سرگرم۔ حق نیوش: سننے کا حق۔

زیر تشریح اشعار میں جہاں ایک مخصوص صورت حال اور رویے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آخری شعر میں باتِ ایک انتہائی خوبصورت طنزیہ ختم کی گئی ہے چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے واعظ کہہ رہا تھا کہ ہندوستان میں جو غیر مسلم تاجر ہیں وہ لین دین اور تجارت کے سلسلے میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ جان لو۔ کہ وہ لوگ جو مشرک سے لین دین رکھتے ہیں وہ بھی مشرک ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی ہماری قوم عقل و ہوش سے محروم ہے۔ امر واقعہ ہے کہ کافر جس چیز کو چھو لے وہ ناپاک و نجس ہو کر رہ جاتی ہے چنانچہ اے مسلمانوں اگر تم میں حقائق کا سامنا کرنے کی جراءت ہے تو یہ بات کان کھول کر غور سے سن لو۔

اقبال کہتے ہیں کہ واعظ کی اس محفل میں ایک شرابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس شرابی نے واعظ کی اس ناصحانہ تقریر کو سنا تو اسے یہ بات بڑی ناگوار گزری اس نے اٹھ کر بیساختہ کہا کہ حضرت آپ تو کھانے پینے کی اشیا پر جس طرح پابندی عائد کر رہے ہیں یہ طرز فکر تو بڑی افسوسناک ہے۔ بھلا تجارت میں اس نوعیت کی پابندیاں جو آپ عائد کر رہے ہیں وہ کس طرح روا رکھی جا سکتی ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اس شرابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ گھبرایئے نہیں آپ کو اپنے شغل میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ یہاں مسلمان شراب فروش بھی موجود ہیں۔

(18)

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک — شیشہ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشتر تعلیم جدید — میرا سرجن رگ ملت سے لہو لیتا ہے

*

(19)

گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرم سخن — نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شے کو قرار
میں تو بدنام ہوئی توڑ کے رسی اپنی — سنتی ہوں آپ نے بھی توڑ کے رکھ دی ہے مہار
ہند میں آپ تو ازروئے سیاست ہیں اہم — ریل چلنے سے مگر دشت عرب میں بیکار
کل تلک آپ کو تھا گائے کی محفل سے حذر — تھی لٹکتے ہوئے ہونٹوں پہ صدائے زنہار
آج یہ کیا ہے کہ ہم پر ہے عنایت اتنی — نہ رہا آئنہ دل میں وہ دیرینہ غبار
جب یہ تقریر سنی اونٹ نے شرما کے کہا — ہے ترے چاہنے والوں میں ہمارا بھی شمار
رشک صد غمزۂ اشتر ہے تری ایک کلیل — ہم تو ہیں ایسی کلیلوں کے پرانے بیمار
ترے ہنگاموں کی تاثیر یہ پھیلی بن میں — بے زبانوں میں بھی پیدا ہے مذاق گفتار
ایک ہی بن میں ہے مدت سے بسیرا اپنا — گرچہ کچھ پاس نہیں چارہ بھی کھاتے ہیں ادھار
گوسفند و شتر و گا و پلنگ و خرلنگ — ایک ہی رنگ میں رنگیں ہوں تو ہے اپنا وقار
باغباں ہو سبق آموز جو یک رنگی کا — ہمزباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیور گلزار
دے وہی جام ہمیں بھی کہ مناسب ہے یہی — تو بھی سرشار ہو، تیرے رفقا بھی سرشار
"دلق حافظ بچہ ارزد بہ میش رنگیں کن — وانگہش مست و خراب ازرہ بازار بیار"

*

معنی: حذر: دور بھاگنا۔ صدائے زنہار: خدا کی پناہ کی آواز۔ گوسفند: بکری۔ پلنگ: چیتا۔ خرلنگ: لنگڑا گدھا۔

یہ نظم عملاً حافظ شیرازی کے ایک شعر پر تضمین ہے۔ موضوع کے اعتبار سے تو اسے قدرے اہمیت دی جا سکتی ہے کہ یہ انگریز کے عہد میں ہندو اور مسلمانوں کے باہمی روابط اور ان کے سیاسی نظریات کی آئنہ دار ہے۔ اس نظم کو ایک تمثیل قرار دیا جا سکتا ہے جس کے کردار ہندو اور مسلمان ہیں۔ اقبال نے علی الترتیب ان کرداروں کو گائے اور اونٹ کی علامتوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ تاہم تکنیکی سطح پر یہ انتہائی کمزور نظم ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اسے ظریفانہ کلام میں شامل کیا گیا ہے جب کہ اس میں نہ تو ظرافت ہے نا ہی طنز موجود ہے۔ محض ہندو کو گائے اور مسلمان کو اونٹ کی علامت سے تعبیر کرنا تو ظرافت نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ یہ اصلاح کے زمرے میں بھی نہیں آتی۔ بے شک اقبال بہت بڑے شاعر اور نظم نگار تھے لیکن محض اسی بناء پر تو اس نظم کو اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ یہ اقبال کی نظم ہے۔ یہ امر بھی بڑی حد تک حیرت کا سبب ہے کہ اقبال نے اسے اپنے مجموعے میں شریک کیسے کر لیا جب کہ ان کی مسترد کی ہوئی بہت سی نظمیں اور اشعار جو "باقیات اقبال" میں موجود ہیں اس نظم سے کہیں بہتر ہیں۔

تاہم چونکہ یہ نظم "بانگ درا" میں شامل ہے اس لیے ضرور تا اس کی تشریح بھی ناگزیر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز گائے نے اونٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ حالات بے شک ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے میں تو اپنی رسی توڑ کر بدنام ہوئی تھی۔ اب سنا ہے کہ آپ بھی اپنی مہار تڑا بیٹھے ہیں۔ ہندوستان میں تو آج بھی اہمیت حاصل ہے لیکن صحرائے عرب میں ریل کا وجود ناکارہ ہے کل تک آپ گائے کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور جب بھی اس ضمن میں آپ سے کچھ بات ہوئی ہرگز نہیں،

ہرگز نہیں کی صدا آتی تھی لیکن آج یہ کیسا انقلاب آگیا کہ ہم پر یہ عنایت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کے دل میں ہمارے خلاف کسی قسم کا کینہ باقی نہیں رہا۔

اونٹ نے گائے کی یہ تقریر سنی تو قدرے شرما کر بولا! سچ تو یہ ہے کہ تیرے چاہنے والوں میں ہمیشہ ہمارا شمار رہا ہے اور جب تو مستانہ وار چلتی ہے تو ہم تیری ہر ادا پر فدا ہونے کو تیار رہتے ہیں اور تو نے اب جو ہنگامے برپا کیے ہیں تو جنگل کے دوسرے بے زبان جانوروں میں بھی شعور پیدا ہو گیا۔ ہم اور تو آخر ایک عرصے سے اس جنگل میں یکجا رہتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ہم چارہ بھی ادھار کھاتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جنگل کے تمام جانور ایک سے خیالات اختیار کر لیں تو ان کا وقار بحال ہو سکتا ہے۔ باغ کا مالک اگر سب کو باہمی اتحاد و یک رنگی کا درس دے تو باغ کے سارے پرندے محبت اور یگانگت کے لہجے میں گفتگو کرنے لگیں گے۔ سوائے گائے! بہتر یہی ہے کہ باغ کا مالک ہونے کے ناطے ہمیں بھی کچھ دے تاکہ ہم بھی خوش رہیں اور ہمارے رفقاء بھی خوش رہیں۔

آخری شعر حافظ شیرازی کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حافظ کی گدڑی کو جس قیمت پر بھی ہو رنگین کرو۔ اور اس انداز میں اسے شراب سے بدمست کر کے بازار جاتے ہوئے پکڑ لاؤ۔

اقبال کی یہ تمثیل گائے (ہندو) اور اونٹ (مسلمان) دو کرداروں کے حوالے سے اس امر کی غماز ہے کہ ہندوستان میں مغلوں کے زوال اور انگریز کے تسلط کی بنا پر ہندوؤں نے انگریزوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر لیے۔ دوسری طرف چونکہ انگریز کو بھی یہاں اپنی حمایت درکار تھی اس لیے انہوں نے بھی مسلمانوں کے مقابلے پر ہندوؤں کی پذیرائی کی لیکن جب اول الذکر نے اقتدار کے خلاف تحریک چلائی تو مسلمانوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے انگریز سے تعاون کیا۔ حتیٰ کہ تحریک خلافت کے سبب ان کا بھی انگریز سے شدید اختلاف ہو گیا۔

اس صورت حال میں بیشتر ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کی کہ دونوں متحد ہو کر آزادی کے لیے انگریز کے خلاف تحریک چلائیں جب کہ ماضی کے تجربات کی روشنی میں بعض مسلم رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ ہندو چونکہ تعداد کے اعتبار سے اکثریت میں ہیں اس لیے اقلیت ہونے کے ناطے مسلمانوں کے حقوق کو تسلیم کریں۔ یہی داستان اس نظم کی لب لباب ہے۔

(20)

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار بے زحمت پی گیا سب لہو اسامی کا

٭

معنی: ناتمامی: ناکامی۔ بسوہ دار: یعنی زمیندار۔ اسامی: کاشت کار۔

اقبال کہتے ہیں کہ رات ایک مچھر نے مجھ سے کہا کہ میں تو انتہائی تگ و دو کے بعد انسان کے جسم سے لہو کی ایک بوند حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں جب کہ زمیندار ہاتھ پیر ہلائے بغیر کاشتکار کا تمام

ں و متاع ہڑپ کر جاتا ہے۔ اس قطعہ میں جاگیرداری نظام پر کھری چوٹ کی گئی ہے کہ محنت کاشتکار کرتا ہے اور پیداوار سمیٹ کر جاگیردار لے جاتا ہے اور غریب کاشتکار ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

(21)

یہ آیہ نو جیل سے نازل ہوئی مجھ پر — گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
کیا خوب ہوئی آشتی شیخ و برہمن — اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے بدری — مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے مسیتا

*

معنی: آشتی: صلح۔ شیخ و برہمن: مراد ہے مسلمان اور ہندو۔ بدری: یعنی ہندو۔ **مسیتا:** مراد ہے مسلمان۔

زیر تشریح قطعہ کا پس منظر ایک روایت کے مطابق یہ ہے کہ انگریز کے خلاف ترک موالات اور تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد گاندھی کو زیر حراست رکھا گیا تو انہوں نے جیل سے اپنے اخبار "نوجیون" کو ایک مضمون اشاعت کے لیے بھجوایا جس میں بنیادی بات یہ تھی کہ میں نے قرآن اور گیتا' دونوں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ دونوں کی تعلیمات میں یکسانیت ہے۔

اقبال نے جب یہ مضمون پڑھا تو طنزیہ انداز میں زیر تشریح قطعہ لکھا جس میں گاندھی کے اس نقطہ نظر کا ذکر کرتے ہوئے کہ قرآن اور گیتا کی تعلیمات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو گی کہ اسلام اور ہندو مت کے مابین یکسانیت پیدا کی جا رہی ہے اور شیخ و برہمن کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے کہ دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو تو اپنے عقائد سے بہت عرصے قبل بیزار ہو چکا ہے جب کہ گاندھی مسانوں کو بھی اسی سطح پر لانا چاہتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مذہب سے لاتعلق ہو جائیں۔

(22)

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست — ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت
چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں — ساہو کاری' بسوہ داری' سلطنت

*

معنی: ست: سچ۔ تت: روح۔ بسوہ داری: زمینداری۔

اس قطعے میں کہا گیا ہے کہ صحیح کردار کا انسان وہ ہے جو اس امر کا پوری طرح قائل ہو کہ بے شک جان جاتی ہے تو چلی جائے لیکن سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ کہ سچائی ہی کائنات میں بنیادی حقیقت کی حامل ہوتی ہے۔ یہی اصول دنیا کے ہر مذہب اور عقیدے کا سب سے اہم جزو ہے چنانچہ اس حقیقت کا اظہار بلا تامل کیا جا سکتا ہے کہ ساہو کاری' جاگیرداری اور حکومت ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ تینوں علی الترتیب مقروض' کاشتکار اور عوام کا خون چوستے ہیں۔

(23)

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے — دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب خیز — ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہ تستعجلون"
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام — چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف "ینسلون"
شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رند لم یزل — رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ عبرت کا مقام — رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق
حضرت کرزن کو اب فکر مداوا ہے ضرور — حکم برداری کے معدے میں ہے درد لایطاق
وفد ہندوستاں سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب — کیا یہ چورن ہے پے ہضم فلسطین و عراق؟

*

معنی: صف آرا: صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فتنہ آشوب خیز: طوفان بپا کرنے والا فتنہ۔ یاجوج اور ماجوج: دو قوموں کے نام ہیں۔ درد لایطاق: شدید درد۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال ہر نوع کے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف تھے۔ اس حقیقت کے اظہار ان کے اشعار میں جابجا ہوتا ہے چنانچہ زیر تشریح قطعہ میں بھی انہوں نے اسی حوالے سے ایک نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ عصری صورتحال یہ ہے کہ محنت کش اور سرمایہ دار اب ساری دنیا میں ایک دوسرے کے مقابلے پر صف بستہ ہو گئے ہیں۔ بالفاظ دگر سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک ایک دوسرے کے خلاف صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ اقبال قرآنی آیات کے حوالے سے یہ مفہوم پیدا کرتے ہیں کہ اس کا تو علم نہیں کہ ان دونوں طاقتوں کے مابین جو جنگ ہو گی اس میں کون جیتے گا اور کون ہارے گا البتہ یہ طے ہے کہ اس جنگ میں دونوں طاقتوں کی بہت سی تمناؤں کا خون ہو جائے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمانوں یاد رکھو کہ یہ طاقتیں خدا کے وعدوں پر شک کرتی ہیں ان پر خدا کا عذاب جلد ہی نازل ہونے والا ہے اور یہ دونوں نظام ایک دوسرے کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔ قطعے کے ایک مصرع میں اقبال نے یاجوج ماجوج کا جو حوالہ دیا ہے تو ایک روایت کے مطابق زمانہ قدیم میں یاجوج ماجوج دو جنگجو قومیں ہوتی تھیں جو ہر لمحے تباہی مچاتی رہتی تھیں۔ حکم خداوندی کے پیش نظر ایک پیغمبر نے ان کے درمیان بلند دیوار تعمیر کر دی جس کو یہ لوگ دن بھر چاٹتے رہتے ہیں لیکن رات کو یہ دیوار پھر سے بلند ہو جاتی ہے تاہم روز قیامت کے نزدیک یہ قومیں دیوار کو چاٹ لیں گی اور پھر سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر دنیا بھر کی تباہی کا سبب بن جائیں گی۔ ایک طرح سے اقبال نے سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک کو یاجوج ماجوج سے تعبیر کیا ہے۔

یہ قطعہ ایک مخصوص سیاسی پس منظر کی روشنی میں خاصا اہم ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دور میں ترکی ایک وسیع مملکت شمار ہوتی تھی۔ عرب بھی اس کے زیر نگیں تھے۔ انگریزوں نے ترکی کو کمزور کرنے کے لیے عرب ممالک کو اکسایا کہ وہ ترکی کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس بغاوت کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی چنانچہ حجاز کی سلطنت شریف حسین کے حصے میں آئی۔ شام کی مملکت امیر فیصل کو تفویض ہوئی۔ امیر عبداللہ شرق اردن اور عراق امیر زید کے زیر تسلط آ گیا۔ فلسطین کو انگریزوں نے اپنے زیر انتظام رکھا بلکہ عراق اور فلسطین کے لیے ایسا نظام حکومت طے کیا جسے سیاسی اصطلاح میں "منڈیٹ" یا

لم برداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ عراق اور فلسطین کے حکمران دونوں انگریز کی زیر
الت نظام حکومت چلائیں گے۔

گر یہ تجویز پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ شام کے باشندوں نے امیر فیصل کی
مرانی کو مسترد کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا اور اس میں شرکت کے لیے
رانس کو شام سے اپنی افواج بلوانی پڑیں۔ یہ سلسلہ یوں تو جنگ عظیم کے بعد بھی جاری رہا لیکن اقبال نے
یر تشریح قطعہ شام سے فرانسیسی فوج کی واپسی کے پس منظر میں ہی لکھا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ۔

فرانسیسی عساکر جو ہمیشہ شراب میں بدمست رہا کرتے ہیں اب مجبور ہو کر شام کی سرحدوں سے واپس
رہے ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے پسپائی کے وہ اطوار بھی نظرانداز کر دیے ہیں جو مبازرت
کے حوالے سے پیش آیا کرتے ہیں۔ بہرکیف فرانسیسی افواج شام سے فرار ہو گئی ہیں۔ یہ بڑا عبرت انگیز
نظام ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کس طرح تغیرپذیر ہوا کرتے ہیں۔ لارڈ کرزن جو ان ایام
ں برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا اور بعد میں ہندوستان کا وائسرائے بنا اسے عراق و فلسطین میں حکم برداری کا
ظام ناکام ہوتا نظر آیا تو سر آغا خان کے مشورے سے ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان
بھیجا گیا۔ اس ضمن میں اقبال استفسار کرتے ہیں کہ کیا یہ وفد اس لیے ترتیب دیا جا رہا ہے کہ اس کی
ساطت سے انگریز عراق و فلسطین کو باسانی ہضم کریں۔ اس قطعے سے اقبال کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا
ہے۔

(24)

کرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز	دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ' کرے جو زراعت اسی کا کھیت	کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو	بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے	جو زیر آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

*

معنی: مزارع شوریدہ حال: بدحال کاشت کار۔

زمین کی ملکیت کے پس منظر میں اقبال نے ایک اہم اور دلچسپ نکتہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ
ایک روز مالک اور مزارع کے مابین یہ تکرار ہو رہی تھی کہ زمین کا مالک کون ہے؟ دونوں ہی اس امر کے
دعویدار تھے کہ زمین اس کی ملکیت ہے مزارع کا کہنا تھا کہ جو بھی زمین پر کاشت کرے وہی شخص اس کا
مالک بھی ہوتا ہے۔ مالک نے جواباً کہا کہ شاید تیری عقل ٹھکانے نہیں ہے۔ زمین پر چونکہ قبضہ میرا ہے
اس لیے میں ہی اس کا مالک بھی ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ مزارع اور مالک کی تکرار اور استدلال کو سن کر میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس ضمن
میں زمین سے ہی پوچھ لیا جائے کہ آخرکار تو کس کی ملکیت ہے۔ زمین نے چند لمحے سوچ کر جواب میں کہا
کہ اے اقبال! مجھے تو صرف اس امر پر ہی یقین ہے کہ یہ مزارع و مالک کی تکرار قطعی بے معنی ہے۔ میں
تو بس اسی قدر جانتی ہوں کہ نہ مزارع ہی میرا آقا ہے نا ہی مالک کو میری ملکیت سے کچھ سروکار ہے۔ اس

کے برعکس حقیقت بس اسی قدر ہے کہ جو اس آسمان کے نیچے بود و باش رکھتا ہے۔ وہ میرا ہی مال ہے یعنی یہ کہ بالآخر ایسے ہر شخص کا مقدر موت ہے اور فنا ہونے کے بعد اسے یقیناً زیر زمین ہی دفنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ کون کس کا مال ہے۔

(25)

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

اس قطعہ میں اقبال انگریز کی لائی ہوئی تہذیب پر شدید طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیب جدید تو گندے انڈوں کی مانند ہے۔ اور یہ گندے انڈے چونکہ استعمال نہیں کیے جا سکتے اس لیے ان کو باہر گلی میں پھینک کر ضائع کر دینا چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریز کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک نئی تہذیب بھی آ گئی ہے اور ہمارے نوجوان اس تہذیب سے متاثر ہو رہے ہیں تو انہیں بتا دینا چاہیے کہ یہ تہذیب کسی طور پر بھی ان کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔

انتخابات، ممبری، کونسل اور صدارت یہ سب اسی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں۔ جن کو انگریز نے ہندوستانیوں پر آزادی کے نام سے مسلط کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حقیقی آزادی نہیں بلکہ ان کے ذریعے آزادی کو دور تر لے جانے کا ذریعہ ہیں۔ دراصل یورپی استعمار نے آزادی کے نام پر جو عیاریاں مقامی رہنماؤں کو سکھائی ہیں کہ جب وہ ان کو بروئے کار لاتے ہیں تو خود ہی ان عیاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

زیر تشریح قطعہ کے آخری شعر سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ یورپ میں نئی ایجادات کے حوالے سے جو مشینری یہاں ہندوستان میں بھیجی جاتی ہے مقامی ماہرین جب ان کو استعمال کرتے ہیں تو بات اس مشینری تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ وہ یورپی تہذیب کے اثرات بھی قبول کرتے نظر آتے ہیں۔

(26)

کارخانے کا ہے مالک مردک ناکارہ کار عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکم حق ہے لیس الانسان الا ما سعی کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

معنی: لیس للانسان الا ماسعی انسان اسی چیز کا حقدار ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

اقبال کا یہ قطعہ بھی ظرافت اور طنز دونوں سے یکسر عاری ہے۔ نہ جانے انہوں نے اسے اپنے ظریفانہ کلام میں کس لیے شریک کیا ہے جب کہ اس سے قطعی طور پر یہ عناصر غائب ہیں۔ بہر حال اس قطعے میں اقبال کہتے ہیں کہ کارخانے کا سرمایہ دار مالک ناکارہ اور عیاش ہے کہ مالک ہوتے ہوئے کوئی کام بھی

پنے ہاتھ سے نہیں کرتا اور شب و روز چین کی بنسری بجاتا رہتا ہے جب کہ قرآن کریم کی رو سے خدائے
ک کا یہ حکم ہے کہ انسان اسی شے کا حقدار ہے جو اس نے ذاتی کوشش اور جدو جہد سے حاصل کی ہو اس
کم کے پیش نظر کارخانے دار جو مزدور کی محنت کا پھل ہڑپ کر جاتا ہے اس کا بھلا کیا جواز ہے؟

دراصل اس قطعہ میں اقبال نے اسلام اور قرآن کے نقطہ نظر سے محنت و سرمائے کے مسئلے کا جائزہ لیا
ہے اور محنت کش کے حقوق کو واضح کیا ہے۔ اقبال نے بعض دوسری نظموں اور اشعار میں بھی اس موضوع
بڑے واضح اور جرأت مندانہ انداز میں بات کی ہے۔

(27)

نا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں	پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا	کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

●

اقبال کہتے ہیں کہ میرے علم یہ بات آئی کہ کل کارخانے میں محنت کشوں کے مابین یہ گفتگو ہو رہی
تھی کہ ہم لوگ تو خیر پرانے اور بوسیدہ جھونپڑوں میں رہائش پر مجبور ہیں اور وہیں کسی ایک جھونپڑے
میں ضرورت کے وقت اکٹھے ہو کر اپنے برے بھلے مسائل پر گفتگو کر لیتے ہیں لیکن سرکار نے یہ بہت اچھا
کیا کہ کونسل ہال تعمیر کروا دیا۔ اس لیے کہ سرمایہ داروں کے پاس ہماری طرح مذاکرات کے لیے کوئی جگہ
نہ تھی۔

دراصل اقبال نے یہ طنز اس کونسل ہال کے تعمیر کے حوالے سے کیا ہے جو انگریزوں نے جمہوریت کا
فریب دینے کے لیے ہندوستان میں تعمیر کرایا تھا تا کہ لوگ انتخابات میں کامیاب ہو کر جب وہاں پہنچیں
تو دنیا پر یہ امر واضح کیا جا سکے کہ مقامی سطح پر عوامی نمائندے ملکی و قومی مفادات کو زیر بحث لانے کے لیے
یہاں جمع ہو سکتے ہیں۔ جب کہ اس نوع کے عوامی نمائندوں کی حیثیت محض خوشامدیوں کی تھی اور وہ
انگریز حاکموں کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہہ سکتے تھے۔

(28)

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے	من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا	تو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں	جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے	گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی نہ بنا

●

معنی: اپدیشک: معلم، ناصح

اس غزل کے چار اشعار میں سے تیسرے شعر کے علاوہ باقی اشعار میں طنزیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ پہلا

شعر تقسیم سے قبل ایک خاص واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے جس کے مطابق شاہ عالمی کے قریب دوسرے کوں کے قریب ایک قطعہ زمین پر مقامی مسلمانوں نے راتوں رات مسجد تعمیر کر دی تھی۔ یہ مسجد آج بھی اسی طرح موجود ہے بلکہ اس شعر کے سبب بھی اسے تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں اقبال طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایمان کی حرارت رکھنے والوں نے راتوں رات مسجد تو تعمیر کر دی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے دل تو پرانے گناہگار ہیں۔ برسا برس گزرنے کے باوجود نماز کے عادی نہ ہو سکے۔

بعض شارحین اور نقاد حضرات کا خیال ہے کہ پہلے مصرعے میں اقبال نے ان مسلمانوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے جنہوں نے جوش ایمانی کی مدد سے متنازعہ علاقے میں مسجد تعمیر کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ تاہم پورے شعر سے واضح طور پر بات سامنے آتی ہے کہ یہ وضاحت درست نہیں۔

اس شعر میں اقبال نے حبشہ کے حکمران سنوسی کے ایک پیغام کے حوالے سے بات کی ہے جو اس نے والی حجاز امیر فیصل کو بھجوایا تھا اور وہ پیغام یہ تھا کہ تو محض نام و نسب کے اعتبار سے حجازی یعنی عرب ہے جب کہ تجھ میں قلبی سطح پر عربوں والی کوئی بات نہیں۔ اس کے برعکس تو تو فرنگیوں کا حاشیہ بردار بنا ہوا ہے۔ اس پیغام کا پس منظر یہ ہے کہ افریقی باشندہ ہوتے ہوئے بھی سینوسی نے ترک جرنیل انور پاشا کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا تھا۔ جب کہ فیصل اور دوسرے عرب حکمرانوں نے انگریزوں کی اعانت کی تھی چنانچہ یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ عربوں اور ترکوں کے باہمی آویزش کی بنا پر انگریز اور دوسرے یورپی ممالک نے بڑا فائدہ اُٹھایا اور ادھر ترکی ہی نہیں بلکہ خود عرب حکومتیں بھی کمزور اور غیر مستحکم ہوتی گئیں۔

تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نام سنتے ہی ہماری آنکھیں تو آنسو بہانے لگتی ہیں لیکن اس نوعیت کے رونے میں آخر کیا لطف ہے۔ رونا تو وہ ہوتا ہے جب جگر کا خون بھی آنسوؤں میں شامل ہو اور ان کا رنگ پیاز کی مانند گلابی ہو جائے۔ جس سے یہ اندازہ بھی ہو سکے کہ رونے والے کے دل میں انتہائی خلوص شامل ہے۔ بصورت دیگر اسلام کے نام پر آنسو ٹپکانے والے اور عملاً اسلام کے لیے کچھ نہ کرنے والے حقیقتاً اسلام کی کوئی خدمت نہیں کرتے۔

چوتھے اور آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ وعظ و نصیحت کے سلسلے میں تو اقبال بے شک لاجواب ہے۔ وہ اتنے خوبصورت انداز میں نصیحت کرتا ہے کہ سننے والوں کے دل مٹھی میں لے لیتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ گفتار کا غازی تو بن گیا مگر اپنے ذاتی کردار کے حوالے سے بلند نہ ہو سکا۔ دراصل اس شعر میں اقبال نے تمثیلی سطح پر تو اپنا نام بنا لیا ہے لیکن اس کا اشارہ مذہبی اور قومی رہنماؤں کی طرف ہے کہ محض باتیں ہی باتیں کرتے ہیں عملی سطح پر ان کا کردار منفی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی بے عملی نے ہی مسلمانوں کو بحیثیت قوم بے حد نقصان پہنچایا ہے لطافت اور لفاظی میں ان کا جواب نہیں لیکن عمل سے بے بہرہ ہیں۔

فہرست

غزلیات (حصہ اول)

قیمت: 140 روپے

غزلیات (حصہ دوم)

رُباعیات

منظومات

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر
(بھرتری ہری)

"بانگ درا" کے بعد علامہ اقبال نے اردو شاعری کے دوسرے مجموعے "بال جبریل" کا آغاز مندرجہ بالا شعر سے کیا ہے۔ ہر چند کہ یہ شعر خود اقبال کا ہے تاہم اس کا بنیادی اور مرکزی خیال قدیم مالوہ (بھارت) کے ایک تاریخ ساز راجہ بھرتری ہری کے حکیمانہ تصور سے ماخوذ ہے۔ جنوبی ہند کی ریاست مالوہ کی شناخت بھرتری ہری کے علاوہ روپ متی اور باز بہادر کی شخصیات سے ہوتی ہے۔

روپ متی اور باز بہادر کا رومان اور جراءت مندی بھارت کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہیں۔ عابد علی عابد نے انہی کرداروں کو بنیاد بنا کر جو ڈرامہ لکھا وہ ہمارے ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ بھرتری ہری نے اپنی حکمرانی کا بیشتر حصہ اگرچہ عیش و عشرت میں گزارا تاہم بعد میں وہ اقتدار کو تج کر درویش بن گیا۔ اس کے حکیمانہ نظریات پر مشتمل شاعری نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ علامہ اقبالؒ جیسے صاحب فکر شاعر نے بھی مذکورہ شعر میں اس کے ایک خیال سے استفادہ کیا ہے۔

اس شعر کی تشریح کچھ یوں کی جا سکتی ہے کہ پھول کی پتی جیسی نازک شے سے ہیرے جیسی سخت چیز کو کاٹنا تو بے شک ممکن ہے جب کہ ایسا شخص جو دانش و سمجھ سے بے بہرہ ہو اس پر معقول اور سیدھی سادی بات اثرانداز نہیں ہوتی۔ اس شعر میں اقبال نے واضح کر دیا ہے کہ معقولیت پسند انسان ہی سچائی اور حقیقت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ناسمجھ اور نافہم شخص کے لئے یہ سب کچھ بے معنی اور بے مقصد شے ہیں۔

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

"بال جبریل" کی پوری شاعری انسانی اور معاشرتی سطح پر انقلاب سے ہم آہنگ ہونے والے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اوپر درج ہونے والا شعر اپنی جامعیت کے اعتبار سے کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جس طرح رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے خورشید اپنی آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور بتدریج ساری فضاء کو روشن اور منور کر دیتا ہے اسی طرح سے ہمیں اپنی زندگی کا آغاز ایسی جدوجہد سے کرنا چاہئے کہ اس میں مایوسی ختم ہو اور رجائیت کا دور دورہ ہو۔ عملاً یہ شعر اقبالؒ کی حکمت و فکر کا عنوان ہے۔

ان دو اشعار کی تشریح و تفہیم کے بعد اب اگر "بال جبریل" کی پوری شاعری کی طرف آیئے تو اس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں کا بیشتر حصہ مسلسل غزلوں پر مشتمل ہے یا پھر انہیں مقفی نظموں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا حصہ رباعیات و قطعات سے تعلق رکھتا ہے۔ باقی حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ تاہم اس مجموعے میں جو ترتیب پیش نظر رکھی گئی ہے اسی حساب سے اشعار کی تشریح بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اولین مسلسل غزل کے پانچ اشعار کو اسی حوالے سے دیکھنا پڑے گا۔

(1)

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں — میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند — میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں
گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود — گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

معنی: **ذات:** باری تعالیٰ کی ہستی، وجود مطلق۔ **نقش بند:** نقش باندھنے والا نقشے بنانے والا نقاش۔ **صفات:** باری تعالیٰ کی وہ صفتیں جن کی وجہ سے انسانوں میں ذات کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہے۔ **رستخیز:** قیامت۔

① اس مسلسل غزل کے پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میری عشقیہ اور والہانہ پکار سے بارگاہ ایزدی میں ایک شور و تلاطم برپا ہو گیا جب کہ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی فرد کے لئے بھی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ شاعر کو ذات خداوندی سے ایسا والہانہ عشق ہے کہ وہ اس کی صفات کو بھی ایک بتکدے کی مانند اپنی وارفتگی کی راہ میں حائل سمجھتا ہے چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ میری یہی والہانہ صدا اس بتکدۂ صفات کو بھی متلاطم کر گئی۔ عملاً یہ شعر بڑا وسیع المعانی ہے جس کی تفہیم کے لئے عشق حقیقی کی ایک رمق ہی میسر آ جائے تو غنیمت ہے۔

② دوسرا شعر بھی یوں پہلے شعر کا تسلسل ٹھہرتا ہے کہ میری والہانہ صدا جب حریم ذات میں تلاطم پیدا کر سکتی ہے تو حور اور فرشتے لاکھ غیر مادی سہی پھر بھی وہ میرے تخیل کے اسیر ہیں۔ میں ان کی اصلیت کا مکمل ادراک کر سکتا ہوں میری بے باک نگاہی نے تو اے والا صفات تیری تجلیوں میں بھی خلل پیدا کر کے رکھ دیا ہے۔

③ اے باری تعالیٰ تجھے پانے کے لئے میں نے بت خانوں اور مسجدوں کی تعمیر کا اہتمام بھی کیا لیکن تلاش بسیار کے باوجود وہاں کچھ نہ ملا تو پھر اپنی فریاد سے میں نے کعبے اور بت خانوں میں قیامت برپا کر دی۔ اقبال یہاں دراصل اس نکتے کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں کہ ذات الٰہی عبادت گاہوں تک محدود نہیں ہے۔ اس کا نور تو ہر جگہ ہر مقام پر ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے تو بس دیدۂ بینا کی ضرورت ہے۔

④ زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ بھی آیا کہ میں نے اپنی تیز نگاہی سے انسانی وجود کی داخلی کیفیتوں اور حقیقتوں کا ادراک کر لیا اور کبھی یوں بھی ہوا کہ اپنے ہی توہمات میں ایسا الجھا کہ اپنی ہی شناخت مشکل ہو گئی۔ اس شعر میں دو متضاد انسانی اور نفسیاتی کیفیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

⑤ یہ شعر بظاہر سیدھا سادہ ہے لیکن اتنا سادہ بھی نہیں کہ با آسانی اس کی گہرائی تک پہنچا جا سکے۔ اقبال کے شارحین نے اس شعر کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ تجزیہ مولانا غلام رسول مہر جیسے اقبال شناس کا ہے کہ شعر کے لفظی معانی بیان کرنے کے بعد یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ "اشعار کے عام مطالب واضح کر دیئے گئے لیکن ان سے حقیقی لذت اندوزی ذوقی و وجدانی چیز ہے۔ محض تشریح پر موقوف نہیں"۔ بہرحال میرے نزدیک یہ شعر "عظمت آدم سے زوال آدم" تک جو داستان ہے اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں اس کا احاطہ کیا ہے۔ کہاں آدم مسجود ملائک تھا اور کہاں اسے ایک معمولی

ہی غلطی کی پاداش میں زمین پر پھینک دیا گیا۔ اس شعر میں اقبال نے اپنی ذات کے حوالے سے خالق کائنات سے اسی اقدام کے ضمن میں گلہ کیا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی شاید غیر ضروری نہ ہو کہ محض اس شعر کے لغوی معنی بیان کرنے کے بعد قاری سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ذوق و وجدان کی مدد سے ہی شعر سے لطف اندوز ہو سکے گا' قطعی غیر مناسب ہے۔ اقبال نے شعر میں اپنے فکر و نظریات کو جس سلیقے اور مشاقی کے ساتھ سمویا ہے اس تک رسائی کے بغیر اقبال کی تفہیم ممکن نہیں۔

(2)

اگر کج رو ہیں انجم' آسماں تیرا ہے یا میرا؟ — مجھے فکر جہاں کیوں ہو' جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یا رب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبح ازل انکار کی جراءت ہوئی کیونکر؟ — مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن — زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

① "بال جبریل" کی اولیں غزل کی طرح یہ دوسری غزل بھی اپنے مطالب اور مضامین کے حوالے سے مسلسل ہے اور پانچ اشعار پر ہی مشتمل ہے۔ اس غزل کے پہلے شعر میں اقبال خداوند عزوجل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ستاروں کی چال درست نہیں تو اس کے لئے مجھے تو سزاوار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ آسمان کا مالک بھی تو ہی ہے اور اس پر جگمگاتے ہوئے ستاروں پر بھی تیرا ہی اختیار ہے۔ بے شک تو ہی قادر مطلق ہے اور میں تو ایک عاجز و لاچار بندہ ہوں۔ اس جہان کی فکر بھی مجھے نہیں بلکہ تجھے ہی ہونی چاہئے کہ یہ جہاں یقیناً تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔

② یہ لامکاں' یہ فضائے بسیط بھی تیری ہی دسترس میں ہے۔ اس کے باوجود اگر یہاں تجھ سے والہانہ شیفتگی کا اظہار نہیں ہوتا تو اس کی ذمہ داری بھی اے خدا تجھ پر ہے۔ مجھ پر نہیں ہو سکتی۔

③ ابلیس نے جو تیرے احکام سے روگردانی کی تو اپنے مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسے انکار کی جراءت کیونکر ہوئی۔ اس لئے کہ ابلیس تو تیرے وابستگان خاص میں سے تھا اور تیرا رازداں بھی تھا۔ اس صورت میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ساری صورت حال کا تعلق مجھ سے تو نہیں تھا بلکہ تجھ سے اور صرف تجھ سے تھا۔

④ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاتم الانبیاء پیغمبر انقلاب حضور سرور کائنات احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے فرستادہ تھے۔ تمام فرشتوں میں افضل و اعلیٰ حضرت جبریلؑ جو تیری وحی انبیاء کرام کو پہنچایا کرتے تھے ان کا تعلق بھی تجھ سے ہی تھا؟ پھر وہ صحیفہ کاملہ جب قرآن کی صورت میں پیغمبر آخر الزماںؐ پر نازل ہوا وہ بھی تیرا تھا مگر وہ حرف شیریں جو دعا کی صورت میں نازل ہوا میرا تو نہیں تیرا ہی تھا۔

⑤ کائنات میں انسان کی حیثیت اس تابندہ ستارے کی طرح ہے جس سے سارا جہاں منور ہوتا ہے اور یہ روشنی تیری شناخت کا سبب بنتی ہے چنانچہ اگر یہی انسان زوال سے دوچار ہوا تو اس میں نقصان تیرا ہی

ے میرا نہیں۔

فی الواقع ان پانچوں اشعار میں معنی و مفہوم کے اعتبار سے جو بات مقصد مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ایک قربت الٰہی کا خواہاں بندہ اپنے محبوب سے گلہ مند ہے کہ تیرے وابستگان خاص میں سے ابلیس یا کسی اور انسان نے نافرمانی کی تو میری ذات سے تو اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ فرشتے ہوں یا انسان کوئی بھی مخلوق ہو ان کی تخلیق کی ذمہ داری خداوند تعالیٰ پر ہی عائد ہوتی ہے کسی اور فرد پر نہیں!

رباعی

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟ بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم! بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے!

① اقبال نے اس رباعی میں بھی گلہ مندی کا رویہ اختیار کیا ہے تاہم ابتدائی شعر میں قدرے طنز بھی ہے۔ خداوند عزوجل سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال استفسار کرتے ہیں کہ قادر مطلق ہونے کے باوجود تو ضرورت مندوں کی پوری طرح کفالت کیوں نہیں کرتا۔ تمثیلی سطح پر اگر سمندر کسی پیاسے کی تشنگی رفع کرنے کے لئے محض ایک قطرہ آب فراہم کرتا ہے تو اس سے اس کی پیاس کیسے بجھ سکتی ہے۔ اس عمل کو رزاقی کی جگہ کنجوسی سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔

(3)

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں!
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

تو ہے محیط بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بیکنار کر!

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خذف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر!

نغمہ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر!

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر!

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر!

① اقبال اس غزل میں اپنے رویے کے اعتبار سے پہلی دو غزلوں سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں۔ پہلی غزلوں میں گلہ مندی کے ساتھ ایک حد تک طنزیہ انداز بھی اختیار کیا گیا تھا جب کہ اس غزل میں استدعا اور خواہش کا رنگ نمایاں ہے۔ غزل کے پہلے شعر میں رب تعالیٰ سے مخاطبت میں ایک واضح اشارہ موجود ہے کہ اپنے جلووں کو درون پردہ چھپا کے نہ رکھ بلکہ ان کو اس قدر نمایاں کر دے کہ دیکھنے والوں کے قلب و نظر اور ہوش و خرد شکار ہو کر رہ جائیں اور ان پر تیری مکمل گرفت قائم ہو۔

② اے میرے محبوب یہ کون سی ادا ہے کہ عشق بھی پردے میں ہو اور حسن پر بھی حجاب کی دھند چھائی

ہوئی ہو یعنی اس امر کی توقع کی جائے کہ تیری ذات سے جو وارفتگی ہے اس کا اظہار بھی نہ کیا جائے اور تیرا اپنا وجود بھی پوشیدہ رہے۔ میں تو اس امر کا خواہاں ہوں کہ یا تو تو خود اپنے وجود کو ظاہر کر دے یا مجھے اپنے ساتھ والہانہ عشق کے اظہار کی اجازت مرحمت کر!

③ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تیری ذات شعور سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ تیری عظمت اور بلندی اس حقیقت میں ہی مضمر ہے کہ میرا مرتبہ بھی بلند کر دے۔

④ خداوندا! اگر میرا وجود ایک سیپی تصور کر لیا جائے تو اس میں پوشیدہ جوہر کی قدر و قیمت کا اندازہ تو ہی کر سکتا ہے اور اگر میں ایک ٹھیکری کی طرح سے ہوں تو یہ تیرے قبضۂ قدرت میں ہے کہ مجھے ایسا گوہر آبدار بنا دے جو تاج شاہی کے شایان شان ہو۔ بالفاظ دیگر اس شعر میں کہا گیا ہے کہ تو ہی میری قدر و قیمت سے آشنا ہے اور تو ہی مجھے لازوال عظمتوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

⑤ اے مالک کل کائنات اگر آنے والی بہار کے نغمے یعنی متوقع کامیاب مستقبل کا ثمر میرے مقدر میں نہیں ہے تو کم از کم ایسا پرندہ ہی بنا دے جو آنے والی بہار اور روشن مستقبل کا نقیب ہی بن سکے۔ اقبال کا یہ شعر یاسیت کے عالم میں رجائیت کا مظہر ہے۔

⑥ خداوندا! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تیرے حکم سے ہی مجھے جنت سے نکال کر اس کرۂ ارض پر بھیجا گیا تھا کہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ یہ روز حشر تک کرنا پڑے گا۔ اس شعر میں اقبال پوری طرح اپنی شاعرانہ انا کے ساتھ اس جذبے سے مسلح نظر آتے ہیں جو ان کے نزدیک انسانی عظمت کا آئینہ دار ہے۔

⑦ اس شعر میں اقبال نے بڑی صفائی اور چابکدستی کے ساتھ بندہ و خالق کے مابین جو رشتہ ہے اس کی نشاندہی اپنے مخصوص فکری انداز میں کی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ روز قیامت جب میرے گناہوں کا حساب تیرے روبرو پیش ہو گا تو یہ عمل میرے لئے تو یقیناً شرمساری کا سبب ہو گا کہ مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوئے ہیں لیکن جب تجھے یہ خیال آئے گا کہ میں نے ہی اس گناہ گار کو اپنا جانشین بنا کر دنیا میں بھیجا تھا تو اس لمحے تیرا رد عمل کیا ہو گا؟

(4)

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

یہ مشت خاک، یہ صرصر، یہ وسعت افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل!
یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے باد مراد؟

قصوروار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشت سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

ہام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

① مولائے کائنات! یہ امر تو اپنی جگہ کہ میری فریاد میں اثر ہے یا نہیں! تاہم اس کو سننے میں تو کوئی احت نہیں ہونی چاہئے کہ میں تو ان افراد میں سے ہوں جو داد کا طلب گار ہونے کی بجائے اس نوع کے میلوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

② انسان جو ایک مشت خاک کے مانند ہے گوناگوں مصائب اور بلاؤں کے ہجوم میں گھرا ہوا ہے۔ یہ ئیں اور مصائب آسمانوں کی تمام تر وسعت کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اب اس کا اندازہ کیسے ہو کہ تیرے ق تخلیق میں یہ عمل قہر و غضب پر مبنی ہے یا لطف و عنایت کا حامل ہے۔

③ یہ درست ہے کہ بہار آئی تو باغوں میں پھول کھلے لیکن خزاں کے جھونکوں سے وہ سب کے سب رجھا گئے۔ کیا یہی وہ مختصر عرصۂ زیست ہے جسے بہار کے موسم اور باد مراد سے منسوب کیا جاتا ہے؟ اسی ضمون کے حوالے سے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

رق یہی ہے بس ہونے میں اور نہ ہونے میں غنچہ چٹکا، پھول بنا، مرجھایا اور گیا

(اسرار زیدی)

④ خداوندا! بے شک تو نے آدم کو ایک گناہ کی پاداش میں کرۂ ارض پر جلاوطن تو کر دیا تاہم اس نے ں خرابے کو ایک گلشن میں تبدیل کر دیا ظاہر ہے کہ یہ عمل تیرے فرشتوں کے بس کا روگ نہ تھا۔

⑤ یہ آدم کی محنت اور جفاکشی تھی جس نے ویران خطۂ ارض کو گل و گلزار بنا دیا۔ یہاں کے موجود ناصر آج بھی اس حقیقت کے معترف ہیں۔

⑥ خطروں اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے والی طبائع کسی ایسے گلستان کو بھی ناپسند کرتی ہیں جہاں کوئی رمقابل موجود نہ ہو۔

⑦ اے خدا! یہ جاں نثاری کا عمل تیرے فرشتوں کے بس کا نہیں ہے۔ اس کے سزاوار تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں جراءت و ہمت کی کمی نہ ہو۔ اس شرط پر فرشتے نہیں بلکہ آدم ہی پورا اتر سکتا ہے۔

اقبال کے کلام میں اس نوع کے بہت سے اشعار ملیں گے جن میں انہوں نے خداوند لایزال کے پیش نظر عظمت آدم کے بالمقابل فرشتوں کے مقام کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے کے حوالے سے وہ انسان کی فضیلت پر یقین رکھتے ہیں۔

(5)

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا! کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا!
عشق، جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا!
میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس! شعلے سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
ر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا!
نا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو!

معنی: مستعار: لفظی معنی مانگی ہوئی، اصطلاحی عارضی اور فانی۔

① اقبال نے یہ اشعار اگرچہ غزل کی ہیئت میں لکھے ہیں تاہم تکنیکی اور فنی سطح پر یہ ایک نظم کے
اشعار ہیں۔ اس نظم کے پہلے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ حیات انسانی عارضی اور فنا ہونے والی ہے اسے ا
ذات مطلق سے عشق کا حوصلہ کیسے ہو سکتا ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔
② وہ عشق جو فنا کے ایک تھپیڑے کا بھی متحمل نہ ہو سکے اس میں ہجر کی تپش اور انتظار میں جو اضطرا
کیفیت ہوتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
③ میں اپنے وجود میں ایک ایسے ستارے کے مانند ہوں جو لمحے بھر کے لئے چمک دکھا کر غائب ہو جا
ہے۔ مجھ سا ایک ادنیٰ انسان اس ذات مطلق سے کیسے الجھنے کا حوصلہ کر سکتا ہے جو پوری کائنات پر ہ
طرح کی قدرت رکھتا ہے۔
④ خداوندا! اگر میرا حوصلہ اور شوق وارفتگی دیکھنا ہے تو ایسی طویل عمر عطاء کر جس میں فنا کا تصور بھ
موجود نہ ہو۔
⑤ اے میرے معبود میرے دل کو وہ خلش عطا کر جو ہمیشہ برقرار رہ سکے اور ایسا درد دے جس کی کسک
لازوال ہو۔

رباعی

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

① اس رباعی میں اقبال دعائیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے خداوند عز و جل سے درخواست گزار ہیں ک
مولا! انسانی قلوب کو اپنی محبت سے لبریز کر دے اور انہیں راہِ وفا پر گامزن کر دے۔
② وہ مفلس و نادار اور بے سرو سامان لوگ جن کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ پیٹ بھرنے کے لئے
کی روٹی پر ہی اکتفا کرتے ہیں تو یہی سہی تاہم ان کے بازوؤں کو قوت حیدریؓ سے بھی نواز دے۔ اقبا
نے یہاں علامتی سطح پر "نانِ جویں" اور قوت حیدریؓ کا جو تذکرہ کیا ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محم
کسی کو جو کی روٹی کی فراہمی کافی نہیں اسے شیرِ خدا علی مرتضیٰؓ کی جراءت و ہمت اور قوت سے بھی نوا
دے۔ اقبالؒ نے اپنے کلام میں بے شمار مقامات پر حضرت علی مرتضیٰؓ کی جراءت و ہمت اور استغنی
بار بار ذکر کیا ہے کہ وہ ان کے مثالی کردار کے بڑی شدت کے ساتھ قائل تھے۔

(6)

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے! جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے!
نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے!
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے!

عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو — یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے!
...س اس عالم بے رنگ و بو میں بھی طلب میری — وہی افسانہ دنبالۂ محمل نہ بن جائے!
...ج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے!

...ی: ناپیدا کراں: جس کا کنارہ نظر نہ آئے۔ خود نگہداری: اپنے آپ کو نگاہ میں رکھنا۔ دنبالہ: پشت
...ے۔

اس غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ اس کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ موت کے بعد میری
...ک کے منتشر ذرات اگر یکجا ہو کر دل کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر میں اسی مصیبت میں گرفتار ہو
...ں کا جو عشق کی صورت میں زندگی کے دور میں مجھ پر مسلط تھی۔ مطلب یہ کہ زندگی میں بس عشق
...گرفتار رہا ایسا نہ ہو کہ موت کے بعد بھی اسی صورت حال سے دوچار ہو جاؤں۔

اگر بہشت میں بھی پہنچ گیا تو وہاں موجود حوریں مجھے اظہار عشق کی اس کیفیت پر مجبور نہ کر دیں جس
...سبب میری زندگی میں فتور برپا رہا۔ اقبال نے اس شعر میں ایک ایسے نفسیاتی رویے کی طرف اشارہ کیا
...جو انسانی فطرت کا بنیادی عنصر ہے۔

منزل تک رسائی میں ناکامی کا جو دکھ ہوتا ہے وہ مسافر کے لئے ایک مستقل خلش بن جاتا ہے اور
...ں تک پہنچنے کے لئے جدوجہد میں حائل ہو جاتا ہے۔ اقبال اس صورت حال کو اپنے فکر کی نفی تصور
...تے ہیں۔

جذبہ عشق نے مجھے ہر چند کہ ایسی وسعت عطا کر دی ہے جو ایک بیکراں سمندر کی سی ہے اب خدشہ
...ہے کہ یہی تصور ایک ایسے ساحل کی حیثیت اختیار نہ کرے جو میرے عمل ارتقاء کی جدوجہد میں سنگ
...بن جائے۔

اس شعر میں اقبال نے لیلیٰ اور مجنوں کے معاشقے کی روایتی داستان کے حوالے سے یہ خدشہ ظاہر
...ہے کہ میں اس عالم بے رنگ و بو میں بھی جنون عشق میں مبتلا ہو کر مذکورہ داستان کی تمثیل نہ بن
...ں۔ یعنی زندگی بھر تو محبوب کی طلب ناکامی کا مظہر رہی اور اگر بعد از مرگ دوسری دنیا میں بھی ایسا ہوا تو
...ی کرب انگیز ہو گا۔

اس شعر میں اقبال نے ستاروں اور مہ کامل کی علامتوں کے حوالے سے اپنے عہد میں انسان کے
...ء کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج ایک عام انسان کی جدوجہد کے سبب اسے جو عروج حاصل ہو رہا
...اس نے معاشرے میں موجود اشرافیہ کو خوفزدہ کر کے رکھ دیا ہے کہ اس نے اپنی جدوجہد کے ساتھ
...یابی کی منزل تک رسائی حاصل کر لی تو ان کی (اشرافیہ کی) اہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

(7)

...ا ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی! — دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی!

وہی دیرینہ بیماری ! وہی نامحکمی دل کی! | علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی
حرم کے دل میں سوز آرزو پیدا نہیں ہوتا | کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے | وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے | ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی | بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

معنی: پیدائی: ظہور۔

① "بال جبریل" کی ساتویں اور آٹھویں غزلیں عملاً ایک طرح کے تسلسل کی آئینہ دار ہیں اور انہیں جزوی سطح پر ساقی نامہ کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے غزل کو نظم سے زیادہ قریب لانے کے ضمن میں جو تجربے کیے ہیں۔ یہ دونوں غزلیں بھی ان تجربوں کا شاہکار ہیں۔ ان دو غزلوں کے سلسلے کی پہلی غزل میں علامہ اقبال نے اس عالمی انتشار کی جانب اشارہ کیا ہے جو مسلم امہ کو درپیش ہے۔ بقول ان کے اس عالم انتشار میں ملت اسلامیہ کی مخالف قوتوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں جن کے پنجے میں پورا ماحول عرصہ قیامت بنا ہوا ہے۔

② دوسرے شعر میں اقبال اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کو وہ لوگ جو خداوند ذوالجلال کے حقیقی نام لیوا ہیں اب وہ ایسی مشکلات سے دوچار ہو چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے حقیقی منصب کو بھی فراموش کر دیا۔

③ امت مسلمہ میں عقیدے اور جذبات کی سطح پر ماضی کی طرح ایک بے یقینی کی کیفیت طاری ہے۔ اس مسئلے کا حل ایک انقلاب نامہ میں مضمر ہے۔ ایسا انقلاب جو سرورِ کائنات کے فرمودات سے ہم آہنگ ہو۔

④ جیسا کہ سطور بالا میں اشارتاً کہا گیا ہے کہ مذکورہ دونوں غزلوں کو جزوی سطح پر ساقی نامہ سے تعبیر کیا جانا چاہئے ان میں ان کا خطاب بالواسطہ طور پر خالق حقیقی سے ہے۔ اس شعر میں بھی وہ خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ مسلم امہ کے دل جذب و کیف سے خالی ہو چکے ہیں۔ حوصلہ اور بیداری کی قوت ناپید ہو چکی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تیرے مظاہر پردۂ حجاب میں ہیں۔ اگر تیری تجلیات ان کے دلوں کو منور کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان میں وہ جذبہ پیدا نہ ہو جائے جو ابتدائے اسلام کا آئینہ دار تھا۔

⑤ اس حقیقت کا کسے علم نہیں کہ اقبال کا شمار مولانا روم کے مداحوں میں ہوتا ہے۔ وہ ان کے افکار و نظریات کو اپنی سوچ کا مرکز و محور تصور کرتے ہیں۔

دوسری مولانا روم کے استاد شمس تبریز کا تعلق بھی ایران سے ہی تھا یہی وجہ تھی کہ اقبال مملکت ایران اور اس کے دانشوروں کی صلاحیت کے ہمیشہ سے قائل تھے۔ ایک اور نظم میں ان کا مشہور شعر اس امر کی دلیل ہے۔ فرماتے ہیں۔

تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا | شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

بہرحال پانچویں شعر میں مولانا روم کی شخصیت کو علامتی سطح پر بلندیٔ افکار کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اس امر پر [illegible] ناظر ہیں کہ مولانا روم کے بعد ایران کی سرزمین سے [illegible] دانشور پیدا نہیں ہوا جو مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کر سکے۔

⑥ اس شعر میں علامہ اقبال کی رجائیت پسندی پھر سے لوٹ آئی ہے اور کسی نوع کی ناامیدی کا شکار ہونے کی بجائے حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یقین ظاہر کرتے ہیں کہ ذرا حالات سازگار ہوں تو ہم ہر مرحلۂ جاں گداز سے گزر سکتے ہیں۔

⑦ اس غزل کے ساتویں اور آخری شعر میں اقبال خود اپنے افکار کے بارے میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قدرت نے مجھے ایسے درویش کو جن رازہائے درون پردہ سے آشنا کیا ہے اور میں جس انداز سے ان کو عام لوگوں پر منکشف کرتا ہوں اس پر بادشاہوں کے خزانے بھی نچھاور کیے جا سکتے ہیں۔

(8)

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی! ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!
مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی!
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!
تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!

معنی: **تہی:** خالی۔ **تیغ جگر:** جوہردار تلوار جس کی کاٹ بے پناہ ہو۔

گذشتہ غزل کی شرح کے آغاز میں اس امر کی نشاندہی کی گئی تھی کہ یہ غزل (نمبر7) اور نمبر8 غزل عملاً ساقی نامہ کے اجزاء پر مشتمل ہیں۔ یہ بات ان کی ہیئت سے ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں غزلوں میں ساقی ایک ایسے کردار سے مطابقت رکھتا ہے جس سے مراد خالق حقیقی ہے۔

① اس شعر میں اقبال خدائے عزوجل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے پالنے والے مجھے وہی جذبہ عطا کر دے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھا اور جس جذبے کے تحت انہوں نے عروج حاصل کیا تھا۔ اس جذبے کے حصول سے ہی میں وہی مرتبہ حاصل کر سکتا ہوں جو اس دور کے مسلمانوں کا تھا۔

② اس شعر میں بھی اقبال نے ہندوستان میں اپنے عہد کی صورت حال اور گذشتہ تین سو سال کے دوران ملت اسلامیہ پر جو جمود طاری رہا ہے اس کے حوالے سے وہ دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے فیض خداوندی عام ہو اور یہ جمود ٹوٹ جائے۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس شعر کے ضمن میں جو وضاحت پیش کی ہے وہ بڑی حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں تین سو سال کی مدت کا اقبال نے جو ذکر کیا ہے اس سے مراد حضرت مجدد الف ثانی سے ہے جنہوں نے مغلیہ دور کے شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں احیائے شریعت کے لیے بڑا کام کیا۔ اقبال بذات خود مجدد الف ثانی سے بہت متاثر تھے۔

③ شاعر کا کہنا ہے کہ میری تخلیقات میں کہیں کہیں دین کے فکری اجزاء موجود ہیں۔ شریعت کے عویدار شیخ کو ان کا وجود بھی گوارا نہیں۔ بالفاظ دگر آج کا مولوی اس قدر رجعت پسند ہے کہ اسلام کے فکری نظام کے حوالے سے ان کا کوئی ترقی پہلو کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔

④ اس شعر کا مضمون بھی پہلے دو شعروں کا تسلسل ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دین کو فکری سطح پر پرکھنے کی بجائے جذباتیت اور عصبیت کے حوالے کیا جا رہا ہے اور اس کے ذمے دار عملاً وہ لوگ ہیں جو ذہنی اور فکری سطح صوفی اور ملا کے پیروکار ہیں اور دینی امور میں کسی قسم کے اجتہاد کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں۔

⑤ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی عقیدے اور جذبے سے جو عشق تھا وہ ختم ہو کر رہ گیا ہے جس کے باعث وہ علم بھی اسی طرح کی حیثیت کا حامل بن گیا ہے جیسے کہ میدان کارزار میں کوئی تلوار نکالنا چاہے تو اسے نیام خالی ملے۔

⑥ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ انسان میں کچھ حاصل کرنے اور جذب کرنے کا شعور ہو تو بات میں وزن پیدا ہو جاتا ہے اور جب یہ شعور ہی موجود نہ ہو تو کتنی ہی اہم بات کہی جائے وہ بے معنی ہی نظر آتی ہے۔ بالفاظ دگر اس شعر کی وضاحت یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ انسان حقیقت شناس ہو تو حق بات اس کی زندگی کے لئے ایک نصب العین بن جاتی ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو کتنا ہی اہم قول ہو وہ بے معنی بن جاتا ہے۔

⑦ اقبال اس شعر میں بھی اپنے مخصوص علامتی انداز اور استعاروں میں بارگاہ ایزدی میں درخواست گزار ہیں کہ میری قوم بے شک ادبار کا شکار ہے لیکن تو براہ کرم اسے اپنے بے پناہ وسائل سے محروم نہ رکھ اور اسے اپنے الطاف و کرم سے نواز دے۔

(9)

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مے لا الہ الا ہو!

نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شور چنگ و رباب!
سکوت کوہ و لب جوئے و لالۂ خود رو!

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو!

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو!

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو!

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکیٔ طینت سے ہے گہر کا وضو

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو!

① اس غزل کے بیشتر اشعار میں عملاً گذشتہ دو غزلوں سے بڑی حد تک ہم آہنگ جو اپنی ہیئت اور مواد کے اعتبار سے ساقی نامے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس غزل کے مطلع میں کہا لنے والے کے حسب ارشاد من و تو کا فرق مٹا دیا ہے۔ یعنی خدائے ذوالجلال کے علاوہ اور کوئی فرد نہیں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا عبادت کے لائق اور کوئی فرد نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا عبادت کے لائق اور کوئی فرد نہیں ہے اور اسی کے سبب میں اور تو کا فرق مٹا کر کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا گیا۔

② اس شعر میں کہا گیا ہے کہ مجھے نہ تو شعر کی ضرورت ہے نہ شراب کی نا ہی ساقی کی اور نا ہی ساز و نغمہ کی! اس کے برعکس میں تو پہاڑ کے دامن کا سکوت ندی کا کنارا اور اس پر اگے ہوئے خود رو لالہ کے

پھولوں کا خواہاں ہوں کہ یہی وہ اشیاء ہیں جو میرے قلب و روح کے لئے باعث سکون و اطمینان ہو سکتی ہیں۔

③ یہاں اقبال" کا کہنا ہے کہ میں ایک ایسا درویش ہوں جس کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ آب حیات کے چشمے پر پہنچ کر بھی اس کا ایک قطرہ پینے سے بھی اجتناب کرتا ہے اور اس کے جملہ لوازمات سے بھی بیگانہ بن چکا ہے۔

④ اس عہد کم سواد میں تو میری محدود فکر سے پیدا ہونے والی روشنی کو ہی غنیمت سمجھ! کہ اس عہد کے "اہل صفا" تو علم و ہنر کی روشنی سے محروم و بیگانہ ہو چکے ہیں بالفاظ دگر یہ عہد شعور سے خالی ہو گیا ہے۔

⑤ علامہ اقبال اس شعر میں عشق الٰہی کے اس ابتدائی مرحلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں ایک نیازمند قربت خدا اور اس کے جلوے کی تمنا کر سکے اس لئے کہ ایسے میں چاہنے والے کی نگاہ بھی دل سے زیادہ مضطرب اور بے قرار ہوتی ہے جس پر قابو پانا محال ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے عشق الٰہی کے ابتدائی ایام کی اضطرابی کیفیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔

⑥ یہ درست ہے کہ موتی کا اصل مقام سمندر میں ہوتا ہے جہاں ہر لمحے اس کا واسطہ سمندر کے پانی سے ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی فطرت کی پاکیزگی ہی اسے مصفا بناتی ہے۔ اس شعر میں اقبال کا اشارہ اس حقیقت کی جانب ہے کہ انسان کو کتنا اچھا ماحول ملے کہیں اس کی فطرت میں موجود پاکیزگی ہی اس کی عظمت و صفا کا سبب بنتی ہے۔

⑦ یہ ایک خوبصورت اور باصلاحیت شاعر کی صلاحیتوں کا کمال ہے کہ جب وہ اپنے اشعار میں پھولوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے تخلیقی فیض کے سبب یہ پھول بھی زیادہ شاداب و خوش رنگ نظر آتے ہیں۔

(10)

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی!

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی!

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
میری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی!

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی!

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی؟

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی!

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی!

معنی: **دیر پیوندی**: دیر کے بعد ملنا۔ **الوندی**: الوند سے متعلق، الوند ایران کا ایک مشہور پہاڑ ہے۔ **مشاطگی**: بناؤ سنگار کرنا۔

① دیکھا جائے تو "بال جبریل" کی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں جو عملی سطح پر نظم سے زیادہ قریب ہیں۔ دراصل اقبال نے کم و بیش تمام تخلیقات میں فکر کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو شعر کی جملہ اصناف میں حسب ضرورت پیش کیا ہے جن میں قدر مشترک فکر ہی ہے۔ اس مسلسل غزل

میں بھی یہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے مطلع میں اقبال نے کہا ہے کہ عشق حبیب میں سوز و درد ایسے عوامل ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ ناممکنات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے وجود کی انفرادیت کے مقابلے میں آقائیت کی بے نیازی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکوں گا۔

② اس شعر میں اقبال خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہم انسان اپنے وجود میں آزاد کیسے ہوئے جب کہ زندگی میں تو ہم پر فناء ہونے کی پابندی عائد کی گئی ہے اور موت کے بعد دوبارہ جینا بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی ذات میں خودمختار کیسے ہوا جب کہ اسے اپنی مرضی سے نہ تو مرنے کا اختیار ہے نا ہی بعد از فنا دوبارہ زندہ ہونے کی استطاعت رکھتا ہے۔

③ وادیٔ محبت میں سرگردانی تو چاہنے والے کا مقدر ہوتی ہے تاہم یہ ضرورت ہے کہ محبوب کا پردے میں رہنا اس کے جذبات کے لئے (یعنی عاشق کے لئے) اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے کہ محبوب جب تادیر پردے میں رہے تو سوز عشق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دگر ہجر کی گھڑیاں عاشق کے لئے اضطراب کا سبب بن جاتی ہیں۔

④ اس شعر میں شاہیں کا استعارہ شاعر نے بلند حوصلہ اور جراءت مند لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے کہ جس طرح شاہیں اپنا گھونسلہ بنانے کو ذلت تصور کرتا ہے اس کے برعکس وہ آزادانہ پرواز کے ساتھ پہاڑوں اور جنگلوں میں بسیرا کرتا ہے اسی طرح مردان حر کو بھی کسی خاص مکان کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہاں اپنا سر چھپا کر بیٹھ جائیں بلکہ وہ جدوجہد کے ذریعے اپنا مستقبل استوار کرتے ہیں۔

⑤ حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی تکمیل کے لئے جس طرح خود کو قربانی کے لئے پیش کیا ان کا یہ کردار کسی مدرسے کی تعلیمات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کی تربیت کا پوری طرح سے عمل دخل تھا۔ اقبال کے مطابق نیک اور فرمانبردار اولاد کا ایسا ہی کردار ہونا چاہئے جیسا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کا تھا۔ ان کی فرمانبرداری اور جذبۂ قربانی ایک ایسی مثالی حیثیت کے حامل ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

⑥ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ موت کے بعد میری لحد مستحکم ارادہ رکھنے والے اور حوصلہ مند لوگوں کے لئے زیارت گاہ کی حیثیت اختیار کر لے گی کہ میری تعلیمات نے تو راستے کی خاک پر بھی قدرت الٰہی کے راز افشاء کر دیئے۔ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ایک آدمی کو بھی معرفت الٰہی سے آشنا کر کے نظام اسلام کو تقویت بخشی ہے۔

⑦ فطری حسن کو کسی بناوٹ اور سنگھار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس طرح قدرت نے لالے کے پھول کو ایک فطری سرخ رنگ عطا کیا ہے اسی طرح سے سچائی کے اظہار میں کسی ملمع سازی کی حاجت نہیں ہوتی۔

(11)

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ　　وہ ادب گہ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ!

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آزرانہ!
نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت — یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ!
رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی — کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ!
مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے! — انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ! ۵
مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا — صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ!
تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں — نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ!

اگر یہ کہنے کی جسارت کی جائے کہ علامہ اقبال کی اس غزل کے بیشتر اشعار نسبتاً کمزور ہیں تو بے جا نہیں ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس غزل میں جو دو تین اچھے اور ان کے معیار کے اشعار ہیں ان کی خاطر علامہ نے باقی اشعار کہے ہیں۔ یہاں یہ نشاندہی بھی شاید غیر ضروری نہ ہو کہ "باقیاتِ اقبال" ایک ضخیم مجموعے کی شکل میں علامہ کی وفات کے کافی عرصے بعد مولانا عبداللہ قریشی نے مرتب کر کے شائع کرائی۔ اس مجموعے میں علامہ کا ایسا کلام شامل ہے جو انہوں نے بوجوہ مسترد کر دیا تھا۔

تاہم "باقیاتِ اقبال" کے مطالعے کے بعد اس امر پر قدرے حیرت ہوتی ہے کہ اس میں شامل متعدد تخلیقات کو علامہ اقبال نے کس بناء پر مسترد کر دیا تھا جب کہ اپنے معیار اور اسلوب کے حوالے سے یہ تخلیقات زیرِ گفتگو غزل سے کہیں بہتر ہیں۔ ان جملہ ہائے معترضہ سے اقبال پر کسی نوعیت کی تنقید مقصود نہیں بلکہ محض ایک صورتِ حال کی نشاندہی ہے۔

① اس غزل کے مطلع میں اقبال اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ کیا تجھے وہ زمانہ یاد نہیں جب پہلے پہل میرا دل تیری جانب ملتفت ہوا تو ہم دونوں کے رویے ایک دوسرے کے جذبات سے ہم آہنگ تھے لیکن اس ادب گہ محبت میں مجھ پر تیری نگاہ کسی تازیانے سے کم نہ تھی۔

② اس شعر میں اقبال نے عہد کی درس گاہوں سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد کی ذہنی صلاحیت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ یہ بے شعور لوگ کسی بت کی مانند ساکت و بے حس ہیں۔ نہ تو ان میں کافروں کی سی خصوصیات ہیں نا ہی ان کی تراش خراش میں آذر کی سی ہنر مندی کا کوئی شائبہ دکھائی دیتا ہے بالفاظ دگر مذکورہ قسم کی افراد کی تربیت میں کوئی صلاحیت نہیں محسوس ہوتی۔

③ یہ ماحول کتنا ہی آزاد روی کا حامل ہو لیکن عملاً اس میں کہیں بھی کشادگی اور فراغت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ عجیب جہان ہے جس میں نہ قید خانے کا پتہ چلتا ہے نا ہی آشیانے کا وجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا جو ماحول ہے اس پر گھٹن کی ایسی فضا محیط ہے جہاں اضطراب اور بے چینی کے سوا کچھ نہیں۔

④ اس شعر کے لغوی معنی سے قطع نظر اقبال مالکِ حقیقی سے ملتمس ہیں کہ ہماری تہذیب تباہی و بربادی کے آخری مراحل میں داخل ہو چکی۔ مولا! اب تیرا ہی لطف و کرم اس کی بقا اور تعمیر کا سبب بن سکتا ہے۔

⑤ میں نے جو عشق و محبت کے نغمے الاپے تو میرے ہمراہیوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح موسمِ بہار میں مرغانِ چمن مست ہو کر اپنی اپنی لے میں گاتے ہیں میرے یہ اشعار بھی شاید موسمِ بہار کے اثرات سے ہم آہنگ ہیں۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ لوگ عشق و محبت کے نغموں میں جو سوز و کرب پوشیدہ ہوتا ہے اس سے قطعی واقف نہیں۔

⑥ خداوندا! یوں لگتا ہے کہ تو نے انہی لوگوں کے خاک و خون سے بطور انعام اس جہان کی تخلیق کی

ہے اس لئے کہ شہادت اور قربانی کا صلہ حیات جاوداں ہی تو ہے۔

⑦ مولائے کریم! میں جس بے نیازی کے ساتھ شب و روز گزار رہا ہوں یہ عمل تیرے لطف کرم کے سبب ہی تو ہے یہی وجہ ہے کہ نہ تو مجھے دوستوں سے کسی قسم کا گلہ ہے اور نا ہی زمانے کا شاکی ہوں۔

(12)

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لب ریز — اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز!
بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی — کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز!
پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ — جہاں وہ چاہئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز!
کسے خبر ہے کہ ہنگامۂ نشور ہے کیا — تری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز!
نہ چھین لذت آہ سحرگہی مجھ سے — نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز!
دل غمیں کے موافق نہیں ہے موسم گل — صدائے مرغ چمن ہے بہت نشاط انگیز!
حدیث بے خبراں ہے 'تو بازمانہ بساز' — زمانہ با تو نسازد' تو بازمانہ ستیز!

معنی: ہنگامۂ نشور: قیامت کا شور۔

① اس غزل کے مطلع میں اقبال" کہتے ہیں کہ میں تو ایک ایسے لالے کے پھول کے مانند ہوں جس کا ضمیر شراب سرخ سے لبریز ہو چکا ہے۔ بالفاظ دگر ایک عام فرد تو ہر جائز و ناجائز شے کو قبول کر لیتا ہے لیکن وہ لوگ جو مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوئے ان کو کیا ہو گیا ہے کہ چشم زدن میں ہی اپنے مفادات کی خاطر مذہبی اصولوں کی نفی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

② عشق الٰہی اتنی بڑی قوت ہے کہ جب وہ کسی فرد کے دل میں گھر کر لیتا ہے تو لاچار و نامراد ہونے کے باوجود تخت شاہی کا مالک بن جاتا ہے یعنی عشق الٰہی کے طفیل ایک بے سروسامان فرد بھی انتہائی ارفع اور بلند مدارج پر پہنچ جاتا ہے۔

③ اس شعر میں اقبال" اپنے رب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مالک دو سرا تیری پوری کائنات اور اس کا نظام بوسیدہ اور پرانا ہو چکا ہے۔ میں تو ایک ایسی کائنات اور نظام کا خواہاں ہوں جو نیا اور منفرد ہو جس میں تازگی بھی ہو اور شگفتگی بھی ہو!۔

④ قیامت کا حشر کیا چیز ہے اس کی ہیئت اور نوعیت کیا ہے؟ یہ تو ایک سوالیہ نشان کے مانند ہے جس کا جواب اس لئے ممکن نہیں کہ قیامت کی حقیقت سے تو اسی وقت کوئی آشنا ہو سکتا ہے جب وہ اسے اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔ میرے لئے تو اے محبوب تیری نگاہ التفات اور لطف عنایات سے محرومی کا عمل ہی قیامت سے کم نہیں ہے یعنی میں تو اس صورت حال کو ہی قیامت تصور کرتا ہوں۔

⑤ خداوند ذوالجلال علی الصبح مجھے تجھ سے آہ و فریاد میں جو لطف حاصل ہوتا ہے مجھے تو وہی کافی ہے۔ اپنے تغافل میں لطف و کرم کی آمیزش نہ کر کہ یہ میرے جذبہ عشق سے مطابقت نہیں رکھتی۔

⑥ موسم بہار میرے دل رنجور کو راس نہیں آتا کہ یہ ماحول میری فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا ہر چند کہ اس موسم میں خوشنما اور خوش نوا پرندوں کی صدائیں بڑی کیف آور ہوتی ہیں تاہم میرے دل

رنجور کو یہ بھی پسند نہیں۔

⑦ معاشرے اور ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لینا بے علم اور حقیقت سے بے خبر لوگوں تک ممکن ہے قابل قبول ہو لیکن جو لوگ باشعور اور حقیقت شناس ہیں وہ نامساعد حالات میں بھی معاشرتی انتشار کے خلاف بڑی جراءت مندی کے ساتھ سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔

(13)

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی! میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی!
میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟ یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟
اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی!
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی!
نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی!
کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

① قادر مطلق سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں اتنا بڑا تخلیق کار ہونے کے باوجود میں اب بھی اسی طرح کم نصیب ہوں جس طرح کہ تو ہر معاملے سے بے نیاز ہے۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شعر گوئی میں میں نے جو کمال حاصل کیا تھا وہ عملاً میرے لئے بیکار ثابت ہوا۔

② خدایا یہ تو بتا کہ میں کس مقام پر ہوں اور تو کس مقام پر ہے اور جس جگہ میرا قیام ہے وہ مکان ہے کہ لامکان! یہ حقیقت بھی ایک راز سربستہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ عالم امکان میرے اپنے تخیل کا پیدا کردہ ہے یا اسے تیری کرشمہ سازی نے تخلیق کیا ہے؟ مطلب یہ کہ انسان کو ابھی تک حقیقت ابدی کا سراغ نہیں مل سکا۔

③ میری زندگی کی بیشتر راتیں تذبذب اور ذہنی کشمکش کا شکار رہیں کبھی مولانا رومی کے سوز و ساز سے دل ہم آہنگ ہوا اور کبھی اس پر امام رازی کی فلسفیانہ موشگافیاں مسلط رہیں۔

④ اس شعر میں علامہؒ نے شاہین اور کرگس کی علامتوں کے ذریعے قوم کے نونہالوں کی جانب اشارہ کیا ہے کہ وہ جس بزدلانہ اور منافقانہ ماحول میں پرورش پا رہے ہیں ان سے جراءت مندی اور انقلاب پسندی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس کی توجیہ کچھ یوں بھی ہوتی ہے جو قوم کے جو نونہال انگریز کی غلامی اور ان کی تقلید کو ہی شرف قبولیت دے چکے ہیں ان سے ایسے نظام اور اقدار سے بغاوت کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ وہ تو اس حقیقت سے بھی بے خبر ہیں کہ آزاد اور حوصلہ مند نوجوانوں کی فطرت کیا ہونی چاہئے؟

⑤ اس غزل کے بیشتر اشعار میں اقبال اپنے عہد کے مسلمانوں کے انحطاط و انتشار کے پیش نظر یاسیت سے دوچار نظر آتے ہیں تاہم کہیں کہیں ایسی توقعات کی جانب اشارہ بھی کر جاتے ہیں جو رجائیت کی آئینہ دار ہیں۔ اس شعر میں انہوں نے عہد کے تخلیقی عمل کو بے معنی قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ

اس میں تاثر ناپید ہے ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ قوم کو کوئی پر لطف اور دلکشا نغمہ ملے جو خواہ فارسی زبان میں ہو یا عربی میں! اس کے لئے زبان کی کوئی قید نہیں!

⑥ اس شعر میں درویشی اور بادشاہی کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بظاہر وہ دونوں میں کوئی امتیاز اور فرق محسوس نہیں ہوتا۔ درویش اپنے افکار و خیالات کے ذریعے اور بادشاہ تلوار کے ذریعے لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔ عملاً دونوں کا کردار یکساں طرز کا ہے۔

⑦ یہ شعر ہرچند کہ چھ سات دہائی قبل کہا گیا ہے اس کے باوجود مسلمانان عالم بالخصوص ہمارے اپنے ملک میں کم و بیش نصف صدی سے جو صورت حال رہی ہے اس کی غمازی کرتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کیفیت یہ ہے کہ ہر شخص انتشار و بے یقینی کا شکار ہو کر اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے۔ کسی کو اجتماعی مفاد سے واسطہ نہیں۔ اس کی قطعی وجہ یہی ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں اقتدار ہے اور جسے قافلہ سالاری کے فرائض انجام دینے چاہئیں وہی اپنی بے عملی اور ذاتی مفاد کے سبب قوم کی رہنمائی کا حامل نہیں ہے۔ ایسے شخص کا قول و فعل اور کردار دوسروں کو کس طرح متاثر کر سکتا ہے جو ذاتی مفاوات سے بالاتر ہو کر سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ شعر آج کی صورت حال کی پوری طرح تصویر کشی کرتا ہے۔

(14)

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں ۔۔۔ آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم ۔۔۔ اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا ۔۔۔ مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں!
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔۔۔ اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
کہہ گئیں رازِ محبت پردہ دارِیہائے شوق! ۔۔۔ تھی فغاں وہ بھی جسے ضبط فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک ۔۔۔ جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں!

معنی: ردائے نیلگوں: نیلی چادر۔

① اس غزل میں اقبال اپنے فکری موضوعات کو مخصوص انداز میں بیان کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ مطلع کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ اپنی کارکردگی اور جدوجہد کو میں صرف زمیں تک محدود سمجھا تھا یہاں تک کہ پانی اور مٹی کے مابین جو ربط ہے وہی میری کائنات تھی۔ بالفاظ دگر میں نے ایک خاص سطح سے بڑھ کر بلندی تک دیکھنے کی زحمت نہ کی۔

② میری نگاہوں کا طلسم اس لمحے ٹوٹ کر رہ گیا جب تو نے حجاب سے باہر آکر اپنا جلوہ دکھایا ورنہ صورت حالی یہ تھی کہ فضاء میں جو نیلے بادل ہیں ان کو ہی میں نے آسماں سمجھ لیا تھا تیرے جلوے کے پرتو سے مجھ پر حقیقت منکشف ہوئی۔

③ سورج، چاند اور ستاروں کو میں نے اپنا سفر جانا تاکہ عروج کی منازل طے کر سکوں لیکن میرے یہ سفر راہ کے پیچ و خم میں تھک کر رہ گئے اور یوں میں تنہا ہو کر رہ گیا۔

④ عشق ہی وہ قوت تھی جس کے ایک ہلے نے ہی مجھ پر ساری حقیقت کھول کر رکھ دی ورنہ قبل

ازیں اپنی کم علمی کے سبب زمیں اور آسماں کو لاانتہا اور وسیع تر سمجھ رہا تھا یعنی عشق ہی وہ قوت ہے جو شعور ذات اور شعور کائنات سے روشناس کراتی ہے۔

⑤ ہوا یوں کہ شوق کی پردہ داری نے ہی راز محبت فاش کر دیا اور جس کیفیت کو میں نے ضبط فغاں کا نام دیا راز محبت فاش ہونے کے بعد پتہ چلا کہ ضبط فغاں بھی عملاً فغاں بن گئی۔

⑥ فی الواقعہ وہ کسی درماندہ مسافر کی صدائے دردناک تھی جسے اپنی بے خبری سے میں نے قافلے کے کوچ کے اعلان کی آواز سمجھ لیا تھا۔

(15)

اک دانش نورانی، اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی!
اس پیکر خاکی میں اک شے ہے، سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی!
اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی!
ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی!
تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی!
تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی!

معنی: دانش نورانی: اس سے وہ عقل مراد ہے۔ جو انسان کے دل و دماغ کو منور کر دے۔ اور اسے حقیقتوں کو پہچاننے کے قابل بنا دے۔ یہ عقل نور ایمان اور نور یقین کے مترادف ہے۔ **دانش برہانی**: وہ عقل جس میں فلسفیانہ دلیلوں سے کام لیا جائے یہ یقینی طور پر حقیقتوں تک نہیں پہنچاتی اور عموماً دلیلوں ہی کے اندھیرے میں چکر لگاتی رہتی ہے۔

① اس غزل کے مطلع میں اقبالؒ نے دانش نورانی اور دانش برہانی کے مابین فرق کو واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق ایک دانش تو وہ ہوتی ہے جو نور ایمان اور نور یقین کے امتزاج سے جنم لیتی ہے اور قلب و روح کو منور کر دیتی ہے اس کے برعکس دانش برہانی کا تعلق تعقل اور استدلال سے ہے جس سے حقائق تک رسائی مشکل ہوتی ہے۔ اور دلائل کی بھول بھلیاں ہی میں گردش کرتی رہتی ہے اس سے انسان کے تجسس میں تو اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن یہ کسی بنیادی نتیجے پر پہنچنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتی۔

② انسانی جسم میں ایک ایسی شے ہے جو تیری نذر کے قابل ہے اور وہ شے روح ہے یہی سبب ہے کہ میرے لئے اس کا تحفظ ممکن نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس شعر کی تشریح میں اس شے کو دل سے تعبیر کیا لیکن میرے نزدیک یہ تشریح مناسب نہیں کہ اقبالؒ نے واضح طور پر ایک ایسا اشارہ دیا ہے جو دل کی نسبت روح کو زیادہ بہتر طور پر نمایاں کرتا ہے۔ شعر کچھ اس طرح سے ہے کہ۔

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی

علامہ نے پہلے مصرعے میں پیکر خاکی کا ذکر کرتے ہوئے جس شے کا حوالہ دیا ہے وہ روح کے سوا اور دوسری کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو کسی مرحلے پر بھی انسان کے قبضۂ قدرت میں نہیں۔ مزید یہ کہ بے شک

خداوند تعالیٰ ہر شے کا خالق اور اس پر قابض ہے تاہم دل تو ایک مادی شے ہے جو اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب کہ جسم زندہ ہے لیکن روح فنا ہوتی ہے تو جسم کے ساتھ دل بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ آخری بات یہ کہ خداوند قدوس کا رابطہ مادہ سے کہیں زیادہ روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان فنا ہو جائے تو دل اور جسم تو یہیں دنیا میں رہ جاتے ہیں جب کہ روح عالم بالا کو پرواز کر جاتی ہے۔

③ میری آہ و فریاد اب اگر ستاروں تک جا پہنچی ہے تو یہ تو ایک فطری امر ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہو سکتا ہے جب کہ شعر کے ذریعے اظہار کا جوہر تو اے خدا خود تو نے ہی مجھے عطا کیا ہے۔

④ انسان جس طرح سے فنا و بقا کے مراحل سے گزرتے ہیں اس سے تو اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی وجود ایک نقش باطل کی طرح تھا جب چاہا اسے تیرے قبضۂ قدرت نے ختم کر ڈالا لیکن یہ تو بتا کہ انسان جس کو تو نے خود تخلیق کیا اور فرشتوں سے بھی افضل قرار دیا پھر اس آسانی سے اس کو فنا کرنے اور اس کی ناقدری کیا خود تیرے لئے باعث مسرت ہے۔

⑤ تسلیم کہ مغرب کی تعلیم و تہذیب نے مجھے تو مذہب سے لاتعلق کر دیا لیکن اس عہد کے ملا پر تو مغربی تہذیب و علوم کا سایہ تک نہیں پڑا پھر کیا وجہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ مذہب سے لاتعلق ہے بلکہ اس کے لئے باعث ننگ ہو کر رہ گیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملا بالعموم اپنے مفادات کے لئے اسلام کی غلط تاویلیں کر کے عام لوگوں کو اس سے منحرف کر رہے ہیں۔

⑥ وہ احمق لوگ ہیں جو انسان کو تقدیر کا پابند سمجھتے ہیں جب کہ وہ تقدیر کے خلاف جدوجہد کی قوت بھی رکھتا ہے اور واقع یہ ہے کہ انسان نے اپنی بے ہمتی اور بے عملی کے سبب کسی بھی معاملے کو تقدیر کا نام دے دیا ہے حالانکہ خدا نے انسان کو وہ قوت بھی عطا کی ہے جو ناساعد حالات کو اپنی مرضی کے مطابق بدل ڈالے۔ اقبالؒ کا ایک اور شعر اس معاملے کی یوں تصویر کشی کرتا ہے۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے شمشیر و سناں اول' طاؤس و رباب آخر

ایک دوسرا شعر بھی اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبالؒ کا مندرجہ بالا شعر خاصی گہرائی کا حامل ہے۔ وہ ایسے افراد کی نشاندہی کرتے ہیں جو اپنے تساہل اور بے عملی کے سبب ہر مصیبت کو ہی تقدیر کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں۔ جب کہ ہمت و جراءت عمل اور جدوجہد کے ذریعے انسان کم و بیش ہر مشکل پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

⑦ یہ شعر قدرے الجھا ہوا ہے اور اس کی تشریح یوں تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے تاہم صحیح تشریح کے لئے خاصی تگ و دو کی ضرورت ہے چونکہ اس غزل کے باقی اشعار میں اقبال' خدائے ذوالجلال سے مخاطب ہیں لہٰذا شعر کے مطابق یہ کہنا غلط ہو گا کہ جس طرح انسان کے بنائے ہوئے بت مٹی کے ہیں اسی طرح خدا نے بھی جو بت بنائے ہیں وہ مٹی کے ہیں اور ہر دو طرح کے بت فنا ہو جانے والے ہیں۔ یہ تصور بھی بے معنی ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اس شعر میں اقبال کا مخاطب خدا نہیں بلکہ اور کوئی ہے اور وہ کون ہے یہ امر ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔

(16)

یا رب! یہ جہان گزراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردان صفا کیش و ہنر مند؟

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند!

تو برگ گیا ہے ندہی اہل خرد را
او کشت گل و لالہ بہ بخشد بخرے چند!

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند!

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند!

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند!

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظربند!

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی!
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند!

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند!

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند!

پرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خور سند!

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند!

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند!

معنی: **موعظہ:** وعظ، نصیحت۔ **پاژند:** ژند کی تفسیر۔ پارسیوں کے عقیدے کے مطابق ژند وہ کتاب تھی جو ان کے پیغمبر و رہبر زرتشت پر اتری۔ **قریہ:** گاؤں، بستی۔ **دماوند:** ایران کا ایک مشہور پہاڑ۔ **اسپند:** ہرمل، وہ کالا دانہ جو نظربد کا اثر دور کرنے کے لئے جلا دیا جاتا ہے اور آگ پر پڑتے ہی تڑخ کر پھٹ جاتا ہے۔ شاعر تڑخ کی آواز کو سپند کا نالہ یا فریاد کہتے ہیں۔

① بنیادی طور پر "بال جبریل" کی یہ تخلیق غزل نہیں بلکہ اقبال کے مخصوص اسلوب کی نظم میں اس کے ابتدائی شعر میں علامہ اس کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ یہ دنیا اپنی جگہ خوبصورت اور خوشنما سہی لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ یہاں جو صاف دل اور باکمال ہنرمند موجود ہیں ان کی تذلیل کس لئے ہوتی ہے اور انہیں نچلی سطح کا فرد کیوں سمجھا جاتا ہے؟ یہ سوال اس شعر میں اقبال نے خدا کو مخاطب کر کے اٹھایا ہے۔

② دوسرے شعر میں اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ہرچند اس دنیا پر سرمایہ دار طبقے کا تسلط اور اجارہ داری قائم ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے لوگ انگریز کو بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔

③ نظم کا یہ شعر فارسی زبان میں کہا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس شعر میں جو مضمون باندھا گیا ہے اس کے اظہار کے لئے شاعر نے فارسی زبان کو زیادہ مناسب سمجھا ہے چنانچہ یہاں بھی اقبال خدا سے گلہ مند ہے کہ بظاہر تو باکمال اور اہل دانش افراد کو گھاس کی ایک پتی سے بھی نہیں نوازتا جب کہ ہندوستان پر

مسلط انگریز نے انتہائی احمق اور نالائق افراد کو انتہائی عروج پر چڑھا رکھا ہے۔

④ یہ شعر بھی فارسی زبان میں کہا گیا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ عیسائیوں کے کلیساؤں میں تو شراب و کباب فراہم کیے جاتے ہیں جب کہ اسلامیات عالم کی مساجد میں خشک قسم کے وعظ و پند اور نصیحتوں کے سوا اور کیا رکھا ہے بالفاظ دیگر ان مساجد میں عام مسلمان کی دلچسپی کا تو کوئی سامان موجود نہیں اس لئے ان کے ہاں گریز کی کیفیت ملتی ہے۔

⑤ اے رب حقیقی اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تیرے تمام احکام برحق ہیں تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے مفسرین نے قرآنی آیات کو بھی بے جا تاویلات اور پیچیدہ مفاہیم سے ان کے معانی اور مطالب کو بے معنی اور غیر فطری مباحث میں الجھا کر ان کی حیثیت ہی بدل دی ہے۔ بالفاظ دگر ان مفسرین نے قرآن کریم کو بھی "پاژند" بنا کر رکھ دیا ہے۔ واضح رہے کہ پاژندوہ کتاب ہے جو پارسیوں کے پیغمبر حضرت زرتشتؑ پر نازل ہونے والے صحیفہ "ژند" کی تفسیر ہے اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اصل متن کے معانی و مطالب کو بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔ عملاً اقبال قرآن کے بیشتر مفسرین سے غیر مطمئن اور ناخوش نظر آتے ہیں۔ ان کے متعدد اشعار اس کا ثبوت ہیں۔

⑥ یا رب! تو نے اپنے فرمانبردار اور اطاعت شعار بندوں سے بعد وفات جو بہشت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ برحق! تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بہشت کو آج تک کسی نے بھی نہیں دیکھا جب کہ افرنگیوں کا ہر قصبہ و شہر بہشت کی مانند آراستہ ہے اور جو لوگ محض ظاہری خوبصورتی کے قائل ہیں وہ ان سے متاثر کیوں نہیں ہوں گے؟۔

⑦ میری سوچ اور فکر ایک عرصے سے انتشار کا شکار ہے۔ ان کی وسعت اور بلندیوں کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا نا ہی ان سے استفادہ کیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو اب میرے خیالات کو چاند کے غاروں میں مقفل کر دے۔

⑧ اسی حوالے سے اقبال اپنے افکار کے بارے میں یوں گویا ہیں کہ فطرت نے مجھے وہ جوہر عطا کئے ہیں جو فرشتوں میں ہوتے ہیں حالانکہ میری تخلیق تو خاک سے ہوئی اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا اس خاکی دنیا سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔

⑨ میں تو ایسا درویش ہوں جس کا تعلق نہ مشرق سے ہے نا ہی مغرب سے! اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا وطن نہ تو دلی ہے نہ اصفہان اور نا ہی سمرقند ہے بلکہ تیرے عشق نے مجھے ساری دنیا سے بے تعلق کر کے رکھ دیا ہے۔

⑩ خدایا! میں تو سیدھی سچی اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔ وہی میرا قول ہوتا ہے جسے حق پر مبنی سمجھتا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ نہ تو میں ایسا جعلساز ہوں جس نے مسجد کو اپنی پناہ گاہ بنا رکھا ہو نا ہی جدید تہذیب کی مکاریوں اور منافقتوں کا قائل ہوں۔ مطلب یہ کہ نا تو ملا کی طرح سے رجعت پسند ہوں نا ہی جدید تہذیب کا حامی کار اور اندھا مقلد ہوں۔

(11) یہی سبب ہے کہ میری حق گوئی کے سبب اپنے بھی مجھ سے خفا ہیں اور بیگانے لوگ بھی ناخوش ہیں کہ میں زہر کو زہر ہی اور قند کو قند ہی کہنے کا قائل ہوں یعنی ریاکاری اور منافقت کسی مرحلے پر بھی میرے قریب سے نہیں گزری۔

(12) ایک ایسے سچے اور حقیقت پسند انسان کے لئے یہ امر ناممکنات میں سے ہے کہ وہ خس و خاشاک کے ڈھیر کو دماوند پہاڑ سے تشبیہ دے یعنی حقیقت سے روگردانی کرے اس طرح کے کھلے جھوٹ اور فریب کا میں روادار نہیں ہو سکتا۔

(13) جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کی آگ میں بھی خود کو ثابت قدم رکھا تھا۔ یہی کیفیت میری ہے کہ زمانے کی ابتلاؤں کا بھی بڑے عزم و استقلال سے مقابلہ کر رہا ہوں اس لئے کہ میں بندۂ مومن ہوں وہ کالا دانہ نہیں جسے کمزور عقیدہ خواتین ٹونے ٹوٹکے کے لئے آگ میں پھینکتی ہیں اور وہ بلا تاخیر چیخ اٹھتا ہے۔ میں تو ایسا پیکر استقامت ہوں جو ہر چھوٹی بڑی مصیبت کو برداشت کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

(14) میرا کردار یہ ہوتا ہے کو دل سوز و گداز سے لبریز ہے۔ انسان کی خوبیاں دیکھتا ہوں عیب تلاش نہیں کرتا نا ہی کسی کے لئے باعث آزار ہوں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اپنی تمام انا کے باوجود آزاد بھی ہوں اور خود کو پابند قفس بھی محسوس کرتا ہوں اور مال و زر سے محرومی کے باوجود مطمئن اور مسرور ہوں۔

(15) کتنی ہی مشکلات و مصائب ہوں میرا دل تو ہر حال میں مطمئن و مسرور رہتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ کوئی کلی کے لبوں سے مسکراہٹ نہیں چھین سکتا کہ یہ تو اس کی فطری صلاحیت کی مظہر ہے۔

(16) نظم کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ یزداں کے حضور میں بھی میں خاموش نہ رہ سکا بلکہ بڑی بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ اپنی معروضات پیش کر دیں۔ اس جسارت کو بے شک گستاخی پر محمول کیا جائے اور اس کے لئے جو سزا تجویز کی جائے وہ بصد احترام قبول! لیکن یہ بھی تو طرز وفاداری ہے کہ محبوب کے روبرو دل کھول کر رکھ دیا جائے۔ اس پوری نظم میں علامہ نے خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں کچھ معروضات بھی کی ہیں۔ گلے شکوے بھی کئے ہیں۔ اپنی کیفیت قلبی بھی بیان کی ہے۔ اپنے عہد اور کائنات کے معاملات پر بھی گفتگو کی ہے۔ مجموعی طور پر بہرحال بلا عنوان کے یہ ایک بھرپور نظم ہے۔ اگر وہ اس کا کوئی عنوان وضع کرتے تو وہ یقیناً یہی ہوتا کہ "خدا کے حضور میں!"

حصہ دوم

(1)

اعلیٰ حضرت شہید امیرالمومنین نادر شاہ غازیؒ کے لطف و کرم سے نومبر33ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنویؒ کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکار پریشاں جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے۔ اس روز سعید کی یادگار میں سپرد قلم کیے گئے۔ 'ما از پے سنائی و عطار آمدیم'

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شائد ترا اندازۂ صحرا!

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا!

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ!

*

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ!

حضور حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا!

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا!

*

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا!

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا!

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

*

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا!

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا!

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا!

محبت خویشتن بینی، محبت (خویشتن داری)
محبت آستان قیصر و کسریٰ سے بے پروا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را'

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے — غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر — وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسیں وہی ط
سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ — ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لا

*

معنی: حلاج: لفظی معنی دھنیا۔ جو شخصیت عام طور پر منصور کے نام سے معروف ہے اس کا نام حسین
منصور تھا چونکہ اس کے والد کا پیشہ روئی دھنکنا تھا۔ اس وجہ سے وہ حلاج مشہور ہوا۔ منصور کو بھی بعض اوقا
اسی نسبت سے حلاج کہتے ہیں۔ یہاں منصور مراد ہے۔ **استغنا:** بے پروائی' بے نیازی' سیر چشمی۔ صہب
شراب۔ **گلیم:** گدڑی۔ **اویس**ؓ: حضرت اویسؓ قرنی۔ **ابوذرؓ:** مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ جو اسلامی فق
ایک عجیب و غریب نمونہ تھے۔ **دلق:** خرقہ۔ **زہراؓ:** حضرت فاطمہؓ کا ایک لقب۔ **اسرافیل:** ایک فرشتہ
قیامت کے دن صور پھونکے گا۔ **لا:** عربی زبان کا حرف نفی جو کلمہ طیبہ کا پہلا حرف ہے یہاں مراد ہے دہریت او
خدائی قانون کی نفی سے۔ **الا:** عربی زبان کا حرف استثناء مراد ہے الا اللہ سے یعنی ہستی باری تعالیٰ اور اس کے
مقررہ حکموں کا اقرار نیز ان پر عمل۔ **تیز دستی:** لفظی معنی ہاتھ تیزی سے چلانا یعنی مشاق و ہنرمند ہونا۔ مو
تند جولاں: زور شور سے اچھلنے والی لہر۔ **نہنگ:** مگرمچھ۔ **سبل:** سبیل کی جمع' راستے۔ **ختم الرسل:** رسولوں
خاتم یعنی آخری رسول'

"بال جبریل" کی جو ترتیب ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے اس کے دوسرے حصے کا آغاز ہو
ہے۔ اس کی اولیں تخلیق اگرچہ غزل کی ہیئت میں ہے لیکن خود علامہ اقبال کے بقول یہ اشعار انہوں نے
افغانستان کے مشہور بزرگ حکیم سنائی کے مزار اقدس کی زیارت اور ان کے ایک بلند پایہ فارسی قصیدے
سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ 1933ء میں والیٔ افغانستان اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی دعوت پر
ان کے علاوہ سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود بھی کابل تشریف لے گئے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ تینوں
سرکردہ بزرگ افغانستان کے طلباء کے لئے نصابی کتب کی ترتیب کے سلسلے میں مقامی محکمہ تعلیم کی رہنمائی
فرمائیں۔ تاریخی حقائق کے مطابق علامہ اقبالؒ درہ خیبر' پشاور اور جلال آباد کے راستے کابل پہنچے پھر غزنی'
ہرات اور قندھار کے راستے واپس آئے۔ موصوف نے اس سفر کی یادگار کے طور پر مشہور مثنوی "
مسافر" لکھی جو بعد میں ایک دوسری نظم "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" میں شامل کی گئی۔ حکیم سنائی
کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائی عالم و فاضل بزرگ اور بلند پایہ شاعر بھی تھے تاہم ان کی تخلیقات
زیادہ تر غزنی بادشاہوں کے دربار میں قصیدہ گوئی تک محدود تھیں۔

روایت ہے کہ سلطان بہرام غزنوی ہندوستان کی مہم پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تو حکیم سنائی قصیدہ
تیار کر کے دربار میں سنانے کے لئے گھر سے برآمد ہوئے تو راہ میں انہیں ایک مجذوب جس کا نام "لائے
خوار" تھا مل گیا۔ وہ بالعموم شراب خانوں سے تلچھٹ حاصل کر کے پیا کرتا تھا۔ جب حکیم سنائی پر اس کی
نظر پڑی تو وہ شراب فروش سے کہنے لگا۔ "ایک پیالہ اسے بھی دے دینا کہ یہ شخص بے بصیرت ہے"۔
شراب فروش کو اس امر پر بڑا تعجب ہوا۔ اسی اثنا میں "لائے خوار" پھر گویا ہوا کہ "یہ شخص دو چار جھوٹ
سچ جوڑ کر کسی صاحب ثروت شخص کو سنا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں سے حاصل کردہ بخشش ہی اس کا ذریعہ
معاش ہے۔ قیامت میں جب اس سے استفسار کیا جائے گا کہ توشۂ آخرت کیا لایا ہے تو اس کے پاس کوئی

جواب نہ ہو گا"۔

کہا جاتا ہے کہ اس مجذوب کی اس بات نے حکیم سنائی پر دہشت کا عالم طاری کر دیا۔ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور ایسی کایا پلٹی کہ دربار جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد پا برہنہ حج کو گئے۔ واپسی پر عملاً گوشہ نشینی اختیار کر لی کبھی باہر نکلتے بھی تو ننگے پاؤں ہی نکلتے۔ ان کی ایک مشہور تصنیف کا نام حدیقہ ہے۔ علامہ اقبال ان کے قصائد سے بے حد متاثر تھے۔

① زیر تشریح نظم بھی انہوں نے حکیم سنائی کے ایک مشہور قصیدے سے متاثر ہو کر اسی اسلوب میں تخلیق کی ہے اس کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ میرے جذبۂ عشق میں اتنی شدت اور وسعت ہے کہ اگر اس کا احاطہ کیا جائے تو وہ صحرا کی لامحدود پہنائیوں میں بھی نہیں سما سکتا۔ وہ اس شعر میں اپنی اس جذباتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں جو خود ان کے اپنے اندازے سے بھی کہیں زیادہ شدید ہے۔ جنون عشق میں روایتی سطح پر صحرا ہی پناہ گاہ ہو سکتا ہے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ میرے لئے تو وسعت صحرا بھی ناکافی ہے۔

② کائنات کے جو رازہائے سربستہ ہیں وہ محض خودی کے توسط سے ہی منکشف ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ طلسم ٹوٹ جائے تو پھر ذات باری کی حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ توحید عملاً اسی حقیقت سے ہم آہنگ ہے جسے ابھی تک فی الواقع کوئی بھی سمجھ نہیں سکا۔

③ انسان عملاً اس حقیقت سے کلی طور پر غافل ہے کہ نور مطلق ہی دراصل فطرت کی حقیقی روح ہے۔ جس طرح دریا اپنی موجودگی کے بغیر محض ایک ٹھہرے ہوئے پانی کا ذخیرہ بن سکتا ہے۔ یہی کیفیت نور مطلق کے شعور کے بغیر انسان کی ہے اور بدقسمتی یہ کہ انسان ابھی تک اسی شعور سے بیگانہ ہے۔

④ وہ علمائے ظاہر جو علم و عرفاں سے بے بہرہ ہو کر انہیں اپنا رقیب سمجھے بیٹھے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ علم ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا اور ذات باری کا عرفان بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظاہر بین ملا ان سے کد رکھتے ہیں اور حسین بن منصور حلاج جیسے معرفت شناس صوفی کو اپنا رقیب سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ حسین بن منصور حلاج تو معرفت ذات باری میں اس حد تک جذب ہو گیا تھا کہ اپنی ذات کی نفی کر کے من و تو کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی۔ علمائے ظاہر اس کی معرفت شناسی تک رسائی حاصل کرنے کی بجائے اس سے حسد کرنے لگے اور اپنا حریف سمجھ کر اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔

⑤ اس شعر میں اقبال نے ایک ایسا اہم نکتہ بیان کیا ہے جو ہمیشہ سے زیادہ آج کی صورت حال میں زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقتدار ہو یا محکومی دونوں حالتوں میں سچے اور نیک باطن لوگ حرص و ہوس سے بے نیاز رہ کر ہی انتشار و اضطراب اور بنی نوع کے مسائل سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں یعنی استغنا ایسا عمل ہے جو ہر حالت میں انسان کو تمام مسائل و آلام سے محفوظ رکھتا ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ تم ہم ایسے عمل پسند اور عشق حقیقی میں سرشار لوگوں کی تقلید کیا کرو گے کہ تمہارے نزدیک تو ہر لمحہ ذکر خداوندی، تسبیح خوانی اور عرش الٰہی کا طواف ہی کافی ہے۔ جب کہ عشق حقیقی کی راہیں بے حد کٹھن ہیں۔ اس حقیقت کا عرفان تمہیں ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

*

⑦ اس شعر سے زیر تشریح قصیدہ نما نظم کے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے جس میں اقبال کہتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کے مابین جو تضاد ہے وہ بالکل واضح ہے۔ عملاً اس شعر میں وہ مشرقی اور مغربی تہذیب و علوم کا موازنہ یوں کرتے ہیں کہ یہ بدقسمتی ہے کہ مشرق میں بے پناہ علوم و فنون موجود ہیں لیکن ان کو وسعت دینے کی صلاحیت سے اہل مشرق محروم ہیں۔ اس کے مقابلے میں اہل مغرب اپنے علم و فن کو وسعت دینے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن ان علوم و فنون میں وہ روح نہیں جو انسان پر براہ راست اثرانداز ہوتی ہے۔ بالفاظ دگر مغربی تہذیب و علوم راہ حق دکھانے کی بجائے صرف مادی افادیت سے ہم کنار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بس۔

⑧ جن اہل حق اور جراءت مند انسانوں نے روم و ایران کی سلطنتوں اور تہذیب کو اپنی حق گوئی، بے باکی اور جراءت و شجاعت سے خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا اب وہ شخصیتیں نہ تو ایران میں باقی رہی ہیں نہ توران میں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مشرق کے اسلامی ملک اب ایسے صاحب کردار اور جانباز فرمانرواؤں سے محروم ہو چکے ہیں جن کی شان و شوکت اور دبدبہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اب تو صورت حال یکسر بدل گئی ہے۔

⑨ اقبال عرب ممالک کی صورت حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ ممالک تھے جنہیں کعبہ کا سردار کہا جاتا تھا لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ یہاں کے سرداروں نے ابوذر غفاری کی گدڑی، حضرت اویس قرنی کا خرقہ اور سیدہ فاطمۃ الزہرہ کی چادر تک بیچ کھائی ہے۔ اقبال کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے سردار غیرت و حمیت سے محروم ہو چکے ہیں اور انہوں نے اپنے باوقار اور صاحب کردار آباء و اجداد کا ترکہ بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ وہ تمام اسلامی اور انسانی خصوصیات سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک تو عیاشی اور شکم پروری ہی سب کچھ ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ نچلی سے نچلی سطح تک جانے کو تیار ہیں۔

⑩ اس شعر میں علامہ حضرت اسرافیلؑ کے حوالے سے اپنی حق گوئی اور بے باکی کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ فرشتوں کو بھی اس امر کا خوف ہے کہ میری یہ صلاحیتیں اور جراءت مندی کہیں قیامت سے پہلے قیامت برپا نہ کر دے چنانچہ انہوں نے اس امر کی خداوند تعالیٰ کے روبرو بھی شکایت کی۔

(11) یہ شعر بھی ایک طرح سے اس سے پہلے شعر سے مربوط ہے۔ اس شعر کے مطابق فرشتے کی شکایت کے جواب میں عرش معلیٰ سے آواز آئی کہ یہ حقیقت ہی قیامت سے کیا کم ہے کہ کعبہ سے ہزاروں میل دور رہنے والے اہل چین تو عمرہ و حج کے لئے کمربستہ رہتے ہیں جب کہ خود اہل مکہ کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے نواحات میں خواب خرگوش میں مبتلا ہیں۔ اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرعہ حکیم سنائی کے قصیدے سے اقتباس ہے۔

(12) گیارھویں شعر تک علامہ نے اپنی نظم میں مشرقی تہذیب کے حوالے سے بات کی ہے لیکن اس شعر سے وہ مغربی تہذیب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغرب میں تو اب خدا کی ذات سے بھی انکار ہو رہا ہے اور کوئی اس کے احکام کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ عملاً وہاں ابلیس کی حکمرانی ہے۔ اس کے برعکس وہاں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اہل مغرب کو خدا کے وجود اور اس کے احکامات کو تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکے۔

(13) انکار خداوندی اور اس کے احکامات کی عدم تکمیل کے سبب مغرب میں جو انتشار و اضطراب کا

غلغلہ ہے' ہرچند کہ اس کو خوش آئند نعروں اور اسی نوع کی دوسری چیزوں نے عارضی طور پر دبا رکھا ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔ بالاخر اس صورت حال کا رد عمل کسی نہ کسی شکل میں واضح ہو کر سامنے آئے گا۔

(14) ہرچند کہ یورپ اس وقت بڑی طاقتوں کا مرکز ہے۔ اس نے دنیاوی سطح پر بھی بڑی ترقی کر لی ہے لیکن آخر کار وہاں موجود تہذیب ہی ان طاقتوں کی تباہی کا سبب بنے گی۔ اس حوالے سے علامہ نے اپنے ایک اور شعر میں بھی واضح الفاظ میں اسی نوع کی پیش گوئی کی ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اقبال کی یہی پیش گوئی ایک طرح سے دوسری جنگ عظیم کے حوالے سے بھی پوری ہوئی۔

(15) حقیقت یہ ہے کہ اس قصیدہ نما نظم میں علامہ اقبال نے ایک سے زیادہ موضوعات کو اپنے اظہار میں پیش نظر رکھا ہے۔ آئندہ جو تین اشعار ہیں ان میں اپنے نقطہ نظر سے غلامی اور آزادی کا تجزیہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ غلامی دراصل حسن و زیبائی سے محرومی کا نام ہے اور فکر و عمل کی آزادی کے بغیر کوئی شخص بھی آزاد تصور نہیں کیا جا سکتا نا ہی اس کی رائے کو کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے۔

(16) اس شعر میں بھی گزشتہ شعر کے موضوع کے تسلسل میں علامہ نے کہا ہے کہ غلاموں کی بصیرت بھی ناقابل اعتماد ہوتی ہے اس لئے کہ بصیرت تو صرف ان مردان حر کے پاس ہوتی ہے جو بلا خوف و خطر حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے لئے اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔

(17) وہی آج کے عہد کا کامیاب و کامران قائد ہے جو اپنی ہمت و صلاحیت کے بل بوتے پر مستقبل کے متوقع مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان سے نمٹنے کی قدرت رکھتا ہو۔ مقصد یہ کہ عہد حال میں جو کچھ آنکھوں کے سامنے عمل میں آ رہا ہے اس کا اندازہ تو قریب قریب ہر سمجھدار شخص کو ہو سکتا ہے لیکن حقیقی رہنما وہی ہوتا ہے جو اپنی دوربیں نگاہوں اور ادراک و شعور سے مستقبل میں وجود پذیر ہونے والے معاملات تک رسائی حاصل کر سکے۔ ایسا شخص ہی اپنے دور کے علاوہ آئندہ عہد کی نسلوں کی رہنمائی کا حقدار ہوتا ہے۔

(18) مذکورہ بالا تین اشعار کے بعد اقبال پھر اپنا موضوع بدلتے ہیں۔ ان کے مطابق اہل یورپ نے مشرق کی مستحکم اور باوقار قوتوں کو اپنی شعبدہ بازی اور مکاری کے ذریعے ان کی تمام تر صلاحیتوں اور قوتوں سے محروم کر رکھا ہے لیکن مجھے قدرت نے ایسی توفیق عطا کر دی ہے کہ جس کے ذریعے میں اہل مشرق میں ہمت اور مقابلے کی استطاعت پیدا کر سکوں۔

(19) ہرچند کہ اس عہد کے فرعون میرے افکار کے شدت سے مخالف ہیں اور ہر لمحے مجھے شکست سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنے جال بچھائے رہتے ہیں لیکن جس طرح فرعون کے بالمقابل حضرت موسیٰؑ ید بیضا سے کام لیتے تھے اسی طرح میرے افکار و عمل اور قدرت خداوندی پر اعتماد کا جذبہ میرے دشمن فراعین کے لئے ید بیضا کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا مہر نے اس شعر میں ید بیضا کو قرآن حکیم سے تشبیہ دی ہے۔ ممکن ہے ان کا نقطہ نظر درست ہو۔

(20) اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ زیر تشریح شعر میں یوں گویا ہیں کہ میرا فکر و عمل کسی

منفی قوت سے ناکارہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے مشرق کی اقوام میں عزم و ہمت کی ایک نئی لہر اور جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ یہ قوت و صلاحیت مجھے خود ذات باری تعالیٰ نے عطا کی ہے۔

(21) وہ عشق جو مجھے ذات رسول مقبولؐ سے ہے وہ اپنی حقیقت کو پہچاننے میں مددگار ثابت ہوتا ہے لیکن ضروری ہے کہ اس جذبہ عشق پر قائم رہنے اور اسے برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے کہ یہ عشق تو قیصر و کسریٰ جیسے بادشاہوں کے آستانوں سے حاصل ہونے والی عزت و حرمت سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے۔ مراد یہ کہ حضورؐ سے عشق ہی وہ مقتدر جذبہ ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

(22) اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں ارتقاء کے ان مراحل سے گزر رہا ہوں جن کی بنیاد پر چاند اور ثریا پر اپنا تسلط جمالوں تو کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ میں تو ذہن اور فطری طور پر اس بلند و بالا ہستی کے خاک پا کی حیثیت رکھتا ہوں جو نبیؐ آخر الزماں ہے اور ازل سے ابد تک پوری کائنات میں اس کا کوئی ہمسر نہیں چنانچہ اس بلند و بالا شخصیت کے طفیل اگر میں کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لوں تو حیرت نہیں ہونی چاہئے!

(23) یہ شعر بھی پہلے دو اشعار کے تسلسل میں تخلیق کیا گیا ہے کہ حضور مقبولؐ کی ذات والا صفات تو عقل و دانش کی کلیت سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وہ ذات پاک ہے جو خداوند عزوجل تک رسائی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہی وہ ذات والا صفات ہے جس پر اس دنیا میں آنے والے انبیاء اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہوا کہ وہی تو نبیؐ آخر ہیں۔ اور وہی اس پوری کائنات کے آقا و مولا ہیں۔ انہی کی خاطر یہ کائنات وجود میں آئی۔ یہی وہ ذات پاک ہے جو راستے کی گرد کو بھی کوہ طور کی تجلیوں میں ڈھالنے کی قدرت رکھتی ہے۔

(24) پیغمبرؐ آخر الزماں کی عظمت بیان کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں کہ یہی ذات والا صفات ہے جو نگاہ عشق و مستی میں سب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور اس کائنات میں جس کی تخلیق سب سے پہلے ہوئی اور جس کی شخصیت دنیا کے آخری مرحلے تک برقرار رہے گی۔ یہی وہ ہستی ہے جو اخلاق قرآنی کا مکمل نمونہ تھی۔ یہی ہستی قرآن بھی تھی اور اسی کو یٰسین و طٰہٰ کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔

(25) اس قصیدہ نما نظم کو تمام کرتے ہوئے آخری شعر میں علامہ فرماتے ہیں کہ حکیم سنائی کا احترام دامن گیر نہ ہوتا تو حضورؐ ختمی مرتبت کی شان میں اس نعتیہ قصیدے میں جو بحر استعمال کی گئی ہے اس میں مزید اشعار تخلیق کرتا کہ حضورؐ تو اتنی صفات کے مالک ہیں جن کا شمار انسانی فہم سے بالاتر ہے۔

(2)

یہ کون غزل خواں ہے پُر سوز و نشاط انگیز — اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز!
گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ — ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنت پرویز!
اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی — خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز!
اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا — ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز!
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن — جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز!

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز!
یوں داد سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس یہ کافر ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز!

معنی: تیمور: وسط ایشیاء کا سب سے بڑا فاتح مسلمان۔ بابر تیمور کی چھٹی پشت میں تھا۔ جس نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تیمور نے ایشیا کے اکثر چھوٹے بڑے بادشاہوں کو تباہ کیا اور بے شمار انسانوں کا خون بہایا۔ رستا خیز: قیامت۔ چنگیز: تاتاریوں کے وہ مشہور سپہ سالار جس نے تیرہویں صدی عیسوی میں اپنی خانہ بدوش قوم کو منظم کر کے ایک بے پناہ قوت پیدا کر لی۔ پھر اسلامی ملکوں پر حملہ آور ہوا۔ اور ایشیا کے تاریخی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی یورش میں کم و بیش ستر لاکھ مسلمان موت کے گھاٹ اترے۔

① اس غزل کے مطلع میں اقبال سوالیہ انداز میں خود اپنے بارے میں یوں گویا ہیں کہ یہ کون سخن ور ہے جس کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور کیف و سرور بھی! اور جن لوگوں کو اپنی دانشوری پر ناز ہے ان کی عقل پر بھی۔ اس کلام سے ایک طرح کے جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کلام میں دانشوروں کے لئے عمل کی ترغیب فراہم کی گئی ہے۔ اس شعر میں اقبال اپنی سیرت و کردار کے حوالے سے خود ہی موجود نظر آتے ہیں۔

② یہ درست ہے فقیری اور بادشاہی دونوں میں کچھ باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فقیر بھی بادشاہ کی طرح بے نیاز ہوتا ہے تاہم دونوں کے مابین بنیادی فرق یہ ہے کہ فقیر اپنی شان و شوکت کو نمایاں کرنے کے لئے کسی حکومت یا سلطنت کا محتاج نہیں ہوتا جب کہ بادشاہی سلطنت و مملکت کے بغیر ناتمام اور بے معنی شے ہے۔ بالفاظ دیگر فقیر تو اپنی روحانی قوت سے کام لیتا ہے جب کہ بادشاہ کے پاس ہر طرح کے لاؤ لشکر کے علاوہ ہر نوع کے ہتھیاروں کی بہتات ہوتی ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان لوازمات کے بغیر بادشاہت اور اس کے اقتدار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ فقیر نہ مال و دولت کا آرزومند ہوتا ہے نا ہی عز و جاہ اور اقتدار کا! وہ تو اپنے معتقدین کے دلوں پر اپنی روحانی قوت کے ذریعے دسترس رکھتا ہے۔

③ اب اگر یہ کہا جائے کہ صوفی میں پہلے جیسی صلاحیت اور روحانی قوت برقرار نہیں رہی تو بے جا نہ ہو گا ورنہ ماضی میں تو صوفی اور درویش میں ایسی روحانی قوت ہوا کرتی تھی جس کے روبرو شیر بھی لرزہ براندام رہتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ اس عہد کا صوفی اور درویش تو فقر و غنا سے انحراف کر کے دنیاوی مال و منال کے چکر میں الجھ کر رہ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ روحانی قوت باقی نہیں رہی جو ہر نوع کی بڑی قوت پر بھاری ہوتی تھی۔

④ اقبال اس شعر میں آج کے صوفیوں اور درویشوں کو مخاطب کر کے ان سے استفسار کرتے ہیں کہ ذرا اس حقیقی اور سچے صوفی کے متعلق تو سوچو جو اپنے سینے میں زبردست روحانی قوت رکھتا ہے۔ ایسی روحانی قوت جو کسی بھی قوم میں انقلاب انگیز صفات پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال کا اس شعر میں بنیادی مقصد یہ ہے کہ اپنے عہد کے ان صوفیوں اور درویشوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ تم لوگ تو بے حسی اور بے عملی کے سبب اپنی روحانی قوت اور قدرت کی بخشی ہوئی صلاحیت کھو چکے ہو لیکن آج بھی ایسے مرد درویش موجود ہیں جو قوموں میں انقلاب کی جوت جگانے کے اہل ہیں۔

⑤ یہ شعر بھی اپنے موضوع اور مفہوم کے تسلسل میں اس سے پہلے شعر کے بنیادی متن سے ہم آہنگ ہے۔ اس شعر میں اقبال اسی انقلابی درویش کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ایسا مرد حق ہوتا ہے کہ جب اس کے روبرو خالق حقیقی کا ذکر کیا جائے تو اس کے دل و دماغ جوش عقیدت میں شعلے کی طرح روشن ہو جاتے ہیں اور جب فکری سطح پر اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کا ذہن اسی سرعت سے کام کرتا ہے جس طرح برقی رو تیزی سے دوڑتی ہے۔

⑥ یہ فطری امر ہے کہ ملوکیت میں ظلم و جبر بالآخر ایک جنون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے رد عمل کے طور پر تیمور و چنگیز جیسے قاہر و جابر فرمانروا پیدا ہوتے ہیں جو اس جنون کو انتہا پر پہنچا کر اعتدال پر لے آتے ہیں۔

⑦ اقبال کہتے ہیں کہ نہ میرے پاس باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے کوئی ہتھیار ہے نا ہی کوئی اور وسیلہ! اگر ہے تو شعر کی وہ تخلیقی قوت ہے جو شاید کسی بھی ہتھیار سے زیادہ کار آمد ہے۔ ایران و عراق کے دانشور اسی لئے مجھے داد دینے پر مجبور ہیں کہ میں شاعری کو ہتھیار بنا کر باطل سے نبرد آزما ہوں۔

3

وہ حرف راز کہ مجھکو سکھا گیا ہے جنوں ① خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں!
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں
حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی! خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں!
عجب مزا ہے مجھے لذت خودی دے کر وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں!
ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیِ شوق نہ مال و دولت قاروں نہ فکر افلاطوں!
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں!
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں!
علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں!

معنی: قارون: قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا۔ جسے خدا نے بکثرت مال و زر عطا کیا تھا۔ وہ راہ حق سے منحرف ہو گیا تھا۔ سمجھانے بجھانے کا بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے قارون اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا ہے۔ اور کوئی بھی اسے خدا کی گرفت سے بچا نہ سکا۔ **افلاطون:** یونان کا مشہور فلسفی۔ **رومی:** اشارہ ہے حضرت مولانا روم کی طرف۔ **کن فیکون:** اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف:- **بدیع السموات والارض واذا قضی الامر فانما یقول له کن فیکون؛** (خدا ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا سو ہو جاتا ہے) گویا خدا نے کائنات کو پیدا کرتے وقت کن کہا اور وہ پیدا ہو گئی۔ **جیحون:** ترکستان کا مشہور دریا۔

① عشق الٰہی کے جنون نے (بقول اقبال) مجھے ایسا شعور بخش دیا ہے جس کے طفیل میں ایسے رازہائے درون پردہ سے آگاہ ہو گیا ہوں کہ جن کا انکشاف خود اپنی زبان سے کیا جانا ممکن نہیں کہ اس مقصد کے

لئے جبریل امیں جیسی صلاحیت درکار ہے۔ جبریل ہی کو فرشتوں میں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وحی الٰہی پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ کو پہنچایا کرتے تھے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ جو الہامی کیفیت رازوں کی شکل میں میرے پاس محفوظ ہیں ان کے انکشاف اور ترسیل کے لئے جبریلؑ جیسے کسی فرشتے کی ضرورت ہے۔

② اس شعر میں اقبال اپنی ذات کے حوالے سے ان نجومیوں کی کارکردگی پر طنز کرتے ہیں جو ستاروں کے حساب سے لوگوں کی تقدیر اور ان کے احوال کے بارے میں انکشافات کا دعویٰ کر کے محض مادی مفادات حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے کہ ستارے تو خود آسمانوں کی پہنائیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انہیں تو خود ہی اپنے وجود کے بارے میں کسی قسم کا علم نہیں تو پھر دوسروں کے مقدر کا انکشاف ان کے ذریعے کیسے ممکن ہے۔

③ اس شعر میں اقبال فلسفہ حیات پر ایک سوال کے ذریعے استفسار کرتے ہیں اور خود ہی اس کا جواب بھی دیتے ہیں کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ انسانی فکر اور تعقل کے مابین ارتباط ہی زندگی کے فلسفے کا مظہر ہو سکتا ہے اور فکر و تعقل کے مابین اگر یقین و اعتماد کا رشتہ موجود نہ ہو تو خود وجود انسانی اور اس کی روحانی قوت منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ زندگی کے لئے فکر و تعقل اور یقین و اعتماد ناگزیر حیثیت کے حامل ہیں ان کے بغیر انسان کی تکمیل ممکن نہیں۔ اقبال کے نزدیک زندگی کا بنیادی فلسفہ بھی یہی ہے۔

④ یہ کس قدر دلچسپ معاملہ ہے کہ حق تعالیٰ نے خود ہی مجھے وہ صلاحیت عطا کی ہے کہ اپنی ذات اور اپنے وجود کو شناخت کر سکوں۔ اس کے بعد یہ امر کس قدر عجیب و غریب ہے کہ مجھ سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ اپنی ذات اور اپنے وجود کو فراموش کر بیٹھوں۔ اقبال کے پیش نظر یہ حقیقت ہے کہ خدائے عز و جل نے ہی انہیں یہ اہلیت عطا کی ہے کہ وہ اپنی ذات کی حقیقت سے آگاہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یعنی خدا اس امر کا بھی خواہاں ہے کہ اپنے وجود سے بے نیاز ہو کر بھی اس کی محبت اور چاہت میں گم ہو جاؤں یعنی اپنی شخصیت کو بھی بھول جاؤں۔

⑤ حالانکہ میرا ضمیر ہر نوع کے لہو و لعب سے پاک ہے اور عشق الٰہی کے علاوہ اپنی فکری سطح کو بھی بلند رکھتا ہوں ان کے علاوہ نہ تو یہ خواہش ہے کہ قارون کی طرح مال و دولت حاصل کروں نا ہی افلاطون کی طرح رعونت کا قائل ہوں۔ میں تو ہر طرح سے ان لوازم سے بے نیاز ہوں۔

⑥ حضورؐ پاک جس طرح شب معراج عالم بالا پر تشریف لے گئے اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عالم افلاک انسانی دسترس سے باہر نہیں ہے بشرطیکہ انسان میں صلاحیت اور ایسی علمیت موجود ہو جو اس مقصد کے لئے ضروری ہے۔ علامہ اقبال نے واقعہ معراج کے پس منظر میں مستقبل کے لئے جو پیش گوئی کی تھی وہ آج پوری ہو چکی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان چاند پر بھی پہنچ چکا ہے اور اس سے اگلی منزلوں تک بھی اس کی رسائی ہو چکی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے عہد میں تو یہ ٹیکنالوجی نہیں تھی نا ہی سائنسی بنیاد پر انسان اتنی ترقی کر چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ چودہ سو سال قبل پیغمبرؐ اسلام جو عالم بالا پر معراج کے لئے تشریف لے گئے تو اس سے ان کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

⑦ خدائے عز و جل نے ایک لفظ "کن" کے ذریعے کائنات کو تخلیق کیا۔ آج تک کانوں میں یہی لفظ بار بار گونج رہا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کائنات ابھی تک ناتمام ہے اور پایہ تکمیل کو

نہیں پہنچی۔

⑧ آج کے انسان سے مخاطب ہو کر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تیرے مسائل محض اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں کہ تجھ میں مولانا روم کا سا سوز و ساز پیدا ہو جائے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ تو مغرب کے افسوں کا شکار ہے اور اس سے ہی تیرا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان مغرب کی تہذیب سے اس قدر مسحور ہے کہ مولانا روم کی تعلیمات کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ عملاً یہ خطاب اقبال کا مسلمانوں سے ہے۔

⑨ حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ یہ مولانا روم کی تعلیمات کا فیض ہی ہے جس سے میرے (اقبال) دل و دماغ روشن ہیں اور شعور میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ مولانا کے علم و عرفاں کے طفیل ہی میرے علم و دانش میں اضافہ ہوا ہے اور سب چیزوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کے قابل ہو سکا ہوں۔

(4)

عالم آب و خاک و باد! سرِ عیاں ہے تو کہ میں؟ — وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟
وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے — اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرم سیر — شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟
تو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر! — کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

① چار اشعار کی یہ مربوط و مسلسل نظم فی الواقع کائنات اور انسان کی صفات کے مابین ایک تقابلی جائزے کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ابتدائی شعر میں اقبال نے کائنات کو محض پانی، مٹی اور ہوا کا مرکب قرار دیتے ہوئے انسانی صفات کو خالق حقیقی کے ایک ایسے بھید سے تعبیر کیا ہے جو سب پر عیاں ہے۔ اسی حوالے سے انہوں نے فرمایا ہے کہ اے دنیا یہ تو بتا جو خالق حقیقی ہے وہ میرے دل میں موجود رہتا ہے یا تجھ میں؟ مراد یہ کہ تجھے تو اس کا ادراک بھی نہیں جب کہ انسان کے لئے تو وہ سب کچھ ہے۔

② اس شعر میں اقبال نے ظہور آدم اور اس کے وجود میں آنے کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس کے بارے میں بڑے علامتی انداز میں بات کی ہے کہ ظہور آدم سے قبل تو تاریکی ہی تاریکی تھی جب کہ وہ کائنات میں وارد ہوا تو ہر سمت اس کے شعور کی روشنی پھیل گئی سو فی الواقع یہ انسان ہی ہے جو صبح کی اذان کی طرح منظر پر نمودار ہوا اور جس نے کائنات کی تخلیق کا مقصد واضح کر کے ایک ایسے شعور کو جنم دیا جس کے سبب اپنی ذات کے ساتھ کائنات کی شناخت بھی ممکن ہوئی جب کہ انسان کے بغیر تو یہ کائنات ایک تاریک شب کے مانند تھی۔

③ ہر چند کہ انسان نے ارتقاء کا جو عمل شروع کیا ہے وہ ابھی تک تکمیل پذیر نہیں ہو سکا اس لئے کہ کائنات کے جملہ مادی عناصر دیکھا جائے تو اس کی راہ میں حائل ہیں۔ کائنات میں شب و روز کی جو گردش جاری ہے وہ اسی لئے کہ خود انسان بھی ابھی اپنی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سطور بالا کے مطابق انسانی ارتقاء کے عمل میں یہی مادی عناصر رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

④ اس شعر میں بھی اقبال پانی، مٹی اور ہوا جیسے عناصر سے ترتیب پانے والی دنیا سے مخاطب ہیں کہ کہتے

ہیں کہ تو تو یقیناً ایک مشت خاک کے سوا اور کچھ نہیں کہ جس میں نہ شعور موجود ہے نہ ادراک! جب کہ میں وہ شخصیت ہوں جس میں بصیرت بھی موجود ہے اور بصارت بھی! جو اپنی حقیقتوں سے بھی پوری طرح آشنا ہے اور تیری اصلیت سے بھی آگاہی رکھتا ہے۔ اس صورت میں اگر میں یہ استفسار کروں تو غیر مناسب نہ ہو گا کہ حیات میں جو تازگی اور تراوٹ کے علاوہ ارتقاء کا عمل جاری و ساری ہے اس کی وجہ کون ہے؟ تو یا میں؟ اس سوال کا جواب یقیناً میرے حق میں ہو گا۔

(5)

(لندن میں لکھے گئے)

تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گزر! — مصر و حجاز سے گزر' پارس و شام سے گزر!
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے — حور و خیام سے گزر' بادہ و جام سے گزر!
گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار — طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر!
کوہ شگاف تیری ضرب' تجھ سے کشاد شرق و غرب — تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر!
تیرا امام بے حضور' تیری نماز بے سرور — ایسی نماز سے گزر' ایسے امام سے گزر!

معنی: خیام: خیمہ کی جمع۔

① پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم علامہ اقبال نے لندن میں قیام کے دوران لکھی تھی۔ آغاز میں انہوں نے اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے اپنے خصوصی انداز میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم لوگ تو ابھی تک نا آشنائے منزل ہو۔ ابھی تک راستے میں ہی بھٹک رہے ہو۔ لہٰذا اگر اپنے مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے منزل تک پہنچنے کے خواہاں ہو تو پھر یہ مصر و حجاز اور ایران و شام کی حدود سے آگے بڑھنا ہو گا کہ مسلمان کے لئے یہ جغرافیائی حدیں بے معنی شے ہیں۔ عملاً یہ جغرافیائی حدود کا تصور تو یہاں یورپی تہذیب کی در آمدات میں سے ہے جب کہ مسلمان کی تو ایک ہی قومیت ہے وہ خواہ عرب میں بود و باش رکھتا ہو یا عجم میں! بہر حال مسلمان ہے اور اس کی قومیت مشترک ہے۔

② دوسرا شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں علامہ کہتے ہیں کہ جو شخص سیرت و کردار کے حوالے سے بے غرض اور حرص و ہوس سے دور ہو گا خداوند قدوس اس کو خصوصی طور پر اس عمل کی جزا دیتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ بہشت تک رسائی کے لئے حور و غلماں اور شراب طہورہ کے خیال سے بے نیاز ہو کر نیک نیتی کے ساتھ اپنے عمل میں مصروف رہا جائے کہ اس نوعیت کا عمل تو ہر قسم کی جزاء سے بلند ہے۔

③ ہر چند کہ مغرب کا حسن اور وہاں کی تہذیب ظاہری سطح پر مسرت بخش ہوتی ہے لیکن یہ چیزیں تو عملاً ایک جال کے مانند ہیں جس میں بھولے بھالے انسانوں کو پھانسا جاتا ہے۔ یہاں بھی اقبال مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تمہاری سیرت و کردار تو بڑے بلند مقاصد کے آئینہ دار ہیں لہٰذا تمہارے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ مغرب کے حسن برہنہ اور تہذیب سے دور رہو۔

④ تیری ضرب لا الٰہ تو پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اور تجھ میں ایسی صلاحیت بھی موجود ہے جو مشرق و مغرب کے عقدے کھول دے اور ان کے مسائل حل کر دے۔ اے مسلمان! تیرے لئے لازم ہے کہ جس طرح ہلالی تیغ دشمن کی صفوں کو کاٹتی چلی جاتی ہے اسی طرح اپنے عمل سے تمام معاملات کو سلجھا کر رکھ دے۔

⑤ اس میں شک نہیں کہ اس شعر میں بھی اقبال مسلمان سے مخاطب ہیں لیکن یہاں ان کا لہجہ خاصا تند و تیز ہے۔ فرماتے ہیں کہ تو جس امام کی قیادت میں خدائے عز و جل کے حضور میں سجدہ ریز ہو رہا ہے اس امام کو تو خود بھی حضوری کا درجہ حاصل نہیں کہ اس کی نیت اور عمل منافقانہ ہے۔ اسی سبب تیری نماز بھی بے کیف ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ تیرے لئے مناسب یہی ہے کہ ایسے بے کیف سجدوں اور اس طرح کے بے عمل اور منافق امام کی قیادت سے دستبردار ہو جا۔ مراد یہ ہے کہ جب راہ نما خود ہی بے عمل اور بد دیانت ہوں تو ایسے لوگوں کی قیادت کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان سے گریز کرنا چاہئے۔

(6)

امین راز ہے مردان حر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی!

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی!

نگاہ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں
نہ آہ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی!

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی!

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ و نم یہ لہو آب و ناں کی ہے بیشی!

معنی: ناخوش اندیشی: ایسی باتیں سوچنا جو بہت بری ہوں۔

① سچے اور آزاد منش انسان حق تعالیٰ کے رازوں کے اپنی درویش طبعی کے باوجود جبرئیل امیں کی طرح امانت دار ہوتے ہیں مراد یہ ہے کہ جس طرح جبرئیل امیں احکامات الٰہی پوری دیانتداری کے ساتھ انبیاء کرام تک پہنچایا کرتے تھے اسی طرح یہ درویش صفت لوگ خدائے عز و جل کے احکامات تمام لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور دیانت داری کے ساتھ ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کے اور جبرئیل امیں کے مابین یہی ایک رشتہ ہے۔

② دیکھا جائے تو یہ شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے ایسے فقیہہ، صوفی اور شاعر جو منافقانہ روش کے حامل ہیں انہوں نے نہ جانے اپنی دنیاداری اور غلط روش سے کتنے لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور تباہی کے غار میں دھکیلا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ لوگ اپنے علم و فضل اور دانش سے عوام الناس کی رہنمائی کرتے لیکن اپنی بے عملی اور منافقت کے باعث یہ لوگ تو خود ہی گمراہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

③ قوموں کی حقیقی رہنمائی کے لئے تو ایسے سچے جذبوں اور اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کو سرگرم عمل کر کے شیر کی سی توانائی اور قوت عطا کرتے ہیں۔ ایسے جذبوں کی نہیں جو قوموں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بزدل بنا کر رکھ دے۔

④ اس شعر میں بھی اقبال ان لوگوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو جذب و عمل سے محروم ہیں۔ اقبال اس

صورت حال کو ایک مخصوص قسم کے مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس مرض کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں کہ ملت میں عمل اور سربلندی کا جذبہ ہی ایک صحت مند معاشرہ تشکیل دے سکتا ہے۔

⑤ اعلیٰ مقاصد اور ان کے تکمیل کے لئے جس جوش و جذبے کی ضرورت ہے اس کے بغیر انسان سرخرو نہیں ہو سکتا۔ محض بلا نوشی سے انسانی جسم کی پرورش نہیں ہوتی بلکہ اس مقصد کے لئے تو وہ خصوصیات درکار ہیں جو جسم کے ساتھ ساتھ روح میں بھی پاکیزگی کا عنصر پیدا کریں مراد یہ ہے کہ ظاہری نمود و نمائش بے معنی چیزیں ہیں اصل حقیقت تو انسان کے اندر کی پاکیزگی ہے۔

(7)

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار — اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح — اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے — ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!
من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق — تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج — من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

① یہ نظم علامہ اقبال کی دوسری نظموں سے فکری سطح پر قدرے مختلف ہے۔ خاص طور پر اس کے ابتدائی اشعار میں وہ نیچر سے زیادہ قریب ہوتے ہوئے اپنے ماحول کی منظر نگاری کرتے دکھائی دیتے ہیں چنانچہ اولیں شعر میں فرماتے ہیں کہ موسم بہار آگیا ہے اور لالے کے پھول اپنے رنگ و روپ سے پہاڑوں اور ٹیلوں کو تابانی بخش رہے ہیں۔ باغوں میں پرندے مسرت و انبساط سے اس طرح چہک رہے ہیں کہ میں خود جھوم اٹھا ہوں اور اس منظر کے اثرات مجھے نغمہ گری پر اکسانے لگے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایک تخلیق کار اور شاعر کو جب رنگ و روپ میں ڈھلا ہوا فطری ماحول مل جائے تو ایسا ماحول اس کی تخلیقی قوت پر اثر انداز ہوتا ہے اور پھر وہ اپنے تخلیق سے گزرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

② بہار کا موسم پورے جوبن پر ہے۔ باغات تو الگ رہے جنگل میں بھی رنگ برنگے پھول اس طرح سے کھلے ہوئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ پریاں قطار باندھے کھڑی ہیں۔

③ ان اشعار میں علامہ نے جو خوبصورت امیجری پیدا کی ہے اس سے قاری کے ذہن کو آسودگی ملتی ہے۔ چنانچہ اس شعر کے مضمون میں جو حسن اور نزاکت ہے اس سے علامہ کی فنکارانہ چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کو رقصاں دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں صبح کی ہوا نے پھولوں پر ایک موتی کی طرح سجا دیا ہے اور سورج کی کرنیں جب اس موتی پر پڑ کر

اس کی آب و تاب میں اضافہ کرتی ہیں تو یہ منظر اور زیادہ خوشنما ہو جاتا ہے۔

④ خدائے عزوجل تو اس امر سے قطعی بے نیاز ہے کہ اس کے مظاہر کی کس مقام پر زیادہ پذیرائی ہوتی ہے۔ اس کے لئے شہر اور جنگل کی کوئی قید نہیں بس اس کے نزدیک تو یہ حقیقت ہے کہ اپنے مظاہر کی نقاب کشائی کے لئے اگر شہروں کی بجائے صحرا کا انتخاب کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ شہر کے مقابلے میں صحرا کی حیثیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

⑤ اس شعر میں اقبال انسان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تو میری بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں تو اپنے باطن میں جھانک کر ہی زندگی کی حقیقتوں کا ادراک کر لے کہ زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ انسان کے باطن میں پوشیدہ رہتی ہے اور انسان کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہونا چاہیے۔

⑥ اس شعر میں اقبال فلسفۂ خودی کو بالکل ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ جذبۂ عشق و مستی کے علاوہ انسانی فطرت کے دونوں پہلوؤں نیکی اور بدی کا جائزہ بھی لیتے ہیں چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ ایک جانب تو انسان باطنی سطح پر جذب و مستی اور عشق حقیقی سے ہم آہنگ رہتا ہے جب کہ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ذاتی مفاد کے لئے وہ ہر نوع کے مکر و فن کے مراحل سے گزرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا۔ اقبال اس شعر میں انسانی کردار کے ان دونوں پہلوؤں کو خیر و شر کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

⑦ مذکورہ بالا مسئلے کو اس شعر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر سے اقبال نے پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق انسان کو باطنی سطح پر قلبی سکون میسر آ جائے تو پھر اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جو ضائع نہیں ہوتی جب کہ مادی اور جسمانی سطح پر حاصل ہونے والی دولت اور قوت تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں کے مانند ہے۔ اس کو کسی طور پر بھی پائیداری حاصل نہیں ہوتی۔

⑧ اقبال من کی دنیا کو ایسی ریاست سے تعبیر کرتے ہیں جہاں مغربی استعمار کا تسلط بھی کسی طور پر ممکن نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں تو شیخ اور برہمن کے تضادات پر مبنی رویوں کی گنجائش نہیں ہے۔ مراد یہ کہ من کی دنیا ایسی پاکیزہ اور شفاف دنیا ہے جہاں مفاد پرستی' منافقت اور ریاکاری کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ جہاں مغربی استعمار کی مکاری اور فریبی سیاست سے دور ہے وہاں شیخ اور برہمن کے گمراہ کن نظریات بھی نہیں ہیں۔

⑨ اپنی بات کو تمام کرتے ہوئے نظم کے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اس ضمن میں مجھے تو ایک مرد قلندر کا قول شرمسار کر گیا کہ اپنی خودی کو چھوڑ کر اگر تو کسی کے روبرو جھک گیا تو جان لے کہ تیرے پاس نہ تو روحانی سکون کی دولت باقی رہے گی نا ہی دوسرے مادی فوائد برقرار رہیں گے۔

(8)

(کابل میں لکھے گئے)

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندان مکتب سے سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!
بہت مدت کے نخچیروں کا انداز نگہ بدلا کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا!
قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!
حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا!
کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا!

① اس نظم کے چھ اشعار کے بارے میں اقبال نے خود فرمایا ہے کہ یہ کابل کے دوران قیام تخلیقی سطح پر وجود میں آئے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان کی یہ فطرت ہے اور یہ خصوصیت اس کے لہو میں شامل ہے کہ ہر شخص کے ساتھ خلوص و محبت کے ساتھ پیش آئے۔ یہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ہر فرد کے ساتھ مروت سے پیش آنا اس کا نصب العین ہے۔ اور یہی ان لوگوں کا طرز عمل ہوتا ہے جو راہ حق میں جہاد کرتے ہیں۔

② اقبال درس گاہوں کے معلمین کے بارے میں خداوند تعالیٰ سے شکوہ کناں ہیں کہ یہ لوگ شہبازوں کو ایسا سبق دے رہے ہیں جو انہیں پستی میں دھکیل رہا ہے۔ بالفاظ دگر اقبال مالک حقیقی سے مخاطب ہوتے ہوئے مروجہ نظام تعلیم اور اس سے متعلق کارپردازاں کی نااہلی کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ عملاً مسلمان بچوں کو پستی کی طرف لے جا رہا ہے۔

③ وہ لوگ جو صدیوں سے ظلم و جبر کا شکار تھے۔ ان میں بیداری کی لہر ابھر رہی ہے اس لئے کہ میں (اقبال) نے اپنی نوائے فکر سے ان کے لہو کو گرما دیا ہے۔

④ مجھ ایسے درویش و قلندر کے پاس تو لفظ لا الٰہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں جب کہ فقیہہ شہر عربی زبان کی بھاری بھرکم لغت کا حافظ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں انتہائی ثقیل اور ایسے لفظوں کا استعمال کرتا ہے جو کہ عوام الناس کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اسکا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ سننے والا اس کی مبہم تقریروں سے مرعوب ہو کر رہ جائیں۔

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ عام شعراء کی مانند میں گل و بلبل اور جام و شراب کے ذکر تک محدود نہیں رہتا بلکہ میری شاعری میں تو ایسے افکار ہوتے ہیں جو حقیقت پسندی پر مبنی ہوں اور قوم کی ترقی و تعمیر میں مدد و معاون ہوں۔ اگر ان کے اظہار میں میرا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے تو یہ ایک فطری بات ہے۔ عربی زبان کا یہ مقولہ میرے پیش نظر رہتا ہے کہ "الحق مر" یعنی سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے سو اگر سچائی کے اظہار میں میرا شعری لہجہ بھی تلخ ہو جائے تو اس میں حیرت نہیں ہونی چاہئے! چنانچہ مجھ سے ایسے اشعار کی توقع ہی کیوں کی جائے جن کا مقصد محض ذہنی عیاشی کے علاوہ تصنع اور بناوٹ ہو۔

⑥ نظم کے مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ بادشاہوں کو بھی اس امر پر یقیناً حیرت ہوتی ہے کہ میں نے یہ بے نیازی اور درویشی کہاں سے سیکھی کہ میں اظہار حقیقت کے دوران کسی بادشاہ کی پروا بھی نہیں کرتا اور مجھے سچ کہنے میں کسی لمحے بھی دریغ نہیں ہوتا۔

(9)

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم!

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم!

دل کی آزادی شہنشاہی‘ شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ‘ ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

① یہ جذبہ عشق ہی ہے جس کے سبب زندگی میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے اور قوت عمل برقرار رہتی ہے حالانکہ انسان تو محض مٹی کا پتلا ہے جب کہ جذبہ عشق نے اس مٹی کے پتلے میں سوز و گداز اور زندہ رہنے کی خواہش کو جنم دیا ہے۔

② عشق ہی وہ جذبہ ہے جو انسان کے دل و دماغ‘ ضمیر اور روح حتیٰ کہ جسم کے ریشے ریشے میں سما جانے کی اس طرح صلاحیت رکھتا ہے جس طرح صبح کی تازہ اور جاں بخش ہوا سے پیدا شدہ نمی شاخ گل میں سما جاتی ہے۔

③ اقبال کہتے ہیں کہ انسان میں اپنے رزق دینے والے کو شناخت کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ بادشاہوں کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ اس کے رازق دراصل بادشاہ ہی ہیں۔ لیکن جو شخص اپنے پیدا کرنے والے کی ذات سے آگاہی رکھتا ہے تو دارا اور جم جیسے فرمانروا بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے یعنی اصل چیز ذات الٰہی سے رابطہ ہے اور اس رابطے کا عرفان ہے۔

④ اقبال اس شعر میں دل و ضمیر کی آزادی کو شہنشاہی پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر انسان کا دل آزاد ہے تو اس کا مرتبہ شہنشاہوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور غیراز خدا رزق کی طلب اس کے لئے بدترین قسم کی غلامی کے مانند ہے چنانچہ اس ضمن میں خداوند تعالیٰ نے انسان کو اس امر کا اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنی بھلائی کے لئے آزادی کا خواہاں ہے یا غلامی کا! اس شعر میں بھی بات عرفان خداوندی تک جا پہنچی ہے کہ حقیقی رازق تو خدا ہے تاکہ غیراز خدا کوئی انسان کی کفالت کر سکتا ہے۔ اس امر کے باوجود انسان کو قدرت نے یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ طلب رزق کے ضمن میں فیصلہ خود کرے۔

⑤ مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ کسی ملا مولوی کی بجائے خود اپنے دل سے اس امر کی آگاہی حاصل کر کہ حرم کعبہ اب قادر مطلق کے سچے بندوں سے کیوں محروم ہو گیا ہے۔ اب تو وہاں اکثریت ایسے لوگوں کی موجود ہوتی ہے جن کا کاروبار منافقت ہے۔ یہ شعر بھی معنوی سطح پر اس سے پہلے کے دو اشعار کا تسلسل ہے یعنی یہ کہ اب حرم کعبہ میں داخل ہونے والوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو عرفان الٰہی سے آگاہی نہیں رکھتے اور خدا کو رازق جاننے کی بجائے رزق کے لئے غیراز خدا کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ لوگ تو عملاً شکم کے بندے ہیں جو اپنے دل و ضمیر کی آزادی سے محروم ہیں پھر اس طرح کے لوگوں کی حرم کعبہ میں موجودگی کیسے ممکن ہے۔

(10)

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے — پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں — غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!
کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی — ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے!
کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک — یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے!
بجلی ہوں، نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری — میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے!
عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث! — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

معنی: صاحبِ لولاک: اشارہ ہے ایک مشہور عوام حدیث کی طرف جس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے ہے لولاک لما خلقت الافلاک (اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)۔ پرکار: ہوشیار، مکار۔

① اس نظم کے پہلے شعر میں اقبال ایک صورت حال کو پیش کرتے ہوئے اس کی وجہ بھی بتاتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس لئے جراءت اظہار اور ہمت کی کمی ہے کہ وہ سوز عشق سے بھی محروم ہیں اور انکی نظریں بھی شفاف اور حقیقت شناس نہیں! بالفاظ دگر اس مسئلے پر کسی حیرت کی گنجائش نہیں کہ جب انسان عشق حقیقی سے محروم ہو کر مادی آلائشوں میں گھر کر رہ جائے تو یہ فطری امر ہے کہ اس میں جراءت و ہمت باقی نہیں رہتی اور وہ محض ذاتی اغراض اور مصلحتوں کا شکار ہو کر بزدل بن جاتا ہے۔

② یہ درست ہے کہ فہم و ادراک بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن عشق حقیقی کی تجلی کے بغیر فہم و ادراک کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ یہ ساری حقیقتیں اور جذبے مربوط ہو کر انسان کو انسان بناتے ہیں۔

③ وہ لوگ جو مغربی تہذیب کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں وہ فی الواقع غلط فہمی کا شکار ہیں اس لئے کہ مغربی تہذیب چالاکی، مکاری اور اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل کے لئے تو مواقع فراہم کرتی ہے لیکن اس وقت تک انسان کی تکمیل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ عشق حقیقی سے آشنا نہ ہو اور اس کا دل سوز و گداز سے محروم ہو۔

④ اقبال فرماتے ہیں کہ صوفی ملا تو ذات الٰہی کے عرفان اور عشق حقیقی سے یکسر محروم ہو چکے ہیں۔ ملت اسلامیہ کو جو مسائل درپیش ہیں اور جن خطرات میں مسلمان گرفتار ہیں یہ بے حس اور نافہم لوگ اس صورت حال کا ادراک نہیں رکھتے پھر وہ میری قلبی کیفیت سے کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔ وہ تو مادی مفادات کے حصول میں مصروف ہیں۔ قوم کو آپس میں چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھانا ان کا کام ہے۔ ملت کی تعمیر و ترقی کے لئے تو قربانی دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور جذبۂ قربانی سے ان کا دل یکسر خالی ہے۔

⑤ نجوم اور گردش افلاک کے زیر اثر رہنے کی علامتوں کے حوالے سے اقبال نے اس شعر میں دراصل غیروں کی غلامی اور اس سے آزادی کے مسئلے پر بات کی ہے۔ جن دنوں یہ اشعار کہتے تھے تو ہندوستان انگریز کا غلام تھا اور اس کے جبر و استبداد سے رہائی کے لئے یہاں مختلف حلقوں سے آزادی کی

تحریکوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ علامہ نے اسی پس منظر میں یہ شعر کہا ہے کہ اب تو نوبت اس مرحلے پر آ پہنچی ہے کہ یا تو اہل وطن خود کو ختم کر لیں یا پھر انگریز کو ختم کر دیں۔ صرف یہی ایک راستہ رہ گیا ہے فرنگی کے استحصال اور غلامی سے نجات حاصل کرنے کا!

⑥ اس شعر میں وہ فرماتے ہیں کہ میں تو ایک ایسی برق کے مانند ہوں جو جنگل' چٹانوں اور پہاڑوں پر گر کر ان کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ محض کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو جلانا میرا مسلک نہیں۔ مراد یہ ہے کہ انتقام لینا ہو تو بڑی قوت رکھنے والوں سے لو۔ معمولی اور مسکین لوگوں سے تصادم تو بے معنی سی بات ہے۔ کمزور لوگوں کے خلاف کوئی اقدام' حوصلہ مند لوگوں کا مسلک نہیں۔

⑦ یہ کائنات تو محض ایسے مومن کی میراث ہے جو اپنی جان پر کھیل جانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور مومن کی تعریف یہ ہے کہ جو حضورؐ پیغمبر اسلام کے اسوہ حسنہ سے قلب و روح کو منور کرے اور اس طرح وہ مقام لولاک کا فیضان حاصل کر لے۔ وضاحت کے لئے یہاں ایک حدیث قدسی کا ذکر ناگزیر ہے جس کے مطابق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "**لولاک لما خلقت الافلاک**" یعنی "اے محمدؐ اگر تو نہ ہوتا تو میں یہ آسمان ہی پیدا نہ کرتا"۔

اس شعر میں جو پس منظر ہے وہ عملاً مومن کی تعریف اور اس کے مقام سے مطابقت رکھتا ہے۔ مراد یہ کہ مومن نہ صرف یہ کہ جانباز و حوصلہ مند ہوتا ہے بلکہ رسول مقبولؐ کی تعلیمات سے اس کا سینہ بھی روشن ہوتا ہے۔

(11)

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق!

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات' کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق!

علاج ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق!

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق!

اسی طلسم کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں ابتک بتان عہد عتیق

مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر' کہ ملا ہیں صاحب تصدیق!

اگر ہو عشق' تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو' تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق!

معنی: رازی: معروف عالم و امام جن کی تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب) بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ "مباحث شرقیہ" "شرح اشارات" وغیرہ ان کی معروف تصانیف ہیں فخرالدین نام۔ رے (ایران کا مشہور شہر) میں پیدا ہوئے۔ سلطان غیاث الدین غوری ان کا بڑا معتقد تھا۔ ہرات میں وفات پائی۔ عہد عتیق: پرانا زمانہ۔ اقرار باللساں: زبانی اقرار۔ تصدیق: لفظی معنی کسی چیز کے صحیح اور سچا ہونے کی تائید کرنا۔ زندیق: بے دین ملحد۔

① آغاز کائنات سے خدا کے نیک اور وفا شعار لوگوں کا یہی طرز عمل رہا ہے کہ کتنے بھی ناسازگار حالات ہوں ان کا دل عشق حقیقی اور زبان پر ہمیشہ کلمۂ حق رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بے شمار قربانیاں دیں اور سچ کہنے سے گریز نہیں کیا۔

② علامہ اقبال نے اس شعر میں بعض روزمرہ کی تراکیب کا بڑے خوبصورت علامتی انداز میں استعمال کیا ہے۔ بظاہر شعر کا مفہوم اسی قدر ہے کہ شراب خانے میں نسبتاً زیادہ ہجوم محض اس لئے ہے کہ شراب خانے کا مالک انتہائی خلیق شخص ہے تاہم علامہ کی مراد یہ ہے کہ شفقت محبت اور اخلاق ہی ایسے عناصر ہیں جو کسی ایک فرد میں یکجا ہو جائیں تو عام لوگ اس کے گرد و پیش جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی باتیں بڑے احترام کے ساتھ سنتے ہیں۔

③ ہر چند کہ امام رازی کی تعلیمات حکمت و دانائی کی آئینہ دار تھیں اس کے باوجود وہ ان لوگوں کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد نہیں ہو سکتیں جن کا ایمان کمزور دل یقین و اعتماد سے خالی ہے۔ یقین و اعتماد تو محض عشق حقیقی ہی پیدا کر سکتا ہے۔ علامہ نے اسی مضمون کو راجہ بھرتری ہری کے ایک قول کے حوالے سے اپنے ایک شعر میں باندھا ہے۔ یہ شعر "بال جبریل" کے آغاز میں درج ہے۔ یعنی۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

④ بقول اقبال آج کل کے پیران کرام کا کردار یہ ہے کہ وہ اپنے سادہ دل مریدوں کو حق پرستی کی ترغیب تو دیتے رہتے ہیں لیکن خود تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔ جن پر عمل کے لئے اپنے مریدوں کو اکساتے ہیں۔ مراد یہ ہے ان پیروں کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ مرید تو خیر اپنی سادہ لوحی کی بنا پر اپنے پیروں کے اقوال پر ایمان لے آتے ہیں لیکن خود پیروں کا یہ حال ہے کہ اپنے منافقانہ کردار سے سرمو انحراف کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ دیکھا جائے تو اس شعر کا معنوی سطح پر اس سے پہلے شعر سے بھی تعلق بنتا ہے کہ پیر خواہ کیسا ہی ہو لیکن مرید کا دل چونکہ یقین و اعتماد سے پر ہوتا ہے اس لئے وہ پیر کی متضاد اور منافقانہ باتوں کو بھی اپنی سادگی اور یقین و اعتماد کے سبب سچ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ اس سے بڑی بدقسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان ابھی تک اس ترقیاتی عہد میں بھی دور جاہلیت کی برائیوں سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ آج بھی برادری، رنگ و نسل، قبیلے، فرقے اور اسی نوع کی دوسری برائیوں کا وجود برقرار ہے اور آج کا انسان انہی جھگڑوں میں الجھا ہوا ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال نے ملاؤں پر زبردست طنز کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں تو ایک ایسا سیدھا سادا مسلمان ہوں جس کے روبرو اسلام کا زبانی اقرار کر لینا ہی کافی ہے جب کہ ملاؤں نے تو یہ وطیرہ اختیار کیا ہوا ہے کہ وہ ہر امکانی طریق پر ان کے زیر اثر آئے ہوئے مسلمانوں کے عقائد کو کھنگال لیتے ہیں اور اس کے بعد ہی بہت کم خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جو ان کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ مراد یہ کہ عقائد میں فروعی اختلاف کی بنیاد پر ہی ملا کسی شخص کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اور اس کا یہی رویہ ملت میں تفریق کا باعث بنا ہوا ہے۔

⑦ دیکھا جائے تو اس شعر میں اقبال نے بڑے فلسفیانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں اسلام کی تعریف کی ہے کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل میں عشق حقیقی کی تڑپ موجود ہو تو کفر بھی مسلمانی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اگر دل میں عشق حقیقی کی تڑپ نہ ہو تو کسی مسلمان اور کافر و ملحد میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان کے لئے بنیادی شرط عشق حقیقی ہے۔ اسی جذبے کے زیر اثر وہ احکام الٰہی پر کاربند رہتا ہے اور احکام الٰہی پر عمل کئے بغیر کوئی مسلمان، مسلمان نہیں ہے بلکہ اب

میں اور کافر و ملحد میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

(12)

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی — تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی!
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری — مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی!
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی!
میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک — دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی!

معنی: کور نگاہی: اندھا پن۔

① کسی اور سے استفسار کرنے کی حاجت نہیں۔ خود اپنے دل اور ضمیر سے اس امر کا جواب طلب کر لے کہ اے مسلمان! تو صاحب منزل ہے کہ گم کردہ راہ ہے کہ دل اور ضمیر ہی اس مقصد کے لئے کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

② اگر مسلمان نام کا ہے اور اس نے کافروں جیسی عادتیں اختیار کر رکھی ہیں تو وہ نہ تو بادشاہی میں مطمئن ہو سکتا ہے نہ فقیری میں! اس کے برعکس اگر وہ ایک سچا مومن ہے تو فقیری اور درویشی میں بھی وہ بادشاہوں کے مرتبے سے بلند ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان تو محض اسی صورت میں حقیقی مسلمان اور مومن ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں احکام الٰہی کا پیروکار ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کافر اور اس نوع کے نام نہاد مسلمان (جو احکام الٰہی سے گریز کرے) اور کافر میں فرق ہی کیا ہے؟ حقیقی اور سچا مسلمان تو فقیری اور درویشی کے عالم میں بادشاہوں کے رتبے سے کہیں اعلیٰ ہوتا ہے۔

③ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے زیر تشریح شعر میں اقبال حقیقی مومن اور کافر کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی کی جدوجہد ہو یا جنگ کا میدان ہو کافر تو ان میں اسلحہ اور جملہ ساز و سامان پر بھروسہ کرتا ہے جب کہ ایک سچا مومن تو محض اپنی قوت ایمان کے بل پر اسلحہ اور دیگر ساز و سامان کے بغیر کافر سے بھی نبرد آزما ہونے پر تیار رہتا ہے۔

④ جو شخص محض نام کا مسلمان ہے اور احکام الٰہی کا پابند نہیں وہ تو خود کو تقدیر کا پابند بنا لیتا ہے اور عملی دنیا سے ہٹ کر تقدیر کو ہی ہر اچھائی برائی کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے جب کہ حقیقی مومن اور سچے مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ ہر کام رضائے خداوندی کے مطابق کر کے خود تقدیر الٰہی بن جاتا ہے۔ علامہ اپنے ایک دوسرے شعر میں اسی مضمون کو یوں پیش کرتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

امر واقع یہ ہے کہ ہر اچھی بری بات کو تقدیر پر ڈال دینا اور یوں اپنی ذات کا دفاع کرنا کسی طور پر بھی درست نہیں۔ عمل اور سچائی کے لئے جدوجہد سے ہی قدرت کا منشاء پورا ہوتا ہے اور اسی کو اقبال نے تقدیر الٰہی کی ترکیب سے تعبیر کیا ہے۔

⑤ اس شعر میں اقبال انسان اور مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں میں نے تو اپنے باطنی شعور کی بدولت زندگی کے پوشیدہ رازوں کو کھول کر رکھ دیا ہے اس کے باوجود اگر تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا کہ تیرا مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور اب اس سے شفا حاصل کرنے میں شاید کوئی دوا بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

(13)

(قرطبہ میں لکھے گئے)

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب!

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب!

جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب!

سکھا دیئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب!

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب!

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب!

① سات اشعار پر مشتمل یہ نظم اقبال نے 1933ء میں قرطبہ کے دوران قیام لکھی۔ قرطبہ جو کبھی اندلس میں اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ رہا۔ اس شہر کی رونق اور حسن میں آج بھی بعض عمارات کے باعث سلاطین اسلامیہ کا حصہ برقرار ہے۔ بہر حال نظم کے اولین شعر میں کہا گیا ہے کہ یورپ کی خوبصورت عورتیں جن کو دیکھ کر لوگوں کے دل تڑپ اٹھتے ہیں امر واقع یہ ہے کہ یہ چہرے انسان کو راہ حق سے گمراہ کرتے ہیں۔ اسی یورپ کے ممالک جو اپنے حسن و زیبائش کے اعتبار سے بہشت کے مانند ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے جلوے عارضی ہیں۔ ان میں پائیداری نام کو نہیں۔ تصنع اور بناوٹ دیکھا جائے تو ان حسین عورتوں اور یورپی ممالک کا بنیادی جوہر ہے۔ ان میں جو جاذبیت ہے وہ بھی تصنع کی حامل ہے۔

② اقبال اس شعر میں بھی مرد مسلماں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی خوبصورت اور بظاہر کار آمد چیزیں ہیں وہ تیرا مقصود نہیں بلکہ عملاً راہ حق میں رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ تجھ پر لازم ہے کہ ان خوبصورت چیزوں سے گریز کرتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ راہ حق پر گامزن ہو جا۔

③ ہسپانیہ میں چونکہ موسیقی کا بہت زیادہ رواج تھا اس لئے اقبال نے قرطبہ میں قیام کے دوران شعر کہتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان میں چنگ و رباب کو علامتی حیثیت حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چنگ و رباب میں ابتداء سے ہی ایسی خاصیت موجود ہے جو سمجھ میں نہ آنے کے باوجود آواز و آہنگ کی دنیا میں نہیں سما سکتی بالفاظ دگر مذکورہ سازوں میں جو تاثیر ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔

④ اس شعر میں علامہ علمائے شریعت اور پیرانِ طریقت کا ذکر کرتے ہوئے قدرے تلخی اور ترشی سے کام لیتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ پیرانِ طریقت یعنی صوفیوں نے خانقاہی نظام کو مادی سطح پر کامیابی کے ساتھ چلا کر علمائے شریعت کو بھی اس جانب راغب کر لیا ہے اور موخر الذکر عملاً برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔

⑤ اس ضمن میں صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ علمائے شریعت کی بے عملی کے سبب آج محراب و منبران سجدوں کو ترس رہے ہیں جن کے باعث کبھی زمیں لرزا اٹھتی تھی۔

⑥ اور تو اور مصر و فلسطین میں بھی اب اس اذان کا دبدبہ نہیں رہا جس نے پہاڑوں کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اس وقت باعمل اور صاحب کردار تھے جب کہ آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔

⑦ اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں میرے لہجہ میں جو شباب کا سوز و سرور ایک بار پھر رونما ہوا ہے سو یہ قرطبہ کے ماحول اور اس کی آب و ہوا کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

(14)

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری!

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری!

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری!

تو اے مولائے یثرب! آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری!

معنی: فاروقی: حضرت فاروق اعظمؓ کے اوصاف و خصائص۔ کراری: حضرت حیدرؓ کے اوصاف و خصائص۔ مشامِ تیز: سونگھنے کی تیز قوت۔ ظن و تخمین: گمان اور اندازہ۔

① اقبال کے نزدیک جس انسان کا دل بیدار ہو جائے اور شعور ذات پیدا ہو جائے اس میں حضرت فاروق اور حضرت علی جیسے اوصاف و خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ دل کی بیداری انسان کے لئے ایسی ہی شے ہے جیسی کہ تانبے کے لئے کیمیا! جو تانبے کو سونا بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ مراد یہ کہ دل کی بیداری شعور ذات اور مکمل ذات کی حامل ہوتی ہے۔

② اس شعر میں اقبال پہلے شعر کے حوالے سے مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جب تک دل بیدار نہیں ہوتا اور خوابیدہ ہے یہ سمجھ لے کہ دشمن کے خلاف نہ تیرا وار کارگر ہو گا نہ میرا وار کارگر ہو سکے گا۔ اس کے لئے تو دل کی بیداری شرط اول ہے۔

③ منزل مراد تک پہنچنے کے لئے مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان متوقع صورت حال کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ محض واہموں اور اندازوں سے بات بننا مشکل ہے۔

④ میں اب تک جو اظہار حقیقت نہ کر سکا تو اس کی وجہ محض یہ خدشہ تھا کہ میرے افکار سے کہیں غیر

مسلم استفادہ نہ کر لیں۔ جب کہ اپنے عہد کے مسلمانوں کی بے حسی کا تو پہلے سے ہی مجھے اندازہ ہے تاہم میرے لئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ اسی خدشے کی بنا پر اظہار حقیقت سے مسلسل گریز کرتا رہوں۔

⑤ اس شعر میں اقبال خداوند عزوجل سے مخاطب ہو کر استفسار کرتے ہیں کہ اے مالک حقیقی آج کے عہد میں تو درویشی بھی عیاری سے پاک نہیں اور بادشاہت بھی عیاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس صورت میں ہم جیسے سادہ دل انسانوں کا گزر کیسے ہو۔ مراد یہ ہے کہ درویش بھی اپنے حقیقی فرائض سے غافل ہیں اور بادشاہ بھی اپنے منصب کا احترام نہیں کر رہے۔

⑥ اس ساری صورت حال میں ایک بات واضح ہے کہ تہذیب حاضر نے بے شک انسان کو آزادی تو عطا کر دی ہے لیکن بغور جائزہ لیا جائے تو یہ آزادی عملاً غلامی سے بھی بدتر ہے۔

⑦ اس سارے پس منظر کے حوالے سے اقبال ایک طرح کی مایوسی کی حالت میں خداوند تعالیٰ کے روبرو عرض پرداز ہیں کہ میری سوچ تو انگریزی تہذیب و دانش سے مستعار ہے اور جہاں تک عقائد کا تعلق ہے ان پر بھی غیر مسلم کے کلچر کا سایہ ہے۔ اس لئے اے باری تعالیٰ تو ہی مدد کر کہ میں سچائی کی راہ پر گامزن ہو سکوں۔

(15)

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی' تو بے لذت نیاز نہیں

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے!
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

سوال مے نہ کروں ساقی فرنگ سے میں
کہ یہ طریقہ رندان پاکباز نہیں

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومت عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

اک اضطراب مسلسل غیاب ہو' کہ حضور!
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

معنی: غیاب: غائب ہونا۔ غیر حاضر ہونا۔ زبور عجم: اقبال کی مشہور فارسی تصنیف۔

① جس انسان کا ضمیر خودی کے جذبے سے مخمور ہوتا ہے اس میں نہ غرور موجود ہوتا ہے نا ہی وہ اپنی ذات پر فخر کرتا ہے۔ بالفرض کسی مرحلے پر فخر بھی عود کر آئے تو اس میں ابھی عملاً نیازمندی کا پہلو شامل ہو گا۔ اس شعر کو آسان اور سہل الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں میں سچائی کو راہ دکھانے کی اہلیت ہوتی ہے۔ وہ کسی مرحلے پر بھی کبر و غرور سے بالاتر رکھتے ہوئے ہمیشہ نیازمندی اور انکساری سے کام لیتے ہیں۔ یہی عمل ان کی عظمت کی دلیل بن جاتا ہے۔

② عشق حقیقی تو ہمیشہ زندہ دل لوگوں کا وطیرہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شہباز مردہ جانور پر جھپٹنے کی بجائے محو پرواز پرندے کا شکار کرتا ہے۔

③ اس شعر میں اقبال صور اسرافیل کے حوالے سے اپنے نغمہ گری کے ضمن میں ایک اہم بات کہی ہے کہ قیامت کے روز جس طرح حضرت اسرافیل کے صور پھونکنے سے تمام مردے اس خوفناک آواز پر

زندہ ہو اٹھیں گے۔ اسی طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے اشعار کی لے بھی تلخ نوائی کی حامل ہے کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔

④ فرماتے ہیں کہ یورپی استعمار پرستوں سے میں کسی قسم کی بھیک کا طلبگار نہیں ہو سکتا کہ اہل حق اور آزاد لوگوں کے لئے کسی کے روبرو بھی دستِ سوال کرنا ان لوگوں کے اصولوں کے منافی ہو جو آزادی پر کامل یقین رکھتے ہیں اور موت کو غیروں کی غلامی پر ترجیح دیتے ہیں۔

⑤ اقبال کے بقول عشقِ حقیقی کا جذبہ ہر دل میں راہ نہیں پا سکتا کہ اس کا زمانہ سازی اور منافقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ عشقِ حقیقی تو صرف انہی دلوں میں موجزن ہوتا ہے جو اس کی لطافت اور پاکبازی کا شعور رکھتے ہیں اور دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد انتہائی محدود ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال ان لوگوں کے حوالے سے خود پر طاری ہونے اور مسلسل اضطراب و بے قراری کا ذکر کرتے ہیں کہ دنیا والے اس مسئلے پر کتنی ہی مبالغہ آرائی کریں۔ میرا معاملہ تو بس محبوب کی جدائی یا پھر وصال تک محدود ہے۔

⑦ اگر کسی میں ذوقِ مطالعہ اور حقیقت کو پانے کی تڑپ موجود ہے تو پھر شب کی پرسکون تنہائی میں میرے شعری مجموعے زبورِ عجم کا مطالعہ کرے کہ اس کے اشعار میں ایک ایسی فریاد پوشیدہ ہے جو انسان خلوصِ دل کے ساتھ نصف شب کے بعد ہی خدائے پاک کے روبرو کرتا ہے۔ ایسی فریاد رازہائے درون پردہ کی امیں ہوتی ہے۔

(16)

میر سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیر نیم کش' جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج' دیکھ چکا صدف صدف!

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف!

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف' مرگ حیاتِ بے شرف!

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب' ایک کلیم سربکف!

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

معنی: ہدف: نشانہ۔ **لاتخف:** لفظی معنی نہ ڈرنا۔

① اس نظم کے اشعار میں قریب قریب ہر مقام پر اقبال کی حیثیت ایک دل گرفتہ اور مایوس شاعر کے مانند ہے چنانچہ ابتدائی شعر میں ہی وہ ایک صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے بڑے دردانگیز لہجے میں یوں گویا ہیں کہ میری قوم اپنی بے حسی اور بے عملی کے سبب انتہائی انتشار کا شکار ہے۔ یہ بھی ہے کہ قوم کا جو رہنما ہے وہی بے عمل اور قیادت کی صلاحیت سے عاری ہے چنانچہ نہ تو قوم کے سامنے کوئی جذبہ تعمیر ہے نا ہی اس کے رہنما کے ذہن میں کوئی تعمیری منصوبہ! جو مثبت کیفیت کا حامل ہو۔

② اقبال کہتے ہیں کہ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ معاشرے اور قوم میں کوئی تعمیری جوہر تلاش کر

کوں لیکن اس سعی میں بری طرح ناکام ہوا۔ عملاً یہ اشعار ملت کے انتشار، بے عملی اور بے راہ روی کا
رحہ ہیں۔ ان حالات میں بھی اقبال کسی مثبت پہلو کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

③ اس شعر میں اقبال ملت کو ایک نئی راہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیروں کی مدح سرائی اور خوشامد سے احتراز کرتے ہوئے خود اپنی حقیقت کو پہچاننے اور جاننے کی کوشش کر کہ غیروں کی خوشامد اور کاسہ لیسی میں کسی نوع کی قربانی دینا بے مقصد اور بے فائدہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ صحیح انسان وہی ہے جو دوسروں کی غلامی کو مسترد کرتے ہوئے اپنی آزادی کا تحفظ کرے۔

④ موت اور عشق کے مابین جو فرق ہے اس کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی حاجت نہیں بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ عزت کے ساتھ جان دینے کا نام ہی فی الواقع عشق ہے۔ اس کے برعکس موت بے شرف اور بے وقار عمل کا نام ہے۔ مراد یہ ہے کہ بے عزتی اور بے وقار زندگی ہی موت کے مترادف ہے۔

⑤ اقبال فرماتے ہیں کہ مولانا روم کی تعلیمات نے مجھ پر یہ راز منکشف کیا کہ لاکھوں فلسفی اپنے علوم کو دوسروں تک پہنچانے کے باوجود ایک ایسے شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو عالم باعمل ہے اور عشق حقیقی سے سرشار ہے اور اپنا یہ جذبہ دوسروں میں منتقل کرتا ہے۔

⑥ اس شعر کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح فرعون سے نبرد آزما ہونے کی روایت اگر کوئی آج کے عہد میں بھی زندہ رکھنے کا اہل ہو تو جس طرح فرعون کے خلاف خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی مدد کی تھی اسی طرح آج بھی وہ ایسے شخص کا یقیناً مددگار ہو گا۔ مراد یہ ہے کہ باطل کے خلاف نبرد آزما ہونا ہی حمایت خداوندی کی بنیاد بنتا ہے۔

⑦ اس نظم کے آخری شعر میں اقبال عملاً اپنے ذاتی عقیدے کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب و دانش نے اپنی تمام تر جلوہ طرازی کے مجھے اس لئے متاثر نہیں کیا کہ میرا واسطہ تو مدینہ و نجف سے ہے یعنی حضور سرور کائنات محمدؐ اور خلیفۃ المسلمین حضرت علیؓ کی تعلیمات نے ہی مجھے وہ بصیرت عطا کی جس کے بعد کسی دوسرے کے فرمودات کی ضرورت نہیں رہتی۔

(17)

(یورپ میں لکھے گئے)

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی!

کہیں سرمایہ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شان دلاویزی!

① یہ پانچ اشعار جن کی تشریح یہاں پیش کی جا رہی ہے اقبال نے لندن کے دوران قیام لکھے، جن دنوں

وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو سردی کا زمانہ تھا اور اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ برطانیہ میں موسم سرما میں سردی شدت کی ہوتی ہے چنانچہ وہاں کے موسم کا حال بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ لندن میں اگرچہ سرد ہوا میں شمشیر کی سی کاٹ تھی اور بستر سے ہاتھ نکالنا بھی مشکل ہوتا تھا اس کے باوجود میں اپنی فطری عادات کے مطابق علی الصبح بیدار ہوتا اور موسم کی پروا کئے بغیر اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو جاتا۔

② دوسرے شعر میں بیان کرتے تھے کہ احباب کی کسی محفل میں جب میں اظہار خیال کرنے پر آتا تو حاضرین میری گفتگو سے مسحور ہو کر رہ جاتے اور کسی مرحلے پر جب میں حسب عادت خاموشی اختیار کر لیتا تو موجود لوگ میرے سکوت پر پریشان ہو کر رہ جاتے۔ اس شعر میں اقبال اپنی کم آمیزی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر گفتگو سے گریز کرتے تھے۔ لیکن جب ان سے کسی مسئلے کے بارے میں استفسار کیا جاتا تو اس کا جواب بڑے مدلل انداز میں تفصیل کے ساتھ دیا کرتے تھے۔

③ اس شعر میں اقبال نے ایک ایسے مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے جس کو بالعموم زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ان کے نزدیک اگر اقتدار مزدوروں اور محنت کشوں کے سپرد کر دیا جائے تو موجودہ نظام ایسا ہے کہ ان کا رویہ بھی وہی ہو گا جو آج کے آمر حکمرانوں کا ہے۔

④ اس سے پہلے شعر کے حوالے سے اس شعر میں اقبال نے ایک نکتہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں ریاست کا نظام کیسا ہی ہو۔ خواہ وہاں بادشاہت یا آمریت ہو یا پھر جمہوریت! ان کے نزدیک صورت حال یہ ہے کہ سیاست سے اگر دینی اقدار کو نکال دیا جائے تو ظالمانہ آمریت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ اس مسئلے کی مزید وضاحت کی جائے تو بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ کسی مملکت کا نظام سلطنت خواہ کسی طرز کا بھی ہو دینی اقدار کی شمولیت کے بغیر ناکامی کا مظہر ہوتا ہے اور عوامی مسائل حل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی کہ اقبال بادشاہی اور آمرانہ نظام کے بھی خلاف تھے اور جمہوریت کو بھی بوجوہ ناپسند کرتے تھے۔ ان کے مطابق تو کامیاب طرز حکومت وہی ہو سکتا ہے جو دینی اقدار کا پابند ہو۔

⑤ نظم کے اس آخری شعر میں علامہ روم کے قدیم اور عظیم الشان کھنڈرات کا مشاہدہ کرتے ہوئے دہلی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہاں بھی بلند و بالا عمارتوں کی اسی طرح کے کھنڈرات ہیں جو شاہان سلف کی عظمتوں کے یادگار ہوتے ہوئے بھی نشان عبرت بنے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح روم کے قدیم شہر میں ماضی کی پرشکوہ عمارات کے کھنڈر اس عہد کی شان و شوکت کا مظہر ہیں یہی صورتحال دہلی کے عظیم الشان کھنڈرات کی ہے۔

(18)

یہ دیر کہن کیا ہے؟ انبار خس و خاشاک! مشکل ہے گزر اس میں بے نالہ آتشناک!
نخچیر محبت کا قصہ نہیں طولانی لطف خلش پیکاں، آسودگی فتراک!

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں ۔۔۔ سمجھے گا نہ تو جب تک بیرنگ نہ ہو ادراک!

اک شرع مسلمانی' اک جذب مسلمانی ۔۔۔ ہے جذب مسلمانی سر فلک الافلاک!

اے رہرو فرزانہ بے جذب مسلمانی ۔۔۔ نے راہ عمل پیدا نے شاخ یقیں نمناک!

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی ۔۔۔ ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک!

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا ۔۔۔ یا اپنا گریباں چاک' یا دامن یزداں چاک!

معنی: **ہفتاد و دو ملت:** لفظی معنی بہتر فرقے مراد بہت سے فرقے۔ **فلک الافلاک:** آسمانوں کا آسمان یعنی عرش۔

① اقبال بعض مراحل پر اظہار میں خاصا انتہاپسندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جس کا اندازہ زیر تشریح نظم کے قریب قریب تمام اشعار اسی کیفیت کے مظہر ہیں چنانچہ پہلے شعر میں وہ دنیا کے قدیم بت خانے کو خس و خاشاک یعنی گھاس پھونس کے ڈھیر سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں سے نوائے آتش کے بغیر گزر ممکن نہیں۔ مراد یہ ہے کہ دنیاوی اور معاشرتی مسائل کا حل اب محض عام نالہ و فریاد نہیں بلکہ اس مقصد کے لئے عملی جدوجہد کی ضرورت ہے خواہ اس عمل میں آتشیں کردار درکار ہو۔

② محبت کے دام میں گرفتار ہونے والے لوگوں کا معاملہ بس اسی قدر ہے کہ تیر عشق سے گھائل ہوئے پھر محبوب کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں اقبال نے عشق و محبت کا معاملہ بڑے سادہ اور مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔

③ اسلام میں جو فرقہ بندیوں کی لعنت وجود پذیر ہو گئی ہے۔ اس کے ادراک کے لئے ایسے ذہن کی ضرورت ہے جو خود فرقہ بندی اور اس سے جنم لینے والی منافقت سے پاک ہو۔

④ علامہ اس شعر میں ایک نکتے کی توجیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک شے تو اسلامی شریعت ہوتی ہے اور ایک اسلامیت سے جذب و عشق کی کیفیت ہے اور آخر الذکر کیفیت ہی فی الاصل افلاک کے پوشیدہ رازوں میں سے ایک ہے۔

⑤ اس شعر میں اقبال پچھلے شعر کی تشریح میں اضافہ کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں کہ جذب و عشق کے بغیر نہ راہ عمل کا ادراک ممکن ہے نا ہی یقین و اعتماد میں تازگی اور استحکام آتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جذب و عشق کے بغیر راہ عمل کا تعین ممکن نہیں!۔

⑥ عشق حقیقی کی شدت اور انتہا یہ ہے کہ وہ محبت کرنے والے کو ایک حد تک گستاخ بھی بنا دیتا ہے اور بے خوف بھی! عشق حقیقی تو انسان کو ہر شے سے بے نیاز کر کے اپنے نقطہ نظر پر ڈٹ جانے کی تلقین کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق حقیقی میں وہ جوش و خروش اور جذبہ ہوتا ہے کہ اس کیفیت کو قبول کرنے پر محبوب بھی قید ہو جاتا ہے اور وہ عاشق کے جذبات کی پذیرائی اور آسودگی کے لئے کرم گستری کا حامل ہو جاتا ہے۔ تاہم اس حقیقت کو بھی جان لینا چاہئے کہ عشق کا ہر جذبہ اس نوع کی گستاخی اور بے باکی کا مظہر نہیں ہوتا۔

⑦ ابتدائی شعر کی تشریح کرتے ہوئے اس نظم میں اقبال کے اظہار میں جس نوع کی انتہاپسندی کا اشارہ دیا گیا تھا۔ یہ آخری شعر اس کا واضح اور کھلا ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا جذبہ عشق مجھے روز محشر بھی نچلا بیٹھنے نہیں دے گا چنانچہ وہاں اس امر کا خدشہ ہے کہ دیوانگی کے عالم میں یا تو اپنے گریباں کی دھجیاں

اڑا کر رکھ دوں گا یا پھر خدائے لم یزل کا دامن میرے ہاتھ میں ہو گا۔ گذشتہ شعر میں علامہ نے جو بے باکی و گستاخی کو عشق حقیقی کی دو رمزوں سے تعبیر کیا ہے۔ اس آخری شعر میں اقبال اس صورت حال کے عملی پہلو کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ عشق حقیقی کا خوگر جس طرح اس عالم فانی میں محبوب کے ساتھ گستاخی و بے باکی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس طرح روز محشر بھی وہ جوش جنوں میں یہ سب کچھ کیوں نہ کر گزرے گا۔

(19)

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری!

میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری

سنے نہ ساقی مہوش تو اور بھی اچھا
عیار گرمئی صحبت ہے حرف معذوری

حکیم و عارف و صوفی تمام مست ظہور
کسے خبر کہ تجلی ہے عین مستوری!

وہ ملتفت ہوں تو کنج قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحن چمن بھی مقام مجبوری

برا نہ مان' ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری!

معنی: مہجوری: جدائی۔ علیحدگی۔ **ملتفت:** متوجہ' مہربان۔ **اہل حلقہ:** یہ تصوف والوں کی صطلاح ہے۔ اس لئے کہ وہ کسب فیض سے پیرو مرشد کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں۔

① انسان دنیاوی علائق سے گھبرا کر ترک دنیا کر لے اور جنگل بیایاں کی راہ لے۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے کہ کمال کی بات تو یہ ہے کہ اپنی جراءت و بے باکی اور حوصلے کے ساتھ ہر مادی اور روحانی شے پر تسلط جما کر پھر اسے ترک کر دے پھر صرف اور صرف رب ذوالجلال سے اپنا رشتہ استوار کر لے۔

② اے صوفیان کرام! تم جس شے کو فقر اور درویشی سے تعبیر کرتے ہو۔ میں اس کا سرے سے قائل نہیں کہ تمہارے نزدیک تو یہ فقر و درویشی افلاس اور اس سے پیدا ہونے والے دکھ کا نام ہے جب کہ میرا فقر و حقیقت ہے کہ ہر شے پر دسترس رکھنے کے باوجود اس سے بے نیازی اختیار کر لوں اور تعلق صرف ذات خداوندی سے رہے۔

③ جس قوم نے اپنی نااہلی سے مغلیہ عہد کی عظیم الشان سلطنت گنوا کر رکھ دی وہ امر واقع یہ ہے کہ نا بادشاہت کی اہل ہے نا ہی فقر و درویشی کی! مراد یہ کہ ایسی بے عمل قوم نہ مادی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکتی ہے نا ہی روحانیت اور درویشی کے ضمن میں کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔

④ یہ حقیقت ساقی کے علم میں نہ آئے تو اچھا ہی ہے کہ میں ترک لے کر چکا ہوں۔ ہرچند کہ ایک محل میں اس سے معذوری کا اظہار کر چکا ہوں لیکن یہ تاثر دینا مقدور نہیں کہ شراب چھوڑ چکا ہوں۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ ساقی کی عنایات سے محروم ہو جاؤں۔

⑤ فلسفہ' معرفت اور تصوف پر ایمان رکھنے والے اپنے مابین قدر مشترک یہ رکھتے ہیں کہ خدا کو بے حجاب دیکھیں۔ حضرت موسیٰ کی طرح انہیں اس کا جلوہ نظر آئے تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی خواہش بے

معنی ہے کہ تجلی بھی عملاً ایک طرح کا پردہ ہی تو ہے۔

⑥ اگر محبوب مہرباں ہو اور التفات کا مظاہرہ کرے تو قید خانہ بھی آزاد فضا کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر محبوب نامہربان ہو تو قید خانہ تو الگ رہا۔ خود صحن چمن بھی قید خانے کا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ محبوب کا مہربان ہونا عاشق کے لئے متاع بے بہا کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی ناخوشی عاشق کے دل و دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔

⑦ ہر چند کہ مغربی علوم دل و دماغ کو روشن کر دیتے ہیں لیکن ایمان اور عقائد پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ بات میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کسی کو میری بات کا یقین نہ ہو تو خود تجربہ کر کے دیکھ لے!۔

(20)

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں — ایک بھی صاحب سرور نہیں
اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے — اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں
ناصبوری ہے زندگی دل کی — آہ! وہ دل کہ ناصبور نہیں!
بے حضوری ہے تیری موت کا راز — زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں
ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا — تو ہی آمادۂ ظہور نہیں
ارنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر — یہ حدیث کلیمؑ و طور نہیں!

① "بال جبریل" میں شامل یہ اشعار اجتماعی سطح پر کسی مجرد خیال کے مظہر نہیں بلکہ عملاً سادہ سے اشعار ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو کہ اقبال کے معیار کے پیش نظر غالباً یہ اشعار قدرے کمزور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ایک عام سی غزل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے بہر حال پہلے شعر میں انہوں نے عقل اور عشق کے حوالے سے بات کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محبوب کا آستانہ ایک عاشق اپنے عقلی شعور کی بنیاد پر پا تو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کی دانش اس آستاں پر باریابی حاصل کر سکے۔ مراد یہ کہ عشق تو ایک والہانہ جذبے کا نام ہے جب کہ عقل کا مسلک استدلال ہے۔ یہی تضاد عقل اور عشق کے مابین حائل ہے۔

② اس شعر میں کہا گیا ہے کہ لازم ہے کہ حق تعالیٰ سے وہ بصیرت بھی طلب کی جائے جس سے دل روشن ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ صرف بصارت چشم ہی دل کے لئے بصارت نہیں بن سکتی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دل ہی روشن نہ ہو تو محض آنکھ کی روشنی کافی نہیں۔ عملاً بصارت اور بصیرت کے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

③ علم کی تعریف بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ بے شک اس میں ایک کیف آور جذبہ تو موجود

ہے لیکن اس کیف آور جذبے کی رسائی دل تک نہیں ہوتی بلکہ یہ تو دماغ تک محدود رہتا ہے چنانچہ علم دراصل عملاً ایک ایسی بہشت کی حیثیت رکھتا ہے جس میں حور تو الگ رہی اس کا تصور بھی موجود نہیں۔ علامہ نے اس سے پہلے شعر میں دل اور آنکھ کے مابین فرق کا ذکر کیا تھا جب کہ اس شعر میں وہ علم اور دل کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔

④ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ بقول اقبال ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں جو ذوق و شوق کا مالک ہو یعنی عشق حقیقی سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکے۔

⑤ یہ ایک انتہائی سادہ شعر ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک جنوں تو ایسا ہے جس میں ہوش و حواس اور شعور قائم رہتے ہیں۔ جب کہ ایک جنون اس کے برعکس ہے۔ اس میں انسان ہوش و حواس اور شعور سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقی وہی ہے جس میں ہوش و حواس قائم رہ سکیں۔ یہی وہ کیفیت ہے جو عشق حقیقی تک لے جاتی ہے۔

⑥ دل میں اضطراب اور تڑپ کی موجودگی ہی دراصل دل کے زندہ ہونے کا ثبوت ہیں چنانچہ عملاً وہ دل بے حسی کا حامل ہے جس میں تڑپ اور اضطراب موجود نہ ہو۔

⑦ محبوب کی بارگاہ سے محرومی ایک طرح سے موت کے مترادف ہے اور اس کی بارگاہ تک رسائی زندگی کی دلیل ہے۔

⑧ مختلف شارح حضرات نے اس شعر کے مختلف مطالب بیان کیے ہیں لیکن آخری شعر کو پیش نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمام موتی سیپیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے لیکن ایک تو ہی ہے جس نے ظہور نہیں کیا اور ابھی تک مستور ہے۔

⑨ میں بھی حضرت موسیٰؑ کی مانند حق تعالیٰ سے جلوہ نمائی کی استدعا کر رہا ہوں لیکن میں اس امر کا خواہاں نہیں کہ اس کے جلوے کو دیکھ کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔ میں تو اسے عالم ہوش میں دیکھنے کا خواہاں ہوں۔

(21)

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں! — تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!
طلسم گنبد گردوں کو توڑ سکتے ہیں — زجاج کی یہ عمارت ہے سنگ خارہ نہیں!
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں — مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارہ نہیں
ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے! — کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں
یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے — تری نگہ میں ابھی شوخی نظارہ نہیں
مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا — وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں!
غضب ہے عین کرم میں بخیل ہے فطرت — کہ لعل ناب میں آتش تو ہے شرارہ نہیں!

معنی: زجاج: شیشہ۔

① یوں تو شاعر مشرق نے اپنے بیشتر اشعار میں خودی کو اپنا موضوع بنایا ہے لیکن اس سلسلے کی چند

ں میں انہوں نے بڑے تسلسل کے ساتھ فلسفہ خودی پر اظہار خیال کیا ہے جس سے اس امر کا بخوبی زہ ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک فلسفہ خودی کیا ہے اور وہ اسے انسانی فطرت کے لئے کس لئے ناگزیر تے ہیں چنانچہ اس نظم کے مطلع میں وہ خودی کی تعریف پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خودی تو ایسا بے ں سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ تو نے تو خودی کو ایک معمولی ندی لیا ہے۔ یہی تیری کج فہمی اور کم ہمتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خداوند عزوجل نے انسان کو بے پناہ ں عطا کی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے ان قوتوں کا ادراک نہیں ہے۔

انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ آسمان کے طلسم کو توڑ کر رکھ دے۔ علامہ یہاں علامتی انداز بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ طلسم تو شیشے کی عمارت کے مانند ہے۔ سنگ خارا یعنی سخت پتھر کی ں چنانچہ سنگ خارا کے مقابلے میں شیشے کی عمارت کو توڑنا سہل ہے۔ دیکھا جائے تو اقبال نے اس شعر سائنسی ارتقا کے حوالے سے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ عصری سائنسدان اب اس مرحلے پر جا پہنچے کہ ں طرح وہ چاند کو تسخیر کر چکے ہیں اسی طرح آسمان کے طلسم کو بھی توڑ دیں۔

ایسے جانباز لوگ جو کچھ کر گزرنے کی ہمت و استطاعت رکھتے ہیں۔ ان کے روبرو اگر خودی ایک در کے مانند ہے تو اس میں غوطہ لگا کر اپنی ہمت و جراءت کے طفیل پھر سے صفحہ آب پر ابھر سکتے ہیں ں یہ جان لینا چاہئے کہ یہ نکمے اور ناکارہ لوگوں کا نہیں ہو سکتا بلکہ جواں ہمت لوگوں سے اس کی توقع کی لتی ہے۔

انسان سے مخاطب ہوتے ہوئے شاعر مشرق کہتے ہیں کہ وہ لوگ جو ستارہ شناسی کے دعویدار ہیں ے مقام اور مرتبے کو کس طرح سے جان سکتے ہیں کہ تو تو ایک زندہ وجود ہے اور ستاروں کی تابع تو نہیں و اور ستاروں کا محدود علم رکھنے والے تیرے مقام کو کس طرح سے جان سکتا ہے۔

روایت تو یہی ہے کہ جبرئیل اور حور و غلماں خدائے لایزل کی پیدا کردہ بہشت میں موجود ہیں لیکن تجھ میں بصیرت اور دور بینی کے عنصر موجود ہوں تو اس حقیقت کو جان لے گا کہ حور و غلماں، جبرئیل اور ت تو خود تیرے سامنے موجود ہیں لیکن اس کو جاننے کے لئے چشم بصیرت درکار ہے۔ بدقسمتی سے اس وصیت سے تو بہرہ ور نہیں ہے۔

میرا جذبہ عشق تو اس قدر حقیقت شناس ہے کہ اپنے عہد اور اس کے معاشرے سے پوری طرح ے آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے سر چھپانے کے لئے وہ لباس عطا کیا جو پارہ پارہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یا عملی سطح پر وہ لباس عطا کیا جو کسی طور پر بھی شکستہ اور پارہ پارہ نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ آج کے عہد کا ق بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔

یہ امر یقیناً حیرت کا باعث ہے کہ فطرت اپنی کرم گستری میں ان کمال تک پہنچنے کے باوجود بخل اور جوسی سے بعض مرحلوں میں کام لیتی ہے۔ جس کی مثال لعل خالص ہے س کا رنگ تو انتہائی سرخ شعلوں ے مانند ہے۔ تاہم اس میں سے کوئی چنگاری نہیں جھڑتی۔ دیکھا جائے تو یہ غیر فطری سا عمل ہے لیکن بال نے فطرت کے بخل کے بارے میں بات اسی حوالے سے کی ہے۔

(22)

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

نہ دیا نشان منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

مرے حلقہ سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسم کجکلاہی

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا
لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

① ان اشعار میں بھی علامہ نے خودی کے معاملات پر یوں کہا ہے کہ صبح کی خوشگوار ہوا مجھے یہ پیغا[م] دے گئی ہے کہ جو لوگ خودی کے مقام سے آشنا ہیں۔ وہ رتبے میں بادشاہ سے کم نہیں ہوتے!۔

② اس شعر میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ زندگی میں خودی کے حوالے سے اور انسانی آبرو بھی اسی پیا[م] سے باقی جاتی ہے۔ خودی قائم ہے تو یہ جان لے کہ تیرے ہاتھ بادشاہی آگئی اور اگر قائم نہ رہی تو تیر[ے] لئے بربادی یا رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔

③ اے فلسفی! تو نے اپنے تمام تر علم و دانش کے باوجود منزل کے نشان سے بھی آگاہ نہیں کیا لیکن اس ضمن میں تجھ سے کسی قسم کا گلہ بے معنی ہے کہ تو خود اپنے آپ میں مگن رہنے والا ہے۔ تجھے اس سے کیا غرض کہ منزل کون سی ہے اور کیسے اس کی رہنمائی کرنی ہے۔

④ اقبال کہتے ہیں کہ میرے گرد و پیش جمع ہونے والوں میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور میں ان کی تربیت کر رہا ہوں۔ یہ درست ہے کہ لوگ ایسے درویش ہیں جو بادشاہوں کے طور طریقوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

⑤ اے صوفی! جہاں تک عقائد کے معاملات کا تعلق ہے۔ ان کی نزاکت سے میں پوری طرح آگاہ ہوں اور سوائے اس کے کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تو نے جو خانقاہی نظام رائج کیا ہے کم از کم مجھے تو وہ پسند نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جو تیری مرضی ہے تو کر۔ یعنی پند و نصائح کی بجائے میں نے تو تجھے تیرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

⑧ شاعر مشرق کہتے ہیں کہ تو نے ابھی عملی زندگی میں جدوجہد کا آغاز تو کر دیا لیکن اپنے گرد و پیش کے معاملات سے آگاہی کے بغیر اس بلندی پر پہنچنے کی سعی میں مصروف ہو گیا ہے جو دیکھا جائے تو کسی طور بھی تیری دسترس میں نہیں لیکن تو ہے کہ اپنے گرد و پیش کو نظرانداز کر کے ایک لایعنی عمل میں مصروف ہے۔

⑨ اقبال نظم کے اس آخری شعر میں مسلمان سے مخاطب ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قطع نظر اس کے کہ تیرا تعلق عرب سے ہے یا عجم سے۔ تیرے لئے لا الٰہ الا ہی حقیقی پیغام ہے لیکن اسے محض زبان سے کہہ دینا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ تیرا دل بھی اس کی گواہی دے تو عملی سطح پر اس کی تصدیق نہ کرے تو پھر جان لینا چاہئے کہ یہ کسی ایسی زبان کا لفظ ہے جسے نہ تو سمجھ سکتا ہے نہ کسی کو سمجھا سکتا ہے۔

(23)

نگاہ فرو مایہ' ہاتھ ہے کوتاہ ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ!

تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

ں میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

ث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ!

ہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!

ہے ستارے کی گردش نہ بازی افلاک خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ!

میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی' نہ محبت' نہ معرفت' نہ نگاہ!

ں: **نخیل**: کھجور کا درخت۔

یہ نظم بھی جیسا کہ پہلے نشاندہی کی گئی تھی۔ گذشتہ دو نظموں کی توسیع ہے لیکن اس میں خودی کی ی حیثیت قدرے مختلف ہے۔ یہاں اقبال خودی کے مقابلے میں خدا سے لو لگانے کا درس دیتے ۔ نظم کے اولین شعر میں معمول کے مطابق مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ بدقسمتی ں تو اور کیا ہے کہ تیری نگاہ دور رس نہیں اور ہاتھ بھی اتنا چھوٹا ہے کہ بلندی تک اس کی رسائی ممکن ں ہے۔ چنانچہ اگر تو کھجور کے بلند و بالا درخت سے پھل نہیں توڑ سکتا تو اس میں قصور درخت کا ہے یا ! مراد یہ ہے کہ مقاصد بلند ہوں تو انسان کے حوصلے بھی بلند ہونا چاہئیں۔

اس شعر میں اقبال نے نظام تعلیم کی خامیوں کی جانب اشارہ کیا ہے جس کے باعث مسلمان اپنی دینی لم و تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ تعلیم تو طلباء کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر کے رکھ ی ہے۔ پھر وہ نعرہ حق کیسے بلند کر سکتے ہیں۔

تیرے لئے اب فلاح کی راہ یہی ہے کہ خدائی جو خودی میں پوشیدہ ہے اس کو پھر سے ڈھونڈ نکال! کہ ں میں تیری بہتری ہے۔

دل میں جو رازہائے درون پردہ موجود ہیں ان کے بارے میں کسی حقیقی درویش سے استفسار کر! وہی ے تیرے صحیح مقام سے آگاہ کر سکتا ہے لیکن اس جعلی درویش سے احتراز کر جس نے ایک نمائشی گدڑی ندھوں پر ڈال رکھی ہے۔

5 اپنے سر پر کامیابی کا تاج رکھنا ہے تو پھر اپنے عزائم اور حوصلے بلند رکھ کہ بلند پروازی شاہین کی وایت ہے۔ تو بھی شاہین کی پیروی کر۔

6 تو جو اقتدار اور نعمتوں سے محروم ہو گیا ہے تو تقدیر آسمان و ستاروں کو اسی صورت حال کا ذمہ دار مجھتا ہے بنیادی طور پر یہ سوچ ہی غلط ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تو نے خودی سے رشتہ کاٹ دیا ہے اور ی عزم و حوصلے سے خالی ہو گیا ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ ظاہری اور باطنی علوم کے تمام ادارے اپنے حقیقی مسلک سے محروم ہو گئے یں۔ نہ ان میں زندگی کی رمق باقی رہی اس کے علاوہ یہاں اب محبت و معرفت کا بھی فقدان ہے۔ یہ

ادارے تو اپنی حقیقی روح سے محروم ہو چکے ہیں۔

(24)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں!

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں!

عروس لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں!

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجران فرنگ
وہ شے متاع ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

معنی: کساد: بے رواجی بے رونقی' اشیاء کی خریداری نہ ہونا۔ مندا پڑ جانا۔

① ہمارے دانشور اور فلسفی مستعار نظریات اور ادھر ادھر سے اکٹھی کی ہوئی باتوں کے علاوہ حقائق کے اظہار سے محروم ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ معاشرتی سطح پر جو خامیاں موجود ہیں ان کا تدارک کسی صاحب دل کی نگاہ دور رس سے ہی ہو سکتا ہے۔

② تیرا مرتبہ ہر مقام سے بلند ہے تاہم اس بعید کو پانا ناگزیر ہے کہ زندگی ایک طرح سے مسلسل جدوجہد اور عمل سے عبارت ہے۔

③ جس طرح سے موتی کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی آب و تاب سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی قدر و قیمت خودی کے تحفظ سے ہے۔

④ زندگی فی الواقع جگر میں سوز و گداز سے لبریز ہونے کا نام ہے۔ محض رگوں میں خون کی گردش کا نام ہی زندگی نہیں! میرزا اسد اللہ غالب نے اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں زیادہ خوبصورتی کے ساتھ باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

⑤ یہ ایک سیدھا سادا سا رومانوی شعر ہے جس کی تشریح کی بظاہر ضرورت نہیں۔ یہاں اقبال کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب تو تو گل لالہ کی طرح سرخ ہے۔ مجھ سے حجاب کیا کہ میں تو نسیم سحر کے مانند ہوں۔

⑥ مغربی تاجر حقیقی ہنر کی قدر و قیمت کو نظرانداز کر کے نمائشی ہنر کی بدولت روزی کما رہے ہیں۔ جو باتیں عالم انسانیت کے لئے مفید ہیں انہیں پس پشت ڈال رہے ہیں حالانکہ اصل شے ہنر کی متاع ہے۔

⑦ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میرا کل اثاثہ تو عشق حقیقی ہے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں' میں اسی اثاثہ میں سے حسب استطاعت تقسیم کرتا رہتا ہوں۔

(25)

نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے!
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

بتوں سے تجھ کو امیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے!

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے!

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے!

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے!

معنی: عتاب: غصہ۔ ناراضی۔ مآل: انجام۔ نتیجہ۔

① یہ شعر اقبال کی مخصوص فکر کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں جو حقیقی درویش ہوتا ہے وہ اپنی بے نیازی کے طفیل سکندر جیسے شہنشاہ کی شان و شوکت کو خاطر میں نہیں لاتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رعایا سے خراج حاصل کر کے جو لوگ اپنا خزانہ بھرتے ہیں ان کی بادشاہی کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ مراد یہ کہ ایسا حکمران تو ضرور رعایا کا محتاج ہوتا ہے۔

② کفر کی ایک جامع تعریف علامہ نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے کہ جو شخص خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر غیر از خدا کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے حقیقتاً وہی کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

③ حالات نے بدقسمتی سے ایسے لوگوں کو اقتدار عطا کیا ہے جو اس حقیقت سے بھی آگاہ نہیں' حقوق العباد کس شے کا نام ہے۔

④ دل کا فیصلہ تو بس ایک نگاہ سے ہی ہوتا ہے اور نگاہ میں شوخی نہ ہو تو دلبری کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

⑤ سکندر جیسے بادشاہ کے انجام سے چونکہ میں پوری طرح آگاہ ہوں اور یہی بات شاہی آمروں کو کھٹکتی ہے کہ میں اس راز سے واقف ہوں۔ بجائے اس کے کہ وہ دوسرے بادشاہوں کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ مجھ سے بلاوجہ کی کد رکھتے ہیں۔

⑥ یہ بھی درست ہے کہ ہر شخص کو دوسروں پر فوقیت اور سرداری کے حصول کی خواہش ہوتی ہے لیکن ایسی سرداری بے معنی شے ہے جو انسان میں خودی کی موت کا سبب بنے۔ مراد یہ ہے کہ خودی کا وجود ہی سرداری کے لئے مناسب ہوتا ہے۔

⑦ اقبال کہتے ہیں میرے شعر اور شاعری کچھ زیادہ اہمیت کے حامل نہیں۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھ میں جو درویشانہ روش ہے وہی لوگوں کو غالباً پسند آ گئی ہے اسی وجہ سے وہ میری ذات کے علاوہ میری شاعری کو بھی پسند کرتے ہیں۔

(26)

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلہ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے!

مقام پرورش آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیر گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے!

نگہ بلند' سخن دل نواز' جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

ذرا سی بات تھی اندیشہ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے!'

① انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے لئے باری تعالیٰ نے دونوں جہانوں کو پیدا کیا۔ ابلیس جیسے فرشتے نے حکم خداوندی کے تحت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اسے راندہ درگاہ کر دیا گیا۔ اقبال کا یہ شعر کم و بیش اسی مفہوم کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے انسان! تو نہ زمیں کے لئے ہے نا ہی آسمان کے لئے! اس کے برعکس یہ جہاں تیرے لئے ہے تو جہاں کے لئے نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ قدرت نے انسان کو ہر شے سے افضل قرار دیا ہے۔ عملاً دنیا کی ہر شے انسان ہی کے تابع ہے وہ دنیا کا تابع نہیں ہو سکتا کہ یہ صورت اس کے لئے انتہائی پستی کی حامل ہے۔ اس نے تو اپنی صلاحیتوں سے پوری کائنات کو تسخیر کرنا ہے۔

② اقبال کہتے ہیں کہ عقل اور دل ایک ہی جذبے کے مظہر ہیں لیکن عقل کا دائرہ کار محدود ہے جب کہ دل کا تعلق لامتناہی سلسلے سے ہے۔ شعر کے مطابق عقل اور دل ایک طرح سے محبت کے شعلے کی چنگاریوں کے مانند ہیں لیکن جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ عقل اگر چنگاری کے مانند ہے تو وہ گھاس پھونس کے ڈھیر کو آگ لگا سکتی ہے جب کہ دل کی چنگاریاں تو لامحدود جنگل کو بھسم کرنے کی صلاحیت کی حامل ہیں۔

③ یہ کائنات تو آہ و فریاد سے لبریز ہے۔ ایسی صورت میں نہ تو یہاں سیر گل کا تصور کیا جا سکتا ہے نا ہی مستقل رہائش گاہ کا۔ مراد یہ ہے کہ انسان علائق دنیوی میں مست ہو کر عشق حقیقی سے بے پرواہ ہو جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی بھول ہے۔ اصل شے تو عشق حقیقی ہے جو منزل تک رسائی کے لئے ناگزیر ہے۔

④ اس شعر میں علامہ نے فرد کی ذمہ داریوں کو وسیع تر مفاد کے پیش نظر اس امر کی رہنمائی کی ہے کہ چھوٹی چھوٹی خواہشات میں الجھ کر زندگی کے بنیادی مقاصد سے روگردانی کرنا دانشمندی نہیں۔ حقیقی مسئلہ تو منزل تک پہنچنے کا ہے۔

⑤ وہ لوگ جو ساری دنیا کی رہنمائی کے اہل تھے افسوسناک امر یہ ہے کہ آج خود ہی گم کردہ راہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا کوئی حقیقی راہ نما نہیں۔

⑥ یہ شعر بھی اس سے قبل کے شعر کا تسلسل ہے جس میں حقیقی رہنما کی صفات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اقبال کے نزدیک حقیقی رہنما وہ ہوتا ہے جو مسائل پر گہری نظر رکھتا ہو گفتگو دل میں اتر جانے والی ہو اور دل سوز و گداز سے بھرپور ہو۔

⑦ یہ شعر بھی ایک طرح سے گذشتہ دو شعروں کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے کہ یہی وہ نکات تھے جنہیں اہل عجم نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے حالانکہ اہل دانش کے لئے تو یہ باتیں سیدھی سادی سی ہیں۔

⑧ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال نے کہا ہے کہ میری آواز میں تو ایک ایسی لے مستور ہے جسے میں نے مستقبل کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔ اس لے میں ایسی خصوصیت ہے جو پیغمبر آخرالزماںؐ کے لئے وحی لے کر آنے والا فرشتہ جبرئیلؑ بھی سن کر تڑپ اٹھے۔ مراد یہ ہے کہ شاعر کے سخن میں کمال موجود ہو تو وہ فرشتوں کو بھی تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔

(27)

تو اے اسیر مکاں! لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں

یہ ہے خلاصۂ علم قلندری کہ حیات
خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں!

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

کہے نہ راہنما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو!
یہ بات راہرو نکتہ داں سے دور نہیں

معنی: خدنگ جستہ: کمان سے نکلا ہوا تیر۔

① اس شعر میں اقبال انسان کی محدود سوچ کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ اگر وہ دور رس نگاہ کا حامل ہو تو اس کی رسائی لامکاں تک بھی ممکن ہے۔ لامکاں جو نور مطلق کی خصوصی جلوہ گاہ سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے تو اسے اس امر کی معرفت ہو سکتی ہے کہ نور مطلق کی خصوصی جلوہ گاہ زمین سے زیادہ نہیں ہے۔

② پہلے شعر کے موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ نور مطلق کی خصوصی جلوہ گاہ تو ہمیشہ پر بہار رہتی ہے۔ اسے خزاں سے دور کا بھی واسطہ نہیں اس لئے تجھے رنجور ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ تیری دسترس سے بڑی حد تک نزدیک ہے۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت تو اے انسان تجھ میں پیدا ہونی چاہئے!۔

③ معاملہ صرف اسی قدر ہے کہ اقبال کے مطابق قلندری کا جو فلسفہ ہے۔ اس کے مطابق کائنات کا تعلق ہر صورت میں نور مطلق کے سرچشمہ سے ضرور رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح کماں سے نکلے ہوئے تیر کا رابطہ کسی نہ کسی طور کماں سے برقرار رہتا ہے یعنی یہ کہنا کافی نہیں کہ جو تیر کمان سے برآمد ہوئے اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ تیر مخصوص کمان نے پھینکا ہے۔ اس مسئلے کو انسان کی تخلیق اور خدائے عزوجل کے حوالے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہر صورت میں انسان کا کچھ نہ کچھ ربط خالق مطلق سے لازمی ہوتا ہے۔

④ تیرا مقام اور تیری منزل اے انسان! بے شک چاند اور ستاروں سے آگے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

مسلسل عمل اور جدوجہد سے آگے قدم بڑھایا جائے تو یہ مقام آسمان سے زیادہ دوری پر واقع نہیں ہے اس لئے کہ چاند اور ستارے تو خود آسمان کو آراستہ کرتے ہیں۔

⑤ ایسی صورتِ حال میں جو رہنمائی کرنے والا منزل کی جانب لے جانے والی صلاحیتوں سے محروم ہو اور یوں منزل کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو وہ رہرو جو عقل و دانش اور صورتِ حال کا مکمل ادراک رکھتا ہے وہ ایسے رہنما سے یقیناً منحرف ہو جائے گا جس کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو مذکورہ قسم کے رہنماؤں کی بھی اندھی تقلید پر آمادہ رہتے ہیں وہ جو صحیح یا غلط بات کہے اس کو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن وہ لوگ جو حقیقت سے بہرہ ور ہیں ایسے رہنماؤں سے اجتناب کرتے ہیں۔

(28)

(یورپ میں لکھے گئے)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ! سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ!

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دورِ پیمانہ فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ!

کلی کو دیکھ، کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ!

کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور سب آشنا ہیں یہاں، ایک میں ہوں بیگانہ!

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ!

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ!

① یہ اشعار بھی بقول اقبال انہوں نے یورپ کے دوران قیام لکھے ہیں۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ اپنی عقل سے میں فلسفیانہ انداز نظر کو حاصل کیا جب کہ عشق نے وہ طور طریقے سکھائے جو رندوں کے ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ میں نے عقل اور عشق دونوں سے ہی فیض حاصل کیا ہے۔ یعنی جو شخص صاحبِ ادراک ہوتا ہے وہ زندگی کے ہر پہلو سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

② ایسا بھی محبوب ہو سکتا ہے جس کی محفل شراب، صراحی اور جام کی گردش کے بغیر محض اس کی نگاہ ناز سے رنگین ہو۔

③ میرے نغمے جن منتشر خیالات سے معمور ہوں انہیں شاعری نہ سمجھو کہ میں تو کائنات کے اکثر رازوں سے واقف ہوں اور وہی راز ان اشعار کے ذریعے آشکار کر رہا ہوں۔

④ میرا دل تو ایک ایسی کلی کے مانند ہے جو پھول بننے کے عمل تک نسیم صبح کی طرح معطر ہو۔ چنانچہ میں بھی اپنی تکمیل اسی صورت میں کر سکتا ہوں جب عشق حقیقی کا ادراک حاصل کر لوں۔ مطلب ہے کہ کلی کی طرح میرا دل بھی محبوب کے التفات کے بغیر شگفتہ نہیں ہو سکتا۔

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ کوئی مجھے اس حقیقت سے باخبر کر دے کہ دنیا میں میرے علاوہ سب لوگ ہی

حقیقت شناس ہیں۔ صرف میں ہی حقیقت سے بیگانہ ہوں۔ نہ جانے یہ محبوب کی بارگاہ میں باریابی کا اثر ہے یا وہاں تک رسائی نہ ہونے سے محرومی کا!۔

⑥ یورپ میں شاید چند دن اور قیام کر لیتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہاں ایسا ماحول موجود نہیں جس میں میرا نقطہ نظر سمجھا جا سکے۔

⑦ نظم کے اس آخری شعر میں علامہ فرماتے ہیں کہ عقل کی منزل سے تو میں با آسانی گزر گیا لیکن مقامِ شخص سے گزرتے ہوتے بے شمار رکاوٹیں در آئیں۔ مراد یہ ہے عقل و خرد کے مقابلے میں عشق کی منزل بڑی کٹھن ہے۔

(29)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اول سوز و تب و تاب آخر!

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر!

میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر!

کیا دبدبہ نادر، کیا شوکت تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مے ناب آخر!

خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر!

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!

معنی: امم: امت کی جمع۔ قومیں۔ **طاؤس و رباب:** دو سازوں کا نام۔ **نادر:** ایران کا مشہور بادشاہ۔ نادر شاہ افشار۔

① آسمانوں سے بالآخر بقول اقبال میری فریاد کا جواب آنے لگا ہے۔ نورِ مطلق کے حجابات بھی اٹھنے لگے ہیں اور میرا محبوب مجھ سے مخاطب بھی ہونے لگا ہے۔ یہ شعر فی الحقیقت معرفتِ الٰہی کا مظہر ہے۔

② دراصل اظہارِ محبت کے معاملات میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ اس کے آغاز میں سوز و گداز اور اضطراب سے عاشق کو واسطہ پڑتا ہے اور اس کا انجام بھی انہی جذبوں پر ہوتا ہے۔

③ میرے لئے یہ بتانا چنداں مشکل نہیں کہ قوموں کی تقدیر کس طرح عروج و زوال کے مراحل سے گزرتی ہیں کہ ان کا عروج اس وقت تک قائم رہتا ہے کہ جب تک وہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دشمن سے میدانِ جنگ میں نبرد آزما رہتی ہیں۔ بالفاظ دگر عملی جدوجہد میں مصروف رہتی ہیں اور ان مراحل سے گزرنے کے بعد جب وہ عیش و عشرت اور راگ رنگ میں مصروف ہو جائیں تو یہ سمجھ لو کہ ان کا زوال شروع ہو گیا۔

④ اس شعر میں اقبال نے غیر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ یورپ کے طرزِ عمل اور اس کی نفسیات سے آگاہ کیا ہے کہ یہاں کے استعمار پسند طبقے ضرورت مند ممالک کو پہلے ہمدردی اور دولت کی جھلکیاں دکھاتے ہیں اس کے بعد اپنے مفاد کی تکمیل کے لئے کچھ مادی امداد بھی فراہم کر دیتے ہیں تاکہ ان پر تسلط برقرار رہے۔ مراد یہ کہ پہلے تو ترقی پذیر قوموں کو حرص و ہوس کے دام میں پھنساتے ہیں اور اس کے بعد

دکھاوے کے لئے کچھ مدد بھی کر دیتے ہیں۔

⑤ نادر شاہ اور تیمور جیسے حکمرانوں کے دبدبے اور شوکت کو بالا خر شراب و کباب نے تباہ کر کے رکھ دیا مراد یہ کہ جب تک حکمران باعمل اور جدوجہد میں مصروف رہتے ان کے عروج کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن جب عیش و عشرت میں پڑ گئے تو پھر یہ عروج' زوال میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ نادر شاہ اور تیمور دونوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

⑥ اب وہ مرحلہ آگیا ہے کہ محبوب حجاب سے نکل کر عام سطح پر جلوہ گر ہو گیا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ برق بادلوں میں چھپی رہتی ہے تو اس کا پتہ نہیں چلتا لیکن بادلوں سے نکل کر اس کی چمک ماحول کو خیرہ کر دیتی ہے۔

⑦ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال خود کو قلندر سے منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے لئے اب ضبط کرنا مشکل ہو گیا اسی لئے میں نے قرآن پاک کے اسرار و رموز اپنے اشعار میں بیان کر دیئے۔

(30)

ہر شے مسافر ہر چیز راہی! کیا چاند تارے' کیا مرغ و ماہی!
تو مرد میداں تو میر لشکر نوری حضوری تیرے سپاہی!
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی یہ بے سوادی یہ کم نگاہی!
دنیائے دوں کی کب تک غلامی یا راہبی کر' یا پادشاہی!
پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے کردار بے سوز! گفتار واہی!

معنی: بے سوادی: بے عملی۔ واہی: بے سروپا۔

① اس دنیا کی ہر شے مسافرت کے عالم میں ہے اور متحرک ہے۔ ان میں خواہ چاند اور ستارے ہوں یا پھر مچھلیاں اور پرندے! سب کے سب سفر میں ہیں۔

② اے عظیم المرتبت انسان! اس دنیا میں تیری حیثیت سب سے زیادہ بلند اور میر لشکر کی طرح ہے جب کہ فرشتے اور قدسی تیرے لشکر کے سپاہی اور تابع فرمان ہیں۔

③ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ تو اپنے مرتبے سے خود آگاہ نہیں ہے اس کا ثبوت تیری بے عملی اور کج نگاہی ہے جس کے سبب تو اس شعور و ادراک سے محروم ہو کر رہ گیا ہے جو قدرت نے تجھے ودیعت کیا تھا۔

④ تو کب تک اس دنیا کی غلامی کرتا رہے گا اس سے نجات حاصل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو رہبانیت اختیار کر کے علائق دنیوی سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جا! یا پھر عملی جدوجہد کر اور ہمت و تدبیر سے کام لے کر دنیا کو تسخیر کر لے اور اپنی حکمرانی قائم کر! صرف انہی صورتوں میں تو غلامی سے نجات پا سکتا ہے۔

⑤ میں تو اس شیخ حرم کو بھی دیکھ چکا ہوں جو کعبے کا متولی ہے اور جسے اسلامی دنیا اپنا روحانی رہنما تصور کرتی ہے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ بے عمل ہے۔ سیرت و کردار کے اعتبار سے سچائی اور حقیقت سے

بے بہرہ! حد تو یہ ہے کہ اس کی گفتگو تک بے سروپا اور لغو ہوتی ہے۔

(31)

ہر چیز ہے محو خود نمائی ہر ذرہ شہید کبریائی!
بے ذوق نمود زندگی موت تعمیر خودی میں ہے خدائی!
رائی زور خودی سے پربت پربت ضعف خودی سے رائی!
تارے آوارہ و کم آمیز تقدیر وجود ہے جدائی!
یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند بے راز و نیاز آشنائی!
تیری قندیل ہے ترا دل تو آپ ہے اپنی روشنائی!
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں! باقی ہے نمود سیمیائی!
ہیں عقدہ کشا یہ خار صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی!

معنی: نمود سیمیائی: ایسی نمائش جو حقیقت سے خالی ہو۔ لیکن اصل میں کچھ نہ ہو۔

① عجیب بات ہے کہ اس دنیا میں ہر شے خود کو نمایاں کرنے میں مصروف ہے۔ اور ایک معمولی ذرہ بھی خود کو بڑا بنانے کی تگ و دو کر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے نمائش کا شکار ہے اور اپنی حقیقت سے بے نیاز ہو کر رہ گئی ہے۔

② اس کے برعکس یہ بھی درست ہے کہ زندگی میں ذاتی کمالات کی نمائش کا جذبہ موجود نہ ہو تو پھر ایسی زندگی یقیناً موت کے مانند ہے۔ دیکھا جائے تو خودی کی تعمیر میں ہی خدائی اوصاف پوشیدہ ہوتے ہیں۔

③ ایک معمولی سے انسان میں بھی خودی کا جذبہ پرورش پا رہا ہو تو پہاڑ کی مانند بلند و مستحکم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اس میں خودی نہ ہو تو وہ کسی بھی حیثیت کا حامل نہیں رہتا۔

④ ستاروں کا جائزہ لو تو اندازہ ہو گا کہ وہ آسمان کو درخشاں کرنے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ الگ آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ اس سے یہ مطلب اخذ کرنا مناسب ہو گا کہ کسی بھی شے کا مقدر جدائی کا حامل ہوتا ہے۔

⑤ رات کے پچھلے پہر میں چاند کا چہرہ زرد نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ آشنائی کے راز و نیاز سے واقف ہی نہیں اور ستاروں سے جدائی کا خوف اس پر مسلط ہو گیا ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال انسان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تیرا دل تو قندیل کی طرح سے روشن ہے تو یقیناً کسی قسم کی چاندنی کا محتاج نہیں بلکہ تو تو خود ہی چراغ راہ کی طرح روشنی سے معمور ہے۔

⑦ محض اک تیری ذات ہی ہے جو اس دنیا میں حقیقی وجود کی حامل ہے۔ اس کے سوا اور جو کچھ ہے وہ مصنوعی ہونے کے ساتھ واہمہ اور خیال کی کرشمہ سازی ہے۔ ان تمام اشعار میں علامہ نے موجود اشیاء کے بالمقابل انسانی عظمت کو پیش کیا ہے اور کسی طور پر بھی دوسری اشیاء کے مقابلے پر انسان کے احترام و وقار کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی ہے۔

⑧ اس آخری شعر میں بھی اقبال انسان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو اپنے سامنے کی مشکلات اور مسائل سے نہ گھبرا کہ ان مشکلات و مسائل سے عہدہ برآ ہونا ہی تو جہد مسلسل اور عزم و ہمت کی دلیل ہے۔ یہ درست ہے کہ ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے تیرے پاس وسائل محدود ہیں۔ اس کے باوجود تو اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ ان محدود وسائل کو ہی عروج کا زینہ بنائے۔

(32)

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ! — ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ!
تعمیرِ آشیاں سے میں نے یہ راز پایا — اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ!
یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی — یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ
غافل نہ ہو خودی سے، کر اپنی پاسبانی — شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ!
اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں — گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ!
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے! — کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ!
رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے — ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ!

① اس نظم کے مطلع میں اقبال اپنے عہد کی عالمی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یورپ کی نئی ایجادات اور عسکری قوت کے باوجود آج پورے ایشیائی ممالک میں اس کے خلاف مزاحمتی تحریکوں کا زور شور سے جاری ہونا جہاں ان ممالک کے لوگوں کی بیداری کی دلیل ہے وہاں یورپی استعمار کی عملاً ناکامی کو یا تو زمانے کی گردش کہا جا سکتا ہے یا پھر معجزے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

② اس شعر میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو آزادی اور زندگی کا مکمل شعور اور ادراک رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ غیر ضروری بار خود پر مسلط کرنے کے مقابلے میں بے سروساماں رہنا بھی بہتر ہے۔ یہی ایک سچے انسان کی شان بے نیازی ہے۔

③ ایک بندگی تو خدائے عزوجل کے سایہ عاطفت میں حاصل ہونے والی شے ہے اور دوسری بندگی محض مادی مفادات تک محدود ہوتی ہے۔ یہ بندگی کی دو حقیقتیں ہیں۔ اے انسان! اب یہ تیری صوابدید پر منحصر ہے کہ تو خدا کا بندہ بنتا ہے یا مادی مفادات کے لئے زمانے کا!۔

④ اپنی خودی کا تحفظ کر اور اس سے غافل نہ ہو جا کہ شاید یہی خودی تیرے لئے عزت و وقار کا وسیلہ بن جائے۔

⑤ اے تمام دنیا کو توحید کا پیغام دینے والے شخص! تجھ میں نہ اپنے اور غیروں کے ساتھ مکالمہ کرنے کی صلاحیت رہی ہے نا ہی تو اس کردار کا مالک رہا ہے جو میدان عمل میں تیری بلند سیرت کا مظہر ہو۔

⑥ حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ تو جس پر اپنی قاہرانہ نگاہ ڈالتا تھا اس کا سینہ خوف سے دہل جاتا تھا۔ لیکن اب افسوسناک امر یہ ہے کہ درویشی کی یہ صلاحیت بھی تجھ میں ختم ہو کر رہ گئی۔

⑦ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بقول اقبال میں کعبے کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہو چکا ہوں۔ حرم کے تمام راز مجھ پر منکشف ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ لوگوں کے نزدیک میں ان سے جو مکالمہ کرتا ہوں اس

کا ما حصل یہی ہے۔

(33)

ردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے — کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے!

ودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

قام گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں — یہی سوز نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے!

ظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں — نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشم سرمہ سا کیا ہے!

گر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے!

وائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا — خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟

① اس شعر میں اقبال نے انسان کے وجود میں آنے اور اس کے مقاصد زندگی کے حوالے سے اشارہ یات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حقیقت سے تو ہر شخص آگاہ ہے کہ وہ کس طرح سے تخلیق کیا گیا لیکن میرے نزدیک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کیوں تخلیق کیا گیا اور پیدائش سے موت تک کا جو سفر ہے۔ اس کے مقاصد کیا ہیں۔ اس کا نصب العین کیا ہے؟ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کا صحیح جواب انسان اور معاشرے میں انقلاب کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔

② یہ شعر اقبال کے ان اشعار میں سے ہے جنہیں ضرب الامثال کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ انسان خودی کو انتہائی بلندی اور عروج پر لے جائے تو خالق دو جہاں اس پر مہرباں ہو کر اپنی رضا اور اس انسان کی سوچ میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ یہ مقام خدا سے انسان کی انتہائی قربت کی دلیل ہے۔

③ میرے اقوال اور اشعار میں جو تاثر اور سوز و گداز موجود ہے اس کے بارے میں استفسار بے معنی سی بات ہے۔ میں انسان سے محبت کرتا ہوں اس کے اور اقوام کے مسائل کا ہمدردی اور سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے۔ یہی رویہ بقول اقبال میرے کلام میں وہ تاثر اور سوز و گداز پیدا کرتا ہے جس کو سن کر یا پڑھ کر کوئی بھی شخص اپنے آپ کو حقیقی زندگی میں بدلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

④ جب میں نے اپنے محبوب کی خوبصورت آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو مجھے حقیقی صورت حال کے بارے میں کسی حد تک اندازہ ہوا اور میں اسی قدر جان سکا کہ اس کے ذہن میں میری قدر و قیمت کیا ہے؟ مراد یہ ہے کہ حقیقی عشق میں حبیب اور محبوب کے وجود کا ہر جزو ان کے جذبوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور معمولی سی کوشش سے اس امر کا اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ محبوب کے دل میں کیا ہے اس کی سوچ کیا ہے؟

⑤ اس شعر میں اقبال نے نطشے کے فلسفیانہ نقطہ نظر کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر نطشے میرے عہد میں ہوتا تو میں اس کو "مقام کبریا" سے ضرور آشنا کرتا۔ اقبال نے اپنے اشعار اور نثری تحریروں میں نطشے کے فلسفیانہ افکار کا کئی مقام پر ذکر کیا ہے۔ یہ وہ فلسفی تھا جس نے غالباً سب سے پہلے "سپرمین" یعنی فوق البشر کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق دنیا کی سب سے بڑی نیکی قوت ہے اور طاقتور انسان ہی کو یہ

حق حاصل ہے کہ کمزور لوگوں پر حکومت کرے۔ اقبال کے نزدیک نطشے میں ایمان کا جوہر تو موجود تھا لیکن اس کوئی حقیقی رہنما نہ مل سکا۔ مزید یہ کہ ذاتی فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ میرے عہد میں وہ زندہ ہوتا تو "فوق البشر" کی تعریف اسے بتاتا کہ روحانی سطح پر ہی سیرت و کردار کی تعمیر سب سے بڑی نیکی ہے اور اسی کے ذریعے انسان "فوق البشر" بن سکتا ہے۔ نیز مقام کبریا سے بھی آگاہ ہو سکتا ہے۔

⑥ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ جب میں صبحدم بیدار ہوتا ہوں اور معاشرتی صورت حال کا منظر سامنے آیا بالخصوص مسلمانوں کی پستی اور زوال کے بارے میں سوچتا ہوں تو دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لمحے لاشعوری طور پر خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ اے پالنے والے! آخر میں نے ایسی کون سی خطا کی تھی جس کی یہ سزا مجھے مل رہی ہے؟

(34)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی!
عطار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی!
نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ — کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی!
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

معنی: کم کوش: لفظی معنی تھوڑی کوشش کرنے والے یعنی تن آسان۔ طائرِ لاہوتی: علم تصوف میں روحانی ترقی کی آخری منزل لاہوت ہے یعنی وہ مقام جہاں ذات باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گویا لاہوت کا مطلب ہے انتہائی بلند مقام۔ طائرلاہوتی وہ پرندہ جو روحانی ترقی کے بلند ترین مقام پر اڑنے والا ہو۔

① عشق ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو معرفت ذات سے آشنا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ غلاموں کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہو جائے تو شہنشاہی کے رازوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ جوہر پیدا ہو جاتا ہے جو غلامی کی نفی کا اہل ہوتا ہے۔

② اس شعر میں اقبال خواجہ فرید الدین عطار' مولانا روم' امام رازی اور امام غزالی جیسے صوفی دانشوروں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تنہا علم زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے انقلابی سوچ اور عمل درکار ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ معرفت الٰہی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

③ یہاں اقبال اہل دانش راہ نماؤں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ بے شک تمہارے مقلدین تن آساں اور بے عمل ضرور ہیں۔ ان میں پہلے سی جفاکشی بھی باقی نہیں رہی۔ پھر بھی ان سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ صحیح رہنمائی پر ان میں عمل کی صلاحیت بہرحال موجود ہے۔

④ اقبال کا یہ شعر بھی عام طور پر زبان زد عوام ہے جس میں انہوں نے علامتی حوالے سے خیال ظاہر

کیا ہے کہ اس رزق سے موت بہتر ہے جو عملی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ یعنی ایسا رزق جو کشکول گدائی کے ذریعے حاصل ہو تو اس کے بجائے تو مرجانا بہتر ہے۔ اس لئے کہ پاکیزہ رزق وہ ہے جو قوت بازو سے حاصل کیا جائے اس میں کسی دوسرے کی عنایات کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس شعر میں علامہ نے اپنے نقطہ نظر کو بڑے عالمانہ اور حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

⑤ وہ مرد درویش تو دارا و سکندر جیسے عظیم المرتبت بادشاہوں کے مقابلے پر اعلیٰ مرتبے کا حامل ہے۔ جس درویشی میں شیر خدا حضرت علیؓ کی حاکمانہ بصیرت اور اولالعزمی کی جھلکیاں موجود ہوں۔ مراد یہ ہے کہ وہ مرد درویش جو علی مرتضیٰؓ کی صفات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے وہ بڑے بڑے عالی مرتبت بادشاہوں سے بھی بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

⑥ یہ شعر بھی اقبال کے ان مشہور اشعار میں سے ہے جو زباں زد خواص و عوام ہی۔ اس شعر کی شرح کچھ اس طرح سے ہے کہ جوانمردوں کا مسلک تو انتہائی جراءت مندانہ انداز میں صداقت کا اظہار کرنا ہے اس لئے کہ ایسے لوگ تو شیروں کی سی فطرت کے حامل ہوتے ہیں جن میں لومڑیوں کے مانند بزدلی اور مکاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

(35)

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا!

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا!

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا!

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے!
وہ محفل اٹھ گئی جس دم تو مجھ تک دور جام آیا!

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا!

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا!

① زندگی میں شاید پھر کوئی ایسا مشکل مقام آ پہنچا ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میرے لئے نصف شب کے وقت بیدار ہو کر بارگاہ ایزدی میں دعا اور فریاد کا پیغام ملا ہے کہ اس نوع کی مشکلات سے گزرنے کا طریق کار ہی یہی ہے۔

② اقبال کہتے ہیں کہ تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب کر میں اب ایسی تلوار کے مانند برآمد ہوا ہوں جو نیام کی حامل ہی نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ اہل ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم بھی اسی طریق پر عمل کر کے مجھ جیسے ہو جاؤ۔

③ اس شعر میں سجدے اور قیام کی علامتوں کے حوالے سے اقبال نے کہا ہے کہ اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ جب مسلمانوں کے لئے جدوجہد اور عمل کا وقت آتا ہے تو ان کے ارادے کمزور پڑ جاتے اور عزم و حوصلہ جواب دے جاتے ہیں یعنی بے عملی نے ان پر مایوسی کی فضا طاری کر دی ہے۔

④ حضرت علی مرتضیٰؓ کا قول ہے کہ جس کا کوئی دوست نہیں ہوتا' غریب ہوتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے اپنی غربت کا ذکر غالباً اسی حوالے سے کیا ہے کہ میری غربت کا تماشا دیکھنے والے شاید حقیقت سے آگاہ

نہیں ہیں کہ لوگ تو اب محفل سے رخصت ہو چکے ہیں جو میرا پیغام سننے کے اہل تھے۔

⑤ میں نے اپنا تمام سوز دروں ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں منتقل کر دیا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ اشعار قیام پاکستان کے قبل سے ہیں) چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ میں تو خود ایک کمزور اور بے عمل شخص تھا اور ہندی مسلمانوں کی صفات بھی کچھ اسی نوعیت کی ہیں سوانہیں پیغام پہنچانے والا بھی ایک تن آسان شخص مل گیا۔

⑥ میں برسوں سے اسی اقبال کی تلاش میں تھا میرے باطن سے جس کا تعلق ہے اور جو شاہین صفت ہے تاہم خوش قسمت ہوں کہ ایک مدت کے بعد اپنے دام میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں!

(36)

نہ ہو طغیان مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیان مشتاقی!

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی!

وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے
طلب صادق نہ ہو تو تیری تو پھر کیا شکوہ ساقی!

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی!

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی!

خزاں میں بھی کب آ سکتا تھا میں صیاد کی زد میں
مری غماز تھی شاخ نشیمن کی کم اوراقی!

الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

معنی: طغیان: طوفان۔ سیل۔ براقی: بجلی جیسی چمک دمک۔ خلاقی: تخلیق۔ پیداوار۔

① اقبال کہتے ہیں کہ میرا دل میں جذبہ عشق ایک طوفان کے مانند موجزن ہے اس لئے کہ عشق میری فطرت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ میرے دل میں اگر عشق موجزن نہ ہو تو اس حالت میں میں زندہ نہیں رہ سکتا کہ عشق کا یہی طوفان تو میری زندگی کو متحرک رکھتا ہے۔

② میری فطرت شاید اسی لئے شعری تخلیق پر مجبور کرتی رہتی ہے کہ ابھی دنیا میں کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جو میرے اشعار اور ان میں پوشیدہ پیغام کو سمجھنے کے اہل ہیں۔

③ جس طرح عشق حقیقی نے تیرے اسلاف کے دل میں گھر کر لیا تھا اسی طرح یہ تیرے دل میں گھر کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے طلب صادق کی ضرورت ہے۔ طلب صادق ہی موجود نہ ہو تو پھر خدا سے گلہ کیسا؟

④ اس سے بڑی حماقت کیا ہے کہ تو تہذیب مغرب میں خوبیاں اس کی ظاہری چمک دمک سے کر رہا ہے۔ یہ تو سراسر جعلی نمائش ہے اور جس طرح بجلی کا چراغ روشن ہو تو ماحول بھی منور ہو جاتا ہے لیکن بجلی بند ہونے پر بالآخر تاریکی ہی پھیل جاتی ہے۔ تہذیب مغرب کی چمک دمک کی مثال بھی کچھ اسی نوعیت کی ہے۔

⑤ دلوں میں تمام عالم کو تسخیر کرنے کا جذبہ اسی صورت میں بیدار ہوتا ہے کہ نگاہوں میں عالمگیری کا انداز بھی پیدا ہو جائے۔

انتہائی برے حالات میں بھی میں دشمن کے تیروں کا ہدف نہیں بن سکتا لیکن بدقسمتی سے وسائل
ختم ہو گئے یوں میں اس کا نشانہ بن گیا۔
حالات اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ جو ہم نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جو تدبیریں کی ہیں
[...]ی بدل کر رہ جائیں گی اور ایک بار پھر تقدیر بھی پلٹا کھائے۔ یہ نکتہ محض میرے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ
[...]نے کی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ مراد یہ ہے کہ معاشرے میں اس تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آ رہی ہیں کہ
[...] کچھ الٹ پلٹ کر رہ جائے گا۔

(37)

[...]ت کو خرد کے روبرو کر   تسخیر مقام رنگ و بو کر
[...] اپنی خودی کو کھو چکا ہے   کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
[...]وں کی فضا ہے بیکرانہ   تو بھی یہ مقام آرزو کر
[...]ں ہیں ترے چمن کی حوریں   چاک گل و لالہ کو رفو کر
[...] ذوق نہیں اگرچہ فطرت   جو اس سے نہ ہو سکا، وہ تو کر!

[...] دنیا کی تسخیر کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ اپنی فطری صلاحیتوں کے ساتھ عقل سلیم سے بھی کام لے اسی
[...]رت میں تو کامیابی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔
یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو نے اپنی خودی کو ضائع کر دیا ہے اگر تو کامیابی کے مراحل طے کرنے کا
[...]ں ہے تو پھر اس کھوئی ہوئی شے کو پھر سے تلاش کر لے۔ مراد یہ کہ خودی وہ جوہر ہے جس کے بغیر
[...]ن زندگی میں کسی مرحلے پر بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔
جس طرح آسمان کی وسعتوں میں لامحدود طریق پر ستارے دمک رہے ہیں تو بھی اپنی صلاحیتوں کو اسی
[...]ی وسعت سے ہم کنار کر!
تیری دنیا کی کتنی دوشیزائیں مکمل لباس سے محروم ہیں۔ تیرے لئے لازم ہے کہ ان کی تن پوشی کا
[...]ام کرے۔
ہرچند کہ فطرت بھی بے ذوق نہیں ہے اس کے باوجود جو کام وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکی اسے تو
[...] جدوجہد اور عمل سے مکمل کر لے۔

(38)

[...]یران کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری!   صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!
[...]ں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے   وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!
[...]ی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہ سحرگاہی،   بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا درد مہجوری!
[...] ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی   سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری!

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسبابِ مستوری!
کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری!
فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبال آ گیا کیونکر!
میسر میر و سلطاں کو نہیں شاہینِ کافوری!

معنی: فغفوری: فغفور چین کے بادشاہ کا لقب تھا۔ مراد ہے شہنشاہی۔ **پیدائی:** ظہور۔ **شاہین کافوری:** سفید رنگ کا شہباز جو بہت کمیاب ہے۔

① اقبال نے اس شعر میں کلیسا اور حرم کے پیشوا کی بے عملی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا سینہ چونکہ عشقِ الٰہی سے خالی ہے اس لئے انہوں نے مذہب کے حوالے سے جو بھی کوششیں کیں وہ بیکار گئیں۔ مراد یہ کہ ان لوگوں نے اشاعتِ دین کا جو طریقہ اختیار کیا وہ رائیگاں گیا۔ اس لئے کہ لوگ خود دین سے مخلص نہ تھے۔

② یقینِ کامل کے بغیر درویشی بھی ہاتھ نہیں آتی۔ اے بے خبر! یاد رکھ کہ یقینِ کامل ہی بادشاہی کا حصول ممکن ہے۔

③ محبوب کے عشق میں انسان کے سامنے کیسے کیسے مرحلے آتے ہیں۔ کبھی حیرت اور مایوسی اس کا مقدر بن جاتی ہے؟ کبھی وصالِ محبوب سے مست ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ساری ساری رات جاگ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل کتنے ہی رنگ بدلتا رہتا ہے۔

④ عشق و مستی کا معاملہ دیکھا جائے تو انسانی فہم سے بالاتر ہے۔ بات جو سمجھ میں آتی ہے محض اسی قدر! کہ محبوب سے دوری کا عمل دل کے لئے موت کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

⑤ محبوب تو اپنے حسن کو ہر نہج پر نمائش کرتا رہتا ہے۔ لیکن میرے پیشِ نظر یہ ہے کہ وہ کسی حد تک حجاب میں رہے۔

⑥ تقدیر کے معاملات کوئی بھی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ ترکانِ عثمانی سے ترکانِ تیموری یعنی مغل کسی اعتبار سے بھی کم نہ تھے لیکن اول الاذکر نے اپنی عملی جدوجہد اور اتفاق و اتحاد سے چھینا ہوا اقتدار واپس لے لیا جب کہ مغل اپنی حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

⑦ حرم کے درویشوں کے ہاتھ اقبال آج نہ جانے کیسے آ گیا۔ یہ تو سفید رنگ کے شہباز کی مانند ہے جس پر بادشاہوں اور امراء کی دسترس بھی نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ سفید رنگ کا شہباز انتہائی کمیاب پرندہ ہے جو کسی خوش قسمت انسان کے ہاتھ آ جاتا ہے۔

(39)

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم!
عقلِ عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم!
عیش منزل ہے غریبانِ محبت پہ حرام
سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم!
ہے گراں سیر غمِ راحلہ و زاد سے تو
کوہ و دریا سے گزر سکتے ہیں مانندِ نسیم!

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ! ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

معنی: **دانش حاضر:** موجودہ زمانے کا فلسفہ اور سائنس۔ **چوب کلیم:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساحروں کا جادو باطل ہو گیا۔ **گراں سیر:** وہ مسافر جو بوجھ کی زیادتی کے باعث تیز نہ چل سکے۔ **راحلہ وزاد:** سواری اور راستے کا خرچ۔ **نصاب:** وہ مقدار مال جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔

① عہد جدید کے سائنس اور فلسفے کی بنا پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دور قدیم پھر سے رونما ہو گیا ہے۔ اس کی مثال حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے دور سے دی جا سکتی ہے کہ اس زمانے میں ساحروں نے اپنے فن میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے خلاف ان ساحروں کو استعمال کیا لیکن انہوں نے عصائے موسوی سے فرعون اور اس کے ساحروں کا تمام طلسم بے کار کر کے رکھ دیا۔ آج کے سائنس و فلسفے کی تباہ کاریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بقول اقبال عصائے موسوی کی ضرورت ہے۔

② ملا، زاہد اور اہل دانش اپنی عقل کی عیاری کے سبب حسب ضرورت رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس عشق کا جذبہ سادگی کا مظہر ہے جسے فریب کاری نہیں آتی۔

③ محبت کرنے والے لوگوں پر تو منزل تک پہنچنے کے لئے کسی مرحلے پر بھی ٹھہرنا حرام ہے۔ اگر کہیں قیام بھی کریں تو بھی متحرک نظر آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ عشق و محبت میں سکون ممکن نہیں!

④ انسان کو مخاطب کر کے اقبال کہتے ہیں کہ تو نے منزل تک رسائی کے لئے سواری اور زادراہ کا بار اٹھا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیری رفتار سست ہو گئی ہے اور جو زادراہ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ کسی تاخیر کے بغیر پہاڑوں اور دریاؤں کو بھی پار کر جاتے ہیں۔

⑤ مرد درویش تو آزادانہ زندگی گزارنے کا قائل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انجام تو بالآخر موت ہی ہوتا ہے لیکن جو دنیادار لوگ ہیں وہی مال و دولت اور سونے چاندی جمع کرنے کی ہوس رکھتے ہیں۔ آزاد زندگی کا تصور ان کے لئے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

(40)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں!
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

① اگر ان اشعار کو باقاعدہ غزل کے اشعار سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ اپنے موضوعات اور فورم کے اعتبار سے یہ ایک مکمل غزل ہے۔ مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ستاروں سے آگے اور بھی دنیاؤں کی نشاندہی کی گئی ہے اس طرح سے عشق میں آزمائشوں کا سلسلہ بھی جاری و ساری رہتا ہے۔ اور

آزمائش کی یہ منزلیں اختتام پذیر نہیں ہوتیں۔

② دوسرے شعر کا مضمون بھی پہلے شعر سے کافی حد تک مشابہت رکھتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بظاہر جو فضائیں زندگی سے خالی نظر آتی ہیں لیکن واقعاتی سطح پر ایسا نہیں ہے۔ ان فضاؤں میں ہزاروں قافلے رواں دواں نظر آتے ہیں اور پوری فضا زندگی سے لبریز ہے۔

③ اس عالم رنگ و بو پر جسے دنیا سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی پر قناعت نہ کر کہ اس سے آگے بھی بہت سی جیتی جاگتی دنیائیں موجود ہیں۔

④ اگر ایک آشیانہ کسی حادثے کے باعث ختم ہو گیا تو اس کا غم کرنا بے سود ہے اس لئے کہ ہجر محبوب میں آہ و زاری کے لئے کوئی ایک مقام تو مخصوص نہیں بلکہ اور بھی مقامات ہیں۔

⑤ اے انسان! تو تو شاہیں صفت ہے جس کا منصب پے بہ پے عروج و ترقی کی منزلیں طے کرنا ہے اور یہ منزل ایک آسمان تک دور نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی آسمان موجود ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انسان عروج وارتقاء کے مراحل سے گزرتا ہے تو اس کے لئے محض ایک حد نہیں بلکہ وسیع امکانات موجود ہیں۔

⑥ اقبال کہتے ہیں کہ اے انسان جو حدود تیرے روبرو ہیں انہی میں الجھنے پر اکتفا نہ کر! اس لئے کہ اس کے علاوہ بھی زمان و مکان کی وسعتیں موجود ہیں وتیری جولانگاہ ہیں۔

⑦ وہ دور ختم ہوا جب یہ دنیا اہل ذوق سے خالی ہو گئی تھی اور بقول اقبال میری حکیمانہ باتیں سننے پر کوئی آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن اب تو صورت حال بڑی حد تک مختلف ہے۔ یہاں کچھ ایسے اہل ذوق موجود ہیں جو میری باتوں کو سنتے اور سمجھتے ہیں بلکہ میرے حکیمانہ اقوال کے رازداں بھی ہیں۔

(41)

(فرانس میں لکھے گئے)

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام — وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!
پیرِ حرم نے کہا سن کے مری روئداد — پختہ ہے تیری فغاں اب نہ اسے دل میں تھام
تھا ارِنی گو کلیمؑ میں ارِنی گو نہیں — اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام!
گرچہ ہے افشائے راز اہلِ نظر کی فغاں — ہو نہیں سکتا کبھی شیوۂ رندانہ عام!
حلقۂ صوفی میں ذکر، بے نم و بے سوز و ساز — میں بھی رہا تشنہ کام، تو بھی رہا تشنہ کام!
عشق تری انتہا، عشق مری انتہا — تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام!
آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز — ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنتِ روم و شام!

① ایک روایت کے مطابق اس نظم کے اشعار اقبال نے فرانس کے دوران قیام لکھے۔ مطلع میں کہا گیا ہے کہ یورپی ممالک اس لایعنی اور فضول خواہش میں مبتلا ہیں کہ دنیا میں عیش و عشرت کو ہمیشہ برقرار رکھنے کا نسخہ مل جائے۔ مراد یہ کہ اس دار فانی میں تمام تر ترقی کے باوجود ہمیشہ کے لئے عیش و عشرت کا وجود کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ یورپی ممالک کی یہ خواہش عملی سطح پر ناممکنات سے ہے۔

② میں نے جب اپنی روئیداد پیر حرم کے سامنے بیان کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ اسے محض اپنی ذات تک محدود نہ رکھ! بلکہ عام لوگوں تک پہنچادے تا کہ وہ بھی تیرے ہم نوا بن جائیں!

③ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر جا کر رب ذوالجلال سے جلوہ نمائی کا تقاضا کیا تو اس کا ایک جواز تھا کہ وہ مقربان خداوندی میں سے تھے۔ اس کے برعکس میں تو ایک ادنیٰ انسان ہوں۔ میں خدا سے جلوہ نمائی کا تقاضا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو کسی طور پر بھی اس کا اہل نہیں!

④ یہ درست ہے کہ بعض اوقات اہل نظر کے کسی عمل سے بھی عشق کا راز افشا ہو جاتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر یہ ممکن نہیں کہ عشق کے رازوں کو عام کیا جائے۔ یوں بھی عشق کا حوصلہ ہر کوئی شخص کرنے کا اہل نہیں ہے۔

⑤ اب تو صوفیاء کے حلقے کی بھی یہ کیفیت ہو کر رہ گئی ہے کہ وہاں جو ذکر ہوتا ہے وہ بھی بے رس اور بے سوز و ساز ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سامعین میں سے کوئی شخص بھی استفادہ نہیں کر سکتا۔

⑥ ہر چند کہ عشق ہر فرد کے جذبے کی انتہا پر محمول ہے اس کے باوجود عشق کی تکمیل کا امکان نہیں ہوتا۔

⑦ اے درویش منش انسان تجھ سے یہ بڑی بھول ہوئی کہ سچی درویشی کا راز کھو دیا ورنہ یہ امر واقع ہے کہ روم و شام کی سلطنت فقیر کی ہی ملکیت تھی۔ اس فقیر سے اقبالؒ کی مراد مولانا رومی ہیں۔

(42)

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل!

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ!

فریب خوردہ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رحیل!

نظر نہیں تو مرے حلقہ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل!

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل!

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لئے ہے مرا شعلہ نوا قندیل!

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ!

معنی: رحیل: کوچ۔

① خودی کے جذبے کو اگر علم سے استحکام مل جائے تو اس پر جبرئیلؑ جیسا فرشتہ بھی رشک کرے گا اور اگر اس جذبے میں عشق حقیقی بھی شامل ہو جائے تو خودی کی کیفیت وہ انقلاب انگیز تاثر پیدا کرے گی جو رب ذوالجلال نے قیامت کے دن کے لئے "صور اسرافیل" کو عطا کیا ہے۔

② اقبال کہتے ہیں کہ میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ عہد حاضر کے علم و دانش میرے لئے ایک عذاب کے مانند ہیں اور اس عذاب میں میں خود کو اسی طرح سے مبتلا محسوس کرتا ہوں جس طرح حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے آتش نمرود میں داخل ہو کر خود کو محسوس کیا تھا۔ مراد یہ ہے کہ عہد حاضر کی دانش بقول اقبال میرے لئے اسی طرح عذاب کے مانند ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لئے آتش نمرود

تھی۔ اور جس طرح آتش نمرود سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ بحفاظت نکل آئے تھے۔ اسی طرح میں بھی انشاءاللہ اس عذاب سے محفوظ رہوں گا جس میں مبتلا ہوں!

③ میرا قافلہ امر واقع یہ ہے کہ سراب کو منزل سمجھ کر دھوکا کھا بیٹھا ہے ورنہ اگر وہ حقیقت حال کے ادراک رکھتا تو اسے یہ جاننے میں دقت نہ ہوتی کہ سستانے کے لئے قیام سے کہیں زیادہ بہتر مسلسل سفر ہوتا۔ خواہ اس عمل میں کتنی ہی تکلیفوں کا سامنا ہو۔

④ اگر تیرے پاس نگاہ دور رس نہیں تو میری محفل سے دور رہ۔ اس لئے کہ میں تو یہاں فلسفہ خودی کے حوالے سے جو نکتے بیان کرتا ہوں وہ تو دل میں اتر جانے والے ہیں اور ان میں ایسی کاٹ ہے جو تیغ اصیل میں ہوتی ہے۔

⑤ اقبال کا کہنا ہے کہ مجھے اب یورپ میں طالبعلمی کا وہ دور یاد آ رہا ہے جہاں ہر مسئلے کے بارے میں استدلال سے کام لیا جاتا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ مجھے آج جب کہ حضوری قلب حاصل ہوئی ہے تو اس کے مقابلے میں استدلال تو ایک طرح سے بے معنی شے ہے چونکہ دیکھا جائے تو حضوری قلب میں جو لذت موجود ہے وہ استدلال میں نہیں!

⑥ اس شعر میں علامہ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ نامساعد حالات کی اندھیری رات میں تم لوگ اپنے قافلے سے بھٹک کر رہ گئے البتہ اگر تو اشعار اور ان کی فکر کی گہرائی سے استفادہ کر سکے تو یہ تیرے شب کی تاریکی روشن چراغ کے مانند ہوں گے جن سے تم بھٹکے ہوئے لوگ سفر منزل میں چراغوں سے قدرے روشنی حاصل کر سکو گے!

⑦ حرم کعبہ کی داستان اور پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ یہ بظاہر غریب و سادہ ہونے کے باوجود تاریخی سطح پر ہمہ جہت رنگوں کی حامل ہے اس لئے کہ اس کی عظمت و تعمیر کی انتہا نواسہ رسول امام حسینؓ کی شہادت عظمیٰ سے ہوئی ہے۔ اور ابتداء پیغمبر خدا حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کے جذبہ قربانی سے! اقبال کے بعض دوسرے اشعار کی طرح یہ شعر بھی ان کے کلام میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

(43)

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟ خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے؟
منزل رہرواں دور بھی دشوار بھی ہے کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن اس زمانہ میں کوئی حیدرؓ کرار بھی ہے
علم کی حد سے پرے بندہ مومن کے لئے لذت شوق بھی ہے، نعمت دیدار بھی ہے
پیر میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

① اس نظم کے بیشتر اشعار ایک سوالیہ نشان کے مانند نظر آتے ہیں۔ ان میں اقبال اپنے عہد کی جو صورت حال ہے اس کا ذکر بھی اشارتاً کرتے ہیں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا عندیہ بھی دیتے ہیں۔ پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ ان دونوں درس گاہوں میں نہ تو فکر و دانش کے آثار ملتے ہیں اور نہ ہی خانقاہوں میں

وہ جوہر نظر آتا ہے جو روحانی تربیت کا باعث ہوا کرتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ یہ دور عملاً منفی اثرات کا حامل ہے اور کسی مرحلے پر بھی اصلاح کی گنجائش نظر نہیں آتی اور یہی اس دور کا المیہ ہے۔

② پہلے شعر کی طرح اس شعر میں بھی کیفیت یہ ہے کہ بے عملی کے سبب اہل قافلہ کی منزل دشوار بھی زیادہ ہو چلی ہے اور اس تک پہنچنے کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یعنی زندگی تو حرکت اور عملی جدوجہد سے عبارت ہے۔ انہی کے ذریعے انسان ترقی کر سکتا ہے اور اپنی منزل مراد کو بھی پا لیتا ہے۔ اس کے برعکس زندگی حرکت اور عملی جدوجہد سے خالی ہو تو ناکامی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صورت حال اس وقت مزید خراب ہو جاتی ہے جب کہ ان حالات میں لوگوں کی صحیح رہنمائی کے لئے کوئی موجود نہ ہو۔

③ حضور رسول اکرمؐ کے عہد میں جب مسلمانوں کے سامنے خیبر کے ناقابل تسخیر قلعے کا معرکہ درپیش ہوا تو اس کو فتح کرنے کے لئے اس وقت حضرت علی مرتضیٰ جیسے جری انسان اپنی معروف تلوار ذوالفقار کے ساتھ موجود تھے جنہوں نے اپنے دست و بازو سے کام لے کر خیبر کا در اکھاڑ پھینکا اور قلعہ کو فتح کر لیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ آج بھی دین اور وطن کے مقابل خیبر سے کہیں بڑھ کر معرکہ موجود ہے لیکن اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں نہ تو حیدر کرار جیسے جری اور بہادر انسان موجود ہیں نا ہی ان کی ذوالفقار! سو یہ معرکہ سر ہو تو کیسے ہو؟

④ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ علم بے شک اپنے مقام پر بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن مومن کے لئے علم ہی کافی نہیں بلکہ عشق حقیقی بھی درکار ہے۔

⑤ دانش مند لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یورپی تہذیب ہرچند کہ اپنی حدود میں ترقی یافتہ ہے لیکن اس میں تصنع اور بناوٹ نے ہر نوع کی اخلاقیات سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ مراد یہ کہ مادی ترقی ہی معاشرے کی تعمیر کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے روحانی اقدار بھی درکار ہیں۔

(44)

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے!

یا مری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں!
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے!

کیا عجب میری نوا ہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے!

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے!

معنی: پیچاک: پیچ و خم۔

① اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شعور و ادراک سے مستقبل میں رونما ہونے والی واردات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ یہ نتیجہ جادو کے زور سے نہیں بلکہ اپنی دوربینی سے اخذ کرنے کے قابل ہوا ہوں!

② شاعر مشرق نے اپنی متعدد نظموں میں واضح طور پر اس امر کی خبر دی ہے کہ انسانی تقدیر کی تعمیر عملی جدوجہد سے ہوتی ہے۔ نہ تو کوئی ستارہ نا ہی کوئی آسمانی گردش انسانی تقدیر بنانے یا بگاڑنے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بناؤ اور بگاڑ تو خود انسان کے اپنے عمل میں ہے۔

③ اپنے اشعار کے ذریعے میں جو دعوت عمل دے رہا ہوں۔ اس کا تجھ پر اثر کیوں نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یا تو میری فکر و نوا ہی بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں یا پھر تجھ میں ہی میری دعوت عمل کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

④ اور اگر میرے اشعار تیرے اندر چھپے ہوئے جذبوں کی قبولیت سے ہم کنار کر لیں کہ اس میں کوئی حیرت کی بات نہ ہو گی۔ اس لئے کہ انسان میں بالا خر اچھی باتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت تو بہر حال ہوتی ہے۔

⑤ اور بالا خر مسلمانوں کی صلاحیتیں اپنی قربانی اور جدوجہد کے ذریعے اپنی منزل کو پانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ ان میں بہرحال ایک انقلابی روح تو موجود ہے صرف اس کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کارہائے نمایاں بقول اقبال میرے اشعار اور علی الصبح کی دعائیں سرانجام دے سکیں گی۔

(45)

رہا نہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی!
خراب کوشک سلطان و خانقاہ فقیر فغاں کہ تخت و مصلیٰ کمال زراقی!
کرے گی داور محشر کو شرمسار اک روز کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی!
نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی!
مے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمہ ساقی!
چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی!
عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی!

معنی: زراقی: مکر و فریب۔

① نظم کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ صوفی اور درویشوں کی خانقاہوں کی صورت حال آج کل بس ایسی ہے کہ عشق و عمل کی جگہ محض جھوٹی کرامتیں دکھا کر اپنے پیروؤں کو لوٹنے کی روش باقی رہ گئی ہے۔

② دوسرے شعر میں بھی پہلے شعر کی مانند اقبال نے صوفی اور درویش کے ساتھ بادشاہوں کے کردار کا جائزہ لیا ہے۔ کہ شاہی محلات اور درویشوں کی خانقاہیں دونوں کی کیفیت ان دنوں انتہائی خراب اور ناقص ہے۔ دونوں انتہائی مکاری اور عیاری کے اڈے بن گئے ہیں۔

③ یہ شعر بھی ایک طرح سے ابتدائی دونوں اشعار کے تسلسل میں ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ صوفی اور ملا جو دین مذہب کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں لیکن ان کی کارکردگی کو دیکھا جائے تو صفر کے برابر ہے۔ ان کے کورے اعمال نامے جب داور محشر کے روبرو پیش کئے جائیں گے تو اسے خود دکھ ہو گا کہ یہی لوگ تھے جو مذہب کے نام پر کیا کیا گل کھلاتے رہے ہیں۔ کہ خداوند عالم نے انہیں مواقع فراہم کئے لیکن وہ اپنی بے عملی اور بدنیتی کے سبب کوئی شایان شان کام نہ کر سکے۔

④ اسلام تو رنگ و نسل کی پابندی سے ہٹ کر ایک آزاد مذہب کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں شامل ہونے والا کوئی بھی شخص خواہ چینی ہو یا عربی، رومی ہو یا شامی بہرحال مسلمان ہے اور اسلام سے وابستہ

ہے۔

⑤ رات پی جانے والی شراب کا خمار تو اب ختم ہو گیا لیکن ساقی کی عنایات کا کرشمہ ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔

⑥ عربی کا ایک مقولہ ہے جس کے معانی ہیں کہ سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے اسی حوالے سے اقبال کہتے ہیں بے شک میری باتیں بھی اے مسلمان تجھے کڑوی اور تلخ محسوس ہوں گی لیکن نہ بھول کہ یہ باتیں تلخ سچائی پر مبنی ہیں۔

⑦ جو شعر جو حقائق پر مبنی ہے اور جس میں روح عصر جھلکتی ہو وہ تو یقیناً بادشاہوں اور امراء کے مال و دولت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس نوعیت کے شعر کی افادیت تو مال و دولت سے بھی زیادہ ہے کہ یہ حقیقی رہنمائی کا حامل ہوتا ہے۔

(46)

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک — اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک
مے یقیں سے ضمیر حیات ہے پرسوز — نصیب مدرسہ یا رب یہ آب آتشناک!
عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام — یہ کہکشاں' یہ ستارے' یہ نیلگوں افلاک!
یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا؟ — دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک!
تو بے بصر ہو تو یہ مانع نگاہ بھی ہے — وگرنہ آگ ہے مومن' جہاں خس و خاشاک!
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک!
جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی — میرے کلام پہ حجت ہے نکتہ لولاک!

① اس شعر میں اقبال اہل یورپ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی دانشور سائنس' فلسفہ اور دیگر علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور عالمی سطح پر لوگوں پر اثر انداز ہونے کی قوت کے حامل ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان کی روح اور ضمیر کو تسخیر نہیں کر سکے۔ کہنے کا مقصد یوں ہے کہ یہ صلاحیت مشرقی رہنماؤں کی ہے جو ظاہر کی بجائے باطن کی پاکیزگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

② یقین محکم کی بدولت حیات انسانی جن اوصاف کی حامل ہے خدا کرے اسی نوع کا یقین محکم ہمارے تعلیمی اداروں کو بھی نصیب ہو اور وہ اس سے استفادہ بھی کر سکیں۔

③ انسان ہر چند کہ خاک سے پیدا ہوا ہے اس کے باوجود اس کی عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ ستارے' کہکشاں اور یہ نیلی رنگت والے آسمان اس کے عروج اور ترقی کا ہر لمحے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا انتظار ہی اب ان کے لئے لازم ہے۔

④ اس شعر میں اقبال اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا عصر موجود کے پاس یہی اثاثہ رہ گیا ہے کہ انسانی دماغ تو علم سے روشن اور تابندہ ہے لیکن دل میں عدم اعتماد کی تیرگی چھائی ہوئی ہے اور نگاہوں میں بے باکی تو ہے حیا کا فقدان ہے۔

⑤ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر اقبال کہتے ہیں کہ تو اگر بینائی سے محروم ہے تو دنیا کے معاملات تجھ...

کھل نہیں سکتے ورنہ امر واقع تو یہ ہے کہ مومن تو ایک ایسی آتش فروزاں کی طرح ہے کہ اس کے بالمقابل دنیا دیکھا جائے تو خس و خاشاک کے مانند ہے اور کون نہیں جانتا کہ آگ خس و اشاک کو کس طرح بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔

⑥ دنیا نے تو محض عقل کو حرف آخر سمجھ رکھا ہے حالانکہ انسان میں مردانگی کا جوہر وہ جنوں عطا کرتا ہے جو عقل سے بھی زیادہ قوی ہے۔

⑦ اور امر واقعہ تو یہ ہے کہ تمام دنیا تو مرد مومن کا ورثہ ہے اور اس دعویٰ کی تصدیق "لولاک" سے کی گئی ہے کہ یہ کائنات خدا نے محض حضور اکرمؐ کے لئے پیدا کی ہے۔

(47)

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ! یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ!
یا سنجر و طغرل کا آئین جہانگیری یا مرد قلندر کے انداز ملوکانہ!

یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی
یا فکر حکیمانہ یا جذب کلیمانہ!

یا عقل کی روباہی یا عشق ید اللّٰہی یا حیلہ افرنگی یا حملہ ترکانہ!
یا شرع مسلمانی یا دیر کی دربانی یا نعرہ مستانہ' کعبہ ہو کہ بتخانہ!
میری میں' فقیری میں' شاہی میں' غلامی میں کچھ کام نہیں بنتا بے جراءت رندانہ!

① ان اشعار میں اقبال نے آزادی اور منافقت سے گریز کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ منافقت سے گریز کو وہ یکرنگی کے عمل سے تعبیر کرتے ہیں اور آزادی سے ان کی مراد آزادی اظہار و افکار' آزادی خیر' اور زندگی کے ہر معاملے میں مکمل آزادی ہے چنانچہ مطلع میں کہتے ہیں کہ اے ہمت مردانہ اس حقیقت سے آگاہ رہ کر آزادی اور منافقت سے گریز کا عمل ہی ایسے عناصر ہیں جن کی مدد کے بغیر انسان کو گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

② نظم کے کم و بیش تمام اشعار میں آزادی و یکرنگی کے حوالوں سے علامہ نے ایک تقابلی فضا تخلیق کی ہے۔ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اے ہمت مردانہ! یا تو سنجر اور طغرل جیسے عالی مرتبت حکمرانوں کی طرز جہانگیر اختیار کر لے یا سچے درویشوں کی صفات کو اپنا لے۔

③ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ان تمام اشعار میں ایک طرح کے تقابلی جائزے کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے تسلسل کی فضا موجود ہے چنانچہ شعر میں کہا گیا ہے کہ یا تو حکیم ابو نصر فارابی جیسی دانش و حکمت حاصل کر! یا مولانا روم جیسا سوز و گداز! کہ یہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطمع رہا ہے۔

④ جب بات عقل تک پہنچے تو اس کی حیلہ سازی اور عیاری سیکھ لے! کہ یہی مغرب کے دانشوروں کا وطیرہ ہے۔ یا پھر علیؓ شیر خدا کی جراءت اور عشق حقیقی کے علاوہ ترک عساکر کی جراءت و یلغار اپنا لے!

⑤ یہ بھی نہیں تو پھر اسلامی شریعت اپنا لے یا پھر کفار کی کاسہ لیسی اختیار کر لے۔ یوں بھی کعبہ ہو یا بت خانہ مردوں کا شیوہ یکرنگی پر مبنی ہونا چاہیے۔

⑥ سرداری ہو یا پھر فقیری' بادشاہی ہو یا غلامی! ہر عمل کی تکمیل جراءت رندانہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ان اشعار میں علامہ نے مختلف شخصیتوں اور کردار کے حوالوں سے ایسی فضا تخلیق کی ہے جو نوع انسانی کے انتہائی تضادات کی آئینہ دار ہے اور جس کا مقصد آزادی اور یکرنگی کے سوا اور کچھ نہیں!

(48)

نہ تخت و تاج میں' نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے!

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے!

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے!

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشت خاک ابھی آوارگان راہ میں ہے!

خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذر سیل بے پناہ میں ہے!

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہان تازہ مری آہ صبح گاہ میں ہے!

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادہ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے!

① مطلع میں اقبال نے کہا ہے کہ سچے اور حقیقی درویش کی بارگاہ میں جس دلاویز کیفیت کا اظہار ہوتا ہے وہ نہ تو تخت و تاج کی سربراہی میں ملتی ہے نا ہی لشکروں کی سالاری اتنا لطف دے سکتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مرد قلندر کو ہی وہ مقام حاصل ہے جو انسان کو روح عصر سے آگاہ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

② حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو قدرت نے یہ شرف بخشا کہ وہ خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ خالق حقیقی رب ذوالجلال کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

③ اب اگر یہ کہا جائے کہ خس و خاشاک کا ڈھیر ہی حقیقی دنیا کے مترادف ہے تو اس سے بڑھ کر احمقانہ بات اور کیا ہو گی کہ ایک فعال انسان تو خود ہی اپنی دنیا تخلیق کرتا ہے اور یہ دنیا ہمت و جراءت اور عملی جدوجہد سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

④ اقبال کے نزدیک انسان کا مقام تو چاند ستاروں سے بھی کہیں آگے ہے۔ اس لئے اسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ وہ اپنی کم ہمتی اور بے عملی کے سبب منزل مقصود پانا تو الگ رہا ابھی اس کے راستے میں ہی بھٹک رہا ہے۔

⑤ علامہ نے یہ اور اس طرح کی پیشین گوئیاں اپنے اشعار میں جا بجا کی ہیں وہ اسے فکری شعور کے تحت پیش آمدہ حالات کا جائزہ لینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اس شعر میں انہوں نے ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک پر برطانوی تہذیب و استعمار کی یلغار کا ذکر کیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ مغربی تہذیب و استعمار مشرق کو تباہ کرنے کے لئے برسر عمل ہے۔ اس کا تدارک ضروری ہے۔

⑥ میں نے اپنے اشعار میں جو منشور ترتیب دیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے جہان تازہ کی تعمیر کا سبب بن سکتا ہے۔

⑦ یہ شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ میں نے اپنے اشعار میں جو تعلیم دی ہے وہ

ناتو تعلیمی اداروں میں ملے گی ناہی مذہبی درسگاہوں میں! لہٰذا اسی سے استفادہ کیا جائے تو مناسب ہے۔

(49)

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشہ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقت پرواز مری خاک!

وہ خاک، کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک
وہ خاک، کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک!

وہ خاک، کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک!

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک!

① ان چار اشعار میں اقبال نے اپنی ذات کے حوالے سے ملت بیضا کے بعض مسائل کو پیش نظر رکھ کر بات کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ان چاروں اشعار میں قدر مشترک ذات، ملت اور کائنات ہیں۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ فطرت نے اگرچہ مجھ میں وہ خصوصیت روا نہیں رکھی جو چالاکی اور عیاری سے عبارت ہوتی ہے اس کے باوجود مجھ میں وہ صلاحیت موجود ہے جو زندگی کے عروج و ارتقاء میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ حیات انسانی منفی حربوں سے اپنی تکمیل کی طرف نہیں بڑھتی بلکہ اس کے لئے مثبت اور بامقصد طرز عمل درکار ہوتا ہے۔

② میری ذات اتنی باصلاحیت ہے کہ اس کی دیوانگی بھی ادراک اور سوجھ بوجھ سے خالی نہیں ہوتی۔ اور جس کے سامنے جبرئیل جیسے فرشتے بھی سر تسلیم خم کر لیتے ہیں۔ اقبال کا اشارہ یہاں خدائے تعالیٰ کے اس حکم کی جانب ہے جس میں اس نے فرشتوں کو آدم کے روبرو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

③ میری ہستی کو عملاً کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ مجھے ایسا آشیانہ درکار ہے جس کی تعمیر کے لئے ایسے وسائل فراہم کئے جا سکیں جو میری بے نیازی پر اثر انداز ہوں ناہی مجھے دیگر علائق دنیوی سے کوئی سروکار ہے۔

④ میرا وجود ہرچند کہ ہر طرح کی خواہش سے بے نیاز ہے۔ اس کے باوجود قدرت نے مجھے ایسی روشنی عطا کی ہے جس کا سامنا کرتے ہوئے ستارے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انسانی وجود میں قدرت نے وہ تمام صلاحیتیں ودیعت کر دی ہیں جن کے روبرو تمام عناصر احساس کمتری کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(50)

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد!

یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سرور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے میخانہ فرنگ آباد!

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

فقیہہ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری،
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد!

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز
خدا کی دین ہے سرمایہ غم فرہاد!

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے — کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد!

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم — عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد!

معنی: رشی: لفظی معنی خداپرست' عابد' زاہد' گیانی۔ یہ لفظ ہندو بھگتوؤں اور عابدوں کے لئے مخصوص ہے۔اقبالؒ نے یہاں گاندھی جی کے لئے استعمال کیا ہے۔

① اس شعر میں اقبالؒ نے ایک انتہائی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ لوگ جو دوررس نگاہوں کے مالک ہوتے ہیں اور مستقبل پر نظر رکھتے ہیں' وہ ماضی کی شان و شوکت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مستقبل میں ان کا کردار کیا ہونا چاہئے۔ اس کے لئے وہ ماضی کی بجائے حسبِ ضرورت نئی تعمیرات کے لئے سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔

② علامہ کے بیشتر اشعار میں اگرچہ فکر کی یکسانیت پائی جاتی ہے تاہم ان حوالوں سے بھی وہ اظہار میں تازہ خون کی آمیزش کا بہرحال پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ اس شعر میں بھی ہرچند کہ انہوں نے نئی بات نہیں کہی تاہم جو کہا اپنے انداز میں کہا۔ فرماتے ہیں کہ ملت کے جوان' ہماری درس گاہیں اور مروجہ تہذیب و معاشرت' یہ سب مغربی کلچر کا ملغوبہ ہیں اور اس کلچر میں پوری طرح سے پھنسے ہوئے ہیں۔

③ علامہ اس شعر میں بھی عہد کے فلسفیوں اور ملاؤں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اوّل الذکر اپنی فکر کے ذریعے نہ تو کوئی مثبت طرزِ عمل فراہم کرتے ہیں۔ نہ ہی اہل دل کے لئے ان کی دانش تقویت کا باعث ہو سکتی ہے۔ رہے مُلا تو ان کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ دین مُلاّ فی سبیل اللہ فساد یعنی ملا تو دین اور اسلام کے نام پر تفرقہ پھیلاتا ہے۔

④ بے شک میرے نزدیک مفتیِ شہر کی [illegible]انت اگرچہ مناسب نہیں پھر بھی اس میں جو ظرف ہے بہرحال میں اس سے متفق ہوں

⑤ بے شک [illegible] ہو تو عیش و طرب کے لئے ہر ممکن سامان کیا جا سکتا ہے لیکن درد کی دولت تو ایسی گراں [illegible] ہے [illegible] حاصل نہیں ہو سکتی۔

(51)

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی — گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی!

خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی — رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی!

سکھائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے — آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

معنی: حنابندی: لفظی معنی مہندی لگانا' محاورے میں بناؤ سنگھار۔ کاشی: منسوب بہ کاشان جو ایران کا مشہور مقام ہے۔

① فرشتوں نے بارگاہ ایزدی میں میری یہ شکایت کی ہے کہ یہ شخص بڑا بے ادب اور گستاخ ہے۔ ہر وقت فطرت کے بناؤ سنگھار اور تزئین و آرائش میں لگا رہتا ہے۔ یعنی وہ اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بڑے دلکش اور پرکشش انداز میں پیش کرتا رہتا ہے۔

② اگرچہ یہ شخص مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے اور زمین کا باشندہ ہے مگر اس کے انداز اور طور طریقے آسمانی مخلوق جیسے ہیں۔ نہ تو یہ روم کا باشندہ ہے اور نہ ہی شام کا' نہ ہی کاشان کا اور نہ ہی سمرقند کا۔ گویا وہ جغرافیائی بندھنوں سے آزاد ہے اور اس کی طرزِ حیات بادہ پرستانہ نہیں ہے۔ اس کا زاویہ نگاہ بھی آفاقی ہے کیونکہ یہ اس دین کا پیروکار ہے جو ایک آفاقی دین ہے۔

③ علامہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے انسان کی فضیلت کو اس قدر نمایاں کر دیا ہے کہ فرشتوں میں بھی رشک کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ انسانوں کو اپنے اندر خدائی صفات کا رنگ پیدا کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ گویا اس طرح میں نے انسان کے دل میں ہر مخلوق سے اعلیٰ و اشرف ہونے کا جذبہ بھر دیا ہے۔

(52)

نے مہرہ باقی' نے مہرہ بازی جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی!
روشن ہے جامِ جمشید اب تک شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی!
دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا تو بھی نمازی' میں بھی نمازی!
میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے میں ملا ہوں غازی!
ترکی بھی شیریں' تازی بھی شیریں حرفِ محبت' ترکی نہ تازی!
آزر کا پیشہ خارا تراشی کارِ خلیلاں خارا گدازی!
تو زندگی ہے' پائندگی ہے باقی ہے جو کچھ سب خاک بازی!

① زندگی کی تکمیل کے لئے محض علم و حکمت اور فلسفہ کافی نہیں بلکہ اس کے لئے بنیادی مسئلہ عشق حقیقی ہے۔ یہ استدلال اس شعر میں علامہ اقبالؒ نے امام رازی اور مولانا رومؒ کے حوالوں سے پیش کیا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ امام رازی جو حکمت و فلسفہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لیکن وہ عشق حقیقی کے بغیر منزل تک نہ پہنچ سکے۔ ان کے مقابلے میں مولانا رومؒ نے اس لئے منزل پا لی کہ وہ عشق حقیقی کے محرم تھے۔

② اقبالؒ کہتے ہیں کہ بادشاہت عیاری کے بغیر نہیں چل سکتی اس کا ثبوت جامِ جمشید ہے جو اَب تک باقی ہے یعنی جمشید نے بلور کا جو مشہور زمانہ جام تیار کرایا تھا' وہ بناوٹ اور تصنع کا منبع تھا۔ جمشید کی بادشاہت اور شہرت کا راز یہی رہا تھا۔ مراد یہ ہے کہ بادشاہی کو قائم رکھنے کیلئے ہمیشہ کی [illegible]

اسی نوع کے حربے اور مکاری درکار ہے۔

③ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر علامہ کہتے ہیں کہ دکھانے کے لئے نماز میں بھی پڑھتا ہوں اور تو بھی! اس کے باوجود نہ باطنی سطح پر میں مسلماں ہوں نہ تو! یعنی میرے اور تیرے دلوں میں اسلام کا جذبہ برائے نام ہے۔

④ اور یہ بھی جان لے کہ جس معرکے میں ملا آپس میں ٹکرا جائیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے ہر طرح کا حربہ استعمال کریں۔ اس معرکے کا انجام جو کچھ بھی ہوگا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

⑤ محبت کسی زبان اور رنگ و نسل کی پابند نہیں۔ اسی موضوع پر گفتگو ترکی زبان میں ہو یا عربی میں! یہ باتیں بہرحال میٹھی لگتی ہیں۔

⑥ آذر بت تراش تھا اور اپنے ہم پیشہ افراد کی طرح پتھروں کو تراش کر بت بنایا کرتا تھا۔ اس کے برعکس پیغمبر خدا حضرت ابرہیم خلیل اللہؑ تو اپنی شیریں بیانی سے پتھردل لوگوں کے سینوں میں گداز پیدا کر دیتے تھے۔ مراد یہ کہ آذر اتنا بڑا بت تراش ہونے کے باوجود اس انسانی عظمت سے محروم رہا جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو ان کی شیریں بیانی اور انسانی راہ نمائی کے سبب حاصل ہوئی۔

⑧ علامہ نظم کے اس آخری شعر میں اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تو ہی میری زندگی ہے اور تجھی سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ باقی سب بے معنی بات ہے۔

(53)

گرم فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ! — وائے وہ رہرو کہ ہے منتظر راحلہ!
تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور — تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ!
دل ہو غلام خرد یا کہ امام خرد — سالک رہ ہوشیار' سخت ہے یہ مرحلہ!
اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر — گردش دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ
تیرے نفس سے ہوئی آتش گل تیز تر — مرغ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

① یہاں بھی اقبال مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ قافلہ کو اذن روانگی مل چکا ہے اور وہ اپنی منزل کی جانب آغاز سفر کے لئے تیار ہے۔ لیکن تو جو اس قافلے کا ایک فرد ہے زاد راہ اور سواری کا منتظر یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑا ہے۔ یہ تو بے عملی کی دلیل ہے۔ یاد رکھ کہ جو لوگ صاحب ہمت اور عزم و حوصلہ کے مالک ہوتے ہیں وہ کسی سہارے کے بغیر بھی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔
ان کا مقصود تو منزل تک رسائی ہے۔ خواہ اس کے لئے انہیں پابرہنہ بھی جانا پڑے۔

② اس شعر میں بھی اس عہد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا جب ہمیں خانقاہوں تک ہی محدود رہنا پڑتا تھا۔ اب تو انسان اس قدر ترقی یافتہ ہو چکا ہے کہ اس کے لئے ان خانقاہوں کا فرسودہ نظام بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

③ اب تیرے پیش نظر مقصد کے حصول میں دو راستے ہیں کہ یا تو دل کو عقل کا تابع کر لے یا پھر دل کو

ہی سب کچھ مان کر اس کے مطابق عمل کر! لیکن یہ بھی جان لے کہ دل کی رہنمائی میں ہی تو حصول مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

④ جو شخص بھی خودی کا قائل ہو وہ نہ تو شام و سحر کی گردش میں اسیر ہو سکتا ہے نا ہی زمانے کا شاکی ہوتا ہے۔ اس میں تو خودی کے سبب وہ اعتماد پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر کسی سے گلہ مند ہونے کی حاجت نہیں رہتی۔

⑤ اس شعر میں اقبال کا کہنا ہے کہ میرے اشعار میں جو نظام فکر موجود ہے اس کے سبب قوم میں زندہ رہنے کا جذبہ بیدار ہو گیا اور وہ عمل کی طرف مائل ہو گئی۔ یہی میرا مقصد تھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اسی صورت حال کے پیش نظر مجھے اپنی فکری کارکردگی کا صلہ مل گیا ہے۔

(54)

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی! دیا ہے میں نے انہیں ذوق آتش آشامی!
حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی!
حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؓ بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی!
مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی!
عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں شکوہ سنجر و فقر جنیدؒ و بسطامیؒ!
قبائے علم و ہنر لطف خاص ہے ورنہ تری نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی!

معنی: آتش آشامی: لفظی معنی آگ پینا۔ محاورے میں تیز شراب پینا ہے۔ **اعجمی:** نادان اور عامی۔ **احرام:** وہ خاص لباس جو حج کے موقع پر پہنا جاتا ہے چونکہ یہ لباس پہن لینے کے بعد مقررہ وقت کے لئے حاجی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لیتا ہے اس لئے لباس کا نام احرام (اپنے اوپر کچھ چیزیں حرام کر لینا ہے) اسے جامۂ احرام یا جامۂ احرامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ اقبال نے استعمال کیا۔ **مقامر:** قمار باز۔ جواری۔ **بسطامی:** اشارہ ہے بایزید بسطامیؒ کی طرف۔ **ناخوش اندامی:** جسم کا غیر موزوں ہونا جس پر کوئی لباس زیبا معلوم نہ ہو۔

① میرے اشعار میں جو زور ہے اس کے سبب نہ صرف یہ کہ اہل معرفت بلکہ عام لوگوں میں بھی زندگی کی لہر پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے اپنے نغموں کے ذریعے ان میں وہ روح پھونک دی ہے جس نے انہیں جوش عمل سے سرشار کر دیا ہے۔

② اب تو ملت کی بے عملی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ حرم کعبہ کے نزدیک جا کر بھی لوگ مسلمانوں پر طنز کرنے لگے ہیں کہ ان میں فرض کی ادائیگی کا جذبہ مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔

③ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو حقائق سے بے بہرہ ہیں ان کا طرز عمل تو ہر لمحے تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن نواسہ رسول ﷺ مقبول حضرت امام حسینؓ کی سچ کو زندہ رکھنے کے لئے قربانی ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی حقیقت کی علامت بن گئی ہے۔ چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود نواسہ رسول ﷺ اور ان کے رفقاء نے میدان کربلا میں اپنی جان و مال قربان کر کے اسلام کو جس طرح نئی زندگی عطا کی ہے اس کے سبب یہ قربانی لازوال حیثیت اختیار کر گئی لیکن ان کے دشمنوں کے قاتلوں کا نام و نشان تک باقی

نہیں رہا۔

④ مجھے اس امر کا خدشہ ہے کہ تو سیدھا سادا اور نا تجربہ کار شخص ہے جب کہ تیرے حریف انتہائی عیار اور چالاک واقع ہوئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ فی زمانہ لوگ اس قدر عیار ہو چکے ہیں جن سے عہدہ بر آ ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

⑤ رب ذوالجلال اس قدر رحیم و کریم ہے کہ ملت اسلامیہ کی تمام تر خامیوں کے باوجود دینے پر آئے تو اسے ایک بار پھر سلطان سنجر جیسا جاہ و جلال اور حضرت جنیدؒ و حضرت بایزیدؒ جیسا فقر اور روحانی عظمت عطا کر دے۔

⑥ میں تو جو کچھ بھی تھا اس کا اگرچہ تجھے اے رب ذوالجلال پوری طرح سے علم تھا اس کے باوجود یہ تیری رحمت اور کرم ہے کہ تو نے مجھے علم و ہنر کے اعزاز سے بہرہ ور کیا۔

(55)

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پر تو

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

پنپ سکا نہ خیاباں میں لالہ دل سوز
کہ سازگار نہیں یہ جہان گندم و جو

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمہ خسرو!

① اقبال نے اپنے کم و بیش تمام اشعار میں انسان بالخصوص مسلمانوں کو عملی جدوجہد کی ترغیب دی ہے۔ اس نظم کے اشعار میں بھی انہوں نے مختلف حوالوں سے یہی بات دہرائی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عملی جدوجہد کے بغیر آج تک کوئی فرد کمال حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی مثال چاند کی ہے کہ اول اول ہلال کی صورت میں نمودار ہوا اور پھر کسی مقام پر ٹھہرے بغیر آخر کار بدر کامل کا روپ اختیار کر گیا۔ مراد یہ ہے کہ یہ حرکت کا عمل ہی تھا جس نے ہلال کو بدر کامل بننے میں مدد دی۔

② سورج کی حدت کے بغیر غنچہ، پھول بن کر شگفتگی اور تازگی حاصل نہیں کر سکتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان پھونکیں مار مار کر غنچہ کو نہ پھول بنا سکتا ہے نہ اس میں رنگ و روپ پیدا کر سکتا ہے۔

③ دل اسی صورت میں پاک و پاکیزہ رہ سکتا ہے کہ یہ پاکیزگی انسان کی نگاہ میں بھی موجود ہو۔ کہ قدرت نے عملاً دل کو نگاہ کا تابع پیدا کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان کی نظروں میں پاکیزگی اور لطافت ہو گی تو اس کے اثرات دل تک بھی پہنچیں گے۔

④ لالے کا پھول باغوں میں نہیں کھلتا وہ تو ایک طرح کا خودرو پھول ہے۔ جو صحرا و کوہسار میں ہی اپنی بہار دکھاتا ہے۔ باغوں کی محدود فضاء اس کے لئے سازگار نہیں۔ اقبال کی مراد دراصل اس حوالے سے ان مسلمانوں کی جانب ہے جو کوہ و صحرا کی فضاء میں پرورش پاتے ہیں اور دنیا بھر سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیتے ہیں۔

⑤ امیر خسرو نے جو نغمے تخلیق کئے تھے ان کی گونج آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی فضا میں یہ نغمے اپنی

آب و تاب کے ساتھ زندہ ہیں۔ ان کے برعکس سلطان قطب الدین ایبک اور شہاب الدین غوری کے معرکے محض تاریخ تک محدود ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تخلیق فن لازوال ہوتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

(56)

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش!

کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش!

میں نے پایا ہے اسے اشک سحرگاہی میں!
جس درناب سے خالی ہے صدف کی آغوش!

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش!

① دانشوروں سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ عہد کی صبح اور شام میں گم ہو کر نہ رہ جاؤ! کہ یہ سارا عمل محض اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک اور دنیا بھی ہے جس میں صبح اور شام کا کوئی وجود نہیں! میرے نزدیک اس دنیا کا اشارہ قیامت کی جانب ہے یا پھر ایک ایسی خیالی دنیا جو سحر و شام کے تصور سے ہی بے نیاز ہے۔

② دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ مستقبل کے بارے میں وجود پذیر ہونے والے واقعات کا ادراک کس کو ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے عہد کی مساجد' درس گاہیں امن خانے تو شعور سے بیگانے ہیں اور وہاں کبھی لوگوں کی جو تربیت ہوتی تھی وہ سلسلہ بھی قریب قریب ناپید ہو چکا ہے جب صورت حال یہ ہو تو مستقبل کے معاملات کا اندازہ آخر کون کر سکے گا؟

③ صبح کی عبادت و دعا کے دوران میں جو عرفان خداوندی حاصل کرتا ہوں وہ ایک ایسے گوہر نایاب کی مانند ہے جس کا وجود صدف کی آغوش میں بھی ممکن نہیں۔

④ اقبال اپنے ہم عصر دانشوروں کی مانند عہد کی تہذیب سے ہمیشہ بدظن نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تہذیب ایک طرح کی ملمع سازی کے سوا اور کچھ نہیں چنانچہ ان کے نزدیک جب انسانی چہرہ صاف و شفاف ہو تو پھر اس کے لئے غازہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

⑤ اس شعر کے مطابق اگرچہ ہر دانشور ہمیشہ اپنی رائے کو صحیح جانتے ہوئے حرف آخر سمجھ لیتا ہے تاہم اس حقیقت کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کبھی کبھی غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔

(57)

تھا جہاں مدرسہ شیری و شاہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی!

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللہی!

لذت نغمہ کہاں مرغ خوش الحاں کے لئے
آہ! اس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی!

ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک! ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی!
صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی!

معنی: شبانی: گلہ بانی۔ گڈریا پن۔

① ماضی کے حوالے سے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ جن تربیت گاہوں میں شیر شاہ سوری جیسے عظیم المرتبت اور جہاں باہمت حکمرانوں کا دور دورہ تھا وہ آج اپنی بے عملی کے سبب بزدل اور ناکارہ لوگوں کی آماجگاہ ہیں۔

② ہمارے عہد کے قائدین میں وہ تربیت اور جوہر مفقود ہے جو کہ حضرت موسیٰؑ جیسے باوقار پیغمبر میں موجود تھا۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ نے سالہاسال تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرا کر اپنا مقصود حاصل کیا اور بنی اسرائیل کی رہنمائی کا شرف پایا۔ وہ سخت جانی اور کڑی تربیت ہمارے عہد کے رہنماؤں کے لئے تو ایک طرح سے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

③ جس ناسازگار ماحول میں حبس کا سا سماں ہو وہاں کسی بھی آزاد منش انسان کے سانس لینے کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟

④ جو شخص معرفت الٰہی سے آگاہ ہوتا ہے۔ ایک سرمستی و حیرت تو اس کے لئے ہر ممکن سطح پر آگاہی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جب کہ اسی حوالے سے دوسرا عمل فلسفیوں سے تعلق رکھتا ہے جہاں سرمستی و حیرت کے باوجود وہ کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتا!

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ میری فکر اس قدر بلند اور روشن ہے کہ اس کو برق تابناک سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو شب کی تاریکی میں مسافروں کی رہنمائی کرتی ہے چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ میری فکر اور میری شاعری بھی اسی طرح سے انسانوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہے تو کسی طور پر یہ بات غلط نہ ہو گی۔ اقبال کے نزدیک ان کی فکر اور شاعری روشن چراغ کے مانند ہے جو لوگوں کو راہ دکھاتا ہے۔

(58)

ہے یاد مجھے نکتہ سلمان خوش آہنگ دنیا نہیں مردان جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ!
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ!

معنی: سلمان: اشارہ ہے غزنوی دور کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کی طرف جو لاہور میں مدت تک حاکم بھی رہے اور قید بھی۔

① تین اشعار پر مشتمل اس مختصری مگر خوبصورت نظم میں اقبال نے عہد غزنوی کے ممتاز فارسی شاعر مسعود سعد سلمان کے ایک نکتے کو پیش نظر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص لاہور میں ہی پیدا ہوا پھر عہد غزنوی میں ایک عرصے تک لاہور کا حاکم رہا اور کسی فروگذاشت کی بنیاد پر بعد میں زیر عتاب آیا اور قید کر دیا گیا۔ چنانچہ سلمان کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ یہ دنیا جوانمردوں اور سخت کوش لوگوں کے لئے تنگ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو جہاں بھی جائیں گے اپنی ہمت، سخت کوشی اور جراءت کے سبب اطمینان کی

زندگی بسر کریں گے۔ ان کی راہ میں کوئی مشکل بھی حائل نہیں ہو سکتی۔

② اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ انسان کے لئے علم و دانش کی روشنی بھی بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے باوجود ان خصوصیات کے بغیر انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس میں اگر جراءت و حوصلہ مندی اور عملی جدوجہد کا جذبہ نہ ہو تو اس کی ہستی ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

③ یوں تو بلبل اور مور جیسے خوش گلو اور خوش نما پرندے بھی نظر کے سامنے رہتے ہیں لیکن ان کے بارے میں سوچنا تو بے معنی سی بات ہے اس لئے کہ بلبل تو محض خوب صورت آواز اور مور محض خوب صورت رنگوں کا استعارہ ہیں۔

(59)

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد — فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقام نظر، علم مقام خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ!
علم کا 'موجود' اور، فقر کا 'موجود' اور — **اشھد ان لا الہ، اشھد ان لا الہ**
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو — تیری نگہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ!

معنی : اعراف: اس کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہوتا ہے جو زمین سے بلند ہو۔ قرآن مجید میں جنت و دوزخ کے درمیان کی بلندی کو اعراف کہا گیا ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرتی ہے۔ **صاحب کشاف:** جار اللہ محمود زمخشری جس کی تفسیر کا نام کشاف ہے اور عربیت کے لحاظ سے وہ مستند تفسیر مانی جاتی ہے۔

① فقیر محض درویشی سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس میں استغنا کا وہ پہلو بھی شامل ہے جو معجزوں کا سبب ہوتا ہے اور انہی معجزات کے تحت انسان تاج و تخت، بادشاہی اور لشکر کا مالک بن جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فقر محض درویشی ہی نہیں بلکہ سرداروں کا سردار اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ یہ سب مناصب فقر کے کرشمے ہیں۔

② اس شعر میں اقبال ایک ایسے نکتے پر روشنی ڈالتے ہیں جو اہل دانش کے لئے توجہ طلب ہے ان کے نزدیک عقل و خرد کی پاکیزگی ہی علم کا ماحصل ہے۔ جب کہ فقر دل و نگاہ کو پاکیزگی اور جلا بخشتا ہے۔ مراد یہ کہ علم اور فقر دونوں کے ارتباط سے ہی انسان تکمیل کے مراحل سے گزر سکتا ہے۔

③ یوں تو اس نظم کے کم و بیش تمام اشعار علم اور فقر کے حوالوں سے تخلیق کئے گئے ہیں چنانچہ یہ شعر بھی پہلے دو اشعار کا تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ علم فی الواقع فلسفی اور عالم کی متاع ہے جب کہ فقر حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰؑ کے علاوہ تمام پیغمبروں کا ورثہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر دو خصوصیات کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے۔ علم راستے کی تلاش کرتا ہے جب کہ فقر راستہ جانتا ہے اور اس کا عرفان رکھتا ہے۔

④ فقر انسان کو ایسی معراج عطا کرتا ہے جہاں وہ سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھنے کا اہل ہوتا ہے جب کہ علم سب کچھ دیکھنے دکھانے سے محروم ہے البتہ ان کے بارے میں تفصیلات ضرور فراہم کر سکتا ہے۔ ان دونوں کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ فقر میں مست و بیخود ہو جانا عین ثواب ہے کہ اس کا تعلق عشق حقیقی سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس علم کے لئے مست و بے خود ہو جانا گناہ کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ یہ صورت حال علم کی افادیت کو زائل کر دیتی ہے۔

⑤ علم اور فقر دونوں ہی اگرچہ اپنے اپنے طور پر خدا کے وجود کی گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود حقیقی نہیں تاہم علم خالق حقیقی کو ظاہری سطح پر دیکھتا ہے لیکن فقر اپنے موجود کو باطنی سطح پر دیکھنے کا ادراک رکھتا ہے۔ معرفت خداوندی سے دونوں ہی بہرہ ور ہیں لیکن اس تک رسائی کے لئے راہیں الگ الگ ہیں۔

⑥ فقر کے ساتھ جب خودی کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو یہ ارتباط اتنی بڑی قوت بن جاتا ہے کہ دونوں اوصاف اگر ایک ہی سپاہی میں یک جا ہو جائیں تو وہ پورے لشکر سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے۔

⑦ نظم کے آخری شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ اگر اس کرہ ارض کے کسی باشندے کا دل بیدار عشق حقیقی سے معمور ہو تو وہ چاند اور سورج کے آئینے کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ علامہ نے ان اشعار میں علم، فقر اور دل کی جو مثلث وضع کی ہے اس سے ان تینوں کے اوصاف واضح ہوتے ہیں اور سب سے بلند مرتبہ دل کے حصے میں آتا ہے۔

(60)

کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف!

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف!

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

سرور و سوز میں ناپائیدار ہے ورنہ
مئے فرنگ کا تہ جرعہ بھی نہیں ناصاف!

① علامہ فرماتے ہیں کہ جب میں کعبے کے گرد طواف میں مصروف تھا تو عشق میں وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے دیوانگی کی انتہائی شکل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کیفیت میں حرم کا غلاف صحیح و سلامت رہ گیا تو اس میں شکر خداوندی ادا کرنا چاہئے ورنہ عالم دیوانگی میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟

② اقبال نے اہل ایمان کو بڑے طنزیہ انداز میں یوں مبارک باد سے نوازا ہے کہ شہر کے سارے قاضی و ملا اپنی فطرت کے خلاف کسی بات پر متفق تو ہوئے اور اس اتفاق رائے کی تحریک میرے فکر و نظر سے اختلاف کی بنیاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ طبقہ تو خدا اور رسولؐ کو بھی اختلافی مسئلہ بنائے بیٹھے ہیں۔ کم از کم میری ذات کی حد تک ایک معاملے میں اس نوعیت کی ذہنی ہم آہنگی معجزے سے کم نہیں!

③ ابتدائے آفرینش سے اہل خرد کا مقام جنت اور دوزخ کے مابین (اعراف) ہی رہا ہے۔ اس کی ایک

مثال یونان کے مشہور فلسفی افلاطون کی ہے جو ایک روایت کے مطابق بقول اقبال اعراف میں تڑپ رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ تجلی ذات خداوندی سے آسودہ ہوا یا نہیں؟ ابھی تک یہ معاملہ ایک سوالیہ نشان کے مانند ہے۔

④ اے مرد مومن جب تک تیرا ضمیر صحیفہ آسمانی کے عرفان سے آشنا نہیں ہوتا اور تو خود اس کے بین السطور کا ادراک حاصل نہ کر لے تو خواہ امام رازی ہوں یا علامہ زمخشری کی مشہور زمانہ تفسیر قرآن "کشاف" بھی تجھ پر یہ عقدہ نہیں کھول سکتے کہ قرآن کی تفہیم محض تفاسیر کی مدد سے ممکن نہیں۔ اس کے لئے تو قلب و روح کو اس کا جزو بنانا ناگزیر ہوتا ہے۔

⑤ مغرب کے علوم کی افادیت مسلم! لیکن بدقسمتی سے ان میں پائیداری کا فقدان ہوتا ہے۔

(61)

شعور و ہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب ۔ مقام شوق میں ہیں سب دل و نظر کے رقیب!
میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا ۔ مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب!
اگرچہ میرے نشیمن کا کر رہا ہے طواف ۔ مری نوا میں نہیں طائر چمن کا نصیب!
سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترک عثمانی ۔ سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب!
سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا ۔ ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!

① عشق میں تو انسان ہر شے سے بیگانہ ہو کر نفع نقصان کی تمیز کئے بغیر بر سر عمل رہتا ہے جب کہ انسانی شعور، ہوشمندی اور عقل کسی بھی عمل سے قبل اس سے حاصل ہونے والے نفع نقصان کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عناصر اور عشق کے مابین ایک طرح کی رقابت پائی جاتی ہے۔ اقبال نے ایک دوسرے مشہور شعر میں کم و بیش اسی مضمون کو ایک نئے انداز سے باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

② اقبال کہتے ہیں کہ آج صورت احوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے قوم کی صحیح بنیاد پر رہنمائی کرنا تھی وہ تو اپنے منصب سے لاتعلق ہو کر فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں قوم کا حشر کیا ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں!

③ اس شعر میں اقبال نے واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ وہ لوگ میری شاعری میں سے کسی طور پر بھی استفادہ نہیں کر سکتے جو اس کے حقیقی مفاہیم اور اس میں موجود فکر سے آگاہ نہیں۔ نیز اس پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے۔

④ یہ شعر علامہ نے ترکی کے نجات دہندہ کمال اتاترک کے حوالے سے کہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر چند یہ مرد مجاہد دوررس نگاہ کا حامل ہے لیکن کوئی اگر اسے میرا یہ پیغام پہنچا دے تو مناسب ہو گا۔ یہ پیغام اگلے شعر میں موجود ہے۔

⑤ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے نام اقبال کے پیغام حوالے سے یہ شعر بھی اوپر والے

شعر کا تسلسل ہے کہ اے ترکی کے مجاہدو! تم جو یورپ کی تقلید کر رہے ہو اور اس کی ہمسائگی پر نازاں ہو اس حقیقت کو کیوں فراموش کر بیٹھے ہو کہ مرتبہ و عظمت کے حوالے سے یورپ کے مقابلے میں تمہارا ستارہ ہمیشہ بلند رہا ہے۔

رباعیات
و
قطعات

(1)

رہ و رسم حرم نامحرمانہ! کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ!

① اس رباعی میں اقبال نے مذہبی اداروں کے منفی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہرچند یہ عہد اہل جنوں کے لئے سازگار نہیں پھر بھی میری فکر اور نقطہ نظر کو پیش نظر رکھا جائے تو آج کا انسان اس سے کچھ استفادہ کر سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ حرم اور کلیسا (مسلمانوں اور عیسائیوں) میں جو لوگ برسراقتدار اور مسلط ہیں وہ قطعی طور پر اس کے اہل نہیں۔ اس صورت حال کا ادراک میری شاعری کے مطالعے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

(2)

ظلام بحر میں کھو کر سنبھل جا تڑپ جا پیچ کھا کھا کر بدل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج! ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا!

معنی: ظلام: ظلمت کی جمع۔ اندھیرے۔

② انسانی زندگی تو ایک بحرِ بے کنار کے مانند ہے جس میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انتہائی جدوجہد اور عمل کی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود اگر قسمت یاوری نہ کرے تو خود کو اس مخمصے سے علیحدہ کر لے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی بے شک انتہائی کٹھن اور مشکل معاملات سے دوچار ہے اس کے باوجود جواں ہمت لوگوں کی ذمے داری یہ ہے کہ اس پیچیدہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے راہ خود ہموار کریں اور پھر بھی ناکامی کا خدشہ ہو تو راہ بدل لیں۔ اور کوئی مناسب طرز عمل اختیار کریں۔

(3)

مکانی ہوں کہ آزاد مکاں ہوں؟ جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں!

③ مجھے ابھی تک اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا کہ اس جہان ارضی میں میری اپنی حقیقت کیا ہے۔ قدرت نے کچھ وسائل ضرور فراہم کیے اس کے باوجود خود کو بے وسیلہ محسوس کر رہا ہوں اور یہ پتہ نہیں چل رہا کہ میں جس معاشرے میں زندگی گزار رہا ہوں۔ اس کی حدود کیا ہیں؟ یہ حدود ہیں بھی یا نہیں ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ یکہ و تنہا ایک ویرانے میں کھڑا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ پوری کائنات میں ہی تو ہوں۔ زندگی کا یہ تضاد میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
بے شک رب ذوالجلال کی لامکانی مسلمہ ہے لیکن مجھے کم از کم یہ تو بتایا جائے کہ میرا اپنا مقام اور

حدود اربعہ کیا ہے؟

(4)

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں!
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوہ دوست قیامت میں تماشا بن گیا میں!

④ اس رباعی میں اقبال نے اپنی ذات کے حوالے سے ایک تصوراتی منظر نامہ پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ روز قیامت جب میدان حشر میں سب لوگ جمع تھے اور خالق حقیقی کا جلوہ دیکھنے میں مگن تھے تو میں اس وقت بھی اپنی خودی میں مگن تھا اور اس مرحلے پر بھی خالق حقیقی کا جلوہ دیکھنے سے بے نیاز رہا جس کے نتیجے میں وہاں موجود لوگوں کے درمیان تماشا بن کر رہ گیا۔

(5)

پریشاں کاروبار آشنائی! پریشاں تر مری رنگیں نوائی!
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذت وصل خوش آتا ہے کبھی سوز جدائی

⑤ یہاں اقبال نے عاشقی کے حوالے سے اپنی ذاتی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ عشق کے عمل میں انسان بے شک اضطراب و انتشار کا شکار تو ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میری نغمہ سرائی کا عمل بھی انتہائی اضطراب و انتشار کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس اضطراب و انتشار کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی مرحلے پر تو مجھے لذت وصل کی طلب ہوتی ہے۔ اور کبھی محبوب کے ہجر سے پیدا ہونے والی کیفیت اپنی تمام تر سوزش کے باوجود دل پسند محسوس ہوتی ہے۔

(6)

یقیں مثل خلیل آتش نشینی! یقیں اللہ مستی خود گزینی!
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

معنی: خود گزینی: اپنے آپ کو چننا' اختیار کرنا اپنی ذات کی حقیقت سمجھ کر اس پر پختہ ہو جانا۔ خودی۔

⑥ اس رباعی میں علامہ نے یقین کامل کی ماہیت بیان کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ چند سوال اٹھائے ہیں بلکہ ساتھ ہی ان کے جوابات مختصر اور جامع انداز میں پیش کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب ہم سوچتے ہیں کہ یقین کامل کیا ہے؟ تو اس کا بڑا آسان اور مثبت جواب پیغمبر برحق حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے عمل میں مل جاتا ہے کہ بے دھڑک انجام کی پروا کیے بغیر آتش نمرود میں کود پڑے تھے۔ اقبال نے خود ایک دوسرے مقام پر اسی مضمون کے حوالے سے کہا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق!

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ یقین عشق خداوندی اور اس کی مستی میں چور ہونے کا نام بھی ہے۔
چنانچہ اے تہذیب حاضر کے سحر میں گرفتار شخص سن! کہ بے یقینی کو دیکھا جائے تو وہ غلامی سے زیادہ بر تر شے ہے۔

(7)

عرب کے سوز میں ساز عجم ہے حرم کا راز توحید امم ہے!
تہی وحدت سے ہے اندیشہ غرب کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے!

⑦ حضور سرورِ دو عالم کی ذات والا صفات نے دنیائے عرب کو اس سوز عشق سے بہرہ ور کیا جس میں عجم کی نغمگی بھی شامل تھی یہی سوز عشق ساری کائنات کے لئے بہبودی اور بہتری کے ساتھ مینارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ کعبتہ اللہ بھی قوموں میں وحدت کی علامت بن گیا۔ تہذیب مغرب کے پاس چونکہ کعبہ جیسا کوئی مرکزی ادارہ نہیں۔ اس لئے وہاں وحدت کا تصور ہی بے معنی شے ہے۔

(8)

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی نفس ہندی، مقام نغمہ تازی!
نگہ آلودہ انداز افرنگ! طبیعت غزنوی، قسمت ایازی!

⑧ یہ رباعی انتہائی مختصر انداز میں اقبال کی سیرت و کردار کا تجزیہ کرتی ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ اپنی ذاتی خصوصیات کا بیان عام طور پر خود ستائی سے محمول کیا جاتا ہے۔ کہیں علامہ نے انتہائی بے نیازی کے ساتھ اس پورے عمل کو ان چار مصرعوں میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر میری نغمہ سرائی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ نفس ہندی کے ساتھ نغمے میں عرب کی حلاوت شامل ہے۔ اسی مضمون کو علامہ نے ایک اور مقام پر یوں کہا ہے کہ

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

چنانچہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ مغرب کے جلووں سے آلودہ ہے۔ ہر چند کہ قسمت میں ایاز کے مانند غلامی لکھی ہے۔ اس کے بر عکس فطرت سلطان محمود غزنوی سے ملتی جلتی ہے۔

(9)

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیر دوش و فردا ہے و لیکن غلام گردش دوراں نہیں دل!

⑨ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ہر ذرے کے پہلو میں بھی دل موجود ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہر نوع

کی جلوت میں ہی وہ خلوت کے مزے لے رہا ہے۔ اگرچہ دل ماضی اور مستقبل کی حدود کا پابند ہے۔ اس کے باوجود وہ زمانے کی گردش کا غلام نہیں بلکہ عملاً آزادی اس کا محور ہے۔

(10)

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے!

⑩ فرماتے ہیں کہ اے مسلماں! تیرے خیالات میں بلندی اور پاکیزگی نہیں۔ نا ہی تجھ میں وہ رفعت ہے جو حضورؐ اکرم سے محبت کرنے والے میں ہونی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ تو بظاہر شاہین صفت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں وہ بیباکی اور تڑپ نہیں جو شہباز میں ہوتی ہے۔

(11)

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری!

(11) اب صورت احوال یہ ہے کہ مردِ مومن میں بھی وہ صلاحیتیں باقی نہیں رہیں جو اس کا طرہ امتیاز تھیں۔ یہی کیفیت صوفی اور درویش کی ہے کہ اس میں اور تو سب کچھ ہے۔ روشن ضمیری کا فقدان ہے۔ ان حالات کے پیش نظر رب ذوالجلال سے اسی قلب و نظر کی استدعا کر جو ذاتی صلاحیتوں کے منبع ہوتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ درویش صفتی ہی حقیقی امارت اور قیادت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

(12)

خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

(12) خودی وہ جذبہ ہے جس کا عرفان حاصل ہو جائے تو انسان کو آقائے دوجہاں حضرت محمد مصطفیؐ کے اوصاف حسنہ کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ داخلی اور باطنی سطح پر رب ذوالجلال کے جلوے اس پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ زمین، آسمان، کرسی اور عرش غرض تمام عناصر خودی کی زد میں ہیں اور کوئی شے بھی اس سے باہر نہیں!

(13)

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں! خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں!

نہ چھوڑ اے دل فغان صبحگاہی اماں شاید ملے اللہ ھو میں!

(13) معاملہ یہ ہے کہ اس دنیا کے رنگین نظاموں سے انسان مسحور ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح اس کی عقل و دانش بھی انتشار کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کیفیت میں تیرے لئے یہ بات لازم ہو گئی ہے۔ کہ علی الصبح بیدار ہو کر خدا سے دعا مانگ اور "اللہ ھو" کا ورد کر! شاید اسی طرح تجھے سکون قلب حاصل ہو جائے۔

(14)

جمال عشق و مستی نے نوازی جلال عشق و مستی بے نیازی
کمال عشق و مستی ظرف حیدرؓ زوال عشق و مستی حرف رازی!

(14) کی وساطت سے لوگوں تک پیغام خداوندی کی ترسیل کو عشق و مستی کے جمالی شان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اسی طرح عشق و مستی میں دنیا اور اس کے جملہ مسائل سے بے نیازی کو اس کی جلالی شان کہہ سکتے ہیں۔ اب رہا عشق و مستی کا کمال تو یہ مولائے کائنات علی مرتضیٰؓ کی ذات والا صفات اور کردار میں نظر آ جائے گا۔ جب کہ عشق و مستی کا زوال امام رازی کے اقوال میں موجود ہے۔

(15)

وہ میرا رونق محفل کہاں ہے مری بجلی مرا حاصل کہاں ہے
مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں خدا جانے مقام دل کہاں ہے!

(15) اس رباعی میں اقبال نے سوالیہ انداز میں اپنے محبوب حقیقی کو رونق محفل کی طرح پیش کیا ہے۔ یہاں محبوب سے مراد رب ذوالجلال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ مفروضہ اپنی جگہ درست کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا وجود بجلی کی رو کے مانند ہے جو نظر نہیں آتی لیکن اپنے وجود کا احساس ضرور دلاتی ہے۔ وہ یقیناً خدا ہے لیکن اب تک اس کے بارے میں یہ علم نہ ہو سکا کہ اس کا مسکن کونسا ہے۔ یہ تو کہا جاتا ہے کہ وہ دل کی خلوتوں میں رہتا ہے تاہم آج تک یہ راز آشکار نہیں ہو سکا کہ دل کے جس مقام پر خدا کا مسکن ہے۔ وہ مقام کہاں ہے؟ ابھی تک یہ معاملہ سوالیہ نشان کے مانند ہے؟

(16)

سوار ناقہ و محمل نہیں میں نشان جادہ ہوں منزل نہیں میں
مری تقدیر ہے خاشاک سوزی فقط بجلی ہوں میں، حاصل نہیں میں!

(16) جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نہ کوئی والا جاہ ہوں جو ناقہ محمل سے ہٹ کر قدم نہیں

رکھتا نا ہی میری حیثیت کسی منزل کی سی ہے۔ اس کے برعکس میں تو ایک نشان راہ کے مانند ہوں۔ میں تو برق رخشندہ کے مانند ہوں جو خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

(17)

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے ترا دم گرمی محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے!

(17) اس رباعی میں انسان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیرے سینے میں سانس تو موجود ہے مگر دل نہیں ہے اور سانس بھی ایسا ہے کہ اس سے کسی محفل میں گرمی اور ہنگامہ پیدا نہیں ہوتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تو عقل و دانش کا پجاری ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر قدم نہیں رکھ سکتا چنانچہ اگر تو نے اپنے مقصد کو پانا ہے تو عقل کے مراحل سے آگے گزر کر سوچ! کہ عقل تو محض راہ دکھانے والے ایک معمولی چراغ کے مانند ہے۔ یہ کوئی منزل کی حیثیت تو نہیں رکھتی جب کہ ناداں لوگ عقل کو ہی حرف آخر سمجھ لیتے ہیں۔

(18)

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو فروغ دیدہ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور کہ شاہین شہ لولاک ہے تو!

(18) تجھ میں جو جوہر پوشیدہ ہے۔ وہ پاک و پاکیزہ ہے اور نور خداوندی سے کشید کیا ہوا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جس کے نور سے آسمانوں کی درخشانی اور تابناکی میں اضافہ ہوتا ہے۔ تو تو خدائے عز و جل کا ایسا شاہیں ہے حور اور فرشتے بھی جس کے شکار ہوتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ خدا نے انسان کو تمام مخلوقات سے افضل و برتر پیدا کیا ہے۔

(19)

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

(19) اس رباعی میں اقبال مسلمانوں کی صورت حال پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں نہ جذبہ رہا نہ غیرت! نا ہی کچھ کر گزرنے کا جنوں برقرار ہے۔ آج کے مسلماں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ان کی صفوں میں نفاق نے بیج بوئے ہوئے ہیں جس کے سبب پریشاں حالی ان کا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔ حد تو یہ ہے خالق حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ان سجدوں میں ذوق اور خلوص ناپید ہوتا ہے۔ اس ساری صورت حال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل عشق حقیقی کے جذبے سے خالی ہو چکے ہیں۔

(20)

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا مقام رنگ و بو کا راز پا جا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ! کف ساحل سے دامن کھینچتا جا

(20) اس رباعی میں اقبال مسلمانوں کو دعوت عمل دیتے ہوئے ایک لائحہ عمل بھی تجویز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرے پاس خودی کا جو حربہ ہے وہ اس قدر کار آمد اور طاقتور ہے کہ اس کی مدد سے تو پوری دنیا پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی کے ذریعے ظاہر و باطن کے سارے بھیدوں سے آگہی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ سمندر کے مانند کناروں سے تیرا رابطہ تو بے شک برقرار رہنا چاہیے۔ لیکن ساحل پر لہریں جو جھاگ اڑاتی ہیں ان سے اپنے دامن کو بچا کے رکھ! مراد یہ ہے کہ ایک مکمل انسان کی تعریف یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا فانی ہے وہ تا زندگی اس میں عملی جدوجہد سے کام لے لیکن خود کو علائق دنیوی سے محفوظ رکھے!

(21)

چمن میں رخت گل شبنم سے تر ہے سمن ہے، سبزہ ہے، باد سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم یہاں کا لالہ بے سوز جگر ہے

(21) کائنات میں اگرچہ وہ تمام عناصر موجود ہیں جن کی مدد اور تعاون سے ارتقاء کی منزلیں طے کی جا سکتی ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمانوں میں نہ وہ قوت عمل موجود ہے نا ہی وہ عزم و حوصلہ جو کسی انقلاب کے لئے ممد و مددگار ثابت ہو سکے اور اس کا پیش خیمہ بن سکے۔

(22)

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے!

(22) عقل و دانش کے طفیل انسان کی بصیرت مل جاتی ہے جب کہ عقل و دانش تو ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جو راستے کو دکھاتا ہے اور اس کو منور کر دیتا ہے۔ لیکن عقل و دانش جس کو "چراغ رہگذر" سے تعبیر کیا گیا ہے انسان کی باطنی اور داخلی کیفیت سے بہرہ ور نہیں ہوتی اسی لئے وہ اس کی تکمیل کا باعث نہیں بن سکتی۔

(23)

جوانوں کو مری آہ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے!

(23) اس رباعی میں اقبال خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں دعاگو ہیں کہ نوجوانان ملت کو وہ آہ سحر عطا کر جس سے میں خود بہرہ ور ہوں۔ ہر چند کہ اپنی فطرت میں یہ بلند پرواز شاہیں کے مانند ہیں تاہم ان کا المیہ یہ ہے کہ اپنی بے عملی کے سبب ان میں آگے بڑھنے کی قوت باقی نہیں رہی چنانچہ میری آرزو اور تمنا یہی ہے کہ تو نے مجھے جو بصیرت کا نور بخشا ہے وہ عام لوگوں خصوصاً نوجوانوں تک پہنچا دے۔

(24)

تری دنیا جہان مرغ و ماہی مری دنیا فغان صبحگاہی!
تری دنیا میں ہیں محکوم و مجبور مری دنیا میں تیری پادشاہی!

(24) اے رب دو جہاں تیری دنیا تو چرند پرند اور ہر نوع کی زندہ اشیاء سے عبارت ہے جب کہ میری دنیا میں تو آہ و زاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ ایک سادہ سی رباعی ہے جس میں خالق حقیقی سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہمارے لئے ترقی کے وسائل پیدا کر دے اس لئے کہ تو نے تو ہمیں اس دنیا میں جس کو خود تو نے تخلیق کیا ہے میں ایک محکوم و مجبور انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہوں جب کہ میری اپنی دنیا پر تیرا مکمل تسلط ہے۔

(25)

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

(25) اے مولا! یہ تیرا کرم ہے کہ مجھ کو تمام صلاحیتوں سے نوازا ہے اور صاحب اقتدار لوگوں کی محکومی اور غلامی سے بچالیا ہے۔ ہر چند کہ اپنی فطرت کے مطابق میں دنیا کے جملہ مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اس کے باوجود جام جمشید کی طرح کسی کا آلہ کار نہیں ہوں۔

(26)

وہی اصل مکان و لامکاں ہے مکاں کیا شے ہے؟ انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

(26) . یہ ذات خداوندی ہے جو کسی ایک مقام تک محدود نہیں بلکہ ہر مقام پر اس کی موجودگی برحق

ہے۔ ویسے بھی یہ محض انداز بیاں کی بات ہے کہ کسی مقام کا تعین کر سکے۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ اگر کوئی مچھلی جو پانی میں مستقل بود و باش رکھنے پر مجبور ہے وہ ہی اس امر کا کسی سے استفسار کرے کہ دریا کہاں ہے؟ تو اس پر محض حیرت اور تعجب کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے اور بس!

(27)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق   کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش   کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق!

(27) اس رباعی کا موضوع بھی عشق ہے اور یہاں علامہ نے اس کی مختلف جہتیں بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جذبہ عشق ابھی تک آوارگی کے علاوہ بے خانماں ہونے کے مراحل سے گزرتا ہے۔ کبھی نوشیروان عادل کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہی نہیں کہ ایک مرحلہ تو ایسا بھی آتا ہے کہ میدان جنگ میں زرہ پہن کر برآمد ہوتا ہے لیکن جب یہ جذبہ اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو نہ زرہ پوشی کی ضرورت رہتی ہے نہ مدمقابل کے سامنے اسلحہ کی! کہ عشق حقیقی کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(28)

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق   کبھی سوز و سرور و انجمن عشق!
کبھی سرمایہ محراب و منبر   کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق!

(28) اس رباعی میں اقبال نے عشق کے جذبے کی لامحدودیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے نزدیک ابھی تک عشق کی آماجگاہ پہاڑوں اور صحراؤں کی وسعت بلندی اور تنہائی ہے۔ کبھی کسی محفل کا سوز اور سرخوشی عشق کے مظہر ہیں۔ کبھی یہ عشق جب حقیقت الٰہی سے روشناس ہوتا ہے تو پھر محراب و منبر یعنی مسجد کی محراب اور اس کے منبر کا سرمایہ بن جاتا ہے اور جب عشق حقیقی کا جذبہ انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰؓ کے سیرت و کردار میں ڈھل جاتا ہے اور قلعہ خیبر کے ناقابل تسخیر دروازے کو اکھاڑ کر لشکر اسلامی کی کفار پر فتح کا سبب بن جاتا ہے۔

(29)

عطا اسلاف کا جذب دروں کر   شریک زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں   مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!

(29) اس رباعی میں اقبال مالک حقیقی سے استدعا کرتے ہیں کہ اب میں تو ان صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہوں جو میرے اسلاف میں موجود تھیں۔ خداوندا! مجھ کو بھی عشق حقیقی کا وہ جذبہ عطا کر دے جو میرے بزرگوں کا سرمایہ افتخار تھا اور جس کی بدولت وہ اپنے حریفوں پر سبقت حاصل کرتے تھے۔ مولا! مجھے بھی ہر

ہوئیت کے غم و اندوہ سے نجات دلا دے۔ اس لئے کہ عقل و دانش کے جو معمے تھے ان کو تو میں حل کر چکا
ہوں۔ اب تو بس مجھے وہ جنون عطا کر دے جو عشق حقیقی کا سرمایہ ہے۔

(30)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی — اگر بیزار ہو اپنی کرن سے!

(30) اقبال کہتے ہیں کہ نکتہ میں نے بوالحسن سے سیکھا ہے کہ انسان بے شک جسمانی سطح پر وفات پا جاتا ہے لیکن اس کی روح زندہ و برقرار رہتی ہے بالفاظ دگر اگر کرنیں سورج سے رابطہ ختم کر لیں تو سورج میں وہ تابندگی کیسے برقرار رہے گی جو اس کی پہچان ہے۔ مراد یہ ہے کہ روح کے بغیر انسان محض ایک تودہ خاک ہے۔ اس رباعی کے مطالب بیان کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ یہ ہیں کہ بوالحسن سے مراد غالباً ابو الحسن خرقانیؒ ہیں! میرے نزدیک یہ مفروضہ غلط ہے۔ بوالحسنؓ سے یہاں مراد حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں چونکہ وہ امام حسنؓ کے والد محترم بھی تھے اس لئے ان کی کنیت ابوالحسنؓ تھی۔ رباعی میں جو نکتہ بیان کیا گیا ہے اس کے اشارے قرآن پاک کی ایک آیت کے حوالے سے نہج البلاغہ کے بعض اشعار میں بھی ملتے ہیں کہ خدا نور ہے اور روح اس نور کی کرن یعنی پرتو ہے!

(31)

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے — بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — خرد بیزار دل سے دل خرد سے!

(31) عقل نہ جانے کیوں اپنی حدود سے آگے نکل جاتی ہے جب کہ بقول اقبال اس میں تو نیک و بد کی تمیز بھی نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس رباعی میں اقبال کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے جس میں کہتے ہیں کہ نہ معلوم میں کس صورت حال میں گم ہو کر رہ گیا ہوں کہ میری عقل، دل سے بیزار ہے اور دل، عقل سے بیزار لگتا ہے۔

(32)

خدائی اہتمام خشک و تر ہے — خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی! استغفر اللہ — یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

(32) اے مالک دو جہاں! بے شک یہ حقیقت اپنی جگہ درست سہی کہ پوری کائنات میں خشک و تر کا اہتمام تیرے لئے درد سر کی حیثیت رکھتا ہو گا لیکن میں جو تیرا حقیر بندہ ہوں اس کے لئے بندگی کی جو ذمے داریاں ہیں ان کو بروئے کار لانا تو درد جگر سے کم نہیں جو درد سر سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔

(33)

ی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا؟ کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا!
خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا؟

(33) عشق الٰہی کی یہ منزل جب انسان اپنے رب کی معرفت حاصل کر لیتا ہے ہر کسی کے مقدر میں
یں ہوتی۔ اقبال کے بیشتر عارفانہ کلام بالخصوص زیر شرح رباعی کے متن سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ
عشق الٰہی کی اس منزل تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔ اس رباعی میں وہ جس بے تکلفانہ انداز میں
پنے پالنے والے سے مخاطب ہیں۔ دیکھا جائے تو یہی بے تکلفی ایک لطیف طنز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔
انچہ وہ مالک حقیقی سے استفسار کرتے ہیں کہ اس انسان کو تو نے خشکی اور تری کا حکمران بنا دیا ہے۔ کیا
ں تیرے تخلیقی ہنر کا شہ کار ہے؟ کہ اگر اس کی حقیقت کا تیرے روبرو انکشاف کروں تو بس اتنا ہی کہہ
کتا ہوں کہ اس کی بے بصیرتی کا یہ عالم ہے کہ نہ اسے اپنی حقیقت کا کچھ علم ہے نہ تیری معرفت کا
دراک ہے اور نا ہی وہ کائنات کے سربستہ رازوں سے آگاہ ہے۔ اس صورت حال میں اس کو تو نے جو
رتبہ بخشا ہے اس پر حیرت کے سوا اور کس جذبے کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

(34)

م عارف نسیم صبحدم ہے اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
گر کوئی شعیبؑ آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!

معانی: شعیب: شعیب سے یہاں مراد ہے مرشد، ہادی، مربی اور رہنما۔

(34) اس رباعی میں کہا گیا ہے کہ جو شخص صاحب عرفان ہوتا ہے اس کا سانس بھی نسیم سحری کے
مانند لطافت کی حامل ہوتی ہے اور اسی کے سبب انسان حقیقت ابدی سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کی بے حد
اہم مثال رب ذوالجلال کے دو پیغمبروں حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کی ہے کہ آخر الذکر نے اول اول
حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں پھر ان کے اتنے محبوب ہو گئے کہ حضرت شعیبؑ نے انہیں اپنا داماد بنا لیا
اور بیٹی سونپ دی۔ مراد یہ ہے کہ صاحب عرفان کسی بھی معمولی شخص کو انتہائی رفعتوں سے دوچار کرنے کی
صلاحیت رکھتا ہے۔

(35)

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے! وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے!
نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(35) اقبال کے بقول ملت کی رگوں میں ماضی کی طرح خون کی وہ گردش نہیں رہی جو جوش عمل سے

دوچار کرتی تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ نہ تو دل میں خلوص باقی رہا ہے نہ ایسی خواہش جو عروج انسانی کی مظہر ہوتی ہے۔ ہرچند کہ آج بھی ظاہری سطح پر نماز' روزہ' قربانی اور حج کی روایات تو باقی رہ گئیں لیکن افسوسناک امر یہ ہے وہ مسلمان باقی نہیں رہا جس کی شخصیت اور کردار ان خصوصیات کے اہل گردانے جاتے تھے۔

(36)

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی! گیا دور حدیث لن ترانی!
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار وہی مہدی' وہی آخر زمانی!

(36) **معانی**: **مہدی**: لفظی معنی ہدایت کرنے والا۔ **آخر زمانی**: لفظی معنی آخری زمانے میں آنے والا۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے۔ جب دنیا فسق و فجر سے بھر جائے گی تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایک ایسا مہدی بھیجے گا جو باطل کی قوتوں کو مٹا کر رکھے دے گا۔ اسلام کا ڈنکا نئے سرے سے بجے گا۔ اس آنے والے کو وہ آخری زمانے کا مجدد سمجھتے ہیں۔ اس کو اقبال نے مہدی اور آخر زمانی کے لقبوں سے یاد کیا ہے۔

اس رباعی کے مطابق اب وہ دور آگیا ہے جب کائنات کے تمام رازہائے سربستہ کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اب وہ زمانہ بھی نہیں رہا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح جواب ملے "لن ترانی" یعنی تم ہمارا جلوہ نہیں دیکھ سکتے!

غالب نے اس سے بڑی حد تک ملتا جلتا مضمون اپنے ایک شعر میں باندھا ہے کہ

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!

چنانچہ بقول اقبال اب تک تو صورت حال اس مرحلے تک آ پہنچی ہے کہ جو شخص بھی اول اول خودی کی معرفت حاصل کر سکا وہی مہدی آخرالزماں ٹھہرے گا۔ مراد یہ کہ خودی کے بغیر انسان بلند درجات حاصل نہیں کر سکتا۔

(37)

زمانے کی یہ گردش جاودانہ حقیقت ایک تو' باقی فسانہ!
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا فقط امروز ہے تیرا زمانہ!

(37) اقبال کہتے ہیں کہ زمانے کی گردش تو ماضی میں بھی جاری رہی۔ حال میں بھی جاری ہے اور مستقبل میں بھی جاری رہے گی۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ اصل شے وجود انسانی ہے باقی عناصر کو افسانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جو انسان عملی جدوجہد کا قائل ہے وہ گزرے زمانے کی تلخیوں کو نظرانداز کر دیتا ہے اور مستقبل کی نامعلوم جہتیں بھی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں کہ ان کا علم تو شاید کسی کو بھی نہ ہو گا۔ اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا حقیقی مقصود تو دور حاضر ہے کہ یہ وقت

اس کا اپنا ہے اور اس پر ہی ایک فرد بڑے اعتماد کے ساتھ بات کر سکتا ہے۔

(38)

حکیمی نامسلمانی خودی کی کلیمی رمز پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں غریبی میں نگہبانی خودی کی!

(38) عقل و دانش اور خودی کے بارے میں علامہ اقبال کے جو تصورات ہیں وہ ان کے بیشتر اشعار اور نظموں کے حوالے سے سامنے آ چکے ہیں زیر تشریح رباعی بھی انہی تصورات کی آئینہ دار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو انسان حکمت و دانش اور فلسفے کی گتھیوں میں الجھا رہتا ہے اس کا یہ عمل خودی کی نفی ہے اس لئے کہ حکمت و دانش اور فلسفہ اپنے اپنے انداز میں مسائل کا تجزیہ تو کرتے ہیں لیکن ان مباحث اور جائزوں میں نہ تو یقین و اعتماد ہوتا ہے نا ہی وہ عرفان جو ایمان کا جوہر ہے۔

خودی کے اسرار و رموز کو جاننے کے لئے تو حضرت موسیٰؑ جیسے اولالعزم پیغمبروں کا کردار پیش نظر رکھنا ہو گا کہ جابروں سے مظلوموں کو نجات دلانا جذبہ خودی کا ہی کارنامہ ہے۔ ایسے ہی کردار میں خودی کے راز مضمر ہوتے ہیں۔

رباعی کے دوسرے شعر میں اقبال ایک اور نکتہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فقیری اور درویشی میں بھی بادشاہوں جیسی عظمت اور وقار کا حصول اس صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنی خودی کو حرص و آز اور ہر نوع کی غلاظت سے بچائے رکھے! یہی وہ گر ہیں جن کے ذریعے خودی کا حقیقی نقشہ سامنے آتا ہے۔

(39)

ترا تن روح سے نا آشنا ہے عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے!

(39) اس رباعی میں بے عمل انسان سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح روح کے بغیر جسم ایک تودہ خاک کے مانند ہوتا ہے یہی صورت ایک بے عمل شخص کی ہے حتیٰ کہ خدائے عزوجل جو رحیم و کریم ہے وہ بھی ایسے بے عمل اور بے روح لوگوں کی دعائیں نہیں سنتا اس لئے کہ فی الواقع وہ اس نوع کے افراد سے بیزار رہتا ہے اور وہ تو چونکہ خود زندہ ہے لہٰذا خدا بھی زندہ لوگوں کا ہے۔ زندہ لوگ وہی ہوتے ہیں جن کے جسم میں روح زندہ ہے اور اپنی بقاء کے لئے عملی جدوجہد کے قائل ہیں۔

قطعات

(40)

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا — یہ شعر نشاط آور و پر سوز و طربناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج — کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک!

(40) یہ چار مصرعے ایک دلچسپ صورت حال کی جانب اشارہ کرتے ہیں اس صورت حال کو اقبال نے زیر تشریح قطعہ میں منکشف کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے عملاً ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کی مثال غنچے کی ہے کہ بادِ صبا کے جھونکوں کے بغیر وہ پھول بننے کی استطاعت نہیں رکھتا تاہم صرف انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ کسی کی پروا کئے بغیر اپنی منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کہ انسان تو خودی کے جذبے کی بدولت اپنی پہچان اور معرفتِ الٰہی سے بہرہ ور ہو جاتا ہے جب کہ دوسری اشیاء کے لئے یہ ممکن نہیں!

ستارے کا پیغام

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی — مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا — کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

(41) اقبال کہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان پر جو ستارہ چمک رہا ہے وہ انسان کو کچھ اس طرح کا پیغام دیتا ہے کہ میری فطرت میں چونکہ پاکیزگی اور تابندگی موجود ہے اس لئے اگر فضا پر تاریکی کا تسلط ہو جائے پھر بھی میں اس سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ میں تو خود اس نوع کی تاریکی کا سینہ چیر کا فضا کو منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

اسی حوالے سے ستارہ شب کو سفر کرنے والے مسافر سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ اگر تجھے اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے تو میری طرح اپنی ذات میں وہ صلاحیت پیدا کر جو کسی دوسرے کے سہارے کے بغیر تیرے لئے روشن چراغ کی طرح رہنمائی کا سبب بن سکے اور اس کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ تیرے جگر کا داغ شمع کے مانند تیری تاریک رات کو روشن کر دے۔

مراد یہ ہے کہ عشقِ حقیقی بھی ایک روشن ستارے کے مانند ہے جو ماحول کو خواہ وہ کتنا بھی تیرہ و تار ہو تابناک بنا سکتا ہے۔

سیاست

اس کھیل میں تعیینِ مراتب ہے ضروری — شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ!

ره پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ!

(42) معانی: تعین: مقرر کرنا۔ مراتب: مرتبہ کی جمع۔ فرزین: لفظی معنی وزیر۔ پیادہ: شطرنج کا سب سے چھوٹا مہرہ۔

اس قطعہ میں متحدہ ہندوستان پر انگریز کی سامراجی سیاست کو اپنا موضوع بنایا ہے ان کے نزدیک برطانوی حکمران یہاں شاطرانہ چالوں سے کام لے رہے ہیں ان کی سیاست کی بنیاد یہ ہے کہ مقامی رہنماؤں اور خوشامدیوں کو حسب مراتب عہدے تقسیم کر دیئے بالکل اسی طرح جیسے شطرنج کے کھیل میں وزیر اور پیادے ہوتے ہیں اور شاطران مہروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہے۔

تاہم یہاں انگریزی شاطروں کی عیاری کا یہ عالم ہے کہ پیادہ تو بے چارہ خیر ایک معمولی سا اہلکار ہوتا ہے یہاں تو وزیر کو بھی پتہ نہیں ہونے دیا جاتا کہ اسے کس طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ سیاست اسی نوعیت کی عیاری کا نام ہے۔

خانقاہ

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن!

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

(43) معانی: قم باذن اللہ: خدا کے حکم سے اٹھو۔

علامہ فرماتے ہیں کہ یہ عہد جس میں ہم سانس لے رہے ہیں اشاروں کنایوں اور علامتی سطح پر بات کرنے کا عہد نہیں۔ یہاں تو صاف اور کھری بات کرنے کی ضرورت ہے۔ یوں بھی میں تصنع کا قائل نہیں ہوں چنانچہ کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنے مطمع نظر کو واضح کر دیتا ہوں۔ سو امر واقع یہ ہے کہ وہ لوگ جو قم باذن اللہ کہہ کر مردوں کو پھر سے زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اب ہمارے درمیان موجود نہیں رہے۔ اب تو خانقاہوں میں ان لوگوں کی جگہ ایسے لوگ باقی رہ گئے ہیں جو یا تو مجاہد ہیں یا پھر قبر کھودنے والے!

مراد یہ ہے کہ خانقاہیں کبھی ان درویشوں کی آماجگاہ ہوتی تھیں جن کے دل عشق الٰہی سے معمور ہوتے تھے ان میں قدرت نے یہ صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ قم باذن اللہ (خدا کے حکم سے اٹھ جا) کہہ کر مردوں کو زندہ کر دیتے تھے جب کہ اب تو خانقاہوں میں مفادات کے بندے باقی رہ گئے ہیں جو پیسے کے لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔

لہو

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس

جسے ملا یہ متاع گراں بہا اس کو نہ سیم و زر سے محبت ہے نے غم افلاس!

(44) انسانی جسم میں خون تندرستی اور جوش و جذبے کی علامت ہے۔ ان اشعار میں اسی امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اگر جسم میں خون موجود ہے تو وہ انسان کو نہ صرف یہ کہ ترو تازہ رکھتا ہے بلکہ خوف و

ہراس بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔ خون کی موجودگی کے سبب دل میں کوئی وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔
اقبال کہتے ہیں کہ جس شخص کو خون جیسی گراں بہا شے میسر آ گئی وہ ملک و دولت کی بھی پروا نہیں کرتا بلکہ افلاس اور غربت سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور اپنی تندرستی کے علاوہ جراءت و ہمت اور حوصلہ کی بنیاد پر ہر شے کے حصول پر قدرت رکھتا ہے۔

فلسفی

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور حکیم سر محبت سے بے نصیب رہا!
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا!

(45) معانی: بلند بال: اونچا اڑنے والا۔ جسور: جسارت والا۔
اقبال کے نزدیک فلسفی کی تعریف یہ ہے کہ بظاہر وہ ذہنی طور پر تو بلند ہوتا ہے لیکن اس میں جراءت و ہمت نہیں ہوتی بلکہ دیکھا جائے تو غیرت کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ فلسفی کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ محبت کے جذبے سے آشنا ہوتا ہے اس لئے مذکورہ بالا صلاحیتوں سے محرومی فطری امر ہے۔
اس کی مثال وہ شاہین اور گدھ کے کرداروں کے حوالے سے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پرندے تو دونوں ہی ہیں اور فضاؤں میں اڑنے کا شرف بھی دونوں کو ہی حاصل ہے لیکن فطری سطح پر دونوں کی خصوصیات متضاد ہیں۔ شاہین تو زندہ پرندوں کو خود شکار کرتا ہے اس لئے کہ اس میں جراءت و ہمت موجود ہے۔ وہ غیرت مند بھی ہے کہ نہ مردہ گوشت کھاتا ہے نہ کسی کا مارا ہوا شکار! اس کے برعکس گدھ اگرچہ ہر ممکن بلندی تک اڑنے کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن جراءت و ہمت دونوں صلاحیتوں سے محروم رہتا ہے اسی باعث وہ زندہ شکار کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا بلکہ مردہ گوشت پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہی کیفیت ایک فلسفی کی ہوتی ہے جو موخر الذکر پرندے سے منسوب کی گئی ہے۔

ہارون کی آخری نصیحت

ہاروں نے کہا وقت رحیل اپنے پسر سے جائے گا کبھی تو بھی اسی راہگذر سے!
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے!

(46) یہ قطعہ عباسی خاندان کے سب سے اہم حکمران ہارون الرشید کی آخری نصیحت سے متعلق ہے۔ یہ نصیحت ہارون نے اپنی وفات سے چند لمحے قبل اپنے بیٹے کے گوش گزار کی تھی۔ جس میں اسے تلقین کی تھی کہ میری طرح سے تو بھی ایک اور فنا کے مرحلے سے گزرے گا۔ لہٰذا یہ امر ذہن نشین کر لے کہ موت کا فرشتہ جب روح قبض کرنے آتا ہے تو بے شک وہ کافر کی نظروں سے تو معدوم رہتا ہے لیکن مسلمان کی آنکھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ مراد یہ ہے کہ کافر چونکہ منکر خدا ہوتا ہے لہٰذا وہ موت کو بھی یاد نہیں رکھتا اس کے برعکس وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے لیکن مسلمان خدا کے ساتھ موت کو بھی ہر

لیے یاد رکھتا ہے اور قیامت پر بھی ایمان رکھتا ہے۔

ماہر نفسیات سے

جراءت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!
کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے!

(47) ماہر نفسیات سے ہم کلام ہوتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تو ہر لمحے جو انسانوں اور ان کے مسائل کے بارے میں جائزے لیتا رہتا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ درست سہی! پھر بھی تجھ میں اگر جراءت و ہمت ہے تو محض اس خیالی دنیا تک محدود نہ رہ بلکہ اس سے آگے نکل کر یہ بھی دیکھ کر خودی تو ایک بحرِ بے کنار کی مانند ہے اور اس میں ابھی تک کئی ایسے گوشے موجود ہیں جو انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

یاد رکھ! کہ خودی ایک ایسا خاموش سمندر ہے جس کے بھیدوں کو اس وقت تک انسان نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی پیروی نہ کرے۔ یعنی حکم خدا پر حضرت موسیٰؑ نے اپنی عصا کو پانی پر مارا جس سے انہیں پار اترنے کا راستہ مل گیا۔ مراد یہ ہے کہ محض اپنی سوچ اور تصورات ہی زندگی میں کامیابی و کامرانی کا ذریعہ نہیں بن سکتے بلکہ یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ کسی معاملے میں حکم خداوندی اور رضائے الٰہی کی نوعیت کیا ہے۔ خودی سے بہرہ ور ہونے کا یہی طریقہ ہے۔

یورپ

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ!
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ!

(48) ایک مدت سے یہودی سود خوار یورپ کو ہڑپ کرنے کی تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ وہ عیار و مکار لوگ ہیں جن کے بالمقابل چیتے جیسی پھرتی اور شہ زوری بھی ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یورپ کی حیثیت تو ایک پکے ہوئے پھل کی مانند ہے۔ کون جانے وہ کس کی جھولی میں جا گرے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال اقبال نے جرمنی کے مشہور فلسفی اور دانشور نطشے سے لیا ہے جس نے پہلی بار اپنی ایک تحریر میں یہودی ساہوکاروں کی مکاری اور عیاری کو واشگاف انداز میں بیان کیا۔

(49)

فطرت مری مانند نسیمِ سحری ہے رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو کرتا ہوں خار کو سوزن کی طرح تیز!

(49) جس طرح نسیم سحر کے رویے میں تیزی اور ٹھہراؤ دونوں پہلو موجود ہیں۔ میری فطرت بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے کمال ہنر سے کبھی لالہ و گل کو اطلس کی قبا

پہنا دیتا ہوں اور کبھی کانٹوں کے سروں کو سوئی کے ناکے کی طرح تیز کر دیتا ہوں۔ مراد یہ کہ جدوجہد اور جوش عمل کے ذریعے میں چیزوں کے روپ بدلنے کی قدرت رکھتا ہوں!

(50)

کل اپنے مریدوں سے کہا پیر مغاں نے قیمت میں یہ معنی ہے در ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مے افرنگ جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

(50) اپنے مریدوں کو نصیحت کرتے ہوئے پیر مغاں نے کہا "سنو! میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ راز جواہرات سے بھی دس گنا زیادہ قیمتی ہے۔ اور وہ یہ کہ مغربی تہذیب اس قوم کے لئے زہر قاتل کی سی حیثیت رکھتی ہے جس قوم کے نوجوانوں میں خودداری کا فقدان ہو اور ہنرمند نہ ہوں۔ مراد یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان جہاں خوددار ہوں وہاں جملہ ہنروں سے بھی آگاہی رکھتے ہوں۔

نظمیں

دعا

(مسجد قرطبہ میں لکھی گئی)

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو!
صحبت اہل صفا نور و حضور و سرور سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آبجو!
راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو!
میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر! میرا نشیمن بھی تو' شاخ نشیمن بھی تو!
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح نشور تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ہو!
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ تو ہی مری آرزو' تو ہی مری جستجو!
پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو!
پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر' کہ میں ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو!
چشم کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر جلوتیوں کے سبو' خلوتیوں کے کدو!
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سو!
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا' حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو!

معنی: صبح نشور: قیامت کی صبح۔ کاخ و کو: کوچے اور محل۔ جلوتی اور خلوتی: جلوتی کے لفظی معنی ہیں وہ لوگ جو جلوت میں رہتے ہیں۔ اور خلوتیوں سے مراد ہے گوشہ نشین لوگ ان دونوں اصطلاحوں سے مختلف مفہوم

لئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً امیر اور فقیر' اہل سیاست اور اہل تصوف' علماء اور اولیا۔ دنیا دار اور دین دار۔ حال ہی کی مناسبت سے دونوں کے لئے الگ الگ لفظ استعمال کئے۔ جلوتیوں کے لئے سبو جس سے محفل آرائی کا سرو سامان اور اہتمام ظاہر ہوتا ہے۔ خلوتیوں کے لئے کدو جو درویشی اور قلعت سامان کی دلیل ہے۔ **لامکان:** وہ مکان جس کی حدود نیامت کوئی نہ ہو۔ **چار سو:** وہ مقام جو چار طرفوں سے گھرا ہوا ہو یعنی دنیا۔

① اقبال جب 32ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو وہاں سے فراغت کے بعد انہوں نے ہسپانیہ کا دورہ بھی کیا۔ تاریخی اعتبار سے ہسپانیہ جن دنوں مسلمان سلاطین کے زیر نگیں رہا تو اس کی عظمت انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ مسلمان سلاطین نے قرطبہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ زیر شرح نظم علامہ نے قرطبہ کی جامع مسجد میں بیٹھ کر تخلیق کی۔ یہ مسجد مسلمانوں کے زوال کے بعد عیسائی حکمرانوں نے گرجا میں تبدیل کردی تھی۔ اس المیے کے اثرات اقبال کی اس نظم میں جابجا موجود ہیں۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عشق حقیقی جب اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو جگر کا لہو بھی آہ و فریاد میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی آہ و فریاد میری نماز اور وضو کا روپ دھار گئی ہے۔

② اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ صاف و پاکیزہ محبت سے قلب انسان جلا پاتا ہے۔ محبوب کی حضوری کے ساتھ کیف و سرور کی وہ صورت ملتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نہر کے کنارے لالے کا پھول لہراتا رہتا ہے اور ندی کی لہریں اس کو ہمیشہ تازگی' سرخوشی اور سوز بخشتی رہتی ہیں۔

③ محبت کی راہیں اس قدر سنگلاخ ہوتی ہیں کہ اس میں انتہائی قربت رکھنے والے عزیز و اقربا بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک اور شاعر نے اسی مضمون کو ایک مصرعہ میں یوں پیش کیا ہے۔

تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

چنانچہ اقبال کے مطابق کہ محبت میں کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ محض عشق کا جذبہ ہی آرزو میں ڈھل کر انسان کو اس کی منزل تک پہنچانے کا اہل ہوتا ہے۔

④ خدائے عزوجل سے مخاطب ہو کر اس شعر میں علامہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں امیروں اور وزیروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ میرے لئے تو تو ہی سب کچھ ہے۔ منزل بھی اور راہ منزل بھی!

⑤ اے خدا تو نے میرے سینے میں عشق حقیقی کی جو آگ روشن کی ہے وہ قیامت کے روز بھڑکنے والی آگ سے کم نہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل "اللہ ہو" کی حرارت کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

⑥ مولائے کائنات تیرے ہی دم سے میری زندگی سوز و درد اور داغ کے علاوہ روشنی کا مظہر بنی ہوئی ہے۔ تو ہی ہے جو میرے عشق میں آرزو بن کر بسا ہوا ہے اور یہی جذبہ جستجو کا حامل بن جاتا ہے۔

⑦ اے آقا! یہ تیری یاد ہی ہے جس کے بغیر ہر سو ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے اور جب مجھے تیری قربت کا احساس ہوتا ہے تو اجڑے ہوئے محلات اور سنسان گلی کوچے بھی آباد و درخشاں نظر آتے ہیں۔ مراد یہ کہ قرب الٰہی سے انسان کو عظمت و بلندی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عشق الٰہی اور اس کی معرفت نہ ہو تو پورا ماحول اجاڑ و سنسان بن کر رہ جاتا ہے۔

⑧ اے مالک دوسرا میں نے جدید تہذیب کے تمام لوازمات سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ مجھے وہی جذبہ عشق سے نواز دے جو میرے اسلاف کا ورثہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر میں تو عشق الٰہی میں جذب ہو چکا ہوں۔ اور محض تیری تلاش میں مصروف ہوں!

⑨ یہ شعر بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے پچھلے شعر کا تسلسل ہے جس میں خدا سے دعا کی گئی ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سب تیری نظر کرم کے محتاج ہیں۔

⑩ اس شعر میں علامہ کا لہجہ قدرے تبدیل ہو گیا ہے۔ یہاں وہ مالک حقیقی سے گلہ مند نظر آتے ہیں کہ وہ خود تو لامکاں ہے اور افلاک و کائنات پر اس کی اجارہ داری ہے جب کہ انسان کو اپنا نائب بنا کر بھیجنے کے باوجود زمین کے ایک مختصر علاقے تک محدود کر دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ خدا کے لامحدود اختیارات کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں جب کہ انسان تو محض بے اختیار ہے۔

(11) فلسفہ اور شعر کی تعریف مختصراً اتنی ہی ہے کہ ان کی وساطت سے اپنی دلی تمنا کا اظہار کھل کر نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہاں بھی علامتوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

مسجد قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب[1] نقش گر حادثات — سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات!
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار — موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات!
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کار جہاں بے ثبات! کار جہاں بے ثبات!
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام — جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات!
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود!
قطرہ خون جگر سل کو بناتا ہے دل خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرش معلّیٰ سے کم سینہ آدم نہیں گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود!
کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمہ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے!

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل!
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے اس کی اذانوں سے فاش سر کلیمؑ و خلیلؑ
اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل!
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل!
ساقی ارباب ذوق، فارس میدان شوق بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل!

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایہ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

تجھ سے ہوا آشکار بندہ مومن کا راز اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطہ پرکار حق مرد خدا کا یقیں اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

کعبہ ارباب فن! سطوت دین مبیں تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!
آہ وہ مردان حق! وہ عربی شہسوار حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں!

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب — ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی — خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال — اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

دیدہ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں — آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے — عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں!
دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں
حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذت تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!
دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب — لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!
سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت — کشتی دل کے لئے سیل ہے عہد شباب!
آب روان کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روح امم کی حیات کشمکش انقلاب!
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر!

معنی: **حادثات:** حادثہ کی جمع یعنی پیدا ہونے اور مرنے والی چیزیں۔ **صیرفی:** صراف۔ پرکھنے والا۔ **تقویم:** جنتری' کلینڈر۔ وہ کتاب جس میں سال بھر کی تاریخوں وغیرہ کا نقشہ درج ہو۔ **عصر رواں:** وہ زمانہ جو جاری ہے۔ **پیکر گل:** مٹی کا جسم یعنی انسان۔ **صہبائے خام:** وہ شراب جس میں کوئی چیز نہ ملائی گئی ہو اور بالکل خالص ہو۔ **کاس الکرام:** کاس معنی پیالہ۔ کرام بمعنے سخی کریم کاس الکرام سے اہل کرم کا وہ پیالہ مراد ہے جس سے دوسروں کو بھی حصہ ملے۔ **جنود:** جند کی جمع۔ فوجیں۔ لشکر۔ **ابن السبیل:** مسافر۔ **رفت و بود:** لفظی معنی گیا اور تھا یعنی فنا۔ **چنگ:** ایک قسم کا باجا جو منہ سے بجایا جاتا ہے۔ **کشود:** کھلنا۔ **کف خاک:** خاک کی مٹھی یعنی انسان۔ **سپرد کبود:** نیلا آسمان۔ **پیکر نوری:** نورانی وجود یعنی فرشتے اور قدوسی۔

علامہ اقبال کی شاعری کے بیشتر حصے میں مسلم عہد کے سپین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس عہد میں مسلمانوں کے عروج و زوال سے بری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ 1934ء میں تیسری گول میز کانفرنس

میں شرکت کے لئے یورپ گئے تو بعد میں ہسپانیہ کا دورہ بھی کیا اور اموی عہد کے آثار قدیم بھی دیکھے۔" دعا" کی طرح زیر شرح نظم بھی انہوں نے ہسپانیہ ہی میں لکھی۔ مسلمانوں کے عہد میں ہسپانیہ نے ہر شعبہ زندگی میں جو ترقی کی وہ محض اب تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ بے شمار محلات، مساجد، درسگاہیں اور دوسری شاندار عمارتیں جو اس عہد میں تعمیر ہوئیں مسلمان حکمرانوں کے زوال کے بعد عیسائیوں کی بربریت اور تشدد کا شکار ہو گئیں۔ لے دے کے محض مسجد قرطبہ باقی رہی ہے جس کو عیسائیوں نے گرجے میں تبدیل کر لیا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مطابق مسجد قرطبہ دنیا کی عظیم الشان اور نادر روزگار عبادت گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس مسجد کی بنیاد ہسپانیہ میں اموی سلطنت کے بانی عبدالرحمٰن اول نے رکھی تھی۔ بعد میں متعدد حکمرانوں نے اس میں قابل قدر اضافے کیے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد قرطبہ کا عرض چار سو چالیس فٹ اور طول چھ سو بیس فٹ تھا۔ اس میں ایک ہزار چار سو سترہ ستون تھے جو اس قدر مجلا اور تابدار تھے کہ ان میں انسانی عکس نظر آتا تھا۔ دیواروں میں اکیس دروازے تھے جن پر پیتل منڈھا ہوا تھا۔ ان پر بے حد خوبصورت ملمع کاری کی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں کسی مسجد کا حصہ اتنا بڑا اور وسیع نہیں ہے۔

مسجد میں روشنی کے لئے دو سو اسی بلوریں جھاڑ آویزاں تھے۔ سب سے بڑی اور مرکزی جھاڑ میں ہر وقت چودہ سو موم بتیاں جلتی رہتی تھیں۔ دیواروں میں کم و بیش سات ہزار چار سو پچیس پیالے آویزاں تھے و تیل بتی سے روشن رہتے تھے۔ اذان کے لئے جو مینار تعمیر کیا گیا تھا ایک سو ساٹھ فٹ بلند تھا۔ اس کی چوٹی پر سونے اور چاندی کے سیب نما گولے نصب تھے جو سورج کی شعاعوں کی بدولت میلوں دور سے چمکتے تھے۔ شاہی خانوادے کے لئے جو حصہ مسجد میں مخصوص تھا اس کے دروازوں پر سونے چاندی کا منقش کام تھا اور تمام ستون لاجورد کے تھے۔ مسجد کا نادر روزگار منبر ہاتھی دانت، آبنوس اور صندل کے کم و بیش چھتیس ہزار ٹکڑوں سے تیار کیا گیا تھا اور سنہری کیلوں سے جوڑا گیا تھا۔ اس عجوبہ روزگار مسجد کی تکمیل میں کم و بیش سات سال لگے تھے۔ بہت سے جید علماء نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی۔ اقبال نے اگرچہ صدیوں کے بعد اس مسجد کو دیکھا لیکن ان کے ذہن پر جو نقوش مرتسم ہوئے اس کا اندازہ اس نظم سے کیا جا سکتا ہے۔

"مسجد قرطبہ" علامہ اقبال کی نسبتاً طویل نظموں میں سے ایک نظم ہے جو آٹھ بند پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا اشارتاً ذکر کرتے ہوئے مسجد قرطبہ سمیت ان عظیم الشان تعمیرات کے شکستہ آثار کے بارے میں انتہائی کرب کا اظہار کیا ہے۔ متذکرہ عمارات مسلمان سلاطین کے عہد میں تعمیر کی گئیں تھیں۔ بعد میں ان کے زوال کے بعد جو نامساعد حالات پیش آئے یہ آثار قدیم ان کی منہ بولتی تصویر ہیں چنانچہ نظم کے اولیں بند کا آغاز علامہ اس طرح کرتے ہیں۔

*

(1) روز و شب کی داستان عہد کے حوالے سے یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ اس میں فنا و بقا کے بنیادی سلسلے کے حوالے سے ہی صورت حال کی تفہیم ممکن ہے۔ یعنی دن اور رات کے عرصے میں کتنے ہی بچے جنم لیتے ہیں اور کتنے ہی لوگ وفات پا جاتے ہیں۔ یہی عمل قدرت کے نظام کا حقیقی روپ ہے چنانچہ اس

پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارے روز و شب یعنی زمانہ ہی زندگی اور موت کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔

(2) یہ شعر بھی عملاً پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رات اور دن کی شناخت ریشم کے دو متضاد رنگوں میں علامتوں سے ممکن ہے۔ ریشم کے ان متضاد رنگ کے تاروں میں سیاہ رنگ رات کا مظہر ہے جب کہ سفید رنگ دن کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کو ذات خداوندی اور اس کی صفات سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود تو نظر نہیں آتا لیکن بعض اشیا میں اس کے پرتو کی جھلک ملتی ہے۔ ان اشیاء میں ذات باری کی صفات جزوی طور پر نمایاں ہوتی ہیں۔ یہ تصورات اور علامتیں زمانے کے وجود سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

(3) کائنات کے آغاز کے ساتھ ہی زمانے کی تخلیق ممکن ہوئی ہے جس سے باری تعالیٰ کا مقصد انسان کو اس اتار چڑھاؤ سے آگاہ کرنا تھا جو اس راہ میں موجود ہوتے ہیں۔ اس شعر میں بھی علامہ نے زمانے کو "ساز ازل کی فغاں" سے تعبیر کیا ہے کہ ساز کی طرح زمانے میں بھی اتار چڑھاؤ کا عمل جاری رہتا ہے جس کے ذریعہ قدرت متوقع امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ انسان ان حوالوں کی روشنی میں حقیقت کو پا سکے!

(4) زمانہ ہر شے کا احتساب ہی نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی کسوٹی کے مانند ہے جو نیک و بد کی تمیز پیدا کرتی ہے اور کھرے کھوٹے کو الگ کر دیتی ہے۔ یہ احتسابی عمل اور کسوٹی ایسی حقیقتیں ہیں جو خواہ سب ہوں یا اور کوئی سب کے لئے ہیں اور کوئی اس سے ماورا نہیں ہے۔

(5) کمزور اور بے حقیقت انسان کو خواہ وہ کوئی بھی ہو زمانہ مٹا کر رکھ دیتا ہے اس کا مقدر موت کے سوا اور کچھ نہیں مراد یہ کہ وقت و استحکام زندگی کی دلیل ہیں جب کہ انتشار اور کمزوری موت کی علامتیں ہیں۔

(6) اس سارے پس منظر اور صورت حال کے باوجود شب و روز کی حقیقت زمانے کی ایک رو کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ ایسی رو ہے جس میں دن اور رات کا تصور باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں دن اور رات کے مابین تمیز بالکل بے حقیقت شے ہے۔

(7) ہر چند کہ اس دنیا میں انسان کی ہنرمندی بے پناہ ترقی کی حامل ہے لیکن یہ ترقی عارضی ہے اور اس میں کوئی شے پائیدار نہیں ہے اور حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جہان کو ثبات نہیں۔

(8) ان تمام اشعار کے پس منظر میں اقبال یہ کہتے ہیں کہ اس جہان کا اول و آخر غرض ہر شے کا مقصد فنا کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ شعر عملاً قرآن پاک کی اس آیت کی تعبیر ہے۔

کل نفس ذائقة الموت یعنی ہر ذی روح نے موت کا مزا ضرور چکھنا ہے یعنی کہ موت ہر شے کا مقدر ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آغاز ہو یا انجام ظاہر ہو یا باطن! کوئی تخلیق نئی ہو یا پرانی! بالآخر اس کی منزل فنا کے سوا اور کچھ نہیں!

دوسرا بند

(1) پہلے بند کے اشعار کے بعد اقبال زندگی اور موت کے مسئلے کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں کہ

اس حقیقت کے باوجود کو ہر شے فنا ہونے والی ہے تاہم اگر ایک مرد حق پرست نے کسی نقش کی تکمیل کی ہو تو اس میں پائیداری اور استحکام کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرد حق پرست کا ہر عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔

(2) اور جو مرد حق پرست ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل جیسا کہ پہلے شعر میں کہا گیا ہے رضائے الٰہی اور عشق حقیقی کے دم سے ہی پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اس لئے کہ عشق حقیقی تو زندگی کا وہ جوہر ہے جو موت کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ موت اس پر حرام ہوتی ہے اور یہ جذبہ عملاً زندگی کی حقیقت اور روح ہے۔

(3) ہر چند کہ زمانے کی رو انتہائی تند و تیز ہے جس کے سامنے کوئی شے ٹھہر نہیں سکتی لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عشق تو خود ایک تند و تیز سیلاب کے مانند ہوتا ہے جو ہر زمانے کے مقابل سیلاب کو روکنے کی صلاحیت کا حامل ہے یعنی عشق کا جذبہ ہر حال میں بالا دست رہتا ہے۔

(4) عشق کا جذبہ اپنے دامن میں اتنی وسعت ہے جو زمانی سطح پر عصر موجود ہی نہیں ایسے زمانوں پر بھی محیط ہے جن کو بادی النظر میں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور یہ زمانے رات اور دن تک محدود نہیں!

(5) اس شعر میں اقبال اپنے مخصوص انداز میں عشق حقیقی کو مختلف زاویوں اور کرداروں کے حوالے سے دیکھتے ہوئے اس کی ہمہ گیر جہتوں کو حضرت جبرئیل امیں، حضور سرورِ کائنات کے علاوہ پیغمبروں اور کتاب خدا کے حوالوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق حقیقی محض ایک پاکیزہ جذبہ ہی نہیں بلکہ اس کی کسی فرشتے تک رسائی ہو تو جبرئیل امیں کی سانس اور آواز بن جاتا ہے، پیغمبر تک پہنچ ہو تو حضرت محمد مصطفیٰ کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس کا انتہائے عروج یہ ہے کہ کبھی خدا کا رسول اور کبھی اس کے کلام کا مظہر بن جاتا ہے۔

(6) عشق حقیقی کی توصیف میں اقبال اس سطح تک آ جاتے ہیں کہ ایک پھول یا پھول سے نازک بدن میں جو تازگی، شگفتگی اور رخشندگی ہے وہ بھی اسی جذبے کا ایک پرتو ہے۔ اس کے علاوہ عشق حقیقی تو خالص شراب کی مانند ہے جس کی مستی اور نشہ انتہائی تند و تیز ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ عشق اہل کرم کا عطا کردہ ایسا کاسہ ہے جس سے ہر ضرورت مند فیض یاب ہو سکتا ہے۔

(7) آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں کہ عشق تو حرم کعبہ کا وہ جید اور پاکباز عالم ہے جو انتہائی خلوص و دیانتداری کے ساتھ ضرورت مندوں کو فقہ اور شریعت کے نکتے سمجھاتا ہے اور میدان حرب میں جہاد کرنے والے عساکر کے لئے سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ غرض حقیقت یہ ہے کہ حقیقی عشق کے ظہور کی لاتعداد شکلیں ہیں۔ وہ تو ایسا مسافر ہے جس کے ایسے ہزاروں مقام ہیں جن کا شمار ممکنات سے نہیں! عشق حقیقی کی ایک شکل بقول اقبال یہ بھی ہے کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی!

(8) اگر زندگی کو ایک ساز تصور کر لیا جائے تو عشق حقیقی کا جذبہ اس ساز کے لئے ایک مضراب کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر ساز کا وجود ایک ناکارہ شے ہے اسی طرح اگر یہ جذبہ زندگی کو منور کرتا ہے تو اس میں جوش و خروش بھی پیدا کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق حقیقی عملاً حیات انسانی کو عملی جدوجہد کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے اور اسی کے سبب زندگی میں جلالی و جمالی شان پیدا ہوتی ہیں۔

تیسرا بند

(1) سابقہ دو بند علامہ نے اس نظم میں تمہید اور پس منظر کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ زیر تشریح بند میں وہ اپنے موضوع کی جانب آتے ہوئے "مسجد قرطبہ کو مخاطب کرتے ہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ یہاں بھی انہوں نے سابقہ دونوں بند کے مندرجات اور نقطہ نظر سے بڑی کامیابی سے تسلسل قائم رکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے مسجد قرطبہ! یہ عشق حقیقی کا جذبہ ہی تھا جس کے سبب تیری تعمیر ممکن ہوئی اور عشق تو وہ جذبہ ہے جو ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔ فنا اس کی تقدیر میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں کے نامساعد حالات اور آفات کے باوجود تیرا وجود ابھی تک برقرار رہے۔

(2) اے مسجد قرطبہ! تیرے وجود میں مصوری، فن تعمیر اور اسی نوعیت کے فنون اور ہنر جس مہارت اور چابکدستی سے ہم آہنگ ہوئے ہیں وہ اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ جب تک تخلیق کے لئے خون جگر صرف نہ کیا جائے کوئی فن معجزے کی شکل اختیار نہیں کرتا۔

(3) اور وہ معجزہ خون جگر صرف کرنے سے ہی نمودار ہوتا ہے کہ حقیقی فنکار پتھر کو بھی تراشے تو اس میں جان ڈال دیتا ہے اور یہی کیفیت اس کے قول و الفاظ میں ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اے مسجد قرطبہ! تیری تعمیر کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

(4) اے مسجد قرطبہ! تیرا ماحول پر کشش اور دل میں عبادت حق تعالیٰ کی تڑپ پیدا کرنے والا ہے جب کہ میرے اشعار سے سینوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ تیری زیارت دیکھنے والوں کو قربت الٰہی کا احساس دلاتی ہے جب کہ میرا کلام لطافت اور بیداری کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

(5) ایسے فنکارانہ معجزے دیکھنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کا سینہ عرش معلیٰ سے کم نہیں ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے جسم خاکی کی بدولت آسمان تو کیا خلاء کو بھی چھونے کی صلاحیت نہیں رکھتا پھر بھی اسے فرشتوں سے برتر قرار دیا گیا ہے۔

(6) بے شک فرشتوں کی تخلیق حق تعالیٰ نے نور سے کی ہے اور انہیں یہ بھی شرف حاصل ہے کہ وہ ہر لمحے معبود حقیقی کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں تاہم انسان کا مرتبہ فرشتوں اور قدسیوں سے اس لئے زیادہ بلند ہے کہ اس کا دل سوز و گداز اور عشق حقیقی کے جذبے سے مالامال ہوتا ہے۔

(7) ہرچند کہ مجھے ہند کا رہنے والا کافر تصور کیا جاتا ہے لیکن اے "مسجد قرطبہ" تو نے میرے ذوق و شوق کا نظارہ یقیناً کر لیا ہو گا کہ دل سے بھی صلوٰۃ و درود کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور میرے لبوں پر بھی صلوٰۃ و درود کا نغمہ ہے۔

(8) یہ شوق جو عشق حقیقی سے عبارت ہے اس امر کا گواہ ہے کہ میرا لب و لہجہ بھی اسی جذبے سے لبریز ہے اور میرے نغموں میں بھی اسی کا لحن شامل ہے۔ غرض کہ میرے جسم کا ریشہ ریشہ "اللہ ہو" کے نعروں سے سرشار ہے!

چوتھا بند

معنی: **نخیل**: کھجور کا درخت۔ **دجلہ**: عراق کا مشہور دریا جس کے کنارے بغداد واقع ہے۔ **ڈینیوب**: وسطی یورپ کا مشہور دریا۔ **ثغور**: ثغر کی جمع سرحدیں۔ **رحیل**: کوچ۔ **فارس**: شہسوار۔ **رحیق**: خالص اور صاف شراب۔ **ڈینیوب**: جو جنوبی جرمنی سے نکلتا ہے۔ آسٹریا، ہنگری، پورٹ اور رومانیہ میں گزرتا ہے یورپ کے بعض مشہور شہر مثلاً ویانا۔ بوڈاپسٹ اسی کے کنارے واقع ہیں۔

(1) اقبال گذشتہ اشعار کے پس منظر کے حوالے سے اس بند کے اشعار میں انہوں نے براہ راست "مسجد قرطبہ" تجھ میں بھی وہی جمال و جلال موجود ہے جو معبود حقیقی کے نزدیک ایک پسندیدہ 'نڈر' بے باک اور سالک شخص میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح وہ شان و شوکت والا اور صاحب حسن و جمال ہوتا ہے تیرے پیکر میں بھی یہی خصوصیات موجود ہیں۔

(2) اے مسجد قرطبہ! تیری بنیادیں مستحکم ہیں اور تیرے ستونوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ یہ ستون اس طرح سے ایستادہ ہیں جیسے کہ صحرائے شام میں کھجوروں کے درخت کھڑے ہوں۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود وہ اسی طرح قائم و دائم ہے۔ یہ ان ماہرین تعمیرات کا کمال ہے جنہوں نے تیری نادر روزگار عمارت کی تکمیل میں اپنی تمام تر فنی صلاحیتوں اور مہارت سے کام لیا۔

(3) نظم کے آغاز سے قبل انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے مسجد قرطبہ کے بارے میں ایک اجمالی صورت حال اور "مسجد قرطبہ" کی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کی تکنیکی اور فنی مہارت کے بارے میں کچھ باتیں بتائی گئی ہیں۔ زیر تشریح بند کے اس شعر میں بھی مسجد سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ تیرے دروازوں اور چھتوں پر وادی سینا میں جو نور چمکا تھا یہاں بھی وہ اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور تیرا وہ بلند و بالا مینار جو اذان کے لئے وقف تھا اس پر حضرت جبرئیلؑ سایہ فگن ہیں۔

(4) اقبال اس شعر میں ایک نئے جذبے اور جوش کے ساتھ اعلان کرتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کتنے ہی مراحل سے گزرے اسے کوئی طوفان فنا نہیں کر سکتا اس لئے کہ اس کے جاں نثاروں نے تو اپنی اذانوں کے ذریعے ان رازوں کو بے نقاب کر دیا تھا جن کا تعلق حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ اور حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبروں سے تھا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کو سمجھا اور اسے عالمی سطح پر وسعت دینے میں بے حد کار نمایاں انجام دیئے!

(5) مسلمانوں میں اپنے عہد اقتدار میں اپنی زیر نگیں سلطنت کو جو وسعت دی اس کی حدود کا تعین مشکل ہے۔ حتیٰ کہ اس کا افق بھی اس نوع کی حد بندیوں سے آزاد ہے اور دجلہ 'ڈینیوب اور نیل جیسے دریا تو اس کے سمندر کی لہریں ہیں مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے وطن کی کوئی حدود نہیں بلکہ دیکھا جائے تو زمین کا ہر گوشہ ہر خطہ اس کا وطن ہے۔

(6) ماضی میں بھی یہ ملت اسلامیہ کے جیالے ہی تھے جنہوں نے نامساعد حالات کے پیش نظر عہد کو کوچ کرنے کا عملی پیغام دیا۔ اس عہد کے حوالے سے مسلمانوں کی عظمت و کارکردگی کے افسانے زباں زد خلق ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اہل ذوق کی رہنمائی کی اور بڑے خلوص و محبت کے ساتھ انہیں منزل آشنا کیا۔ ان کے قول و فعل میں کسی قسم کے تضاد کی گنجائش نہ تھی بلکہ تلوار کی مانند ان کے لہجے میں بھی

کاٹ تھی!

(7) اپنے عزم و عمل کے سبب مسلماں ایسے جاں نثار مرد میدان ہیں جن کا جنگی ساز و سامان بھی کلمہ توحید سے عبارت ہے اور جب دشمنوں کے لشکر ان کے مقابل تلوار اٹھاتے ہیں تو یہی کلمہ توحید ان کی سپر بن جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ سچا مسلمان خواہ امن ہو یا حالت جنگ وہ کلمہ توحید کو ہی اپنا کل ایمان تصور کرتے ہیں۔

پانچواں بند

معنی: نوری نہاد: جس کی طرف نوری ہو۔

(1) اے مسجد قرطبہ! تیری نادر روزگار تعمیر اور اس کی ہیئت و عظمت ان خاصان خدا کی صلاحیتوں اور جذبہ ایمانی کا اظہار بھی ہوتا جو تیری تعمیر و تکمیل کا سبب بنے۔ اس منصوبے میں ان کی شب و روز کی محنت شاقہ اور اس سے لگن کے عمل کا دخل موجود ہے۔

(2) تیری عظمت سے انہی صاحب ایمان و یقین کے بلند مراتب کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیالات کتنے بلند تھے۔ مزید یہ کہ تیرے وجود سے اس امر کا پتہ بھی چلتا ہے کہ متعلقہ افراد میں ذوق و شوق کی پاکیزگی اور لطافت کا معیار کیا تھا؟ وہ تیرے وسیع صحن میں سجدہ نیاز کے متمنی بھی تھے اور اس نیازمندی میں نیاز کی شان بھی موجود تھی۔

(3) اے مسجد قرطبہ! یہی وہ صاحب ایمان و یقین لوگ تھے جو رضائے خدا کے بغیر اپنی مرضی سے کوئی کام نہ کرتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عمل کے عوض کہ ان کی مرضی بھی رضائے خدا میں ڈھل جاتی ہے ان کا کوئی عمل ذاتی اغراض سے وابستہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ خدائے عزوجل نے ان میں وہ صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں جن کے سبب وہ اپنے حریفوں پر غالب ہو جاتے ہیں۔ حاجت مندوں کی مشکلات کو رفع کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی حسن عمل کی راہ دکھاتے ہیں۔ بے شک ایسے ہی لوگ تھے جن کے ذہنوں میں تیری تعمیر کا جذبہ پیدا ہوا اور انتہائی جدوجہد اور اپنی قوت عمل سے انہوں نے اس جذبے کو عملی جامہ پہنایا۔

(4) مذکورہ قسم کے لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ان کی تخلیق ہر چند کہ مٹی سے ہوئی ہے لیکن ان میں فرشتوں کے اوصاف در آئے ہیں اور ان کے دل نور خدا سے تابندہ رہتے ہیں۔ ان کے اندر اپنے آقا و مولا کی سی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن کے سبب ان کے دل دونوں جہانوں کی نعمتوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا اور کسی کے بارے میں نہیں سوچتے!

(5) ایسے صاحب ایمان لوگوں کے دلوں میں دنیاوی خواہشات کے لئے کم سے کم گنجائش ہوتی ہے جب کہ ان کے مقاصد بہت بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی بجائے دوسروں کی بہتری کے لئے عملی اقدام کرتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ انتہائی محبت والا اور نرم ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کی خوبصورت اور روایتی طور پر دلفریب آنکھوں میں ایک دل نواز چمک ہوتی ہے اسی طرح ان کی

نگاہوں میں بھی یہی کیفیت محسوس کی جا سکتی ہے۔

(6) یہ صاحب ایمان و یقین جب کسی سے مکالمہ کرتے ہیں تو ان کا لہجہ انتہائی نرم اور شفقت و محبت کا مظہر ہوتا ہے جب کہ تلاش حق میں انتہائی طور پر سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں کوئی میدان جنگ ہو یا نجی محفل ہر دو مقامات پر وہ پاک دلی اور پاک طینتی سے کام لیتے ہیں۔

(7) اقبال کے نزدیک اہل ایمان کے نزدیک خدائے برتر کا وجود ہی مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے یعنی ذات باری کا عرفان ہی سب کچھ ہے اس کے برعکس یہ جو عالم رنگ و بو ہے وہ وہم' سحر اور ناپائیداری کا مظہر ہے۔ مراد یہ کہ صاحب ایمان لوگوں کا خدا کی ذات پر یقین ہی پائیداری کی علامت ہے۔

(8) اس ضمن میں آخری بات تو یہ ہے کہ یہی صاحب ایمان لوگ فی الواقع عقل سلیم کا سرچشمہ ہیں اور عشق حقیقی کا حامل بھی انہی کا جذبہ ہے۔ چنانچہ کائنات میں جو رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے فی الواقع انہی کے دم سے ہے۔

چھٹا بند

معنی: دین مبین: روشن یعنی اسلام۔ **حرم مرتبت**: لفظی معنی کے ہم رتبہ۔ مراد ہے انتہائی عزت و حرمت والی۔ **اندلسی**: اندلس کے رہنے والے۔ اندلس واندالوشیا کا عربی تلفظ ہے یہ ہسپانیہ کے ایک صوبے کا نام ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں یہ لفظ پورے اسلامی ہسپانیہ کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ **خلق عظیم**: اقبال نے ان دو لفظوں کو واوین میں لکھا ہے۔ گویا اس آیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ انک لعلی خلق عظیم (یعنی اے رسولؐ: آپؐ پیدا ہوئے ہیں بڑے خلق پر) اس آیت میں حضرت رسولؐ کے اخلاق حسنہ کا ذکر ہے جو اس کائنات میں اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ اقبال سے مراد یہ ہے کہ اندلس کے مسلمان پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے۔ جو رسولؐ اللہ لے کر دنیا میں آئے۔ **رمز غریب**: نادر بھید۔ عجیب نکتہ۔ **شرق و غرب**: مشرق اور مغرب یعنی ساری دنیا۔ **گرم اختلاط**: میل جول میں پرتپاک۔

(1) اے مسجد قرطبہ! تیری سطوت و شان کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہو گا کہ ماہرین فن کے نزدیک تیری حیثیت حرم کعبہ سے کم نہیں! تو ہی ہے جس سے ملت اسلامیہ کی شان و شوکت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اندلس کی سرزمین کو بھی تیرے سبب دوسروں کے لئے انتہائی عزت و احترام کی حقدار بن گئی ہے۔

(2) اس آسمان کے تلے' زمیں پر تیری خوبصورت اور باکمال تعمیر کی دوسری مثال تلاش کی جائے تو اس کا ملنا خارج از امکانات ہے۔ ہاں اگر کہیں اس کا وجود ممکن ہے تو وہ تیرے معمار مسلمانوں کے دلوں میں ہی ہو سکتا ہے کہ یہی لوگ تیری عظمت و احترام کا ادراک رکھتے تھے۔

(3) اور یہ لوگ کون تھے! بعد کے اشعار میں اقبال ان مسلم حکمرانوں کے اوصاف بیان کرتے ہیں جن کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ وہ عربی شہسوار اور مردان حق جو اپنے جملہ کارناموں کی بدولت ہسپانیہ میں اپنے عہد کو مثالی بنا گئے۔ انتہائی خلیق ہونے کے ساتھ پاکیزگی اور سچائی پر یقین رکھتے تھے۔ اور اپنی راستبازی کے طفیل اعلیٰ مراتب حاصل کر سکے۔

(4) یہی وہ مردان حق تھے جن کی حکومت کے ادوار میں یہ راز کھلا کہ اہل دل کی سلطنت توفی الواقع بادشاہی نہیں بلکہ فقر اور درویشی ہے۔ یہی پیغام حضور سرورِ دو عالم نے دنیا کو دیا تھا۔
(5) یہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے بلند کردار اور سیرت کے پس منظر میں مشرق و مغرب میں مقیم باشندوں کی تربیت کی یہی نہیں بلکہ اپنی دانش سے انہوں نے یورپ کو جہل و تعصب کی تاریکیوں سے نجات دلائی اور ہر طرح ان کی رہنمائی کی۔
(6) یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اندلس کو اپنے علم و اخلاق سے آراستہ کیا اور آج بھی وہاں کے لوگ یہ سبق نہیں بھولے ہیں۔
(7) اندلس میں عربی خون کی آمیزش سے آج بھی حسن و جمال عام ہے اور آج بھی محبت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔
(8) جو عرب ابتداء میں اندلس میں آکر آباد ہوئے ان میں سے اکثریت کا تعلق یمن سے تھا چنانچہ یمن کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کے اثرات نے اندلس کے مقامی باشندوں کو پوری طرح متاثر کیا۔

ساتواں بند

معنی: المنی: جرمنی۔ **اصلاح دین:** مراد ریفریشن (Reformation) سے یعنی مذہبی اصلاح کی وہ تحریک جو مارٹن لوتھر باشندہ جرمنی نے یورپ کے خلاف اٹھائی۔ جس کی بنا پر عیسائیت دو بڑے حصوں میں بٹ گئی۔ **پیر کنشت:** لفظی معنی کلیسا کا سب سے بڑا بزرگ یعنی پوپ۔ **انقلاب فرانس:** یہ انقلاب فرانس کی شہنشاہی کے خلاف تھا۔ **ملت رومی نژاد:** مراد ہے اہل اٹلی سے۔ **لذت تجدید:** لفظی معنی تازہ کرنے کی لذت۔ **گنبد نیلو فری:** آسمان۔
(1) ہر چند کہ اے مسجد قرطبہ! ستارے بھی تیری سرزمین کو آسمان سے کم تر نہیں سمجھتے یعنی تیرا رتبہ بے شک بہت بلند ہے اس کے باوجود اس سے بڑا المیہ یہاں اور کیا ہو سکتا ہے کہ صدیوں سے کسی نے تیرے بلند و بالا مینار سے اذان کی آواز نہیں سنی!
(2) اب تو مردان حق پرست اور جاں نثاروں کے اس قافلے کا انتظار ہے کہ یہاں پہنچ کر اے مسجد! تیرے وسیع صحن میں سجدہ ریز ہونے سے قبل اللہ اکبر کا آوازہ بلند کرے گا۔
(3) پچھلی چند صدیوں میں مختلف یورپی ممالک میں مذہب اور معاشرے کے حوالے سے کئی تحریکیں اٹھیں۔ اقبال نے اس بند کے اس شعر اور باقی اشعار میں ان تحریکوں کے حوالے سے اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ زیر تشریح اس شعر میں انہوں نے جرمنی میں مارٹن لوتھر کی مشہور تحریک "اصلاح دین" کا ذکر کیا ہے۔ جس کے باعث عیسائیت دو دھڑوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں بٹ گئی۔ کیتھولک پوپ کے ماننے والے تھے جب کہ پروٹسٹنٹ مارٹن لوتھر کے پیرو قرار دیے گئے۔ لوتھر نے یہ دعویٰ کیا کہ نہ پوپ معصوم ہے نا ہی وہ کسی کے گناہ بخشنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ اصلاح دین کی تحریک نے یورپ میں عیسائیت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔
(4) اس شعر کا موضوع بھی اس سے پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پوپ کی جس

معصومیت کا ایک عرصے سے ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا وہ حرف غلط ثابت ہو کر رہ گئی۔ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح دین نے اسے کافی نقصان پہنچایا اور عیسائیت کا بنیادی تصور بھی متزلزل ہو کر رہ گیا۔ آزادی فکر کا رد عمل بھی یورپ کو کوئی مثبت تہذیبی ڈھانچہ فراہم نہ کر سکا۔

(5) اس کے ساتھ ہی فرانس میں جو انقلاب آیا اس نے تو مغربی تہذیب اور مغربی معاشرے کے ضمن میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس انقلاب کے اثرات بھی عیسائیت کے خلاف مرتب ہوئے۔

(6) لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اطالوی تہذیب اور معاشرہ جو رجعت پسندی اور قدامت کے آخری مرحلے پر تھے وہ ان تبدیلیوں سے ضرور متاثر ہوئے اور ان کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔

(7) اور تو اور مسلم معاشرے میں بھی تبدیلی اور ارتقاء کی خواہشوں نے بڑی تیزی کے ساتھ جنم لینا شروع کر دیا ہے اور یہاں ایک اضطراب کی لہریں دوڑ رہی ہیں اور طوفان کے آثار ہویدا ہیں دیکھنا یہ ہے کہ اس صورتحال میں اس سمندر کی تہہ سے اچھل کر کیا نکلتا ہے۔ اور یہ نیلگوں آسماں کیا رنگ بدلے گا؟ اس شعر میں اقبال کا کہنا یہ ہے کہ یورپ کی طرح عالم اسلام بھی ان بین الاقوامی تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا ہے تاہم یہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں اگر تبدیلیوں کو قبول کیا گیا تو اس کی نوعیت کیا ہو گی۔

آٹھواں بند

معنی: آب روان کبیر: وادی الکبیر اندلس کا مشہور دریا۔ امم: امت کی جمع یعنی قومیں۔

(1) اس بند کے ابتدائی اشعار میں اقبال نے مسجد قرطبہ کے گردوپیش جو مناظر ہیں۔ ان کو اپنے مخصوص انداز میں نظم کرتے ہوئے بعد کے اشعار میں اپنی فکر کے حوالے سے صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ اولین شعر میں انہوں نے وادی کہسار میں غروب آفتاب کا نظارہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس لمحے تو بادل بھی شفق کے رنگ میں غرق ہو چکے ہیں۔ یوں لگتا ہے ڈوبتا سورج اس مقام پر غروب ہوتے ہوئے لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا ہے مراد یہ ہے کہ وادی کوہ میں موجود سنگریزوں پر شفق کی سرخی جس طرح پڑ رہی ہے اس کے سبب یہ سنگریزے لعل بدخشاں دکھائی دیتے ہیں۔

(2) اس منظر نامے میں کسان کی ایک بیٹی سادہ لیکن پر سوز لے میں اس طرح گیت گا رہی ہے کہ جس سے یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ ایک دوشیزہ کے دل کو اگر کشتی سے تعبیر کر لیا جائے تو شباب کا زمانہ ایک طوفان کے مانند ہو گا۔ اقبال نے بڑی خوبصورت علاقوں کے حوالے سے مذکورہ بالا منظر نامہ میں موجود ایک گاتی ہوئی دوشیزہ کے کردار کو واضح کیا ہے۔

(3) سابقہ دو اشعار کے بعد اس شعر میں اقبال ایک نیا رخ بدلتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اندلس کے مشہور دریا وادالکبیر کے کنارے پر بیٹھا کسی اور زمانے کے بارے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ واضح رہے کہ یہ زمانہ ماضی بھی ہو سکتا ہے جب ہسپانیہ میں سلطنت اسلامیہ عروج پر تھی اور آنے والا دور بھی ہو سکتا ہے جو یورپ میں رونما ہونے والے انقلاب اور تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دریائے کبیر کے کنارے پر ہی مسجد قرطبہ واقع ہے۔

(4) ہر چند کہ آنے والا نیا دور ابھی تک پردہ تقدیر میں پوشیدہ ہے اقبال کہتے ہیں اس کے باوجود میں

اس کی حقیقتیں سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

(5) اس شعر میں اقبال اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یورپ نے جو افکار اپنائے ہیں اگر ان کی حقیقت بیان کردوں تو یورپ کے دانشور شاید اس کو برداشت نہیں کر سکیں گے کہ سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے۔

(6) اس سمیت باقی اشعار میں ایسے نکات بیان کئے گئے ہیں جن کو علامہ کی فکر و دانش کے نچوڑ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ وہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے جس میں انقلاب اور تغیر و تبدل کی صلاحیت نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ انقلابی جدوجہد کو بین الاقوامی سطح پر زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح ایک مقام پر ٹھہرا ہوا پانی کچھ عرصے کے بعد سڑاند دینے لگتا ہے یہی حال ایک قوم کا ہے کہ اگر اس میں عملی جدوجہد کا جذبہ موجود ہو تو وہ عروج سے ہم کنار نہیں ہو سکتی اس مقصد کے لئے تو زندگی میں انقلابی عمل درکار ہوتا ہے۔

(7) وہ قوم جو اپنی جدوجہد اور عمل کے دائرہ کار میں خود احتسابی کو روا رکھتی ہے تو اسے اپنی خامیوں اور خوبیوں کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنی خامیوں کو دور کر لیتی ہے اور خوبیوں میں اضافے کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس کی حیثیت تو ایک ایسی تلوار کی مانند ہے جس سے قدرت کام لینے کی خواہاں ہو۔

(8) اور اس ضمن میں حرف آخر یہ ہے کہ عملی جدوجہد اور خون جگر صرف کئے بغیر تمام نقوش اور کام نامکمل رہتے ہیں حتیٰ کہ شاعری کی تخلیق بھی خون جگر کی شمولیت کے بغیر نیم دیوانگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مراد یہ کہ ہر عمل کے لئے خون جگر بنیادی شرط ہے۔

قید خانہ میں معتمد کی فریاد

معتمد اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک حکمران نے اس کو شکست دے کر قید میں ڈال دیا تھا۔ معتمد کی نظمیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" میں شائع ہو چکی ہیں۔

اک فغان بے شرر سینے میں باقی رہ گئی سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی!
مرد حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج میں پشیماں ہوں پشیماں ہے مری تدبیر بھی!
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی!
جو مری تیغ دو دم تھی اب مری زنجیر ہے شوخ و بے پروا ہے کتنا خالق تقدیر بھی!

معتمد بقول علامہ اقبال اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی زبان کا مشہور شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک حکمران نے اسے شکست دے کر قید میں ڈال دیا۔ اس کی نظمیں انگریزی زبان میں ترجمہ ہو کر "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" (Wisdom of the East Series) میں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر شرح نظم کا ترجمہ بھی اقبال نے انگریزی زبان سے کیا ہے۔ معتمد اور اس کے خانوادے کا تاریخی پس منظر نظم کے اشعار کی تشریح کے بعد پیش کیا جائے گا۔ نظم کے اولین شعر میں کہا گیا ہے کہ

① اقبال کے بقول معتمد نے اپنے اشعار میں کہا کہ میں قید خانے کی چار دیواری میں محبوس ہوں۔ اس

وقت مایوسی اور دل شکستگی کی صورت حال یہ ہے کہ میرا سینہ ہر قسم کے جذبہ مردانگی اور جوش و خروش سے خالی ہو چکا ہے بس لے دے کے ایک فریاد اور باقی رہ گئی ہے۔ جس میں کوئی چنگاری دکھائی نہیں دیتی۔ اور حد تو یہ ہے کہ فریاد میں بھی سوز باقی نہیں رہا اور وہ تاثیر سے بھی محروم ہو گئی ہے۔

② دوسرے شعر میں معتمد کہتے ہیں کہ کس قدر افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ مجھ سا حریت پسند انسان قید خانے کی چہار دیواری میں بند ہے۔ اپنے حریف کے خلاف میں نے جو منصوبہ بندی کی تھی آج اس کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا ہے کہ میں اس غلط منصوبہ بندی کے باعث شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا ہوں۔

③ مجھے میرے دشمن نے جس زنجیر میں جکڑا ہوا ہے اب تو میرا دل بھی اسی زنجیر کی جانب کھنچا جا رہا ہے حالانکہ میں تو ہمیشہ سے صاحب شمشیر رہا ہوں۔ زنجیر سے اس کشش کا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ دونوں ایک ہی فولاد سے تیار کی گئی ہوں۔

④ یہی کشش اس امر کی مظہر ہے۔ میرے ہاتھ میں کبھی جب دو دھاری تلوار ہوتی تھی اب وہ میرے ہاتھ اور پاؤں کی زنجیر میں ڈھل گئی ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ میں جو کبھی صاحب تخت و تاج تھا اور جاں نثاروں کے ایک لشکر کا سالار بھی تھا آج قید خانے کی زنجیروں میں جکڑا پڑا ہے۔ شاید یہ تقدیر کا کھیل ہی ہے تاہم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ خالق تقدیر کس قدر بے پروا اور بے نیاز واقع ہوا ہے۔

ان اشعار کی مختصر تشریح کے بعد معتمد اور اس کی گرفتاری کے پس منظر کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے تو اس سے ان اشعار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ملت اسلامیہ کی تواریخ کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اندلس میں سلاطین بنو امیہ کا زوال ہوا تو یہ سلطنت پارہ پارہ ہو کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان میں سے ایک سلطنت بنو عباس کی تھی جس کا مرکز اشبیلیہ تھا۔ المعتمد علی اللہ اس سلطنت کا سب سے اہم حکمران تھا۔ جس نے مورخین کے مطابق 1068ء سے 1091ء تک حکومت کی۔

معتمد نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کے شعراء اور علماء کی پذیرائی کرتا تھا بلکہ خود بھی انتہائی خوش مذاق شاعر تھا۔ اس زمانے میں ہسپانیہ کی عیسائی حکومتوں نے مذکورہ مسلم ریاستوں پر حملے شروع کر دیئے۔ معتمد میں ایک عیسائی بادشاہ الفانسو کا خراج گزار تھا لیکن اس سے بوجوہ اختلاف کے سبب دونوں ممالک کے مابین جنگ ہوئی جس میں مراکش کے مشہور حکمران یوسف بن تاشفین کی مدد سے معتمد نے الفانسو کو شکست فاش دی۔ عیسائیوں کے حملوں سے نجات پانے کے بعد اندلس کی مسلم حکومتوں کے مابین از سر نو ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ جس کی بنا پر یوسف بن تاشفین نے بالآخر اندلس پر اپنا تسلط جما لیا۔ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ معتمد کو بھی قید خانے میں ڈلوا دیا۔ مندرجہ بالا اشعار اسی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔

عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت

سرزمین اندلس میں

یہ اشعار، جو عبدالرحمٰن اول کی تصنیف سے ہیں تاریخ المقری میں درج ہیں۔ مندرجہ ذیل اردو

نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے۔ (درخت مذکور مدینتہ الزہرا میں بویا گیا تھا)

میری آنکھوں کا نور ہے تو میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں میرے لئے نخلِ طور ہے تو!
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا صحرائے عرب کی حور ہے تو!
پردیس میں ناصبور ہوں میں پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو ساقی تیرا نمِ سحر ہو!
عالم کا عجیب ہے نظارہ دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک پیدا نہیں بحر کا کنارہ!
ہے سوزِ دروں سے زندگانی اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبحِ غربت میں اور چمکا ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے! مومن کا مقام ہر کہیں ہے!

اقبال کے بقول اس نظم کے چھ اشعار عبدالرحمٰن کی تصنیف سے ہیں اور تاریخ المقوی میں درج ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم ان اشعار کے آزاد اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ (درخت مذکورہ مدینتہ الزہرہ میں بویا گیا تھا)۔ نظم دو بندوں پر مشتمل ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ پہلے بند کے اشعار تو عبدالرحمٰن اول کی نظم کے آزاد اردو ترجمے کے طور پر پیش کیے گئے اور دوسرے بند میں خود اقبال کے اپنے تاثرات درج ہیں۔

عبدالرحمٰن اول کے اشعار اور ان کا آزاد ترجمہ بظاہر بالکل سیدھا سادا ہے۔ اس میں کسی تشریح کی گنجائش بھی نہیں ہے تاہم یہ اشعار اور اس کا شاعر اپنے تاریخی اور ثقافتی پس منظر کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ نظم کی تشریح کے بعد یہ تاریخی پس منظر میں پیش کر دیا جائے گا۔

① شاعر نظم کے اولین شعر میں اپنے ہاتھ سے بوئے ہوئے کھجور کے درخت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو میری آنکھوں کی روشنی بھی ہے اور دل کے لئے وجہ مسرت و سکون بھی ہے۔

② مجھے تو جبری طور پر اپنا وطن چھوڑ کر دیارِ غیر میں اپنا مسکن آباد کرنا پڑا یہاں تیرا وجود میرے لئے وہی اہمیت رکھتا ہے جو کوہ طور پر تجلی حق کے سبب وہاں موجود کھجور کے درخت کو حاصل ہوئی۔

③ ہرچند کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے تیرا وجود عرب کے صحرا سے ہی مطابقت رکھتا ہے اور تجھ سے ہی اس صحرا کا حسن برقرار رہے لیکن یہاں اندلس میں مقامی آب و ہوا نے تیری پرورش کی ہے۔

④ اپنا وطن چھوڑ کر میں جس طرح اندلس میں مضطرب اور پریشان ہوں تیری بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

⑤ میری دعا ہے کہ تو پردیس کی اس اجنبی آب و ہوا اور ماحول میں پھلے پھولے اور علی الصبح برسنے والی شبنم تجھے تازہ دم اور ہرا بھرا رکھے۔

دوسرا بند

معنی: شناوری: تیرنا۔ شام: مراد ہے ملک شام سے۔

سطور بالا میں اس امر کی نشاندہی کر دی گئی تھی کہ یہ دوسرا بند پہلے بند کے حوالے سے اقبال کے اپنے تاثرات پر مشتمل ہے۔ عملاً اس نظم کی تخلیق دو شاعروں سے متعلق ہے۔ پہلے بند کے اشعار عبدالرحمٰن اول کی نظم کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی اقبال نے کیا ہے اور دوسرا بند تو خود ان کے تاثرات کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں کہ

① اس عالم فانی کی صورت حال عجیب و غریب ہے کہ جسے دیکھ کر انسان کی آنکھیں چار ہو جاتی ہیں اور وہ پتھر ہو کر رہ جاتا ہے کہ بقول خود اقبال کے!

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

مراد یہ ہے کہ کل جو انتہائی عروج پر تھے آج زوال و پستی سے دوچار ہیں۔ یہ اشعار عبدالرحمٰن اول کی جانب ہے۔ جو ترک وطن پر مجبور ہو کر ایک اجنبی دیس میں آ کر آباد ہوا۔

② اس عالم رنگ و بو کی مثال سمندر کی سی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا اور لامحدود ہوتا ہے۔ یہاں کم ہمتی اور مایوسی کا کوئی دخل نہیں بلکہ انسان کو بلند حوصلگی اور عزم و ہمت کے ساتھ حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

③ یہ زندگی کسی نصب العین کے بغیر کامیابی کے ساتھ بسر نہیں ہو سکتی۔ انسان تو مٹی کا پتلا ہے اور مٹی سے کبھی چنگاریاں پیدا نہیں ہوتیں لیکن اگر اس کے دل میں کچھ کرنے کی لگن اور تڑپ موجود ہو تو پھر اس کا ہر عمل کامیابی و کامرانی سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

④ اس شعر میں علامتی سطح کے باوجود اقبال کا واضح اشارہ عبدالرحمٰن اول کی جانب ہے کہ یہ بلند حوصلگی اور دلی تڑپ کے علاوہ عزم و ارادہ کی برکت ہی تھی کہ اموی شہزادے عبدالرحمٰن کو اپنی مملکت شام سے فرار ہو کر اندلس میں پناہ لینا پڑی لیکن انہی جذبوں کی بدولت یہاں بھی وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا بانی ہوا جس کا نام آج بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ صبح غربت اور شام کے ٹوٹے ستارے سے اقبال نے خوبصورت علامتیں تخلیق کی ہیں۔

⑤ آخری بات یہ کہ جو شخص صاحب ایمان ہے وہ کسی ایک مقام تک محدود نہیں رہتا بلکہ جہاں سکونت اختیار کی وہی اس کا وطن ہے۔

اس نظم کا پس منظر مختصراً یہ ہے کہ شام میں عباسیوں نے اموی سلطنت کو ختم کر کے اس خانوادے کے سرکردہ لوگوں کو چن چن کر قتل کرا دیا۔ اموی خاندان کا شہزادہ عبدالرحمٰن مختصر سے لشکر کے ساتھ فرار ہو کر اندلس پہنچا اور وہاں اموی گورنر کو شکست دے کر ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی۔ قرطبہ کے پاس اس نے ایک باغ لگوا کر وہاں اپنا محل تعمیر کرایا۔ یہیں پر وہ کھجور کا درخت لگوایا جو اس نظم کا محرک ہے۔

ہسپانیہ

(ہسپانیہ کی سرزمین میں لکھے گئے)

(واپس آتے ہوئے)

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی؟
باقی ہے ابھی رنگ مرے خون جگر میں!
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں!
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن
تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں!
دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں!

معنی: کوہ کمر: پہاڑ اور اس کا دامن۔ غرناطہ: اندلس کا مشہور شہر جو قرطبہ کی عظمت مٹ جانے کے بعد ہسپانیہ کے آخری اسلامی حکمران خاندان کا دارالحکومت تھا۔

ہسپانیہ میں مسلمانوں کا عروج و زوال بعض مورخین کی طرح اقبال کے ہاں بھی ان کی شاعری کے حوالے سے انتہائی طور پر قابل توجہ رہا ہے۔ دراصل مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہسپانیہ نے ہر شعبہ زندگی میں جو ترقی کی وہ اس ملک کے لئے عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے جب مسلم حکومتیں زوال پذیر ہوئیں اور یہاں عیسائی حکمرانوں نے تسلط جمایا تو انہوں نے انتقاماً مسلمانوں کی قائم کردہ تہذیب و ثقافت کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں جہاں بھی ہسپانیہ کو موضوع بنایا ہے وہاں وہ ایک طرح کے کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ زیر شرح نظم بھی انہوں نے ہسپانیہ کی سرزمین سے واپس آتے ہوئے لکھی۔ وہ کہتے ہیں۔

① ہسپانیہ وہ سرزمین ہے جہاں صدیوں تک نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کا اقتدار قائم رہا بلکہ وہ وقفے وقفے سے عیسائی حکمرانوں کی یلغار کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس سرزمین کو مسلمانوں نے ہر ممکن جدوجہد اور قربانی سے زندگی کے ہر شعبے میں انتہائی عروج پر پہنچایا۔ ہسپانیہ پر اپنا تسلط برقرار رکھنے اور اس سرزمین کے دفاع میں لاکھوں مسلمانوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ بے شمار مسلم حکمران، سپہ سالار، ادیب، فلسفی، شاعر، معمار، صناع اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اس کی خاک تلے دفن ہیں۔ اس لئے اگر اقبال اس سرزمین کو مسلمانوں کے خون کی امانت دار سمجھتے ہوئے اسے حرم کعبہ کی طرح پاک اور محترم گردانتے ہیں تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کی قربانیوں کے سبب آج بھی ہسپانیہ کی تہذیب و ثقافت ساری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

② اے ہسپانیہ! جب بھی چشم بصیرت سے دیکھا تو یوں لگتا ہے کہ تیری خاک ابھی تک ان سجدوں کے نشان ثبت ہیں جو سات سو سال سے زیادہ عرصے تک یہاں مسلمانوں نے ادا کئے۔ اسی طرح جب یہاں

صبح کی ہوا چلتی ہے تو ان میں ماضی کی اذانوں کی گونج سنائی دیتی ہے اور اس دور کی یاد تازہ کر جاتی ہے۔

③ یہ سجدہ گزار وہی جاں نثار تھے۔ جنگ و جدل کے دوران جن کی تلواریں اور نیزے اس طرح چمکتے تھے جیسے ستارے جگمگا رہے ہوں یہی وہ لوگ تھے جو آرام و آسائش کی پروا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے خیمے پہاڑوں کی چوٹیوں اور ان کے دامن میں نصب ہوتے تھے۔ وہ ہر لمحے حالت جنگ میں ہوتے تھے اس لئے انہیں مستقل ٹھکانوں کی پرواہ نہ تھی۔

④ ہسپانیہ کی سرزمین حال کی طرح ماضی میں بھی حسن و جمال کا سرچشمہ رہی ہے۔ اقبال پیشکش کرتے ہیں کہ ہسپانیہ اگر تیری حسین صورتوں کو اپنے جمال میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے تو میرا خون ان کے لئے مہندی کا بدل ثابت ہو سکتا ہے اور ابھی اس خون کی ایک قلیل مقدار میرے جسم میں محفوظ ہے۔

⑤ ہرچند کہ آج کے مسلمانوں میں وہ جذبہ' حرارت اور غیرت باقی نہیں رہی جو ماضی کے ادوار میں ہوتی تھی اس کے باوجود وہ اپنے حریفوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔

⑥ اقبال کہتے ہیں کہ ہسپانیہ میں قیام کے دوران میں نے غرناطہ کا مشہور شہر بھی دیکھا جو قرطبہ کی عظمت مٹ جانے کے بعد اندلس کے آخری مسلمان حکمران کا دارالحکومت بنا اور جہاں وہ مشہور زمانہ شاہی محل اب تک موجود ہے جو الحمرا کے نام سے موسوم ہے اور دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ غرناطہ جیسے عظیم الشان مناظر دیکھنے کے باوجود سکون قلب میسر نہیں ہوا۔

⑦ اس آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ میں نے (اقبال نے) ہسپانیہ کے دوران قیام ہر نوع کے خوشنما مناظر بھی دیکھے اور ان کے بارے میں دوسروں سے مختلف نوعیت کی داستانیں بھی سنیں۔ ان کا جلال و جمال اپنے اشعار کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کے علاوہ وہ باتیں بھی دہرائیں جو اوروں کی زبانی سنی تھیں اس کے باوجود ہمیں سکون قلب حاصل نہ ہو سکا۔

طارق کی دعا

(اندلس کے میدان جنگ میں)

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی!
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت' نہ کشور کشائی!
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے قبا چاہئے اس کو خون عرب سے!
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا خبر میں' نظر میں' اذان سحر میں!
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں!
کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دل مرد مومن میں پھر زندہ کر دے وہ بجلی کہ تھی نعرہ لا تذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے!

معنی: خیاباں: پھولوں کی کیاری عرفاً مراد ہے باغ۔

بنو امیہ کے خلیفہ ولید کے عہد میں پہلی بار جب مسلمان عساکر نے ہسپانیہ پر قبضہ کیا تو اس فوج کا سپہ سالار طارق بن زیاد تھا۔ طارق کا تعلق بربر قبیلے سے تھا۔ وہ انتہائی دلیر، جراءت مند اور اصولوں کا پکا تھا۔ عالم اسلام کے ممتاز سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کی زیر تربیت تمام عسکری فنون پر اس نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ جب خلیفہ ولید نے موسیٰ بن نصیر کو افریقہ کا گورنر بنا کر بھیجا تو طارق بھی ایک فوجی دستے کے سالار کی حیثیت سے اس کے ہمراہ تھا۔

انہی ایام میں اندلس سے مسلمانوں کی ایک جماعت ہسپانیہ کے سربراہ مملکت راڈرک کے ظلم و ستم کی داستانوں کے ساتھ موسیٰ بن نصیر کے پاس آئی تو اس نے اپنے چند فوجی دستے سرحدی علاقوں کا جائزہ لینے کے لئے بھیجے جو ہسپانوی فوج سے معمولی جھڑپوں کے بعد واپس چلے آئے۔ موسیٰ بن نصیر نے بالآخر تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد پانچ ہزار جنگجو فوجیوں کا نسبتاً ایک بڑا لشکر طارق بن زیاد کی قیادت میں بھیجا۔

اس معرکے کا سب سے اہم اور تاریخی واقعہ یہ ہے کہ طارق جن جہازوں پر سمندر پار کر کے اپنی فوجوں کو دشمن کے علاقے میں لے گیا تھا ساحل پر اترتے ہی اس نے ان جہازوں کو نذر آتش کرنے کا حکم دیا تاکہ اس کا کوئی سپاہی واپسی کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔ کئی روز کی خونریز جنگ کے بعد طارق کا لشکر فتح یاب ہوا اور راڈرک فرار ہوتے ہوئے ایک دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس حملے نے ہسپانیہ کی تقدیر بدل کر رکھ دی بعد میں اس ملک پر مسلمانوں کا ساڑھے سات سو سال تک قبضہ برقرار رہا۔

اس پس منظر میں یہ نظم ہرچند کہ اقبال کے تصوراتی اشعار پر مبنی ہے تاہم بین السطور میں تاریخ کا جو بے حد منفرد اور اہم واقعہ موجود ہے (جہاز جلوانے کا) اس کے باعث اس نظم کی اہمیت بھی دوچند ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں بالخصوص ہسپانیہ میں مسلمانوں کے عروج و زوال پر رائے زنی کی گئی ہے۔ وہ ایسے عظیم المرتبت کرداروں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ طارق بن زیاد کا یہ ہمیشہ یاد رکھا جانے والا معرکہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فرماتے ہیں۔

① اے پالنے والے! میرے فوج کے جیالے جو اپنی کشتیاں جلا کر راہ حق میں اپنے دشمن کے خلاف نبرد آزما ہیں وہ غازی ہیں جن کے کردار اور صلاحیتوں کا بھید کسی پر منکشف نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کو تیری جانب سے قیادت اور سرداری کی صلاحیت عطا ہوئی ہے۔

② یہ لوگ تو صحراؤں اور دریاؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کی ہیبت سے پہاڑوں کے دل بھی لرز اٹھتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کے جانبازوں کے عزم و حوصلے اور جراءت و ہمت کے سامنے جنگل، دریا اور پہاڑ بھی کوئی معنی نہیں رکھتے۔

③ اس کی وجہ اے باری تعالیٰ! ان غازیوں کے پاکیزہ قلوب میں تیرے عشق حقیقی کا موجزن ہونا ہے کہ اس عشق میں ہی وہ لذت موجود ہوتی ہے جو انسان کو ہمیشہ سرمست رکھتی ہے۔ اور دونوں جہانوں سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ دنیا و آخرت میں صرف تجھے ہی اپنا مقصود تصور کرتے ہیں۔ اور تیری ہی خاطر

زندہ رہتے ہیں اور تیرے لئے موت سے ٹکرا جاتے ہیں۔

④ یہ لوگ ایسے صاحب ایمان ہیں جن کا مقصد تیری راہ میں شہادت کے حصول کے سوا اور کچھ نہیں! وہ نہ تو دوسروں کی املاک پر قابض ہونے میں یقین رکھتے ہیں نا ہی اس قبضے سے حاصل ہونے والا لوٹ کا مال ان کا مقصود ہوتا ہے۔

⑤ ہسپانیہ اگرچہ خوش حال اور سرسبز علاقہ ہے لیکن اے باری تعالیٰ تیرے نام اور ملک کی سربلندی کے لئے تیرے غازی ہر قربانی دینے یہاں آ گئے ہیں۔

دوسرا بند

① اقبال کے مطابق طارق بن زیاد کے حوالے سے دعائیہ نظم کے دوسرے بند میں باری تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ تو نے عرب کے صحرانشین مسلمانوں میں وہ صلاحیت پیدا کر دیں جو عشق حقیقی سے آگاہی' اور اشیاء کی پہچان کے علاوہ صبح کی اذان میں جو سرور اور کیفیت ہوتی ہے۔ ان سب کی بنا پر انہیں یگانہ روزگار بنا دیا۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں میں زندگی کی جملہ حقیقتوں کا ادراک پیدا کر کے انہیں دوسروں سے افضل بنا دیا۔

② حیات انسانی صدیوں سے جن خصوصیات سے محروم تھی اے مالک! عرب کے صحرانشینوں میں تو نے وہی صلاحیتیں اور خصوصیات پیدا کر کے انہیں ایک ایسی مثالی قوم میں ڈھال دیا جو دوسری قوموں کو نصیب نہ ہو سکیں۔ مسلمانوں کے دلوں میں کچھ کر گزرنے کی جو تڑپ اور اضطراب ہے وہی حقیقی زندگی کی مظہر ہیں۔

③ میرے مولا! ان صحرانشینوں کی خصوصیت تو یہ بھی ہے کہ وہ موت کو ہلاکت نہیں تصور کرتے بلکہ ان کے لئے نہ صرف یہ کہ زندگی آخرت کی کھیتی ہے بلکہ وہ تو حیات بعد الموت کے قائل ہوتے ہوئے موت کے بعد کی زندگی کو پہلی زندگی سے بدرجہا بہتر اور افضل سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں موت انہیں کیسے خوفزدہ کر سکتی ہے؟

④ حضرت نوحؑ نے مولائے کائنات سے دعا کی تھی کہ دنیا سے کفر کی ظلمت کو مٹا دے اور اسے نور ایمان سے لبریز کر دے۔ اسی حوالے سے دعا کے اس شعر میں کہا گیا کہ باری تعالیٰ تو اپنی رحمت سے مرد مومن کے دل میں وہی جذبہ پیدا کر دے جو حضرت نوحؑ کی دعا میں موجود تھا۔

⑤ اے مالک دوسرا! عزم و حوصلے کے جذبے مومنوں کے سینوں میں دفن ہیں۔ انہیں پھر سے بیدار کر دے کہ مسلمانوں کی نگاہیں تلوار کی مانند کاٹ کی حامل ہوں جو حریف کو فنا کے گھاٹ اتار دیں یعنی ان میں عملی جدوجہد کا جذبہ پیدا ہو سکے!

لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات — حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے — ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے — بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات!
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت — میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے — تو خالق اعصار و نگارندہ آنات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات!
جب تک میں جیا خیمہ افلاک کے نیچے — کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا — جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی! — مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!
یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات!
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات!
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت! — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات!
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات!
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر — تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل — بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام — یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟ — دنیا ہے تری منتظر روز مکافات!

معنی: انفس: نفس کی جمع۔ مراد ہے عالم ارواح سے۔ **آفاق**: افق کی جمع۔ مراد ہے عالم اجسام۔ **آیات**: آیت کی جمع نشانیاں۔ **متغیر**: بدلنے والے۔ **نظریات**: نظریہ کی جمع۔ **کواکب**: کوکب کی جمع ستارے **بینائے کواکب** سے مراد ہے ستاروں کے علم کا ماہر یعنی نجومی یا عالم ہیئت۔ **دانائے نباتات**: علم نباتات کا ماہر۔ **اعصار**: عصر کی جمع۔ زمانے۔ **نگارندہ**: لکھنے والے۔ **آنات**: آن کی جمع۔ اوقات۔ **متلاطم**: لہریں لینے والے۔ **سماوات**: سما کی جمع۔ آسمان۔ **فلزات**: دھاتیں۔ **ظلمات**: ظلمت کی جمع اندھیرے۔ **مرگ مفاجات**: ناگہانی موت۔ **مدنیت**: تمدن۔ بود و ماند۔ **شاطر**: لفظی معنی شطرنج کھیلنے والا۔ مراد ہے نہایت چالاک۔ **تزلزل**: زلزلہ۔ **پیران**

خرابات: مے خانے کے منتظم۔ **مکافات:** بدلہ۔

"بال جبریل" اور اقبال کی دوسری کتابوں میں بعض ایسی نظمیں اور اشعار شامل ہیں جن کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنے فکر و فلسفے کے حوالے سے انتہائی بالغ نظر اور وسیع القلب شاعر تھے۔ ان کی سوچ گہرائی اور گیرائی کی مظہر تھی۔ یہ مسئلہ یقیناً ایک تفصیلی بحث کا متقاضی ہے جس کی ان صفحات میں کسی اعتبار سے بھی گنجائش نہیں۔ اس مجموعہ میں "لینن خدا کے حضور میں' فرشتوں کا گیت اور فرمان خداوندی' فرشتوں کے نام اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو علامہ کی عام سوچ سے قدرے مختلف نظر آتی ہیں۔

لینن روس کا وہ عظیم انقلابی رہنما تھا جس کارل مارکس کے اشتراکی فلسفے کو عملی جامہ پہنا کر نہ صرف یہ کہ اپنی جماعت بنائی جس کا نام بالشویک تھا بلکہ 1917ء میں زار روس کا تختہ الٹ کر اشتراکی حکومت قائم کی۔ ہر چند کہ اقبال کا اشتراکی نظریات سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم انہوں نے اس فلسفے اور اس کے رہنماؤں بالخصوص لینن کے فکر و فلسفے کو جس انداز سے دیکھا یہ نظم اس کی ایک واضح شکل ہے۔ اس نظم میں علامہ نے لینن کو خدائے ذوالجلال سے مکالمہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ تکنیکی اور فکری سطح پر بھی یہ ایک اہم نظم ہے۔ فرماتے ہیں۔

① اے خدا! میں اس حقیقت سے تو آشنا ہوں کہ عالم ارواح اور عالم اجسام دونوں مقامات پر تیری نشانیاں واضح اور نمایاں ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ تیرا وجود ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔

② لیکن اس عالم آب و گل میں فلسفہ و دانش اور ان کے حوالوں سے نظریات میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے اس نے ایک تذبذب کی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کے سامنے تیرے وجود کے بارے میں میں بھی بے یقینی کا شکار رہا اور کوئی واضح شکل سامنے نہ آ سکی۔

③ یوں بھی ہے کہ عصر موجود میں علم ہیئت و نجوم کے ماہر ہوں یا ماہرین فطرت! وہ خود بھی حقیقت کا صحیح ادراک نہیں رکھتے۔ اول الذکر تو ستاروں کی گردش پر اکتفا کرتے ہیں اور دوسرے آئے دن نئی نئی باتیں سناتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو ان کو فطرت کے مظاہر سے کوئی آگاہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود بھی تیری ذات کے عرفان سے محروم رہے اور دوسروں کو بھی محروم رکھا۔

④ یہ درست ہے کہ جب تک زندہ رہا اس وقت کلیسا کی تعلیم اور پادریوں کی باتوں کو بے معنی سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا لیکن اب عالم آخرت میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تمام باتیں تو حقیقت پر مبنی تھیں۔

⑤ بے شک ہم تو شب و روز کے چکروں میں محصور اور بے بس انسان ہیں اور اے باری تعالیٰ! جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے تو زمانوں کا خالق اور ایک ایک لمحے کی واردات کو محفوظ رکھنے والا ہے۔

⑥ تاہم! اگر تو مجھ کو اجازت دے اور میری اس جسارت سے درگزر کرے تو وہ بات ضرور پوچھوں گا جسے دنیا کے بڑے بڑے فلسفی اور ان کی تصانیف حل نہ کر سکیں۔

⑦ اور وہ یہ کہ جب تک میں زندہ رہا یہی بات میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔

⑧ اپنا مدعا بیان کرنے سے قبل یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ جب روح میں خیالات متلاطم ہوں تو انسان کو اپنی گفتگو پر قابو نہیں رہتا چنانچہ اس جسارت کے لئے پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

⑨ لیکن اے خالق کائنات! بس اتنا بتا دے کہ وہ کون سا انسان ہے کہ تو جس کا معبود ہے؟ کیا یہ وہی انسان تو نہیں جو خاک کا پتلا ہے اور جو زیر آسماں آباد ہے؟

⑩ لیکن مشرق کے انسانوں کے خدا تو مغرب کے سفید فام لوگ بنے ہوئے ہیں جنہوں نے اس علاقے پر اپنا تسلط قائم کیا ہوا ہے اور جہاں تک اہل مغرب کا تعلق ہے وہ ہر لمحے چمکدار دھاتوں یعنی اسلحہ اور سکوں کی پرستش کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر اے باری تعالیٰ! یہ تو بتا کہ تیرا پرستار کون ہے۔

(11) مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ یورپ میں علم و ہنر اور سائنس و فلسفہ نے بڑی ترقی کی ہے اور وہاں ہر سو عقل و خرد کی روشنی ہے لیکن پھر بھی وہاں تاریکی کا دور دورہ ہے اور اس تاریکی میں کوئی ایسا چشمہ حیواں نہیں جس سے انسان حقیقی زندگی حاصل کر سکے۔

(12) یورپ میں تو صورت حال یہ ہے کہ فن تعمیر' رونق اور صفائی کے اعتبار سے بنکوں کی عمارتیں گرجا گھروں کی نسبت زیادہ آسودہ نظر آتی ہیں اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یورپی باشندوں کو مذہبی عبادت گاہوں سے زیادہ اپنی دولت اور کاروبار سے لگاؤ ہے۔

(13) تاہم امر واقع یہ ہے کہ بظاہر یہ لوگ تجارت اور کاروبار کر رہے ہیں لیکن عملی طور پر اس کی حیثیت جوئے سے کم نہیں۔ یورپ میں کاروبار بالعموم سٹے کی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں ایک آدھ شخص کو فائدہ ہوتا ہے جب کہ لاکھوں لوگ اقتصادی طور پر تباہ ہو جاتے ہیں۔

(14) چنانچہ وہاں جو علم و فلسفہ اور حکمت و سلطنت ہیں وہ بظاہر تو مساوات کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن عملاً اپنے استعماری منصوبوں سے لوگوں کے جسموں سے خون نچوڑ لیتے ہیں۔

(15) مغرب میں ہر نوع کی ترقی کے باوجود آج بھی کیفیت یہ ہے کہ ان کے زیر نگیں ممالک میں بیروزگاری اور غربت نے ڈیرہ جما رکھا ہے۔ تن ڈھانپنے کو لباس نہیں اور شراب نوشی کی لعنت عام ہے۔ ان مسائل کے پیدا کرنے کے علاوہ اہل یورپ نے خلق خدا کے لئے کون سی خدمات سرانجام دی ہیں۔

(16) یہ نظم فی الواقع تکنیکی اور فکری سطح پر اقبال کی نمائندہ اور شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔ قاری جوں جوں آگے بڑھتا ہے تخیل اور نغمگی اس کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ نظم کے پہلے شعر سے آخر تک انہوں نے جو تھیسس بنایا ہے اور جس انداز میں بنایا ہے اس کی مثال خود اقبال کے ہاں ہی نہیں اردو کی پوری نظمیہ شاعری میں غالباً مشکل سے ہی مل سکے گی۔ اس حوالے سے ہمیں ہر ہر شعر میں ایک نئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ زیر تشریح اس شعر میں بھی لینن کی زبانی یورپ کی تہذیبی اور اقتصادی صورت حال کے حوالے سے اس کی خامیوں کی جانب بھی اشارے ملتے ہیں کہ مغربی قوم نے بے شک بجلی اور بھاپ کی قوتوں کو تسخیر کر کے اپنے لئے ترقی کی راہیں تو کھول دی ہیں لیکن اسے قدرت کے انعامات پر اعتماد نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ وہ اخلاقی اقدار سے محروم ہو چکا ہے اور سائنسی اور فنی ارتقاء کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھی ہے۔

(17) اس شعر کو بھی سابقہ شعر کے منظر نامے کے حوالے سے ہی دیکھا جانا چاہئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یورپ نے صنعتی ارتقاء کے لئے نت نئی مشینوں کی ایجاد سے ان کی اجارہ داری تو قائم کر لی لیکن اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانوں کے دل فولاد کی طرح بے حس ہو گئے اور خود بھی مشین ہی بن گئے اس کے نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسانی ہمدردی کے ساتھ مروت اور احسان کے احساسات بھی ان

مشینوں کی زد میں آکر کچلے گئے۔ یعنی خود انسان فولادی مشینوں کی مانند بے حس ہو گیا۔

(18) تاہم اس سائنسی اور فنی ارتقاء کے ذریعے یورپ میں جس طرح کی مصنوعی زندگی بروئے کار آئی ہے اس کی ناکامی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں اور یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ تقدیر بالاخر انسانی تدبیروں کو شکست دینے میں پھر سے کامیاب ہو گئی ہے۔ جس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ استعمار پرستوں نے جو سرمایہ دارانہ صنعتی نظام قائم کیا تھا وہ اب شکست و ریخت سے دوچار ہوتا نظر آ رہا ہے اس نظام کا مقصد محض دولت کا ارتکاز اور پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ قوموں کو لوٹ کر مزید انحطاط سے دوچار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

خود یورپ میں محنت کشوں میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے ان کو احساس ہو چکا ہے کہ صنعتکار اور سرمایہ دار ان کی محنت سے اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں اور وہ خود افلاس کی چکی میں بری طرح سے پستے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی صفوں میں ہلچل پیدا ہو چکی ہے اور شدید رد عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔

(19) یورپ کا سرمایہ دارانہ نظام بے شک کچھ عرصے تک تو کامیابی سے دوچار رہا لیکن اس کی بنیاد چونکہ مستحکم نہ تھی اس لئے اب بری طرح سے انتشار سے دوچار ہے چنانچہ اس نظام کو جاری رکھنے والے خود پریشان ہیں کہ جو صورت حال سامنے نظر آ رہی ہے اس سے کس طرح عہدہ بر آ ہوں۔

(20) اس مشینی اور استعماری نظام نے جہاں دوسروں کو متاثر کیا ہے وہاں خود اس نظام کے مدعی اہل یورپ کی صحتیں برباد ہو چکی ہیں۔ سر شام جب وہ گھر سے بن ٹھن کر بر آمد ہوتے ہیں تو ان کے چہروں کی سرخی فطری نہیں بلکہ اس امر کی غماز ہوتی ہے کہ یا تو ان کے چہروں پر شراب نوشی یا پھر مختلف نوعیت کے پاؤڈر کے استعمال کے سبب سرخ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ مصنوعی زندگی نے ان کی صحتوں کو گھن کی طرح چاٹ لیا ہے اور اب جو چہروں پر سرخی نظر آتی ہے وہ فطری نہیں بلکہ مصنوعی ہے۔

(21) نظم کے آخری دو اشعار میں یہ لہجہ نسبتاً زیادہ تلخ نظر آتا ہے۔ زیر تشریح شعر میں باری تعالٰی سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بے شک تجھے کائنات کی ہر شے پر قدرت حاصل ہے اور تو عادل و منصف بھی ہے اس کے باوجود اتنا بتا دے کہ تیری دنیا میں مزدوروں اور محنت کشوں کی زندگیوں میں تلخیاں کیوں بھری ہوئی ہیں۔ انہیں اطمینان قلب کیوں نصیب نہیں ہوتا؟

(22) مجھے اب اتنا بتا دے کہ سرمایہ دارانہ اور استعماری نظام کب تباہ ہو گا؟ اب تو ساری دنیا اس ضمن میں روز مکافات کی منتظر ہے۔ بے شک ظالم کی رسی ایک حد تک دراز ضرور ہوتی ہے لیکن بالاخر ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب تیرا عذاب اس پر نازل ہوتا ہے۔ استعماری نظام اب ظلم کی انتہا تک پہنچ گیا ہے اس پر تیرا عذاب کب نازل ہو گا؟ اور دنیا بھر کے لوگ اس ظالمانہ نظام سے کب نجات پا سکیں گے؟

فرشتوں کا گیت

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی   نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی!

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی!
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی!
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام — عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی!
جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی — آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی!

معنی: زمام: لگام باگ عنان نکیل۔ پردگیٔ نیام: میان کے اندر چھپی ہوئی۔

یہ تجزیہ بڑی حد تک حقیقت پر مبنی سمجھا جانا چاہئے یہ تین نظمیں "لینن خدا کے حضور میں" فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا (فرشتوں سے) ایک ہی دور کی نظمیں ہیں۔ مشرق و مغرب کی تہذیب، ثقافت معاشیات اور دیگر عوامل اور ان کے تضادات کو جب اقبال نے قریب سے دیکھا تو اس کے ردعمل کے طور پر انہوں نے ان نظموں میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

① چنانچہ اس نظم کے اولین شعر میں فرشتے باری تعالیٰ کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ تو نے انسان کو عقل و دانش اور عشق و محبت کے جذبوں سے اس لئے نوازا تھا کہ وہ تیرے مشن کی تکمیل کر سکے لیکن صورت یہ ہے کہ نہ وہ عقل و دانش سے کوئی مثبت کام لے سکا نا ہی معاشرے میں عشق و محبت کے جذبے کو عام کر سکا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تو نے جو نقش وضع کیا تھا وہ عملی سطح پر ابھی تک ادھورا ہے۔

② اے مالکِ دوجہاں! آج بھی صورت حال یہ ہے کہ رند ہو یا فقیہہ، امیر ہو یا کوئی سجادہ نشیں۔ یہ سب عوام الناس کو اپنے مفاد کے لئے آلہ کار بنانے میں مصروف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیری دنیا میں جو حالات پہلے تھے ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ حالات جوں کے توں ہیں۔

③ تیرے رؤسا کا حال تو یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے میں مصروف ہے اور ہر جائز و ناجائز طور پر اپنی تجوریاں بھر رہا ہے جب کہ تیرے درویش اپنے حالِ پریشاں میں ہی مست نظر آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں عام آدمی تو گلی کوچوں میں دھکے کھاتا پھر رہا ہے اور آقاؤں کا معاملہ آدمی تو گلی کوچوں میں دھکے کھاتا پھر رہا ہے اور آقاؤں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بلند و بالا محلات میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

④ عقل و دانش اور علم و فن کے نام لیوا ان خصوصیات کو ذاتی مفادات اور برتری کے لئے استعمال کر رہے حالانکہ ان تمام خصوصیات کا بنیادی مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ عام لوگوں کی بہتری کے لئے استعمال ہوں اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ تیرے عشقِ حقیقی کا فیض عام نہیں ہو سکا۔

⑤ اس ضمن میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کا جوہر عشق ہے جب کہ عشق کا جوہر جذبہ خودی ہے چونکہ معاشرے میں خودی بروئے کار نہیں آ سکی یہی وجہ ہے کہ زندگی کے جوہر آشکار ہوئے نا ہی عشق کے! اس طرح اب تک سارا عمل ہی ادھورا رہ گیا ہے۔

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو!

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

معنی: کاخ: محل۔ کنجشک: چڑیا۔ فرومایہ: بے حقیقت۔ بے حیثیت ناچیز۔

گزشتہ دو نظموں "لینن خدا کے حضور میں! اور فرشتوں کا گیت میں انسانی معاشرے میں طبقاتی تضاد اور انتشار کے حوالے سے باری تعالٰی کے روبرو جو گلے شکوے کئے گئے تھے زیر شرح نظم پہلی نظموں کا ایک طرح سے جواب ہے جس میں خدائے تعالٰی فرشتوں کے نام اپنا فرمان جاری کرتے ہوئے انہیں حکم دیتے ہیں کہ!

① اے فرشتو اٹھو! دنیا میں محنت کشوں اور دوسرے بے سروسامان لوگوں کے ساتھ اہل ثروت اور صاحبان اقتدار جو بدسلوکی کر رہے ہیں اس کے تدارک کے لئے اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ میری دنیا کے غریبوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دو اور طبقہ امراء کے بلند و بالا محلات کے در و دیوار ہلا کر رکھ دو کہ اس کے بغیر انصاف ممکن نہیں!

② اس مقصد کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ جو لوگ بوجوہ دوسروں کے محکوم اور دست نگر ہیں ان کی غیرت کو اس طرح بیدار کر دو کہ ان کا لہو جوش میں آجائے اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ان میں یقین و اعتماد پیدا کر دیا جائے اسی صورت میں یہ بے بس و ناچار لوگ ان سرمایہ داروں اور استعمار پرستوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو ان پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں۔

③ یہ بھی جان لو کہ اب حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ رد و بدل ہو رہا ہے۔ بادشاہتیں اور سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے بدلے اب عوام کے اقتدار کا دور نزدیک آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب انہیں کے ہاتھ میں کل اختیارات ہوں گے اس لئے تم پر لازم ہے کہ ماضی کے جو بھی نقوش تمہیں نظر آئیں ان کو مٹا ڈالو تاکہ اس کے بعد ایک نئی دنیا نئے نظام کے ساتھ آباد کی جا سکے۔

④ اے فرشتو! اس امر کو بھی پیش نظر رکھو کہ کسانوں کو جس کھیت سے اس کی تمام تر محنت مشقت کے باوجود روزی اور معاوضہ میسر نہ ہو اور اس کی تمام پیداوار زمیندار ہڑپ کر جاتا ہو اس کے اقدام سے قبل ہی اس کھیت کے ایک ایک خوشہ گندم کو جلا کر رکھ دو کہ اگر محنت کش کسان کو پیٹ بھرنے اور تن

ڈھانپنے کے لئے یہاں سے معاوضہ نہیں ملتا تو پھر زمیندار کو بھی لوٹ کھسوٹ کا حق حاصل نہیں۔

⑤ سوال یہ کہ میرے اور میری مخلوق کے درمیان پادریوں اور دوسرے مذہبی پیشواؤں نے جو بے جواز پردے حائل کر دیئے ہیں۔ اس کا تدارک اسی طرح سے ممکن ہے کہ ان پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کو ان عبادت گاہوں سے اٹھا کر باہر پھینک دو اور وہاں ان کی اجارہ داری کا خاتمہ کر دو۔ مراد یہ ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے عوام میں جو اپنی دکانداری چمکا رکھی ہے کہ ان کے توسط کے بغیر مجھ تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی اس تاثر کو ختم کرنا ضروری ہے۔

⑥ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسجدوں اور بت خانوں کی صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ دکھاوے کے لئے مسجد میں گئے اور نمائشی سجدے کر لئے یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بت پرست ہیں کہ کبھی کبھار بتوں کی پرستش کر لی اور بس! یہ سب لوگ ہی مذہب اور عقیدے کو ایک کھیل سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس صورت حال سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ مساجد اور بت کدوں کو ختم کر کے رکھ دو! کہ ان اداروں میں بے راہ روی کے باعث لوگ اپنے مذہب اور عقیدوں سے بیزار ہو کر رہ گئے ہیں۔

⑦ اے فرشتو! یاد رکھو کہ عبادت گاہوں میں جو قیمتی پتھر آویزاں کئے گئے ہیں اور قیمتی اشیاء سے ان کی تزئین کی گئی ہے میں ان سے شدید طور پر بیزار اور ناخوش ہوں۔ ان سے بہتر تو یہ ہے کہ میری عبادت کے لئے تو سادہ سا مٹی کا حرم تعمیر کر دو مراد یہ ہے کہ عبادت گاہوں کی آرائش و تزئین تو بے معنی شے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں میں عشق حقیقی کی لگن پیدا کی جائے! تصنع اور ظاہرداری تو خلوص و وفا کی ازلی دشمن ہیں۔

⑧ اے فرشتو! یہ بھی سن لو کہ جدید تہذیب جو اس وقت پورے انسانی معاشرہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ شیشہ سازوں کے کارخانوں کی مانند ہے جہاں ہر طرف شیشے آویزاں ہوتے ہیں لیکن کسی شے کی معمولی ضرب سے ہی چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ ایسی ناپائیدار تہذیب کو ختم کرنا ضروری ہے کہ جس میں عدم مساوات اور اقتصادی ناہمواریاں عام ہیں۔ اس کے خاتمے کے لئے لازم ہے کہ شاعر مشرق (اقبال) کو آداب جنوں سکھا دو کہ وہ اپنے تخلیقی فن کے ذریعے عوام کو مروجہ تہذیب کی بے اعتدالیوں اور خرابیوں سے آگاہ کر سکے کہ یہی طریق کار اس تہذیب کو ختم کرنے کے لئے ناگزیر ہے اور جب تک یہ تہذیب ختم نہ ہو گی اور نیا نظام اس کی جگہ نہ لے گا۔ عالمی سطح پر امن قائم نہیں ہو سکتا اور نا ہی لوگوں کو مسرت و خوشحالی حاصل ہو سکتی ہے۔

ذوق و شوق

(ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

دریغ آدم زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں!

حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں!

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!

گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں!

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں!

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیشِ دوام ہے یہی!

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات!

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات!

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات!

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق!
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو!

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو!

میں، کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!

بادِ صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس!
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو!

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو!

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را،

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود!
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب!

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب!

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے!
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے!

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب!

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب!

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزوری کشد
عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب!

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو! ہجر میں لذت طلب۔
عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب!

گرمیِ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق!

"بال جبریل" میں "مسجد قرطبہ" "لینن' خدا کے حضور میں 'لالہ صحرا اور ذوق و شوق' ایسی نظمیں شامل ہیں جنہوں نے اقبال کو اقبال بنایا۔ یہ نظمیں تکنیک' فکر' نئے تجربوں اور خوبصورت امیجری کے سبب اردو شاعری میں بھی شاہکار کی حیثیت سے دیکھی جائیں گی۔ "ذوق و شوق" تیں اشعار پر مشتمل ایک طویل مختصر نظم ہے جس کے بیشتر اشعار بقول اقبال فلسطین میں لکھے گئے۔ واضح رہے کہ جب دسمبر 1931ء میں اقبال عالمی مسلم کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو کم و بیش ایک ہفتے تک بیت المقدس میں قیام کیا اور بعد میں فلسطین کے بعض دوسرے مقامات کا دورہ بھی کیا۔ عملاً یہ نظم پانچ بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند

معنی: **اضم:** حجاز کا ایک پہاڑ جو مدینہ منورہ سے شمال کی جانب تقریباً ایک منزل پر واقع ہے۔ **طیلسان:** چادر۔ **کاظمہ:** یہ کظم سے ہے جس کے معنی ہیں غصے کا ٹھنڈا ہونا کاظمہ کے معنی ہوئے غصے کو ٹھنڈا کرنے والی۔ **پرنیاں:** ریشم۔ **طناب:** رسی۔

اقبال نے نظم کا آغاز شیخ سعدی کے اس شعر سے کیا ہے کہ

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں تہی دست رفتن سوئے دوستاں

یعنی

① اس شعر میں اقبال کا اشارہ فلسطین کی جانب ہے کہ اس کے صحرا میں صبح کا ایسا منظر نظر آیا جو قلب و نظر کو منور کر گیا پھر جب آفتاب طلوع ہوا اور اس کی کرنیں فضائے بسیط پر رقص کرنے لگیں تو یوں محسوس ہوا جیسے نور کی ندیاں رواں ہوں۔ اقبال کے عہد کے بیشتر شاعر فطری مناظر کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ ذریعہ اظہار بنایا کرتے تھے۔ اقبال نے بھی اسی روایت کو فکری معنویت کے حوالے سے انتہائی فنی مہارت کے ساتھ بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔

② نگاہوں نے جو منظر دیکھا ہے اس کے مطابق یوں لگتا ہے کہ حسن ازل ایک بار اپنے مستور حصار کو توڑ کر پھر سے بے نقاب ہو گیا ہے۔ گویا اب وہی منظر سامنے ہے جو تخلیق کائنات کے مرحلے پر دیکھنے میں آیا تھا۔ یہی وہ منظر تھا جو تخلیق آدم کا مظہر بنا۔ ایسا منظر دیکھنے سے انسان کو وہ دولت مل جاتی ہے جو اسے حیات نو سے روشناس کراتی ہے۔

③ فضا میں رات کے وقت جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ صبح دم نیلی اور سرخ بدلیاں چھوڑ گئے اور مدینہ منورہ سے شمال کی جانب واقع کوہ اضم کو ان بدلیوں کی رنگ برنگی چادر نے ڈھانپ لیا۔

④ اس منظر میں بارش کی آمد نے ہوا کو گرد و غبار سے پاک کر دیا ہے۔ صحرا میں استادہ کھجور کے درختوں کی شاخیں پھواروں سے دھل کر اور زیادہ نکھر گئی ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ

اس بارش کی وجہ سے مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں پھیلی ہوئی ریت ریشم کی مانند نرم ہو گئی ہے۔

⑤ ہر چند کہ بعض شارحین نے اس شعر کی مختلف تاویلات بیان کی ہیں۔ اس کی مثال صرف ایک شرح کے حوالے سے یہاں پیش کی جائے گی جس کے مطابق ایک راہرو دوران سفر خیموں کی ٹوٹی ہوئی طنابیں اور انہی کے سامنے راکھ کے ڈھیر دیکھ کر یہ سوچتا ہے کہ نہ جانے اس مقام سے کتنے قافلے گزرے ہیں لیکن فلسطین کے پس منظر میں یہ تشریح بے جواز نظر آتی ہیں۔ اس کے قرین قیاس یہ ہے کہ اس شعر میں اقبال نے اس علاقے کی جنگوں اور معرکہ آرائیوں کے پس منظر میں ان فوجی قافلوں اور عساکر کی نشاندہی کی ہے۔ میدان مبارزت میں جاتے ہوئے جنہوں نے یہاں عارضی طور پر قیام کیا لیکن پھر افراتفری میں اس طرح روانگی اختیار کی کہ چنے لپیٹتے ہوئے ان کی طنابوں کے ٹوٹنے کی پروا بھی نہیں کی۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران فلسطین اور اس علاقے کے لوگوں کو جس محاذ آرائی سے واسطہ رہا وہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اقبال نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

⑥ اقبال کا کہنا ہے کہ دوران سفر اس مقام پر محض یوں لگا کہ حضرت جبرئیل اس امر سے مجھے مطلع کر رہے ہیں کہ میں اس علاقے کی تاریخ اور حقائق سے آگاہی کا خواں تو یہی وہ مقام ہے جس کے جائزے اور کوائف سے مجھے حقیقت احوال کا پتہ چل سکتا ہے۔

دوسرا بند

معنی: غزنوی: اشارہ ہے سلطان محمود غزنوی کی طرف۔ **سومنات:** کاٹھیاواڑ کا وہ مشہور بت خانہ جس کی تسخیر کے لئے غزنوی نے بہت بڑے صحرائی علاقے کا سفر کیا جو اس کے تمام کارناموں میں سے سب سے بڑا عظیم الشان مانا جاتا ہے۔ **دجلہ و فرات:** عراق کے مشہور دریا کربلا کی جنگ دریائے فرات ہی کے کنارے ہوئی تھی۔

اقبال کے کلام کی تفہیم کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان کے فکری نظام کو پیش نظر رکھا جائے وہاں اس امر کا ادراک بھی ناگزیر ہے کہ ان کے طرز اسلوب میں جو ہمہ جہت کیفیات موجود ہیں ان کا احاطہ بھی کیا جا سکے۔ ان کی اکثر و بیشتر نظموں میں یہ بات بالخصوص قابل غور ہے کہ ان نظموں کی تمہید بسا اوقات کسی اور حوالے سے ہوتی ہے لیکن پھر ایک ہی جست میں وہ اپنے اصل موضوع پر آجاتے ہیں۔ ان کے شعری کینوس میں جو وسعت ہے اس کا سبب بھی یہی طرز اظہار ہے۔ زیر تشریح نظم بھی اسی پس منظر کی آئینہ دار ہے چنانچہ اب ذرا دوسرے بند کے اشعار کی طرف آیئے!

① اقبال کہتے ہیں کہ مجھے قدرت نے ایسے دور میں تخلیق کیا ہے وہ انتہائی کہنہ عقائد کی آماجگاہ ہے اس پر ستم یہ کہ مجھے ایسے فرسودہ معاشرے میں نئے تصورات اور اجتہادی فکر کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اب اس کا گلہ اور شکایت کس سے کی جائے کہ اس نوع کے تضادات نے میری زندگی میں زہر گھول کر رکھ دیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ عہد حال کے پس منظر میں میری سوچ اور نظر مستقبل تک رسائی حاصل کرنے کی اہل ہے جب کہ میرے گردوپیش فرسودہ اور منتشر نظریات سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس عہد میں آج انسان سانس لے رہا ہے وہ بے حد پرانا ہو چکا ہے جو نئے افکار کو برداشت کرنے کا اہل نہیں۔

② اس وقت صورت حال یہ ہے کہ فقیہان کرام نے حرم اور مساجد کو بھی اسی طرح اندھی تقلید اور پرستش کی آماجگاہ بنا لیا ہے جس طرح سومنات کے مندر میں بتوں کی پرستش کا دور دورہ تھا چنانچہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے محمود غزنوی جیسا کوئی مرد مجاہد اٹھے اور اس صورت حال کو اسی طرح تبدیل کر دے جس طرح اس نے سومنات کے مندر میں بتوں کو پاش پاش کر کے لوگوں میں وحدانیت کا تصور پیدا کیا تھا۔ مراد یہ ہے کہ کائنات میں فکری سطح پر انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جو مروجہ فرسودہ نظام کو یکسر بدل ڈالے۔

③ بغور جائزہ لیا جائے تو عرب اور عجم دونوں کا سارا ماحول اور منظر نامہ بدل کر رہ گیا ہے۔ پہلے عربوں کو ایک آزاد اور حقیقت پسند قوم سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن اب ان میں تصور آزادی اور حقیقت پسندی کا فقدان ہے۔ یہی حالت اہل عجم کی ہے جو اپنی بلندی فکر اور اعلیٰ تصورات کے باعث بین الاقوامی سطح پر شہرت رکھتے تھے۔ اب تو عرب بھی اور اہل عجم بھی اپنی تمام تر خصوصیات سے محروم ہو چکے ہیں۔

④ اقبال کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لئے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو گا کہ آج پورے حجازی قافلے میں ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا جو نواسہ رسولؐ امام حسینؓ جیسی سیرت و کردار کا مالک ہو اور ظلم و استبداد کے علاوہ آمریت کے خلاف سر بکف اعلان جہاد کر سکے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ظلم و استبداد اور آمریت آج بھی اپنے عروج پر ہے لیکن اس کے خلاف رزم آرائی کے لئے ایک بھی حسینؓ جیسا مجاہد پوری ملت اسلامیہ میں موجود نہیں۔

⑤ اس کی وجہ یقیناً یہ بھی ہے کہ انسان کے قلب میں عشق حقیقی جو ولولہ پیدا کرتا ہے وہ عشق ہی اب ناپید ہے۔ کربلا میں شہادت عظمیٰ کی اساس یہی عشق حقیقی تھا جس کی بدولت حسینؓ نے نہ صرف یہ کہ اپنی جان ہار دی بلکہ اپنے عزیز و اقارب سمیت بہتر رفقاء کو میدان کربلا میں قربان کر دیا۔ یہ عشق حقیقی ہی تھا جس کی بدولت نواسہ رسولؐ نے انتہائی نامساعد حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں ظلم و استبداد کے خلاف جہاد کر کے حیات جاوداں حاصل کی۔ دراصل عشق حقیقی ہی دل و دانش اور نگاہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ عشق کے بغیر تو مذہب اور شریعت محض تصوراتی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

⑥ چنانچہ یہ عشق ہی تھا جس کی بدولت حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے سچائی اور راست بازی کا رتبہ بلند حاصل کیا۔ امام عالی مقام جناب حسینؓ نے کربلا کے میدان میں جو قربانیاں دیں اور تین روز کی بھوک و پیاس کے باوجود لشکر یزید کے خلاف علم جہاد بلند کر کے سر کٹوایا اور زندگی کے آخری مرحلے تک صبر و شکر کا مظاہرہ کیا تو یہ سارا عمل عشق حقیقی کا ہی مرہون منت تھا۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام حضور سرور کائناتؐ نے بدر و حنین کے معرکوں میں کفار کو زیر کر کے جو کامیابیاں حاصل کیں وہ بھی عشق حقیقی کے سبب کیں۔

تیسرا بند

معنی: معنی دیریاب: وہ مطلب جو مشکل سے سمجھ میں آئے۔ قافلہ ہائے بانگ و بو: لفظی معنی رنگ و بو کے قافلے۔ جلوتیان مدرسہ: ظاہری علوم پڑھنے والے۔ خلوتیان مے کدہ: ذکر و فکر اور روحانیت میں مگن

رہنے والے۔

پچھلے اشعار کی تشریحات کے بعد یہ سمجھنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ اقبال کے کلام کی مختلف پرتیں ہیں اور ہر پرت اپنی شناخت ساتھ لے کر آتی ہے۔ زیر تشریح نظم اپنی معنویت اور تکنیک کے اعتبار سے نسبتاً مشکل نظم ہے کہ اس کے کردار اور پھران سے تخاطب یہ ایسی گھمبیر فضاء تخلیق کرتے ہیں جو بعض مراحل میں قاری کے لئے الجھن کا سبب بن جاتی ہے لیکن اس طرح کے اشعار کی گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو بات سمجھنے میں کوئی خاص قباحت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے جن علامتوں اور تلازمات کا استعمال کیا ہے ان تک رسائی شرط ہے چنانچہ اس بند کے پہلے شعر کو دوسرے بند کے آخری شعر سے مربوط کئے بغیر بات نہیں بنتی۔

① اقبال یہاں فرماتے ہیں کہ خدا نے جس نے آیات نازل کی ہیں اس طرح کائنات کو بھی تخلیق کیا ہے اور اگر کائنات کو بھی ایک آیت سے تشبیہ دے لی جائے تو یہ ایک ایسی آیت ہوگی۔ جس کا مفہوم اے عشق حقیقی تو ہے کہ آسانی سے جس کی تفہیم نہیں ہو سکتی۔ ارباب ظاہر و باطن تیری جستجو میں ہیں کہ تیرے بغیر وہ اپنے مقصد میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔

② لیکن صورت حال یہ ہے کہ جو لوگ بظاہر تحصیل علم میں مصروف ہیں وہ بے بصیرت اور حقیقت سے ناشناس ہیں۔ ان کے دلوں میں عملاً طلب علم کا ذوق مردہ ہو چکا ہے اور جو لوگ میکدے میں براجمان ہیں وہ صرف کم ظرف ہی نہیں بلکہ خالی پیمانے پر ہی اکتفا کئے ہوئے ہیں۔ مراد یہ زندگی کے لئے عملی جدوجہد سے عاری اور تہی دست ہیں۔

③ اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ جہاں تک میری تخلیقی کاوشوں کا سوال ہے تو بس اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اشعار میں اس آتش رفتہ کا سراغ لگانے اور اس میں از سر نو حرارت پیدا کرنے کی سعی کی ہے جو عرصے سے اپنی فطری صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں تو اپنے سوئے ہوئے ماضی کی جستجو میں مصروف ہوں۔ وہ ماضی جو درخشندہ اور تابناک تھا۔

④ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ جس طرح باد صبا کی حیات بخش لہریں گھاس پھوس کو تازگی سے ہم کنار کر کے اس کی نشوونما کا سبب بنتی ہیں۔ اسی طرح میرا آدرش اور پیغام لوگوں کے دلوں میں عملی جدوجہد اور کچھ کرنے کی لگن پیدا کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میرے اشعار پڑھنے والوں میں یقین اور اعتماد کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ عشق الٰہی سے روشناس کرا کے روح کو تازگی بخشتے ہیں۔

⑤ دیکھا جائے تو میں جو اشعار تخلیق کرتا ہوں ان میں میرے قلب و جگر کا لہو شامل ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی اس مضمون کو اپنی غزل کے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے کہ

خشک سیروں تن شاعر میں لہو ہوتا ہے
پھر نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

ظاہر ہے کہ اقبال کے مقابلے پر مولانا حالی کا یہ شعر حد سے زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ بہرحال اس کا تذکرہ تو سر راہے آ گیا۔ اقبال نے جس لطیف انداز میں اپنی بات کہی ہے وہ انتہائی قابل تعریف ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس شعر کے پہلے مصرعہ کا جواب دوسرے مصرعہ کے مضمون سے ملتا ہے کہ ساز سے جو نغمہ برآمد ہوتا ہے اس میں ساز بجانے والے شخص کی تخلیقی کاوش کا بھی دخل ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ

تخلیق ایج کے بغیر کوئی تخلیق نہ وجود میں آتی ہے نا ہی تکمیل پاتی ہے۔

⑥ اس شعر میں عشق حبیب سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تو نے میرے قلب و روح کو جس ولولے اور تڑپ سے روشناس کیا ہے اس میں مزید اضافہ درکار ہے۔ یہ اضطراب جس قدر زیادہ ہو قلب و روح کو تڑپانے کے ساتھ جلا بھی بخشتا ہے۔ ولولے اور تڑپ میں اضافہ اور اس کی تشکیل بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے محبوب کی تابدار زلفوں کی شکنوں میں اضافے کا مطالبہ! کہ ان میں دل الجھ کر رہ جائے۔

چوتھا بند

معنی: سلیم: عثمانی خاندان کا مشہور تاجدار جس نے مصر کو فتح کیا۔ اور جس کے عہد میں عثمانی ترکوں کو خلافت کا منصب نیز حرمین شریفین کی خدمت ملی۔ **جنیدؒ:** مشہور ولی اللہ حضرت جنید بغدادیؒ۔ **بایزیدؒ:** مشہور ولی اللہ بایزید بسطامیؒ۔ **غیاب:** غائب ہونا۔ **لوح و قلم:** لوح کے لفظی معنی تختی۔ **الکتاب:** قرآن مجید۔ **آبگینہ رنگ:** شیشے جیسا۔ **محیط:** لفظی معنی احاطہ کرنے والا۔ نیز سمندر۔ **سنجر:** سلجوقی خاندان کے مشہور بادشاہ کا نام۔

نظم کے اس بند میں جو چھ اشعار ہیں ان کا مطالبہ کسی حد تک تذبذب کو جنم دیتا ہے کہ شاعر نے عملاً یہ بات واضح نہیں کی کہ ان اشعار کا مخاطب کون ہے۔ تذبذب اور شکست و شبہ کی فضا نے اس لئے جنم لیا کہ بظاہر یہ اشعار باری تعالیٰ سے بھی منسوب کئے جاسکتے ہیں اور پیغمبر آخر الزماں حضور سرور کائناتؐ سے بھی! یہی وجہ ہے کہ بعض شارحین کے نزدیک ان اشعار کے مخاطب حضورؐ ہیں تاہم اگر سارے بند کا احتیاط اور گہرائی سے جائزہ لیا جائے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے چھٹے اور آخری شعر کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ معمہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ شعر اس طرح سے ہے

تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب ہے
طبع زمانہ تازہ کر' جلوہ بے حجاب سے

اس شعر کے آخری مصرعے میں اقبال نے جو بات کہی ہے کھل کر کہی ہے اور ان کا مخاطب باری تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس بند کے تمام اشعار ایک وجود کے گرد ہی گھومتے ہیں اور ان میں ایک واضح تسلسل ہے اس لئے اس توجیہ کی ضرورت پیش آئی۔

① اقبال باری تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو ہی لوح و قلم کا مالک ہے اور تیرے وجود کا مظہر قرآن ہے۔ یہاں لوح و قلم کی تراکیب کے حوالے سے رب ذوالجلال کو انسانی تقدیر کا خالق قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ باری تعالیٰ یہ جو رنگ برنگا اور شفاف آسمان ہے یہ تو تیرے دائرہ کار میں ایک معمولی بلبلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کنایہ یہ ہے کہ تو قادر مطلق ہے اور ہر شے تیرے وجود کے بالمقابل ذرے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

② اے مولائے کل! ہرچند کہ تو نے اب تک انسانی نظروں سے اپنے وجود کو پوشیدہ رکھا ہے لیکن تیرے جلوے کی علامتیں طلوع آفتاب کی شکل میں سامنے آئی جس کی تابندگی نے ریت کے معمولی ذروں کو بھی منور کر دیا۔ اسی نوع کی علامتیں پوری کائنات میں روشنی اور ارتقاء کا سبب ہیں۔

③ اے باری تعالیٰ! سلجوقی خاندان کا جلیل القدر حکمران سنجر اور خاندان عثمانیہ کے مشہور تاجدار سلیم میں جراءت' حوصلے اور پختہ عزم و ارادہ کی جو خصوصیات موجود تھیں ان کو اگر تیری شان جلال کا مظہر کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اسی طرح تیری شان جمال حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے مقبول بارگاہ اولیا میں دیکھی جا سکتی ہے۔

④ اگر تیرا عشق میرے سجدہ و نماز کا مقصود و مطلوب نہ ہو تیرا دوران نماز میرا قیام بھی بے معنی ہو جاتا ہے اور سجدے میں بھی کوئی کیفیت باقی نہیں رہتی مراد یہ کہ عشق حقیقی کے بغیر نماز اور سجدہ محض نمائشی حیثیت کا حامل ہے۔

⑤ اگر تیرا کرم ہو تو عقل و دانش اور جذبہ عشق دونوں ہی اپنی مراد پا جاتے ہیں۔ دانش و عقل جو تلاش و جستجو میں لگی رہتی ہے اور جذبہ عشق جو حضوری کا خواہش مند رہتا ہے یہی خواہش اسے مضطرب اور بے قرار رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جن میں عقل و دانش نمایاں تھی اور وہ لوگ بھی جو جذبہ عشق سے سرشار تھے بالاخر دونوں ہی تیری عنایات سے مستفید ہونے میں کامیاب و کامران ہو گئے۔

⑥ اے مولا! اب صورت حال یہ ہے کہ سورج کی گردش جاری رہنے کے بعد بھی ساری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے لہٰذا یہ خواہش اب ناگزیر ہو گئی ہے کہ پردے سے باہر آ کر اپنا جلوہ دکھا تاکہ ساری دنیا اس سے منور اور ترو تازہ ہو جائے۔

مراد یہ ہے کہ تیری عنایات کے باوجود آج بھی لوگوں کے دل تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ برائیاں ہر سو فروغ پا رہی ہیں اور نیکی کی طاقتیں کمزور پڑتی جا رہی ہیں ایسے میں ضروری ہے کہ تو اپنا جلوہ دکھا کر انسان کے سینوں کو اس کی روشنی سے منور کر دے۔

پانچواں بند

معنی: نخیلِ بے رطب: کھجور کا وہ درخت جو پھل نہ دے۔

یہ چھ اشعار بھی ایک طرح سے موضوعی سطح پر پچھلے بند کا تسلسل ہیں۔ یہ بند عملاً زیر تشریح نظم کا خوبصورت اختتامیہ ہے جس میں اقبال اپنی فکر اور کمال فن کے ساتھ انتہائی بلندی پر نظر آتے ہیں اور قدرے خود احتسابی کے ساتھ اپنے تازہ شعور و ادراک کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ وہ بدستور باری تعالیٰ سے یوں مخاطبت کرتے ہیں کہ۔

① میں جانتا ہوں کہ میرا ماضی اور عمل تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے جہاں تک میرے کردار کا تعلق ہے میں تو اس حقیقت سے بھی بے خبر رہا کہ علم ایک شجر بے ثمر کے مانند ہے اور میں تھا کہ کم و بیش ساری عمر ہی حصول علم میں گزار دی۔ اس طرح ایک ایسے سائے کے عقب میں دوڑتا رہا جس میں جذبہ عشق کا فقدان تھا۔

② لیکن اب جو اپنے اسلاف کی زندگی بھر کا جائزہ لیا تو مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ عشق حقیقی کی مظہر تو ذات محمد مصطفیٰﷺ ہے اور اس کے مقابلے میں جو عقل و دانش ہے وہ کار بولہبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ عقل و خرد تو ہوس خام کا دوسرا نام ہے۔ اگر زندگی کا حقیقی مقصود پانا ہے اور کچھ حاصل کرنا ہے تو

اس کا منبع ذات محمد مصطفیٰؐ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

③ اے باری تعالیٰ! اب مجھ پر یہ راز آشکار ہو سکا ہے کہ عشق کی ابتداء اور اس کی انتہا دونوں عجیب و غریب ہیں۔ کبھی تو یہ ایسی تدبیروں سے کام لیتا ہے جو فرد کو منزل مراد تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں اور کبھی بزور قوت اس کی توجہ اپنی جانب منعطف کراتا ہے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے موخر الذکر صورت حال سے واسطہ پڑا۔ یوں عشق نے مجھے عقل و دانش کے دام سے چھڑا کر ایک مثبت کیفیت سے آشنا کر دیا ورنہ میرے مشاغل تو قطعی اس کے برعکس تھے۔

④ عشق حقیقی نے یہ بھید بھی آشکار کر دیا کہ اس عمل میں ہجر اور جدائی کو وصل حبیب پر فوقیت حاصل ہے۔ وصل میں تو انسان اپنی خواہش اور آرزو کی تکمیل سے آسودہ ہو جاتا ہے لیکن ہجر میں محبوب کی طلب اور اس سے پیدا ہونے والی تڑپ برقرار رہتی ہے اور یہی تڑپ عاشق کے لئے زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے۔

⑤ یہ میری بدبختی ہی تو ہے کہ جب محبوب کے وصل کا مرحلہ آیا تو مجھے اس کی جانب ایک نگاہ ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی حالانکہ میری شوخ نگاہیں عرصے سے دیدار محبوب کی متلاشی تھیں یوں وصل کی خواہش اور عمل بھی ادھورا رہا۔

⑥ سو اس ساری بحث کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عشق حقیقی میں ہجر و فراق کی کیفیت ہی سب سے اہم شے ہے۔ آرزو اور خواہش اسی کیفیت میں برقرار رہتی ہیں اور تمام نالہ و فریاد بھی اسی کے دم سے زندہ ہیں۔ اس کی مثال سمندر میں موج کی سی ہے جو اس سے علیحدگی کے لئے مضطرب اور بے قرار رہتی ہے۔ اسی کے سبب سمندر میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیں ایک قطرہ آب کو ہی لیجئے جو پانی میں مل کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اس کی آبرو تو اسی لمحے تک قائم رہتی ہے جب تک وہ سمندر سے علیحدہ رہ کر اپنے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔

مراد یہ کہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ کر فرد اپنی شناخت کرا سکتا ہے اور یہی انفرادیت اس کو منزل کا پتہ دیتی ہے۔

پروانہ اور جگنو

پروانہ

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو   کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو

اللہ کا سو شکر، کہ پروانہ نہیں میں   دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

معنی: دریوزہ گر: بھکاری۔

یہ مختصر سی نظم محض دو اشعار پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر اقبال نے مکالمہ کی صورت میں دو ایسے ننھے ننھے پرندوں کی فطرت اور کردار کا حکیمانہ انداز میں تجزیہ کیا۔ اس میں ایک مکالمہ پروانے کا ہے اور دوسرا جگنو کا! دلچسپ بات یہ کہ محض ایک ایک شعر میں انہوں نے ان کرداروں کی تجزیہ نگاری کرتے ہوئے دو بڑے موضوعات کو محض دو اشعار میں سمو دیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کا ایک بڑے شاعر کی قادر الکلامی اور حکیمانہ روش کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروانہ

① اقبال یہاں اپنی تخیلی قوت کے حوالے سے پروانے اور جگنو کو ایک ہی مقام پر لے آتے ہیں۔ اس شعر میں جگنو کو مخاطب کرتے ہوئے پروانہ یوں گویا ہوتا ہے کہ میری فطرت تو شمع کی روشنی پر قربان ہو کر مرمٹنے کی ہے جب کہ تجھ میں قطعی طور پر ایسی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ تیرے پروں سے تو ایسی آگ برآمد ہوتی ہے جس میں حدت اور حرارت بھی نہیں ہوتی اس اعتبار سے تیرا وجود محض ایک بیکار جنس کے سوا اور کچھ نہیں!

جگنو

② اس مکالے اور الزام تراشی پر کسی قسم کی برہمی کا اظہار کئے بغیر جگنو، پروانہ سے مخاطب ہو کر یوں جواب دیتا ہے کہ تو محض روشنی پر جل مرنے کے عمل پر نازاں ہے۔ اسی باعث میں پروردگار کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے تجھ جیسا نہیں بنایا۔ میں تو خود اپنی روشنی سے فضا کو منور کرتا ہوں اور تیری طرح دوسروں کی روشنی پر مرمٹنے کا قائل نہیں۔ مراد یہ ہے کہ ہر جاندار کی بنیادی خصوصیت اس کا ذاتی جوہر ہی ہوتا ہے۔

جاوید کے نام

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ! — خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ!
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود — ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی — خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ!
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی — خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ!
ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال — کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ!

ہر چند کہ یہ نظم جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے علامہ اقبال نے اپنے فرزند ارجمند جاوید اقبال کے لئے تخلیق کی اس میں کچھ نصیحتیں بھی ہیں۔ دانشمندانہ مشورے بھی اور دعائیں بھی ہیں۔ اپنے کینوس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ نظم محض جاوید تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مخاطب پوری ملت کے نوجوان

ہیں۔

① اس شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ اے فرزند عزیز! اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کر لے کہ خودی ہی ایسا جذبہ ہے جس کو اپنانے سے فرد کو حیات جاودانی نصیب ہو سکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ جذبہ خودی ہی ہے جو افراد اور قوموں کے لئے عروج و ارتقاء کی منزل فراہم کرتی ہے۔

② یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی مقصد لے کر آتا ہے۔ یہی مقصد اسے ارتقاء کی منزل سے ہم آہنگ بھی کرتا ہے اور اطمینان قلب بھی بخشتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ظاہری نمود و نمائش کوئی شے نہیں۔ اصل مسئلہ وہ زندگی ہے جو بامقصد ہو۔ یہی جذبہ فرد کو عملی جدوجہد کا حامل بناتا ہے۔

③ اب ذرا ایک پرندے کوے کی جانب دیکھو کہ وہ ادھر ادھر منہ مار کر بڑی عیاری اور چالاکی سے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسروں کا مال تو ہڑپ کر جاتا ہے لیکن خود اپنی جدوجہد کے ذریعے کبھی بھی روزی حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بلند پروازی مفقود ہے۔ یہ بھی جان لو کہ اگر کسی بلند پرواز شاہین کا بچہ کوے کی صحبت میں رہے گا۔ تو وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے محروم ہو کر اس کی سی عادتیں اختیار کر لے گا۔ مراد یہ ہے کہ صحبت بد سے گریز کرو کہ یہ انسان کے اپنے کردار کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

④ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ پورے معاشرے پر نظر ڈالیں تو اس امر کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ انسانوں میں غیرت و حیا کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ کسی بھی برائی کو قبول کرتے ہوئے ان کو کسی طرح کی پشیمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سوائے بیٹے! اس صورت حال کے پیش نظر میں خدائے عزو جل سے یہی دعا کرتا ہوں کہ تجھ میں غیرت و حیا کا جذبہ برقرار رہے اور تیرا شباب ہمیشہ داغدار ہونے سے بچا رہے۔

⑤ آخری شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ جہاں تک میری زندگی اور کردار کا تعلق ہے اس امر سے واضح ہو جائے گا کہ میں ایک خوش طبع' خوش اخلاق اور خوش ہونے کے سبب ان خانقاہوں کے قریب تک نہ پھٹک سکا جو تنگ ظرف' خشک طبع اور مفسد ملاؤں کی کمین گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نوجوانوں کو جہاں رند مشرب لوگوں کی صحبتوں سے گریز کرنا چاہئے وہاں متذکرہ قسم کی خانقاہوں سے احتراز بھی لازم ہے کہ ہر دو مقامات کا ماحول غیرت و حیا سے عاری ہو چکا ہے اور نوجوان نسل کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

گدائی

میکدے میں ایک دن اک رند زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے؟
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا؟

اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا

اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی   دینے والا کون ہے؟ مرد غریب و بے نوا!
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج   کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا!

(ماخوذ از انوری)

اقبال کے بقول یہ نظم مصنوعی سطح پر فارسی زبان کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر "انوری" کی نظم سے ماخوذ ہے لیکن اقبال نے جس انداز میں اپنے اشعار میں اس موضوع کا احاطہ کیا ہے وہ دیکھا جائے تو عملاً ان کے کمال فن کی دلیل ہے۔ نظم کے اشعار پر ان کی گرفت اس قدر مستحکم ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① ایک رند شراب خانے میں ایک مے نوش سے جس کی گفتگو دانائی پر مبنی تھی۔ یوں گویا ہوا کہ ہمارے شہر کا حاکم عملاً ایک بھک منگے سے کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ دوسرے بھک منگوں کی طرح اس میں بھی حیا اور غیرت کا کلی طور پر فقدان ہے۔

② اپنے دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے استدلال کیا کہ دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگوں کی دستار چھین کر اس نے اپنے سر کا تاج بنوایا ہے اور کتنے لوگوں کو بے لباس کر کے اس کے جسم کے لئے قبائے زریں تیار ہوئی ہے۔

③ کسانوں کی خون پسینے کی کمائی سے خراج اور ٹیکس کے نام سے وصول کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے شراب کے جام لنڈھاتا ہے اور غریب کسانوں کے کھیت کی مٹی اس کے لئے کیمیا ثابت ہو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ حاکم شہر اپنے مفادات اور عیش پرستی کے لئے محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے یعنی خود محنت سے جی چرا کر دوسروں کی محنت کی کمائی کو حلال سمجھتا ہے۔

④ صورت حال یہ ہے کہ اس کے دولت کدے میں جو چیز بھی موجود ہے وہ چھینی ہوئی یا مانگی ہوئی ہے۔ اور جن لوگوں سے یہ اشیاء حاصل کی گئی ہیں وہ غریب اور مفلس لوگ ہیں جو شب و روز خون پسینہ بہا کر اپنی روزی اور دوسری ضروریات زندگی فراہم کرتے ہیں۔ لیکن حاکم شہر ہے کہ بڑی ڈھٹائی اور بے غیرتی کے ساتھ پیداواری اشیاء کا بیشتر حصہ مفت میں ہڑپ کر جاتا ہے۔

⑤ دراصل حقیقت یہ ہے کہ ساری صورت احوال کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خواہ کوئی صدقہ یا بھیک مانگے یا پھر خراج طلب کرے وہ اور کچھ نہیں عملاً بھکاری اور فقیر ہے اور اس حقیقت کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے بات یہی ہے کہ فقیر ہو یا بادشاہ عملاً وہ بھکاری اور گداگر ہی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں! ان سب کی زندگیاں بھیک پر ہی گزر رہی ہیں۔

اقبال نے جس حکیمانہ انداز میں گداگری کے مسئلے کا تجزیہ کیا ہے وہ معاشرے کے لئے دیکھا جائے تو درس عبرت ہے۔ تاہم وہ لوگ جس سارے قضیے کے ذمہ دار ہیں وہ اس قدر بے حیا اور غیرت سے عاری ہیں کہ ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ملا اور بہشت

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا   حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت!

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت!
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال! — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

معنی: جدل: لڑائی۔ اختلاف۔ **قول و اقوال**: لفظی معنی اس نے کہا اور میں کہتا ہوں اس سے بھی میرا جھگڑا اور بحث ہے۔ **سرشت**: فطرت۔ خصلت۔ **بد آموزی**: بری تعلیم دینا۔ **ملل**: ملت کی جمع۔ قومیں۔ **کنشت**: بت خانہ یا غیر مسلموں کی عبادت گاہ۔

غالباً گذشتہ صفحات میں کسی مقام پر اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ "مسجد قرطبہ' لینن۔ خدا کے حضور میں' لالہ صحرا اور ذوق و شوق کے علاوہ "ملا اور بہشت! اقبال کی ان شاہکار نظموں میں سے ہیں جن کی بدولت اقبال کو ایک بڑا شاعر مانا اور جانا جاتا ہے۔ اس مختصری زیر تشریح نظم میں تو ان کا فن اوج کمال پر ہے۔ ملاحظہ کیجئے!

① ایک عرصے سے ملاؤں نے کج بحثی' منافقت اور تفرقہ پردازی کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اسی کے سبب بے شمار لوگوں خصوصیت کے ساتھ نوجوان نسل میں دین و مذہب کے ساتھ وہ لگاؤ نہیں کہ جو ہونا چاہئے۔ اقبال عمر بھر اپنے افکار کے ذریعے ملاؤں کے اس کردار کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ یہاں انہوں نے ملاؤں کے کردار کو جس خوبصورت انداز میں پینٹ کیا ہے وہ انتہائی لائق ستائش ہے۔ چنانچہ اس شعر میں وہ آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ اس وقت ملا کو بہشت میں بھیجنے کے لئے باری تعالیٰ نے حکم جاری کیا تو اتفاق سے میں بھی وہیں موجود تھا۔ چنانچہ ملا کی پذیرائی کے اس عمل کو دیکھ کر میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

② چنانچہ حق تعالیٰ سے میں نے گذارش کی کہ اگر میری تقصیر معاف کر دے تو تجھ سے یہ استفسار کرنے کی جسارت کروں کہ تو جو اسے بہشت میں بھیج رہا ہے تو یہ بھی سوچا کہ اس جیسے شخص کو وہاں کی حوریں' شراب طہورہ اور سبزہ و گل کیسے راس آئیں گے اور یہ چیزیں کیسے اس کے اطمینان قلب کا باعث ہو سکیں گی کہ وہ تو اپنی فطرت کے لحاظ سے لڑائی جھگڑے کا قائل رہا ہے۔

③ اس شعر میں بھی کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کے شعر میں موجود ہیں یعنی کہ کج بحثی اور لڑائی جھگڑا تو تیرے اس بندے کی سرشت میں شامل ہے جب کہ بہشت میں اس جیسے مشغلوں کی گنجائش کہاں ہے۔

④ قوموں اور ملتوں کو غلط راہ پر لگانا اور مختلف حیلے بہانوں سے ان میں پھوٹ ڈالنا تو ہمیشہ اس کی سرخوشی کا باعث ہوتا ہے جب کہ جنت میں تو نہ مسجدیں ہوں گی نہ گرجے اور نا ہی دوسری عبادت گاہیں! جن کو یہ شخص جھگڑے کی بنیاد بناتا ہے۔ اقبال نے یہی موضوع اپنے بے شمار اشعار میں چھیڑا ہے۔ وہ بوجوہ ملا سے اکثر و بیشتر بدظن نظر آتے ہیں کہ ان کے نزدیک ملا کا کردار بس یہ ہے کہ

دین ملا فی سبیل اللہ فساد

دین و سیاست

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری!
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری!
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری!

معنی: رہبانیت: ترک دنیا۔ **خصومت**: دشمنی۔ **سربزیری**: لفظی معنی سر نیچے رکھنا۔ سرنگونی۔ **نابصیری**: اندھاپن۔ کوری۔ **صحرانشین**: لفظی معنی۔ بیابان کا رہنے والا۔ **بشیری**: بشارت دینا یعنی لوگوں کو راہ حق پر چلا کر اس کے ثواب کی خوشخبری سنانا۔ **نذیری**: لفظی معنی ڈرانا۔ **جنیدی**: حضرت جنیدؒ بغدادی کی صفت مراد ہے دین داری سے۔ **اردشیری**: اردشیر ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔ یہاں اس سے مراد شہنشاہی ہے۔ یعنی سیاست۔

① علامہ اقبال نے اس نظم میں یہ وضاحت کی ہے کہ اسلام نے سیاست اور دین کو مربوط کیا ہے جب کہ عیسائیت مذہب اور سیاست کے مابین جو ربط ہونا چاہئے اس کو ختم کر دیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ خامی تھی کہ کلیسا نے اپنے عقائد کی بنیاد ترک دنیا پر رکھی۔ مقصود یہ تھا کہ دنیاداری اور اس کے جملہ معاملات کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھا جائے۔ اس صورت حال میں دین اور سیاست کی یکجائی کے امکانات کا عمل دخل کس طرح سے ہو سکتا تھا؟

② بادشاہی اور رہبانیت کے مابین تو ازل ہی سے شدید اختلافات چلے آ رہے ہیں اس لئے کہ حاکمیت کا تصور تو انسان کی بلند مرتبت کا حامل ہے جب کہ ترک دنیا کا معاملہ انسان کو پستی کی طرف دیکھنے والا اور غیر فطری ہے۔

③ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب مذہب سے سیاست نے اپنا پیچھا چھڑا لیا اور یوں دونوں کے مابین جو رابطہ تھا ختم ہو گیا اس کے باوجود پادریوں کی اجارہ داری بھی ایک طرح سے ختم ہو کر رہ گئی۔

④ کہنا یہ ہے کہ جب دین و سیاست کے مابین جو رشتہ تھا وہ ٹوٹ گیا تو سربراہ مملکت اور ان کے وزیر مشیر بے شک برسراقتدار تو رہے تاہم محض حرص و ہوس کے بندے بن کر رہ گئے۔ اس لئے کہ اخلاقی اقدار کا تصور ہی ختم ہو گیا تو بات آگے کیسے چلتی۔

⑤ دین اور سیاست کے ایک دوسرے سے علیحدگی کے باعث ان پر نا آسودگی نے ڈیرہ ڈال لیا۔ اور اس دو رخ اور متضاد رویے کے سبب تہذیب اور کلچر بے بصر ہو کر رہ گئے۔ اور دونوں میں نیکی اور بدی کا تصور بے معنی ہو کر رہ گیا۔ پھر معاملے یہاں اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ سارا نظام معاشرت درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔

⑥ متذکرہ انتشار کا یہ ردعمل تھا کہ پیغمبر انقلاب حضور سرور کائناتؐ نے مبعوث ہونے کے ساتھ جہاں دعوت اسلام دی اور وہاں معاشرے میں بھی انقلابی تبدیلیاں لانے کے لئے دین اور سیاست کو یکجا

کردیا اور دینی احکام کو ہی حکمرانی کا منشور قرار دیا۔ اس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ حاکم وقت پر بھی لازم ہے کہ وہ فرمان الٰہی کی ہر قیمت پر تعمیل کرے اور دوسروں کو بھی ان کی مکمل اطاعت پر آمادہ کرے۔ اس کا منطقی نتیجہ اس صورت میں نمودار ہوا کہ حاکم اور عام لوگ فطری طور پر ایک احتسابی عمل کے زیر اہتمام زندگی بسر کرنے لگے اور یوں خود بخود برائی سے دور ہوتے چلے گئے۔

⑦ حضورؐ نے احکام خداوندی کی روشنی میں یہ بات واضح کردی کہ دین اور سیاست کو یکجا کیے بغیر انسانی معاشرے اور انسانیت کا تحفظ ممکن نہیں۔ کسی بھی معاشرے بالخصوص اسلامی معاشرے میں یہ امر ناگزیر ہے کہ ہر دو بنیادی معاملات کے مابین ربط رہے۔ اسی صورت میں انقلاب کی تکمیل ممکن ہے۔

الارض للہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نور آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

معنی: دہ خدا: گاؤں کا مالک زمیندار۔ آبا: اب کی جمع۔ باپ دادا۔

① چار اشعار پر مشتمل اس نظم کا بنیادی موضوع زمین کی ملکیت کا مسئلہ ہے۔ احکام قرآنی اور تعلیمات اسلامی کے حوالے سے اقبال یہاں کہتے ہیں کہ زمین کا مالک زمیندار اور جاگیردار نہیں بلکہ خدائے ذوالجلال ہے۔ اور جو کاشتکار اپنی اپنی محنت سے اس کی آبیاری کرکے فصل اگاتا ہے وہ اگر کسی کے سامنے جوابدہ ہے تو وہ محض ذات خداوندی ہے۔ لہٰذا زمیندار اور جاگیرداروں کو جنہوں نے تمام زمینوں پر اپنی اجارہ داری کرکے مزارعین اور کاشتکاروں کو اپنا غلام بنایا ہے اور ان لوگوں کی خون پسینے کی کمائی سے ہی اپنی تجوریاں بھرتے ہیں اور پھر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔
سو اقبال زمینداروں اور جاگیرداروں سے استفسار کرتے ہیں کہ براہ کرم اتنا تو بتا دو! کہ وہ کون ہے جو زمین پر ہل چلا کر وہاں فصل اگانے کے لئے بیج ڈالتا ہے اور اس عمل کے لئے کس نے اسے اتنی صلاحیت عطا کی ہے پھر اس بیج کی پرورش کون کرتا ہے اور وہ کون ہے جو دریاؤں اور سمندروں کی موجود سے پانی کشید کرکے بادلوں میں محفوظ کرتا ہے اور پھر ان محفوظ ذخائر اگتی ہوئی فصلوں کو تازگی اور نشوونما کے مراحل سے گزارتا ہے۔

② اس سوال کا جواب بھی دے کہ انہی فصلوں کی پرداخت کے لئے پچھم سے جو ہوائیں آتی ہیں وہ کس کے حکم سے آتی ہیں۔ یہ زمین کس کی ہے؟ اور سورج جو روشنی فراہم کرتا ہے کس کے حکم سے کرتا ہے۔

③ وہ کون سی قوت ہے وہ وقتاً "فوقتاً" موسموں میں بھی تبدیلی لاتی ہے اور گندم کی فصل پکنے پر اس کے سنہری خوشے موتیوں جیسے دانوں سے بھر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کوئی نہیں!

④ اے زمینوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے والے شخص! یہ حقیقت تجھ پر واضح کرنی ضروری ہے کہ یہ زمین نہ تیری ہے نا تیرے آباء و اجداد اس کے مالک ہیں۔ نہ میری ہے بلکہ اس زمین کا مالک حقیقی تو وہ ربِ ذوالجلال ہے جس نے ہم سب کو اور پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔

ایک نوجوان کے نام

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی؟
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل؟ — نہ زورِ حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانی!
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں!
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی!
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں!
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے — امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں!
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے! بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر!

معنی: **استغنائے سلیمانیؓ:** استغنا کے لفظی معنی ہیں بے نیازی، دل کی سیری، ہر قسم کا احتیاج سے بے پروائی سلیمانؓ سے مراد حضرت سلیمان فارسی ہیں۔ **علم و عرفان:** عام لفظ ہیں لیکن یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو دماغی جوہروں کو جلا دیتا ہے۔ عرفان سے مراد کیفیت ہے جو تزکیۂ قلوب اور حقائق شناسی کا ذریعہ ہے۔

ہر چند کہ یہ نظم اپنے عنوان کے اعتبار سے ایک نوجوان کے نام ہے لیکن عملاً یہاں اقبال نے ملت اسلامیہ کے تمام نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے نصیحت کی ہے کہ تمہیں تن آسانی زیب نہیں دیتی بلکہ جفاکش ہونا چاہیے اور ضروری ہے کہ حیدر کرارؓ کی سی قوت و جراءت اور سلمان فارسی جیسا استغنا اپنے آپ میں پیدا کرو۔ یہی عوامل دنیا میں کامیابی و کامرانی کی دلیل ہیں۔ چنانچہ وہ نظم کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

① اے نوجوان! ہر چند کہ تیرے ایوان راحت میں عیش و عشرت کے تمام لوازمات یکجا نظر آتے ہیں۔ اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ تیرے جو صوفے بچھے ہوئے ہیں وہ مغربی طرز کے ہیں اور کمروں کو ایرانی قالینوں سے مزین کر رکھا ہے بے شک تیرے پاس دولت ہے اور دولت کی نمائش کا حق بھی تجھے حاصل ہے لیکن ان نمائشی اشیاء کی موجودگی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تجھے آرام پسندی اور عیش و عشرت کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں اور یہی وہ المیہ ہے جو مجھے خون کے آنسو رلاتا ہے۔

② دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے نوجوان! یہ دولت تو الگ رہی اگر تجھے کسی ملک کی بادشاہت بھی مل جائے تو اس سے اس وقت تک کچھ حاصل نہ ہو گا کہ اس کو مضبوط و مستحکم رکھنے کے لئے تجھ میں شیر خدا حیدر کرارؓ جیسی قوت اور جراءت و ہمت کے علاوہ حضرت سلمان فارسی جیسا استغناء موجود نہ ہو یعنی تو مذکورہ علائق دنیوی سے بے نیاز نہ ہو جائے۔

③ اور اس نوع کی بے نیازی عہد حاضر کی جو تہذیب ہے اس کی مصنوعی چکا چوند میں ملنا مشکل ہی نہیں

بلکہ ناممکنات سے ہے کہ اس تہذیب نے حرص و ہوس ایسی لعنتیں انسان پر مسلط کر دی ہیں جن سے چھٹکارا اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات پر عمل کرے۔ انہی تعلیمات کے ذریعے مسلمان عروج و ارتقاء کی منازل طے کرنے کے اہل بن سکتے ہیں۔

④ اے میرے عزیز! تجھے اس حقیقت کا مکمل ادراک ہونا چاہئے کہ جب نوجوانوں میں بلند ہمتی اور ارادوں میں استحکام کے جوہر پیدا ہوتے ہیں تو وہ اپنی منزلِ مقصود کی معراج کو چھو لیتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمت و حوصلے کے بغیر منزل تک رسائی ممکن نہیں۔

⑤ بے شک حالات کتنے ہی ناگفتہ بہ ہوں اور فضا کتنی ہی ناساز گار ہو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہئے کہ اس نوع کی مایوسی اور ناامیدی اس وقت جنم لیتی ہیں جب فرد میں علم و عرفان کے جوہر زائل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی ذات کی شناخت کے عمل اور معرفت خداوندی سے محروم ہو جاتا ہے۔ امید پر ہی دنیا قائم ہے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ منزل کو پا لینے کے لئے عملی جدوجہد کرتا رہے اور اس کا نتیجہ کیا حاصل ہو گا۔ یہ سب خدا پر چھوڑ دے۔ مومن کی حقیقی شان اور اس کا کردار ہی یہی ہے۔

⑥ اے نوجوان! اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ جس طرح شاہین کسی ایسے مقام پر نہیں ٹھہرتا جہاں محض مصنوعی آرام و آرائش ہو بلکہ وہ تو پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں جا کر بسیرا کرتا ہے تو بھی شاہین کے مانند ہے جس کی عملی زندگی آرام و آسائش اور عیش و عشرت تک محدود نہیں ہونی چاہئے بلکہ جفاکشی اور بلند حوصلگی تیرا شعار ہونا چاہئے!

نصیحت

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں!

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں!

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں!

معنی: سال خوردہ: بوڑھا۔ تلخ: کڑواہٹ۔ انگبیں: شہد۔

① یہ نظم بھی اقبال کے مخصوص اندازِ فکر کی حامل ہے جس کے دو بنیادی اور مرکزی کردار ہیں۔ ان میں ایک تو ایسا شاہین ہے جو تجربہ کار ہے اور عمر کے آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔ دوسرا کردار شاہین کا بچہ ہے۔ اس مختصر لیکن جامع اور مکمل نظم کے تین شعر ہیں جن میں ایک پوری داستان بیان کر دی گئی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ نظم بھی اس سے پچھلی نظم سے معنوی سطح پر خاصی مشابہت رکھتی ہے چنانچہ نظم کے تینوں اشعار میں جو مکالمہ کیا گیا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

① ایک تجربہ کار اور عمر رسیدہ شاہین نے اپنی نسل کے ایک نو عمر شاہین بچے سے کہا کہ میری دعا تو یہ ہے کہ ربِ ذوالجلال تیرے بازوؤں میں آسمان کی بلندیوں تک اڑنے کی صلاحیت پیدا کرے۔

② اے عزیز! یہ بات بھی ذہن نشیں کر لے کہ جوانی سخت کوشی، جفاکشی اور جدوجہد کے عمل سے عبارت ہے۔ کوئی بھی جاندار عمر کے اس حصے میں اگر ان خصوصیات کو نہیں اپناتا تو زندگی میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ ان مراحل کے ضمن میں بسا اوقات بڑے سخت معاملات کا سامنا

بھی ...نا پڑتا ہے لیکن نتیجہ ہمیشہ کامیابی اور کامرانی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے کہ محنت اور جدوجہد کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔

③ اور یہ بھی جان لے کہ جو لطف اڑتے ہوئے کبوتر پر حملہ آور ہونے اور اس پر جھپٹنے کے عمل میں حاصل ہوتا ہے وہ مزہ تو شاید اس کبوتر کا خون پینے میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ان تین اشعار سے مراد یہ لی گئی ہے کہ زندگی عملی جدوجہد کے بغیر بے معنی شے ہے اور ہر بلند ہمت اور جفاکش انسان اس نوع کی جدوجہد میں ہی وہ لطف محسوس کرتا ہے جو فی الواقع جدوجہد سے حاصل کی ہوئی اشیاء میں نہیں ملتا۔

لالہ صحرا

یہ گنبد مینائی! یہ عالم تنہائی! — مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی!
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو! — منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی؟
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ — تو شعلہ سینائی! میں شعلہ سینائی!
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا — اک جذبہ پیدائی! اک لذت یکتائی!
غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو — ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی!
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ — دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی!
ہے گرمی آدم سے ہنگامہ عالم گرم — سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی!
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو — خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی!

علامہ اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے "لالہ صحرا" ان کی بہترین اور شاہکار نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں جو امیجری ہے وہ اقبال کے فنی اجتہاد کی دلیل ہے۔ نظم کے اولین شعر میں انہوں نے گنبد مینائی اور عالم تنہائی کے تلازمات سے ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے جو ایک مخصوص صورت حال کا آئینہ دار ہے اور اس کے بعد دوسرے شعر سے "لالہ صحرا" سے مکالمہ کرتے اور حکمت و دانش کے موتی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

① صحرا کی وسعت اور فراخی! جس پر نیلگوں آسمان کا گنبد! اس ماحول میں اے "لالہ صحرا" تیری موجودگی حیران کن ہے جب کہ میرے لئے تو یہ سب کچھ خوفزدہ کرنے کا سبب ہے۔ عملی سطح پر یہ کیفیت تو ترک دنیا کے عمل کی مظہر ہے جب کہ میرے نزدیک زندگی ترک دنیا نہیں بلکہ اس میں موجود رہ کر اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے عملی جدوجہد کا نام ہے۔

② ہرچند کہ اپنی بے عملی کے سبب ایک ایسے مسافر کی مانند ہوں جو کہ گم کردہ راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور تیرا وجود بھی مجھے کچھ اپنے سے ملتا جلتا محسوس ہوتا ہے۔ میری طرح تو نے بھی کبھی سوچا کہ تیری منزل کون سی ہے جب کہ تو نے تو خود کو صحرا و بیاباں تک محدود کر لیا ہے۔ اس ماحول میں آخر تیرے حسن کا قدرداں کون ہے؟

③ یہ ایک المیہ ہے کہ دنیا کے پہاڑ اور اس کے دامن اب پیغمبر خدا حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ جیسی بلند ...

ہستیوں کی آماجگاہ نہیں رہے ورنہ میرے سینے میں بھی وہی شعلہ موجود ہے اور تیرے سینے میں جو حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر نظر آیا تھا اور جس کی تاب نہ لا کر وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ مراد یہ ہے کہ تیری طرح مجھ میں بھی وہ خصوصیتیں موجود ہیں جو حسن حقیقی کی آئینہ دار ہیں لیکن ہوا یوں ہے کہ ان کا ادراک رکھنے والے لوگ ناپید ہو چکے ہیں۔

④ اسی پس منظر میں یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ اے لالہ صحرا، تو شاخ کی کوکھ سے کیوں بر آمد ہوا اور میں عدم سے وجود میں کیوں آیا تو اس کا جواب بھی شاید مشکل نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہر شے میں نمود و نمائش کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ یہی جذبہ تیری تخلیق کا سبب بنا اور یہی جذبہ میری تخلیق کا! دونوں کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں آکر اپنے اپنے مقام سے ذاتی انفرادیت اور خود نمائی کا اظہار کیا جائے!

⑤ عشق و محبت کی راہیں اس قدر کٹھن ہیں کہ ان سے خدا کی مدد کے بغیر عاشق عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس راہ کا ایک ایک مرحلہ پورے بیابان خارزار سے گزرنے کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں دلی مقصد کا حصول انتہائی مشکلات کا حامل ہے۔

⑥ عملی جدوجہد کے ذریعے بے شک ہر شخص اپنی منزل پا لیتا ہے لیکن کچھ بدقسمت افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو تمام تر عملی جدوجہد اور اس کے علاوہ ہر نوع کی مشکلات سے گزرنے کے باوجود اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ فطرت بھی ایسے لوگوں کی ناکامی پر کسی نہ کسی انداز میں اظہار تاسف کئے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ انسان کو اس کی محنت اور جدوجہد کا پھل کسی نہ کسی صورت میں مل ہی جاتا ہے۔

⑦ کائنات میں اگر کوئی فرد سرگرم عمل ہے تو وہ محض انسان ہے جو دنیاوی سطح پر تہذیب و تمدن اور معاشرے کی بھلائی کے لئے ہر ممکن سعی کرتا رہتا ہے ورنہ سورج اور ستارے ہرچند کہ تاریکی میں جلوہ آرا ہوتے ہیں اور دنیا کو منور کرنے کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی حیثیت محض تماشائی کی سی ہے۔ سارا زمام کار تو انسان کے ہاتھوں میں ہے۔

⑧ کاش مجھے بھی رب ذوالجلال ان کیفیتوں سے نواز دے جو اس نے صحرا کی ہواؤں کو بخشی ہیں کہ تنہائی کے سناٹے میں جاری و ساری رہتی ہیں۔ ایک طرف سکون اور دوسری جانب سرمستی اور رعنائی سے ان کا وجود عبارت ہے۔ میں بھی انہی کیفیات میں زندگی گزارنے کا خواہاں ہوں۔

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار!
گل و نرگس و سوسن و نسترن! شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن!
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں!
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ! — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ!
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام!
پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصل گل روز روز!
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات! — وہ مے جس سے ہے مستی کائنات!
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل! — وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل!

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے!

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ!
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!
گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!
دل طور سینا و فاراں دو نیم — تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!
مسلماں ہے توحید میں گرمجوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!
تمدن تصوف شریعت کلام — بتان عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی!
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب — مگر لذت شوق سے بے نصیب!
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا!

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر! — جوانوں کو پیروں کا استاد کر!
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے — نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے! — دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے!
جگر سے وہی تیر پھر پار کر! — تمنا کو سینوں میں بیدار کر!
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر! — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

جوانوں کو سوز جگر بخش دے مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر!
بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات!
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں! مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز! مری خلوت و انجمن کا گداز!
امنگیں مری، آرزوئیں مری! امیدیں مری، جستجوئیں مری!
مری فطرت آئینۂ روزگار! غزالان افکار کا مرغزار!
مرا دل مری رزم گاہ حیات! گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات!
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے!

دمادم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود!
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل خوش آئی اسے محنت آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی! عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی!
یہ وحدت ہے، کثرت میں ہر دم اسیر! مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر!
یہ عالم، یہ بتخانۂ شش جہات! اسی نے تراشا ہے یہ سومنات!
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور!
کہیں جرۂ شاہین سیماب رنگ لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور!
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور!

فریب نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوق پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے! تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے!

ہوا جب اسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں!
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے! — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے!
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس! — ازل سے ابد تک رمِ یک نفس!

زمانہ کے زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے!

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے! — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے!
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات! — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند! — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک! — من و تو میں پیدا من و تو سے پاک!
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے! — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے!
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی — دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں! — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں!
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے!
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں! — یہ بیرنگ ہے' ڈوب کر رنگ میں!
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے! — نشیب و فراز و پس و پیش سے!
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے!

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہی اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فروفالِ محمود سے درگزر — خودی کو نگہ رکھ، ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام!
یہ عالم، یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم، یہ بتخانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں! — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں!
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر!

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید! زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید!
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخی فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار!
تو ہے فاتح عالم خوب و زشت! تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت!
حقیقت پہ ہے جامہ حرف تنگ! حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ!
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس مگر تاب گفتار کہتی ہے بس!

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم!

اقبال نے یوں تو اس نوعیت کی متعدد نظمیں تخلیق کی ہیں لیکن زیر تشریح نظم جو "بال جبریل" میں "ساقی نامہ" کے عنوان سے شامل ہیں اس موضوع پر ان کی طویل ترین نظم ہے۔ جو ننانوے اشعار اور سات بند پر مشتمل ہے۔ یہ بند علی الترتیب موسم بہار، عہد حاضر کے انقلابات اور ملت اسلامیہ کی پستی، باری تعالیٰ کے حضور ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کے لئے دعائیں، زندگی کے حقائق، زندگی کی خصوصیات، راز خودی اور خودی کے محاسن و اوصاف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری چند اشعار فلسفہ زندگی اور پیغام سے عبارت ہیں، ملاحظہ ہوں۔

پہلا بند

① علامہ اقبال نے اس ابتدائی بند میں موسم بہار کے حوالے سے جو خوبصورت امیجری پینٹ کی ہے وہ اردو زبان کی پوری نیچرل شاعری میں انتہائی انفرادیت کی حامل نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ موسم بہار کی آمد آمد ہے اور پہاڑوں کے دامن میں اس طرح سے رنگ برنگے پھول نشوونما پا رہے ہیں کہ ان کو دیکھ کر باغ ارم کا گمان ہوتا ہے۔

② اس باغ ارم میں گلاب، نرگس، سوسن، و نسرین کے علاوہ "لالے" کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ ان کا وجود گناہوں کو خیرہ کیے دیتا ہے۔

③ ساری کائنات انہی رنگارنگ پھولوں میں چھپ کر رہ گئی ہے۔ ان کے حسن نے اس کو مسرور و مسحور کر دیا ہے۔ عمارات پر بھی نظر ڈالیے تو ان پر بھی ان پھولوں کے رنگ یوں جگمگا رہے ہیں جیسے ان میں لگے ہوئے پتھروں کی رگ رگ میں سرخ رنگ لہو گردش کر رہا ہو۔ مراد یہ ہے کہ بہار کے پھولوں نے چار سو رنگ و نور پھیلا رکھا ہے۔

④ اس منظر سے ساری فضا رنگ برنگی ہو کر رہ گئی ہے۔ پھولوں کی مہک اور عطر بیز ہوائیں دل و نظر کو سرور بخش رہی ہیں۔ انسان تو انسان، پرندے تک جھومتے جھامتے اپنے آشیانوں سے باہر نکل کر اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

⑤ موسم بہار محض عام فضاء پر ہی اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ پہاڑ اور دریا بھی اس سے لطف اندوز ہوتے

ہیں چنانچہ پہاڑوں میں سے برآمد ہونے والے ندی نالوں کا یہ عالم ہے کہ کبھی تو وہ دھیرے دھیرے اور خراماں خراماں رواں دواں ہوتے ہیں اور کبھی رکتے ہوئے اور سرسراتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

⑥ گردوپیش کی فضاء سے یہ ندی نالے بھی اس طرح مسحور ہو رہے ہیں کہ کبھی جوش مسرت سے اچھل پڑتے ہیں اور ان کی روانی میں تیزی آجاتی ہے۔ یہ ندی نالے تمام پر پیچ راستوں سے بل کھاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

⑦ دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنی تیز روانی کے سبب جب ان ندی نالوں کی راہ میں کوئی پتھر آجائے تو ان کو ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں۔ اس لمحے یوں لگتا ہے جیسے وہ پہاڑوں کے دل چیر رہے ہوں۔ واضح رہے کہ یہ زیر تشریح تینوں اشعار اپنے مضمون کے اعتبار سے موسم بہار میں پہاڑی ندی نالوں کی کیفیت کے مظہر ہیں۔

⑧ پہلے بند کے آخری پانچ اشعار میں اقبال موضوع کے بنیادی کردار ساقی سے مخاطب کرتے ہیں کہ اور باتوں کے علاوہ اس جانب بھی توجہ دے کہ زندگی تجھے کیا پیغام دے رہی ہے۔ اس شعر سے قبل کوہ و ندی کے حوالے سے جو حرکت اور جوش کی بات کی گئی ہے وہی دراصل بندی حیثیت کی حامل ہے۔

⑨ اے ساقی! یہ تو ایک بدیہی امر ہے کہ یہ فصل گل اور موسم بہار کا مخصوص وقت ہوتا ہے۔ روز روز ان کی آمد ممکن نہیں! للہذا اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ تو مجھ ایسا نشہ آور مشروب دے جو اس پردے کو جلا کر خاک کر دے کہ جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہیں۔

⑩ مجھے وہ نشہ پلا جو ضمیر حیات کی روشنی اور تازگی بخشتا ہے اور جس کے سرور سے ساری کائنات وجد میں آجاتی ہے۔

(11) ایسا نشہ جو آغاز کائنات کے سوز و ساز سے عبارت ہے۔ یہی نہیں بلکہ عشق حقیقی کے حوالے سے آغاز کائنات کے بھید کھولنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

(12) اور اے ساقی! جب تو راز عشق سے پردہ اٹھا دے گا تو مجھ ایسا کمزور و ناتواں شخص بھی اپنے انتہائی طاقتور حریف سے اس طرح نبرد آزما ہو سکے گا جس طرح کہ ایک ننھی چڑیا عقاب کے مقابلے پر سر دھڑ کی بازی لگا دے۔

دوسرا بند

① نظم کی تشریح کا آغاز کرتے ہوئے اس امر کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی تھی کہ دوسرے بند میں علامہ اقبال نے اپنے عہد میں عالمی سطح پر جن تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا ان کو اپنے افکار و تجربات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ آج کا عہد انقلابی تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ جس طرح کسی گیت کے لئے نئے راگ اور نئے سازوں سے کام لے کر موسیقار روایت سے ہٹ کر نئی دھن ترتیب دیتا ہے۔ اسی طرح معاشرتی سطح پر تمام دنیا میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

② ان انقلابی تبدیلیوں کے سبب ساری دنیا کو اب اس حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ یورپ اپنے استعماری نظام کو زندہ رکھنے کے لئے کس طرح دوسرے ممالک کا عیاری اور مکاری کے ساتھ استحصال کرتا ہے۔ اس راز کے اچانک افشاء ہونے سے خود استعمار پسند یورپی ممالک حیرت زدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے

لئے یہ امر انتہائی خدشات کا سبب ہے کہ ان کے زیر اقتدار ملک بھی اس عیاری اور مکاری سے آگاہ ہو گئے ہیں۔

③ بدلتے ہوئے حالات میں کیفیت یہ ہے کہ سیاست کے قدیم ہتھکنڈے ناکارہ اور ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری دنیا بادشاہی ملوکیت اور آمریت سے بیزار ہو چکی۔ اب کوئی بھی اس فرسودہ نظام کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

④ سب اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سرمایہ داری کا استحصالی نظام اپنے منطقی انجام تک پہنچ کر ختم ہو گیا ہے۔ بالکل ایک ایسے مداری کی طرح جو تماشا دکھاتا ہے اور تماشائیوں سے اس کا معاوضہ وصول کر کے اپنی راہ لیتا ہے۔ اسی طرح سے استعماری نظام نے بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا ہے۔

⑤ حد تو یہ ہے کہ اہل چین جن کو مغرب نے اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہوئے منشیات کا عادی بنا دیا تھا اسی عادت بد کے سبب وہ ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔ اب وہ بھی شعوری سطح پر بیدار ہونے لگے ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کی خاطر مغرب کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ یہی کیفیت ہمالہ کے نواحات کی ہے۔ یعنی ہندوستان اور اس کے قرب کے ممالک میں بھی استعماریت سے آزادی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔

⑥ یہاں سے اقبال مذکورہ بالا پس منظر کے حوالہ سے بڑی دل سوزی کے ساتھ ملت اسلامیہ کے انحطاط و زوال پر روشنی ڈالتے ہیں کہ عالمی سطح پر انقلابی تبدیلیوں کے باوجود ملت مسلمہ شعوری سطح پر عصری انقلابات کا ادراک رکھنے کے باوجود انحطاط سے دوچار ہے اور جس طرح کوہ طور پر حضرت موسیٰ اور فاران کی چوٹی پر حضور سرور کائنات نے معجز نمائی کی۔ آج بھی پوری ملت اس طرح کے معجزوں کی منتظر ہے۔ خود کسی قسم کی عملی جدوجہد سے گریزاں ہے۔

⑦ ہرچند کے مسلمان توحید الٰہی کے ضمن میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن غلامی کے دور میں اس کے عقائد میں جس طرح سے ردوبدل ہوا آج بھی وہ اس کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔

⑧ حد تو یہ ہے کہ معاشرت اور رہن سہن ہی نہیں تصوف' شریعت اور علم کلام غرض آج کے مسلمانوں میں اسلام کے نظریات کی بجائے عجمی معتقدات کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

⑨ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم' فضول اور لغو معاملات سے ہم آہنگ ہو کر رہ گئی ہے۔ اور پوری ملت اسلامیہ جو انقلابی نظریات کی آئینہ دار تھی اب وہ محض توہمی روایات میں دب کر رہ گئی ہے۔

⑩ بے شک مسلمان علماء اور واعظین کی پر زور خطابت سننے والوں کے دل کو تو لبھا لیتی ہے مگر ان تقریروں میں حقیقت کی وہ چاشنی موجود نہیں ہوتی جو قلب و روح کو منور کرتی ہے۔

(11) اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ان علماء اور واعظین کا بیان منطق اور فلسفے کے علوم سے آراستہ ہوتا ہے لیکن وہ جو ثقیل و پرشوکت الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ وہ بالعموم عام سامع کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں۔ اس صورت میں ان تقریروں کا اثر کیا خاک ہو گا؟

(12) ملت اسلامیہ میں ایک زمانہ تھا کہ تصوف پر اعتقاد رکھنے والا شخص خدائے ذوالجلال اور اس کی

وضع کردہ حقیقتوں پر جان نثار کرنے کے لئے آمادہ ہوتا تھا۔ یہی نہیں اس کے دل میں بندگان خدا سے بھی بے پناہ جذبہ محبت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غیرت مندی اور جراءت اس کے کردار کی بنیادی خصوصیات ہوتی تھیں۔ لیکن اب تو کیفیت ہی مختلف ہے۔

(13) آج کی صورت حال تو یہ ہے کہ وہی صوفی جس کی خصوصیات گزشتہ شعر میں بیان کی گئی ہیں۔ افسوس کہ اب وہ غیر اسلامی اور غیر حقیقی روایات میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور اپنی روایات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

(14) اس ساری کیفیات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے دلوں میں عشق حقیقی کا جو شعلہ روشن تھا وہ بجھ چکا ہے اور عملاً ملت اسلامیہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔

تیسرا بند

معنی: سیار: چلنے پھرنے والا۔ گردش کرنے والا۔ **غزالان افکار:** خیالات کے ہرن یعنی خیالات۔

اس بند کے اشعار میں ایک بار پھر منظر تبدیل ہوتا ہے اور اقبال دعائیہ انداز میں خدائے ذوالجلال سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اس نظم میں ساقی سے بالعموم ان کی مراد رب العزت ہے۔ ان اشعار میں تو یہ حقیقت اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

① لغوی اور معنوی سطح پر اس شعر کا مفہوم بس اتنا ہی ہے کہ اے ساقی مجھے پھر وہی پرانی شراب سے سرشار کرا اور اسی جام کا دور چلا جو انتہائی سرور بخشتا تھا لیکن ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو اس شعر میں اقبال رب ذوالجلال سے درخواست کرتے ہیں کہ خداوندا! مجھے ایک بار پھر عشق محمد مصطفیٰ کی دولت سے نواز دے کہ یہی عہد قدیم سے روز حشر تک میرا سرمایہ حیات اور جزو ایمان ہے۔

② عشق رسول مقبولؐ کی انتہائی معراج میرے قلب و روح کا سرمایہ ہو اور میری خاک کا ہر ذرہ جگنو کی طرح پرواز کرے جس سے ساری فضا منور ہو جائے۔

③ اے مولائے کائنات! ملت مسلمہ کی ذہنیتوں میں انقلاب برپا کر دے تاکہ وہ غیروں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ اسی طرح جو ملت کے نونہال ہیں کہ وہ دینی اور انسانی سطح پر اپنے اجداد سے بھی بازی لے جائیں۔

④ ملت اسلامیہ دیکھا جائے تو تیری عنایات کے طفیل ہی زندہ و پائندہ ہے۔ اور تیرے ہی لطف و کرم کے سبب تمام تر مشکلات کے باوجود اسے فروغ حاصل ہے۔

⑤ اے مالک حقیقی! مجھے اتنی توفیق عطا فرما کہ اپنی منزل تک رسائی کے لئے عملی جدوجہد سے کام لے سکوں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے لازم ہے کہ علی مرتضیٰؓ جیسی جراءت، ہمت و حوصلہ اور ابوبکر صدیقؓ جیسا سوز و گداز حاصل ہو۔ یہی وہ عوامل ہیں جو کامیابی کے ضامن بن سکتے ہیں۔

⑥ خدایا! ملت کے قلب و روح کو پھر سے عشق رسولؐ سے ہمکنار کرا اور منزل تک رسائی کے جذبے سے پھر اسے سرشار کر دے۔

⑦ اے رب العزت تیرے آسمان اور ستارے ہمیشہ سلامت رہیں اور دنیا میں وہ لوگ جو راتوں کی نیندیں قربان کر کے تیری بارگاہ میں سجدہ نیاز بجالاتے ہیں۔ وہ بھی زندہ سلامت رہیں۔

⑧ میں دست بدعا ہوں کہ ملت کے نوجوانوں کو سوز و گداز سے آشنا کر اور جس طرح میں عشق حقیقی کا پرستار ہوں اور جیسے میری نظریں نور حقیقی سے منور ہیں یہ صلاحیتیں نوجوانوں میں بھی پیدا کر دے۔

⑨ اے مولائے کل! ملت اسلامیہ کے ہر پیر و جواں کو مشکلات سے نکال کر ان کی منزل تک پہنچا دے۔ ان کی جو کشتی میری طرح گرداب میں پھنسی ہوئی ہے اسے بھی پار لگانے کا اہتمام کر!

⑩ تو مجھے بھی موت و زندگی کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کر دے اس لئے کہ یہ محض تیرا ہی وجود ہے جو تمام کائنات کے احوال سے باخبر ہے۔

(11) ملت مسلمہ جس ابتلاء میں گرفتار ہے اور انحطاط و زوال سے دوچار ہے اس پر میرا دل خون کے آنسو روتا رہتا ہے۔ یہی اذیت مجھے شب بھر بیدار رکھتی ہے۔ لیکن افسوس اس امر پر ہے کہ میری اس حالت سے کوئی واقف نہیں!

(12) اسی کیفیت کے سبب میں تیری بارگاہ میں نصف شب کے وقت نالہ و فغاں میں مصروف رہتا ہوں۔ تنہا ہوں یا کسی اجتماع کے مابین! ہر لمحے میرا قلب اسی کرب کا شکار رہتا ہے۔ اور ہر لمحے اضطراب مجھ پر مسلط رہتا ہے۔

(13) اے مولا! میری امنگیں اور آرزوئیں سب میری ذات تک محدود نہیں بلکہ پوری ملت کے لئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں اس کے لئے ہی بہتری کی امید اور جستجو کرتا رہتا ہوں۔

(14) میں تو ایک ایسا مفکر ہوں جو فطرتاً کائنات کے حقائق کا ادراک حاصل کرنے میں مصروف رہتا ہے اور میرا دل ہر نوع کے خیالات کا خزینہ ہے۔ جس میں انسان اور معاشرے کی بہبودی کے لئے جذبات موجزن رہتے ہیں۔

(15) اے رب کریم! میرا دل تو حیات انسانی کے جملہ مسائل کی آماجگاہ ہے جہاں ہر لمحے نیک و بد میں تصادم رہتا ہے۔ اور ہر نوع کے یقین و گمان کا مرکز ہے۔

(16) میں تو ایک فقیر و درویش کے مانند ہوں لیکن تو نے میری ذات میں جو خصوصیات پیدا کی ہیں اور جن کا تذکرہ میں اشارتاً گزشتہ چند اشعار میں کر چکا ہوں انہی کے دم پر میں امیری کا لطف حاصل کر رہا ہوں۔

(17) ان اشعار میں جو اسرار و رموز بیان کئے گئے ہیں تو جانتا ہے کہ ملت کے لئے وہ کس قدر کارآمد ہیں۔ تجھ سے اتنی ہی استدعا ہے کہ یہ جذبے ملت مسلمہ کے سینوں میں بھی داخل کر دے کہ تو اس عمل پر قادر ہے۔

چوتھا بند

معنی: حضر: سفر کے برعکس۔ اپنے گھر میں ٹھہرے رہنا۔ **مکافات:** بدلہ۔ **زوج** زوج۔ جوڑا جوڑا۔ **تیز جولاں:** تیز چلنے والی۔ **زود رس:** جلد پہنچنے والی۔

① اس بند میں اقبال نے زندگی کے ان اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا ہے جن کا ہر فرد کو ادراک نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ زندگی کا تمام کاروبار ہر لمحے جاری و ساری ہے۔ افراد کی عملی جدوجہد نے اس میں جوش و خروش پیدا کر دیا ہے۔ اسی کے سبب ہر شعبے میں ترقی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔

② جس طرح سے آگ کے ایک شعلے میں دھوئیں کی ایک رو پوشیدہ ہوتی ہے اسی طرح جسم حیات انسانی میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ زندگی ہی ہے جو اسے وجود عطا کر کے نمایاں کرتی ہے۔ مراد یہ کہ اصل شے روح حیات۔ ہے۔

③ ہر چند کہ حیات کو آگ، پانی، مٹی اور ہوا جیسے جملہ عناصر کی حدود میں رہنا گوارا نہیں لیکن یہ عناصر انسانی وجود میں جدوجہد میں ارتقاء کی علامت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کو خوشگوار انداز میں برداشت کر لیتی ہے۔

④ یہ نکتہ کہ زندگی مذکورہ چار عناصر کے پھندے میں جکڑی ہوئی بھی ہے اس کے باوجود انہی عناصر کے وسیلے سے چونکہ وجود قائم و دائم ہے اور انہی کے سبب ترقی کے مواقع نصیب ہوتے ہیں اسی لئے زندگی کے لئے جملہ عناصر ناگزیر ہیں۔

⑤ زندگی تو عملاً ظہور وحدت ہے تاہم اس کے منظر نامے میں جو اشیاء موجود ہیں وہ کثرت کی آئینہ دار ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ہر شے اور اس کا منظر جدا جدا اور ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک شے کی ہیئت ہر دوسری شے سے جداگانہ ہے۔

⑥ اور جو یہ دنیا ہے وہ ایک ایسے جھگڑے کی مانند ہے جو عملاً چھ سمتوں پر مشتمل ہے یہ بھی زندگی کی بدولت وجود میں آیا ہے یعنی زندگی کا وجود نہ ہوتا تو دنیا بھی نہ ہوتی۔

⑦ یہ عالم رنگ و بو ایسا ہے جس میں موجود ایک فرد کی شبیہ کسی دوسرے سے نہیں ملتی۔ کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں ہے کہ ہر فرد دوسرے سے عملاً مختلف ہے۔

⑧ ہر چند انجمن سجانے میں زندگی بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس کے بغیر آرائش انجمن بھی ممکن نہیں۔ اس کے باوجود یہ حیرت انگیز بات ہے کہ میری تیری محفل کے دوران بھی وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا رہتی ہے اور ہر کہ و مہ کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

⑨ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو زندگی عالمی سطح پر بے شمار اشیاء میں مختلف رنگ ڈھنگ سے نظر آتی ہے۔ کبھی بجلی کے تاروں میں کبھی ستاروں میں اس کی چمک موجود ہوتی ہے اور کبھی چاندی، سونے اور پارے میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غرض یہ کہ زندگی اپنے طور پر مختلف اشکال میں موجود ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کو گہری نظروں سے دیکھا جائے۔

⑩ امر واقعہ تو یہ ہے کہ زندگی ہی کی بدولت صحرا اور اس کے کانٹے دار درخت اور پھول نشوونما پاتے ہیں۔

(11) زندگی میں اس قدر قوت و استحکام ہے کہ تصادم کی صورت میں پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ جبرئیل علیہ السلام جیسا فرشتہ اور حوران جنت اگر بالمقابل ہوں تو انہیں بھی اپنے جال میں پھانسنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان میں اگر روحانی قوت موجود ہو تو اس کی رسائی بہشت بریں اور اس میں موجود فرشتوں اور حوروں تک ہو سکتی ہے۔

(12) کہیں اس امر کا امکان بھی ہوتا ہے کہ زندگی سے بھرپور کوئی لشکر اور اس کا سپہ سالار اپنے سے کمزور سلطنتوں کے خلاف خوں ریز جنگ کے بعد شکست فاش دے کر ان پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں اور ان پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی فکر کرتا ہے۔

(13) کہیں زندگی ایسی بالادست حیثیت میں ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی ذہانت سے حریفوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی ہے۔ غرض زندگی ہی وہ قوت ہے جو ہر شے پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی اہل ہوتی ہے۔

پانچواں بند

اس بند کے اشعار میں علامہ اقبال مزید ایک قدم آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی فکر و نظر میں زندگی کی کچھ ایسی حقیقتیں بھی ہیں جو عمومی سطح پر انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ چنانچہ ان اشعار میں وہ اسی نوعیت کے رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مطابق!

① زندگی میں کہیں کہیں جو یہ سکون اور ٹھہراؤ سا نظر آتا ہے۔ یہ تو دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں اس لئے کہ فی الواقع حرکت ہی حقیقی زندگی ہے۔ بے شک ظاہر بیں آنکھ اس مرحلے تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ کائنات کا ہر ایک ذرہ اضطراب سے دوچار ہے اور حرکت میں ہے۔

② اسی پس منظر میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انسانی وجود بھی ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور مختلف جہتوں سے ہم کنار رہتا ہے۔

③ اے دانشمند انسان حیرت ہے کہ تو اب بھی زندگی کو ایک ایسا راز تصور کرتا ہے جو افشاء نہیں ہوتا حالانکہ یہ بنیادی حقیقت ہے کہ زندگی تو بلند پروازی اور عروج و ارتقاء سے عبارت ہے۔

④ جان لے کہ زندگی تو بے شمار بلندیوں اور پستیوں سے ہو کر گزری ہے۔ حرکت اور گردش اس کی سرشت ہے اس کو تو منزل تک رسائی سے زیادہ سفر اور گردش ہی پسند ہے۔ وہ کسی پڑاؤ پر رکنے کا نام نہیں لیتی بلکہ ہمیشہ متحرک رہتی ہے۔

⑤ جہاں تک سفر کا تعلق ہے سو وہ زندگی کو متحرک اور بر سر عمل رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے سفر کو ایک حقیقت بھی تصور کر لینا چاہئے اور مجاز بھی! کہ سفر کی یہ دونوں صورتیں زندگی کے ہی بلاشبہ دو رخ ہیں۔

⑥ ہنگامہ خیزی' کشمکش اور ہر نوع کی آویزش دیکھا جائے تو ایسے عوامل ہیں جو زندگی کے لئے باعث سکون ہوتے ہیں۔ وہ اسی صورت میں عروج و ارتقاء کی منازل طے کر سکتی ہے کہ معروضی حالات کا دلیری اور جراءت مندی کے ساتھ مقابلہ کرے۔ صرف مقابلہ ہی نہیں بلکہ ان پر غلبہ حاصل کرنے کی سعی بھی کرے۔

⑦ اقبال کے بقول زندگی کی اصل حریف موت ہے اور جس مرحلے پر اسے موت کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اس سے مقابلہ بڑا سخت تھا۔ اس کے باوجود یہ زندگی میں جراءت و ہمت و حوصلہ ہی تھے کہ اس نے بالآخر موت کو شکست سے ہم کنار کر دیا۔

⑧ چنانچہ موت سے نبرد آزمائی کے وقت زندگی نے اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لے کر اسے گھٹنے ٹیکنے

ر مجبور کر دیا۔

⑨ فطرت کے ساتھ امتزاج کے سبب زندگی جنگلوں اور پہاڑوں میں اپنے تخلیقی رویے کے ساتھ فوج کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

⑩ چنانچہ زندگی کو اگر کسی پودے کی شاخ تصور کر لیا جائے تو ایک جانب تو پھول اسی شاخ سے ٹوٹتے ہیں دوسری طرف اسی شاخ سے پھولوں کی نمود ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ زندگی کا دوہرا عمل یہ ہے کہ اس ہاتھ سے دیتی ہے تو دوسرے سے لے لیتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس شعر میں اقبال نے مسئلہ آواگون کا اشارتاً ذکر کیا ہے۔

(11) سچی بات تو ہے کہ جو نادان اور احمق لوگ ہیں وہ زندگی کو ناپائیدار اور فانی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ زندگی تو ایسا نقش ہے جو مٹ مٹ کر ابھرتا ہے۔ یہ تو ایسی حقیقت ہے جو موت سے ہمکنار ہو کر بھی زندہ اور جاوداں رہتی ہے۔

(12) جان لے! کہ زندگی اس قدر تیز رفتار ہے جو آن کی آن میں اس منزل تک رسائی حاصل کر لیتی ہے جو اس کی مطلوبہ منزل ہو۔ یہ تو ایسی حقیقت ہے جس نے آغاز کائنات سے سانس کی آمد و شد کے حوالے سے اپنے وجود کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ موت قطعی طور پر اس کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

(13) زمانہ تو دنوں، مہینوں اور سالوں کے باہمی تسلسل کا دوسرا نام ہے اسی لئے یہ رواں دواں اور متحرک زندگی کی دوسری صورت ہے۔

چھٹا بند

معنی: تجسس: تلاش۔ جستجو۔ ڈھونڈ ڈھانڈ۔ تقویم: قیام۔ ثبات۔ مضبوطی استحکام پائیداری استقامت۔

اقبال کی بنیادی فکر اور فلسفہ دیکھا جائے تو خودی سے عبارت ہے۔ اس بند میں وہ خودی کے حوالے سے اپنے نظریات بیان کرتے ہیں۔ ان اشعار کے علاوہ علامہ کے اردو اور فارسی کلام کے علاوہ ان کے بعض مضامین میں خودی کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ تیرہ اشعار پر مشتمل یہ بند خودی کی ماہیت پیش کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① اگر انسان کے سانس کو ایک تلوار تصور کر لیا جائے تو پھر خودی کو اس تلوار کی دھار سمجھ لینا چاہیے اور اس حقیقت کی وضاحت کی زیادہ ضرورت بھی نہیں ہے کہ دھار کے بغیر تلوار کند اور بے مصرف ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس شعر سے مراد یہ ہے کہ خودی ہی دراصل روح حیات ہے اس کے بغیر زندگی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

② اس شعر میں بھی علامہ خودی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خودی ایک ایسا راز ہے جسے زندگی نے محفوظ اور پوشیدہ رکھا ہوا ہے اور یہ خودی ہی ہے کہ پوری کائنات کو بیداری کا پیغام دیتی ہے۔ جس طرح بے شعور انسان کا وجود بے معنی ہے اسی طرح کائنات خودی سے خالی ہو تو بے مقصد اور بے معنی بن کر رہ جاتی ہے۔

③ جلوت اور خلوت دونوں صورتوں میں خودی اپنا کمال دکھاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ خودی کی شکل میں سمندر ہے جو محض ایک قطرہ میں بند ہے۔ مراد یہ ہے کہ خودی تو ایک ایسا جوہر ہے جو پوری زندگی پر محیط ہے۔

④ خودی کی روشنی محض تاریکی ہی کو نہیں اجالے کو بھی زیادہ تابناک بنا دیتی ہے۔ یعنی خودی عملاً اندھیرے اجالے کا امتیاز کئے بغیر دونوں صورتوں میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اور کوئی شے اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ خودی تو کثرت و وحدت میں یکساں طور پر نمودار ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں عناصر سے خود کو علیحدہ رکھتی ہے۔

⑤ اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خودی کا وجود آغاز کائنات سے پہلے بھی تھا اور آئندہ روز حشر تک برقرار رہے گا۔ عملاً خودی کے نزدیک ہر دو زمانوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

⑥ مذکورہ صلاحیتوں کے باوجود اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ زمانہ ایک دریا کی مانند ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خودی ایک ایسا مظلوم جذبہ ہے جو اس دریا میں بہتا ہوا دریا سے پیدا ہونے والی اور بپھری ہوئی موجوں کے مظالم سہہ رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جذبہ خودی ناقدری زمانہ سے متصادم ہو رہا ہے۔

⑦ اقبال کہتے ہیں کہ خودی کی تلاش عملاً بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ اس تک رسائی کے لئے طرز عمل حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اور اس طرز عمل کی طرح نظروں میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ خودی کو درجہ کمال تک پہنچنے کے لئے انتہائی کٹھن اور پیچیدہ راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

⑧ اور جب اس عمل کے بعد خودی ایک مستحکم اور پر قوت جذبہ بن کر ابھرتا ہے تو بھاری پتھر بھی اس کے لئے سبک اور بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی ضربوں سے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو کر ریت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب خودی کا جذبہ مستحکم ہو جاتا ہے تو بڑی سے بڑی شے بھی اس کے سامنے ہیچ ہوتی ہے۔

⑨ گذشتہ بند کے بعض اشعار کی طرح یہاں بھی سفر کو حرکت کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کہ سفر خودی کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی! کہ اس کے استحکام کا راز بھی سفر میں مضمر ہے۔ دراصل سفر سے یہاں مراد حرکت اور جدوجہد ہے کہ حرکت اور جدوجہد کے بغیر منزل تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتی ہے۔

⑩ خودی کا جذبہ چاند میں کرن کی صورت اختیار کر لیتا ہے اسی طرح وہ پتھر میں چنگاری کا روپ دھار لیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رنگ میں غوطہ لگانے پر بھی وہ بے رنگ ہی رہتی ہے۔ یعنی مختلف اشیاء میں موجود ہونے کے باعث وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے اور دوسری اشیاء میں گم ہو کر نہیں رہ جاتا اس لئے کہ جذبہ مادی نہیں بلکہ روحانی ہے۔

(11) خودی کو بلندی و پستی اور کمی و زیادتی سے کوئی واسطہ نہیں اس لئے کہ اس کا مادی اشیاء سے کوئی تعلق نہیں!

(12) آغاز کائنات سے خودی کشمکش میں مبتلا رہی ہے کہ اس کا حقیقی مسکن کہاں ہے؟ بالآخر اس پر انکشاف ہوا کہ آدم خاکی کا جسم ہی اس کی پناہ گاہ بن سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اور صرف انسان ہی خودی کی اہمیت سے آگاہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری شے اس کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کرنے کی قطعی

اہل نہیں۔

(12) اس سے پہلے کے شعر کا جو موضوع ہے وہی زیرِ تشریح بند کے آخری شعر کا موضوع ہے۔ جس طرح مختصر اور محدود سی آنکھ آسمان کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اسی طرح سے یہ جان لینا چاہئے کہ خودی کا حقیقی مقام دل ہے اور یہ کہ انسان خودی میں ڈوب کر ہی کائنات کے علاوہ اپنی ذات کے داخلی بھید پا سکتا ہے۔

ساتواں بند

معنی: **فروفال:** شان و شوکت اور اقبال مندی۔ **خاک دان:** لفظی معنی مٹی کا گھر۔ مراد دنیا۔ **یلغار:** ترکتاز، یورش، حملہ۔

① شاعرِ مشرق نے اس بند کے اشعار میں فلسفہ خودی کے محاسن اور اوصاف کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ عملاً یہ موضوع ان کا پسندیدہ ہے جس کے حوالے سے بے شمار اشعار اور نظمیں انہوں نے تخلیق کی ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ جذبہ خودی کو اوجِ کمال پر پہنچانے کے لئے لازم ہے کہ خودی کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والا شخص رزقِ حلال سے خود کو آسودہ کرے اس لئے رزقِ حرام اور ناجائز کمائی سے تو خودی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

② اس شعر میں بھی اقبال سابقہ شعر کے مضمون کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کے لئے رزقِ حلال ہی عظمت و سربلندی کا سبب بنتا ہے۔ یہی اس کی خودی کا کمال ہے۔ اسی مضمون کو انہوں نے قدرے مختلف انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

③ سلطان محمود غزنوی ہر چند کہ بڑا جلیل القدر اور بہادر سلطان تھا۔ اس کے باوجود زندگی میں کامرانی کے لئے لازم ہے کہ اس کی پیروی کرنے کی بجائے اپنی خودی کو بروئے کار لایا جائے۔ ایسا نہ کیا گیا تو ایاز کی طرح غلامی مقدر بن جائے گی۔

④ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہونے کے سوا غیر خدا کے لئے کسی سجدے کا اہتمام باعثِ قدر و تحسین نہیں ہوتا کہ یہ تو غلامی کے مترادف ہو گا۔ خودی کی تکمیل کے لئے یہی عمل ضروری اور ناگزیر ہے۔

⑤ یہ دنیا جو بظاہر رنگ و روشنی اور آوازوں کی غنائیت سے ہم آہنگ ہے۔ عملاً اس کا وجود فنا سے عبارت ہے یعنی تمام حسن و رنگ کے باوجود بالآخر ہر شے کو فنا کے گھاٹ اترنا ہے۔

⑥ یہ شعر اور اس کے بعد کے متعدد اشعار پانچویں شعر کا تسلسل ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ یہ دنیا تو وہ مقام ہے جہاں کچھ کہا جائے اس کو سن لیا جائے اور جس شے کا نظارہ ہو اس کو خاموشی کے ساتھ دیکھا جائے کہ یہاں جو زندگی رواں دواں ہے وہ محض خورد و نوش تک محدود ہی نہیں اس کی محتاج بھی ہے۔

⑦ یہ دنیا تو بلاشک و شبہ جذبہ خودی کی پہلی منزل ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے معنی بات نہ ہو گی کہ

یہاں تو انسان ہر دم مسافرت میں ہے۔ اس کا کوئی مستقل گھر اور ٹھکانہ نہیں ہے۔

⑧ اے زمینی باشندے یہ بھی جان لے کہ تجھ میں جو حرارت ہے وہ اس دنیا کی خاک کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ خالق کل نے تو یہ جہاں تیرے لئے ہی تخلیق کیا ہے اور تو کسی مرحلے پر بھی اس کا دست نگر نہیں ہے۔

⑨ لہٰذا تیرے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ اپنے وجود کو زندہ برقرار رکھنے کی راہ میں حائل تمام پابندیوں کو توڑ کر اپنی منزل تک رسائی کے لئے آگے بڑھتا جا اور زمان و مکان کے طلسم کو توڑ کر اپنی خودی کو اوج کمال تک لے جا!

⑩ خودی تو خدائے ذوالجلال کے تخلیق کردہ ایسے شیر کی مانند ہے جس کا شکار یہ تمام تر عالم رنگ و بو ہے اس شیر کی گرفت تو زمیں اور آسمان دونوں پر ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس نے اپنی خودی کو عروج پر پہنچا دیا اس نے کل کائنات کو تسخیر کر لیا۔

(11) یہ بھی جان لے کہ اس جہان فانی کے علاوہ دنیائیں اور بھی ہیں جو ابھی تک ہماری بصیرت کی گرفت میں نہیں آسکیں تاہم ضمو وجود خلا کا متحمل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اگر خودی پایہ تکمیل تک پہنچ جائے تو ہر ان دیکھی دنیا کا ادراک خارج از امکان نہیں رہتا۔

(12) شاید یہ امر خلاف حقیقت نہ ہو کہ ہر ان دیکھی دنیا تیری یورش کی منتظر ہے کہ کب تو اپنی فکر و دانش کے علاوہ جذبہ خودی کے طفیل کب اس کو مسخر کرتا ہے۔ تیرا کردار اور عمل ہی اس کی تسخیر کر سکتا ہے۔

(13) اور یہ جو کائنات کا نظام ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور گردش میں مصروف رہتا ہے۔ اس کا مدعا ہی یہ ہے کہ تیری خودی کے سارے بھید تجھ پر کھل جائیں اور تو اپنی حقیقی منزل پانے کا اہل ہو سکے۔

(14) اب تجھ کیسے سمجھاؤں کہ قدرت نے تیری تخلیق کس مقصد کے لئے کی ہے۔ پہلے تو یہ جان لے! کہ دنیا اچھی ہے یا بری! تجھے تو اس پر اپنا تسلط جمانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

(15) سچ تو یہ ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ سچائی اور حقیقت تو آئینے کی مانند ہیں اور ان پر تفصیلی گفتگو اس آئینے پر گرد کی طرح سے ہے۔

(16) ہر چند کہ میرا سینہ جذبات کی شدت سے پھٹا پڑتا ہے لیکن یہ موضوع ایسا ہے جس پر مزید گفتار کی تاب نہیں!

(17) پھر خدشہ اس امر کا بھی ہے کہ اگر اپنی حدود سے بڑھتے ہوئے عشق حقیقی کے راز افشاء کر دوں تو قادر مطلق کو یہ گوارا نہ ہوگا اور وہ مجھے جلا کر خاک کر دے گا۔

زمانہ

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ!
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ!
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں

میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!

ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ!

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا؟
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ!

مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ!

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے! یہ جوئے خوں ہے!
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ!

ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ!

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ!

معنی: حرفِ محرمانہ: نکتہ' رمز' پتے کی بات۔ مقامر: جوا کھیلنے والا۔

① اس نظم کا مرکزی کردار زمانہ ہے۔ علامہ اقبال نے عہد کے حوالے سے جو کچھ کہنا چاہا ہے وہ اسی کی زبان سے کہلوایا ہے۔ دس اشعار پر مشتمل اس نظم کے اولین شعر میں بقول اقبال زمانہ یوں گویا ہوتا ہے کہ کائنات میں بے شمار اشیاء جو کبھی موجود تھیں نظامِ قدرت کے تحت اب ناپید ہو چکی ہیں۔ اور وہ اشیاء بھی ناپید ہو جائیں گی جو آج موجود ہیں۔ غرض فنا ہر شے کا مقدر ہے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہی معرفت کا نکتہ ہے۔ پھر یوں بھی ہے کہ جو عہدِ آئندہ میں ظہور پذیر ہوگا تو میں اسی کا منتظر رہتا ہوں۔

② میں (زمانہ) تو ایک ایسے خزینے کے مانند ہوں جس میں ہزاروں بھید اور واقعات محفوظ ہیں اور جب حسبِ حالات یہ واقعات ایک ایک کر کے برآمد ہو کر منظرِ عام پر آتے ہیں تو ان کو شمار کر کے اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا ہوں۔

③ میرا عام طرزِ عمل یہ ہے کہ دنیا میں موجود ہر فرد سے واقف ہونے کے باوجود ان کے ساتھ میری رسم و راہ کے انداز بالکل الگ الگ ہیں۔ کسی کو اپنا طابع بنا لیتا ہوں اور جو باصلاحیت اور صاحبِ اختیار ہیں۔ ان کا مطیع ہو جاتا ہوں اور کسی کے لئے عبرت کا تازیانہ بن جاتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میں ہر فرد کے ساتھ اس کی صلاحیت کے مطابق زندہ برآمد ہوتا ہوں۔

④ میں تو ہر لمحے داد و دہش کے مراحل سے گزرتا رہتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری فیاضی سے استفادہ نہیں کرتا تو اس کے لئے قصور وار وہ ہے میں نہیں! یوں سمجھنا چاہئے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور جو لوگ موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ وہ نااہل بھی ہیں اور اپنی مراد کے حصول سے بھی محروم رہتے ہیں۔

⑤ علم نجوم کا ماہر میری حقیقت سے کس طرح آشنا ہو سکتا ہے جب کہ اس کا کام تو ہر لمحے ستاروں کی گردش کی مدد سے لوگوں کو قسمت کا حال بتانے کے چکر میں مبتلا رکھنا ہوتا ہے۔ کہ یہ طرز عمل میری شناخت کا معیار نہیں ہو سکتا۔ جان لو کہ جس شخص کو معرفت کا مقام حاصل نہ ہوں وہ منزل مراد تک نہیں پہنچ سکتا۔

⑥ اور یہ مغرب یعنی یورپ کے افق پر جو شفق کی سرخی نمایاں ہے تو فی الواقعہ یہ شفق کی سرخی نہیں بلکہ ان لوگوں کے خون کی سرخی ہے۔ مغرب نے جن کا استحصال کیا۔ لہٰذا اے مرد خدا! یہ امر ناگزیر ہے کہ حالات کا جائزہ آنے والے عہد کے پیش منظر سے لیا جائے۔

⑦ یورپ کے سائنسدان اور خطرناک ہتھیاروں کے موجد یکجا ہو کر انسانی فطرت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ بے شک یہ لوگ اپنی تباہ کن ایجادات پر فخر کریں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ آج یہ ایجادات ان کے اپنے لئے ہی تباہی کا سبب بن رہی ہیں۔ ہر چند کہ انہوں نے عالمی امن کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اس کے باوجود ان ایجادات کے باعث یورپ کو جنگ اور اس کے خوف کے علاوہ کچھ اور نہیں مل سکا۔ حد تو یہ ہے کہ ان خطرناک ایجادات پر جو بے دریغ اخراجات ہوئے ہیں انہوں نے یورپ کے کم و بیش تمام ممالک کو اقتصادی طور پر شدید قسم کے بحرانوں سے دوچار کر دیا ہے۔

⑧ اس شعر میں بھی اقبال نے پچھلے شعر کے حوالے سے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے کہ بے شک یورپی طاقتیں آج اپنے جہازوں' سیاروں اور دوسرے ذرائع سے خشکی' سمندر اور تمام فضاؤں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود قدرت نے انہیں ایسے گرداب کا شکار بنا دیا ہے جو ان کے لئے ہولناک تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ ہولناک ایجادیں بھی ان کی ان کی بربادی کا سامان بن رہی ہیں۔

⑨ ہرچند کہ یہ ہولناک ایجادات کا دور ہے جسے عالمی سطح پر عروج و ترقی کا نام دیا جا رہا ہے لیکن ذرا گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ عروج و ارتقاء منفی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کا انحطاط و تنزل زیادہ دور نہیں ہے جس کے رد عمل کے طور پر یہ امر قدرتی ہے کہ ایک نیا نظام وجود میں آئے گا اور ہر طرح کی برائیوں اور تباہ کاریوں کے خلاف نبرد آزما ہو سکے گا۔ مراد یہ ہے کہ اہل یورپ نے جس طرح عالمی امن تباہ کرنے کے منصوبے بنا رکھے ہیں یہ منصوبے انہیں خود ہی لے ڈوبیں گے اور اس کے بعد ایک نیا نظام وجود میں آنا قدرتی امر ہے ایسا نظام جو عالمی سطح پر امن و سکون اور خوشحالی سے بہرہ ور کر سکے۔

⑩ اقبال نظم کو تمام کرتے ہوئے اس شعر میں فرماتے ہیں۔
ہرچند کہ حالات ناسازگار ہیں مخالفت کی تند و تیز آندھی پورے زور و شور کے ساتھ ماحول کو زیر و زبر کر رہی ہے تاہم میں نے اس کی پرواہ کئے بغیر اپنی فکر اور حکمت و دانش کا چراغ جلا رکھا ہے اس لئے کہ رب ذوالجلال نے مجھے وہ صلاحیت اور قوت بخشی ہوئی ہے کہ ہر طرح کی برائیوں اور نامساعد حالات کا

مقابلہ کرسکوں۔

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحرگاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی!
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی!

معنی: شکر خوابی: میٹھی نیند۔

پانچ اشعار پر مشتمل اس مختصر سی نظم میں اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں تصوراتی سطح پر فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس مکالمے کی نشاندہی کی ہے جب کہ رب العزت نے حضرت آدمؑ کو بہشت سے نکال کر اس لئے زمین پر بھیج دیا تھا کہ انہوں نے اس کی نافرمانی کی تھی۔ اس واقعہ کے ضمن میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اقبال نے خود بیشتر مقامات پر نظم و نثر میں اشارتاً اور کسی مقام پر تفصیل کے ساتھ بات کی ہے۔ یہ نظم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے اشعار میں اس تصوراتی اور تخیلی سطح پر مکالمے کو یوں پیش کیا ہے کہ!

① اے آدمؑ! یہاں فردوس میں جو تو اس طرح مضطرب اور بیتاب رہتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں؟ ہم نے تیرے بارے میں بہت سوچا لیکن یہ طے نہ کرسکے کہ تو خاک سے پیدا ہوا ہے یا پارے سے!

② شنید تو یہی ہے اور ارشاد خداوندی بھی یہ ہے کہ تیری تخلیق مٹی سے کی گئی ہے لیکن تیری سرشت کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں تاروں اور چاند کی سی چمک دمک دکھائی دیتی ہے مراد یہ ہے کہ قدرت نے تجھے بے شک مٹی سے پیدا کیا جس کا تعلق زمین سے ہے لیکن تیری فطرت عملاً ارتقاء اور بلندیوں سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

③ خدائے عزوجل نے تجھ میں وہ صلاحیتیں اور کمالات ودیعت کئے ہیں کہ اگر تو خواب میں بھی ان کا تصور کرے تو یوں لگے گا کہ تیری میٹھی نیند عالم ہوش کی بیداریوں پر بھی فوقیت اور برتری رکھتی ہے۔

④ اے آدم! جب تو صبحدم بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو کر اس کے حضور گریہ و زاری کرتا ہے تو یہ بیش بہا عمل ہر عبادت سے افضل نظر آتا ہے کہ یہ عجز و انکسار کی انتہا ہے اور یہی عمل ہر لحظے نہ صرف یہ کہ تجھے تر و تازہ رکھتا ہے بلکہ اسی سے تیرا ضمیر بھی مطمئن رہتا ہے اور روح کو سکون بھی نصیب ہوتا ہے۔

⑤ تیری صداؤں میں وہ کیف موجود ہے جو رازہائے زندگی کو بے نقاب کرتا ہے۔ ان میں وہ اسرار و رموز پوشیدہ ہیں جن سے افراد کو اپنی شناخت میں مدد ملتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تجھ میں جتنے بھی جوہر اور کمالات موجود ہیں وہ خدائے ذوالجلال کے عطا کردہ ہیں مزید یہ کہ ایسے جوہر اور کمالات قدرت نے کسی اور کو عطا نہیں کئے۔ اسی لئے تجھے کائنات کی ہر شے سے افضل و برتر قرار دیا گیا ہے۔

ابلیس لاکھ بغاوت پر آمادہ ہو اس کے باوجود وہ قطعی طور پر تیری ہمسری نہیں کر سکتا۔

روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ! مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ! ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکہ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے! دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے! پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے!
تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں! آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں!
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں! جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں!
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے! تو جنس محبت کا خریدار ازل سے!
تو پیر صنم خانہ اسرار ازل سے! محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے!
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ!

معنی: بیم و رجا: خوف و امید۔ نالندہ: لفظی معنی رونے والا۔ مراد بجنے والا۔

یہ نظم عملاً اس سے پہلی نظم کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں بھی پہلی نظم کی طرح انسان کی عظمت و برتری کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ نظم اس اعتبار سے بھی دلچسپ اور بعض نفسی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کسی مقام پر ایک اجنبی کو درپیش ہوتے ہیں اور مقامی لوگ اس سلسلے میں اس کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ نظم عملاً پانچ بند پر مشتمل ہے جس کے پہلے بند میں روح ارض آدم سے کہتی ہے۔

پہلا بند

اے آدم! تیرے لئے یہ زمیں یہ مقام اجنبی حیثیت کا حامل ہے۔ بہشت سے نکال کر خداوند تعالیٰ نے تجھے یہاں بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ بہشت کا ماحول مختلف تھا۔ یہاں کی فضاء بھی مختلف ہے چنانچہ یہ میری ذمہ داری ہے کہ تجھے اس اجنبی فضا سے متعارف کراؤں لہٰذا اس کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ اپنی آنکھیں کھول کر اس زمین، اس آسمان بلکہ ساری فضا کا بغور جائزہ لے۔ مشرق کی سمت سے طلوع آفتاب

کا نظارہ کر! اور تو نے جن جلووں کو بے پردہ دیکھا ہے اب پردوں میں بھی ان کا مشاہدہ کر اور یہاں زمین کے مصائب و آلام سے بھی آشنائی حاصل کر۔ اور سب سے اہم کہ کسی اضطراب اور بے چینی کے ساتھ قدرے سکون سے امید و ناامیدی کے منظر نامے کا جائزہ لے۔ اس لئے کہ یہ دنیا تو عملی جدوجہد کا دوسرا نام ہے جہاں امید اور ناامیدی دو متضاد مگر زندہ حقیقتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

دوسرا بند

پہچان لے کہ یہ جو بادل اور گھٹائیں ہیں' یہ جو آسمان اور اس کے نیچے خاموش فضائیں موجود ہیں۔ یہ پہاڑ' صحرا' سمندر اور ہوائیں ہیں۔ یہ سب اب تیرے تصرف اور زیر اہتمام و انصرام ہیں۔ یہ نظارہ یوں بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ کل تو تیرا مسکن بہشت تھا لیکن اب تو زمیں پر مسند نشین ہو چکا ہے لہٰذا لازم ہے کہ یہاں کے شب و روز اور ماحول کا جائزہ لے۔ کہ یہاں کے مسائل اور مشکلات کا اندازہ ہو سکے۔

تیسرا بند

اس بند میں اقبال فرشتوں کی جانب سے آدمؑ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابھی تو تو اس دنیا میں نیا نیا وارد ہوا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب یہاں کی ہر شے تیری عظمت کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ زمانہ تیری آنکھوں کے اشاروں کو سمجھے گا اور فلک پر ستارے تجھے دور سے دیکھ کر رشک کریں گے۔ تیرے خیالات و تصورات میں اتنی وسعت ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ کسی مرحلے پر تیرے دل سے آہ بھی نکلی تو اس کا تاثر آسمان تک بھی پہنچ جائے گا لیکن اس کے لئے یہ امر لازم ہے کہ تو اپنی خودی کی تعمیر کرے پھر دیکھ تیری آہ کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے۔

چوتھا بند

تیرے سینے میں فکر کی جو چنگاری موجود ہے اس میں ساری دنیا کو منور کرنے والے آفتاب کی ضو پوشیدہ ہے۔ اور تجھ میں جو ہنر موجود ہے وہ ایک نیا جہان تخلیق کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے اس لئے کہ تو اور تیری حمیت مانگی ہوئی جنت قبول کرنے پر یقین نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ تیری جنت تو خود تیری صلاحیت اور محنت و مشقت میں پوشیدہ ہے چنانچہ اسے خاک کے پتلے ہمت کر اور اپنی سعی پیہم کا صلہ حاصل کر لے۔

پانچواں بند

ابتدائے آفرینش سے ہی تیری حیثیت مسلمہ ہے۔ اسی لمحے سے محبت تیری روح میں رچی بسی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ کہ کائنات کے جملہ اسرار تیری ذہانت سے منکشف ہوئے ہیں اور آخری بات یہ کہ تو ابتداء سے ہی محنت و مشقت کا عادی اور خون پسینہ ایک کرنے والا ہے۔ مزید یہ کہ کسی کو آزار میں مبتلا نہیں کرتا اسی لئے تیری مرضی کے بغیر یہ دنیا بے معنی شے ہے۔

پیر و مرید

مریدِ ہندی

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!

پیرِ رومی

علم را برتن زنی مارے بود! علم را بر دل زنی یارے بود!

مریدِ ہندی

اے امامِ عاشقانِ دردمند یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند!
خشک مغز و خشک تار و خشک پوست! از کجا می آید ایں آوازِ دوست!
دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور! بے ثبات و بے یقین و بے حضور!
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا! دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا!
آہ یورپ! با فروغ و تاب ناک نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

پیرِ رومی

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست! طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست!

مریدِ ہندی

پڑھ لئے میں نے علومِ شرق و غرب روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب!

پیرِ رومی

دست ہر نا اہل بیمارت کند! سوئے مادر آ کہ تیمارت کند!

مریدِ ہندی

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد کھول مجھ پہ نکتۂ حکمِ جہاد

پیر رومی

نقش حق راہم با مرحق شکن بر زجاج دوست سنگ دوست زن

مرید ہندی

ہے نگاہ خاوراں مسحور غرب! حور جنت سے ہے خوشتر حور غرب!

پیر رومی

ظاہر نقرہ گر اسپید است و نو دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو!

مرید ہندی

آہ مکتب کا جوان گرم خون! ساحر افرنگ کا صید زبوں!

پیر رومی

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود طعمہ ہر گربۂ دراں شود!

مرید ہندی

تا کجا آویزش دین و وطن جوہر جاں پر مقدم ہے بدن؟

پیر رومی

قلب پہلو می زند بازر بشب! انتظار روز می دارد ذہب

مرید ہندی

سر آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرے کو مہر و ماہ کر!

پیر رومی

ظاہرش را پشہ آرد بچرخ باطنش آمد محیط ہفت چرخ!

مرید ہندی

خاک تیرے نور سے روشن بصر! غایت آدم خبر ہے یا نظر؟

پیر رومی

آدمی دید است باقی پوست است دید آں باشد کہ دید دوست است

مرید ہندی

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے امتیں مرتی ہیں کس آزار سے؟

پیر رومی

ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود زانکہ برجندل گمان بردند عود!

مرید ہندی

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو؟

پیر رومی

تا دل صاحب دلے نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد!

مرید ہندی

گرچہ بے رونق ہے بازار وجود کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود؟

پیر رومی

زیرکی بفروش و حیرانی بخر! زیرکی ظن است و حیرانی نظر!

مرید ہندی

ہم نفس میرے سلاطیں کے ندیم میں فقیر بے کلاہ و بے گلیم!

پیر رومی

بندہ یک مرد روشن دل شوی بہ کہ بر فرق سر شاہاں روی!

مرید ہندی

اے شریک مستی خاصان بدر میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر

پیر رومی

بال بازاں را سوئے سلطاں برد بال زاغاں رابگورستاں برد

مرید ہندی

کاروبار خسروی یا راہبی؟ کیا ہے آخر غایت دین نبی؟

پیر رومی

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ — مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

مرید ہندی

کس طرح قابو میں آئے آب و گل؟ — کس طرح بیدار ہو سینے میں دل؟

پیر رومی

بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند! — چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند!

مرید ہندی

سر دیں ادراک میں آتا نہیں! — کس طرح آئے قیامت کا یقیں؟

پیر رومی

پس قیامت شو قیامت را بہ بیں! — دیدن ہر چیز را شرط است ایں!

مرید ہندی

آسماں میں راہ کرتی ہے خودی! — صید مہر و ماہ کرتی ہے خودی!
بے حضور و با فروغ و بے فراغ! — اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ!

پیر رومی

آں کہ ارزد صید را عشق است و بس — لیکن او کے گنجد اندر دام کس!

مرید ہندی

تجھ پہ روشن ہے ضمیر کائنات — کس طرح محکم ہو ملت کی حیات؟

پیر رومی

دانہ باشی مرغ کانت برچنند! — غنچہ باشی کودکانت برکنند!
دانہ پنہاں کن سراپا دام شو! — غنچہ پنہاں کن گیاہ بام شو!

مرید ہندی

تو یہ کہتا ہے کہ دل کی کر تلاش — طالب دل باش و در پیکار باش
جو مرا دل ہے مرے سینے میں ہے — میرا جوہر میرے آئینے میں ہے

پیر رومی

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست — دل فراز عرش باشد نے بہ پست!
تو دل خود را دلے پنداشتی! — جستجوئے اہل دل بگذاشتی!

مرید ہندی

آسمانوں پر مرا فکر بلند! — میں زمیں پر خوار و زار و درد مند
کار دنیا میں رہا جاتا ہوں میں — ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں
کیوں مرے بس کا نہیں کار زمیں؟ — ابلہ دنیا ہے کیوں دانائے دیں؟

پیر رومی

آں کہ بر افلاک رفتارش بود — بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود!

مرید ہندی

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ؟ — کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

پیر رومی

علم و حکمت زاید از نان حلال! — عشق و رقت آید از نان حلال!

مرید ہندی

ہے زمانے کا تقاضا انجمن — اور بے خلوت نہیں سوز سخن!

پیر رومی

خلوت از اغیار باید نے ز یار — پوستیں بہر دے آمد نے بہار

مرید ہندی

ہند میں اب نور ہے باقی نہ سوز! — اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز!

پیر رومی

کار مرداں روشنی و گرمی است — کار دوناں حیلہ و بے شرمی است

یہ طویل نظم عملاً دو کرداروں پر محیط ہونے کے ساتھ فکری سطح پر بڑی اہم اور قدرے طویل نظم ہے۔ اس میں اقبال نے مولانا روم اور ان کے ہندی مرید کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا ہے۔ جو مولانا روم کے فکر انگیز جوابات اور اسی طرح ان کے ہندی مرید کے استفسارات پر مشتمل ہے۔ مکالمے کا آغاز مرید ہندی کے استفسار سے ہوتا ہے۔ اقبال نے ساتھ ہی مثنوی مولانا روم کے بعض اشعار کی تشریح بھی کردی ہے۔

مرید ہندی

① حقیقت حال کو پرکھنے والی آنکھ سے آنسوؤں کی جگہ خون جاری ہے۔ اس لئے کہ عہد حاضر کی تہذیب اور علوم نے مذہب کی اہمیت گھٹا دی اور یوں دین کو خراب و خستہ کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کا کیا علاج ہے۔

پیر رومی

اگر تو علم کو محض جسمانی پرورش تک محدود رکھے گا تو وہ بلاشبہ سانپ بن کر ڈس لے گا۔ اس کے برعکس اگر تو علم کی وساطت سے باطن کو آراستہ کرے گا تو پھر وہ تیرا رفیق و مددگار ثابت ہو گا۔

مراد یہ ہے کہ علم اگر ظاہری آرائش و آسائش کے لئے استعمال ہو گا تو وہ عملاً غیر مفید اور نقصان دہ ثابت ہو گا۔ اس کے برعکس اگر علم کا مقصد باطن کی آراستگی ہو تو خواہ وہ مغربی علم ہی کیوں نہ ہو عالم انسانیت کے لئے باعث رحمت ہو گا۔ مغربی علوم کو دراصل منفی انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ دینی نقطہ نگاہ سے خرابی کا سبب بن گئے ہیں۔

مرید ہندی

② اے دردمند عشاق کے امام! مجھے آپؒ کا یہ قول بلند مرتبہ پوری طرح ازبر ہے کہ ساز کا مغز خشک ہوتا ہے۔ اس کے تار اور ڈھانچہ یہ سب خشک ہوتے ہیں پھر اس میں سے وہ نغمے کیسے برآمد ہوتے ہیں جو محبوب حقیقی کی یاد تازہ کرتے ہیں؟۔

موجودہ عہد محض آواز پرست ہے اسی لئے اسے کیف و سرور کا ادراک نہیں۔ نہ یہ راہ حقیقی کا پرستار ہے۔ نا ہی اس میں یقین کا کرشمہ نظر آتا ہے اور نا ہی اسے حضوری کا ذوق نصیب ہے۔ اس صورت میں اسے اس راز سے کیا واسطہ کہ دوست کون ہے اور اس کی آواز سے کیا مراد ہے۔ ہرچند کہ اہل یورپ نے علم و فن میں کافی ترقی کر لی پھر بھی اس نے کوئی بلند مرتبہ حاصل نہیں کیا۔ اس کا ذوق سطحی ہے۔ نغمہ و ساز سے بھی اس نے استفادہ نہیں کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

پیر رومی

جس طرح انجیر کا میل ہر پرندے کی مرغوب غذا نہیں۔ اسی طرح موسیقی کا معاملہ ہے۔ اس سے لطف وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو حقیقی ذوق کا مالک ہو۔ بالفاظ دگر یہ یورپ کی بدنصیبی ہے کہ موسیقی سے حقیقی معنوں میں حظ نہ اٹھا سکا۔

مرید ہندی

③ میں نے ہرچند کہ مشرق و مغرب کے بیشتر علوم کا مطالعہ کر لیا۔ اس کے باوجود محسوس کرتا ہوں کہ روح ابھی تک تشنہ ہے۔ ان سے میرے دکھ اور کرب کا مداوا نہیں ہو سکا۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟۔

پیر رومی

طبیب ہو یا تیماردار' ہر نااہل شخص کا ہاتھ تجھے مزید بیمار کر دے گا۔ ماما یہی ہے جو حقیقی تیمارداری کی اہل ہے۔ اسی کی جانب متوجہ ہوا۔ مراد یہ ہے کہ محض علم و فنون سے روح کی تشنگی دور نہیں ہو سکتی نا ہی انسانی دکھ اور کرب کا مداوا ہو سکتا ہے۔ روح کی کسک تو اہل حق رفع کر سکتے ہیں جو اس کے اہل ہوں اور

جس میں ماں کی سی شفقت بھی ہو۔

مرید ہندی

④ پیر و مرشد! آپ کی حکمت و دانش ہر لمحے میرے لئے مشعل راہ رہی ہے۔ ازراہ کرم یہ فرمایئے کہ جہاد کی حقیقت کیا ہے؟ یہ نکتہ میرے ذہن میں ابھی تک لاینحل ہے۔

پیر رومی

جہاد کی تعریف یہ ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے نقش کو اسی کے حکم کے مطابق مٹا دیا جائے۔ بالفاظ دگر دوست کے آئینے پر اسی کے دیئے ہوئے پتھر سے وار کیا جائے۔ مراد یہ ہے کہ باطل کی قوتوں کے خلاف بحکم خداوند تعالیٰ حق پرستوں کا نبرد آزما ہونا ہی جہاد ہے۔ حالانکہ دونوں قوتیں رب العزت نے ہی پیدا کی ہیں لیکن اس کے فرمان کی تعمیل کے مطابق باطل کی قوتوں کے خلاف جہاد فرض اولین ہے۔

مرید ہندی

⑤ اہل مشرق کی نگاہیں یورپی تہذیب اور اس کے ظاہری حسن و جمال سے خیرہ ہیں۔ انہیں تو یورپ کی حسین و جمیل عورتیں حوران جنت سے بھی زیادہ حسین لگتی ہیں۔

پیر رومی

چاندی بظاہر چمکیلی' سفید اور نئی لگتی ہے جب کہ اس کے استعمال سے ہاتھ اور کپڑے سیاہ بھی تو ہو جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ چیزوں کی ظاہری حالت سے ان کی باطنی حقیقت اور افادیت کا اندازہ لگانا صریحاً غلط ہے۔ یورپی خواتین کتنی بھی پرکشش اور حسین و جمیل ہوں پھر بھی اگر وہ قلب و روح کے لئے چاندی کی طرح سیاہی کا باعث بنیں تو ان پر فریفتگی کار عبث ہے۔

مرید ہندی

⑥ افسوس کہ ہماری درس گاہوں کے گرم خون نوجوان مغربی خواتین پر فریفتہ ہونے کے ساتھ انہی کی تہذیب اور طور طریقوں کو اپنا لیتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرمایئے؟

پیر رومی

جو پرندہ ابھی ننھا سا ہو اور پروں سے بھی محروم ہو اس کے باوجود اڑنے کی کوشش کرے گا تو قریب ہی تاک میں بیٹھی ہوئی بلی اسے یقیناً دبوچ لے گی اور وہ اس کا لقمہ تر بن کر رہ جائے گا۔

مرید ہندی

⑦ یہ تو فرمایئے کہ مذہب اور وطن کے حوالے سے معرکہ آرائی کب تک جاری رہے گی۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ مذہب کی حیثیت جان کی ہے اور وطن کو جسم تصور کر لیا جائے تو اس صورت میں مذہب ہی اصل شے ہے مگر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو جان پر جسم کو یعنی وطن کو مذہب پر فوقیت دیتا ہے۔ یہ مسئلہ کافی حد تک حل طلب ہے۔

پیر رومی

شب کی تاریکی میں دیکھا جائے تو کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں کی جا سکتی۔ سونے کی حقیقت تو شب کی

تاریکی میں نہیں دن کی روشنی میں بھی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ شب کو تو کھوٹا سکہ بھی کھرا سکہ لگتا ہے اور دونوں میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔

مراد یہ کہ عہد حاضر کی جو تعلیم ہے اس کی چمک نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ ذہنوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ جب مطلع صاف ہو گا تو پتہ چل جائے گا کہ حقیقت کیا ہے۔ مذہب کھرا سکہ ہے یا وطنیت!

مرید ہندی

⑧ یا حضرت! میں تو ایک ذرہ خاک ہوں۔ براہ کرم مجھے اس امر سے آگاہ کیجئے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس حقیقت سے آگاہی مجھے مہر و ماہ کے ہم پلہ لانے کی مترادف ہو گی!

پیر رومی

بظاہر انسان اس قدر کمزور اور بے حیثیت ہے کہ ایک معمولی سا مچھر بھی اس کی بے بسی کا سبب بن سکتا ہے اور دم بھر کے لئے چین نہیں لینے دے گا لیکن خدائے ذوالجلال نے باطنی سطح پر اس میں وہ صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں کہ آسمانوں کی بلندیوں کو بھی چھو سکتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کے پس منظر میں نمرود جیسے صاحب اقتدار بادشاہ اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ کی معراج کے واقعات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ کہ نمرود جیسے ظالم لیکن جلیل القدر بادشاہ کی موت کا سبب ایک معمولی سا مچھر تھا جب کہ حضورؐ نے بحیثیت انسان اور پیغمبر ہفت افلاک طے کر کے معراج کا مرتبہ بلند حاصل کیا۔

مرید ہندی

⑨ آپ تو ایسے صاحب حکمت و کرامت ہیں کہ اپنے نور سے مٹی کے پتلے کی آنکھیں روشن کر دی تھیں۔ مجھے اتنا بتا دیجئے کہ انسان کا مقصد اس جہان فانی میں حقیقتوں کا بالواسطہ علم حاصل کرنا ہے یا ان کو بلاواسطہ دیکھنا!۔

پیر رومی

انسانیت کی حقیقت محض دیدار دوست ہے۔ باقی سب کچھ محض تکلف ہے اور دیدار سے یہ مراد ہے کہ محبوب حقیقی کے جمال سے آنکھوں میں روشنی آ جائے۔ مراد یہ ہے کہ عشق حقیقی سے ہی انسانی روح میں بالیدگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

مرید ہندی

⑩ مشرق کے لوگ آپ کے کلام اور اس میں موجود حکمت و دانش سے زندگی کی حرارت اور تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ تو فرمایئے! وہ کون سے عوارض ہیں جن سے قومیں تباہ و برباد ہو کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اور ان کا وجود باقی نہیں رہتا؟

پیر رومی

بے معنی شے اور غلط کاریوں کو حقیقت کے جوہر سے تعبیر کرنے والی قومیں کبھی زندہ نہیں رہ سکتیں نا ہی ترقی کے عمل سے گزر سکتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہر پتھر کو عود تصور کر لیا جائے تو یہ بصیرت کا نقص ہے۔ بے شک عود اور پتھر ملتی جلتی شباہت کے مظہر ہوتے ہیں لیکن عود کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے

جس مقام پر رکھ کر جلایا جائے تو وہ مقام معطر ہو جاتا ہے جب کہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جوہر ناشناس بصیرت کی موت ہے اور جو قوم دانش و بصیرت کے جوہر سے محروم ہو جائے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

مرید ہندی

11- یہ کیسے ہوا کہ مسلمانوں میں نہ وہ جذبہ باقی رہا نہ پہلی سی شان و شوکت اس کی قوت عمل اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ آخر کیوں سرد پڑ گیا۔

پیر رومی

اس کا سبب یہ ہے کہ اب مسلمان سچائیوں اور حق پرستی سے محروم ہو گئے اور ان اہل حق کے لئے دل شکنی اور دکھ کا سبب بن گئے ہیں جنھوں نے ان کی رہنمائی کی اور اس عمل میں بے شمار مصائب سے دوچار ہوئے جب کہ مسلمان ان کی پیروی سے گریز کر رہے ہیں۔

مرید ہندی

12- ہرچند کہ یہ دنیا عارضی قیامگاہ ہے اور اس کی رونق مفقود ہوتی جا رہی ہے لیکن یہ تو فرمایئے کہ ان حالات میں مردان حق کا کیا کردار ہونا چاہیے جس سے وہ موجودہ صورت حال میں بھی کامیاب زندگی گزار سکیں؟

پیر رومی

مردان حق پر لازم ہے کہ عقل و دانش جو عملی سطح پر وہم و گمان سے ہم آہنگ ہیں۔ انہیں لوگوں میں تقسیم کریں اور حیرانی ان کے عوض حاصل کریں جو عشق اور معرفت کی مظہر ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے مردان حق اس جہان عارضی میں کامرانی و بامراد ہو سکتے ہیں۔

مرید ہندی

13- میرے تمام رفقا اور ہم جلیس تو بادشاہوں اور امراء کے مصاحب بن گئے ہیں۔ ایک میں ہی ایسا فرد ہوں جس کا سر کلاہ اور جسم لباس سے بھی محروم ہوئے یعنی میرے رفقا تو مصلحتوں اور موقعہ پرستی کے طفیل بلند مناصب پر پہنچ گئے لیکن چونکہ مجھ میں یہ صلاحیتیں موجود نہ تھیں اس لئے ہر نوع کی سہولت اور آسائش سے محروم رہا۔

پیر رومی

اے عزیز! شاہوں اور امراء کے دربار میں اعزاز حاصل کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ تو کسی مرد حق اور روشن ضمیر سے اکتساب فیض کرے۔ کہ شاہوں اور امراء کے دربار تو خوشامدی اور منافقوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں جب کہ مردان حق اور روشن ضمیر لوگوں کی صحبت اختیار کرنے والے لوگ ہر نوع کی شان و شوکت اور نمائش و مصلحت پرستی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

مرید ہندی

14- پیر و مرشد! آپ تو اس مرتبے کے مالک ہیں جو معرکہ بدر کے ان مجاہدین کو حاصل ہوا جو حضور ختمی مرتبتؐ کے خاص یار و مددگار تھے۔ آپ نے معرفت الٰہی کا اکتساب انہی کے اسوہ حسنہ سے کیا

لیکن مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں کہ مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت معلوم کر سکوں۔ براہ کرم اس سلسلے میں میری رہنمائی کیجئے!

پیر رومی

شاہین اور کوے میں قدر مشترک یہ ہے کہ رب ذوالجلال نے دونوں کو پرواز کے لئے پر عطا کیے ہیں لیکن شاہین کو صاحب اختیار لوگ پالتے ہیں کہ ان کو دوسرے پرندوں کے شکار کے لئے استعمال کریں جب کہ کوا مردہ شکار سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے یعنی شاہین کو بال و پر شاہوں اور امراء کے دربار تک لے جاتے ہیں جب کہ اسی نوع کے بال و پر کوے کو قبرستان کا راستہ دکھاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ ایک اپنی بلند ہمتی اور اعلیٰ ذوق کے سبب انتہائی اعزاز اور مرتبے سے سرفراز ہوتا ہے جب کہ اس کے مقابل دوسرا اپنی پست ہمتی اور کور ذوقی کے باعث ذلت و رسوائی کے ساتھ پستی میں گر جاتا ہے۔ دونوں اپنے کردار و عمل کے حوالے سے اچھے یا برے مقام کے حقدار ہوتے ہیں۔

مرید ہندی

15- یہ فرمایئے! کہ پیغمبر اسلام حضور سرورؐ کائنات نے جو دین رائج کیا اس کی بنیادی طور پر غرض و غایت کیا ہے۔ کیا اس سے بادشاہی اور حکمرانی مراد ہے یا ترک دنیا اور رہبانیت اس کا مقصود ہے؟۔

پیر رومی

اسلام کی تعلیمات اور ان کی روح کے مطابق نا تو شاہی اور غیر ضروری شان و شوکت ہی قابل قدر عمل ہے نا ہی یہ کہ انسان ترک دنیا کر کے پہاڑوں اور غاروں میں پناہ گزیں ہو جائے اور رہبانیت اختیار کر لے۔ دین اسلام تو جدوجہد اور عمل سے عبارت ہے کہ عشق حقیقی کے حصول اور اپنی منزل تک رسائی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے۔ یہی دین نبیؐ کی غرض و غایت اور مقصد ہے۔

مرید ہندی

16- ازراہ عنایت یہ بھی بتا دیجئے کہ پانی اور مٹی جیسے عناصر پر غلبہ حاصل کر کے مادی اور جسمانی خواہشات پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر نہ تو دل بیدار ہو سکتا ہے نا ہی زندگی کے قالب میں نئی روح پھونکی جا سکتی ہے؟

پیر رومی

رب العزت کے احکام کی پیروی اسی طرح کر! جیسے زمین پر گھوڑا اپنے سوار کے اشارے پر چلتا ہے۔ جدوجہد اور عمل سے گریز نہ کر! اور دوسروں کا اس طرح دست نگر نہ بن جس طرح کسی فرد کا جنازہ دوسروں کی گردن کا بوجھ بن جاتا ہے۔ یہی عوامل ہیں جن کے ذریعے زندگی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

مرید ہندی

17- میری سمجھ میں تو آج تک دین کا بھید ہی نہیں آیا پھر قیامت پر کس طرح سے یقین آ سکتا ہے؟

پیر رومی

تو خود عملاً قیامت بن جا۔ اپنی ذات میں ایسا انقلاب پیدا کر لے جو قیامت کے ضمن میں متوقع ہے۔ اس کے بعد تجھے خود بخود قیامت کا یقین آ جائے گا اور یہ معرفت بھی حاصل ہو جائے گی کہ دین کیا ہے اور پھر قیامت کیا ہے۔

مرید ہندی

18- جب خودی اپنے انتہائی عروج تک جا پہنچتی ہے تو اس کی رسائی آسمانوں تک ہو جاتی ہے جہاں پہنچ کر وہ چاند اور سورج کو بھی اپنے زیر نگیں کر لیتی ہے۔ مراد یہ کہ جذبہ خودی کا اوج کمال تک پہنچنا افلاک سے لے کر سورج اور چاند پر گرفت حاصل کرنے کے مترادف ہے! لیکن جب اسے بارگاہ خداوندی میں حضوری کا شرف حاصل نہیں ہوتا اور فراغت میسر نہیں آتی تو اپنے افکاروں کے ہاتھوں ہی پریشان حالی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

پیر رومی

اگر شکار کے لائق کائنات میں کوئی شے ہے تو وہ عشق حقیقی ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عشق حقیقی تو ہر حال میں کسی کی بھی پہنچ سے باہر ہے۔ وہ کس طرح کسی کے جال میں سما سکتا ہے۔

مرید ہندی

19- پیر و مرشد آپ پر تو پوری طرح واضح ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے۔ اتنا بتا دیجئے کہ قومی زندگی کے استحکام کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟

پیر رومی

اگر تو تخریب کاروں کی گرفت سے بچنا چاہے تو اپنی ذات کو محفوظ رکھ! اس صورت میں جو بھی تیرا تعاقب کرے گا خود ہی تیرے جال میں پھنس کر رہ جائے گا۔ اگر تیری ہیئت دانے کے مانند ہو تو ظاہر ہے کہ اسے پرندے کب چھوڑیں گے۔ کلی کی شکل اختیار کر لے تو چھوٹے چھوٹے بچے تجھے نوچ پھینکیں گے۔ اس صورت میں لازم ہے کہ اپنا بسیرا کسی ایسی بلندی پر استوار کر جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہو۔ قوموں کا استحکام اسی صورت میں ممکن ہے کہ اپنے دفاع کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کر لی جائیں!

مرید ہندی

20- پیر و مرشد! یہ خود آپ ہی کا ارشاد ہے کہ دل کو تلاش کر! اور آپ ہی کا فرمان ہے کہ دل کا طلبگار رہ! اور اس ضمن میں جو رکاوٹیں درپیش ہوں ان کی مزاحمت کے لئے مستعد رہ! جب کہ میرا دل تو خود میرے سینے میں موجود ہے اور مجھ میں جو جوہر موجود ہے وہ اسی آئینے میں فروزاں نظر آتا ہے؟

پیر رومی

مانا کہ تیرے سینے میں بھی دل موجود ہے لیکن اس حقیقت کو جان لے کہ دل محض اس گوشت کے ٹکڑے کو نہیں کہتے جو ہر انسان کے پہلو میں دھڑکتا رہتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دل کا حقیقی مقام عرش معلّٰی ہے نہ کہ وہ پستی میں رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر دل کا تعلق تو بالواسطہ طور پر رب العزت سے ہے نہ کہ اس عالم فانی سے! جہاں تک میرے قول کا تعلق ہے تو نے اسے غلط سمجھا ہے اور اسی پس منظر میں

دل کو روایتی دل تصور کر لیا ہے۔ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ اہل دل کو تلاش کر! اور المیہ یہ ہے کہ وہ
ں تو نے ترک کر دی ہے۔

ید ہندی

-2 مری فکر اتنی بلند ہے کہ اس کا رابطہ آسمانوں کے ساتھ ہے اس کے باوجود مقام عبرت ہے
میں خود زمین پر خوار و خستہ اور غمزدگی کے عالم میں بیٹھا ہوں! سچ تو یہ ہے کہ میں دنیاوی کاروبار کے
اہل ثابت نہیں ہو سکا۔ اسی لئے اس راہ میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اتنا بتا دیجئے کہ دنیا کا کاروبار کیوں
ے بس کا نہیں! اور میں کیوں اس کو انجام دینے میں ناکام رہا ہوں۔ یہ فرمایئے! کہ جو شخص دین کی
توں سے کلی طور پر آگاہ ہے وہ دنیوی کام سے کیوں ناواقف ہے؟

روی

پہلے یہ امر ذہن نشین کر لے کہ جو شخص آسمانوں پر بے تکلف پرواز کرتا رہتا ہے اس کے لئے زمین
چلنا پھرنا کیسے مشکل ہو سکتا ہے۔

ید ہندی

-22 یہ فرمایئے کہ مجھے علم و حکمت کا سراغ کس طرح سے مل سکتا ہے۔ سوز و گداز، درد اور داغ
س طرح دستیاب ہو سکتے ہیں کہ عشق کے اوصاف یہی عوامل تو سمجھے جاتے ہیں؟

ر رومی

علم، حکمت، سوز و گداز اور عشق عملاً حلال کی روزی کمانے کے عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ جان
لے! کسب حلال کرنے والا شخص ان نعمتوں کا سزاوار ہے۔

رید ہندی

-23 ہر عہد کا تقاضا یہی رہا ہے کہ لوگوں سے میل جول رکھا جائے تا کہ انسان تنہائی اور گوشہ
گیری پر مائل نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنہائی اور گوشہ گیری کے بغیر تخلیقی عمل میں سوز و گداز پیدا ہونا
مکن نہیں!

پیر رومی

اس حقیقت کو جان لے! کہ خلوت اور گوشہ گیری غیروں سے چاہئے تا کہ اپنوں سے! پھر پوستین
موسم سرما کا لباس ہے کہ موسم بہار کا؟

مرید ہندی

-24 ہندوستان کا المیہ یہ ہے کہ یہ خطہ ارض ان لوگوں سے خالی ہو گیا ہے جو روشن دماغ اور دل
میں سوز و گداز رکھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اہل دل اب سیہ بختی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں؟

پیر رومی

مردان حق کی صفت یہ ہے کہ لوگوں میں ایمان کی روشنی اور عشق کا سوز و گداز پیدا کریں جب کہ
کم ظرف لوگ فطرتاً بہانہ جوئی اور بے غیرتی کے حامل رہیں گے تاہم ان کے رویوں کے پیش نظر مردان
حق کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں زیادہ سرگرمی سے مصروف ہو جانا چاہئے تا کہ انہیں اطمینان قلب

حاصل ہو سکے!

جبریل و ابلیس

جبریل

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو!

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو — کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے — کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں — کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات — اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

جبریل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند — چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس

ہے مری جراءت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو — میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر — کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا — میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو!
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے — قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح — تو فقط! اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو!

***

معنی: کاخ و کو: محل اور کوچے۔ **تقنطوا:** تم ناامید ہو۔ **لا تقنطوا** تم نہ امید نہ ہو۔ **تار و پو:** تانا بانا۔

یہ نظم حضرت جبریلؑ اور ابلیس کے مابین ایک مکالمے پر مشتمل ہے۔ دونوں فرشتے بارگاہ ایزدی میں مقربین خاص کے طور پر شمار ہوتے تھے جب کہ ابلیس، خدائے پاک کی نافرمانی پر راندہ درگاہ قرار دیا گیا۔ سب جانتے ہیں کہ اس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جبریلؑ آج بھی باری تعالیٰ کے مقربین خاص میں شمار ہونے والا فرشتہ ہے۔ دونوں کے مابین اقبال نے ان کے کرداروں کے پس منظر میں تخیلی سطح پر یہ مکالمہ ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ مکالمے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

جبریل

ابلیس سے مخاطب ہو کر جبریلؑ کہتے ہیں! تو میرا یار قدیم ہے یہ بتا وہ جہان رنگ بو کیسا ہے جسے دنیا کہا جاتا ہے اور جہاں اب تیری بود و باش ہے۔

ابلیس

وہاں کی زندگی اور ماحول میں سوز و ساز' درد و داغ' جستجو اور آرزو کے سوا اور کیا رکھا ہے؟

جبریلؑ

اے ابلیس! جان لے کہ آسمان پر اکثر و بیشتر تیرا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کر کے تو نے احکام خداوندی سے انحراف کر کے جو گناہ کیا ہے کیا اس امر کا امکان نہیں کہ تو اپنی غلطی کو تسلیم کر لے تاکہ رب ذوالجلال تجھے معاف کر کے تیرے پرانے منصب پر فائز کر دے۔

ابلیس

جبریلؑ! تو میرا ہم جلیس ہونے کے باوجود اس کیف و سرمستی سے لطف انداز ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو میں نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے حاصل کی ہے نا ہی تو اس راز سے آگاہ ہو سکتا ہے جس سے میں اب واقف ہو چکا ہوں۔ میں اب اس نشے میں غرق ہوں جو کسی طور بھی نہیں اتر سکتا۔

میں تو اب اس ماحول میں رچ بس گیا ہوں جہاں ہر لمحے محلات کیا عام گلی کوچوں میں بھی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ زندگی دوڑ رہی ہوتی ہے اور جس کا ہر فرد اپنی اپنی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں مصروف رہتا ہے۔ جب کہ تو ابھی تک اس پرسکوت فضاء اور سناٹے تک محدود ہے جو فرشتوں اور قدسیوں کے لئے تو سازگار ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے نہیں جنہیں زندگی سے پیار ہے۔ میں بے شک اپنی نافرمانی کے سبب فرشتوں پر ودیعت کردہ عنایتوں سے تو محروم ہو گیا ہوں لیکن اب پوری زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اس صورت میں خدا کی رحمت بہتر ہے کہ اس رحمت سے محرومی؟

جبریلؑ

تو نے تو حکم ربی کی تعمیل سے انکار کر کے نہ صرف یہ کہ اپنے بلند مراتب کھوئے بلکہ اپنی راہ میں کانٹے بھی بو لئے! لیکن تیرا یہ عمل صرف تیری ہی ذات تک محدود نہیں بلکہ پروردگار کی نظروں میں تو اب شاید دوسرے فرشتوں کا بھی عمل مشتبہ ہو کر رہ گیا ہو گا۔

ابلیس

میری جراءت مندی کے سبب تو ارض خاک کے باسیوں میں وہ جذبہ پیدا ہوا جو ان کے لئے حقیقی اور مسرت افزاء زندگی گزارنے کا سبب بنا۔ پھر میرا کردار جسے فتنہ سازی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہی تو عقل و دانش کا سرچشمہ ہیں۔ جہاں تک تیرا تعلق ہے تو تو ایک ایسا تماشائی ہے جو نیکی و بدی کے مابین معرکہ آرائی کو ایک پرسکون مقام پر کھڑے ہو کر اس کا نظارہ کرتا ہے جب کہ میں تو اس معرکہ آرائی کے طوفان میں بری طرح سے تھپیڑے کھا رہا ہوں!

میں نے جو طوفان برپا کئے ہیں انہوں نے حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ جیسے اولوالعزم پیغمبروں کو بھی بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اگر بارگاہ ایزدی میں کبھی خلوت نصیب ہو تو یہ ضرور استفسار کرنا کہ

حضرت آدمؑ کے واقعہ کو کس نے قربانی دے کر لہو رنگ کیا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ اپنی نافرمانی کے سبب دلِ یزداں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہوں اور تیرا کیا ہے تو تو ابھی تک اللہ ہو اللہ ہو کی ہر لحظہ گردان میں مصروف ہے۔

اذان

اک رات ستاروں سے کہا نجمِ سحر نے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار؟

کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا؟
اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار!

بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار!

واقف ہو اگر لذتِ بیداریِ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُراسرار!

آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار!

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار!

اقبال نے ہر موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی فکر اور حکمت و دانش کے حوالے سے جو جادو جگایا ہے اس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے لیکن اس کی تمام تر خیال آرائی اور فکر کا بنیادی کردار ہمیشہ اور ہمیشہ انسان ہی رہا ہے۔ زیرِ تشریح نظم کا مرکزی خیال "اذان اور شب بیداری" جیسے معاملات کا احاطہ کئے ہوئے ہے تاہم اس میں دلچسپی چاند اور ستاروں کے مکالمات سے پیدا کی گئی ہے۔ سات اشعار پر مشتمل یہ ایک مختصر مگر بڑی جامع نظم ہے۔ فرماتے ہیں:

① اقبال نے اپنے موضوع کے حوالے سے اظہار کے لئے جو فضاء تخلیق کی ہے اس میں چاند اور بعض ستارے اہم کردار بن کر سامنے آتے ہیں تاہم اس موضوع کا مرکز و محور انسان ہی ہے۔ اس شعر کے مطابق ایک شب ستارہ صبح دوسرے ستاروں سے استفسار کرتا ہے کہ باری تعالیٰ نے ہمارے لئے تو شب بیداری مقدر کر دی ہے۔ رات کی تاریکی میں ہماری روشنی پوری کائنات کو جگمگاتی رہتی ہے لیکن انسان کو جو رتبہ بلند عطا کیا گیا ہے کیا تم نے اسے بھی کبھی اپنی طرح ساری ساری رات تک بیدار اور مصروفِ کار دیکھا ہے؟

② سب سے پہلے "ستارہ صبح" کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مریخ نے کہا کہ قدرت بڑی حقیقت شناس ہے۔ انسان بلا شک و شبہ ایک چھوٹے سے فتنہ کے مانند ہے جس کا سویا رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ بیدار ہے تو نہ جانے کیا کیا قیامت ڈھاتا رہے۔

③ زہرہ نے یہ گفتگو سنی تو بولا تمہارے پاس اظہار خیال کے لئے کیا کوئی اور موضوع نہیں ہے۔ انسان سے ہمیں آخر کیا لینا ہے۔ اس کی حیثیت تو ایک ایسے کیڑے کی سی ہے جو شب کی تاریکی میں بصارت سے محروم رہتا ہے پھر وہ اگر رات کو بیدار بھی رہے تو اس سے کیا حاصل ہو گا۔

④⑤⑥ ستارہ صبح، مریخ اور زہرہ کا مکالمہ جس لمحے مہ کامل کے گوش گزار ہوا تو زمین سے دوسرے ستاروں کی نسبت زیادہ قربت اور انسان کی فطرت سے نسبتاً زیادہ آگاہی کے سبب وہ گفتگو میں مداخلت

کرتے ہوئے یوں گویا ہوا کہ انسان تو عملی سطح پر زمین کو تابندہ کرنے والے ستارے کی مانند ہے۔ تم اگر رات کے وقت چمکتے ہو تو وہ دن میں درخشاں رہتا ہے۔ یہ جان لو کہ اگر کہیں وہ بیداری شب کی لذت سے آگاہ ہو جائے اور اسے پتہ چل جائے کہ رات کو جاگنے میں کیا لطف حاصل ہوتا ہے تو اس کا مرتبہ ثریا سے بھی زیادہ بلند ہو جائے۔ مت بھولو کہ اس خاک کے پتلے میں ایسا پوشیدہ نور موج زن ہے کہ اگر کسی مرحلے پر اس کا ظہور ہو جائے تو تم سمیت آسمان پر چمکنے والے تمام ستارے اور سیارے اس کے سامنے ماند پڑ جائیں اور اس کے جلووں میں دفن ہو کر رہ جائیں۔

⑦ یہ مکالمہ جاری تھا کہ ساری فضا صبح کی اذان کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ ایسی گونج تھی جس سے پہاڑ بھی دہل اٹھتے ہیں گویا اس خدائی پیغام کے ساتھ انسان کو عبادت کے لئے بیدار ہونے کا حکم مل گیا اور مکالمہ کرنے والے ستارے بھی اس راز سے آگاہ ہو گئے کہ انسان کو مخلوقات میں اس لئے اشرف قرار دیا گیا ہے کہ احکام الٰہی کے تحت سوتا ہے اور انہی کے تحت بیدار ہوتا ہے۔

محبت

شہید محبت نہ کافر نہ غازی! محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی!
وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی!
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی!
نہ محتاج سلطاں نہ مرعوب سلطاں محبت ہے آزادی و بے نیازی!
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

معنی: غزنوی: سلطان محمود غزنوی۔ **ایازی:** ایاز سلطان محمود غزنوی کا غلام اور عہدہ دار تھا۔ **شیشہ بازی:** فریب کاری۔ **مرعوب:** رعب میں آیا ہوا۔ ڈرا ہوا۔ **اسکندری:** بادشاہی اس لئے کہ سکندر بہت بڑا بادشاہ تھا۔ **آئینہ سازی:** لفظی معنی آئینہ بنانا۔

دنیا کے مختلف مفکرین اور ماہر نفسیات اس کلیے پر مکمل اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ محبت کا جذبہ دوسرے تمام جذبوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اقبال بھی اس نقطہ نظر سے متفق نظر آتے ہیں۔ زیر تشریح نظم کے علاوہ ان کے کلام میں جہاں کہیں بھی محبت کا ذکر آیا ہے۔ اسی حوالے سے آیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

① محبت کا جذبہ عملاً تمام حدود سے متجاوز نظر آتا ہے۔ مذہب، قوم، ملک، نسل، فرقہ بندی اور دوسرے عوامل سے محبت بے نیاز رہتی ہے۔ اس جذبے میں نہ عقیدہ کو دخل ہے نہ کوئی روایت اور رسم اس کی پاسداری کرتی ہے۔ محبت کے عمل میں قربانی دینے والا نہ تو شہید ہوتا ہے نا ہی اسے کافر اور غازی جیسے خطابات سے نوازا جا سکتا ہے نا ہی کسی نسلی بنیاد پر اس کی شناخت ممکن ہے۔

② اس شعر میں ایک اہم راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ محمود غزنوی اور اس کے پسندیدہ غلام ایاز کے مابین جو رشتہ تھا وہ کچھ اور تو ہو سکتا ہے اسے جذبہ محبت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس تعلق کو اقبال کے نقطہ نظر کی روشنی میں واضح کیا جائے تو بات جنس اور نفس پرستی تک جا پہنچتی ہے۔

③ نظم کے ہر دو اشعار میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس کے باوجود زیر تشریح شعر میں اس امر کو واضح کر دیا گیا ہے کہ علم اور حکمت میں اگر محبت کا جوہر شامل نہ ہو تو انہیں فریب کاری اور مکاری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مراد یہ ہے کہ علم و حکمت عملاً انسانی بہبود و ترقی کے ساتھ شعور و دانش سے ہم آہنگ ہیں۔ تاہم یہ اسی وقت فروغ پا سکتے ہیں کہ یہ محبت کے جوہر سے آراستہ ہوں۔ اس کے بغیر علم و حکمت بے معنی شے ہیں۔

④ محبت کا جذبہ نہ کسی بادشاہ کا محتاج ہوتا ہے نا ہی اس کا پابند! اس کے برعکس محبت تو تمام علائق دنیوی سے آزادی اور بے نیازی کا نام ہے۔

⑤ میرا فقر اور خلق خدا سے محبت کا جذبہ عملاً سکندر اعظم جیسے پرشکوہ بادشاہ کی عظمت اور جاہ و جلال سے بھی بہتر اور بلند تر ہے کہ اول الذکر میں مخلوق کی بہتری اور اس کی تربیت کا جذبہ مضمر ہے اور ثانی الذکر تصنع اور بناوٹ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہاں اقبال کے سکندر اور آئینہ سازی کے ضمن میں جو اشارے کئے ہیں ان کا پس منظروہ تاریخی آئینہ ہے جو سکندر نے اسکندریہ کے مقام پر سمندر میں ایستادہ مینار میں نصب کرایا تھا کہ رات کی تاریکی میں یہاں سے گزرنے والے جہازوں کی رہنمائی ہو سکے۔

جاوید کے نام

(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر! نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر!
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر!
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر!
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر!
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے! خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر!

معنی: سفال: مٹی کا برتن۔ مٹی۔

پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم بقول اقبال انہوں نے اس خط کے جواب میں لکھی جو ان کے بیٹے جاوید نے باپ کے نام تحریر کیا تھا۔ یہ جاوید کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط تھا جو اقبال کو لندن میں موصول ہوا۔ یہ بات دل کو لگتی ہے کہ بظاہر یہ نظم انہوں نے بیٹے کے نام ہی لکھی ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو وہ اس میں ملت اسلامیہ کے تمام نوجوانوں سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

① تیرے لئے اے بیٹے لازم ہے کہ علم اور عملی جدوجہد کے ذریعے معاشرے میں اپنی شناخت کرائے اور وہ مرتبہ حاصل کرے جو عزت و احترام کا حامل ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ قدیم روایات کو ترک کر کے خود کو نئی اور مثبت جہتوں سے ہم آہنگ کرے۔

② خدا کرے تجھے وہ فطرت شناس دل عطا ہو کہ تو ان اشیا کی باتیں بھی جان سکے گا جو قوت اظہار سے محروم ہیں اور لالہ و گلاب جیسے پھولوں کی خامشی بھی تیرے لئے کلام بن جائے گی۔

③ اے فرزند! یورپ کے علوم و فنون اور وہاں کی تہذیب کو بھی حرفِ آخر تصور نہ کر کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! تجھے عروج حاصل کرنا ہے تو اپنی تہذیب اور اپنے ہی وطن کے طور طریقوں کے علاوہ علوم و فنون سے وابستگی پیدا کر! کہ یورپ کی تہذیب مصنوعی اور ناپائیدار ہے اور مشرق کے علم و فن اور تہذیب میں وطن کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔

④ میں نے اپنے اشعار میں جو اسرار و رموز بیان کیے ہیں ان کی معرفت حاصل کر کے پوری طرح ذہن نشین کر لے اور انہی پر کاربند ہو جا۔

⑤ میرا طرزِ عمل امارت کی بجائے سے عبارت ہے۔ تیرے لئے بہتر ہے کہ یہی راستہ اختیار کر لے۔ تا ہی اپنی خودی کا سودا کر! یہی وہ نکتہ ہے کہ تو غربت میں بھی نام پیدا کر سکتا ہے۔

فلسفہ و مذہب

یہ آفتاب کیا یہ سپہر بریں ہے کیا؟ / سمجھا نہیں تسلسل شام و سحر کو میں
اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں؟ / ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں!
کھلتا نہیں مرے سفر زندگی کا راز / لاؤں کہاں سے بندہ صاحب نظر کو میں!
حیراں ہے بو علی کہ میں آیا کہاں سے ہوں / رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں!
"جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ / پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

معنی: سپہر بریں: بلند آسمان۔ غریب الدیار: پردیسی مسافر۔

فلسفہ اور مذہب کے مابین کیا فرق ہے۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے یہ تقابلی سطح پر تضادات کے شکار کیوں ہیں۔ ان کے مقاصد میں کیا فرق ہے؟ ان کا تجزیہ کیا جائے تو جاننے میں بالعموم زیادہ قباحت محسوس نہ ہو گی کہ فلسفہ اصولی طور پر اشیاء کی تخلیق اور ان کے وجود کی غرض و غایت کے بارے میں تعقل اور استدلال کے حوالے سے جاننے کا علم ہے جب کہ خالص عقیدے بلکہ ایک طرح سے اندھے عقیدے' یقین اور ایمان ایک طرح سے مذہب کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اقبال نے اپنی اس نظم میں جس خوبی کے ساتھ فلسفہ اور مذہب کے مابین جو حد فاصل ہے اس کا تجزیہ کیا ہے وہ انتہائی فکر انگیز ہے۔ ان کے نزدیک بو علی سینا فلسفیوں کی نمائندہ کرتے ہیں اور مولانا روم کو مذہب کے ترجمان ہیں زیر تشریح نظم کے چوتھے شعر میں انہوں نے اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ اس پس منظر کے حوالے سے یہ عجیب بات دیکھنے میں آتی ہے کہ اجتماعی سطح پر ان اشعار میں ایک تذبذب کی کیفیت موجود ہے اور ان کا شاعر ایک سوالیہ نشان کی صورت میں دوراہے پر کھڑا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

① یہ سورج جو علی الصبح برآمد ہوتا ہے اور شام کو غروب ہو جاتا ہے اور یہ آسمان جو کرہ ارض پر چھایا ہوا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کیفیت شام و سحر کے مابین جو سلسلہ ہے اس کی ہے۔

② یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس مقام پر جہاں میں بود و باش اختیار کیے ہوں اپنے وطن سے تعبیر کروں یا یہ سمجھوں کہ میرا کوئی وطن اور گھر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے صحرا اور گھر مجھے ایک انجانے خوف

میں مبتلا رکھتے ہیں۔

③ ہر چند کہ میرا سفر جاری ہے اور زندگی کی جو مسافت ہے اسے طے کر رہا ہوں لیکن اس کے اغراض و مقاصد سے بے بہرہ ہوں۔ دکھ تو یہ ہے کہ کوئی ایسا صاحب فکر رہنما بھی نہیں ملتا جو حقائق سے روشناس کرا سکے اور یہ باور کرا سکے کہ زندگانی کا بنیادی مقصد کیا ہے اور میرے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں فلسفیوں کی سوچ ایک سوالیہ نشان میں ڈھل جاتی ہے۔

④ چنانچہ جب ممتاز فلسفی حکیم بو علی سینا کے تصورات پر نظر پڑتی ہے تو انسانی وجود اور اس کی غرض و غایت کے سلسلے میں کوئی واضح نقطہ نظر نہیں رکھتے بلکہ اس مسئلے پر حیران و پریشان نظر آتے ہیں۔ سو وہ فلسفی اور دانشور خود ہی حیرانی اور تذبذب کا شکار ہو وہ کسی کی رہنمائی کیسے کر سکتا ہے۔ دوسری طرف ممتاز دانشور اور ممتاز شاعر مولانا روم ہیں وہ خود صحیح راہ اور حقیقی منزل کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں۔ سو ان سے یہ توقع عبث ہے کہ حتمی سطح پر عقدہ کشائی کر سکیں۔

⑤ نظم میں شامل یہ شعر میرزا غالب کا ہے اور اقبال نے اپنی مخصوص سوچ کے باوجود تھوڑے سے اجتہاد کے ساتھ اسی شعر سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ ساتھ ہی اس کے ذریعے وہ ایک منطقی نتیجے پر بھی اس طرح پہنچتے ہیں کہ منزل تک پہنچنے کے لئے جو راہرو سامنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑی سی مسافت ضرور طے کر لیتا ہوں تاہم جلد ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک میں گم کردہ راہ ہوں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک میں ایسے حقیقی رہنما کی شناخت کا اہل ثابت نہیں ہو سکا جو منزل تک پہنچانے کی واقعی صلاحیت رکھتا ہو۔

یورپ سے ایک خط

ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحر پر آشوب و پراسرار ہے رومی!
تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال!
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام؟
کہتے ہیں چراغ رہ احرار ہے رومی

جواب

کہ نباید خورد و جو ہمچوں خراں
آہوانہ در ختن چرا ارغواں
ہر کہ کاہ و جو خورد قرباں شود
ہر کہ نور حق خورد قرآں شود!

معنی: محسوس: وہ شے جس کا علم حواس خمسہ کے ذریعے ہو سکے یعنی جو دیکھی، سنی، چھوئی، چکھی اور سونگھی جا سکے۔ مراد ہے مادی شے۔ پر آشوب: طوفانی۔ احرار: حر کی جمع۔ لفظی معنی آزاد۔ اصطلاحی معنی اہل حق اور خدا دوست اصحاب۔

یہ مختصر نظم بھی اسی انداز کی ہے جس طرح "پیر و مرید" کے عنوان کی نظم ہے۔ موخر الذکر نظم میں "مرید ہندی" کے کردار میں خود اقبال ہیں جو بعض ایسے استفسار تراشتے ہیں جن کے جوابات بڑے حکیمانہ

انداز میں مولانا روم نے دیئے ہیں۔ زیر تشریح نظم کے پانچ اشعار میں تین اشعار تو خود علامہ اقبال کے ہیں جن کا متن یورپ سے علامہ کے نام ایک خط سے ماخوذ ہے۔ ان اشعار میں مولانا روم کی حکمت و دانش کے حوالے سے بعض سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب آخری دو اشعار میں موجود ہے۔ یہ دونوں اشعار مولانا روم کے ہیں۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ نظم بھی علامہ اقبال کی ایک دوسری نظم "پیر و مرید" سے فورم کے اعتبار سے کافی حد تک ملتی جلتی ہے۔ ملاحظہ ہو!

پہلا بند

① مکتوب نگار! علامہ اقبال سے اپنے خط میں استفسار کرتا ہے کہ ہم لوگ تو خیر اس امر کے عادی ہو چکے ہیں کہ ایک تماشائی کی حیثیت سے ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کریں۔ (مراد یہ ہے کہ ہماری نظریں محض مادی اشیاء کے نظارے تک محدود رہیں) جب کہ مولانا روم تو معرفت اور روحانیت کا ایک ایسا سمندر ہیں جس کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ مشکل ہے۔

② آپ کا تعلق بھی تو اسی سلسلہ شوق سے ہے جس سلسلہ شوق کے سرکردہ رہنما مولانا روم ہیں یعنی آپ بھی ان کی طرح معرفت اور روحانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس صورت میں آپ با آسانی اس امر کی وضاحت کر سکتے ہیں کہ مولانا روم کا نظریہ کیا ہے۔

③ ازراہ کرم یہ تو فرمایئے کہ مولانا روم کو تو خدا دوست اور آزاد منش لوگوں کا رہنما تصور کیا جاتا ہے تو کیا انہوں نے اس ضمن میں عصر موجود کو بھی کوئی پیغام دیا ہے یا نہیں!

جواب

① اقبال کے بقول مولانا روم کے ان دو اشعار میں ہی ان کا پیغام موجود ہے۔ پہلے شعر میں ان کا فرمان ہے کہ گھاس اور جو تو گدھوں کی خوراک ہے اور ختن کی پہاڑیوں کے باسی ہرن جو مشک نافہ پیدا کرتے ہیں نارنجی رنگ کا خوبصورت، میٹھا اور نشہ آور پھول ارغوان کھاتے ہیں۔ اسی کے سبب مشک کی پیداوار کے لئے ان کے خون میں مطلوبہ جوہر پیدا ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ مادیت بے شک تن پروری کے کام تو آ سکتی ہے جب کہ روحانیت کے طفیل انسان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ پوری فضا کو متاثر کر دیتا ہے۔

② مولانا روم اس شعر میں فرماتے ہیں کہ گھاس اور جو کھانے والا بھیڑ بکری اور گائے بیل کی طرح ذبح کر دیا جاتا ہے تاکہ دوسروں کی تن پروری کا سبب بن سکے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو نور خداوندی پر اکتفا کرتا ہے اس کا سینہ روحانیت سے منور ہو جاتا ہے اور وہ قرآن کی مانند دوسروں کے لئے رہنمائی کا سبب بن جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ انسان میں صلاحیت ہو اور رہنمائی کا جوہر موجود ہو تو اس کے طفیل پورا ماحول منور ہو کر رہ جاتا ہے۔

نپولین کے مزار پر

راز ہے راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!

جوش کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!

ہے مگر فرصت کردار نفس یا دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز!

"عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز!"

معنی: **جہان تگ و تازہ:** وہ دنیا جس میں دوڑ دھوپ اور جدوجہد لازم ہے۔ یعنی ہماری دنیا۔ **الوند:** ایران کا ایک مشہور پہاڑ۔ **تیمور:** ترکستان کا مشہور مغل فاتح جس نے اپنی ہمت سے ایشیا میں ایک نہایت عظیم الشان سلطنت قائم کرلی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر تیمور ہی کی اولاد میں سے تھا۔ اسی وجہ سے مغل سلاطین کو تیموری بھی کہتے ہیں۔

نپولین کا شمار فرانس ہی نہیں دنیا کے چند عظیم ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ یہ اس کی بے پناہ صلاحیت اور جدوجہد کا نتیجہ ہی تھا کہ اس معمولی لیفٹنٹ کے عہدہ سے ترقی پاکر وہاں کی افواج کا سپہ سالار پھر مطلق العنان شہنشاہ بنا۔ زندگی میں اس نے سینکڑوں جنگیں جیتیں لیکن واٹرلو کے مقام پر انگریزوں سے شکست کھائی جس کے سبب وہ جزیرہ سینٹ ہلینا میں قید کردیا گیا اور 1891ء میں وہیں پر اس نے وفات پائی۔ نپولین کے اس زوال کے باوجود پیرس کے قلب میں اس کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جو آج بھی مرجع خاص وعام ہے۔

اقبال جب پیرس میں نپولین کے مقبرے میں گئے تو اس سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ نظم کہی۔ یہ اقبال کی انتہائی بلند پایہ نظموں میں سے ایک ہے۔ ہرچند کہ یہ مختصر سی نظم محض چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود اس میں نپولین اعظم کا مکمل کردار جھلکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے!

① ہرچند کہ یہ دنیا جوش عمل اور انتہائی جدوجہد کی حامل ہے۔ اس کے یہاں انسانی تقدیر ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے جس کی عقدہ کشائی کسی کے بس کا روگ نہیں۔ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ اس کے بارے میں انسانی علم کچھ بتانے سے معذور ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ انسان میں جوش عمل اور جدوجہد کا جذبہ موجود ہو تو تقدیر کے بھید کھلنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

② اور یہی جوش کردار و عمل تھا جس کی مدد سے سکندر اعظم نے ایران جیسی مستحکم اور پر شکوہ سلطنت کو تہ وبالا کردیا۔ اور اس کا نقش صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

③ یہ جوش کردار و عمل ہی تھا جس نے تیمور کی عسکری قوت کو ایک ہمہ گیر طوفان میں ڈھال دیا۔ اس طوفان کے مقابلے پر جو کچھ بھی آیا اس کے ریلے میں بہہ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کے ہمہ گیر طوفان کے مقابلے پر بلندی اور پستی کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ وہ تو جب پوری تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے تو نہ بلندی کو دیکھتا ہے نا ہی پستی کو ہر چیز کو روند کر بڑھتا چلا جاتا ہے۔

④ میدانِ کارزار میں جب اللہ کے سپاہی معرکہ آرا ہو کر تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو جوشِ کردار عمل اس کی بنیاد ہوتا ہے اور پھر یہی نعرہ عملاً نعرہ حق یعنی خدا کی آواز بن جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ نعرہ تکبیر میں رضائے الٰہی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمن کے لئے تو یہ نعرہ صورِ اسرافیل سے کم نہیں ہوتا۔

⑤ تاہم یہ جوشِ کردار و عمل انسان کی عمر کے ساتھ بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو قبر کی لمبی تاریکی ہے جو روزِ قیامت تک مقدر کردی گئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی عارضی اور مختصر ہوتی ہے۔ اپنے کردار اور عمل سے اس مختصر وقت سے پوری طرح استفادہ کرنا چاہئے تاکہ انسان کا نام اس کی موت کے بعد بھی زندہ رہے۔ اور یہ سب کچھ جوشِ کردار و عمل کے بغیر ممکن نہیں!

⑥ نظم کا یہ آخری شعر اقبال کا نہیں بلکہ حافظ کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انسان کی منزل بالاخر قبر ہی ہے جہاں تاریکی اور سکوت و خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں۔ قبر سے نہ تو کوئی صدا بلند ہوتی ہے نا ہی اور کوئی شے قریب پھٹکتی ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو کیوں نہ زندگی کو ہنگامہ ہاؤ ہو میں صرف کیا جائے اور اس آواز کو یوں بلند کیا جائے کہ وہ گنبدِ افلاک میں بھی غلغلہ پیدا کر دے۔

ان اشعار میں نپولین کے عملی کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی موت کے بعد کا منظر نامہ بھی ایک طرح سے نمایاں کیا گیا ہے۔

مسولینی

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب! — ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب!
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی — ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب!
رومۃ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر — اینکہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب!
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ — نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب!
یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود! — فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب!
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے — زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب!
فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟ — وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

معنی: ندرت: تازگی۔ انوکھا پن۔ **رومۃ الکبریٰ:** لفظی معنی سب سے بڑا شہر رومہ یہ اس زمانے سے رومہ کا لقب چلا آتا ہے۔ جب وہ رومی سلطنت کا مرکز تھا۔ **سینہ تاب:** جن کے سینے گرم ہوں۔ **زخمہ وار:** ساز بجانے والا۔

1931ء میں علامہ اقبال جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن پہنچے تو ان کو اطالوی سفیر متعینہ بھارت کی وساطت سے مسولینی کا پیغام ملا جس میں انہیں کانفرنس سے فراغت کے بعد روم آکر کچھ عرصہ قیام کرنے اور وہاں لیکچر دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ اقبال نے یہ دعوت منظور کرلی۔ روم پہنچ کر انہوں نے روم کے اکابرین کی مجلس میں ایک لیکچر بھی دیا اور مسولینی سے بھی ملاقات کی۔ ان پر اس ملاقات کا گہرا اثر پڑا۔ یہاں مسولینی کے بارے میں چند حقائق کا ذکر ناگزیر ہے کہ ان کے بغیر اس

نظم کی روح کو سمجھنا مشکل ہے۔ مسولینی نوجوانی میں اطالوی فوج سے منسلک بھی رہا۔ وہ ایک طرح سے اٹلی میں فاشزم کی تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ 1922ء میں وہ اپنے ملک کا مختار کل بن گیا۔ وہ شعلہ بیاں مقرر تھا۔ اس نے قوم میں جنگی روح پھونک کر اہل روم کی عظمت رفتہ کو یاد دلا کر ایک عظیم الشان سلطنت کا تصور پیش کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں مسولینی نے ہٹلر کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں اتحادیوں کے مقابلے پر اٹلی نے شکست کھائی اور مسولینی کو اقتدار سے علیحدہ کر کے ایک جزیرے میں نظربند کر دیا گیا۔ جہاں سے ہٹلر کے ہواباز اسے چھڑا کر لے گئے۔ چنانچہ شمالی اٹلی میں دوبارہ اس کی حکومت قائم ہوئی لیکن حالات اس کے قابو سے باہر ہو چکے تھے جس کے سبب وہ بھیس بدل کر سوئٹزرلینڈ فرار ہونے لگا تو راہ میں پکڑ کر اسے گولی مار دی گئی۔

1931ء میں اقبال نے اٹلی کے سفر کے دوران مسولینی کی عظمت کے نظارے جگہ جگہ دیکھے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر انہوں نے فاشسٹ نوجوانوں کے پرجوش جتھے دیکھے۔ وہ ان کے جوش و خروش سے بے حد متاثر ہوئے ہی نہیں بلکہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسولینی کی قیادت میں اٹلی کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ یہی وہ تصورات تھے جن کی بنیاد پر اقبال نے یہ نظم تخلیق کی۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال قطعی طور پر فاشزم کے حامی نہ تھے بلکہ اسے فرنگی استعمار کے خلاف رد عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔

① ''مسولینی'' کے عنوان سے زیر تشریح نظم سات اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے شعر میں کہا گیا ہے کہ نظریہ جب زیر عمل آتا ہے تو وہ قوم میں انقلاب کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ یہی عمل انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ نظریہ اور عمل کے ارتباط کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ قوم میں جوانی کی روح اور جوش پیدا ہو تا کہ وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکے۔

② یہ نظریہ اور عمل کے مابین ارتباط کی انفرادیت ہے جو زندگی کو معجزات سے ہم کنار کرتی ہے اور یہی عمل پتھر کو سل میں منتقل کر دیتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب کسی قوم کے پاس کوئی ٹھوس نظریہ ہو اور وہ اس پر عمل پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو تو وہ ایسے انقلاب سے دوچار ہو جاتی ہے جو اپنی قوت و نمو کے سبب اپنے آپ کو بھی بدلتی ہے اور دوسروں کو بھی تبدیلی پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی ہی قوم عملی سطح پر ایسے کارنامے انجام دیتی ہے جن کے سبب اس کا نام ہمیشہ کے لئے تاریخ کی زینت بن جاتا ہے۔

③ اس شعر میں اقبال اٹلی میں دوران قیام اپنے مشاہدے پر متحیر ہیں کہ ایک قلیل عرصے میں یہ ملک کتنے تغیر سے ہم آہنگ ہوا ہے کہ اس کی موجودہ حالت پر یقین کرنے میں تامل ہوتا ہے اور دیکھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں حالات خواب میں ہوں یا جاگ رہا ہوں۔

④ اب تو کیفیت یہ ہے کہ یہاں کے ضعیف لوگوں کی نظریں بھی اس روشنی سے جگمگا رہی ہیں جو جواں عمری کی مظہر سمجھی جاتی ہے۔ ان میں ایک ایسی آب و تاب دکھائی دیتی ہے جو قابل رشک ہے۔ اور جہاں تک روم کے نوجوانوں کا تعلق ہے ان کے سینے بلند ولولوں اور خواہشات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ ایسا ہمہ گیر تغیر تو زندہ قوموں ہی کا مقدر ہوتا ہے۔

⑤ وطن پر مرمٹنے کا جذبہ! پھر اس جذبے میں حرارت اور جوش و خروش کا مظاہرہ تو ایسے عوامل ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اطالوی قوم کا ہر فرد اپنی منزل کی طرف غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ اسی طرح

رواں دواں ہے۔ جس طرح موسم بہار میں پھول شاخوں سے بر آمد ہونے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں۔ اقبال نے اپنے تاثرات جس خوبصورتی کے ساتھ بیان کئے ہیں ان پر بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

⑥ اے اطالیہ! آج تیری فضا جن نعروں سے گونج رہی ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تیری خوابیدہ انقلابی فطرت کو جس تحریک کی ضرورت تھی وہ معرض وجود میں آ چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے نزدیک اس تحریک کی مظہر مسولینی کی ذات کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

⑦ اے اطالیہ! اتنا بتا دے کہ آج تیری فضائیں جن انقلابی نعروں سے زیر و زبر ہو رہی ہیں اور ان میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ کس کا فیض اور کس کی کرامت ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کی نگاہ سورج کی شعاع کے مانند ہے جہاں تک سورج کی شعاعوں کا تعلق ہے۔ وہ دیکھا جائے تو ساری کائنات کو روشنی فراہم کرتی ہیں۔ اقبال نے یقیناً مسولینی کے لئے ہی "سورج کی شعاع" کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

پنجاب کے دہقان سے

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز ۔۔۔ ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز!
تری خاک میں دب گئی تیری آگ ۔۔۔ سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ!
زمیں میں ہے گو خاکیوں کی برات ۔۔۔ نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات!
زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں ۔۔۔ جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں!
بتان شعوب و قبائل کو توڑ ۔۔۔ رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم یہی فتح باب ۔۔۔ کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

بخاک بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں!

معنی: شعوب: شعیب کی جمع۔ بڑے قبیلے۔ **سلاسل:** سلسلہ کی جمع۔ زنجیریں۔

اقبال نے اپنے گرد و پیش کے مسائل کا جس دل سوزی مگر حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لیا ہے وہ ایک طرف تو اس امر کا غماز ہے کہ وہ عصری صورت حال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ شعر میں ان کا اظہار ہمیشہ اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ان کی شاعری عملاً ایک پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ زیر تشریح نظم کے اشعار میں جہاں وہ "پنجاب کے دہقاں کی کیفیات اور ان کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں وہاں وہ ان کو بیداری کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے!

① نظم کے تمام اشعار میں علامہ اقبال پنجاب کے کسان سے براہ راست مخاطب ہیں۔ اس کے اولین شعر میں وہ کسان سے استفسار کرتے ہیں کہ ہزارہا سال سے تو خاک چھان رہا ہے اور غذائی اجناس پیدا کر رہا ہے لیکن اتنا بتا دے کہ کیا تیری زندگی ہمیشہ اسی عمل تک محدود رہے گی۔ نہ جانے تو اسی پر کیوں اکتفا کئے ہوئے ہے جب کہ تو زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہے۔

② تجھ میں جوش و عمل کا جو جذبہ تھا کیا وہ اس مٹی کی نذر ہو گیا جس کو تو قابل کاشت بناتا ہے۔ اب تو

مایوسیوں کا اندھیرا دور ہو کر امید کی نئی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ دنیا بھر میں ہر ملک کے عوام اپنے حقوق کے حصول کی خاطر بیدار ہو کر استحصالی قوتوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اب تیرے لئے بھی لازم ہے کہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنے حقوق کے لئے عملی جدوجہد کرے۔

③ ہر چند کہ دنیا کے تمام باشندوں کو پیٹ بھرنے کے لئے رزق زمین سے ہی میسر آتا ہے اس لئے غذائی فصلوں کی کاشت زمین میں ہی ہوتی ہے اس کے باوجود یہ فصلیں انسان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی اہل نہیں ہوتیں۔ زندگی محض یہ تو نہیں کہ فصل پیدا ہو اور اس سے پیٹ بھر لیا۔ زندگی کا مقصد تو اور بھی کچھ ہے۔

④ یعنی زندگی کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو پہچانے۔ اس کا تحفظ کرے اور لحہ بہ لحہ اس کو جانچتا رہے۔ اور جو شخص اس عمل سے بے بہرہ ہے اس کے بارے میں بس اسی قدر کہنا ہی کافی ہے کہ وہ حقیقتوں کے ادراک سے محروم ہے۔

⑤ افسوس کہ تو بیداری کے اس عہد میں بھی نسلوں، قبیلوں اور فرقوں کے قدیم اور از کار رفتہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان کی شکست و ریخت کے بغیر تیرا منزل مقصود تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قدیم رسموں اور روایتوں کی زنجیروں کو بھی توڑ کر ان سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لے۔

⑥ دنیا میں اگر توحید کا سبق عام ہو جائے اور یہ جو مسلمانوں میں چھوٹے چھوٹے دھڑے، فرقے اور قبائل موجود ہیں اگر یہ سب متحد ہو کر ایک ہی ملت میں ڈھل جائیں تو یہاں دوسری قوموں پر برتری کی صورت نکل سکتی ہے۔ اور اس طرح توحید کا قیام ساری دنیا تک پہنچ سکتا ہے۔ کہ یہی پیغام سب کے لئے تمام علائق دنیوی سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

⑦ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال پنجاب کے دہقان کو اسی کی زبان میں مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تک انسان کے دل میں زندگی کے حقیقی نصب العین کے حصول کی تڑپ نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک وہ ناقابل فراموش کارنامے سرانجام نہیں دے سکتا۔ یہی تڑپ دراصل انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے۔

نادر شاہ افغان

حضورِ حق سے چلا لے کے لولوئے لالا ۔۔۔ وہ ابر جس سے رگ گل ہے مثل تار نفس!
بہشت راہ میں دیکھا تو ہو گیا بے تاب ۔۔۔ عجب مقام ہے جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا ۔۔۔ ہرات و کابل و غزنی کا سبزہ نورس!
سرشک دیدہ نادر بہ داغ لالہ فشاں!
چناں کہ آتش اوراد گر فرونہ نشاں!

معنی: لولوئے لالا: روشن اور تابدار موتی۔ ہرات، کابل، غزنی: افغانستان کے مشہور شہر۔ سبزہ نورس: لہلہاتا ہوا سبزہ۔

مسلمان سلاطین اور زندگی کے مختلف شعبوں میں تعلق رکھنے والے بعض زعماء علامہ اقبال کے پسندیدہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تذکرہ گاہے گاہے وہ مثالی کرداروں کے طور پر اپنے اشعار میں کرتے رہتے ہیں۔ نادر شاہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ زیر تشریح نظم میں انہوں نے نادر شاہ کے کردار کو ایک ایسے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جو اپنی جراءت اور حریت پسندی کے سبب ان کے نزدیک رب العزت کی بخشش و کرم کا حامل بھی بنا اور اپنی قوم کے لئے سرخروئی کا سبب بھی بنا۔ چار اشعار پر یہ مختصر مگر کئی اعتبار سے اہم نظم بڑی حد تک علامتی انداز میں تخلیق کی گئی ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ نظم "بال جبریل" کی دوسری نظموں سے قدرے مختلف ہے۔ ان اشعار میں اقبال فرماتے ہیں کہ

① خالق ایزدی کی رضا سے جس لمحے زمین پر برسنے کے لئے اپنے دامن میں موتیوں کی مانند پانی کے بے شمار قطرے لے کر روانہ ہوا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے وجود سے پھولوں میں زندگی دوڑنے لگے گی۔

② اسی پرواز کے دوران جب اس نے اپنے راستے میں بہشت کے جانفزا نظاروں کو دیکھا تو ان کو دیکھ کر اس طرح سے مضطرب ہوا کہ اس کا جی چاہا کہ اسی مقام پر برس جائے۔

③ لیکن یوں لگتا تھا کہ بہشت نے اس کی نیت کو بھانپ لیا اور یوں گویا ہوئی کہ بے شک میرے وسیع و عریض دامن کو قدرت نے انتہائی حسین و جمیل نظاروں سے بھر دیا ہے تاہم میرا مشورہ یہ ہے کہ تو آگے بڑھ اور زمین پر جا کر ہرات و کابل اور غزنی کا نظارہ بھی کر کہ نادر شاہ افغانی کے زیر اقتدار یہ علاقے مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت سبزہ زار میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے سبزہ زار تو نے پہلے کہیں اور نہ دیکھے ہوں گے۔ لہٰذا برسنا ہے تو وہاں جا کر برس!

④ کہ وہاں نادر شاہ افغانی کے جذبوں میں زندگی کی جو حرارت اور جوش موجود ہے وہ پوری افغان قوم کے دلوں میں موجزن ہو جانا چاہئے تاکہ وہ کسی مرحلے پر بھی مایوس و افسردہ نہ ہو سکے یعنی نادر شاہ کے دل میں قوم کا جو درد موجود ہے اور جس طرح وہ اس کو بیدار کرنا چاہتا ہے یہ درد افغانوں کے دلوں میں منتقل ہونا چاہئے!

خوشحال خاں کی وصیت

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں **قہستاں** کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند!

معانی: قہستان: افغانستان کے حصے کا نام۔

خوشحال خاں خٹک پشتو زبان کا مشہور حریت پسند اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کی کم و بیش ایک سو

بلند پایہ نظمیں پشتو زبان سے انگریزی میں منتقل ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ خوشحال کے دیوان کے اردو زبان میں بھی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ مغلوں کے تسلط سے افغانستان کو آزاد کرانے کا خواہاں تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں اس نے متعدد پٹھان قبیلوں کو اکٹھا کر کے مغل سلطنت سے زبردست معرکہ آرائی کی تاہم محض ایک آفریدی قبیلہ تھا جو آخر دم تک اس کے ہم رکاب رہا۔ علامہ اقبال کے نزدیک خوشحال خاں خٹک ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے آزادی کی خاطر تمام عمر مغلوں کے خلاف نبرد آزمائی میں گزار دی۔ چار اشعار پر یہ مختصر نظم خوشحال خاں کے جراءت مندانہ کردار کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

① افغان باشندوں کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کے تمام قبائل یکجا ہو جائیں تاکہ وہ مغلوں کے خلاف اپنی آزادی کے لئے معرکہ آرا ہو سکیں۔ صرف اسی طرح سے ان کا نام بلند ہو سکتا ہے اور وہ سرخرو بھی ہو سکتے ہیں۔

② خوشحال کہتے ہیں کہ میں تو ایسے جوانمردوں کا والہ و شیدہ ہوں جو ستاروں پر بھی کمند ڈالنے سے گریز نہیں کرتے۔ مراد ان جوانمردوں سے ہے جو ارضی ملکتیں تو الگ رہیں آسمان کو تسخیر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اپنی حوصلہ مندی و اولوالعزمی کے سبب مجھے بے حد عزیز ہیں۔

③ یہ وہ افغان نوجوان ہیں جو جراءت و بہادری اور پامردی میں مغلوں سے کسی طور پر بھی کمتر نہیں۔

④⑤ خوشحال کہتے ہیں کہ یہ علاقہ تو خیر تیرا اور میرے ہم وطنوں کا ہے۔ اس پر مغل فوجوں کی یلغار کیسے برداشت ہو سکتی ہے؟ مجھے تو قبر بھی ایسی پسند ہے جہاں مغل شہسواروں کے قدموں سے اڑتی ہوئی خاک بھی نہ پہنچ سکے۔

مراد یہ ہے کہ ایک حریت پسند اور جنگجو کی حیثیت میں خوشحال خاں کا سینہ مغلوں کے خلاف شدید نفرت کی آماجگاہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مغلوں نے اس کے ملک پر غاصبانہ قبضہ کر کے افغان باشندوں کی آزادی سلب کر لی ہے۔ یہی جذبہ تھا جس کے تحت وہ ساری عمر مغلوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔

تاتاری کا خواب

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن کہیں ترسا بچوں کی چشم بیباک!
ردائے دین و ملت پارہ پارہ قبائے ملک و دولت چاک در چاک!
مرا ایماں تو ہے باقی و لیکن نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک!
ہوائے تند کی موجوں میں محصور سمرقند و بخارا کی کف خاک!
بگردا گرد خود چندانکہ بینم
بلا انگشتری و من نگینم
یکایک ہل گئی خاک سمرقند اٹھا تیمور کی تربت سے اک نور!
شفق آمیز تھی اس کی سفیدی صدا آئی کہ "میں ہوں روح تیمور!

ر محصور ہیں مردان تاتار! نہیں اللہ کی تقدیر محصور!
اضا زندگی کا کیا یہی ہے کہ تورانی ہو تورانی سے مجور؟
"خودی را سوز و تا بے دیگرے دہ
جہاں را انقلابے دیگرے دہ!"

معانی: سجادہ: جائے نماز۔ عمامہ: دستار۔ ترسا بچہ: یہ لفظ عموماً شراب فروشوں کے ملازموں کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ ردا: چادر۔

یہ نظم ایک خواب اور اس خواب کے رد عمل کی مظہر ہے۔ اس خواب میں ایک تاتاری اپنے قبائل اور ملت کے انحطاط و زوال کے بارے میں اشاراتی سطح پر بعض حقیقتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس خواب کی رسائی تاتاری قبائل کے سب سے بڑے فاتح تیمور کی روح تک ہوتی ہے تو وہ تاتاری قبائل کے مابین چپقلش اور عدم اتحاد کو ان کی بنیادی خامی قرار دیتے ہوئے ان کی بقاء اور استحکام کے لئے ایک اجمالی لائحہ عمل پیش کرتی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اپنی متخیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے محض تاتاری قبائل کے مابین نفاق کو ہی ان کی کمزوری اور عدم استحکام کا سبب ہی قرار نہیں دیا بلکہ اس طرح سے پوری ملت اسلامیہ کے بارے میں بنیادی صورت حال کی نشاندہی کی ہے۔

پہلا بند

① تاتاری کے اس خواب کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ قبائل و ملت کی رہنمائی جن علماء اور صوفیا کی ذمہ داری تھی وہ خود نہ صرف اپنے منصب کو بھول بیٹھے ہیں بلکہ ان کو غلط راہ پر لگا رہے ہیں۔ جس کے سبب شدید انتشار پیدا ہو گیا ہے اور نفاق تباہی کا باعث بن گیا ہے۔ دوسری جانب ساقی گری کرنے والے خوبصورت لڑکوں کی بیباک نگاہیں ان کے دین و ایمان پر ڈاکے ڈال رہی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تاتاری اول و آخر لہو و لعب اور نفاق کے سبب تباہی و بربادی سے دوچار ہو چکے ہیں۔

② یہی وہ حالات ہیں جن کے نتیجے میں دین و ملت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ملک اور سلطنت بھی انحطاط و زوال کا شکار ہیں یعنی عدم اتحاد اور نفاق کے باعث نہ دین سلامت رہا نا ہی قوم و ملت میں اتحاد و استحکام کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔

③ ہر چند کہ ابھی لوگوں میں ایمان کی تھوڑی سی رمق باقی ہے تاہم چہار جانب فتنوں کی جو قیامت برپا ہے ان کے سبب یہ خدشہ خارج از امکان نہیں کہ یہ قیامت ایمان کو بھی بھسم کر ڈالے!

④ تاتاری قبائل آپس میں دست و گریباں ہیں۔ دشمن اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں اور وہ سمرقند و بخارا پر یلغار کے لئے صف آرائی میں مصروف ہیں۔ تاتاریوں کی غفلت کے باعث ملک و سلطنت دونوں خطرات میں گھر کر رہ گئے ہیں۔ اب بھی اگر انہیں اس حقیقت کا احساس نہ ہوا تو تباہی ان کا مقدر بن جائے گی۔

⑤ فارسی کا یہ شعر کسی نامعلوم شاعر کا ہے۔ نصیر الدین طوسی نے غالباً اسے شرح اشارات میں بعینہٖ نقل کیا ہے۔ اقبال نے خود بھی لکھا ہے کہ وہ اس شعر کے مصنف کے نام سے آگاہی نہیں رکھتے! تاہم یہ

شعر اس دور کے ترکستان کی صورت حال کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ گردوپیش جہاں تک نگاہیں جاتی ہیں کہ آفتوں اور بلاؤں نے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان آفتوں اور بلاؤں کا نشانہ میں ہوں۔ یہاں میں سے مراد ترکستان ہے۔

دوسرا بند

① تاتاری جو خواب دیکھ رہا تھا اسی کے دوران ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا کہ پورے سمرقند کی زمین لرزہ براندام ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے زبردست زلزلہ رونما ہو گیا ہے حتیٰ کہ تیمور کی قبر بھی ملنے لگی اور اس کی تربت سے روشنی کی ایک شعاع برآمد ہوئی۔ اس منظر کو دیکھنے والے حیران و پریشان رہ گئے۔

② تیمور کی قبر سے جو شعاع برآمد ہوئی ہرچند کہ اس کا رنگ کافی حد تک سفید تھا پھر بھی اس میں یوں لگتا تھا کہ شفق کی سرخی کی کسی حد تک آمیزش موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس شعاع میں سے ایک صدا برآمد ہوئی کہ میں روح تیمور ہوں!" اور تاتاری قبائل میں عدم اتحاد و نفاق کے سبب ہر لحہ پریشان اور بے چین رہتی ہوں!"

③ تاہم اس حقیقت کو جان لو کہ اگر اہل تاتار مصائب میں گھرے ہوئے ہیں اور ہر جانب سے دشمنوں نے ان پر یلغار کر رکھی ہے تو اس سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ بھی ان کے نرغے میں آ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رب ذوالجلال ہی کائنات کی ہر شے پر قادر ہے۔ وہ جس کو چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔ اس لئے تاتاری اگر اس کے احکامات کی پیروی کریں تو وہ انہیں یقیناً اپنی رحمت سے نواز دے گا۔

④ کان کھول کر سن لو کہ عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے یہ امر لازم ہے کہ قوم و ملت آپس میں مل جل کر رہے۔ ان میں نفاق نہ ہو۔ اسی صورت میں وہ ہر فتنے اور بلا کا مقابلہ کر کے سرخرو ہو سکتی ہیں۔ میں روح تیمور! ایک بار پھر تمہیں متنبہ کرتی ہوں کہ نفاق کے سبب تم خود ہی تمام مصیبتوں کے ذمہ دار ہو۔ اگر حقیقی معنوں میں مل جل کر رہو اور ان کا مقابلہ کرو تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی تمہیں زیر نہیں کر سکتی کہ یہی عمل زندہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا باعث ہوتا ہے۔

⑤ میرے عزیز ہم وطنو! میری اس آخری بات کو غور سے سنو! کہ باعزت زندگی گزارنے کے لئے اپنی خودی میں تازہ حرارت اور تب و تاب پیدا کرو۔ اسی صورت میں تم نہ صرف یہ کہ اپنے مخالفین کو زیر کر سکو گے بلکہ ساری دنیا میں انقلاب برپا کر سکو گے۔ اس کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ اپنی صفوں میں اتحاد و استحکام پیدا کرو۔ باہمی نفاق سے گریز کرو اور آخری بات یہ کہ احکام خداوندی کی ہر صورت میں پیروی کرو! کہ یہی تمہارے لئے سربلندی اور نجات کا راستہ ہے۔

حال و مقام

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج — بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ — ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور!
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

معانی : حال: لفظی معنی عام کیفیت۔ یہاں فرد کی ذہنی' روحانی اور اخلاقی کیفیت مراد ہے۔ جو کسی بھی وقت اس پر طاری ہو۔ **مقام:** لفظی معنی درجہ' مرتبہ' جگہ' سلوک کی اصطلاح۔ **بتدریج:** درجہ بدرجہ' آہستہ آہستہ۔ **چشم نگراں:** دیکھنے والی آنکھ۔ **سالک:** لفظی معنی راہ چلنے والا۔ **تفاوت:** فرق۔ **کرگس:** گدھ۔

یہ مختصر مگر انتہائی خوبصورت نظم ہرچند کہ محض چار اشعار پر مشتمل ہے لیکن علامہ اقبال نے یہاں ایک اہم نکتے کو بڑی مہارت اور حکمت کے ساتھ واضح کیا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر وہ انسان جو اس دنیا میں آتا ہے اس کی کیفیت اور مرتبہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس نکتے کو علامہ نے انتہائی حکمت اور استدلال کے ساتھ اس نظم میں واضح کیا ہے۔ حال ان کے نزدیک فرد کی ذہنی' اخلاقی اور روحانی کیفیت سے عبارت ہے جب کہ مقام کو وہ اس روحانی مرتبے سے متعلق سمجھتے ہیں۔ جس پر سالک پہنچا ہوا ہو۔ یعنی وہ محبوب حقیقی تک رسائی کے لئے مختلف مراحل سے گزر رہا ہو۔

اقبال کے کلام کے اجتماعی رویے اور اس کی کلیت تک رسائی کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کے فکری نظام کے علاوہ فنی سطح پر جس مہارت اور چابکدستی کے ساتھ تمثال نگاری کی گئی ہے اور نئی علامتیں وضع کی ہیں۔ ان کی تفہیم بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں بنیادی اور اہم بات جو پیش نظر رکھی ہو گی وہ یہ ہے کہ اقبال کی تمثال نگاری میں جو قوت کارفرما نظر آتی ہے وہ ان کا تہذیبی لاشعور ہے جو ان کی لسانی اور شعری تشکیل میں بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

① علامہ کی اس زیر تشریح نظم "حال و مقام" کے پہلے شعر میں وہ فرماتے ہیں کہ انسان اگر دل زندہ و بیدار کا مالک ہو تو قدرت بتدریج ایسی چشم بینا عطا کرتی ہے جو اسے کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہی بخشے! حقیقت شناسی کا عمل اسی نکتے سے عبارت ہے۔

② تاہم یہ امر پیش نظر رکھنا لازم ہے کہ اس کا انحصار فرد کی کیفیت اور مرتبے پر ہے۔ ان دونوں کی وضاحت سطور بالا میں کر دی گئی ہے۔ بہرحال یہاں سالک کے مقام کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر لحہ محبوب حقیقی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے لئے زمان و مکان کی کیفیت اس کے احوال و مقام کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔

③ اس امر کی ایک مثال اقبال ملا اور مجاہد کی اذان کے حوالے سے دیتے ہیں کہ زبان' الفاظ اور متن کے اعتبار سے ملا جو اذان دیتا ہے وہی اذان مجاہد بھی دیتا ہے لیکن ان میں فرق نیت اور کردار کا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ملا جو اذان دیتا ہے تو محض اس کا تعلق زبان اور حلق سے ہوتا ہے۔ روحانی سطح پر وہ اس کا اذان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا گویا اس کا عمل محض دکھاوے کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مجاہد کی اذان سے برآمد ہوتی ہے اور اس اذان میں قوت ایمان بھی کارفرما ہوتی ہے۔ حالت امن ہو یا میدان کارزار

اس کی اذان نفس مطمئنہ کی مظہر ہوتی ہے۔ یہی ملا اور مجاہد کی اذان میں فرق ہے۔

④ اسی مضمون کو اقبال یہاں بھی دہراتے ہیں لیکن اس شعر میں انہوں نے کردار بدل دیے ہیں۔ اس سے پہلے شعر میں بھی بنیادی مقصد تو اذان تھا لیکن تقابل دو کرداروں ملا اور مجاہد کے مابین رہا جب کہ زیر تشریح شعر میں فضا تو مشترک ہے لیکن جب اس میں کرگس (گدھ) اور شاہین (عقاب) محو پرواز ہوتے ہیں تو ان کا عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ان دونوں اشعار کے حوالے سے دیکھا جائے تو اقبال نے تمثالی سطح پر ملا اور کرگس، دوسری جانب مجاہد اور شاہین کے کرداروں کے حوالے سے اپنا مفہوم واضح کیا ہے۔

ابو العلا معری

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات

اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات

یہ خوان تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحب غفران و لزومات

اے مرغک بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!

معانی: **شاطر**: لفظی معنی شطرنج کا ماہر، اصطلاحاً چالاک۔ **مکافات**: بدلہ۔

اقبال نے جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے اپنے پیغام اور فکری اظہار کے لئے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے ممتاز ہیں اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ سکندر، دارا، ارسطو، سقراط، منصور، نادر شاہ، خوشحال خاں خٹک، حسینؓ، امیر المومنین حضرت علیؓ اور بے شمار کردار ایسے ملیں گے جو علامہ کے فکری اور شعری نظام میں اپنے خصوصی کردار کے سبب اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ پرندوں میں شاہین اور کرگس کا تذکرہ بھی تمثالی سطح پر اکثر و بیشتر آیا ہے۔

اس نظم کا مرکزی کردار ابو العلا معری، عربی زبان کا ممتاز شاعر تھا۔ وہ نابینا ہونے کے علاوہ بلا کے حافظے کا مالک تھے۔ معری کے شعری دیوان کے علاوہ اس کی دو تصنیفات "غفران اور لزومات" بھی انتہائی طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نظم میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ نظم کے مرکزی خیال کے مطابق ابو العلا معری چھیاسی سال تک جیا لیکن کم و بیش پینتالیس سال تک اس نے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا اور محض سبزیات پر گزر اوقات کی۔ اس مسئلے کا تذکرہ بھی ان اشعار میں آئے گا۔ تاہم اس کا نقطہ نظریہ تھا کہ کمزور اور ضعیف انسان کو ابتدائے آفرینش سے ہی جینے کا حق نہیں دیا گیا جب کہ طاقتور کو ہر اعتبار سے معزز و محترم سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس پس منظر کے حوالے سے اب نظم کی طرف آیئے!

① یہ ایک تاریخی روایت ہے کہ ابو العلا معری گوشت کھانے سے پرہیز کرتا تھا اور محض پھل اور سبزیات پر ہی گزر اوقات کرتا تھا۔

② اس کے ایک دوست نے ایک دن معری کے لئے بڑی چالاکی کے ساتھ بھنا ہوا تیتر بھیجا کہ شاید وہ

تیتر کی لذت اور خوشبو کے سبب اپنی قسم توڑ دے لیکن معری بڑا صاحب کردار اور با اصول شخص تھا۔ اس نے اس تیتر کی بجائے معمول کے مطابق سبزی پر ہی گزارا کیا۔

③ تاہم جب اسے اپنے دوست کے بھیجے ہوئے بھنے ہوئے تیتر کا علم ہا تو وہ جو ”غفران اور لزومات“ جیسی تصانیف کا تخلیق کار تھا تیتر سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا۔

④ اے ناتواں اور مسکین پرندے! ذرا یہ تو بتا کہ تو نے وہ کون سا گناہ کیا تھا جس کے سبب تجھے یہ دن دیکھنا پڑا یعنی تجھے آخر یہ کس گناہ کی سزا ملی۔

⑤ تیرے اس انجام پر بے شک مجھے بے حد افسوس ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فطرت کے اشارات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور شاہین بننے سے گریز کیا یعنی اگر تو عقاب کی سی بلند پروازی کا حوصلہ اور جراءت کا حامل ہوتا تو کس کی ہمت تھی جو تجھے اس طرح شکار کر کے دستر خوان پر لاتا۔ تیری کمزوری ہی اس عمل کا سبب بنی۔

⑥ اور میرا یہ قول بھی سن لے کہ فطرہ کا اشارہ تقدیر کے مفتی کا وہ فتویٰ ہے جو اس نے ازل سے جاری کیا ہوا ہے کہ ناتوانی اور کمزوری کا انجام موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں وہ طاقتور لوگوں کا شکار بن جاتے ہیں اور دنیا میں ہر طرح کے منصب و اعزاز سے محروم رہ کر اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال عملی طور پر خود اس نقطہ نظر کے حامی تھے جو انہوں نے ابو العلا معری کی وساطت سے ملت اسلامیہ کو پہنچایا۔

سینما

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے سینما ہے یا صنعت آذری ہے؟
وہ صنعت نہ تھی شیوہ کافری تھا یہ صنعت نہیں شیوہ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے!
وہ دنیا کی مٹی، یہ دوزخ کی مٹی وہ بت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے!

چار شعر کی اس نظم میں اقبال سینما کی شدید مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک سیدھی سادی سی نظم ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

① حضرت ابراہیمؑ کو تو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ پیغمبر بھی بنے اور خلیل اللہ کا لقب بھی پایا۔ جب کہ انؑ کے والد محترم آذر اپنے عہد کے ممتاز بت تراش تھے اور اس حیثیت سے ان کا نام آج بھی تاریخ کی زینت ہے جس طرح آذر بت تراش کر ان کی تجارت کیا کرتے تھے۔ آج کے عہد میں سینما بھی اسی نوعیت کی صنعت و تجارت ہے۔ آذر بت تراش کر روپیہ کماتے تھے۔ سینما میں فلمیں دکھا کر دولت کمائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان دونوں کے مابین کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

② بت تراشی عملاً صنعت نہیں بلکہ کافری کا ایک طریق کار تھا۔ جب کہ سینما بھی کوئی صنعت نہیں ہے بلکہ عملاً جادوگری ہے۔

③ اگر آذر کی بت تراشی کو عہد قدیم کے لوگوں کا مذہبی عقیدہ تصور کر لیا جائے کہ وہ بتوں کی پرستش

کرتے تھے تو سینما بھی اس سے کچھ کم نہیں کہ یہ دورِ حاضر کی تہذیب کی تجارت ہے۔

④ آخری بات یہ کہ بت تراشی تو دنیا کی مٹی سے عبارت تھی جب کہ سینما کی حیثیت تو دوزخ سے کم نہیں کہ وہاں بھی گمراہ لوگوں کو بھیجا جائے گا اور یہاں بھی گمراہ لوگ جاتے ہیں۔

پنجاب کے پیرزادوں سے

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں و لیکن نہیں بیدار!

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار!

عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار!

باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار!

اس نظم کے عملاً دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے چار اشعار میں اقبال حضرت شیخ مجددؒ کی قبر کی زیارت اور ان کے اوصافِ حمیدہ کا احوال بیان کرتے ہیں اور دوسرے حصے کا پہلا شعر حضرت شیخ مجدد سے خود اقبال ایک سوال کرتے ہیں۔ باقی تین اشعار اسی سوال کے جواب پر مشتمل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجاب کے پیرزادوں کی صورتِ حال کا اظہار خود شیخ مجدد نے کیا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کے ان پیرزادوں کے اسلاف ربِ العزت کے برگزیدہ بندے تھے چنانچہ ان کے معتقدین نے ان کو بڑی بڑی جاگیرداریاں نذرانے کے طور پر پیش کیں۔

ان بزرگوں کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے اپنے اسلاف کی روایت سے منہ موڑ لیا اور ان کے بزرگوں کی حاصل کردہ جاگیروں کی آمدنی نے ان پیرزادوں کو لہو و لعب اور عیاشی کا خوگر بنا دیا۔ انہی دنوں انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط جمایا تو انہوں نے مفادات کے لئے ان پیرزادوں کو استعمال کیا اور نہ صرف ان کی جاگیروں کو برقرار رکھا بلکہ بشرطِ وفاداری ان کی جاگیروں اور مناصب میں بھی اضافہ کر دیا۔ اس نظم کے آخری اشعار میں شیخ مجددؒ کی زبانی انہی پیرزادوں کو سرزنش کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

پہلا حصہ

① اقبال فرماتے ہیں کہ میں شیخ مجددؒ الف ثانی کی قبر پر زیارت کے لئے گیا وہ اس خاک تلے دفن ہیں جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ زیرِ آسماں نورانی تجلیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔

② شیخ مجددؒ کی قبر کی مٹی ایسی بلند پایہ مٹی ہے جس کے ذروں کی تابانی اور درخشانی کے روبرو ستاروں کی چمک بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ یہی وہ خاک ہے جس میں شیخ مجددؒ الف ثانی جیسا اولوالعزم بزرگ محوِ خواب

ہے۔

③ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آزادی فکر و نظر کے حوالے سے وہ ایسے کردار کے مالک تھے جنہوں نے اپنے عہد کے تمام حریت پسند انسانوں کو متاثر کیا۔ ان کا یہی کردار تھا کہ شہنشاہ جہانگیر جیسے شہنشاہ کے روبرو اپنے سر کو جھکانا گوارا نہ کیا۔

④ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر انہوں نے ملت اسلامیہ کے مفادات اور تصورات کا تحفظ کا اور اس مقصد کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کیا۔

دوسرا حصہ

① اقبال کہتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی سے میں نے دست بستہ درخواست کی کہ آپ تو راز فطرت کے امین ہیں۔ ازراہ کرم مجھے بھی فقر کی دولت عطا کر دیں۔ ہر چند میری آنکھوں میں اشیا کو ظاہری سطح پر دیکھنے کا جوہر تو موجود ہے اس کے باوجود باطن تک ان کی رسائی ممکن نہیں۔ ان کو وہ روشنی عطا ہو کہ اس ضمن میں کامیاب ہو سکیں۔

② میری اس درخواست کے جواب میں شیخ مجدد کی قبر سے آواز آئی کہ پنجاب میں فقر کا جو سلسلہ تھا وہ تو ایک عرصے سے بند ہو چکا ہے اس لئے کہ اہل حق یہاں کے لوگوں اور ان کی ولایت سے مایوس و بیزار ہو چکے ہیں۔

③ اس لئے کہ جو لوگ معرفت الٰہی کا ادراک رکھتے ہیں وہ ایسے خطہ ارض میں قیام کرنا پسند نہیں کرتے جہاں طرۂ دستار عملاً کلہ فقر کی جگہ لے لے۔ یعنی اہل فقر اپنے منصب کو بھلا کر ظاہری عزّ و جاہ کے چکر میں پڑ جائیں۔ وہ لوگ جو یہاں فقیری اور درویشی کی گدیوں کے مالک تھے۔ اب وہی دنیاوی جاہ و جلال اور امارت کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے حقیقی مسلک سے منحرف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلاف کی دولت و عزت کو دینی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی بجائے ذاتی اغراض کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اہل حق کا رشتہ برقرار نہیں رہا کرتا۔

④ عشق حقیقی کا ولولہ اور جوش تو کلۂ فقر تک محدود تھا جب تک درویشی کا سلسلہ قائم رہا اور اہل فقر اس کی عظمت و منصب کے نگہبان رہے۔ ان کے مقاصد کو گزند نہ پہنچا لیکن جب طرۂ دستار نے کلۂ فقر کی جگہ لے لی تو پھر فقر کی گنجائش کہاں رہی۔ اب تو صورت یہ ہے کہ پنجاب کے جن بزرگوں نے یہاں درویشی کی محفلیں سجائیں۔ ان کی اولاد سلسلہ فقر کو نظرانداز کر کے ذاتی منصب اور مدارج کے حصول کی خاطر حکمرانوں کی خوشامد میں مصروف ہے۔ یہ لوگ خدمت حق کی جگہ انگریز کی خدمت گزاری کو اپنا نصب العین قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگوں سے خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔

فقر

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری! اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری!
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری! اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری!
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری! میراث مسلمانی سرمایہ شبیری!

تین اشعار پر مشتمل اس انتہائی مختصر نظم میں نہ صرف یہ کہ فقر جیسے اہم مسئلے کو چھیڑا ہے بلکہ اس کا ایک تقابلی جائزہ پیش کر کے فقر کی حقیقی نوعیت سے بھی آگاہی بخشی ہے۔ اقبال کے نزدیک فقر کو ان کے عہد میں پیش کیا گیا۔ مسکینی، فقیری اور مفلسی کے حوالے سے پیش کیا گیا جب کہ اسلامی نقطہ نظر سے فقر ایک مختلف سے ہے جس کو اختیار کرنے سے کسی بھی فرد کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے!

① ایک فقر جو اقوام میں بر سر عمل ہے وہ تو ایسا فقر ہے جو شکاری میں خود شکار ہونے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس انداز کے فقر سے غالباً اقبال کی مراد رہبانیت ہے۔ اس کے بالمقابل حقیقی فقر وہ ہے جس سے دنیا کو مسخر اور زیر کرنے کے بھید انسان پر کھلتے ہیں۔

② پہلے قسم کا فقر تو قوموں کے عروج و ارتقاء کے لئے زہر قاتل ہے۔ اس کے برعکس وہ ان میں بے چارگی اور غم انگیز کیفیت جنم دیتا ہے جب کہ حقیقی فقر تو مٹی میں بھی کیمیا کی تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی توضیح یوں بھی ہو سکتی ہے۔ ایسا فقر مٹی کو سونا نہیں بناتا بلکہ اکسیر کے درجے تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ جس شے سے مس ہو جائے وہ سونے میں تبدیل ہو جائے!

③ چنانچہ یہی فقر جو حقیقی ہے نواسۂ رسولؐ مقبول حضرت امام حسینؓ کے کردار کا جزو بنا۔ اسی فقر میں سربلندی اور برتری ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امام حسینؓ کا یہ فقر ہی فی الواقع ان کا سرمایہ حیات تھا۔ یہی فقر مسلمانوں کو ورثے میں ملا ہے اور ان کے لئے موجب فخر ہے۔

خودی

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض
یہ کہتا ہے فردوسیِ دیدہ ور عجم جس کے سرمے سے روشن بصر
"زبہر درم تند و بد خو مباش
تو باید کہ باشی درم گو مباش"

معانی: روشن بصر: جس کی نظر روشن ہو۔

① خودی کا تصور اقبال کے ان بنیادی تصورات میں سے ایک ہے جن سے ان کا پورا نظام فکر عبارت ہے۔ تین اشعار کی اس نظم میں جن میں سے آخری شعر ایران کے ممتاز شاعر فردوسی کا ہے۔ علامہ نے تصور خودی کو اجاگر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت کے بدلے اپنی خودی کا سودا نہ کر! اس ضمن میں یہ حقیقت جان لے کہ چنگاری کی شعلے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ مراد یہ کہ خودی تو ایک شعلے کی مانند ہے اور دولت محض ایک چنگاری کی طرح ہے۔

② تیرے لئے لازم ہے کہ فارسی کا ممتاز دانش ور اور شاعر فردوسی جو انتہائی حقیقت شناس تھا اس کا قول پیش نظر رکھ! اہل عجم کے لئے بھی اس کی حکمت و دانش بصیرت افروز ہے۔

③ فردوسی کا قول ہے کہ مال و دولت اور روپے پیسے کے لئے آپے سے باہر ہو کر اپنی عادت میں بگاڑ پیدا نہ کر! روپیہ پیسہ نہیں ملتا تو نہ ملے تجھ کو یہ امر زیب نہیں دیتا کہ اس کے لئے اپنے جذبہ انسانیت کا خون کر دے بلکہ معاملہ کیسا بھی ہو خود کو اعتدال میں رکھنا ہی احسن فعل ہے۔

مراد یہ ہے کہ مال و دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ یہ تو آنی جانی چیز ہے۔ مال و دولت کے لئے لوگوں سے نہ الجھ! اس ضمن میں تجھ پر اعتدال کی راہ اختیار کرنا لازم ہے۔ استغنا اسی خصوصیت کا نام ہے۔

جدائی

سورج بنتا ہے تارِ زر سے دنیا کے لئے ردائے نوری!
عالم ہے خموش و مست گویا ہر شے کو نصیب ہے حضوری!
دریا، کہسار، چاند، تارے کیا جانیں فراق و ناصبوری!
شایان ہے مجھے غمِ جدائی یہ خاک ہے محرمِ جدائی!

اردو شاعری میں ہجر و وصال کا تصور ابتداء سے ہی ایک اہم اور بنیادی موضوع کی حیثیت سے کار فرما رہا ہے۔ رومانوی شاعری میں تو خیر ہجر و وصال کے موضوع کے بغیر بات آگے نہیں چلتی لیکن غیر رومانی بالخصوص سیاسی شاعری میں اس کا استعمال علامتی سطح پر قدرے نئے معانی کے ساتھ ہوا جب کہ علامہ اقبال نے تو زیر تشریح نظم میں جدائی کے استعارے کو قطعی نئی معنویت کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک پوری کائنات میں صرف انسان ہی ایسی ہستی ہے جو جدائی کی کیفیت کا ادراک رکھتا ہے کہ یہی عشق حقیقی سے بہرہ ور ہے اور عشق حقیقی میں ہی جدائی اور وصال کے اسرار سے آگاہی ہوتی ہے۔

① ہر چند کہ سورج اپنی زرتاب کرنوں سے پورے جہان کو روشنی سے معمور کرتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس عمل کو کسی مخصوص تناظر میں دیکھنے کی بجائے مقدر سمجھ لیا گیا ہے۔

② یہی صورت کائنات کی ہے جس میں موجود ہر شے اس طرحِ خاموش اور پر سکوت ہے جیسے اس کی منزل اور مقدر ہی یہی ہے۔

③ اس عالم رنگ و بو میں یہ جو دریا، پہاڑ، چاند اور ستارے موجود ہیں۔ یہ اگرچہ اپنے اپنے مقام پر مصروف عمل ہیں تاہم انہیں ہجر و فراق کی کیفیتوں کا کوئی علم نہیں۔

④ البتہ یہاں ایک انسان کا وجود ہی ہے جسے ہجر اور جدائی کے غم اور کرب سے آگاہی نصیب ہے اس لئے کہ وہی ایک ایسی ہستی ہے جو عشق حقیقی کا شعور رکھتی ہے۔ اسی لئے وہ ہجر و فراق کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ ہے۔

ان اشعار میں اقبال کا نقطہ نظریہ ہے کہ کائنات میں جو سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور دریا غرض یہاں موجود ہر شے اپنے اپنے مقام پر مصروف عمل تو ہے لیکن ان سب کو عشق حقیقی کا ادراک نہیں۔

اسی لئے وہ جدائی کے احساس سے محروم ہیں۔ محض انسان ہی ہے جو عشق حقیقی کے سبب ہجر و فراق کی کیفیت سے آگاہ ہے۔

ابلیس کی عرضداشت

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے
پرکالہ آتش ہوئی آدم کی کف خاک!
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب!
دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک!
ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک!
تجھ کو نہیں معلوم کہ حوران بہشتی
ویرانی جنت کے تصور سے ہیں غمناک؟
جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک!

مغربی دنیائے سائنس اور صنعت کاری میں جو ترقی کی ہے اقبال اسے محض ظاہری ترقی سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ ایک ایسی ترقی معکوس ہے جس نے انسان کو روحانی اقدار سے محروم کرکے رکھ دیا ہے۔ وہ اسے کار شیطانی قرار دیتے ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے شیطان کی زبانی ہی معاشرے کے اس کھوکھلے پن کا اظہار کیا ہے۔

① شیطان ملعون بڑے طنز کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں عرض کرتا ہے کہ تو نے تو انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا تھا اور اس کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں مجھے جنت سے نکال پھینکا تھا لیکن اب اس کے کرتوت دیکھ! کہ اپنی فتنہ انگیزیوں کے سبب وہ ساری دنیا کو بھسم کرنے کے درپے ہے۔

② اس کی کیفیت ہے کہ بدن تو خوب موٹا تازہ ہے جس پر بھڑکدار لباس زیب تن کرتا ہے لیکن اس کی داخلی کیفیت ہر خوبی سے محرومی کی ہے البتہ ذہنی طور پر انتہائی چالاک اور عیار ہو چکا ہے کہ ساری دنیا کو انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔

③ مشرقی تہذیب و شریعت نے شراب' جوا اور ہر نوع کی برائی و بدکاری کو حرام قرار دیا ہے۔ مغرب میں ان کو حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے اثرات مشرق پر بھی نمودار ہو رہے جس کے سبب یہاں کے لوگ بھی تمام اخلاقی اور روحانی اقدار سے محروم ہو کر لہو و لعب میں گرفتار ہیں۔

④ اے قادر مطلق! کیا تو اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ انسان کی بدکاریوں کے سبب حوران بہشت بھی اس نتیجے پر پہنچ کر مغموم و مایوس ہیں کہ ایسے بدکردار لوگوں کے لئے جنت میں کوئی گنجائش نہیں لہٰذا وہ ویرانی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

⑤ جہاں تک اس دنیا کے سیاستدانوں کا احوال ہے تو انہوں نے جمہوریت کے نام پر ہر وہ کام شروع کر دیا ہے جو بالعموم مجھ سے منسوب کیا جاتا تھا۔ وہ قدم قدم پر عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے ہر ممکن فریب کاری سے کام لے رہے ہیں۔ تو ہی بتا! کہ اب اس دنیا میں میری کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ میری جگہ تو ان لوگوں نے لے لی ہے۔

پرواز

کہا درخت نے اک روز مرغِ صحرا سے ستم پہ غمکدۂ رنگ و بو کی ہے بنیاد!
خدا مجھے بھی اگر بال و پر عطا کرتا! شگفتہ اور بھی ہوتا یہ عالمِ ایجاد!
دیا جواب اسے خوب مرغِ صحرا نے غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہے تو بیداد!
جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

معانی: **غم کدۂ رنگ و بو:** لفظی معنی رنگ و بو کا وہ مقام جو غم کا گھر ہے یعنی دنیا۔ **عالم ایجاد:** مراد دنیا۔

اس نظم میں اقبال نے دو کرداروں کے مکالمے اور ان کی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو شخص سطحی نظر کا حامل ہوتا ہے وہ عملی طور پر نہ ترقی کر سکتا ہے نا ہی زندگی میں عروج حاصل کر سکتا ہے کہ بلند پروازی کے لئے بلند حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چار اشعار کی اس مختصر نظم میں شاعرِ مشرق نے ایک درخت اور مرغِ صحرا کے مابین مکالمے کو یوں نظم کیا ہے۔

① جیسا کہ بعض مقامات پر بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے افکار و نظریات کے اظہار کے لئے کہیں کہیں انسان کی بجائے مختلف اشیاء کے حوالے سے بات کی ہے۔ یہاں بھی اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک درخت اور ایک جنگلی پرندے کے مابین ایسا مکالمہ نظم کیا ہے۔ جس کی اساس خود ان کی حکمت و دانش پر ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک روز درخت نے جنگلی پرندے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ عالم رنگ و بو جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں دیکھا جائے تو اس کی اساس ظلم و ستم پر قائم ہے۔

② ایک تیری طرح اگر میں بھی بال و پر رکھتا تو اڑ کر بلندی پر پہنچ سکتا تھا اور اس جہان کی چہل پہل اور شگفتگی میں مزید اضافہ ہو جاتا یعنی میں بھی ترقی کی منازل طے کر سکتا۔

③ درخت کی بات سن کر جنگلی پرندہ حیرت زدہ ہوئے بغیر یوں بولا! کہ مجھے اس امر پر یقیناً تعجب ہوا کہ تو انصاف اور حق رسی کو ظلم و ستم سمجھ رہا ہے مگر اس نکتے سے آگاہ نہیں!

④ یہ جان لے کہ سطحی سوچ اور نظر رکھنے والا کبھی بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ نا ہی ایسا فرد اس استحقاق کا روادار ہو سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ درخت کی نشو و نما تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی جڑیں مٹی میں پیوست ہوں۔ اگر یہ جڑیں مٹی سے باہر آ جائیں تو درخت مرجھا کر رہ جاتا ہے۔ یہی عمل اسے لذت پرواز سے محروم رکھتا ہے۔ چنانچہ اسے ظلم و ستم سے تعبیر کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ پرواز کا حق تو اسی کو ہوتا ہے جو خود کو مٹی سے آزاد کر لے۔

شیخِ مکتب سے

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دلپذیر تیرے لئے کہہ گیا ہے حکیم قاآنی

"پیش خورشید برمکش دیوار
خواہی از صحن خانہ نورانی"

معانی: قاآنی: ایران کا مشہور شاعر جسے پرانی ایرانی شاعری کا خاتم کہا جاتا ہے۔

اس مختصر نظم کی اساس فارسی کے بلند پایہ شاعر اور دانشور حکیم قاآنی کے ایک شعر پر قائم ہے۔ تین اشعار کی اس نظم میں ابتدائی دو اشعار علامہ اقبال کے ہیں۔ تیسرا اور آخری شعر قاآنی کا ہے جس کی طرف علامہ نے خود اپنے چوتھے مصرع میں اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① مدرسے کا استاد تو ایک ایسے معمار کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنے طلبا کو روحانی سطح پر تعمیر و تربیت کرتا ہے۔ اپنے علم و دانش کے ذریعے وہ طالب علموں کی ذہنی سطح بلند کرتا ہے۔

② یہی وہ نکتہ ہے جس کو حکیم قاآنی نے اپنے شعر میں بیان کر گئے ہیں کہ ہر پڑھنے والا اس سے استفادہ کر سکے۔

③ حکیم قاآنی کے بقول وہ گراں قدر نکتہ یہ ہے کہ اگر تو اپنے گھر کا صحن روشن رکھنے کا خواہشمند ہے تو ایسی دیوار کی تعمیر سے گریز کرو۔ جو سورج کی روشنی کے مابین حائل ہو! یعنی کہ ایسی تعمیر و تربیت ہی افادیت کی حامل ہوتی ہے جو فطرت اور صورت حال سے مطابقت رکھے!

شاہیں

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ!
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ!
نہ باد بہاری نہ گلچیں نہ بلبل نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ!
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری جوانمرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ!
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ!
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

معانی: خاکدان: لفظی معنی مٹی کا گھر' مراد دنیا۔ راہبانہ: درویشوں جیسی۔ خیابانی: باغوں میں رہنے والا۔ ضربت: چوٹ' وار۔ حمام: وہ پرندہ جس کے گلے میں طوق ہو' مثلاً قمری فاختہ یا طوق والا کبوتر۔

علامہ اقبال کے پورے فکری نظام اور اس کے تحت ہونے والی اردو فارسی شاعری میں شاہین ایک بنیادی اور مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ شاہین پرندوں کی دنیا کا بقول اقبال درویش ہے۔ یعنی وہ صفات جو ایک مرد درویش میں ہونی چاہئیں۔ اسی طرح کی صفات پرندوں میں شاہین کی ہیں۔ زیر تشریح اشعار میں شاہین خود اپنی جملہ صفات کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ:

① میں نے اس دنیا سے رشتہ توڑ دیا ہے جہاں رزق کو آب و دانہ کا نام دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ میں زمین پر بکھرے ہوئے دانے دنکے پر گزارہ نہیں کرتا بلکہ اپنا رزق فضاؤں میں تلاش کرتا ہوں۔

② ابتدائے آفرینش سے میری فطرت میں فقر و درویشی کی صفات ودیعت کر دی گئی ہیں۔ اسی لئے تو صحراؤں کی خلوت میرا پسندیدہ مقام ہے۔

③ اس لئے کہ صحرا میں نہ بہار کا موسم ہوتا ہے' پھول بھی نہیں ہوتے تو ان کو توڑنے والا کہاں سے آئے گا۔ نہ یہاں بلبل ہوتی ہے اور نا ہی یہاں عشق و محبت کے نغموں سے پیدا ہونے والی بیماری کا ہی کوئی وجود ہوتا ہے۔ یہی فضا مجھے راس آتی ہے۔

④ باغوں کی فضاؤں میں بسنے والے نرم و نازک لوگوں کا وجود مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا اس لئے کہ ان مردانہ صفات کی بجائے معشوقوں کے سے انداز ہوتے ہیں۔ جب کہ میری فطرت تو جراءت و مردانگی سے عبارت ہے۔

⑤ یوں بھی صحرا میں بسر کرنے والے جوانمردوں کا وار زیادہ بھرپور قوی اور کاری ہوتا ہے کہ صحرا کی ہوائیں اسے زیادہ تقویت بخشتی ہیں۔

⑥ یہ بات غور سے سن لو کہ میں فاختہ اور کبوتر جیسے مسکین پرندوں کے گوشت کا بھوکا نہیں ہوں اس لئے کہ میں تو درویشوں اور زاہدوں کی سی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

⑦ البتہ میرا ان پرندوں پر جھپٹنا پھر پلٹنا اور پلٹنے کے بعد پھر سے جھپٹنا محض ان کے شکار کی خاطر نہیں ہوتا بلکہ یہ تو اپنے لہو کو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے کہ جسم میں لہو گرم نہ ہو اور اس روانی معطل ہو جائے تو ہر جاندار ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

⑧ یہ بھی جان لو کو یہ جو مشرق و مغرب کی فضا ہے۔ اس میں تو صرف چکور جیسے کمزور اور ناتواں پرندے بسر اوقات کرتے ہیں جب کہ میں تو نیلگوں آسمانوں کی ان فضاؤں میں محوِ پرواز رہتا ہوں جہاں عزم و ہمت اور حوصلہ درکار ہوتے ہیں۔ کم ہمتی اور بزدلی مجھ ایسے جواں مرد کا شیوہ نہیں!

⑨ میری یہی صفات ہیں جن کی بنا پر مجھے پرندوں کی دنیا کا درویش کہا جاتا ہے چنانچہ درویش کی مانند میں بھی کسی ایک مقام پر اپنا آشیانہ نہیں بناتا۔ میری دنیا تو لامحدود ہے۔

باغی مرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!

شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!

نذرانہ نہیں! سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن!

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

معانی: خرقہ سالوس: مکر و فریب کا لباس۔ زاغ: کوا۔

ان اشعار میں اقبال ان نام نہاد' دنیادار اور بد اعمال پیروں کے خلاف ان کے ایک ایسے باغی مرید کے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جو ان پیروں کی کرتوتوں سے آگاہ ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ

محض کسی ایک مخصوص پیر کا نہیں بلکہ اب تو کم و بیش تمام پیر اپنے حقیقی کردار کو بھلا کر لہو و لعب اور عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ماضی میں یہ لوگ اپنے سادہ دل مریدوں کی ارادت سے جائز و ناجائز مفاد حاصل کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اب مرید بھی باشعور اور بیدار ہو گئے ہیں۔ رد عمل کے طور پر ان میں جو اپنے پیروں کے خلاف بغاوت کا عنصر عود کر آیا ہے۔ ان اشعار میں ان کی سوچ اور باغیانہ رد عمل کا اظہار ہے۔

① چنانچہ باغی مرید کہتا ہے کہ ہم جو شب و روز محنت کر کے ان نام نہاد پیروں پر اپنی کمائی نچھاور کر دیتے ہیں ان کے گھروں میں تو روشنی کے لئے ایک مٹی کا دیا بھی موجود نہیں ہے جب کہ پیروں کے محلات برقی قمقموں سے جگمگا رہے ہیں۔

② ہم سادہ لوح مرید خواہ شہری باشندے ہوں یا دیہات کے رہنے والے! عملی سطح پر ہمارا چالاکی اور عیاری سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا جب کہ ہم لوگ ان پیروں کی اس طرح سے پرستش کرتے ہیں جس طرح کہ یہ لوگ "کعبے کے برہمن" ہوں اور ہم ان کی اسی طرح پوجا کرنے پر مجبور ہیں جیسے کہ برہمن بتوں کی کرتے ہیں۔ علامہ نے یہاں "کعبے کے برہمن" کا استعارہ پیر کے لئے طنزاً باندھا ہے کہ یہ حضرات بھی بتوں کی مانند اپنی پرستش کے خواہاں ہیں۔

③ یہ پیر ہم سے جو خراج وصول کرتے ہیں یہ نذرانہ نہیں بلکہ سود کے مانند ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان مکر و فریب کے پتلوں کے اندر کوئی مہاجن چھپا بیٹھا ہے۔

④ افسوسناک امر یہ ہے کہ وعظ و نصیحت کی مسندیں ان ناعاقبت لوگوں کو ورثے میں ملی ہوئی ہیں۔ یہاں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ عقابوں کے گھونسلے کووں کی کمین گاہ بنے ہوئے ہیں۔

آزادیِ افکار

جو دونیِ فطرت سے نہیں لائقِ پرواز — اس مرغکِ بیچارہ کا انجام ہے افتاد!
ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا — ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیاد!
اس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک — جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد!
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ — آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد!

یہ نہیں کہ علامہ اقبال آزادیِ افکار کے پرزور حامی نہیں تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسی آزادی کو ناپسند کرتے تھے جو تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے تجاوز کرتی نظر آتی ہو۔ بلندیِ افکار تو ہر شخص کے لئے قابلِ فخریات ہوتی ہے۔ لیکن جو افکار عملاً مادر پدر آزادی سے عبارت ہوں وہ کسی بھی معاشرے اور اس کے افراد بالخصوص نوجوان نسل کے لئے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بے شک قومی اور عالمی سطح پر ہر عہد بالخصوص موجودہ دور میں آزادیِ اظہار کو انسان کے بنیادی حقوق سے وابستہ سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے افکار جو عملاً آزادی کے حقیقی مفہوم سے متصادم ہوں ان کو کسی طور بھی مثبت انداز سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

زیرِ تشریح مختصر نظم میں اقبال عملاً افکار کی آزادی کے مخالف نہیں البتہ وہ ہر نوع کی مادر پدر

زادی کی چاہت نہیں کرتے۔ وہ ایسی آزادی کے حامی ہیں جو معاشرے کی تعمیر و ارتقاء میں مددگار ثابت سکے۔ بصورت دیگر آزادی کا منفی رویہ کسی بڑے فتنے سے کم نہیں! ملاحظہ ہو!

① جو پست فطرت پرندہ فضاء میں بلندی پر اڑنے کی صلاحیت سے محروم ہو اس صورت میں اگر وہ نے کی جسارت کرے گا تو اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ مراد یہ ہ افکار کی بلندی اور آزادی ہر فرد کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتی۔

② ہر فرد کا سینہ جبریلؑ امیں کے پیغامات کا متحمل نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح جیسے کہ فکر اقبال کے ول ہشت کی معنویت کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی۔ مراد یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ کو تو محض اس امر کا ہ دار قرار دیا گیا تھا کہ وہ حق تعالیٰ کے پیغامات اور احکامات دنیا میں اس کے پیغمبروں تک پہنچا دیں کہ ہر ص کو ان پیغامات کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

③ یہ شعر بھی اپنے مطالب کے لحاظ سے پہلے دو اشعار کے تسلسل میں ہے۔ یہاں اقبال واضح طور پر پنے اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہیں کہ جو قوم اور معاشرہ خود کو ہر نوع کی اخلاقی و تہذیبی اور دوسری سانی اقدار کو مسترد کر کے خود کو مادر پدر آزاد قسم کی قوم اور معاشرہ تصور کر لے اس کے لئے آزادی ظہار و افکار ہمیشہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ یعنی آزادی اظہار و افکار کے لئے بھی بعض عاشرتی اور اخلاقی اقدار کی پابندی ناگزیر ہے۔

④ اس شعر میں اقبال مذکورہ پس منظر کے حوالے سے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس کا اعلان کرتے ہوئے رماتے ہیں کہ اس میں بے شک کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ رب ذوالجلال نے انسان کو غور و فکر اور اپنے طہ نظر کے اظہار کے لئے جو صلاحیت عطا کی ہے وہ معاشرے کے لئے روشن ہدایات کا کام دیتی ہے۔ اور اہنمائی کا سبب بنتی ہے۔ لیکن جہاں تک "مادر پدر آزادی" کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں شاید یہ کہنا ط نہ ہو کہ یہ تو شیطان کی ان ایجادات اور لعنتوں میں سے ایک ہے جو اس نے دنیا میں وارد ہو کر انسان و گمراہی اور قعرِ ذلت سے ہم کنار کرنے کے لئے وضع کی ہیں اور جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور چھ نہیں!

چنانچہ ایک بار پھر اس نقطہ کا اعادہ غیر ضروری نہیں ہو گا کہ اقبال آزادی افکار و اظہار کے قطعی طور مخالف نہیں ہیں تاہم اس کے لئے وہ کچھ حدود کا تعین ضروری سمجھتے ہیں جن کے بغیر یہ آزادی کار بلیس کے سوا اور کچھ نہیں رہتی۔

شیر اور خچر

شیر

ساکنانِ دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ
کون ہیں تیرے اب وجد؟ کس قبیلے سے ہے تو؟

خچر

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار! شاہی اصطبل کی آبرو!
(ماخوذاز جرمن)

اقبال نے دو اشعار پر مشتمل اس نظم میں شیر اور خچر کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا ہے جس کا مرکزی خیال بقول ان کے جرمن ادب سے ماخوذ ہے۔ مکالمہ کچھ یوں ہے۔

شیر

① اس شعر میں خچر سے مخاطب ہو کر شیر یوں گویا ہوتا ہے کہ اس جنگل میں جو جانور رہائش پذیر ہیں ان میں تیری وضع قطع یقیناً سب سے نرالی ہے۔ اتنا تو بتا دے کہ تیرا کس قبیلے سے تعلق ہے اور تیرے باپ دادا کون تھے؟ حقیقتاً یہاں شیر ایک طرح سے خچر کے دوغلے پن پر طنز کرتا نظر آتا ہے۔

خچر

② لیکن خچر بھی بڑا ہوشیار اور کائیاں ثابت ہوتا ہے وہ اپنے باپ کا ذکر کرنے کی بجائے جواباً یوں گویا ہوتا ہے کہ حضرت آپ یقیناً گھوڑے کو تو یوں پہچانتے ہوں گے جس کی چال ہوا کے مانند ہے اور جس کے دم سے شاہی اصطبل کا وقار قائم ہے سو میرا ماموں وہی تو ہے۔

چیونٹی اور عقاب

چیونٹی

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

عقاب

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں!
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

ان دو اشعار میں بھی چیونٹی اور عقاب کے مابین ایک سبق آموز مکالمہ ہے جس کا ایک کردار کمزور

اور پست ہے۔ جب کہ دوسرا کردار باہمت' حوصلہ مند اور بلند پرواز ہے۔ یہ مکالمہ اس منطق نتیجے کی نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ باوقار اور سربلند ہوتے ہیں جو اعلیٰ آدرش کے مالک ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو!

چیونٹی

① اس شعر میں چیونٹی' عقاب سے یوں مکالمہ کرتی ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ انتہائی خوار و خستہ اور حقیر شے ہوں جسے راہگیر اپنے پیروں تلے روند ڈالتے ہیں جب کہ تیرا مرتبہ تو مجھے ستاروں سے بھی اونچا لگتا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

عقاب

② اس شعر میں چیونٹی کے استفسار کے جواب میں عقاب یوں گویا ہوتا ہے کہ تیری ذلت و خواری کا سبب یہ ہے کہ تو نے پستی پر ہی قناعت کر لی ہے۔ اس سے بڑی کم ہمتی اور کیا ہو گی کہ تو زندہ رہنے کے لئے رزق کی تلاش میں بھی خاک راہ تک محدود رہتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ راہگیر تجھے روند ڈالتے ہیں جب کہ میں تو آسمانوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور ان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ میں باوقار ہوں اور تو ذلیل و خوار!

فہرست

تعلیم و تربیت

عورت

ادبیات فنون لطیفہ

سیاسیات مشرق و مغرب

محراب گل افغان کے افکار

اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں

معانی : اعلیٰ حضرت : بہت ہی معزز اور محترم شخصیت۔ یہ لقب عام طور پر راجوں، نوابوں اور بادشاہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ **سر:** اردو میں اس کے معنی ہیں جناب۔ یہ لفظ خطاب کے طور پر انگریزوں کی طرف سے کسی خدمت کے صلے میں دیا جاتا تھا۔ **بھوپال:** متحدہ ہندوستان کی ایک مسلمان ریاست کا نام ہے۔

یہ اشعار علامہ اقبالؒ نے نواب بھوپال کے لیے انتساب کے طور پر لکھے ہیں نہ کہ ان کے قصیدے یا تعریف کے لیے۔ علامہ نے اپنی عمر کا آخری کچھ حصہ (جب وہ گلے کے مرض میں مبتلا تھے) نواب صاحب کے پاس گذارا ہے۔

اشعار

زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و کند — کسے نہ بود کہ ایں داستاں فروخواند
تو صاحبِ نظری آنچہ در ضمیرِ من است — دلِ تو بیند و اندیشۂ تو مے داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من! — کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

① **معانی:** **با:** ساتھ۔ **امم ایشیا:** ایشیائی قومیں۔ **چہ:** کیا۔ **کرد:** کیا۔ **کند:** کرتا ہے۔ **کسے:** کوئی شخص۔ **نہ بود:** نہ تھا۔ **ایں:** یہ۔ **فرد خواند:** بیان کرتا۔

مطلب: زمانے نے ایشیائی اقوام کے ساتھ کیا کیا۔ کوئی نہ تھا جو اس داستان کو بیان کرتا۔

② **معانی:** **تو صاحب نظری:** تو اہل نظر ہے۔ **آنچہ:** جو کچھ۔ **در:** میں۔ **ضمیر من:** میرا ضمیر۔ **است:** ہے۔ **دل تو:** تیرا دل۔ **بیند:** دیکھتا ہے۔ **اندیشہ تو:** تیرا فکر۔ **مے داند:** جانتا ہے۔

مطلب: تو اہل نظر ہے جو کچھ میرے ضمیر میں ہے تیرا دل دیکھتا ہے اور تیرا فکر اسے جانتا ہے۔

③ **معانی:** **بگیر:** لے لے۔ **ایں:** یہ۔ **ہمہ:** سارا۔ **سرمایہ بہار:** بہار کا سرمایہ۔ **از من:** مجھ سے۔ **گل:** گلاب کا پھول۔ **بدست تو:** تیرے ہاتھ میں۔ **از شاخ:** شاخ سے۔ **تازہ تر:** زیادہ تازہ۔ **ماند:** رہتا ہے۔

مطلب: (اے حمید اللہ خاں) تو مجھ سے بہار کا یہ سارا سرمایہ (ضرب کلیم اور اس کے مضامین) لے لے کیونکہ گلاب کا پھول تیرے ہاتھ میں شاخ سے بھی زیادہ تر و تازہ رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تو نہ صرف خود اس سرمائے کو بہتر طور پر سمجھے گا بلکہ مسلمان قوم تک بھی پہنچائے گا۔ (اس شعر کا دوسرا مصرع مشہور فارسی شاعر طالب آملی کا ہے)۔

ناظرین سے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ!

یہ اشعار علامہ نے عموماً ایشیائی اقوام اور خصوصاً مسلمان قوم کے لیے لکھے ہیں اور ان میں ضرب کلیم کا مقصد اور نصب العین بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

① **معانی:** **زجاج:** آبگینہ' شیشہ۔ **حریف:** مدمقابل یا برابر۔

مطلب: جب تک تجھے زندگی کے حقائق (حقیقتوں) سے آگاہی حاصل نہ ہو گی تیرا شیشہ (آبگینہ) پتھر کے مدمقابل آنے کی صلاحیت یا اس سے ٹکرانے کی طاقت پیدا نہیں کر سکتا۔ مراد یہ ہے کہ اے ایشیائی اقوام تمہیں مغرب کے مدمقابل آنے کے لیے اپنے اندر صلاحیتیں پیدا کرنی ہوں گی۔

② **معانی:** **زورِ دست:** بازوؤں کی قوت۔ **ضربتِ کاری:** سخت ضرب یا وار۔ **نوائے چنگ:** ساز کی آواز۔

مطلب: زندگی آسان نہیں ہے۔ اس میں کامیاب ہونے کے لیے قوت بازو اور اپنی راہ کی رکاوٹوں پر سخت ضرب کاری لگانی پڑتی ہے۔ زندگی خصوصاً ایشیائی اقوام کی مغربی اقوام کے مقابلے میں زندگی میدان جنگ میں اتر کر کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس لیے تم ساز کے طلب گار نہ بنو۔ جنگ کے لیے جس قوت اور جن آلات کی ضرورت ہوتی ہے اس کے طالب بنو۔

③ **معانی:** **خونِ دل و جگر:** خلوص' محنت اور مشقت' عشق۔ **سرمایۂ حیات:** زندگی کا سرمایہ۔ **لہو ترنگ:** لہو کے ساز کا نغمہ۔ **جل ترنگ:** پانی بھرے پیالوں پر ضرب لگا کر نغمے پیدا کرنا۔

مطلب: اے ناظر! زندگی کا سرمایہ اپنے دل اور اپنے جگر کو خون کرنے سے پیدا ہوتا ہے یعنی خلوص اور محنت و مشقت سے ہاتھ آتا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ فطرت لہو کے ساز کا نغمہ مانگتی ہے نہ کہ پانی کے ساز کا نغمہ۔ مراد یہ کہ جو شخص اور جو قوم اپنا خون دینا جانتی ہو گی وہی کامیاب ہو گی اور جو محفل میں ساز کی آواز پر کان دھرے بیٹھی رہے گی وہ ناکام رہے گی۔

تمہید

①

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری! کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روح تریاکی!
اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی!
تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی
زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا! ترا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی!

عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھ کو کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بیباکی

①**معانی:** دیر: مندر۔ حرم: کعبہ۔ خاوراں: مشرق کی سرزمین۔ تریاکی: افیونی۔

مطلب: اس شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ میں نے سرزمین مشرق ساری دیکھی ہے اور مشرقی اقوام کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ یہاں نہ مندر میں' نہ کعبے میں کہیں بھی افراد و اقوام کی خودی بیدار نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ صرف مسلمانوں میں ہی نہیں غیر مسلموں میں بھی خودی کی بیداری مفقود ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کہ مشرق کی ان قوموں نے افیون گھول کر پی لی ہو یعنی ان میں آگے بڑھنے کی آرزو ختم ہو چکی ہے۔

②**معانی:** سہل: آسان۔ اندیشہ ہائے افلاکی: آسمانوں پر پرواز کی فکر کرنا۔

مطلب: یہاں علامہ نے پتے کی بات یہ کی ہے کہ دنیا ہنگاموں کا گھر ہے۔ جب تک آدمی دنیا کے ان ہنگاموں کو آسان نہ بنا لے' مراد ہے دنیا میں ترقی یافتہ نہ ہو جائے اس کے لیے آسمانوں پر اڑنے کی فکر کی مستی کرنا بری چیز ہے۔ مراد یہ ہے کہ اپنے ادب و شعر اور اپنے فنون لطیفہ میں اور اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں میں خیالی اڑان میں مست رہنا اور دنیا کے ہنگاموں پر قابو پانے کے عمل سے بیگانہ رہنا کسی قوم کے لیے بھی مفید نہیں ہے۔

③**معانی:** خودی: یہ کلام اقبال کا بنیادی فلسفہ ہے۔ دو لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آدمی کی اپنی معرفت کا نام ہے۔ اپنے نفس کی پہچان کرنا اس کا اصل مقصد ہے۔ پیکر خاکی: مٹی کا جسم۔

مطلب: عام طور پر غلام قومیں موت کے غم میں مبتلا رہتی ہیں اور زندگی کو قربان کر کے آزادی حاصل کرنے کی قوت سے محروم ہوتی ہیں۔ یہاں اقبال خبردار کرتے ہیں کہ اے غلام اقوام کے لوگو! یہ موت کا غم تمہیں غلامی سے اور مصائب زندگی سے نجات نہیں دلا سکتا کیونکہ خودی کوئی جسمانی پیکر کا نام نہیں۔ یہ تو ایک اندرونی اور باطنی اور روحانی کیفیت کا نام ہے جو موت کے ساتھ بھی نہیں مرتی۔ تیرا مرض یہی ہے کہ تو خودی کو خاکی پیکر (مٹی کا بدن) سمجھتا ہے۔

④**معانی:** حوادث: حادثہ کی جمع۔ حجاب: پردہ۔

مطلب: زمانے میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ جتنے حادثات پیش آ رہے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ تجھ سے محض اس لیے چھپے ہوئے ہیں کہ تیرا دل اور تیری نظر ناپاک ہے یعنی ان میں حادثات زمانہ کو دیکھنے' پرکھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اے مخاطب پہلے اپنے دل کو اپنی نظر کو صاف اور پاک بنا پھر جا کر تجھے زمانہ کے سارے حادثات کی اور ان پر قابو حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

⑤**معانی:** خس و خاشاک: گھاس پھوس۔ سرکشی و بے باکی: قابو میں نہ آنے والی اور نڈر۔

مطلب: خالق کائنات نے مجھے بے خوف اور بے باک شعلے (مراد اپنی شاعری سے ہے) عطا کر کے مجھ پر یہ ذمہ داری ڈال دی ہے کہ میں اقوام ایشیا کو جو اس وقت گھاس پھوس کی مانند ہیں' ان شعلوں سے جلا کر ان میں حرارت پیدا کر دوں اور ان کی مردہ رگوں میں جان ڈال دوں۔

غزل ②

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی — اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند!
جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو — تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لیے — وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند
تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی — مقامِ شوق و سرور و نظر سے محرومی

① **معانی**: کم پیوند: لوگوں سے کم ملنے والا۔ **مجلس آرائی**: محفل آراستہ کرنا۔

مطلب: اے اقبال اگرچہ تو لوگوں سے کم میل جول رکھتا ہے لیکن یہ جو تو اپنے ہاں مجلس آراستہ کرتا ہے اور دوسروں تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے یہ تیرا گناہ کیا کم ہے۔

② **معانی**: کوکنار: پوست۔ نوا: آواز' شاعری۔ ذوقِ جذبہ ہائے بلند: اعلیٰ جذبوں کی لذت۔

مطلب: جو لوگ پوست پی کر اونگھتے رہتے تھے' اے اقبال تیری نوا (شاعری کی آواز) نے ان بے چاروں میں بلند جذبوں کا ذوق پیدا کر دیا۔ مراد یہ ہے کہ تیری شاعری سے سوئے ہوئے لوگ بیدار ہو گئے۔

③ **معانی**: فضا ہائے نیلگوں: نیلی فضائیں یعنی نیلا آسمان۔ **صحن سرا**: گھر کا صحن۔ **پر شکستہ**: جن کے پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ **خورسند**: خوش۔

مطلب: وہ پرندے جو گھروں کے صحنوں میں خوش تھے' ٹوٹے ہوئے پروں کے باوجود اب وہ آسمان کی نیلی فضاؤں میں اڑنے کے لیے بے تاب ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اے اقبال تیری شاعری نے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے والوں میں اور غلامی پر قناعت کرنے والوں میں غلامی کی زنجیریں توڑ کر ترقی کی منازل طے کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

④ **معانی**: نوائے سحر: صبح کی آواز۔ محرومی: ناکامی مایوسی' کسی شے کا نہ ہونا۔

مطلب: اے اقبال تیرے اس گناہ کی سزا (جو تو اپنی نوا سے مردہ قوموں کو زندہ کر رہا ہے) تیرے بدخواہ یہ دینا چاہتے ہیں کہ تجھے نوائے سحر (صبح کی عاشقانہ نوا) تیرے ذوق و شوق اور تیری اس نظر سے محروم کر دیا جائے جو تو نے پسی ہوئی قوموں کو اٹھانے اور بیدار کرنے کے لیے ان پر رکھی ہوئی ہے۔

اسلام اور مسلمان

صبح

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز — نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پید
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پید

① **معانی:** سحر: صبح۔ **فردا:** آنے والی کل۔ **امروز:** آج۔

مطلب: یہ صبح جو ہر روز سورج کے طلوع ہونے سے پیدا ہوتی ہے' اور جس سے آج کی صبح آنے والے کل کی صبح بن جاتی ہے' معلوم نہیں کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ مراد ہے مجھے اس کی جغرافیائی قسم کی تفتیش کی ضرورت نہیں۔

② **معانی:** شبستان وجود: انسانی جسم کا یا کائنات کا سیاہ خانہ۔

مطلب: لیکن وہ صبح جو انسانی جسم کے سیاہ خانے کے اندر لرزہ پیدا کر دیتی ہے اور پوری کائنات کو بیدار کر دیتی ہے وہ صبح بندہ مومن کی اذاں سے پیدا ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب صبح کا موذن اذان دیتا ہے اور **الصلوۃ خیر من النوم** (نیند سے نماز بہتر ہے) کی صدا لگاتا ہے تو مسلمانوں کے جسم میں اللہ کے خوف سے لرزہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عبادت خداوندی کے لیے بیدار ہو جاتے ہیں۔ یہ صبح اصل صبح ہے۔ سورج سے طلوع ہونے والی صبح اس کے بغیر بے کار ہے۔

لا الٰہ الا اللہ

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغ' فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا — فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند — بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری! — نہ ہے زماں' نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں' لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں! — مجھے ہے حکمِ اذاں' لا الٰہ الا اللہ

① **معانی:** خودی: لفظی معنی غرور لیکن اقبال کی شاعری میں یہ لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد اپنی ذات یا اپنے نفس کی معرفت ہے۔ **سر نہاں:** چھپا ہوا بھید۔ **لا الٰہ الا اللہ:** کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا پہلا جز جس سے مراد ہے کوئی الٰہ (معبود/رب) نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ یہ توحید کی بنیاد ہے اسی لیے اس کو کلمہ توحید بھی کہتے ہیں۔ **تیغ:** تلوار۔ **فساں:** تلوار کی دھار تیز کرنے کا آلہ۔

مطلب: خودی (اپنی ذات کی معرفت) کا بھید کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ توحید کے بغیر نہ اس کی سمجھ آ سکتی ہے اور نہ یہ حاصل ہو سکتی ہے۔ خودی کو اگر آپ تلوار (تیغ) سمجھیں گے تو لا الٰہ الا اللہ (توحید) اس تلوار کو تیز کرنے والی سان ہے۔ اس سان کے بغیر یہ تلوار کند رہتی ہے۔

② **معانی:** دور: زمانہ۔ براہیم: مراد حضرت ابراہیم (پیغمبر) علیہ السلام سے ہے جنہوں نے اپنے وقت کے بادشاہ اور خود کو خدا کہلوانے والے نمرود کے طلسم کو توڑ دیا تھا اور اس کی بت پرستی کے سارے نظام کو پاش پاش کر دیا تھا۔ صنم کدہ: بت خانہ۔

مطلب: عہد حاضر نمرود کے زمانے کی طرح توحید کو چھوڑ کر بت پرستی کی طرف مائل ہو چکا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ بت پتھر کے ہوں بلکہ انسان نے غیر خدا کے بت اپنے دل میں تراش کر رکھے ہوئے ہیں۔ کفر، شرک، مادہ پرستی، خدا گریزی اور اس دور کی بے شمار برائیاں بت ہی تو ہیں۔ علامہ کہتے ہیں جس طرح نمرود کے زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے بت پرستی کے سارے تصورات ختم کر دیئے تھے اسی طرح آج بھی ضرورت ہے کہ اس جہان کو جو بت کدہ بن چکا ہے کوئی ابراہیم کی طرح کا شخص آئے اور آ کر توڑے۔ اور توحید قائم کرے۔

③ **معانی:** متاع غرور: غرور کی دولت مراد ہے دنیا کی دولت، مادی دولت۔ سود: نفع۔ زیاں: نقصان۔

مطلب: علامہ یہاں مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے تو توحید کا علم بردار ہونا چاہیے تھا۔ اور دنیا کی متاع کو اس کے آگے ہیچ سمجھنا چاہیے تھا۔ لیکن معاملہ اس سے الٹ ہے۔ تو نے اے مسلمان دارالآخرت کا خیال چھوڑ کر دارالدنیا کو اپنا لیا ہے۔ یہ توحید کے منافی ہے۔ توحید تو یہ ہے کہ خدا اور خدا طلبی کے مقابلے میں ہر چیز کو چھوڑ دیا جائے لیکن تو نے دنیا کے نفع اور نقصان کو پیش نظر رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا فریب ہے جس کو لا الٰہ الا اللہ (توحید) کی ضرب سے توڑا جا سکتا ہے۔

④ **معانی:** رشتہ و پیوند: عزیز داریاں، تعلقات کے رشتے۔

مطلب: اے مسلمان دنیا کا مال و دولت اور دنیا کے جملہ رشتے چاہے وہ عزیز داری کے ہوں یا تعلقات کے، وہم و گمان کے بتوں کی طرح ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ یقین کی دولت اور یقین کے رشتوں کا تعلق توحید سے ہے۔ توحید ہے تو یہ سب رشتے بھی ہیں ورنہ یہ توحید کے راستے کے بت ہیں۔ اگر دنیا کی دولت اور دنیا کے رشتوں کے لیے زندگی گزاری جائے اور آخرت کو بھلا دیا جائے تو یہ توحید کے منافی ہے۔

⑤ **معانی:** خرد: عقل۔ زمان و مکاں: کائنات، دنیا، جو زمان و مکان میں محدود ہے۔ زناری: برہمنوں کا وہ دھاگہ پہننا جس کو جنیو کہتے ہیں مراد ہے کافر ہو جانا۔

مطلب: عقل انسانی تو زمان و مکاں (دنیا اور اس کے لوازمات)) کی پجاری ہے اور اس کا جنیو (ہندووانہ دھاگہ) پہن کر غیر اسلامی اقدامات کر رہی ہے۔ حالانکہ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ زمان اور مکان عارضی ہیں۔ فنا ہو جانے والے ہیں۔ اصل حیات اور اصل حاصل کرنے والی دولت عاقبت اور آخرت کی ہے۔ دنیا کو حاصل کرنا اور آخرت کو بھول جانا اے مسلمان یہ دانش مندی نہیں۔ ایمان تو یہ ہے کہ دنیا کو آخرت کے تابع کر کے بسر کیا جائے۔ یہی توحید کا سبق ہے۔ ایسی صورت میں دنیا بھی دین بن جاتی ہے۔

⑥ **مطلب:** توحید محدود نہیں۔ یہ نہیں کہ خوش حالی ہو تو، توحید اور بدحالی تو شرک اختیار کر لیا

بستہ۔ کوئی فصل (موسم) ہو یہ نغمہ (توحید) ہر دو صورتوں میں قیام رہنا چاہیے۔ چاہے گلاب کے اور لالہ کے پھولوں کا موسم ہو یعنی بہار ہو اور چاہے خزاں کا موسم۔ توحید ہر حالت میں قائم رہنی چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ اے مسلمان چاہے دنیاوی طور پر تیرا عروج ہو چاہے زوال ہو لا الٰہ الا اللہ کی روح سے اپنے جسم کو خالی نہیں کرنا چاہیے۔ خوش حالی اور بد حالی دونوں صورتوں میں یہی تیرا علاج ہے۔

معانی: بُت: مٹی پتھر کے بنائے خدا، **جماعت:** مسلمان قوم، **آستین:** کرتے کے بازو کا وہ حصہ جو ہاتھ کے قریب ہوتا ہے، **اذاں:** نماز (مسلمانوں کی پنجگانہ عبادت) کیلئے پکار۔

⑦ **مطلب:** جماعت سے مراد یہاں مسلمان قوم ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ اگرچہ فی زمانہ مسلمان قوم نے اپنی آستینوں میں بت چھپا رکھے ہیں یعنی مسلمان توحید کو چھوڑ کر غیر خدا کی طرف مائل ہو چکے ہیں اور دنیاوی نفع و نقصان کو آخرت کے نفع و نقصان پر ترجیح دے رہے ہیں لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے یا مجھ میں اللہ نے یہ استعداد پیدا کی ہے کہ میں اس حالت میں بھی قوم کے سامنے اللہ اکبر کی آواز لگاؤں اور بتاؤں کہ اللہ اکبر ہے باقی جو کچھ تم اپنائے ہوئے ہو یا اپنانا چاہتے ہو سب کچھ اصغر ہے۔ توحید کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ یہی تمہاری فلاح دارین کا راستہ ہے۔

تن بہ تقدیر

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز!
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی، خوب ہوا،
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

معانی: تن بہ تقدیر: تقدیر کے غلط مفہوم پر یقین کر کے کچھ نہ کرنا اور ہاتھ پاؤں توڑ کر اس انتظار میں بیٹھے رہنا کہ جو کچھ ہونا ہو گا ہو جائے گا۔

① **معانی: ترکِ جہاں:** دنیا چھوڑ دینا۔ **مہ و پرویں:** چاند اور ثریا یا تارے۔

مطلب: علامہ جب یہ کہتے ہیں کہ اسی قرآن میں اب ترکِ جہاں کی تعلیم ہے تو اس سے یہ مراد نہ لیں کہ واقعی قرآن بدل گیا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان نے اپنی غلط تاویلوں سے قرآن سے ایسے معانی اخذ کرنے شروع کر دیئے ہیں جن سے مراد دنیا کا ترک کرنا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ قرآن تو مسلمان کو چاند اور ستاروں کی تسخیر کی تعلیم دیتا ہے لیکن آج کا مسلمان ہے کہ وہ رہبانیت اور ترک دنیا کو پسند کیے ہوئے ہے۔ یہ سب کچھ تقدیر کا غلط مفہوم پیدا کرنے اور سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

② **مطلب:** کبھی یہ بات تھی کہ مسلمان جس چیز کا ارادہ کرتا تھا اس کو حاصل کر لیتا تھا وہ اپنی تقدیر آپ بناتا تھا۔ وہ جو ارادہ کرتا تھا خدا اس کو پورا کر دیتا تھا لیکن آج وہی مسلمان تقدیر پر شاکر بے عمل بیٹھا ہے۔ اس کے ہر عمل میں مایوسی اور بے یقینی نظر آ رہی ہے۔

③ **معانی: بتدریج:** آہستہ۔ **ضمیر:** دل، فطرت، سرشت۔

مطلب: علامہ نے یہاں ایک اصول بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ جو قوم غلام ہو جاتی ہے وہ اپنے مالک کے منشاء کے تابع ہوتی ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک اس کے مالک کی پسند اور ناپسند کے پیش نظر اچھی چیز

آہستہ آہستہ بری اور بری چیز اچھی ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ بھی وہ کہتے ہیں یہی کچھ ہوا کہ
لام بن کر مسلمان قوم تقدیر پر شاکر ہو گئی ہے اور اسے صفت اور اچھائی سمجھنے لگی ہے حالانکہ آزادی
یں اس کے بالکل الٹ بات تھی۔ مسلمان اپنی تقدیر آپ بناتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ غلامی کی
ندگی میں خوب (اچھائی) ناخوب (برائی) بن گئی ہے اور ناخوب شے **خوب** کی صورت میں ڈھل گئی
ہے۔

معراج

ے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز! کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج!
شکل نہیں یارانِ چمن! معرکۂ باز پر سوز اگر ہو نفسِ سینۂ دراج!
وک ہے مسلماں! ہدف اس کا ہے ثریا ہے سرِّ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج
معنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا! ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

معانی: معراج: وہ واقعہ جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو شب معراج میں پیش آیا اور آپ ﷺ اپنے
ھر سے آسمان اور عرش اور نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کر کے مختصر سے وقفے میں واپس بھی آ گئے تھے۔ تفصیل
یرت کی کتابوں میں دیکھیے۔

① **مطلب:** یہاں علامہ معراج کے واقعہ کی تفصیل میں نہیں گئے بلکہ بے یقینوں کو یقین کی دولت
سے مالامال کرنے کے لیے کچھ گر بیان کر رہے ہیں جن سے نتیجہ نکلتا ہے کہ واقعہ معراج واقعی پیش آیا
ھا۔ پہلے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک ذرہ بھی ارادہ کر لے کہ وہ پرواز کرے گا اور اس کے پیچھے اس کا
وق اور ولولہ بھی کارفرما ہو تو وہ ذرہ چاند اور سورج کو مسخر کر سکتا ہے۔

② **معانی:** معرکہ: جنگ، مقابلہ۔ نفس: سانس۔ دراج: تیتر۔

مطلب: پہلے شعر میں جو کچھ علامہ نے کہا ہے اس کو مزید تقویت بخشنے کے لیے مثال دیتے ہوئے کہتے
یں کہ اگر تیتر کا سینہ اپنے اندر پرسوز حرارت بھرا سانس رکھتا ہو تو اس کے لیے باز سے مقابلہ کرنا یا اس
سے جنگ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ مراد یہ ہے کہ عشق معمولی طاقت والی شے کو بھی طاقت ور بنا دیتا ہے اور
علیٰ مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔

③ **معانی:** ناوک: تیر۔ ہدف: نشانہ۔ ثریا: ستاروں کا جھرمٹ جو کافی بلندی پر ہے۔ سر: بھید۔ سرا پردہ:
گھر، خلوت خانہ۔ نکتہ: باریک بات۔

مطلب: مسلمان کو اگر تیر سمجھو تو نشانہ اس کا آسمان کی بلندی پر ثریا (ستاروں کا ایک جھرمٹ) ہے۔
معراج کے واقعہ کے اندر جو باریک بات یا جو رمز چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ معراج بندہ مومن کی جان
کے خلوت خانے کا بھید ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ شب معراج (بشر ہوتے ہوئے،
اللہ کے بندے ہوتے ہوئے) سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے کی سیر کر آئے اسی طرح مسلمان بھی اگر خدا کا
صحیح بندہ بن جائے تو وہ بھی آسمانوں کی تسخیر کر سکتا ہے۔ واقعہ معراج ہمیں یہ بھید بتا رہا ہے اور ہم پر یہ

بات آشکارا کر رہا ہے کہ جو مسلمان بھی اللہ کا بندہ بن کر اپنے اندر ولولہ شوق پیدا کرے گا وہ تسخیر کائنات کا موجب بن جائے گا۔

④ **معانی**: والنجم: قسم ہے ستارے کی۔ یہ قرآن کی اس سورۃ کا نام بھی ہے اور آغاز بھی ہے جس میں شب معراج کے واقعات کے اجمالی اشارے موجود ہیں۔ مدو جزر: کہتے ہیں کہ جب چاند عروج پر ہوتا ہے تو اس کی کشش سے سمندروں میں جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے۔

مطلب: علامہ نے یہاں مسلمان کو اس کی اس غلطی کا احساس دلایا ہے کہ تو نے سورۃ والنجم کی آیات کی حقیقتوں کو سمجھا ہی نہیں۔ جس طرح سمندر میں جوار بھاٹے کا پیدا ہونا چاند کی عروجی کیفیت کا محتاج ہوتا ہے اس طرح تیرا سورۃ والنجم کی حقیقت کو پانا تیرے ولولہ' شوق اور تیرے عشق کا محتاج ہے۔ جس سے تو آج محروم ہو چکا ہے۔ سورۃ والنجم کو اگر ایمان کی آنکھ سے پڑھا جائے اور عشق کی حقیقت سے سمجھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک بشر (نبی ﷺ جو ظاہری اعتبار سے عالم بشریت سے تعلق رکھتے تھے) کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اے مسلمان تو بھی اگر اپنے اندر ایمان اور عشق کی صحیح کیفیت پیدا کرے تو ماہ و مہر اور انجم و سپہر کو تو بھی تسخیر کر سکتا ہے۔

ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زناریِ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی؟ کس طرح خودی ہو لازمانی؟
آدم کو ثبات کی طلب ہے دستورِ حیات کی طلب ہے
دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق مومن کی اذاں ندائے آفاق
میں اصل کا خاص سومناتی آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم! دیں سرِّ محمدؐ و براہیمؑ!
"دل در سخنِ محمدیؐ بند اے پورِ علیؑ ز بو علی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری قائد قرشی بہ از بخاری"

معانی: فلسفہ زدہ: فلسفہ کا مارا ہوا' فلسفہ کا اثر لیے ہوئے۔ سید زادہ: سید کا بیٹا' علامہ سے ایک سید زادے نے فلسفیانہ گفتگو کے دوران یورپ کے بعض فلاسفہ کے افکار پر پسندیدہ باتیں کی تھیں۔ اقبال نے اس گفتگو

کے اثر کے تحت اس کے لیے خصوصاً اور دوسرے فرنگی فلسفیوں کے اثرات قبول کرنے والوں کے لیے عموماً یہ نظم لکھی ہے۔

① **معانی: زناری:** وہ دھاگہ جو ہندو پجاری یا برہمن بت کی پوجا کے لیے اپنے کندھے کے گرد ڈالتے ہیں۔ اس دھاگے کو جنیو کہتے ہیں۔ **برگساں:** انیسویں صدی عیسوی کا ایک فرانسیسی فلسفی جو اگرچہ عقل کے مقابلے میں وجدان کا قائل تھا لیکن خدا اور رسول ﷺ کا قائل نہ تھا۔

مطلب: اے سید زادے تو جو برگساں کے افکار کا قائل ہے اس کا سبب صرف اور صرف یہ ہے کہ تو خودی (خود معرفتی) سے بیگانہ ہے۔

② **معانی: ہیگل:** اٹھارویں/انیسویں صدی کا ایک جرمن فلسفی جو افلاطون کی طرح کی دنیا گریزی کی باتیں کرتا ہے۔ **صدف:** سیپ۔ **گہر:** موتی۔ **طلسم:** جادو۔

مطلب: تو ہیگل سے بھی متاثر ہے۔ وہ تو افلاطونی باتیں زیادہ کرتا ہے۔ اور شیروں کو گوسفندی (بھیڑ بننا) سکھاتا ہے۔ اس کا سیپ بھی موتی سے خالی ہے۔ اس کا تجھ پر یونہی جادو چل چکا ہے۔ تجھ پر اس کے خیالی جادو کا اثر ہو گیا ہے۔ اس سے نکل آ۔

③ **معانی: محکم:** مضبوط۔ **خودی:** اپنے نفس کی یا اپنی پہچان۔ معرفت ذات، معرفت نفس۔ **لازمانی:** زمانہ سے ماورا، حدود زمانہ کی قید سے باہر۔

مطلب: اصل بات یہ سمجھنے کی ہے کہ آدمی کی زندگی مضبوط کیسے بنے اور اس کی خودی زمانے کی حدود و قیود سے آزاد کیسے ہو۔ ان باتوں کا جواب نہ برگساں کے پاس ہے اور نہ ہیگل کے پاس۔ تو کیوں ان کے جادو میں اسیر ہے؟ ان کے اثرات زائل کر کے خود کو پہچان۔

④ **معانی: ثبات:** استحکام، پائیداری۔ **دستورِ حیات:** زندگی گزارنے کا طریقہ یا آئین۔

مطلب: آدمی تو چاہتا ہے کہ اسے استحکام (پائیداری) نصیب ہو۔ اسے زندگی کا ایک ایسا طریقہ یا دستور العمل ہاتھ آئے جس سے اس کی زندگی صحیح طور پر بسر ہو۔ تیری اس طلب کو یہ فلسفی پورا نہیں کر سکتے۔ (اسے اسلام اور قرآن پورا کر سکتا ہے۔)

⑤ **معانی: عشا:** رات کی نماز/ تاریکی۔ **اشراق:** صبح طلوع ہونے کی نماز/ مراد روشنی۔ **ندائے آفاق:** دنیا میں پھیلنے والی آواز۔

مطلب: جس عمل سے دنیا کی تاریکی چھٹ کر روشنی پیدا ہو سکتی ہے وہ ان فلسفیوں کے افکار میں نہیں بلکہ مومن کی ہمہ گیر اور عالمگیر اذان کی آواز میں ہے جس میں اللہ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا ذکر ہے۔

⑥ **معانی: سومناتی:** سومنات ہندوؤں کا بت، سومنات سے تعلق۔ **لاتی و مناتی:** لات و منات عربوں کے بت۔ **آبا:** باپ دادا۔ **اصل کا:** پیدائشی طور پر۔

مطلب: اقبال کے باپ دادا چونکہ کشمیری برہمن (پنڈت/ہندو) تھے اس شعر میں علامہ نے فرمایا ہے کہ میں اصل کا (پیدائش کے اعتبار سے) برہمنوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے باپ دادا کا سومنات

کے ہبل و لات اور منات جیسے بت پوجنے والوں سے واسطہ رہا ہے۔ اس کے باوجود میں مسلمانی طور طریقے، اسلام کے دستور اور نبی ﷺ کے افکار کو بلند کرتا ہوں۔ لیکن تو مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر غیر مسلموں کے خیالات رکھتا ہے۔

⑦ **معانی:** **سید ہاشمی:** نبی کریم ﷺ کی اولاد میں سے۔ **کفِ خاک:** مٹی کی مٹھی، جسم۔ **برہمن زاد:** برہمنوں کے گھر پیدا ہونے والی۔

مطلب: اے سید زادے تو تو نبی کریم ﷺ کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور میرا بدن برہمنوں کے گھر پیدا ہوا ہے۔ میں تو اس برگساں اور ہیگل سے متاثر نہیں لیکن تو ہاشمی ہوتے ہوئے ان سے متاثر ہے۔ فلسفہ سے میں بھی واقف ہوں لیکن مجھے فلسفہ کی حقیقت کا اور اس کی اچھائی برائی کا پتہ ہے۔ برہمن زادہ ہو کر میں تو یہ سب کچھ جانتا ہوں لیکن ہاشم زادہ ہو کر حیرت ہے تو اس سے ناواقف ہے۔

⑧ **معانی:** **آب و گل میں:** پانی اور مٹی میں، جسم میں، خلقت میں۔ **ریشہ ہائے دل:** دل کی رگوں میں۔

مطلب: میں فلسفہ سے ناواقف نہیں ہوں۔ یہ میرے جسم میں سمایا ہوا ہے۔ میرے دل کی رگوں میں بسا ہوا ہے لیکن میں تو اس کی اچھائی اور برائی سے واقف ہوں لیکن تو واقف نہیں ہے۔ افسوس ہے تجھ پر جو فلسفہ کی برائی کو اپنائے ہوئے ہے۔

معانی: **اقبال:** علامہ محمد اقبال مصنف کتاب، **بے ہنر**، **رگ رگ:** باخبر، معلومات رکھنے والا۔

⑨ **مطلب:** اقبال یہاں کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اگرچہ کوئی ہنر نہیں جانتا لیکن فلسفہ کی رگ رگ سے ضرور واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آدمی کو اصلیت اور حقائق سے دور لے جاتا ہے۔ اور اس کی خودی کی نفی کر دیتا ہے۔

⑩ **معانی:** **جنوں:** عشق انتہائی حد تک۔ **بے سوز:** بے تپش۔ **نکتہ دل افروز:** دل کو روشن کرنے والا نکتہ۔ **نکتہ:** باریک بات۔

مطلب: اے فلسفہ زدہ! تیرے جنون عشق کا شعلہ تپش نہیں رکھتا کیونکہ تیرا جنوں، عشق پر نہیں عقل پر اعتماد کیے ہوئے ہے۔ آ میں تجھے دل کو (عشق) سے روشن کرنے والی باریک بات بتاؤں۔

(11) **معانی:** **خرد:** عقل، فلسفیانہ عقل۔

مطلب: عقل اور فلسفہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ تجھ کو زندگی کی حقیقتوں سے دور کر دیتا ہے۔ اس کا انجام حضوری یعنی انجام تک رسائی نہیں بلکہ اس سے دوری ہے۔

(12) **معانی:** **افکار:** فکر کی جمع، عقل کی باتیں، فلسفہ کی باتیں۔ **نغمہ ہائے بے صوت:** بے آواز نغمے۔

مطلب: فلسفہ کے افکار کو یوں سمجھیں جیسے کہ وہ ایسے نغمے ہوں جن میں کوئی آواز نہیں۔ یہ زندگی کو عمل نہیں بے عملی سکھاتے ہیں۔ انسان میں جو عمل (کچھ کرنے کا اور حقیقت تک پہنچنے کا) ذوق ہوتا ہے اس کو یہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔

(13) **معانی:** **مسلکِ زندگی:** زندگی کا راستہ، طریقہ۔ **تقویم:** جنتری، دستور العمل۔ **سر:** بھید۔ **دین:** اسلام

مطلب: اے فلسفہ زدہ سید زندگی کی جنتری زندگی گزارنے کا نظام الاوقات فلسفہ نہیں ہے۔ دینِ اسلام ہے۔ یہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھید ہے۔ فلسفہ کو چھوڑ اور اس بھید کو سمجھ تاکہ زندگی کی حقیقت ہاتھ آئے۔

(14) معانی: در: میں۔ سخنِ محمدیؐ: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بات۔ بند: وابستہ کرنا۔ در سخنِ محمدی بند: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی باتوں میں دل لگا۔ پورِ علیؓ: حضرت علیؓ کی اولاد۔ بو علی: بو علی سینا جو ایک مسلمان فلسفی گزرے ہیں۔ چند: کب تک۔

یہ شعر مشہور فارسی شاعر خاقانی کا ہے۔

مطلب: اے سید فلسفہ زدہ تو تو حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہے۔ تو حضرت علیؓ کا پیروکار بن بو علی جیسے فلسفی کے پیچھے کیوں چلتا ہے۔ کب تک تو اس عمل کو اپنائے رکھے گا اپنا دل اسلام کے پیغمبر، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی باتوں میں لگا۔ جو کچھ انہوں نے حدیث میں کہا ہے یا جو کچھ ان پر نازل شدہ آسمانی کتاب قرآن میں آیا ہے اس پر عمل کر۔

(15) معانی: چوں: جب۔ دیدہ راہ میں: راہ دیکھنے والی آنکھ۔ نہ داری: تو نہیں رکھتا۔ قائد قرشی: قریش کے خاندان کا راہبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔ بہ از: بہتر ہے۔ بخاری: بخاری سے / بو علی سینا ہے جن کا تعلق شہر بخارا سے تھا۔

یہ شعر بھی خاقانی کا ہی ہے۔ اور تحفۃ العراقین مصنفہ خاقانی سے ہی لیا گیا ہے۔

مطلب: اے شخص جب تو راستہ دیکھنے والی آنکھ نہیں رکھتا تو تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تو قرشی کو (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کو اپنا قائد بنا لے اور بخاری (بو علی فلسفی) کو چھوڑ دے۔ ہاں اگر تجھے میری طرح زندگی کے راستے کا پوری طرح علم ہو جائے اور فلسفہ کی اونچ نیچ کا پتہ چل جائے تو پھر بو علی سینا کو پڑھنا نقصان دہ نہ ہوگا کیونکہ تجھے علم ہو جائے گا کہ عقل نے کہاں ڈنڈی ماری ہے۔

زمین و آسمان

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں — اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا
ہے سلسلہ احوال کا ہر لحظہ دگرگوں — اے سالکِ رہ فکر نہ کر سود و زیاں کا
شاید کہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی — تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

معانی: بہار: موسمِ گل، خزاں: پت جھڑ کا موسم، نگاہ: نظر

(1) مطلب: اے شخص جس کو تو موسم بہار سمجھتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے کے لیے خزاں کا موسم ہو۔ کیونکہ غم و خوشی، پستی و بلندی اور بہار و خزاں کا تعلق آدمی کی اندرونی کیفیات پر مبنی ہے۔ ایک غم زدہ شخص کو موسم بہار بھی خزاں لگے گا اور ایک خوشیوں سے بھرپور شخص کا موسم خزاں بھی بہار کی مانند گزرے گا۔

(2) معانی: سود و زیاں: نفع اور نقصان۔ سالک: راہ چلنے والا۔ دگرگوں: بدلا ہوا۔

مطلب: اے زندگی کی راہ پر چلنے والے مسافر چونکہ ہر شخص کو اپنے حالات اور کیفیات کے بدلنے پر دنیا کے حالات بھی بدلے ہوئے نظر آتے ہیں اس لیے تو نفع اور نقصان کی فکر کیے بغیر اور صرف

اپنے نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہ اور اس بات کو پیش نظر رکھ کہ احوال ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تیری ایک لمحہ کی مشکل دوسرے لمحہ میں آسان ہو جائے۔

معانی: جہاں: عالم، دُنیا، فلک: آسمان۔

③ **مطلب:** حالات کی دگرگونی (ادل بدل) کی صورت میں یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ جس آسمان کو تو اپنی زمین کا آسمان سمجھتا ہے وہ کسی اور جہان کی زمین ہو اور اس کا آسمان کوئی اور ہو کیونکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں اس لیے اے مسافر تو چلتا رہ۔ ہمت نہ ہار۔ احوال کے ادل بدل کی فکر نہ کر صرف چلتا رہ۔ اس طرح تو ایسی منزلیں طے کرلے گا جو تیرے ذہن و فکر میں بھی نہیں ہوں گی۔ مسلمان کو درس عمل دینے کا اقبال نے یہ نہایت ہی انوکھا اور سچا طریقہ اپنایا ہے۔

مسلمان کا زوال

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

① **معانی:** زر: سونا، دولت۔ **قاضی الحاجات:** حاجتیں یا ضرورتیں پوری کرنے والا۔ **فقر:** دولت کا نہ ہونا، درویشی کا ہونا۔ **سکندری:** سکندر یونانی بادشاہ کی دولت اور اقتدار۔

مطلب: اگرچہ ہر قسم کی ضرورتیں اور احتیاجیں پوری کرنے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود جو چیز فقیری (درویشی) میں میسر ہے سکندری (امیری) میں میسر نہیں۔ درویشی سکندر جیسے بادشاہ کی دولت اور اقتدار کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ فقر سے یہاں مراد غریبی نہیں بلکہ وہ درویشی ہے کہ جس میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہوتا ہے۔

② **معانی:** جسور: ہمت والے، دلیر۔ **غیور:** غیرت والے۔ **قلندری:** قلندر وہ درویش یا فقیر جو اپنی ذات، اپنے حالات اور اپنی دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف ذات باری تعالیٰ سے متعلق ہو چکا ہوتا ہے اور اس میں یہ صفت بھی ہوتی ہے کہ وہ جب کچھ کرنے پر آجائے تو جو چاہے وہ کر گزرے اور وہ ہو بھی جائے وہ مصلحت بین نہیں ہوتا۔ **سکندری:** بادشاہی، امیری۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ اگر میری قوم کے جوان کم ہمتی کی بجائے ہمت والے ہوں۔ ہر قدم دلیری اور جسارت سے اٹھا سکتے ہوں اور وہ غیرت مند بھی ہوں تو پھر میری قلندری (فقیری کی بے نیازانہ طرز) سکندری (شاہ سکندر کی عظمت اور جاہ و مرتبہ) سے کم نہیں ہے کیونکہ عظمت انسان کی اصل چیز غیرت ہے خودداری ہے۔ دولت نہیں۔

③ **معانی:** بے زری: دولت کا نہ ہونا۔

مطلب: اے مسلمان تو خود اس بات کو سمجھتا ہے کہ تیرا زوال دولت کے نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تو خدا مست فقیری کو چھوڑ گیا ہے اور شکم پرستی کے چکر میں پھنس گیا ہے۔

④ **معانی:** جوہر: صلاحیت۔ آشکار: ظاہر۔

مطلب: اے مسلمان اگر جہان میں میری صلاحیتیں ظاہر ہوئی ہیں تو وہ قلندری اور خدا مستی فقیری سے ہوئی ہیں۔ سکندرانہ شان اور جاہ و جلال سے نہیں ہوئیں۔ علامہ نے بات تو یہاں اپنی کی ہے لیکن اس مثال سے وہ مسلمان کو بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ایمان پختہ ہو اور فقر کی دولت موجود ہو تو پھر کام بنتا ہے۔ بے ایمان اور بے فقر شخص کے پاس کتنی دولت اور کتنا جاہ و جلال کیوں نہ ہو وہ اس کا زوال ہے کمال نہیں۔ کمال تو صرف اس مرتبہ اور امیری میں ہے جس میں فقر کی دولت اور خدا مستی کی حالت موجود ہو۔

علم و عشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

*

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

*

عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دیں عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتحِ باب

*

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام شورشِ طوفاں حلال، لذّتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

① **معانی:** تخمین و ظن: تخمین کے معنی اندازہ، قیاس اور گمان کے ہیں اور ظن کے معنی یقین اور شک کی درمیانی حالت کے ہیں۔ کرمِ کتابی: کتاب کا کیڑا، صرف کتابیں پڑھتے رہنا۔ سراپا حضور: کلیتاً حاضری۔ سراپا حجاب: کلیتاً پردہ۔

مطلب: علامہ شاعرانہ انداز میں کہتے ہیں کہ مجھ سے علم نے کہا کہ عشق اختیار نہ کرنا یہ تو سراسر دیوانگی ہے۔ عشق نے یہ بات سن کر مجھ سے کہا کہ علم اختیار نہ کرنا کیونکہ یہ سراسر وہم و گمان ہے۔ علم بے شک ضروری ہے لیکن حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ بے کار ہے۔ اے اقبال تو کتاب کا کیڑا بن کر نہ رہ جانا یعنی صرف علم پڑھنے ہی میں ساری زندگی نہ گزار دینا بلکہ علم کی تکمیل کے بعد عشق کے راستہ پر بھی آنا کیونکہ وہم و گمان کی راہ پر چلنا جو علم کی راہ ہے، دانش مندی نہیں ہے۔ علم کلیتاً حجاب ہے۔ حقیقت علم پر نہیں کھلتی۔ اس کے برعکس عشق اختیاری تجھے حضور ذات تک پہنچا دے گی۔ تمام پردے اٹھ جائیں گے اور حقیقت عیاں ہو جائے گی۔

② **معانی:** معرکہ کائنات: دنیا کی تگ و دو۔ مقامِ صفات: اللہ تعالیٰ کی صفات کا مقام۔ تماشائے

ذات: اللہ تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ یا دیدار۔ **حیات و ممات**: زندگی اور موت۔ **پیدا**: ظاہر۔ پنہاں ہوچھپا ہوا۔

مطلب: عشق مزید کہتا ہے کہ کائنات کا ہنگامہ' کائنات کی گرمی' کائنات میں تگ ودو اور کائنات میں عمل و سعی صرف عشق کی وجہ سے ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کی صفات کو تو پہنچان سکتا ہے لیکن اس کی ذات کا تماشا نہیں کر سکتا یہ صرف عشق کا کام ہے۔ زندگی اور کائنات میں سکون اور ثبات عشق کی ہی بدولت ہے اور جینے اور مرنے کے انداز صحیح کو صرف عشق ہی بتاتا ہے۔ موت وحیات کے راز کو علم نہیں عشق کھولتا ہے۔ علم تو ایک ظاہری سوال کی صورت ہے جس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اس ظاہری سوال کا اگر پوشیدہ جواب کسی کے پاس موجود ہے تو وہ صرف عشق ہے۔ جس بات کو اور جس حقیقت کو علم نہیں سمجھتا علم نہیں پاتا عشق اس کو سمجھ بھی لیتا ہے اور پا بھی لیتا ہے۔ اس لیے علم پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ رہو عشق اختیار کرو۔

③ **معانی**: **معجزات**: معجزہ کی جمع' کسی نبی سے ایسی بات کا ظہور ہونا جو انسانی عقل و فکر سے بعید اور ماورا ہو' علامہ نے یہاں عشق کی محیر العقول باتوں کو بھی معجزہ کہا ہے۔ **فقر**: لفظی معنی غریبی' محتاجی لیکن اصطلاحاً اس سے مراد مقام درویشی جہاں ... ظاہر ہوتا ہے۔ **صاحب تاج و نگیں**: تاج اور انگوٹھی کے جوہر یا مہر کا مالک یعنی بادشاہ۔ **زمان**: زمانہ' **باب**: دروازہ' کامیابی کا طلسم۔

مطلب: عشق کے اصل رخ اور اس کے مقام و اہمیت کا اندازہ کرنا ہو تو دین' فقیری اور سلطنت کے ان صحیح رخوں کو دیکھیں جو کسی مرد عشق کی بنا پر سامنے آتے ہیں۔ یہ سب عشق ہی کے حیران کن اور بعید از عقل رخ ہیں جو عام سلطنت' دین اور فقر سے الگ ہیں۔ جو تاج و تخت اور مہر شاہی کے مالک ہیں یعنی بادشاہ تو عشق کے حقیر غلام ہیں۔ اصل شہنشاہ تو عشق ہے۔ عشق سب کچھ ہے۔ ساری کائنات پر عشق کی حکمرانی ہے۔ زمین ہو کہ زمانہ ہو مکان ہو کہ اس کا مکین ہو جس کو بھی صحیح رخ پر دیکھو گے عشق ہی کی بدولت دیکھو گے۔ علم کی طرح عشق وہم و گمان میں مبتلا نہیں ہے بلکہ عشق سراسر یقین کا حامل ہے اور کسی بھی مشکل کی کنجی یا کسی بھی مہم کے سر کرنے کا دروازہ ہے۔

④ **معانی**: **حاصل**: کسی کھیت سے جو پیداوار حاصل ہو۔ کسی کوشش کا نتیجہ' خرمن' اناج کا ڈھیر۔ **عشرت منزل**: منزل پر ٹھہرنے کا آرام' سفر کی بجائے کہیں قیام کرنے کا عیش۔ **شورش طوفاں**: دریا یا سمندر میں طوفان کی ہلچل اور اس کے تھپیڑے' مراد کوشش پیہم' سخت حالات کے باوجود کشمکش جاری رکھنا۔ **لذت ساحل**: ساحل پر ٹھہرنے یا سیر کرنے کی لذت' مراد ہے آرام طلبی۔ **ابن الکتاب**: کتاب کا بیٹا' ہر وقت کتابیں پڑھنے والا' کتاب کا کیڑا بنے رہنا جس سے کوئی نتیجہ خیز چیز حاصل نہ ہو۔ **ام الکتاب**: کتاب کی ماں' لوح محفوظ' امام مبین' وہ جگہ یا شے جو ہر علم الٰہی کا منبع ہے قرآن۔

مطلب: جس طرح دین اسلام کی شرع میں کچھ چیزیں حلال اور کچھ حرام قرار دی گئی ہیں اسی طرح شاعر کے نزدیک عشق کی بھی ایک اپنی شرع ہے۔ اس شرع کے مطابق طوفانوں سے کھیلنا' اور کشمکش زندگی میں لگے رہنا تو حلال ہے لیکن ساحل پر بیٹھ کر سیر و تفریح کے مزے لینا یعنی کشمکش زندگی اور خطرات حیات سے مقابلہ نہ کرنا یہ شرع محبت (عشق) میں حرام ہے۔ کھیت سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کو

سنبھال اور بچا کر رکھنا یعنی کشمکش زندگی سے جو کچھ حاصل ہو اس پر تسلی کر کے بیٹھ رہنا اور مزید تگ و دو نہ کرنا یہ شرع محبت میں حرام ہے۔ شرع محبت میں تو یہ آیا ہے کہ اس خرمن کو جو اکٹھا کیا ہے بجلی گرا کر جلا دو تا کہ اور خرمن جمع کرنے کا خیال آئے اور تگ و دو زندگی کی ختم نہ ہو۔ اس شرع میں حاصل (خرمن / نتیجہ) کی حفاظت حرام ہے اور اس کو بجلی گرا کر جلا دینا حلال ہے کیونکہ حاصل کو بچانا مزید تگ و دو سے بچنے کی دلیل ہے اور عشق کو یہ ترک کشمکش پسند نہیں۔ ہاں علم کو پسند ہو تو الگ بات ہے۔ علم کشمکش سے گھبراتا ہے۔ علم کو شاعر نے ابن الکتاب (کتاب کا بیٹا) کہا ہے۔ جو پڑھتا تو سب کچھ ہے اور کرتا کچھ نہیں۔ عشق کو اس کے برعکس شاعر نے ام الکتاب (کتاب کی ماں) کہا ہے۔ جملہ علوم اور ہر قسم کی کشمکش حیات کے سورج کی کرنیں یہاں سے پھوٹتی ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جو جملہ علوم الٰہی کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے ابن الکتاب نہ بنو۔ ام الکتاب بنو۔

اجتہاد

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے ۔۔۔ نہ کہیں لذّتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں ۔۔۔ آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں ۔۔۔ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب ۔۔۔ کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

معانی: **اجتہاد:** جو باتیں آدمی کو پہلے سے معلوم ہوں ان کو دماغ میں دوبارہ ترتیب دے کر خاص نتیجہ اخذ کرنا۔ اصطلاحاً" شرع دین محمدی ﷺ میں حالات کے تقاضوں کے تحت نئی بات کا اخذ کرنا۔

① **معانی:** **ہند:** برصغیر، ہندوستان۔ **عمیق:** گہرے۔ **کردار:** عمل۔ **حکمت:** فکر، تدبر، دانائی، فلسفہ، سوچ۔

مطلب: دین اسلام میں کیا دانائی، کیا تدبیر اور کیا فکر ہے۔ یہ بات کوئی کہاں سے اور کس سے پوچھے؟ کیونکہ (متحدہ ہندوستان) برصغیر کے جو دینی حلقہ کے لوگ ہیں ان میں نہ تو عمل کی چاشنی ہے اور نہ ان میں کردار کی گہرائی ہے ان کا دین کے متعلق علم بھی سطحی ہے اور ان کا عمل بھی پختہ نہیں ہے۔

② **معانی:** **شوق:** آرزو، چاہت، عشق۔ **محکومی:** غلامی۔ **اندیشہ:** فکر۔ **تقلید:** پیروی۔ **زوال تحقیق:** تحقیق کا زوال، تحقیق کا نہ ہونا۔

مطلب: اہل علم کے حلقہ سے اگر اہل شوق (عشق، تصوف، فقر) کے حلقہ میں آئیں تو یہاں بھی وہی حالت ہے۔ ان میں بھی فکر انگیزی کی جرأت نہیں۔ دونوں حلقے (جلوت اور خلوت کے) دور غلامی کی وجہ سے اندھی پیروی میں لگے ہوئے ہیں اور تحقیق تو اس قدر رو بہ زوال ہے گویا نام کو بھی نہیں ہے۔

③ **معانی:** **فقیہان حرم:** حرم کے فقیہہ، متعلق بہ کعبہ فقیہہ، مسلمان علماء۔ **بے توفیق:** بے ہمت، بے حوصلہ، بے جرأت۔

مطلب: اس دور کے مسلمان علماء میں قرآن کے صحیح مفہوم کو لوگوں تک پہنچانے کی توفیق نہیں ہے۔ وہ اس قدر بے ہمت و کم حوصلہ ہیں کہ قرآن کا اصل مفہوم بتانے کی بجائے اس کے مطلب کو بدل کر اس

معانی کی اپنی مرضی کے مطابق تاویل کر کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں یا یوں سمجھئے اپنے مفاد اور غرض کی خاطر بجائے خود بدلنے کے قرآن کے مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔

معانی: مسلک: مذہب۔ طریقہ' **ناقص:** نقص والی۔ عیب دار' **کتاب:** مراد قرآن' **طرق:** طریقے۔ انداز۔

④ **مطلب:** جلوت و خلوت کے یہ دونوں گروہ خاص کر علمائے دین محکومی اور غلامی کے دور میں اس قدر بدل چکے ہیں اور غلامی سے اس حد تک مانوس ہو چکے ہیں کہ اس بنا پر وہ قرآن میں بھی یہ نقص نکال رہے ہیں کہ یہ لوگوں کو غلامی پر قناعت کرنے کی تعلیم کیوں نہیں دیتا۔ چنانچہ بعض نے اعلاناً سرعام یہ کہہ دیا کہ اس دور میں جہاد مسلمان پر حرام ہے اور انگریزی سلطنت کے ساتھ وفاداری عین دین ہے۔ قرآن میں اگر اجتہاد کیا بھی تو ان علماء نے الٹے رخ کیا۔ سیدھے رخ نہیں کیا۔

شکر و شکایت

میں بندۂ ناداں ہوں' مگر شکر ہے تیرا — رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں — مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

① **معانی: نہاں خانہ لاہوت:** پراسرار عالم بالا' فرشتوں کا جہاں یا آنسوئے افلاک کی دنیا جو علم اور عام نظروں سے پوشیدہ ہے جسے اہل دل اور اہل نظر دیکھتے ہیں۔ **پیوند:** رشتہ' جوڑ۔

مطلب: اس شعر میں علامہ اقبال" اللہ تعالیٰ کا پہلے شکر ادا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں تو ایک نادان سا انسان تھا۔ تیرے کرم نے مجھے عالم ناسوت (اس مادی دنیا) سے نکال کر عالم لاہوت (اپنے اس پراسرار جہان سے) متعلق کر دیا ہے۔ جہاں کے افکار و اعمال اس ناسوتی جہان کے اعمال و افکار سے بالکل جداگانہ ہیں اور یہ بات میری شاعری کے موضوعات و مضامین سے صاف ظاہر ہے۔

② **معانی: ولولہ:** جوش۔ **لاہور:** متحدہ پنجاب اور اب پاکستانی پنجاب کا دارالحکومت' اقبال" کا رہائشی شہر۔ **خاک:** مٹی۔ **بخارا:** وسط ایشیا کا ایک مشہور شہر جو اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ **سمرقند:** وسط ایشیا کا ایک مشہور اسلامی شہر۔ **لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند:** سارے ایشیائے وسطی کو خصوصاً یہاں کے مسلمانوں کو۔

مطلب: میں نے ایشیا خصوصاً ہندوستان اور وسطی ایشیا کی قوموں اور ان میں سے بھی خاص طور پر یہاں کے مسلمانوں میں اپنی شاعری اور اپنے پیغام کے ذریعے ایک نیا جوش اور ایک نئی امنگ پیدا کی ہے۔ ان کو خواب غفلت سے جگایا ہے اور ان میں پھر سے آزادی اور عروج حاصل کرنے کا ولولہ پیدا کیا ہے۔

③ **معانی: تاثیر:** اثر کا ہونا۔ **نفس:** سانس' روح' جان یہاں مراد پیغام جو روح کی گہرائی سے دیا گیا ہو۔ **مرغان:** پرندے۔ **سحر خواں:** علی الصبح نغمہ الاپنے والے۔ **خورسند:** خوش۔

مطلب: میں نے وہ پیغام جو اپنے کلام کے ذریعے دل و جان کی گہرائی اور خلوص نیت سے دیا ہے اس کا

یہ اثر ہوا ہے کہ خزاں کے موسم میں (غلامی اور انحطاط کے زمانے میں) بھی جو پرندے علی الصبح نغمے الاپتے ہیں (جو لوگ غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں) میری صحبت میں خوش ہیں۔ میرے پیغام پر کان دھرتے ہیں لیکن حالات انہیں کچھ کرنے نہیں دیتے۔

④ **معانی**: دیس: ملک، **بندے**: لوگ، **رضا مند**: راضی خوش، **غلامی**: محکومی۔

مطلب: لیکن اے میرے پیدا کرنے والے (خاکم بدہن) مجھے تجھ سے شکوہ یہ ہے کہ مجھے ایسے ملک میں پیدا کر دیا ہے جو غلام ہے۔ نہ صرف یہ کہ ملک غلام ہے بلکہ یہاں کے لوگ اپنی غلامی پر مطمئن ہیں۔ اے کاش میں کسی آزاد وطن اور کسی آزاد قوم میں پیدا ہوا ہوتا تو پھر دنیا کو میرے پیغام کی تاثیر، اس کے نتیجہ، اور میری قدر و قیمت کا پتہ چلتا۔

ذکر و فکر

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام — وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسما
مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار — مقامِ فکر مقالاتِ بو علی سینا
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں — مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

① **معانی**: **سالک**: راستہ چلنے والا۔ **جستجو**: تلاش۔ **مقام**: منزل، تصوف کے راستہ کا کوئی مقام۔ **علم الاسما**: اس میں قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ جس میں کہا گیا ہے کہ علم آدم الاسما کلھا (آدم کو سارے اسما سکھا دیئے)۔ مراد چیزوں یا اشخاص کے نام نہیں بلکہ اشیا کے حقائق کا علم دے دیا۔ **ذکر**: تصوف کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کا ذکر جس کے کئی صوفیانہ طریقے ہیں۔ **فکر**: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی آیات میں صوفیانہ نوع کی فکر ہے لیکن یہاں مراد فلسفیانہ سوچ بچار سے ہے۔

مطلب: راہ حق پر سفر اور حقیقت کی جستجو کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ مشاہدہ کا ہے جو صوفیانہ طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ عقلی ہے جو فلسفیوں کا طریقہ ہے۔ سالک یعنی حقیقت کی تلاش کے راستے پر چلنے والے دونوں ہیں۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے علم الاسما کی صفت سے نوازا ہے (بلکہ سارے انسانوں کو نوازا ہے بشرطیکہ وہ اس انعام خداوندی کو سمجھ کر تلاش حقیقت میں نکلیں) جو سالک ذکر کا یا عشق کا راستہ اور مشاہدے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ تو اپنے مقصود کو یقین کی حد تک پا لیتے ہیں۔ وہ حقیقت کو دیکھ لیتے ہیں اور دیکھنے والا شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا اس کے برعکس جو عقل کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں حقیقت ان میں سے بعض پر منکشف ہو جاتی ہے لیکن مشاہدہ نہ ہونے کے اعتبار سے یقین کامل کا پاؤں بعض دفعہ لغزش کھا جاتا ہے۔

② **معانی**: **رومی**: مشہور صوفی مولانا جلال الدین رومیؒ۔ **عطار**: مشہور صوفی خواجہ فرید الدین عطار۔ **مقالات**: جمع مقالہ، مضامین، تحریریں۔ **بو علی سینا**: مشہور فلسفی۔

مطلب: ذکر اور فکر میں امتیاز اور فرق کی مثال دیتے ہوئے علامہ رومی اور عطار کو اہل ذکر کے نمائندوں کے طور پر پیش کرتے ہیں جنہوں نے کہ مشاہدہ حق کا مقام حاصل کیا ہے اور بو علی سینا کو جس

کی عقل پر مبنی تحریریں مشہور ہیں' اہلِ فکر کے نمائندہ کے لحاظ سے متعارف کرایا ہے۔ حقیقت اس طبقہ بعض گروہ کے لوگوں کے بھی ہاتھ لگی ہے لیکن وہ دیدار اور مشاہدہ سے محروم ہیں۔

③ **معانی: زمان:** زمانہ۔ **مکان:** جگہ۔ **زمان و مکان:** وہ جگہ اور زمانے میں محدود و مقید ہو' یہ جہان شش جہات' مادی جہان۔ **پیمائش:** ناپ۔ **سبحان ربی الاعلیٰ:** نماز کے سجدہ میں یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں جس کے معنی ہیں پاک ہے وہ رب جو سب سے اعلیٰ اور بالا ہے۔ مراد اللہ کا ذکر کرنا۔

مطلب: اہل فکر زمان و مکان کی حدود میں پابند رہتے ہیں وہ اس مادی جہان اور اس عالم شش جہات کے متعلق ہی غور و خوض کرتے رہتے ہیں۔ اس جہان کے پیچھے یا آگے کیا ہے۔ وہاں کے حقائق تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کا راز صرف اہل ذکر کو معلوم ہوتا ہے اور وہ اللہ کی پاکی بیان کر کے اور اس کے ذکر کی مختلف صورتیں اختیار کر کے اس جہان مادہ کے پس پردہ جو حقیقت ہے اسے پا لیتے ہیں۔ صفات کے بت کدہ کو توڑتے ہوئے دیدار ذات کی منزل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور یہ سب سے اعلیٰ' برتر اور حقیقت پر مبنی مقام ہے۔

ملائے حرم

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو — تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے' نہ جمال — تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

معانی: ملائے حرم: مسجد کا مولوی۔

① **معانی: رسائی:** پہنچ۔ **پوشیدہ:** چھپا ہوا۔ **سحر:** علی الصبح۔ **مقام:** مرتبہ۔ **جمال:** حسن۔ **جلال:** ہیبت' شکوہ۔ **عجب نہیں:** کوئی حیرانی کی بات نہیں۔

مطلب: پہلی بات تو یہاں یہ کرنے کی ہے کہ علامہ نے اپنے کلام میں جہاں بھی مولوی یا ملاّ کے خلاف بات کی ہے وہاں رسمی اور بے حقیقت قسم کے مولوی اور ملاّ مراد ہیں۔ اس طبقہ کی بحیثیت مجموعی مخالفت علامہ کے کلام میں نہیں ملتی بلکہ کئی جگہ ان کے اوصاف حمیدہ بھی بیان ہوئے ہیں۔ یہاں رسمی قسم کے ملاؤں کے متعلق علامہ کہتے ہیں کہ انہیں آدمی کے مقام (مرتبہ) کا علم نہیں۔ آدمی تو خلیفتہ الارض ہے۔ نائب خدا ہے۔ اپنے اندر علم الاسما کا خزانہ رکھتا ہے۔ صفات خداوندی کا مظہر ہے۔ اگر اے ملاّ تو بھی ان اوصاف سے بہرہ ور ہوتا تو خدا تک رسائی پا لینا تیرے لیے بھی ممکن تھا۔ اب ایسا نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ تمہیں آدمی کے مقام کا ہی علم نہیں۔

2 **معانی: نماز:** مسلمانوں کی خاص پنجگانہ عبادت' **جلال:** دبدبہ۔ شکوہ۔ ہیبت' **جمال:** حسن' خوبصورتی' **سحر:** صبح' **اذان:** اذان' نماز کے لئے پکار۔

مطلب: تیری نمازیں حسن و خوبی اور شان و شکوہ سے محروم ہیں اور تیری اذان میں غافل دلوں کو بیدار کرنے' تاریک قلوب میں روشنی پیدا کرنے اور اہل اسلام میں عمل و سعی کا ولولہ پیدا کرنے کا وہ جوہر نہیں ہے جو میری سحر نے دیا ہے۔ مری سحر سے مراد اقبال کے نزدیک وہ سحر ہے۔ جو اذان سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ سحر رسمی ملاّ کی اذان سے پیدا نہیں ہوتی۔ صرف مرد مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اسی کتاب کی نظم بہ عنوان اذان ملاحظہ کریں۔

تقدیر

...کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت ہے خوار زمانے میں کبھی جوہرِ ذاتی
...کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں تقدیر نہیں تابعِ منطق نظر آتی
...ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
...لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی برّاں صفتِ تیغِ دو پیکر نظر اس کی

معانی: نا اہل: جس میں کوئی قابلیت اور صلاحیت نہ ہو۔ **قوت**: طاقت۔ **جبروت**: جلال، ہیبت۔ **خوار**...ی۔ **جوہر ذاتی**: ذاتی قابلیت۔

...سب: عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ جو نالائق ہوتے ہیں اور ان میں کوئی ذاتی صلاحیت ...وتی وہ طاقت، عظمت اور ہیبت کے مالک بن جاتے ہیں اور حکومت کے عہدوں تک پہنچ جاتے ہیں ...اس کے برعکس یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ذاتی قابلیت رکھتے ہیں اور اللہ نے جنہیں ذاتی ...حیتیں عطا کی ہوئی ہوتی ہیں وہ زمانے میں ذلیل اور خوار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تقدیر کے متعلق ایک عام ...نظر ہے جو علامہ نے اس شعر میں پیش کیا ہے۔

معانی: **منطق**: علم معقول یعنی وہ علم جو کسی کلام کے صحیح یا غلط ہونے پر دلیل سے فیصلہ کرتا ہے۔ ...ع: زیر فرمان۔ **نہاں**: پوشیدہ۔ **تقدیر**: قسمت۔ **شاید**: ہوسکتا ہے۔

...لب: نا اہل کے کامیاب اور اہل کے ناکام ہونے کے پیچھے شاید کوئی علم معقول یا دلیل کی بات ...یدہ ہو لیکن میرے خیال میں تقدیر جو ہے وہ منطق (علم معقول) کے زیر فرمان نظر نہیں آتی۔ اس کا ...لہ ہی اور ہے۔

معانی: **امم**: امت کی جمع، قومیں۔ **حقیقت**: اصلیت۔ **تاریخ**: قوموں کے حالات و واقعات پر مبنی کتاب

...لب: اقبالؒ نے دوسرے شعر میں یہ بات بیان کی ہے کہ شاید اہل اور نا اہل کی تقدیر میں کوئی منطق ...ی ہوئی ہو لیکن اس تیسرے شعر میں کہتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے جو سب کو معلوم ہے اور ...حقیقت قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے صاف ظاہر ہے۔ جو قومیں ہمت سے کام لیتی ہیں اور ...مل ہوتی ہیں وہ قوت اور جبروت حاصل کر لیتی ہیں اور جو قومیں عمل سے محروم ہوتی ہیں وہ ذلیل و خوار ...جاتی ہیں۔ یہ بات اقوام کی تاریخ سے بالکل عیاں ہے۔

معانی: **ہر لحظہ**: ہر لمحہ۔ **برّاں**: کاٹنے والی۔ **صفت**: مانند۔ **تیغ دو پیکر**: دو دھاری تلوار۔

...طلب: اقبالؒ نے اس شعر میں تقدیر کا صحیح مفہوم بتاتے ہوئے کہا ہے کہ تقدیر ہر لمحہ قوموں کے اعمال ...نظر رکھتی ہے۔ تقدیر دو دھاری تلوار کی مانند ہے جو اہل عمل کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے اور بے ...ملوں کو ناکامی کا منہ دکھاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کا وہ مفہوم جو عوام کے ذہن میں ہے کہ نا اہل ...پھلتے پھولتے ہیں اور اہل خوار نظر آتے ہیں بالکل غلط ہے۔ تقدیر بندوں کے اپنے اعمال کے نتیجے میں بنتی ...ہے۔

توحید
(ایک خدا کو ماننا)

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلا

روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقا

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیا

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا، نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خا

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے اما

① **معانی:** توحید: خدا کو ایک جاننا اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرانا۔ **علم کلام:** وہ علم جو اسلامی عقائد کو دلیل کے ذریعے سمجھاتا ہے۔ **زندہ قوت:** عمل میں لائی جانیوالی طاقت، **جہان:** دنیا، **فقط:** صرف، **مسئلہ:** زیر بحث

مطلب: حق اور باطل یا کفر اور اسلام کے درمیان جو تمیزی چیزیں ہیں ان میں توحید (یعنی خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا) بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ توحید مسلمان کا اصل سرمایہ تھا اور اس کی ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی تھی لیکن یہی توحید جو مسلمان کے لیے ایک زندہ (حقیقی اور پائیدار) طاقت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج صرف ایک علم کلام کے مسئلہ کے طور پر باقی رہ گئی ہے۔ اس پر علمی، دلیلی اور منطقی باتیں تو بہت کی جاتی ہیں لیکن عملاً مسلمانوں میں یہ قوت ناپید نظر آتی ہے۔

② **معانی:** ضو: روشنی۔ **ظلمت کردار:** عمل و سیرت کی تاریکی یعنی بے عملی و بدعملی، **پوشیدہ:** چھپا ہوا۔

مطلب: اقبالؒ اس شعر میں کہتے ہیں کہ جب تک توحید کی اس زندہ قوت کی روشنی سے مسلمان کے عمل اور سیرت کی تاریکی میں تابندگی پیدا نہ ہو یعنی جب تک مسلمان توحید پر عملاً کاربند نہ ہو اس کا اپنا مقام (کہ وہ کیا ہے؟ اور وہ کس مقام پر ہے؟) اس سے چھپا ہوا رہے گا۔

③ **معانی:** میر سپہ: لشکر کا امیر۔ سپہ: لشکر، فوج۔ **قل ھو اللہ:** قرآن کی سورۂ اخلاص کے پہلے الفاظ جن سے مراد ہے کہ اللہ ایک ہے۔ **نیام:** میان۔

مطلب: اقبالؒ اس شعر میں مسلمانوں کے رہنماؤں خصوصاً مذہبی رہنماؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس لشکر (قوم) کے تم امیر اور سپہ سالار ہو میں نے اس سپاہ کو دیکھا ہے۔ اس میں ایک ایک سپاہی کی میان توحید کی تلوار سے خالی ہے۔ اقبالؒ کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اگر توحید کی دولت نایاب ہے تو اس کے ذمہ دار اصل میں وہ خلوتی (صوفیاء) اور جلوتی (علماء) ہیں جو نہ خود توحید پر عامل ہیں اور نہ اپنی قوم کو انہوں نے اس کی روح سے آشنا کرایا ہے۔

④ **معانی:** ملا: مراد ہے رسمی اور پیشہ ور مولوی۔ **فقیہہ:** فقہ کو جاننے والے یعنی مسائل شرعیہ پر روشنی ڈالنے والے، یہاں بھی اقبالؒ کی مراد رسمی، پیشہ ور اور خود غرض فقیہاں سے ہے نہ کہ اصلی اور صحیح فقیہہ مراد ہیں۔ **وحدت افکار کی:** خیالات میں یگانگت۔ **بے وحدت کردار:** عمل اور سیرت میں یکسانیت نہ ہونا یعنی منافقت کا ہونا۔ **خام:** ناپختہ۔

مطلب: اقبالؒ کے اس شعر کے شروع میں لفظ آہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ آج کے مسلمانوں کے علماء اور فقہا اس بھید سے بالکل ناواقف ہیں کہ عمل اور سیرت کی

ت (یکسانیت) خیالات کی وحدت (یگانگت) کے بغیر ناپختہ ہے۔ آج کے پیشہ ور دینی رہنما توحید کی ں تو بہت کرتے ہیں لیکن ان کا اپنا کردار اس سے بالکل مختلف ہے جس کی وجہ سے مسلمان قوم میں ں خیالات و اعمال کی یگانگت موجود نہیں بلکہ ہر طرف منافقت نظر آتی ہے۔

معانی: **امام:** پیشوا، رہنما، یہاں خصوصی طور پر نماز پڑھانے والا پیشوا مراد ہے۔ **امامت:** پیشوائی، مائی۔ **دو رکعت کے امام:** مسجدوں میں نماز کی چند رکعتیں پڑھانے والے پیش امام۔

طلب: ایسے پیشہ ور اور خود غرض علماءِ فقیہہ اور امام جن کی باتیں علامہ نے مذکورہ بالا شعروں میں کی ۔ جب مسجد میں نماز کی چند رکعتیں صحیح طور پر نہیں پڑھا سکتے وہ پوری قوم کی رہنمائی کیسے کر سکتے ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ آج کے مسجدی امام اکثر نااہل، پیشہ ور اور فسادی ہوتے ہیں اور ان میں اپنے یوں اپنے (پیچھے نماز پڑھنے والوں) میں اتحادِ عمل و افکار پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ایسے امام پوری قوم امامت کیسے کر سکتے ہیں اور اس کی واحد وجہ ان کی توحید نا آشنائی ہے۔

علم اور دین

علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
نہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک — دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم
ں میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی! — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم!
علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں — تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

معانی: یہاں علم سے مراد عام علم نہیں بلکہ "العلم" مراد ہے۔ یعنی وہ علم جو آدمی کو اپنی اور اپنے خدا معرفت عطا کرتا ہے۔ **ابراہیم:** ایک پیغمبر کا نام ہے جو نمرود کے زمانے میں تھے اور جنہوں نے نمرود کی خدائی بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی۔ **ندیم:** ساتھی، دوست، ہمدرد۔

طلب: یہاں علامہ نے دین کو علم کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ علم جو العلم کہلاتا ہے ن سے الگ نہیں ہے وہ انسان کے اندر کے سارے بتوں کو اس طرح پاش پاش کر دیتا ہے جس طرح کہ رت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے زمانے میں بتوں کو توڑا پھوڑا تھا۔ یہ علم اقبال" کے نزدیک وہ علم جسے خدا نے انسان کے دل اور اس کی نظر کا دوست بنایا ہے۔ یعنی اس کے ذریعے انسان کا باطن اور ں کا ظاہر دونوں صاف ہو جاتے ہیں۔

معانی: **کم نظری:** نظر کا کم ہونا، کم نگاہی۔ **قصہ:** کہانی۔ **قدیم:** پرانا۔ **جدید:** نیا۔ **حیات:** زندگی۔ **کائنات:** دنیا۔

طلب: جب زمانہ ایک ہے۔ زندگی ایک ہے اور کائنات بھی ایک ہے تو پھر ہم ان کو جب جدید اور یم میں (نئے اور پرانے میں) تقسیم کرتے ہیں تو یہ تقسیم کنندوں کی کم نگاہی کی دلیل ہے۔ علم چاہے کسی انے کا بھی ہو وہی علم ہے جو انسان کو اس کے دل و نظر کے قریب کر دے۔ اس لیے یہ جدید اور قدیم کی ت کرنے والے کم فہم ہیں۔

معانی: **نسیم:** صبح کی نرم و لطیف ہوا۔ **قطرۂ شبنم:** اوس کی بوند۔ **چمن:** باغ۔ **غنچہ:** کلی، بند پھول۔ **شریک:** ال، **تربیت:** صحیح پرورش

مطلب: اقبالؒ نے اس شعر میں ایک اصول بیان کیا ہے وہ اصول یہ ہے کہ باغ میں غنچے کی تربیت (غنچے کا پھلنا پھولنا اور کھلنا) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صبح کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ شبنم کے قطرے مل کر غنچوں کے منہ میں نہ گریں۔ مراد یہ ہے کہ علم جب تک آسمانی دین سے ہم آہنگ نہ ہو جہالت ہے۔

④ **معانی:** **کم بصری:** نگاہ کا کم ہونا۔ **ہمکنار:** بغل گیر۔ **کلیم:** حضرت موسیٰ علیہ السلام' کلیم ان کا لقب کیونکہ وہ خدا سے باتیں کرتے تھے۔ **حکیم:** فلسفی۔ **تجلیات:** جلوے' **مشاہدات:** حقائق کو دیکھنا۔

مطلب: علامہ کے نزدیک وہ علم علم نہیں بلکہ علم حاصل کرنے والے کی کم نگاہی کی دلیل ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام (کلیم اللہ) کی تجلیات ربانی اور مسلمان فلسفیوں کے مشاہدات ساتھ ساتھ نہ چلتے ہوں۔ یعنی ایسے علوم جو آسمانی کتابوں اور دین اسلام سے منقطع ہوں (چاہے وہ فلسفیانہ علوم ہوں یا دینی علوم ہوں) وہ صحیح علوم نہیں بلکہ ان سے جہالت بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا علم (جس میں گمراہ مذہبی علم بھی شامل ہے) باوجود انتہا کو پہنچنے کے روح اور نظر کا ندیم نہیں بن سکا۔

ہندی مسلمان

غدارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن — انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر
پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت — کہتی ہے کہ یہ مومن پارینہ ہے کافر
آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے — "مسکیں دلکم" ماندہ دریں کشمکش اندر

①②③ **معانی:** **گداگر:** بھیک مانگنے والا۔ **اربابِ نبوت:** نبوت کے رب' یہاں مراد ہے پنجاب میں پیدا ہونے والے کاذب نبی مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار۔ **پارینہ:** پرانا۔ **آوازۂ حق:** سچا غلغلہ۔ **مسکین:** غریب۔ **دلکم:** میرا چھوٹا دل۔ **ماندہ:** رہتا ہے۔ **دریں کشمکش اندر:** اس کشمکش کے اندر۔

مطلب: یہاں علامہ نے ان مسلمانوں کی بات کی ہے جو تقسیم برصغیر سے پہلے کے ہیں اور کہا ہے کہ برہمن (ہندو) مسلمان کو وطن کا غدار سمجھتا ہے کیونکہ وہ خیال کرتا ہے کہ مسلمان الگ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں اور ہمارا ساتھ نہیں دیتے۔ انگریز مسلمان کو بھکاری سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ مسلمان ہر وقت کچھ نہ کچھ مانگتا ہی رہتا ہے کبھی نوکریاں اور کبھی اسمبلیوں کی ممبریاں۔ اور کبھی حقوق۔
پنجاب میں مرزا غلام احمد (جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا) کے پیروکار یہ کہتے ہیں کہ ہماری شریعت سچی ہے اور یہ پرانے مسلمان جو ہمارے نبی کو نہیں مانتے وہ کافر ہیں۔
ان حالات میں جب کہ ہر طرف سے مسلمان کے خلاف جھوٹی باتیں ہو رہی ہیں دیکھئے کون مردِ حق پیدا ہوتا ہے اور کب پیدا ہوتا ہے اور کب سچی بات کہنے والا مسلمانوں میں آتا ہے میرا چھوٹا سا غریب دل تو اسی کشمکش میں رہتا ہے کہ کب خدا کی طرف سے ایسا مردِ حق آتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔

آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے ... کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں ... پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ ... اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن ... یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ

① **معانی:** فولاد: لوہا۔ **شمشیر:** تلوار۔ **جگردار:** دو ہرو الی' تیز کاٹ والی۔

مطلب: 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہندی مسلمان کو بالکل نہتے کر دیا تھا۔ 1935ء میں انہیں تلوار رکھنے کی اجازت ملی۔ اس پر علامہ نے کہا کہ اے ہندوستانی مسلمان تو نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جس تلوار کی تمہیں آزادی ملی ہے لوہے کی وہ تیز کاٹ والی تلوار کیا ہے؟

② **معانی:** بیت: شعر۔ **اسرار:** سرّ کی جمع' بھید۔ **مصرع اول:** شعر کا پہلا جز۔

مطلب: اس شعر میں اور اس کے اگلے شعر میں بیت' مصرع اول اور مصرع ثانی کی شاعرانہ اصطلاحوں کے پس منظر میں شاعر نے اپنی بات اور بڑھائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اس شعر کا پہلا مصرع ہے جس میں توحید کے بھید چھپے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسرا مصرع اس کے بعد آتا ہے جس سے شعر (بات) مکمل ہوتا ہے۔

معانی: عطا کرے: دے۔ **فقر:** درویشی' **ثانی:** دوسرا

③ **مطلب:** جس طرح کوئی شعر دو مصرعوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اسی طرح جو مضمون اقبال ادا کرنا چاہتے ہیں وہ ان دو شعروں میں پورا ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں اس نے مصرع اول کی بات کر کے لوہے کی جگردار تلوار کا ذکر کیا ہے اور دوسرے شعر میں انہوں نے فولاد کی تلوار کے مقابلے میں فقر کی تلوار کا بیان فرمایا ہے اور کہا ہے کہ جب تک تجھے فقر کی (اسلامی فقر کی) تلوار عطا نہ ہو گی۔ یہ لوہے کی تلوار بے کار ہے۔ خدا کرے کہ تجھے فقیری (درویشی) کی تلوار بھی عطا ہو۔

④ **معانی: خالد:** حضرت خالدؓ بن ولید۔ **جانباز:** جان پہ کھیل جانے والے۔ **حیدر کرار:** حضرت علیؓ۔ کرار: کامیاب حملے کرنے والا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ یہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان کے پاس فولاد کی تلوار کے ساتھ ساتھ (لشکری قوت کے ساتھ ساتھ) فقر کی تلوار (درویشی کی طاقت) بھی آ جائے تو پھر مسلمان یا جان پر کھیل جانے والا حضرت خالدؓ بن ولید بن جاتا ہے یا خیبر میں کامیابی حاصل کرنے والا حضرت علیؓ ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ صرف فوجی طاقت اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ یہ دین اور ایمان کی طاقت نہ رکھتی ہو۔ دین کے بغیر تلوار چنگیزیت بن جاتی ہے اور تلوار کے بغیر دین کا نفاذ ناممکن ہو جاتا ہے۔

جہاد

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں — مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں — ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل — کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر
تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی — دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے — یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے — مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات — اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

① **معانی**: فتویٰ: کسی بات کے بارے میں شرعی حکم یا فیصلہ۔ شیخ: مذہبی عالم۔ کارگر: کام کی چیز، فائدے والی چیز۔

مطلب: عہد حاضر میں ہندوستان کے بعض مسلمان مذہبی رہنماؤں خصوصاً مرزا غلام احمد قادیانی نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ یہ زمانہ قلم کا ہے، تلوار کا نہیں۔ تلوار اس زمانے میں کام کی چیز نہیں رہی لہٰذا اسے ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ صرف قلم سے اسلام کی اچھائیاں بیان کرنی چاہئیں۔ جہاد کا اس زمانے میں نام لینا مناسب نہیں۔

② **معانی**: بے سود: بے فائدہ۔

مطلب: لیکن ان مذہبی رہنماؤں کو کیا یہ معلوم نہیں ہے کہ مسجدوں میں اس قسم کی تقریر یا نصیحت کرنا بے فائدہ بھی ہے اور بے اثر بھی کیونکہ مسلمان ہی صحیح مسلمان نہیں رہا۔

③ **معانی**: تیغ: تلوار۔ تفنگ: بندوق۔ دست: ہاتھ۔ لذت: چاشنی، ذائقہ۔ بے خبر: ناواقف۔

مطلب: ایسی نصیحتیں کرنا اس لیے بے کار ہے کہ مسلمان کے پاس اب نہ تلوار ہے نہ بندوق یعنی وہ ہر قسم کی فوجی طاقت سے محروم ہے۔ فرض کر لیں کہ تلوار اور بندوق مسلمان کے ہاتھ میں ہو بھی تب بھی وہ اسے استعمال نہیں کرے گا کیونکہ اس کا دل موت کی لذت سے بے بہرہ ہے۔

④ **معانی**: لرزنا: کانپنا۔ کافر: منکرِ اسلام، غیر مسلم۔

مطلب: جس مسلمان کا دل کسی کافر کی موت پر کانپ اٹھتا ہے اس سے یہ کہنا کہ اللہ کے راستے میں مسلمان کی حیثیت سے مر، بے فائدہ ہے۔ کیونکہ جو دوسروں کو مرتا ہوا دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے وہ خود مرنے کے لیے کب تیار ہو گا۔

⑤ **معانی**: جہاد: اہل ایمان ہوتے ہوئے باطل یا کفر کے ساتھ حق یا اسلام کے لیے لڑنا۔ پنجہ خونیں: خون سے بھرا ہوا ہاتھ۔ خطر: ڈر۔

مطلب: جب مسلمان کے پاس کسی قسم کی فوجی قوت ہی نہیں ہے تو ہمارے مذہبی رہنماؤں کو مسلمانوں

کی بجائے ان لوگوں کو ترک جہاد (ترک جنگ) کی نصیحت کرنی چاہیے جن کے پاس بے اندازہ فوجی قوت ہے اور جن کے ظالمانہ ہاتھ کمزور قوموں کے خون سے رنگین ہیں۔ مراد یہاں مغربی اقوام سے ہے۔

⑥ **معانی: باطل:** جھوٹ' جو حق نہ ہو۔ **فال و فر:** شان و شوکت۔ **زرہ میں ڈوب جانا:** فوجی ساز و سامان سے پوری طرح آراستہ ہونا۔ **دوش تا کمر:** کندھے سے کمر تک یعنی سر بہ سر۔

مطلب: یورپ والوں نے باطل (جھوٹ یا جو حق نہ ہو) کی شان و شوکت اور دبدبہ کی حفاظت کے واسطے اپنے آپ کو کندھے سے کمر تک زرہ پوش کر رکھا ہے۔ یعنی وہ پوری طرح حق کے مقابلے میں باطل کی حفاظت کے لیے فوجی طاقت جمع کئے ہوئے ہیں۔ ترک جنگ کی نصیحت ہمارے رہنماؤں کو یورپ والوں کو کرنی چاہیے نہ کہ مسلمانوں کو جن کے پاس کوئی فوجی ساز و سامان یا طاقت نہیں ہے بلکہ ایمانی طاقت بھی کھو بیٹھے ہیں۔

⑦ **معانی: کلیسا نواز:** گرجا نواز' یعنی عیسائیوں کو خوش کرنے والے۔ **شر:** برائی' فتنہ' **شیخ:** مسلمانوں کا مذہبی راہنما۔

مطلب: ان حالات میں جب یورپ پوری طرح فوجی ساز و سامان سے آراستہ ہے اور مسلمان نہتا اور بے طاقت ہے ہم ان مذہبی رہنماؤں سے جنہوں نے جہاد کے خلاف فتویٰ دیا ہے پوچھتے ہیں کہ اگر جنگ اہل مشرق کے لیے بری ہے تو اہل مغرب کے لیے بری کیوں نہیں چونکہ یہ رہنما عیسائی نواز ہیں اس لیے وہ اہل مغرب کے خلاف فتویٰ نہیں دے سکتے۔

⑧ **معانی: زیبا:** پسندیدہ ہونا۔ **محاسبہ:** پوچھ گچھ کرنا' احتساب کرنا۔ **درگذر کرنا:** چھوڑ دینا' معاف کر دینا۔

مطلب: اگر ان مذہبی رہنماؤں کی غرض سچ بات کہنا ہے تو کیا ان کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اس یورپ کو تو معاف کر دیں جو سر بہ سر فوجی طاقت بنا ہوا ہے اور مسلمانوں سے پوچھ گچھ کریں جن کے پاس کوئی فوجی قوت نہیں ہے اور ان کو جہاد ترک کرنے کی نصیحت کریں۔ حالانکہ ایسا انہیں اہل یورپ کو کہنا چاہیے جنہوں نے اپنی فوجی قوت کی بنا پر کمزور قوموں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔

قوت اور دین

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

① **معانی: اسکندر:** جو اسکندر اعظم بھی کہلاتا ہے۔ جو یونان کا بادشاہ تھا اور عظیم فاتح تھا۔ **چنگیز:** منگولیا (چین سے اوپر ایک ملک ہے) وہاں کا رہنے والا ظالم فاتح۔ **قبا:** لباس' لبادہ۔ **چاک:** پھٹ جانا۔

مطلب: اسکندر اور چنگیز جیسے عظیم اور ظالم فاتحوں کے ہاتھوں حضرت انسان کا لباس سو بار پھٹا۔ مراد یہ ہے کہ دنیا میں ایسے فاتحین نے اور ظالم و جابر حکمرانوں نے انسانیت و آدمیت کی بارہا تذلیل کی ہے اور خون بہایا ہے۔

② **معانی**: **امم**: امت کی جمع' اقوام۔ **ازلی**: ہمیشہ سے' شروع سے۔ **صاحب نظراں**: اے نظر والو۔ **نشہ**: خمار' **خطرناک**: جس میں خطرات (ڈر) ہوں۔ **قوت**: طاقت۔

مطلب: قوموں کی تاریخ ہمیشہ سے یہ پیام دے رہی ہے کہ اے نظر رکھنے والو یاد رکھو کہ قوت کا نشہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ جس شخص یا قوم کے پاس قوت آ جاتی ہے وہ اپنی طاقت کے نشہ میں نیک و بد ہر قسم کا قدم اٹھا لیتی ہے۔

③ **معانی**: **سیل**: سیلاب۔ **سبک سیر**: تند و تیز۔ **زمیں گیر**: زمین پر پھیل جانے والا۔ **خس و خاشاک**: گھاس پھوس۔

مطلب: قوت کا نشہ زمین پر پھیل جانے والے تند و تیز سیلاب کی مانند ہوتا ہے جو سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ قوت کے نشہ کے سیلاب کے سامنے مفتوح قوموں اور افراد کی عقل' نظر' علم' ہنر وغیرہ گھاس پھوس کی طرح بہہ جاتا ہے۔

④ **معانی**: **لادیں**: بے دین۔ **زہر ہلاہل**: ہلاک کر دینے والا زہر۔ **تریاک**: یعنی تریاق' زہر کا علاج۔ **دین اسلام**

مطلب: اگر قوت کا نشہ بے دین ہو تو یہ ہلاک کر دینے والے زہر سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہاں اگر دین کی اس پر قدغن ہو یا دین کے لیے ہو تو پھر یہی قوت زہر کا علاج بن جاتی ہے۔ چنگیزیت اسی لیے ظلم و جبر کی انتہا تھی کہ اس پر دین کی قدغن نہیں تھی۔ جو قوت بھی دین کے سایہ کے بغیر ہو گی وہ چنگیزیت ہی ہو گی۔ دین کے سایہ میں جو تلوار اور جو قوت استعمال کی جائے گی وہ رحمت ہو گی۔

فقر و ملوکیت

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم
عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم

معانی: **فقر و ملوکیت**: درویشی اور بادشاہت۔

① **معانی**: **جنگاہ**: میدان جنگ۔ **ساز و یراق**: ساز و سامان۔ **ضرب کاری**: سخت چوٹ' وار۔ **قلب سلیم**: ایسا دل جو ہر قسم کی برائی سے پاک ہو۔ اس میں کوئی روحانی بیماری نہ ہو۔

مطلب: فقیری (درویشی) دنیا کے میدان جنگ میں ساز و سامان کے بغیر اترتی ہے چونکہ درویش کے پاس پاک اور ہر قسم کی روحانی بیماری سے شفایاب دل ہوتا ہے اس لیے اس کا وار تلوار اور لشکری قوت و سامان سے بھی زیادہ سخت اور کارگر ہوتا ہے۔

② **معانی**: **بے باکی**: بے خوفی۔ **فرعون**: مصر کا بادشاہ جو اپنے آپ کو خدا کہتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تھا۔ **کلیم**: حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ باری تعالیٰ سے کوہ طور پر باتیں کیا کرتے تھے اس لیے کلیم (بات کرنے والے) مشہور ہو گئے اور کلیم اللہ کہلانے لگے۔ **عہد**: زمانہ' **بے باکی**: ڈر نہ ہونا' **بے تابی**: بیقراری۔

مطالب: درویشی باطل سے ٹکرانے اور حق کو پھیلانے کے لیے ہمیشہ بے خوف اور بے قرار رہتی ہے۔ اس لیے ہر لمحہ پہلے سے بھی زیادہ بے خوف اور بے قرار ہوتی ہے۔ اس درویش مزاجی کی وجہ سے ہر عہد میں فرعون و کلیم کا قصہ تازہ ہوتا رہتا ہے یعنی حق و باطل کی جنگ ہر دور میں رہتی ہے جس طرح اپنی ساری قوت کے باوجود فرعون اور اس کے لشکر نے موسیٰ سے شکست کھائی تھی اسی طرح فقر (درویشی) کے سامنے ملوکیت (بادشاہت) اور طاقت بھی ہر دور میں شکست کھا لیتی ہے لیکن افسوس ہے آج کے مادی دور میں درویشی کی اہمیت لوگوں کی نظروں میں نہیں رہی اور خود درویش بھی دنیادار ہو گئے ہیں۔ فرعون شکن درویشی اگر آج بھی ہو تو ہر باطل قوت سے ٹکرایا بھی جا سکتا ہے اور اس پر فتح بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

③ **معانی:** فقر غیور: غیرت مند فقر۔ فرنگی: اہل یورپ۔ زر و سیم: سونا اور چاندی، دولت، مادیت۔ دور: عہد، ہوائے: ہوس، لالچ، حرام: ناجائز۔

مطلب: فقر کے لغوی معنی تنگ دستی اور غریبی کے ہیں۔ اور یہ اچھی چیز نہیں۔ ایسا صاحب فقر دنیا کا محتاج اور بھکاری ہوتا ہے لیکن یہاں فقر اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے جو غیرت والا ہوتا ہے اور صاحب فقر کچھ نہ ہونے کے باوجود کسی کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ سب اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ دنیا سے نفرت کرتا ہے اور دنیا اس کے قدموں میں گرتی ہے۔ اقبال" کہتے ہیں کہ یورپ اور اہل یورپ کی تہذیب و ثقافت اور علم و فن نے سارے لوگوں کو مادیت کا پرستار بنا دیا ہے۔ شکم پرست بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہر کوئی دولت اور زر و سیم کے لالچ میں پھنسا ہوا ہے، جس سے انسانی قدریں تباہ ہو چکی ہیں اور انسانی بھیس میں ہر طرف حیوانوں کے ریوڑ نظر آتے ہیں۔ اقبال" کو امید بلکہ یقین ہے کہ دنیا ایک دن خود ہی اپنے اس کئے پر پچھتائے گی۔ اور پھر وہ دور آئے گا جو درویشی کا دور ہوگا۔ جس میں انسانیت اور شرف آدمیت بحال ہوگا۔

④ **معانی:** ضبط نفس: سانس کا ضبط کرنا۔ گرہ: گانٹھ، پیچیدگی۔ موج نسیم: صبح کی ٹھنڈی ہوا کی لہر۔ حرام: ناجائز۔

مطلب: عشق اور مستی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ جو بات میری جان، میرے دل اور میری سانس میں ہے اسے میں صاف صاف بیان کر دوں جس طرح، کلی کی گانٹھ (غنچے کا منہ) صبح کی ٹھنڈی ہوا کے بغیر نہیں کھلتی اسی طرح عشق و مستی کے بغیر ایسی بات واشگاف طور پر زبان پر نہیں لائی جا سکتی میں نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے اور وہ یہ کہ فرنگیوں کی مادہ پرستی کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اور غیرت مند درویشی کا پھر سے رواج ہونے والا ہے۔ اس زمانے میں انسانی قدریں پھر بحال ہو جائیں گی اور انسان حیوان سے پھر انسان بن جائے گا۔

اسلام

روح اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی
زندگانی کے لیے نارِ خودی نور و حضور

یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

① **معانی:** نور خودی: خودی کا نور، روشنی۔ نار خودی: خودی کی آگ، حرارت۔ حضور: کسی کے سامنے

حاضر: ۔۔۔ خودی: اپنی معرفت یا پہچان کرنا۔ حضور: سامنے ہونا، زندگانی: زندگی گزارنا۔

مطلب: اسلام کی روح نور خودی (خودی کی روشنی) اور نار خودی (خودی کی حرارت) میں مضمر ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے خودی کی حرارت سے صاحب خودی کے اندر نور (روشنی) بھی پیدا ہوتا ہے اور اس کی خدا کے حضور حاضری بھی ہو جاتی ہے یا بہ الفاظ دیگر صاحب خودی کو اپنے اندر خدا کی موجودگی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے بلکہ وہ اس کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

② **معانی**: تقویم: جنتری، دستور العمل، مضبوطی: استحکام، نمود: ظہور، مستور: چھپا ہوا، پوشیدہ۔

مطلب: اگرچہ قدرت نے اسلام کی اس روح (یعنی نور خودی اور نار خودی) کو پوشیدہ رکھا ہوا ہے لیکن یہی ہر چیز کی جنتری (حیات کے حساب کا دفتر) یا دستور العمل ہے۔ اس سے ہر چیز میں استحکام اور مضبوطی ہے اور یہی ہر شے کے ظہور کی اصل (جڑ) ہے۔

③ **معانی**: کد: چڑ۔ فقر غیور: غیرت مند فقیر، تذخیر: چلیے یونہی سہی، دین: اسلام۔

مطلب: اگر اہل یورپ کو اسلام کے لفظ سے چڑ ہے (جس کی خوبیاں اوپر بیان ہوئی ہیں) تو وہ یہ لفظ استعمال نہ کریں اس کی جگہ فقر غیور (غیرت مند فقر) نام استعمال کر لیں۔ بات ایک ہی ہے فقر کے لغوی معنی تو احتیاج، غریبی اور تنگ دستی کے ہیں لیکن تصوف کی اصطلاح میں فقر مسلمان کا وہ جوہر ہے جو اسے ہر احتیاج سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ بلکہ ہر شے اس کی محتاج ہو جاتی ہے اور یہی مسلمان کی شان ہے کہ وہ دنیاوی احتیاجات سے بے نیاز صرف اللہ کے لیے اپنی زندگی بسر کرے۔ اسلام اور فقر کو ایک ثابت کر کے اقبالؒ نے ان لوگوں کا بھی منہ موڑ دیا ہے جو فقر (تصوف) کو غیر اسلامی، رہبانیت، ترک دنیا اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔

حیات ابدی

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی ۔۔۔ وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی ۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

معنی: حیات ابدی: ہمیشہ کی زندگی۔

① **معانی**: صدف: سیپ۔ گہر: موتی۔ نیساں: ایک خاص موسم کا بادل جس کے قطرے جب ان سیپیوں کے منہ میں داخل ہوتے ہیں جو منہ کھولے سمندر کی سطح پر تیر رہی ہوتی ہیں تو وہ سالہا سال ان کے پیٹ میں رہ کر موتی بن جاتے ہیں۔ خودی: اپنی معرفت یا پہچان، قطرہ: پانی کی بوند، کیا: یہاں مراد بے قیمت، بیکار۔

مطلب: اقبال نے آدمی کی زندگی کو سیپ سے تشبیہ دی ہے اور خودی کو اس بادل سے برسنے والے قطرے سے تشبیہ دی ہے جو سیپ کے منہ میں جا کر موتی بن جاتا ہے۔ جس طرح سیپ موتی کے بغیر ایک بے کار شے ہے اسی طرح آدمی کی زندگی بھی خود شناسی کے بغیر بے کار ہے۔ خودی انسانی زندگی کے صدف کا موتی ہے۔ جس طرح وہ صدف (سیپ) صدف کہلانے کی مستحق نہیں جو قطرہ آب کو موتی نہ بنا سکے اسی طرح وہ آدمی، آدمی یا وہ انسان، انسان کہلانے کا حق دار نہیں جو خودی سے خالی ہے۔

② **معانی:** خودنگر: اپنی اور اپنے گردوپیش کی معرفت حاصل کرنے والی۔ خودگر: دوسروں سے بے نیاز اپنی تربیت و پرورش خود کرنے والی۔ خودگیر: خود کفیل، اپنی حفاظت آپ کرنے والی۔

مطلب: اگر اے انسان تیری خودی اپنی معرفت رکھتی ہو، دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنی تربیت خود کرتی ہو اور اپنی ضروریات و احتیاجات میں خود کفیل ہو اور کسی دوسرے کی دست نگر نہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی نہ مر سکے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ تجھ پر ظاہری موت نہیں آئے گی اس کا ذائقہ تو ہر نفس کو چکھنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مر کر بھی ایک اور طرح کی زندگی کے روپ میں تو زندہ رہے گا۔ شہداء، اولیاء اور انبیا کی زندگیاں اس پر گواہ ہیں۔

سلطانی

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے ۔۔۔ وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی ۔۔۔ یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار ۔۔۔ اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے ۔۔۔ کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو ۔۔۔ کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود ۔۔۔ خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
ہوا حریفِ مہ و آفتاب تو جس سے ۔۔۔ رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ درخشانی

معنی: سلطانی: بادشاہت۔ خبر: معلوم۔ مقام: مراتب، منازل۔ مسلمانوں کی الہامی کتاب کی جان روحِ قرآنی۔

① **مطلب:** اس راز کی کسے خبر ہے یعنی بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ وہ فقر (درویشی) جس میں قرآن کی روح ظاہر ہو ہزاروں مقام رکھتا ہے۔ سلطانی بھی اس کا ایک مقام ہے۔ وہ مرد درویش جس کی درویشی (فقر/تصوف) میں قرآن کی روح بیدار ہوتی ہے وہ بہ ظاہر کچھ نہ رکھتا ہوا سلاطین زمانہ سے بلند تر ہوتا ہے۔ اس فقر کے آگے دارا اور سکندر جیسے سلطان جھکتے ہیں۔ اصل سلطانی اسی مرد درویش کی سلطانی ہے جو اسلامی تصوف/فقر کا حامل ہے۔

② **معانی:** قاہری: غلبہ پانے کی قوت۔ سلطانی: شاہی۔ مقام: مرتبہ، منزل۔

مطلب: جب خودی کو یہ نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اندر ہر دوسری شے پر غلبہ پانے کی طاقت رکھتی ہے اور وہ ہر ایک پر فاتحانہ شان سے حکمرانی کر سکتی ہے تو اس کے اسی مقام کو ہی سلطانی کہتے ہیں۔ یہ وہ سلطانی ہے جس کو زوال نہیں ہے ورنہ وہ سلطانی جو عام مفہوم میں سلطانی کہلاتی ہے، آج ہے کل نہیں ہو سکتی۔

③ **معانی:** عیار: کسوٹی۔ ظلِ سبحانی: خدا کا سایہ۔ مقام: مرتبہ، منزل، قوت، طاقت

مطلب: جب مومن خودی کے اس مقام پر ہوتا ہے کہ اس کی خودی ہر شے پر غلبہ پالیتی ہے تو یہی وہ مقام ہے جس سے مومن کی قوتوں کی پرکھ ہو سکتی ہے۔ یہ ایک قسم کی کسوٹی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مومن کس مقام پر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس سے آدم کو خدا کا سایہ کہتے ہیں۔ عام طور پر بادشاہوں کو ظل

جانی (خدا کا سایہ) کہا جاتا ہے لیکن یہ محض رسمی مقولہ ہے اصل ظلِ سبحانی وہ سلطان ہے جس کی خودی کو اپنی قاہری نظر آتی ہے۔ ایسے ہی سلطان خلافت یا خدا کے نائب ہونے کے حق دار ہوتے ہیں۔

④ **معانی:** قہر: ستم، جہانبانی: جہاں پر حکمرانی کرنا، جبر: دباؤ یا حالتِ مجبوری، عشق: محبت کا انتہائی جذبہ، مستی: وجد، سرور

مطلب: خودی کے مقام کو پانے والا سلطان دنیا کے عام سلطانوں کی طرح جابر اور قاہر نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں پر ظلم و ستم نہیں کرتا کیونکہ جبر و قہر (ظلم و ستم) سے دوسروں پر حکمرانی کرنا ممکن نہیں۔ اصل جہانبانی جبر و قہر سے نہیں عشق و مستی سے کی جاتی ہے۔ جبر و قہر سے لوگوں کے جسموں پر تو حکمرانی ہو سکتی ہے لیکن دلوں پر نہیں۔

⑤ **معانی:** فقر: لغوی معنی تنگ دستی اور محتاجی کے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں اسلامی تصوف مراد ہے۔ نگہبانی: حفاظت، غلامی: محکومی، مبتلا کرنا: ملوث کرنا، داخل کرنا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ اپنے دور کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قدرت نے تمہیں دوسروں کا اس لیے محکوم بنا دیا ہے کہ تم سے اس فقر کی حفاظت نہ ہو سکی جو اسلامی فقر (تصوف) کہلاتا ہے اور جس کی چند خوبیاں شاعر نے مذکورہ بالا شعروں میں خودی کے حوالے سے بیان کی ہیں۔

⑥ **معانی:** ماہ: چاند۔ داغِ سجود: سجدوں کا داغ۔ فرنگی: انگریز، یورپی اقوام۔ مثالِ ماہ: چاند کی مانند۔ داغ: نشان۔

مطلب: جن مسلمانوں کے ماتھوں پر کبھی سجدوں کے نشان چاند کی طرح چمکتے تھے آج یورپی قوموں نے ان سے وہ مسلمانی (جو داغِ سجود کا سبب تھی) ان سے خرید لی ہے۔ مراد یہ ہے کہ آج کے مسلمانوں نے اپنے مفاد اور غرض کی خاطر اسلام کی روح چھوڑ دی ہے اور محض رسمی مسلمان باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ انگریزی تہذیب و ثقافت کا علم بردار بن کر اپنی مسلمانی روایات کھو بیٹھا ہے۔

⑦ **معانی:** حریف: مدمقابل۔ مہ و آفتاب: چاند اور سورج۔ درخشانی: روشنی۔

مطلب: آسمانِ اسلام پر چمکنے والے جو ستارے کبھی سورج اور چاند کے مدمقابل آتے تھے اور ان کی روشنی کو مدھم کر دیتے تھے آج وہ ستارے خود اپنی روشنی سے محروم ہو گئے ہیں۔ سبب اس کا (جیسا کہ اوپر کے اشعار سے پتہ چلتا ہے) صرف اور صرف یہ ہے کہ مسلمان سے فقر کی نگہبانی نہ ہو سکی اور وہ اپنی خودی کے مقام سے گر گیا۔

صوفی سے

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا　　مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن　　غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری　　بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

معانی: نگاہ: نظر، معجزات: معجزہ کی جمع، وہ فعل جو عام عادت سے ماورا ہو، پیغمبر کا ایسا عمل معجزہ اور صوفی کا کرامت کہلاتا ہے۔

① **مطلب:** اقبالؒ نے اس شعر میں اس صوفی کو خطاب کرتے ہوئے، جو صرف کرامات کی دنیا میں

بستا ہے اور اصل دنیا سے کنارہ کش ہے' کہا ہے کہ تو صرف کرامات کی دنیا میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں ایک وہ دنیا بھی ہے جس میں ہر لحہ نئے واقعات پیش آتے ہیں۔ تیری نظر میں معجزات (کرامات) کی دنیا ہے اور میری نظر اس واقعاتی دنیا پر جمی ہوئی ہے۔ کرامات اس وقت کار آمد ہیں جب کرامات دکھانے والا واقعاتی اور حقیقی دنیا سے الگ نہ ہو۔

② **معانی: تخیلات:** خیالات۔ **غریب:** عجیب۔ **غریب تر:** زیادہ عجیب۔ **حیات:** زندگی۔ **ممات:** موت۔

مطلب: اس شعر میں کرامات کی دنیا میں بسنے والے صوفی سے اقبالؒ مزید یہ کہتے ہیں کہ تیرے تخیلات یعنی کرامات کی دنیا بے شک عجیب ہے اور انسانی عقل و فکر سے ماورا ہے لیکن اس سے بھی عجیب تر دنیا یہ زندگی اور موت کی دنیا ہے جس سے حقیقی طور پر ہر انسان کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس دنیا کو چھوڑ دینا اور تخیلات کی دنیا میں بسے رہنا اسلامی تصوف نہیں ہے۔ اسلامی تصوف تو وہ ہے جس میں کرامات کی دنیا کے ساتھ ساتھ اس دنیا سے بھی رابطہ رہے۔

③ **معانی: ممکنات:** یہ مادی دنیا جس میں ہزاروں قسم کے امکانات موجود ہیں۔ یا عالم کون و مکاں کی دنیا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ کرامات اور تخیلات کی دنیا میں بسنے والے صوفی کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی اس کراماتی اور عجیب دنیا سے نکل کر اس دنیا کی طرف بھی توجہ کرے جسے ہم واقعات اور حادثات کی دنیا کہتے ہیں۔ اہل یورپ نے اس دنیا میں سائنس کے بہت سے کرشمے دکھائے ہیں اور وہ سارے کے سارے مادی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب تو تخیلاتی اور کراماتی دنیا سے امکانی دنیا میں داخل ہو تو یہاں اہل یورپ سے بھی زیادہ سائنسی معجزات دکھا سکے اور ان میں مادیت کے اندھیروں کی بجائے روحانیت کی روشنی پیدا کر سکے۔

افرنگ زدہ

(یورپی تہذیب میں ڈوبا ہوا)

①

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

① **معانی: وجود:** ہستی' ذات۔ **سراپا:** سر سے پاؤں تک۔ **تجلی افرنگ:** اہل یورپ کی تجلی' روشنی یا سایہ۔

مطلب: اقبال نے اس نظم میں ان مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے جو اہل یورپ کی تہذیب اور ثقافت کا پرتو یا روشنی لیے ہوئے ہیں کہتے ہیں تمہاری ہستی یورپ کے عمارت گروں نے تعمیر کی ہے اور تمہارا اپنا کچھ نہیں ہے۔ تمہارے ظاہری جسم اور تمہارے باطنی بدن (روح' افکار) دونوں اہل یورپ کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔

② **معانی:** **پیکر خاکی:** مٹی کا جسم یعنی آدمی کا جسم ظاہری۔ **فقط:** صرف۔ **نیام:** میان۔ **زر نگار:** جس پر سونے کے نقش ہوں۔ **بے شمشیر:** بغیر تلوار کے۔

مطلب: اقبالؒ اس شخص کو جو اپنی ہستی مٹا کر یورپی تہذیب کے رنگ میں رنگا جا چکا ہے' کہتے ہیں۔ ایسا محض اس لیے ہوا ہے کہ تیرا مٹی کا بدن خودی (خود شناسی۔ خود معرفتی) سے خالی ہے۔ تو ایسی میان کی مانند ہے جو ظاہر میں تو سونے کے نقش و نگار رکھتی ہے لیکن اندر تلوار سے خالی ہوتی ہے۔ اگر تو خود آگاہ ہوتا تو کبھی یورپ والوں کے پھندے میں نہ پھنستا۔

②

معانی: **نگاہ:** نظر' **وجود:** ہستی' **ثابت ہونا:** موجود ہونا۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

① **مطلب:** اقبالؒ نے پہلی نظم میں افرنگ زدہ شخص کی ظاہری خرابیوں کا زیادہ ذکر کیا تھا۔ اس نظم میں اس کی اندرونی فکر کا جائزہ لیا ہے۔ اس شعر میں یہ کہا ہے کہ اے سر سے پاؤں تک فرنگی تہذیب میں ڈوبے ہوئے انسان تو مادیت کی رو میں بہہ کر خدا کی ہستی کا انکار کر رہا ہے۔ میرے نزدیک تیرا یہ انکار دراصل تیری اپنی ہستی کا انکار ہے جسے اپنی ہستی کا احساس ہو گا وہ اس ہستی کو کسی خالق کا کرشمہ سمجھتے ہوئے اس خالق سے انکار نہیں کر سکتا۔

② **معانی:** **نمود:** ظاہر ہونا۔ **بے نمود:** ظاہر نہ ہونا۔ **جوہر:** اصلیت۔ **فقط:** صرف' **وجود:** ہستی

مطلب: اس شعر میں علامہ خدا کے وجود سے انکار کرنے والے شخص کو کہہ رہے ہیں کہ کیا تجھے معلوم بھی ہے کہ وجود (ہستی) کیا ہوتا ہے؟ وجود نام ہے صرف اپنی خودی کے جوہر کو نمایاں کرنے کا۔ جو وجود خودی کے جوہر (اصلیت) سے محروم ہے وہ وجود نہیں کچھ اور ہے اس لیے خدا کے وجود پر بات کرنے سے پہلے تو اپنی فکر کر کیونکہ تیرا جوہر خودی بے نمود یعنی ظاہر نہیں ہے۔ خودی کی نمود سے پہلے اپنی ہستی تو ثابت کر پھر خدا کے وجود کی بات بھی کر لینا۔

تصوف

یہ حکمتِ ملکوتی' یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکرِ نیم شبی' یہ مراقبے' یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ عقل' جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

① **معانی:** **ملکوتی:** فرشتوں کی دنیا۔ **لاہوتی:** لاہوت کے معنی ہیں الوہیت کا جہاں' یعنی وہ جہان جہاں پہنچ کر سالک فنافی اللہ کی منزل حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ملکوتی جہان سے بھی آگے کا جہان ہے۔ **درماں:** علاج۔ **حرم:**

کعبہ، مسجد۔ درد: مرض، غم۔

مطلب: اس نظم میں علامہ ان صوفیاء سے خطاب کرتے ہیں جو ذکر و فکر کی دنیا میں زندگی گزار دیتے ہیں لیکن مسلمانوں کے اصل دکھ درد کا علاج نہیں کرتے چنانچہ اس پہلے شعر میں یہی کہا ہے کہ اے صوفی تیری فرشتوں کے جہان تک رسائی میں جو حکمت ہے اور تیرے پاس جو الوہیت کے عالم کا علم ہے وہ اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ وہ مسلمانوں کے دکھ درد کا علاج نہیں کرتا۔

② **معانی:** **نیم شبی:** آدھی رات۔ ذکر **نیم شبی:** آدھی رات کا ذکر۔ **مراقبہ:** سب طرف سے حواس خمسہ کو الگ کر کے صرف اللہ اور اس کی الہیت کے غور و فکر میں ڈوب جانا۔

مطلب: اس شعر میں پہلے شعر کی طرح پھر کہا ہے کہ آدھی راتوں کو اٹھ کر اللہ کا ذکر کرنا اور مراقبے میں رہنا (یعنی اللہ کی ذات و صفات پر غور کرنا) بے شک تیرے لیے مستی اور کیفیت کی بات ہے لیکن اگر ان سے تو اپنی خودی (خود نگہداری اور خودشناسی) کی حفاظت نہیں کر سکتا تو میرے نزدیک یہ سب کچھ بے کار ہے۔

③ **معانی:** ماہ: چاند۔ پروین: ستاروں کا ایک جھرمٹ۔ **شورش پنہاں:** چھپا ہوا ہنگامہ۔

مطلب: یہ انسانی عقل جو چاند اور پروین (ستاروں کا ایک جھرمٹ) کا شکار کھیل رہی ہے یعنی جو معجزانہ طور پر آسمان تک کی چیزوں کی تسخیر کر رہی ہے اگر وہ انسان کے اندر کے چھپے ہوئے ہنگامے یعنی اس کی عشقیہ کیفیات میں شریک نہیں ہے تو یہ عقل بے کار ہے۔ عشق کے بغیر عقل فائدہ کی بجائے نقصان دیتی ہے۔

④ **معانی:** **خرد:** عقل۔ لا الہ: کلمہ طیبہ کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔

مطلب: اس سے پہلے شعر میں چونکہ بے عشق عقل کی بات چلی تھی اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان زبان سے کلمہ توحید پڑھ بھی لے اور خدا کو الٰہ (معبود، پروردگار) مان بھی لے تو اس سے اس وقت تک کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل سے بھی اس کا اقرار نہ کیا جائے۔ اقرار دل سے مسلمان کی نگاہ میں بھی فرق پڑ جاتا ہے اور یہی مقصود مسلمانی ہے۔ مگر آج کا مسلمان زبان سے تو کلمہ پڑھتا ہے لیکن اس کا دل اور اس کی نگاہ اس کلمے کے مطابق نہیں ہے۔

⑤ **معانی:** پریشاں: انتشار۔ پریشاں: (دوسرے مصرعے میں) پھیلاؤ۔ **فروغ صبح:** صبح کی روشنی ہونا، صبح کا نمودار ہونا۔

مطلب: اقبال "تصوف پر مذکورہ بالا باتیں کرتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید بعض قاری میری اس گفتگو کو انتشاری کیفیت سمجھیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح صبح کی روشنی پھیلتی ہے اور اس سے تاریکی چھٹ جاتی ہے اسی طرح میری گفتگو بھی ا... نہیں۔ صبح کی روشنی کے پھیلاؤ کی مانند ہے۔ اہل نظر اس میں سے صحیح بات اخذ کر سکتے ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو — آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدیِ جاوید — جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

① **معانی:** **وحدتِ افکار:** خیالات کی یگانگت۔ **الہام:** خدا کا پیغام۔ **الحاد:** کفر، بے دینی۔ **ملت:** مسلمان قوم۔

مطلب: اسلام چاہے کسی زمانے یا کسی ملک میں کیوں نہ ہو ایک ہی اسلام ہے۔ اگر اسلام اپنی صحیح روح میں رائج ہو تو وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوتے ہوئے خیالات کی وحدت رکھے گا اور اس بنا پر وہ ایک زندہ قوت بن جائے گا لیکن جب یہ وحدت ختم ہو گئی اور مختلف اقوام ممالک اور ادوار کے مسلمانوں نے اپنے اپنے اسلامی عقائد گھڑ لیے تو مسلمان ذلیل ہو گئے۔ ایسی حالت میں ان کا الہام (خدائی پیغام) بھی متاثر ہو کر بے دینی اور کفر تک پہنچ گیا کیونکہ اس میں اصلیت باقی نہیں رہی۔

② **معانی:** **قوتِ بازو:** اپنی طاقت۔ **عقلِ خداداد:** خدا کی دی ہوئی عقل۔

مطلب: ملت (مسلمان قوم) جیسا کہ پہلے شعر میں کہا گیا ہے فقط خیالات اور عقائد کے اتحاد کی بنا پر ہی قائم رہ سکتی ہے اس لیے اس وحدت اور یگانگت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان کے پاس طاقت ہو۔ یہاں اللہ کی دی ہوئی عقل یا مناظرے یا بحثیں کام نہیں دیں گی۔ اس لیے مسلمان کو عقل اور علم کے ساتھ ساتھ قوتِ بازو (اپنی طاقت) بھی پیدا کرنی چاہیے۔

معانی: **غار:** پہاڑ کی کھوہ، **قوت:** طاقت

③ **مطلب:** اے اللہ کے بندے (اے مسلمان) اگر تجھے قوت حاصل نہیں تو پھر اسلام کا نہ دفاع کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تو دنیا کو چھوڑ کر کسی غار کے اندر جا بیٹھ اور وہاں اللہ کو یاد کر۔ یعنی اللہ اللہ کر۔

④ **معانی:** **مسکینی:** غریبی۔ **محکومی:** غلامی۔ **نومیدیِ جاوید:** ہمیشہ کی ناامیدی۔

مطلب: اے مسلمان جب تو افکار و عقائد کی وحدت سے بیگانہ ہو چکا ہے اور حفاظتِ دین کی تجھ میں طاقت بھی نہیں ہے تو بہتر یہ ہے کہ اصل تصوف کو چھوڑ کر وہ تصوف اور اسلام ایجاد کر کہ جس میں غریبی، عاجزی، غلامی اور ہمیشہ کے لیے ناامیدی کا سامان ہو۔ اقبالؒ نے یہ بات غلط صوفیوں پر طنز کے طور پر کہی ہے ورنہ اصل تصوف تو مقصودِ اسلام ہے۔

⑤ **مطلب:** اقبالؒ نے یہاں بھی رسمی اور پیشہ ور ملاؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہند (برصغیر) میں انگریز حاکم کی طرف سے جو مسلمانوں کو نماز روزہ کرنے اور دوسری اسلامی رسوم ادا کرنے کی اجازت ہے اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ برصغیر میں اسلام آزاد ہے حالانکہ آزادیِ اسلام اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب مسلمان کے پاس حکمرانی ہو، طاقت ہو اور وہ اسلام کے سارے اصولوں اور احکامات کو رائج بھی کر

ان کی حفاظت کرنے کی بھی اس میں اہلیت ہو۔

غزل

دلِ مردہ دل نہیں ہے' اسے زندہ کر دوبارہ — کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پرسکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے — نہ نہنگ ہے' نہ طوفاں' نہ خرابیِ کنارہ
تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے — نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ
ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے — مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ
نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا — جسے آ گئی میسر مری شوخیِ نظارہ

① **معانی: دل زندہ:** دل تو ہر شخص کے سینے میں دھڑکتا ہی ہے اور زندہ بھی ہوتا ہے لیکن اقبال نے اہل تصوف کے پیرائے میں یہ بات کی ہے کہ جس دل میں عشق نہ ہو۔ خدا نہ بستا ہو۔ خودی سے نا آشنا ہو وہ دل باوجود طبی طور پر زندہ ہونے کے مردہ ہے۔ **مرض کہن:** پرانی بیماری۔ **چارہ:** علاج۔

مطلب: اقبال" مسلمان کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرے پاس زندہ دل نہیں ہے بلکہ تو مردہ دل رکھتا ہے جو سوز سے' عشق سے' یادالٰہی سے اور خودی سے نا آشنا ہے۔ اگر تو دنیا میں دوبارہ ابھرنا چاہتا ہے تو اپنے اس مردہ دل کو عشق کی حرارت سے' اللہ کی یاد سے' اور خود معرفتی سے زندہ کر کیونکہ میرے نزدیک مردہ اقوام کے پرانے امراض کا اس سے بڑھ کر کوئی علاج نہیں ہے۔

② **معانی: بحر:** سمندر۔ **سکوں:** آرام۔ **فسوں:** جادو۔ **نہنگ:** مگرمچھ۔ **خرابیِ کنارہ:** کنارے کی ٹوٹ پھوٹ۔

مطلب: اقبال" یہاں مسلمان کو یہ کہہ رہے ہیں کہ تیرے دل کے یا زندگی کے سمندر میں مجھے کوئی طوفان نظر نہیں آتا۔ نہ ہی اس میں مگرمچھ جیسے خطرناک جانور دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی اس کے ساحلی کناروں پر کوئی ٹوٹ پھوٹ دکھائی دیتی ہے۔ تیرے سمندر کی یہ بے طوفانی اور آرام کی جو صورت ہے کیا یہ اس لیے ہے کہ تجھ پر کسی نے جادو کر رکھا ہے؟ مراد یہ ہے کہ زندگی مخالف قوتوں سے تصادم اور خطرات سے کھیلنے کا نام ہے لیکن اے مسلمان تیری زندگی تو سراسر سکوں کی زندگی ہے اس لیے تو اقوام میں پیچھے ہے اور غلامی پر مطمئن ہے۔

③ **معانی: غمزہ:** ناز نخرا۔ **ضمیر آسماں:** آسمان کی فطرت یا دل۔ **آشنا:** واقف۔

مطلب: اے مسلمان معلوم ہوتا ہے کہ تو ابھی آسمان کے دل یا فطرت میں جو کچھ ہے اس سے بالکل ناواقف ہے اور میں اس بات پر بھی حیران ہوں کہ تجھے ستاروں کے ناز نخرے کیوں بے قرار نہیں کرتے۔ آسمان صرف ان افراد اور اقوام کو زندہ رہنے کا حق دیتا ہے جو اپنے اندر عمل کی قوت رکھتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تو فطرت کے اس اصول کو کیوں نہیں سمجھ رہا اور غلامی پر کیوں رضامند ہے۔

④ **معانی: نیستاں:** سرکنڈوں کا جنگل۔ **خاک پے سپر:** پاؤں سے راستے میں اڑنے والی مٹی۔ **نہاں:** چھپا ہوا۔ **شرارہ:** چنگاری۔

مطلب : راستے میں میرے پاؤں سے اڑنے والی مٹی میں جو ایک چنگاری چھپی ہوئی تھی' اس نے میرے صبح کے نغمہ میں شامل ہو کر تیرے سرکنڈوں کے جنگل میں آگ لگا دی ہے۔ مراد یہ ہے کہ میری آہ سحرگاہی نے یعنی میری شاعری نے' اے مسلمان تیرے اندر تڑپ پیدا کر دی ہے یعنی آزادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

⑤ **معانی**: دوش و فردا: گذرا ہوا کل اور آنے والا کل۔ میسر آگئی: حاصل ہو گئی۔

مطلب: جس شخص کو میری طرح نظاروں کو شوخی سے دیکھنے کا فن آتا ہو اسے ہی اس جہان کی جو گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کے اجزا پر مشتمل ہے حقیقت نظر آئے گی۔ حقیقت جہان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شوخ نظر پیدا کی جائے اور یہ شوخ نظری قلندری اور درویشی سے ہاتھ آتی ہے۔

دنیا

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی	وہ چاند' یہ تارا ہے' وہ پتھر' یہ نگیں ہے
دیتی ہے مری چشم بصیرت بھی یہ فتویٰ	وہ کوہ' یہ دریا ہے' وہ گردوں' یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا	تو ہے' تجھے جو کچھ نظر آتا ہے' نہیں ہے

① **معانی**: بوقلمونی: رنگارنگی۔ نگیں: نگینہ۔

مطلب: اے شخص مجھ کو بھی دنیا کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ تیری طرح میں بھی دیکھتا ہوں کہ آسمان پر چاند نکلا ہوا ہے تارے چمک رہے ہیں۔ زمین پر اور پہاڑوں میں پتھر اور نگینے موجود ہیں۔

② **معانی** : چشم بصیرت : دیکھنے والی عقل کی آنکھ۔ فتویٰ : کسی مذہبی بات پر فیصلہ دینا' یہاں مراد فیصلہ' تمیز۔ گردوں: آسمان۔ کوہ: پہاڑ۔

مطلب: میری دیکھنے والی عقل کی آنکھ بھی یہ فیصلہ دیتی ہے یا یہ تمیز کرتی ہے کہ یہ پہاڑ ہے یہ دریا ہے۔ یہ آسمان ہے اور یہ زمین ہے۔

③ **معانی**: حق بات: سچی بات۔

مطلب: میں اگرچہ وہ سب کچھ دیکھتا ہوں جس کا اوپر کے شعروں میں ذکر ہوا ہے لیکن یہ سچ بات کہنے سے بھی نہیں رک سکتا کہ تو ہے تو یہ سب کچھ ہے۔ تو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اصل وجود تیرا ہے۔ باقی سب کچھ تیرے وجود کی وجہ سے ہے۔ اس لیے تو پہلے اپنے وجود کو پہچان اور پھر یہ سب کچھ دیکھ۔

نماز

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدمؑ جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

① **معانی:** پیر: بوڑھا۔ لات و منات: بتوں کے نام جو کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔

مطلب: آدمی اگرچہ بوڑھا ہو گیا ہے اور لاکھوں کروڑوں سالوں سے دنیا میں موجود ہے لیکن غیر خدا بتوں کی شکل میں اب بھی جوان ہے۔ صرف ان بتوں کے نام بدلے ہیں۔ شکلیں بدلی ہیں لیکن آدم کا ان کے آگے جھکنا آج بھی اسی طرح کا ہے جس طرح کعبہ کے اندر موجود لات و منات کے بتوں کے آگے جھکا جاتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بت پتھر کے نہیں بلکہ کئی اور طرزوں کے ہیں مثلاً حرص و ہوا، حاکیت و اقتدار، ہوس و شہوت، زر و زن، اور کئی قسم کے دوسرے بتوں کے آگے جھکنا آج بھی آدمی کا شیوہ ہے۔ اور یہ بت ان لوگوں کے لیے جو خدا کے بندوں کی بجائے حرص و ہوا کے بندے ہیں ہر دور کی طرح آج بھی اپنی پوری رعنائی، حسن اور جوانی کے ساتھ موجود ہیں۔

② **معانی:** گراں: بوجھ۔ نجات: رہائی۔

مطلب: اگر آدمی خدائے واحد کے آگے اسی طرح جھکنے لگ جائے جیسا کہ صحیح نماز میں ہوتا ہے اور غیر خدا کے آگے جھکنے کو معیوب سمجھتا ہو تو پھر اس کا یہ ایک سجدہ ہزارہا دوسرے سجدوں سے اسے نجات دے دیتا ہے۔ شرط اس میں بھی صحیح نماز اور صحیح سجدہ نماز کی ہے۔ یہ نہ ہو کہ دل میں تو غیر خدا کے کئی بت بسے ہوئے ہوں اور وہ سجدہ ریز ہو رہا ہو۔ پہلے اپنے دل کو غیر خدا سے صاف کرنا ضروری ہے صرف اس حالت میں نماز نماز اور سجدہ سجدہ کہلانے کا مستحق ہے۔

وحی

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

معنی: وحی: اللہ کی طرف سے وہ پیغام جو عام طور پر انبیا کو آتا ہے۔

① **معانی:** بے مایہ: بے قیمت۔ امامت: امام ہونا، رہنمائی کرنا۔ سزاوار: لائق، قابل۔ راہبر: راہنما۔ ظن و تخمیں: وہم و گمان۔ زبوں: ذلیل، کمینہ، منتشر۔ کارِ حیات: زندگی کا کاروبار۔

مطلب: عقل کی بے قیمتی اور بے وقعتی کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ قوم کی امامت (راہنمائی، رہبری) کے لیے عقل نااہل ہے۔ اس میں سالاری کی قابلیت نہیں ہے۔ کیونکہ اگر راہنما وہم و گمان ہو (جو عقل کی خاصیت ہے) تو پھر زندگی کا کام یا کاروبار گھٹیا ہو جاتا ہے یا انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

② **معانی:** فکر: خیال، سوچ۔ جذبِ عمل: عمل کا جذبہ یا جاذبیت۔ شبِ تارِ حیات: زندگی کی تاریک

رات۔ تار: تاریک۔

مطلب: جب تیرا فکر اور تری سوچ بے نور ہے یعنی صحیح رہنمائی کی روشنی سے خالی ہے اور تیرے عمل کا جذبہ بے بنیاد ہے تو یہ بات بڑی مشکل ہے کہ تیری تاریک رات روشن ہو۔

③ **معانی:** **خوب و ناخوب:** اچھا اور برا۔ **گرہ:** گانٹھ۔ **وا:** کھلے۔ **کیونکر:** کس طرح۔ **حیات:** زندگی۔ **شارحِ اسرارِ حیات:** زندگی کے بھیدوں کی شرح کرنے والی۔ **شارح:** شرح کرنے والی۔ **اسرار:** سرّ کی جمع' بھیدوں۔

مطلب: انسانی زندگی کا عمل کون سا اچھا ہے اور کون سا برا ہے۔ یہ گرہ کس طرح کھلے اور یہ مشکل کس طرح حل ہو؟ جب تک کہ خود زندگی زندگی کے بھیدوں کی تشریح کرنے والی نہ ہو مراد یہ ہے کہ ہدایت اور راہنمائی کی جو طلب زندگی کی جبلت میں داخل ہے وہ فکر سے نہیں وحی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ زندگی کسی انسان کے بھیس میں آکر اور خدا سے وحی حاصل کرنے کے بعد ہی اپنے اچھے اور برے عمل میں تمیز کر سکتی ہے جیسا کہ انبیائے کرام کی زندگیوں کا شیوہ ہے۔

شکست

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

معانی: **شکست:** ہار' ٹوٹ پھوٹ۔

① **معانی:** **مجاہدانہ:** مجاہدوں جیسی۔ **حرارت:** تپش' گرمی۔ **صوفی:** درویش' فقیر' صاحبِ تصوف۔ **بے عملی:** عمل سے گریز۔ **شرابِ الست:** روزِ ازل آدمی نے الستُ بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) کے جواب میں قالو بلیٰ (ہاں تو رب ہے) کہا تھا۔ شرابِ الست سے مراد ایسی شراب ہے جو آدمی میں اللہ کے رب ہونے کے اقرار کا نشہ پیدا کرتی ہے۔

مطلب: کبھی صوفی مجاہد ہوتے تھے اور ان کی سرگرمیاں بھی مجاہدانہ ہوتی تھیں۔ وہ زندگی کے عملی کاروبار میں حصہ لیتے تھے لیکن شاعر کہتا ہے کہ آج کے صوفی تو بس یہی کافی سمجھتے ہیں کہ ہم نے الست بربکم کے جواب میں قالو بلیٰ کہا تھا اور ہم بس اسی شراب میں مست ہیں ہمیں دنیاوی کاروبار اور عمل سے کیا غرض ہے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ ہم نے خدا کی یاد کی اور اس کو رب کہنے کے اقرار کی شراب پی رکھی ہے۔ اس نشہ شراب نے انہیں بے عملی اور دنیاوی کاروبار سے دوری کی زندگی پر مجبور کر دیا ہے جو سراسر اصل تصوف اسلامی کے خلاف ہے۔

② **معانی:** **فقیہِ شہر:** شہر کا فقہ جاننے والا' مراد عالمِ دین۔ **رہبانیت:** دنیا چھوڑ دینا۔ **معرکے:** مقابلہ' جنگ۔ **جنگِ دست بدست:** ہاتھوں ہاتھ لڑائی' دشمن سے دوبدو مقابلہ۔

مطلب: صوفیوں نے تو ترکِ دنیا کیا ہی تھا۔ ہمارے عالموں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ بھی شریعت اور دین

ں باتیں برملا کہنے میں جھجکتے ہیں۔ اس خیال سے کہ کہیں حاکمان وقت سے تصادم نہ ہو جائے۔ اس
لئے فقیہہ شہر (عالم دین جو شہر میں رہتا ہے یا سارے شہر کا عالم مانا جاتا ہے) وہ بھی ترک دنیا پر مجبور ہے
کیونکہ شریعت کی بات صاف صاف کہنے میں بالکل لوگوں اور حاکموں سے مقابلہ ضروری ہے۔ اس لئے
شریعت کی باتیں برملا کہنے سے کتراتا ہے۔ ہاں آپس میں علما کے ساتھ دست و گریباں ہونے اور فرقہ
دری کی جنگ کا دروازہ کھولنے میں وہ پیش پیش ہے۔

③ **معانی:** گریز: بچنا۔ کش مکش: کھینچا تانی۔

مطلب: اگر مرد ہو کر کوئی زندگی کی کش مکش (کھینچا تانی، کاروبار زندگی میں کوشش) سے بچے اور زندگی
کے عملی میدان سے کنارہ کشی اختیار کرے تو یہ اس مرد کی شکست ہے۔ اور شکست کیا ہوتی ہے۔ زندگی
کی کش مکش سے گریز کرنا، کاروبار زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنا، یہی تو شکست زندگی ہے۔ ہمارے آج
کے نام نہاد علما اور صوفیا اسی شکست سے دوچار ہیں۔

عقل و دل

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی | باہر نہیں کچھ عقل خداداد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلالِ ازلی کا | اک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

① **معانی:** خاکی: مٹی کا بنا ہوا، آدمی۔ نوری: نور کا بنا ہوا یعنی فرشتہ۔ خداداد: خدا کی دی ہوئی۔ خرد:
عقل۔ زد: مار۔

مطلب: خدا نے جو عقل آدمی کو دی ہے اس کی مار سے اس کے احاطے سے کوئی چیز باہر نہیں چاہے وہ
مٹی کی ہو چاہے نور کی ہو۔ چاہے آدمی سے متعلق ہو چاہے فرشتے سے متعلق ہو۔

② **معانی:** عالم: جہان۔ جلال ازلی: ہمیشہ کی ہیبت۔ لحظہ: لمحہ۔

مطلب: عقل ہمیشہ سے (جب سے زمانہ شروع ہوا ہے) جہان کو اپنی ہیبت اور دبدبہ کا غلام بنائے ہوئے
ہے۔ کوئی شے "کوئی زمانہ" اس کی عظمت مانے بغیر نہیں رہا لیکن ایک دل ہے جو ہمیشہ اس سے الجھتا رہا
ہے اور اس کی ہیبت اور دلائل کو چیلنج کرتا رہا ہے۔ جہان اگر عقل کا غلام ہے تو عقل دل کی غلام ہے۔

مستی کردار

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال | ملّا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق | افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو | ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

معانی: مستیِ کردار: عمل کی مستی۔

① **معانی:** طریقت: تصوف کا باطنی علم۔ فقط: صرف۔ احوال: حالات باطن، کیفیات۔ شریعت: دین کا

ظاہری علم۔ کردار: عمل۔

مطلب: علامہ آج کے دور کے پیشہ ور اور رسمی علمائے دین اور صوفیا کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تصوف کا باطنی علم محض مستی کیفیات کا اور شریعت (دین کا قانون) صرف باتوں کی مستی کا نام رہ گیا ہے۔ عمل کی مستی دونوں میں گم ہو چکی ہے۔

② **معانی: نوا:** آواز' شاعری۔ **افسردہ:** بجھی ہوئی' بے جوش۔ **افکار:** خیالات۔ **سرمست:** مگن۔ **خوابیدہ:** سویا ہوا۔ **بیدار:** جاگا ہوا۔

مطلب: صوفیوں اور علما سے ہٹ کر اگر ادیبوں خصوصاً شاعروں کو دیکھیں تو ان کی شاعری مری ہوئی اور بجھی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی جوش' کوئی ولولہ' کوئی صداقت اور سوئی ہوئی قوم کو جگانے کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے بلکہ اس سے الٹ قوم کو مردہ اور افسردہ کرنے کی باتیں موجود ہیں۔ آج کے نام نہاد شاعر اپنے فرضی خیالات میں مگن ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ نہ وہ سوئے ہوؤں میں سے معلوم ہوتے ہیں اور نہ جاگے ہوؤں میں سے۔ بس اپنے فرضی خیالات میں مست ہیں۔ جن میں کوئی عملی بات اور پیغام نہیں ہے۔

③ **معانی: مردِ مجاہد:** اللہ کی خاطر باطل سے ٹکرانے والا آدمی۔ **رگ و پے:** ریشہ ریشہ میں' روئیں روئیں میں۔

مطلب: تصوف ہو کہ شریعت' ادب ہو کہ فن' شعر ہو کہ ہنر مجھے اس دور میں کسی بھی میدان میں باطل کے خلاف جہاد کرنے والا' کوئی شخص نظر نہیں آتا (ایسا باطل سے ٹکرانے والا مرد جس کی رگ رگ میں صرف کردار (عمل) کی مستی ہو' دکھائی نہیں دیتا۔ یعنی سب قول کے پجاری ہیں عمل سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

مرقد

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا   آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے
خاموشیِ افلاک تو ہے قبر میں لیکن   بے قیدی و پہنائیِ افلاک نہیں ہے

معانی: مرقد: قبر۔

① **معانی: شبستاں:** رات کی محفل کی جگہ۔ **راس آنا:** موافق آنا۔ **تہ خاک:** مٹی کے نیچے۔

مطلب: قلندر (صوفیا میں سے ایک مقام کا صوفی جو ہر چیز سے بے نیاز ہونے کے ساتھ بے باک بھی ہوتا ہے اور جو جی میں آئے کر بیٹھتا ہے) کو قبر کی محفل تاریک بھی موافق نہ بیٹھی وہ وہاں بھی بے چین ہے اور آرام سے نہیں بیٹھا ہوا۔

② **معانی: افلاک:** فلک کی جمع' آسمان۔ **بے قیدی:** محدود نہ ہونا' بے حدی۔ **پہنائی:** وسعت۔

مطلب: آسمان کو خاموش سمجھا جاتا ہے۔ ہنگامے ٹھے ہوئے زمین پر سمجھے جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں علامہ

کہتے ہیں کہ قلندر کی قبر میں آسمانوں جیسی خاموشی تو ضرور ہے لیکن آسمانوں جیسی بے حدودی اور وسعت نہیں ہے۔ اور قلندر کا جنوں (سودا) اس تنگ فضا میں نہیں سما سکتا۔ اس لیے قلندر کو خاک کے نیچے یعنی قبر میں بھی آرام نہیں ہے۔ وہ وہاں بھی وسعتوں کے لیے اور کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔

قلندر کی پہچان

کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ جوانمرد — جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا
ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ — بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا — چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا
توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا — ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر — ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

① **معانی:** جواں مرد: جوانی کی قوت رکھنے والا آدمی۔ بندہ حق: اللہ کا بندہ، سچ کا طرفدار۔ درویش: فقیر، صوفی۔ قلندر: ایسا درویش جو ہر شے سے بے نیاز صرف اللہ میں محو ہو اور جب اپنی آئی پر آجائے تو جو جی میں آئے کر گزرے۔ وہ مصلحت میں نہیں ہوتا اور نہ دنیاوی ساز و سامان اور اغراض و مفادات سے اس کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔

مطلب: یہاں درویش جواں مرد (مردانہ قوتیں رکھنے والے درویش) سے مراد قلندر ہے۔ اور قلندر کی پہچان کے سلسلے میں یہ اس کی پہلی صفت بیان کی ہے اور دوسری صفت یہ بیان کی ہے کہ یہ قلندر درویش زمانہ سے کہتا ہے کہ اس راستہ پر چلو جس راستہ پر اللہ کے طالب اور حق کے پرستار اور بندے چلتے ہیں۔

② **معانی:** بنگاہ: خانقاہ، جگہ، مکان۔

مطلب: قلندر درویش مزید کہتا ہے کہ میرے ہنگامے اے زمانے تیری برداشت اور طاقت سے زیادہ ہیں۔ تیرا پرستار تو ان کو برداشت نہیں کر سکے گا اس لئے اس کے واسطے ضروری ہے کہ وہ میری خانقاہ (مکان) سے بچتا ہوا گزر جائے۔ میری خانقاہ پر تو وہ ٹھہرے جو راہ حق میں میری طرح کا جواں مرد ہو۔ اور میرے ہنگامے برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

③ **معانی:** ملاح: کشتی چلانے والا۔ محتاج: دست نگر۔ چڑھتا ہوا: طوفان پر آیا ہوا۔

مطلب: اے زمانے تو اگر طوفان میں بپھرا ہوا ہے تو تیرے لیے بہتر ہے کہ تو طوفان کو ختم کر دے۔ تیرا کیا خیال ہے کہ مجھے تیرے پار جانے کے لیے کشتی کی اور کشتی چلانے والے کی ضرورت ہے۔ ہرگز نہیں۔ میں ان کا محتاج نہیں۔ تجھ میں کتنا بڑا طوفان کیوں نہ آیا ہوا ہو میرے لیے تو وہ پایاب ہے۔ جب چاہوں اور جیسے چاہوں اس کو پار کر جاؤں۔

④ **معانی:** تکبیر: اللہ اکبر کا نعرہ۔ مکر جا: انکار کر جانا۔ جرأت: دلیری۔

مطلب: پہلا مصرع سوالیہ انداز میں ہے۔ قلندر زمانے سے کہتا ہے کہ کیا میرے اس عقیدے نے کہ

اللہ اکبر ہے باقی سب اس سے کم ہیں تیرا جادو توڑ نہیں دیا۔ تجھے بڑا زعم تھا کہ مجھ سے بڑا کوئی نہیں۔ میں اہل زمانہ کو جدھر چاہوں لپیٹ کر لے جاؤں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میرے نعرہ اللہ اکبر نے تجھے چھوٹا بنا کر رکھ دیا ہے۔ تو تو میرا غلام ہے۔ تو مجھے کیا موڑے گا میں جس طرح چاہوں تجھے موڑ سکتا ہوں۔ کیا تجھے میرا کہنا جو یہ حقیقت نہیں ہے اگر تجھ میں دلیری ہے تو اس سے انکار کر کے دیکھ لے۔ میری بات تسلیم کیے بغیر نہیں بنے گی۔

⑤ **معانی:** مہر: سورج۔ مہ: چاند۔ انجم: ستارہ۔ راکب: سوار۔ مرکب: جس پر سواری کی جائے۔

مطلب: ستارہ شناس اور اہل نجوم کہتے ہیں کہ زمانہ چاند، سورج، ستاروں اور آسمان کی گردش کے تابع ہے۔ وہ عام حالات میں ٹھیک کہتے ہوں گے لیکن جہاں تک قلندر کی طاقت کا تعلق ہے سورج، چاند، تارے اور آسمان سب اس کے تابع ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ان کی گردش کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ قلندر ایام (جمع یوم یعنی زمانہ) کا گھوڑا نہیں بلکہ خود گھڑسوار ہے۔ زمانے کے گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے وہ جس طرح چاہے زمانے کو موڑ سکتا ہے۔

فلسفہ

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں — پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی — مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہگذر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا — غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟
پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں — وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل — قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار — جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

معانی: فلسفہ: حکمت، عقل سے مسائل سمجھنے اور حل کرنے کا علم۔

① **معانی:** افکار: خیالات۔ خفی: چھپے ہوئے۔ جلی: ظاہر۔ مردِ قلندر: اس کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلی نظم قلندر کی پہچان اور اس سے پہلی نظم قبر پڑھیئے۔ پوشیدہ: چھپے ہوئے۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ مردِ قلندر کی نگاہ سے (یہاں مراد خود ان کی ذات ہے کیونکہ وہ خود کو قلندر کہتے ہیں) جوانوں کے خیالات چاہے وہ ان کے باطن میں ہوں یا ان کے ظاہر میں ہوں چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

② **مطلب:** اے فلسفہ کے مارے ہوئے نوجوان مجھے تیرے ظاہری اور باطنی حالات کی اس لئے خبر ہے کہ کبھی میں بھی اس راستہ سے ہو کر گزرا تھا۔ کبھی میں بھی تیری طرح فلسفہ کا مارا ہوا تھا جب اس کی حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی تو میں اس سے باز آ گیا کیونکہ فلسفہ کسی چیز کا حل نہیں ہے۔ یہ حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

③ **معانی:** پیچوں: پیچ کی جمع ہیر پھیر، گورکھ دھندا۔ غواص: غوطہ لگانے والا۔ صدف: سیپ۔ گہر: موتی۔

طلب: جو عقل و دانش رکھنے والے لوگ ہیں وہ الفاظ کے گورکھ دھندے میں خود کو نہیں الجھاتے اور
ہ سوائے گورکھ دھندے میں الجھنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ علامہ یہاں سوالیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ
میں غوطہ لگانے والے کا مقصد تو موتی حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کہ سیپ۔ اور فلسفہ کا مارا ہوا سیپ کے
ے پڑا رہتا ہے۔ موتی اس کے ہاتھ نہیں آتا۔

معانی: حلقہ ارباب جنوں: جنوں (عشق) کے مالک لوگوں کے حلقے۔ عاشقان الٰہی کے حلقے اور
یں۔ شرر: چنگاری۔

طلب: عقل بھی دو قسم کی ہے۔ ایک عقل فلسفہ کے مارے ہوئے لوگوں کی ہے وہ شرر اور شعلے میں
راقت اور کذب میں / حق اور باطل میں / حقیقت اور ظن میں) فرق نہیں کر سکتی۔ ایک عقل عاشقان
ں کی ہے اہل عشق و جنوں کی ہے۔ یہ عقل اس فرق کو سمجھتی ہے۔ اس لئے آدمی کو اس فلسفہ عقل کے پیچھے
کی بجائے اہل عشق کی عقل کے پیچھے لگنا چاہیئے۔ عشق / جنوں (سودا) تو ہے لیکن خوش سودا ہے۔

معانی: پیچیدہ: الجھے ہوئے معانی۔ تصدیق: سچ کہنا۔ تابندہ: چمکنے والا۔

طلب: جس الجھے ہوئے معنی کو دل سچ جانے وہ سچ ہے۔ یہ معنی جو دل یا عشق کی سمجھ میں آ
تے ہیں یہ چمکتے ہوئے موتی سے بھی زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

معانی: نزع کی حالت: جان کنی کی حالت۔ گرفتار: پھنسا ہوا۔ خون جگر: جگر کے خون سے، خلوص
سے، عشق کی کیفیات میں گم ہو کر۔

طلب: جو فلسفہ کہ عقل محض کے تابع ہے وہ بے کار ہے لیکن وہ فکر / فلسفہ خون جگر سے لکھا گیا ہو اور عشق
ے تابع ہو وہ فکر صحیح فکر ہے۔ او جو فلسفہ (فکر) دل کے اور جگر کے خون سے نہ لکھا گیا ہو یعنی جس کی
دیق انسان کا دل اور اس کی روح نہ کرتی ہو وہ فلسفہ یا تو مردہ ہے یا مرنے کے قریب ہے۔

مردان خدا

ی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری — نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ل سے فطرت احرار میں ہیں دوش بدوش — قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
مانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے — انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
ود انہیں کا طواف بتاں سے ہے آزاد — یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

① معانی: بندہ حر: حریت والا بندہ، آزاد۔ ضرب: چوٹ، وار۔ کاری: سخت۔ حرب: جنگ۔ عیاری:
چالبازی، فریب۔

طلب: آزاد بندہ اور حریت پسند بندہ وہ ہے جس کی چوٹ یا جس کا وار سخت ہوتا ہے اور سیدھا ہوتا
ہے نہ کہ وہ شخص جو مقابلے اور جنگ میں ہیرا پھیری چالبازی اور فریب سے کام لیتا ہے۔

② معانی: ازل: ہمیشہ سے، جب سے زمانہ شروع ہوا ہے۔ فطرت احرار: آزاد لوگوں کی جبلت۔ دوش

بدوش: پہلو بہ پہلو' ساتھ ساتھ۔ قلندری: قلندر ہونا۔ قبا پوشی: قبا پہننا' خرقہ پہننا' مراد درویش ہونا۔ کلہ داری: سر پر ٹوپی رکھنا' سر پر تاج رکھنا۔ احرار: جمع حر' آزاد۔

مطلب: آزاد بندوں کی جبلت ازل سے یہ ہے کہ ان میں قلندری' درویشی اور سلطانی ساتھ ساتھ (پہلو بہ پہلو) چلتی ہے وہ درویش ہوتے ہوئے سلطان اور سلطان ہوتے ہوئے درویش ہوتے ہیں۔

معانی: خاک: مٹی' چنگاری: شرر' آفتاب: سورج' پوشیدہ: چھپی ہوئی۔

③ مطلب: یہ آزاد لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جن میں سے چنگاری کو لے کر زمانہ سورج بنا دیتا ہے۔ وہ دیکھنے میں بے سر و سامان اور ناچیز سے ہوتے ہیں لیکن عشق الٰہی کی حرارت سے ان کی چنگاری آفتاب کی حرارت پیدا کر لیتی ہے یعنی کچھ سامان ظاہری نہ رکھتے ہوئے بھی وہ سب کچھ رکھتے ہیں۔ زمانہ اور اشیائے زمانہ ان کے تابع ہوتی ہیں۔

④ معانی: طواف: پھیرے لینا' چکر کاٹنا۔ زناری: زنار باندھنا' کافر ہونا۔

مطلب: یہ مردان خدا وہ ہیں جو اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجتے ہیں اور نہ کسی کے آگے جھکتے ہیں۔ ورنہ عامی مسلمانوں کو بھی دیکھا ہے اور کافروں کو بھی دیکھا ہے۔ سب زنار باندھے ہوئے ہیں۔ بت پرست ہیں۔ بت ضروری نہیں کہ پتھر کے ہوں' غیر اللہ اور بہت کچھ ہے۔ دنیا ہے' فریب ہے' رشوت ہے' لوٹ کھسوٹ ہے' حق مارنا ہے' جعلی چیزیں بیچنا ہے۔ ان سب کے پیچھے لگنا ان کا پجاری بننا ہی تو ہے لیکن اللہ کے بندے ان سب بتوں کے پھیرے لینے (طواف کرنے) سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ صرف اللہ کی بندگی اختیار کرتے ہیں اور صرف اسے اپنا پروردگار اور رب تسلیم کرتے ہیں۔ باقی ہر قسم کے لوگ جنہیں حرص' لالچ اور کشش مادی اللہ سے دور لے جاتی ہے اور وہ اس کی ربوبیت کے قائل نہیں اللہ سے غافل ہوتے ہیں۔

کافر و مومن

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے ۔۔۔ تو ڈھونڈ رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق
اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند ۔۔۔ بُرّندہ و صیقل زدہ و روشن و بُرّاق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے ۔۔۔ مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

① معانی: خضر: ایک اللہ کا بندہ جو آب حیات پی کر ہمیشہ کی زندگی حاصل کر چکا ہے اور خشکی و تری میں بھولے بھٹکوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ زیادہ تر دریا و سمندر کی طرف دیکھا جاتا ہے۔ سم: زہر۔ افرنگ: یورپی قومیں۔ تریاق: علاج زہر کا۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ کل مجھے دریا کے کنارے حضرت خضر مل گئے وہ خود ہی پوچھنے لگے اے شخص کیا تو اہل یورپ (مغربی اقوام) کے زہر کا علاج ڈھونڈ رہا ہے۔

② معانی: نکتہ: باریک بات۔ شمشیر: تلوار۔ برندہ: کاٹنے والی۔ صیقل زدہ: جلا کیا ہوا' شفاف۔ براق: بجلی کی طرح کا چمکدار۔

مطلب: افرنگ کے زہر کے علاج کے لیے میرے پاس ایک نکتہ (باریک بات) ہے۔ جو تلوار کی طرح کی

ہے اس کا ذکر اگلے شعر میں۔

③ **معانی:** آفاق: کائنات' افق کی جمع۔

مطلب: کافر کی پہچان یہ ہے کہ وہ کائنات میں گم ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ مادی جہان اور دنیاوی اغراض و مفادات کے سوا کچھ نہیں سوچتا۔ اس کا علم' اس کی حکمت' اس کی سائنس اور اس کی ایجادات سب کائنات کے مادی مفادات کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ کائنات کا غلام ہوتا ہے اور اپنی اور اپنے خدا کی معرفت سے بے گانہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کی پہچان یہ ہے کہ کائنات اس میں گم ہوتی ہے۔ وہ چونکہ کائنات کے خالق کا ہو جاتا ہے اس لیے ساری کائنات اس کی ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی مالک نہیں اس کی خادم بن جاتی ہے۔

مہدی برحق

ب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

ران کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے' نے جدتِ کردار

ں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاس تخیل میں گرفتار

یا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

معانی: مہدی برحق: سچا مہدی۔

① **معانی:** مہدی: ایک ایسا شخص جو قربِ قیامت کے وقت نبی کریم ﷺ کی اولاد میں سے اسلام کو زندہ کرنے کے لیے آئے گا۔ زنداں: قید خانہ۔ **خاور:** مشرق۔ **محبوس:** قیدی۔ **برحق:** سچا۔ **سیّار:** حرکت کرنے والا' مراد یورپ جو ترقی کر رہا ہے۔ **ثوابت:** جو حرکت نہ کرے' مراد مشرق جو ترقی نہیں کر رہا۔

مطلب: مشرق کی چاہے بے حس' بے حرکت اور ترقی نہ کرنے والی قومیں ہوں یا مغرب کے حرکت کرنے والے یعنی ترقی کرنے والے افرنگی (اہل یورپ) ہوں دونوں ہی اپنے اپنے بنائے ہوئے قید خانوں کے قیدی ہیں۔ مشرق کی بے حسی اور اور بے حرکتی بھی مناسب نہیں اور مغرب کی حرکت اور ترقی بھی صحیح نہیں کیونکہ اس نے سب کو مادہ پرست بنا دیا ہے۔

② **معانی:** پیران کلیسا: گرجا کے پیرپادری۔ **شیخان حرم:** حرم کے شیخ' علمائے دین۔ **نے:** نہیں۔ **جدت گفتار:** بات کا نیا پن۔ **جدت کردار:** عمل کا نیا پن۔

مطلب: مغرب کے عیسائی اور ان کے پیرپادری ہوں یا مشرق کے علمائے دین ہوں' دونوں میں نئے پن کی کوئی بات نہیں۔ مغرب کے عیسائیوں میں کردار و عمل وہی پرانا ہے اور مشرق کے دینی علما کی گفتار بھی وہی پرانی ہے۔ دونوں ہی اپنے اپنے افکار و گفتار کے قید خانوں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔

③ **معانی:** کہنہ: پرانے۔ **خم و پیچ:** ہیرپھیر' داؤ۔ **افلاس تخیل:** خیالات کی بے مائگی اور بے چارگی' بے قیمتی۔

مطلب: اگر دونوں طرف کے سیاست دانوں کو دیکھیں تو ان کے داؤ پیچ بھی پرانے زمانے کے ہیرپھیر

آ نظر آتے ہیں۔ ان کے شاعروں کو دیکھیں تو ان کی شاعری بھی خیالات کے افلاس کی آئینہ دار ہے یعنی
سطحی خیالات سے پر ہے۔

معانی: نگہ: نظر، **زلزلہ:** بھونچال، **برحق:** سچا، **عالم:** دنیا۔ جہاں، **افکار:** فکر کی جمع، **فلسفہ:** سوچ

④ **مطلب:** ان حالات میں جب کہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ ہر میدان میں حالات خراب ہیں
اور لوگ اللہ سے دور اور شیطان کے زیادہ نزدیک ہو رہے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ جس سچے
مہدی کو کہتے ہیں کہ اسے آنا ہے وہ آجائے اور آکر سب کی افکار و خیالات کی دنیا میں ایسا زلزلہ پیدا کر
دے کہ پرانا سب کچھ منہدم ہو جائے اور نیا سرمایہ جو انسانی مجد اور شرافت کو برقرار رکھنے والا ہو ہر
میدان میں ابھر آئے۔

مومن

(دنیا میں)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

(جنت میں)

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

معانی: مومن: اہل ایمان، اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان صحیح اور عمل کامل رکھنے والا شخص۔

① **معانی: حلقہ یاراں:** دوستوں کا حلقہ۔ **بریشم:** ریشم۔ **رزم حق و باطل:** جھوٹ اور سچ میں جنگ، کفر
اور اسلام کا مقابلہ۔ **فولاد:** لوہا۔

مطلب: مومن کی دنیا میں پہچان یہ ہے کہ جب وہ اپنے مسلمان بھائیوں، مومن دوستوں میں ہوتا ہے
ان کے ساتھ یوں رہتا ہے اور ان سے یوں پیش آتا ہے جیسا کہ ریشم ہو جو ملائم و نرم ہوتا ہے۔ نرمی
ملائمت، اخوت، رواداری، مروت، ہمدردی اس کا شیوہ ہوتا ہے لیکن جب دشمن دین سے مقابلہ
جائے۔ جب سچ اور جھوٹ، حق اور باطل اور کفر و اسلام میں معرکہ ہو جائے تو یہی ریشم کی طرح ملا
مومن لوہے کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور جب تک باطل کو جھکا نہیں لیتا ضرب کاری سے کام لیتا رہتا
ہے۔

② **معانی: افلاک:** آسمان۔ **حریفانہ کشاکش:** دشمنوں جیسا مقابلہ۔ **خاک:** مٹی۔ **خاکی:** مٹی کا بنا ہوا
مطلب: مومن ہر وقت آسمانوں کے مدمقابل اور ان کا دشمن بنا رہتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ آسمانوں
سے کوئی بلا آئے وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے اس کے آگے جھکتا نہیں دوسرے یہ کہ وہ ان افلاک سے دوبدو

کران سے آگے (ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کے مصداق) نکل جانا چاہتا ہے۔ زمین پر ہوتا ہوا اپنا تعلق آنسوئے افلاک یا عرشِ معلٰی سے قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اب یہ بات کسے معلوم نہیں کہ زمان و مکان سے آگے آنسوئے افلاک سے تعلق پیدا کرنا تب ہی ہو سکتا ہے جب مومن بھی نوری ہو کیونکہ نوری جہان کا تعلق نور سے ہی ہو سکتا ہے اس لیے مومن جو بشریت کے لحاظ سے خاکی (مٹی کا بنا ہوا ہے) ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کی نورانی ہوتی ہے۔ وہ خاکی ہوتا ہوا خاک سے آزاد ہوتا ہے۔ بندہ ہوتے ہوئے مومن صفات ہوتا ہے۔ نوری نہاد ہوتا ہے۔

③ **معانی:** جچتے نہیں: بھاتے نہیں' پسند نہیں آتے۔ حمام: کبوتر۔ کنجشک: چڑیا۔ جبریل و سرافیل: اللہ کے قریبی دو فرشتوں کے نام' یہاں انہیں بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ مراد ہے بہت بلند مقاصد' حمام اور کنجشک بھی استعاراتہً معنی رکھتے ہیں۔ مراد ہے معمولی اور عام مقاصد۔ صیاد: شکاری۔

مطلب: مومن چڑیوں اور کبوتروں کا شکار نہیں کھیلتا۔ بلکہ وہ جبریل و سرافیل جیسے فرشتوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے۔ یہاں کوئی گستاخی کا پہلو نہیں ہے کیونکہ علامہ نے ان فرشتوں کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مومن کے مقاصد بہت بلند' اعلیٰ اور ارفع و پاک ہوتے ہیں۔ معمولی مقاصد تو اس کی نظر کو پسند ہی نہیں آتے۔

مومن (جنت میں)

(اس سے پہلے حصہ میں زمین پر بسنے والے مومن کی بات کی ہے۔ نظم کے اس حصہ میں جو صرف ایک شعر پر مشتمل ہے۔ مومن کے بعد از وفات جنت میں جانے اور وہاں جا کر اس کے مقام کی بات ہے)۔

① **معانی:** دلاویز: دل کو لبھانے والا۔ کم آمیز: کم ملنے والا۔

مطلب: فرشتے یہ کہتے ہیں کہ مومن ایک دل آویز یا دل کو لبھانے والی شخصیت ہے۔ حوریں یہ کہتی ہیں کہ دوسروں کے مقابلے میں مومن ہم سے کم ملتا ہے یا بالکل نہیں ملتا مراد یہ ہے کہ مومن ایک انوکھی اور عجیب شے ہے جب جنت میں حوروں کے لئے اور جنت کی دوسری پر کشش چیزوں کے لئے آتے ہیں اور مومن ہے کہ وہ ان کی طرف دھیان بھی نہیں کرتا۔ اس کی تو صرف ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ دیدار ذات ہو جائے۔ وہ اپنے رب سے ملاقی ہونا چاہتا ہے۔ حوروں اور جنت کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔

محمد علی باب

تھی خوب حضورِ علما باب کی تقریر بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سمٰوٰت
اس کی غلطی پر علما تھے متبسم بولا تمہیں معلوم نہیں میرے مقامات

اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد
محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

تعارف: **محمد علی باب:** ایران کا ایک مذہبی پیشوا جس کا دعویٰ تھا کہ مجھے مہدی موعود کے آنے کے لئے زمین تیار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اپنے غلط دعویٰ پر اسے موت کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد بہا اللہ ایک شخص پیدا ہوا جس نے باب کے مذہب کی تبلیغ بھی کی اور اس میں ترمیم و اضافہ بھی کیا۔ اس کے ماننے والے لوگ آجکل بہائی کہلاتے ہیں۔

① **معانی:** **سموت:** سما کی جمع، آسمان۔ **اعراب:** زیر زبر پیش جو الفاظ پر لگائے جاتے ہیں۔

مطلب: جب محمد علی باب (بعض علی محمد نام بتاتے ہیں) نے غلط دعویٰ کیا تو اس وقت کے بادشاہ نے جس کا نام ناصر الدین قاچار تھا اسے علما کی مجلس میں تقریر کرنے کے لیے کہا تو اس سے قرآن کے ایک لفظ سمٰوت ہی کا تلفظ صحیح ادا نہ ہوا جس سے اس کی بے علمی کا پول کھل گیا۔

② **معانی:** **متبسم:** مسکراتے تھے۔ **مقامات:** جمع مقام کی، روحانی مرتبہ۔

مطلب: علما اس کے غلط تلفظ قرآن کو سن کر مسکرائے اس پر وہ کہنے لگا تم میرے روحانی مقامات کو نہیں جانتے۔ میں جو تلفظ کرتا ہوں، وہی صحیح ہے اور تم غلط ہو۔

③ **معانی:** **امامت:** امام ہونا۔ **تصدق:** طفیل۔ **محبوس:** قید۔ **آیات:** آیت کی جمع۔

مطلب: باب کہنے لگا چونکہ اب میں امام وقت ہوں اس لیے میں نے قرآن کے الفاظ کو اعراب (زیر، زبر، پیش) سے آزاد کر دیا ہے جس طرح جی میں آئے پڑھو۔ سب ٹھیک ہے۔ اور اعراب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے قرآنی الفاظ کو میری امامت کے طفیل آزادی مل گئی ہے۔ اسی پس منظر میں بابیوں (بہائیوں) نے قرآن کو بدل دیا ہے۔

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

ابلیس

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس

بعد! اے تیری تجلی سے کمالات وجود

یزداں

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے — کہتا ہے' تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

معانی: ابلیس و یزداں: ابلیس کے معنی شیطان اور یزداں کے معنی خدا کے ہیں۔ یہ نظم ان دونوں میں مکالمے کی صورت میں ہے۔

(ماخوذ از محی الدین ابن عربی)

ابلیس

①② **معانی: خدائے کن فکاں:** وہ خدا جس نے کن (ہو جا) کہا تو فکاں (سب کچھ ہو گیا یعنی جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ **بیر:** دشمنی۔ **زود:** جلدی۔ **استکبار:** غرور۔ **مشیت:** خدا کی مرضی/ارادہ، **زندانی:** قیدی، **سجود:** سجدہ کی جمع۔ مراد سجدہ کرنا،

مطلب: اے وہ خدا جس نے ساری کائنات اور اس میں جو کچھ ہے پیدا کیا ہے مجھے آدم سے کوئی دشمنی نہ تھی کہ تو نے جب مجھے حکم دیا کہ اسے سجدہ کرتو میں نے نہیں کیا۔ یہ دشمنی کی وجہ سے نہ تھا۔ مجھے اس سے دشمنی کی ضرورت ہی کیا تھی وہ تو خود نزدیک دور' جلدی اور دیر کے یعنی زمان و مکان کے گورکھ دھندے میں پھنسا ہوا ہے۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ قادر مطلق خدا کے سامنے میں انکار سجدہ کرتا یا اپنے آپ کو متکبر و مغرور ثابت کرتا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میرا سجدہ نہ کرنا تیری مرضی اور ارادے کے مطابق تھا۔

یزداں

مطلب: خدا شیطان کی اس صفائی پر جو اس نے مذکورہ بالا اشعار میں دی ہے اس سے پوچھتا ہے کہ یہ بھید جس کا تو اب ذکر کر رہا ہے تیرے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کے بعد کھلا یا تجھے اس کا پہلے ہی علم تھا۔

ابلیس

مطلب: اے وہ خدا! جس کی تجلی کی وجہ سے کائنات کا وجود قائم ہے' یہ بھید مجھ پر انکار سجدہ کے بعد کھلا۔

یزداں

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

معانی: **پستی فطرت:** فطرت کا پست ہونا' کمینہ فطرتی۔ **حجت:** دلیل۔ **مشیت:** خدا کی مرضی/ارادہ۔ **سجود:** سجدہ کی جمع' یہاں مراد ہے سجدہ کرنا۔ **شعلہ سوزاں:** جلا دینے والا شعلہ۔ **دود:** دھواں، **شعلہ:** آگ کی لپٹ۔

مطلب: خدا تعالیٰ شیطان کا جواب سن کر فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم نے اس کا جواب سن لیا۔ یہ اس کی کمینہ فطرت کو ظاہر کر رہا ہے۔ انکار سجدہ اس نے اپنی مرضی سے کیا اور اب بہانہ کر رہا ہے کہ اے خدا میں نے جو کچھ کیا ہے تیری مرضی سے کیا ہے یعنی تیرے ارادے اور مرضی میں اگر میرا آدم کو سجدہ کرنا ہوتا تو میں ضرور آدم کو سجدہ کرتا۔ ایسا نہ کرنا تیری مرضی سے ہوا ہے۔ وہ اپنی کردہ گناہی کو خدا کی تقدیر بنا کر پیش کر رہا ہے اور تقدیر کا غلط مفہوم بتا رہا ہے۔ شیطان سجدہ کرنے یا نہ کرنے میں آزاد تھا۔ میری طرف سے اس پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن اب وہ اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے رہا ہے۔ کتنا نادان اور بے وقوف ہے کہ اپنے جلا دینے والے شعلے کو خود ہی دھواں کہہ رہا ہے اور اپنی آزادی کو مجبوری بنا رہا ہے۔ یہ خیالات چونکہ علامہ نے مشہور صوفی (شارح وحدۃ الوجود) علامہ شیخ محی الدین ابن عربی سے لئے ہیں۔

اے روحِ محمد ﷺ

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا' تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذت آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے

ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

تعارف: علامہ مسلمانوں کے اس عقیدہ کے پیش نظر کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ظاہری موت سے ضرور گزرے ہیں لیکن حقیقت میں حیات النبی ﷺ ہیں یعنی پس پردہ موت زندہ ہیں اور جب چاہیں اور جہاں چاہیں اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کی بدولت اس دنیا میں تصرف بھی کر سکتے ہیں۔ اس عقیدہ کے پیش نظر علامہ روح محمد ﷺ سے جو کائنات میں جاری و ساری ہے خطاب کرتے ہیں۔

① **معانی:** **شیرازہ:** انتظام و ضبط۔ **ابتر:** برا' بکھر گیا۔ **ملت:** مسلمان قوم۔ **مرحوم:** لفظی معنی جس پر رحم کیا گیا ہو' یہاں مراد جو مردہ ہو گئی ہے۔

مطلب: اے روح محمد ﷺ وہ ملت (مسلمان قوم/ملت اسلامیہ) جو کبھی زندہ و تابندہ تھی۔ آزاد و حکمران تھی۔ آج اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور اس میں ہر قسم کا نظم و ضبط ختم ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں آپ ہی بتائیں کہ آپ کا امتی آپ کا مسلمان کیا صورت اختیار کرے' کیا قدم اٹھائے' کدھر جائے۔

② **معانی:** آشوب: شورش۔ **بحرِ عرب:** عرب کا سمندر' مراد ہے عرب قوم۔ **پوشیدہ:** چھپا ہوا۔

مطلب: میں دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے سمندر میں کوئی شورش اور کوئی طوفان نہیں ہے۔ یہ عرب قوم جو کہ یہ ساری دنیا پر چھائی ہوئی تھی آج سرد و افسردہ ہے۔ اور لذتِ سوزش سے محروم ہے۔ میرے سینے میں طوفان چھپا ہے جو بند پڑا ہے۔ وہ میں ان تک کیوں پہنچاؤں۔ وہ تو اس حد تک بے شور ہو چکے ہیں کہ میرا طوفان بھی ان میں کوئی حرکت پیدا نہیں کرے گا۔ میں اپنے طوفان کو کہاں لے جاؤں۔

③ **معانی:** راحلہ: سواری۔ **زاد:** سفر کا سامان۔ **کوہ و بیاباں:** پہاڑ اور صحرا یا بے آباد جگہ۔ **حدی خوان:** قافلہ کے آگے اونٹوں کو مست کرنے اور گرمِ سفر رکھنے والا گیت گاتا ہوا شخص۔ اقبالؒ حدی خوان خود کو کہتے ہیں اور اپنی شاعری کو حدی کہتے ہیں۔

مطلب: عرب کے پہاڑوں اور جنگلوں میں جو عرب ہیں وہ بے قافلے ہیں نہ ان کے پاس سواریاں ہیں اور نہ ان کے پاس سفر کا سامان ہے۔ مراد یہ ہے کہ عرب بالکل مفلس' بے آواز اور بے کار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان میں سے حدی خوان (قافلوں کے آگے گانے والے) بھی غائب ہو گئے ہیں یعنی ان کو دوبارہ زندہ قوم بنانے کے لیے ان میں کوئی راہبر بھی نظر نہیں آتا۔ اگر حدی خواں سے مراد خود اقبال اور حدی سے مراد اس کی شاعری لی جائے تو پھر معنی یہ ہوں گے کہ قافلہ والے کہیں گم ہیں تو میں ان کو اپنی شاعری سے جگاؤں جب قافلے ہی تتر بتر ہو چکے ہیں۔ تو میں کیا کروں۔

④ **معانی:** رازفاش کرنا: بھید کا کھولنا۔ **آیاتِ الٰہی:** اللہ کی آیات مراد قرآن۔ **نگہبان:** حفاظت کرنے والا۔

مطلب: اے روحِ محمد ﷺ اب تو اس بھید کو کھول کہ اللہ کی آیات (قرآن حکیم) کی حفاظت کرنے والا مسلمان اب کدھر جائے' کیا کرے۔ نہ اس کے پاس احکام قرآن کی حفاظت اور نفاذ کا ساز و سامان موجود ہے اور نہ ذوق و شوق باقی ہے۔ دعا کریں یا نظرِ کرم فرمائیں تاکہ مسلمان قوم پھر سے عروج حاصل کر لے اور نظامِ اسلام کی حفاظت اور اس کے نفاذ کے قابل ہو جائے۔

مدنیتِ اسلام

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے ۔۔۔ یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب ۔۔۔ یگانہ اور مثالِ زمانہ گونا گوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری ۔۔۔ نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی ۔۔۔ یہ زندگی ہے' نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال ۔۔۔ عجم کا حسنِ طبیعت' عرب کا سوزِ دروں

معانی: مدنیتِ اسلام: تمدن جو تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس نظم میں ایک مسلمان کی مثالی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

① **معانی:** نہایتِ اندیشہ: فکر کی آخری حد' عقل کی بلندی و رفعت۔ **کمالِ جنوں:** جنوں (عشق) کا کمال'

سودا کی حد تک عشق۔

مطلب: یاد رکھو مسلمان وہ ہے جس کی زندگی کے دو بنیادی اور بڑے جوہر ہیں۔ پہلا جوہر عقل کا ہے جو اس میں درجہ کمال تک ہوتی ہے اور دوسرا جوہر عشق کا ہے وہ بھی اس میں کمال کی اس حد تک ہوتا ہے کہ ہم اسے جنوں کہہ سکتے ہیں۔ مسلمان عقل اور عشق کے ان اعلیٰ و ارفع کمالات کا مجموعہ ہوتا ہے۔

② **معانی:** **طلوع:** سورج کا نکلنا۔ **مثالِ زمانہ:** زمانہ کی مانند۔ **گوناگوں:** رنگارنگ۔

مطلب: مسلمان ایک بے مثل و بے مثال شخص ہوتا ہے۔ زمانہ کی طرح رنگارنگ یعنی زمانے کے مطابق خود کو پورا اتار کر مگر اسلام کو نہ چھوڑتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا مرنا جینا، اس کا عروج و زوال اس کا زندگی میں کم و بیش ہونا برابر ہوتا ہے۔ جس طرح آفتاب (سورج) ادھر غروب ہوتا ہے ادھر طلوع ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمان بھی ادھر مرتا ہے ادھر عالم برزخ میں پھر نکل آتا ہے۔ ادھر اگر کم ہو گیا تو دوسرے لمحے اس کی کو پورا کر لیتا ہے۔ اس کا غروب و طلوع برابر ہے۔

③ **معانی:** **عصرِ رواں:** دورِ حاضر، مغربی تہذیب کا دور۔ **بیزاری:** نفرت۔ **عہدِ کہن:** پرانا زمانہ۔ **فسانہ و افسوں:** کتھا، جنتر منتر اور جادو۔

مطلب: مسلمان کی مدنیت (تہذیب / ثقافت اور تمدن) میں دورِ حاضر کی طرح حیا سے بیزاری نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک تو حیا نصف ایمان ہے۔ حیا ایک مسلمان خصوصاً مسلمان عورت کا بنیادی جوہر ہے۔ حیا اور ایمان کے اس تعلق کی بنا پر مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ میں حیا کارفرما ہوتی ہے اور نہ ہی مسلمان اپنی زندگی میں پرانی اساطیری کہانیوں اور افسانوں پر اعتقاد رکھتا ہے اور نہ وہ جادوگری کو مانتا ہے وہ تو صرف توحید و رسالت کا شیدائی ہے اس لیے اسلامی مدنیت جو ان دو محوروں یعنی توحید و رسالت کے گرد اور جو اصل میں ایک ہی مشترکہ محور کے دو جزو ہیں) گھومتی ہے۔

④ **معانی:** **حقائقِ ابدی:** ہمیشہ کی حقیقت۔ **اساس:** بنیاد۔ **طلسم:** جادو، **افلاطون:** افلاطون ایک یونانی حکیم تھا۔ جو زندگی کو وہم و خیال کہتا تھا۔

مطلب: مسلمان کے تمدن و ثقافت اور تہذیب کی بنیاد ان حقیقتوں پر ہے جو کبھی نہیں بدلتیں۔ اس میں زندگی کو ایک حقیقت (حقیقی شے) سمجھا جاتا ہے نہ کہ یونانی حکیم افلاطون کی طرح اسے وہم و خیال تصور کیا جاتا ہے۔ جو ایسا سوچے گا وہ دنیا سے گریز اور زندگی سے نفرت کرے گا لیکن جو زندگی کو حقیقت سمجھے گا وہ اسے ذمہ داری سے گزارے گا۔

⑤ **معانی:** **عناصر:** عنصر کی جمع (آگ، پانی، مٹی، ہوا وغیرہ) اجزائے ترکیبی۔ **روح القدس:** حضرت جبرئیل۔ **ذوقِ جمال:** نفاست اور پاکیزگی کا ذائقہ۔ **عجم:** غیر عرب۔ **حسنِ طبیعت:** طبیعت کا حسن۔ **سوزِ دروں:** اندر کا سوز، عشق۔

مطلب: اسلامی مدنیت کے اجزائے ترکیبی تین ہیں۔ ایک جز میں حضرت جبرئیل کے ذوق کا حسن پوشیدہ ہے۔ دوسرے جز میں عرب کے علاوہ جو قومیں ہیں، خصوصاً اہل فارس کی طبیعت کا حسن موجود ہے اور تیسرے جز میں عربوں کا سوزِ دروں (عشق کی حرارت) شامل ہے۔ مدنیت اسلام، جبرئیل کی روح کی

طرح پاکیزہ بھی ہے۔ اہل فارس کے طبائع کی طرح حسین بھی ہے اور عربوں کے دلوں کی طرح پرسوز و پرجوش بھی ہے۔

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

① **معانی: امامت**: امام ہونا، راہبر ہونا، قوم کا راہبر یا نماز میں پیشوا ہونا۔ **صاحب اسرار**: بھیدوں کا جاننے والا۔

مطلب: اے شخص تو نے مجھ سے قوموں کے راہبر ہونے کی حقیقت پوچھی ہے۔ یعنی یہ پوچھا ہے کہ جو شخص ملت کا امام بننے کے قابل ہے اس میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں۔ میں بتاتا ہوں۔ خدا کرے تو بھی میری طرح بھیدوں کا جاننے والا بن جائے۔

② **معانی: برحق**: سچا۔ **حاضر و موجود**: زمانہ حاضر۔ **بے زار کرے**: نفرت دلا دے۔

مطلب: تیرے زمانے (دور/عہد) کا سچا امام (راہبر قوم) وہی شخص ہو سکتا ہے جو تجھے عہد حاضر کی تمام قباحتوں سے بے زار کر دے اور تیرے دل میں مغربی تہذیب کی پیدا کردہ برائیوں کے مقابلے میں اسلامی اقدار و عقائد صحت کے ساتھ پیدا کر دے۔

③ **مطلب**: وہ امام برحق یہ خصوصیات بھی رکھتا ہو کہ تجھے موت کے پس پردہ حقیقت کا اور محبوب حقیقی کا چہرہ دکھا کر تیرا جینا مشکل کر دے اور تیرے اندر ہر وقت یہ خواہش رہے کہ میں شہادت کا مرتبہ پا کر جلد اپنے محبوب سے جا ملوں۔

④ **معانی: سان**: اوزار (تلوار/چاقو) تیز کرنے والا آلہ۔ **زیاں**: نقصان، **فقر**: درویشی، **لہو گرمانا**: حرارت پیدا کرنا، جوش پیدا کرنا۔

مطلب: امام برحق کی ایک اور خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ تجھے تیرے اس نقصان کا (جو مسلمانوں کو صدیوں سے پہنچ رہا ہے) احساس دلا کر تیرے لہو کو گرم کر دے اور تجھ میں اس نقصان کو پورا کرنے کا احساس پیدا کر دے اور تیری زندگی کو فقر کی سان پر چڑھا کر تلوار کی طرح تیز کر دے۔ ایسی تلوار بنا دے جو باطل کو کاٹ کر رکھ دے۔ فقر اقبال کے نزدیک وہ جوہر ہے جو مسلمان کو صحیح مسلمان بناتا ہے۔

⑤ **معانی: فتنہ**: فساد۔ **ملت بیضا**: روشن ملت، مسلمان قوم۔ **پرستار**: پوجنے والا، **پرستار**: پوجنے والا۔ **سلاطین**: سلطان کی جمع بمعنی بادشاہ۔

مطلب: وہ امام وہ راہبر قوم جو تجھے مندرجہ بالا خصوصیات کا مالک بنانے کی بجائے تجھے بادشاہوں، درباروں، وڈیروں، نوابوں وغیرہ کا پجاری بنا دے۔ اس امام کی قیادت اور راہبری روشن ملت (مسلمان

قوم) کے لیے فساد کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ آج کل کے اکثر دینی اور دنیاوی پیشواؤں کا حال ہے۔ ایسے شخص کی امامت فائدے کی بجائے نقصان کا سبب ہے۔

فقر و راہبی

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وا نمود اس کو
کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی
وجود صیرفیِ کائنات ہے اس کا
اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی
اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ
جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

معانی: فقر و راہبی: فقر کے لغوی معنی تنگ دستی کے ہیں لیکن اصطلاح میں فقر وہ جوہر ہے جو مسلمان کو محبوب حقیقی سے ملا کر دنیا کی ہر شے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں راہبی کا مفہوم دنیا کو ترک کرنا ہے۔

① **مطلب:** اگر تو صحیح مسلمان ہوتا تو فقر میں اور راہبی میں تمیز کر سکتا لیکن تجھ میں اسلام کی صحیح سوچ نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمیز ختم ہو چکی ہے اور تو عیسائیوں کے پادریوں اور ہندوؤں کے جوگیوں یوگیوں کی طرح مسلمان فقیر کو بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ بھی ان کی طرح تارک الدنیا ہی ہوتا ہے۔ یہ خیال فقر کے خلاف لوگ عام طور پر ظاہر کرتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمان کے فقر اور غیر مسلموں کے فقر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مسلمان کا فقر دنیا سدھار ہے۔ کافر کا فقر دنیا گریز ہے۔

② **معانی:** سکوں پرستی: آرام طلبی گوشہ گیری۔ سفینہ: کشتی۔

مطلب: سچا درویش (مسلمان فقیر) ہندوؤں اور عیسائیوں کے درویشوں کی طرح آرام طلب گوشہ گیر اور تارک الدنیا نہیں ہوتا بلکہ اس کی زندگی کی کشتی ہمیشہ طوفانوں سے کھیلتی رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ باطل سے ٹکراتا ہے۔ قوم کو بناتا ہے۔ افراد کو سلجھاتا ہے۔ دنیا پرست اور نفس پرست بھی نہیں ہوتا وہ اس دنیا کا باشندہ ہوتا ہے جو آخرت کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنتی۔ **الفقر فخری** (مجھے اپنے فقر پر فخر ہے) ایسے ہی فقر کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔

③ **معانی:** وا نمود: ظاہر کرنا۔ **نہایت مومن:** مومن کی انتہا۔ **عریانی:** ننگا پن۔

مطلب: غیر مسلم درویش بدن کو مارتے ہیں۔ مسلمان درویش بدن کو بھی قائم رکھتا ہے اور روح کی پرورش بھی کرتا ہے۔ وہ غیر مسلم درویشوں کی طرح بدن کی جائز ضروریات کو نہیں بھولتا۔ خودی بے نقاب صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب بدن اور روح دونوں کی ساتھ ساتھ پرورش ہو اس لیے مسلمان فقیر اپنی خودی کو عریاں کرتا ہے جب کہ غیر مسلم درویش خودی کو فنا کرتا ہے۔

④ **معانی:** وجود: ہستی۔ **صیرفی:** کھوٹا کھرا پرکھنے والا۔

مطلب: مسلمان، فقیر کائنات کا صیرفی ہے۔ جس طرح صراف سونے کو کسوٹی پر لگا کر بتا دیتا ہے کہ یہ کھوٹا ہے یہ کھرا ہے۔ اسی طرح مسلمان فقیر کائنات اور اس کی ہر شئے کو جانتا ہے کہ یہ کھوٹی ہے یہ کھری ہے۔ یہ حق ہے یہ باطل ہے۔ یہ باقی رہنے والی ہے یہ فنا ہو جانے والی ہے جب کہ غیر مسلم درویش اس بارے میں اندھا ہے۔ اس نے جب کائنات ہی ترک کر دی تو اس کے کھوٹے کھرے کو کیا سمجھے گا۔ اسے فانی و باقی کی کیا خبر ہو گی۔

معانی: طغیانی: طوفان۔ جہاں: دنیا۔ پیش نگاہ: نظر کے سامنے۔

⑤ **مطلب:** مسلمان درویش چونکہ کائنات اور اس میں پوشیدہ رازوں کو جانتا ہے۔ اس لئے تو اس سے ہی یہ پوچھ کہ جو کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہے یعنی جس کائنات کو ہم دیکھ رہے ہیں یہ حقیقی ہے یا محض رنگ و بو کی پر ہنگامہ تصویر ہے۔ رنگ و بو ہمیشہ اڑ جاتے ہیں۔ باقی نہیں رہتے۔ فقیر کی نظر میں کائنات کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل حقیقت اس کی اپنی ہے۔ اس کے خدا کی ہے۔ وہ اس کائنات (دنیا) کو ٹھکرا دیتا ہے جس کائنات (دنیا) کی قرآن مجید برائی کرتا ہے اور اپنے فکر اور اپنے عمل سے ایسی دنیا بناتا ہے جو دنیا ہوتے ہوئے دین بن جاتی ہے۔

⑥ **معانی:** دولت سلمانی: حضور ﷺ کے صحابی حضرت سلمان فارسی کی دولت، درویشی کی دولت۔ دولت سلیمانی: حضرت سلیمان پیغمبر کی دولت، بادشاہی، حکمرانی، شان و شکوہ۔

مطلب: جب سے مسلمانوں میں وہ فقر غائب ہوا ہے جس کی خصوصیات مذکورہ بالا اشعار میں بیان کی گئی ہیں اور مسلمانوں نے غیر مسلموں کا سا فقر اور پیشہ ور فقر بلکہ گدائی اختیار کر لی ہے اس وقت سے مسلمانوں میں نہ سلمانی شان رہی ہے اور نہ سلیمانی شکوہ رہا ہے یعنی نہ تزکیہ، تقویٰ، پرہیزگاری اور درویشانہ شان رہی ہے اور نہ دنیاوی شان و شکوہ جہانبانی اور حکمرانی باقی رہی ہے۔

غزل

تیری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور — میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور
معجزۂ اہلِ فکر، فلسفۂ پیچ پیچ — معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰؑ و فرعون و طور
مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے — تیرے نفس میں نہیں، گرمیِ یوم النشور
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا — تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور
فیضِ نظر کے لیے ضبطِ سخن چاہیے — حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور
خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم — عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

① **معانی:** متاع حیات: زندگی کا سرمایہ۔ سرور: خوشی اور مستی۔ ناصبور: صبر نہ کرنے والا۔

مطلب: شاعران لوگوں کا جو عقل و فن میں مگن ہیں اور ان لوگوں کا جو بے قرار دل رکھتے ہیں میری اور تیری کے الفاظ میں موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم کو اپنے علم، اپنے ہنر اور اپنے فن پر ناز ہے اور تم ان میں مست و مسرور ہو جب کہ میں ایک بے قرار دل کی دولت پر خوش ہوں۔ دل بے قرار اس لیے ہے کہ مجھ میں عشق ہے اور دولت عشق دولت علم پر فائق ہے۔

معانی : معجزہ : خوارقِ عادت بات، **اہلِ فکر** : اہلِ عقل و دانش، فلسفہ پیچ پیچ ؛ اُلجھا دینے والی عقل، **اہلِ ذکر** : اللہ کو یاد کرنے والے، مردِ درویش **طور** : وادیِ سینا میں ایک پہاڑ کا نام، **موسیٰ** : ایک پیغمبر کا نام، **فرعون** : موسیٰ کے زمانے کا ظالم بادشاہ۔

② **مطلب** : انہی دو طبقوں کا جن کا پہلے شعر میں بیان ہے علامہ اہل فکر اور اہل ذکر کے دو نئے ناموں سے ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکیم، فلسفی، سوچ بچار کرنے والے لوگ معاملات کو مزید الجھا دیتے ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ یا اعجاز یہ ہے کہ وہ فکر کے ایسے پیچ ڈالتے ہیں کہ حقیقت ہاتھ نہیں آتی ان کے مقابلے میں جو اہل ذکر ہیں جو خدا کے ذکر میں مگن ہوتے ہیں جو انبیاء اور اولیاء ہیں وہ ایسے ایسے معجزات اور ایسی ایسی کرامات دکھاتے ہیں کہ الجھے ہوئے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ذرا حضرت موسیٰ، فرعونِ مصر اور کوہ طور سے متعلقہ حکایات کو دیکھ لیجیے ایک نبی فقیر نے کس طرح شاہ مصر کی فرعونیت کو شکست دی کس طرح کوہ طور پر اللہ سے ہم کلام ہوئے کس طرح بنی اسرائیل کو فرعون سے چھڑوایا اور کس طرح فرعون جیسے جابر بادشاہ کو لشکر سمیت دریائے نیل میں غرق کروا دیا تو پھر اہل ذکر (فقرا اور درویش) اچھے ہوئے یا فلسفی اور اہل فکر و علم!

③ **معانی** : **مصلحتاً** : مصلحت کے تحت۔ **نفس** : سانس۔ **گرمیِ یوم النشور** : قیامت کے دن کی گرمی۔

مطلب : علامہ آج کے بے عمل اور نام کے مسلمان کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں مصلحت کے تحت تجھے مسلمان کہتا ہوں ورنہ تجھ میں مسلمانی کی کوئی بات باقی نہیں ہے۔ مسلمان تو وہ ہوتا ہے جس کی ایک ایک سانس میں قیامت کے دن کی گرمی، ہنگامہ، اور شور برپا ہو جو سراپا جوش عمل ہو جس کے ہر فعل، ہر عمل اور ہر اقدام میں اسلام کی روح ہو۔

④ **معانی** : **چاکِ گریباں** : کرتے کے گریباں کا پھٹ جانا، عشق کا ہونا۔ **جنوں** : عشق سودا کی حد تک / ایسا سودا جو خوش سودا ہو / عشق کی انتہا۔

مطلب : میرا گریبان تو مدت سے چاک ہے، تار تار ہے۔ عشق مجھے ایک مدت سے تڑپا رہا ہے لیکن تو ابھی عشق سے نا آشنا ہے۔ تیرا گریباں چاک نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے انتہائی عشق (جنوں) کے ذریعے تجھے بھی عشق کی دولت سے مالا مال کرنا چاہا تھا لیکن اے آج کے مسلمان تجھ پر کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس میں میرے جنوں کا تو کوئی قصور نہیں۔ تو دیکھ تیرے اندر کیا کمی ہے۔

⑤ **معانی** : **ضبطِ سخن** : قوتِ گویائی پر پابندی، کم بولنا، نہ بولنا۔ **فیضِ نظر** : نگاہ کی برکت، **اہلِ نظر** : نظر والے یعنی درویش لوگ، **حضور** : سامنے، **حرف** : بات۔

مطلب : علم کا فیض اور ہے نظر اور صحبت کا فیض اور ہے۔ علم بے فیض ہوتا ہے۔ کسی اہل نظر کی نظر جو فیض (فائدہ / بھلائی / انسان کی اندرونی طبیعت کو بدل دینے کا عمل) پہنچاتی ہے وہ صرف واقف راز ہی جانتے ہیں۔ اس لیے اہل نظر کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کے لیے خاموشی بہتر ہے۔ خواہ مخواہ ان کے حضور، بے کار باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ہاں ضروری بات ہو تو ضرور کی جائے۔ صاحب نظر خود ہی بھانپ لے گا کہ طالب کی طلب کیسی ہے اور کتنی ہے اور وہ اس کے مطابق فائدہ / بھلائی پہنچائے گا۔

⑥ معانی: معانی خوار: ذلیل۔ جسور: دلیر۔ غیور: غیرت والا۔ فقر: درویشی۔

مطلب: وہ قوم (خاص طور پر مسلمان قوم مراد ہے) دنیا میں ذلیل نہیں ہو سکتی جس کے افراد کا عشق دلیر اور درویشی غیرت والی ہو۔ آج مسلمان قوم کی ذلت کا سب اس میں ان دو خصوصیات کا مفقود ہو جانا ہے۔ عشق کی جگہ علم نے لے لی اور فقر کی جگہ گدائی آ گئی۔

تسلیم و رضا

شاخ سے یہ نکتہ پیچیدہ ہے پیدا ۔۔۔ پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا ۔۔۔ ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشوونما کا
رت کے تقاضوں پہ نہ کر راہ عمل بند ۔۔۔ مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا
ات ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے ۔۔۔ اے مردِ خدا! ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

انی: تسلیم و رضا: خدا کی مرضی (رضا) کے آگے اپنی مرضی چھوڑ دینا اور اس کی مرضی کے آگے سر خم کر دینا۔

① معانی: نکتہ پیچیدہ: پیچیدہ اور باریک بات۔ پیدا: ظاہر۔ پہنائے فضا: فضا کی وسعت۔

مطلب: پودوں اور درختوں پر غور کرو تو پتہ چلے گا کہ ان کی شاخوں کو بھی فضا کی وسعت کا احساس ہے۔ یہ پیچیدہ قسم کی بات ان کی فضا میں قوت نمو سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ وہ بڑھنا چاہتی ہیں۔ پھیلنا چاہتی ہیں۔

② معانی: ظلمت کدہ خاک: مٹی کا تاریک گھر۔ شاکر: شکر کرنے والا، مطمئن۔ نشوونما: بڑھنا، پھلنا پھولنا۔

مطلب: پودے کا جو بیج ہوتا ہے وہ مٹی کے تاریک گھر میں یعنی مٹی کے نیچے دبا ہوا ہوتا ہے لیکن پھلنے پھولنے کی خواہش اسے مٹی سے باہر بطور شاخ لے آتی ہے اور پھر وہ اسی پر مطمئن نہیں رہتا بلکہ مزید بڑھنے کے لیے اور شاخیں نکالتا ہے اور اس طرح پودا پھولتا پھلتا اور پھیلتا رہتا ہے۔

③ معانی: فطرت: جبلت، قدرت۔ تقاضے: ضرورتیں۔ راہ عمل: عمل کا راستہ۔

مطلب: جس طرح پودا قدرت کے تقاضے اور ضرورتیں پوری کرتا ہوا بیج سے پودا بن جاتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے اس طرح اے انسان تو بھی ضرورتوں کے مطابق بڑھ اور پھل پھول۔ تسلیم و رضا کا جو مقصد تیرے ذہن میں ہے کہ جو کچھ ہونا ہے ہوتا رہے گا اور خود ہاتھ پاؤں نہ ہلانا یہ تسلیم و رضا کا غلط مفہوم ہے۔ بات عمل سے بنتی ہے۔ عمل کر، نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔

معانی: جرأت: دلیری، حوصلہ۔ تنگ: محدود۔ مردِ خدا: اللہ کا مرد وہ جو اللہ کا ہو جائے۔ نمو: ظاہر ہونا۔ بڑھنا۔ پھلنا پھولنا۔

④ مطلب: اگر تجھ میں پھلنے پھولنے کی آرزو ہے اور جرأت ہے تو دیکھ جس طرح پودے کے لئے فضا تنگ نہیں ہے اسی طرح تیرے لیے بھی فضا تنگ نہیں ہے اور خدا کا ملک بھی تنگ نہیں تو جس طرح چاہے اور

جیسے چاہے اپنی نشوونما کر سکتا ہے۔ تسلیم و رضا کا جو مفہوم تیرے ذہن میں ہے کہ کچھ نہ کرو خود بخود سب کچھ ہو جائے گا وہ غلط ہے۔ تسلیم و رضا کا اصل مفہوم تو خدا کی مرضی کے مطابق جینے کا ہے' نہ کہ بے عمل ہونے کا۔

نکتہ توحید

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے — طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے
سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے — تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے
جہاں میں بندۂ حر کے مشاہدات ہیں کیا — تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے
مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے — روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

معانی: نکتہ توحید: خدا کے سوا کسی کو معبود اور پروردگار نہ ماننے میں کیا باریک بات یا راز ہے۔

① **مطلب:** توحید میں جو باریک بات یا جو رمز ہے اس کو سمجھانا مشکل تو نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اے شخص تیرا دماغ غیر خدا کے بتوں سے بھرا ہوا ہے۔ کہیں دولت کا بت' کہیں حرص کا بت' کہیں غرض کا بت کہیں شہوت کا بت غرضیکہ کئی بت تیرے دماغ میں موجود ہیں جب تک تو اپنے دل و دماغ کو ان سے صاف نہیں کرے گا خدا کے ایک ہونے یا اس کے معبود برحق ہونے یا صرف اسی کے پروردگار ہونے کی بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

② **معانی:** لا الہ: کلمہ طیبہ۔ **فقیہانہ:** عالمانہ۔

مطلب: کلمہ طیبہ یا کلمہ توحید یا خدا کے سوا کسی اور کے الہ (پروردگار / معبود) نہ ہونے کی رمز عاشقانہ جذبہ سے سمجھی جا سکتی ہے۔ عالم دین تو اسے دلیلوں اور منطق اور دوسرے علمی ذرائع سے سمجھاتا ہے اس طرح توحید کی رمز سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس کے لیے شوق اور عشق درکار ہے ایسا ایمان درکار ہے جو عشق کی حد تک پختہ ہو۔

③ **معانی:** **سرور:** مستی' مزہ' لطف۔ **حق و باطل:** سچ اور جھوٹ' کفر و اسلام۔ **کارزار:** جنگ۔ **حرب و ضرب:** جنگ کرنا۔ ایک دوسرے کو مارنا۔

مطلب: سچ اور جھوٹ یا کفر و اسلام کی جنگ میں جو لطف اور مزہ ہے اگر تجھے جنگ کے سازوسامان اور طریقہ کار کا ہی علم نہ ہو تو ہم کیا کہیں۔ اس لطف کا علم تو صرف اس کو ہو سکتا ہے جو باطل سے لڑنا جانتا ہو۔ اور حق کی تلوار سے اس پر فتح یاب ہونے کی لذت سے آشنا ہو۔

④ **معانی:** بندہ حر: آزادی کا بندہ' آزاد شخص۔ **مشاہدات:** مشاہدہ کی جمع۔ کسی شے کو دیکھ لینا۔

مطلب: آزاد بندہ جو کچھ دیکھتا ہے اور جو کچھ اس کے تجربے میں آتا ہے میں تجھ سے کیا بیاں کروں۔ بیان اس لیے نہیں کر سکتا کہ تیری نظر غلامی آشنا ہے اور تو آزادی کے حرف سے ناواقف ہے۔ غلام کے ذہن میں آزادی اور اسکی ادا کی بات نہیں سما سکتی۔

⑤ **معانی:** **فقر:** درویشی' تصوف۔ **روش:** راستہ' طریقہ۔

مطلب: دنیا دار لوگ بادشاہی' امیری اور حاکیت کی آرزو رکھتے ہیں۔ انہیں کیا خبر ہے کہ مسلمان

رویش کی فقیری کا مقام بادشاہی سے کتنا اعلیٰ اور ارفع ہے۔ فقر (درویشی) کی یہ بات اس درویش کی سمجھ
ں آ سکتی ہے جو بھکاری نہ ہو دنیا کا گداگر نہ ہو بلکہ دنیا سے بے نیاز صرف خدا کا ہو گیا ہو۔ فقر حقیقت
ں یہی ہے۔ اس کے برعکس گداگری ہے۔ دنیاداری ہے۔

الہام اور آزادی

و بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی ہو جاتی ہے خاکِ چمنستاں شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اس مردِ خود آگاہ خدا مست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

معانی: الہام: خدا کی طرف سے کسی بات کا بندے کے دل و دماغ میں آنا۔

① معانی: مہمیز: ایڑ، میخ والی ایڑ بھی جو گھڑ سوار گھوڑے کو دوڑانے کے لیے مارتے ہیں۔ فکر: سوچ، عمل: کام

مطلب: اگر کوئی شخص آزاد ہو اور پھر وہ کہے کہ میرے ذہن میں خدا کی طرف سے یہ بات آئی ہے تو اس کی بات سننے والوں کے فکر اور عمل کے گھوڑے پر ایڑ کا کام کرے گی۔ اس سے اس میں فکر کی صحت اور عمل کی راستی پیدا ہو گی۔

② معانی: نفسِ گرم: گرم سانس۔ تاثیر: اثر ہونا۔ چمنستان: باغ۔ شرر آمیز: جس میں چنگاری ملی ہوئی ہو۔

مطلب: آزاد شخص کا الہام اس کے سانس میں گرمی آزادی و عمل پیدا کر دیتا ہے اور اس کے سانس کی آواز سے سننے والوں کے دل و دماغ پر بھی ایسا اثر پیدا ہوتا ہے کہ ان میں بھی حرارت اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور بے عمل، باعمل بن جاتے ہیں۔ یوں کہیے کہ آزادی والے شخص کی الہامی تاثیر سے اس کی سانس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ باغ میں بھی جہاں ہو چنگاریاں پیدا کر دیتا ہے یعنی لوگوں کے دلوں کی مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اور حرارت شوق پیدا کر کے ان کو عمل کی صحیح راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔

③ معانی: شاہیں: باز۔ نمودار: ظاہر۔ مرغانِ سحر خیز: صبح کو اٹھنے والے پرندے۔

مطلب: ایسے شخص کے الہام سے جو کہ آزاد ہوتا ہے۔ بلبل میں باز کی سی طاقت اور انداز آ جاتا ہے۔ دیکھئے اس شخص کے فیضان سے صبح اٹھنے والے پرندے کس حد تک بدل جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ پست ہمت بلند حوصلہ، بے عمل، عمل والے اور بے شوق، شوق والے بن جاتے ہیں۔

④ معانی: خود آگاہ: اپنی معرفت رکھنے والا۔ گدا: بھکاری۔ شکوہ: جلال۔ جم: پورا نام جمشید، ایران کا ایک بادشاہ۔ پرویز: پورا نام خسرو پرویز، ایران کا ایک بادشاہ۔

مطلب: جو یہ آزاد شخص الہام کا علم بردار ہوتا ہے۔ وہ اپنی معرفت بھی رکھتا ہے اور خدا میں بھی مست

رہتا ہے۔ ایسے خود معرفت اور خدا مست شخص کی صحبت کی تاثیر سے بھکاری میں ایران کے جمشید اور پرویز جیسے بادشاہوں کا جلال اور شکوہ آجاتا ہے۔

⑤ **معانی**: **غارت گر اقوام**: قوموں کو تباہ و برباد کرنے والا۔ **صورت**: مانند۔ **چنگیز**: منگولوں کا مشہور بادشاہ جو اپنی بربریت اور ظلم و ستم کے لیے مشہور ہے۔

مطلب: آزاد شخص کے الہام کی صفات بیان کرنے کے بعد علامہ محکوم شخص کے الہام کی بات کرتے ہیں کہ محکوم شخص اگر صاحب الہام ہو تو اس سے بچنا چاہیے کیونکہ صحیح اور حقیقی الہام تو ہمیشہ خود آگاہ، خدا مست اور آزاد شخص کو ہوتا ہے۔ غلام کا الہام خود ساختہ اور فریب بھرا ہوتا ہے جس سے قوموں میں اس قسم کی تباہی اور بربادی پھیلتی ہے جس طرح کبھی ظالم چنگیز نے پھیلائی تھی۔

جان و تن

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی روح کس جوہر سے خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے
میری مشکل! مستی و شور و سرور و درد و داغ تیری مشکل؟ مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے
ارتباط حرف و معنی؟ اختلاطِ جان و تن؟ جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

① **معانی**: **پیچاک**: الجھاؤ، عقدہ۔ **جوہر**: اصلیت، اصل۔ **خاک تیرہ**: کالی مٹی، تاریک مٹی یعنی انسانی جسم۔

مطلب: عقل ایک مدت سے اس الجھاؤ میں پھنسی ہوئی ہے کہ انسانی روح کی اصل کیا ہے اور انسانی جسم (جو کیچڑ کی مٹی کا بنا ہوا ہے) اس کی اصل کیا ہے۔ اور وہ آج تک اس عقدہ کو حل نہیں کر سکی۔

معانی: **مے**: شراب، **ساغر**: پیالہ، **شور**: ہنگامہ، **درد**: رنج، **داغ**: زخم۔ دھبہ، **سرور**: لطف، **مستی**: نشہ، بیخودی۔

② **مطلب**: علامہ خود کو صاحب عشق کہتے ہوئے عقل پسند کو (میری اور تیری کے الفاظ میں) یہ بات کہہ رہے ہیں کہ میں جو صاحب عشق ہوں میں تو اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ مجھ میں مستی، لطف، اور غم اور داغ کی جو صورتیں پیدا ہو رہی ہیں یہ کس وجہ سے ہیں اور تو اے عقل پسند اس بات میں الجھا ہوا ہے کہ پیالہ شراب سے ہے یا شراب پیالے سے ہے۔ یعنی میں تو سمجھ چکا ہوں کہ لطف و مستی اور درد و داغ کی ساری کیفیات روحانی ہیں۔ روح کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں لیکن تو اے عقل پسند ابھی اس مخمصے میں پھنسا ہوا ہے کہ روح بدن سے ہے کہ بدن روح سے ہے۔

③ **معانی**: **ارتباط حرف و معنی**: حرف و معنی میں میل جول (تعلق)۔ **اخگر**: چنگاری۔ **قبا پوش**: لباس پہنے ہوئے۔ **خاکستر**: راکھ۔

مطلب: اگر اے شخص تو روح اور بدن میں تعلق اور میل جول کی بات سمجھنا چاہتا ہے تو پہلے حرف اور معنی کے میل جول کی بات سمجھ لے۔ جس طرح حرف نہ ہو تو معنی کہاں سے ہوں گے۔ اسی طرح اگر روح نہ ہو تو بدن کہاں ہو گا۔ جس طرح حرف اور معنی میں تعلق ہے اسی طرح روح اور جسم میں تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ روح کے بغیر بدن کا اور بدن کے بغیر روح کا ہونا (ایک زندہ انسان میں) ناممکن ہے۔ اس لیے ہمیں جان و تن دونوں کی پرورش کرنی چاہیے۔ راہبوں کی طرح تن کو

بھلا دینا اور جان پر توجہ رکھنا یا دنیادار کی طرح تن پر توجہ صرف کرنا اور روح کو خاطر میں نہ لانا درست نہیں ہے۔ درست وہی ہے جو اسلامی تصوف (فقر/درویشی) بتاتا ہے وہ بتاتا ہے کہ روح اور جسم دونوں اللہ کے انعامات میں سے ہیں۔ دونوں کی ان کے جائز تقاضوں کے مطابق پرورش کرنی چاہیے۔

لاہور و کراچی

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور   موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ   قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں   حرفِ **لا تدع مع اللہ الٰھا آخر**

① **معانی:** مسلمان غیور: غیرت مند مسلمان۔ عالم معنیٰ کا سفر: باطنی سفر۔

مطلب: غیرت مند مسلمان ہمیشہ اور ہر کام میں اپنی نظر اپنے اللہ کی طرف رکھتا ہے۔ غیر اللہ کی طرف نظر نہیں اٹھاتا۔ علامہ کہتے ہیں یہاں یہ بھی بتا دوں کہ موت کیا چیز ہے۔ یہ ایک باطنی سفر کا نام ہے۔ آدمی اس جہان سے اگلے جہان کی جانب روحانی طور پر سفر کر جاتا ہے۔ اس موت کے پیچھے ان چند مسلمان شہدا کا ذکر ہے جنہوں نے چند ہندوؤں کو اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کہ انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے متعلق توہین آمیز کتابیں لکھی تھیں۔ ان شہدا میں سے ایک لاہور کا غازی علم دین تھا اور دوسرا کراچی کا عبداللہ۔ اقبالؒ نے ان کی شہادت کو ایسی موت کہا ہے جیسے کوئی ایک جگہ سے باطنی طور پر دوسری جگہ سفر کر لے۔ مسلمان جو ان کی اموات کا صلہ انگریز سے مانگتا ہے' اقبالؒ کے نزدیک یہ مسلمان کی غیرت کے خلاف ہے۔ شہادت کا بدلہ تو خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور شہید زندہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ ان دونوں مجاہدوں کو انگریز نے عدالتوں کے ذریعہ پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔ ان کا تعلق چونکہ لاہور اور کراچی سے تھا۔ اس لیے اقبالؒ نے نظم کا عنوان ہی کراچی اور لاہور رکھا ہے۔

② **معانی:** دیت: خون بہا۔ اہل کلیسا: اہل گرجا' انگریز' عیسائی۔ خون حرم سے بڑھ کر: ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے کعبہ کے طواف کے دوران فرمایا تھا کہ اے حرم کعبہ تو اللہ کو سب سے پیارا ہے۔ لیکن مسلمان کا خون تجھ سے بھی زیادہ پیارا ہے۔

مطلب: اے مسلمان جب تمہیں اس حدیث قدسی کا علم ہے کہ مسلمان کا خون اللہ کو حرم سے بھی زیادہ پیارا ہے تو علم دین غازیؒ اور عبداللہ غازیؒ کا خون بہا تو انگریز سے کیوں مانگ رہا ہے؟ ان کی شہادت کی انگریز کیا قیمت یا بدلہ دے گا شہادت محض روحانی طور پر اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف سفر کا نام ہے۔ اور وہ اپنے اللہ کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بڑا ان کے لئے اور کیا صلہ ہو سکتا ہے۔

معانی: آہ: افسوس ہے، **حرف:** بات، کلام' آیت' **مرد مسلمان:** مسلمان شخص' **آخر:** انجام۔

③ **مطلب:** اے مرد مسلمان انگریز سے خون بہا مت مانگ کیا تجھے اللہ کا یہ حکم یاد نہیں کہ مت پکار اللہ کے سوا دوسرے کو۔ علامہ نے اشارۃ" اتنی بات کی ہے پوری یوں ہے " اور مت پکار اللہ کے سوا دوسرے کو۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں ہے۔ اللہ کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے۔

والی ہے اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم پھر کر جاؤ گے"۔(یہ قرآن کی سورت عنکبوت کی آخری آیت ہے)۔

نبوت

میں نہ عارف، نہ مجدد نہ محدث، نہ فقیہہ　　مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر　　فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے　　یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش　　جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

معانی: عارف: خدا کی معرفت رکھنے والا، درویش: ولی، **مجدد**: جو دین کی تجدید کرے، **محدث**: حدیث کا عالم، حدیث: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، **فقیہہ**: فقہ جاننے والا، دین کا عالم، **نبوت**: نبی ہونا، اللہ کی طرف سے پیغمبر ہونا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں، میں چونکہ نہ عارف (اہلِ معرفت میں سے) ہوں۔ نہ میں مجدد (دین کو زندہ اور تازہ کرنے والا ہوں) نہ میں محدث (حدیث کو جاننے والا ہوں) اور نہ میں فقیہہ (شرع کے علوم کا عالم) ہوں اس لیے میں کیا بتا سکتا ہوں کہ نبوت کیا ہے اور اس کا مرتبہ کیا ہے۔

② **معانی**: **فاش**: کھلا، ظاہر۔ **ضمیرِ فلکِ نیلی فام**: نیلے رنگ والے آسمان کا ضمیر۔ ضمیر: دل، **ہاں**: البتہ

مطلب: اگرچہ میں محدث، فقیہہ، مجدد اور عارف نہیں ہوں مگر ایک بات مجھ میں ضرور ہے اور وہ یہ کہ میں ممالک اسلام پر گہری نظر رکھتا ہوں یہ نیلے رنگ کا آسمان جو کچھ اپنے دل میں چھپائے بیٹھا ہے وہ مجھ پر ظاہر ہے۔ البتہ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ممالک میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

③ **معانی**: **عصرِ حاضر**: موجودہ زمانہ۔ **شبِ تار**: اندھیری رات۔ **صفت**: مانند۔ **ماہ تمام**: پورا چاند۔

مطلب: موجودہ زمانے کی اندھیری رات میں، میں نے ایک حقیقت چودھویں رات کے پورے چاند کی طرح دیکھی ہے۔ یعنی ایسی حقیقت جس میں کسی قسم کا کوئی شائبہ اور شک نہیں ہے۔ یہ حقیقت اگلے شعر میں بیان ہوئی ہے۔

④ **معانی**: **برگِ حشیش**: بھنگ کے پتے، جو سلا دینے والا نشہ رکھتے ہیں۔ **قوت**: طاقت، **شوکت**: بلند، دبدبہ

مطلب: وہ نبوت پیغام مسلمان کے لیے بھنگ کے سلا دینے والے نشہ کی مانند ہے۔ جس میں قوت، شکوہ، دبدبہ اور جلال کا پیغام نہ ہو۔ سب انبیا اپنے مدمقابل فرعونوں اور نمرودوں کے لیے باوجود فقر کے اپنی ہی شان و شکوہ رکھتے تھے لیکن پنجاب (ہندوستان) کے قصبہ قادیاں میں ایک غلام احمد نامی شخص نے ایسی نبوت کا دعویٰ کیا جس میں جہاد کو حرام قرار دے دیا گیا ہے اور اس طرح نبیوں کے اندر موجود فقیرانہ شان و شکوہ اور جلال سے انکار کیا ہے اور لوگوں کو انگریز حاکم کا پرستار بنانے کی کوشش کی ہے۔

آدم

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم — خدا کا راز ہے، قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر — مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں — وجودِ حضرتِ انساں، نہ روح ہے، نہ بدن

① **معانی: طلسم**: جادو۔ **بود و عدم**: ہونا اور نہ ہونا، ہستی اور نیستی۔ **راز**: بھید۔ **قادر نہیں**: قدرت نہیں رکھتا۔ **سخن**: بات، کلام۔

مطلب: آدم جس کا نام بود و عدم (ہستی و نیستی/ہونا یا نہ ہونا) کا جادو ہے یعنی جو پہلے وجود میں آتا ہے اور پھر مر جاتا ہے اور اس کی جگہ اور آدمی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ راز ایسا ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خدا کا بھید ہے جس کو بیان کرنے کی طاقت میرے کلام میں نہیں ہے۔

② **معانی: صبحِ ازل**: زمانہ کے آغاز سے۔ **تگ و دو**: بھاگ دوڑ۔ **کہن**: پرانا۔ **محوِ سفر**: سفر میں مگن۔

مطلب: زمانہ اپنے آغاز سے لے کر اب تک سفر میں لگا ہوا ہے۔ آدمی بھی اس زمانے کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ ایک مرتا ہے تو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے روز کی طرح وہ نیا معلوم ہوتا ہے اور ہر نئی منزل پر نئے نئے افکار کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ آدمی باوجود صدیوں سے ہونے کے نیا ہی ہے۔ زمانے کی بھاگ دوڑ اور سفر سے یہ پرانا نہیں ہو سکا۔

معانی: وجودِ ہستی: حضرتِ انسان، آدمی۔ **بدن**: جسم۔ **روح**: جان، جاں۔ **مرکب**: ایک لطیف جان جو سوائے آدمی کے کسی اور میں نہیں۔

③ **مطلب**: اے قاری اگر تجھے کوئی الجھن نہ ہو تو تجھے صاف صاف بتا دوں کہ باوجود ان باتوں کے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ انسان کوئی اور ہی شے ہے۔ نہ اس کے بدن کو انسان کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کی روح کو۔ اور نہ دونوں کے امتزاج کو۔ اس کی حقیقت کو اہلِ راز اور صاحبِ نظر ہی جانتے ہیں۔ وہ خلیفۃ الارض اور نائبِ خدا ہے علم الاکلام کا حامل ہے اور مظہرِ صفاتِ الٰہیہ ہے اگر وہ ایسا نہیں تو آدمی نہیں کچھ اور ہے۔

مکہ اور جنیوا

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

معانی: مکہ وہ شہر جہاں بیت اللہ شریف ہے۔ جنیوا یورپ کے ملک سوئٹزرلینڈ کا دارالحکومت ہے جہاں پہلی جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ متحدہ کا دفتر بنا تھا۔

① **معانی: وحدتِ آدم**: جملہ آدمیوں کا ایک ہونا۔ **دور**: عہد، زمانہ۔ **صحبت**: میل جول۔ **پوشیدہ**: چھپی ہوئی۔

مطلب: اقوامِ متحدہ بنانے کا مقصد محض قوموں میں میل جول پیدا کرنا تھا جس سے علامہ کے نزدیک کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ اصل کام قوموں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنا ہونا چاہیے تھا جو کہ اسلام کا مقصود ہے۔ مگر اس جمعیت کا کام تو بڑی قوموں کا آپس میں مشورہ کر کے چھوٹی قوموں کی لوٹ کھسوٹ کرنا تھا۔

② **معانی: تفریق ملل:** قوموں میں نفاق ڈالنا۔ **حکمت افرنگ:** یورپی اقوام کی حکمت۔ **مقصود:** مطلوب **ملتِ آدم:** جملہ آدمیوں کا ایک قوم ہونا۔ **فقط:** صرف

مطلب: اس اقوام متحدہ کا اصل مقصد یورپ کی اقوام کا قانونی منظوری لے کر چھوٹی اور ماتحت قوموں میں نفاق ڈالنا تھا نہ کہ ان میں اتحاد پیدا کرنا اس کے مقابلے میں اسلام کی حکمت اور فلسفہ یہ ہے کہ سب اقوام چونکہ ایک آدم کی اولاد کے افراد پر مشتمل ہیں اس لیے ان میں اتفاق' اتحاد اور یگانگت پیدا کرنی چاہیے۔

③ **مطلب:** مکہ نے (یعنی اسلام نے) دنیا والوں خصوصاً اہل یورپ کو جو جنیوا میں اقوام متحدہ بنائے بیٹھے تھے یہ پیغام دیا ہے کہ اقوام متحدہ کا اصل کام قوموں اور ان کے افراد میں اتفاق پیدا کرنا ہونا چاہیے اور ایک آدم کی اولاد کی حیثیت سے ان میں اتفاق اور یگانگت پیدا کرنی چاہیے نہ کہ محض آپس کا رسمی میل جول۔ ظاہر میں ملاپ اندر سے نفاق۔ ظاہر میں انصاف اندر سے لوٹ کھسوٹ۔ مراد یہ ہے کہ دنیا کی سب اقوام میں اگر کسی کے پاس اتحاد کے رشتے کا اور جنگ اور نفاق سے گریز کا پیغام ہے تو وہ صرف مسلمانوں (اسلام کے) پاس ہے۔ اے کاش مسلمان ہی آپس میں اکٹھے ہو کر اس پیغام کا عملی مظاہرہ دنیا کو دکھا دیتے۔ لیکن وہ خود تفریق اور تقسیم کا شکار ہیں۔

اے پیر حرم

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی' خود نگری کا

تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

کہہ جاتا ہوں میں زورِ جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

معانی: پیر حرم: حرم کا پیر' مکہ کا پیر' مراد عالم دین یا مسلمانوں کا راہنما۔

① **معانی: پیر حرم:** مسلمان راہنما۔ **خانقہی:** مراد خانقاہی' یہاں مراد ترکِ دنیا سکھانے کا مقام۔ **نوائے سحری:** صبح کی آواز' میری صبح کی چیخ پکار اور آہ و زاری یا میری شاعری۔ **رسم و رہ:** طریقے' **مقصود:** غرض۔ مطلب۔

مطلب: اے مسلمانوں کے راہنماؤ (خواہ تمہارا تعلق دین سے ہے یا تصوف سے) یہ دور تم سے عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ اپنی خانقاہوں اور مسجدوں سے نکل کر مسلمان قوم کو بیدار کرنے کی تدبیر کرو۔ میں صبح کے وقت اللہ کے حضور اس مقصد کے لیے جو دعائیں اور فریادیں کرتا ہوں ان کو سمجھو اور میری شاعری میں جو مسلمانوں کی بیداری کے لیے پیغام ہے اس پر عمل کرو۔

② **معانی: خود شکنی:** خود کو توڑنا مراد ہے اپنی جھوٹی انا سے باہر آنا' تکبر چھوڑنا۔ **خود نگری:** خود کو دیکھنا' اپنی معرفت حاصل کرنا۔

مطلب: اے مسلمانوں کے راہنماؤ تمہاری قوم کے جوان اور نئی نسل بڑے کام کی چیز ہے۔ ان میں بڑے جوہر ہیں۔ صرف ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے پھر دیکھئے یہی نوجوان نسل جس سے تم دور رہتے ہو اسلام کے لیے کیا کیا اعجازی کام کرتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک تو ان کو اپنے آپ میں

ست رہنے اور تکبر و غرور کے نشے سے بچاؤ اور دوسرے ان میں خودشناسی اور اپنی پہچان کا جذبہ پیدا کرو اور انہیں بتاؤ کہ تم کس عظیم ملت کے فرزند ہو۔

③ **معانی: خارا شگافی:** سخت پتھر میں سوراخ کرنا۔ **شیشہ گری:** شیشہ بنانا' آرام طلب ہو جانا۔

مطلب: مغربی قوموں نے مسلمان نوجوانوں کو ایک خاص منصوبہ اور سازش کے تحت تعلیمی' تہذیبی اور ثقافتی شراب میں ملا کر مسلم کش اور اسلام نفور زہریلا دیا ہے اور ان کو شیشے کی طرح نازک بنا دیا ہے یعنی آرام طلب اور عمل سے گریز کرنے والا بنا دیا ہے۔ تم اے مسلمانوں کے راہنماؤ! چاہے تمہارا تعلق جلوت (شریعت) سے ہے اور چاہے خلوت (طریقت) سے ہے ان کو سخت بنا دو ایسا سخت کہ وہ سخت پتھروں میں بھی سوراخ کر ڈالیں۔ بڑے سے بڑے عمل سے گریز نہ کریں۔ بڑی سے بڑی مہم سر کرنے سے نہ رکیں اور نہ ڈریں۔

④ **معانی: دارو:** علاج۔ **پریشاں نظری:** پریشان خیالی۔ **دِل توڑ گئی:** ہمت ختم کر گئی

مطلب: مسلمانوں نے بارہ سو سال تک مشرق و مغرب پر حکومت کی ہے اور جملہ اقوام کو نور و دانش اور علم کے زیور سے آراستہ کیا ہے۔ پچھلے دو سو سال سے مسلمانوں کے ممالک پر مغربی اقوام کی برتری اور قبضہ ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے برعکس اپنی مفتوح اقوام کو حیوانیت' بے حیائی اور تہذیب کے پردے میں جہالت سے آشنا کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے نوجوان بھی ان کے اثرات کے زخم کھائے بیٹھے ہیں اور ان کے افکار و خیالات حرم کے مرکز سے ہٹ کر فرنگیوں کے دیئے ہوئے نظریات کے مندروں میں بھٹک رہے ہیں۔ علامہ مسلمان راہنماؤں کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ قصور مسلمان نوجوانوں کا نہیں جن سے تم دور رہتے ہو۔ قصور اس دو سو سالہ محکومی کا اور اس دوران مغربی تہذیب کے اثرات کا ہے کہ وہ پریشان خیال پھر رہے ہیں۔ تم ان سے رابطہ پیدا کرو۔ ان کو پھر سے مغربی مندر سے نکال کر حرمِ کعبہ سے وابستہ کر دو۔

⑤ **معانی: زورِ جنوں:** سودا کا جوش' عشق کا جوش۔ **اسرار:** سِرّ کی جمع' بھید۔ **صلہ:** معاوضہ۔ **آشفتہ سری:** سر میں پریشانی ہونا' یہاں مراد عشق اور جنوں سے ہے۔ **جنوں:** عشق کی انتہائی حالت۔

مطلب: اس شعر میں اگر خدا سے خطاب ہے تو شاعر اس سے صلہ مانگ رہا ہے۔ اگر پیرِ حرم سے شاعر مخاطب ہے تو اپنی بات کا معاوضہ اس سے طلب کر رہا ہے۔ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بہرحال شاعر کہہ یہ رہا ہے کہ میں نے اپنے جوشِ جنوں میں تیرے چھپے ہوئے بھید ظاہر کر دیئے ہیں۔ میرے اس جنوں کا کچھ معاوضہ تو ملنا چاہیے اور پیرِ حرم کو یا خدا کو نوجوانوں کی ڈوبی ہوئی کشتی کو پار لگانا چاہیے۔ یہ اگر ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا' میرے پیغام کا اور میرے عشق کا صلہ (معاوضہ) مل گیا۔

مہدی

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو

مجذوبِ فرنگی نے باندازِ فرنگی   مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار   نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو
ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں   یا چاک کریں مردکِ ناداں کے کفن کو

معانی: مہدی: مسلمانوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ قیامت سے پہلے مسلمانوں کو دوبارہ عروج پر لانے کے لئے ایک شخص پیدا ہوگا جس کا نام مہدی ہوگا۔ وہ کون ہوگا یا اس میں کیا خصوصیات ہوں گی۔ اس نظم میں علامہ نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

① **معانی:** حیات: زندگی۔ **تخیل:** خیال کرنا، فکر کرنا، نصب العین۔ **مرغِ چمن:** باغ کا پرندہ، موقوف، منحصر۔ ذوق، **ذوالقہ:** لذت، حیات: زندگی۔

مطلب: قوموں کی زندگی ان کے خیالات و افکار اور نصب العین کے مطابق ہوتی ہے۔ نصب العین کے بغیر کوئی قوم، قوم نہیں بنتی۔ یہ نصب العین ہی ہے جو باغ کے پرندوں کو ادب سکھاتا ہے۔ وہ شام و سحر اس نصب العین کے پیش نظر وقت پر اٹھتے اور وقت پر سوتے، اور وقت پر اکیلے یا مل کر اپنی اپنی خاص لے میں نغمے الاپتے ہیں۔ اگر پرندوں تک میں نصب العین موجود ہے تو آدمی میں تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ نصب العین اگر فرد میں ہوگا تو جماعت میں بھی ہوگا۔

② **معانی:** **مجذوبِ فرنگی:** فرنگیوں کا یا یورپ کا ایک مفکر نطشے جس کا تعلق جرمنی سے تھا اور اس نے اہلِ جرمن کو یہ نظریہ دے کر کہ تم ساری دنیا کی قوموں سے برتر ہو مہدی کا سا کام کیا اور پوری جرمن قوم میں بیداری پیدا کر دی اور اس کے اندر یہ جوش اور ولولہ پیدا کر دیا کہ تم سب قوموں پر حکمرانی کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ لیکن یہ تصور چونکہ فطری اور اسلامی تصور کے مطابق نہ تھا اس لیے اقبالؒ نے اس کی بات کو بڑ کہا ہے اور اس بڑ مارنے والے کو مجذوب۔

مطلب: اس شعر کے مطلب کو سمجھنے کے لیے اوپر کی گئی نطشے کے متعلق تشریح کو پیش نظر رکھیں اور سمجھیں کہ نطشے نے مہدی وطن بن کر اپنی قوم کو اس حد تک جگا دیا کہ انہیں فوق البشر بنا دیا۔ سب انسانوں سے بالا انسان بنا کر رکھ دیا اور اپنے وطن کے لوگوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔ حالانکہ فوق البشر اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ مسلمان ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ بندۂ مومن کی حقیقت کو سمجھے اور اس حقیقت کو پائے۔ نطشے کا فوق البشر صرف بدنی طاقتوں والا بشر تھا۔ روح اس سے غائب تھی۔ اس نے فرنگی انداز میں اس بشر کی تعبیر کی۔ اسلام کے انداز میں کرتا تو بات بھی تھی۔

③ **معانی:** **بیزار:** اکتایا ہوا، نفرت کرنے والا۔ **نومید:** ناامید، مایوس۔ **آہوئے مشکیں:** مشک والا ہرن۔ **ختن:** وسطِ ایشیا کا ایک علاقہ جہاں کے ہرن نافہ مشک کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی ناف میں مشک (کستوری) پیدا ہوتی ہے۔ **تخیل:** تصور، عقیدہ۔

مطلب: اس دور میں مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مہدی کے تخیل کو بے بنیاد خیال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مسلمانوں کو مہدی کے عقیدے سے بیزار کر دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ملک ختن کو مشک والے ہرنوں سے خالی کر دینا۔ مراد یہ ہے کہ اس تصور نے اگر جرمن جیسی غیر مسلم قوم میں بیداری کی لہر دوڑا دی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ یہاں (مسلمانوں میں) بھی کوئی

مہدی پیدا ہو کر ان میں بیداری پیدا کر دے اور ان میں یقین پیدا کر دے کہ تم سب قوموں سے افضل ہو اور اللہ کا فرمان بھی یہ ہے کہ اگر تم مومن ہو تو سب پر فائق ہو۔ شرط مومن ہونے کی ہے اور یہ خصوصیاتِ ایمان کوئی مہدی بن کر آئے گا تو پیدا کر دے گا۔

④ **معانی:** **کفن پوش:** مردوں کا لباس پہنے ہوئے۔ **میت:** مردہ جسم۔ **مردک ناداں:** بے وقوف چھوٹا اور کمزور مرد۔

مطلب: اقبالؒ نے پہلے ایک اصول بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ اگر ایک زندہ شخص کفن (مردے کا لباس) پہن لے تو وہ مردہ نہیں ہو گا۔ مردہ ہونے کا فریب کھائے ہوئے ہو گا۔ اس کو یہ جتانے کے لیے کہ تو مردہ نہیں ہے بلکہ بے وقوفی سے خود کو مردہ سمجھ رہا ہے اس کے کفن کو اس کے جسم سے اتار دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ناداں خود کو مردہ کی بجائے زندہ سمجھنے لگے۔ یہ اصول بیان کر کے اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان قوم زندہ ہے اس نے اپنی کمزوری کا فریب خوردہ کفن پہن رکھا ہے۔ اور عمل اور ترقی کرنے سے بے گانہ اور بے زار ہو چکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے کفن کو پھاڑ کر اسے احساس دلایا جائے کہ تو مردہ نہیں زندہ ہے اور تجھ میں زندہ قوموں کی طرح رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ کام کوئی معمولی آدمی نہیں کر سکتا، مہدی کے مرتبہ اور طاقت والا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے مسلمان قوم کو سچے مہدی کی ضرورت ہے۔ جھوٹے مہدیوں کی نہیں جو قوم کو پہلے سے بھی خراب کر دیتے ہیں۔

مردِ مسلمان

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم — لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

① **معانی:** **لحظہ:** لمحہ۔ **آن:** عزت، شکوہ اکرام۔ **گفتار:** کلام، بات چیت، گفتگو۔ **کردار:** عمل۔ **برہان:** دلیل، حجت، نشان۔

مطلب: مردِ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ ایک نئی شان، ایک نئے شکوہ اور ایک نئے اکرام کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ ایک جامد شے کی طرح منجمد نہیں ہوتا بلکہ ہر لمحہ ایک نئی شان کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کی گفتگو سنیں یا اس کا عمل دیکھیں دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی حجت، دلیل اور نشان ہوتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ مردِ مومن کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ کوئی اللہ بھی ہے۔ مردِ مومن کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔

② **معانی:** **قہاری:** قہر جس سے دشمن لرز اٹھے۔ **غفاری:** خطاکاروں کو معاف کرنا۔ **قدوسی:** پاکیزگی فرشتوں کی سی۔ **جبروت:** عظمت، دبدبہ۔ **عناصر:** عنصر کی جمع، اجزائے ترکیبی۔

مطلب: ایک مرد مسلمان میں (مرد مومن میں) چار عناصر (اجزائے ترکیبی) کا ہونا ضروری ہے۔ پہلا عنصر قہاری کا ہے یعنی اس میں ایسی ہیبت ایسی قوت ہوتی ہے کہ مخالف لرز اٹھتا ہے۔ دوسرا عنصر غفاری کا ہے وہ دوستوں کے ساتھ حسن سلوک اور رحم کے ساتھ پیش آتا ہے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب وہ دشمن پر غلبہ پالیتا ہے تو اسے بھی معاف کر دیتا ہے۔ تیسرا عنصر قدوسی ہوتا ہے اس کی سیرت میں' اس کے عمل میں اس کی گفتار میں اور اس کی حرکات و سکنات' میں فرشتوں جیسی پاکیزگی ہوتی ہے اور چوتھا عنصر اس میں جبروتی کا ہوتا ہے۔ یعنی عظمت' جلال اور شکوہ میں سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ ایک شخص ایمان تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر لا سکتا ہے لیکن عملاً وہ مسلمان اور مومن اس وقت بنتا ہے جب اس میں مذکورہ بالا چار عناصر جمع ہوں۔

③ **معانی: امیں:** امانت دار۔ **بندہ خاکی:** مٹی کا بنا ہوا آدمی۔ **نشیمن:** گھر' وطن۔ **بخارا' بدخشاں:** وسط ایشیا کے دو شہر جو کبھی مسلمانی شان کے علم بردار رہے ہیں۔

مطلب: دوسرے آدم کے بیٹوں/بیٹیوں کی طرح مسلمان بھی مٹی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا جسم بھی خاکی ہی ہوتا ہے لیکن اس کی سرشت اور نہاد نورانی ہوتی ہے۔ وہ اپنے باطن کی صفائی اور پاکیزگی کی وجہ سے جبریل امین کا ہمسایہ ہوتا ہے۔ اسے نسلی وطنیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا وہ خود کو بدخشانی یا بخاری وطنیت کی حدوں میں محدود نہیں کرتا۔ یعنی اپنی قومیت کی بنیاد جغرافیائی وطنیت پر نہیں رکھتا بلکہ ایمانی اور روحانی وطنیت پر رکھتا ہے۔

④ **معانی: راز:** بھید۔ **قاری:** پڑھنے والا۔ **قرآن:** مسلمانوں کی مقدس آسمانی کتاب۔

مطلب: دنیا والے بہت کم ایسے ہوں گے جو اس بھید کو جانتے ہوں گے کہ مسلمان (مومن) بظاہر تو قرآن پڑھتا ہوا نظر آتا ہے لیکن بحقیقت وہ خود قرآن ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کتاب صرف پڑھتا نہیں بلکہ اس کے حرف حرف پر عمل کر کے اس کا آئینہ دار ہو جاتا ہے۔ خود چلتا پھرتا قرآن بن جاتا ہے۔

⑤ **معانی: مقاصد:** مقصد کی جمع۔ **عیار:** کسوٹی۔ **میزان:** ترازو۔

مطلب: مومن کے ارادے (چاہے گفتاری اور فکری ہوں اور چاہے عملی و کرداری ہوں) قدرت کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں یعنی مومن وہ کچھ کہتا اور کرتا ہے جو قدرت چاہتی ہے یا خدا چاہتا ہے۔ اس لیے دنیا ہو یا قیامت (آخرت) دونوں جگہ نیکی اور بدی کو مومن کے اعمال و گفتار کے ترازو پر پرکھا جائے گا۔ دنیا میں وہی کچھ نیک ہے جو مومن کے ارادے میں نیک ہے اور وہی کچھ بد ہے جو اس کے ارادے میں بد ہے۔ قیامت کے روز اعمال اسی کسوٹی پر پرکھے جائیں گے اور اسی ترازو میں تولے جائیں گے۔

⑥ **معانی: جگر لالہ:** لالہ سرخ رنگ کا ایک پھول ہوتا ہے جس کے اندر کا نچلا حصہ سیاہ ہوتا ہے۔ شاعر اس سے یہ مراد لیتے ہیں جیسے کہ اس کے کھر میں آگ ہو۔ **دہل جائیں:** کانپ جائیں۔

مطلب: مرد مسلمان (مومن) وہ ہے جو سوختہ دلوں اور جلے ہوئے جگر والوں کے لیے یعنی مصیبت زدوں اور دکھیوں کے لیے ایسی ہی ٹھنڈک بنتا ہے جیسی کہ لالہ کے سوختہ جگر کو صبح کی شبنم ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ مومن اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے رحم دل اور نرم دل ہوتا ہے اس کے

برعکس اگر دشمن مقابلے میں ہو تو وہ اس طوفان کی طرح ہوتا ہے جس سے دریاؤں کے دل بھی کانپ اٹھیں مراد یہ ہے کہ وہ دشمنوں سے اپنے پورے قہر' جبروت اور طاقت سے نپٹتا ہے۔

⑦ **معانی:** فطرت: قدرت' خلقت' سرشت۔ **سرور ازلی:** ہمیشہ کا سرور۔ **ازل:** زمانے کا ایسا آغاز جس کا کچھ علم نہیں۔ **شب و روز:** دن رات۔ **آہنگ:** آواز خصوصاً شاعری اور موسیقی کی آواز یا ردم (انگریزی میں)۔ **یکتا:** اکیلا' بے مثل۔ **مثل:** مانند۔ **سورۃ رحمٰن:** قرآن کی ایک سورۃ کا نام جو آواز میں سب قرآنی سورتوں سے زیادہ آہنگ رکھتی ہے۔

مطلب: مسلمان (مومن) کے دن اور رات اس طرح گزرتے ہیں کہ جیسے ان میں فطرت (قدرت) کا ہمیشہ کا سرور ہو۔ اس کی زندگی کے نغمات فطرت کے ساز کے مطابق ہوتے ہیں اور ان میں ایک ازلی قسم کی کیفیاتی خوشی ہوتی ہے۔ ان نغموں کی ہم آہنگی یا ہم آوازی قرآن کی سورۃ رحمٰن کی طرح ہے جس کی آیتیں دوسری قرآنی سورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہم آواز' ہم آہنگ اور ردم میں ہیں۔ جس طرح قرآن میں سورۃ رحمٰن اپنی اس صفت کے اعتبار سے واحد اور بے مثل سورۃ ہے اسی طرح مسلمان بھی قدرت کے منشا کی ہم آوازی کے لحاظ سے جملہ انسانوں میں منفرد' واحد اور بے مثل ہوتا ہے۔

⑧ **معانی:** کارگہ: کارگاہ' کارخانہ۔ **انجم:** تارے۔ **مقدر:** قسمت' بخت' نصیب۔

مطلب: آخر میں اقبال کہتا ہے کہ اے میرے مخاطب میری شاعری کو شاعری نہ سمجھ بلکہ یوں سمجھ کہ یہ ایک ایسا کارخانہ ہے جس میں فکر و عمل کے اور تیری قسمت کے ستارے بنتے ہیں۔ دانش مندی یہ ہو گی کہ تو اپنے مقدر کے ان ستاروں کو پہچان۔ مراد ہے میری شاعری کے حقائق و معارف سے جو مقدر بدلنے والے ستاروں کی طرح ہیں' فائدہ اٹھا۔ میری شاعری کو محض اچھے شعر سمجھ کر پڑھتا ہوا نہ نکل جا۔

پنجابی مسلمان

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت — کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

معانی: پنجاب متحدہ ہندوستان کے ایک صوبے کا نام ہے جو اب پاکستانی پنجاب اور بھارتی پنجاب میں تقسیم ہو چکا ہے۔

① **مطلب:** پنجاب کا رہنے والا مسلمان مذہب کے معاملے میں بڑا تازہ پسند واقع ہوا ہے۔ یعنی عقیدہ مذہبی کے اعتبار سے جب اس کے سامنے کوئی نئی بات آتی ہے تو اس کو بہت جلد تسلیم کر لیتا ہے اور پھر اس کے بعد اگر کوئی اور عقیدہ مذہبی لے کر سامنے آ جائے تو پہلی منزل کو چھوڑ کر عقیدہ مذہبی کی دوسری منزل کی طرف لپکتا ہے۔

معانی: بازی: کھیل' شرکت کرنا: شامل ہونا' مریدی: کسی پیر کا بیعت (چیلا) ہونا۔

② **مطلب:** [illegible] (چھان بین) کا میدان ہو تو پنجابی مسلمان اس میں دلچسپی نہیں لیتا اور بغیر پرکھ اور بغیر چھان بین کے [illegible] عقائد کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اسی لیے وہ پیری مریدی کی بازی بھی

جلد ہار جاتا ہے کیونکہ وہ یہ جاننے کی زحمت ہی نہیں کرتا کہ پیر کیسا ہے۔ واقعی پیری کے لائق ہے یا کوئی مذہبی ٹھگ ہے۔

③ **معانی**: صیاد: شکاری۔ شاخِ نشیمن: گھونسلے کی شاخ۔ تاویل: کسی لفظ یا بات کے نئے یا خود ساختہ معنی پیدا کرنا۔ پھندا: جال۔

مطلب: جس طرح پرندے ان دانوں کے لالچ میں جو شکاری نے جال کے نیچے پرندوں کو فریب دینے کے لیے بکھیرے ہوتے ہیں اپنے گھونسلے کی شاخ سے اتر کر جال میں پھنس جاتے ہیں اسی طرح پنجابی مسلمان ان مذہبی اور سیاسی شکاریوں کے جال میں جلد گرفتار ہو جاتے ہیں جنھوں نے مذہبی یا سیاسی الفاظ یا عقائد کے غلط اور خود ساختہ معنی پیدا کر رکھے ہوں اور اس طرح وہ بہت جلد گمراہ ہو جاتے ہیں۔

آزادی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے　　حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس　　چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر　　چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا　　اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

① **معانی**: جرأت: حوصلہ۔ ٹوکے: منع کرے۔ حریت افکار: خیالات کی آزادی۔ نعمت: اللہ کا انعام۔ خداداد: خدا کی دی ہوئی۔

مطلب: انگریزی تہذیب و تمدن کے اثر کے تحت مسلمان کے ذہن میں جس قسم کی مادر پدر آزادی کا تصور بس چکا ہے اس کی بات کرتا ہوا شاعر کہتا ہے کہ وہ اس میدان میں اتنا آگے نکل چکا ہے اور اتنا سرکش ہو گیا ہے کہ کسی میں حوصلہ نہیں پڑتا کہ اسے اس سے روکے اور اگر کوئی روکتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ آزادی تو اللہ کا بخشا ہوا انعام ہے۔ تم اس سے ہمیں کیوں روکتے ہو؟ وہ آزادی کے خود ساختہ معنی پیدا کر کے اپنے اقدام کو درست قرار دیتا ہے۔

② **معانی**: کعبہ: مسلمانوں کا حرم، اللہ کا گھر۔ آتش کدہ پارس: اہل فارس کا آتش کدہ۔ فرنگی صنم: یورپی یا انگریزی بت۔ آتش کدہ: وہ معبد جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے اور پارسی مذہب کے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔

مطلب: مسلمان کا تصور آزادی اس قدر بے باک ہو چکا ہے کہ چاہے کوئی کعبہ کو پارسیوں کا مندر بنا دے یا خدا کے اس گھر میں مغربیوں کے بت نصب کر دے وہ آزادی کے نام پر اسے قبول کرنے کو تیار ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ دین اسلام کے خیالات کو چھوڑ کر کافروں کے خیالات بھی تسلیم کرنے کو تیار ہے۔

③ **معانی**: قرآن: مسلمانوں کی مقدس کتاب، آخری آسمانی کتاب۔ بازیچہ اطفال: بچوں کا کھیل۔ ایجاد کرے: نئی چیز پیدا کرے۔ تاویل: خود ساختہ معنی پیدا کرنا۔

مطلب: مادر پدر آزادی میں پنجابی مسلمان اس قدر آگے نکل چکا ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب

قرآن) کا مفہوم بدلنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اور اس بات سے بھی نہیں ڈرتا کہ شریعت محمدی ﷺ
کو چھوڑ کر ایک نئی شریعت (مذہبی لائحہ عمل یا قانون) رائج کر دے۔

④ معانی: مملکت ہند: ہندوستان کی سلطنت، خصوصاً انگریزی دور کی حکمرانی۔ طرفہ: عجیب و غریب۔

مطلب: انگریزوں کی عمل داری میں آزادی کے نام پر مسلمان قوم میں ایک عجیب و غریب تماشا نظر آ
رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان تو اپنے افکار و خیالات دینی میں آزاد ہے جو چاہے کہے جو چاہے سوچے جو
چاہے کرے لیکن اسلام کا ضابطہ پابند ہے۔ اسلام اپنی اصل روح میں نہ کہیں نافذ ہے نہ کوئی نافذ ہونے
دیتا ہے۔ اور یہ صورت حال تو اب انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اسلام کے نام پر بننے والے ملک
پاکستان کے اندر بھی موجود ہے۔ یہ اسی انگریزی دور کا تسلسل ہے۔

اشاعت اسلام فرنگستان میں

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں قبولِ دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰ انگریز سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

معانی: فرنگستان: یورپ، انگلستان۔

① معانی: ضمیر: ذہنیت، دل۔ مدنیت: تمدن، تہذیب۔ دیں: مذہب۔ فرنگیوں: اہل مغرب۔ اخوت:
بھائی چارہ۔ نسب: خاندان، قبیلہ۔ قیام: دار و مدار۔

مطلب: اہل مغرب کی تہذیب و تمدن کی افتاد یا ذہنیت مذہب سے بالکل بیگانہ ہے۔ ان میں بھائی چارہ کی
بنیاد اسلام کی طرح کی نہیں کہ سب اہل ایمان بھائی بھائی ہیں۔ چاہے وہ کہیں کے ہوں۔ ان میں بھائی چارہ
کی بنیاد خاندان، قبیلہ، نسب نسل اور وطن پر ہے۔ باقی سارے ان کے لیے غیر اور نفرت کے قابل
ہیں۔ اسلام میں عجمی پر عربی کو اور کالے پر گورے کو اور ایک نسل و نسب کے شخص کو دوسری نسل و نسب
کے شخص پر کوئی برتری نہیں جب کہ اہل مغرب کی تہذیب ہمیں کالا گورے کے برابر اور فلاں نسل کا فلاں
نسل کے برابر نہیں مذہب کا سبق دیتے رہی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ غیر انسانی تفریق ہے۔

② معانی: دین مسیحی: عیسائی مذہب۔ برہمن: ہندوؤں کا پیشوا، ہندو۔ مقام: مرتبہ

مطلب: اگر ایک ہندو، چاہے وہ نیچی ذات کا کیوں نہ ہو، اسلام قبول کر لے تو اسے مسلمان برادری میں
برابر کی حیثیت مل جاتی ہے لیکن اگر کوئی اونچی ذات کا ہندو یعنی ہندوؤں کا پیشوا بھی عیسائی مذہب قبول کر
لے تو اسے عیسائی اپنے برابر درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ رنگ، نسب اور نسل کی تفریق کا عقیدہ، جو ان
کی تہذیب کا بنیادی عقیدہ ہے، انھیں ایسا کرنے نہیں دیتا۔

③ معانی: دین مصطفیٰ: اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے آیا ہوا مذہب۔ سیاہ روز: کالا

مطلب: اگر کوئی انگریز اسلام بھی قبول کر لے تو وہ پھر بھی خود کو ایک

مسلمان سے برتر سمجھے گا۔ اس نا توٗنی تصور اسے خود کو مسلمان کے برابر سمجھنے سے روکے گا۔ وہ مسلمان کو بدستور غلام، کم تر اور ہیچ بنائے رکھے گا۔ یہ شرف، اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ کالے کو، عجمی کو، ایک نیچ سے نیچ ذات والے کو گورے، عربی اور بلند ذات والے کے برابر بنا دیتا ہے۔

لا و الا

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا ۔۔۔ سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الا ۔۔۔ پیامِ موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی ۔۔۔ یقیں جانو ہوا لب ریز اس ملت کا پیمانہ

معانی: لا سے مراد نہیں، الا سے مراد سوا۔ یہ کلمہ طیبہ کی تخفیف ہے کہ لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) محمد الرسول اللہ (اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں)۔ لا و الا کو صوفیا نفی و اثبات بھی کہتے ہیں۔

① **معانی:** برگ: پتے۔ بر: پھل۔ **خاکی شبستاں:** اندھیری رات کی طرح کا تاریک مٹی کا گھر یعنی زمین۔

مطلب: وہ دانہ (وہ بیج) جو تاریک مٹی کے گھر میں رکھا جاتا ہے کبھی نمو کر کے روشنی میں نہ آتا اور نہ شاخوں، پتوں اور پھلوں کی شکل میں نمودار نہ ہوتا۔ اگر اس میں نمو کرنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی اور وہ زمین کے تاریک گھر سے روشنی میں آنے کی آرزو نہ کرتا۔

② **معانی:** نہاد: اصل فطرت۔ لا و الا: اوپر تشریح دیکھیں۔

مطلب: جس طرح پہلے شعر میں دانے کی مثال دی گئی ہے کہ جس وقت وہ صرف دانہ ہوتا ہے بطور پودا نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ لا کی منزل پر ہوتا ہے یعنی کچھ نہیں ہوتا پھر جب آرزوئے نمو اس میں پیدا ہوتی ہے تو وہ لا کی منزل سے باہر آ کر کچھ ہونے کچھ وجود کرنے کی منزل میں آ جاتا ہے جسے علامہ نے الا کی علامت میں ظاہر کیا ہے۔ آدمی کی زندگی کی بھی یہی صورت ہے۔ اس کی اصل بنیاد کی ابتدا بھی لا سے ہے۔ اگر وہ لا ہی پر قائم رہے تو اس کا وجود لا شے ہے۔ جب وہ لا سے الا کی منزل کی طرف آتا ہے اور یہ اقرار کرتا ہے کہ مجھ سمیت ہر شے (لا) یعنی نہیں ہے اور صرف ایک ہستی ہے جو لا نہیں ہے وہ اللہ ہے تب اس کی زندگی کا بیج تاریکی سے روشنی میں آتا ہے۔ لا پر بیٹھ رہنا اور الا کہہ کر ایک الٰہ کو تسلیم نہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ دانہ مٹی کی تاریکی ہی میں ضائع ہو جائے اور پودے کی شکل میں باہر نہ آئے۔ پہلے نفی (اپنی اور ہر دوسری شے کی سوائے اللہ کے) ضروری ہے پھر الا کہہ کر اثبات الٰہ کرنا لازمی ہے۔ صرف لا پر قائم رہنا اپنی موت خریدتا ہے۔ الا پر آ کر زندگی حاصل ہوتی ہے۔

③ **معانی:** **پیمانہ لب ریز ہونا:** پیالے کا بھر جانا، یہاں مراد ہے زندگی کے پیالے کا بھر جانا یعنی موت۔ **ملت:** مسلمان قوم۔

مطلب: وہ قوم (خصوصاً مسلمان قوم سے خطاب ہے) اگر لا کی منزل پر یعنی خدا سمیت ہر شے کے انکار

پر اڑی رہی تو سمجھو اس قوم نے اپنی موت خرید لی۔ زندگی اثبات الٰہ میں ہے الا کہہ کر لا کی نفی کو اثبات میں بدلنے میں ہے۔

امرائے عرب سے

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار — اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو — وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا — محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی

① **معانی: کافرِ ہندی:** ہندوستان کا کافر' اقبال نے اپنے آپ کو کہا ہے۔ **جرأت:** حوصلہ۔ **امرا:** امیر کی جمع سردار۔ **گفتار:** کلام

مطلب: اگر ہندوستان کا رہنے والا یہ اقبال جسے اے عرب کے امرا شاید تم مسلمانوں میں بھی شمار نہ کرتے ہو گے تمہیں ایک بات کہنا چاہتا ہے۔ اگر اے امرائے عرب تم اسے اپنی بے ادبی نہ سمجھو تو کہوں۔

② **معانی: نکتہ:** باریک بات' راز کی بات۔ **امت:** قوم۔ **وصال مصطفوی:** حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا پیغام اتفاق۔ **وصال:** اتفاق۔ **افتراق:** نفاق۔ **افتراق بولہبی:** بولہب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا چچا تھا لیکن آخر تک اسلام کی مخالفت کرتا رہا اور انسانوں میں اتفاق اور برابری کی بجائے نفاق کی بات کرتا رہا۔ اور عربوں کو عجمیوں پر ترجیح دیتا رہا۔

مطلب: اے امرائے عرب یاد کرو کہ یہ باریک اور رمزی بات دنیا میں سب سے پہلے کس قوم کو سکھائی گئی کہ سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور برابر ہیں۔ اور اسلام میں کسی قسم کی اونچ نیچ نہیں ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پہلے شخص ہیں جنہوں نے پوری تاریخ انسانیت میں پہلی بار رنگ' نسل' خون' وطن' جغرافیہ وغیرہ کی بنیادوں کو ڈھا کر صرف اتقا (خدا پر ایمان اور اس سے ڈر پر) پر برادری اور برابری کی بنیاد رکھی اور ابولہب کی تفریق رنگ و نسل کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا لیکن تم اے عرب کے لوگو خصوصاً امرائے عرب آج حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے برعکس ابولہب کی بات پر چل رہے ہو اور خود کو دوسرے مسلمانوں سے ایک الگ قوم بنا کر فخر کر رہے ہو۔

③ **معانی: ثغور:** ثغر کی جمع' حدیں۔ **وجود:** ہستی' **عالم:** جہان۔

مطلب: اے امرائے عرب یاد رکھو تم جس ہستی کی امت ہو جس قوم کے افراد ہو وہ امت اور قوم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ ابولہب کی وجہ سے نہیں اور محمد ﷺ کا پیغام یہ ہے کہ ملت اسلامیہ جغرافیائی' وطنی' نسلی' نسبی' خونی' لسانی وغیرہ حدود میں محدود نہیں ہے اور تمہارا وجود چونکہ نبی ﷺ کی ہستی کا مرہون منت ہے اس لیے تمہیں اور سارے اہل عرب کو نبی کریم ﷺ کے پیغام پر کان دھرنے چاہئیں اور خود کو دوسرے مسلمانوں سے ایک الگ قوم تصور نہیں کرنا چاہیے۔

احکامِ الٰہی

پابندیِ تقدیر کہ پابندیِ احکام؟ یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خرد مند
اک آن میں سَو بار بدل جاتی ہے تقدیر ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

① **معانی:** مردِ خردمند: عقل مند آدمی۔ **پابندی:** قید، غلامی، **احکام:** حکم کی جمع، **مسئلہ:** سوال، معاملہ۔
مطلب: اے عقل مند شخص اس بات کا جواب مشکل نہیں ہے کہ تجھے تقدیر کے احکام کی پابندی کرنی چاہیے یا اللہ کے احکام کی۔

② **معانی:** آن: لمحہ۔ **مقلد:** پیروی کرنے والے۔ **خورسند:** خوش۔
مطلب: تقدیر تو مستقل کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ ایک لمحہ میں سو بار بدل سکتی ہے۔ تقدیر کے احکام کی پیروی کرنے والا (اگر تقدیر کا فیصلہ اس کی پیروی کرنے والے کے حق میں نہیں) تو وہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کے خیال کے مطابق ہو تو خوش ہو جاتا ہے۔ تقدیر کی پابندی دھوکہ ہے۔ اصل پابندی اللہ کے احکام کی ہے جس کے تقدیر بھی تابع ہے۔

③ **معانی:** پابند: قیدی، غلام۔ **نباتات:** گھاس پھوس، فصلیں، درخت وغیرہ۔ **جمادات:** پتھر، اینٹ، روڑا وغیرہ۔ **فقط:** محض۔ **احکامِ الٰہی:** اللہ کے حکم۔
مطلب: تقدیر کی پابندی کرتے تو ہم نے جمادات (زمین، پہاڑ، پتھر، سونا، موتی وغیرہ بے جان اشیا) کو دیکھا ہے یا نباتات کو جو گھاس پھوس فصلوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ مومن کوئی جماداتی یا نباتاتی مخلوق نہیں ہے وہ حرکی (حرکت کرنے والی باعقل و بااختیار) مخلوق ہے اور سوائے اللہ کے احکام کے کسی اور کے حکم کو تسلیم نہیں کرتی۔ تقدیر کو تو مومن احکامِ الٰہی کے تحت سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ اس کی پابندی نہیں کرتا۔

موت

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس مے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

① **معانی:** لحد: قبر۔ **غیب و حضور:** غیب اور سامنے۔ **ناصبور:** لبریز کرنے والا۔
مطلب: موت دو قسم کی ہے ایک عامی کی اور ایک اخص آدمی کی۔ اخص ہستیوں میں انبیا، صدیقین، شہدا، صلحا، اولیا اور خودی والے (خود شناسی والے) لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ظاہری موت کی منزل سے گزر کر گزرتے ہیں لیکن مرنے کے بعد بھی ان کی ایک خاص قسم کی زندگی قائم رہتی ہے۔ یہ بات عامی کو نصیب نہیں۔ اخص ہستیاں قبر میں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انہیں خدا کا کبھی دیدار ہوتا ہے اور کبھی اس سے محروم ہوتے ہیں جس طرح ایسے لوگ دنیا میں بیقرار رہتے تھے اسی طرح وہ موت کے بعد بھی بے قرار رہتے ہیں۔

② **معانی**: مہ: چاند۔ **شرارہ**: چنگاری۔ **مثال**: مانند۔ **یک دو نفس**: ایک دو سانس۔ **مے خودی**: خودی کی شراب۔ **ابد**: وہ انتہائے زمانہ جس کی انتہا کی کسی کو خبر نہیں۔

مطلب: عامی لوگ تو چاند اور سورج اور ستاروں کی طرح ہوتے ہیں کہ ابھی ہیں اور ابھی غروب ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ چمکتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ عامی لوگ ابھی زندہ ہوتے ہیں اور ابھی مرکر قبر میں مٹی ہو جاتے ہیں جب کہ وہ لوگ جنھوں نے خود معرفتی اور خودشناسی کی شراب پی رکھی ہوتی ہے وہ زمانے کی ایسی انتہا تک زندہ ہوتے ہیں جس کی انتہا کی کسی کو کچھ خبر نہیں۔ وہ قبروں میں بھی زندہ ہوتے ہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے زور پر اگر چاہیں تو اس دنیائے ظاہری میں بھی متصرف ہو کر آ سکتے ہیں۔

معانی: وجود: ہستی۔ بدن، **مرکز**: مدار۔ درمیانی حصہ۔

③ **مطلب**: اے شخص خاص جو ہستی و نشہ خودی میں مست ہے تیری موت کی صورت عامی لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ موت کا فرشتہ اگرچہ تجھے چھوتا ضرور ہے اور تجھ پر موت کی حالت ضرور طاری کرتا ہے لیکن تیرے جسم کا جو مرکز ہے (مدار) (جو بہ شکل روح ہے) اس کو نہیں چھیڑتا تیرا ظاہری جسم تو موت کے انداز میں قبر میں چلا جاتا ہے لیکن تیرا روحانی جسم ہمیشہ کے لیے زندہ رہتا ہے۔

قم باذن اللہ

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے، قم باذن اللہ | وہی زمیں، وہی گردوں ہے، قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے | تری رگوں میں وہی خوں ہے، قم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا | فرنگیوں کا یہ افسوں ہے، قم باذن اللہ

معانی: **قم باذن اللہ**: اٹھو اللہ کے حکم سے۔ یہ اشارہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ طاقت کی طرف کہ جب وہ مردے کے سرہانے قم باذن اللہ کہتے تھے تو وہ زندہ ہو جاتا تھا۔

① **معانی**: دگرگوں: موافق نہ ہونا۔ گردوں: آسماں۔

مطلب: اگرچہ موجودہ دور کی دنیا بالکل بدل چکی ہے۔ اور اہل مغرب کے جادو سے دنیا اور دنیا والے مادہ پرست ہو گئے ہیں وہ تہذیب کے نام پر جہالت پھیلا رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہر طرف انسان نما حیوان پھر رہے ہیں اور اگرچہ یہ دنیا اے شخص یعنی اے مرد مسلمان تیرے مزاج اور عقیدے کے موافق نہیں ہے۔ لیکن تو گھبرا نہیں اللہ کے حکم سے اٹھ اور اس مردہ جہان میں پھر وہی زندگی پیدا کردے جو کبھی اسلام اور ایمان نے پیدا کر دی تھی۔ میں نے مانا کہ زمین بھی وہی ہے آسمان بھی وہی ہے لیکن آسمان کے نیچے رہنے والے اہل زمین بدل چکے ہیں۔ ان کی اس بدلی ہوئی زندگی کو اللہ کے حکم سے پھر کارآمد بنانے کی ضرورت ہے۔ تو اے مخاطب یعنی اے مرد مسلمان اٹھ اور اس دور کو تبدیل کردے۔ (اللہ کے حکم سے)۔

② **معانی**: نوائے انا الحق: انا الحق کی آواز۔ اشارہ ہے منصور حلاج کی طرف جس نے انا الحق (میں حق ہوں) کہا تھا اور دار پر چڑھا تھا۔ آتشیں: آگ کی حرارت والا۔

مطلب: اے مسلمان تیری رگوں میں وہی خون ہے جس نے منصور حلاج میں 'انا الحق (میں حق ہوں) کی آواز پیدا کر دی تھی اور وہ دار سے بے پروا اپنے اعلان حق پر قائم رہا تھا۔ اے مسلمان تیرا خون نہیں بدلا۔ تہذیب

حاضر نے تجھے بدل دیا ہے۔ اپنے اندر جھانک تیرے اندر بھی انا الحقی خون موجود ہے۔ اس کی حرارت سے اللہ کے حکم کے تحت اٹھ کر دنیا کو بدل دے اور باطل کی جگہ حق قائم کر دے۔

③ **معانی : غمیں**: غمگین۔ **پراگندہ**: بکھرا ہوا انتشار والا **شعور**: عقل۔ **فرنگی**: اہل مغرب۔ **افسوں**: جادو۔

مطلب: اے مسلمان اگر آج تیری عقل و شعور میں انتشار نظر آتا ہے تو غمگیں نہ ہو کیونکہ یہ انتشار حقیقی نہیں۔ صرف تیرے ذہن میں ہے۔ تو خود اپنی اسلامی اصلیت اور خون پر قائم ہے۔ اہل مغرب نے اپنی تہذیب و ثقافت کے ذریعے تیرے ذہن میں یہ عارضی انتشار پیدا کر دیا ہے۔ ان کے جادو کو توڑ دے۔ اور "اللہ کے حکم سے اٹھ" کا نعرہ لگا اور مسلمان قوم کو اور اس جہان کو بدل دے۔

تعلیم و تربیت

مقصود

سپنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

فلاطون

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود

*

حیات و موت نہیں التفات کے لائق فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

معانی: مقصود: اصلی غرض: نظم کے اعتبار سے زندگی کی اصل غرض۔ اس نظم میں سترھویں صدی عیسوی کا ولندیزی فلاسفر سپنوزا' قدیم یونانی فلاسفر افلاطون اور خود اقبال'' کی زندگی کے متعلق تین نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

سپنوزا کہتا ہے۔

① **معانی:** **حیات:** زندگی۔ **مردِ دانش مند:** عقل مند آدمی۔ **حضور:** خدا کی حضوری ہونا۔ **سرور:** مستی' کیف۔ **نور:** روشنی۔ **وجود:** ہستی۔

مطلب: سپنوزا کہتا ہے کہ عقل مند آدمی وہ ہے جو زندگی پر نظر رکھے۔ زندگی کیا ہے خدا کی حضوری حاصل کرنا پھر اس حضوری سے مستی و کیف کا حاصل ہونا اور حقیقت تک راہنمائی کی روشنی کا حاصل ہونا اور اپنے وجود کو ہستی سمجھنا کہ یہ موجود ہے۔ یہ سب ہے زندگی۔

افلاطون کہتا ہے کہ۔

② **معانی:** **شب تاریک:** اندھیری رات۔ **شرر کی نمود:** چنگاری کا ظاہر ہونا جو ابھی ہے ابھی نہیں ہے۔ **مردِ دانش مند:** عقل مند شخص۔

مطلب: افلاطون کہتا ہے کہ عقل مند آدمی زندگی پر نہیں موت پر نظر رکھتا ہے۔ زندگی تو کالی رات میں ایک چنگاری کی نمود (ظاہر ہونے) کی مانند ہے جو ہوا میں اٹھتی ہے اور اسی وقت ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی عارضی ہے۔ موت حقیقت ہے۔ اصل زندگی اس ظاہری زندگی کے پیچھے ہے۔

اقبال کہتا ہے کہ۔

③ **معانی:** **خودی:** خود شناسی' خود معرفتی' خودی کا مقصود' خودی والوں کا مقصد اصلی۔ **التفات:** توجہ۔ **مقصود:** غرض غائت۔ **فقط:** حرف۔

مطلب: وہ مزید کہتا ہے کہ نہ زندگی توجہ کے قابل ہے اور نہ موت۔ جو لوگ خودی سے واقف ہیں اور صرف خودی کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ توجہ کے قابل ہیں۔ اگر انسان کو خودی (خود معرفتی' اپنی ہستی کی پہچان) حاصل ہو جائے تو موت و حیات دونوں اس کے تابع ہو جاتی ہیں۔

زمانہ حاضر کا انسان

عشق ناپید و خرد مے گزدش صورت مار — عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

معانی: زمانہ حاضر سے مراد وہ جدید زمانہ ہے جو مغربی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے۔

① **معانی:** **ناپید:** غائب۔ **خرد:** عقل۔ **می گزدش:** اس کو کاٹتی ہے۔ **صورت مار:** سانپ کی مانند۔ **قابو:** ماتحت۔ **نظر:** اہل نظر کی نظر، عشق کی نظر۔

مطلب: آج کے دور کے انسان میں، جو مغربی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے، عشق بالکل غائب ہے اور وہ عقل کا غلام ہے اور عقل نے اسے ایسے ڈس لیا ہے جیسے کہ سانپ کسی کو ڈس لیتا ہے۔ عقل اپنی جگہ بری چیز نہیں بشرطیکہ وہ جذبہ و عشق کے ماتحت ہو۔ لیکن آج کا انسان اپنی عقل کو نظر (اہل نظر) کے زیر حکم نہیں لا سکا۔ یہی اس کی سب سے بڑی خرابی ہے۔

② **معانی:** **گزرگاہوں:** راستوں۔ **افکار:** فکر کی جمع، خیالات۔

مطلب: آج کا انسان ستاروں اور سیاروں کے راستوں کی تلاش تو کرتا پھرتا ہے بلکہ چاند سمیت کئی سیاروں پر پہنچ بھی گیا ہے لیکن اپنے خیالات کی دنیا میں سفر کر کے وہاں سے اپنی دریافت نہیں کر سکا۔ ستاروں اور آسمانوں پر تو اڑ رہا ہے لیکن اپنے اندر جھانک کر اپنی حقیقت معلوم نہیں کر سکا۔

③ **معانی:** **حکمت:** فلسفہ۔ **خم و پیچ:** ہیر پھیر، الجھاؤ۔ **نفع و ضرر:** فائدہ اور نقصان۔

مطلب: آج کا انسان فلسفہ کی الجھنوں اور عقل و افکار کے پیچ و خم میں اس قدر الجھ گیا ہے کہ اسے یہ معلوم بھی نہ رہا کہ زندگی میں نفع کیا ہے اور نقصان کیا ہے۔ وہ نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع سمجھ رہا ہے۔ اسے زندگی کی حقیقت کا علم نہیں۔

④ **معانی:** **شب تاریک:** اندھیری رات۔ **سحر:** صبح۔ **گرفتار:** قید۔

مطلب: اس نے سورج کی کرنوں کو تو مسخر کر لیا ہے اور انہیں قابو کر کے ان سے مختلف قسم کے علمی و عملی فائدے اٹھا رہا ہے لیکن اپنی زندگی کی تاریک رات میں صبح کی روشنی پیدا نہیں کر سکا۔ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والا اپنے اندر کی دنیا کا کھوج نہ لگا سکا۔ اپنی معرفت حاصل نہیں کر سکا اس لیے وہ انسان نما حیوان بن کر رہ گیا ہے۔

اقوامِ مشرق

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

معانی: **اقوامِ مشرق:** اقوام، قوم کی جمع، مشرقی قومیں۔ **خصوصاً مسلمان قوم**

① **معانی:** **حقائق:** حقیقتیں۔ **محکومی:** غلامی۔ **تقلید:** پیروی۔ **کور:** اندھی۔

مطلب: جن مشرقی اقوام کی آنکھیں غلامی اور مغرب کی بے جا پیروی کی وجہ سے اندھی ہو چکی ہیں وہ ان حقیقتوں کو بھی نہیں دیکھ سکتیں جو بالکل ظاہر ہیں۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اہل مغرب اور تہذیب مغرب نے ان کا ستیاناس کر دیا ہے لیکن وہ اس سے بے خبر پھر بھی ان کی پیروی میں خوش ہیں۔

② **معانی:** **فرنگی مدنیت:** یورپ کی تہذیب، تمدن، ثقافت۔ **لبِ گور:** قبر کے کنارے، مرنے کے قریب۔

مطلب: ان اہل مغرب کی تہذیب و تمدن، جو خود قبر کے کنارے پہنچی ہوئی ہے۔ اور فنا ہونے کے قریب ہے اس سے ایران اور عرب اور دیگر ممالک کیسے زندگی پا سکتے ہیں۔ ان مشرقی ممالک کو چاہیے کہ فرنگی تہذیب و تمدن سے اپنی جان چھڑائیں۔ اور اپنی اقدار اپنائیں۔

آگاہی

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ
وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

① **معانی:** **سپہر:** آسمان۔ **ستارہ شناس:** اہل نجوم۔ **خودی:** خود شناسی۔ **مقام:** مرتبہ۔ **آگاہ:** واقف۔

مطلب: میں نے اہل نجوم (ستاروں کا علم جاننے والوں) کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی نظریں آسمان پر جمائے رہتے ہیں۔ اتنی دور تو وہ نظریں گاڑتے ہیں لیکن نزدیک ترین وجود یعنی اپنے وجود پر نظر نہیں دوڑاتے اور اس کی معرفت حاصل کر کے اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے۔ ستاروں کی خبر پا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ آدمی کو پہلے اپنی خبر پانی چاہیے کہ میں کون ہوں۔

② **معانی:** **خودی:** خود شناسی۔ **فلک:** آسمانی۔ **بلند تر:** زیادہ اونچا۔ **مملکت:** حکومت، ملک، سلطنت۔

مطلب: جس شخص نے یہ جان لیا کہ اپنی معرفت حاصل کرنا آسمان اور ستاروں کا علم حاصل کرنے سے زیادہ اونچی بات ہے۔ وہی شخص صبح و شام کی سلطنت سے واقف ہے۔ یعنی صرف اسے علم ہے کہ زندگی کیا ہے، زندگی کا گرد و پیش کیا ہے۔ کائنات کیا ہے۔ اس کے وجود کی اس میں کیا حیثیت ہے۔

③ **معانی:** **نگاہ:** نظر۔ **ناخوب و خوب:** اچھائی اور برائی۔ **محرم:** واقف۔

مطلب: وہی شخص اپنی نظر کی اچھائی اور برائی سے واقف ہے جو دل کے حرام و حلال سے واقف ہے۔

یعنی کونسی چیز دل کے لیے فائدہ مند ہے اور کونسی نقصان دہ ہے۔

مصلحین مشرق

میں ہوں نومید تیرے ساقیان سامری فن سے ‌ ‌ کہ بزم خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں ‌ ‌ پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

معانی: مصلحین مشرق: مشرق کے اصلاح کرنے والے' ریفارمر۔

① **معانی: نومید:** ناامید۔ **ساقیان:** ساقی کی جمع۔ **سامری فن:** سامری حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا جادوگر تھا۔ اس نے اپنے جادو کے فن سے بچھڑے میں جان پیدا کر دی تھی۔ **بزم خاوراں:** مشرق کا جہان۔ **ساتگیں:** صراحی' پیالہ۔

مطلب: اے اہل مشرق جو تمہاری اصلاح کرنے والے ساقی یا راہبر ہیں ان کے پاس جو صراحیاں اور پیالے ہیں وہ اصلاحی شراب سے خالی ہیں وہ تو سامری کی طرح کے جادوگر ہیں۔ ہوتے کچھ ہیں اور دکھائی کچھ دیتے ہیں۔ میں ان اصلاح کرنے والے ساقیوں (راہبروں) سے ناامید ہوں جو مشرقی اقوام کی محفل میں شراب سے خالی پیالے لے کے آئے ہوئے ہیں یعنی مقصود ان کا اصلاح نہیں بلکہ لوٹنا ہے۔

② **معانی: جیب و دامن:** کرتے کا گریباں اور داماں۔ **آستیں:** کرتے کا وہ حصہ جس میں ہاتھ ہوتا ہے۔

مطلب: جن اصلاح کا دعویٰ کرنے والوں کے بادلوں کے دامن اور گریبان پرانی بجلیوں سے خالی ہیں ان میں نئی بجلیاں کہاں سے آئیں گی۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ اپنی روایات' اقدار اور علوم و فنون سے واقف نہیں ہیں وہ نئے دور کے علوم و فنون اور اقدار و روایات سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ وہ نقصان تو پہنچا سکتے ہیں فائدہ نہیں۔

مغربی تہذیب

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب ‌ ‌ کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ‌ ‌ ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

① **معانی: قلب:** دل۔ **فساد:** بگاڑ۔ **مدنیت:** ثقافت و تمدن۔ **عفیف:** پاک' پاکیزہ۔

مطلب: فرنگیوں کی (یورپ والوں کی) تہذیب نظر کے لئے بھی فتنہ اور خرابی ہے اور دل کے لئے بھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کی تہذیب' تمدن اور ثقافت کی روح میں حیا اور پاک دامنی باقی نہیں ہے۔

② **معانی: ناپید:** غائب' نہ ہونا۔ **ذوق لطیف:** لطیف بمقابلہ کثیف (گندہ)۔ **ضمیر پاک:** انسان کی افتاد کا یا ذہنیت کا پاک ہونا۔ اچھا اور پاکیزہ ذوق۔ ضمیر آدمی کا وہ جوہر ہے جو اچھے اور برے میں تمیز بتا کر اسے اچھائی کی طرف مائل کرتا ہے۔

مطلب: آدمی کا بدن جتنا مرضی صاف ستھرا اور اجلا ہو جب تک اس کا من اجلا نہیں ہوگا۔ اس کی

روح ہر گندگی سے پاک نہیں ہو گی وہ آدمی نما حیوان ہو گا آدمی نہیں ہو گا۔ یورپی تہذیب نے بدن کو اجلا کرنے کے تو بہت سے طریقے بتائے ہیں لیکن روح کو پاک رکھنے کا کوئی نسخہ نہیں بتایا اور اگر روح پاک نہ رہے تو نہ آدمی کی ذہنیت، افتاد اور طبعی مزاج میں پاکی آ سکتی ہے۔ نہ اس کے خیالات میں لاہوتی و ملکوتی اور انسانی شرف و مجد کی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور اس میں اشیائے کائنات، فنون و ہنر اور علم و ادب کے لیے بھی کوئی اچھا ذوق پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لیے مغربی تہذیب کے تحت جتنے بھی افکار و خیالات اور علوم و فنون پیدا ہوئے ہیں ان میں گندگی اور پراگندگی کے سوا کچھ نہیں۔

اسرارِ پیدا

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے وہ عالم مجبور ہے، تو عالم آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

معانی: اسرارِ پیدا: وہ راز جو ظاہر ہوں۔

① **معانی:** شمشیر: تلوار۔ حاجت: ضرورت۔ خودی: خود معرفتی، خودشناسی۔ صورتِ فولاد: لوہے کی مانند مضبوط۔

مطلب: جس قوم کے جوان اپنی لوہے جیسی مضبوط خودی سے آشنا ہوں اور اس پر مضبوطی سے قائم بھی ہوں۔ یعنی وہ اپنی اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ اس قوم کو پھر تلوار (فوجی ساز و سامان) کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس قوم کے لئے ان جوانوں کا جذبہ ایمان اور جذبہ حب الوطنی آلات حرب و ضرب سے زیادہ کام کرتا ہے۔

② **معانی:** ناچیز: بے قیمت۔ مہ: چاند۔ پروین: ستاروں کے ایک گچھے کا نام۔

مطلب: اے انسان تو اپنے ارادے، اپنی فکر اور اپنے عمل میں آزاد ہے جب کہ یہ آسمان پر چمکنے والے تارے، چاند، وغیرہ آزادی کے ان اوصاف سے محروم ہیں۔ وہ مجبور محض ہیں اس لئے تو ان سے افضل ہے۔ یہ تیری بھول ہے کہ تو ان کو اپنے آپ سے بلند اور چمک دار سمجھتا ہے وہ تو تیرے شکار ہیں۔ تو جب چاہے انہیں تسخیر کر سکتا ہے تو ان سب پر فائق ہے۔

③ **معانی:** تپش: تڑپ، حرارت۔ ذوقِ طلب: کچھ چاہنے کا ذوق۔ پنہاں: چھپا ہوا۔ خداداد: اللہ کا دیا ہوا

مطلب: دریا یا سمندر میں موجوں کی تڑپ کو دیکھو وہ کسی شے کی طلب کے لیے تڑپ رہی ہوتی ہیں۔ اور اس تڑپ اور طلب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدرت ان میں موجود سیپیوں کے اندر موتی چھپا کر رکھ دیتی ہے اور انہیں مالا مال کر دیتی ہے۔ اصل چیز طلب کی تڑپ ہے۔ یہ تڑپ ہو گی تو مقاصد بلند بھی حاصل ہوں گے۔

④ **معانی:** شاہین: باز۔ پرواز: اڑان۔ پردم: پکے دم والا۔ **خطرہ افتاد:** گرنے کا خطرہ۔

مطلب: باقی جانور تھوڑا بہت اڑنے کے بعد تھک جاتے ہیں اور کہیں کہیں دم لینے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں لیکن باز کو دیکھو وہ گھنٹوں اڑتا رہتا ہے۔ اس کا دم ایسا پکا ہے کہ وہ **تھکتا نہیں**۔ اگر تو بھی باز کی طرح پختہ دم ہو تو تجھے بھی اپنی زندگی کی پرواز میں گرنے کا خطرہ نہیں ہے۔ یہ ہے وہ کھلا ہوا بھید جو اقبال نے اس نظم میں بیان کرنا چاہا ہے۔

سلطان ٹیپوؒ کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیلؑ نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکتِ میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

معانی: سلطان حیدر علی والیِ میسور کا بیٹا فتح علی خاں ٹیپو جو انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا 1799ء میں شہید ہوا۔ اس نے جو وصیت کی تھی یہ شعر اس کا چربہ ہیں۔

① **معانی:** رہ نوردِ شوق: عشق کے راستے کا مسافر۔ **محمل:** اونٹ پر کا وہ کجاوہ جس میں لیلیٰ بیٹھا کرتی تھی۔

مطلب: ٹیپو سلطان چونکہ خود شیر کی طرح بہادر تھا۔ اس نے انگریز کی غلامی کے مقابلے میں لڑتے ہوئے شہادت کو ترجیح دی تھی اس لیے وہ مسلمان کو بھی بہادری کا پیغام دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تو عشق کے راستے کا مسافر ہے۔ اس راہ کے مسافر ٹھہرا نہیں کرتے۔ اگر لیلیٰ جیسا معشوق بھی دعوت دے کہ اس کے کجاوے میں آ کر تسکین پا لے تو اس کو قبول نہ کر۔ تیرا کام ہے چلتے رہنا۔ منزل پر منزل مارنا۔ کیسے ہی ناموافق حالات ہوں ان سے ٹکر لے کر آگے بڑھتے رہنا اور کیسی ہی دل خوش کن منزل ہو وہاں قیام نہ کرنا اور ہر دم نئی منزل کی تلاش میں رہنا۔

② **معانی:** جوئے آب: پانی کی ندی، ندی میں پانی کم ہوتا ہے۔ کم گہرا اور کم چوڑا ہوتا ہے جبکہ دریا کے پانی کی گہرائی اور چوڑائی بہت ہوتی ہے۔ اور طوفان بھی دریاؤں اور سمندروں میں اٹھتے ہیں ندیوں میں نہیں۔

مطلب: اگر تو تنگ اور بے طوفان ندی کی مانند ہے تو ہمت نہ ہار۔ بڑھ کر ایک ایسا دریا بن جا جس میں تیز اور بلند طوفان اٹھتے ہیں۔ اگر تجھے ساحل بھی میسر آئے تو اس کو بھی قبول نہ کر اور ساحل کو توڑتا ہوا نکل جا۔ مراد یہ ہے کہ اے مسلمان اگر تو کمزور ہے تو کوئی بات نہیں۔ شوق اور عشق کے زور سے اپنی طلب میں طاقت پیدا کر اور اعلیٰ مقاصد کو حاصل کر۔

③ **معانی:** صنم کدہ: بت خانہ۔ **محفل گداز:** محفل کو پگھلا دینے والا۔ **کائنات:** دنیا، جہان۔

مطلب: تو اس جہان کے بت کدے میں گم ہو کر نہ رہ جا۔ تو تو توحید کا علم بردار ہے اس بت کدہ کو توڑ

دے۔ تو تو خود محفل کو گداز کر دینے والا یا اسے پگھلا دینے والا ہے تو محفل کی گرمی یا رونق کا فریب کھا کر آرام طلب نہ ہو جا۔

④ **معانی: صبح ازل:** کائنات کی پیدائش یا زمانہ کے آغاز کے وقت۔ **جبرئیل:** خدا تعالیٰ کا ایک مقرب فرشتہ۔

مطلب: جب کائنات پیدا کی گئی اور حضرت آدمؑ کو وجود عطا کیا گیا تو اللہ نے یہ بات آدم کی گھٹی میں رکھ دی جو مجھ تک جبریل کے واسطے سے پہنچی ہے کہ دیکھنا ایسا دل پیدا نہ کرنا جو عقل کا غلام ہو جو عقل کے پیچھے چلنے والا ہو کیونکہ بہت سے مرحلے زندگی میں ایسے آتے ہیں جہاں عقل کے پیچھے چلنا خوار ہونا اور عشق کی پیروی کرنا بااعتبار اور معزز ہونا ہوتا ہے۔

⑤ **معانی: باطل:** جھوٹ۔ **دوئی پسند:** دو کو پسند کرنا۔ **حق:** سچائی۔ **لاشریک:** کسی کو شریک نہ کرنا۔

مطلب: باطل' اور کفر ایک خدا کی بجائے زیادہ خداؤں (بتوں) کو پسند کرتا ہے۔ جب کہ سچائی یا حق صرف ایک خدا کو پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ کسی اور کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے اے مسلمان تو بھی حق (صداقت / سچائی) اور باطل (باطل یا کفر) کے درمیان شرکت اور میل جول پسند نہ کر۔ اور حق کو باطل سے الگ رکھ۔ دنیا میں ہمیشہ حق کا ساتھ دے۔ چاہے عقل تجھے لاکھ کہے کہ اس میں یہ نقصان ہے اور وہ نقصان ہے اور باطل کے پیچھے کبھی نہ لگنا چاہے عقل تجھے لاکھ کہے کہ اس میں یہ فائدہ ہے اور وہ فائدہ ہے۔ عقل کی بجائے ہمیشہ عشق کو پیش نظر رکھنا کہ اسی میں حقیقی زندگی ہے۔

غزل

نہ میں اعجمی' نہ ہندی' نہ عراقی و حجازی — کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
تو مری نظر میں کافر' میں تری نظر میں کافر — ترا دیں نفس شماری' مرا دیں نفس گدازی
تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت — کہ موافق تدرواں نہیں دین شاہبازی
ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا — کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسم کارسازی
نہ جدا رہے نوا گر تب و تاب زندگی سے — کہ ہلاکی امم ہے یہ طریق نے نوازی

① **معانی: اعجمی:** غیر عربی' ایرانی۔ **ہندی:** ہندوستانی۔ **عراقی:** عراق کا۔ **حجازی:** حجاز کا۔ **خودی:** خود معرفتی' خودشناسی۔

مطلب: میرا تعلق کسی وطن سے نہیں ہے۔ مجھے میری خودشناسی و خود معرفتی نے مجھے یہ رمز سکھائی ہے کہ خودی والا کسی جغرافیائی وطنیت میں محدود نہیں ہوتا۔ وہ نہ خود کو حجازی کہلواتا ہے اور نہ عراقی' ہندی یا ایرانی بلکہ خود کو بندہ خدا کہلاتا ہے۔ خود کو مسلمان کہلاتا ہے۔ رنگ' نسل' خون' وطن کی حد بندیوں سے وہ آزاد ہے۔ جہاں جہاں خدا کا ملک ہے وہ اس کا ملک ہے۔ جو خودی کا راز پا لیتا ہے۔ وہ اس جہان سے اور آنے والے جہان سے دونوں جہانوں سے بے گانہ اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ سارے امتیازات مٹا کر فقط خدا کے لیے جیتا اور مرتا ہے۔

① **معانی:** **کافر:** دین سے بے گانہ' منکر' انکار کرنے والا۔ **نفس شماری:** سانس شمار کرنا۔ **نفس گدازی:** سانس گداز کرنا' سانس کا پگھلانا۔

مطلب مذہبی میدان میں' دو طبقات ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو دین کو پیشہ بنائے ہوئے ہے۔ اور دین بیچ کر دنیا کماتا ہے۔ یہ علمائے سو کا طبقہ ہے۔ ایک دوسرا طبقہ ہے جو روحانیت کا مالک ہے۔ غلط لوگ اس میں بھی ہوتے ہیں لیکن یہاں شاعر نے صحیح روحانی لوگوں کی بات کی ہے اور دونوں طبقات کو میں اور تو کی علامتوں میں ظاہر کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تو سانس گننے والا ہے یعنی تیری زندگی کا مقصد سانسوں تک محدود ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے جتنی دنیا کما ہوتی ہے کما لو اور میں سانس گننے کی بجائے سانس کو گداز کئے ہوئے (پگھلائے ہوئے) ہوں۔ تیرے اندر صرف علم ہے جو ہوس پر مبنی ہے۔ میرے اندر عشق ہے جس کی بنیاد اخلاص پر ہے۔ اب صورت حال یہ بنی ہوئی ہے کہ دنیا دار علما اور صوفی دین دار اور خدا آشنا علما اور صوفیوں کو کہتے ہیں کہ تم بے دین ہو اور جواب میں وہ یہ کہتے ہیں کہ تم بے دین ہو۔ اس طرح ملت کفرسازی کے فتووں کے تحت تقسیم بھی ہو رہی ہے اور مختلف طبقات میں نفرت بھی بڑھ رہی ہے۔

③ **معانی:** **تدرواں:** تذرواں بھی کہتے ہیں۔ چکوروں' تدرو' چکور۔ **دین شاہبازی:** بڑے باز کا دین۔

مطلب: تو کی علامت میں علمائے سو (غلط علما) اور فریب کار پیروں کو کہہ رہے ہیں کہ شریعت اور دین تو بڑے بڑے بازوں کا شکار ہیں یعنی ان کے لیے علمائے حق اور صوفیائے خدا شناس کا ہونا ضروری ہے تو شاہباز (بڑا باز جو بڑے بڑے پرندوں کو شکار کرتا ہے) نہیں رہا بلکہ چکور (تیتر کی ایک قسم) بن گیا ہے۔ تو بدلی ہوئی شریعت اور تبدیل شدہ دین ہی کے لائق ہے۔

④ **معانی:** **دشت و در:** جنگل اور بیاباں۔ **جنوں:** انتہائی عشق۔ **خرد:** عقل۔ **رہ و رسم کارسازی:** کام بنانے اور کام سنوارنے کا طور طریقہ۔

مطلب: اے عالم دنیادار اور اے صوفی حق گریز تیرے جنگل' صحرا اور بیابان میں مجھے عشق کی وہ انتہا نظر نہیں آتی کہ جو عقل کو کام بنانے اور کامیابی کے طور طریقے سکھا سکے اور عقل نے اس زمانے میں جو کام بگاڑ رکھے ہیں وہ اپنے مقصد اور اپنے دین سے جنوں کی حد تک جذبہ تعلق کی وجہ سے سدھر سکتے ہیں لیکن افسوس ہے تو اس جذبہ سے خالی ہے۔

⑤ **معانی:** **نواگر:** گانے والا۔ **تب و تاب زندگی:** زندگی کا سوز و ساز۔ **ہلاکی امم:** قوموں کی ہلاکت۔ **طریق نے نوازی:** بنسری بجانے کا طریقہ۔

مطلب: جو بنسری (یا ساز) بجانے والا سازندہ یا موسیقار زندگی کے سوز و ساز سے (عشق سے) بے گانہ ہوتا ہے وہ قوموں کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ ہر شاعر' ہر ادیب' ہر موسیقار' ہر فن کار' ہر ہنر مند شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے فن' ہنر' ادب' شعر اور سر میں سوز پیدا کرنے کے لیے اپنے اندر عشق پیدا کرے۔ جو شاعر عشق خالص و صادق سے خالی ہے اور جو موسیقار زندگی کی تپش و حرارت نہیں رکھتا اس کی شاعری' اس کا فن' اس کا ساز' اس کا گانا ہلاکت اقوام کا سبب ہے۔ ان کو چاہیے کہ اپنے اندر اخلاص اور سوز پیدا کریں تاکہ ان کے فن سے مردہ قوموں میں زندگی پیدا ہو جائے۔

بیداری

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و برّاق

اس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اشراق

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے، وہ صاحبِ آفاق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیِ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

معانی: **بیداری:** نیند سے جاگنا' زندہ ہونا۔

① **معانی:** **بندہ حق:** اللہ کا بندہ۔ **خودی:** خود شناسی۔ **بیدار:** جاگ اٹھی' زندہ ہو گئی۔ **شمشیر:** تلوار۔ **برندہ و براق:** کاٹنے والی اور چمک دار بجلی کی مانند۔

مطلب: بندے دو طرح کے ہیں ایک اللہ کے (رحمٰن کے) بندے اور دوسرے ابلیس (شیطان) کے غلام۔ اللہ کے بندوں میں سے یا حق کا ساتھ دینے والوں میں سے جس بندہ کو اپنی معرفت (خودی) حاصل ہو جاتی ہے اس بندہ کو عام بندوں کی طرح نہ سمجھو وہ اپنی روحانی طاقتوں اور جسمانی و اعصابی قوتوں کے اعتبار سے بجلی کی طرح کوندتی اور چمکتی ہوئی اور تیز کاٹ والی تلوار کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی یہ تلوار جس پر چلے وہ فنا ہو جائے اور وہ جو ارادہ کرے وہ ہو کر رہے۔

② **معانی:** **نگہ:** نگاہ' نظر۔ **نمودار:** ظاہر ہونا۔ **اشراق:** طلوع ہونا۔ **نگہ شوخ:** ناز بھری نگاہ۔ **قوت:** طاقت۔

مطلب: جو اللہ کا بندہ قرب حق کی منزل پر ہوتا ہے اس کی ناز بھری نظر میں وہ طاقت صاف دکھائی دیتی ہے جو ذروں کے اندر سورج کی روشنی کی طرح چھپی ہوئی ہوتی ہے یعنی اس پر کائنات کے خفی و جلی سب بھید ظاہر ہوتے ہیں۔ بندہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے تو اس پر اسے ناز بھی ہوتا ہے اور اللہ اس میں عجیب و غریب اور فوق الفطرت و عادت قوتیں بھی پیدا کر دیتا ہے۔

③ **معانی:** **مردِ خدا:** خدا کا مرد' مقرب خدا۔ **نسبت:** تعلق۔ **بندہ:** غلام۔ **بندہ آفاق:** کائنات کا غلام۔ **صاحب آفاق:** کائنات کا مالک۔

مطلب: اے جدید دور کے انسان اے اسلام اور مومن کی قوتوں کو بھولے ہوئے آج کے مسلمان تیرا خدا کے اس مرد سے جس کی صفات مذکورہ بالا دو شعروں میں بیان ہوئی ہیں کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ کائنات کا مالک ہے اور تو کائنات کا غلام ہے۔ وہ کائنات کا راکب (سوار) ہے اور تو کائنات کا مرکب (سواری ہے)۔

④ **معانی:** **پیدا:** ظاہر۔ **ساحل:** دریا کا کنارہ۔ **پاکی فطرت:** جبلت کی پاکیزگی۔ **محرم اعماق:** گہرائیوں سے واقف' اعماق عمق کی جمع ہے جس کے معنی گہرائی ہے۔

مطلب: اے موجودہ دور کے مسلمان اور انسان تجھ میں تو دریا ئے کے کنارے تک جانے کی بھی خواہش نہیں تو خدا سے' دین سے' قوانین قدرت سے بہت دور ہو گیا ہے۔ تیرے برعکس اللہ کے اس بندے کی

جو اس کے قریب ہے اور صرف اس کا غلام ہے یہ شان ہے کہ وہ دریا یا سمندر کی تہ در تہ گہرائیوں سے واقف ہے۔ مراد ہے اس پر کائنات کے جملہ اسرار (بھید) ظاہر ہیں جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اسے سب قوتیں عطا کر دیتا ہے۔ مسلمانوں کے اولیا، فقرا اور درویش بھی اسی شان کے مالک تھے اور اگر کہیں آج بھی ہوں گے تو یہ شان بھی رکھتے ہوں گے۔

خودی کی تربیت

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سِرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز

① **معانی: مشتِ خاک:** مٹی کی مٹھی مراد ہے آدمی۔ **تربیت:** اصلاح کا اور سلیقہ سکھانے کا عمل۔ **موقوف:** مبنی۔ **آتشِ ہمہ سوز:** سب کچھ جلا دینے والی آگ، آتش کے معنی آگ ہمہ سوز کے معنی سب کچھ جلا دینے والی۔

مطلب: آدمی کا جسم مٹی کا بنا ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مٹی کے اس جسم میں ایک ایسی آگ (نور) پیدا ہو سکتی ہے جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی خودی (خود شناسی) کو خاص سلیقے اور طریقے سے پالے۔ یہ سب کچھ خودی کی تربیت اور پرورش پر مبنی ہے۔

② **معانی: سرِ کلیمی:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم تھا کیونکہ وہ خدا سے ہم کلام ہوتے تھے۔ سر کے معنی بھید۔ موسیٰ علیہ السلام کا اللہ سے ہم کلام ہونے کا بھید۔ **دشت:** بیابان، جنگل۔ **شعیب:** ایک برگزیدہ پیغمبر تھے جن کی بکریاں حضرت موسیٰ چرایا کرتے تھے اور جن کی صحبت میں ان کی تربیت ہوئی تھی۔ **شبانی:** بھیڑ بکری چرانا، گڈریا بننا۔ **شب و روز:** دن رات۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ اے مخاطب آ، میں تجھے اللہ سے ہم کلام ہونے کا بھید بتاؤں۔ اس بھید کے پیچھے جو بات ہے وہ ہر زمانے میں ایک سی رہی ہے اور رہے گی۔ وہ بات کیا ہے؟ وہ راز کیا ہے؟ وہ راز یہ ہے کہ جو شخص اللہ کا مقرب بننا چاہتا ہے اس کے لیے اس حد تک اس کے قریب ہونا چاہے کہ اس سے حضرت موسیٰ کی طرح ہم کلام ہو سکے، اسے ایک تو جنگل اور بیابان میں جا کر مشاہدہ فطرت کرنا چاہیے اور آبادیوں کے شور و غل اور افراتفری سے الگ ہو کر خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ دوسرے محنت کی عادت ڈالنی چاہیے۔ دیکھیے حضرت موسیٰ اللہ کا ذکر بھی کرتے تھے اور بھیڑ بکریاں بھی چراتے تھے۔ یہ محنت بھی تھی اور رزق حلال کا ذریعہ بھی۔ ذکر کے لیے ریاضت اور رزق حلال ضروری شرط ہے اور تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ خدا کا راستہ بتانے والا کوئی راہبر ہو۔ کوئی مرشد بھی ہو جو اس کی تربیت کر سکے اور دن رات اسے اللہ کے ذکر میں اور اس کے مشاہدے میں لگائے رکھے اور اپنی راہنمائی سے اس کو صحیح راہ پر رکھے اور سلوک کی منزلوں میں جو رکاوٹیں آتی ہیں ان کو دور کرے۔ مراد یہ ہے کہ بغیر رہنما یا مرشد کے کوئی شخص بھی اللہ کو نہیں پا سکتا۔ جس طرح حضرت موسیٰ نے حضرت شعیب کی صحبت اختیار کی ضروری ہے کہ وہ شخص جو اللہ کا قرب چاہتا ہے وہ بھی مرشد پکڑے۔ صحیح، صادق اور اللہ کا مقرب مرشد۔ پھر بیابانوں اور جنگلوں میں شہروں کے شور و غل سے دور ہو کر اس مرشد کی راہنمائی کے بعد جب سلوک

کی منزلیں طے کر لے تو پھر دنیا کی طرف اس طرح رجوع ہو کہ دل حق کے ساتھ ہو اور ہاتھ کام میں۔ پھر وہ حضرت موسیٰؑ کی طرح فرعونی قوتوں سے ٹکرائے۔ انسانوں کی صحیح راہنمائی کرے اور بغیر کسی خوف و خطر کے مسند ارشاد پر بیٹھ کر اللہ کے بندوں کی اصلاح کرے۔ طریقت کا مسلک جو مسلمانوں میں ہے اس کا یہی مقصد ہے اور یہی عمل ہے۔ طریقت' فقر' تصوف اور درویشی ہی کا نام ہے۔

آزادیِ فکر

آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

① **معانی:** تدبر: دور اندیشی۔ سلیقہ: شعور' تمیز۔

مطلب: جو لوگ سوچ بچار اور دور اندیشی کا شعور اور تمیز نہیں رکھتے اگر وہ اپنے افکار و خیالات میں آزادی اختیار کریں گے تو یہ ان کی تباہی کا موجب ہو گا۔ آزادی کسی اصول اور طریقہ کے اندر رہتے ہوئے ہونی چاہیے نہ کہ مادر پدر آزادی جیسا کہ آج کل عام ہے۔

② **معانی:** خام: ناپختہ۔ فکر: خیال' سوچ۔

مطلب: اگر آدمی کا خیال اور اس کی سوچ ناپختہ ہو تو اس کی آزادی خیال و فکر اسے انسان سے حیوان بنا دے گی جیسا کہ آج کے دور کے لوگ خصوصاً مغربی تہذیب و تمدن اور سیاسی افکار کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔

خودی کی زندگی

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد — نہنگِ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

① **معانی:** فقر: لغوی معنی تنگ دستی' اصطلاح درویشی۔ سنجر و طغرل: طغرل خاندان سلجوق کا ایک بادشاہ۔ سنجر: ایک شان والا شاہ۔ شکوہ: ہیبت' جلال۔ فقیر: صاحب فقر۔ درویش۔

مطلب: اگر خودی (خود معرفتی) زندہ ہو اور درویش کو اپنے مقام کا علم ہو اور وہ صحیح فقیر ہو تو اس کا فقر شہنشاہی سے کم نہیں ہے۔ ایک صاحب فقر کی ہیبت اور جلال طغرل اور سنجر جیسے پر شکوہ اور پر ہیبت بادشاہوں سے کم نہیں ہوتی۔ شرط یہ ہے کہ فقیر واقعی اسلامی فقر کا حامل ہو گداگر اور مکار نہ ہو۔

② **معانی:** دریائے بیکراں: وہ دریا جس کا کوئی کنارہ نہ ہو۔ پایاب: دریا کی اتنی سطح کہ آدمی پاؤں رکھ کر اس پر سے گزر سکے۔ پرنیاں و حریر: ریشمی کپڑوں کے نام ہیں۔ کہسار: پہاڑوں کا سلسلہ۔

مطلب: اگر مرد فقیر کی خودی (خود معرفتی) زندہ ہو تو وہ دریا جو کنارہ نہیں رکھتے یعنی بڑے چوڑے ہوتے

ہیں وہ ان کی سطح پر بھی پاؤں رکھ کر گزر جاتا ہے۔ اس کے لیے وہ دریا ایک قدم کی عبوری سے زیادہ نہیں ہوتے اور پہاڑوں کا سنگلاخ سلسلہ ان کے لیے نرم اور ملائم ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مردِ فقیر کے آگے (بشرطیکہ وہ واقعی اسلامی فقر کا حامل ہو) سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل کام اور مہمیں آسان ہوتی ہیں۔ اس کی ایمانی اور روحانی طاقت کے آگے ہر بڑی طاقت اور ہر بڑی مشکل زیر ہو جاتی ہے۔

③ **معانی:** **نہنگ:** مگرمچھ۔ **محیط:** سمندر۔ **سراب:** خیالی پانی جو صحرا میں ریت کی گرمی کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ **زنجیر:** قید۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے مسلمان مردِ فقیر کو' صادق اور سچے درویش اسلامی کو ایسے زندہ مگرمچھ سے تشبیہ دی ہے جو سمندر کی وسعت میں آزادی سے جیتا ہے اور جو شخص جعلی فقیر ہو' اور مری ہوئی خودی والا درویش ہے اس کی مثال ایسے مردہ مگرمچھ سے دی ہے جو سراب یعنی ریت سے پیدا شدہ غلط اور خیالی پانی کے سمندر میں قید ہوتا ہے۔ صاحبِ خودی فقیر کے لیے بڑے بڑے سمندروں کی موجیں یعنی بڑی بڑی مشکلات بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتیں لیکن وہ درویش جو خودی سے بے گانہ ہو وہ خیالی پانی میں سردار کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی خیالی موجیں اس کو قید کر لیتی ہیں۔ وہ کسی کام کا نہیں۔ وہ مشکلات سے ٹکراتا نہیں گھبراتا ہے۔ اس کے پاس کوئی روحانی اور ایمانی قوت نہیں ہوتی۔

حکومت

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و ملّا کو بری لگتی ہے درویش کی بات

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات

گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات

قسمتِ بادہ، مگر حق ہے اسی ملت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

① **معانی:** **گوارا:** پسند۔ **حق:** سچی' **شیخ و ملّا:** مذہبی علما اور راہنما' **درویش:** فقیر' ولی' صوفی۔

مطلب: اگر کوئی پیر (سچا اور صادق پیر) اپنے مریدوں کو کوئی سچی اور خدا لگتی بات کہتا ہے تو وہ تو اسے مان لیتے ہیں لیکن یہ پیشہ ور اور دین فروش ملا اس کی بات پر کان نہیں دھرتے۔ وہ اسے محض درویش کی بات سمجھ کر پسند نہیں کرتے۔

② **معانی:** **ہاتھ سے جانا:** کھو دینا' ضائع کر دینا۔ **متاعِ کردار:** عمل کی دولت۔ **بحث میں آنا:** کسی بات میں موشگافیاں کرنا' جھگڑنا۔ **فلسفہ ذات و صفات:** ذات سے مراد اللہ کی ذات اور صفات سے مراد بھی اللہ کی صفات۔ ایسی فکر یا ایسا فلسفہ جو اس بات کی موشگافیوں اور جھگڑوں میں پڑا رہے کہ ذات کیا ہے اور اس کی صفات کیا ہیں اور ان میں کیا تعلق ہے؟

مطلب: جب کوئی قوم خصوصاً ملت اسلامیہ اس جھگڑے میں پڑی رہے اور اس بات میں موشگافیاں کرتی رہے کہ ذات باری تعالیٰ کیا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ ان کا آپس میں تعلق کیا ہے؟ تو وہ قوم عمل سے بے گانہ ہو جاتی ہے اور لفظی بحثوں میں اپنا وقت ضائع کر دیتی ہے۔ مسلمانوں میں اس قسم کی بحثیں

عام ہیں۔ عمل کی طرف توجہ نہیں اور مختلف قسم کے افکار اور عقائد پر لفظی بحثیں اور جھگڑے ہو رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں قوم بے عمل ہی نہیں ہوئی بلکہ آپس میں بٹ بھی گئی ہے اور وہ کئی اعتبارات سے دشمنی کی حد تک تقسیم ہو گئی ہے۔

③ **معانی:** دیرِ کہن: پرانا جہان۔ دستورِ قدیم: پرانا دستور یا قانون۔ میکدہ: بے خانہ۔ مینا: صراحی۔ ثبات: ہمیشہ رہنا۔

مطلب: اگرچہ اس قدیم جہان کا جو صدیوں سے قائم ہے قانون اور اصول یہ ہے کہ یہاں کے میخانہ کو اور اس کی کسی چیز کو بھی ہمیشگی نصیب نہیں۔ یہ مے خانہ بدلتا رہتا ہے۔ ساقی ایک کے بعد ایک نیا آتا رہتا ہے صراحیاں اور پیالے ٹوٹتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے برتن آجاتے ہیں۔ مراد ہے جہان انقلابات اور اور تغیرات سے دوچار رہتا ہے۔

4) **معانی:** بادہ: شراب۔ ملت: قوم۔ انگبیں: شہد۔ تلخابِ حیات: زندگی کا زہر، زندگی کی سختیاں۔

مطلب: اگرچہ مے خانہ جہان کو ثبات نہیں لیکن اس مے خانہ سے شراب لینے اور شراب پینے کا حق صرف اسی قوم کو ہے جس کے جوان زندگی کے زہر اور سختیوں کو شہد اور آسانیاں سمجھ لیں۔ سخت سے سخت وقت اور مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کر سکیں۔ ایسی جوانوں والی قوم کو زندہ رہنے اور حکومت کرنے کا حق ملتا ہے لیکن جو سختیوں سے گھبراتی ہے وہ قوم غلام بنی رہتی ہے۔

ہندی مکتب

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی — موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

معانی: ہندی مکتب: متحدہ ہندوستان (بھارت و پاکستان کے علاقے) کے مدرسے۔

① **معانی:** علمِ خودی: خود معرفتی کا علم۔ مکتب: مدرسہ۔ موزوں: مناسب۔ مقالات: مقالہ کی جمع، مضامین

مطلب: اے اقبالؒ یہ انگریز کے قائم کیے ہوئے برصغیر میں جو سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں یہاں خودشناسی اور خود معرفتی کے علم کی یا خودی کی بات نہ کر۔ ان کے نصاب میں ایسے مضامین شامل کرنا مناسب نہیں کیونکہ ان تعلیمی اداروں کے طالب علم انگریزی اور انگریزی تہذیب و تمدن کی بنا پر اپنی قومی و مذہبی شناخت سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ ان کو خودی کے مضامین راس نہیں آئیں گے۔

معانی: ممولوں: ممولہ کی جمع، پوشیدہ، چھپے ہوئے، ایک چھوٹی اور کمزور چڑیا۔ احوال و مقامات: کیفیات و مراتب، باز: عقاب، بیچارہ: بے کس، کمزور

مطلب: اقبال کہتا ہے کہ انگریزی نصاب تعلیم اور تہذیب و تمدن نے درس گاہوں میں پڑھنے والوں کو شاہبازوں سے کمزور چڑیاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس لئے ان کے سامنے بازوں کی کیفیات اور مرتبوں کی بات کرنا بے سود ہے۔ وہ اسے نہ سمجھیں گے اور نہ اس پر عمل کریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ باز کے احوال و مقامات کے مضامین ان سے چھپے ہی رہیں۔

③ **معانی:** **آن:** لحہ۔ **گراں سیر:** سست رفتار۔ **محکوم:** غلام۔ **اوقات:** وقت کی جمع۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے آزاد اور محکوم کی زندگی کا مقابلہ کیا ہے اور کہا ہے کہ آزاد شخص کا ایک لحہ محکوم کے ایک سال کے برابر ہوتا ہے۔ آزاد ایک لحہ میں وہ کچھ کر گزرتا ہے جو غلام سالوں میں نہیں کر پاتا۔ غلاموں کی زندگی کے سال بڑے سست رفتار ہوتے ہیں۔ یہ سست رفتاری زمانے کے اعتبار سے نہیں عمل کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

④ **معانی:** **لحظہ:** لحہ۔ **پیام ابدیت:** ہمیشگی کا پیغام۔ **مرگ مفاجات:** ناگہانی موت۔

مطلب: آزاد کے ایک ایک لحہ میں ہمیشگی کا پیغام ہوتا ہے اور غلام کا ایک ایک لحہ ناگہانی موت ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آزاد قوم کا آزاد شخص ایک ایک لحہ میں وہ عملی اور یادگار کام کرتا ہے جس سے وہ خود بھی بنتا ہے اور اس کی قوم بھی بنتی ہے لیکن غلام قوم کا شخص غلامی کی وجہ سے ذلت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ عمل سے خالی ہو جاتا ہے اور اس کا ایک ایک لحہ زندگی نہیں موت ہوتا ہے۔ وہ اپنے آقاؤں کی خواہش پر جیتا ہے اپنی خودی اور معرفت کھو بیٹھتا ہے۔

⑤ **معانی:** **اندیشہ:** فکر، فلسفہ، عقل۔ **حقیقت:** صحیح اور اصل بات۔ **منور:** روشن۔ **گرفتار خرافات:** فضول باتوں میں جکڑا ہوا۔

مطلب: آزاد شخص کا فکر، اس کا فلسفہ اور اس کی عقل اصل اور صحیح باتوں سے روشن ہوتی ہے جب کہ غلام کا فکر و فلسفہ اور خیال فضول باتوں میں لگا رہتا ہے۔

⑥ **معانی:** **کرامات:** مافوق الفطرت باتیں۔ **پیر:** روحانی پیشوا۔ **سودا:** لگن، جنوں۔

مطلب: غلام چونکہ عملاً بے کار ہو چکا ہوتا ہے اس لیے وہ روحانی رہنماؤں کی طرف سے کسی مافوق الفطرت یا عادت کے خلاف اور قانون فطرت سے ہٹ کر کسی کام کے ہونے کی لگن رکھے ہوئے ہوتا ہے کہ شاید غائب سے کوئی ایسی بات ہو جائے جو اس کی کامیابی کی ضمانت ہو یعنی وہ فضول بنیادوں پر اپنی ترقی اور زندگی کی عمارت تعمیر کرتا ہے جب کہ آزاد شخص کا ایک ایک لحہ خود کرامت ہوتا ہے۔ وہ ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیتا ہے کہ اسے مافوق الفطرت سہاروں کی ضرورت نہیں رہتی۔

⑦ **معانی:** **تربیت:** پرورش، اصلاح۔ **محکوم:** غلام۔ **موسیقی:** گانا بجانا۔ **صورت گری:** تصویر کشی، مصوری۔ **علم نباتات:** نباتات کی چیزوں کا علم۔

مطلب: غلام قوموں کے مدرسوں میں حاکم قومیں ایسا نصاب رائج کرتی ہیں جس سے وہ حقیقی علم حاصل نہ کر سکیں اور آزادی کی لذت سے بھی محروم کر دی جائیں ان کے لیے گانا بجانا، تصویریں بنانا اور نباتات قسم کے علوم سے واقفیت حاصل کروانا ہی ان کی تربیت (پرورش و اصلاح) کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ آزاد

قوموں کے نصاب میں وہ علوم ہوتے ہیں جو ان کو ترقی سے آشنا کر سکیں۔ غلام قوموں کو وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جن سے ان میں زوال پذیری کی صورتیں پیدا ہوں۔

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

معانی: تربیت: پرورش، اصلاح۔

① **معانی:** شے: چیز۔ **سوزِ جگر:** جگر کا جلانا۔ **سوزِ دماغ:** دماغ کا جلانا۔

مطلب: شاعر اس نظم میں یہ بتانا چاہتا ہے کہ جب تک آدمی کی تربیت (اصلاح) نہ ہو علم بے کار ہے۔ اصل زندگی تربیت مانگتی ہے۔ صرف علم فائدہ مند نہیں ہے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ زندگی اور علم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ زندگی خونِ جگر پینے یا جگر کی تپش کا نام ہے۔ عشق سے آشنا ہونے کا نام ہے جب کہ علم صرف دماغ کو جلاتا ہے۔ اس میں صرف دماغ خرچ ہوتا ہے۔ اس سے زندگی کی اصل حقیقت ہاتھ نہیں آتی۔ وہ علم جو آدمی کی انسانی اور روحانی پرورش نہیں کرتا بے کار ہے۔

② **معانی:** قدرت: طاقت۔ **لذت:** ذائقہ۔ **ہاتھ آنا:** ملنا۔ **سراغ:** نشان، پتہ۔

مطلب: علم میں دولت حاصل کرنے، اشیا پر قابو پانے کی طاقت پیدا کرنے اور کئی قسم کی دماغی اور جسمانی ذائقوں اور لذتوں کے وصف موجود ہیں لیکن اس میں بڑی کمی یہ ہے کہ اس کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنا پتہ نہیں ملتا کہ میں کون ہوں اور کیوں ہوں یعنی وہ خود سے بے گانہ رہتا ہے۔

③ **معانی:** اہلِ دانش: دانا، فکر والے، علم والے۔ **کم یاب:** کم ملتے ہیں۔ **اہلِ نظر:** نظر رکھنے والے، مشاہدہ ذات کرنے والے۔ **ایاغ:** پیالہ۔

مطلب: علم والے تو عام ملتے ہیں لیکن نظر والے (جن کو حقیقت دکھائی دے چکی ہو جو مشاہدہ حق کر چکے ہوں) بہت کم ملتے ہیں۔ اے مخاطب اگر تو علم کی بجائے اہلِ نظر کی صحبت اختیار کرتا تو تیری زندگی کا پیالہ زندگی کی حقیقت کی شراب سے خالی نہ رہتا۔ تجھے بھی اپنا اور اپنی زندگی کا بھی پتہ مل جاتا اور تو آدمی نما حیوان نہ رہتا۔

④ **معانی:** شیخِ مکتب: استاد۔ **کشادِ دل:** دل کا کھلنا۔ **کبریت:** دیا سلائی۔ **چراغ:** دیا

مطلب: آج کل کے مدرسوں میں استاد جو کچھ پڑھاتے ہیں ان کے طریقہ تعلیم سے طالب علم کا دل کیسے کشادگی حاصل کر سکتا ہے یعنی نہیں حاصل کر سکتا اس سے دل زندہ نہیں ہوتا ہے، مرجاتا ہے اور جب دل مرجاتا ہے تو آدمی آدمی نہیں رہتا حیوان بن جاتا ہے۔ کیا دیا سلائی سے بجلی کا چراغ (بلب) روشن کیا جا سکتا ہے۔ ہرگز

نہیں ہے اسی طرح موجودہ طریقہ تعلیم سے جو انگریزی حکومت نے ایک خاص مقصد کے لیے رائج کیا تھا دماغ تو روشن ہو جاتا ہے لیکن دل تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ علم کا اصل مقصد طالب علم کی روحانی اور انسانی تربیت ہے جو موجودہ دور کے مدارس اور مدرس پورا نہیں کر رہے۔

خوب و زشت

ستارگانِ فضا ہائے نیلگوں کی طرح ۔۔۔ تخیلات بھی ہیں تابعِ طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب ۔۔۔ یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو، وہ جمیل ۔۔۔ جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب

معانی: خوب و زشت: اچھائی اور برائی۔

① **معانی:** **ستارگان فضاہائے نیلگوں:** نیلے آسمان کی فضا کے ستارے۔ **تخیلات:** خیالات۔ **تابع طلوع و غروب:** نکلنے اور چھپنے کے ماتحت۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے انسان کے خیالات کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ جس طرح نیلے آسمان کی فضاؤں میں ستارے کبھی نکلتے ہیں اور کبھی چھپ جاتے ہیں اسی طرح انسان کے خیالات بھی ہمیشہ ایک جیسے اور ایک سطح پر نہیں رہتے بلکہ بدلتے رہتے ہیں اور ستاروں کی طرح نکلتے اور ڈوبتے رہتے ہیں۔ خیالات بھی ستاروں کی مانند یعنی کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی چھپ جاتے ہیں۔

② **معانی:** **صاحب فراز و نشیب:** بلندی اور پستی کا مالک۔ **معرکہ آرا:** جنگ یا تصادم میں مصروف۔ **خوب:** اچھائی۔ **ناخوب:** برائی۔

مطلب: جس طرح ہماری خارجی دنیا میں بلندی اور پستی دونوں موجود ہیں اور ان میں تصادم رہتا ہے۔ کبھی خوبی برائی پر اور کبھی برائی خوبی پر فتح یاب ہوتی ہے۔ اسی طرح ہماری داخلی دنیا یعنی خودی (خود معرفتی) کی دنیا میں بھی اچھائی اور برائی میں جنگ برپا رہتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے پر فتح یاب ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔

③ **معانی:** **نمود:** ظہور۔ **فراز خودی:** خودی کی بلندی۔ **جمیل:** حسین۔ **نشیب:** پستی۔ **قبیح:** بری۔ **نامحبوب:** غیر پسندیدہ۔

مطلب: پہلے دو شعروں میں شاعر نے انسانی خیالات کی طرح انسانی خودی (خود شناسی) کے بلند اور پست یا اچھے اور برے ہونے کی جو بات کی ہے تیسرے شعر میں اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے شاعر یہ کہتا ہے کہ جس خیال کی اور جس چیز کا خودی کی بلندی سے ظہور ہو وہ خیال اور وہ شے حسین ہے اور جو خیال اور جو شے خودی کی پستی سے (یعنی جس میں صحیح خودی نہ ہو) سے وجود میں آئے وہ بات' وہ خیال اور وہ شے بری بھی اور ناپسندیدہ بھی ہے۔

مرگِ خودی

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

خودی کی موت سے رُوحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

معانی: **مرگِ خودی:** خودی کی موت۔ **خودی:** بمعنی خودمعرفتی' اپنی پہچان۔

① **معانی:** **اندروں:** باطن۔ **مبتلائے جذام:** کوڑھ کے مرض میں مبتلا۔

مطلب: اس پوری نظم میں اقبال نے خودی (خودشناسی) کی موت کا یا نہ ہونے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے نہ ہونے سے اہلِ مغرب کے باطن میں اندھیرا ہے اور مشرق والے بھی اس کے نہ ہونے سے دینی اور اخلاقی اعتبار سے کوڑھ جیسے مرض میں مبتلا ہیں جو بڑا مہلک ہے۔

② **معانی:** **بے تب و تاب:** بغیر تپش اور تڑپ کے۔ **عراق و عجم:** یعنی عراق اور ایران۔ **عروق:** عرق کی جمع یعنی رگیں۔ **عظام:** عظم کی جمع یعنی ہڈیاں۔

مطلب: خودی کے نہ ہونے یا اس کے مرجانے کے نتیجے میں میں نے اہلِ عرب کو دیکھا ہے کہ ان کی جان میں نہ حرارت ہے اور نہ تڑپ ہے۔ میں نے عراق اور ایران کے جسموں کو بھی دیکھا ہے یعنی ان ملکوں کے لوگوں کو بھی دیکھا ہے ان میں نہ رگیں ہیں اور نہ ہڈیاں ہیں اور جس جسم میں نہ رگیں ہوں اور نہ ہڈیاں ہوں وہ بیکار یا مردہ جسم ہوتا ہے۔

③ **معانی:** **شکستہ بال:** ٹوٹے ہوئے بازو یا پر۔ **قفس:** پنجرہ۔ **آشیانہ:** گھونسلہ۔

مطلب: اس شعر میں علامہ اقبال نے اس ہندوستان کی بات کی ہے جو انگریز کا غلام تھا اور کہا ہے کہ اس ملک کے رہنے والے ان پرندوں کی طرح ہیں جن کے پر اور بازو ٹوٹ چکے ہوں اور وہ پنجرے میں رہنے کو تو جائز اور پسندیدہ سمجھتے ہوں لیکن اپنے گھونسلے میں رہنے کو حرام یا برا جانتے ہوں۔ مراد یہ ہے کہ اہلِ ہند اپنی غلامی پر رضامند ہیں اور آزادی کے لیے کوشش نہیں کر رہے۔

④ **معانی:** **پیرِ حرم:** حرم کا پیر یعنی مسلمانوں کا پیشوا۔ **جامہ احرام:** حاجیوں کے جسم پر کا لباس۔

مطلب: خودی کی موت کا ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ مسلمانوں کے پیشوا اور دینی رہنما حاجیوں کے جسم پر پہنا ہوا احرام (لباس) تک بیچ کھانے پر مجبور ہیں یعنی وہ اپنے مفاد' اپنی غرض اور اپنی شکم پروری کے لیے دین تک کو بیچ رہے ہیں۔ اگر وہ خودی یعنی خودشناسی سے آشنا ہوتے تو ایسا کبھی نہ کرتے اور غریبی میں بھی امیری کے مزے لیتے۔

مہمانِ عزیز

پر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

① **معانی : افکار**: فکر کی جمع' خیالات۔ **پر ہے**: بھرا ہوا ہے۔ **ضمیر**: دل' ذہنیت۔ **خوب و ناخوب**: اچھا اور برا۔

مطلب: علامہ نے اس شعر میں ان مدرسوں کی بات کی ہے جو انگریزی نظامِ تعلیم و نصاب رائج کیے ہوئے ہیں جن میں طالب علم مغرب کی تہذیب و تمدن کا شکار ہو کر اپنی معرفت بھول چکا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ ان مدرسوں میں جو طالب علم پڑھتے ہیں اور استاد پڑھاتے ہیں سب کے دل یا ذہنیتیں عقلی باتوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بھری ہوئی ہیں اور عشق سے خالی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے تعلیم یافتہ اچھائی اور برائی میں فرق روا نہیں رکھتے بلکہ یہاں تک ہے کہ ناخوب کو (برائی کو) انہوں نے خوب (اچھائی) بنا رکھا ہے۔

② **معانی : مہمانِ عزیز**: پیارا مہمان۔ **خانہ دل**: دل کا گھر۔

مطلب: اس شعر میں علامہ ان لوگوں کو جن کی بات انہوں نے پہلے شعر میں کی ہے یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنے پورے دل کو مغرب کی تہذیب و ثقافت کے خیالات سے نہ بھر لینا بلکہ اپنے دل کے گھر کا کوئی کونہ ان سے خالی ضرور رکھنا کہ شاید کہیں سے کوئی پیارا مہمان آ کر اس میں بس جائے۔ مراد یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی گنجائش ضرور رکھنا کہ تم بھولے ہوئے دین کو یاد کر سکو اور اس طرح مغرب کے خیالات سے آزاد ہو سکو۔ اگر پورا دل ہی مغربی افکار میں ڈوب گیا تو پھر اپنے دین اور اپنے دینی افکار و خیالات کی طرف آنا ناممکن ہو گا۔

عصرِ حاضر

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

معانی: **عصرِ حاضر**: موجودہ زمانہ۔

① **معانی**: **پختہ افکار**: پکے اور صحیح خیالات۔ **خام**: کچا۔

مطلب: زمانہ جدید جو کاملاً" مغربی تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات میں غرق ہو چکا ہے اسکی بات کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں پکے اور صحیح خیالات ڈھونڈنے ہم کہاں جائیں (یعنی وہ کہیں نہیں ملیں گے) کیونکہ اس زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے جس نے ہر پختہ (پکی ہوئی) چیز کو خام (کچا) بنا رکھا ہے۔

② **معانی**: **بے ربط و نظام**: بغیر کسی ترتیب اور تنظیم کے۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے انگریزی تہذیب و تمدن کے تحت قائم ہونے والے مدرسوں کی خرابی کا

ذکر کیا ہے کہ ان مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اور جو نصاب پڑھائے جاتے ہیں ان سے طالب علموں کی عقل آزاد ہو جاتی ہے یعنی وہ مادر پدر آزاد عقل کے مالک بن جاتے ہیں اور پختہ اور اچھی باتوں کو ماننے کی بجائے ان میں مین میخ نکالتے رہتے ہیں۔ وہ جذبہ اور وہ عشق جن کی وجہ سے کبھی ایک طالب علم کے ذہن میں خیالات و افکار کی تنظیم اور ترتیب رہتی تھی اب اس سے وہ بالکل ناآشنا ہو جاتا ہے اور نتیجتاً قوم کے نوجوان انتشار خیالات اور آوارگی کردار کے مالک بن جاتے ہیں۔

③ **معانی:** **لادینی افکار:** خیالات کا بے دین ہونا۔ **بے ربطی افکار:** خیالات میں ترتیب و تنظیم نہ ہونا۔ **افرنگ:** اہل مغرب۔

مطلب: اہل مغرب میں ان کے خیالات کی بے دینی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ دین سے الگ ہو گئے ہیں اور ان میں عشق کی روح مر گئی ہے۔ دوسری طرف اگر ہم اہل مشرق کو دیکھیں تو ان میں خیالات کی بے ترتیبی اور بے تنظیمی کی وجہ سے عشق تو ختم ہوا ہی تھا عقل بھی اہل مغرب کی غلام بن کر رہ گئی ہے اور وہ وہی کچھ کہتے اور وہی کچھ سوچتے ہیں جو مغرب والے کہتے اور سوچتے ہیں۔

طالب علم

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو ۔۔۔ کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں

① **معانی:** **اضطراب:** بے قراری، طوفان۔ **بحر:** سمندر۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے دور جدید کے مدرسوں میں پڑھنے والے ان طالب علموں کو جو اہل مغرب کے افکار و خیالات اور ان کی تہذیب و ثقافت کا شکار ہو چکے ہیں کہا ہے کہ تم ایک ایسے سمندر کی مانند ہو جس کی لہروں میں کوئی تڑپ اور بے قراری نظر نہیں آتی۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہاری زندگی کے سمندر کو کسی طوفان سے آشنا کر دے یعنی تمہارے اندر صحیح زندگی، انسانیت اور صحیح مسلمانی کا جذبہ اس حد تک پیدا ہو جائے جیسا کہ سمندر میں طوفان ہوتا ہے۔

② **معانی:** **فراغ:** فرصت۔ **کتاب خواں:** کتاب پڑھنے والا۔ **صاحب کتاب:** کتاب کا مالک یعنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس پر عمل کرنے والا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ جدید درسگاہوں کے طالب علم کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ تجھے کتابیں پڑھنے سے فرصت نہیں اور تو کتابی کیڑا بنا ہوا ہے۔ تو کتاب پڑھتا ضرور ہے لیکن اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر عمل کی تجھے توفیق نہیں ہے۔ یہاں علامہ کی مراد ان کتابوں پر عمل کی نہیں ہے جو نصاب جدید میں موجود ہیں اور طالب علموں کو گمراہ کر رہی ہیں بلکہ ایسی کتابوں کی طرف اشارہ ہے جن کو پڑھ کر طالب علم صحیح انسان بن جائیں۔ ایسی کتابیں جدید نصاب میں تو نایاب ہیں البتہ الہامی کتاب قرآن یا اس کی روشنی لیے ہوئے دوسری کتابوں کی صورت میں کتابیں موجود ہیں لیکن ان پر بھی آج کا طالب علم عمل کرنے والا نہیں ہے۔ اسی کو اقبالؒ نے کہا ہے کہ وہ صاحب کتاب نہیں ہے۔

امتحان

ا پہاڑ کی ندی نے سنگ ریزے سے   فتادگی و سرافگندگی تری معراج
ا یہ حال کہ پامال و درد مند ہے تو   مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج
اں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا   کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج

① **معانی**: **سنگ ریزے**: پتھروں کے ٹکڑے۔ **فتادگی**: عاجزی۔ **سرافگندگی**: سر جھکانا۔ **معراج**: ...رگی کا کمال۔

...طلب: اس تین شعروں کی نظم میں اقبالؒ نے پہاڑ کی ندی اور اس کے راستے میں آنے والے یا اس ...ے اندر موجود پتھر کے ٹکڑوں کو خطاب کیا ہے اور ندی کی زبان سے کہا ہے کہ اے میرے راستے میں ...نے والے یا میری تہہ میں بیٹھے ہوئے پتھر کے ٹکڑو تم نے عاجزی کو اور سر جھکانے کو اپنی زندگی کا کمال ...نہ رکھا ہے یعنی تم میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہے جب کہ میں پہاڑ کی بلندیوں سے نیچے حرکت کرتی ...تی چلی جا رہی ہوں۔

② **معانی**: **پامال**: پاؤں میں روندنا۔ **درد مند**: رنج و غم والا۔ **محتاج**: ضرورت مند۔

...طلب: پتھر کے ٹکڑوں کو مزید خطاب کرتے ہوئے پہاڑ میں بہنے والی ندی یہ کہہ رہی ہے کہ ذرا میری ...ان تو دیکھو کہ میں پہاڑوں کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہوں اور میری یہ قدر و قیمت ہے کہ دریا بھی اپنے ...نی کے لیے مجھ پر انحصار رکھتے ہیں۔ اگر میں نہ ہوتی تو دریاؤں میں پانی نہ ہوتا۔ میرے مقابلے میں تمہارا یہ ...ال ہے کہ تم ایک جگہ پڑے ہوئے ہو۔ تمہیں ہر کوئی پاؤں میں روندتا ہے اور اس طرح تم طرح طرح ...کے دکھ سہہ رہے ہو۔ اگر تم بھی میری طرح حرکت میں ہوتے تو تمہارا کبھی یہ حال نہ ہوتا۔

③ **معانی**: **سنگ خارہ**: ایک سخت قسم کا پتھر۔ **زجاج**: شیشہ۔

...طلب: اس شعر میں پہاڑ کی ندی پتھر کے ٹکڑوں سے خطاب کرتی ہوئی پھر یہ کہہ رہی ہے کہ تم تو ...اجزی میں ایک جگہ پڑے ہوئے ہو اور میری طرح (جیسا کہ میں پہاڑوں سے ٹکر لے رہی ہوں) تم کسی ...یوار سے کبھی نہیں ٹکرائے جس کے نتیجے میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ تم شیشے کی طرح کوئی نازک چیز ہو یا ...یک سخت پتھر کی مانند ہو۔ مخالف قوتوں سے ٹکرانے کو شاعر نے زندگی کا امتحان کہا ہے۔ جس طرح پہاڑ ...کی ندی پہاڑوں کو چیرتی ہے اور ہر چیز کو بہا لے جاتی ہے یہ اس کے باحرکت ہونے کا امتحان ہے۔ اس کے ...مقابلے میں پتھروں کی سرنگونی اور عاجزی اور بے حرکتی ان کا ایک ایسا امتحان ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ...زندگی میں ناکام ہیں۔

مدرسہ

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا — جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو — خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

معانی: مدرسہ: مراد ہے جدید طرز کا مغرب زدہ مدرسہ۔

① **معانی:** عصرِ حاضر: موجودہ زمانہ جس پر فرنگی تہذیب و تمدن کے اثرات ہیں۔ **ملک الموت:** موت کا فرشتہ۔ **فکرِ معاش:** روزی کی فکر۔

مطلب: اقبالؒ اس شعر میں موجودہ دور کی مغربی اثرات رکھنے والی درس گاہوں کے طالب علموں خصوصاً مسلمان طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موجودہ دور تمہارے لیے موت کا فرشتہ ہے جس نے تمہاری اصل دینی روح کو قبض کر کے تم پر دینی اور انسانی موت پیدا کر دی ہے اور یہ موت کیا ہے؟ روزی کمانے کا فکر ہے۔ زمانہ جدید کے مدارس طالب علموں کی روحانی اور انسانی تربیت کی بجائے انہیں روزی کمانے کی فکر میں لگائے ہوئے ہیں حالانکہ مقصد تعلیم کچھ اور ہے۔

② **معانی:** حریفانہ کشاکش: مقابلے کی کھینچا تانی۔ **ذوقِ خراش:** تکالیف اٹھانے کا ذوق/لذت۔

مطلب: تعلیمِ دورِ حاضر میں طالب علم کو صرف روزی کمانے کی فکر میں لگائے رکھتی ہے اور علم کا جو اصل مقصود ہے اس سے بے گانہ رکھتی ہے۔ اس لیے موجودہ مدرسوں میں پڑھنے والا طالب علم زندگی میں مقابلے کی کھینچا تانی سے گھبراتا ہے اور اس میں زندگی کی تکالیف اٹھانے کی کوئی سکت باقی نہیں رہتی۔ جس کے نتیجے میں اس کی زندگی زندگی نہیں رہتی موت بن جاتی ہے۔ ایسی زندگی جس میں زندگی کے اصل مقاصد کے حصول کی کوئی کوشش نہیں ہوتی بلکہ صرف اتنی فکر ہوتی ہے کہ پڑھ کر کس طرح کہیں ملازمت یا روزگار مل سکتا ہے۔

③ **معانی:** جنوں: انتہائی عشق۔ **خرد:** عقل۔ **بہانے تراشنا:** بہانے بنانا۔

مطلب: اے دورِ جدید کے مدرسوں کے طالب علم موجودہ تعلیم نے تجھے عشق کی انتہا سے اور جذبات کی فراوانی سے بالکل خالی کر دیا ہے۔ وہ عشق جو کبھی عقل کو یہ کہا کرتا تھا کہ تو خواہ مخواہ کے بہانے بنا کر زندگی کی اصل حقیقت سے دور نہ ہو آج وہ جذبہ عشق تجھ میں نہیں رہا جس کی بنا پر تیری عقل نے مادر پدر آزادی حاصل کر کے تجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے۔

④ **معانی:** فیض: نفع پہنچانے کا عمل۔ **فطرت:** قدرت۔ **دیدۂ شاہیں:** شاہیں کی آنکھیں۔ **نگاہ خفاش:** چمگادڑ کی نظر جو رات کو دیکھتی ہے اور دن میں اندھی ہوتی ہے۔

مطلب: قدرت نے تو اپنی نفع بخشنے والی طاقت کے ذریعے اے جدید دور کے طالب علم (خصوصاً مسلمان

طالب علم) تجھے شہباز کی آنکھیں بخشی تھیں لیکن انگریز کی سیاسی غلامی اور تعلیمی و نصابی سازش نے تیری نظر کو چمگادڑ کی نظر بنا دیا ہے جس میں دن کی روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ مراد یہ ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تعلیم جدید نے تجھے اپنے دینی اور اسلامی ساز و سامان سے بے گانہ کر دیا ہے اس قدر بیگانہ کہ اب تجھے اپنے اس نقصان کا احساس تک بھی نہیں ہے۔

⑤ **معانی:** خلوت کوہ و بیاباں: پہاڑوں اور جنگلوں کی تنہائی۔ **اسرار:** سِر کی جمع' بھید۔ **فاش:** کھلے۔

مطلب: اے دور حاضر کے طالب علم جو بھید قدرت نے پہاڑوں اور جنگلوں کی تنہائیوں میں کھول رکھے ہیں تیرے جدید مدرسے نے ان کو تیری آنکھوں سے چھپا رکھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تعلیم حاضر نے طالب علموں کو قدرت اور فطرت اور ان کے تقاضوں سے بہت دور کر دیا ہے۔

حکیم نطشہ

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم ۔۔۔ نگاہ چاہیے اسرارِ لا الٰہ کے لیے
خدنگِ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند ۔۔۔ کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لیے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی ۔۔۔ ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لیے

معانی: حکیم نطشہ: نطشہ ایک جرمن فلاسفر کا نام ہے جس کا اقبال نے اپنی شاعری میں کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ وہ خدا کا منکر تھا اور جرمن قوم کو سب قوموں سے برتر سمجھتا تھا۔ اس نے فوق البشر کا جو تصور دیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ جرمنی کے باشندے سارے انسانوں سے افضل ہیں اور ظاہر ہے یہ نظریہ اسلامی برتری انسانی کے سراسر خلاف ہے۔ اور وہ برتری بھی آدمی کے جسمانی طور پر برتری کو سمجھتا تھا۔ چاہیے وہ روح سے بیزار ہی کیوں نہ ہو۔

① **معانی:** نکتۂ توحید: خدا کے ایک ہونے کی باریک بات۔ **حریف:** مدمقابل۔ **حکیم:** فلسفی۔ **اسرار لا الٰہ:** کلمہ توحید کے بھید۔

مطلب: اقبالؒ کہتے ہیں کہ نطشے فلسفی ضرور تھا لیکن توحید کے باریک نکتے کا مدمقابل نہ بن سکا یعنی توحید کے اصل راز کو نہ پا سکا اور اس راز کو نہ پا سکنے کی وجہ علامہ نے یہ بتائی ہے کہ کلمہ توحید (**لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ**) کے بھیدوں سے واقف ہونے کے لیے مومنانہ نگاہ چاہیے۔ اس کے لیے عاشقانہ نظر درکار ہے نہ کہ فلسفیانہ نگاہ۔

② **معانی:** خدنگ: تیر۔ **سینہ گردوں:** آسمان کا سینہ۔ **کمند:** رسی کا وہ پھندا جو کسی چیز کو پھنسانے کے لیے بلندی پر پھینکا جاتا ہے۔ **مہر و ماہ:** سورج اور چاند۔ **تخیل:** خیال۔

مطلب: نطشے کا فکر اتنا بلند ہے کہ اگر وہ اس فکر کا تیر آسمان کے سینے پر چلائے تو وہ بھی چھلنی ہو جائے اور اس کے خیال کی کمند ایسی ہے کہ اگر وہ سورج اور چاند پر بھی پھینکے تو انہیں بھی اس میں پھنسا لے۔ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا فلسفی ہے۔

③ **معانی:** طینت: سرشت' فطرت۔ **راہبی:** ترک دنیا کرنا۔

مطلب: نطشے ایک ایسا شخص تھا جو دنیا سے اور اس کے علائق سے الگ تھا۔ اس لحاظ سے اس کی

سرشت پاک تھی لیکن ساتھ ہی اس کے خیالات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ترک دنیا کے باوجود وہ اپنے گنہ کی خواہشات پر قابو نہ پاسکا اور خدا اور اس کا خوف لوگوں کے دلوں میں بھی پیدا نہ کرسکا۔ وجہ اس کی صرف یہ تھی کہ وہ توحید کے صحیح راز کو نہیں پاسکا تھا۔ وہ آدمی کی جسمانی طاقتوں کی فوقیت کا قائل تھا۔ چاہے روح مرجائے۔

اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں ۔۔۔ بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار ۔۔۔ کیا مدرسہ، کیا مدرسے والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت ۔۔۔ وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

معانی: اساتذہ: استاد کی جمع۔

① **معانی:** **لعل بدخشاں:** بدخشاں کا ایک قیمتی پتھر۔ بدخشاں ایک خطے کا نام ہے جو وسطی ایشیا میں واقع ہے۔ **بے سود:** بے فائدہ۔ **خورشید:** سورج۔ **پرتو:** سایہ، روشنی۔

مطلب: اگر سورج بھٹک جائے یعنی اپنی روشنی کا صحیح عکس نہ ڈال سکے تو بدخشاں کے لعل (قیمتی پتھر یا موتی) کی تربیت بھی وہ نہیں کر سکتا۔ مراد یہ ہے کہ اگر استاد طالب علموں کو علم کی صحیح اور سچی روشنی نہ دے تو قیمتی سے قیمتی اور لائق سے لائق طالب علم بھی راہ راست سے بھٹک جائے گا جیسا کہ آج کل کے مدرسوں میں بھٹکے ہوئے طالب علم نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب جہاں تعلیم کی خرابی ہے وہاں اساتذہ کی خرابی بھی ہے۔

② **معانی:** **روایات:** روایت کی جمع یعنی ایسی باتیں جو قدیم سے چلی آرہی ہوں۔ **تگ و دو:** دوڑ دھوپ، کوشش۔

مطلب: یہ زمانہ ایسا ہے کہ ساری دنیا روایات کے پھندوں میں گرفتار ہے اور اس میں مدرسہ، مدرسے والے اور ان کی دوڑ دھوپ بھی شامل ہے اس لیے تعلیم کا صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی کوئی امید نہیں۔

③ **معانی:** **امامت:** رہنمائی۔ **کہنہ دماغ:** پرانے دماغ والے۔ **پیرو:** تابع۔

مطلب: جن اساتذہ میں یہ صلاحیت ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کی رہنمائی کرسکتے تھے وہ مشاق اور قدیم دماغ رکھنے والے استاد جدید دور کے تابع ہو گئے ہیں اور طالب علموں کو صحیح راہیں دکھانے کی بجائے زمانہ حاضر کی تعلیم کے پیروکار بنائے بیٹھے ہیں۔

غزل

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ ۔۔۔ اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو ۔۔۔ نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے! تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ
وہ بزمِ عیش ہے مہمان یک نفس دو نفس چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گُل کا سراغ

① **معانی**: منزلِ مقصود: مقصد کی منزل۔ سراغ: نشان۔ شب: رات۔ چیتا: ایک درندے کا نام۔ چراغ: دیا۔

مطلب: چیتا ایک درندہ ہے جس کی آنکھیں رات کے اندھیرے میں دیئے کی طرح روشن دکھائی دیتی ہیں اور ساتھ ہی وہ اندھیرے میں دیکھنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ علامہ نے اس کو تشبیہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ اس شخص کو اپنے مقصد کی منزل کا نشان مل سکتا ہے جس کی آنکھیں رات کے اندھیرے میں چیتے کی آنکھوں کی طرح روشن اور دیکھنے والی ہوں۔ مراد یہ ہے کہ وہ شخص مشکلات کے اندھیروں سے نہ گھبرائے اور چیتے جیسے حوصلے سے اور اس جیسی تیز نظر پیدا کر کے آگے بڑھتا جائے۔

② **معانی**: بندۂ حر: آزاد بندہ۔ فراغ: فراغت' فرصت۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے غلام اور آزاد بندے کی مصروفیات کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ جو بندہ غلام ہوتا ہے اس کو فرصت ہی فرصت ہوتی ہے کیونکہ اس کی نہ آرزو اپنی ہوتی ہے اور نہ کوئی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ تگ و دو کرے۔ اس کے مقابلے میں آزاد بندہ ایک لمحے کے لیے بھی فارغ نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر وقت اپنے مقاصد کے حصول اور منازل تک پہنچنے کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے۔

③ **معانی**: فروغ: ترقی' سربلندی۔ خیرہ کرنا: آنکھوں کو چندھیانا۔ صاحب مازاغ: حضرت محمد ﷺ۔ مازاغ سورۂ والنجم کی ایک آیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں شب معراج کا اشارۃً ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے ما زاغ البصر وما طغٰی کہ نبی ﷺ کی نظر نے جو کچھ دیکھا وہ بالکل درست دیکھا۔ ان کی نگاہ نہ ادھر سے ادھر ہوئی اور نہ حد سے بڑھی۔

مطلب: اہل مغرب نے جو بھی اور جیسی بھی ترقی کی ہے علامہ اقبالؒ اسے فطرت میں مداخلت سمجھتے ہیں۔ اس ترقی نے چونکہ انسان کو انسان نہیں رہنے دیا اس لیے علامہ مسلمان کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری نظریں اہل مغرب کی ترقی اور سربلندی دیکھ کر چندھیا رہی ہیں حالانکہ یہ ترقی ترقی نہیں انسانی زوال کا دوسرا نام ہے اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ وہ ہستی جس کی نظر نے شب معراج سب کچھ دیکھا اور سچ دیکھا یعنی حضرت محمد مصطفٰی ﷺ کی ہستی تیری نگہبان ہو اور تجھے صحیح نظر سے مغربیوں کی ترقی دیکھنے کی توفیق نصیب کرے۔

④ **معانی**: بزم عیش: عیش و عشرت کی محفل۔ مہمان یک نفس دو نفس: ایک دو سانسوں کی مہمان۔ مثالِ ستارہ: ستارے کی مانند۔ ایاغ: پیالہ۔

مطلب: اس شعر میں بھی اہل مغرب کی غیر فطری ترقی کی طرف ہی اشارہ کیا ہے جس نے خود ان کو اور دوسروں کو بھی پیدائش انسانی کا اصل مقصد بھلا کر دنیاوی عیش و عشرت میں مشغول کر دیا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ عیش و عشرت کی مجلس چاہے اس کے شراب بھرے پیالے ستاروں کی مانند ہی کیوں نہ چمک رہے

ہوں صرف ایک دو لمحوں کی مہمان ہوتی ہے یعنی جلد ختم ہو جاتی ہے اس لیے آدمی کو اپنی پیدائش کا اصل مقصد سامنے رکھنا چاہیے اور عیش و عشرت کی ظاہری چکا چوند میں نہیں آنا چاہیے۔ ان کے نزدیک ترقی یافتہ مغرب، فطرت کے مقاصد سے چونکہ ہٹا ہوا ہے اس لیے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔

⑤ **معانی**: **کور ذوق**: اندھا ذوق، برے ذوق یا لذت سے نا آشنا۔ **صبا**: صبح کی نرم و لطیف ہوا جو غنچوں کو کھلا کر پھول بناتی ہے۔ **بوئے گل**: گلاب کے پھولوں کی خوشبو۔ **سراغ**: پتہ، نشان۔

مطلب: صبح کی پھول کھلانے والی نرم و لطیف ہوا جب گلاب کے پھولوں کے باغ سے آتی ہے تو اپنے ساتھ خوشبو بھی لاتی ہے جس کا ناک بند نہ ہو وہ اس خوشبو کو محسوس کرتا ہے لیکن بند ناک والے کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس مثال سے علامہ نے اس شعر میں مسلمان نوجوان کو کہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ذوق کا ناک بھی بند ہے اور تو ذوق نا آشنا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تو ایسی کتابیں پڑھتا ہے جو اہل مغرب نے اپنی تہذیب و ثقافت کو تم میں پھیلانے کے لیے لکھی ہیں اور مدرسوں کے نصابوں میں داخل کی ہیں۔ ان کتابوں سے ہٹ کر دیکھ کہ مغرب کی ترقی واقعی ترقی ہے یا زوال ہے۔

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعوئ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

① **معانی**: **پیرانِ حرم**: کعبے کے پیر یعنی دین کے علما۔ **انداز**: طریقے۔ **اخلاص**: خلوص۔ **دعوئ نظر**: یہ دعویٰ کرنا کہ میں نظر رکھتا ہوں۔ **لاف و گزاف**: فضول باتیں، شیخی اور گپ شپ کی باتیں۔

مطلب: موجودہ دور کے پیشہ ور اور دین فروش علمائے دین کے متعلق علامہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی زندگی اور ان کے کردار کے طور طریقے دیکھے ہیں یوں تو وہ اپنے خلوص کا اور معاملات پر صحیح نظر رکھنے کا بڑا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ دعویٰ فضول اور شیخی کی باتوں کے سوا کچھ نہیں اور یہ ان کے عمل اور کردار سے صاف ظاہر ہے۔

② **معانی**: **اہلِ کلیسا**: کلیسا والے یعنی عیسائی، یہاں مراد ہے مغربی اقوام جو عیسائی مذہب رکھتی ہیں۔ **دین**: اسلام۔ **مروت**: حسنِ اخلاق۔

مطلب: مغرب والوں نے جن کا تعلق عیسائی مذہب سے ہے مدرسوں میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا ہے اور ایسی کتابیں نصاب میں داخل کی ہیں کہ جن کو پڑھ کر مسلمان طالب علم اپنے مذہب اسلام سے بھی بے گانہ ہو جائیں اور اسلام حسن اخلاق کی جو تعلیم دیتا ہے اس سے بھی وہ محروم ہو جائیں۔ برصغیر میں تعلیمی نظام نافذ کرتے ہوئے انگریز مدبروں نے یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ اس کے ذریعے اگر مسلمان

سائی نہیں ہو گا تو کم از کم مسلمان بھی نہیں رہے گا اور ایک صدی کا تعلیمی تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ ان یہ بات سچ تھی اور آج کا تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان اپنے دین اور حسن اخلاق دونوں سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔

③ **معانی:** **محکومی:** غلامی۔ **مظلومی:** بے چارگی۔ **خودی سے انصاف نہ کرنا:** خود معرفتی اور خود شناسی سے بیگانہ رہنا۔

مطلب: جو قوم خود معرفتی اور خود شناسی یا اپنی خودی سے واقف نہ رہے اور دوسروں کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی نیت کر لے وہ قوم نہ ابھر سکتی ہے نہ آزاد ہو سکتی ہے۔ تقدیر نے ایسی قوم کے لیے غلامی اور بے چارگی لکھ دی ہے۔

④ **معانی:** **فطرت:** قدرت۔ **افراد:** فرد کی جمع، اشخاص۔ **اغماض کرنا:** چشم پوشی کرنا، دھیان نہ دینا، نظر انداز کرنا۔ **ملت:** قوم، جماعت۔

مطلب: اصول قدرت یہ ہے کہ اگر کسی قوم کے اشخاص میں سے انفرادی طور پر کوئی خطا کر بیٹھے تو قدرت اس کی خطا کو نظرانداز بھی کر سکتی ہے لیکن اگر پوری قوم کوئی خطا کر بیٹھے تو اس کی معافی نہیں ملتی اس کی سزا ضرور ملتی ہے۔

جاوید سے

①

غارتِ گر دیں ہے یہ زمانہ ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربار شہنشہی سے خوشتر مردانِ خدا کا آستانہ
لیکن یہ دورِ ساحری ہے انداز ہیں سب کے جادوانہ
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک باقی ہے کہاں مے شبانہ
خالی ان سے ہوا دبستان تھی جن کی نگاہ تازیانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخِ گل پر چہک ولیکن کر اپنی خودی میں آشیانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ
دہقان اگر نہ ہو تن آساں ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ
غافل منشیں نہ وقت بازی ست وقتِ ہنر است و کارسازی ست

ف: یہ نظم اور آگے آنے والی دو نظمیں بظاہر اقبال نے اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کرتے ہوئے کہیں ہیں مگر در اصل مراد سارے مسلمان نوجوان ہیں۔

① **معانی:** **غارت گر دیں:** دیں کو تباہ کرنے والا۔ **یہ زمانہ:** عہد حاضر۔ **نہاد:** سرشت، فطرت۔

مطلب: اس شعر میں جو کہ بظاہر جاوید سے خطاب کی صورت میں ہے علامہ جملہ مسلمان نوجوانوں کو

کہہ رہے ہیں کہ عصر حاضر کی چمک دمک اور فریب میں نہ آ جانا۔ بظاہر یہ دور بڑا ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کا دور نظر آتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہل مغرب کی سازش اور غلط روش کی وجہ سے یہ دور دین اسلام کو برباد کرنے والا دور ہے اور اس کی سرشت اور جبلت میں بے دینی کے عنصر کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لیے اس کے اثرات سے بچنا ضروری ہے۔

② **معانی**: **دربار شہنشہی**: بادشاہوں کی سرکار۔ **خوشتر**: بہتر۔ زیادہ اچھا۔ **مردان خدا**: اللہ کے پسندیدہ بندے۔ **آستانہ**: چوکھٹ۔

مطلب: بادشاہوں کے درباروں اور ان کی سرکار میں حاضری سے یہ بہتر ہے کہ اللہ کے برگزیدہ اور پسندیدہ بندوں (فقیروں اور درویشوں) کی چوکھٹ پر حاضری دی جائے۔

③ **معانی**: **ساحری**: جادوگری۔ **جادوانہ**: جادو بھرا' **انداز**: طریقہ' **دور**: زمانہ۔

مطلب: لیکن دور حاضر جادوگری کا دور ہے اور اس کے سارے طور طریقے جادو جیسے ہیں۔ جس طرح جادو کرنے والا خیالات اور نظروں کو باندھ کر نقل چیزوں کو اصل چیز بنا کر پیش کرتا ہے اور ان چیزوں کو جن کا وجود نہیں ہوتا ان کو وجود دے کر سامنے لاتا ہے۔ اسی طرح عہد حاضر بھی غلط چیزوں کو صحیح بنا کر پیش کر رہا ہے اور اس کی یہ جادوگری اور دھوکا دہی ہمیں نقل کو اصل سمجھنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

④ **معانی**: **سرچشمہ زندگی**: زندگی کا منبع یا زندگی کے سوتے۔ **مئے شبانہ**: رات کی شراب۔

مطلب: اس دور میں اہل مغرب کی جادوگری کی وجہ سے ایسی ہوا چلی ہے یا ایسے اسباب پیدا ہوئے ہیں کہ جن کی وجہ سے دریائے زندگی کے سوتے خشک ہو گئے ہیں اور رات کی وہ شراب (جو ہمارے آباء و اجداد اور ہمارے گزرے ہوئے بزرگ ہمیں پلاتے تھے یعنی صحیح علم اور معرفت کی شراب اب کہیں نظر نہیں آتی۔

⑤ **معانی**: **دبستان**: مدرسہ۔ **تازیانہ**: کوڑا۔ **نگاہ**: نظر

مطلب: جدید دور کے مدرسے ان استادوں اور بزرگوں سے خالی ہو چکے جن کی نگاہ اپنے طالب علموں کو راہ راست پر رکھنے کے لیے کوڑے کا کام دیتی تھی اور وہ اپنی نظر اور محبت سے ان کی صحیح تربیت کرتے تھے۔

⑥ **معانی**: **مذاق**: ذوق۔ **عارفانہ**: معرفت والا۔

مطلب: اس شعر میں جاوید کو خاص طور پر خطاب کیا گیا ہے اور کہا ہے کہ جس گھر کا تو چراغ ہے یعنی جس خاندان کا تو بیٹا ہے اس خاندان کا ذوق اور مزاج ہمیشہ سے معرفت پسند اور صوفیانہ رہا ہے۔ تمہیں بھی چاہیے کہ اس ذوق کو اپنے اندر پیدا کرے اور زندہ رکھے۔

⑦ **معانی**: **جوہر**: اصلیت' سرشت۔ **لا الٰہ**: کلمہ طیبہ' اللہ کی توحید اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان۔ **فرنگیانہ**: فرنگیوں کی' اہل مغرب کی۔

مطلب: علامہ نے یہاں ایک اصولی اور بنیادی بات کہی ہے اور وہ یہ کہ اگر مسلمان کلمہ توحید پڑھ کر دل سے مسلمان بن چکا ہے اور اس کی سرشت میں اس کا اثر پختہ حد تک موجود ہے تو پھر اہل مغرب کی

تعلیم حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ ایمان جو اس کی اصلیت میں ہو گا وہ اسے کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرا دے گا اور فرنگی تعلیم سے وہی چیز حاصل کرے گا جو بحیثیت مسلمان اس کے فائدے کی ہو گی اور باقی سب کچھ رد کر دے گا۔

⑧ **معانی:** آشیانہ: گھونسلہ۔ خودی: اپنی شناخت اور معرفت۔

مطلب: علامہ نے اس شعر میں ایک پرندے کی مثال دے کر راز کی بات سمجھائی ہے جس طرح کہ پرندہ پھولوں کی ٹہنی پر چہکتا ہے لیکن نظر اپنے گھونسلے پر رکھتا ہے اور ادھر ادھر پھر پھرا کر پھر اپنے آشیانے میں آ جاتا ہے اسی طرح تو بھی، اے مسلمان نوجوان، جہاں چاہے جا، جو چاہے پڑھ لیکن اپنی خود شناسی اور خود معرفتی کے گھر کو نہ بھول۔ اور اپنے دین اور اپنی روایات کو ہر وقت پیش نظر رکھ۔

⑨ **معانی:** بحر بیکرانہ: ایسا سمندر جس کا کوئی کنارہ نہ ہو۔

مطلب: آدمی کوئی سرسری چیز نہیں ہے۔ خاص طور پر اہل ایمان آدمی جو خدا کا نائب ہے دیکھنے میں تو وہ ایک پانی کے قطرے کی مانند یعنی محض ایک فرد نظر آئے گا لیکن وہ قطرہ ایسا قطرہ ہے کہ اس سمندر سے بھی زیادہ وسعت رکھتا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ اے مسلمان نوجوان تو اپنی اس اصلیت کو مت بھول۔

⑩ **معانی:** دہقاں: کسان۔ تن آساں: آرام طلب۔ صد ہزار دانہ: سو ہزار دانہ۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے مسلمان نوجوان کو محنت کی قیمت سے آگاہ کیا ہے اور ایک کسان کی مثال دے کر سمجھایا ہے کہ اگر کسان آرام طلب نہ ہو اور رات دن خون پسینہ ایک کر کے محنت کرنے کا عادی ہو تو وہ اس ایک دانے سے جو وہ زمین میں بوتا ہے فصل کی صورت میں سو ہزار دانے لیتا ہے۔ اس لیے اے نوجوان تو بھی محنت کر، تاکہ کامیابی تیرے در خوش حالی بھی ہاتھ آئے۔

(11) **معانی:** منشیں: مت بیٹھ۔ وقت بازی: کھیل کود کا وقت۔ ست: است، ہے۔ کارسازی: کام کرنے کا وقت۔

مطلب: اے مسلمان نوجوان یا اے میرے بیٹے جاوید یہ کھیل کود کا وقت نہیں ہے بلکہ کچھ سیکھنے کا وقت ہے اور غافل ہو کر مت بیٹھ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ اور کوئی نہ کوئی کام کر کے دکھا۔

②

سینے میں اگر نہ ہو دلِ گرم رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست آتی نہیں کام کہنہ دامی
ہے آبِ حیات اسی جہاں میں شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی
غیرت ہے طریقتِ حقیقی غیرت سے ہے فقر کی غلامی
اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن شاہیں سے تدرو کی غلامی

نایاب نہیں متاعِ گفتار صد انوری و ہزار جامی
ہے میری بساط کیا جہاں میں بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے، جسے دے میراث نہیں بلند نامی
اپنے نورِ نظر سے کیا خوب فرماتے ہیں حضرتِ نظامی
جائے کہ بزرگ بایدت بود فرزندیِ من ندارد سود

① **معانی**: دل گرم: عشق کی حرارت رکھنے والا دل۔ **خامی**: کمی، نقص۔

مطلب: اگر آدمی کے سینے میں عشق کی حرارت رکھنے والا دل نہ ہو تو سمجھیے کہ اس کی زندگی خام ہے یعنی اس میں کوئی نہ کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہے۔ اس لیے زندگی کو پختہ بنانے کے لیے سچے عشق کا ہونا ضروری ہے۔

② **معانی**: **نخچیر**: شکار۔ **زیرک**: دانا۔ **چست**: چالاک۔ **کہنہ دامی**: شکاری کی جال بچھانے کی پرانی مہارت۔

مطلب: اگر شکار (چاہے پرندہ ہو یا کوئی اور جانور) دانا اور چالاک ہو تو جال بچھانے میں پرانی مہارت رکھنے والا شکاری بھی اس کو جال میں پھنسنے میں ناکام رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر میری قوم کے نوجوان دور اندیش اور بیدار ہوں تو کوئی ان کو اپنا سیاسی یا ثقافتی غلام نہیں بنا سکتا۔

③ **معانی**: **آبِ حیات**: زندگی کا پانی۔ کہتے ہیں کہ اس جہان میں کہیں سمندروں میں ایسا چشمہ موجود ہے جس کا پانی پی لینے سے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت خضر جو اللہ کے بندے ہیں اس چشمے کو جانتے ہیں اور شاید خود بھی انہوں نے اسی کا پانی پیا ہو اسی لئے وہ زندگی دوام رکھتے ہیں۔ **تشنہ کامی**: پیاس۔

مطلب: آبِ حیات (زندگی کا پانی) کا چشمہ ضرور موجود ہے اور اسی جہان میں کہیں ہے۔ اِن کے ڈھونڈنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی کو اس کی پیاس بھی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ کسی بھی منزل کے حصول کے لیے اس تک پہنچنے کی آرزو کا ہونا ضروری ہے۔

④ **معانی**: **غیرت**: خودداری، شرم و حیا۔ **طریقت حقیقی**: سچی درویشی۔

مطلب: درویش دو قسم کے ہیں۔ ایک غیرت والے یعنی جو خوددار ہوتے ہیں اور دوسرے بے غیرت جو بے شرم اور بے حیا بن کر مانگتے اور لوٹتے پھرتے ہیں۔ یہاں شاعر نے سچی درویشی اور صحیح صوفیانہ مسلک کا ذکر کیا ہے کہ وہ غیرت، خودداری اور شرم و حیا کا حامل ہوتا ہے۔ صحیح فقر (درویشی) کی غلامی غیرت (خودداری) سے ہاتھ آتی ہے۔ بے غیرت درویش اسلامی طریقت کا یا مسلک درویشی کا حامل نہیں ہوتا۔

⑤ **معانی**: **جانِ پدر**: باپ کی جان۔ **شاہیں**: باز۔ **تدرو**: تیتر۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے راست اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کیا ہے اور کہا ہے اے باپ کی جان زندگی میں شاہیں بن۔ تیتر نہ بن۔ کیونکہ شاہیں کبھی تیتر کا غلام یا شکار نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ تیتر ہی شاہین کا

بنتا ہے۔ مقصود اس نصیحت سے یہ ہے کہ شہباز جیسی خوددار اور آزاد زندگی گزارو۔ تیتروں جیسی بے
زندگی سے بچو۔

معانی: متاع گفتار: بات کرنے کی دولت' یہاں مراد شاعری سے ہے۔ **انوری اور جامی**: فارسی کے
مشہور شاعر ہیں۔ **نایاب**: نہ ملنے والی۔ **صد**: سو' سینکڑہ۔

مطلب: شاعری کوئی ایسی دولت نہیں ہے جو کہیں نہ ملے۔ اس دنیا میں انوری اور جامی جیسے سینکڑوں ہزاروں شاعر موجود ہیں۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ کس کی شاعری افراد کو یا اقوام کو بیدار کرتی ہے اور کس کی شاعری انہیں سلاتی ہے۔ اس لیے اگر شاعری کا ذوق ہو تو ایسا شعر کہہ جس سے سوئی ہوئی قوم جاگ
اٹھے۔

معانی: بساط: حیثیت۔ **فغان زیر بامی**: چھت کے نیچے کھڑے ہو کر فریاد کرنا۔

مطلب: اس سے پہلے شعر میں علامہ نے شاعر اور شاعری کی بات کی ہے۔ علامہ چونکہ خود بھی شاعر ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں بطور شاعر میری حیثیت کیا ہے یعنی کچھ بھی نہیں۔ میری شاعری تو اس فریاد کی طرح کی ہے جو کوئی چھت کے نیچے کھڑے ہو کر کرے۔ مراد یہ ہے کہ میں غلام قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ اگر آزاد قوم میں پیدا ہوا ہوتا تو میری شاعرانہ فریاد اس شخص کی فریاد کی طرح ہوتی جو چھت کے اوپر کھڑا ہو کر فریاد کرتا ہو یعنی وہ فریاد سنی بھی جاتی ہے۔ میری فریاد کون سنتا ہے۔

معانی: صدق مقال: بات کی سچائی' صحیح شاعری۔ **چشم جہاں**: جہاں والوں کی آنکھوں میں۔ **گرامی**: عزت والا' قدر و منزلت والا۔

مطلب: اس شعر میں بھی علامہ نے شاعری ہی کی بات کو آگے بڑھایا ہے اور کہا ہے کہ میری شاعری سچی اور صحیح شاعری ہے۔ میں اپنے شعروں میں وہی کچھ کہتا ہوں جو ایک سچے شاعر کو کہنا چاہیے۔ اس لیے میں جہان والوں کی نظروں میں عزت دار اور قدر و منزلت والا سمجھا جاتا ہوں۔

معانی: دین: عطا۔ **میراث**: ورثہ' وراثت۔ **بلند نامی**: نام کی شہرت۔

مطلب: اپنے نام کی شہرت یا اپنی شہرت کوئی خاندانی وراثت نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ جسے چاہے عطا کر دے اور اس کے لیے اپنے کردار و عمل کا اعلیٰ ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی اللہ کی توفیق پر ہی ہے۔

(11) **معانی: نور نظر**: آنکھوں کا نور بیٹا۔ **نظامی**: فارسی کے مشہور شاعر جو عام طور پر نظامی گنجوی کے نام سے مشہور ہیں۔ **جائیکہ**: جس جگہ۔ **بزرگ بایدت بود**: بزرگی کا درجہ حاصل کرنا چاہیے تجھے۔ **فرزندی من**: میرا بیٹا ہونا۔ **ندارد ت سود**: تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

مطلب: ان دو شعروں میں علامہ نے پھر راست اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیکھو نظامی گنجوی نے اپنے بیٹے سے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس جگہ تجھے بزرگی کا درجہ حاصل ہونا چاہیے وہاں تجھے میرا بیٹا ہونا فائدہ نہیں دے گا بلکہ تمہارے ذاتی جوہر کام آئیں گے کیونکہ بزرگی اپنے کردار و عمل سے ملتی ہے وراثت سے نہیں۔

③

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز
دین و دولت قمار بازی

ناپید ہے بندۂ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی

اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی

کنجشک و حمام کے لیے موت
ہے اس کا مقامِ شاہبازی

روشن اس سے خرد کی آنکھیں
بے سرمۂ بو علی و رازی

حاصل اس کا شکوہِ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی

تیری دنیا کا یہ سرافیل
رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی

ہے اس کی نگاہ عالم آشوب
درپردہ تمام کارسازی

یہ فقرِ غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

① **معانی**: یہ شب و روز: عہد حاضر، یہ دن رات۔ دولت: حکومت۔ دین: مذہب اسلام۔ **قمار بازی**: جوا کھیلنا۔ گراں: بھاری، مشکل۔

مطلب: اس نظم میں علامہ اقبال اپنے بیٹے جاوید کو (اور اس کے حوالے سے سارے مسلمان نوجوانوں کو) خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: مومنوں (مسلمانوں) کے لئے اس دور کے شب و روز بڑے کٹھن اور مشکل ہیں کیونکہ موجودہ زمانہ مغربی تہذیب و تمدن کی خرابیوں کی وجہ سے اتنا خراب ہو چکا ہے کہ دین اور حکومت دونوں جواری بن گئے ہیں۔ وہ دونوں اپنے اغراض اور مفادات کے لیے لوگوں کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔

② **معانی**: ناپید: غائب۔ **بندہ عمل مست**: عمل میں مست رہنے والا بندہ۔ **نفس درازی**: سانسوں کو طول دینا یعنی بے کار زندگی گزارنا۔

مطلب: اس زمانے میں صاحب کردار اور اپنے عمل میں مست لوگ غائب ہو گئے ہیں یعنی نہیں ملتے البتہ فضول زندگی گزارنے والے اور مقصد زندگی سے غافل لوگ ضرور عام ہیں۔

③ **معانی**: فقر: درویشی۔ حجازی: منسوب بہ حجاز یعنی اسلامی (حجاز وہ علاقہ ہے جس میں مکہ اور مدینہ کے شہر ہیں)۔

مطلب: اگر تجھ میں درویشی کی خواہش ہو اور اس کے حصول کے لیے ہمت ہو تو ایسا فقر (درویشی) تلاش کر جس کی جڑ حجاز میں ہو یعنی وہ فقر جو اسلامی فقر ہے۔ یا وہ فقر جس پر **الفقر فخری** کہہ کر نبی کریم ﷺ نے فخر کیا ہے۔ اس کے سوا جو درویشی ہے وہ غیر اسلامی بھی ہے اور محض ڈھونگ بھی ہے۔

④ **معانی**: پیدا: ظاہر۔ بے نیازی: بے پروائی۔

لب: جس اسلامی اور حجازی فقر یا درویشی کی اے بیٹے میں بات کر رہا ہوں اس فقر سے آدمی کے اللہ کی بے پروائی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ فقر کسی کا یا کسی شے کا محتاج نہیں ہوتا ہر دوسرا اس فقر کا یا مرد فقیر کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ فقر جس میں احتیاج ہو یا خود محتاج ہو وہ حجازی فقر ا ہے۔

معانی: کنجشک: چڑیا۔ حمام: کبوتر۔ مقام: مرتبہ۔ شاہبازی: باز جیسا۔

لب: جس فقر کی میں بات کر رہا ہوں۔ وہ شاہبازوں جیسے مرتبہ والے فقر کی بات ہے۔ شاہباز ں میں آزاد اڑتا ہے۔ پہاڑوں پر اپنا ڈیرا بناتا ہے۔ اپنا شکار خود کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ س سے نبی کریم ﷺ نے بھی پناہ مانگی ہے وہ محتاجی کا فقر ہے جس میں فقیر چڑیوں اور کبوتروں رح دانہ دنکا کا محتاج ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے بھروسے پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی نہیں ں کی موت ہے۔

معانی: خرد: عقل۔ بو علی و رازی: بو علی سینا اور فخرالدین رازی جو عقل پسند یا فلسفی تھے۔

ب: اس شعر میں بھی فقر اسلامی کی بات کی ہے اور کہا ہے ایک عقل تو وہ ہے جو اپنی آنکھوں میں بو ینا اور فخرالدین رازی کے فلسفہ کا سرمہ ڈالے تو روشن ہوتی ہے لیکن یہ عقل طالب کو منزل مقصود تک پہنچاتی اور حقیقت کا مشاہدہ نہیں کراتی۔ دوسری عقل وہ ہے جسے فقر کا سرمہ روشن کرتا ہے۔ یہ منزل مقصود پر بھی پہنچاتی ہے اور حقیقت کا مشاہدہ بھی کراتی ہے۔ اس لئے اے بیٹے فقر والی عقل نا کر۔

معانی: حاصل: نتیجہ، ثمر، پھل۔ فطرت: سرشت۔ شکوہ: دبدبہ۔ ایازی: غلامی۔

ب: اسلامی فقر محمود غزنوی کا سا دبدبہ اور ہیبت لئے ہوئے ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کی ت میں ایازی (غلامی) نہ ہو۔ محمود غزنوی اپنے ایک غلام ایاز کو بہت چاہتا تھا اور اس کی مرضی کو دیتا تھا جس کے نتیجہ میں اس کے شکوہ میں فرق آتا تھا۔ فقر بھی اگر کسی کا محتاج ہو اور اپنی بے شان نہ رکھتا ہو تو وہ بھی درست نہیں۔ اسلامی فقر کا جلال اور دبدبہ اس میں ہے کہ وہ کسی کا محتاج ۔ دوسرے اس کے محتاج ہوں۔

معانی: اسرافیل: وہ فرشتہ جس کے صور پھونکنے سے مردے قیامت کے روز زندہ ہو جائیں گے۔ ذوق ازی: بانسری بجانے کا ذوق۔

ب: دور جدید، جس نے اپنی ترقی کے باوجود، مجد انسانیت اور شرف آدمیت کو برباد کر کے رکھ دیا اپنے اندر ایسی طاقت اور صلاحیت نہیں رکھتا کہ مردہ دلوں کو زندہ کر دے۔ جس طرح قیامت کے اسرافیل فرشتہ صور (ایک قسم کا آواز دینے والا آلہ) پھونکے گا تو سب مردے قبروں سے زندہ نکل ے ہوں گے۔ زمانہ حاضر کی بانسری میں ہر قسم کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں فقر کی بانسری بجانے کا اگر ذوق عاشق) نصیب ہو تو وہ اسرافیل کی طرح آدمی کے مردہ دل کو زندہ کر سکتی ہے اور زمانہ جدید کے پھر سے حیوان سے انسان اور مردہ دل سے زندہ دل بنا سکتی ہے۔

⑨ **معانی : نگاہ عالم آشوب** : دنیا میں تلاطم پیدا کرنے والی نظر۔ **درپردہ** : پوشیدہ۔ **تمام** : س
کارسازی: بگڑا ہوا کام بنانا۔

مطلب : مردِ فقیر کی نگاہ اسرافیل کی طرح مردہ دلوں کو زندہ کرنے والی ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ دنیا ئے
میں تلاطم پیدا کر کے اس کو صحیح دل بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسی نگاہ جو دنیا میں انقلاب پید
دے۔ لوگوں کی تقدیریں بدل دے۔ وہ پوشیدہ طور پر کارساز (دوسروں کے کام بنانے والی) ہوتی
آج کے پیشہ ور فقیر خود گداگر ہیں۔ وہ اپنی محتاجی دور نہیں کر سکتے دوسروں کے بگڑے ہوئے کام
بنائیں گے۔ یہ کام اصل فقر اور اسلامی فقیر کا ہے کہ وہ لوگوں کی کارسازی کرتا ہے۔

⑩ **معانی : فقر غیور** : غیرت مند فقر۔ **بے تیغ و سنان** : بغیر تلوار اور نیزے کے۔ **مرد غازی** : جہا
شریک ہو کر زندہ بچ رہنے والا صاحب ایمان سپاہی۔

مطلب : جس شخص کو خوددار، غیرت مند اور بے نیاز دو جہان کی صفات والا فقر حاصل ہو جاتا ہے ا
میدان جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے تلوار اور نیزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ان آ
حرب کے بغیر ہی فریق مقابل کے سامنے آ جاتا ہے اور اپنی نگاہ سے تلوار اور نیزے کا کام لیتا ہے۔
فقیر کی نگاہ تقدیریں بدل دیتی ہے۔ وہ تلوار کا نہیں نگاہ کی ضرب لگانے والا مرد میدان ہوتا ہے اور ہمیش
یاب ہو کر غازی بنتا ہے۔

معانی : مومن : صحیح اہل ایمان، **فقیری** : درویشی۔

(11) **مطلب** : جو اہل ایمان واقعی مرد مومن ہوتا ہے، اس کی امیری دولت کی امیری نہیں ہوتی
دولت فقر کی امیری ہوتی ہے۔ دھن دولت تو چھاؤں ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے۔ فقر کی دولت وہ دو
ہے جس کو نہ زوال ہے اور نہ کوئی اسے چھین سکتا ہے۔ مرد فقیر کسی کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ سب اس
محتاج ہوتے ہیں۔ اور وہ محتاجوں کی احتیاج دور کرتا ہے۔ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ وہ خود
محتاج ہو۔ اپنے بیٹے اللہ سے دعا کر کہ وہ تمہیں فقر کی یہ دولت عطا کر دے۔ دنیا کی دولت تو آنی جانی
ہے۔ اس پر فقر کی دولت کو قربان نہ کر دینا۔

عورت

مردِ فرنگ

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا — مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں — گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

معانی: مردِ فرنگ: فرنگی مرد، انگریز آدمی، اہل مغرب۔

① **معانی:** حکیم: فلسفی، اہل عقل و دانش۔ سلجھانا: حل کرنا۔ زن: عورت۔

مطلب: اہل عقل و دانش، مفکر اور فلسفی عورت کے مسئلے کو ہزار بار حل کرنے کی کوشش کر چکے ہیں (کہ یہ کیا ہے۔ اس کے کیا حقوق ہیں مرد کے مقابلے میں اس کا کیا درجہ ہے وغیرہ وغیرہ) لیکن کوئی خاطر خواہ حل نہیں مل سکا۔

② **معانی:** مہ و پرویں: چاند اور ثریا ستارہ۔ شرافت: شریف ہونا۔

مطلب: اس خرابی میں کہ داناؤں سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا عورت کا کوئی قصور نہیں۔ اس کے شریف ہونے پر تو چاند اور ثریا بھی گواہ ہیں۔ جس طرح چاند اور تارے پاک و صاف ہیں اسی طرح عورت بھی پاک و صاف ہے۔

③ **معانی:** فرنگی معاشرت: مغربی معاشرہ۔ زن شناس: عورت کو پہچاننے والا۔

مطلب: اس خرابی کے ہزار بار سلجھانے پر بھی عورت کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ اصل قصور نہ عورت کا ہے نہ اہل دانش کا بلکہ فساد کی جڑ اہل مغرب کا معاشرہ ہے۔ وہاں مرد اتنا سادہ ہے کہ بے چارہ عورت کی ذہنیت کو نہیں پہچان سکا۔ جس کی وجہ سے یورپ میں اور اس کی ریس میں باقی دنیا میں بھی عورت مرد پر سوار ہے۔ اگر اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھا جاتا تو یہ حل ہو چکا ہوتا اور مرد اور عورت اپنے اپنے فطری دائروں میں اطمینان کی زندگی گزار رہے ہوتے۔

ایک سوال

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بیکار و زن تہی آغوش

① **معانی:** حلقہ بگوش: غلام۔ حکیم: مفکر، فلسفی۔ معاشرت: تہذیب و تمدن، رہن سہن کا طریقہ۔ زن: عورت۔ تہی آغوش: خالی گود والی، بے اولاد۔

مطلب: پہلے شعر میں علامہ نے یورپ کے مفکروں سے اس لیے سوال کیا ہے کہ عورت کو سر پر چڑھانے کا ذمہ دار ان کا معاشرہ ہی ہے اور دوسرے اس لیے کہ وہ خود کو باقی دنیا سے زیادہ علم والے اور دانائی والے سمجھتے ہیں اور ہندوستان اور یونان جیسے ملکوں کی تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات کو اپنے علم

دانش کا غلام سمجھتے ہیں حالانکہ کبھی یہ ملک دانش کا گہوارہ تھے اور فرنگیوں کا علاء جہالت کے اندھیرے میں تھا۔ سوال جو علامہ نے ان مغربی
تھا۔ سے جو خود کو ساری دنیا سے بڑھ کر دانا سمجھتے ہیں' یہ پوچھا ہے کہ جس تہذیب و تمدن اور رہن سہن
کے طریقوں کو تم نے رائج کر رکھا ہے کیا اس کا کمال یہی ہے کہ اس کے نتیجے میں وہاں کے مرد بے کار ہو
گئے ہیں اور عورتوں کی گودیں خالی ہیں۔ یعنی وہ بچہ جننا پسند نہیں کرتیں۔ جو معاشرہ یہ دو خرابیاں سامنے
لاتا ہے کیا وہ اس معاشرے کا کمال ہے یا زوال؟ حقیقت میں یہ کمال نہیں زوال ہے۔

پردہ

بہت رنگ بدلے سپہرِ بریں نے خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے وہ خلوت نشیں ہے یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

① **معانی:** سپہرِ بریں: بلند آسمان۔ رنگ بدلے: کئی زمانے آئے' کئی صورتیں بدلیں۔

مطلب: بظاہر اس نظم کے عنوان سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں عورت کے پردے کی بات ہوگی
مگر اس کے برعکس علامہ نے اس پردے کی بات کی ہے جو آدمی کی خودی پر پڑا ہوا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر
یہ کہتا ہے کہ بلند آسمان نے آج تک کئی زمانے اور ان کے کئی رنگ دیکھے ہیں لیکن اے خدا یہ دنیا جس
طرح اول روز تھی ویسے ہی آج بھی قائم ہے۔

② **معانی:** تفاوت: فرق۔ زن و شو: بیوی اور شوہر۔ خلوت نشیں: تنہائی میں بیٹھنے والے یا پردہ کرنے
والے۔

مطلب: عام اصول یہ ہے کہ عورت پردے میں ہوتی ہے اور مرد بے پردہ ہوتا ہے۔ یہاں شاعر نے
اس ظاہری پردے سے ہٹ کر ایک اور پردے کی بات کی ہے اور وہ پردہ ہے جو آدمی کی خودی پر پڑا ہوا
ہے۔ اس لحاظ سے شاعر کہتا ہے کہ آج عورت بھی پردے میں ہے اور مرد بھی پردے میں ہے۔ دونوں
میں فرق دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں ہی اپنی خودی سے ناآشنا ہیں۔ اگر وہ اپنی اپنی معرفت رکھتے تو اپنے اپنے
قدرتی اور فطرتی دائرے میں زندگی گزارتے۔

③ **معانی:** آشکارہ: ظاہر۔ خودی: خودشناسی' اپنی پہچان۔ اولادِ آدم: حضرت آدم کی اولاد یعنی بنی نوع آدم۔

مطلب: اس شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ آج آدمی کی پوری اولاد یعنی سارے لوگ پردے میں ہیں کیونکہ
میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی کی خودی بھی ظاہر نہیں ہے۔ خود شناسی اور خود معرفتی سے سارے لوگ ہی
ناواقف ہیں۔

خلوت

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے ۔۔۔ روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے ۔۔۔ ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے ۔۔۔ وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر ولیکن ۔۔۔ خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

معانی: خلوت: تنہائی۔

① **معانی:** جلوت: نمود، نمائش۔ آئینہ دل: دل کا شیشہ۔ مکدر: میلا۔

مطلب: عہدِ حاضر جو مغربی تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات کے اجزا سے بنا ہے، نمود و نمائش کا زیادہ قائل ہے اور اس کی وجہ آدمی کی ہوس ہے جو اسے اپنی نمود پر مجبور کرتی ہے۔ اس سے آدمی کی نگاہ تو روشن ہو گئی ہے لیکن اس کے دل کا شیشہ میلا ہو گیا ہے۔

② **معانی:** ذوقِ نظر: نظارے کی لذت۔ پراگندہ: منتشر، بکھرے ہوئے۔ ابتر: برے۔

مطلب: جب آدمی کی ہوس نظارے کی لذت کو حد سے زیادہ بڑھا دیتی ہے تو پھر آدمی اچھے اور برے کے دیکھنے یا نہ دیکھنے میں تمیز روا نہیں رکھ سکتا اور اس کے خیالات منتشر اور خراب ہو جاتے ہیں۔

③ **معانی:** آغوشِ صدف: سیپی کی گود۔ قطرۂ نیساں: خاص ابرِ بہار کا قطرہ۔ گوہر: موتی۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے اس نمود اور اس نظر کی لذت کا جسے آدمی کی ہوس پیدا کرتی ہے تنہائی اور خلوت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اور جلوت پر خلوت کی بڑائی کو ایک قدرتی مثال سے سمجھایا ہے۔ ایک خاص قسم کی بہار کا بادل جب برستا ہے تو سیپ سمندر کی سطح پر منہ کھولے تیر رہے ہوتے ہیں، ان قطروں کو اپنی آغوش یا اپنے پیٹ میں لے لیتے ہیں اور پھر برسوں سمندر کی تہہ کی تنہائیوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح بارش کے قطرے ان کے پیٹ میں موتی بن جاتے ہیں۔ اگر کوئی سیپ تنہائی اختیار نہ کرے تو یہ قطرے چاہے ابرِ نیساں کے کیوں نہ ہوں موتی نہیں بن سکتے۔

④ **معانی:** خودگیر: اپنی تربیت میں مشغول۔ دیر و حرم: مندر اور مسجد۔ میسر: حاصل۔

مطلب: خودی کی تربیت کے لیے تنہائی کا ہونا ضروری ہے۔ مسلمان صوفیائے کرام اپنی ابتدائی زندگی میں اپنی اور اپنے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جب ریاضت اور محنت کرتے تھے تو آبادیوں کے شور و غل سے دور بیابانوں میں جا کر یادِ خدا میں مشغول ہو جاتے تھے اور یوں وہ قدرت کے نظاروں کے قریب تر ہوتے تھے۔ اس طرح وہ خود شناسی کی دولت لے کر دنیا کو ہدایت دینے کے لیے جلوت میں آ جاتے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ تنہائی جو اپنی اور اپنے خدا کی معرفت کے لیے لازمی ہے آج کل نہ کعبے میں نظر آتی ہے نہ مندر میں۔ مراد یہ ہے کہ آدمی کے اندر جلوت اور خودنمائی کی اتنی ہوس پیدا ہو چکی ہے کہ دین و دنیا میں اسے کہیں بھی وہ خلوت حاصل نہیں ہے جو معرفت کے لیے ضروری ہے۔

عورت

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ   اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی   کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن   اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

معانی: عورت کے لفظ کے معنی ہی چھپی ہوئی چیز کے ہیں۔ اس لیے عورت ہو تو اس کا چھپا ہوا ہونا یا پردے میں ہونا لازمی ہے اگر ایسا نہیں تو دیکھنے میں عورت ہے حقیقت میں نہیں۔

① **معانی:** وجودِ زن: عورت کا موجود ہونا۔ **تصویرِ کائنات میں رنگ:** دنیا کی تصویر کا رنگین ہونا۔ **سوزِ دروں:** اندر کا سوز۔

مطلب: شاعر نے اس شعر میں ایک حقیقت بیان کی ہے کہ دنیا کی تصویر اگر رنگین ہے تو صرف عورت کی موجودگی کی وجہ سے ہے۔ عورت ایک ایسے ساز کی مانند ہے کہ جس میں سے ایسے نغمے نکلتے ہیں جس سے آدمی کی زندگی میں اندرونی سوز یا گرمی ہنگامہ پیدا ہوتی ہے۔ اگر دنیا میں صرف مرد ہی ہوتے اور عورت نہ ہوتی تو یہ تصویرِ کائنات سراسر بے رنگ ہوتی۔

② **معانی:** شرف: برتری۔ **ثریا:** ستاروں کا ایک جھرمٹ۔ **مشتِ خاک:** مٹی کی مٹھی، یعنی آدمی۔ **درج:** ڈبیا۔ **درِ مکنوں:** چھپا ہوا موتی۔

مطلب: عورت بظاہر مٹی کی ایک مٹھی ہے یعنی خاکی جسم رکھتی ہے لیکن وہ آسمان کی بلندی پر چمکتی ہوئی ثریا (ستاروں کا ایک جھرمٹ) سے بھی بڑھ کر ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی برتری یا عزت نظر آتی ہے وہ اسی ڈبیا کا پوشیدہ موتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ عورت ہی سب کی سربلندیوں اور عظمتوں کا سرچشمہ ہے۔

③ **معانی:** مکالماتِ افلاطوں: افلاطون ایک یونانی فلسفی تھا جس کی ایک کتاب کا نام مکالمات ہے (مکالمات، مکالمہ کی جمع، آپس میں گفتگو کرنا)۔ **شرار:** چنگاری۔

مطلب: اس سے پہلے شعر میں علامہ نے یہ اشارہ دیا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی باعزت اور برتری والے لوگ ہوئے ہیں وہ عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اسی کی گود میں تربیت پائی ہے۔ اس اصول کو شاعر نے اس شعر میں ایک مثال دے کر سمجھایا ہے۔ افلاطون ایک یونانی فلسفی تھا جس نے مکالمات کے نام سے ایک اہم فلسفیانہ کتاب لکھی ہے۔ اگر عورت (جسے شاعر نے شعلے سے تشبیہ دی ہے) نہ ہوتی تو اس کے بطن سے افلاطون کی چنگاری پیدا نہ ہوتی۔ اور اگر عورت بحیثیت ماں اس کی صحیح تربیت نہ کرتی تو وہ مکالمات جیسی کتاب لکھنے کے قابل نہ ہو سکتا۔ یہ سچ ہے کہ ایسی کتاب وہ خود نہیں لکھ سکی لیکن ایسی کتاب لکھنے والے کو اس نے جنم بھی دیا ہے اور پرورش کرکے ایسی کتاب لکھنے کا اہل بھی بنایا ہے۔

آزادیٔ نسواں

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قند

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

معانی: آزادیٔ نسواں: عورتوں کی آزادی۔

① **معانی:** قند: شکر۔ بحث: قیل و قال۔ گو: اگرچہ۔ خوب: اچھی طرح۔ زہر: ایک دوا جسے کھا کر آدمی مر جاتا ہے۔

مطلب: اس نظم میں آزادی نسواں (عورتوں کی آزادی) کی بحث کے متعلق جو دور جدید کا ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اس بحث پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتا کیونکہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ زہر کیا ہوتا ہے اور شکر کیا ہوتی ہے۔ یعنی میرے سامنے عورت کی آزادی کا زہر اور اس کی اصل اور فطری نسوانی حالت کی شیرینی کا فرق صاف موجود ہے۔ شاعر سب کچھ جاننے کے باوجود اس پر فیصلہ کیوں نہیں دے رہا اس کے لیے اگلا شعر دیکھیے۔

② **معانی:** معتوب: عتاب کو دعوت دینے والا۔ عتاب: بمعنی غصہ، عذاب۔ فرزند: بیٹا۔ خفا: ناراض۔

مطلب: پہلے شعر میں اقبال نے جو یہ کہا ہے کہ میں آزادی نسواں کی بحث کا کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فیصلہ دینے کے اہل نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے جو راز ہے اس کا ذکر اس دوسرے شعر میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر میں نے صحیح فیصلہ دے دیا کہ عورت اس حد تک آزاد نہیں ہونی چاہیے جس سے معاشرے میں خرابی پیدا ہو تو موجودہ تہذیب کے بیٹے یعنی اس کے گرویدہ لوگ جو پہلے ہی میری صحیح باتوں اور مغربی تہذیب کے خلاف فیصلوں سے مجھے اپنے زیر عتاب رکھے ہوئے ہیں وہ مجھ سے اور ناراض ہو جائیں گے۔

③ **معانی:** بصیرت: دانائی۔ فاش کرے: ظاہر کرے۔ معذور ہیں: مجبور ہیں۔ مردان خرد مند: عقل مند لوگ۔

مطلب: عقل مند لوگ جو آزادی نسواں کے مسئلے پر صحیح فیصلہ دے سکتے ہیں حالات کی مجبوری اور معذوری کے تحت خاموش ہیں کیونکہ موجودہ حالات میں عورت کی بے لگام آزادی اتنی عام ہو چکی ہے کہ اگر کوئی اسے روکنے کی کوشش کرے گا تو عورتوں اور عورتوں کی آزادی کے علمبرداروں کے زیر عتاب آ جائے گا۔ میں اس فیصلے کو عورت پر ہی چھوڑتا ہوں جو آج کل اپنے آپ کو بہت دانا سمجھتی ہے کہ اس راز کو اپنی دانائی سے ظاہر کر دے کہ دونوں میں سے کونسی چیز صحیح اور پسندیدہ اور کونسی غلط اور ناپسندیدہ ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ (کونسی دو چیزیں۔ اگلے شعر میں دیکھیے)۔

④ **معانی:** زمرد کا گلوبند: زمرد کے قیمتی پتھروں کا ہار۔ آرائش: زینت۔

مطلب: اللہ تعالیٰ، جس نے مرد اور عورت کے دو الگ الگ جسمانی اور صفاتی مجسمے تخلیق کیے ہیں،

قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ ہم نے مرد کو عورت پر قوام بنایا ہے یعنی مرد کو عورت کی حفاظت کرنے والا اور گھر بیٹھے اس کی ساری ضرورتیں پوری کرنے والا (ایک قسم کا خادم) بنایا ہے۔ اب اس عورت سے جو مردوں سے آزاد ہو کر اپنی انفرادی اور آزادانہ زندگی گزارنا چاہتی ہے' علامہ پوچھتے ہیں کہ یہ بات تو ہی بتا کہ تیرے نزدیک تیری بے لگام آزادی تیری زینت اور قیمت میں زیادہ ہے یا ہیروں کا وہ ہار جو تیرے گلے میں سجا ہوا ہے اور جسے مرد نے تجھے گھر بیٹھے بٹھائے تیری زینت کے لیے عطا کیا ہے۔ اس سوالیہ انداز سے ہوشمند عورت تو یہی جواب نکالے گی کہ میری اس آزادی سے جس میں میں نے اپنی فطری اور قدرتی ذمہ داریوں سے زیادہ خواہ مخواہ کی ذمہ داریاں مول لے لی ہیں اس سے تو میرے لئے وہ محدود آزادی بہتر ہے جو مجھے گھر بیٹھے ملی ہوئی ہے۔ اور جس میں بغیر میری محنت کے اور تگ و دو کے مرد مجھے زندگی کی ساری نعمتیں نصیب کر رہا ہے۔

عورت کی حفاظت

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ' نہ تعلیم' نئی ہو کہ پرانی نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

④ **معانی:** مستور: چھپی ہوئی۔ زندہ حقیقت: وہ سچائی جو کبھی نہ مرے' ہر دور میں صحیح ہو' رگ: خون دوڑنے والی نالی' لہو کا سرد ہونا: جذبات' جوش اور غیرت کا مر جانا۔

مطلب: میرے سینے میں ایک زندہ حقیقت چھپی ہوئی ہے لیکن اسے وہی سمجھ سکتا ہے جس کی رگوں میں خون سرد نہ ہو یعنی جس کے جذبات مردہ نہ ہو چکے ہوں۔ وہ حقیقت کیا ہے؟ شاعر نے اگلے شعر میں بیان کی ہے۔

② **معانی:** نے: نہ۔ نسوانیت زن: عورت کا عورت پن۔ مرد: آدمی' نسوانیت: عورت پن' نگہباں: محافظ۔

مطلب: وہ زندہ حقیقت جس کا شاعر نے پہلے شعر میں ذکر کیا ہے اور جس کو صرف زندہ جذبات والے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ عورت کے عورت پن کا محافظ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف مرد ہے۔ اگر مرد اس نگہبانی کے جذبے سے عاری ہو تو پھر نہ پردہ اور نہ تعلیم' چاہے وہ نئی ہو یا پرانی' عورت کے عورت پن کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ ایسی صورت میں عورت اپنے عورت پن کے حلقہ سے نکل کر عورت نہیں رہے گی کچھ اور بن جائے گی۔

③ **معانی:** خورشید: سورج۔ زرد ہونا: غروب ہونے کے قریب ہونا۔ زندہ حقیقت: سچی اصلیت۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ وہ زندہ حقیقت جو میرے سینے میں چھپی ہوئی تھی اور جس کو میں نے مذکورہ بالا شعر میں صاف بیان کر دیا ہے۔ اس زندہ حقیقت کو کہ نسوانیت زن کا اگر کوئی نگہبان ہے تو صرف مرد ہے۔ جو قوم نہیں پا سکے گی تو سمجھ لینا کہ اس قوم کا سورج بہت جلد غروب ہونے کے قریب ہے۔ جن قوموں نے آزادی نسواں کو مادر پدر آزادی سمجھ کر قبول کر لیا ہے انہوں نے اصل میں فطرت سے بغاوت کی ہے اور فطرت سے بغاوت کرنے والا ضرور سزا پاتا ہے۔

عورت اور تعلیم

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

① **معانی:** تہذیب فرنگی: اہل مغرب کی تہذیب۔ **مرگ:** موت۔ **امومت:** ماں بننا۔ **ثمر:** پھل۔

مطلب: اگر اہل مغرب کی تہذیب عورتوں کو یہ سکھاتی ہے کہ دیکھنا تم ماں نہ بننا' بچے نہ جننا تو سمجھیں کہ اس تہذیب کا پھل انسان کے لیے موت کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ یعنی اگر مائیں بچے جننے چھوڑ دیں گی تو انسان دنیا سے نابود ہو جائے گا اور فرنگیوں کی تہذیب عورت کو ماں نہ بننے کی ہی ترغیب دے رہی ہے جس کا پھل انسانوں کی موت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

② **معانی:** تاثیر: اثر۔ **زن:** عورت۔ **نازن:** عورت نہ رہنا۔ **اربابِ نظر:** صحیح نظر رکھنے والے۔

مطلب: اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی جاندار یا بے جان مخلوق پیدا کی ہے ان میں سے ہر ایک اپنی ایک بنیادی صفت یا جوہر رکھتی ہے۔ اگر اس سے وہ جوہر نکال لیا جائے تو وہ شے دیکھنے میں تو وہ شے ضرور ہو گی لیکن حقیقت میں کچھ اور بن جائے گی۔ مثال کے طور پر آگ کا بنیادی جوہر حرارت اور جلانا ہے اگر اس سے یہ صفت چھین لی جائے تو وہ دیکھنے میں آگ ہو گی حقیقت میں آگ نہیں رہے گی۔ اسی طرح عورت کا بھی ایک بنیادی جوہر ہے اور وہ اس کی صفت عورت پن ہے جو اس کی حیا پر مبنی ہے۔ اگر عورت سے حیا کا جوہر نکال لیا جائے تو وہ دیکھنے میں تو عورت ضرور ہو گی حقیقت میں عورت نہیں رہے گی۔ علامہ کہتے ہیں کہ جدید علم وہ علم ہے کہ جس کو پڑھ کر اور جس کا اثر قبول کر کے عورت' عورت پن کھو بیٹھی ہے۔ اسی لئے دور اندیش اور صحیح اور باریک بین لوگ اس علم یعنی اس جدید تعلیم کو جو موجودہ مدرسوں میں ہے موت کا نام دیتے ہیں۔

③ **معانی:** مدرسہ زن: عورت کی تربیت گاہ۔ **دین:** مذہب' دین اسلام۔

مطلب: اگر عورت کی تعلیم اور تربیت ایسے مدرسے میں ہو جس میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہ ہو تو پھر ہر وہ علم اور ہر وہ ہنر جو وہ سیکھے گی اس کے عشق و محبت کے جذبات کے لیے موت کا سبب ہو گا اور عورت اپنے مقصد تخلیق اور فرائض منصبی سے بالکل غافل ہو جائے گی۔ عورتوں خصوصاً مسلمان عورتوں کو اگر جدید مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنا ہی ہے تو ان کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اپنے دین کی بنیاد کو مضبوط کریں تاکہ مغربی علوم انہیں پر گمراہ اور غلط عمارت تعمیر کرنے پر مجبور نہ کر سکیں۔

عورت

مرد عیاں ، ہوتا ہے بے منت غیر غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق ۔۔۔ آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات ۔۔۔ گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت ۔۔۔ نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

① **معانی:** جوہر: بنیادی صفت۔ **عیاں ہونا:** ظاہر ہونا۔ **بے منت غیر:** بغیر دوسرے کی مدد کے۔ **نمود:** ظاہر ہونا۔

مطلب: مرد اور عورت میں خالق نے جو بنیادی صفتیں رکھی ہیں اور دونوں میں جو فرق ہے اس کو بتاتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ مرد کی بنیادی صفات عورت کی محتاجی اور مدد کے بغیر ہی ظاہر ہو جاتی ہیں لیکن اس کے برعکس عورت کی بنیادی صفات مرد کی مدد سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مرد کو اپنے جوہر ظاہر کرنے کے لئے عورت کی احتیاج نہیں لیکن عورت کو اپنے جوہر ظاہر کرنے کے لیے مرد کی احتیاج ہے اور یہ فرق خالق نے دونوں مجسموں کی تخلیق میں رکھا ہوا ہے جس سے مفر نہیں۔

② **معانی:** **راز:** بھید۔ **تپِ غم:** غم کی حرارت۔ **نکتہ شوق:** شوق کی باریک بات۔ **آتشیں:** آگ سی حرارت والا۔ **لذت تخلیق:** اولاد پیدا کرنے کی لذت۔ **وجود:** ہستی۔

مطلب: عورت کے اندر غم کی جو حرارت ہے اس کا بھید شوق کا یہ باریک نکتہ ہے کہ اس میں اولاد پیدا کرنے کی خواہش آگ کی سی حرارت کی طرح موجود ہے اور اسی سے اس کی ہستی قائم ہے۔ خالق نے عورت کو بنایا ہی اس لئے ہے کہ وہ اولاد پیدا کرے اور اس کا یہ شوق اس میں اولاد حاصل کرنے کی قدرتی حرارت کو زندہ رکھتا ہے۔

③ **معانی:** **اسرار حیات:** زندگی کے بھید۔ **معرکہ بود و نبود:** ہستی اور نیستی کا معرکہ یعنی یہ دنیا' جہاں کوئی زندہ ہوتا ہے اور کوئی مرتا ہے۔

مطلب: عورت کے اندر جو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی لذت یعنی اولاد پیدا کرنے کی ایک قدرتی خواہش رکھی ہوئی ہے وہ ایک ایسی آگ ہے جس سے زندگی کے بھید کھلتے ہیں۔ یہ وہی آگ ہے جس سے اس دنیا میں ہستی و نیستی کی جنگ ہو رہی ہے یعنی کوئی پیدا ہو رہا ہے اور کوئی مر رہا ہے۔ اگر یہ جنگ نہ ہو تو دنیا میں انسان کا وجود ہی ختم ہو جائے۔

④ **معانی:** **مظلومی نسواں:** عورتوں کی مظلومی۔ **عقدۂ مشکل:** مشکل گرہ۔ **کشود:** کھلنا۔

مطلب: یورپ کی جدید تعلیم حاصل کرنے والے اور اس کی تہذیب و تمدن کا اثر لینے والے مفکر اور خود جدید عورتیں ماں بننے کو پسند نہیں کرتیں اور دلیل یہ دیتی ہیں کہ ہمیں کئی مہینے مشقت اٹھانا پڑتی ہے اور پھر بچے جننے سے ہمارے حسن میں کمی آجاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عورتوں کی اس مظلومی پر جس کا وہ اظہار کر رہی ہیں میں بھی غم ناک ہو جاتا ہوں لیکن کیا کیا جائے خالق کائنات نے عورت کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ اولاد پیدا کرے۔ یہ ایک ایسی مشکل گرہ ہے جس کا جدید عقلی نظریات سے کھولنا مشکل ہے۔

ادبیات، فنونِ لطیفہ

دین و ہنر

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

① **معانی:** سرود: موسیقی۔ دین: مذہب۔ کتاب: علم۔ ہنر: فن۔ گہر: موتی۔ گرہ: گانٹھ، جیب، دامن۔ یک دانہ: ایک جیسے سڈول، قیمتی، بے مثل۔

مطلب: موسیقی، شاعری، سیاست، علم، مذہب اور فن میں ایک جیسی صلاحیتیں یا صفتیں ملیں گی۔ سب کی جیب میں بے مثل اور قیمتی موتی موجود ہیں۔ سب انسان کی بھلائی کے لئے ہیں۔

② **معانی:** ضمیر بندہ خاکی: مٹی کے بنے ہوئے جسم والے آدمی کی سرشت۔ نمود: ظہور۔ کاشانہ: گھر، ٹھکانہ، مرتبہ۔

مطلب: ان سب کا ظہور بندہ خاکی (آدمی) کی سرشت سے ہوتا ہے اور ان کا ٹھکانہ اور مرتبہ ستاروں سے بھی بلند ہے۔ لیکن ان کے ستاروں سے بلند ہونے کی ایک شرط ہے جس کا ذکر تیسرے شعر میں ہے۔

③ **معانی:** خودی: آدمی کی خودشناسی۔ عین حیات: سراپا زندگی، صحیح اور مکمل زندگی۔ سراپا: سرتاپا، سربسر۔ فسون و افسانہ: جادو اور کہانی۔

مطلب: اگر یہ جملہ چیزیں جن کا ذکر پہلے شعر میں آیا ہے آدمی کی خودی (خودشناسی اور خود معرفتی) کو نقصان نہ پہنچائیں اور اس کی محافظ ہوں تو پھر یہ آدمی کی زندگی کے لیے مفید ہیں۔ بلکہ سراپا زندگی ہی ہیں۔ اگر یہ خودی کو نقصان پہنچانے والی ہوں تو پھر یہ کہانیوں اور جادو کی اثر انگیزی کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

④ **معانی:** زیر فلک: آسمان کے نیچے، دنیا میں۔ امتوں: قوموں۔ رسوائی: ذلت۔ بے گانہ: ناواقف۔

مطلب: ایسے ادب اور ایسے مذہب یا مسلک سے جو خودی سے ناواقف اور بے خبر ہو دنیا میں قومیں رسوا ہوئی ہیں۔ باعزت نہیں ہوئیں۔ جو ادب، جو موسیقی، جو سیاست، جو علم اور جو شاعری محض تفریح کے لئے ہو اور بے مقصد ہو اس سے قومیں اور افراد سب تباہ ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر یہ خودی سے بے گانہ نہ ہوں اور انسان کی بھلائی اور شرف کے لئے ہوں تو یہ سب کچھ اچھا ہے بلکہ ضروری ہے۔

تخلیق

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحر بیکراں پیدا

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے — جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں — ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے — عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

معانی: تخلیق: نئی چیز پیدا کرنا یا ایجاد کرنا۔

① **معانی:** جہان تازہ: نئی دنیا۔ **افکار تازہ:** نئے خیالات۔ **نمود:** ظہور۔ **سنگ و خشت:** پتھر اور اینٹ۔ **پیدا:** بننا۔

مطلب: یہاں علامہ نے افکار کی دنیا کی بات کی ہے نہ کہ اس دنیا کی جس میں ہم رہتے ہیں اور کہا ہے کہ افکار کے جہان میں نئے نئے خیالات سے نئے نئے جہان ظہور میں آتے ہیں۔ یہ اینٹوں اور پتھروں کا جہان جس میں ہم رہتے ہیں اس میں تو اینٹ اور پتھر ہی کا نیا جہان بن سکتا ہے لیکن ایسا جہان جس میں نیا نظام اور نئے افکار ابھریں صرف انسانی خیالات اور فکر کے نیا پن سے پیدا ہوتا ہے۔

② **معانی:** عزم و ہمت: ارادہ اور حوصلہ۔ **آبجو:** ندی۔ **بحرِ بیکراں:** ایسا سمندر جس کا کنارہ نہ ہو۔

مطلب: جو لوگ اپنی خود معرفتی اور خود شناسی کے دریا میں غوطہ لگائے ہوئے ہیں وہ لوگ ایسے ارادے اور اتنے حوصلے کے مالک ہوتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کی ندی کو اپنے خیالات و افکار کی تازگی کی بنا پر ایک ایسا سمندر بنا دیتے ہیں جس کا کوئی کنارہ نہ ہو یعنی ان کے عزم اور ان کی ہمت کی کوئی حد نہیں ہوتی اور وہ ایسے نئے نئے جہان ہائے خیالات و افکار پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے آدمیت کا شرف بڑھتا ہے۔

③ **معانی:** زمانے کی گردش: کہتے ہیں زمانہ گردش (حرکت) میں رہتا ہے جس سے دنیا میں حالات بدلتے رہتے ہیں۔ **غالب آنا:** فتح پانا۔ **نفس:** سانس۔ **عمرِ جاوداں:** ہمیشہ کی زندگی۔

مطلب: زمانہ اگر اپنی گردش کی وجہ سے ناموافق ہو تو اس کی ناموافق گردش پر وہی شخص غلبہ پا سکتا ہے اور اسے موافق گردش پر لا سکتا ہے جو اپنی ایک ایک سانس سے ہمیشہ کی زندگی پیدا کرے۔ یعنی ہر لمحہ کو اپنی ہمت اور کوشش سے حرکت زمانہ کو بدلنے میں لگائے رکھے۔ اور عزم و حوصلہ کو نہ چھوڑے۔ ایسا وہی کر سکتا ہے جس کی خودی بلند و ارفع ہو۔

④ **معانی:** مشرق کی سرزمین: ایشیا اور افریقہ کے ملک۔ **رازداں:** راز پانے والا۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ میں نے مشرق کے ممالک یعنی افریقہ اور ایشیا کے ملکوں میں دیکھا ہے یہاں نہ لوگوں کی انفرادی خودی بیدار ہے اور نہ جماعتی و ملکی بے خودی آشکارا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کمزور بھی ہیں اور غلام بھی ہیں۔ اگر ان میں ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جائے جو خودی کا بھید جاننے والا اور خود مالک خودی ہو تو مشرقی ملکوں کی تقدیر بدل سکتی ہے اور زمانے کی گردش کو بھی (جس کا اس سے پہلے شعر میں ذکر آیا ہے) وہی شخص روک کر اپنے موافق کر سکتا ہے اور یہ مالک خودی اللہ کا کوئی برگزیدہ و چیدہ بندہ ہو گا۔ وہ جو درویشی اور فقر کے ملک کا شہنشاہ ہو گا جس میں تقدیریں بدلنے کی صلاحیت موجود ہو گی لیکن خدا جانے خدائی اور خودی کا ایسا رازدان کیوں پیدا نہیں ہو رہا۔

⑤ **معانی:** ہوائے دشت: بیابان کی ہوا۔ **بوئے رفاقت:** ساتھی ہونے کی خوشبو۔ **ہم عناں:** ہم زمام

ہم خیال اور ہم کار۔

مطلب: بیابان کی ہوا سے مجھے دوستی اور ہم خیالی کی خوشبو آ رہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر مجھے یہاں میرے ہم نوا ہم خیال اور ہم کار مل جائیں۔ بیابان مشرق ممالک کو کہا ہے اور اپنی شاعری کو ایک ایسی نوا کہا ہے جو ان کو جگانے کے لئے کی گئی ہے۔ شاعر کو یقین ہے کہ اس کی شاعری کے ذریعے مشرقی ممالک میں کچھ لوگ ایسے ضرور پیدا ہو جائیں گے جو اس کی طرح کے افکار اور خیالات رکھتے ہوں گے۔

جنوں

زجاج گر کی دکاں شاعری و ملّائی ستم ہے خوار پھرے دشت و در میں دیوانہ

کسے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ

ہجوم مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو کہ اس کے واسطے لازم نہیں ہے ویرانہ

معانی: جنوں: سودا لیکن خوش سودا، عشق صادق کی انتہا۔

① **معانی:** زجاج گر: شیشہ بنانے والا۔ وشت و در: جنگل اور بیابان، دیوانہ: سودائی، خوار پھرنا: ذلیل ہوتے پھرنا، ملّائی: ملّا ہونا، دین اسلام کا مولوی یا عالم ہونا۔

مطلب: آج کل کی شاعری اور آج کل کی ملّائی کی مثال ایک شیشہ گر کی دکان کی طرح ہے جس میں ظاہری چمک تو ہوتی ہے لیکن مضبوطی نہیں ہوتی۔ اسے جب چاہیں ریزہ ریزہ کیا جا سکتا ہے لیکن ظلم یہ ہے کہ وہ دیوانے جو ایسی دکانوں کو توڑ سکتے ہیں وہ جنگل اور بیابانوں میں ذلیل اور خوار پھر رہے ہیں۔ مراد ہے کہ ایسے اہل لوگ جو واقعی ملّا بننے کے اور شاعر بننے کے قابل ہوں ان کی تو کوئی قدر نہیں اور نہ ہی ان میں وہ ہمت اور جنوں ہے کہ وہ ان شیشہ گروں جھوٹے شاعروں اور ملّاؤں کی دکانوں کو ریزہ ریزہ کر دیں۔

② **معانی:** کمال: اعلیٰ وصف۔ کوہ و کمر: پہاڑ اور گھاٹی۔ بیگانہ: ناواقف۔

مطلب: بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ جنوں (خوش سودا یا انتہائی عشق) میں علاوہ جنوں کے اور بھی وصف ہیں اگر کسی صاحب جنوں کو پہاڑوں اور گھاٹیوں یا جنگل اور بیابان سے ناواقف یا الگ بھی کر دیا جائے تو اسکے کرنے کے اور کام بھی ہیں جیسا کہ ایک کام پہلے شعر میں ملّائی اور شاعری کی شیشہ گری کی دکانیں توڑنے کا ہے اور دوسرا کام اس سے اگلے شعر میں بتایا گیا ہے۔

③ **معانی:** ہجوم مدرسہ: درس گاہوں کی بھیڑ بھاڑ۔ سازگار: موافق، واسطے: لئے، ویرانہ: بیابان،

مطلب: شاعری اور ملّائی کی طرح ہمارے جدید مدارس بھی علم کی جگہ کی بجائے نام نہاد طالب علموں کی بھیڑ کی جگہ بن چکے ہیں۔ شیشہ گروں کی دکانوں کی طرح ان مدرسوں کو ویران کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے صاحب جنوں کا یہ کام بھی ہے کہ وہ بیابانوں کی بجائے ان مدرسوں کا رخ کرے اور ان کو برباد کر کے ان کی جگہ ایسے مدارس قائم کرے جہاں صحیح طالب علم اور انسان پیدا ہو سکیں۔ صاحب جنوں سے دراصل وہ لوگ مراد ہیں جو جنوں کی حد تک اپنے مقصد کو پورا کرنے کی لگن رکھتے ہوں۔

اپنے شعر سے

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا ۔۔۔ تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
شعلے سے ٹوٹ کے مثلِ شررِ آوارہ نہ رہ ۔۔۔ کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

① **معانی:** گلہ ہے: شکایت ہے۔ **لذتِ پیدائی:** ظاہر ہونے کی چاشنی۔ **فاش ہونا:** بھید کا کھلنا۔ **اسرار:** سّر کی جمع، راز، بھید۔

مطلب: شاعری دراصل شاعر کے ذاتی اور پوشیدہ جذبات و افکار کی نمائندگی کرتی ہے۔ زمانہ حاضر چونکہ ان جذبات و افکار کا حامل نہیں بن سکتا جو اقبالؒ کے سینے میں انگڑائی لے رہے ہیں اس لیے وہ اپنی شاعری سے خود ہی شکایت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ تجھے ظاہر ہونے کی چاشنی نے وجود دیا ہے۔ اس دور میں تجھے ظاہر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب جب کہ تو ظاہر ہو گئی ہے تو تجھ پر لازم ہے کہ وہ بھید جو میرے سینے میں چھپے ہوئے ہیں ان کو بھی فاش کر دے۔ یعنی پوری طرح میرے پوشیدہ اور باطنی جذبات و افکار کی نمائندہ بن جا۔

② **معانی:** **شرر:** چنگاری۔ **آوارہ نہ رہ:** بے مقصد نہ پھر، بے کار نہ رہ۔ **سینہ پرسوز:** تپش اور حرارت سے بھرا ہوا سینہ۔ **خلوت:** تنہائی۔ **شعلہ:** آگ کی لپیٹ، **مثل:** مانند۔

مطلب: شاعر نے یہاں شعلہ اور چنگاری کی مثال دے کر اپنے مقصد کو بیان کیا ہے۔ جب آگ میں سے چنگاری نکلتی ہے تو بے مقصد ہوا میں گم ہو جاتی ہے۔ وہ کسی چیز کو جلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اپنی شاعری سے اقبال اس پس منظر میں یہ کہہ رہے ہیں کہ تو بھی میرے سینے کی آگ سے نکل کر چنگاری کی طرح بے مقصد اور بے کار نہ رہ جانا بلکہ ایسے سینوں کو تلاش کر کے کہ جن میں حرارت اور تپش ہے ان کی خلوت میں اپنی جگہ بنا لینا۔ کیونکہ میری شاعری ایسے سینوں کی ہی اہل ہے۔ بے سوز سینے اسے نہ برداشت کر سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔

پیرس کی مسجد

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے ۔۔۔ کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے ۔۔۔ تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بتخانہ
یہ بتکدہ انہیں غارت گروں کی ہے تعمیر ۔۔۔ دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

معانی: پیرس: پیرس ملک فرانس کا دارالحکومت ہے۔ جہاں مسلمانوں نے ایک مسجد تعمیر کی تھی۔

① **معانی:** **کمالِ ہنر:** فن تعمیر کا اعلیٰ وصف۔ **حرمِ مغربی:** مغربی ملک میں بنی ہوئی مسجد۔ **حق:** صداقت، خدا۔

مطلب: پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تو فرانس نے بعض دوسرے مسلمان ملکوں کے علاوہ ملک شام پر بھی قبضہ کر لیا جس کا دارالحکومت دمشق ہے۔ اہلِ فرانس نے غالباً حکومت فرانس کے اشارے پر اپنے ملک کے دارالحکومت پیرس میں ایک مسجد بنائی جو فنِ تعمیر

کے لحاظ سے اعلیٰ اوصاف کی مالک تھی لیکن علامہ کہتے ہیں کہ یہ مسجد جو اس مغربی ملک میں بنی ہے صداقت یا خدا سے بالکل خالی ہے کیونکہ اس کے پیچھے مقصد صرف مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے سوا یا ان کو خوش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

② **معانی**: حرم: مسجد۔ **فرنگی کرشمہ باز**: شعبدے دکھانے والے اہل مغرب۔ **تن حرم**: مسجد کا جسم۔ روح بت خانہ: کفر اور باطل کی روح۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ مسجد صحیح معنوں میں مسجد نہیں ہے کیونکہ اہل مغرب کے شعبدہ بازوں نے اس مسجد کے جسم میں بت پرستی یا کفر اور باطل کی روح چھپا رکھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مقصد ان کا مسجد تعمیر کر کے صرف مسلمانوں کو یہ فریب دینے کی کوشش کرنا ہے کہ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں حالانکہ وہ اندر سے اسلام کے اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

③ **معانی**: **غارت گر**: لٹیرے۔ **دمشق**: ملک شام کا دار الحکومت۔ **ویرانہ**: ویران، تباہ و برباد۔

مطلب: یہ مسجد اپنی شکل کے اعتبار سے تو ضرور مسجد ہے لیکن چونکہ اس کی تعمیر کا مقصد محض مسلمانوں کو فریب دینا ہے اور یہ ان لٹیروں (فرانسیسیوں) نے بنائی ہے جنھوں نے لشکر کشی کر کے ملک شام کے دار الحکومت دمشق کو تباہ و برباد کر کے بیابان بنا دیا ہے اس لیے اقبال کے نزدیک یہ ظاہری شکل میں مسجد ہونے کے باوجود اندرونی طور پر کافری روح اپنے اندر رکھتی ہے۔

ادبیات

عشق اب پیروی عقل خداداد کرے آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

معانی: **ادبیات**: ادب سے متعلق تمام باتیں۔ ادب سے یہاں مراد ہے شعر و شاعری اور دوسری اصناف۔

① **معانی**: **پیروی کرنا**: پیچھے چلنا، تقلید کرنا۔ **عقل خداداد**: خدا کی دی ہوئی عقل۔ **آبرو**: عزت۔ **کوچہ جاناں**: معشوق کی گلی۔

مطلب: آج کل کے ادب (شعر و شاعری، نثر، ناول، ڈرامہ وغیرہ) کے متعلق اقبال یہ رائے دیتے ہیں کہ یہ عشق سے یعنی سوز اور جذبہ سے بالکل خالی ہے حالانکہ یہ ادب کے دو بنیادی وصف ہیں۔ آج کل کے ادیب عشق کی بجائے خدا کی دی ہوئی عقل کے غلام ہیں اور معشوق کی گلی میں جا کر اپنی عزت برباد کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ یعنی وہ جذبے اور عشق سے (جو ادب خصوصاً شعر و شاعری کی روح ہے) بالکل خالی ہیں۔

② **معانی**: **کہنہ پیکر**: پرانا جسم۔ **کہن روح**: پرانی روح۔ **تقلید سے آزاد کرنا**: پیروی سے چھڑانا۔

مطلب: آج کے ادیبوں کو اپنی جدید راہ چھوڑ کر یا تو یہ کرنا چاہیے کہ پرانی طرز کی شاعری میں نئی جان پیدا کریں اور انہیں آدمیت و انسانیت اور قومی اور وطنی ترقی کے موضوعات سے آشنا کریں اور اگر وہ یہ

نہیں کرسکتے تو پھر یہ کریں کہ پرانی شاعری کو ہی اپنائیں لیکن اس کی روح کو روایتی پیروی سے چھڑا کر اس میں نئے نئے اسالیب و معانی پیدا کریں۔

نگاہ

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی — شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی — یہ بحر یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی
سفر عروسِ قمر کا عماریِ شب میں — طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں — کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

معانی: نگاہ: نظر۔

①②③④ **معانی:** لالہ ہائے صحرائی: صحرا میں کھلے ہوئے لالے کے پھول جو سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ **شباب:** جوان۔ **رعنائی:** ظاہری رونق' زیبائی۔ **چشمکیں:** آنکھوں کے اشارے۔ **بحر:** سمندر۔ **فلک نیلگوں:** نیلا آسمان۔ **پہنائی:** وسعت۔ **عروسِ قمر:** چاند کی دلہن۔ **عماری شب:** رات کی ڈولی۔ **طلوعِ مہر:** سورج کا نکلنا۔ **سکوت سپہر مینائی:** نیلے رنگ کے آسمان کی خاموشی۔ **بہائے نظارہ:** نظارے کی قیمت۔ **فطرت:** قدرت۔ **جمال:** حسن۔ **زیبائی:** زینت۔

مطلب: یہ چاروں اشعار چونکہ مسلسل مضمون کے حامل ہیں اس لیے ان کو اکٹھا لکھ دیا گیا ہے۔ مطلب یوں بنتا ہے کہ موسم بہار ہو' صحرا کے سرخ رنگ کے لالہ کے پھولوں کے قافلے سامنے ہوں' جوانی کا زمانہ ہو اور اس عمر کی مستی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہو' ہر قسم کی لذت اٹھانے کی خواہش موجود ہو اور سرور یا خوشی حاصل کرنا بھی مقصود ہو' اور حسن و جمال اپنی کمال زیبائی پر ہو' رات کی تاریکی ہو اور اس میں ستارے ایک دوسرے سے اشاروں میں مصروف ہوں' سمندر ہو یا نیلے آسمان کی وسعت ہو' رات کے کجاوے یا ڈولی میں چاند کی دلہن کا سفر ہو' سورج نکل رہا ہو اور نیلے آسمان پر خاموشی چھائی ہو' ان سب کو دیکھنے کے لئے انسان کے پاس نظر چاہیے ورنہ ان نظاروں کو دیکھنے کا تو قدرت کوئی معاوضہ نہیں چاہتی اور نہ ہی قدرت ان نظاروں کے حسن و جمال کو اور زینت و کمال کو بیچتی ہے۔ یہ تو مفت کے نظارے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان کے پاس دیکھنے والا حسن نظر موجود ہو اگر یہ نہیں تو یہ سارے حسین و جمیل نظارے اس کے لئے بے کار ہیں۔

مسجد قوت الاسلام

ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی — لا الہ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود
چشمِ فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو — کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقامِ محمود
کیوں مسلماں نہ خجل ہو تری سنگینی سے — کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود
ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت، وہ گداز بے تب و تابِ دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود؟

معانی: یہ ہندوستان میں فتح دہلی کے بعد پہلی مسجد ہے جسے قطب الدین ایبک نے دارالحکومت دہلی میں تعمیر کرایا تھا اور جس کا ایک مینار قطب مینار کے نام سے آج بھی تعمیرات کے شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے۔ (اس کو مسجد قوت الاسلام کہتے ہیں)

① **معانی:** لاالٰہ: کلمہ توحید۔ **افسردہ:** بجھا ہوا۔ **بے ذوقِ نمود:** اظہار کے ذوق کا نہ ہونا۔

مطلب: اس نظم میں میرے اور میری کے الفاظ علامہ نے علامتی طور پر استعمال کئے ہیں جس کے اصل معنی آج کل کے بے عمل مسلمان ہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ آج ہم مسلمانوں کے سینے روحِ اسلام سے خالی ہو چکے ہیں اور کلمہ توحید کی روح ہمارے اندر مردہ ہو چکی ہے یا بجھ چکی ہے اور کسی میں بھی توحید کو ظاہر کرنے کا ذوق موجود نہیں ہے۔ مسلمان لاالٰہ زبان سے تو پڑھتے ہیں لیکن دل اس کی روح سے خالی ہیں۔

② **معانی:** **چشمِ فطرت:** قدرت کی آنکھ۔ **ایازی:** غلامی، ایاز سلطان محمود کا غلام تھا۔ **مقامِ محمود:** سلطان محمود غزنوی کا مرتبہ یعنی سلطانی و حکمرانی۔ **دگرگوں ہے:** منتشر ہے، الٹ ہے، برباد ہے۔

مطلب: مسلمانوں میں غلامی کی وجہ سے سلطانی اور حکمرانی کا نظام اس طرح الٹ پلٹ ہو چکا ہے اور مسلمان مسلمانی کے اعتبار سے اس حد تک بدل چکے ہیں کہ قدرت کی آنکھ بھی شاید انہیں بطور مسلمان نہ پہچان سکے۔

③ **معانی:** **خجل ہونا:** شرمندہ ہونا۔ **سنگینی:** مضبوطی۔ **مثلِ زجاج:** شیشے کی مانند۔ **وجود:** ہستی، جسم۔

مطلب: اے مسجد قوت الاسلام تیرے وجود سے جو تیری مضبوطی کی وجہ سے سینکڑوں سال گزرنے پر آج بھی قائم ہے مسلمان کیوں نہ شرمندہ ہو کہ غلامی نے اس کی اور اس کے اندر مسلمانی کی مضبوطی کو شیشے کی مانند نرم کر دیا ہے۔

④ **معانی:** **شان کے شایاں:** شان کے قابل۔ **تکبیر:** اللہ اکبر کہنا۔ **بود و نبود:** ہستی اور نیستی۔

مطلب: اے مسلمان نمازیں تو بھی پڑھتا ہے لیکن یہ نماز کی اصل روح سے خالی ہیں۔ مومن کی شان کے لائق تو وہ نماز ہوتی ہے جس کی تکبیر (اللہ اکبر کہنے) میں وجود و عدم یا ہستی و نیستی کی جنگ موجود ہو۔ یعنی وہ اپنی تکبیر سے حق کو وجود دینے والا اور باطل کو ختم کرنے والا ہو۔

⑤ **معانی:** **نفس:** سانس۔ **گداز:** سوز۔ **بے تب و تابِ دروں:** اندرونی تڑپ اور گرمی کے بغیر۔ **صلوٰۃ:** نماز۔ **درود:** حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایک خاص انداز اور خاص الفاظ میں تحسین و آفرین کرنا۔

مطلب: آج کے مسلمانوں کی سانسوں میں پہلے مسلمانوں کی سانسوں جیسی گرمی اور سوز باقی نہیں رہا۔ ان کی نمازیں پڑھنا یا ان کا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر درود بھیجنا بالکل رسمی ہوتا ہے اور ان میں اندرونی گرمی اور تڑپ بالکل نہیں ہوتی یعنی یہ سب کچھ رسمی رہ گیا ہے اور اصلی روح ان کے اجسام سے نکل چکی ہے۔

④ **معانی:** **بانگ اذاں:** اذان کی آواز۔ **شکوہ:** ہیبت، دبدبہ، شان۔ **گوارا:** پسند، برداشت۔ **سجود:** سجدہ۔
مطلب: اے مسجد قوت الاسلام تجھ میں جو موذن اذان دیتا ہے اس کی اذان میں بھی وہ رفعت اور وہ ہیبت نہیں رہی جو کبھی اذان سے فضا میں اور مسلمانوں کے دلوں پر چھا جاتی تھی اور وہ جوق در جوق خدا کے آگے سجدہ ریز ہونے کے لیے کھنچے چلے آتے تھے۔ اے مسجد اب جس قسم کی بے سوز اور بے شان اذان اس دور کا گیا گزرا مسلمان تجھ میں دے رہا ہے کیا تو اسے پسند کرتی ہے یا برداشت کرتی ہے۔ ایسے مسلمان کی اذان کو اور اس کے سجدوں کو جو وہ نماز میں ادا کرتا ہے۔ یقیناً یہ مسجد پسند نہیں کرتی ہوگی کیونکہ یہ سب کچھ رسمی رہ گیا ہے اور اصل روح اسلامی سے بیگانہ ہو چکا ہے۔

تیاتر

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود — حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام — اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ — دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے — رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

معانی: **تیاتر:** انگریزی لفظ تھیٹر کا اردو بنایا ہے۔ مطلب تماشہ گاہ، خصوصاً اسٹیج پر دکھانے والا تماشہ۔
معانی: **حریم وجود:** وجود کا گھر (جسم)۔ **ثبات:** قائم رہنا، پائیداری۔ **خودی:** اپنی معرفت، **حیات:** زندگی
سوز: جلن، **سرور:** مستی، خوشی

مطلب: یہاں علامہ نے آدمی کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تیری ہستی کا گھر خودی (خود شناسی، خود معرفتی) سے روشن ہے۔ زندگی جسے کہتے ہیں وہ اسی خودی کی خوشی، تپش اور پائیداری کا نام ہے۔ یعنی خودی انسانی زندگی جس میں یہ صفات پیدا کرتی ہے اور اس کے جسم کے گھر کو روشن رکھتی ہے۔

② **معانی:** **بلند تر:** زیادہ بلند۔ **مہ و پرویں:** چاند اور تارے۔ **پیدا:** ظاہر، **مقام:** مرتبہ، **وجود:** ہستی، **صفات:** صفت کی جمع
مطلب: خودی کے نور سے آدمی کی ذات اور اس کی صفات کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں اور جب یہ جوہر کسی آدمی میں پیدا ہو جائیں تو اس کا مرتبہ چاند اور ثریا ستارے سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔

③ **معانی:** **حریم:** گھر۔ **معاذ اللہ:** خدا کی پناہ۔ **لات و منات:** دو بتوں کے نام جو کعبے میں رکھے ہوئے تھے۔ **دوبارہ:** پھر سے، **زندہ کرنا:** تازہ کرنا، **غیر:** دوسرا، **خودی:** خود شناسی۔
مطلب: علامہ تیاتر میں اسٹیج پر اداکاری کرنے والے اداکار سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ خودی جس کا میں نے مذکورہ بالا اشعار میں ذکر کیا ہے تجھ میں موجود نہیں ہے۔ اداکاری چونکہ نقالی ہوتی ہے اور اے اداکار تو چونکہ دوسروں کی نقل اتارتا ہے اس طرح تو اپنے گھر میں اپنی خودی کی بجائے غیر کی خودی کو داخل کرتا ہے جس سے تجھے توبہ کرنی چاہیے اور اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے کیونکہ اس طرح تو کافروں کے زمانے میں کعبے میں رکھے ہوئے لات اور منات کے کاروبار بت پرستی کو دوبارہ زندہ کر رہا ہے۔

⑤ معانی: تمثیل: اداکاری، ڈرامہ۔ کمال: عروج، سوز: جلن، ساز: لذت، خودی: اپنی معرفت۔

طلب: ڈرامہ کھیلنے یا اداکاری کرنے کا کمال یہ ہے کہ اداکار اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے اور خود میں کسی سرے کو داخل کر کے اس کی جگہ اداکاری کر رہا ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے اداکار اس کا نتیجہ ائے اس کے کچھ نہیں کہ تیری ہستی مٹ جائے اور تجھ میں نہ خودی (خود معرفتی و خود شناسی) کی تپش ں رہے اور نہ زندگی کا نغمہ باقی رہے۔

شعاع امید

①

ورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام — دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام
ت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں — بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت — نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
ر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ — چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

① مطلب: سورج نے اپنی کرنوں کو یہ پیغام دیا کہ اس دنیا کو بھی اللہ تعالیٰ نے عجیب بنایا ہے کبھی اس ں میرے نکلنے سے صبح طلوع ہوتی ہے اور کبھی میرے غروب ہونے سے شام کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔

② معانی: پہنائے فضا: فضا کی وسعت۔ بے مہری ایام: زمانے کا ظلم۔

طلب: سورج مزید کہتا ہے کہ اے کرنو! تم ایک عرصہ سے فضا کی وسعت میں منتشر ہو اور اشیائے انہ پر تم اپنا پرتو ڈال رہی ہو لیکن اس کے مقابلے میں زمانے کے ظلم کو دیکھو کہ وہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے ہیں روندتا ہوا چلا جا رہا ہے اور تمہارے احسان اور محبت کی کوئی قدر نہیں کر رہا۔

③ معانی: نے: نہ۔ راحت: آرام۔ مثل: مانند۔ صبا: صبح کی نرم اور لطیف ہوا جس کے اثر سے پھول لتے ہیں۔ طواف گل و لالہ: گلاب کے اور لالہ کے پھولوں کے پھیرے لینا۔

طلب: سورج اپنی کرنوں کو مزید یہ کہتا ہے کہ تم مٹی اور ریت کے ذروں میں چمک پیدا کرتی ہو لیکن اب میں وہ تمھیں کوئی آرام نہیں پہنچاتے۔ جس طرح صبح کی نرم اور لطیف ہوا پھولوں کو کھلانے کے لئے گلاب اور لالہ کے پھولوں کے پھیرے لیتی ہے لیکن اس احسان کے بدلے میں، وہ صبا کو آرام تک بھی یب نہیں کرتے اسی طرح تمہارے احسان کا بھی کوئی شے بدلہ نہیں چکاتی۔

④ معانی: تجلی کدۂ دل: تجلیات بھرا دل۔ چمنستان: گلستان، باغ۔ در و بام: آبادی، شہر۔

طلب: سورج کہتا ہے اے میری کرنو! جب تمہارے رحم کے بدلے تم پر ظلم کیا جاتا ہے اور جب ہارے احسانات کا کوئی بدلہ نہیں چکایا جاتا تو بہتر یہ ہے کہ تم سمٹ جاؤ اور میرے دل کی جلوہ گاہ میں بند و جاؤ۔ باغ، بیابان اور آبادیوں کو بالکل چھوڑ دو اور کہیں بھی چمکنا اور دمکنا بند کر دو۔

②

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں — بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن — افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم — لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے — اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

① **معانی :** **آفاق :** افق کی جمع' دنیا' کائنات۔ **شعاعیں :** کرنیں۔ **ہم آغوش :** بغل گیر۔ **خورشید :** سورج۔

مطلب: پہلے حصے میں سورج کے کرنوں کو یہ کہنے پر کہ تم اشیاء پر چمکنا چھوڑ دو کائنات کے ہر کونے سے کرنوں نے اٹھنا شروع کیا اور اس سورج سے بغل گیر ہو گئیں (دوبارہ سورج میں سما گئیں) جس سورج سے الگ ہو کر وہ دنیا اور اس کی اشیاء کو چمکا رہی تھیں۔

② **معانی :** **اجالا :** روشنی۔ **افرنگ :** اہل مغرب۔ **سیہ پوش :** کالے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے۔

مطلب: علامہ سورج کو اپنی کرنیں واپس لینے پر کہتے ہیں کہ ان کرنوں سے چیزیں تو ضرور روشن ہو رہی ہیں لیکن مغربی تہذیب و تمدن کی تاریکی ان کرنوں کی روشنی کو تاریکی میں بدل رہی ہے اس لیے ہر طرف شور برپا ہے کہ مغرب میں روشنی کا ہونا ممکن نہیں۔ اہل مغرب کو دیکھیں کہ وہ مادہ کے پجاری ہو چکے ہیں اور مشینیں (کارخانے) لگا کر اس کی چمنیوں کے دھوئیں کی وجہ سے سیاہ کپڑے پہننے والے بن گئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نہ ان کے جسم (طہارت نہ ہونے کی وجہ سے) پاک ہیں اور نہ ان کے دلوں میں نور ہے۔ ایسے حالات میں کرنوں کا ان پر چمکنا بے فائدہ ہے۔

③ **معانی :** **لذت نظارہ :** چیزوں کو دیکھنے کا شوق۔ **محروم :** بیگانہ۔ **صفت عالم لاہوت :** فرشتوں کے جہان کی مانند۔

مطلب: اہل مغرب کے مقابلے میں اہل مشرق میں نظاروں کو دیکھنے کی چاشنی موجود ہے اور وہ اس ذوق سے بیگانہ نہیں ہیں لیکن وہ عملاً کچھ نہیں کر رہے۔ ان کی مثال تو فرشتوں کی دنیا کی سی ہے جہاں کوئی ہنگامہ نہیں ہے۔

④ **معانی :** **مہرِ جہاں تاب :** دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔ **فراموش کرنا :** بھول جانا۔

مطلب: اس پس منظر میں جس کا ذکر اہل مغرب اور اہل مشرق کے سلسلے میں مذکورہ بالا شعروں میں ہوا ہے کرنیں اتنی مایوس ہو جاتی ہیں کہ وہ جہان کے روشن کرنے والے اس سورج کو جس سے وہ جدا ہوئی ہیں فریاد کرتی ہیں کہ اے سورج تو ہمیں بھول مت اور ہمیں سمیٹ کر دوبارہ اپنے روشن سینے میں بند کر لے کیونکہ ایسی دنیا میں ہمارا چمکنا بے کار اور فضول ہے۔

③

ک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور ۔ آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
ولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو ۔ جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو ۔ جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز ۔ اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن ۔ یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درِ ناب
س خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی ۔ جن کے لیے ہر بحرِ پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں ۔ محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
ت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن ۔ تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
شرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر ۔ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

① **معانی:** صفت جوہر سیماب: پارے کی اصلیت کی مانند جس کی صفت ہر وقت تڑپتے رہنا ہے۔ شوخ: نخرے والی، کرن: شعاع، حور: جنت کی حسین عورت، صفت: مانند۔

مطلب: جب کرنوں نے (جیسا کہ نظم نمبر 2 کے آخری شعر میں کہا ہے) سورج سے یہ کہا کہ ہمیں سمیٹ لے اور اپنے اندر جذب کر لے تو ان میں سے ایک کرن جو جنت کی حور کی نگاہ کی مانند شوخ تھی اور پارے کی تڑپ کی صفت کی مانند چین اور آرام سے فارغ تھی یعنی بیقرار تھی کہنے لگی اس نے جو کچھ کہا اس کے بعد کے شعروں میں دیکھیے)۔

② **معانی:** رخصت تنویر: چمکنے کی اجازت۔ جہاں تاب: جہاں کو روشن کرنے والا۔

مطلب: سورج کی ان گنت کرنوں میں سے ایک کرن جو بڑی شوخ تھی، سورج سے کہنے لگی کہ ساری کرنیں چاہیں تو سمٹ جائیں لیکن میں نہیں سمٹنا چاہتی۔ اے سورج مجھ کو اجازت دے کہ میں اس روئے زمین پر اس وقت تک چمکتی رہوں جب تک کہ میں مشرقی دنیا کے ایک ایک ذرے کو، پورے جہان کو روشن کرنے والا ذرہ نہ بنا لوں۔ مراد ہے جملہ اہل مشرق میں بیداری نہ پیدا کر لوں۔

③ **معانی:** مردان گراں خواب: گہری نیند سوئے ہوئے لوگ۔ ہند: ہندوستان، تاریک: سیاہ

مطلب: وہ شوخ کرن سورج سے مزید کہنے لگی مجھے چمکنے کی اس وقت تک کی مہلت دو جب تک کہ میں ہند (متحدہ ہندوستان یا برصغیر) کی اندھیری فضا کو روشن نہ کر لوں اور جب تک اس ملک کے گہری نیند سوئے ہوئے (یعنی غفلت میں بیکار زندگی گزارنے والے) لوگ نیند سے جاگ نہیں پڑتے اور ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو جاتے۔

④ **معانی:** خاور: مشرق۔ اشک: آنسو، خاک: مٹی، زمین، ملک، مرکز: محور، مدار، سیراب ہونا: نم والی ہونا۔

مطلب: یہ خاک یعنی برصغیر کی مٹی چونکہ اقبال کے آنسوؤں سے سیراب ہو چکی ہے اس لیے اس میں سے مشرق اور اہل مشرق کی امیدوں کے پودوں کا نکلنا اور بڑھنا ممکن ہے۔ اسی لئے برصغیر کی خاک تمام مشرقی ممالک اور جملہ اہل مشرق کی امیدوں کا مرکز ہے۔

⑤ **معانی:** چشم مہ و پرویں: چاند اور ثریا کی آنکھیں۔ خزف ریزہ: ٹھیکری۔ درناب: خالص موتی، سچا

موتی۔

مطلب: اس ملک کی یعنی برصغیر کی مٹی کو خالق نے ایسی روشنی عطا کی ہے کہ جس سے چاند اور ثریا ستارے کی آنکھیں بھی روشن ہیں۔ یہ مٹی وہ ہے کہ اس کی ہر ٹھیکری یا سنگ ریزہ خالص اور سچے موتی کے برابر ہے۔

⑥ **معانی:** **غواص معانی:** معانی کے دریا میں غوطہ لگانے والے۔ **بحر پر آشوب:** طوفان بھرا اور تلاطم خیز سمندر۔ **پایاب:** پاؤں پر چل کر گزر جانے والا یعنی قدم برابر چوڑا۔

مطلب: برصغیر کی مٹی سے ایسے ایسے لوگ اٹھے ہیں جنھوں نے معانی کے سمندر میں غوطے لگائے ہیں یعنی یہاں اعلیٰ درجے کے مفکر اور درویش پیدا ہوئے ہیں اور یہ معانی کے سمندر میں غوطہ لگانے والی شخصیتیں ایسی بلند ارادہ اور بلند حوصلہ تھیں کہ طوفانی سمندروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں اور اس کو صرف ایک قدم کا فاصلہ سمجھتی تھیں۔

⑦ **معانی:** **مضراب:** ساز کو بجانے والی وہ چیز جو سازندہ کی انگلی میں ہوتی ہے۔ **ساز:** موسیقی کا آلہ۔ **نغمہ:** راگ۔ **حرارت:** تپش۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے برصغیر کو ایک ساز کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ جس طرح ساز کو بجانے والے انگلی میں موجود آلہ سے جب کوئی سازندہ محروم ہوتا ہے تو وہ ساز کے تاروں سے نغموں کو باہر نہیں لا سکتا اسی طرح برصغیر کی بھی یہی حالت ہو گئی ہے کہ جس میں کبھی بڑے بڑے رشی، منی، مجدد، ولی، درویش، شاعر، ادیب، مفکر، مصور اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے تھے اب بدقسمتی سے اس ملک میں پیدا نہیں ہو رہے۔

⑧ **معانی:** **تہ محراب:** مسجد کی محراب کے نیچے۔ **برہمن:** ہندوؤں کا مذہبی پیشوا۔

مطلب: برصغیر میں چونکہ دو بڑی قومیں موجود ہیں جن میں سے ایک قوم بتوں کو پوجنے والی یعنی ہندو قوم ہے اور دوسری توحید خدا کو ماننے والی یعنی مسلمان قوم ہے۔ ان دونوں قوموں کے متعلق اقبال کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے پیشوا یعنی برہمن بت خانوں کے دروازوں پر پڑے غافل سو رہے ہیں اور مسلمانوں کے پیشوا مسجدوں کی محرابوں کے تلے بیٹھے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہے ہیں۔ مراد ہے دونوں قومیں آرزوئے آزادی و ترقی سے محروم غفلت کی نیند سوئی ہوئی ہیں۔

⑨ **معانی:** **حذر کرنا:** بچنا۔ **شب:** رات۔ **سحر:** صبح۔ **بیزار:** دل برداشتہ۔ **فطرت:** قدرت۔

مطلب: ان جملہ مایوس کن حالات کے ہوتے ہوئے وہ کرن جس نے دوسری کرنوں سے الگ چمکتے رہنے کا فیصلہ کیا تھا کہتی ہے کہ نہ میں مشرق اور اہل مشرق سے دل برداشتہ ہوں اور نہ میں مغرب اور اہل مغرب سے دامن کو بچانا چاہتی ہوں۔ میرے ذمے تو قدرت نے چمکتے رہنے کا فرض سونپا ہوا ہے اور ہر رات کو صبح میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری لگائی ہوئی ہے اس لیے میں تو اس امید پر مشرق اور مغرب دونوں کی سرزمین پر چمکتی رہوں گی کہ شاید ان میں سے کوئی یا دونوں میری روشنی سے منور ہو جائیں اور حقیقت کو پا لیں۔

امید

مقابلہ تو زمانے کا خوب کرتا ہوں — اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں' نے امیر جنود
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور — عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود
جبین بندۂ حق میں نمود ہے جس کی — اسی جلال سے لبریز ہے ضمیر وجود
یہ کافری تو نہیں' کافری سے کم بھی نہیں — کہ مرد حق ہو گرفتار حاضر و موجود
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی — نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہر کبود

① **معانی:** امیرِ جنود: فوجوں کا سالار (جنود۔ جند کی جمع۔ لشکر' فوج)۔

مطلب: اگرچہ نہ میں سپاہی ہوں نہ سپہ سالار لیکن زمانہ حاضر جو کہ مغربی تہذیب و تمدن کی وجہ سے خرابیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اس کا مقابلہ بہت اچھی طرح کر رہا ہوں اور لوگوں کو اس کی خرابیوں سے پوری طرح آگاہ کر رہا ہوں۔

② **معانی:** ذکر: اللہ کی یاد۔ **فکر:** غور و خوض (خود پر' کائنات پر اور خدا پر)۔ **جذب:** مستی۔ **سرود:** نغمہ۔

مطلب: میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں مجھے خود معلوم نہیں کہ یہ شاعری ہے یا کچھ اور لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی یاد دے کر اور اپنی ذات و صفات میں غور و خوض کی نعمت عطا کر کے مجھ میں ایک مستی اور نغمگی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری شاعری رسمی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں میرے ذکر' فکر' جذب اور سرود کا اظہار ہے۔

③ **معانی:** جبین: ماتھا' پیشانی۔ **بندۂ حق:** خدا کا برگزیدہ بندہ۔ **نمود:** ظہور۔ **جلال:** ہیبت۔ **لبریز ہے:** بھرا ہوا ہے۔ **ضمیرِ وجود:** اپنی ہستی یا کائنات کا دل۔

مطلب: جو ہیبت اور شکوہ خدا کے کسی برگزیدہ بندے کے ماتھے میں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کائنات کا دل اسی شکوہ سے بھرا ہوا ہے۔ یعنی کائنات میں جہاں کہیں بھی شکوہ نظر آئے گا' وہ بندۂ حق یا مرد مومن کے جلال کی وجہ سے ہی ہو گا۔

④ **معانی:** مردِ حق: اللہ کا برگزیدہ بندہ' مرد مومن۔ **حاضر و موجود:** جو کچھ کائنات میں موجود ہے اور نظر آتا ہے۔

مطلب: اگر وہ شخص جو خود کو اللہ کا بندہ کہلاتا ہو اور وہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے اور جو کچھ اسے ظاہری طور پر نظر آتا ہے اسی میں گم ہو کر رہ جائے اور جو کچھ کائنات کے پس پردہ ہے اس کو نہ دیکھے اور اپنی ساری زندگی خدا سے غافل اور دنیا میں محو ہو کر گزار دے تو اس شخص کی زندگی کو اگرچہ ہم پورے طور پر غیر اسلامی زندگی نہیں کہہ سکتے لیکن یہ کافری (اللہ اور اس کی صفات کے انکار) سے کم بھی نہیں ہے۔ مرد حق تو وہ ہے جو اپنے ہر لمحہ کو اپنے ہر کام کو خدا کی مرضی کے مطابق کرے نہ کہ جو حالات موجود ہوں ان میں گم ہو کر رہ جائے۔

⑤ **معانی:** غمیں نہ ہو: غم مت کر۔ دور: زمانے۔ **سپہر کبود:** نیلا آسمان۔

مطلب: جیسا کہ پہلے اشعار میں کہا گیا ہے اگر اللہ تعالیٰ کے بندے دورِ حاضر میں خدا سے غافل ہو کر دنیا میں گرفتار ہو چکے ہیں تو اے مخاطب غم مت کر کیونکہ نیلا آسمان نئے ستاروں سے خالی نہیں ہے۔ امید رکھ کہ نئے ستارے ابھر کر نیا زمانہ لائیں گے۔ جس طرح پہلے زمانے ختم ہونے پر موجودہ زمانہ آیا ہے اسی طرح موجود زمانہ ختم ہو کر کئی نئے زمانوں میں بدلے گا اور اس وقت شاعروں کی شاعری، ذکر، فکر، جذب اور سرود کی حامل ہو گی اور مردِ حق کی جبین جلالِ حق سے ضرور چمکے گی۔

نگاہِ شوق

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوقِ آشکارائی

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

اسی نگاہ سے محکوم قوم کے فرزند
ہوئے جہاں میں سزاوارِ کارفرمائی

اسی نگاہ میں ہے قاہری و جباری
اسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی

اسی نگاہ سے ہر ذرہ کو جنوں میرا
سکھا رہا ہے رہ و رسمِ دشت پیمائی

نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

معانی: نگاہِ شوق: شوق کی نظر یا عشق بھری نظر۔

① **معانی:** ضمیر: دل، باطن۔ ذوقِ آشکارائی: ظاہر ہونے کی لذت۔ کائنات: جہان۔

مطلب: کائنات کے باطن یا دل میں جو کچھ بھی موجود ہے یہ اسے چھپا کر نہیں رکھتی بلکہ ظاہر کرتی رہتی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرے میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی لذت اور چاشنی موجود ہے۔

② **معانی:** نگاہِ شوق: عشق بھری نظر۔ بینائی: ظاہری آنکھ۔

مطلب: ظاہری آنکھ سے تو اس کائنات کو یا جہان کو ہر کوئی دیکھتا ہے اور اسے جو کچھ ظاہر میں ہے وہی کچھ نظر آتا ہے۔ اگر ظاہری نظر میں عشق کی نظر بھی شامل ہو جائے تو پھر جہان کا کاروبار کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ یعنی کائنات کے باطن میں جو کچھ ہے وہ بھی اس کے سامنے آجاتا ہے۔

③ **معانی:** فرزند: بیٹے، نوجوان۔ محکوم قوم: غلام قوم۔ سزاوار: لائق۔ کار فرمائی: حکمرانی۔

مطلب: جب بھی کسی غلام قوم کے نوجوانوں نے اپنی ظاہری بینائی میں عشق کی نگاہ شامل کی ہے تو وہ دنیا میں غلامی سے نکل کر حکمرانی کے لائق بن گئے ہیں۔

④ **معانی:** قاہری و جباری: یہ اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی ناموں قاہر اور جبار کی صفات ہیں۔ بندہ بھی چونکہ صفاتِ باری تعالیٰ کا مظہر ہے اس لئے یہ صفات اس میں بھی موجود ہیں۔ اس کا قاہر ہونا دوسروں پر خصوصاً کافروں پر دبدبہ ڈالنا یا ان پر غالب آنا ہے۔ جباری بھی اسی قسم کے رعب اور جلال کے معنی رکھتی ہے۔ دلبری: محبوبی۔ رعنائی: زیبائی۔

طلب: اسی نگاہ شوق کی بدولت خدا کے بندے میں باطل کے ساتھ مقابلے کے وقت قہر، جبر، ہیبت اور
دبہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسی نگاہ شوق سے جب اس کا واسطہ اپنوں سے یعنی حق پرستوں سے
تا ہے تو وہاں یہ نگاہ اپنے اندر محبوبی اور زیبائی کی شان پیدا کر لیتی ہے۔ یعنی بندۂ مومن جب نگاہ عشق
دا کرتا ہے تو کافروں کے لئے اس کی نظر قاہری و جباری والی اور مسلمانوں کے لئے اس کی نظر دلبری اور
عنائی والی ہوتی ہے۔

⑤ **معانی**: رہ و رسم: طریقے اور رسمیں۔ وحشت پیمائی: بیابان ناپنا یا عبور کرنا۔ جنوں: انتہائی عشق۔

طلب: شاعر کہتا ہے کہ اسی نظر سے جس میں عشق شامل ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے
ں کی وجہ سے میرے انتہائی عشق نے ذروں کے اندر ایسے طور طریقے پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ بیابان طے
ر سکتے ہیں۔ یعنی میں نے اپنی شاعری سے بے ہمت اور بے طاقت لوگوں کے اندر مشکلات سے ٹکرانے
ر ان پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔

⑥ **معانی**: وجود: ہستی۔ قلب: دل۔ رسوائی: ذلت۔ میسر ہونا: حاصل ہونا۔ نگاہ شوق: عشق کی نظر

طلب: اگر تیری ہستی کو عشق کی وہ نظر حاصل نہیں ہے جس کی صفات کا مذکورہ بالا شعروں میں ذکر ہوا
ہے تو تو سمجھ لے کہ تیری ہستی تیرے دل اور تیری نظر یعنی تیرے ظاہر اور تیرے باطن دونوں کے لئے
ت کا موجب ہے۔

اہل ہنر سے

ر و مہ و مشتری، چند نفس کا فروغ — عشق سے ہے پائیدار تیری خودی کا وجود
ے حرم کا ضمیر اسود و احمر سے پاک — ننگ ہے تیرے لئے سرخ و سپید و کبود
تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر — تیری خودی کا حضور عالم شعر و سرود
روح اگر ہے تری رنجِ غلامی سے زار — تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود
ور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو — تیری سپہ انس و جن! تو ہے امیرِ جنود

عانی: اہل ہنر سے: فن جاننے والوں سے۔

① **معانی**: مہر: سورج۔ مہ: چاند۔ مشتری: ایک سیارے کا نام۔ نفس: سانس۔ فروغ: ظہور۔ پائیدار:
مضبوط۔ وجود: ہستی۔

طلب: اس نظم میں شاعر نے رسمی اور خوددار اہل فن کا تعارف کرایا ہے اور ان میں فرق بتایا ہے۔
س شعر میں وہ کہتا ہے کہ سورج، چاند، مشتری (یعنی سب سیاروں اور ستاروں کا وجود) چند سانسوں یا
حات کا ظہور رکھتے ہیں یعنی ادھر نکلتے ہیں اور ادھر چھپ جاتے ہیں لیکن اے وہ شخص جو اہل فن ہونے کا
دعویٰ دار ہے تیری ہستی عارضی نہیں ہے بشرطیکہ تو نے اسے عشق کے ذریعے خود معرفتی حاصل کر کے
مضبوط بنا لیا ہو۔

② **معانی**: حرم: کعبہ۔ ضمیر: باطن یا دل۔ اسود: کالا۔ احمر: سرخ۔ ننگ ہے: باعث شرم ہے۔ سپید

سفید۔ کبود: نیلا۔

مطلب: اس شعر میں اہل فن سے خطاب کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ تیرے کعبہ دل کا باطن کالے اور سرخ کی تمیز سے پاک ہے۔ اور اگر تو اپنے فن میں سرخ' سفید' نیلے اور کالے کی تمیز روا رکھتا ہے (جیسا کہ آج کل کے اہل فن رنگ' نسل' خون اور وطن کی بنیاد پر فن پیدا کر رہے ہیں) تو اے اہل فن کے دعویدار یہ تیرے لیے باعث شرم ہے۔ اگر تیری خودی کا وجود تیرے عشق سے پائیدار ہو چکا ہو اور تو اسلام کی روح کو صحیح طور پر سمجھتا ہو تو کبھی ایسا فن (چاہے وہ شاعری ہو' مصوری ہو' سنگ تراشی ہو' ادب ہو) پیدا نہیں کرے گا جس میں رنگ' نسل' وطن وغیرہ کی تمیز ہو۔

③ **معانی:** **غیاب:** باطن' خلوت۔ **معرکہ ذکرو فکر:** ذکر اور فکر میں مشغول رہنا۔ **حضور:** ظاہر ہونا' جلوت۔ **عالم شعرو سرود:** شاعری اور نغمے کا جہان۔

مطلب: اگر تو واقعی اہل فن ہے اور تو نے عشق کے ذریعے اپنی خودی کو مضبوط کر رکھا ہے تو جب تو خلوت میں ہوتا ہے تو تجھے ذکرو فکر میں (جس کی تشریح پچھلی نظم میں ہو چکی ہے) مشغول رہنا چاہیے۔ یہ تیری خودی کے باطن کا ظہور ہے۔ اور تیری خودی کی جلوت کا ظہور' تیری شاعری اور تیرے نغمہ کے جہان میں نظر آئے گا یعنی خودی کے بغیر فن حقیقی فن نہیں بنتا۔

④ **معانی:** **زار ہے:** کمزور ہے' تکلیف میں ہے۔ **دیر:** بت خانہ۔ **طواف:** چکر کاٹنا۔ **سجود:** سجدہ کرنا۔

مطلب: اے فن کے دعویدار اگر تیری روح خودی سے بیگانہ ہے اور غلامی کی وجہ سے کمزور ہو چکی ہے تو تیرے فن کی دنیا بت خانے اور اس کے پھیرے لینے اور اس کے سامنے سجدے کرنے تک محدود ہو گی یعنی تو ایسا فن پیدا کرے گا جو ان صفات سے خالی ہو گا جن کا ذکر اوپر کے اشعار میں ہو چکا ہے اور تیرا فن حق کی بجائے باطل کا نمائندہ ہو گا۔

⑤ **معانی:** **سپہ:** فوج۔ **انس:** انسان۔ **امیر جنود:** لشکر کا سردار۔

مطلب: اے فن کے دعویدار اگر بطور انسان تجھے اپنے شرف' عزت اور بزرگی کا صحیح علم ہو تو جن اور انسان تیرے اس طرح تابع ہوں گے جس طرح کہ کسی لشکر کے امیر کے سپاہی اس کے حکم بردار ہوتے ہیں۔

غزل

دریا میں موتی! اے موجِ بیباک ساحل کی سوغات خار و خس و خاک
میرے شرر میں بجلی کے جوہر لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک
تیرا زمانہ' تاثیر تیری ناداں' نہیں یہ تاثیرِ افلاک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں مستی ہے جس کی بے منتِ تاک

رکھتا ہے اب تک مے خانۂ شرق وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک
اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید ان امتوں کے باطن نہیں پاک

① **معانی:** موجِ بے باک: بے خوف لہر۔ سوغات: تحفہ۔ خار: کانٹا۔ خس: تنکے۔ خاک: مٹی۔

مطلب: اگر تو بے خوف لہر کی مانند ہے تو سمندر کی تہ میں جا کر موتی حاصل کر اور اگر تو نڈر نہیں اور آرام طلب ہے تو ان لہروں کی مانند زندگی گزار دے جو ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں اور ان کے نصیب میں کانٹوں، گھاس پھوس، تنکوں اور مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کامیابی محنت و مشقت سے حاصل ہوتی ہے، آرام طلبی سے نہیں۔

② **معانی:** شرر: چنگاری۔ جوہر: صلاحیت۔ نیستاں: جنگل (سرکنڈوں کا)۔ نمناک: گیلا، پانی سے تر۔

مطلب: علامہ اپنی شاعری کا اور اپنے خیالات و افکار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی مثال تو ایک ایسی چنگاری کی مانند ہے جو سرکنڈوں کے جنگل میں آگ لگا سکتی ہے۔ اس چنگاری میں بجلی کی سی صلاحیت موجود ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ تیرے جس جنگل میں، میں اپنی چنگاری سے آگ لگانا چاہتا ہوں اس کے سرکنڈے گیلے ہیں اور وہ آگ نہیں پکڑ رہے۔ مراد یہ ہے کہ میں تو اپنی شاعری اور شاعرانہ پیغام کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے پر تلا ہوا ہوں لیکن قوم ہے کہ وہ غلامی کی اور آرام طلبی کی زندگی پر رضامند ہے اور میرا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔

③ **معانی:** تاثیر: اثر ہونا۔ ناداں: بے وقوف۔ افلاک: آسمان۔

مطلب: عام طور پر مشہور یہ ہے کہ زمانہ اور قسمت آسمانوں کی گردش اور ستاروں کی رفتار کی محتاج ہے۔ شاعر اپنی سوئی ہوئی قوم کے اس عقیدے کو باطل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا زمانہ تیری تاثیر کا محتاج ہے نہ کہ آسمانوں کی گردش کا۔ تو جس طرح چاہے اسے موڑ سکتا ہے اگر محنت و مشقت کرے گا تو تیرا زمانہ کامیابی کا زمانہ ہو گا۔ اگر آرام طلب ہو گا تو تیرا زمانہ تجھے کچھ نہیں دے گا۔ تو ناکامی کا منہ ہی دیکھے گا۔

④ **معانی:** جنوں: خوش سودا، انتہائی عشق۔ تقدیر کے چاک: پھٹا ہوا لباس قسمت۔

مطلب: میں نے ایسے خوش سودا اور انتہائی عشق صادق والے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جنہوں نے اپنی تاثیر سے یا فیض سے تقدیر کے پھٹے ہوئے دامن اور گریبان کے چاک سی دیئے ہیں۔ یعنی افراد و اقوام کی قسمتیں بدل دی ہیں۔ لوگ وہ مرد مومن، مرد قلندر، فقیر و درویش ہیں جن کی طاقتوں کا اقبالؒ نے اپنے کلام میں بار بار ذکر کیا ہے۔

⑤ **معانی:** رندی کا فن: شراب پینے کا فن۔ بے منت: احسان کے بغیر۔ تاک: انگور کی بیل یا شراب۔

مطلب: میں فن شراب خوری میں اس کو ماہر سمجھتا ہوں جس کی مستی انگور کی شراب کے بغیر ہو۔ جس نے اپنے خون جگر اور خون دل کی شراب پی رکھی ہو یا جو عشق حقیقی کی شراب میں مست ہو۔

⑥ **معانی:** مے: شراب۔ میخانہ: شراب خانہ۔ ادراک: عقل، سمجھ، شعور، علم۔

مطلب: رسمی شراب کی برائی اور عشق حقیقی کی شراب کی جو اچھائی پانچویں شعر میں بیان ہوئی ہے اسی

کو مزید بڑھاتے ہوئے اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ عشق کے شراب خانے میں اب تک وہ شراب موجود ہے جس سے پینے والے کا علم، شعور، عقل اور سمجھ روشن ہوتی ہے نہ کہ ان شرابیوں کی طرح ضائع ہوتی ہے جو عام انگوری شراب پیتے ہیں۔

⑦ **معانی:** **اہلِ نظر:** نظر والے، جن کی نظر باطن تک پہنچتی ہے۔ **نومید:** ناامید۔ **امتوں:** اقوام۔ **باطن:** اندرون۔

مطلب: وہ لوگ جو اہلِ نظر کہلاتے ہیں اور جن کی نظر کسی کے باطن تک کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یورپ اور اہلِ یورپ سے ناامید ہیں کیونکہ یورپی اقوام کے ظاہر تو بڑے تابناک ہیں لیکن اندرون ناپاک ہیں۔ ان کو ان کی تہذیب، تمدن اور ثقافت نے انکو بے حیا بنا دیا ہے اور وہ انسان نہیں انسان نما حیوان بن گئے ہیں۔

وجود

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
مکتب و میکدہ جز درسِ نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

معانی: **وجود:** جسم، ہستی۔

① **معانی:** **زیرِ فلک:** آسمان کے نیچے۔ **مثلِ شرر:** چنگاری کی مانند۔ **نمود:** ظہور۔ **مقاماتِ وجود:** ہستی کے مراتب۔

مطلب: عام آدمی کی مثال دیتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس آسمان کے نیچے یعنی دنیا میں تیری ہستی چنگاری کی مانند ہے کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں ہے۔ یعنی تو آنی اور فانی ہے لیکن ہستی آدمی کے اور مراتب بھی ہیں۔ یہ تمہیں کون سمجھائے اگر تیری سمجھ میں ان مراتب کی بات آ جائے تو پھر تو آنی اور فانی نہیں رہے گا۔ جاودانی ہو جائے گا اور یہ مراتب خودی کی تکمیل سے حاصل ہوتے ہیں۔

② **معانی:** **ہنر:** فن۔ **تعمیرِ خودی:** خودی کا پیدا کرنا۔ **جوہر:** صلاحیت۔ **وائے:** افسوس ہے۔ **صورت گری:** مصوری۔ **نائے:** ساز، بنسری۔ **سرود:** نغمہ گانا۔

مطلب: اے فن کار اگر تیرے فن میں خودی کی تعمیر نہیں ہے اور خودی کی جھلک موجود نہیں ہے تو تیرے ایسے فن پر افسوس ہے۔ چاہے یہ فن مصوری کا ہو چاہے ساز و موسیقی اور شعر و ادب کا۔

③ **معانی:** **مدرسہ:** مکتب، اسکول۔ **میکدہ:** شراب خانہ۔ **جز:** سوائے۔ **درسِ نبودن:** نہ رہنے، مٹ جانے کا سبق۔ **نہ دہند:** نہیں دیتے۔ **بودن:** ہونا۔ **آموز:** سیکھ۔ **ہم باشی:** رہے بھی، دنیا کی زندگی میں رہے بھی۔ **ہم خواہی بود:** رہے گا بھی، زندگی کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

مطلب: جدید دور کے مدرسے اور میخانے طالب علموں اور شراب نوشوں کو اپنی ہستی کو فنا کر دینے کا

درس دیتے ہیں۔ سوائے اپنے نہ ہونے کے کوئی اور سبق نہیں دیتے۔ اے شخص ایسا علم پڑھ اور ایسی شراب پی کہ جس کے پڑھنے اور پینے سے اس دنیا میں بھی تو قائم رہے اور تجھے بقا نصیب ہو اور مرنے کے بعد بھی تو زندہ رہے اور باقی رہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم وہ شراب پئیں جو چودہ سو سال پہلے اسلام نے پلائی تھی اور جس کو پی کر مسلمان خود مست و خدا مست بن گئے تھے اور دنیا بھر میں سرفراز و حکمران ہو گئے تھے۔

سرود

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

دل کیا ہے؟ اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کے

کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے

جس روز دل کی رمزِ مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

معانی: سرود: نغمہ، موسیقی، گانا۔

① **معانی:** **نالہ نے:** بنسری کی پرسوز آواز۔ **سرورِ مے:** شراب کا نشہ۔ **اصل:** اصلیت اس کی۔ **نے نواز:** بنسری بجانے والے۔ **چوبِ نے:** بنسری کی لکڑی، بانس کی لکڑی۔

مطلب: ہم بنسری بجانے والے کو دیکھتے ہیں کہ وہ لکڑی کی ایک لمبی سی چھیدوں والی بانس کی لکڑی سے پرسوز نغمے نکالتا ہے۔ شاعر یہ پوچھتا ہے کہ اے مخاطب کیا تجھے معلوم ہے کہ اس لکڑی سے (جو بنسری کی شکل میں ہوتی ہے) جو پرسوز نغمے نکل کر ہم میں شراب کی سی مستی پیدا کر رہے ہیں یہ شراب کی سی مستی کہاں سے آتی ہے۔ کیا اس کا سبب بنسری بجانے والے کا دل ہے یا بنسری کی لکڑی ہے؟ اس کا جواب اگلے شعروں میں آئے گا۔

② **معانی:** کے: ایران کے بادشاہوں کا لقب جیسے کیقباد، کیخسرو وغیرہ۔

مطلب: دل کیا ہے؟ یہ محض گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے۔ دل کیا ہے پہلے اس کو سمجھ اور یہ بھی سمجھ کہ اس میں جو مستی پیدا ہوتی ہے اور اس میں جو طاقتیں موجود ہیں وہ کہاں سے آتی ہیں۔ یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ دل میں ایسی صلاحیت اور قوت کہاں سے آ گئی ہے کہ اہل دل اپنی ایک نگاہ سے ایران کے طاقت ور بادشاہوں کا تخت الٹ سکتے ہیں۔

③ **معانی:** **واردات:** اندرونی کیفیات۔ **پے بہ پے:** لگاتار۔

مطلب: یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ دل میں کونسی ایسی چیز ہے کہ اس کی زندگی پر قوموں کی زندگی موقوف ہے اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دل کی اندرونی کیفیات کیوں ایک جیسی نہیں رہتیں اور کیوں لگاتار بدلتی رہتی ہیں۔

④ **معانی:** روم و شام و رے: ملکوں کے نام ہیں۔ روم اور شام تو مشہور ہیں رے ایک قدیم سلطنت تھی

جو ملک شام کے تابع تھی۔

مطلب: یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ کسی دل والے (جو اصل اہل دل ہوتے ہیں) کی نگاہ میں روم، شام اور رے کی سلطنتیں کیوں نہیں جچتیں۔ اسے پسند کیوں نہیں آتیں۔ وہ ان کو حقیر کیوں سمجھتا ہے۔

⑤ **معانی:** مغنی: گانے والا۔ رمز: بھید، پوشیدہ بات۔

مطلب: اقبالؒ نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں کئی جگہ دل کی بات کی ہے اور سمجھایا ہے کہ آدمی کا دل کیا ہے۔ اہل دل کون ہے۔ اس میں کیا صلاحیتیں ہوتی ہیں لیکن یہاں استفہامیہ انداز ہی اختیار کیے رکھا ہے اور جواب میں کچھ نہیں۔ کہا البتہ دوسری کئی جگہ بتایا ہے کہ دل خون کو جسم میں بھیجنے والے عضو کا نام نہیں بلکہ اہل عشق و فقر کے نزدیک دل کچھ اور ہی شے ہے اور جس دن گانے والے کو وہ دل مل گیا اور اس دل کا بھید اسکی سمجھ آگیا تو پھر سمجھو کہ اس نے اصل نغمہ کی منزل طے کر لی۔ ورنہ اس کا نغمہ تفریح کے سوا کچھ نہیں۔ وہ نغمہ جو اس کے اس دل سے نکلے گا جس دل کی بات صاحب عشق و فقر کرتے ہیں تو اس نغمہ سے افراد و اقوام کو حیات ملے گی۔ نہ کہ وہ ان کی موت ہو گی جیسا کہ تفریحی نغمہ پیدا کر رہا ہے۔

نسیم و شبنم

نسیم

انجم کی فضا تک نہ ہوئی میری رسائی — کرتی رہی ہیں پیرہن لالہ و گل چاک
مجبور ہوئی جاتی ہوں میں ترک وطن پر — بے ذوق ہیں بلبل کی نواہائے طربناک
دونوں سے کیا ہے تجھے تقدیر نے محرم — خاکِ چمن اچھی کہ سرا پردۂ افلاک

شبنم

کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک — گلشن بھی ہے اک سِرِّ سرا پردۂ افلاک

یہ نظم نسیم و شبنم، مکالے کی صورت میں ہے۔

نسیم

معانی: صبح کے وقت چلنے والی ٹھنڈی اور خوش گوار ہوا۔

① **معانی:** انجم: ستارے۔ رسائی: پہنچ۔ پیرہن: لباس۔ چاک کرنا: پھاڑنا۔ لالہ و گل: لالے کا اور گلاب کا پھول۔

مطلب: نسیم، شبنم (اوس) سے کہتی ہے کہ تمہیں تو آسمان کی بلندی نصیب ہے کیونکہ تو بلندی سے

آتی ہے لیکن تاروں کی فضا یعنی آسمان تک میری پہنچ نہ ہو سکی۔ میں تو ساری عمر زمین کے باغات میں گلاب اور لالہ کے پھولوں کے لباس چاک کرتی رہی یعنی ان کو کھلاتی رہی۔

② **معانی:** **ترکِ وطن:** گھر یا وطن چھوڑنا۔ **بے ذوق:** بے لذت۔ **نوا ہائے طرب ناک:** خوشیوں بھری آوازیں یا نغمے۔

مطلب: اب میں باغ کو چھوڑ کر اپنے گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور ہوں کیونکہ باغ میں بلبل جو خوشیوں بھرے نغمے الاپ رہی ہے۔ ان میں میرے لئے کوئی لذت نہیں ہے۔ بلبل کے نغمے طربناک اس لئے ہیں کہ اس کے محبوب پھول اس کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ ورنہ عام طور پر بلبل کے نغموں کو غم ناک کہا جاتا ہے۔

③ **معانی:** **تقدیر:** قسمت۔ **محرم:** واقف۔ **خاکِ چمن:** باغ کی مٹی۔ **سراپردہ:** گھر کا اندرون۔ **افلاک:** فلک کی جمع، آسمان۔

مطلب: اے شبنم! (اوس) تجھے قسمت نے دونوں کا واقف کار بنا دیا ہے۔ آسمان کا بھی اور زمین پر کے باغ کا بھی کیونکہ تو اوپر سے نیچے زمین پر آتی ہے اب تو مجھے یہ بتا کہ باغ کی مٹی اچھی ہے یعنی باغ میں رہنا اچھا ہے یا آسمان کے گھر کا اندرون اچھا ہے۔ شبنم نے جو جواب دیا ہے وہ اگلے شعر میں ہے۔

شبنم

معانی: اوس۔ پانی کے وہ قطرے جو صبح کے وقت فضا میں سے گر کر سبزہ اور پھولوں پر پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

① **معانی:** **چمن:** باغ۔ **خس و خاشاک:** گھاس پھوس اور تنکے۔ **گلشن:** باغ۔ **سّر:** بھید۔

مطلب: اوس جواب دیتی ہے کہ اے نسیم اگر تو پھولوں کی صحبت ہی میں رہے اور باغ میں جو گھاس پھوس اور تنکے یا کوڑا کرکٹ ہے اس کی طرف نظر نہ کرے تو باغ بھی بے شک آسمانوں کے اندرون خانہ کی طرح ہی کا ایک اندرون خانہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ زمین ہو یا آسمان (یعنی کوئی حالت ہو) آدمی اگر اچھائی بھلائی اور نیکی کی طرف رجوع رکھے اور برائی اور خرابی سے بچے تو وہ جہاں بھی ہو جس ماحول میں بھی ہو وہ صحیح ہے۔

اہرامِ مصر

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضا میں ‏ ‏ فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک ‏ ‏ کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو ‏ ‏ صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر

معنی: **اہرامِ مصر:** مصر ایک ملک ہے جہاں مصر کے قدیم بادشاہوں کے (جو فرعون کہلاتے ہیں) مخروطی شکل کے مقبرے ہیں۔ ان کو اہرام کہا جاتا ہے۔

① **معنی** : **دشت** : صحرا۔ **جگر تاب** : جگر کو گرم کرنے والی۔ **فطرت** : قدرت۔ **خاموش فضا** : زمین سے آسمان تک کی جگہ' آب و ہوا' ماحول۔

مطلب : مصر میں اس کے دارالحکومت قاہرہ کے قریب تپتی ہوئی ریت اور گرمی کی شدت لیے ہوئے ایسا صحرا ہے جس کی گرمی سے آدمی کا جگر تپ جائے۔ اس صحرا کے ماحول میں قدرت نے سوائے ریت کے ٹیلوں کے' جن کو گرم ہوائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں' کچھ نہیں بنایا۔

② **معنی** : **اہرام** : قدیم مصری بادشاہوں کے مقبرے۔ **عظمت** : بڑائی۔ **نگوں سار** : سر جھکائے ہوئے۔ **افلاک** : فلک کی جمع' آسمان۔ **ابدیت** : ہمیشگی۔

مطلب : اہرام اگرچہ آسمان تک بلند نہیں ہیں لیکن ان کی تعمیری اور فنی عظمت کو دیکھ کر آسمان بھی ان کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ یہ تصویریں کس ہاتھ نے کھینچی ہیں کہ ان کے اندر ہمیشگی کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ وہ ہوائیں بھی جو ریت کے ٹیلوں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پھینکنے کی طاقت رکھتی ہیں ان اہراموں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ جبھی تو صدیوں سے اپنی شان و شوکت کے ساتھ اسی طرح کھڑے ہیں ان کے تعمیر کرنے والے ضرور اعلیٰ فنی مہارت والے ہاتھ ہوں گے۔

③ **معنی** : **فطرت** : قدرت۔ **ہنر** : فن۔ **صیاد** : شکاری۔ **مردان ہنرمند** : فن کار۔ **نخچیر** : شکار۔

مطلب : علامہ ہنرمندوں اور فن کاروں کو کہہ رہے ہیں کہ اگر تم بھی ایسا فن پیدا کرنا چاہتے ہو جس میں ہمیشگی اور عظمت ہو تو خود کو قدرت کی زنجیروں سے آزاد کرو اور ریت کے ٹیلوں کی طرح قدرت کے آگے مجبور نہ بنو بلکہ قدرت پر قابو پاؤ تاکہ تم بھی مصر کے اہرام جیسے فن کی تخلیق کر سکو۔ اہل فن قدرت کے شکاری ہوتے ہیں قدرت کا شکار نہیں بنتے۔ وہ قدرت کو اپنے آگے سرنگوں کر کے اعلیٰ تخلیقات ہنر پیدا کرتے ہیں۔

مخلوقاتِ ہنر

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانۂ ذات
نہ خودی ہے' نہ جہانِ سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آہ! وہ کافرِ بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات
تو ہے میّت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

معنی : **مخلوقات ہنر** : اہل فن کی تخلیقات یا جو ہنر اور فن وہ پیش کرتے ہیں۔

① **معنی** : **فردوس نظر** : نظر کی جنت۔ **اہل ہنر** : اہل فن۔ **فاش** : کھلا۔ **چشم تماشا** : دیکھنے والی آنکھ۔ **نہاں خانہ ذات** : ذات کا اندرون خانہ۔

مطلب : عہد حاضر کے فن کاروں کی تخلیقات کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ظاہری لحاظ سے تو ان کے فن پارے دیکھنے والوں کی آنکھوں کے لیے جنت کا کام کرتے ہیں یعنی بڑے خوش نما دکھائی دیتے

ہیں لیکن جو لوگ دیکھنے کا صحیح ذوق رکھتے ہیں ان پر ان فن پاروں کے خالقوں کی ذات کا اندرون پوری طرح ظاہر ہے کہ وہ اپنے تاریک اور بے نور اندرون کی بدولت ایسے فن پارے تخلیق نہیں کر سکتے جن کے اندرون خوبصورت ہوں۔ ان کے فن پارے ہمیں ان کے اندرون کا اس لئے پتہ دیتے ہیں کہ فن فنکار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔

② **معنی:** **جہان سحر و شام کے دور:** زندگی کی صبح و شام کے دور کی بات۔ **زندگانی کی حریفانہ کشاکش:** زندگی میں آپس میں جو تصادم اور کھینچا تانی ہوتی ہے۔ **نجات:** فراغت۔

مطلب: عہد حاضر کے فن کاروں کے فن پاروں میں نہ تو ان کی خود معرفتی (خودی) کی بات ہوتی ہے اور نہ شام و سحر کے جہان کے کسی دور کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کی کیفیات و واردات کے عکاس نہیں ہوتے بلکہ محض تفریح طبع کے لیے ہوتے ہیں اور ان میں زندگی کو مشکلات اور حالات کے تصادم اور ان پر فتح یاب ہونے کے لئے جس کش مکش کی ضرورت ہے اس کی باتیں بھی نہیں ہوتی ہیں۔ وہ خودی اور زندگی دونوں سے عاری ہوتے ہیں۔

③ **معنی:** **کافر بے چارہ:** بے بس منکر۔ **عصر رفتہ:** گزرا ہوا زمانہ۔ **صنم:** بت۔ **لات و منات:** کعبے میں جو بت رکھے ہوئے تھے ان میں سے دو کے نام۔

مطلب: علامہ نے عہد حاضر کے فن کاروں اور اہل ہنر کو منکر بے بس کہا ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی اصل حقیقتوں سے بے گانہ' حق سے دور اور خودی سے محروم ہیں۔ یہ اپنی کوشش سے ایسی تخلیقات پیدا کرتے ہیں جو باطل کی اور بتوں کی حامل ہوتی ہے۔ صداقت اور حق سے وہ خالی ہوتی ہیں۔ یہ دیکھنے والے کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچاتی ہیں۔ اور زندگی کی اصلیت سے دور لے جاتی ہیں۔

④ **معنی:** **میت:** مردہ۔ **مرقد:** قبر۔ **شبستان:** خواب گاہ۔ **حیات:** زندگی۔

مطلب: اے دور جدید کے اہل فن تیرا فن مردہ ہے اس لئے کہ تو مردہ ہے۔ تو ایک مردہ کی مانند ہے اور تیرا فن تیرے جنازے کا امام ہے۔ جس طرح مردہ کا گھر قبر ہوتی ہے اسی طرح تجھے بھی اپنی خواب گاہ قبر ہی دکھائی دی ہے۔ تجھ میں اور تیرے فن میں زندگی کے کہیں آثار نظر نہیں آتے۔ میں نے تیرے ہنر کی ہر طرح کی کاوش دیکھی ہے۔ تیرا ادب' تیرا شعر' تیری مصوری' تیری گائیکی' تیری سازندگی' تیری تعمیرات وغیرہ میں کہیں زندگی کی حرارت نہیں ہے۔ سوائے تفریح طبع کی آسودگی اور عورت کی اعصاب سواری کے تیرے ہنر میں کچھ نظر نہیں آتا۔

اقبال

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی ۔۔۔ مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ' وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر ۔۔۔ اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

① **معنی:** **فردوس:** جنت۔ **رومی:** مولانا رومؒ جو اقبال کے پیر و مرشد ہیں۔ ایک شاعر اور ولی۔ **سنائی:** حکیم سنائی۔ ایک شاعر اور فلسفی۔ **کاسہ:** فقیری پیالہ۔ **آش:** دال' سالن۔

مطلب: جنت میں مولانا روم مرحوم سے جو ولی تھے، حکیم سنائی مرحوم جو فلسفی تھے کہہ رہے تھے کہ اہل مشرق ابھی تک پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں وہی پرانا کاسہ اور سالن ہے۔ ان کو نئی روش اور ترقی اور آزادی کی راہ دکھانے والا کوئی پیدا نہیں ہے اور وہ صدیوں سے غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

② **معنی:** **حلاج:** منصور حلاج جسے انا الحق کہنے کی پاداش میں سولی دے دی گئی تھی۔ **مرد قلندر:** یعنی اقبال خود۔ **راز خودی:** خودی کا راز۔ **فاش:** کھولا۔

مطلب: رومی اور سنائی کی بات سن کر حلاج بولا کہ یہ سچ ہے کہ مشرق ایک عرصہ سے غلام ہے اور اس کو آزادی کا درس دینے والا ابھی کسی زمانے میں پیدا نہیں ہوا لیکن اب ایک مرد قلندر پیدا ہو گیا ہے جس کا نام اقبال ہے اور اس نے اہل مشرق کو خودی اور خودی کے راز سے آشنا کر دیا ہے۔ اب یقیناً مشرق میں بیداری اور آزادی کی لہر دوڑ جائے گی۔

فنون لطیفہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

معنی: **فنون لطیفہ:** لطیف فن جن میں مصوری، ادب، شاعری، موسیقی وغیرہ آتی ہے۔ **اہل نظر:** بینائی والے لوگ، **ذوق نظر:** دیکھنے کی، **لذت:** خوب، اچھی، **شے:** چیز، **حقیقت:** اصلیت۔

① **مطلب:** اے کائنات اور اشیائے کائنات کو اپنی ظاہری نظر سے دیکھنے والو دیکھنے کا ذوق، لذت اور چاشنی بڑی اچھی چیز ہے لیکن اشیائے ظاہر کو دیکھنا اور ان کی حقیقت سے آگاہ نہ ہونا یہ دیکھنا دیکھنا نہیں ہے۔ دیکھنا وہ ہے کہ آدمی اشیا کے ظاہر کو دیکھتا ہوا اس کے باطن کو دیکھ لے۔ کیونکہ کسی چیز کی اچھائی اور برائی کا اصل پتہ اس کی حقیقت سے چلتا ہے نہ کہ ظاہر بینی سے۔

② **معنی:** **مقصود ہنر:** ہنر تخلیق کرنے کا مقصد۔ **سوز حیات ابدی:** ہمیشہ کی زندگی کا سوز۔ **ایک نفس یا دو نفس:** ایک سانس یا دو سانس کے لئے۔ **مثل شرر:** چنگاری کی مانند۔ **کیا:** بے کار ہے۔

مطلب: ہنر اور فن کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ اس میں زندگی کا دائمی (ہمیشہ رہنے والا) سوز بھر دیا جائے۔ زمانہ گزشتہ ہو کہ آئندہ یا زمانہ حاضر ہو ہر زمانے میں اس کا سوز دیکھنے والے کو متاثر کرنے والا ہو یہ ایک لمحہ یا دو لمحوں کے لیے (چنگاری کی مانند) اس کے اثر کا رہنا اور پھر مٹ جانا یہ ادب و ہنر کی شان کے شایاں نہیں۔ عہد حاضر کے فنون و ہنر اسی طرز کے ہیں کہ ان میں وقتی سوز اور حسن تو ہوتا ہے لیکن دائمی نہیں ہوتا۔

③ **معنی:** **متلاطم ہونا:** ہلچل پیدا ہونا، طوفان کا آنا۔ **نیساں:** ایک خاص موسم بہار کا بادل۔ **صدف:** سیپ

گہر: موتی۔ کیا: بے کار ہے۔

طلب: اے ایک خاص موسم بہار کے بادل سے برسنے والے قطرے جس کی قسمت میں موتی بننا ہوتا اگر تجھ سے سے دریا کے اندر ہلچل اور طوفان پیدا نہ ہو جائے تو پھر وہ سیپ جس میں موتی پیدا ہوتا اور خود موتی بے کار ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایسا فن لطیف جس سے دریائے زندگی میں تلاطم پیدا نہ ہو دیکھنے میں موتی جیسی آب والا بھی کیوں نہ ہو بے کار ہے۔ اصل ہنر اور اصل فن وہ ہے جو آدمی کی گی کے اندر حرارت اور تپش پیدا کر دے۔

معنی: نوا: آواز' شاعری۔ مغنی: گانے والا۔ نفس: سانس یا گانا۔ افسردہ: بجھا ہوا۔ باد سحر: صبح کی

طلب: فنون لطیفہ میں سے یہاں دو کی مثال دے کر شاعر نے جملہ فن ہائے لطیف کے متعلق فیصلہ دیا۔ وہ کہتے ہیں اگر کسی شاعر کی شاعری یا کسی گانے والے کا نغمہ یا گانا قاری اور سامع کے دل میں زندگی حرارت پیدا نہیں کرتا تو وہ بے حقیقت ہے۔ جس طرح صبح کی وہ نرم و لطیف ہوا بے حقیقت ہوتی ہے باغ میں آئے تو سہی لیکن اس کی وجہ سے غنچوں کے کھلنے اور پھولوں پر تازگی آنے کی بجائے بجھی بجھی کیفیت پیدا ہو جائے یعنی ان پر پژمردگی طاری ہو جائے۔

معنی: بے معجزہ: بغیر معجزہ کے' بغیر اعجاز کے۔ ابھرتی نہیں: ترقی نہیں کرتیں۔ ضرب کلیمی: کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے کیونکہ وہ خدا سے کلام کرتے تھے جن کی ضرب عصا سے چشمے پھوٹ پڑے تھے اور دریائے نیل دولخت ہو گیا تھا۔ معجزہ: خوارق عادت' جو بات عادت سے ماورا ہو۔

طلب: جس طرح معجزہ کو عقل نہیں سمجھ سکتی اور وہ عام قانون' اصول اور ڈگر سے ہٹ کر ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں جب کوئی قوم ترقی کرنے پر آتی ہے تو اس کے افراد بھی ایسے کارنامے سرانجام دیتے ہیں جو معجزہ سے کم نہیں ہوتے اسی طرح جس ہنر میں ضرب کلیمی جیسا معجزہ نہ ہو جو ہنر اپنے قاریوں اور نظارگیوں کے دلوں میں اور ان کی زندگیوں میں اسی طرح کا انقلاب پیدا نہ کر دے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کی ضرب سے کیا تھا کہ کہیں چشمے پھوٹ پڑتے تھے اور کہیں دریا نیل دولخت ہو گیا تھا وہ ہنر بے کار ہے۔ علامہ اسی لیے برصغیر کے مصوروں کی مصوری' شاعروں کی شاعری' ادیبوں کے ادب' سازندوں کی سازندگی اور موسیقاروں کی موسیقی کے خلاف ہیں کیونکہ یہ سب بے تب و تاب اور بے حرارت و تپش فن ہیں جن سے زندگی ابھرنے کی بجائے افسردہ ہوتی ہے۔

صبح چمن

پھول

شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا اے قاصدِ افلاک! نہیں! دور نہیں ہے

شبنم

یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے
ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن

صبح

مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن
ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

معنی: صبح چمن: باغ کی صبح۔ اس نظم میں پھول، شبنم اور صبح کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔

صبح

معنی: قاصد افلاک: آسمانوں کا پیغام لانے والی یعنی شبنم۔ وطن: جائے سکونت، ملک

مطلب: پھول شبنم (اوس) سے کہتا ہے کہ تو شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ میرا گھر تجھ سے بہت دور ہے لیکن اے آسمانوں کی پیغام بر میں تجھے کہتا ہوں کہ جو تو سمجھی ہوئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میرا وطن تجھ سے بہت دور نہیں ہے۔

شبنم

معنی: محنت پرواز: اڑان کی مشقت۔ نکتہ: باریک بات۔ گردوں: آسمان۔

مطلب: شبنم پھول کو جواب دیتی ہے کہ بے شک تیری یہ بات درست ہے کہ زمین اور آسمان کا فاصلہ میرے لئے دور کا نہیں ہے لیکن یہ باریک بات کہ آسمان سے زمین دور نہیں ہے صرف اسی پر واضح ہوتی ہے جو اڑان کی محنت اٹھاتا ہے۔ اس مشقت کے بغیر آسمان سے زمین دور ہی نظر آئے گی۔

صبح

معنی: مانند سحر: صبح کی مانند۔ صحن گلستاں: باغ کا صحن۔ تہ پا: پاؤں کے نیچے۔ گوہر شبنم: شبنم کا موتی۔ کوہ و بیاباں: پہاڑ اور جنگل۔ ہم آغوش: بغل گیر۔ دامن افلاک: آسمانوں کا دامن۔

مطلب: صبح پھول اور شبنم دونوں سے کہتی ہے کہ جس طرح صبح آہستگی اور پیار سے باغ کے صحن میں قدم رکھتی ہے اور اس سے باغ کی کسی بھی شے کا نقصان نہیں ہوتا۔ تمہیں بھی چاہیے کہ صبح کی مانند باغ کے صحن میں اس طرح قدم رکھو کہ اگر تمہارے قدموں کے نیچے شبنم کا موتی بھی آجائے تو وہ ٹوٹنے نہ پائے۔ مراد یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے کہ جس سے دوسروں کو راحت ہو تکلیف نہ ہو۔ صبح ان سے مزید کہتی ہے کہ بے شک تم پہاڑوں اور جنگلوں سے بغل گیر رہو لیکن

تمہارے ہاتھوں سے آسمان کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ اس میں انسان کے لئے یہ پیغام ہے کہ بے شک وہ زمینی ہے لیکن اسے بلند پروازی کا خیال رہنا چاہیے اور ترقی کرتے ہوئے آگے سے آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔

خاقانی

وہ صاحبِ تحفتہ العراقین ارباب نظر کا قرۃ العین
ہے پردہ شگاف اس کا ادراک پردے ہیں تمام چاک در چاک
خاموش ہے عالم معانی کہتا نہیں حرفِ لن ترانی
پوچھ اس سے یہ خاکداں ہے کیا چیز ہنگامۂ این و آں ہے کیا چیز
وہ محرم عالم مکافات اک بات میں کہہ گیا ہے سو بات
خود بوئے چنیں جہاں تواں برد کابلیس بماند و بوالبشر مرد

معنی: خاقانی: فارسی کا ایک مشہور شاعر اور حکیم۔

①② **معنی: تحفتہ العراقین**: خاقانی کی ایک مشہور فارسی مثنوی کا نام ہے۔ جس میں اس نے اپنے سفر حج کے حالات لکھے ہیں۔ **قرۃ العین**: آنکھوں کی ٹھنڈک، مقبول، ہردلعزیز۔ **پردہ شگاف**: پردوں کو چاک کرنے والی۔ **ادراک**: عقل، حکمت۔ **چاک در چاک**: تار تار، پھٹے ہوئے۔ **صاحب**: مالک، یہاں مصنف۔

مطلب: مشہور فارسی مثنوی تحفتہ العراقین کا مصنف جو صحیح نظر رکھنے والوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یا ان میں مقبول ہے اور جسکی حکمت، دانش یا عقل و فکر پردوں کو چاک کرنے والی ہے۔ اس نے ان پردوں کو جو نظر انسانی اور حقیقت کے درمیان حائل ہوتے ہیں اپنے افکار و خیالات سے تار تار کر دیا ہے جسکے نتیجہ میں اہل نظر ان پردوں کے پیچھے جو کچھ ہے اسے دیکھ رہے ہیں۔

③ **معنی: عالم معانی**: معانی یا حقیقت کو جاننے والا۔ **حرف لن ترانی کہنا**: شیخی بگھارنا، باتیں بنانا۔

مطلب: معانی یا حقیقت کا عالم (جاننے والا، علم والا) خاموش رہتا ہے اور خواہ مخواہ شیخی نہیں بگھارتا۔ خالی ڈھول آواز دیتے ہیں۔ خاقانی نے بھی ڈینگیں نہیں ماریں اس سے پوچھنا پڑے گا۔ کیا پوچھنا پڑے گا" یہ اگلے شعر میں ہے۔

④ **معنی: خاکدان**: کوڑا پھینکنے کی جگہ، مراد دنیا۔ **ہنگامہ این و آں**: یہ، وہ کا ہنگامہ، طرح طرح کے ہنگامے یا شور۔

مطلب: اس شاعر بنام فضل الدین خاقانی سے پوچھ کہ یہ دنیا (جسے اہل حقیقت ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں) کیا ہے اور اس میں جو طرح طرح کے ہنگامے برپا رہتے ہیں اور طرح طرح کا شور و غل رہتا ہے وہ سب کیا ہے۔

⑤ **معنی: محرم**: جاننے والا۔ **عالم مکافات**: وہ جہان جہاں ادلے کا بدلا مل جاتا ہے۔

مطلب: خاقانی وہ شاعر اور حکیم ہے جو اس دنیا کا (جہاں ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلا مل جاتا ہے)

اچھی طرح جاننے اور اس کو اچھی طرح سمجھنے والا ہے۔ اس نے ایک بات کی ہے جس میں سو باتیں آجاتی ہیں وہ بات اگلے شعر میں ہے۔

⑥ **معنی: بوئے چنیں جہاں:** ایسے جہان کی بو۔ **تواں برد:** لی جا سکتی ہے۔ سونگھی جا سکتی ہے۔ **کابلیس:** کہ ابلیس (شیطان)۔ **بماند:** باقی ہے۔ **بوالبشر:** بشر کا باپ، آدم، **مرد:** مر گیا۔

مطلب: اس دنیا کو چونکہ اوپر کے شعروں میں کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ، ذلیل، مردار وغیرہ کہا گیا ہے اس لئے خاقانی اپنے اس فارسی شعر میں کہتا ہے کہ دنیا کو سمجھنا مشکل نہیں۔ اس جہان کی بو خود ہی ناک تک پہنچ جاتی ہے۔ دنیا کا رویہ اور اس کے واقعات اس کی بدبو پہنچانے کے لئے کافی ہیں۔ کیا دنیا کی ذلت اور بدبو دار شے ہونے کا آپ اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ آدم تو مر گیا ہے اور شیطان ابھی تک زندہ ہے جو اپنی شیطنت پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ رہا۔ اور دنیا کو نیکی اور خداشناسی کا گھر بننے سے روکنے کے لئے اپنی یلغار شیطانی سے اسے شیطانی گھر بنائے ہوئے ہے۔ اہلِ حقیقت اسی لئے ایسی دنیا سے نفرت کرتے ہیں جہاں سے یزداں تو غائب ہو اور ابلیس ہر سُو پھل پھول رہا ہو۔

رومی

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک — ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک — کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گُستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک — کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

معنی: مولانا جلال الدین رومی جو مشہور مثنوی معنوی کے مصنف، اعلیٰ پایہ کے شاعر اور بزرگ گزرے ہیں۔ علامہ اقبال انہیں اپنا روحانی راہنما تسلیم کرتے ہیں۔ مرشد مانتے ہیں۔

① **معنی: غلط نگر:** غلط دیکھنے والی۔ **چشمِ نیم باز:** آدھی کھلی ہوئی آنکھ۔ **وجود:** ہستی۔ **راز:** بھید۔

مطلب: اے شخص اگر تیری آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی ہوں اور حقیقت کو دیکھنے کی اہل ہوں تو تجھ پر سب بھید ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن تیری آنکھ تو ادھ کھلی ہے اس لئے وہ غلط زاویوں سے اشیا کو دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجھے اب تک کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکی یہاں تک کہ خود تجھ پر یہ بھی منکشف نہیں ہو سکا کہ تیری اپنی ہستی کیا ہے جس کے لیے اپنی ہستی ایک راز بنی ہوئی ہو وہ دوسری اشیا کے راز کیسے جان سکتا ہے۔

② **معنی: نیاز:** عاجزی، خاکساری۔ **ناز:** نخرہ ادا، نخرہ، استغنا: بے نیازی۔ **قیام سے خالی نماز:** نماز کا ایک رکن قیام یعنی کھڑے ہونا بھی ہے۔ یہاں مراد ہے کہ تو غیر خدا کے سامنے جھکا رہتا ہے اور سینہ تان کر ان کا مقابلہ نہیں کرتا۔

مطلب: تو نے ابھی تک غیر خدا کے آگے یا دنیا کی طاغوتی طاقتوں کے آگے جھکنا سیکھا ہے۔ ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کا سبق حاصل نہیں کیا۔ نیاز کے ناز سے آشنا نہ ہونے سے یہی مراد ہے کہ تم میں عجز ہے استغنا نہیں ہے۔ اس کی صورت تو ایسی ہے کہ نماز کے ارکان میں سجدہ، رکوع، قعدہ وغیرہ تو

ہو لیکن اس میں سے قیام کار کن غائب ہو۔

③ **معنی:** گستہ تار: ٹوٹے ہوئے تار۔ **نغمہ رومی:** رومی کی شاعری اور افکار۔

مطلب: اے مخاطب تیری خودی (خود معرفتی) ایک ایسا ساز ہے جس کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں جس میں سے کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا۔ مراد ہے کہ تو خودی سے بالکل بیگانہ ہے اور اس کی وجہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تو مولانا روم کی شاعری اور افکار سے بے پروا ہے۔ اگر تو نے مولانا کی مثنوی معنوی پڑھی ہوتی اور اس کے اثرات قبول کئے ہوتے تو تو کبھی بھی خودی سے نا آشنا نہ رہتا۔

جدت

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے — افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے — ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے — شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی — کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

معنی: جدت: نیا پن۔

① **معنی:** **افلاک:** فلک کی جمع' آسمان۔ **نور سحر:** صبح کی روشنی۔

مطلب: تو چونکہ اپنی خودی سے نا آشنا ہے اس لئے تو زمانے کو دوسروں کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے تجھے اس میں کوئی نیا پن نظر نہیں آتا۔ اگر تو خود آشنا ہو کر اپنی نظر سے زمانے کو دیکھے تو یقین رکھ کہ آسمان اس صبح کی روشنی سے جسے تو نے اپنی نظر کے زاویے سے دیکھا ہوگا روشن ہو جائے گا اور یہ تیرا زمانہ تجھے نیا نظر آئے گا۔

② **معنی** : **خورشید** : سورج۔ **کسب ضیا** : روشنی حاصل کرنا۔ **شرر** : چنگاری۔ **سیمائے قمر:** چاند کی پیشانی۔

مطلب: اگر تو خود آشنا اور خودی آشنا ہو کر اپنی نظر سے جہان کو دیکھے اور غیر کی نظر سے نہ دیکھے تو تو دیکھے گا کہ تیری نظر کی اس چنگاری سے سورج روشنی حاصل کرے گا اور تری قسمت چاند کی پیشانی سے ظاہر ہوگی یعنی یہ سب تیری مرضی کے تابع ہوں گے۔

③ **معنی** : **متلاطم ہوں** : طوفان آجائے' اچھل پیدا ہو جائے۔ **موج گہر:** موتی کی لہر۔ **اعجاز ہنر:** فن کی انوکھی شان۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے پہلے شعر کی طرح خود آشنا اور خودی آشنا نظر کے متعلق مزید بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ موتی کی ایک ایسی لہر ہے جس سے دریاؤں میں طوفان آجائے گا اور اس نظر سے جو انوکھا فن تو پیدا کرے گا قدرت اس کے سامنے شرمندہ ہوگی کہ ایسا فن تو میں بھی پیدا نہیں کر سکی۔

④ **معنی** : **اغیار** : غیر کی جمع۔ **افکار** : خیالات۔ **تخیل کی گدائی** : غیروں کے افکار کی بھیک مانگنا۔ **رسائی** :

پہنچ۔

مطلب: اس آخری شعر میں شاعر نے پہلے تین اشعار کا نچوڑ بیان کیا ہے کہ جب تک آدمی کی اپنی خودی تک پہنچ نہیں ہو گی یعنی وہ خود آشنا نہیں ہو گا اور جب تک وہ غیروں کے خیالات کی بھیک مانگتا رہے گا اور اپنے خودی آشنا خیالات سے زمانے کو نہیں دیکھے گا زمانے میں اس کے لئے نیا پن پیدا نہیں ہو سکتا۔ شاعر کے نزدیک جدت یعنی نیا پن کے لئے اپنی خودی تک رسائی ضروری ہے اور غیروں کے افکار و خیالات پر جینا چھوڑنا لازمی ہے۔

مرزا بیدل

ہے حقیقت یا مری چشمِ غلط بیں کا فساد
یہ زمیں‘ یہ دشت‘ یہ کہسار‘ یہ چرخِ کبود
کوئی کہتا ہے نہیں ہے‘ کوئی کہتا ہے کہ ہے
کیا خبر! ہے یا نہیں ہے تیری دنیا کا وجود
میرزا بیدل نے کس خوبی سے کھولی یہ گرہ
اہلِ حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود
”دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگِ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود“

تعارف: بیدل تخلص‘ مرزا عبدالقادر نام‘ مغلوں کے آخری دور کے مشہور تصوف گو فارسی شاعر تھے اور برصغیر کے مشہور شہر عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ اسی لیے انہیں بیدل عظیم آبادی بھی کہتے ہیں۔

① **معنی:** چشمِ غلط بیں: غلط دیکھنے والی آنکھ۔ فساد: خرابی۔ کہسار: پہاڑوں کا سلسلہ۔ چرخِ کبود: نیلا آسمان۔

مطلب: حکما یا فلسفیوں میں یہ بحث دیر سے چل رہی ہے کہ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ حقیقت میں موجود ہے بھی یا نہیں ہے۔ علامہ نے اسی فلسفیانہ موضوع کو اس نظم کے پہلے دو شعروں میں بیان کیا ہے اور آخری دو شعروں میں مرزا بیدل کی زبان سے اس کا حل بتایا ہے۔ اس شعر میں علامہ یہی کہتے ہیں کہ یہ زمین‘ یہ بیابان‘ یہ پہاڑوں کا سلسلہ‘ یہ نیلا آسمان غرض کہ پوری کائنات جس کو کہ ہم دیکھتے ہیں یہ واقعی موجود ہے یا صرف میری غلط دیکھنے والی نگاہ کی خرابی ہے کہ وہ اسے حقیقت سمجھ رہی ہے۔

② **معنی:** وجود: موجود ہونا۔

مطلب: مفکروں میں سے کوئی تو یہ کہتا ہے کہ یہ کائنات اپنی جملہ اشیا سمیت حقیقت میں موجود ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ دیکھنے میں یہ موجود تو ہے لیکن اس کا موجود ہونا میری نظر کا محتاج ہے۔ اس لئے اے شخص کیا خبر ہے کہ یہ دنیا جس میں تو رہتا ہے‘ واقعی موجود ہے یا صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔

③ **معنی:** گرہ: گانٹھ‘ مشکل۔ اہلِ حکمت: مفکر‘ فلسفی۔ کشود: کھولنا۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ اس پیچیدہ اور اختلافی مسئلہ کو جس کا مذکورہ بالا شعروں میں ذکر ہوا ہے اور جس کا کھولنا مفکروں پر بڑا مشکل رہا ہے دیکھئے مرزا عبدالقادر بیدل نے اس مشکل کو کس خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر دیا ہے۔

④ **معنی:** دل اگر می داشت: دل اگر رکھتا۔ وسعت: کشادگی پہنائی۔ بے نشاں بود: بے نشان ہوتا۔

ں چمن: یہ باغ یعنی دنیا۔ رنگ مے: شراب کا رنگ۔ بیرون نشست: باہر بیٹھ گیا۔ از بسکہ: اس کی وجہ۔
: صراحی۔ تنگ بود: تنگ تھی۔

طلب: یہ مرزا کا فارسی شعر ہے جس کے لفظی معنی یہ بنتے ہیں کہ اگر دل وسعت رکھتا تو یہ چمن یا
نات بے نشان یا غیر موجود نظر آتی۔ ہوا یوں ہے کہ چونکہ صراحی تنگ تھی اس لئے اس میں جو
اب ڈالی گئی وہ یا اس کا رنگ صراحی سے باہر آگیا۔ خمریات کی ان علامات سے مرزا نے یہ بتایا ہے کہ
ا دل چونکہ تنگ تھا اس لئے اس میں خدا کی تمام تجلیات نہیں سما سکیں اور جو دل کی صراحی سے باہر رہ
یں وہ دنیا کا نشان بن گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کا جو بھی نشان ہمیں نظر آتا ہے وہ خدا کی ان
یات کا پرتو ہے جو دل میں نہیں سما سکیں۔ یہ کائنات اس لیے موجود ہے کہ ہمارا دل تنگ ہے۔ اگر
ے دل میں وسعت ہوتی اور یہ ساری تجلیات دل میں ہی سما سکتیں تو کائنات کا وجود نہ ہوتا۔ اب بھی یہ کائنا
ے کے لئے وجود رکھتی ہے جن کے دل تنگ ہیں، وسعت دل رکھنے والوں کے لئے یہ ساری کائنات ان کے
یں موجود ہے۔

جلال و جمال

ے لئے ہے فقط زور حیدری کافی ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک
ں نظر میں یہی ہے جمالِ زیبائی کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک
سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

ی: جلال و جمال: شکوہ (ہیبت) اور خوبصورتی (حسن)۔

معنی: زور حیدری: حضرت علیؓ کی طاقت، فقر کی طاقت، روح کی طاقت۔ فلاطوں کی تیزی ادراک
یم یونانی فلسفی افلاطون کی فکر یا عقل کی تیزی۔

طلب: اس نظم میں میری اور تیری کی دو علامتوں میں دو الگ الگ اور متضاد موضوعات کو سمجھایا گیا
۔ 'میری' علامت سے وہ شخص مراد ہے جو خود آشنا اور خودی آشنا ہے اور 'تیری' علامت سے وہ شخص
و ہے جو خود نا آشنا اور خودی نا آشنا ہے۔ اس پس منظر میں علامہ کہتے ہیں کہ مجھے تو حضرت علیؓ کے
زوں کی طاقت ہی کافی ہے اور تو افلاطون کی فکر کی تیزی کا غلام ہے حالانکہ جہاں روحانی طاقت پہنچاتی
وہاں فکری طاقت نہیں پہنچاتی۔

معنی: جمال زیبائی: زینت کی خوبصورتی۔ سر بسجدہ: سجدے میں گرنا۔ افلاک: فلک کی جمع،
مان، قوت: طاقت۔

طلب: علامہ نے اس نظم میں جلال (شکوہ، ہیبت) کو جمال (حسن) پر ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ جلال
بغیر جمال کوئی شے نہیں۔ اس شعر میں انہوں نے کہا ہے کہ میں اس خوبصورتی کو حسن کی زینت سمجھتا
جس میں قوت بھی ہو کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ قوت کے سامنے آسمان بھی سر جھکا دیتے ہیں۔ صرف دلبری
ے وہ حسن کی کتنی انتہا پر کیوں نہ ہو آسمانوں کو سجدہ ریز ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی۔
معنی: نرا نفس: صرف سانس۔ نغمہ: راگ۔ آتشناک: آگ کی سی حرارت رکھنے والا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے اس سے پہلے کے شعر کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے کہ اگر جلال (شکوہ) نہ ہو تو حسن اور جمال بے اثر ہے۔ اس کے ثبوت میں علامہ مثال یہ لائے ہیں کہ اگر موسیقار کے نغمے میں آگ کی طرح کی حرارت موجود نہ ہو تو اس کا نغمہ یا راگ صرف ایک بے اثر سانس کی حیثیت رکھے گا۔ اثر اس وقت ہو گا جب اس کے نغمے کے حسن میں جلال کی کیفیت بھی ہو گی۔

④ **معنی:** **تند:** تیز۔ **سرکش:** سر اٹھانے والے' باغی۔ **بے باک:** بے خوف۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے جمال پر جلال کی فوقیت ثابت کرنے کے لیے ایک انوکھی ہی مثال دی ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر مجھے کسی گناہ کی پاداش میں آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو میں ایسی آگ کو کبھی قبول نہیں کروں گا جس کے شعلے تند و تیز اور بھڑکیلے نہ ہوں۔ یعنی آگ بھی وہ پسند کروں گا جس میں جلال کی کیفیت ہو۔ اس نظم کے اشعار سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جہاں جلال ہو گا اس میں جمال بھی موجود ہوتا ہے لیکن جہاں جمال وہاں جلال کا ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے اصل چیز جلال ہے جمال نہیں۔ جمال بے جلال بے کار ہے۔

مصور

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی' نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے' دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

معنی: **مصور:** تصویریں بنانے والا۔

① **معنی:** **مرگِ تخیل:** خیالات کی موت۔ **ہندی:** ہندوستان کا رہنے والا۔ **فرنگی:** یورپ کا رہنے والا۔ **عجمی:** ایران کا رہنے والا۔ **مقلد:** پیروی کرنے والا۔

مطلب: یوں تو علامہ اقبالؒ نے اہلِ مشرق کے ہر شعبہ زندگی میں اہلِ مغرب کی پیروی کرنے کی بات کی ہے لیکن اس نظم میں مصوری یا تصویر کشی میں اہلِ مغرب کی پیروی کی خرابیوں کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ مشرق میں افکار و خیالات پر غالباً موت چھا چکی ہے کہ ان میں سے چاہے کوئی ہندی ہو اور چاہے کوئی ایرانی ہو تخیلات و افکار میں اہلِ مغرب کی ہی پیروی کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ مصوری میں بھی اس نے مغربی مصوروں کی تقلید کو اچھا سمجھا ہے۔

② **معنی:** **بہزاد:** قدیم ایران کا ایک مصور۔ **سرورِ ازلی:** ازلی خوشی اور مستی۔

مطلب: علامہ دوسرے میدانوں کی طرح مصوری میں بھی اہلِ مشرق کی تقلید مغربی دیکھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے تو یہ غم کھا رہا ہے کہ اس زمانے کے مشرقی بہزاد یعنی اعلیٰ مصور مغربی مصوری کی پیروی میں ان کا مقام تو حاصل نہ کر سکے لیکن وہ ازلی خوشی اور مستی جو ان میں مشرقی پن کی وجہ سے موجود تھی اسے بھی ختم کر بیٹھے ہیں۔

③ **مطلب**: اے مشرق کے مردِ ہنر یعنی مصوری کے فن کو جاننے والے مجھے تیرے اوصاف کمالی کا علم ہے کہ تو مصوری کی پرانی صنعت سے بھی یا فن سے بھی واقف ہے اور مصوری کے نئے ہنر سے بھی آشنا ہے لیکن جو کچھ تجھے کرنا چاہیے اس کا ذکر اگلے شعر میں موجود ہے۔

④ **معنی**: آئینہ فطرت: قدرت کا شیشہ۔

مطلب: میں جانتا ہوں کہ اے مشرقی مصور تو نے فطرت کو دیکھا بھی ہے اور اپنی تصویروں میں اس فطرت کے نقشے بھی کھینچے ہیں لیکن بات تب بنے گی جب تو فطرت کے شیشے میں اپنی خودی یا خود شناسی کا چہرہ دیکھے گا اور غیروں خصوصاً اہل مغرب کی مصوری کی تقلید کو چھوڑ کر اس میں اپنے خیالات و افکار کے رنگ بھرے گا۔

سرود حلال

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود

ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود

مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے
تو رہے اور ترا زمزمۂ لا موجود

جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

معنی: سرود حلال: جائز موسیقی یا راگ۔ وہ موسیقی جو شرعاً حلال ہو حرام نہ ہو۔

① **معنی**: مغنی: گانے والا۔ بم و زیر: اونچ نیچ۔ پائندہ: ہمیشہ رہنے والا۔ دل کی کشود: دل کا شگفتہ ہونا۔

مطلب: کسی گانے والے کے سر تال کی اونچ نیچ سے دل میں شگفتگی اور کشادگی تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ اثر وقتی ہو اور ہمیشہ کے لئے زندہ اور قائم رہنے والا نہ ہو تو دل کی ایسی شگفتگی بے معنی ہے۔

② **معنی**: سینہ افلاک: آسمانوں کا سینہ۔ پنہاں: چھپا ہوا۔ نوا: آواز۔ وجود: جسم۔ افلاک: فلک کی جمع، آسمان۔

مطلب: شاعر کا خیال ہے کہ ابھی تک ایسا نغمہ جس سے دل کی صحیح کشود ہو اس کی آواز کہیں آسمان کے سینے میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ آواز وہ آواز ہے کہ جب کسی کے سینے سے نکلے تو ستاروں کے جسم بھی پگھل جائیں۔ موسیقی کی ایسی نوا تو جائز ہے لیکن جس سے اس کے الٹ دل افسردہ ہو وہ جائز نہیں ہے۔

③ **معنی**: ایازی: ایاز سلطان محمود کا غلام تھا۔ یہاں مراد ہے غلامی۔ **مقام محمود**: سلطان محمود غزنوی کا مرتبہ، یہاں مراد ہے حکمرانی اور سلطانی۔

مطلب: شاعر کے نزدیک وہ نغمہ جو جائز ہے اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کو سن کر آدمی غم اور خوف سے آزاد ہو کر اس کی تاثیر کی لہر میں بہہ جائے اور سب کچھ بھول جائے۔ اس کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ غلاموں کے اندر ایسا جذبہ اور ہمت پیدا ہو کہ وہ سلطانی اور حکمرانی کے خواب دیکھنے لگیں۔ اگر نغمے کی تاثیر یہ ہو کہ اس کو سن کر آدمی غفلت میں چلا جائے تو یہ سرود حلال نہیں ہے۔

④ **معنی**: مہ و انجم: چاند اور تارے۔ حیرت کدہ: حیرانی کا گھر۔ **زمزمہ لاموجود**: اللہ کے سوا کسی اور کے موجود نہ ہونے کا راگ۔

مطلب: وہ نغمہ جو شاعر کے نزدیک ابھی آسمان کے سینے میں چھپا ہوا ہے' اس کا ایک اور وصف یہ بتایا گیا ہے کہ اس کو سن کر سننے والے کے سامنے یا ذہن میں چاند اور تاروں کا یہ حیرانی کا گھر باقی نہ رہے یعنی سننے والا دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو جائے۔ سب کچھ مٹ کر صرف سننے والے کا اپنا وجود اور وہ توحید کا نغمہ باقی رہ جائے۔ جس کی بناء پر اللہ کے سوا ہر دوسری چیز لا یعنی نہیں ہو جاتی۔

⑤ **معنی**: مشروع سمجھنا: شرع کے نزدیک جائز سمجھنا۔ **فقیہان خودی**: خودی کے عالم۔ **مطرب**: گانے والا۔ **سرود**: راگ۔

مطلب: ایسا راگ جس کے اوصاف مذکورہ بالا شعروں میں بیان ہوئے ہیں اور جن کو خودی کے عالم' شرع کے مطابق جائز سمجھتے ہیں وہ ابھی تک اس انتظار میں ہے کہ کوئی گانے والا پیدا ہو اور اسے گائے۔

سرود حرام

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے فقیہ شہر کہ ہے محرم حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

ذکر: اللہ کو یاد کرنا' **فکر**: اللہ اس کی کائنات اور اپنے متعلق غور کرنا۔

معنی: سرود حرام: ناجائز موسیقی یا راگ۔ **سوز**: جلن تپش' **سرور**: مستی' **پیمانہ**: جام۔ ناپ۔ آلہ'

① **مطلب**: شاعر اپنی بات کرتا ہوا ایک خاص طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں جو اللہ کا ذکر کرتا ہوں اس میں صوفیوں جیسی تپش اور مستی موجود نہیں ہے اور میری فکر بھی ثواب اور عذاب کا پیمانہ لئے ہوئے نہیں ہے یعنی اس کے ذریعے بھی میں یہ فیصلہ نہیں دے سکتا کہ یہ بات ثواب میں داخل ہے اور یہ بات عذاب میں داخل ہے یہ کام تو صوفیاء اور فقہا کا ہے۔

② **معنی**: فقیہ شہر: شہر کا عالم دین۔ **محرم حدیث و کتاب**: قرآن اور حدیث کا جاننے والا۔

مطلب: شاعر نے پہلے شعر میں اگرچہ خود کو صوفیا اور علما کے ذکر و فکر کی دنیا سے الگ رکھا ہے' اس لیے وہ شہر کے عالم دین اور قرآن و حدیث جاننے والے کے متعلق جو عام طور پر مختلف مسائل پر دینی فیصلے دیتے ہیں' کہتا ہے کہ اللہ کرے جو بات میں کہنے والا ہوں اس سے وہ اتفاق کر لیں۔ شاعر نے جو بات کہی ہے وہ اگلے شعر میں موجود ہے۔

③ **معنی**: نوا: آواز' یہاں مراد ہے راگ۔ **نائے' چنگ' رباب**: یہ سازوں کی مختلف قسمیں ہیں۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ اگر گانے والے کا راگ یا سازندے کا ساز زندگی کی بجائے موت کا پیغام دے تو چاہے وہ راگ بانسری پر ہو یا چنگ اور رباب پر ہو میری نگاہ میں حرام ہے۔ جو راگ افراد کو غفلت سے جگانے کی بجائے غفلت کی نیند سلا دے۔ زندگی کے قریب لے جانے کی بجائے موت کے قریب لے

جائے وہ جائز نہیں ہے۔

فوارہ

یہ آبجو کی روانی، یہ ہمکناری خاک — مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
اِدھر نہ دیکھ، اُدھر دیکھ اے جوانِ عزیز — بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

① **معنی**: آبجو: ندی۔ روانی: بہاؤ۔ **ہمکناری خاک**: مٹی کے ساتھ رہنا۔ **ناخوب ہے**: اچھا نہیں ہے۔

مطلب: اس نظم میں شاعر نے آدمی کی اندرونی قوت کا ذکر ندی اور فوارہ کی علامتوں سے سمجھایا ہے۔ ندی میدان میں بہتی رہتی ہے جب کہ فوارہ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر کے زور سے پانی کو اوپر اچھالتا ہے۔ اسی بات کو اس نظم کے دونوں شعروں میں بیان کیا ہے۔ پہلے شعر میں یہ کہا ہے کہ ندی کو دیکھو وہ بہتی ضرور ہے لیکن مٹی کے کناروں میں بہتی چلی جاتی ہے اور مٹی سے بلند اٹھنا اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ اس بنا پر ندی کا یہ نظارہ میری نگاہ میں اچھا نہیں ہے۔

② **معنی**: زورِ دروں: اندر کا زور۔ **جوانِ عزیز**: قسمتی یا پیارے نوجوان

مطلب: دوسرے شعر میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں اے میرے پیارے جوانو! تم ندی اور اس کے بہاؤ کو نہ دیکھو اور اس کے نظارے کو دیکھ کر خوش نہ ہو بلکہ دوسری طرف فوارے کو دیکھو کہ اس کے اندر ایسا زور ہے کہ وہ اس زور سے پانی کو اوپر کی طرف اچھالتا ہے اور مٹی سے کہیں اوپر لے جاتا ہے۔ اس سے تمہیں بھی سبق سیکھنا چاہیے کہ اصل چیز تمہارے اندر کی طاقت ہے جس کو پیدا کر کے تم بھی مٹی سے بلند ہو سکتے ہو اور غلامی سے نکل کر آزادی کی سانس لے سکتے ہو۔

شاعر

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے — شاعر! ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم — اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو — شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے — بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

① **معنی**: نیستاں: سرکنڈوں کا جنگل، بانسوں کا جنگل۔ نفس: سانس۔ نے: بانس کا ایک ٹکڑا، بنسری۔

مطلب: مشرق کے نیستان (سرکنڈوں یا بانسوں کے جنگل) میں جو بانس کا ٹکڑا یا بنسری ہے وہ کسی کے سانس کی محتاج ہے۔ (بنسری سے لے تب نکلتی ہے جب کوئی بجانے والا اپنے سانس یا پھونک سے اسے بجائے)۔ اقبال" مشرق کے خصوصاً برصغیر کے شاعر سے پوچھتے ہیں کہ کیا تیرے پاس ایسا سانس ہے کہ

جس کی پھونک سے یہ بانسری لے نکال سکے۔ مراد یہ ہے کہ مشرق غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ غفلت کی نیند سویا ہوا ہے۔ اے شاعر تو اپنی شاعری کے ذریعے اسے بیدار کر سکتا ہے لیکن معلوم نہیں تیرے پاس بیدار کرنے والا شاعری کا جوہر موجود ہے یا نہیں ہے۔ اس ہے اور نہیں سے' مطلب یہی نکلتا ہے کہ نہیں ہے۔ مشرق کا شاعر بھی غلامی کی شراب پی کر مست ہے اور ایسی شاعری کر رہا ہے جس سے اقوام بیدار ہونے کی بجائے اور سو جائیں۔

② **معنی:** عجمی لے: ایرانی لے غیری عربی لے' غیر حجازی لے' غیر اسلامی لے۔

مطلب: اے شاعر جس قوم کی خودی غلامی کے اثر کی وجہ سے نرم ہو چکی ہو یعنی اس میں خودشناسی کا مادہ موجود نہ ہو اور اس میں آزادی کی خواہش ختم ہو چکی ہو اس قوم کے حق میں وہ غیر عربی لے جو تو بانسری سے نکال رہا ہے یا اپنی شاعری کے ذریعے قوم کے کانوں تک پہنچا رہا ہے مناسب نہیں ہے۔ اس سے تو غلام قوم تاثیر غلامی میں اور پختہ ہو جائے گی۔ تیرے لیے ضروری ہے کہ تو غیر عربی کی بجائے عربی اور حجازی لے اختیار کرے اور درس اسلامی دے کر قوم کو بیدار کرے۔

③ **معنی:** سبو: پیالہ یا مٹکا' شمشیر: تلوار۔ تیزی: کاٹ۔ مے: شراب۔

مطلب: اس سے کوئی غرض نہیں کہ تیری شراب شیشے کی صراحی میں ہے۔ یا مٹی کے پیالے یا مٹکے میں ہے۔ غرض اس سے ہے کہ جو شراب اس میں ہے وہ اپنی تندی اور تیزی میں تلوار کی کاٹ کی مانند ہو۔ شاعری میں ایک تو الفاظ ہوتے ہیں اور دوسرے معانی یا یہ الفاظ دیگر ایک طرز اور ادائیگی ہوتی ہے اور دوسرے موضوعات اور مضامین۔ اقبال کہتے ہیں کہ انداز بیان کا اچھا ہونا بھی اگرچہ شاعری میں ضروری ہے لیکن اصل ضرورت مضامین کے اچھے ہونے کی ہے۔ اے شاعر تیری شاعری کے مضامین افراد و اقوام میں شرف آدمیت پیدا کرنے اور ان کو غلامی سے آزاد کرنے کے لیے ہونے چاہییں۔ چاہے ان کے لئے طرز کوئی اختیار کر لی جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

④ **معنی:** افلاک: فلک کی جمع آسمان۔ بے معرکہ: جنگ یا کوشش کے بغیر۔ تختِ جم و کے: جم اور کے کا تخت یعنی ایران کے ان مشہور بادشاہوں کا تخت یعنی عروج اور ترقی اور مقام بلند۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ میں نے آسمان کے نیچے ایسی کوئی دنیا نہیں دیکھی جہاں کوئی فرد یا کوئی جماعت بغیر حالات سے مقابلہ کئے اور بغیر تگ و دو اور کوشش کئے کامیاب ہوئی ہو یا بلندی پر پہنچی ہو۔

⑤ **معنی:** ہر لحظہ: ہر لمحہ۔ طور: وادی سینا کا ایک پہاڑ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام جایا کرتے تھے۔ برقِ تجلی: جلوے کی بجلی۔ مرحلہ شوق: عشق کا فاصلہ۔ یا منزل۔

مطلب: حضرت موسیٰ علیہ السلام جس کوہ طور پر اللہ سے ہمکلام ہونے کے لیے جاتے تھے وہ پہاڑ تو دنیا میں صرف ایک ہی ہے اور اس پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کے نور کے جس جلوے کی بجلی حضرت موسیٰ پر گری تھی وہ بھی صرف ایک مرتبہ ہی گری ہے لیکن عشق کی منزل تک کے سفر میں ایک نہیں کئی طور آتے ہیں۔ جلوے کی ایک بجلی نہیں کئی بجلیاں گرتی ہیں اور عاشق کو ہر نئے طور پر اور ہر نئی بجلی گرنے پر ایک نیا مزا آتا ہے۔ اسی لئے وہ اللہ سے دعا کرتا ہے کہ عشق کا یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ نظم کے عنوان شاعر کے تناظر میں جب ہم اس شعر پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا مقصد یہ ہے کہ اے شاعر تیرے اسالیب و مضامین

ور تیرے الفاظ و ں کی دنیا محدود نہیں۔ تجھے ایک ہی روایتی ڈگر پر نہیں چلنا چاہیے بلکہ نئے نئے
ضامین اور اسالیب اختیار کرنے چاہئیں جن کے نتیجے میں قاری کے ذہن و قلب میں انقلاب پیدا ہو اور
س کی زندگی متحرک ہو اور وہ نیند سے بیدار ہو اور غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا جویا ہو۔

شعرِ عجم

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
فسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
ہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے — جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز
قبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ — از ہرچہ بہ آئینہ نمایند بہ پرہیز

عنی: شعرِ عجم: ایرانی یا غیر عربی شاعری۔

① معنی: طرب ناک: نغمہ ریز، پر سرور۔ دل آویز: دل کو لبھانے والا۔ شمشیرِ خودی: خود آگاہی کی لوار۔

طلب: علامہ نے اس نظم میں مسلمان ملکوں خصوصاً برصغیر کے شاعروں کی شاعری کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس شعر میں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے عہد حاضر کے شاعروں کی شاعری بڑی سرور اور دل کو لبھانے والی ہوتی ہے لیکن یہ حجاز اور حرم سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے قاری کے لوں میں عشق کی حرارت پیدا نہیں کرتی اور اسے پڑھنے والے کی خود آگاہی اور خود شناسی کی تلوار تیز نہیں وتی بلکہ کند ہی رہتی ہے۔

② معنی: افسردہ ہونا: بجھ جانا، پژمردہ ہو جانا۔ نوا: آواز۔ مرغ سحر خیز: علی الصبح اٹھ کر چہچہانے والا رندہ۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے باغ، پرندے اور اس کے چہچہانے کی علامتوں سے عجمی شعرا کی شاعری کی بے اثری کا ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں اگر علی الصبح اٹھ کر پرندہ باغ میں چہچہاتا ہے اور اس کے چہچہانے سے باغ کی ہر شے پر پژمردگی چھا جاتی ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ وہ نغمہ ریز ہی نہ ہو۔ اگر کسی شاعر کی شاعری سے قاری کی زندگی کا دیا جلنے کی بجائے بجھ جائے اور اس کے خیالات و افکار کا چراغ بے نور ہو کر رہ جائے تو ایسی شاعری سے بہتر یہ ہے کہ شاعر خاموش رہے اور ایسی شاعری سے پرہیز کرے۔

③ معنی: متزلزل ہونا: زلزلہ پیدا ہونا۔ دولت پرویز: ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کی حکومت۔ ضرب: چوٹ، وار۔ کوہ شکن: پہاڑ توڑنے والی۔

مطلب: اگر کسی کا وار پہاڑ کو بھی توڑ ڈالے تو اس سے کیا حاصل ہو گا۔ مزا تو جب ہے کہ اس کے وار سے خسرو پرویز جیسے بادشاہ کی عظیم سلطنت میں زلزلہ آ جائے۔ عجمی شاعروں کی شاعری سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک وہ مشرق کی سوئی ہوئی قوموں کو بیدار کرنے والی، ان کو غلامی سے آزاد کرانے والی اور ان کے حاکموں کی حاکمیت ختم کرنے والی شاعری نہ ہو۔

④ **معنی:** خارہ تراشی: پتھر توڑنا' سخت محنت کرنا۔ از: سے۔ ہر چہ: جو کچھ۔ بہ آئینہ: آئینے میں۔ نماید: دکھاتے ہیں۔ بہ پرہیز: بچو۔

مطلب: اے اقبالؒ یہ دور پتھر توڑنے یعنی سخت محنت اور مشقت کرنے کا دور ہے۔ ہمارے شاعر ہمیں مشکلات سے ٹکرانے کی بجائے ہمیں محنت سے کترانے کا سبق سکھاتے ہیں اور جذبات سفلی کا بھڑکا کر ہمارے اندر زندگی کی لو کو بجھا رہے ہیں یہ اپنی شاعری میں ہمیں جو کچھ دکھاتے ہیں ہمیں اس سے بچنا چاہیے۔

ہنروران ہند

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں — زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ' بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

معنی: ہنروران ہند: برصغیر کے فنکار۔

① **معنی:** اندیشہ تاریک: سیاہ فکر' بھیانک سوچ۔

مطلب: اس نظم میں علامہ اقبالؒ نے برصغیر کے ادیبوں' شاعروں' مصوروں' موسیقاروں' سنگ تراشوں اور دوسری قسم کے جملہ اہل فن کے متعلق کہا ہے کہ ان کی تخلیقات میں جو تخیل ہوتا ہے اس سے پڑھنے والے اور دیکھنے والے کے اندر عشق اور مستی کا جوہر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے جذبات مردہ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ ان ہنرمندوں اور فنکاروں کے خیالات و افکار کی بھیانک تاریکی سے قومیں مرجاتی ہیں اور وہ زندہ مزاروں کی صورت میں باقی رہ جاتی ہیں۔

② **معنی:** نقش گری: تصویر کشی۔ صنم خانوں: بت خانوں۔ برہمن: ہندوؤں کا پیشوا' بتوں کو پوجنے والا۔

مطلب: برصغیر کے ہنروروں کی مزید صفت بیان کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے ہنر سے ایسے بت خانے بناتے ہیں جن میں زندگی کی نہیں موت کی تصویریں آویزاں ہوں اور ان بتوں کے برہمنوں یعنی ان ہنرمندوں کے ہنر سے زندگی بیزار اور موت ان پر فریفتہ نظر آتی ہے ان کے جملہ فن پاروں میں افسردگی پائی جاتی ہے اور زندگی کی کوئی لہر نظر نہیں آتی۔

③ **معنی:** چشم آدم: آدمی کی آنکھ۔ مقامات بلند: اونچے مقامات۔ خوابیدہ کرتے ہیں: سلاتے ہیں۔

مطلب: مذکورہ بالا شعروں میں جن ہنرمندوں کا ذکر آیا ہے ان پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ ان کا کام یہ ہے کہ یہ آدمی کی نگاہوں سے آدمیت اور انسانیت کے اعلیٰ و ارفع مقامات کو چھپاتے ہیں اور ان میں حیوانی و سفلی جذبات بھڑکاتے ہیں۔ یہ اپنے فن پاروں کے پڑھنے والوں اور دیکھنے

والوں کے بدنوں کو تو جگا دیتے ہیں اور ان میں حیوانی اور جنسی جذبات و خیالات تو پیدا کر دیتے ہیں لیکن ان کی روحوں کو سلا دیتے ہیں اور انہیں بے روح بدنوں والے آدمی بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

④ **معنی:** **صورت گر:** مصور۔ **اعصاب:** عصب کی جمع یعنی رگ اور پٹھے۔

مطلب: اس آخری شعر میں علامہ نے برصغیر کے مصوروں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ایسے فن پارے تخلیق کرتے ہیں جن میں عورت اور اس سے متعلق سفلی جذبات کا ضرور ذکر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورت اور جنسی و سفلی جذبات ان کے رگ و ریشہ میں سما گئے ہیں اور اس کے سوا انہیں کسی اور موضوع پر سوچنے کی توفیق ہی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم دور جدید کی ترقی پسند (بے باطن، زوال پسند) تحریک کو دیکھیں تو اس سے متعلقہ جملہ فن کاروں کا یہی حال ہے۔ حتی کہ انہوں نے کارل مارکس کی بے دینی اور فرائیڈ کی جنسیات کو بھی عام کرنے سے پرہیز نہیں کیا۔

مردِ بزرگ

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

معنی: **مردِ بزرگ:** بڑا آدمی۔ وہ آدمی جو اللہ کے نزدیک بڑا ہے جو قوم کا بزرگ ہے۔

① **معنی:** **عمیق:** گہری۔ **قہر:** سختی۔ **شفیق:** مہربان۔

مطلب: اس نظم میں اقبالؒ نے اس شخص کا ذکر کیا ہے جو اللہ کے نزدیک بڑا ہے۔ یہ اقبالؒ کا مردِ مومن بھی ہو سکتا ہے اور اللہ کا کوئی ولی بھی۔ علامہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی نفرت بھی گہری ہوتی ہے اور اس کی محبت بھی گہری ہوتی ہے۔ نفرت باطل سے اور بری چیزوں سے۔ اور محبت حق سے اور اچھی چیزوں سے۔ ایسے شخص کو اگر اللہ کے بندوں پر سختی کرتے ہوئے دیکھیں گے تو دراصل اس میں بھی مہربانی کا جذبہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ وہ سختی بندوں پر ظلم کرنے کے لئے نہیں کرتا بلکہ ان کو راہ راست پر رکھنے کے لئے کرتا ہے۔ یہ حقیقت میں سختی نہیں ان پر احسان اور مہربانی ہے۔

② **معنی:** **تقلید:** پیروی۔ **تخلیق:** نئی چیز پیدا کرنا۔ **تقاضا ہے:** ضرورت ہے۔

مطلب: یہ مردِ بزرگ اگرچہ اپنے عہد کی پیروی کے ماحول میں پھلتا پھولتا ہے لیکن وہ اس پیروی کے اندھیرے میں اپنے آپ کو گم کرنے کی بجائے نئی راہیں تلاش کرتا ہے اور یہ نئی راہیں پیدا کرنا اس کی سرشت اور مزاج کی عین ضرورت ہے۔

③ **معنی:** **انجمن:** محفل۔ **میسر رہنا:** حاصل ہونا۔ **خلوت:** تنہائی۔ **رفیق:** دوست۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے محفل اور شمع کی علامتوں سے اپنا مقصد ادا کیا ہے اور کہا ہے کہ جس

طرح محفل کے اندر شمع جملہ حاضرین مجلس سے جدا ہوتی ہے لیکن سب کو روشنی پہنچاتی ہے اسی طرح اللہ کا برگزیدہ بندہ بھی مجلس میں ہوتا ہوا سب کا دوست بھی ہوتا ہے اور سب سے الگ اور تنہا بھی ہوتا ہے۔ ہاتھ اس کا کام میں اور دل اس کا خدا کی یاد میں لگا رہتا ہے۔

④ **معنی : مثل خورشید سحر:** صبح کے سورج کی مانند۔ **فکر کی تابانی:** فکر کی چمک دمک۔ **آزادہ:** آزاد۔ **دقیق:** مشکل۔

مطلب: اس شعر میں سورج اور اس کی روشنی کا استعارہ استعمال کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کا بزرگ بندہ اپنی فکر کی چمک دمک میں صبح کے سورج کی مانند ہوتا ہے۔ جس طرح صبح کے سورج کے طلوع ہونے سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور ہر چیز بیدار ہو جاتی ہے اسی طرح مرد بزرگ کی فکر سے بھی باطل کی تاریکیاں اور غلامی کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ اس کی باتیں اگرچہ بہت سادہ ہوتی ہیں لیکن غور کیا جائے تو وہ معنی میں یا سمجھنے کے اعتبار سے مشکل ہوتی ہیں۔ یعنی اس کی سیدھی سادی باتوں میں بہت سی رمزیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

⑤ **معنی : انداز نظر:** دیکھنے کا انداز۔ **احوال:** حال کی جمع' حالات۔ **محرم:** آشنا۔ **پیران طریق:** طریقت کے پیر مرشد۔

مطلب: اس مرد بزرگ کے دیکھنے کا انداز دوسروں کے دیکھنے کے طریقے سے مختلف ہوتا ہے وہ صرف ظاہری نظروں سے ہی زمانے اور اس کے حالات کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ ان پر باطنی اور معنی خیز نظریں ڈالتا ہے۔ اسکے جو روحانی حالات ہوتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے اس دور کے پیشہ ور پیران طریقت یا ولایت کے میدان میں رسمی قدم رکھنے والے واقف نہیں ہوتے ہیں۔

عالمِ نو

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر ۔ خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے ۔ کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کفِ خاک ۔ روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

معنی: عالم نو: نیا جہان۔

① **معنی : پوشیدہ:** چھپی ہوئی۔ **ضمیر تقدیر:** تقدیر کا باطن۔ **زندہ دِل :** وہ دل جو روحانی طور پر جی رہا ہو۔ جو اہلِ تصوف و طریقت کا دل ہوتا ہے۔

مطلب: جس شخص کا دل روحانی طور پر زندہ ہے اس سے تقدیر کا باطن چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ اس کے رازوں کو خوب جانتا ہے۔ صرف بیداری ہی میں نہیں بلکہ نیند کی حالت میں بھی وہ نئے نئے جہانوں کی تصویریں دیکھتا ہے۔ وہ اپنے زمان میں مقید نہیں ہوتا بلکہ اس سے آگے بہت کچھ دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

معانی : بانگ : آواز۔ **اذان :** نماز کے لئے پکار۔ **بیدار کرنا :** جگانا۔

② **مطلب:** اللہ کا وہ بندہ جس کا دل روحانی طور پر زندہ ہوتا ہے وہ نیند کی حالت میں بھی سچے خواب دیکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ بعض اوقات خواب کی حالت میں اسے وہ کچھ دکھا دیتا ہے جو کچھ اسے کرنا ہوتا۔

ہے۔ اللہ کا ایسا بندہ جب صبح کی اذان سن کر جاگتا ہے تو جس دنیا کو اس نے خواب کی حالت میں دیکھا ہوتا ہے اس کو بنانے اور سنوارنے میں لگ جاتا ہے۔

③ **معنی: کفِ خاک:** مٹی کی مٹھی۔ **تکبیر:** اللہ اکبر کی صدا۔

مطلب: یہ مردِ حق جو نئے جہان تعمیر کرتا ہے وہ ظاہری مٹی یا سنگ و خشت کے نہیں ہوتے بلکہ اس نئے جہان کا بدن وہ اپنے دلِ زندہ کی مٹی سے پیدا کرتا ہے۔ یہ جہان روحانی اور فکری ہوتا ہے اس جہان کے بدن میں جو روح ہوتی ہے وہ عام انسانی روح نہیں ہوتی بلکہ اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) یعنی توحید کی روح موجود ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ عالم نو جو زندہ دل رکھنے والے لوگ (اللہ کے بزرگ بندے یا درویش) پیدا کرتے ہیں۔

ایجادِ معانی

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد — کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

معنی: ایجادِ معانی: نئے معنی پیدا کرنا۔

① **معنی: خداداد:** خدا کا دیا ہوا۔ نئی چیز تخلیق کرنا۔

مطلب: اگرچہ کسی لفظ یا چیز کے نئے معنی پیدا کرنا یا کوئی نیا فن پیدا کرنے کی صلاحیت کا ہونا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اہلیت کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن ہنرمند اور فن کار شخص کوشش سے اس صلاحیت اور اہلیت کو مزید اجاگر کرتا ہے اور نئے نئے اسلوب اور معنی پیدا کرتا ہے۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں بنتا بلکہ ہر فن پارے میں اپنی کوشش سے نیا رنگ بھرتا ہے۔

② **معنی: خونِ رگِ معمار:** راج رگوں کا خون۔ **میخانہ حافظ:** حافظ شیرازی (جو کہ ایران کا ایک شاعر ہے) کی شاعری کا مے خانہ۔ **بت خانہ بہزاد:** بہزاد (جو کہ ایران کا ایک مصور ہے) اسکی تصویروں کا بت خانہ یعنی مصوری۔

مطلب: خواجہ حافظ شیرازی نے اگر اپنی خمریاتی شاعری سے مے خانہ سجایا ہے اور اپنے مضامین و معانی کو شراب، جام، سبو، مے، مغ وغیرہ کی علامات سے تعبیر کیا ہے یا بہزاد نے اپنی تصویروں سے بت خانہ سجایا ہے یعنی اعلیٰ مصوری کی ہے تو یہ محض اس لیئے ممکن ہو سکا ہے کہ ان معماروں (راجوں) کی رگوں میں گرم خون دوڑتا تھا۔ یعنی عشق اور اخلاص کی گرمی کے وہ حامل تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور ان کی رگیں عشق اور اخلاص کی حرارت سے خالی ہوتیں تو وہ عظیم مے خانہ حافظ اور بت خانہ بہزاد جو آج ہم دیکھتے ہیں کبھی تعمیر نہ ہوتا۔ مراد یہ ہے کہ فن میں نئے معانی، نئی چیز، مستقل قدر و قیمت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ فن کار کے دل میں عشق کا جوش اور اخلاص کا ہوش موجود ہو۔

③ **معنی: بے محنتِ پیہم:** بغیر لگاتار جدوجہد کے۔ **جوہر نہیں کھلتا:** اصلیت ظاہر نہیں ہوتی۔ **شررِ تیشہ:** تیشہ کی چنگاری۔ **خانہ فرہاد:** فرہاد کا گھر۔ فرہاد ایران کا ایک شخص تھا جو شیریں نامی ایک حسینہ پر عاشق تھا (تیشہ: شیریں کو حاصل کرنے کے لئے فرہاد کا تیشہ جو اس نے پہاڑ کھودنے کے لئے بنایا تھا)

مطلب: اس شعر میں علامہ نے خسرو پرویز' فرہاد اور شیریں کے قصے کو پس منظر میں رکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جس طرح فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کے لیے خسرو پرویز کے فریب میں آ کر تیشے سے پہاڑ کو چیر کہ دودھ کی نہر نکالنے کی ٹھان لی تھی اسی طرح بغیر مسلسل محنت کے اور بغیر بڑی سے بڑی مہم سر کرنے کے ارادے کے کسی بھی فن کار کی اصلیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ جس طرح فرہاد کا گھر اس کے پتھروں پر تیشہ چلانے کی بناء پر نکلتی ہوئی چنگاریوں سے روشن ہوا ہے اور اس کی شہرت بطور کوہ کن آج تک موجود ہے اسی طرح وہ فن کار جو مسلسل محنت کر کے تیشہ فرہاد کی طرح چنگاریاں پیدا کرتا ہے اس کا فن اعلیٰ فن ہوتا ہے۔

موسیقی

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل   کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود   وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں   کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

① **معنی:** **غزل سرا:** غزل گانے والا۔ **تابناک:** روشن۔

مطلب: وہ غزل گانے والا کہ جس کی غزل کو سن کر سننے والے کے چہرے پر اس کے اندرونی جذبات کی گرمی کی روشنی ظاہر نہ ہو تو سمجھئے کہ اس غزل گانے والے کا خون سرد ہے۔ وہ غزل جو دل کی گہرائی اور پورے جوش و جذبہ عشق کے ساتھ نہ گائی جائے وہ سننے والے کے جذبات کو ہی نہیں خون کو بھی سرد کر دیتی ہے۔ موسیقی وہ ہونی چاہیے جس سے سننے والے کے دل میں حرارت پیدا ہو اور اس حرارت کی چمک دمک اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہو۔

② **معنی:** **نوا:** آواز۔ **موجِ نفس:** سانس کی لہر۔ **زہر آلود:** زہر سے بھرا ہوا۔ **نے نواز:** بانسری بجانے والا۔ **ضمیر:** دل' اندرون۔

مطلب: جس طرح شعر کو نغمے کے روپ میں ڈھالنے کے لیے گانے والے کے خون کا گرم ہونا ضروری ہے اسی طرح بانسری بجانے والا یا کوئی اور ساز بجانے والا یا کوئی موسیقار اگر اپنے اندروں اور دل کے اعتبار سے پاکیزہ نہیں ہے تو اس کے ساز کی آواز جو وہ اپنی سانسوں یا پھونک مارنے کے ذریعے سے نکالے گا' سننے والے کے خون میں زہر بھر دے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ موسیقار پاک ضمیر ہو اور خلوص اور عشق کے خمیر سے بنا ہوا ہو۔

③ **معنی:** **لالہ زار:** وہ باغ جہاں لالے کے پھول اگتے ہیں۔ لالے کے پھول کو علامہ نے عشق کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے لالے کے پھول کی علامت سے مضمون ادا کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے مشرق اور مغرب کے وہ سارے لالہ زار دیکھے ہیں جہاں موسیقار اور گانے والے اپنی نوا سے دوسروں کو بہلاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کی نوا سے کسی ایک لالے کے پھول کا گریبان بھی چاک نہیں

یعنی اس میں مستی اور جنوں کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا سبب صرف اور صرف یہ ہے کہ آج کل کے موسیقار چاہے وہ شعر گانے والے ہوں یا ساز بجانے والے ہوں اپنے اندر عشق کی گرمی اور اخلاص کی حرارت نہیں رکھتے۔ ان کی نواؤں کو سن کر کسی کے دل میں سوز پیدا نہیں ہوتا بلکہ الٹے دل سرد ہو جاتے ہیں ایسی موسیقی سے بچنا لازمی ہے۔

ذوق نظر

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی	کہا غریب نے جلاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دلکشا ہے یہ منظر	ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکیِ شمشیر

①② معنی: خوں گرفتہ: قتل کے لائق۔ دمِ تعزیر: سزا دینے کے وقت۔ دل کشا: دل کو کھول دینے والا۔ تابناکی شمشیر: تلوار کی چمک دمک۔

مطلب: ان دو شعروں میں اقبالؒ نے ایک ایسے چینی کا واقعہ بیان کیا ہے جو کسی جرم کی پاداش میں قتل کیا جانے والا تھا۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ جب اس غریب چینی کو جلاد کے سامنے سزا دینے اور قتل کرنے کے لئے لایا گیا تو وہ جلاد سے کہنے لگا کہ ذرا ٹھہر جا۔ مجھے یہ قتل ہونے کا منظر بڑا دل کو کشادہ کرنے والا یا دل پسند معلوم ہوتا ہے۔ قتل کرنے سے پہلے ذرا مجھے وہ تلوار دکھا جس سے تو مجھے قتل کرے گا تاکہ میں اس کی چمک دمک دیکھ لوں اور پھر مجھے بے شک قتل کر دینا۔ موت کے دہانے پر کھڑے ہوئے اس چینی کی صبر آمیز اور دلچسپ باتیں بتا رہی ہیں کہ وہ بہت حوصلے والا تھا۔ موت کا اس کو کوئی خوف نہیں تھا۔ علامہ کہتے ہیں کہ اس کا سبب میری نظر میں یہ ہے کہ اس چینی کا جذبہ خودی بہت بلند تھا اور وہ نظر کی لذت سے آشنا تھا۔

شعر

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن	یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے	یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

①② معنی: اسرار: سر کی جمع، بھید۔ محرم: واقف۔ نکتہ: باریک بات۔ تاریخ امم: قوموں کی تاریخ۔ حیات ابدی: ہمیشہ کی زندگی۔ نغمہ جبریل: جبریل فرشتے کا نغمہ جو پاکیزہ ہوتا ہے۔ بانگ سرافیل: اسرافیل فرشتے کی آواز جو مردوں کو زندہ کرتی ہے۔

مطلب: علامہ ان دو شعروں میں شعر اور شاعری کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔ پہلے شعر میں انکساری کے طور پر کہتے ہیں کہ شعر کے بھیدوں سے میں واقف تو نہیں ہوں لیکن مجھ پر قوموں کی تاریخ پڑھنے سے شعر و شاعری کا یہ باریک نکتہ اور اس کی تفصیل واضح ہوئی ہے کہ جو شعر یا شاعری اپنے اندر ہمیشہ کی زندگی کا پیغام رکھتی ہے اس شاعری کی دو ہی صفتیں ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ حضرت جبریل علیہ السلام کے نغمہ

یا وحی کی طرح پاکیزہ ہوتی ہے اور اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن صور پھونک کر مردوں کو جگانے والے اسرافیل فرشتے کی آواز کی طرح مردہ قوموں کو زندہ کرنے' سوئی ہوئی قوموں کو جگانے اور غلام قوموں کو آزادی کا احساس دلانے والی ہوتی ہے۔

رقص و موسیقی

شعر سے روشن ہے جانِ جبرئیل و اہرمن   رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرور انجمن
فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرارِ فن   شعر گویا روحِ موسیقی ہے رقص اس کا بدن

①② **معنی**: **اہرمن**: شیطان۔ **رقص**: ناچ۔ **موسیقی**: راگ۔ **سوز و سرود انجمن**: محفل کی تپش اور کیف۔ **فاش کرنا**: ظاہر کرنا۔ **چینی حکیم**: چین کا ایک مفکر۔ **اسرار فن**: فن کے بھید۔

مطلب: ان دو شعروں میں علامہ نے ناچ اور راگ کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شعر سے' سننے والے میں جبرائیلی جان یا فرشتوں کا سا جذبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے اور اس سے شعر سننے والا شیطانی خصلتوں کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ یہی صورت حال ناچ اور راگ کی ہے کہ اس سے محفل میں تپش بھی پیدا ہو سکتی ہے اور عیش کے جذبات بھی ابھر سکتے ہیں۔ فرق شاعری' رقص اور موسیقی کے مقاصد اور انداز اظہار میں ہے۔ چین کے ایک مفکر نے فن کے بھیدوں کو اس طرح فاش کیا ہے کہ اس کے نزدیک شاعری یا شعر موسیقی کی روح ہے اور رقص اس کا بدن ہے کیونکہ شعر گائیکی کی چیز ہے جس کا بدن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور ناچ کا تعلق بدن کے ساتھ ہے۔ اگر ان دونوں فنون کے بدن اور ان کی روح صحیح ہے تو یہ فنون بھی صحیح ہیں اگر اس کے برعکس ہیں تو دونوں ہی غلط ہیں۔

ضبط

طریقِ اہل دنیا ہے گلہ شکوہ زمانے کا   نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی
یہ نکتہ پیرِ دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا   کہ ہے ضبطِ فغاں شیری' فغاں روباہی و میشی

معنی: **ضبط**: برداشت۔

①② **معنی**: **پیر دانا**: ایک دانشمند بوڑھا۔ **نکتہ**: باریک بات۔ **خلوت**: تنہائی۔ **ضبط فغاں**: فریاد کو برداشت کرنا۔ **روباہی**: لومڑی کی طرح کی مکاری۔ **میشی**: بھیڑ کی طرح کی بزدلی۔

مطلب: جو لوگ دنیادار ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ زمانے کا شکوہ اور شکایت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو درویش لوگ ہیں وہ زمانے کے زخم کھا کر بھی آہ نہیں کرتے اور اسے خدا کی رضا سمجھتے ہوئے اسے برداشت کرتے ہیں۔ مجھے ایک دانشمند بزرگ نے تنہائی میں یہ باریک بات سمجھائی کہ مصیبت کے وقت فریاد کو ضبط کر لینا اور مصیبت پر آہ و فریاد نہ کرنا شیروں کی خصلت ہے اور ایسے موقع پر آہ و فریاد کرنا اور مصیبت کو برداشت نہ کرنا' لومڑی اور بھیڑ کی طرح کی مکاری اور بزدلی ہے۔

رقص

ڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی
د اس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن — صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

ی: رقص: ناچ۔

② معنی: خم و پیچ: بل۔ ضرب کلیم اللہی: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرب۔ صلہ: بدلہ،
وضہ۔ تشنگی کام و دہن: منہ اور حلق کی پیاس۔

طلب: علامہ نے ان دو شعروں میں بتایا ہے کہ رقص (ناچ) دو قسم کا ہے ایک رقص تو وہ ہے جس میں
قص کرنے والے کا جسم تو ناچتا ہے لیکن اس کی روح ساکت رہتی ہے۔ دوسرا رقص (ناچ) وہ ہے جس
ں روح ناچتی ہے اور روح کے ناچنے کی وجہ سے اس کا بدن بھی از خود روح کی حرکات کے تابع ناچتا
ہے۔ اس کو صوفیانہ اصطلاح میں وجد اور تواجد کی کیفیت بھی بتایا جاتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ ایسا رقص
اچ) جس کا تعلق صرف جسم کو بل دینے سے ہے اور جس میں روح دب جاتی ہے ایسے رقص کو تو صرف
رپ والوں کے لئے چھوڑ دے کیونکہ وہاں ہی اسی قسم کا رقص مقبول ہے اور تو اے مرد مسلماں اس
قص (ناچ) کی ریس اور پیروی نہ کر۔ تو اس کے برعکس روح کا رقص اختیار کر کیونکہ اس رقص میں
ضرت موسیٰؑ (جو اللہ سے کلام کرنے کی وجہ سے کلیم اللہ کہلاتے تھے) کے عصا کی چوٹ کا اثر ہے۔ یہ وہ
صا تھا جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زمین پر مارا تو چشمے پھوٹ پڑے۔ دریا کے پانی پر مارا تو دریا کا
نی دو ٹکڑے ہو گیا اور اس نے راہ دے دی۔ جب کہ بدن کے رقص میں کوئی بھی رحمانی صفت نہیں
ے یہ صرف شیطانی صفات کا حامل ہے۔ اس کا نتیجہ رقص کرنے والے کے حلق اور منہ کی پیاس ہے یعنی
ں میں شراب پینے یا جنسیات سے تسکین حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کے مقابلے میں وہ
ص جس میں حضرت موسیٰؑ کے عصا جیسی ضرب ہو اس کا نتیجہ درویشی اور شہنشاہی ہے۔ ایسا رقص
رنے والا عام طور پر وہ درویش ہوتا ہے جو شہنشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

سیاسیاتِ مشرق و مغرب

اشتراکیت

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

معنی: اشتراکیت: کیونزم۔ کارل مارکس یہودی کا دیا ہوا اقتصادی نظام جو دین اور اخلاق سے عاری ہے اور مساوات کے غیر فطری اور غیر انسانی سبق کا حامل ہے۔

① **معنی:** روش: طریقہ۔ بے سود: بے فائدہ۔ روس: یورپ کے ایک ملک کا نام۔ گرمی رفتار: چال میں تیزی یعنی تیز ترقی، جوش بھرا طریقہ کار

مطلب: ایک جرمن یہودی نے جس کا نام کارل مارکس تھا اپنی فکر شیطانی سے دنیا کے سامنے ایک ایسا بے دین اور بے اخلاق سیاسی اور اقتصادی نظام رکھا جو عام طور پر کیونزم (اشتراکیت) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نظام میں سب کچھ سرکاری ملکیت میں لے لیا جاتا ہے اور مزدوروں اور کسانوں کو یہ فریب دے کر کہ اس نظام میں ان کے لئے بہتری ہے انھیں لوٹا جاتا ہے۔ اس شعر میں علامہ اسی پس منظر میں کہتے ہیں کہ کارل مارکس کی اشتراکیت کے جس نظام کو لینن نے بہ جبر روس میں نافذ کیا تھا بعض دوسری قوموں کے طور طریقے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی روس کی ترقی کے اس نئے انداز کو بے فائدہ نہیں سمجھتیں اور اپنے ہاں بھی اس نظام کو رائج کرنے کے لیے تیار ہیں۔

② **معنی:** اندیشہ: انسانوں کے سوچنے کا انداز۔ شوخیِ افکار: خیالات کی شوخی۔ فرسودہ: گھسا پٹا، پرانا۔

مطلب: اشتراکی نظام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی سوچ کا انداز اور ان کے خیالات کے طریقوں نے انہیں شوخی پر مجبور کر دیا ہے اور وہ پرانے سیاسی اور اقتصادی طور طریقوں سے چاہے وہ ان کے لیے فائدہ والے ہی کیوں نہ ہوں اکتائے ہوئے نظر آتے ہیں اور اشتراکی نظام کو اس کی خرابیوں کے باوجود قبول کرنے پر تلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

③ **معنی:** ہوس: شیطانی آرزو۔ بتدریج: آہستہ آہستہ۔ اسرار: سر کی جمع، بھید۔

مطلب: انسانوں نے اپنی جن شیطانی خواہشات کو اخلاق و دین یا کسی اور وجہ سے اپنے سینوں میں دبا رکھا تھا اور وہ ان پر عمل کرنے سے ڈرتے تھے اشتراکی نظام کی ہوس کارانہ حیثیت کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ شیطانی بھید (جو انسان نے اپنے سینے میں چھپا رکھے تھے) اب وہ ان کو آہستہ آہستہ اور تسلسل کے ساتھ عمل میں لا رہے ہیں۔

④ **معنی:** قرآن میں غوطہ زن ہو: قرآن کے معانی و مطالب غور سے اور اچھی طرح سمجھ۔ جدت کردار: عمل کا نیا پن۔

مطلب: اشتراکیت کی خرابیوں کو دیکھ کر علامہ اقبال سوچتے ہیں کہ کہیں مسلمان بھی بعض دوسری

قوموں خصوصاً روس کی طرح اشتراکی نظامِ حکومت کو پسند نہ کرنے لگیں اس لئے وہ انہیں خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم کارل مارکس کی کتاب بنام "سرمایہ" پڑھ کر اس کے ہوس کارانہ اور غیر فطری خیالات سے متاثر نہ ہو جانا بلکہ تمہارے پاس قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آخری الہامی کتاب ہے وہ ایک وسیع سمندر کی طرح ہے اس کے اندر غوطہ لگانا اور جو کچھ اس نے سیاسی اور اقتصادی نظام کے متعلق بتایا ہے اس کو پڑھ کر اس پر عمل کرنا تاکہ اللہ تمہیں عمل کا نیا جذبہ عطا کرے اور تم اشتراکیت کے چنگل میں نہ پھنس جاؤ۔

⑤ **معنی : قل العفو** : قرآن مجید کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے جس کے معنی ہیں۔ "اے نبی ﷺ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ تم کہہ دو قل العفو یعنی تمہاری جائز ضرورتوں سے جو کچھ بھی زیادہ ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو"۔ **پوشیدہ**: چھپی ہوئی۔ **نمودار**: ظاہر۔

مطلب: علامہ نے اس آخری شعر میں مسلمان کو قرآن پڑھ کر نظامِ اقتصادیات کو سمجھنے اور سمجھانے کا جو طریقہ استعمال کیا ہے اس کے لیے **قل العفو** (اپنی جائز ضرورت سے جو کچھ زیادہ ہے خرچ کر دو) کی طرف اشارہ کیا ہے اور امید رکھی ہے کہ شاید اس دور میں غلط نظریات سے تنگ آ کر لوگ صحیح فکر کی تلاش میں قرآن اور اسلام کی طرف رجوع کریں اور اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے جو **قل العفو** والی آیت میں (جس کا ترجمہ اوپر لکھا جا چکا ہے) موجود ہے دنیا کے سامنے اسلامی نظامِ اقتصادیات کا وہ تصور پیش کریں جس نے تقریباً بارہ تیرہ سو سال انسانی فلاح کا کام کیا ہے اور آج ہم انگریزی اور مغربی تہذیب و تمدن اور افکار سیاسیات و اقتصادیات کی بنا پر اسے بھول چکے ہیں اور اشتراکیت جیسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔

کارل مارکس کی آواز

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی، یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش! مریز و کجدار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

تعارف: کارل مارکس (متوفی 1883) ایک جرمن یہودی تھا جس نے مشہور کتاب "سرمایہ" لکھ کر دنیا کو اس اشتراکیت یا کمیونزم کے نظام کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی خرابی کا اظہار علامہ اقبال اس سے پہلے کی نظم "اشتراکیت" میں کر چکے ہیں۔

① **معنی**: **مہرہ بازی**: لفظی معانی ہیں مہروں سے کھیلنا لیکن مراد عیاری اور مکاری ہے۔ **گوارا نہیں**: پسند نہیں۔

مطلب: یہودی کارل مارکس نے جو اشتراکیت کا بانی ہے عہدِ حاضر کے ان سیاسی اور معاشی مفکروں سے خطاب کرتے ہوئے جو سرمایہ داری کے حامی ہیں اور اشتراکیت کے خلاف ہیں کہا ہے کہ میرے نظامِ اشتراکیت کے خلاف اور سرمایہ دارانہ نظام کے حق میں تم جتنی بھی علم کی اور حکمت کی باتیں کرتے ہو یہ

دراصل تمہاری عیاری اور مکاری کی باتیں ہیں اور اس سلسلے میں تم جو بحث و تکرار بھی کرتے ہو وہ دل سے نہیں بلکہ محض اپنی نمود کے لئے کرتے ہو۔ سمجھ رکھو تمہاری یہ مکاری کسی کام نہیں آئے گی کیونکہ دنیا والوں کو اب سرمایہ دارانہ قسم کے پرانے خیالات کی نمائش سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

② **معنی: حکیم معاش:** معاشیات کا مفکر۔ **خطوط خمدار:** ٹیڑھے خط۔ **مریز و کجدار:** لفظی معانی "نہ گرا" اور "ٹیڑھا رکھ"۔ مراد ہے کسی کی جھولی میں سب کچھ ڈالنے کی کوشش کرنا لیکن کچھ نہ ڈالنا۔

مطلب: اے معاشیات کے وہ مفکر جو اشتراکیت کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کر رہا ہے تو نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ سوائے اس کے کیا ہے کہ اس میں کچھ ٹیڑھی لکیریں ہیں اور جو مضمون ہے وہ کچھ اس انداز کو لئے ہوئے ہے کہ کسی کی جھولی میں سب کچھ ڈالنے کا ارادہ ظاہر کرنا لیکن ڈالنا کچھ بھی نہیں۔ یعنی تم اپنی کتابوں میں غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی ہمدردی کا دعویٰ تو کرتے ہو لیکن عملاً ان کے لئے کچھ کرنے کا طریقہ نہ بتاتے ہو نہ نافذ کرتے ہو اس کے مقابلے میں مجھے دیکھو میں نے اپنی کتاب بنام "سرمایہ" میں مزدور کی جھولی کو خالی نہیں رکھا۔

③ **معنی: ہوس کی خونریزیاں:** شیطانی خواہشات کے ایسے ہتھکنڈے جو غریبوں کا خون بہاتے ہیں۔ **عقل عیار:** مکار عقل۔

مطلب: کارل مارکس سرمایہ دارانہ نظام کا پرچار کرنے والوں کو کہتا ہے کہ کیا تم نے یورپ کے بت کدوں، گرجوں اور مدرسوں کو نہیں دیکھا کہ وہاں کے سرمایہ دار لوگ دولت حاصل کرنے کے لیے اور غریبوں اور مزدوروں کا خون چوسنے کے لئے مکار عقل کے ذریعے ایسے ایسے حربے استعمال کرتے ہیں کہ جس سے سرمایہ دارانہ نظام واقعی بھلا معلوم ہوتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ علامہ نے اس سے پہلی نظم بہ عنوان اشتراکیت میں اشتراکی نظام معاش کی برائی دکھائی تھی اور زیر بحث نظم میں کارل مارکس کے خیالات کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں اور مکاریوں کو ظاہر کیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ نہ کارل مارکس کا اشتراکی نظام انسان کی بھلائی کے لئے ہے اور نہ یورپ والوں کا سرمایہ دارانہ نظام۔ اگر کوئی نظام امیر و غریب کے تفرقے اور چپقلش کو ختم کرتا ہے اور ہر چھوٹے بڑے طبقہ کی بھلائی کا علم بردار ہے تو وہ صرف قرآن اور اسلام کا معاشی نظام ہے۔

انقلاب

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات — خودی کی موت ہے یہ، اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا — قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

معنی: انقلاب: تبدیلی۔

① **معنی: سوز و سازِ حیات:** زندگی میں عشق کی حرارت اور اس کی کیفیات کا لطف۔ **ضمیر:** دل یا انسان کا باطن۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں میں نے ایشیا کے ملکوں کو بھی دیکھا ہے اور یورپ کے ملکوں میں بھی پھرا ہوں

دونوں جگہ مجھے تو کسی کی زندگی میں عشق کی حرارت اور اس کی کیفیات کا لطف نظر نہیں آیا۔ میں نے ایشیا میں دیکھا ہے کہ لوگ غلامی کی وجہ سے اپنی شناخت اور معرفت (خودی) پر موت طاری کر چکے ہیں۔ یورپ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ آزاد تو ہیں لیکن ان کی مادر پدر آزادی کی بنا پر ان کے دل مردہ اور ان کے باطن سیاہ ہو چکے ہیں اور ہر طرف بے دینی اور خدا نا آشنائی کا دور دورہ ہے۔ ان حالات میں زندگی کے سوز و ساز کی نہ ایشیا والوں سے کوئی امید رکھی جا سکتی ہے اور نہ یورپ والوں سے۔

② **معنی**: ولولہ انقلاب: تبدیلی کا جوش۔ جہان پیر: بوڑھا جہان یعنی پرانی دنیا۔

مطلب: ایشیا اور یورپ میں سوز و ساز حیات کے نہ ہونے کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے کہ زندگی کی صحیح منزل پر پہنچنے والے لوگوں کے دلوں میں تبدیلی کا ایک جوش پیدا ہو رہا ہے اور وہ ایک نئے جہان کی پیدائش کی امید رکھے ہوئے ہیں جس سے کہ اس پرانی دنیا کی موت یقینی ہے۔ (یہ جہاں جس کی اقبال بات کرتے ہیں سنگ و خشت کا نہیں افکار و خیالات کا جہاں ہے) معلوم ہوتا ہے لوگ پھر سے سوز و ساز زندگی کی تلاش میں نکلنے کے لیے بے تاب ہیں۔ یہ سرمایہ حیات انہیں نہ اشتراکی نظام میں ملے گا اور نہ سرمایہ کارانہ نظام میں بلکہ خدا کے نظام میں ملے گا جس کا دوسرا نام اسلام ہے اور یہی حقیقی انقلاب ہو گا جس میں یورپ اور ایشیا دونوں جگہوں کے لوگوں کی فلاح کا سامان موجود ہو گا۔

خوشامد

میں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ، ولیکن ارباب نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز

کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد دستور نیا اور نئے دور کا آغاز

معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت کہہ دے کوئی اُلّو کو اگر رات کا شہباز

معنی: خوشامد: چاپلوسی۔

① **معنی**: کارجہاں: جہان کے کام۔ ارباب نظر: اہل نظر۔

مطلب: اس نظم میں عام خوشامد کی بات نہیں ہے بلکہ سیاسی خوشامدیوں کی بات کی ہے۔ جب انگریز نے برصغیر کے باشندوں کی رائے کے ذریعے صوبائی اور مرکزی اسمبلیاں منتخب کرائیں تو بطور رکن کامیاب ہونے پر بیشتر اشخاص انگریزی حکومت کی خوشامد کرنے لگے کہ ہمیں وزیر بنایا جائے یا کوئی اور مرتبہ دیا جائے۔ یہ نظم اس پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ پہلے شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ ان سیاست دانوں اور وزارت کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والوں کی طرح اگرچہ میں دنیا اور اس کے کاروبار کو اچھی طرح نہیں جانتا لیکن صاحب نظر ہونے کے اعتبار سے کار جہاں کے اور ان لوگوں کے ارادوں کے چھپے ہوئے راز مجھ پر ظاہر ہیں اور میں یہ جانتا ہوں کہ یہ کیوں حاکموں کی خوشامد کر رہے ہیں۔

② **معنی**: دستور: آئین۔ دور: زمانہ۔

مطلب: جب اپنے انگریز آقاؤں کی خوشامد کر کے اسمبلیوں کے بعض رکن وزیر بن گئے تو ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو اپنا دنیاوی کام نکالنے کے لیے ان وزیروں کی خوشامد میں لگ گئے۔ اس شعر میں علامہ

نے طنز کے طور پر کہا ہے کہ اے شخص تجھے بھی اگر دنیا میں کامیاب ہونا ہے تو تو بھی ان وزیروں کی خوشامد کر کیونکہ اب نیا آئین نافذ ہونے کی وجہ سے ایک نئے زمانے کا آغاز ہو گیا ہے جہاں کام خوشامد سے نکالے جاتے ہیں اور اہل اور نااہل میں تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔

معانی: الو: ایک پرندہ جو رات کو باہر نکلتا ہے، **شہباز**: بڑا باز، **خوشامد**: چاپلوسی۔

③ **مطلب**: اس شعر میں بھی خوشامد کی اصلیت کو طنزیہ پیرائے میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی شخص الو کو (جو بے وقوف بھی سمجھا جاتا ہے اور رات کے اندھیرے میں باہر نکلتا ہے) رات کا شہباز (بہت بلند پرواز، بے نیاز اور درویش طبع جانور) کہہ دے تو کیا یہ خوشامد ہو گی یا کچھ اور۔ حقیقت میں یہی خوشامد ہے کہ لوگ اپنا کام نکالنے کے لئے الوؤں کو شہباز کا درجہ دے دیتے ہیں اور یہ بات آج کے سیاسی دور میں تو عروج پر ہے۔

مناصب

ہوا ہے بندۂ مومن فسونیِ افرنگ — اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب — کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک
مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی — سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعتِ چالاک
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے — خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک

معنی: مناصب: منصب کی جمع۔ عہدے۔

① **معنی: فسونی فرنگ**: جس پر فرنگیوں کا جادو چل چکا ہے۔ **قلندر**: بے نیاز درویش۔ **نمناک**: آنسوؤں سے بھری ہوئی۔

مطلب: اس نظم میں برصغیر کے اس دور کا ذکر ہے جب یہاں فرنگیوں (انگریزوں) کی حکومت تھی لیکن اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آج کے آزاد پاکستان کے لوگوں پر بھی صادق آتا ہے بلکہ اس سے زیادہ شرمناک حد تک صادق آ رہا ہے۔ پہلے شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ بندۂ مومن (پختہ ایمان رکھنے والا مسلمان) آج اپنے مفادات اور ذاتی اغراض کے لیے ایمان کو بیچ کر انگریزوں کے جادو کا شکار ہو گیا ہے اور عہدوں اور ملازمتوں کے لالچ میں اپنی خودداری بیچ چکا ہے۔ یہ بات دیکھ کر مجھ جیسے (قلندر) بے نیاز درویش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔

② **مطلب**: پہلے مصرعے سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ شاعر نے خدا کے عہدۂ بلند ہونے کی خیر مانگی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلوب کو چھوڑ کر اگر معنی پر غور کریں تو یہ ایک طنزیہ دعا ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے انگریز کی خوشامد کر کے بڑے عہدے حاصل کر لئے ہیں۔ علامہ طنزیہ طور پر کہتے ہیں کہ اہلیت سے قطع نظر خوشامد کر کے اور دوسرے ذرائع استعمال کر کے تم نے جو بڑے عہدے حاصل کر لئے ہیں اب خدا تمہارے ان عہدوں کی خیر رکھے کیونکہ تم نے یہ عہدے بہت بڑی قیمت ادا کر کے لئے ہیں اور وہ قیمت یہ ہے کہ تم نے ایمان کو بھی پیش نظر نہیں رکھا اور اپنی خود آگاہی اور خودشناسی کی صفت کو بھی موت کی نیند سلایا ہے، پھر جا کر تمہیں یہ عہدے حاصل ہوئے ہیں۔

③ ④ **معنی: طبیعت چالاک**: چالاک طبیعت۔ **شریک حکم کرنا**: حکومت میں شریک کرنا۔ **جوہر ادراک**: عقل اور دانش کا جوہر۔

مطلب: ہر چالاک طبیعت رکھنے والے اور بیدار مغز شخص کی نگاہ سے یہ بات چھپائے بھی چھپ نہیں سکتی اور اس پر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انگریزوں نے برصغیر کی غلام قوم کو حکومت میں محض اپنی حکمت کے کل پرزوں کے طور پر استعمال کرنے کے لیے شریک کیا ہے اور ان کے ایمان اور ان کی خودی کے عوض عہدے دے کر ان کی عقل اور دانش کے موتی خریدے ہیں یعنی ان کے دل و دماغ سے اپنی حکومت کی مشینری کو چلانے کا کام لیا ہے۔

یورپ اور یہود

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت — دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے — یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جوانمرگ — شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

① **معنی: عیش فراواں**: بہت زیادہ عیش و عشرت۔ **محروم تسلی**: اطمینان سے بے بہرہ۔

مطلب: ایک وقت تھا جب عیسائیوں اور یہودیوں میں بہت بعد اور دشمنی تھی لیکن مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ کرنے کے لئے عیسائیوں نے دشمنی کو چھوڑ کر یہودیوں کے لئے دل کو نرم کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ہزاروں سال سے غلام اور خدا کے غضب کی ماری ہوئی قوم اپنی چالاکی اور مکاری سے سارے یورپ پر اس طرح چھا گئی ہے کہ بظاہر وہاں عیسائی حکمران ہیں لیکن حقیقت میں ہر کام کی باگ ڈور یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ جدید ترقی کی وجہ سے اگرچہ سارے یورپ میں عیش و عشرت کی فراوانی ہے۔ یورپی اقوام دوسری قوموں پر حکومت بھی کر رہی ہیں اور دنیا کی ساری تجارت بھی ان کے ہاتھ میں ہے لیکن اہل یورپ کے سینے ایمان، صداقت اور انسانیت کے نور سے محروم ہو چکے ہیں اور باوجود ساری ترقی اور ہر قسم کی سہولت کے ان کے دل اطمینان سے محروم ہیں۔

② **معنی: افرنگ**: یورپی اقوام۔ **وادی ایمن**: وہ وادی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی تجلی نصیب ہوئی تھی۔

مطلب: جب سے یورپ والوں کو بھاپ کی طاقت کا علم ہوا ہے انہوں نے اپنے ملکوں میں ہر طرف اور ہر طرح کے کارخانے لگا لئے ہیں جن کی مشینیں کوئلے سے بننے والی بھاپ کے ذریعے چلتی ہیں اور ان کارخانوں کی چمنیوں سے جو دھواں نکلتا ہے اس نے یورپ کے ملکوں کے بیشتر شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس تناظر میں علامہ کہتے ہیں کہ یورپ والے جو دھوئیں کی تاریکی کے ساتھ ساتھ دل اور سینے کی تاریکی میں بھی ڈوب چکے ہیں ان کے ملک اس قابل نہیں رہے کہ وہاں اس تجلی کا ظہور ہو جو وادی سینا میں حضرت موسیٰ پر ہوا تھا۔ مراد یہ ہے کہ اہل یورپ خدا سے اور دین سے دور ہو چکے ہیں اور صرف مادی ترقی کے پیچھے لگ گئے ہیں۔

③ **معنی: نزع کی حالت:** مرنے کے قریب۔ **تہذیب جوانمرگ:** جوانی ہی میں مرجانے والی تہذیب۔ **کلیسا:** گرجا۔ **متولی:** نگران' محافظ' انتظام کرنے والے۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ یورپ کی تہذیب اپنے جوانی ہی کے عالم میں مرنے کے قریب پہنچ گئی ہے۔ عیسائیوں اور ان کے مذہب کی اصلیت اس تہذیب کی وجہ سے ختم ہو چکی ہے اور صرف گرجے عیسائی مذہب کی نشان دہی کے لیے باقی موجود ہیں۔ اور جس تیزی سے۔ یہودی باوجود اقلیت ہونے کے اپنی چالاکی' عیاری' مکاری اور دولت کے بل بوتے پر پورے یورپ پر چھا رہے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ عیسائیوں کے گرجوں کو بھی خرید لیں اور اس طرح عیسائی قوم ایک مادہ پرست قوم کی حیثیت سے تو زندہ رہے لیکن عیسائیت کی اصلیت کے اعتبار سے مرجائے۔ اقبال کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہو چکی ہے یہودی نہ صرف سارے یورپ کی تجارت اور حکومت پر چھا چکے ہیں بلکہ امریکی ممالک میں بھی تجارت اور حکومت کی اصل باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے۔ عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کے ساتھ یہ گٹھ جوڑ بہت مہنگا پڑا ہے اور وہ مسلمانوں کو تباہ کرانے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی یہودیوں کے ہاتھوں تباہ کرا چکے ہیں۔

نفسیات غلامی

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی' حکما بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند — تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

① **مطلب:** علامہ نے اس نظم میں غلاموں کی اس ذہنیت کی بات کی ہے جو غلامی کے دور کی وجہ سے ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں ان کے نزدیک برصغیر کے لوگوں کی وہ غلامی ہے جو انگریزی حکومت کے زمانے میں تھی۔ اپنے پہلے شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ غلامی کے زمانے میں غلام قوموں میں شاعر بھی پیدا ہوتے ہیں اور علما اور مفکر بھی لیکن ان کی شاعری' ان کے علم اور ان کی حکمت کا مقصود وہ نہیں ہوتا جو ان جیسے آزاد قوموں کے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ان کا جو مقصد ہوتا ہے اسے اقبال نے اگلے دو شعروں میں بیان کیا ہے۔

②③ **معنی: شرح معانی:** معانوں کی وضاحت کرنا۔ **یگانہ:** بے مثل اور یکتا۔ **رم آہو:** ہرنوں کی طرح بھاگ جانا' بزدلی اور کمزوری۔ **شیری کا فسانہ:** شیروں کی کہانی' بہادری۔

مطلب: غلام قوموں میں' جیسا کہ پہلے شعر میں کہا گیا ہے' شاعر بھی پیدا ہوتے ہیں اور عالم اور حکیم بھی اور ان میں ہر کوئی اپنے علم کی شرح کرنے میں درجہ کمال پر بھی پہنچا ہوا ہوتا ہے اور اپنے اپنے میدان میں یکتا اور بے مثل بھی ہوتا ہے لیکن اللہ کے ان بندوں کا صرف ایک کام ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اپنی شاعری' اپنے علم اور اپنی حکمت کے ذریعے اپنی قوم کے شیروں کو ہرنوں کی طرح بزدلی سے بھاگنا سکھا دیں

اور یہ کام اس حد تک سرانجام دیں کہ نہ شیر باقی رہے اور نہ ان کی شیری کی کہانیاں باقی رہیں۔ سب کو ہرنوں کی طرح کا بزدل بنا دیا جائے۔ مراد ہے کہ بہادری کا سبق دینے کی بجائے اپنی قوم کے لوگوں کو بزدلی کا درس دیا جائے تاکہ وہ غلامی میں اور زیادہ پختہ ہو جائیں۔

④ معنی: تاویلِ مسائل: مسئلوں کے اصل معانی کو چھوڑ کر اپنے معانی پیدا کرنا۔

مطلب: غلام قوموں کے علما، حکما، شاعر اور دوسرے ہنرمند اور فنکار یعنی دینی فنی اور علمی قسم کے مسئلوں کے من گھڑت معنی پیدا کرتے ہیں اور ان غلط معانی کو بہانہ بنا کر اپنی قوم کے غلام لوگوں کو غلامی قبول کرنے پر مزید رضامند کرتے ہیں اور یہ سب کچھ وہ اپنے مفادات و اغراض کے پیش نظر اور اپنے حکمران آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ علامہ نے اسی رویے اور مزاج کو غلامی کی ذہنیت (نفسیاتِ غلامی) کہا ہے۔

بلشویک روس

روش قضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب ۔ خبر نہیں کہ ضمیرِ جہاں میں ہے کیا بات
ہوئے ہیں کسرِ چلیپا کے واسطے مامور ۔ وہی کہ حفظِ چلیپا کو جانتے تھے نجات
وحی یہ دہریتِ روس پر ہوئی نازل ۔ کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

معنی: بلشویک روس: کمیونسٹ روس۔ وہ روس جس میں کارل مارکس یہودی کا نظامِ اشتراکیت نافذ ہے۔

① معنی: روش: طریقہ۔ قضائے الٰہی: اللہ کی طرف سے قضا و قدر۔ ضمیرِ جہاں: جہاں کا دل۔

مطلب: قضا و قدر (جو اللہ کی جانب سے ہوتی ہے) کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جہان کے دل میں کیا بات پوشیدہ ہے اور اس نے روس کو کس باطنی مقصد کے تحت بلشویک یا کیمونسٹ یا اشتراکی ملک بنا دیا ہے۔

② معنی: چلیپا: سولی، صلیب، عیسائیت کی علامت۔ حفظِ چلیپا: صلیب کی حفاظت۔ نجات: چھٹکارا۔ کسرِ چلیپا: صلیب کو ختم کرنا، عیسائیت کو ختم کرنا۔ مامور ہوئے ہیں: مقرر ہوئے ہیں۔

مطلب: یوں تو یورپ کے سارے ممالک اور ان کے عیسائی اسلام کے مخالف رہے ہیں لیکن روس کے بادشاہ جو زار کہلاتے تھے عیسائیت کی حفاظت اور مسلمانوں کی دشمنی میں پیش پیش تھے لیکن قضا و قدر نے دیکھئے کیا کیا کہ روس کے ان عیسائیوں کو جو صلیب کی حفاظت کو اپنی دنیا اور آخرت کے لئے چھٹکارے کا باعث سمجھتے تھے۔ قضا و قدر نے ان کو ہی صلیب (عیسائیت) کے مٹانے پر مقرر کر دیا ہے کیونکہ جس اشتراکیت (کیمونزم) کو روسیوں نے اپنے ملک میں نافذ کیا ہے اس کی بنیاد بے دینی، لامذہبیت اور لا خدا پر ہے۔

③ معنی: وحی: اللہ کا پیغام۔ دہریت: بے دینی۔ کلیسائیوں کے لات و منات: گرجا والوں کے یعنی عیسائیوں کے گرجوں میں رکھے ہوئے بت۔ حضرت عیسیٰؑ اور مریم کے بت بھی گرجوں میں اسی طرح ہوتے ہیں جس طرح کبھی کعبے میں لات اور منات نامی بت رکھے ہوئے تھے۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے روس کے ملک پر اشتراکیت (کمیونزم) کی شکل میں بے دینی اور لاخدا کا جو پیغام اترا ہے اس نے گرجا والوں کے بت توڑ دیئے ہیں اور ہر طرف دہریت (لامذہبیت) کا دور دورہ ہو گیا ہے۔ قضا و قدر کا شاید روس میں کمیونزم نافذ کرنے کا یہی مقصد ہو۔

آج اور کل

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

معنی: آج اور کل: زمانہ حال اور مستقبل۔

①② **معنی:** **غم و عیش:** غم اور خوشی۔ **خود افروز:** خود ترقی کرنے والا۔ **جگر سوز:** جگر جلانے والے یعنی سخت محنت کرنے والا۔ **لائق ہنگامہ فردا:** مستقبل کے ہنگاموں کے لائق۔ **تقدیر:** قسمت۔ **امروز:** آج یعنی زمانہ حال۔

مطلب: ان دو شعروں کی مختصر سی نظم میں علامہ نے یہ بتایا ہے کہ مستقبل کی عظمت کا وہ حق دار ہے جس کا زمانہ حال درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ شخص مستقبل کے غم اور خوشی پر کوئی حق نہیں رکھتا جس نے زمانہ حال میں اپنی قابلیت کے جوہر نہ دکھائے ہوں اور جگر نہ جلایا ہو یعنی دل سوزی سے محنت نہ کی ہو۔ فرد کی طرح یہ بات جماعت یا قوم پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ قوم بھی مستقبل کے ہنگاموں میں شریک ہونے کے لائق نہیں ہے جس کی قسمت میں آج یا زمانہ حال کی جدوجہد اور محنت نہیں ہے۔ یعنی صرف وہ فرد یا قوم آئندہ کی باگ ڈور سنبھالنے کے لائق ہوتی ہے جس نے زمانہ حال کو بے کار نہ گذارا ہو اور خوب محنت کی ہو۔

مشرق

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

① **معنی:** **نوا:** آواز یعنی شاعری۔ **گریبان لالہ:** سرخ رنگ کے لالے کے پھول کا گریبان۔ **چاک ہوا:** پھٹ گیا۔ **نسیم صبح:** صبح کی نرم اور لطیف ہوا۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ میری آواز سے لالہ کے پھولوں کے گریبان چاک ہو گئے ہیں یعنی میری آواز اور میرے پیغام پر کان دھرنے والے بہت سے عاشق پیدا ہو گئے ہیں لیکن دوسری طرف صبح کی نرم و لطیف ہوا ابھی کسی باغ کی تلاش میں ہے کہ وہاں جائے اور کسی غنچے کو کھلائے یا کسی لالہ کے پھول کا دامن چاک کرے۔ مراد یہ ہے کہ میرے سوا اور لوگ میرے کام میں شریک نہیں ہیں اور اہل مشرق کو

خصوصاً مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے نہیں جگا رہے۔

② **معنی : مصطفیٰ**: جدید ترکی کا بانی جس کا پورا نام مصطفیٰ کمال پاشا ہے۔ **رضا شاہ**: جدید ایران کا بادشاہ۔ **نمود**: ظہور۔ **روح شرق**: مشرق کی روح۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ مجھے ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا اور ایران کے رضا شاہ پہلوی سے امید تھی کہ وہ میری طرح لوگوں میں سوز پیدا کر کے مشرق کی قسمت بدلیں گے لیکن افسوس ہے اس بات کا ظہور ان میں نہیں ہوا اور مشرق کی روح ابھی کسی ایسے جسم کی تلاش میں ہے جس میں داخل ہو کر وہ اپنا مقصد حاصل کر سکے یعنی ابھی تک مشرق میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آ رہا جو میری شاعری کو حقیقت کا روپ دے کر اہل مشرق کو عروج کی اس منزل پر لے جا سکے جس کا میں خواہش مند ہوں۔

③ **معنی : مستحق**: لائق، قابل۔ **دار و رسن**: سولی اور رسی یعنی موت کا سامان۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری میں خودی کا درس دے کر جس طرح مشرق کے لوگوں کو جگانا چاہا تھا وہ کام تو نہ ہو سکا البتہ اس کے برعکس مشرق کے دشمنوں نے چاہے وہ خود مشرق کے اندر ہوں یا مغرب میں ہوں میری خودی کو اور اس کے پیغام کو قبول کرنے کی بجائے اسے سزا دینے کے لائق سمجھا ہوا ہے اور وہ میری خودی کے پیغام کو موت کی نیند سلانے کے لئے موت کے ساز و سامان کی تلاش میں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں نے میری خودی کے پیغام کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور اس ناسمجھی کے سبب میرے اور میرے پیغام کے خلاف ہیں اور جو کچھ میں کہتا ہوں اسی لئے اس کے الٹ ہو رہا ہے۔

سیاست افرنگ

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

معنی: **سیاست افرنگ**: اہل مغرب کی سیاست۔

① **معنی**: **حریف**: بدمقابل۔ **رئیس**: دولت مند۔

مطلب: یا اللہ یہ عجیب بات ہے کہ اہل مغرب اپنی سیاست کو تیرا یعنی تیرے دیئے ہوئے سیاسی نظام کا مدمقابل سمجھتے ہیں اور تیری قدرتوں کی طرح اپنی سیاست کو بھی قادر سمجھتے ہیں اور اس کے ذریعے وہ جو چاہتے ہیں دنیا میں کرتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ تجھے پوجنے والے تو امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی ہوتے ہیں لیکن فرنگی سیاست کے پجاری سب کے سب امیر ہوتے ہیں جو غریبوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتے۔

② **معنی**: **ابلیس**: شیطان۔ **دو صد ہزار**: دو سو ہزار یعنی بہت زیادہ۔

مطلب: اے خدا تو نے تو صرف ایک شیطان پیدا کیا تھا جس کا جسم آگ کا بنا ہوا تھا لیکن اہل مغرب کی سیاست نے ہزاروں خاکی ابلیس (یعنی آدمیوں کے ابلیس) پیدا کر دیئے ہیں۔ جہاں جہاں بھی ان کی سیاست پہنچی ہے، اس نے شیطنت اور شیطان کو عام کر دیا ہے۔

خواجگی

دور حاضر ہے حقیقت میں وہی عہد قدیم ۔۔۔ اہل سجادہ ہیں یا اہل سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور ۔۔۔ سیکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی ۔۔۔ پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

معنی: خواجگی: خواجہ ہونا یعنی کسی کو اپنا مالک بنانا۔ آقائی۔

① **معنی: عہد قدیم:** پرانا زمانہ۔ **اہل سجدہ:** پیری کی گدیوں کے مالک۔

مطلب: جہاں تک لوگوں کے ذہن و قلب اور جسم و روح پر حکمرانی یا آقائی کا تعلق ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ اس میں پرانے اور نئے زمانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پرانے زمانے کی طرح آج کے زمانے میں بھی دراصل لوگوں پر وہی لوگ حکومت کر رہے ہیں (چاہے مادی طور پر اور چاہے روحانی طور پر) جو پیری کی بڑی بڑی گدیوں کے مالک ہیں یا سیاسی میدان کے پیشوا ہیں۔

② **معنی: میری:** امیری۔ **خوگر:** عادی۔

مطلب: یہ جو گدیوں کے مالک یا سیاسی وڈیرے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں اس میں نہ تو پیروں کا کوئی اعجاز ہے اور نہ امیروں کی کسی طاقت کا کرشمہ ہے بلکہ بات یہ ہے کہ خود لوگ ہی سینکڑوں سالوں سے غلامی کے عادی ہیں۔ اس وجہ سے پیروں، امیروں اور وڈیروں کے لئے ان پر حکومت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ جب تک عوام میں آزادی کا شعور پیدا نہیں ہو گا یہ لوگ ان کے آقا بن کر ان پر اسی طرح چھائے رہیں گے۔

③ **معنی: خوئے غلامی:** غلامی کی عادت۔ **پختہ ہونا:** پکا ہونا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے غلامی اور آقائی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب غلام لوگ غلامی کی عادت میں پکے ہو جائیں اور غلامی کا مزہ ان کی رگ رگ میں بس جائے تو پھر ایسے لوگوں پر آقائی کرنا ان پر حکمرانی کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔

غلاموں کے لیے

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے ۔۔۔ ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو ۔۔۔ ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں ۔۔۔ ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

① **معنی: حکمت مشرق و مغرب:** مشرق اور مغرب کی فکر یا فلسفہ۔ **نکتہ:** باریک بات۔ **اکسیر:** تانبے یا مٹی کو سونا بنانا، مراد فائدہ مند ہونا۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ میں نے مشرق اور مغرب کے فلسفہ اور فکر پر غور کیا ہے مجھے تو اس سب کچھ

سے صرف ایک باریک بات ہاتھ آئی ہے جو غلاموں کے لیے وہی کام کر سکتی ہے جو کام تانبے کو سونا بنانے کے لیے کوئی اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ باریک بات کیا ہے اس کا ذکر اگلے شعروں میں آتا ہے۔

② **معنی**: **دین**: مذہب۔ **فلسفہ**: فکر۔ **فقر**: درویشی۔ **سلطانی**: شاہی۔ **پختہ عقائد**: پکے عقیدے یا پکا یقین اور ایمان۔ **بنا پر تعمیر ہوتے ہیں**: بنیاد پر بنائے جاتے ہیں۔

مطلب: وہ باریک بات جو غلاموں کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کر سکتی ہے اس کی بنیاد آزادی پر غلاموں کے پختہ یقین پر ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ مذہب ہو' یا فلسفہ ہو درویشی ہو یا شاہی ہو ان سب کی عمارتیں ایمان اور یقین کے پکے ہونے پر رکھی گئی ہیں۔ جب تک یقین اور ایمان پکا نہ ہو یہ عمارتیں تعمیر نہیں ہو سکتیں۔

③ **معنی**: **حرف**: بات۔ **زار و زبوں**: ذلیل و خوار۔ **تہی**: خالی۔ **ضمیر**: دل۔

مطلب: جس قوم کا دل پکے عقائد یا یقین اور ایمان سے خالی ہوتا ہے اس قوم کی بات بغیر سوز کے' اور اس قوم کا عمل ذلیل و خوار یعنی بے نتیجہ ہوتا ہے۔ نظم کے تینوں شعروں کا بنیادی مضمون یہی ہے کہ چاہے زندگی کا کوئی میدان کیوں نہ ہو یقین اور ایمان کا پختہ ہونا ضروری ہے اگر کوئی غلام فرد یا غلام قوم بھی آزادی کا پختہ یقین اپنے اندر پیدا کر لے تو وہ بھی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے۔

اہل مصر سے

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو — وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم
دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم — ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی — کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے، کبھی چوبِ کلیمؑ

① **معنی**: **ابو الہول**: ملک مصر میں دارالحکومت قاہرہ کے نزدیک صحرا میں جہاں فرعونوں کے اہرام (مقبرے) بنے ہوئے ہیں۔ ان کے قریب کی چٹان کو تراش کر ایک بہت بڑا بت بنایا ہوا ہے جس کا دھڑ شیر کا ہے اور چہرہ آدمی کا۔ **صاحب اسرار قدیم**: پرانے بھیدوں کا مالک۔ **نکتہ**: باریک بات۔

مطلب: ظاہر ہے کہ بت تو بے زبان ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے شاعرانہ خیال سے یہ بات بتائی ہے کہ جب میں نے ابوالہول کو دیکھا جو پرانے بھیدوں کا مالک ہے (یعنی صدیوں سے قائم ہے اور اس نے بہت سے زمانے دیکھے ہیں) اس نے خود مجھے یہ باریک بات بتائی ہے۔ اس باریک بات کا ذکر اگلے شعر میں ہے۔

② **معنی**: **دفعتہً**: اچانک۔ **تقدیر امم**: امتوں کی قسمت۔ **حریف**: مدمقابل۔ **عقل حکیم**: فلسفی کا فکر۔

مطلب: وہ نکتہ یا باریک بات یہ ہے کہ جس چیز سے امتوں کی قسمت فوراً بدل جاتی ہے وہ چیز قوت یا طاقت ہے جس کی مدمقابل فلسفی کی فکر بھی نہیں ہو سکتی۔ فلسفی اچھی باتیں تو ضرور کرتا رہے گا لیکن تقدیر کے بدلنے کے لیے صرف باتیں نہیں عمل بھی چاہیے اور اس معاملے میں عمل' طاقت ہے البتہ طاقت

ں قسم کی ہو یہ جواب طلب بات ہے۔ اس کا جواب اگلے شعر میں موجود ہے۔

(معنی: دگرگوں: مختلف۔ شمشیر محمدؐ: نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تلوار۔ چوب
یم: حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی لکڑی یعنی عصا۔

طلب: جس قوت کا دوسرے شعر میں ذکر کیا ہے متعلق علامہ کہتے ہیں کہ ہر زمانے میں موقع و
ں کے مطابق اور حالات و واقعات کے پیش نظر اس کا مزاج یعنی صورت بدلتی رہتی ہے۔ جب ایسے
ات پیدا ہو جائیں جو کفار مکہ نے بانی اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے پیدا کر دیے تھے تو پھر
یؐ تلوار کی طاقت کی ضرورت ہے یعنی ایسی تلوار جو انصاف اور حق کو قائم کرنے کے لئے چلائی جائے
ہ ظلم اور بربریت کے لئے۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں جو فرعون مصر نے بنی اسرائیل (جن کے
ر اس وقت حضرت موسیٰؑ تھے) کے لئے پیدا کر دیے تھے تو پھر طاقت تلوار کا نام نہیں عصائے موسیٰؑ کا
ہے جس کے ذریعے اور جس کے معجزات سے بنی اسرائیل کی قسمت بدل گئی اور فرعون غرق دریا ہو
یا۔

ابی سینیا

(18 اگست 1935ء)

پ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
ذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش
ے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیر کلیسیا یہ حقیقت ہے دلخراش

عارف: ابی سینیا یہ شمالی افریقہ کا ایک ملک ہے جس کا جدید نام ایتھوپیا اور قدیم نام حبشہ ہے۔

(معنی: کرگس: گدھ۔ زہرناک: زہر بھری۔ مردۂ دیرینہ: پرانا مردہ۔ قاش قاش: ٹکڑے ٹکڑے۔

طلب: مسلمانوں نے اس احسان کے بدلے میں کہ ابتدائی زمانے میں ہجرت کر کے حبشہ پہنچنے والے
سلمانوں کو حبشہ کے بادشاہ نے پناہ دی تھی اور ان کی حفاظت کی تھی، حبشہ پر اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں
لہ نہیں کیا حالانکہ انہوں نے شمالی افریقہ کے سارے ملکوں کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے
ک فتح کر لیا لیکن 1935 میں اس وقت کے اٹلی (جس میں عیسائیوں کا پیشوا پاپائے روم بھی رہتا ہے) کے
مر مطلق مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر دیا حالانکہ وہ ایک عیسائی ملک تھا اور بادشاہ بھی وہاں کا عیسائی تھا۔ یہ
ت اقبال کو سخت ناگوار گزری جس سے متاثر ہو کر اس نے ابی سینیا کے عنوان سے یہ نظم لکھی اور پہلے
شعر میں یہ کہا کہ یورپ کے گدھوں کو ابھی تک یہ خبر نہیں ہے کہ جس ابی سینیا کی لاش کا گوشت کھا کر وہ

اپنا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں وہ لاش کتنی زہر سے بھری ہوئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسولینی کے حملے سے ابی سینیا ک
ملک فتح ہو کر ایک مردہ لاش کی طرح ہو جائے گا اور یہ دنیا کا سب سے پرانی بادشاہت رکھنے والا ملک
ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا لیکن اس کے گوشت کے زہر سے یورپ کے گدھ بھی نہیں بچیں گے۔
چنانچہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں اٹلی اور مسولینی کا برا حال ہوا۔ مسولینی کو ت
خود کشی کرنا پڑی لیکن ابی سینیا جوں کا توں قائم ہے اگرچہ اس میں سے پرانی بادشاہت ختم ہو چکی ہے اور
جمہوری طرز کی حکومت آگئی ہے۔

② **معنی**: **غارت گری**: لوٹ مار۔ **معاش**: روزی۔ **گرگ**: بھیڑیا۔ **برۂ معصوم**: معصوم بھیڑ بچہ۔

مطلب: یورپ والوں کا صدیوں سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ دوسرے کمزور ملکوں کو فتح کر کے وہاں کے لوگوں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتے ہیں اور وہاں کے مالی اور مادی وسائل کو اپنے لئے استعمال کر کے اپن قوم کی روزی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ظاہر میں تو یہ یورپی قومیں یہ کہتی ہیں کہ ہماری تہذیب عروج پر ہے اس لیۓ ہم دوسرے ممالک کو فتح کر کے وہاں اپنی تہذیب لے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگ بھی مہذب ہو جائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے پردے میں وہ کمزور قوموں کو لوٹتے ہیں اس لئے ان کی تہذیب کو شرافت ک کمال نہیں زوال کہنا چاہیے۔ ان میں سے ہر قوم کی مثال ایک ظالم بھیڑیے کی مانند ہے جو کسی نہ کسی بے گناہ بھیڑ کے بچے کو (یعنی کمزور ملک کو) کھا جانے کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہی کام مسولینی نے ظالم بھیڑیے کی طرح ابی سینیا کی معصوم بھیڑ کے ساتھ کیا ہے۔

③ **معنی**: **اے وائے**: افسوس ہے۔ **آبروئے کلیسا کا آئینہ**: گرجا یا عیسائیت کی عزت کا آئینہ۔ **روما**: ملک روم یا اٹلی۔ **پاش پاش**: ٹکڑے ٹکڑے۔ **پیرِ کلیسا**: گرجے کا بزرگ 'پاپائے روم۔ **دل خراش**: دل میں زخم کرنے والی۔

مطلب: افسوس تو اس بات پر ہے کہ مسلمانوں نے تو صدیوں کے عروج میں ابی سینیا کو چھیڑا تک نہیں لیکن خود عیسائیوں نے (عیسائی بھی ایسے ملک کے جہاں عیسائیوں کا سربراہ پاپائے روم رہتا ہے) اس ملک پر جو کہ عیسائی ملک ہے' پر حملہ کر کے عیسائیت کی عزت کے شیشے کو سرِعام ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اے عیسائیوں کے سربراہ (جو تو خود ملک روم یا اٹلی میں رہتا ہے) یہ حقیقت دلوں کو زخمی کر دینے والی ہے لیکن اس سچائی نے تیرے دل کو نہ جانے چور چور کیوں نہ کیا اور تو نے مسولینی کو حبشہ پر حملہ کرنے سے منع کیوں نہ کیا؟

ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں ۔۔۔ زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا ۔۔۔ روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات ۔۔۔ اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج ۔۔۔ ملّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

ں حرم سے ان کی روایات چھین لو — آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
ال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز — ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

① **معنی**: برہمن: ہندوؤں کا پیشوا۔ **زنار**: ایک دھاگہ جو ہندو خاص کر برہمن اپنی برہمنی اور ہندو پن ثابت نے کے لئے گلے اور کمر کے گرد باندھتے ہیں۔ اسے جنیو بھی کہتے ہیں۔ **دیر کہن**: پرانا مندر۔

مطلب: یورپ کے سیاست دانوں نے تہذیب کے نام پر دنیا میں تین چار سو سال سے غارت گری کا جو ار گرم کر رکھا ہے وہ دراصل شیطان کے چیلوں کی طرز کا کام ہے۔ شیطان نے ان کو جو کچھ سکھایا ہے ں نظم میں اقبالؒ نے اس کا پردہ فاش کر دیا ہے۔ صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ان یورپ کی شیطانی اقوام نے ر مسلم قوموں کو بھی لوٹا اور غارت کیا ہے۔ پہلے شعر میں برصغیر میں رہنے والے ہندوؤں کی بات کی ے۔ شیطان اپنے سیاسی بیٹوں یا چیلوں کو کہتا ہے کہ ہندو مذہب کو بھی اور ہندوانہ روایات کو بھی ختم کر ۔ ہندوؤں کے پیشواؤں یعنی برہمنوں کو اپنی سیاست کے داؤ پیچ میں اس طرح لاؤ کہ وہ اپنے پرانے دروں سے نکل آئیں۔ یعنی انہیں ترک کر دیں اور جو جنیو انہوں نے پہن رکھے ہیں ان کو توڑ ڈالیں ر وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو چھوڑ کر یورپ کی شیطانی ثقافت کے زیر اثر آجائیں۔

② **معنی**: فاقہ کش: فاقے کاٹنے والا' بھوکا رہنے والا۔

مطلب: برصغیر کے ہندوؤں کی بات اقبالؒ نے اس لئے کرنا ضروری سمجھی تھی کہ یہ اس کا اپنا ملک تھا ب اس ملک کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس ملک کے مسلمان اگرچہ غریب ہیں اور یادہ تر بھوک کا شکار ہیں لیکن عشق محمد مصطفی ﷺ میں سرشار ہیں اور اگر اسلام پر یا بانی اسلام پر ی آنچ آتی دیکھتے ہیں تو اپنی زندگیاں قربان کرنے سے بھی نہیں ڈرتے۔ اس لیے ابلیس اپنے سیاسی زندوں سے کہہ رہا ہے کہ ان مسلمانوں کے بدنوں کو حضرت محمد مصطفی ﷺ کے عشق کی روح ے خالی کر دو تا کہ یہ موت سے ڈرنا شروع کر دیں اور اس طرح ان میں شیطانی روح داخل کرنے میں آسانی ے کامیاب ہو جائیں۔

معانی: فرنگی: یورپ والوں کے' حجاز: عرب کا ایک علاقہ جہاں مکہ اور مدینہ کے شہر ہیں' یمن: ایک ملک کا نام ہے و عرب سے ملحقہ ہے' تخیلات: خیالات' افکار' تصورات۔

③ **مطلب**: برصغیر کے بعد علامہ ملک عرب کی بات کرتے ہیں جہاں سے اسلام کے سوتے پھوٹتے یں۔ ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں کو کہہ رہا ہے کہ ان عربوں کے اسلامی' دینی اور ثقافتی خیالات کو ان کے لوں سے نکال کر ان کے قلب و ذہن میں اہل مغرب کی تہذیب و ثقافت کے خیالات بھر دو اور اس طرح ے اسلام کو اس ملک عرب سے جس میں حجاز اور یمن کے اسلامی تہذیب و تمدن والے علاقے بھی شامل یں' دیس نکالا دے دو تا کہ عرب بھی اسلامی اقدار کو بھول جائیں۔

④ **معنی**: کوہ و دمن: پہاڑ اور وادیاں۔ افغانی: ملک افغانستان کے رہنے والے' غیرت: خودداری۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے افغانستان کی بات کی ہے جہاں کے مسلمان دین کے معاملے میں بڑے یرت مند ہیں اور اس غیرت دینی کا ان میں موجود ہونا ان ملاؤں کی دینی اور اسلامی تعلیم کی وجہ سے ہے جو ان کے علاقوں میں موجود ہیں اور جملہ افغان جن کے زیر اثر ہیں۔ ان افغانوں کو غیرت دیں سے خالی

کرنے کا علاج ابلیس نے یہ سوچا ہے کہ افغانستان کے پہاڑوں اور وادیوں سے کسی نہ کسی طریقے سے ان ملاؤں کو باہر نکال دو۔ نہ یہ ملا وہاں ہوں گے' نہ افغانوں کو دینی غیرت سے آشنا کریں گے اور اس بنا پر نہ و ہمارے ابلیسی پروگرام کی مزاحمت کر سکیں گے۔

⑤ **معنی:** **اہلِ حرم:** کعبے والے' جو لوگ مکہ مدینہ میں رہتے ہیں۔ **روایات:** صدیوں کے طور طریقے۔ **آہو:** ہرن۔ **مرغزار:** سبزہ زار' چراگاہ۔ **ختن:** وسط ایشیا کا ایک علاقہ جہاں وہ ہرن پیدا ہوتے ہیں جن کی ناف میں مشک ہوتی ہے۔

مطلب: جس طرح ملک ختن کے سبزہ زاروں سے اگر مشک کے نافے بھرے ہرنوں کو نکال دیا جائے تو خوشبو وہاں کے علاقے سے خود بخود ختم ہو جائے گی اسی طرح اے ابلیسی سیاست کے داؤ و پیچ جاننے والو تم حرم (کعبہ اور مدینہ کے علاقوں) سے وہاں کے لوگوں سے ان کی پرانی' تہذیبی' ثقافتی اور اسلامی روایات (یعنی طور طریقے) چھین لو۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیائے اسلام کو دین کی روایات سے آشنا کرانے والوں کے موجود نہ ہونے سے ساری اسلامی دنیا سے اسلام کی روح غائب ہو جائے گی اور مسلمان' نام کا مسلمان رہ جائے گا۔

⑥ **معنی:** **نفس:** سانس یہاں مراد ہے شاعری۔ **لالہ:** سرخ رنگ کا ایک پھول ہوتا ہے جس کا نصف اندرون سیاہ ہوتا ہے اقبال نے اسے عاشق کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ **غزل سرا:** غزل کہنے والا۔

مطلب: ابلیس نے اپنے سیاسی چیلوں کو یہ بھی کہا ہے کہ اگر اپنی شیطانی روایات کو جاری کرنا ہے تو وہ شخص جس کا نام اقبال" ہے۔ اس کو بھی خاموش کر دو کیونکہ اس کی شاعری کے ذریعے دنیائے اسلام کے جو لالہ کی طرح کے عاشق مزاج مسلمان ہیں ان میں آگ کی سی تیزی پیدا ہو رہی ہے اور اس سے ہمارے شیطانی پروگرام کو خطرہ ہے۔ بہتر ہے کہ اس چمن سے ایسے غزل گانے والے کو نکال دیا جائے۔

جمعیت اقوام مشرق

پانی بھی مسخر ہے' ہوا بھی ہے مسخر کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

معنی: **جمعیت اقوام مشرق:** مشرقی قوموں کی جمعیت یعنی یو' این' او۔

① **معنی:** **مسخر:** تسخیر کیا گیا۔ **نگاہ فلک پیر:** بوڑھے آسمان کی نظر' فلک: افلاک کی جمع بمعنی آسمان۔

مطلب: جس طرح دوسری جنگ عظیم (1939 تا 1945) کے خاتمے کے بعد فاتح اقوام نے نیویارک (امریکہ) میں ایک اقوام کی جمعیت (انگریزی میں یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن مخفف یو' این' او) بنائی ہے اسی طرح پہلی جنگ عظیم (1914 تا 1918) کے بعد بھی انہی فاتح اقوام نے اقوام کی ایک جمعیت بنائی تھی جس کا ہیڈ کوارٹر یورپ کے ملک سوئٹزرلینڈ کا دارالحکومت جنیوا تھا۔ علامہ نے اس نظم کے پہلے شعر میں اس پہلی جمعیت اقوام کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی بانی اور اس پر قابض وہ یورپی قومیں ہیں جنہوں نے اپنی بحری اور فضائی قوت سے سمندر بھی تسخیر کر رکھے ہیں اور ہواؤں پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ بظاہر ان کی طاقت ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور یہ بوڑھا آسمان ان کے حق میں نظر آتا ہے لیکن

خبر ہے کہ کسی وقت اس بوڑھے آسمان کی نظریں ان سے پھر جائیں اور وہ کمزور ہو جائیں۔

② **معنی: ملوکیت افرنگ:** یورپ والوں کی شہنشاہی۔

مطلب: اہل   اپنی جمعیت اقوام بنا کر مشرق کی کمزور قوموں پر اپنی شہنشاہی نافذ کرنے اور اسے تقویت دینے کے جو خواب دیکھ رکھے ہیں اور مختلف ملکوں اور قوموں کی بندر بانٹ کے جو پروگرام بنا رکھے ہیں کیا خبر ہے کہ قسمت ان کے خوابوں کے نتیجے کو بدل دے اور ان کے پروگرام دھرے کے دھرے رہ جائیں۔

③ **معنی: طہران:** ایران کا دارالحکومت۔ **جنیوا:** یورپ کے ملک سوئٹزر لینڈ کا دارالحکومت۔ **کرۂ ارض:** زمین کا خطہ۔

مطلب: علامہ نے اوپر کے دو شعروں میں بوڑھے آسمان کی نگاہ کے بدل جانے اور اہل یورپ کے خوابوں کے نتیجے کے غلط ہو جانے کی جو بات کی ہے وہ محض اس واسطے کی ہے کہ اگر ان مغربی قوموں کی طرح جنھوں نے دنیا پر حکومت کا خواب دیکھنے کے لیے جمعیت اقوام بنا رکھی ہے مشرقی اقوام ان سے چھٹکارا صرف اسی صورت میں حاصل کرنے کے لیئے ان کی جمعیت سے الگ ہو کر مشرقی قوموں کی ایک الگ جمعیت اقوام بنالیں اور ایران کے دارالحکومت طہران کو اس کا مرکز ٹھہرالیں تو اس طرح شاید اس زمین کے خطے کی تقدیر بدل جائے اور مشرقی اقوام اہل یورپ کے چنگل سے نکل آئیں اور آزاد اور ترقی یافتہ بن جائیں۔

سلطانی جاوید

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی — لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز
فطرت کو گوارا نہیں سلطانیِ جاوید — ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دل آویز
فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک — باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

معنی: سلطانی جاوید: ہمیشہ کی بادشاہی۔

① **معنی: غواص:** غوطہ خور، غوطہ لگانے والا۔ **اعماق سیاست:** اعماق، عمق کی جمع مراد گہرائیاں، یعنی سیاست کی گہرائیاں۔ **فطرت:** قدرت۔

مطلب: قدرت نے مجھے غوطہ لگانے والا تو ضرور بنایا ہے لیکن میں سیاست کے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے سے پرہیز ہی کرتا ہوں۔

② **معنی: گوارا:** پسند۔ **شعبدہ بازی:** جادوگری، دھوکے کا کھیل۔ **دل آویز:** دل کو لبھانے والا۔

مطلب: اگرچہ میں سیاست میں زیادہ دخل انداز نہیں ہوتا لیکن مجھ میں سیاسی بصیرت ضرور ہے اور اسی وجہ سے ہی قدرت نے مجھ پر یہ راز کھولا ہے کہ قدرت کو بادشاہی کی ہمیشگی یا ہمیشہ رہنا پسند نہیں ہے۔ اگرچہ بادشاہی اور بادشاہی کی جادوگری اور فریب کا کھیل بڑا دل لبھانے والا ہوتا ہے لیکن کسی بھی

ـ یہ جادو ٹوٹ بھی جاتا ہے اور شاہی ختم بھی ہو جاتی ہے البتہ وہ لوگ ہمیشہ کی زندگی ضرور پا لیتے ہیں جو دنیا میں ۔ھ کام کر کے دکھاتے ہیں جیسا کہ اگلے شعر سے ظاہر ہے۔

③ **معنی :** **فرہاد:** ایران کا ایک مشہور عاشق جو شیریں نامی حسینہ پر عاشق تھا۔ **خارا شگنی:** سخت پتھر توڑنا یا پہاڑ کاٹنا۔ **ملوکیت پرویز:** ایران کے مشہور بادشاہ خسرو پرویز کی بادشاہی' یہ وہی پرویز ہے جس نے فرہاد سے شیریں کو چھین لیا تھا۔

مطلب : علامہ نے اوپر کے شعر میں کہا ہے کہ شاہی کو ہمیشگی نصیب نہیں البتہ کچھ کام کر کے دکھانے والوں کا نام ضرور ہمیشہ زندہ رہتا ہے اس کے ثبوت میں انہوں نے فرہاد کی مزدوری اور پرویز کی شاہی کا ذکر کیا ہے۔ پرویز نے فرہاد سے کہا تھا کہ اگر وہ فلاں پہاڑ سے نہر نکال دے تو شیریں اس کو مل سکتی ہے۔ وہ بے چارہ سخت پتھریا پہاڑ کاٹتا ہوا ہی ختم ہو گیا لیکن اس کا نام بطور محنت کش اور بطور انوکھے مزدور کے آج تک زندہ ہے اور پرویز کی شاہی کو وہ زندگی دوام نصیب نہیں ہوئی۔

جمہوریت

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

① ② **معنی :** **مردِ فرنگی:** ایک یورپی مرد' اشارہ ہے ایک یورپی فلسفی کی طرف جس کا نام مسنٹلل ہے۔ **فاش:** ظاہر۔ **دانا:** عقل مند آدمی۔ **ہرچند:** اگرچہ۔ بہر حال میں' **جمہوریت:** ایسا نظام جس میں حکومت لوگوں کی رائے دہندگی سے منتخب کی جاتی ہے۔

مطلب : اس بھید کو ایک مسٹنلل نامی یورپی فلسفی نے کھول کر بیان کر دیا ہے اگرچہ یورپی ہونے کے اعتبار سے وہاں کے اس مفکر یا دانش ور کو یہ بیان نہیں دینا چاہیے تھا کیونکہ یہ مغربی طرز کا جمہوری نظام ان مغربیوں ہی نے ساری دنیا کو دیا ہے۔ اور وہ راز جو کھولا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جمہوریت ایک ایسی طرز حکومت کا نام ہے جس میں اگر پچاس فی صد سے زائد رکن ایک طرف ہو جائیں تو وہ حکومت بنا لیتے ہیں چاہے اوصاف کے لحاظ سے وہ شیطان فطرت ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی تناظر میں مزید یہ بات کہی گئی ہے کہ مغربی طرز کی جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں منتخب شدہ ارکان کو گنا جاتا ہے کہ کدھر زیادہ ہیں اور کدھر کم۔ ان کی اصل سیرت کو' ان کے کردار کو اور ان کے نظریے کو نہیں دیکھا جاتا اور ظاہر ہے کہ ایسا نظام حکومت اسلام تو کیا انسانیت ہی کے خلاف ہے۔

یورپ اور سوریا

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبیِ عفت و غم خواری و کم آزاری

صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

تعارف: سوریا ملک شام کا دوسرا نام ہے یہ ملک پہلے موجودہ ملک شام تک محدود نہ تھا بلکہ اس میں لبنان'

طین اور اردن کے بعض علاقے بھی شامل تھے۔

①② **معنی**: **سوریا**: ملک شام' آج کل اس کا نام سیریا ہے۔ **نبی عفت**: پاک دامن اور پاکباز نبی۔ **غم
اری**: دوسروں کا غم کھانا۔ **کم آزاری**: دوسروں کو کم تکلیف پہنچانا۔ **صلہ**: بدلہ' معاوضہ۔ **مے**: شراب۔
ار: جواء۔ **ہجوم زنان بازاری**: بازاری عورتوں یعنی اپنے جسم بیچنے والی اور عفت لٹانے والی عورتوں کی
تات۔

طلب: ملک شام یا سوریا (سیریا) میں چونکہ جنگ عظیم اول سے پہلے ملک فلسطین' لبنان اور اردن تک ے علاقے شامل تھے جہاں کئی پیغمبر ہوئے ہیں۔ ان پیغمبروں میں سے علامہ نے پہلے شعر میں ایک ایسے پیغمبر ذکر کیا ہے جو پاک دامن اور پاکباز تھا۔ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچانے اور دوسروں کے غم میں شریک ونے کا درس دیتا تھا۔ اور یہ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے مذہب کے پیروکار تقریباً سارے رپ والے ہیں۔ علامہ نے اس تناظر میں یہ کہا ہے کہ ملک سیریا کی سرزمین نے تو یورپ والوں کو ایک یسا پیغمبر یا نبی عطا کیا ہے جس کی صفات کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اتنے بڑے احسان کے بدلے میں فرنگیوں نے ک شام (سوریا یا سیریا) کے لوگوں کو شراب دی ہے' جوا کھیلنا سکھایا ہے اور عورتوں کو جسم فروشی پر مادہ کیا ہے اور اب اس علاقے میں ایسی عورتوں کی جو جسم بیچتی ہیں بہتات اور کثرت ہے۔ حالانکہ اتنے ڑے احسان کے بدلے میں کہ انہیں سیریا نے حضرت عیسیٰ جیسا نبی عطا کیا ہے بہتر اور اچھا صلہ دینا اہیے تھا۔

مسولینی

(اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے' مگر باقی نہ راجہ ہے' نہ راج

آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری' آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے' میں روا رکھتا ہوں آج

تعارف: مسولینی اٹلی کا آمر حکمران تھا جس نے قدیم سلطنت روما کو پھر سے قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا اور اس سلسلے میں اس نے کئی کمزور ملکوں پر' جن میں ابی سینیا یا حبشہ بھی شامل ہے' قبضہ کر لیا تھا۔ مسولینی کے اس اقدام پر اس کے بعض مشرقی اور مغربی حریفوں یعنی مدمقابلوں یا دشمنوں نے بڑی لے دے کی تھی جس کے جواب میں مسولینی نے جو کچھ کہا تھا اقبالؒ نے اسے اس نظم میں منظوم کر دیا ہے۔

① **معنی**: **بے محل**: بغیر وجہ کے۔ **معصومان یورپ**: یورپ کے بے گناہ لوگ۔ یہ طنزاً کہا ہے۔

مطلب: جب اٹلی کے آمر مسولینی نے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی خاطر بعض ملکوں پر چڑھائی کر کے ان کو فتح کر لیا تو اس کے بالمقابل مغرب کے چند سیاست دانوں اور حکومتوں نے اسے مجرم ٹھہرایا جس پر اس نے ان کو جواب دیا کہ میں نے کوئی انوکھا جرم نہیں کیا ہے۔ یہ جرم تو تم صدیوں سے کرتے آئے ہو۔ اس لئے اے یورپ کے وہ لوگو جو خود کو بے گناہ سمجھتے ہو خواہ مخواہ مجھ سے مت بگڑو۔

② **معنی:** چھلنی: جس میں آٹا چھانتے ہیں۔ چھاج: جس میں گندم پھٹکتے ہیں۔

مطلب: مسولینی اپنے اعتراض کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جو کام میں نے کیا ہے تم بھی کر چکے ہو اور تہذیب کے اوزار استعمال کر کے یعنی تہذیب پھیلانے کے بھیس میں دوسری قوموں اور ملکوں کو تم بھی فتح کر چکے ہو اس لئے تم میں اور مجھ میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ ہاں اگر کوئی فرق ہو سکتا ہے تو وہ وسعت کا یا مقدار کا ہو سکتا ہے اور اس کو چھلنی اور چھاج کے الفاظ میں سمجھاتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ فرق اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ جیسے تم چھلنی ہو اور میں چھاج۔ چھلنی میں دانے آرام سے نکل جاتے ہیں اور چھاج میں پھٹک پھٹک کر کے نکالنے پڑتے ہیں۔ یعنی تم وہ کام چپکے سے اور ڈپلومیسی سے کر لیتے ہو میں نے ذرا کھل کر کیا ہے۔ میرا پھٹکنا یا سلطنت کو وسعت دینا کیوں برا لگ رہا ہے جب کہ ہم دونوں ایک ہی تہذیب کے فریبی وار سے دوسرے ملکوں اور قوموں کو مفتوح کرتے ہیں۔

③ **معنی:** سودائے ملوکیت: بادشاہت کا جنون۔ زجاج: شیشے۔

مطلب: میرے سر میں جو سلطنت روم کو وسیع کرنے اور رومیوں کی بادشاہت قائم کرنے کا جنون چھا ہوا ہے اس کو تو تم برا کہتے ہو کیا تم نے اپنی آہنی قوت سے دنیا کی کمزور قوموں کے شیشے نہیں توڑے۔ اور ان کو قوت کے بل بوتے پر مفتوح و مغلوب نہیں کیا اور ان کو نہیں لوٹا۔

④ **معنی:** عجائب: عجیب باتیں۔ شعبدے: فریب کاریاں، جادوگری۔ راجدھانی: حکومت کا مرکز۔ راجہ: بادشاہ۔ راج: حکومت۔

مطلب: یہ عجیب فریب کاریاں کس کی بادشاہت کی ہیں اور کس کے شاہانہ ہتھکنڈوں اور سحر سازی کا نتیجہ ہیں کہ دنیا کے ملکوں کے قدیم دارالحکومت تو موجود ہیں لیکن نہ وہاں کے بادشاہ باقی رہے ہیں اور نہ ان کی حکومت۔ ان سب کو ملیا میٹ کر کے تم نے ان ملکوں کے دارالحکومتوں کو اپنی شہنشاہانہ حکومت میں شامل کر لیا ہے۔

⑤ **معنی:** آل سیزر: سیزر کی اولاد، یعنی اٹلی کی قوم۔ اٹلی کو روم بھی کہتے ہیں۔ سیزر قدیم روما کا مشہور جرنیل تھا۔ چوب نے: مشہور ہے کہ سیزر بنسری بجایا کرتا تھا۔ چوب نے: بانس کی لکڑی یا بانسری۔ بیابان۔ بے خراج: بغیر تاوان اور محصول وصول کئے۔

مطلب: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ سیزر کی قوم یعنی اٹلی (روم والے) والے سیزر کی طرح بنسری بجانے لگے ہیں اور تم دنیا کو اسی طرح فتح کرتے رہو کہ آبادیاں تو کیا بیابانوں میں رہنے والوں سے بھی محصولات اور تاوان وصول کر کے اپنی قوم کو خوش حال کرتے رہو۔ روم والوں کو بھی حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح علاقوں کو فتح کر کے اپنے آپ کو مفتوح علاقوں کی لوٹ مار سے خوشحال بنائیں۔

⑥ **معنی**: **بے نوا**: غریب، بے مایہ۔ **صحرا نشین**: صحرا میں رہنے والے۔ **خیام**: خیمے۔ **کشت دہقاں**: کسانوں کے کھیت۔ **تخت و تاج**: بادشاہ اور ان کے تخت و تاج۔ یعنی ان کی شاہی اور ان کے لوازمات۔

مطلب: تم نے تو صحراؤں میں رہنے والے غریب اور بے مایہ لوگوں کے خیموں تک بھی لوٹے ہیں۔ تم نے تو کسانوں کی کھیتیاں بھی لوٹی ہیں۔ تم نے تو مختلف ملکوں کی بادشاہیوں کو بھی ختم کیا ہے اور خود بادشاہ بن بیٹھے ہو۔ اور اپنی قوم کو خوش حال کرنے اور دوسروں کو بے مایہ اور بے سرمایہ بنانے کے تم نے ہر قسم کے طریقے اپنائے ہیں۔ مجھے طعنہ کیوں دیتے ہو۔

⑦ **معنی**: **غارت گری**: لوٹ مار۔ **آدم کشی**: لوگوں کو قتل کرنا۔ **روا رکھنا**: جائز سمجھنا۔

مطلب: یہ بہانہ بنا کر کہ ہم تو دوسرے ملکوں کو فتح کر کے وہاں کے لوگوں تک اپنی تہذیب لے جانا چاہتے ہیں اور انہیں مہذب بنانا چاہتے ہیں۔ تم نے مفتوح ممالک میں لوٹ مار بھی کی ہے اور وہاں کے لوگوں کو قتل بھی کیا ہے۔ اگر یہ بات تمہارے لئے جائز ہے اور تم تین چار صدیوں سے اس لوٹ مار اور قتل و غارت میں لگے ہوئے ہو تو آج میں نے اگر کسی ملک کو فتح کر لیا ہے تو مجھے کیوں برا کہتے ہو۔ میں بھی تو تمہاری طرح مفتوح علاقے کے لوگوں کو مہذب بنانے کے لئے یہ کارروائی کر رہا ہوں۔

گلہ

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک ۔۔۔ بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ ۔۔۔ بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر ۔۔۔ افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو ۔۔۔ مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

معنی: **گلہ**: شکایت، شکوہ۔

① **معنی**: **تاج**: یہاں برطانوی تاج، برطانیہ کی بادشاہت مراد ہے۔ **تابندہ نگیں**: چمکتا ہوا موتی۔

مطلب: ہندوستان (متحدہ ہندوستان / برصغیر جو "اقبال" کے زمانے تک ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا اور انگریزی راج وہاں موجود تھا) کی قسمت میں کیا لکھا ہے کچھ معلوم نہیں ابھی تک وہ برطانوی شہنشاہ کے تاج کا چمکیلا موتی بنا ہوا ہے۔ ہندوستان وسائل کے اعتبار سے جملہ برطانوی مفتوحہ علاقوں سے زیادہ خوش حال تھا۔ اس لئے اسے برطانوی تاج کا تابندہ نگیں کہا گیا ہے۔ اس کو لوگ سونے کی چڑیا کہتے تھے۔ اس سونے کی چڑیا کا سونا انگریز اتار کر لے گئے اور باقی پروں والی بے چاری چڑیا رہ گئی ہے۔ یعنی انگریزوں نے ہندوستان کو خوب لوٹا ہے۔ اور اس لوٹ سے اپنے ملک۔

② **معنی**: **دہقاں**: کسان۔ **بوسیدہ**: پرانا، پھٹا ہوا۔ **زیرِ زمیں**: زمین کے نیچے۔

مطلب: انگریزوں کی لوٹ مار کے نتیجے میں اہلِ ہند کا جو حال ہوا، ان میں سے ایک طبقہ یعنی کسانوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے کہا ہے کہ کھیتوں میں محنت تو وہ کرتے ہیں اور ان کی فصلوں سے فائدہ انگریز حکمران اٹھاتے ہیں جس کے نتیجے میں فاقہ کشی کی بنا پر یہاں کا کسان یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کسی قبر نے

کوئی ایسا مردہ باہر پھینک دیا ہو جس کا پرانا اور پھٹا ہوا کفن ابھی تک زمین کے اندر موجود ہو تاکہ وہ اسے پھر اپنی لپیٹ میں لے لے۔

③ **معنی:** گرو غیر: غیروں کے پاس رہن رکھی ہوئی۔ مکیں: مکان میں رہنے والا۔

مطلب: انگریزوں کی لوٹ مار کے نتیجے میں اس وقت کے برصغیر کا ہر باشندہ سیاسی اور اقتصادی طور پر ان کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ یوں سمجھئے کہ یہاں کے باشندوں کے جسم اور ان کی جانیں انگریزوں کے پاس رہن رکھی ہوئی تھیں۔ اس اعتبار سے بظاہر مکان اور مکان میں رہنے والے تو موجود تھے لیکن بباطن نہ مکان ان کے تھے اور نہ ان مکانوں میں رہنے والے اپنے آپ کے مالک تھے۔ سب کچھ غلامی کے داؤ پر لگ چکا تھا۔

معانی: یورپ: مراد انگریز۔ گلہ: شکایت' رضامند: راضی۔

④ **مطلب:** علامہ نے برصغیر کے لوگوں کی غلامی اور انگریزوں کی آقائی کے سلسلے میں جو باتیں مذکورہ بالا شعروں میں کی ہیں ان کے متعلق ایک نیا ہی خیال دیا ہے اور وہ یہ کہ تم اگر اہل یورپ کی غلامی پر راضی نہ ہوتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اپنے آقاؤں کو اس ملک سے باہر نہ پھینک دیتے اس لیے مجھے تو اے برصغیر کے غلامی پر راضی ہو جانے والے باشندو تم سے شکایت ہے کہ تم نے اپنے آقاؤں کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ مجھے یورپ والوں سے کوئی شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو تم سے ہے کہ تم آزادی کے لئے جدوجہد نہیں کر رہے۔

انتداب

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے — نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں' زن تنک لباس نہیں — جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روحِ ناشکیب و عمیق — طریقِ اب وجد سے نہیں ہے بیزاری
جسور و زیرک و پردم ہے بچہ بدوی — نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمۂ جاری
نظر ورانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ — وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

لغوی معنی: انتداب: نگہداری یا قائم مقامی۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت کسی ملک کی انتظامی اصلاح کے پردے میں اس پر قبضہ جما لے اور لوگوں کو یہ تاثر دے کہ ہم تمہیں تہذیب سکھانے آئے ہیں جیسا کہ یورپ کی قوموں نے ایشیا' افریقہ اور دوسرے ممالک پر قبضہ جمانے کے لئے کیا ہے۔

① **مطلب:** یہ فیصلہ کرنا کہ تہذیب کے فرشتے کی کس ملک اور قوم کو ضرورت ہے تاکہ اسے مہذب بنایا جا سکے۔ زمانہ حال میں جب کہ علوم و فنون ترقی کے اوج پر ہیں فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے لیکن یورپی قوموں نے کمزور قوموں کو فتح کرنے کے لیے تہذیب کا جو بہانہ بنایا ہے وہ بالکل غیر فطری اور غلط ہے۔

② **معنی:** قمار: جوا۔ زن: عورت۔ تنک لباس: کم لباسی یا عریاں لباسی۔ شغلِ مے خواری: شراب پینے کا شغل۔

مطلب: اہل مغرب نے تہذیب کے نام پر کمزور ممالک کو فتح کرنے کے لئے جو فیصلہ دیا ہے وہ سراسر

فطرت اور حقائق کے خلاف ہے۔ وہ ان ملکوں میں تہذیب لے جانا چاہتے ہیں جو پہلے ہی مہذب ہیں لیکن یورپی اقوام کا اصل مقصد تو مغربی تہذیب کو لے جا کر ان ممالک کے باشندوں کو حیوان بنانا ہے۔ اس شعر میں اور اس سے اگلے دو تین شعروں میں علامہ نے اہلِ مغرب کی اسی بدنیتی کے پس منظر میں یہ کہا ہے کہ وہ تہذیب ان ملکوں میں پھیلانا چاہتے ہیں جہاں کے لوگ ان کی طرح جوا کھیلنے والے نہیں ہیں اور جہاں کی عورتیں عریاں لباسی کی وجہ سے بے حیا نہیں ہیں اور جہاں کے لوگ اہلِ یورپ کی طرح شراب پینے کو حلال نہیں بلکہ حرام سمجھتے ہیں۔

③ **معنی**: **ناشکیب**: بے صبر۔ **عمیق**: گہری۔ **طریقہ اب و جد**: باپ دادا کا طریقہ۔ **بیزاری**: اکتاہٹ۔

مطلب: اہلِ مغرب انتداب (ملکوں کی انتظامی اور تہذیبی اصلاح) کے بہانے ایسے لوگوں میں اپنی لادین اور بے حیا تہذیب کو پھیلانا چاہتے ہیں جن کے جسموں میں گہری اور عشق کی بنا پر بے صبر روحیں موجود ہیں اور جو اپنے باپ دادا کے طریقوں سے اکتائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اپنی پرانی انسانی اقدار پر قائم ہیں۔ وہ اقدار جن کی وجہ سے وہ ابھی تک انسان ہیں یورپ والوں کی طرح حیوان نہیں ہوئے۔

④ **معنی**: **جسور**: بہادر۔ **زیرک**: دانا، عقل مند۔ **پردم**: سانس سے پر یعنی توانا اور طاقت والا۔ **ان تھک**۔ **بچہ بدوی**: عرب کے صحراؤں میں رہنے والوں کا بچہ۔ **فیضِ مکاتیب**: درسگاہوں کا فیض۔ **چشمہ جاری**: بہتا ہوا چشمہ۔

مطلب: ذرا عرب کے بدوؤں کے بچوں کو دیکھیں کہ وہ بہادر بھی ہوتے ہیں اور دانا اور توانا بھی۔ یہ محض اس وجہ سے ہے کہ وہاں مغربی طرز کے غیر انسانی اقدار پھیلانے والے مدرسوں کے فیض کا پانی جاری نہیں ہوا ہے۔ اگر انتداب کے بہانے یورپ والے وہاں بھی اپنے تعلیمی مدارس قائم کر دیں گے تو عربوں کے بچے بھی بہادری، دانائی اور توانائی سے خالی ہو کر اہلِ مغرب کی طرح بے حیا، جوا باز اور مے خوار بن جائیں گے۔

⑤ **معنی**: **نظرورانِ فرنگی**: اہلِ مغرب کے دانشور۔ **فتویٰ**: فیصلہ۔ **مدنیت**: تہذیب و تمدن۔ **عاری**: خالی۔

مطلب: جن ملکوں میں مذکورہ بالا شعروں میں بتائی گئی انسانی اقدار کی باتیں موجود ہیں اہلِ مغرب یا یورپی دانشوروں کا فیصلہ ہے کہ ان ملکوں کی سرزمین تہذیب و تمدن سے خالی ہے اور ہم اُن کو تہذیب و تمدن سکھانے کے لیے ان کی انتظامی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔

لادین سیاست

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی   خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں   کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمِ آزاد   فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی   تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسا کے سفیر

① **معنی**: **خبیر**: خبر رکھنے والا۔ **بصیر**: دیکھنے والا۔ **حق**: سچ

مطلب: علامہ کہتے ہیں جو بات حق ہو یا سچ ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی کیونکہ خدا نے مجھے ایک ایسا دل دیا ہے جو ہر بات کی خبر رکھنے والا بھی ہے اور ہر معاملہ اور ہر چیز کو دیکھنے والا بھی ہے۔

② **معنی:** سیاست لادیں: بے دین سیاست۔ کنیز اہرمن: شیطان کی لونڈی۔ دوں نہاد: کمینہ خصلت۔ مردہ ضمیر: مرا ہوا دل۔

مطلب: میری نگاہ میں وہ بے دین سیاست جو اہل مغرب نے ہمیں سکھائی ہے شیطان کی لونڈی ہے، کمینہ خصلت ہے اور اس کا اندرون یا دل مرچکا ہے۔

③ **معنی:** ترکِ کلیسا: گرجے کو یا عیسائی مذہب کو چھوڑنا۔ حاکمی: حکومت۔ دیو بے زنجیر: ایسا دیو جسے آزاد کردیا گیا ہو۔

مطلب: مغرب والوں نے، جو عیسائی مذہب کے پیروکار ہیں، اپنی حکومتوں یا سیاست کو عیسائیت یا مذہب سے الگ کر دیا ہے جس کے نتیجے میں اہل یورپ کی سیاست ایک ایسے دیو کی مانند ہو گئی ہے جس کی زنجیریں کھول دی گئی ہوں اور وہ آزاد گھوم پھر رہا ہو یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب کی زندگی کے ہر شعبہ میں شیطان کا عمل دخل ہے۔

④ **معنی:** متاعِ غیر: دوسروں کی دولت۔ ہراول لشکر: فوج کا اگلا دستہ۔ کلیسا کے سفیر: گرجا کے سفیر یعنی عیسائی پادری۔ یا عیسائیت کا پیغام لے جانے والے۔

مطلب: یہ عجیب بات ہے کہ جب لادین سیاست رکھنے والی مغربی قومیں دوسروں کی دولت پر نظر رکھتی ہیں یعنی دوسرے ملکوں کو فتح کرنا چاہتی ہیں تو اس کی فوج کے پہلے دستے کے طور پر عیسائی پادری پہنچ جاتے ہیں۔ پہلے وہ تبلیغ سے میدان صاف کرتے ہیں اور لوگوں کو عیسائیت کی خوبیاں بتا کر اپنی طرف راغب کرتے ہیں اس کے بعد ان کے ملک کی فوجیں اس ہموار شدہ میدان پر آسانی سے قبضہ کر لیتی ہیں اور اپنی لامذہب سیاست کو عام کر دیتی ہیں۔

دامِ تہذیب

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے — بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ 'جفا پیشہ' کے پنجے سے نکل کر — بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

معنی: دامِ تہذیب: تہذیب کا جال۔

① **مطلب:** اس شعر میں اقبالؒ نے طنز کے طور پر کہا ہے کہ مجھے یورپ والوں کی شرافت پر کوئی شک نہیں۔ وہ اس خصوصیت کی بنا پر دنیا کی ہر مظلوم قوم کے خریدار اور ہمدرد بن جاتے ہیں لیکن جب ان پر قابو پا لیتے ہیں تو یہی "شریف لوگ" مفتوحہ علاقوں میں شیطانی تہذیب پھیلا دیتے ہیں۔

② **معنی:** پیرِ کلیسا: عیسائی پادری۔ کرامت: اعجاز۔ منور: روشن۔ افکار: خیالات۔

ب: اسے عیسائی پادریوں کا اعجاز سمجھیں کہ انہوں نے مفتوحہ قوموں کے لوگوں کے خیالات کو بجلی راغوں یعنی تہذیب جدید سے روشن کیا ہے اور ترقی کے بھیس میں عیسائیت بھی پھیلائی ہے اور لوگوں خیالات کو تبدیل کر کے تہذیب مغرب کا گرویدہ بھی بنایا ہے۔

معنی: عقدۂ دشوار: مشکل گرہ۔ تدبیر سے: عقل سے۔

ب: فلسطین اور شام کے ملک پہلی جنگ عظیم سے پہلے سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے لیکن مغربی اقوام ترکوں کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ کر کے اور ان کو ظالم ثابت کر کے عربوں کو ترکوں سے آزاد ہونے ورہ دیا لیکن جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد خود ان ملکوں پر قابض ہو گئے اس پس منظر میں کہتے ہیں کہ میرا دل شام اور فلسطین میں جو کچھ ہوا ہے اس پر جل رہا ہے یہ ایک ایسی مشکل گرہ ہے ل کے ناخن سے نہیں کھولی جا سکتی۔ کیونکہ اس میں سراسر دھوکا اور فریب کا عمل دخل ہے۔

معنی: ترکان "جفا پیشہ": وہ ترک قوم جسے انگریز عربوں پر ظلم کرنے والا بتاتے رہے۔

لب: اقبالؒ نے اس آخری شعر میں اہل مغرب کی زبان استعمال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ترک تو ں پر ظلم کرنے والے تھے لیکن ہوا کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں عرب ترکوں سے آزاد ہونے کے لئے ان خلاف اٹھ تو کھڑے ہوئے لیکن جب ترک شکست کھا گئے تو انگریزوں اور فرانسیسیوں نے شام اور ین پر اور عربوں کے دوسرے ممالک پر قبضہ کر لیا اور یہ بیچارے عرب ترکوں کی حکمرانی سے نکل کر ی اقوام کی حکمرانی میں آ گئے اور انہوں نے اپنی حکمرانی کے بعد ان میں ایسی شیطانی تہذیب پھیلائی کہ و سیاسی طور پر آزاد رہ سکے اور نہ تہذیبی طور پر۔

نصیحت

ب لردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے | منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر
رے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم | برہ پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
ے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر | کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
م کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو | ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
ر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب | سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

① معنی: لرد: انگریزی لفظ لارڈ کا اردو بنایا گیا ہے۔ سیر ہونا: پر ہونا، بھر جانا۔ پسر: بیٹا۔ فرنگی: انگریز۔

طلب: ایک انگریز لارڈ (انگریز وڈیرہ یا رئیس) نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تو ایسے نظارہ کی تلاش کر کہ ں سے تیری آنکھ نہ بھرے اور دیکھنے کی آرزو باقی رہے۔

② معنی: برہ: بھیڑ کا بچہ۔ فاش کریں: ظاہر کر دیں۔ قاعدۂ شیر: شیر کے طور طریقے۔

طلب: اگر کسی بھیڑ کے بچے کو شیری کے طور طریقے بتا دیئے جائیں تو یہ اس بے چارے کے لئے بہت ے ظلم کی بات ہوگی۔ دراصل فرنگی لارڈ یہ کہنا چاہتا ہے کہ غلاموں پر حکومت کے بھید ظاہر نہیں کرنے

چاہییں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ غلام حاکمیت کے راز سمجھ کر آزاد ہونے کی کوشش کرے اور ہماری جگہ وہ حکمران بن بیٹھے۔ دراصل یہ حاکم کے حق میں ظلم ہو گا لیکن یہاں غلام کو راز نہ بتانے کی پالیسی کے تحت اس نے غلاموں کے حق میں ظلم کہہ دیا ہے تاکہ غلام آزاد ہونے اور حاکم بننے کی کوشش ہی نہ کریں۔

③ **معنی:** رازِ ملوکانہ: شاہانہ بھید۔ تیغ: تلوار۔ زیر کرنا: مغلوب کرنا یا ماتحت بنانا۔

مطلب: فرنگی وڈیرہ اپنے بیٹے کو مزید یہ سمجھاتا ہے کہ شہنشاہی یا حاکمیت کے بھید اپنے سینے میں چھپائے رکھنا بہتر ہے۔ اور وہ بھید اس نے اگلے مصرعے میں اور اس کے بعد آنے والے دو شعروں میں بیان کر دیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ غلام لوگوں کو تلواروں کے ذریعے غلام رکھنے یا اپنا ماتحت رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ان کو غلام رکھنے کا ایک اور طریقہ ہے جو تلوار سے بھی زیادہ کارگر ہے اور اس کا ذکر اگلے شعروں میں موجود ہے۔

④⑤ **معنی:** اکسیر: تانبے یا مٹی کو سونا بنانا۔ ہمالہ: دنیا کا سب سے بلند پہاڑ جو ہندوستان کی شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ کافی دُور تک جاتا ہے۔

مطلب: غلاموں کو ہمیشہ کے لیے محکوم رکھنے کا جو طریقہ تلوار سے بڑھ کر کارگر ہے (جو حاکم قوم کے سینے میں محفوظ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان غلاموں کو ایسا نظام تعلیم دو کہ جس سے وہ اپنی شناخت کو بھول کر حاکموں کے طور طریقوں کو اپنا لیں۔ اس طریقہ کار کو فرنگ لارڈ نے ایک ایسا تیزاب کہا ہے کہ جب غلام قوم کے لوگوں کی خودی اس میں ڈالی جائے گی تو وہ ایسی ملائم ہو جائے گی کہ حاکم اسے جس سمت پھیرنا چاہے پھر جائے گی۔ اور تعلیم کا یہ تیزاب ان غلاموں کے حق میں تانبے یا مٹی کو سونا بنانے کی بجائے اور الٹ کام کرے گا اور وہ یہ کہ وہ نظام تعلیم ان لوگوں کے مضبوط عقائد اور خود شناس شخصیتوں کے سونے کے ہمالہ کو مٹی کا ڈھیر بنا کر رکھ دے گا اور یہ بات پچھلی ڈیڑھ دو صدی کے انگریزی نظام تعلیم کے حصول سے ثابت بھی ہو چکی ہے اور اس حد تک ثابت ہو چکی ہے کہ سیاسی آزادی کے باوجود برصغیر کے لوگ مغربی تہذیب، تمدن اور ثقافت کے رنگ میں ڈھل چکے ہیں اور ان کی اپنی آزادانہ شناخت ختم ہو چکی ہے۔

ایک بحری قزاق اور سکندر

سکندر

① تیرا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی	کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی، میں دریائی

قزاق

② سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے	گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی

ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی، میں دریائی

معنی: بحری قزاق: سمندری لٹیرا۔ **سکندر:** قدیم یونان کا مشہور فاتح بادشاہ۔ اس نظم میں سکندر اور قزاق کے درمیان مکالمہ ہے۔

سکندر

① **معنی: صلہ:** بدلہ۔ **رہزنی:** ڈکیتی، لوٹ مار۔ **پہنائی:** وسعت۔

مطلب: سکندر نے ایک ایسے سمندری لٹیرے کو جس نے سمندر کی وسعتوں میں اپنی لوٹ مار سے مسافروں میں ہلچل مچا رکھی تھی گرفتار ہونے پر اس کے سامنے پیش کیے جانے کے وقت کہا کہ بتا تیری سزا کیا ہے، کیا میں تجھے زنجیر سے باندھوں یعنی قید کر دوں یا تلوار سے تیری گردن اڑا دوں؟

قزاق

②③ **معنی: حیف:** افسوس۔ **جوانمردی:** بہادری۔ **گوارا کرنا:** پسند کرنا۔ برداشت کرنا۔ **سفاکی:** خوں ریزی۔ **دریائی:** سمندری۔ **رسوا کرنا:** ذلیل کرنا۔ **ہم چشم:** ہم رتبہ، دوست۔

مطلب: لٹیرا جواب دیتا ہے کہ اے سکندر مجھے افسوس ہے کہ تو اپنے ہم رتبہ والوں کو یا اپنے پیشہ والوں کو ذلیل کرنا چاہتا ہے حالانکہ ہم دونوں لوٹ مار میں یکساں ہیں۔ ہم رتبہ ہیں۔ ہم پیشہ ہیں۔ تیرا پیشہ بھی لوٹ مار کرنا اور خون بہانا ہے اور میرا کام بھی یہی ہے۔ ہم دونوں لٹیرے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تو میدانوں میں لوٹ مار کرتا ہے اور میں سمندروں میں لوٹ مار کرتا ہوں۔ یاد رکھیں سکندر بہت بڑا فاتح تھا اور اس نے اپنی فتوحات کے دوران بہت سے ملکوں کو لوٹا تھا اور برباد کر دیا تھا۔ اور بہت سے لوگوں کا خون بہایا تھا۔

جمعیت اقوام

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

تعارف: قوموں کی انجمن۔ جس کا انگریزی نام یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن یا مخفف کے طور پر یو، این، او ہے۔ اور یہ اس جمعیت اقوام کی بابت ہے جو پہلی جنگ عظیم (1914 تا 1918) کے بعد جنیوا (ملک سوئٹزرلینڈ) میں قائم ہوئی تھی۔

① **معنی: دم توڑنا:** مرنے کے قریب ہونا۔ **خبرِ بد:** بری خبر۔

مطلب: جمعیت اقوام جو دنیا بھر کے ملکوں کی بہتری کے لئے اہل مغرب نے بنائی تھی جب اپنی بے انصافیوں اور کرتوتوں کی وجہ سے ٹوٹنے کے قریب تھی تو اس پر علامہ نے کہا ہے کہ کئی روز سے یہ مرنے کے قریب ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بری خبر کہ یہ مرگئی ہے میرے منہ سے نہ نکل جائے۔

② **معنی:** **مبرم تقدیر:** نہ ٹلنے والی تقدیر۔ **پیران کلیسا:** گرجے کے پادری' عیسائیوں کے پیشوا۔

مطلب: یہ بات کہ جمعیت اقوام مرنے والی ہے ایک اٹل تقدیر کی طرح ہے۔ یعنی ایسی تقدیر کی طرح ہے جو ٹل نہیں سکتی اور جمعیت اقوام ضرور مر کر رہے گی۔ اگرچہ عیسائی قوموں کے پادری دعا کر رہے ہیں کہ یہ تقدیر کسی طرح ٹل جائے۔ عیسائی پادری اس لئے یہ دعا کر رہے ہیں کہ یہ جمعیت عیسائیوں کے فائدے کے لیے اور اہل مغرب کے مفاد میں تھی۔

③ **معنی:** **داشتہ:** وہ عورت جو گھر میں بغیر نکاح کے رکھی ہوئی ہو۔ یہاں تحقیر کے طور پر کہا گیا ہے۔ **پیرک:** پیر کے معنی بوڑھا۔ پیرک میں تحقیر ہے۔ یعنی ذلیل و خوار بوڑھا۔ **افرنگ:** اہل مغرب۔ **ابلیس:** شیطان۔ **تعویز:** نقش جو بلاؤں کے توڑ کے لیے لکھا جاتا ہے۔ منتر۔

مطلب: اس جمعیت اقوام کے ختم ہو جانے میں تو کوئی شک نہیں۔ یہ ختم ہو کر رہے گی' چاہے عیسائیوں کے پیشوا اس کی زندگی کی دعائیں ہی کیوں نہ کرتے رہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ شیطانی انجمن جسے شیطان نے اہل مغرب سے بنوایا ہے اور جسے اقبالؒ نے تحقیر اور ذلت کے طور پر اہل مغرب کے ذلیل بوڑھوں کی بے نکاح عورت کی مانند کہا ہے۔ شیطان ہی کے دیئے گئے کسی نقش سے یا منتر سے کچھ دیر اور نکال لے لیکن اس کا ختم ہونا اس کی بے انصافیوں اور کرتوتوں کی وجہ سے اس کا مقدر بن چکا ہے۔

شام و فلسطین

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پر ہے مے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

تعارف: ملک شام اور ملک فلسطین پہلے سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے لیکن پہلی جنگ عظیم میں ترکوں اور جرمنوں کی شکست کے بعد شام پر فرانسیسیوں نے اور فلسطین پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

① **معنی:** **رندان فرانسیس:** فرانس کے رہنے والے شرابی۔ **میخانہ:** شراب خانہ۔ **سلامت:** قائم۔ **پر ہے:** بھرا ہوا ہے۔ **مے گلرنگ:** گلاب کے رنگ کی شراب۔ **شیشہ:** پیالہ' صراحی۔ **حلب:** شام کا ایک شہر' یہ شہر شیشے بنانے کے لیے مشہور تھا۔

مطلب: سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں شام ایک بڑا ملک تھا جس میں فلسطین اور لبنان اور اردن کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اسے تقسیم کر دیا گیا اور یہاں یورپ کے شرابی آ گئے۔ اور انہوں نے ان ملکوں کے شہروں کو بھی شراب خانوں سے آشنا کر دیا اور لوگوں کو شراب اور بے حیائی پر لگا دیا۔ ان حالات کو دیکھ کر علامہ طنز کے طور پر کہتے ہیں کہ فرانس کے شرابیوں کے شراب خانہ زندہ ...

رہیں جن کے شام میں آنے سے شام کے شہر بھی شراب خانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ حلب کا وہ شہر جو پیلے شیشے بنانے میں مشہور تھا اب شراب کے شیشوں یعنی پیالوں اور صراحیوں کو بنانے لگا ہے۔ اور شراب ان شرابیوں نے پورے ملک شام میں عام کر دی ہے۔

② **معنی: خاک فلسطیں:** فلسطین کی سرزمین۔ ہسپانیہ: یورپ کا ایک ملک جسے سپین بھی کہتے ہیں اور مسلمانوں کی حکمرانی کے دوران جس کا نام اندلس تھا۔ یہاں مسلمانوں نے سات آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے۔ جس کے بعد یورپ کے عیسائیوں نے ان کو یا قتل کر دیا یا ملک سے مار بھگایا۔

مطلب: اہل مغرب نے اس بات کو بہانہ بنا کر کہ کبھی فلسطین میں یہودی آباد تھے اور یہ یہودیوں کا ابتدائی گھر تھا جہاں سے وہ نکالے گئے ہیں فلسطین کو اسرائیل کے نام پر یہودیوں کو دے دیا گیا ہے (اقبال" کے زمانے میں ابھی یہ تجویز ہو رہی تھی) اقبال" کہتے ہیں کہ اس فارمولے کے تحت اسپین (اندلس) پر عربوں کا حق ہونا چاہیے کیونکہ عرب بھی وہاں سات آٹھ سو سال سے حکمران تھے اور وہاں کے صدیوں سے باشندے تھے اور ان کو بھی وہاں سے نکال دیا گیا یا عیسائی بنا لیا گیا۔ اس لیے اسپین کا ملک عربوں کو دیا جانا چاہیے۔

③ **معنی: ملوکیت انگلیس:** انگریزی حکومت۔ **نارنج:** سنگترے۔ **رطب:** کھجور۔

مطلب: انگریزی حکومت کا فلسطین میں یہودیوں کو بسانا اس لئے نہیں ہے کہ ان کے ذریعے یہاں کے سنگتروں، شہد اور کھجوروں کی فصلوں سے فائدہ اٹھایا جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہودیوں کو یہاں بسا کر ان کے ذریعے سارے عربوں میں پھوٹ ڈالی جائے اور جملہ ممالک اسلام کو ڈرایا اور دھمکایا جائے جیسا کہ اسرائیل بننے کے بعد ثابت ہو چکا ہے اور اہل مغرب یہودیوں کے ذریعے مسلمان ملکوں میں افراتفری پھیلانے کا ہر کام لے رہے ہیں۔

سیاسی پیشوا

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے ... یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی ... جہاں میں ہے صفت عنکبوت ان کی کمند
خوشا وہ قافلہ، جس کے امیر کی ہے متاع ... تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

معنی: سیاسی پیشوا: سیاست کے رہنما یا امیر۔

① **معنی: خاک باز:** مٹی سے کھیلنے والے، پست خیالات والے۔ **پیوند:** تعلق۔

مطلب: آج کل کے سیاست دان یا سیاسی میدان کے رہنماؤں سے اچھائی کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے ان کے خیالات بھی پست ہیں اور یہ خود بھی پست ہیں۔ بڑائی کا ان میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ مٹی سے کھیلنے والے اور مٹی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ بلندیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

② **معنی: مور و مگس:** چیونٹی اور مکھی۔ **صفت عنکبوت:** مکڑی کے جال کی مانند۔ **کمند:** رسی کا پھندا جو شکار کو پھنسانے کے لئے یا چوری کے لئے دیوار پر چڑھنے کے لیے پھینکا جاتا ہے۔

مطلب: جس طرح مکڑی اپنے جالے میں بیٹھی اس انتظار میں رہتی ہے کہ کوئی چیونٹی یا مکھی اس کے جالی کے قریب آئے اور اسے پھانس لے اسی طرح یہ سیاست دان بھی لوگوں کو پھنسانے کے لئے اور اپنی اغراض اور مفادات کو پورا کرنے کے لئے کئی قسم کے گھٹیا طریقے استعمال کرتے رہتے ہیں اور ذلیل سے ذلیل فائدے کے لیے بھی اپنی کمندیں پھینکتے رہتے ہیں۔

③ **معنی:** **خوشا:** خوش نصیب۔ **امیر:** قافلہ، راہنما۔ **متاع:** دولت۔ **تخیل ملکوتی:** فرشتوں کا سا تخیل۔ **جذبہ ہائے بلند:** بلند جذبے۔

مطلب: وہ قافلہ (قوم) خوش نصیب ہے جس کا سالار (سیاست دان) فرشتوں جیسے خیالات اور بلند جذبات کی دولت رکھتا ہو اور جو کمینہ خصلتوں والا نہ ہو۔ ایسا سیاست دان ہی قوم کو منزل تک پہنچا سکتا ہے اور جن سیاست دانوں اور ان کی کمینگی کا پہلے شعروں میں ذکر کیا گیا ہے وہ قوموں کو اصل راستے سے بھٹکا دیتے ہیں اور اپنے مفادات اور اغراض کو پورے کرتے رہتے ہیں۔

نفسیاتِ غلامی

سخت باریک ہیں امراضِ امم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

معنی: **نفسیاتِ غلامی:** غلاموں کی ذہنی کیفیت، یہ عنوان اس کتاب میں دوسری دفعہ آیا ہے۔

① **معنی:** **امراضِ امم:** امتوں کی بیماریاں۔ **اسباب:** سبب کی جمع، وجوہات۔ **بیاں کوتاہی کرتا ہے:** بیان ساتھ نہیں دیتا۔ **سخت باریک:** بہت ہی باریک۔

مطلب: افراد کی طرح امتوں کے امراض بھی ہوتے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ امتوں کی بیماریوں کے سبب (وجوہات) بیان کرنا بڑا مشکل ہے کیونکہ یہ اسباب بال سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان بیماریوں کو تفصیل سے بیان کرنا چاہے تو اس کا بیان اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

② **معنی:** **دینِ شیری:** شیروں کا مذہب، آزاد لوگوں کا مسلک۔ **امام:** پیشوا، راہنما۔ **شیوخ:** سردار، پیر۔ **فلسفہ روباہی:** لومڑی کا فلسفہ، بزدلی اور مکاری کا فلسفہ۔

مطلب: قوموں کی بیماریوں میں سے ایک بڑی بیماری یہ ہے کہ جب کوئی قوم غلام ہو جاتی ہے اور اس میں غلامانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ لومڑی کی مانند بزدل اور مکار بن جاتی ہے اور اس کو شیروں کے طور طریقے میں یا آزاد لوگوں کے مسلک میں بھی یہی بزدلی اور مکاری نظر آنے لگتی ہے۔ غلاموں کے عوام کی بات تو چھوڑیے۔ ان کے پیشوا، راہنما، وڈیرے، سردار اور پیر بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی قوم کو شیروں کی بجائے لومڑی بننے کا سبق دیتے رہتے ہیں۔

③ **معنی:** **فرعون:** قدیم مصر کا ایک بادشاہ جو خود کو خدا کہتا تھا اور جس کی ٹکر حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

وئی تھی اور وہ شکست کھا گیا تھا۔ **قوت**: طاقت۔ در پردہ: پوشیدہ طور پر۔ **مرید**: مطیع۔ **کلیم اللہی**: حضرت موسیٰ علیہ اسلام چونکہ اللہ سے کلام کیا کرتے تھے اس لئے ان کا لقب کلیم اللہ تھا اور ان کے طور طریقے کو کلیم اللہی کہتے ہیں۔

مطلب: اگر کوئی موسیٰ صفت سردار، شیخ، وڈیرہ یا پیر ظاہر میں فرعونی اور طاغوتی طاقت کے خلاف ہو لیکن پوشیدہ طور پر (اندر ہی اندر) فرعون سے ملا ہوا ہو اور اپنے مفادات اور اغراض کی خاطر اس کا مطیع بن چکا ہو تو ایسی قوت، ایسی سرداری، ایسی پیری چاہے وہ ظاہر میں کلیم اللہ کے طور طریقے کی مانند نظر کیوں نہ آتی ہو قوم کے حق میں لعنت ہے اور غلام قوموں کی بیماریوں میں سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ اس کے راہنما چاہے وہ کسی میدان میں کیوں نہ ہوں پوشیدہ طور پر غیر ملکی اور قوم کو غلام بنانے والے آقاؤں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جس سے پوری قوم غلامی کے شکنجے میں ایسی جکڑی جاتی ہے کہ نکل نہیں سکتی۔

غلاموں کی نماز (ترکی وفد ہلال احمر لاہور میں)

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

معنی: **ترکی وفد ہلال احمر لاہور میں**: ہلال احمر، سرخ ہلال، ہلال پہلی رات کے چاند کو کہتے ہیں۔ عیسائیوں کی سرخ صلیب (ریڈ کراس کے مقابلے میں ترکوں نے مریضوں کی دیکھ بھال اور ضرورت مندوں کی امداد کے لئے سرخ ہلال (ریڈ کریسنٹ) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی جس کا وفد برصغیر کے مسلمانوں سے ملنے آیا ہوا تھا)۔

معانی: **طویل**: لمبا، **اس قدر**: اتنے، **امام**: نماز کا پیشوا، **ترکی**: ایک مسلمان ملک کا نام، **مجاہد**: اللہ کی راہ میں جنگ کرنیوالا۔

① **مطلب**: ترکوں کی انجمن ہلال احمر کے وفد کے ارکان نے برصغیر کی کسی مسجد میں جب باجماعت نماز پڑھی تو نماز کی امامت کرانے والے پیش امام کو دیر تک سجدے میں گئے ہوئے دیکھ کر ایک ترکی مجاہد نے علامہ سے سوال کیا (جو ان کے ساتھ تھے) کہ تمہاری نمازوں کے امام اتنے لمبے سجدے کیوں کرتے ہیں۔ حالانکہ تین دفعہ اس میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنے میں زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیئے۔

② **مطلب**: ترک جو کبھی کسی کے غلام نہیں رہے تھے علامہ کہتے ہیں کہ ترکی کے اس وفد کے ساتھ آنے والے مجاہدین (اللہ کی راہ میں لڑنے والوں) کو کیا معلوم تھا کہ نماز غلام کیا ہوتی ہے۔ اگر خبر ہوتی تو وہ مرد مجاہد شاید یہ سوال نہ کرتا۔ (یاد رہے اس وقت برصغیر انگریزوں کا غلام تھا)۔

③ **معنی**: **مردانِ حر**: آزاد مرد۔ **ذوق عمل**: عمل کی لذت۔ **امتوں**: اقوام۔ **مقام**: مرتبہ۔

مطلب: جو لوگ آزاد ہوتے ہیں اور آزاد قوم کے فرد ہوتے ہیں انہیں نماز کے علاوہ اور ہزاروں کام بھی کرنے ہوتے ہیں کیونکہ قوموں کے مراتب عمل اور کام کرنے کی لذت سے حاصل ہوتے ہیں۔ رزم ہو یا بزم' امن ہو یا جنگ ہر دور میں ان کے لئے ہزار قسم کی باتیں سوچنے اور کرنے کی ہوتی ہیں لیکن غلام ان ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے اور آقاؤں کی مرضی پر چلتا ہے۔ خود بے حس اور بے ذوق عمل ہوتا ہے۔

④ **معنی**: **سوزِ عمل**: کام کرنے کی حرارت۔ **محروم**: بے نصیب۔ **مرور**: گذرنے کا عمل۔ **روز و شب**: دن رات۔

مطلب: غلاموں کا جسم کام کرنے یا عمل کی حرارت سے بے نصیب رہتا ہے۔ سوائے غلامی کے اور اپنے آقاؤں کی مرضی میں ہاں سے ہاں ملانے کے اور انہیں کیا کام ہوتا ہے۔ ان کی زندگیوں کے دن رات اس طرح نہیں گذرتے جس طرح آزاد لوگوں کے گزرتے ہیں بلکہ ان پر ان کے دن رات کا گزرنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی حرام چیز کا کھالینا۔ یعنی ان کے دن رات بے کار گزرتے ہیں۔

⑤ **معنی**: **طویل سجدہ**: لمبا سجدہ۔ **تعجب**: عجیب ہونا۔ **ورائے سجدہ**: سجدے کے سوا۔

مطلب: اگر برصغیر کے غلام مسلمانوں کے امام نماز میں لمبے لمبے سجدے کرتے ہیں تو آزاد قوموں کے ترک مجاہدوں کو حیران نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آزاد قوم کے لوگوں کے لیے تو ہزاروں سینکڑوں کام کرنے کو ہوتے ہیں۔ ان بے چارے غلام قوم کے اماموں کو سوائے نماز پڑھانے اور ان میں لمبے سجدے کرکے وقت گزارنے کے اور کیا کام کرنا ہے۔

معانی: ملت: مسلمان قوم' پیام: پیغام' امام: نماز پڑھانے والا۔

⑥ **مطلب**: علامہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ ہندوستان (انگریز کے دور کے متحدہ ہندوستان / برصغیر کی بات کر رہے ہیں) کے پیش اماموں کو نماز میں ایسے سجدے کرنے کی توفیق ہو جس میں طوالت بے شک نہ ہو لیکن زندگی کا پیغام ضرور ہو اور جب وہ سبحان ربی الاعلیٰ (سب سے اعلیٰ رب کی پاکی کی بات کریں) تو قوم کو واقعی درس دیں کہ سب سے اعلیٰ اور ارفع جس کی غلامی کا شرف حاصل کرنا چاہیے خدا کی ذات ہے نہ کہ دنیا کے افراد اور اقوام۔ اس لیے انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔

فلسطینی عرب سے

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے' نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

① **معنی**: **سوز**: حرارت۔ **فارغ**: خالی۔ **آتش**: آگ۔ **وجود**: جسم۔

مطلب: عربوں نے صحرائے عرب سے اٹھ کر ایمان کے زور پر اقوام عالم پر فتح یاب ہو کر مدت تک حکومت کی ہے۔ آزادی کی حرارت عربوں کی گھٹی میں موجود ہے۔ اس تناظر میں علامہ کہتے ہیں کہ فلسطین

ے عربو! میں جانتا ہوں کہ تمہارے جسموں میں وہ آگ موجود ہے جس نے کبھی فارس اور روما کے تخت
ٹ دئے تھے لیکن یہ تمہارے انگریز حاکم (جو پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد فلسطین پر
بض ہو گئے تھے اور انہوں نے وہاں یہودیوں کو اس لیے بسانا شروع کر دیا تھا کہ اس ملک فلسطین میں
ودیوں کی ایک آزاد ریاست اسرائیل کے نام سے قائم کی جائے گی)۔ تمہاری تقریروں اور تحریروں اور
الیوں سے تمہیں آزاد نہیں کریں گے اور یہودیوں کو تمہارے ملک میں لا کر بسانے سے باز نہیں آئیں
ے تاوقتیکہ تم اسی سوز اور آگ سے کام نہ لو گے جو تمہاری سرشت میں موجود ہے۔

معنی: دوا: علاج۔ جنیوا: یورپ کے ایک ملک سوئٹزرلینڈ کا دارالحکومت جہاں اقوام متحدہ کا مرکز تھا۔
ن: انگلستان کا دارالحکومت' انگریز حاکم کا دارالحکومت۔ رگ جاں: جان کی رگ۔ پنجہ یہود: یہودی کا
۔

طلب: تیرا علاج جہاد میں پوشیدہ ہے۔ اپنے بدن کی حرارت کو عمل میں لا کر آزادی حاصل کرنے میں
ے نہ اس میں کہ تو جنیوا میں جا کر اقوام متحدہ سے فریاد کرے یا انگلستان میں جا کر انگریزوں کی منت کرے
ہ وہ تمہارے ملک میں یہودیوں کو لانے اور لا کر بسانے سے باز رہیں۔ وہاں تمہاری بات کوئی نہیں سنے
ے کیونکہ ان اہل مغرب کی جان کی رگ جو اقوام متحدہ بنائے بیٹھے ہیں یا انگریزوں کی جان کی رگ جو
ارے ملک کے حاکم بنے ہوئے ہیں' یہودیوں کے پنجے میں ہے۔ کیونکہ یورپ کے سارے ملکوں
وصاً مغربی ملکوں (انگلستان سمیت اور آج امریکہ سمیت) کی تجارت' صنعت' اور اقتصادیات پر یہودی
بض ہو چکے ہیں اس لیے انگریز وہ کچھ کریں گے اور اقوام متحدہ وہ کچھ کرے گی جو یہودی چاہیں گے۔
ں لیے اقوام متحدہ یا انگلستان کے پیچھے دوڑنے کی بجائے اپنی خودداری سے کام لو اور اپنی جدوجہد کے سوز سے
ریزوں اور یہودیوں کو اپنے ملک سے باہر پھینک دو۔

معنی: نجات: چھٹکارا۔ خودی: خودشناسی' خود آگاہی۔ لذت نمود: عمل میں لانے کی لذت۔

طلب: علامہ کہتے ہیں کہ میں نے تجربہ کار' اور بزرگ لوگوں سے یہ بات سن رکھی ہے کہ اگر کوئی غلام
م غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے پہلے اپنے اندر اپنی خودی کو بیدار کرنا چاہیے۔ اپنی خود
گاہی حاصل کر کے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے آشنا ہونا چاہیے اور پھر ان کو عمل میں لا کر آقاؤں اور
وں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ اسی میں آزادی کا راز پوشیدہ ہے۔ اقوام متحدہ یا انگریزوں کے
منے مطالبات پیش کرنے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

مشرق و مغرب

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید ۔۔۔ وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے' نہ مغرب اس سے بری ۔۔۔ جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

معنی: یہاں: یعنی مشرق میں۔ وہاں: یعنی مغرب میں۔ مرض: بیماری۔ تقلید: پیروی۔ نظام
جمہوری: ایسا سیاسی نظام جس میں بندوں کی منتخب شدہ حکومت بندوں پر ہوتی ہے اور خدا کی حاکمیت اس میں

سے غائب کر دی جاتی ہے۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں کہ مشرق اور مغرب دونوں بیماریوں میں مبتلا ہیں ان سے لوگوں کی فلاح نہیں ہو سکتی۔ مشرق کی بیماری یہ ہے کہ یہاں کی قومیں غلامی پر رضامند ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے آقاؤں کی پیروی کر رہی ہیں۔ اور مغرب میں ایک ایسا جمہوری نظام قائم ہے جہاں خدا کی بادشاہت کی بجائے بندوں کی بادشاہت قائم کر دی گئی ہے اور اس کا نظام جمہوریت رکھ دیا گیا ہے جس کا مطلب ہے، بندوں کی حکومت بندوں پر بندوں کی طرف سے انتخاب حکومت کے ذریعے۔

② **معنی**: بری: نجات یافتہ، آزاد۔ **قلب و نظر کی رنجوری**: دل اور نظر کی بیماری۔

مطلب: مشرق میں اگر لوگ غلامی پر رضامند ہیں اور اپنے آقاؤں کی تقلید کر رہے ہیں اور مغرب میں اگر بے خدا جمہوری نظام قائم ہے اور دونوں ان بیماریوں سے آزاد اور نجات یافتہ نہیں ہیں تو اس کا سبب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ دونوں خطوں کے لوگوں کے دل اور نظر بیماری میں مبتلا ہیں۔ نہ وہ صحیح دیکھتے ہیں اور نہ صحیح محسوس کرتے ہیں فقط شکم پروری اور تن زیبی میں لگے ہوئے ہیں دل کی قوت اور نظر کی صلاحیت کو بھول چکے ہیں۔ اگر انکے اور دل و نظر بیدار ہو جائیں تو دونوں خطوں کی قوموں کی بیماریاں دور ہو جائیں۔

نفسیات حاکمی

(اصلاحات)

مہر ہے بے مہری صیاد کا پردہ — آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں — شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری

معنی: نفسیات حاکمی: حکومت کرنے کی ذہنیت۔ **اصلاحات**: انگریزوں نے برصغیر کے لوگوں کو اصلاحات کے نام پر کچھ سیاسی مراعات دی تھیں جن کو یہاں کے لوگوں نے بڑا غنیمت سمجھا تھا حالانکہ یہ حاکموں کی اپنی حاکمیت کے عرصہ کو دراز کرنے ہی کی ایک اسکیم تھی۔

①② **معنی**: مہر: محبت، مہربانی۔ **بے مہری**: جفا، ظلم۔ صیاد: شکاری۔ پردہ: راز کی بات۔ **قفس**: پنجرہ۔ اسیر: قیدی۔ **کام نہ آئی**: میرا کام نہ بنا سکی۔ **تازہ صفیری**: تازہ نوا، نئی آواز، میرا کلام، میری شاعری۔

مطلب: علامہ نے یہاں باغ، پرندہ، شکاری، پنجرہ اور پرندے کی آواز کی علامات سے حاکم قوم کی حاکمانہ ذہنیت کی بات سمجھائی ہے۔ انگریزوں نے مختلف وقتوں میں برصغیر کے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جو اصلاحات نافذ کی تھیں اور جن کی بنا پر وقتی طور پر غلاموں کا جوش نرم اور حاکموں کی حاکمیت طویل ہو گئی تھی اس عمل کو سمجھاتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایسے ہی ہوا ہے جیسا کہ صیادی کسی قید پرندے کو پنجرے میں زیادہ دیر تک رکھنے اور اس کی تسلی کے لیے کہ شاید وہ باغ کی آزاد فضا ہی میں ہے مرجھائے ہوئے پھول رکھ دیتا ہے۔ یہ ظاہر تو یہ اس پرندے پر مہربانی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں اس

ظلم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح وہ قید سے مزید مانوس ہو جاتا ہے اور اسے پسند کرنے لگتا ہے۔ برصغیر کے لوگوں کے ساتھ بھی انگریزوں نے وہی عمل کیا جو شکاری پرندے کے ساتھ کرتا ہے اور ان کو اصلاحات کے کچھ تحفے دے کر غلامی پر رضامند کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ دراصل ان لوگوں پر مہربانی نہیں تھی بلکہ ظلم تھا کیونکہ اس سے غلام کی قید اور طویل ہو گئی اور جو آوازیں ان لوگوں نے یا علامہ نے اپنی شاعری کے ذریعے نکالی تھیں وہ سب بے کار ہو کر رہ گئیں۔ اور لوگوں نے اصلاحات انگریز کو آزادی کا بدل سمجھ کر گلے سے لگا لیا۔

محراب گل افغان کے افکار

تعارف

محراب گل ایک افغانی (پٹھان) کا نام ہے۔ یہ ناول اور افسانہ کے کرداروں کی طرح ایک فرضی کردار کا نام ہے۔ جس کے ذریعے علامہ نے پٹھانوں (افغانوں) کی خودی بیدار کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر سرحد کے غیور افغان اپنی خودی (خود آگاہی) کو پہچان کر اٹھ کھڑے ہوں تو برصغیر کو انگریزوں سے آزاد کرانا آسان ہو گا اس عنوان کے تحت اقبالؔ نے بیس نظمیں لکھی ہیں۔

①

میرے کہستاں! تجھے چھوڑ کے جاؤں کہاں — تیری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک

روزِ ازل سے ہے تو منزلِ شاہین و چرغ — لالہ و گل سے تہی، نغمۂ بلبل سے پاک

تیرے خم و پیچ میں میری بہشتِ بریں — خاک تری عنبریں! آب ترا تاب ناک

باز نہ ہو گا کبھی بندۂ کبک و حمام — حفظ بدن کے لیے روح کو کردوں ہلاک

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا — خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

① **معنی: کہستان:** پہاڑوں کا سلسلہ۔ **اب وجد کی خاک:** باپ دادا کی قبریں۔

مطلب: اے میرے سامنے پھیلے ہوئے پہاڑوں کے سلسلے میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا کیونکہ تو میرا ہی نہیں میرے باپ دادا کا بھی مولد (پیدا ہونے کی جگہ) اور وطن (رہنے کی جگہ ہے) اور میرے باپ دادا کی مٹی کا تو امین ہے۔ یعنی ان کے جسم تیری مٹی میں دفن ہیں۔

② **معنی:** **روزِ ازل:** آغاز دنیا سے۔ **شاہین:** باز، شہباز۔ **چرغ:** باز کی طرح کا ایک شکاری پرندہ جو چیلوں سے لڑتا ہے۔ **لالہ و گل:** لالہ اور گلاب کا پھول۔ **تہی:** خالی۔ **نغمہ بلبل:** بلبل کی آواز۔

مطلب: جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اے میرے پہاڑی سلسلہ تو شہبازوں اور چرغوں کا وطن رہا ہے اور تیری فضا لالہ اور گلاب کے پھولوں سے خالی اور بلبل کے نغموں سے پاک رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری فضا میں نرم و نازک لوگ نہیں۔ بہادر اور مضبوط لوگ پیدا ہوتے ہیں ایسے لوگ جو خود کسی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کو شکار کرتے ہیں۔ جو آزادی کے دلدادہ اور غلامی سے بیزار ہیں۔

③ **معنی: خم و پیچ:** بل کھاتی ہوئی اور ٹیڑھی راہیں۔ **بہشت بریں:** اعلیٰ بہشت۔ **خاک:** مٹی۔ **عنبریں:**

عنبر: ایک خوشبودار مادہ' مراد عنبر کی خوشبو والا۔ آب: پانی۔ تابناک: چمکیلا۔

مطلب: اے میرے پہاڑوں کے سلسلے تیری ٹیڑھی ترچھی اور بل کھاتی ہوئی راہوں کو میں اپنی اعلیٰ جنت سمجھتا ہوں۔ تیری مٹی میرے لیے عنبر کی مانند خوشبودار ہے اور تیرا پانی میرے لیے چمکیلا ہے۔

④ **معنی:** باز: شاہین۔ بندہ: غلام۔ کبک: تیتر۔ حمام: کبوتر۔ حفظ بدن: بدن کی حفاظت کے لیے' بدن یا پیٹ کی خاطر۔

مطلب: محراب گل نے اپنے پہاڑی سلسلے میں رہنے والے لوگوں کو باز سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ شاہین کی طرح دوسروں کا شکار کرنے والے ہیں۔ اور تیتر اور کبوتر کی طرح نہیں ہیں جو باز کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے غیرت مند لوگ جو شاہین کی طرح خود کبوتروں اور تیتروں کا شکار کرتے ہیں۔ تیتروں اور کبوتروں کے غلام کیسے ہو سکتے ہیں۔ ان کے غلام وہ اشخاص ہوتے ہیں جو اپنی روح کی قیمت پر اور اسے ہلاک کر کے اپنے بدن اور پیٹ کو پالتے ہیں جس طرح کہ وہ لوگ کر رہے ہیں جو انگریز کے خطاب' خلعتیں' جاگیریں اور انعامات حاصل کرنے کے لیے اپنی روحانی قدروں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں اور اپنے بدن کی زینتیں اکٹھی کر لیتے ہیں۔ یعنی دنیاوی مال و دولت۔

⑤ **معنی:** فقر غیور: غیرت والے فقیر۔ خلعت انگریز: انگریز حاکم کا دیا ہوا قیمتی لباس۔ پیرہن چاک چاک: پھٹا ہوا لباس۔

مطلب: کلام اقبال" پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فقر دو قسم کا ہے۔ ایک فقر تنگ دستی اور اس کی وجہ سے احتیاج اور گداگری کا نام ہے۔ دوسرا فقر وہ ہے جو بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا ہر کوئی اس کا محتاج ہوتا ہے۔ اب اقبال' اپنے اس فقرے بہ زبان محراب گل افغان پوچھتے ہیں کہ تجھے بے احتیاج فقر قبول ہے یا انگریز حاکم کی خدمت کر کے اس سے قیمتی لباس پہننا پسند ہے۔ فقر بے احتیاج میں بوریائے فقر اور پھٹا ہوا لباس تو ضرور ہو گا لیکن دل ہر چیز سے بے نیاز ہو گا۔ اب تو ہی بتا کہ تجھے انگریز حاکم کی خدمت کر کے قیمتی لباس چاہیے یا آزاد رہ کر بوریائے فقیری اور لباس فقیری پسند ہے۔ فقر غیور لازماً چاک چاک لباس کو انگریز کی عطا کی ہوئی خلعت پر ترجیح دے گا۔

②

حقیقتِ ازلی ہے رقابتِ اقوام — نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز' نہ تو
خودی میں ڈوب زمانے سے ناامید نہ ہو — کہ اس کا زخم ہے درپردہ اہتمامِ رفو
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا — اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہ'

① **معنی:** حقیقت ازلی: ہمیشہ کی حقیقت' جب سے جہان پیدا ہوا ہے اس وقت سے حقیقت۔ رقابت: دشمنی۔ نگاہ پیر فلک: بوڑھے آسمان کی نگاہ میں۔ عزیز: پیارا۔

مطلب: جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے یہ حقیقت موجود ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی دشمن رہی ہے اور دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتی رہی ہے اور کرتی ہے اور جو قوم مضبوط ارادے اور عمل

والی ہوتی ہے وہ دوسرے پر بازی لے جاتی ہے۔ اے مخاطب اس بوڑھے آسمان کی نظر میں کوئی فرد یا کوئی قوم پیاری نہیں۔ کامیابی اس کو نصیب ہوتی ہے جو عمل میں بڑھ چڑھ کر ہے۔ قوت میں زیادہ ہے۔ اپنے ارادے اور ایمان میں مضبوط ہے۔

② **معنی**: در پردہ: پوشیدہ طور پر۔ **اہتمام رفو**: سینے کا بندوبست۔

مطلب: فرد اور قوم کی ترقی اور وجود کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خودی یعنی خود معرفتی یا خود آگاہی میں ڈوبی ہوئی ہو۔ جو فرد یا جو قوم خود آگاہ ہو گی اگر زمانہ اسے زخم بھی لگائے گا۔ تو خودی کے زور پر وہ اس زخم کو سی لے گی اس لیے زمانے کی شکایت کرنے کی بجائے فرد یا قوم کو خودی (خود آگاہی) سے آشنا ہونا چاہیے' جو ہر زخم زمانہ کا علاج ہے۔

③ **معنی**: **یگانہ و یکتا**: بے مثل اور اکیلا۔ **لا شریک لہ**': اس کا یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ وہ واحد اور بے مثل ہے۔ توحید۔

مطلب: اگر تیرے دل میں یہ بات سما جائے کہ اللہ واحد ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کی مثل کوئی نہیں ہے۔ اور تو اس نظریہ توحید پر پوری طرح کاربند ہو جائے تو اے مسلمان اقوام عالم میں تو بھی سربلند' برگزیدہ' اور بے مثل رہے گا۔ تیری ہمسری اور برابری کرنے والا کوئی اور نہیں ہو گا۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ "**انتم الا علون ان کنتم مومنون**" کہ تمہیں سب پر حاوی ہو گے اگر تم مومن ہو گے اور مومن وہ ہے جو زبان اور دل سے کلمہ توحید کا اقرار کر کے اپنی زندگی کو بھی اس کے مطابق بنائے۔

③

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی — مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا — عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
وہی شراب وہی ہائے و ہو رہے باقی — طریقِ ساقی و رسمِ کدو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری — مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

① **مطلب**: علامہ نے اس شعر میں دعا کا ایک عجیب نکتہ پیش کیا ہے۔ دعا کرنے سے یہ ضروری نہیں کہ جس قضا (تقدیر) کو تو بدلنا چاہتا ہے وہ بدل جائے لیکن یہ تو ممکن ہے کہ اس کو بدلنے کے لیے جس عزم (ارادہ) اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے وہ تجھ میں پیدا ہو جائے اور تیرا یہ ارادہ اور تیرا یہ عمل تیری آرزو کے مطابق نتائج بر آمد کرے۔ اس لیے دعا بھی کرتا رہ اور عمل سے بھی غافل نہ رہ۔

معانی: **انقلاب**: تبدیلی' **خودی**: خود شناسی' **چار سو**: چاروں طرفیں۔

② **مطلب**: اگر تیری خودی (خود معرفتی اور خود آگاہی) مردہ ہو چکی ہے تو اس کو زندہ کرنے سے اور اس میں تبدیلی پیدا کرنے سے اگر تیری آرزو کے مطابق تیرا ماحول اور تیری چاروں طرفیں یعنی سارا جہان بدل جائیں تو کوئی عجیب بات نہیں۔ تبدیلی کا انحصار تیری خود آگاہی اور اپنے آپ کو پہچان کر اپنا مقام حاصل کرنے پر ہے۔

③ **معنی**: ہائے و ہو: رندوں کا شور مستانہ۔ **طریق ساقی**: پلانے والے کا طریقہ۔ **رسم کدو**: پیالے کا

انداز۔

مطلب: اگر تیری خودی میں انقلاب آ جائے تو شراب پلانے والے کا پلانے کا طریقہ اور پیالوں کا صراحیوں میں شراب بھرنے کا انداز بدل جائے گا اگرچہ شراب وہی ہو گی اور شرابیوں کی ہائے و ہو (شورِ مستانہ) بھی وہی رہے گی۔ اس شعر میں میخانے کی علامات استعمال کر کے یہ بات سمجھائی ہے کہ تیری خودی میں انقلاب سے یا اس کے پیدا ہونے سے تجھ پر اللہ کرم ہو جائے گا۔ اور ساقی ازل کی نگاہ کرم سے تیری شراب اور شراب پی کر تیرا مستانہ شور بھی رہے گا لیکن نتائج مختلف ہوں گے۔ وہی ارادہ اور وہی عمل بیداری خودی کے بعد نیا رنگ لائے گا۔

معانی: دعا: اللہ سے التجا، آرزو: تمنا، خواہش۔

④ **مطلب:** تیری دعا تو یہ ہے کہ جو تیرے دل کی آرزو یا خواہش ہے وہ پوری ہو جائے لیکن تیری یہ آرزو چونکہ ایسی حالت میں ہو گی جب کہ تیری خودی بیدار نہیں ہو گی اس لیے نہ تیری خواہش صحیح ہو گی اور نہ دعا پورا ہونے پر اس کے نتائج صحیح ہوں گے۔ اس لیے میری دعا یہ ہے کہ تیری آرزو (خواہش) بدل جائے اور وہ اسی وقت بدل سکتی ہے جب تیری خودی میں انقلاب آ جائے اور وہ مردگی اور پژمردگی ختم ہو جائے جو تجھ پر چھائی ہوئی ہے۔ اور تیرے اندر خود کو بدلنے کی آرزو پیدا ہو جائے۔

④

کیا چرخِ کجرو، کیا مہر، کیا ماہ — سب راہرو ہیں وا ماندۂ راہ
کڑکا سکندر بجلی کی مانند — تجھ کو خبر ہے اے مرگِ ناگاہ
نادر نے لوٹی دلی کی دولت — اک ضربِ شمشیر! افسانہ کوتاہ
افغان باقی! کہسار باقی — الحکم للہ! الملک للہ
حاجت سے مجبور مردانِ آزاد — کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ
محرم خودی سے جس دم ہوا فقر — تو بھی شہنشاہ، میں بھی شہنشاہ
قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش — جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

① **معنی:** چرخِ کج رو: ٹیڑھی چال چلنے والا آسمان۔ عام عقیدہ ہے کہ زمانے کے انقلابات آسمان کی چال پر منحصر ہیں۔ مہر: سورج۔ ماہ: چاند۔ راہرو: مسافر، راہ چلنے والا۔ وا ماندہ راہ: راستہ میں پیچھے رہ جانے والا، تھکا ہوا۔

مطلب: چاہے ٹیڑھی چال چلنے والا آسمان ہو اور چاہے سورج اور چاند ہوں سب راہ چلنے والے یا مسافر ہیں۔ یہ سب کے سب اگرچہ سفر مسلسل کی وجہ سے تھکے ہوئے ہانپتے ہیں لیکن پھر بھی چلتے رہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ زمانے میں کوئی شے بھی مستقل نہیں ہے۔ کسی کی حالت ایک جیسی نہیں رہتی۔ اشیا ایک حالت سے دوسری حالت میں اور مسافر ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ دنیا میں کوئی شے بھی ہمیشہ رہنے والی یا ساکن و ثابت نہیں ہے۔

② **معنی:** سکندر: قدیم یونان کا ایک فاتح۔ بجلی کی مانند کڑکا: ملکوں کو تیزی میں فتح بھی کیا اور جلد مر بھی

یا۔ مرگ ناگاہ: اچانک موت۔ نادر: ایران کا ایک بادشاہ جس نے مغلوں کے آخری دور میں دلی کو فتح کر کے
ل عام کیا۔ ضرب شمشیر: تلوار کی کاٹ۔ افسانہ کوتاہ: قصہ مختصر

مطلب: چونکہ زمانے کی کسی چیز کو بھی ثبات نہیں اس لیے علامہ نے دو ایسے فاتحین کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق افغان علاقے کی فتح سے تھا اور جن میں سے ایک یعنی نادر خود افغان تھا۔ اور بتایا ہے کہ باوجود اتنے بڑے فاتح ہونے کے دونوں فاتحین (سکندر اور نادر) کا اب نام و نشان باقی نہیں۔ سکندر یونانی اپنے ملک سے بجلی کی طرح کڑکتا ہوا نکلا اس نے افغان علاقہ سمیت پنجاب تک کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔ لیکن واپسی پر اچانک مر گیا۔ سکندر کی طرح نادر شاہ بھی ایک عظیم فاتح تھا۔ اس نے دور زوال کے مغل بادشاہ محمد شاہ کے زمانے میں دلی کو فتح کیا۔ اسے برباد کیا۔ اس کی دولت لوٹی۔ اس کے باشندوں کا قتل عام کیا لیکن چند سال بعد اپنے امیروں کی سازش کی بنا پر انہیں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ایک تلوار کے وار نے اس کی سلطنت اور زندگی کا قصہ مختصر کر دیا۔

④ **معنی:** کہسار: پہاڑوں کا سلسلہ۔ الحکم للہ: حکم اللہ کا ہے۔ الملک للہ: ملک اللہ کا ہے۔

مطلب: یہ بات سچ ہے کہ سکندر اور نادر نے یا ان جیسے اور فاتحین نے بڑی بڑی فتوحات کیں بڑے بڑے ملکوں اور بڑی بڑی قوموں کو اپنے زیر نگیں کیا لیکن آج ان کا نام نشان باقی نہیں۔ البتہ دنیا ابھی تک اسی طرح باقی ہے۔ دنیا کی قومیں باقی ہیں جیسا کہ اے افغانو تمہارے پہاڑوں کا سلسلہ باقی ہے اور تمہاری قوم باقی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اصل بادشاہی اللہ کی ہے جو قائم و دائم ہے۔ ملک اور ان پر حقیقی حکمرانی بھی اس کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے۔ باقی سب کی سلطنت فانی اور سب کا حکم عارضی ہے۔

⑤ **معنی:** حاجت: احتیاج، ضرورت۔ روباہ: لومڑی، بزدل اور مکار بن جانا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے ایک اصول بیان کیا ہے کہ احتیاج اور ضرورت ایک ایسی نامراد شے ہے کہ اس کو پورا کرنے کے لیے بعض اوقات آزاد لوگ بھی دوسروں کے غلام بن جاتے ہیں۔ یہ احتیاج ایسی بری چیز ہے کہ شیروں کو (بہادروں کو) لومڑی (بزدل اور مکار) بنا دیتی ہے۔ اور لوگ اپنے آقاؤں کی خوشامد کر کے اپنی خودی کو چھوڑ کر اور اپنی بہادری اور آزادی کو ایک طرف رکھ کر اپنی احتیاجات پوری کرنے لگ جاتے ہیں۔ خصوصی لوگوں کو چھوڑ کر عام لوگوں کا یہی دستور ہے۔

⑥ **معنی:** محرم: آشنا۔ دم: وقت۔ خودی: خود شناسی۔ فقر: درویشی۔ شہنشاہ: بادشاہوں کا بادشاہ۔

مطلب: فقر اگر احتیاج کی بنا پر اپنے مقام سے گر نہ جائے اور اپنے مقام سے آگاہ ہو اور اپنی خود معرفتی و خود شناسی سے واقف ہو تو پھر وہ کسی کا محتاج نہیں رہتا دوسرے اس کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ فقیر اللہ کی تسلیم و رضا پر بھروسا کئے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسا درویش دیکھنے میں بوریائے فقر پر بیٹھا ہو گا۔ پھٹا ہوا لباس اس کے تن پر ہو گا، بال اس کے بکھرے ہوئے ہوں گے لیکن وہ اپنی احتیاج کسی کے پاس نہیں لے جائے گا صرف اللہ پر بھروسہ رکھے گا اور یہ چیز اسے بادشاہوں کا بادشاہ بنا دیتی ہے۔

⑦ **معنی:** مرد درویش: فقیر، ولی، صوفی۔ درگاہ: بارگاہ، دربار۔

مطلب: کلام اقبال" کا یہ خاص موضوع ہے کہ جو فقیر مرد ہوتا ہے وہ اللہ کے سوا ہر کسی سے بے نیاز

ہوتا ہے۔ اور تسلیم و رضائے الٰہی پر پہنچ کر خود میں ایسی قوتیں پیدا کر لیتا ہے کہ اس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ افسوس آج اس قسم کے بے نیاز، بے احتیاج اور خدا رسیدہ فقیر نہیں رہے بلکہ ایسے درویش رہ گئے ہیں جو نفس پرست، دنیادار اور جاہ حشمت سے مرعوب ہونے والے ہیں اور اپنی دنیاوی اور نفسانی اغراض کے لیے سرکاری درباری ماحول میں جانا پسند کرتے ہیں۔ ایسے درویش مسلک فقر کیلئے باعث ذلت ہیں اس کے برعکس ایسا درویش جو بارگاہ میرو سلطاں سے بے نیاز ہو بلکہ میرو سلطاں اس کے آستانہ پر حاضری دینے اور اس کی قدم بوسی کو فخر سمجھتے ہوں وہ افراد و اقوام کی قسمت اللہ کی عطا کی ہوئی قوتوں سے ایک نظر میں بدل سکتا ہے اور (تاریخ تصوف ایسے واقعات سے پر ہے)

⑤

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے رواں رو
اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دو

فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنرمند
شام اس کی ہے مانندِ سحر صاحبِ پرتو

وہ صاحبِ فن چاہے تو فن کی برکت سے
ٹپکے بدنِ مہر سے شبنم کی طرح ضو

① **معنی**: غوغائے رواں رو: بھاگ دوڑ کا شور و غل۔ عیش فراواں: زیادہ خوشی۔ لحظہ: لمحہ۔ غم نو: نیا غم۔

مطلب: اس شعر میں جدید مدرسوں کی بات کرتے ہوئے علامہ بزبان افغان کہتے ہیں کہ اس میں اس علم کا فقدان ہے جو انسان کو اپنی معرفت سکھاتا ہے اور آدمی کو جانور نہیں بننے دیتا اور اس کے نتیجے میں ان مدرسوں میں کھیل کود اور دوڑ دھوپ کا شور و غل زیادہ ہے۔ طالب علم اس کھیل کود کے ماحول کو خوشی کا بڑا سامان سمجھتے ہوئے اسی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ عیش وقتی طور پر تو اس کے دل کو خوش رکھتا ہے لیکن اس زندگی کو نئے نئے غموں سے آشنا کر دیتا ہے اور اس کی واحد وجہ علم کے مقاصد کا غلط ہونا ہے۔

② **معنی**: احرار: آزاد لوگ۔ دو کف جو: جو کی دو مٹھیاں، دو روٹیاں، پیٹ کا دھندہ۔

مطلب: مغربی علوم جو ہماری درس گاہوں میں پڑھائے جاتے ہیں ان کا مقصد طالب علموں کو روح سے آشنا کرانا نہیں بدن پالنے کے طریقے سکھانا ہے۔ ہمارے مدرسے جو تعلیم دے رہے ہیں وہ تن پروری اور شکم بھرنے کے لیے ہے۔ انسانی اقدار پیدا کرنے کے لیے نہیں ہے۔ یہ علم بندہ آزاد کے حق میں زہر کا کام کرتا ہے اسکے اندر سے آزادی کے جذبے کو کھینچ کر لے جاتا ہے اور اسے پیٹ کی غلامی اور اسکی وجہ سے اسے سرکار کی غلامی کرنا سکھاتا ہے۔ یہ علم صرف دو جو کی روٹیوں کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ یعنی تن پروری اور شکم پروری اور نوکری چاکری کرنے کے سوا اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے پیٹ بھرنے کے طریقے تو آ جاتے ہیں لیکن سینہ بے نور ہو جاتا ہے۔ تن اجلا ہو جاتا ہے اور من میلا ہو جاتا ہے اور جدید علم پڑھے ہوئے مسلمان اپنی اسلامی اقدار سے ناواقف انسان نما حیوان بن جاتے ہیں۔

③ **معنی**: ادب: شاعری اور دوسرے اصناف ادب۔ فلسفہ: عقلی و فکری علم۔ اسباب: سبب کی جمع،

وجہ۔ ہنر: فن۔ تگ و دو: دوڑ دھوپ، کوشش۔ ناداں: بے وقوف۔

مطلب: اے بے وقوف شخص عقلی و فکری علوم پڑھنے یا شعر و شاعری اور ادب کے دوسرے اصناف سیکھنے میں کوئی عملی فائدہ نہیں ہے۔ اس کی بجائے کوئی ہنر کوئی فن سیکھ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کوشش کرے ایسے ہنر سیکھنے سے جس پر یورپی فکر و علم کا منفی اثر نہ ہو انسان روزی کمانے کے قابل بھی ہو جاتے اور انسان بھی رہے۔

④ **معنی:** **نوامیس:** جمع پوشیدہ راز۔ **غالب:** مسلط، چھایا ہوا۔ **ہنرمند:** ہنر والا۔ **مانند سحر:** صبح کی طرح۔ **صاحب پرتو:** دھوپ والا، اجالے والا، روشنی والا۔

مطلب: جو شخص ہنر جانتا ہے وہ قدرت کے پوشیدہ رازوں پر چھایا ہوا یا اس پر مسلط ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہنر سے قدرت کی اشیا سے مختلف کام لے لیتا ہے اس کی شام بھی اس کی صبح کی مانند روشن ہوتی ہے۔ کاریگر ساری زندگی اپنے ہاتھ کی کمائی کی وجہ سے خوش حال رہتا ہے اور قدرت کے نئے نئے قوانین دریافت کر کے لوگوں کے لیے سودمند کام کرتا رہتا ہے۔

⑤ **معنی:** **صاحب فن:** اہل فن، فن کا مالک۔ **بدن مہر:** سورج کا جسم۔ **شبنم:** اوس۔ **ضو:** روشنی۔

مطلب: اہل فن کو اللہ نے یہ قدرت علم ایجاد دی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ ناممکن کو بھی ممکن کر سکتا ہے اور چاہے تو سورج کے جسم سے اس طرح روشنی ٹپکا دے جس طرح اوپر سے اوس ٹپکتی ہے۔

⑥

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

① **معنی:** **عالم ایجاد:** ایجاد کی دنیا۔ **صاحب ایجاد:** ایجاد کرنے والا، موجد۔ **طواف:** پھیرے لینا، چکر کاٹنا۔

مطلب: جو شخص ایجاد یعنی نئی نئی چیزیں دریافت کرنے اور بنانے والی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور جسے لوگ ایجاد کا مالک یا نئی نئی چیزوں کو دریافت کرنے والا یا موجد کہتے ہیں۔ ہر زمانہ میں اس کی قدر و منزلت رہی ہے اور زمانہ اس کے پھیرے لیتا رہا ہے یعنی اہل زمانہ میں وہ بہت مشہور و مقبول رہا ہے۔

② **معنی:** **تقلید:** پیروی۔ **ناکارہ:** بے کار۔ **خودی:** خود آگاہی۔ **گوہر:** موتی۔ **یگانہ:** بے مثل۔

مطلب: اے شخص تو بھی نئی نئی چیزیں اور دنیا دریافت کرنے کی طرف دھیان دے۔ محض اپنے زمانے کی پیروی نہ کر اور اندھا دھند اس کے پیچھے نہ چل ورنہ تیری خودی (خود آگاہی اور خود شناسی) کا وہ گوہر (گوہر/موتی) جو بے مثل ہے بے کار ہو جائے گا۔

③ **معنی:** تجدید: نیا پن۔ تصور: خیال۔ بزم شبانہ: رات کی مجلس۔

مطلب: جو قوم کبھی راتوں کی عیش و عشرت میں مشغول رہتی تھی یعنی لہو ولعب میں مشغول اور بے عمل تھی اب اس کے دل میں بھی نئی دنیا آباد کرنے اور قدیم غلط روایات کی پیروی سے باز آنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے یہ اس کے لیے نیک فال ہے۔ خدا کرے وہ بھی اجتہاد (پرانی روایات کو جدید تقاضوں کے مطابق کرنے) سے کام لے کر دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو جائے لیکن اس طرح کہ اپنا مرکز عقائد نہ چھوڑے

④ **معنی:** آوازہ: غلغلہ دھوم۔ **تجدید:** نئی دنیا آباد کرنا۔ **تقلید فرنگی:** اہل مغرب کی پیروی۔

مطلب: اس سے پہلے شعر میں علامہ نے مشرقی اقوام خصوصاً مسلمانوں کو اس بات پر مبارک باد دی ہے کہ ان کے دلوں میں بھی قدیم زمانے کی اندھا دھند تقلید (پیروی) کی بجائے نیا جہان آباد کرنے اور نئی نئی ترقیاں کرنے کا خیال پیدا ہو رہا ہے لیکن اس مبارک باد کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہہ بھی کر رہے ہیں کہ یہ ترقی ایسی نہ ہو کہ ہم تہذیب، تمدن، ثقافت وغیرہ میں اہل مغرب کی پیروی کرنے لگیں اور ان کی طرح انسانی اقدار کو برباد کر بیٹھیں۔ یہ ترقی اور تجدید اس طرز پر ہونی چاہیے کہ اپنی مذہبی اور انسانی اقدار بھی قائم رہیں اور ترقی بھی حاصل ہو جائے۔

⑦

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں! اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا ہے
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

① **معنی:** رومی: ملک روم کے باشندے۔ **شامی:** ملک شام کے باشندے۔ **فرزند کہستان:** پہاڑ کے بیٹے پہاڑوں میں رہنے والے۔ **خودی:** خود آگاہی۔

مطلب: اس پوری نظم میں اقبال نے محراب گل افغان کی زبان سے افغان قوم کو جو پہاڑوں اور اس کی وادیوں میں برصغیر کے شمالی حصے اور افغانستان میں رہتی ہے۔ یہ پیغام دیا ہے کہ ہندوستان، روم اور شام کے ملکوں کے لوگ بدل رہے ہیں، اور ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں تو بھی اے افغان اپنی شناخت کر، خود کو پہچان کہ تیرے اندر قدرت نے کیا طاقتیں اور صلاحیتیں رکھی ہوئی ہیں اور ان سے کام

لے کر تو بھی غلامی و محکومی اور غریبی و ناداری کی زندگی سے نکل اور دنیا کی قوموں کی ترقی یافتہ صفوں میں شامل ہو جا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اپنی قومی اور مذہبی شناخت کو نہ بھولے اور اہل مغرب کی پیروی کر کے ان جیسا نہ ہو جائے۔

② **معنی**: **وافر**: ضرورت سے زیادہ۔ **زرخیز**: اچھی فصلیں دینے والی۔ **کھیت سینچنا**: کھیت کو سنوارنا۔ **دہقان**: کسان۔

مطلب: اے افغان! اللہ تعالیٰ نے تیرے علاقے کا موسم اور تیرے خطے کی زمین ایسی بنائی ہے کہ یہ سب کچھ اچھی فصلیں پیدا کرنے کے لیے بہت مفید ہے۔ یہاں پانی ضرورت سے زیادہ ہے۔ مٹی فصلیں اگانے کی بڑی اہلیت رکھتی ہے۔ موسم ان فصلوں کو اگانے اور بڑھانے کے لیے بڑے سازگار ہیں۔ ضرورت صرف محنت کی ہے۔ اے خود کو بھول جانے والے اور اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں کو بھلا دینے والے افغان خود کو پہچان اور ایک اچھے کسان کی طرح محنت کر کے اپنی زمین سے اچھی فصلیں لے۔ جو کسان موافق حالات کے باوجود اپنی زمین کو فصلیں اگانے کے قابل نہ بنائے وہ بھی کیا کسان کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اٹھ غفلت چھوڑ، زمین تیار کر، محنت سے کام لے۔ قدرت تیری جھولیاں بھر دے گی۔

③ **معنی**: **تند**: تیز۔ **طوفان**: سیلاب، **تلاطم**: لہر، موج

مطلب: یہاں دریا اور طوفان کی مثالیں دے کر افغانوں کو احساس محرومی دلانے اور پھر ان کے اندر اس محرومی سے نکلنے کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ محراب گل اپنی قوم کو کہتا ہے کہ جس دریا کی موجیں اونچی نہیں وہ دریا کہلانے کے قابل نہیں جس طوفان کی ہوائیں تیز نہیں وہ طوفان کہلانے کا مستحق نہیں تو اپنے دریا کی لہروں میں بلند موجیں پیدا کر اور اپنے طوفان حیات کی ہواؤں میں تیزی پیدا کر تاکہ تیرا جوہر بھی کھلے اور تو بھی کسی گنتی اور شمار میں آ سکے۔ تیرے اندر سب صلاحیتیں موجود ہیں۔ کمی ہے تو یہ کہ تو اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں سے آشنا نہیں۔ ان کو پہچان اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو جا۔

④ **معنی**: **خاک**: مٹی، زمین۔ **اپنا آپ پانا**: اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں کا پتہ چلانا۔ **دہقانی**: کسانی۔ **سلطانی**: شاہی۔

مطلب: جس کسان نے اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں سے کام لے کر اپنی زمین کو قابل کاشت بنایا اور اس میں سے فصلیں لے کر اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں کی پہچان کی اس کی کسانی پر شاہی قربان کی جا سکتی ہے۔ بادشاہ تو خراج کا محتاج ہے۔ محصولات کا لینے والا ہے۔ تو تو اس زمین کا مالک ہے جو فصلیں دیتی ہے اور غریب و امیر کو پالتی ہے اور بادشاہ تیرے محصول اور تیرے خراج کے محتاج ہیں۔ ضرورت اے افغان کسان صرف خود کی پہچان کرنے غفلت سے جاگنے اور کام کرنے کی ہے۔

معانی: **لاج رکھنا**: عزت رہ جانا۔ **بے علمی**: انگریزی علوم کا نہ پڑھنا۔ **علامۂ فاضل**: بہت پڑھے لوگ۔

⑤ **مطلب**: سرحد کے غیور افغان جدید علم سے بے بہرہ ہیں اور عام پڑھائی بھی نہ پڑھے ہوئے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ البتہ قرآن کریم ناظرہ پڑھے ہوئے ہیں اس لیے انہیں پڑھا ہوا ہی کہنا چاہیے۔ آج کے دور کے اہل علم اور عقل و دانش میں فضیلت رکھنے والے اپنے ایمان کو دنیا کے عوض بیچ رہے

ہیں اور یاد رکھو اصل دولت ایمان ہے عمل بعد میں آتا ہے۔ ایمان صحیح ہو گا تو عمل بھی کار آمد ہو گا۔ محراب گل اپنی قوم سے کہہ رہا ہے کہ دور حاضر کے علمائے دین اور علمائے علوم جدید سے تو تم ان پڑھ بہتر ہو۔ تمہارا ایمان تو پختگی کی حد تک سلامت ہے۔ تمہاری بے عملی نے بے عملوں کی عزت رکھ لی ہے۔ اس لئے کہ لوگ سوچتے ہیں کہ جدید علوم پڑھنے سے یا ایسے علوم پڑھنے سے جن سے ایمان بک جائے کچھ نہ پڑھنا اچھا ہے۔ اے افغان اپنی خودی کو پہچان اور اس کی حفاظت کر۔ اصل چیز حفاظت خودی ہے۔ جس علم سے خودی ختم ہو جائے اس سے نہ پڑھنا بہتر ہے۔

⑧

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر

لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر

ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دمِ پرواز سر تا پا نظر

①②③ **معنی**: **زاغ**: کوا۔ **بدنما**: برے دکھائی دینے والے۔ **شپرک**: چگادڑ جس کو دن میں نہیں رات میں نظر آتا ہے۔ **کور چشم**: اندھا۔ **بے ہنر**: بے فن۔ **شہباز**: شاہین' باز۔ **مرغان صحرا کے اچھوت**: صحرا کے پرندوں میں کم حیثیت رکھنے والے پرندے۔ **فضائے نیلگوں**: آسمان کی نیلی فضا۔ **پیچ و خم**: رموز و اسرار۔ **طائر**: پرندہ۔ **احوال و مقام**: حالات و مرتبہ۔

مطلب: کوا جو خود خوبصورت نہیں ہے' شہباز (شاہین) کو کہہ رہا ہے کہ تیرے پر میری نظر کو اچھے نہیں' برے لگتے ہیں۔ اس لیے تو خوبصورت نہیں ہے۔ چگادڑ جسے خود دن کے وقت نظر نہیں آتا اس غلط فہمی میں ہے) کہ میں بینا (نظر والی) ہوں اور شاہین نابینا (اندھا) ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ پرندے جن کی حیثیت شہبازوں' عقابوں اور شاہینوں کے مقابل صحرا کے پرندوں میں ایسی ہی ہے جیسی کہ اونچے لوگوں کے مقابلے میں کم درجہ کے لوگوں کی ہوتی ہے جس طرح ہندو برہمن اچھوتوں کو یا مغربی اقوام رنگ' نسل اور خون کی بنا پر خود کو اونچا اور دوسروں کو کمتر قوم سمجھتی ہیں۔ اسی طرح صحرا کے پرندوں میں کوے اور چگادڑ کی حیثیت سمجھی جاتی ہے ان کو کیا خبر کہ بلند پروازی اور تیز بینی کیا چیز ہوتی ہے انہیں کیا خبر کہ اس نیلے آسمان کی بلندیوں پر اڑنے والے شاہین کے حالات اور مراتب کیا ہیں۔ یہ تو زمین سے چند گز اوپر تک کے فاصلے پر کبھی گئے ہی نہیں ان میں ایسی طاقت اور صلاحیت ہی نہیں اس لیے ان کی شاہین کے متعلق رائے بے حقیقت ہے۔ فضائے نیلگوں (نیلے آسمان کی فضا) کے رموز و اسرار اور پیچ و خم سے اور وہاں پرواز کی لذت سے یہ بے خبر ہیں۔ انہیں اس بلند پرواز شہباز کے حالات و مراتب کا کیا علم ہے جس کی جان بلند پرواز میں بھی سر تا پا نظر ہوتی ہے۔ جس کو وہ اندھا کہتے ہیں وہ ایسا بینا ہے کہ بہت بلندی سے بھی (جہاں پر سے کووں' چیلوں' کرگسوں وغیرہ پرندوں کی نظر کا گزر نہیں ہو سکتا) زمین پر کے ذرات کو دیکھ لیتا ہے اور اپنے شکار پر اس طرح جھپٹتا ہے جس جھپٹ کی لذت کی' صحرا کے ان کمینے پرندوں کو خبر تک نہیں۔ اس لیے اے افغان قوم کے فرزند خود کو پہچان اور کوا' چیل' کرگس' چگادڑ نہ بن شاہین بن۔ اور ان کمینے جانوروں پر جھپٹ۔

⑨

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثلِ ہوس پرِ شہباز سے ممکن نہیں پروازِ مگس
یوں بھی دستورِ گلستاں کو بدل سکتے ہیں کہ نشیمن ہو عنادل پہ گراں مثلِ قفس
سفر آمادہ نہیں منتظرِ بانگِ رحیل ہے کہاں قافلۂ موج کو پروائے جرس
گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے مردہ ہے! مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس
پرورش دل کی اگر مدِّ نظر ہے تجھ کو مردِ مومن کی نگاہِ غلط انداز ہے بس

① **معنی: عشق:** محبت کا ارفع اور پاکیزہ جذبہ۔ **ہوس:** محبت کا پست اور ناپاک جذبہ۔ **طینت:** سرشت، فطرت۔ **فرومایہ:** کمینہ، پست۔ **پرِ شہباز:** باز کا پر۔ **پروازِ مگس:** مکھی کی اڑان۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے فغانی کی زبان سے محبت کے اعلیٰ ارفع اور پاک جذبہ کو جسے عشق کہتے ہیں۔ شیطانی خواہشات اور جنسی لذتوں کی دلدادہ محبت کے کمینہ اور پست جذبہ کو جسے ہوس کہتے ہیں شاہین اور مکھی کی مثال دے کر سمجھایا ہے۔ جس طرح باز کے پر اسے بلند پروازی کی وجہ سے آسمان کی وسعتوں میں لے جاتے ہیں اور اس کے برعکس جس طرح مکھی کے پر اسے کم بلندی پر اڑان پر مجبور کرتے ہیں اور وہ گندگی پر بیٹھ کر خوش ہوتی ہے۔ اسی طرح کا فرق عشق اور ہوس میں ہے۔ عشق بلند پرواز شاہین کی طرح ہے اور ہوس کم پرواز مکھی کی مانند ہے۔ عشق کی فطرت ارفع و بلند ہے۔ ہوس کی فطرت پست اور کمینہ ہے۔

② **معنی: دستور:** آئین، اصول۔ **گلستاں:** باغ۔ **نشیمن:** گھونسلہ، آشیانہ۔ **عنادل:** عندلیب کی جمع، بلبل۔ **گراں:** بھاری۔ **مثل:** مانند۔ **قفس:** پنجرہ۔

مطلب: اس شعر میں باغ، بلبل، پنجرہ، آشیانہ وغیرہ کی علامتوں سے آزادی اور درویشی کی بات سمجھائی گئی ہے۔ پنجرہ تو بے شک بلبل کے لیے قید ہے لیکن اس کا گھونسلہ تو قید نہیں لیکن شاعر کہتا ہے کہ اپنی آزادی کو قائم رکھنے کے لیے اور درویش طبع بننے کے لیے اپنے گھربار کی فکر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ آزاد فضا میں درویش کی طرح کی بے نیازانہ زندگی گزارنی چاہیے اور قید خانہ سے بھی استغنا کی صورت پیدا کر لینی چاہیے۔ باغ کا عام اصول اور قانون یہی ہے کہ اس میں بلبل اگر پنجرہ میں نہ ہو تو خود کو آزاد سمجھتی ہے لیکن آزاد منش لوگ اس آئین کو بھی بدل دیتے ہیں اور قید آشیانہ بھی برداشت نہیں کرتے۔

③ **معنی: سفر آمادہ:** سفر پر جانے کے لیے تیار۔ **منتظر:** انتظار کرنے والا۔ **بانگ:** آواز۔ **رحیل:** کوچ۔ **قافلہ موج:** لہر کا قافلہ۔ **جرس:** گھنٹی جو قافلہ کے کوچ کے وقت بجائی جاتی ہے۔

مطلب: جو شخص اپنے دل میں سفر کرنے کا جذبہ رکھتا ہو اور سفر پر اس کا دل آمادہ ہو اور اس کے لیے بے قرار ہو وہ قافلہ سالار کی اس کوچ کی آواز کا انتظار نہیں کرتا جو قافلہ کو کوچ کے لیے تیار رہنے کی صدا لگاتا ہے۔ کیا آپ نے پانی کی موج کو یا دریا کی لہر کو نہیں دیکھا۔ کیا وہ اس گھنٹی کی آواز کا انتظار کرتی ہے جو قافلہ کے کوچ کے وقت بجائی جاتی ہے نہیں بلکہ وہ تو آواز کے انتظار کے بغیر ہی رواں دواں ہے۔ اصل چیز وہ جذبہ ہے جو آدمی کو حرکت، عمل، اور آزاد رہنے پر مجبور کرتا ہے وہ اس کے لیے کسی دوسرے کی مدد یا راہنمائی کا محتاج نہیں ہوتا۔

④ **معنی**: **مکتب**: مدرسہ۔ **فرنگی**: انگریز۔ **نفس**: سانس۔

مطلب: اس شعر میں مدرسہ سے مراد وہ مدرسہ ہے جو انگریزوں نے اپنی تہذیب و ثقافت پھیلانے، مسلمانوں کو اسلام سے نا آشنا کرنے اور اپنی حکومت چلانے کے لیے نوکر چاکر پیدا کرنے کے لیے کھولے تھے۔ ان مدرسوں میں جو طالب علم پڑھتے ہیں وہ اس لحاظ سے تو زندہ ہیں کہ انہیں سانس آ رہی ہے لیکن وہ اس لحاظ سے مردہ ہیں کہ ان کے سانس اپنے نہیں۔ انگریزی تمدن و معاشرت اور تہذیب و ثقافت کی ہوا لئے ہوئے ہیں جس کی بنا پر ان کے دل مردہ، روح بے روح اور جان بے جان ہو چکی ہے البتہ ان کے تن زیب و زینت والے اور دماغ افکار غیر سے ضرور روشن ہو گئے ہیں۔ یہ زندگی موت سے بھی بری ہے۔

⑤ **معنی**: **پرورش**: پالنا، تربیت کرنا۔ **مد نظر**: پیش نظر۔ **نگاہ غلط انداز**: ایسی نگاہ جو بے ارادہ پڑ جائے۔

مطلب: جدید مدرسوں میں تن کی پرورش تو ہوتی ہے لیکن دل مرجاتے ہیں۔ اگر اے جدید مدرسہ کے طالب علم تجھے اپنے دل کو پھر سے زندہ کرنے کی ضرورت ہے تو کسی مرد مومن کو، کسی اللہ کے برگزیدہ و چیدہ بندے کو یا درویش کو تلاش کر کے اس کی صحبت اختیار کر، کیونکہ ایسے شخص کی بے ارادہ پڑی ہوئی نظر بھی حیوان کو انسان اور مردہ دل کو زندہ دل بنا دیتی ہے اور اگر وہ ارادے سے کسی پر نظر ڈالے تو پھر اس کی قسمت بیدار اسے کہاں تک پہنچا دے گی یہ وہی جان سکتے ہیں جن پر یہ نگاہ پڑی ہے اور جو آدمیوں میں روح و دل اور ایمان و ایقان کے اعتبار سے سربر آوردہ ہو گئے ہیں۔

⑩

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

① **معنی**: **آنکھ کا تارا**: پیارا، ہر دلعزیز۔ **شباب**: جوانی۔ **بے داغ**: ہر گناہ سے پاک۔ **ضرب**: چوٹ، وار۔ **کاری**: سخت۔

مطلب: محراب گل اپنے قبیلے کے جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم میں سے وہی جوان قبیلے کے ہر شخص کے لیے پیارا اور ہر شخص میں ہر دلعزیز ہو سکتا ہے جس کی جوانی ہر گناہ اور عیب سے پاک ہو۔ جو متقی ہو۔ ایسے شخص کا ہر وار جو وہ باطل پر لگاتا ہے ہر چوٹ جو وہ شیطان پر مارتا ہے شدید اور کارگر و نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ عہد حاضر بے حیا ہے۔ عہد حاضر کی تعلیم بے حیائی سکھاتی ہے۔ خدا تمہیں اس بے حیائی سے بچائے اور ایک صحیح مرد مومن کے بیٹے کی طرح رکھے یعنی پاک باز اور قوت و شجاعت والا۔

② **معنی**: **شیران غاب**: جنگل کے شیر۔ **رعنا**: خوبصورت۔ **غزال**: ہرن۔ **تاتاری**: ملک تاتار کے، جہاں تہ ختن ہے۔ جہاں کے ہرنوں میں مشک ہوتی ہے۔

طلب: پاکباز مسلم نوجوان کی خصوصیات یہ ہیں کہ میدان جنگ ہو تو دشمن پر جنگل کے شیر کی طرح
جھپٹتا ہے۔ اور اگر صلح اور امن کا زمانہ ہو تو ملک ختن کے اس خوبصورت ہرن کی طرح ہوتا ہے۔ جس کی
ناف میں مشک پیدا ہو جاتی ہے اور جس کی خوشبو سے ساری فضا مہک جاتی ہے۔ مراد ہے وہ امن کے
زمانے میں دوست دشمن سب کے لیے امن کا پیغامبر اور دل خوش کرنے والا ہوتا ہے۔

③ **معنی**: **سوز**: آگ، حرارت۔ **ہمہ سوز**: سب کو جلانے والی۔ **نیستاں**: سرکنڈوں کا جنگل۔ **بس ہے**:
کافی ہے۔

مطلب: جس طرح سرکنڈوں کے جنگل کو جلانے کے لیے آگ کی ایک چنگاری کافی ہوتی ہے اسی طرح
باطل، شرک، کفر، بے ایمانی، بے حیائی وغیرہ کے جنگل کو جلانے کے لیے اس کے ایمان کی حرارت کی
ایک چنگاری کافی ہوتی ہے یا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر اسکے دل کی تپش دوسروں میں بھی تپش پیدا کر دے تو حیران نہیں
ہونا چاہیے کیونکہ سرکنڈوں کے جنگل کو جلانے کے لیے ایک چنگاری کافی ہوتی ہے۔

④ **معنی**: **شکوہ سلطانی**: شاہی ہیبت یا جلال۔ **فقر**: درویشی۔ **حیدری و کراری**: حضرت علیؓ جیسی ہمت،
دبدبہ اور فتوحات حاصل کرنے کی صفات۔

مطلب: ایسا جوان جو مغربی اثرات سے آزاد اور اسلام کی شراب میں سرمست ہے وہ اپنی ہمت، دبدبہ،
درویشی اور دشمن پر حملہ کے اعتبار سے حضرت علیؓ کی صفات رکھنے والا ہے۔ اگرچہ وہ درویش کیوں نہ نظر
آتا ہو اور اس کے پاس دنیا کی دولت اور زینت بھی نہ ہو لیکن وہ بادشاہوں سے بھی زیادہ شکوہ اور دبدبہ کا مالک
ہوتا ہے۔ بادشاہ اور اس کا تخت اس کے بوریائے فقر کے جلال سے لرزتا ہے۔

⑤ **معنی**: **بے کلاہی**: سر پر ٹوپی نہ ہونا۔ دولت کا اور دنیا کے سرمایہ کا نہ ہونا۔ **کلہ داری**: تاجداری۔
سرمایہ: دولت۔

مطلب: اگرچہ ایسا جوان جو پاک باز مومن کی حیثیت رکھتا ہے جس کی درویشی میں اللہ کے شیروں کی
خوشبو ہے۔ بہ ظاہر دنیاوی دولت اور مرتبہ نہیں رکھتا لیکن اس کی یہی بے دولتی دوسروں کو دولت مند
بنانے اور خود ننگے سر رہ کر دوسروں کے سروں پر تاج رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اس کی درویشی سے غریب
بے نیازی سیکھ کر امیر سے زیادہ دولت مند ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دل کا غنی بن جاتا ہے۔ اور سلطانوں کا تخت
و تاج اس کی دعاؤں اور برکت کی وجہ سے سلامت رہتا ہے۔ دیکھنے میں وہ دنیا کی دولت سے محروم ہوتا
ہے لیکن حقیقت میں دنیا کی دولت اس کے قدم چوم رہی ہوتی ہے۔ اس کی ایک نگاہ ذرے کو آفتاب بنا
سکتی ہے۔

(11)

جس کے پرتو سے منور رہی تیری شبِ دوش پھر بھی ہو سکتا ہے روشن وہ چراغِ خاموش
مردِ بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ بندۂ حر کے لئے نشترِ تقدیر ہے نوش

نہیں ہنگامہِ پیکار کے لائق وہ جواں جو ہوا نالہِ مرغانِ سحر سے مدہوش
مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

① **معنی**: **پرتو**: سایہ۔ **منور**: روشن۔ **شب دوش**: گزری ہوئی رات۔ **چراغ خاموش**: بجھا ہوا چراغ۔ **جلوہ**: روشنی۔

مطلب: جس چراغ (دیا) کی روشنی یا جلوہ سے تیری گزری ہوئی کل کی رات روشن رہی ہے اور جواب بجھ چکا ہے۔ وہ چراغ تو اپنی آج کی رات کو منور (روشن) کرنے کے لیے پھر جلا سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے افغان قوم تیری گزشتہ تاریخی روایات بڑی شاندار ہیں۔ اگر آج کسی وجہ سے تو ان روایات سے محروم ہو چکا ہے تو فکر کی بات نہیں۔ عزم اور کوشش کی ضرورت ہے تو ان پرانی روایات سے اپنی زندگی کو مزین کرکے پھر اقوام عالم میں سرفراز ہو سکتا ہے۔

② **معنی**: **مرد بے حوصلہ**: بے ہمت شخص۔ **گلہ**: شکایت' شکوہ۔ **بندہ حر**: آزاد آدمی۔ **نشتر تقدیر**: تقدیر کا نشتر۔ **نوش**: خوش گوار اور پسندیدہ پینے کی چیز۔ **نشتر**: وہ چاقو جس سے زخم چھیڑا جاتا ہے۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے ایک اصولی بات کی ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ جو بے ہمت ہوتے ہیں اور جن میں برداشت کا حوصلہ نہیں ہوتا وہی اپنے مخالف حالات یا زمانہ مخالف کی شکایت/شکوہ کرتے ہیں۔ اور ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن ایک آزاد مرد شکوہ کرنے کی بجائے ان حالات کا مقابلہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ مخالف زمانہ پھر اس کے موافق ہو جائے وہ تقدیر کے نشتر کو بھی ایک خوش گوار بات سمجھتا ہے اور اس نشتر کے نتیجے میں اس میں سے جو خون بہتا ہے اس کو اچھا مشروب سمجھتا ہے اور اسے پسندیدہ سمجھ کر اور برداشت کرکے اپنے زخم کو مندمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس زخم پر یا اس میں سے خون بہتا ہوا دیکھ کر روتا نہیں۔ حوصلہ نہیں ہارتا۔

③ **معنی**: **ہنگامہ پیکار**: جنگ کا ہنگامہ۔ **نالہ مرغان سحر**: صبح کے پرندوں کے نالے۔ **مدہوش**: مست۔

مطلب: وہ جوان جو صبح کے پرندوں کے نالے سن کر ان سے مدہوش ہو جاتا ہے اس میں جنگ کے ہنگامہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مراد یہ ہے کہ جو شخص تن آسان ہے۔ عیش پسند اور آرام طلب ہے وہ زندگی کی جنگ میں حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ زندگی ایک تگ و دو کا میدان اور حالات جنگ کی سی جگہ ہے اس میں کامیابی کے لیے حوصلہ' جراٗت' اور عمل کی ضرورت ہے۔ بے حوصلہ اور بے عمل لوگ حالات زندگی کی جنگ میں شکست کھا جاتے ہیں۔

④ **معنی**: **طفلانہ طبیعت**: بچوں کی سی طبیعت۔ **عیار**: مکار' چالاک۔ **شکرپارہ فروش**: شکر کے ٹکڑے بیچنے والے۔

مطلب: اے افغان جوان میں دیکھ رہا ہوں کہ تیری طبیعت میں بچپنا ہے اور بچپن میں جس طرح کھلونے دے کر بچے کو بہلایا جاتا ہے اور پھر اسے خاموش کر دیا جاتا ہے یا اس سے جو کام لینا ہو وہ لے لیا جاتا ہے کہیں تیری اس طبیعت اور مزاج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یورپ کے مکار اور چالاک لوگ فائدہ نہ اٹھا لیں اور تجھے شکر کے ٹکڑے دے کر اس میں زہر نہ کھلا دیں۔ اس لیے ان یورپ والوں سے ہوشیار رہ۔ وہ ایسے حربے استعمال کرتے ہیں جو بظاہر خوش نما نظر آتے ہیں لیکن جب ان کا وار

ں جاتا ہے تو نتیجہ تباہ کن سامنے آتا ہے اس لیے اہلِ مغرب کی ان میٹھی گولیوں سے بچنا جو باہر سے میٹھی
ں اور اندر زہر رکھتی ہیں۔ نشہ آور ہیں۔

(12)

ینی و لاطینی! کس پیچ میں الجھا تو — دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الا ہو
یادِ معانی کو یورپ سے ہے نومیدی — دلکش ہے فضا، لیکن بے نافہ تمام آہو
ے اشکِ سحرگاہی تقویمِ خودی مشکل — یہ لالۂ پیکانی خوشتر ہے کنارِ جو
اد ہے کافر کا، نخچیر ہے مومن کا — یہ دیرِ کہن یعنی بت خانۂ رنگ و بو
ے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے — ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

① **معنی**: **لادینی**: بے دینی۔ **لاطینی**: لاطین کا، اٹلی کا، لاطینی رسم الخط یا خیالات۔ **ضعیف**: کمزور۔ **دارو**: ...ج۔ **لا غالب الا ھو**: اللہ کے سوا کوئی غالب آنے والا نہیں۔

مطلب: دورِ جدید میں مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار کی وجہ سے مسلمان اقوام میں بے دینی کا اثر آ گیا ہے۔ ...ں یورپ کے پرانے رسم الخط کو اپنانے کا خیال پیدا ہو رہا ہے اور اپنے اصلی رسم الخط کو جو عربی ہے ...وڑنے کے اقدامات کئی ملکوں میں کیے جا رہے ہیں پھر اس پر بحثیں ہو رہی ہیں۔ تنازعات پیدا ہو رہے ...۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا ہے کہ مسلمان قوم جو اپنی نجی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ میں ...ند کو غالب رکھتی تھی اس رویہ سے ہٹ گئی ہے اور اللہ کے غلبہ کی بجائے یورپ کی تہذیب اور ثقافت ...ے غلبہ سے مغلوب ہو گئی ہے۔ جب تک ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے میں پہلے کی طرح اللہ اور اس کے ...ئے ہوئے اصولوں کو خود پر کو غالب نہیں کریں گے ہم پستی سے نہیں نکل سکتے۔ مسلمانو بحثیں چھوڑ کر پھر اللہ ...ی طرف رجوع کرو اور اس کے غلبہ کو تسلیم کرلو۔

② **معنی**: **صیادِ معانی**: حقیقتوں کو شکار کرنے والا۔ **نومیدی**: ناامیدی۔ **دلکش**: دل کو کھینچنے والی۔ **فضا**: ...ول۔ **بے نافہ**: بغیر نافہ کے، بغیر مشک کے۔ **آہو**: ہرن۔

مطلب: جو شخص حقائق کو جانتا ہے، حقیقتوں کا شکار کرنے والا یا ان سے واقف ہے وہ یورپ اور ...رپ والوں سے ناامید ہے۔ کیونکہ یورپ میں جو ماحول پیدا ہو چکا ہے اس کی مثال اس فضا یا ماحول کی ...ی ہے جو دیکھنے میں تو بہت خوش نما اور دل کو لبھانے والا ہو لیکن اس ماحول میں نافہ (مشک رکھنے والا) ...رن نہ ہو یعنی یورپ نے جو ترقی کی ہے اور تہذیب و تمدن اور معاشرت و ثقافت کے جو حسین نقشے پیش ...ے ہیں وہ نظارہ کرنے میں تو بڑے خوبصورت ہیں لیکن اندر سے میلے اور نقصان پہنچانے والے ہیں۔ ...س لئے اے افغان نوجوان ان دھوکہ دینے والے نظاروں سے بچ اور اپنی اسلامی، دینی اور تہذیبی ...وایات کو اپنا جس کا ظاہر بھی روشن ہے اور باطن بھی منور ہے۔

③ **معنی**: **بے اشکِ سحرگاہی**: صبح کے آنسوؤں کے بغیر، عشق کے بغیر، سوز کے بغیر۔ **تقویم**: مضبوطی۔ ...ودی: خود آگاہی۔ **لالہ پیکانی**: تیر کی خاصیت رکھنے والا۔ **خوشتر**: زیادہ خوش، زیادہ اچھا۔ **کنارِ جو**: نہر کے

کنارے۔

مطلب: اس شعر میں اشک سحر گاہی کو نہر کے پانی سے اور خودی کو لالہ پیکاں سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح تیر کی سی تیزی کا اثر رکھنے والا شاداب اور رعنا لالے کا پھول نہر کے چلتے ہوئے پانی کے کنارے پر بھلا لگتا ہے اسی طرح خودی اور خود آگاہی کی پرورش اور خوش نمائی کے لئے ضروری ہے کہ آدمی صبح کیوقت آنسو بہائے یعنی بغیر سوز کے اور بغیر عشق کے خودی کی پرورش اور تربیت ممکن نہیں ہے۔

④ **معنی:** صیاد: شکاری۔ **نخچیر:** شکار۔ **دیر کہن:** پرانا مندر۔ **بت خانہ رنگ و بو:** رنگ اور بو کا بت خانہ 'بہت دل کش بت خانہ۔

مطلب: شاعر نے اس شعر میں دنیا کو ایک پرانا مندر کہا ہے جس میں رنگ اور خوشبو کے بت رکھے ہوئے ہیں۔ پرانا مندر اس لیے کہا ہے کہ یہ دنیا نہ جانے کب سے وجود میں آئی ہوئی ہے اس کے باوجود اس کی ہر شے ہر زمانے میں دنیا والوں کو دل کش معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کی دل کش چیزوں کے آگے اس طرح جھکتے ہیں جیسے کوئی بت پرست بت کے آگے جھکتا ہو۔ شاعر نے اسی لئے دنیا کو ایک مندر سے تشبیہ دی ہے جہاں بت پوجے جاتے ہیں لیکن شاعر یہ کہتا ہے کہ ان بتوں کو وہ پوجتے ہیں جو کافر ہیں۔ مومن نہیں پوجتے۔ یہ پرانا مندر اور اس کے بت کافروں کے تو شکاری ہیں کیونکہ وہ ساری زندگی دنیا میں گم ہو کر گذار دیتے ہیں لیکن مومن کی یہ دنیا شکار ہے کیونکہ مومن دنیا سے کافر کی طرح متاثر نہیں ہوتا وہ دنیا اس حد تک نبھاتا ہے جس حد تک اس پر دین کی چھاپ رہتی ہے۔ اور جس طرح اللہ اور اس کا رسول ﷺ نبھانے کے لیے کہتا ہے۔

⑤ **معنی:** ترش ابرو: خفا' ناراض۔ **محراب:** وہ جگہ جہاں نماز پڑھانے والا امام کھڑا ہوتا ہے۔

مطلب: اس شعر میں شاعر نے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ غریب لوگ ہی زیادہ مسجدوں میں آتے ہیں اور وہ بے چارے ہی اخلاص سے نماز پڑھتے ہیں لیکن امیر بہت کم مساجد میں آتے ہیں اور اگر آتے بھی ہیں تو دکھانے کے لئے یہاں نماز پڑھتے ہیں اور صفوں میں غریبوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہونا بھی پسند نہیں کرتے اس لئے مسجد کے واعظ یا امام سے شاعر کہتا ہے کہ ایسے امیروں کا جن میں وہ عیب ہوں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے مسجدوں سے نکال دینا ہی بہتر ہے کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کے رویے سے مسجد کی محراب جس کے سامنے یہ امیر لوگ نمازیں پڑھتے ہیں ان سے ناراض نظر آتی ہے۔

(13)

① مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں   معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا
سینے میں اک صبح قیامت ہے نمودار   افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر
کتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی   اے پیر حرم تیری مناجات سحر

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

① **معنی:** دگرگوں: بدلی ہوئی۔

مطلب: اس شعر میں شاعر اپنے سوا دوسروں سے خطاب کرتا ہوا کہتا ہے کہ دورِ حاضر کی دنیا مجھے بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور اس میں وہ اقدار مفقود ہیں جو ایک اچھی دنیا کے لیے ہونی چاہئیں لیکن اے میرے مخاطب خبر نہیں کہ تیری نظر بھی اسے میری طرح ہی دیکھتی ہے یا اس میں کوئی خوبیاں پا کر تو اس کا شکار ہو رہا ہے۔

② **معنی:** زیر و زبر: الٹ پلٹ' بدلے ہوئے۔ **صبحِ قیامت:** روزِ حشر کا سا شور۔ **نمودار:** ظاہر۔ **افکار:** خیالات۔

مطلب: شاعر نے پہلے شعر میں چونکہ یہ بات کہی ہے کہ مجھے دنیا بدلی ہوئی نظر آتی ہے اس تبدیلی کی ایک مثال دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ میں نے ہر آدمی کے سینے میں روزِ حشر کا سا شور اور ہنگامہ ظاہر ہوتے دیکھا ہے۔ مراد ہے کہ لوگوں کے قدیم خیالات' روایات اور اقدار عہدِ حاضر کے پرتو سے ایسے بدل رہے ہیں کہ جیسے دنیا حشر میں بدل جائے گی۔ مراد ہے کہ ان میں یکسر تبدیلی آ چکی ہے۔ اے میرے مخاطب کیا تو دیکھ نہیں رہا کہ آج کے نوجوانوں کے خیالات بھی الٹ پلٹ ہو چکے ہیں اور ان میں مغرب کے خیالات اس تیزی سے نفوذ کر رہے ہیں کہ جس سے وہ یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔

③ **معنی:** بے معرکہ: بغیر تصادم یا جنگ کے۔ **تلافی:** نقصان کا پورا کرنا۔ **پیرِ حرم:** کعبے یا مسجد کا پیر یا امام۔ **مناجاتِ سحر:** صبح کے وقت کی دعا یا خدا سے التجا۔

مطلب: شاعر کے نزدیک یہ دنیا' اس میں رہنے والے مسلمان اور ملتِ اسلامیہ کے نوجوان اس حد تک بدل چکے ہیں اور یورپی افکار کے تحت اپنا دینی اور دنیاوی اس قدر نقصان کر چکے ہیں کہ بغیر بہت بڑے تصادم اور جنگ اور کوشش کے اس نقصان کا پورا کیا جانا ممکن نہیں۔ اے کعبہ کے امام! بے شک تو صبح کے وقت خدا سے التجا کرتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کی بگڑی ہوئی تقدیر کو بدل دے لیکن یہ کام محض دعا سے نہیں بنے گا۔ اس کے لیے انقلابی کوشش اور ناموافق حالات سے تصادم کا اختیار کیا جانا ضروری ہے۔

④ **معنی:** خودی: خود آگاہی' خود معرفتی۔ **تخلیق:** پیدا کرنا۔ **خانقاہ:** وہ جگہ جہاں صوفی رہتا ہے۔ **شعلۂ نم خوردہ:** ایسا شعلہ جس میں نمی آ گئی ہو۔ **ٹوٹے گا:** نکلے گا۔ **شرر:** چنگاری۔

مطلب: شاعر نے اس شعر میں صوفیوں کے ان ٹھکانوں کو جو آج اپنی اصلیت کھو چکے ہیں کہا ہے کہ ایسی خانقاہوں پر آدمی میں خودی یا خود آگاہی کا جوہر پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کی مثال ایک ایسے شعلے کی طرح ہے جو گیلا ہو چکا ہو اور ظاہر ہے کہ گیلے شعلے سے کوئی چنگاری نہیں نکل سکتی۔

(14)

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی ۔۔۔ بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید اللّٰہی
جو سختیِ منزل کو سامانِ سفر سمجھے ۔۔۔ اے وائے تن آسانی! ناپید ہے وہ راہی
وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردکِ میدانی ۔۔۔ کہسار کی خلوت ہے تعلیمِ خود آگاہی
دنیا ہے روایاتی' عقبیٰ ہے مناجاتی ۔۔۔ در باز دو عالم را این است شہنشاہی

① **معنی**: **بے جرأت رندانہ**: رندوں کی طرح کی جرأت یا بے باکی کے بغیر۔ **روباہی**: لومڑی کی طرح کی عیاری' مکاری اور کمزوری۔ **قوی**: مضبوط۔ **ید اللّٰہی**: اللہ کا ہاتھ۔

مطلب: وہ عشق جس میں رندوں کی طرح کی جرأت نہ ہو اور وہ مصلحت کا شکار ہو کر بے باکانہ بہادری سے کام نہ لے وہ عشق' عشق نہیں بلکہ ہوس ہے۔ ایسا عشق لومڑی کی طرح مکر و فریب سے کام لیتا ہے۔ اصل عاشق وہ ہے جس کے بازو اس عشق سے مضبوط اور طاقت والے ہوں جس عشق میں اللہ کا ہاتھ ہو۔ وہ عشق جو صرف اعلیٰ مقاصد اور ارفع اقدار رکھتا ہو ایسے عشق میں شیروں کی طرح کی بہادری ہوگی لومڑی کی طرح کی مکاری نہیں ہوگی۔

② **معنی**: **تن آسانی**: آرام طلبی۔ **اے وائے**: افسوس ہے۔ **ناپید**: ملتا نہیں ہے۔ **راہی**: راہ پر چلنے والا' مسافر۔

مطلب: افسوس ہے کہ آج وہ مسافر نظر نہیں آتا جو منزل تک پہنچنے میں پیش آنے والی مصیبتوں کو اپنے سفر کا سامان سمجھے نہ کہ سفر کی آسائشوں اور آرام طلبی کو منزل پر پہنچنے کا ذریعہ سمجھے۔ آج کے دور کے مسلمان اور ان کے جوان ان سختیوں اور مشقت کے عادی نہیں رہے جن سے ان کے بزرگ مانوس تھے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آرام طلبی نے انہیں اپنی منزل سے نا آشنا کر دیا ہے اور یہ بڑی افسوسناک بات ہے۔

③ **معنی**: **وحشت**: جنوں' دیوانگی' بیابانوں میں رہنا۔ **مردک میدانی**: میدان میں رہنے والے چھوٹے آدمی۔ **کہسار**: پہاڑوں کا سلسلہ۔ **خلوت**: تنہائی۔ **خود آگاہی**: خود شناسی' خودی۔

مطلب: ان اشعار میں چونکہ افغانوں کی بات ہے اور وہ برصغیر کے شمال کے پہاڑی سلسلے میں آباد ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو جو میدانوں میں رہتے ہیں مخاطب کر کے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان پہاڑی سلسلوں میں رہنے والے لوگوں کو تم وحشی' دیوانہ یا تہذیب سے نا آشنا نہ سمجھو۔ تم ان کے مقابلے میں چھوٹے لوگ ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان پہاڑوں کی تنہائی افغانوں کو خودداری' خودشناسی اور خودی کی تعلیم دیتی ہے جب کہ تم اے میدان کے لوگو مغربی اثرات کے سبب اپنی خودی سے نا آشنا ہو چکے ہو اور یہ پہاڑی لوگ جو بظاہر وحشیوں کی طرح بیابانوں میں رہتے نظر آتے ہیں مغربی اثرات سے بری ہونے کی بنا پر اپنی معرفت سے آگاہ ہیں۔

④ **معنی**: **روایاتی**: روایت کی پابند۔ **عقبیٰ**: آخرت۔ **مناجاتی**: دعا کی پابند۔ **در باز**: چھوڑ دے۔ **دو عالم را**: دونوں جہانوں کو۔ **این است**: یہ ہے۔

مطلب: اللہ کے آزاد بندے جن کا مقصد صرف اللہ سے تعلق قائم رکھنا ہوتا ہے دونوں جہانوں سے

بے نیاز ہوتے ہیں۔ دنیا چونکہ دنیاوی روایات کی پابند ہوتی ہے اور آخرت صرف دعائیہ یا مذہبی ماحول میں گھری ہوئی ہوگی اس لیئے اللہ کے بندوں کو نصیحت کرتے ہوئے محراب گل کہتا ہے کہ تم دونوں جہانوں کو چھوڑ دو۔ دنیا اور آخرت دونوں سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ کے ہو جاؤ۔ یہی اصل بادشاہی ہے۔

(15)

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد   مشکل نہیں اے سالکِ رہ علمِ فقیری
فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق   پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری
خوددار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی   ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری
افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ   اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

① **معنی:** ضمیر: سرشت' فطرت' دل۔ شاہد: گواہ۔ سالک رہ: راستے کا مسافر۔

مطلب: شاعر کا خیال ہے کہ فقیری یا درویشی کا علم مشکل نہیں ہے اور اس کے مشکل نہ ہونے پر اور اس کی اس حقیقت پر خود آدمی کی فطرت گواہ ہے۔ اس لئے اے راہ فقیری کے مسافر خوف نہ کھا یہ راستہ اتنا مشکل نہیں ہے جتنا تو سمجھ رہا ہے بلکہ یہ تو ایک فطری اور آسانی سے طے ہونے والی راہ ہے۔

② **معنی:** فولاد: لوہا۔ حریری: ریشم کی طرح۔ شمشیر: تلوار۔ فولاد: لوہا' طبیعت: مزاج۔ سرشت۔

مطلب: اگر لوہا اپنا مزاج بدل لے اور اس کی سرشت میں مضبوطی کی بجائے ریشم کی سی نزاکت پیدا ہو جائے تو وہ لوہا اس قابل نہیں رہتا کہ اس سے تلوار بنائی جا سکے۔ پہلے شعر کی نسبت سے اس میں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ راہ فقر اس کے لئے دشوار نہیں ہے جس کی طبیعت تلوار کی مانند تیز اور فولاد کی مثل مضبوط ہو۔ ریشم کی سرشت رکھنے والوں کے لئے اور آسانی طلبوں کے واسطے بے شک یہ ایک مشکل سفر ہے۔

③ **معنی:** خوددار: خود پر بھروسہ کرنے والا۔ فقر: درویشی۔ قہر الٰہی: اللہ کا عذاب۔ صاحب غیرت: غیرت مند' غیرت کا مالک۔ تمہید امیری: امیری کی ابتدا۔ غیرت: خودداری

مطلب: علامہ نے اپنے کلام میں کئی جگہ دو قسم کے فقر یا درویشی کا ذکر کیا ہے۔ ایک فقر تنگ دستی' احتیاج اور گداگری کی صورت میں ہوتا ہے اور دوسرا ہر شے سے بے نیاز' خوددار اور غیرت مند فقر ہوتا ہے۔ اس شعر میں بھی فقر کی ان دو الگ الگ قسموں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے کہا ہے کہ جو فقر (یا درویشی) خود پر اعتماد اور خدا پر بھروسہ کرنے والا نہ ہو وہ فقر گداگری کی ایک شکل ہے اور اسے اللہ کا عذاب کہنا چاہیے۔ اور اگر فقیر غیرت مند' خوددار اور خود آگاہ ہو تو اس کا فقر امیری کی ابتدا ہے یعنی وہ کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی امیروں سے برتر ہوتا ہے اور سبب اس کا صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ایسا مرد فقیر خود آشنا اور خدا آشنا ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔

④ **معنی:** افرنگ: انگریز یا اہل مغرب۔ ز خود: اپنے آپ سے۔ بے خبرت کرد: تجھے بے خبر کر دیا ہے۔ بشیری: خوش خبری دینے والا۔ نذیری: ڈرانے والا۔

مطلب: اے صاحب ایمان بندے یا اے مرد مسلمان اگر تو اپنی اقدار سے واقف ہے تو تو وہ شخص ہے جو اچھے کاموں اور اعتقادات پر دوسروں کو خوشخبری دینے والا ہے کہ اس کا انجام اچھا ہو گا اور برے کام کرنے والوں اور برے اعتقادات رکھنے والوں کو تو ڈرانے والا ہے کہ تمہارے ان کاموں اور عقائد کا انجام اچھا نہیں ہو گا لیکن کیا کیا جائے اہل مغرب نے اپنی تہذیب' تمدن اور معاشرت کے اثرات تم میں نفوذ کر کے تمہیں اپنے آپ سے اور اپنی قدروں سے ناواقف بنا دیا ہے اور اب تو خود بھٹک گیا ہے۔ اس لئے دوسروں کے لئے نہ بشیر ہے اور نہ نذیر۔

(16)

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی
جو فقر ہوا تلخی دوراں کا گلہ مند اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی
اس دور میں بھی مرد خدا کو ہے میسر جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی
در معرکہ بے سوز تو ذوقے نتواں یافت اے بندۂ مومن تو کجائی؟ تو کجائی
خورشید! سرا پردۂ مشرق سے نکل کر پہنا مرے کہسار کو ملبوس حنائی

معانی: خودی: خودمعرفتی' خدائی: شاہی آفاقی' مرکز: دائرے کا درمیانی نقطہ

① **مطلب:** مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقوام اور دوسرے مذاہب کے لوگ رنگ' خون' نسل اور زبان و وطن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ بلکہ مخالف ہیں۔ اسلام اس نظریہ کے خلاف ہے اور وہ ہر رنگ' نسل' خون اور زبان کے لوگوں کو ایمان کے مرکزی نقطے پر جمع رکھتا ہے۔ اور جملہ مسلمانان عالم کا مرکز حرم ہے۔ جب ہم مرکز سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں تو ہم اپنی موت خریدتے ہیں اور اگر ہم مرکز سے بندھے ہیں تو پھر ہماری خود آگاہی کی قدر ہم میں خدائی صفات پیدا کر دے گی اور ہم کو دنیا اور دنیا والوں پر حکمران بنا دے گی۔

② **معنی:** فقر: درویشی۔ تلخی دوراں: زمانے کا کڑواپن یا سختی۔ گلہ مند: شکوہ کرنے والا۔ بوئے گدائی: گداگری کی بو' احتیاج کی بو۔

مطلب: حقیقی درویشی چونکہ اللہ کی رضا پر سر تسلیم خم کیے ہوئے ہوتی ہے اس لئے وہ زمانے کی سختیوں کے کڑواپن کا شکوہ نہیں کرتی اور اگر کہیں ایسا درویش یا ایسی درویشی آپ پائیں جو اللہ پر بھروسے کی بجائے اور اس کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے زمانہ کی شکایت یا اس کا شکوہ کرے تو سمجھ لیں کہ ایسی درویشی درویشی نہیں ہے بلکہ گداگری ہے اور اپنے اندر احتیاج کی بو رکھتی ہے۔

③ **معنی:** معجزہ: اعجاز' کرامت۔ پربت: پہاڑ۔ رائی: رائی ایک فصل ہے جس کا دانہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ میسر ہے: حاصل ہے۔

مطلب: اگرچہ موجودہ دور درویشی کے لائق نہیں ہے اور اس میں اللہ کے وہ بندے جو فقیر ہیں نظر نہیں آتے لیکن اس زمانے میں بھی کوئی اللہ کا بندہ یا مرد فقیر ایسا مل سکتا ہے جس کو یہ قوت حاصل ہو کہ وہ اپنے اعجاز یا کرامت سے پہاڑ کو رائی بنا سکے یعنی بڑی سے بڑی مخالف قوت کو مٹی کا ڈھیر بنا سکے۔ اس

لئے کسی صاحب فقر کی تلاش اس زمانے میں بھی نہ چھوڑو۔

④ **معنی:** **در معرکہ:** جنگ یا تصادم میں۔ **بے سوزِ تو:** تیرے سوز یا حرارت کے بغیر۔ **ذوقے:** کسی قسم کی لذت۔ **نتواں یافت:** حاصل نہیں کی جا سکتی۔ **بندہ مومن:** ایمان کی صحیح صفات رکھنے والا شخص۔ **کجائی:** کہاں ہے۔

مطلب: اس سے پہلے شعر میں علامہ نے چونکہ یہ اشارہ دیا ہے کہ اس ناموافق زمانے میں بھی کہیں کوئی مردِ فقیر ایسا موجود ہو سکتا ہے جو اپنی روحانی اور نظری قوت سے انقلاب برپا کر دے اس لئے اس شعر میں انہوں نے ایسے ہی مرد کے متعلق جو مومن اور فقیری کی صفات کا مالک ہو' آرزو کی ہے اور اسے پکارا ہے کہ تو کہاں ہے؟ تو کہاں ہے؟ کہیں سے آ جا کیونکہ زندگی کے حالاتی تصادم میں تیرے یا تیری صحبت کے بغیر لذت حاصل نہیں ہو سکتی۔

⑤ **معنی:** **خورشید:** سورج۔ **سراپردۂ مشرق:** مشرق کے گھر کے پردے سے۔ **کہسار:** پہاڑوں کا سلسلہ۔ **ملبوس حنائی:** مہندی کے رنگ کا لباس یا سرخی مائل لباس۔

مطلب: اس شعر میں بھی محراب گل نے اس مردِ فقیر کے سامنے آ جانے کی بات کی ہے جس کی صفات کا ذکر اوپر کے دو تین شعروں میں ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح مشرق کے گھر کے پردے سے سورج طلوع ہو کر میرے علاقے کے پہاڑی سلسلے کو اپنی صبح کی دھوپ سے مہندی کے رنگ جیسا لباس پہنا دیتا ہے اسی طرح اے مردِ فقیر تو بھی کہیں سے آ اور میرے پہاڑوں اور وادیوں اور ان کے رہنے والوں میں زندگی اور ایمان کی روح پھونک دے۔

(17)

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں

ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پرکشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

① **معنی:** **برنا و پیر:** جوان اور بوڑھے۔ **صاحب یقیں:** یقین کی حد تک ایمان کا مالک۔

مطلب: اگر لاکھوں میں سے ایک کامل یقین اور ایمان والا آدمی بھی پیدا ہو جائے تو اس کے سوز کی حرارت سے اس کے دور کے سارے بوڑھوں اور جوانوں میں ایمان کی حرارت پیدا ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے۔

② **معنی:** **کوہ و دشت:** پہاڑ اور بیابان۔ **فقر:** درویشی۔ **خزف:** ٹھیکری۔ **نگیں:** نگینہ۔

مطلب: محراب گل نے جس صاحب یقین و ایمان کی بات پہلے شعر میں کی ہے اس کے متعلق اس شعر میں کہا ہے کہ ایسا شخص کبھی کبھار پہاڑوں اور بیابانوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مردِ درویش میں یہ روحانی

اور ایمانی قوت ہوتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو ٹھیکری کو نگینہ بنا سکتا ہے۔ مراد ہے وہ پسے ہوؤں کو سربلند کر سکتا ہے۔

③ **معنی**: سرنوشت: کہانی۔ خامہ حق: اللہ کا قلم۔ جبیں: ماتھا۔

مطلب: اہل نجوم بتاتے ہیں اور عام لوگ بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آدمی کی قسمت کے حالات اس کے ماتھے پر لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس ماتھے کی تختی کو پڑھ کر اس شخص کے حالات بتائے جا سکتے ہیں لیکن یہاں علامہ نے محراب گل کی زبان سے اپنے اس فلسفہ تقدیر کو بیان کیا ہے کہ آدمی کی قسمت پہلے سے لکھی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے خود بناتا ہے۔ اس تناظر میں آدمی کو خصوصاً مسلمان کو یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قلم نے تیرے ماتھے کی تختی پر کچھ نہیں لکھا ہوا۔ یہ تختی تیری پیدائش کے ساتھ بالکل خالی آتی ہے اور تو جو چاہے اس پر لکھ سکتا ہے یعنی اپنے ارادے اور کوشش سے اپنی جو تقدیر چاہے بنا سکتا ہے۔

④ **معنی**: نیلگوں: نیلی۔ پر کشا: پر کھولنا یا اڑنا۔

مطلب: اس سے پہلے شعر میں محراب گل نے افغانوں یا ان کی علامت میں مسلمانوں کو جو یہ بات سمجھائی ہے کہ تمہاری تقدیر کا بننا یا بگڑنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس شعر میں اور اس سے اگلے شعر میں اسی بات کو تقویت دینے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ دیکھنے میں نیلے آسمان کی وسعت اور بلندی بہت ہے اور اس تک رسائی ممکن نظر نہیں آتی لیکن اگر تیرے اندر ہمت موجود ہو اور تو اپنے پر کھول کر اور اپنی اڑان سے اس تک پہنچنا چاہے تو یہ بلندی اور وسعت تیرے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھے گی اور تو وہاں تک پہنچ جائے گا۔ شرط اس ارادے اور ہمت کی ہے جو تقدیر بدلنے کے لیے یا مہمات سر کرنے کے لئے ضروری ہے۔

⑤ **معنی**: بالائے سر: سر کے اوپر۔ زیر پر: پر کے نیچے۔

مطلب: جب تک یہ تیرے سر سے بلند ہے اس کا نام آسمان ہے اور اگر اپنی پرواز سے تو اس تک پہنچ گیا تو یہی آسمان تیرے پاؤں کے نیچے آنے کی وجہ سے تیرے لئے زمین کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ مراد اس مثال سے یہ ہے کہ اگر قسمت کو بدلنے کا عزم پیدا ہو جائے اور اس کے لئے کوشش کی جائے تو اس کو بدلا جا سکتا ہے۔

(18)

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے — کہ امتیاز قبائل تمام تر خواری
عزیز ہے انہیں نام وزیری و محسود — ابھی یہ خلعت افغانیت سے ہیں عاری
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی — کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری
وہی حرم ہے وہی اعتبار لات و منات — خدا نصیب کرے تجھ کو ضربت کاری

① **معنی**: نکتہ: باریک بات۔ شیر شاہ سوری: برصغیر میں سور خاندان کا ایک افغان بادشاہ تھا جس نے

ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کا تخت حاصل کیا تھا۔ **امتیاز قبائل:** افغان قبیلوں میں فرق روا رکھنا۔ **تمام تر خواری:** سراسر ذلت۔

مطلب: محراب گل افغانوں کو برصغیر کے مشہور افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کا ایک قول یاد دلاتا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ افغان ایک متحدہ قوم کی بجائے مختلف قبائل میں جو بٹے ہوئے ہیں اور اس طرح اپنی طاقت کھو بیٹھے ہیں۔ یہ ان کے لیے سرتاسر ذلت کی بات ہے اور اسلام کی روح سے بھی قبائل کا اس طرح تقسیم ہونا کہ ایک کو دوسرے سے فضیلت میں زیادہ سمجھنا ناجائز ہے۔ اس لئے افغان قبائل کو چاہیے کہ وہ قبیلوں کی تقسیم کو ختم کر کے ایک قوم کی حیثیت اختیار کر لیں۔

② **معنی: عزیز ہے:** پیارا ہے۔ **وزیری و محسود:** دو افغان قبیلوں کے نام۔ **خلعت افغانیت:** افغان ہونے کا قیمتی یا شاہی لباس۔ **عاری:** ننگے، محروم۔

مطلب: شیر شاہ سوری کے مقولے یا نصیحت کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ افغان علاقے کے قبیلوں کو ایک افغان قوم بننے کی توفیق حاصل نہیں ہوئی اور وہ وزیری، محسود وغیرہ نام کے قبیلوں میں منقسم ہیں اور ان کے جسم ایک افغان قوم کا قیمتی لباس نہ پہننے کی وجہ سے ننگے ہیں یعنی ان میں قبائل کی تمیز اور تفریق سے ہٹ کر ایک افغان قوم بننے کی اہلیت نہیں ہے۔

③ **معنی: ہزار پارہ:** ہزار ٹکڑے۔ **کہسار:** پہاڑوں کا سلسلہ۔ **زناری:** زنار پہنے ہوئے یا پجاری۔

مطلب: آج افغان قوم کا یہ حال ہے کہ وہ بستی تو پہاڑوں کے ایک ہی سلسلے میں ہے لیکن اسلامی نظریہ کے خلاف مختلف قبیلوں میں بٹ کر اپنی مسلمانی کو ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم کر چکی ہے اور مختلف قبیلوں میں اس طرح بٹ چکی ہے کہ ہر قبیلے کا آدمی اپنے قبیلے کو اچھا جانتا ہے اور دوسرے قبیلے سے دشمنی رکھتا ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے اپنے بتوں کا پجاری ہو کیونکہ غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے یہ تقسیم قبائل بت پرستی سے کم نہیں ہے۔

④ **معنی: حرم:** کعبہ۔ **لات و منات:** اسلام سے پہلے کعبے میں رکھے ہوئے بتوں میں سے دو بتوں کے نام۔ **ضربت کاری:** سخت وار۔

مطلب: جس طرح اسلام سے پہلے اہل عرب مختلف قبائل میں تقسیم تھے اور انہوں نے کعبے میں لات و منات اور اس قسم کے کئی دوسرے ناموں سے اپنے اپنے قبیلے کے بت رکھے ہوئے تھے اور وہ ان کی پوجا کرتے تھے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے اپنے آپ کو افضل جانتا تھا اور وہ قبائل آپس میں جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے۔ محراب گل کہتا ہے کہ اسی قسم کی فضا میرے پہاڑی سلسلے میں بھی پیدا ہو چکی ہے اور ہر قبیلہ اپنی انفرادیت کے بت کا پجاری ہے اور دوسرے قبیلے سے دشمنی رکھتا ہے۔ خدا کرے کہ یہاں بھی وہ صورت حال پیدا ہو جو اسلام کے بعد عرب میں ہوئی تھی کہ کعبے کے سارے بت توڑ دیئے گئے تھے اور تمام قبائل دشمنی کو چھوڑ کر آپس میں شیر و شکر ہو گئے تھے۔ خدا کرے کہ یہاں بھی کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو اپنے سخت وار سے نسل اور خون کے ان قبائلی بتوں کو توڑ کر اسلام کے بعد کے عربوں کی طرح ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کی ایمانی بنیاد پر جملہ افغانوں کو ایک افغانی قوم بنا دے۔

(19)

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے — نگاہ وہ ہے کہ محتاجِ مہر و ماہ نہیں
فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن — قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں
کھلے ہیں سب کے لیئے غربیوں کے میخانے — علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں
سنیں گے میری صدا خانزادگانِ کبیر — گلیم پوش ہوں میں' صاحبِ کلاہ نہیں

① **معنی**: مہر و ماہ: سورج اور چاند۔ محتاج: کسی کی احتیاج یا ضرورت رکھنے والی۔ نگاہ: نظر۔

مطلب: آدمی کی نظر جس کا تعلق ظاہری آنکھوں سے ہے روشنی کے بغیر کچھ نہیں دیکھ سکتی اور اس کا دیکھنا چیزوں میں تمیز کرتا ہے کہ یہ فلاں شے ہے اور یہ فلاں چیز نہیں ہے۔ یہ فلاں رنگ ہے یا یہ فلاں رنگ نہیں ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ نظر جو سرخ اور زرد رنگوں میں تمیز کرنے والی ہے حقیقی نگاہ نہیں ہے۔ حقیقی نگاہ وہ ہے جو سورج اور چاند کی روشنی کی محتاج نہیں اور اسکے بغیر ہی صرف اشیا ہی کو نہیں بلکہ اشیا کی حقیقت تک کو دیکھ لیتی ہے۔ یہ آنکھ درویش مسلک کے لوگوں کے پاس پنہاں ہوتی ہے۔ شاعر اس نگاہ کو پیدا کرنے کی بات کرتا ہے۔

② **معنی**: فرنگ: انگریز' یورپ والے۔ انتہائے راہ: راستے کی آخری منزل۔

مطلب: اہلِ مغرب سائنس کے کرشمات کے ذریعے چاند اور سیاروں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ عالمِ زمان و مکان کے اندر ہوا ہے۔ اس سب کچھ تک رسائی ہر کسی کے لئے ممکن ہے لیکن ان ستاروں سے آگے بھی ایک جہان ہے جسے لامکان کہتے ہیں۔ جس کے فاصلے اور سفر کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ مومن زمان و مکان کی دنیا تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اس ستاروں کے جہاں سے آگے جو جہان ہے وہاں تک کا سفر کرتا ہے اور وہاں کے عجائبات سے آشنا ہوتا ہے۔

③ **مطلب**: یورپ والوں نے اپنے علوم و فنون اور افکار و خیالات کے شراب خانے سب کے لیے کھول رکھے ہیں تاکہ ان کی شراب ہر کوئی پی سکے۔ اے مخاطب علوم و افکار' اور سائنسی و ایجادات کے ان شراب خانوں کی شراب تو بھی پی اور ترقی زمانہ حاضر میں تو بھی شامل ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی روایات کو نہ بھولے جیسا کہ اگلے شعر میں ہے۔

④ **معنی**: سرور: مستی' نشہ۔ پوشیدہ: چھپا ہوا۔ سوزِ لا الٰہ: کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا سوز یا حرارت یا تپش۔ توحید کی حرارت۔

مطلب: علومِ مغربی سے فائدہ ضرور اٹھا اور اس سے جو مستی (جو فائدے) تجھے حاصل ہوتے ہیں ان کا مزہ لے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تو نے جس کلمہ توحید کی شہادت دی ہے اس کو نہ بھولے۔ یعنی اپنے دین اور اخلاق کی روایات سے الگ نہ ہو۔ اگر ایسا نہیں تو مغرب کے علم تیری انسانی اور مسلمانی اقدار کی موت کا سبب بنیں گے ظاہری حیات درست ہو جائے تو الگ بات ہے۔

⑤ **معنی**: صدا: آواز۔ خانہ زادگانِ کبیر: سرداروں اور امیروں کے گھر پیدا ہونے والے۔ گلیم پوش:

گدڑی پوش، درویش۔ صاحب کلاہ: ٹوپی والا، تاج والا یا امیر، بادشاہ۔

مطلب: محراب گل کہتا ہے کہ میں تو ایک گدڑی پوش درویش ہوں۔ امیر یا تاج پہننے والا نہیں ہوں۔ میں نے جو پیغام دیا ہے کیا اس کی آواز کو امیروں اور سرداروں کے گھروں میں پیدا ہونے والے بھی سنیں گے؟ اس سوالیہ انداز میں غالباً نفی کا پہلو موجود ہے کہ یہ لوگ ایک غریب کی آواز پر کیسے اور کیوں کان دھریں گے اور جب تک افغان قبیلوں کے سردار اور وڈیرے اس فقیر کی آواز سن کر اس کے پیغام پر کان نہیں دھریں گے اور خود کو تبدیل نہیں کریں گے عام افغانوں کی قسمت نہیں بدلے گی۔

(20)

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی
دنیا میں محاسب ہے تہذیبِ فسوں گر کا — ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی
یہ حسن و لطافت کیوں وہ قوت و شوکت کیوں — بلبلِ چمنستانی، شہبازِ بیابانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن — بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا — تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

① **معنی:** **فطرت:** قدرت۔ **مقاصد:** مقصد کی جمع۔ **نگہبانی:** حفاظت۔ **بندۂ صحرائی:** ریگستان میں یا بیابان میں رہنے والا۔ **مرد کہستانی:** پہاڑی سلسلوں میں رہنے والا۔

مطلب: محراب گل چونکہ خود پہاڑوں میں رہتا تھا اس لیے اسے اس بات کا مشاہدہ تھا کہ قدرت یہاں بے نقاب ہے اور قدرت کے جو مقصد ہیں وہ بھی لوگوں کی نگاہوں کے سامنے یہاں ظاہر ہیں۔ شہروں اور آبادیوں میں لوگوں کو یہ بات میسر نہیں ہے۔ قدرت کے جو مقصد ہیں ان کی حفاظت صرف ریگستان یا بیابان یا پہاڑ میں رہنے والے لوگ ہی کر سکتے ہیں کیونکہ وہی ان سے واقف ہوتے ہیں۔

② **معنی:** **محاسب:** حساب کرنے والا۔ **تہذیب فسوں گر:** جادو کرنے والی تہذیب۔ **سرمایہ سلطانی:** شاہی دولت۔

مطلب: یورپ کی تہذیب نے لوگوں پر جو جادو کر رکھا ہے اور اس کی ظاہری چمک دمک میں آ کر جس طرح لوگ خود کو بھول چکے ہیں اس کا حساب کتاب کرنا یا اس کی باز پرس کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس تہذیب سے بے خبر ہیں اور جن پر اس کا کوئی اثر نہیں اور ایسے لوگ صرف وہ ہوتے ہیں جو قدرت کے مقاصد کی حفاظت صحراؤں اور پہاڑوں میں رہ کر کرتے ہیں۔ ایسے ہی فطرت شناس لوگوں میں وہ درویش پیدا ہوتا ہے جس کی درویشی میں عہد حاضر کی جادو بھری تہذیب کی باز پرس کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ اس کے فقر میں شاہی دولت چھپی ہوئی ہوتی ہے یعنی وہ فقیری میں بھی شاہانہ شان رکھتا ہے۔

③ **معنی:** **بلبل چمنستانی:** باغ کی بلبل۔ **شہباز بیابانی:** بیابانوں میں رہنے والا شاہین۔

مطلب: اس سے پہلے شعروں میں شاعر نے دو قسم کے طبقات کا ذکر کیا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو تہذیب جدید کے جادو میں آ چکا ہے۔ اس کو شاعر نے باغ کی بلبل سے تشبیہ دی ہے جہاں حسن بھی ہوتا

ہے اور ملائمت بھی۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو فطرت کے قریب رہتا ہے اور اسکے مقاصد کی حفاظت کرتا ہے ایسے طبقہ کے لوگوں کو شاعر نے بیابان کے شاہین سے تشبیہ دی ہے جس میں طاقت بھی ہوتی ہے اور شکوہ بھی ہوتا ہے۔ ان دو طبقات کے موازنے سے شاعر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ باغ میں رہنے والی اور حسن اور ملائمت کو پسند کرنے والی بلبل (یعنی فطرت سے دور جدید تہذیب سے آشنا) بیابان میں رہنے والے شاہین سے (یعنی فطرت کے قریب رہنے والے) سے کم تر ہوتی ہے۔

④ **معنی**: **مکتب**: مدرسہ۔ **شیخ**: استاد مدرسہ۔ **فاروقی**: حضرت عمر فاروقؓ جیسی سلطنت۔ **سلمانی**: حضرت سلمان فارسیؓ جیسی درویشی۔

مطلب: شہروں اور بیابانوں کی فضاؤں اور ان میں رہنے اور پلنے والوں میں جس فرق کا اوپر کے شعروں میں ذکر ہوا ہے اس کو آگے بڑھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اے استاد مدرسہ! میں مانتا ہوں کہ جدید مدرسوں کا ماحول ظاہری طور پر بہت اچھا ہے اور مغربی تہذیب و ثقافت کا اثر لیے ہوئے تعلیم بظاہر بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن ان مدرسوں کی فضا میں مغربی ذہن رکھنے والے تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن حکمران ہوتے ہوئے حضرت عمر فاروقؓ جیسی خصوصیات اور درویش ہوتے ہوئے حضرت سلمان فارسیؓ جیسی صفات رکھنے والے پیدا نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ صرف بیابانوں میں پیدا ہوتے ہیں جہاں فطرت بے نقاب ہوتی ہے اور جہاں کے لوگ فطرت کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں نہ کہ یورپ اور اہل یورپ کے مقاصد کو۔

⑤ **معنی**: **صدیوں میں**: سینکڑوں برسوں میں۔ **حریف**: مدمقابل۔ **صہبائے مسلمانی**: مسلمانی کی شراب۔

مطلب: تہذیب جدید کے مے خانہ کی شراب آدمی کی زندگی کی تلوار کو کند کرتی ہے اور اس میں جو انسانی قدریں ہوتی ہیں ان کو پامال کرتی ہے لیکن جو شراب مے خانہ اسلام سے پی جاتی ہے وہ اس کی زندگی کی تلوار میں تیزی پیدا کرتی ہے اور اس میں ایسی مسلمانی اقدار پیدا کرتی ہے جو ایک صحیح مسلمان کا شیوہ ہے لیکن ایسی شراب اسلام پی کر مسلمانی کے صحیح منصب پر فائز شخص (جو مغربی تہذیب کی شراب پینے والے کا مدمقابل بن سکے) سینکڑوں سالوں میں کہیں جا کر پیدا ہوتا ہے اور جب پیدا ہوتا ہے تو اپنے زمانے کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے۔

ختم شد

الحمدللہ

فہرست

رُباعیات

ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

ابلیس کی مجلس شوریٰ

(شیطان کی مشورے کی مجلس یا پارلیمنٹ)

تعارف: جس طرح موجودہ دور میں ملک پر حکومت کرنے کے لئے انتخابات یا کسی اور ذریعہ کو کام میں لا کر قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ بنائی جاتی ہے اور اس میں مختلف معاملات پر بحث کے بعد ان کے متعلق فیصلے کئے جاتے ہیں اسی انداز میں علامہ اقبالؒ نے ایک خیالی اسمبلی (مجلس شوریٰ) تشکیل دی ہے جس میں حکمران پارٹی شیطان کا ٹولہ اور اس کا سربراہ شیطان خود ہے۔ اس مجلس شوریٰ میں زیر بحث آنے والے معاملات و مسائل آج کے دور سے تعلق رکھتے ہیں جن پر پہلے شیطان کے ساتھی پانچ ارکان اظہار خیال کرتے ہیں اور آخر میں شیطان فیصلہ کن رائے دیتا ہے۔

ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں!

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

① **معنی: عناصر:** عنصر کی جمع مراد آگ' پانی' مٹی' ہوا وغیرہ کے مادی عنصر یا اجزا۔ **عناصر کا پرانا کھیل:** مراد ہے کائنات جو مادی عناصر آگ' پانی' مٹی' ہوا وغیرہ کی ترکیب خاص سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اور اسے وجود میں آئے ہوئے اتنا طویل عرصہ ہو گیا ہے جس کا اندازہ نہیں۔ اس لئے یہ پرانی ہے۔ **دوں:** کمینہ' رذیل۔ **دنیائے دوں:** کمینہ دنیا۔ **ساکنان:** ساکن کی جمع' رہنے والے۔ **عرش:** تخت۔ **عرش اعظم:** بلند و بالا اور عظمت والے خدا کا تخت جو کہیں آسمانوں سے بھی آگے ہے۔ یہ تخت کوئی مادی نہیں ہے۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کے انوار کا ایک جہان ہے جسے خدا کی عظمت اور حقیقی بادشاہت کی بنا پر تخت کا نام دیا گیا ہے۔ **تمنا:** آرزو۔ **تمناؤں کا خون:** آرزوؤں کا برباد ہونا۔ **ابلیس:** شیطان۔

مطلب: شیطان اپنی مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) میں سب سے پہلے تقریر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ دنیا ایک پرانا کھیل ہے جو آگ' پانی' مٹی' ہوا وغیرہ سے تشکیل دیا گیا ہے۔ اسے کھیل اس لئے کہا ہے کہ جس طرح کھیل کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی اسی طرح کائنات کی بھی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ یہ کھیل اس لئے بھی ہے کہ جس طرح کھیل (ڈرامہ) کے اسٹیج پر مختلف کردار اور منظر آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح دنیا کے اسٹیج پر بھی لوگ پیدا ہو کر آتے ہیں اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور مر کر

چلے جاتے ہیں۔ یہ عمل نہ جانے کب سے ہو رہا ہے۔ شیطان یہ بھی کہتا ہے کہ یہ دنیا اپنی فطرت اور ذہنیت کے لحاظ سے کمینہ اور رذیل ہے۔ اس لئے کہ یہ کسی سے وفا نہیں کرتی۔ رذیلوں کی پرورش کرتی ہے اور شریفوں کو رگیدتی ہے۔ شیطان نے دنیا کو آسمانوں سے آگے خدا تعالیٰ کے انوار کے جہان میں رہنے والے فرشتوں کی آرزوؤں کی بربادی کا سبب بھی کہا ہے۔ اس لئے کہ حضرت آدمؑ کی پیدائش سے پہلے خدا کے عرش کے آس پاس صرف فرشتے تھے جو خدا کی بزرگی اور پاکی بیان کرتے رہتے تھے۔ اس وقت اللہ کے نزدیک یہی معزز مخلوق تھی۔ جب حضرت آدمی تخلیق کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔ اس طرح آدم کو سجدہ کرانے سے اللہ نے آدم کو فرشتوں سے افضل بنا دیا۔ اس تبدیلی کو شیطان فرشتوں کی آرزوؤں کا برباد ہونا کہتا ہے۔ خود شیطان نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو آدم سے برتر اور افضل سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی امیدوں کا خون نہیں ہونے دیا۔ اس کی سزا میں اگرچہ اسے دربار خداوندی سے نکلنا پڑا لیکن اس نے فرشتوں کی طرح خود کو آدم کے آگے نہیں جھکایا۔

② **معانی:** **کارساز:** بگڑے ہوئے کام بنانے والا۔ **آمادہ ہے:** راضی ہے' تلا ہوا ہے۔ **کاف و نوں:** حرف کاف (ک) اور حرف نون (ن)۔ دونوں کو ملا کر ایک لفظ کن بنتا ہے جس کے معنی ہیں ہو جا۔ اللہ تعالیٰ نے کن (ہو جا) کہا اور فیکون (ہو گیا) یعنی کائنات اور اس کی جملہ اشیاء اللہ کے لفظ کن کہنے سے عدم سے وجود میں آ گئیں۔

مطلب: وہ بگڑے ہوئے کام بنانے والا خدا جس کے ایک لفظ کن (ہو جا) کہنے سے کائنات عدم سے وجود میں آ گئی آج اس کی بربادی پر تلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کے وجود میں آنے کے کئی نظریے پیش کئے جاتے ہیں لیکن قرآن نے یہی بتایا ہے کہ پہلے عدم تھا۔ خدا کے سوا کچھ بھی نہ تھا پھر خدا نے ارادہ کیا اور کن کہا سب کچھ ہو گیا۔

③ **معانی:** **فرنگی:** انگریز' یورپ کا باشندہ۔ **ملوکیت:** بادشاہت۔ **خواب دکھایا:** حسین خیال دیا۔ **دیر:** مندر' ہندوؤں یا دیگر غیر مسلموں کی عبادت گاہ۔ **کلیسا:** گرجا' عیسائیوں کی عبادت گاہ۔ **مسجد:** مسلمانوں کی عبادت گاہ۔ **فسوں توڑا:** جادو توڑا۔

مطلب: شیطان کہتا ہے کہ میں نے اہل یورپ کو بادشاہت کا حسین خیال دیا اور اس طرح شخصی حکومت قائم کر کے عوام کو بے بس و بے کس بنا دینے کی فکر عطا کی۔ میں نے صرف یہی نہیں کیا میں نے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ان کی عبادت گاہوں سے نفرت دلا دی اور صدیوں سے ان پر مسجد' دیر اور کلیسا کا جو اثر تھا اسے ختم کر دیا۔ اس طرح یا تو ان کے مذہبی عقائد یا مسخ ہو کر رہ گئے یا مذہب ان کے دلوں سے بالکل رخصت ہو گیا۔

④ **معانی:** **سرمایہ دار:** دولت مند۔ **نادار:** غریب۔ **منعم:** جس پر اللہ نے دولت کا انعام کیا ہے۔ **جنوں:** ایسا جذبہ جس میں کسی خاص مقصد کے سوا کچھ نہ سوجھے۔

مطلب: دنیا میں دو طبقات ہیں۔ ایک طبقہ امیر ہے اور دوسرا غریب۔ شیطان کہتا ہے کہ میں نے دولت مندوں کے ذہن و دل میں دولت کی ایسی محبت پیدا کر رکھی ہے کہ وہ ہر حیلے بہانے' جائز ناجائز اور حرام

حلال ذریعے سے اسے اکٹھی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں اس کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں اور ان کے مقابلے میں جو مفلس ہیں۔ محنت مشقت سے روزی کماتے ہیں ان کے ذہن و دل میں' میں نے یہ بات بٹھا رکھی ہے کہ وہ تو پیدا ہی امیروں' وڈیروں' جاگیرداروں' نوابوں' بادشاہوں وغیرہ کی خدمت کرنے اور ان کے ہاتھوں اپنی آزادی اور عزت لٹانے کے لئے ہوئے ہیں وہ اسے تقدیر کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا ان کی قسمت میں لکھا ہوا ہے جس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

⑤ **معانی :** آتشِ سوزاں: جلا دینے والی آگ۔ **ابلیس** : شیطان۔ **ہنگامہ** : شورش' زندگی کا کاروبار اور معاملات' زندگی کا فکر و عمل' جدوجہد۔ **سوزِ دروں**: اندر کی جلن' اندرونی حرارت۔

مطلب میں نے جس شخص میں غیر ابلیسی نظام حیات اور بہ شیطانی اقدار زندگی کو جلا دینے والی آگ جلا رکھی ہے اسے کوئی ٹھنڈا نہیں کر سکتا۔ چونکہ اس کے معاملات' کاروبار حیات اور فکر و عمل میں یہ آگ میری اندرونی حرارت کی وجہ سے جل رہی ہے اس لئے کسی میں ہمت نہیں کہ اس کو بجھا سکے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ آج کے دور کے انسان کا ہر قدم اسی حرارت کی وجہ سے اٹھ رہا ہے اور اس کا ہر فعل اسی تپش کی بنا پر سرزد ہو رہا ہے۔ یہ بات میرے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

⑥ **معانی :** آبیاری: پانی دینا۔ **نخلِ کہن** : پرانا درخت۔ **سرنگوں** : نیچا۔

مطلب : اس سے پہلے شعر میں شیطان نے کاروبار دنیا اور معاملات حیات میں اپنے عمل دخل کو آگ اور حرارت کی علامتوں سے واضح کیا تھا۔ اس شعر میں اس عمل دخل کی وضاحت ایک درخت کی مثال دے کر کی ہے اور کہا ہے کہ شیطانی درخت تو آغاز کائنات ہی سے لگا ہوا ہے۔ یہ بہت پرانا ہے اور اس کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے انکار کرنے والے اور آدم کو سجدہ نہ کرنے والے دن سے ہے۔ شیطان کہتا ہے کہ میں نے تو اسی روز سے خدا کی مخلوق کو بہکانے اور گمراہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اس درخت کو جو جڑوں سے لے کر پھل تک شیطنت کا مزہ لئے ہوئے ہے میں اور میرے شتونگڑے برابر پانی دیتے رہتے ہیں اب یہ اتنا بلند و بالا اور شاخوں کے دور دور تک پھیلاؤ والا درخت بن چکا ہے کہ اس کو گرانے یا جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کسی میں ہمت نہیں۔

پہلا مشیر

(پہلا مشورہ دینے والا)

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی — ورنہ 'قوالی' سے کچھ کمتر نہیں 'علمِ کلام'
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟ — 'ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام'

① **معانی: محکم**: پائدار' مضبوط۔ **ابلیسی نظام**: شیطان کا دیا ہوا نظامِ حیات۔ **پختہ تر**: زیادہ مضبوط۔ **خوئے غلامی**: غلامی کی عادت۔ **عوام**: سب لوگ یا عام لوگ۔

مطلب: شیطان کی تقریر سن کر اس کی حکومت کا ایک رکن اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے آقا اس میں کوئی شک نہیں کہ جس شیطانی نظامِ حیات کا آپ نے اپنی تقریر میں ذکر کیا ہے وہ بڑا پائدار اور مضبوط ہے اور کسی کے بس کی بات نہیں کہ اسے تبدیل کر سکے یا ختم کر سکے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو نظامِ حیات ہم نے دنیا والوں کو دے رکھا ہے اس سے لوگ غلامی کی عادت میں پائدار سے پائدار ہوتے جا رہے ہیں۔ غلامی ان کے مزاج اور ذہنیت میں رچ بس گئی ہے اور وہ ہمارے نمائندوں کے آگے جو بادشاہ' نواب' جاگیردار' زمیندار' وڈیرہ' آمر وغیرہ کی شکل میں ہر جگہ موجود ہیں سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

② **معانی: ازل**: جہان کی تخلیق سے پہلے کا وقت جس کی ابتدا معلوم نہیں کی جا سکتی۔ مراد ہے ہمیشہ سے۔ **مقدر**: قسمت۔ **سجود**: سجدہ کرنا۔ **غریب**: طنز کے طور پر کہا ہے بے بس اور بے کس لوگ۔ **فطرت**: سرشت' ذہنیت۔ **قیام**: کھڑے ہونا۔ **نمازِ بے قیام**: وہ نماز جس میں کھڑے ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور نمازی سجدہ ہی میں رہے۔

مطلب: یہ لوگ جو ہماری تدبیر کے سامنے بے بس اور لاچار ہیں آج سے نہیں' ہمیشہ سے ہی ہمارے نظام کے پرستار چلے آتے ہیں۔ اپنے آقاؤں کے آگے جھکنا ان کی قسمت بن چکی ہے ان کی زندگی کی مثال تو ایسی نماز کی سی ہے جس میں قیام کرنے (کھڑا ہونے) کا رکن موجود ہی نہیں ہے۔ صرف رکوع و سجود ہی ہے۔ جھکنا ہی جھکنا ہے مراد ہے وہ اپنے آقاؤں کی غلامی میں اس حد تک پختہ ہو چکے ہیں کہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ان میں خیال تک نہیں آتا۔

③ **معانی: خام**: کچی' ناپختہ۔ **آرزو**: خواہش۔

مطلب: لوگ شیطانی نظام کے ایسے اور اتنے غلام بن چکے ہیں کہ غلامی کی اس زندگی سے آزاد ہونے کی خواہش اول تو ان کے دلوں میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر کہیں پیدا ہوتی بھی ہے تو یا تو وہ ختم ہو جاتی ہے یا کچی (ناپختہ) رہ جاتی ہے اور اس طرح کوئی بھی ہمارے نظام کی جکڑ بندی سے باہر نہیں نکل سکتا۔

④ **معانی: سعیِ پیہم**: لگاتار کوشش۔ **ملوکیت**: بادشاہت۔ **صوفی**: جو تصوف یا طریقت کو اپنائے ہوئے ہے۔ **کرامت**: کسی صوفی سے ایسی بات یا کام کا ہونا جسے عقل سمجھنے سے قاصر ہو۔

مطلب: یہ ہماری لگاتار کوشش کا عقل کو حیران کر دینے والا نتیجہ ہے کہ آج تصوف (طریقت) اور دین (شریعت) کے میدانوں کے لوگ صوفیانہ اور دینی روح سے بیگانہ ہو کر بادشاہت کے غلام بن چکے ہیں وہ صوفی جن کے بوریا کے آگے کبھی تخت جھکتے تھے آج خود بادشاہوں کے تخت کا طواف کر رہے ہیں۔ یہی صورتِ حال علمائے دین کی بھی ہے کل تک جو جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے سے خوف نہیں کھاتے تھے آج مصلحت کا شکار ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔

⑤ **معانی : طبع مشرق** : مشرق کا مزاج' مشرقی لوگوں کی طبیعت۔ **کم تر** : زیادہ کم۔ **موزوں** : مناسب۔ **افیون** : ایک نشہ آور چیز جو نشہ کرنے والے کو عمل سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ **قوالی** : وہ راگ جو صوفیانہ محفلوں میں روح کی بالیدگی کے لئے گایا جاتا ہے۔ **علم کلام** : کلام کا علم۔ یہ ایسا علم ہے جس میں دین کی باتوں کو عقل اور دلیل سے ثابت کیا جاتا ہے۔

مطلب : ہم نے مشرق کے رہنے والوں کو مراد ہے مسلمانوں کو جو مغرب کی بجائے مشرق میں زیادہ آباد ہیں۔ دو نشہ آور چیزیں کھلا رکھی ہیں۔ ایک قوالی ہے اور دوسری کلام کا علم۔ قوالی کو صوفیانہ نظام میں بڑا عمل دخل رہا ہے اور اسے روحانی جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے لیکن آج صوفیانہ حلقوں میں تصوف کی اصل روح تو غائب ہو چکی ہے اور صرف قوالی پر زور ہے ایسی قوالی جو روح پر کوئی اثر مرتب نہیں کرتی۔ دینی حلقوں کو دیکھیں تو وہاں بھی علمائے دین، دین کی اصل باتوں سے ہٹ کر دینی مسائل پر بحث کرنے اور ان کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے دلیلوں کے بکھیڑوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس طرح ان دونوں حلقوں کے لوگ عمل سے اسی طرح بیگانہ ہو چکے ہیں جس طرح افیون کھانے والا کوئی شخص ہر وقت اونگھتا رہتا ہے اور زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھتے ہوئے گھبراتا ہے۔

⑥ **معانی : طواف** : کعبے کے گرد چکر لگانا۔ **حج** : ارکان اسلام میں سے ایک رکن جو مکہ جا کر خانہ کعبہ کا طواف کرنے اور بعض دوسری رسومات (مناسک) ادا کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ **کند** : جس میں کاٹنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہو۔ **ہنگامہ** : شورش' بھیڑ۔ **مومن** : اہل ایمان' اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر صحیح ایمان رکھنے والا' پکا اور صحیح مسلمان۔ **تیغ** : تلوار۔ **نیام** : تلوار کا خول جس میں تلوار اس وقت رکھی جاتی ہے جب اسے چلانا مقصود نہ ہو۔ **تیغ بے نیام** : بغیر خول کے تلوار' ننگی تلوار جو ہر وقت دشمن کو کاٹنے کے لئے تیار ہو۔

مطلب : اگر اس دور کے مسلمانوں میں مکہ شریف جانے اور وہاں جا کر کعبے کے گرد چکر لگانے اور اہم رکن اسلام حج کی رسوم ادا کرنے کی کوئی صورت باقی رہ گئی ہے تو وہ محض ایک اجتماع اور بھیڑ کی سی صورت ہے۔ کعبہ کا طواف کرنے اور حج کے لئے مکہ شریف میں جمع ہونے کا اصل مقصد تو مسلمانوں میں قوت' اتفاق اور مرکزیت پیدا کرنا ہے۔ لیکن آج اس کی بجائے نفاق اور انتشار کی صورت حال نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کے اندر وہ قوت جو باطل سے ٹکرانے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی اب ختم ہو چکی ہے۔ کبھی مسلمان اپنے دشمنوں کے لئے ننگی تلوار کی مانند تھا جو ہر وقت ان کو کاٹنے پر آمادہ نظر آتی تھی لیکن آج یہ صورت حال ختم ہو چکی ہے اور مسلمان میں اللہ کی راہ میں لڑنے کا جذبہ ختم ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں مسلمانوں کے حج کے اجتماع اور کعبہ کے گرد چکر لگا کر اس سے وابستگی کے اظہار سے کوئی خطرہ نہیں۔

⑦ **معانی : نومیدی** : ناامیدی۔ **حجت** : دلیل۔ **فرمان جدید** : نیا حکم' جدید دور میں دیا گیا حکم۔ **فرمان** : حکم' فتویٰ۔ **جہاد** : اللہ کی راہ میں لڑنا۔ **اس دور میں** : عہد حاضر میں۔ **حرام** : دینی اعتبار سے ناجائز۔

مطلب : برصغیر کے صوبے متحدہ پنجاب کے قصبہ قادیاں میں انگریز عہد حکومت میں ایک شخص بنام مرزا غلام احمد پیدا ہوا تھا جس نے دین کی صدیوں کی روح کے خلاف یہ نیا حکم یا فتویٰ دیا تھا کہ اللہ کی راہ

جہاد کرنا اور اللہ کے دشمنوں سے لڑنا اس عہد میں دینی اور شرعی اعتبار سے ناجائز ہے اور انگریز جو ہم پر حکمران ہیں ان کے خلاف آزادی کے لئے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں۔ یہ شخص خود کو موعود مسیح کہتا تھا۔ مراد تھی کہ میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں جسے قیامت سے پہلے روئے زمین پر آ کر اسلام کو تقویت پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ وہ عیسیٰؑ جس کے اس طرح آنے کا وعدہ کیا گیا ہے وہ مریم کا بیٹا عیسیٰ نہیں وہ میں ہوں۔ اس پر برصغیر کے مسلمانوں میں خصوصاً اور دنیا کے مسلمانوں میں عموماً سخت رد عمل ہوا۔ مسیح ہونے کا دعویٰ کرنے والے شخص نے جہاد کے خلاف شرعی حکم یا فتویٰ بھی صادر کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اس عہد میں جہاد کرنا (اللہ کی راہ میں لڑنا) مسلمانوں پر حرام ہے۔ اس شعر میں اس نئے فتویٰ کی طرف اشارہ ہے جو چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں نہیں دیا گیا۔ اس نے یہ فتویٰ اس لئے صادر کیا تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنے آقا انگریز کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ صورت حال مسلمانوں کی ناامیدی پر دلالت کرتی تھی۔ اور ان کو ہمیشہ کے لئے مایوس ہو کر انگریز آقاؤں کی غلامی اختیار کرنے کی طرف راغب کرتی تھی۔

دوسرا مشیر

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟ تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

معانی: خیر: اچھائی، نیکی۔ شر: بدی، برائی۔ غوغا: شور۔ فتنہ: فساد۔

مطلب: پہلے مشیر کی باتیں سن کر حکومت شیطان کا ایک اور رکن اٹھتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ تیری ساری باتیں درست ہیں لیکن تو نے جہان میں پیدا ہونے والے ایک نئے فسادی نظام کا ذکر نہیں کیا جس کا نام جمہوریت ہے۔ کیا تجھے اس کی خبر نہیں ہے۔ تو ہمیں اس کے متعلق بتا کہ یہ ہمارے لئے اچھائی کی بات ہے یا برائی کی۔ میرے خیال میں جمہوریت کے نام پر یہ بھی ایک شاہی نظام ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سلطانی یا بادشاہت کے نظام میں ایک شخص بااختیار ہوتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے لیکن جمہوریت کے نظام میں جس میں عوام خود اپنی رائے سے حکومت چلانے کے لئے نمائندے منتخب کرتے ہیں یہی سلطانی روح ایک شخص کی بجائے چند اشخاص میں داخل ہو جاتی ہے۔ جو وزیر کہلاتے ہیں۔ جو کام بادشاہت میں فرد واحد کرتا ہے وہی کام یہ منتخب شدہ لوگ وزیر بن کر چند خاندانوں اور چند افراد کے ایک مجموعہ کی صورت میں سرانجام دیتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر اے میرے ساتھی رکن حکومت یہ بتا کہ یہ نظام جمہوریت جو مغرب نے دنیا کے ملکوں کو دیا ہے درست ہے یا غلط۔ اچھا ہے یا برا۔

پہلا مشیر

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے ۔ یہ وجودِ میر و سلطاں' پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ۔ ہے وہ سلطاں' غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟ ۔ چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر!

① **معانی:** **جہاں بینی:** جہان کے معاملات پر نظر رکھنا۔ **ملوکیت کا پردہ:** بادشاہت کی روح جس کے پیچھے کار فرما ہو۔ **خطر:** ڈر۔

مطلب: پہلا مشیر دوسرے مشیر کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ میں دنیا میں اٹھنے والے اس فسادی نظام اور فتنہ سے باخبر ہوں جس کا نام مغربی جمہوریت ہے۔ میں دنیا کے معاملات پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ مغربی جمہوریت کے پیچھے ملوکی یا شاہی روح ہی کار فرما ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو ہمیں اس جمہوری نظام کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں بلکہ یہ بھی ہماری پیداوار ہی ہے۔

② **معانی:** **آدم:** مراد ہے بنی نوع آدم۔ **خود شناس:** اپنے آپ کو پہچاننے والے۔ **خود نگر:** اپنے آپ کو دیکھنے والے۔

مطلب: جب آدمی میں مختلف وجوہات کی بنا پر یہ شعور اجاگر ہوا کہ وہ اپنی قدر و قیمت کو پہچان سکے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کا اہل ہو سکے تو ہم نے اس کے ذہن و دل میں یہ بات ڈال دی کہ اگر بادشاہی نظام میں تمہاری کوئی قدر و منزلت نہیں تو تم خود اپنے لئے حکمران منتخب کر لیا کرو جو تم میں سے ہو گا اور تمہارے حقوق کا خیال رکھے گا۔ اسی کو اس نے جمہوریت کا نام دے دیا لیکن اس میں ہوتا یہ ہے کہ اپنی طرف سے منتخب شدہ حکمران وہی حاکمانہ اور بادشاہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جو ایک حکمران بحیثیت بادشاہ کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں ایک شخص یہ کام کرتا ہے اور جمہوریت میں چند اشخاص یا خاندان مل کر وہی کچھ کرتے ہیں۔ اس لئے اے میرے رفیق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ جمہوری نظام بھی ہمارا ہی پیدا کردہ ہے۔ اس نظام کا لباس ضرور جمہوری ہے لیکن اندر جسم شاہی ہے۔

③ **معانی:** **کاروبار شہریاری:** بادشاہی نظام چلانے کا طریقہ۔ **حقیقت:** اصلیت۔ **میر:** امیر۔ **سلطاں:** بادشاہ۔ **منحصر:** انحصار ہونا۔

مطلب: بادشاہی نظام حکومت کا دارومدار اور انحصار کسی امیر یا بادشاہ کے وجود پر نہیں بلکہ اس کی اصلیت امیری یا شاہی رویہ پر ہے۔ یہی امیری یا شاہی رویہ اگر ہم جمہوریت کے نظام میں پیدا کر دیں تو اس کے ذریعہ منتخب شدہ ارکان حکومت وہی کچھ کریں گے جو کچھ سلطانی نظام میں ہوتا ہے۔

④ **معانی:** **مجلس ملت:** ملی مجلس' قومی اسمبلی۔ **پرویز:** ایران کے ایک بادشاہ کا نام ہے جس نے اپنے وقت کے ایک عاشق کو جس کا نام فرہاد تھا پہاڑ کھودنے پر لگا دیا اور خود اس کی محبوبہ کو جس کا نام شیریں تھا اپنے گھر ڈال لیا۔ پرویز کا نام بطور شاہی نظام کے یا حکمران کی علامت کے طور پر لیا گیا ہے۔

مطلب: چاہے کوئی منتخب شدہ قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ ہو اور چاہے کسی بادشاہ کا طرز حکومت ہو دونوں کا مقصود ایک ہی ہے اور وہ ہے دوسروں کو محنت مزدوری پر لگا کر ان کی روزی کو لوٹنا اور انہیں محتاج و نادار رکھنا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ایران کے بادشاہ پرویز نے فرہاد کی محبوبہ کو چھیننے اور اپنی ملکہ بنانے کے لئے

فرہاد کو یہ کہہ کر پہاڑ کھودنے پر لگا دیا تھا کہ اگر تو اس میں سے نہر نکال لائے گا تو شیریں تجھے مل جائے گی' وہ بے چارہ اس کام میں لگ گیا اور پرویز نے شیریں کو ملکہ بنا لیا۔ اس ایک مثال سے تم شاہی نظام کے رویہ کا اندازہ کر سکتے ہو۔ جمہوریت میں بھی یہ رویہ موجود ہوتا ہے۔

⑤ **معانی: مغرب**: براعظم یورپ۔ **روشن**: چمک دار۔ **اندروں**: اندر۔ **تاریک تر**: زیادہ سیاہ۔ **چنگیز**: ایک فاتح کا نام ہے جس کا تعلق ملک منگولیا (ایشیا) سے تھا اور جس نے اپنی فتح ممالک کے دوران اتنے ظلم کئے تھے کہ اس کا نام تاریخ میں ایک بہت بڑے ظالم کی حیثیت سے موجود و مشہور ہے۔

مطلب: موجودہ طرز کا جمہوری اور پارلیمانی نظام دنیا والوں کو اہل مغرب یعنی یورپ والوں سے ملا ہے۔ تم اے میرے رفیق اسے بہ نظر غور دیکھو اس کا ظاہر تو بڑا چمک دار نظر آئے گا لیکن اس کے اندر جو روح ہے وہ دنیا کے ظالم ترین بادشاہ یا فاتح چنگیز سے بھی زیادہ سیاہ ہے اس نظام میں منتخب شدہ ارکان حکومت اپنے منتخب کرنے والوں پر جو ستم ڈھاتے ہیں وہ چنگیزیت کو بھلا دیتے ہیں۔

تیسرا مشیر

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیمِ بے تجلی! وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

① **معانی: روح سلطانی**: بادشاہی روح۔ **اضطراب**: بے چینی' بے قراری۔ **اس یہودی**: ایک شخص بنام کارل مارکس کی طرف اشارہ ہے جس نے سرمایہ نامی ایک کتاب لکھ کر دنیا کو اشتراکی نظام یا کمیونزم دیا

مطلب: پہلے مشیر سے جمہوری نظام کی وضاحت سن کر شیطان کی حکومت کا ایک اور رکن کہتا ہے کہ اگر جمہوری نظام شاہی نظام سے بدتر اور چنگیز کی بربریت سے زیادہ سیاہ ہے تو ہمیں بے چین ہونے کی واقعی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک یہودی کارل مارکس نے دنیا کو اشتراکی' یا کمیونسٹ نظام دے کر ہمارے خلاف جو شرارت کی ہے اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔

② **معانی: کلیم**: مشہور پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے جنہیں کوہ طور پر خداوند تعالیٰ کی تجلی نصیب ہوئی تھی اور وہ اس سے گفتگو کرتے تھے اور جن کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنا ہاتھ بغل سے نکال کر ظاہر کرتے تھے تو وہ چمکتا تھا۔ کلیم کے لفظی معنی ہیں باتیں کرنے والا۔ **مسیح بے صلیب**: مسیح یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور جنہیں عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق صلیب پر یعنی سولی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ بے صلیب مسیح سے مراد ایسا مسیح جسے سولی پر لٹکایا نہ گیا ہو۔ **نیست**: نہیں ہے۔ **در بغل**: بغل میں۔ **دارد**: رکھتا ہے۔

مطلب: اس یہودی کی طرف اشارے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے تیسرا مشیر کہتا ہے کہ یہ وہ یہودی ہے جس کو جمہوری اور شاہی نظام کی چکی کے نیچے پسے ہوئے لوگ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا درجہ

دیتے ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے بچایا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے غریبوں اور بے کسوں کو سینے سے لگایا تھا اسی طرح یہ یہودی بھی اپنے دیئے گئے اشتراکی نظام کے ذریعے غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور بے بسوں کو شاہی اور جمہوری نظام کے فرعونوں اور غارت گروں کے ظالمانہ ہاتھوں سے بچا کر خود ان کو حکمران بننے کا طریقہ بتاتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کی تجلی اور نور کا مشاہدہ کرتے تھے اور اس سے باتیں کرتے تھے لیکن یہ یہودی خدا کا انکار کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ بھی غریبوں کو سربلند کرنے کا طریقہ بتاتا ہے لیکن یہ سولی پر نہیں چڑھایا گیا کیونکہ وہ پیغمبر نہیں تھا ایک نمبر ۲ اور واضح فرق یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر تو اس لئے آسمانی کتابیں (توریت اور انجیل) اتری تھیں کہ وہ پیغمبر خدا تھے لیکن یہ یہودی پیغمبر تو نہیں ہے لیکن توریت اور انجیل کی طرح ایک کتاب ضرور رکھتا ہے لیکن یہ غیر الہامی ہے۔ ایک جس کا نام سرمایہ ہے اور جسے یورپ کے مزدور اور کسان طبقہ میں مذہبی کتابوں کی طرح کی عزت دی جاتی ہے۔ بندے کی تصنیف ہے۔

③ **معانی**: کافر: انکار کرنے والا۔ پردہ سوز: پردہ جلانے والا۔ روز حساب: حساب کا دن، قیامت کا دن۔

مطلب: اس نظام ابلیسی کے انکار کرنے والے یہودی کی نگاہ نے ملوکیت اور جمہوریت پر پڑے ہوئے پردوں کو جلا کر اس کے پیچھے ان نظاموں کی اصل خرابیوں کو دیکھ لیا اور خود اپنی طرف سے ایک نیا نظام حیات دیا جس کی وجہ سے مشرق اور مغرب کی قوموں کے پسے ہوئے اور ستائے ہوئے فاقہ کش، غریب، مزدور اور کسان اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے اس طرح جاگ اٹھے جیسے قیامت کے روز مردے جاگ اٹھیں گے۔ ان پسے ہوئے طبقات کی زندگیاں ملوکی اور جمہوری نظاموں میں مردوں کی طرح تھیں اب ان میں زندہ رہنے اور زندہ رہنے کے لئے ظالموں سے نپٹنے کا شعور پیدا ہو گیا ہے۔

④ **معانی**: بندوں: غلاموں۔ آقاؤں: مالکوں۔ طناب: رسی۔

مطلب: اس شعر میں اس عظیم اشتراکی انقلاب کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعے عوام نے ایک شخص بنام لینن کی قیادت میں اکٹھے ہو کر روس کے شہنشاہ زار روس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور حکمرانوں کو قتل کر دیا تھا۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور وڈیروں کی زمینیں چھین لی تھیں۔ کارخانوں کے مالکوں کو کارخانوں سے بے دخل کر کے ان پر اپنا کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور سارے ذرائع معیشت کو مزدوروں اور کسانوں کی بنائی ہوئی حکومت کے قبضے میں کر دیا تھا۔ شیطان کا مشیر اسے عوام کے مزاج میں پیدا ہونے والا فساد کہتا ہے جس کے ذریعے انہوں نے غلام ہوتے ہوئے ایسے اقدامات کئے کہ ان کے مالک تہس نہس ہو کر رہ گئے۔ آقاؤں کے خیموں کی رسیاں توڑ کر ان کو گرا دینے کا یہی مفہوم ہے کہ انہیں سارے ذرائع سے محروم کر دیا۔ یہ دنیا میں پہلا اشتراکی انقلاب اور اس کے ذریعے پہلی اشتراکی نظام والی حکومت قائم ہونے کا عمل تھا جس کے بعد یہ دوسرے ملکوں تک پھیل گیا۔ شیطان کا یہ مشیر اسے اپنی شیطانی حکومت کے لئے چیلنج قرار دیتا ہے اور پریشان ہے۔

چوتھا مشیر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ — آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا — گاہ بالد چوں صنوبر، گاہ نالد چوں رباب

① **معانی: توڑ**: روک کرنا، خاتمہ، مٹانا، مقابلہ میں۔ **رومۃ الکبریٰ**: عظیم رومن سلطنت جو قبل از مسیح قائم تھی۔ **ایوانوں**: محلوں۔ **آلِ سیزر**: سیزر کی اولاد، سیزر قدیم ملک روم کا جسے آج کل اطالیہ (یورپ کا ایک ملک) کہتے ہیں اور قدیم رومن سلطنت کا عظیم ہیرو تھا **سیزر کا خواب**: جو خواب کہ سیزر نے کبھی عظیم رومن سلطنت قائم کرنے کے لئے دیکھا تھا۔

مطلب: چوتھا مشیر تیسرے مشیر کی پریشانی اور بے قراری دیکھ کر کہتا ہے کہ اشتراکی نظام سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے اس کو روکنے اور ختم کرنے کے لئے اطالیہ (اٹلی) میں ایک شخص بنام مسولینی پیدا کر دیا ہے جس نے فاشسٹ نظام نافذ کر کے اشتراکی نظام کا راستہ روک دیا ہے۔ فاشسٹ نظام میں ساری طاقتیں ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ وہ اطالیہ (اٹلی) جو کبھی عظیم رومن سلطنت کا مرکز تھا اس سلطنت کے پرانے محلوں میں اب مسولینی موجود ہے جس نے قدیم رومن ہیرو سیزر کی اولاد کو یعنی اہل اطالیہ کو یہ خواب دکھایا ہے کہ میرے دیئے گئے فاشسٹ نظام کے ذریعہ ہم پھر قدیم رومن سلطنت کی سی وسعت اور عروج حاصل کر لیں گے۔ یہ قدیم رومن سلطنت قبل از مسیح یورپ، ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں پر مشتمل تھی جو اسلامی عہد تک کافی سمٹ چکی تھی۔ اس رہی سہی سلطنت کو مسلمانوں نے ختم کر دیا تھا۔

② **معانی: بحرِ روم**: یورپ اور افریقہ کے درمیان ایک سمندر۔ **گاہ**: کبھی۔ **صنوبر**: ایک قد آور درخت۔ **بالد**: ابھرتا ہے۔ **نالد**: روتا ہے۔ **چوں**: مانند۔ **رباب**: ایک قسم کا ساز۔

مطلب: بحرہ روم کی موجوں سے کون لپٹا ہوا ہے۔ وہ مسولینی کا عظیم بحری بیڑہ ہے جو اس سمندر پر حاکمیت قائم کرنے کے لئے اور سمندر پار کے افریقی ممالک پر قبضہ جمانے کے لئے کبھی ابھرتا ہوا اور کبھی سائرن بجاتا ہوا اپنے کام میں مصروف ہے اس شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسولینی بحیرہ روم کو تسخیر کرنے کے لئے اپنی قوم کے سامنے ولولہ انگیز تقریروں کے ذریعہ کبھی ان کو صنوبر کے درخت کی مانند (بلند حوصلہ عطا کر کے) کھڑا کر دیتا ہے اور کبھی ان کو رباب کی مانند کھوئی ہوئی عظمت پر خود رو کر اور ان کو رلا کر ان میں اسے بحال کرنے کا ولولہ پیدا کر رہا ہے اور اس کے لئے بحرۂ روم پر اپنی حاکمیت قائم کر کے اور اسے عبور کرنے کے بعد افریقی ممالک پر قبضہ جما کر عملاً ان کو سربلند ہونے کا ثبوت مہیا کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ مسولینی نے دوسری جنگ عظیم (1939 تا 1945) سے پہلے افریقہ کے ممالک حبشہ اریٹیریا، طرابلس وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہی میں مسولینی کو اتحادیوں نے زبردست شکست دی جس کے بعد یہ ممالک اس کے تسلط سے نکل گئے۔

تیسرا مشیر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

معانی : **عاقبت بینی:** انجام کو دیکھ لینا۔ **قائل :** ماننا۔ **افرنگی سیاست :** اہل یورپ کی سیاست۔ **بے حجاب:** بے پردہ۔

مطلب: چوتھے مشیر کی رائے سن کر تیسرا مشیر اسے کہتا ہے کہ میں تو مسولینی کی سیاست اور نظام کو نہیں مانتا کیونکہ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اس کے انجام کے طور پر اہل یورپ کی سیاست کا پول مزید کھل جائے گا اور اس طرح اشتراکی نظام کو مزید تقویت حاصل ہو گی۔ لوگ مغربی جمہوریت اور ملوکیت کے ظلم کی طرح مسولینی کے فاشسٹ نظام کے ظلم کی وجہ سے اس سے بھی تنگ آ جائیں گے جس کے نتیجے میں اشتراکیت کو ابھرنے کا مزید موقع مل جائے گا۔

پانچواں مشیر

(ابلیس کو مخاطب کر کے)

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز ابلۂ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار
گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

① **معانی :** **سوزِ نفس:** سانس کی تپش۔ **کارِ عالم:** دنیا کا کام۔ **استوار:** پائیدار ہونا، قائم ہونا۔ **پردگی:** چھپی ہوئی۔ **آشکار:** ظاہر۔

مطلب: اے میرے آقا تیری سانس کی گرمی سے دنیا کا کام چل رہا ہے۔ اگر لوگوں میں تیرے سینہ کی حرارت نہ پہنچی ہوتی تو یہ دنیا کے ہنگامے سرد رہتے تو تو وہ ہستی ہے کہ دنیا کی پوشیدہ باتیں بھی تجھ پر ظاہر ہیں اس لیئے ہمیں یہ بتا کہ اس اشتراکی نظام سے ابلیسی نظام کو کیا خطرات ہیں۔

② **معانی :** **آب و گل:** پانی اور ہوا۔ مراد ہے عناصر سے بنا ہوا جہان یا آدمی۔ **حرارت:** گرمی۔ **سوز و**

ساز: گرمی اور رنگینی۔ **ابلہ جنت**: جنت کا بے وقوف یا بھولا' مراد ہے آدم۔ **دانائے کار**: کام کو جاننے والا۔

مطلب: یہ جہان جو آگ' پانی' مٹی' ہوا کے عناصر سے بنا ہوا ہے یا یہ آدم جو انہی عناصر سے وجود میں آیا ہے۔ تیری دی گئی گرمی کی وجہ سے حرارت اور رنگینی کا مجسمہ ہے۔ اور جنت کا یہ بھولا یعنی آدم تیری تعلیم کی وجہ سے ہی کاروبار دنیا سے آشنا ہے۔ اگر تو اسے ممنوعہ درخت کے پاس جانے کی ترغیب نہ دیتا اور وہ اپنے بھول پن یا بے وقوفی کی بنا پر تیری اس تعلیم پر عمل نہ کرتا تو وہ جنت میں ہی رہتا اور اس میں فرشتوں کی طرح سوائے اللہ کی تسبیح بیان کرنے کے اور کوئی حرارت نہ ہوتی۔ یہ جہان کی حرارت اور رنگینی اس آدم کے جنت سے نکلنے اور زمین پر آباد ہونے کی وجہ سے ہے۔ زمین پر آبادی نوع آدم میں جو سوز و ساز دکھائی دیتا ہے۔ یہ صرف تیری تعلیم کی وجہ سے ہے ورنہ یہاں بھی وہ سوائے اللہ کی یاد کے کچھ نہ کرتی۔

③ **معانی**: **فطرت آدم**: آدمی کی سرشت۔ **محرم**: جاننے والا۔ **پروردگار**: پالنے والا' خدا۔

مطلب: میں تو یہ جانتا ہوں کہ آدمی کی سرشت کا تجھ سے بڑھ کر وہ خدا بھی جاننے والا نہیں جو سادہ دل بندوں میں جہان اور جہان والوں کا پالنے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہ تیرے آدمی کی فطرت کو جاننے ہی کا نتیجہ تھا کہ تو اسے بہلا پھسلا کر اور بے وقوف بنا کر اس درخت کا پھل کھانے پر مجبور کر سکا جس کے کھانے کی اسے ممانعت تھی اور اس طرح تو اسے جنت سے نکلوا سکا۔

④ **معانی**: **تسبیح**: پاکی بیان کرنا۔ **تقدیس**: بزرگی بیان کرنا۔ **طواف**: پھیرے لینا۔ **ابد تک**: ہمیشہ کے لئے۔ **سرنگوں**: سر جھکائے۔ **شرمسار**: شرمندہ۔ **غیرت**: عزت نفس۔

مطلب: وہ فرشتے جو ہمیشہ اللہ کی پاکی اور بزرگی بیان کرتے رہتے ہیں اور اس کی ذات ہی کو پھیرے لینے کا اہل سمجھتے ہیں۔ تیری غیرت کے آگے وہ بھی سر جھکائے ہوئے اور شرمندہ ہیں۔ اس لئے کہ وہ تو خدا کے حکم پر آدم کو سجدہ کرنے کے لئے جھک گئے تھے لیکن تیری عزت نفس نے یہ گوارا نہیں کیا تھا اور تو نے آدم کو سجدہ کرنے کے مقابلے میں ہمیشہ کے لئے خدا کی درگاہ سے دور ہو جانے کو پسند کیا تھا۔ اور پھر جب منع کئے ہوئے درخت کا پھل کھانے پر اس آدم کو جنت سے نکال دیا گیا جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا تو وہ اپنے فعل پر ہمیشہ کے لئے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

⑤ **معانی**: **مرید**: بیعت کرنے والا' کسی کو مرشد ماننے والا۔ **افرنگ**: یورپ۔ **ساحر**: جادوگر۔ **فراست**: دور اندیشی' عقل' سمجھ۔

مطلب: اے میرے آقا اگرچہ یورپ کے سارے جادوگر جو اپنے سیاسی جادو اور چالبازی سے دنیا کی قوموں کو غلام بنائے ہوئے ہیں تجھے اپنا مرشد مانتے ہیں۔ اپنے افکار و اعمال میں تیرے ہی اشارے پر چلتے ہیں لیکن اب مجھے ان کی دور اندیشی اور معاملات کو سمجھنے کی اہلیت پر شک ہونے لگا ہے۔ اس بنا پر کہیں ایسا نہ ہو کہ ابلیسی نظام شکست کھا جائے۔

⑥ **معانی**: **یہودی فتنہ گر**: فتنہ پیدا کرنے والا یہودی مراد ہے اشتراکی نظام دینے والا کارل مارکس۔ **مزدک**: کارل مارکس سے بہت پہلے ایران میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام مزدک تھا اور اس نے بھی اشتراکی قسم کا نظام وضع کیا تھا اس لئے اصطلاح میں اشتراکیت کو مزدکیت بھی کہتے ہیں۔ **بروز**: سایہ' کسی کی صفتوں کا

دوسرے میں آ جانا۔ **قبا:** ایک قسم کا لباس۔ **تار تار:** پارہ پارہ۔

مطلب: پانچویں صدی عیسوی میں ایران میں مزدک نے جو نظام دیا تھا اسی قسم کا نظام بیسویں صدی عیسوی میں کارل مارکس نے دیا ہے۔ جو صفتیں مزدک میں تھیں وہ کارل مارکس میں حلول کر گئی ہیں۔ اس یہودی کارل مارکس نے عہد حاضر میں مزدکیت یا اشتراکیت کا جو فتنہ اور فسادی نظام دنیا کو دیا ہے اس سے ہر دوسرے سیاسی نظام کا لباس پارہ پارہ ہونے والا ہے۔ اشتراکیت ان سب نظاموں کو جو میرے آقا آپ کے پیدا کردہ ہیں ختم کر دے گی۔

⑦ **معانی: زاغ دشتی:** بیابان یا جنگل کا کوا' فاقہ کش' کسان' مزدور اور غریب کے لئے علامت۔ **شاہین و چرغ:** دو پرندے جو دوسرے پرندوں کا شکار کر کے ان کو کھاتے ہیں۔ بادشاہ' جاگیردار زمیندار' کارخانہ دار اور وڈیرہ کی علامت۔ **ہمسر:** برابر۔ **روزگار:** زمانہ۔

مطلب: بیابان اور جنگل کے کوے جو بازوں اور چرغوں کا شکار تھے اب ان کی برابری کا دعویٰ کرنے لگے ہیں۔ مراد ہے اشتراکی نظام نے محنت کشوں' کسانوں' مزدوروں' غریبوں اور مظلوموں کے اندر اپنے حقوق حاصل کرنے کا ایسا شعور پیدا کر دیا ہے کہ اب وہ بادشاہوں' نوابوں' جاگیرداروں اور وڈیروں کی برابری کر رہے ہیں بلکہ ان کی جگہ لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ دیکھیں مزاج زمانہ کتنی تیزی سے بدلا ہے۔

⑧ **معانی: آشفتہ:** پریشان۔ **وسعت افلاک:** آسمانوں کا پھیلاؤ۔ **ناوانی:** بے وقوفی۔ **مشت غبار:** گرد کی مٹھی۔

مطلب: جس کو ہم اپنی بے وقوفی کی وجہ سے گرد کی یا مٹی کی ایک مٹھی سمجھے تھے اس نے پریشان ہو کر یا پھیل کر یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ آسمانوں کے پھیلاؤ پر چھا گئی ہے۔ مراد ہے کہ جس اشتراکی نظام کو شروع میں ہم معمولی سمجھے تھے اب اس نے روئے زمین کے سارے ملکوں میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔

⑨ **معانی: فتنہ فردا:** آنے والے کل یا مستقبل کا فتنہ۔ **عالم:** حال' صورت۔ **ہیبت:** دبدبہ' خوف۔ **کوہسار:** پہاڑوں کا سلسلہ۔ **مرغزار:** جنگل' باغ۔ **جوئبار:** ندی نالے۔

مطلب: یہ اشتراکی نظام جو مستقبل میں تمام اہل زمین کے لئے فتنہ و فساد کی صورت اختیار کرنے والا ہے اس سے پہاڑ' دریا' جنگل اور باغ سب لرز رہے ہیں مراد ہے دنیا کا ہر ملک خطرہ محسوس کر رہا ہے کہ کہیں د سے دبے ہوئے اور پسے ہوئے لوگ اس نظام کی بدولت اٹھ نہ کھڑے ہوں اور یوں ان میں قائم جمہوری' ملوکی' یا جاگیردارانہ نظام ختم ہو کر نہ رہ جائے۔

⑩ **معانی: آقا:** مالک۔ **زیر و زبر:** تہس نہس' الٹ پلٹ۔ **سیادت:** قیادت۔ **فقط:** صرف۔ **مدار:** انحصار۔

مطلب: اے میرے مالک میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جہان جس کا صرف تیری قیادت اور راہبری پر انحصار ہے وہ الٹ پلٹ ہونے کو ہے۔ مراد ہے دنیا کو جو نظام ہائے سیاست و اقتصادیات ہم نے دے رکھے ہیں اشتراکیت کی وجہ سے ان سب کو خطرہ ہے اور ان کے ختم ہو جانے اور ان کی جگہ اشتراکیت کے آجانے کا

ذر ہے۔

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو ۔۔۔ کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق ۔۔۔ میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ ۔۔۔ سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے ۔۔۔ توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک ۔۔۔ مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد ۔۔۔ یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے ۔۔۔ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں ابتک نظر آتے ہیں وہ ۔۔۔ کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے ۔۔۔ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

(2)

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں ۔۔۔ ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں ۔۔۔ بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ۔۔۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر ۔۔۔ حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے ۔۔۔ نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف ۔۔۔ منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ۔۔۔ پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب ۔۔۔ یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے ۔۔۔ یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

(3)

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات ۔۔۔ ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟ — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

① **معانی**: **دست**: ہاتھ۔ **تصرف**: قدرت، قبضہ، چیزوں اور معاملات میں دخل دے کر بول سکنے کی طاقت۔ **جہانِ رنگ و بو**: رنگ اور بو کا جہان، وہ جہان جو رنگ اور خوشبو کی طرح خوش نما ہے اور کشش رکھتا ہے لیکن رنگ اور خوشبو کی طرح اڑ جانے والا۔ مراد فانی دنیا۔ **تو بتو**: تہ بہ تہ۔ **تو**: تہ۔

مطلب: جب ابلیس کے پانچوں مشیر تقریریں کر چکے اور اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کر چکے تو ابلیس تقریر کرنے کے لئے اٹھتا ہے اور بحث کو سمیٹتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میرے ارکان سلطنت تمہیں فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ایسی طاقت ہے کہ میں اس فانی کائنات کی جملہ اشیا اور معاملات میں دخل دے کر ان کو اپنے حق میں کر سکتا ہوں۔ مرے تصرف کا ہاتھ چھوٹا نہیں بلکہ یہ اس فانی دنیا کی وسیع زمین، چاند، سورج اور تہ بہ تہ آسمانوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور معاملات و اشیا کو ہر جگہ اپنے حق میں کر سکتا ہے۔

② **معانی**: **تماشا**: تعجب یا شوق سے دیکھنا۔ **شرق**: مشرق۔ **غرب**: مغرب۔ **لہو گرمانا**: غصہ دلانا۔ **اقوام**: جمع قوم۔

مطلب: لوگ اپنی توجہ اور حیرت کی آنکھوں سے مشرق اور مغرب کے اس نظارہ کو دیکھیں گے یا مشرق اور مغرب کے لوگ اس نظارہ کو دیکھیں گے جو میرے یورپ کی قوموں کو آپس میں غضب ناک کر دینے کی وجہ سے پیدا ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ علامہ کے ارمغان حجاز کی زیر نظر نظم کے لکھے جانے کے تین سال بعد 1939 میں تباہ کن جنگ عظیم برپا ہوئی جو 1945 تک رہی۔ اور دنیا کی بہت بڑی تباہی کا سبب بنی۔

③ **معانی**: **امامانِ سیاست**: سیاست کے امام، سیاسی راہنما۔ **کلیسا**: گرجا، عیسائیوں کی عبادت گاہ۔ **دیوانہ بنانا**: عقل و ہوش سے بیگانہ کر دینا۔ **ہو**: نعرہ مستانہ۔ **شیوخ**: شیخ کی جمع۔ **کلیسا کے شیوخ**: پادری، گرجوں کے شیخ، عیسائیوں کے مذہبی راہنما۔

مطلب: مجھ میں اتنی طاقت اور صلاحیت ہے کہ اگر میں عالم مستی میں ایک نعرہ لگاؤں تو وہ یورپ کے سیاسی اور مذہبی راہنماؤں سب کو عقل و ہوش سے بیگانہ کر سکتا ہے اور وہ اپنے نظریات اور عقائد کو چھوڑ کر میرے راستے پر آ سکتے ہیں۔ اور میں جو کچھ چاہوں ان سے کرا سکتا ہوں۔

④ **معانی**: **کارگاہ**: کارخانہ۔ **ناداں**: بے وقوف۔ **اس تہذیب**: مغربی تہذیب کی طرف اشارہ ہے۔ **جام و سبو**: پیالے اور صراحیاں یا مٹکے۔

مطلب: جو شخص یورپ کی تہذیب کو شیشے کے کارخانہ کی طرح خوبصورت سمجھتا ہے وہ بے وقوف ہے۔ وہ اس کارخانہ میں بنے ہوئے پیالوں اور مٹکوں یا صراحیوں کو توڑ کر ان کا اندر دیکھے تو اس پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ ظاہر میں تو خوبصورت ہیں لیکن اندر سے بھیانک اور بدنما ہیں۔ ان کے اندر جو شراب بھری ہوئی ہے وہ انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔ مراد ہے تہذیب مغرب کا ظاہر بڑا دلفریب' دلکش اور حسین ہے لیکن اس کی حقیقت بڑی انسانیت سوز ہے۔ شیطان کہتا ہے یہ اس لئے ہے کہ یہ تہذیب میری ہی پیدا کردہ ہے۔

⑤ **معانی:** **دست فطرت:** قدرت کا ہاتھ۔ **چاک کرنا:** پھاڑ دینا۔ **مزدکی منطق:** اشتراکی فلسفہ یا نظریہ۔ **سوزن:** سوئی۔ **رفو ہونا:** سیا جانا۔

مطلب: قدرت کے ہاتھوں نے جن گریبانوں کو پھاڑ رکھا ہے وہ اشتراکی نظریات کی سوئی سے نہیں سیے جا سکتے۔ مراد یہ ہے کہ امیر غریب کا فرق قدرت نے خود پیدا کر رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا کاروبار نہ چلے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قدرت اس فرق کو حقوق کی پامالی اور عزت نفس کی بربادی کا راستہ نہیں دکھاتی بلکہ ایک دوسرے کے حقوق اور دائرہ کار کو مقرر کر کے آبرومندانہ اور انسانیت بردار زندگی بسر کرنے کے لئے کہتی ہے۔ اشتراکیت اس فرق کو مٹانا چاہتی جو ممکن بھی نہیں اور فطری بھی نہیں۔ اس لئے یہ اشتراکی نظریہ ہمارے لئے خطرہ کا سبب نہیں ہے بلکہ یہ تو میرا ہی پیدا کیا ہوا اور سمجھایا ہوا ہے۔ اس میں میری ہی روح کارفرما ہے۔

⑥ **معانی:** **کوچہ گرد:** آوارہ گرد۔ **پریشاں روزگار:** پریشان زندگی والے۔ **آشفتہ مغز:** دماغی طور پر پریشان۔ **آشفتہ ہو:** پریشان خیالات والے یا پریشان نظریات اور باتوں والے۔

مطلب: اشتراکی نظام کو ماننے والے انسانیت کی راہ سے بھٹکے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ آوارگی' پریشان دماغی اور فضول باتیں کرنا ان کی اہم خصوصیات ہیں۔ ایسے لوگ ہمیں کب ڈرا سکتے ہیں۔ ہمارے نظام کو ان سے کوئی خطرہ نہیں۔

⑦ **معانی:** **خطر:** ڈر۔ **اس امت:** مسلمان قوم۔ **خاکستر:** راکھ۔ **شرار آرزو:** آرزو کی چنگاری۔

مطلب: ملوکیت اور جمہوریت کی طرح مجھے اشتراکیت سے بھی کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ یہ بھی میری ہی پیدا کردہ ہے۔ ہاں اگر مجھے کوئی ڈر ہے تو اس مسلمان قوم سے ہے جو جل کر اگرچہ راکھ ہو چکی ہے لیکن اس راکھ کے اندر دوبارہ ابھرنے کی آرزو کی چنگاری ابھی تک موجود ہے۔ مجھے خوف ہے کہ یہ چنگاری پھر سے آگ نہ بن جائے۔ اور ہمارے پیدا کردہ نظاموں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

⑧ **معانی:** **خال خال:** کوئی کوئی' کہیں کہیں۔ **اشک سحرگاہی:** صبح کا رونا۔ **اشک سحرگاہی سے وضو کرنا:** علی الصبح رو رو کر دعائیں اور التجائیں کرنا۔

مطلب: اس مسلمان قوم میں' باوجود اس کے مٹ جانے کے کہیں کہیں ایسا شخص اب بھی نظر آتا ہے جو علی الصبح اٹھ کر اپنی دعاؤں اور التجاؤں میں گڑگڑا کر اسلام کے دوبارہ عروج حاصل کر لینے کی آرزوئیں کرتا ہے۔ یہ شخص ہمارے لئے ایک ظالم کی طرح ہے۔ کہیں اس کی دعائیں اور التجائیں بار آور نہ ہو

جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو شیطانی نظام روئے زمین سے مٹ جائیں گے۔

⑨ **معانی**: **روشن**: ظاہر۔ **باطن ایام**: زمانے کا اندرون۔ **فتنہ فردا**: کل پیدا ہونے والا فتنہ۔ **مزدکیت**: اشتراکیت۔

مطلب: جس شخص پر میری طرح زمانے کا اندرون ظاہر ہے وہ جانتا ہے کہ ابلیسی نظام کے لئے جو نظام کل کو فتنہ بننے والا ہے وہ اشتراکیت نہیں ہے بلکہ اسلام ہے۔

(2)

① **معانی**: **حامل قرآن**: قرآن اٹھانے والی یا رکھنے والی مراد ہے قرآن پر عمل کرنے والی۔ یہ **امت**: مسلمان قوم۔ **سرمایہ داری**: دولت سے محبت کرنا۔ **بندۂ مومن**: مومن بندہ، وہ جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر سچا ایمان رکھتا ہے۔ صرف زبان سے نہیں دل سے بھی مانتا ہے۔

مطلب: جب شیطان نے اپنے اراکین سلطنت پر یہ بات منکشف کر دی کہ مستقبل میں اگر کوئی قوم ہمارے ابلیسی نظام کو ختم کرنے کے درپے ہو سکتی ہے تو وہ صرف مسلمان قوم ہے اور صرف اسلامی آئین آنے والے دور میں ہمارے نظام کے لئے خطرہ ہے۔ تو اس پر اراکین نے تعجب کیا کہ عہد حاضر کی ایک غلام، بے بس اور بھٹکی ہوئی قوم کس طرح دوبارہ سرفراز ہو سکتی ہے تو اس کے جواب میں شیطان کہتا ہے کہ بے شک عہد حاضر کی مسلمان قوم قرآن پر عمل نہیں کر رہی اور قرآنی دستور پر یقین نہیں رکھتی اور اس کا ایمان قرآنی نظام کی بجائے سرمایہ دارانہ نظام پر ہے اور اس قوم کے افراد دین اسلام پر حقیقی معنوں میں عمل پیدا ہونے کی بجائے دولت سے محبت کرتے ہیں اور جاگیردارانہ، زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ رویہ رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ میں بتانے والا ہوں صرف اسی قوم کے پاس قرآن پر مبنی وہ نظام ہے جس پر اگر اس نے عمل شروع کر دیا تو ہمارے پیدا کردہ جملہ نظاموں کو مٹنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

② **معانی**: **ید بیضا**: سفید ہاتھ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطا کیا تھا کہ جب وہ اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر گریبان میں سے نکالتے تھے تو یہ چمکتا تھا اس میں سے نور نکلتا تھا۔ **پیران حرم**: کعبہ کے پیر، مسلمانوں کے دینی اور روحانی راہنما۔

مطلب: مغرب (یورپ) آزاد بھی ہے اور ترقی یافتہ بھی۔ اس کی فضا روشن ہے، دن کی طرح۔ اس کے مقابلے میں مشرق کے ملک غلام بھی ہیں اور غیر ترقی یافتہ بھی۔ یہاں کی فضا رات کی مانند ہے اندھیرا ہی اندھیرا۔ اس اندھیرے کو جس روشنی سے دور کیا جا سکتا ہے وہ صرف اسلام کے پاس ہے لیکن اس کے دینی اور روحانی راہنما بے نور ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان سے اس تاریکی کے دور کئے جانے کی کوئی امید نہیں۔

③ **معانی**: **عصر حاضر**: موجودہ زمانہ۔ **تقاضا**: لازمی نتیجہ، ضرورت۔ **خوف**: ڈر۔ **آشکارا**: ظاہر۔ **شرع پیغمبر**: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، دین اسلام کا نظام۔

مطلب: شیطان اپنے رفقائے کار سے کہتا ہے ان سب باتوں کے باوجود موجودہ دور کے حالات دیکھ کر

مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ حالات اہل دنیا کو تاریکی کا احساس دلا کر نور کی تلاش میں نکلنے کے لئے مجبور نہ کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے گئے نظام حیات کی طرف لپکیں گے کیونکہ نور صرف وہیں ہے اور اس کے نتیجے میں دنیا کو دیا گیا ہمارا نظام حیات ختم ہو جائے گا۔

④ **معانی : الحذر** : ڈرو۔ **آئین پیغمبر** : حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا دستور حیات۔ **حافظ ناموس زن** : عورت کی عزت کا حفاظت کرنے والا۔ **مرد آزما** : مرد کو بطور مرد آزمانے والا۔ **مرد آفریں** : مرد پیدا کرنے والا۔

مطلب : میرے ساتھیو دنیا کے کسی نظام اور دستور سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ تو سب میرے ہی پیدا کردہ ہیں ہاں اس دستور سے یا اس آئین حیات سے جو قرآن و سنت کے ذریعے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دیا ہے ہر وقت ڈرتے رہو کیونکہ اس دستور میں عہد حاضر کے برعکس عورت کی عزت، عصمت اور عفت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ ایسے مرد پیدا کئے جاتے ہیں جو واقعی اپنی صفات کے اعتبار سے مرد ہوں۔ عہد حاضر کے مردوں کی طرح نہیں کہ شکل و صورت اور جنس کے اعتبار سے تو مرد ہیں لیکن صفات کے اعتبار سے نامرد اور مخنث ہیں۔ صفات کے لحاظ سے مرد ہوتے تو میرے ابلیسی نظام کا مقابلہ کرتے اور اسے کہیں نافذ نہ ہونے دیتے۔ اسلام صرف یہ نہیں کرتا کہ مردوں کو حقیقی مردانہ صفات سے نوازتا ہے اور ان میں شیطانی نظام ہائے حیات کا مقابلہ کر کے اسے شکست دینے کی اہلیت اور صلاحیت پیدا کرتا ہے بلکہ آزماتا بھی ہے۔ اور میدان عمل میں بھی ان کو سرگرم دکھاتا ہے۔

⑤ **معانی : نوع غلامی** : غلامی کی ہر قسم۔ **نے** : نہیں ہے۔ **فغفور و خاقاں** : ترکستان اور چین کے ملکوں کے بادشاہوں کے لقب، مراد بادشاہ۔ **فقیر رہ نشیں** : راستے میں بیٹھنے والا فقیر۔

مطلب : قرآن و سنت کا دستور آدمی کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاتا ہے یہ غلامی چاہے سیاسی ہو، چاہے اقتصادی، چاہے تہذیبی ہو، چاہے ثقافتی، اس دستور میں بادشاہ اور حکمران کی غریب کے اور عام آدمی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ وہ تخت نشین ہو کر بوریا نشین ہوتا ہے۔ بادشاہ ہوتے ہوئے عوام کا خادم ہوتا ہے۔ عیسائیت، ہندو مت، بدھ مت وغیرہ میں جس طرح لوگوں کو روحانی اور دینی راہنما اپنا غلام بنائے رکھتے ہیں یہ صورت حال بھی اسلامی نظام حیات میں نہیں ہے۔ مسلمان ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے۔ اسلام میں غریب اور امیر کے درمیان قدرتی اقتصادی فرق تو ہے لیکن بحیثیت انسان ان میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں غریب بھی اسی قدر عزت اور احترام کے قابل ہے جس قدر امیر۔ غریب کے بھی بحیثیت انسان وہی حقوق ہیں جو امیر کے ہیں۔

⑥ **معانی : آلودگی** : میل کچیل۔ **منعم** : جن پر اللہ نے دولت دے کر انعام کیا ہے۔ **امیں** : امانت رکھنے والا۔

مطلب : اسلامی دستور حیات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں دولت کمانے کا ذریعہ محض حلال ذریعہ رکھا ہوا ہے۔ یہ ہر قسم کی حرام کی کمائی سے مسلمان کو بچنے کے لئے کہتا ہے۔ اور اپنی جائز کمائی کو جو اللہ نے اسے عطا کی ہے خود اپنے لئے سمیٹ کر رکھنے سے بھی منع کرتا ہے بلکہ اسے اللہ کی دی ہوئی امانت

قرار دے کر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بھی کہتا ہے۔ غریب، مسکین، یتیم، بیوہ، مسافر، قیدی، وغیرہ نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس پر خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ زکوٰۃ یعنی مال کا ایک مقررہ حصہ اور عشر یعنی مختلف قسم کی پیداوار کا ایک مقررہ حصہ دولت مندوں اور زمینداروں سے لیا جائے گا اور غریبوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کیا جائے گا۔ اسلام صدقہ، خیرات، فطرانہ وغیرہ کے ذریعے اپنی کمائی ہوئی دولت کو ضرورت مندوں کو دینے کے لئے بھی کہتا ہے۔ اس طرز پر کمائی گئی اور خرچ کی گئی دولت آدمی کو سرمایہ دار بننے اور سرمایہ دارانہ رویہ اختیار کرنے سے روکتی ہے۔ اور غریب کا استحصال نہیں ہونے دیتی۔ انہی ذرائع کو شیطان نے دولت کمانے اور خرچ کرنے کے پاک صاف اور ہر میل کچیل سے پاک ذرائع کہا ہے۔

⑦ **معانی:** **فکر:** سوچ۔ **عمل:** فعل، کام کرنا۔ **انقلاب:** بدل جانا۔

مطلب: زمین کے متعلق انسان کی سوچ میں اور اس سوچ کو کام میں لانے کی جو تبدیلی قرآن اور سنت کے ذریعے پیدا ہوئی ہے وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ نہ ملوکیت میں اور نہ اشتراکیت میں اور نہ کسی اور نظام میں۔ قرآن کہتا ہے کہ زمین اللہ کی ہے کسی بادشاہ، نواب، جاگیردار اور زمیندار کی نہیں۔ اس کی ملکیت اور اس سے حاصل شدہ پیداوار کی تقسیم اللہ کے دیئے گئے قوانین اور نظام کے مطابق ہوگی۔ نہ کہ اشتراکی نظام کی طرح اسے حکومت کی اور ملوکی نظام کی طرح بادشاہ یا جاگیردار کی ملکیت سمجھا جائے گا۔

⑧ **معانی:** **چشم عالم:** دنیا کی نظر۔ **پوشیدہ:** چھپا ہوا۔ **آئیں:** دستور۔ **خوب:** اچھا۔ **غنیمت ہے:** تسلی کے لئے کافی ہے۔ **مومن:** اہل ایمان، مسلمان۔ **محروم یقیں:** یقین کا نہ ہونا۔

مطلب: ہمارے حق میں تو یہی بہتر ہے کہ ایسا آئین حیات اور دستور العمل دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپا رہے۔ ہمارے لئے تسلی کی بات یہ ہے کہ آج کا اہل ایمان خود قرآن و سنت کے دیئے گئے دستور پر یقین نہیں رکھتا۔ اور اسے کہیں بنیاد پرستی کا نام دے کر کہیں ترقی کی راہ میں حائل قرار دے کر اور کہیں کسی اور طریقے سے رد کر رہا ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے نظام ہائے حیات کو اپنائے ہوئے ہے جو ہماری ہی پیداوار ہیں۔ اگر مسلمان کو پھر سے قرآن و سنت کے دستور پر یقین آ گیا تو ہماری اور ہمارے دیئے گئے نظام ہائے حیات کی خیر نہیں۔

⑨ **معانی:** **الٰہیات:** حکمت یا فلسفہ کا ایک علم جس میں اللہ کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ **کتاب اللہ:** اللہ کی کتاب یعنی قرآن۔ **تاویلات:** من مانے معنی پیدا کرنا۔

مطلب: ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ آج کا مسلمان الٰہی علم کے مسائل و مباحث میں اور قرآن کریم کے من مانے معنی پیدا کرنے کے چکر میں پھنس کر عمل سے بے گانہ رہے اور وہ اس فضول بحث سے نکل کر قرآن کی اصلیت اور حقیقت کی طرف دھیان نہ دے۔

(3)

① **معانی**: تکبیر: نعرہ اللہ اکبر۔ **طلسم**: جادو۔ **شش جہات**: چھ طرفیں شمال' جنوب' مشرق' مغرب اوپر نیچے مراد ہے جہان۔ **خدا اندیش**: خدا کی سوچ رکھنے والا' خدا کو ماننے والا۔

مطلب: شیطان آرزو کرتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتا ہے کہ اس کوشش میں لگے رہو کہ خدا سے ڈرنے اور اس پر ایمان رکھنے والا مرد مسلمان پھر سے پیدا نہ ہو جائے اور اس کی زندگی میں جو تاریکی ہے وہ روشنی میں نہ بدل جائے کیونکہ میں جانتا ہے کہ اگر مسلمان صحیح معنوں سے اللہ سے تعلق والا اور قرآن و سنت پر عمل کرنے والا بن گیا تو اس کے ایک نعرہ اللہ اکبر سے (یعنی اللہ سے بڑا کوئی نہیں) دنیا اور دنیا والوں کا وہ جادو ٹوٹ جائے گا جس کے ذریعے ہم نے مسلمانوں سمیت سب کو اپنے دام میں پھنسا کر اللہ سے دور کر رکھا ہے۔

② **معانی**: **ابن مریم**: مریم کا بیٹا حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ **زندہ جاوید**: ہمیشہ کے لئے زندہ۔ **صفات حق**: اللہ کی صفتیں۔ **ذات حق**: اللہ کی ذات۔ **عین ذات**: ذات کا ظہور۔

مطلب: جن مسائل و مباحث نے آج تک مسلمانوں کو آپس میں الجھا کر عمل سے بے گانہ کر رکھا ہے ان میں سے شیطان چند کا ذکر کرتا ہے۔ عہد حاضر کا ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں یا صلیب پر چڑھنے سے پہلے اٹھا لئے گئے ہیں اور کہیں آسمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مسئلہ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد اس کے ایک صوبہ پنجاب کے قصبہ میں رہنے والے ایک شخص بنام غلام احمد مرزا کے اس دعویٰ کی بنا پر پیدا ہوا کہ وہ مسیح موعود ہے یعنی جس عیسیٰ علیہ السلام کے قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں آنے اور آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نافذ کر کے ساری دنیا میں اسلام پھیلا دینے کا ذکر احادیث میں آیا ہے وہ میں ہوں۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب لوگوں کو یقین دلا دیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو سولی پر لٹکا دیئے گئے تھے وہ تو دوبارہ نہیں آسکتے البتہ اس کی مثل کوئی آسکتا ہے اور وہ میں ہوں اس سے برصغیر میں خصوصاً اور دنیائے اسلام میں عموماً بحث کا دروازہ کھل گیا اور مسلمانوں میں اس وقت اس مسئلے پر آپس میں مخالفت شروع ہو گئی جب انہیں اتحاد کی ضرورت تھی۔ اس شخص کے دعویٰ نبوت کرنے پر جن لوگوں نے اسے تسلیم کر لیا وہ قادیانی یا مرزائی کے نام سے جانے جاتے ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھے جاتے ہیں۔ ایک اور بحث جس نے صدیوں سے مسلمانوں کو بحث مباحثے میں الجھا رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی صفتیں اس کی ذات سے الگ ہیں یا اس کی ذات کا ظہور ہیں۔ یہ بحث وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی صوفیانہ اصطلاحوں سے تعلق رکھتی ہے۔

③ **معانی**: **مسیح ناصری**: حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ **مجدد**: دین کو دوبارہ زندہ کرنے والا۔ **فرزند مریم**: مریم کا بیٹا' حضرت عیسیٰ۔ **مقصود**: مقصد' غائت۔

مطلب: مندرجہ بالا شعر میں جس بحث کا ذکر کیا گیا ہے اس کی ایک شاخ یہ بھی ہے کہ جس مسیح کو قیامت سے پہلے دنیا میں آنا ہے اس سے مراد مریم کا بیٹا مسیح ہی ہے یا اس کے سوا کوئی اور شخص جس کا مقصد دین اسلام کو دوبارہ زندہ کرنا ہے اس سے مسیح ہونے کا دعویٰ کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کے

متعلق دو رائیں ہو گئیں۔ ایک اس کو مسیح سمجھنے کی اور دوسری اس کو مجدد ماننے کی۔ اس سے خود مرزائیوں کے اندر دو فرقے ہو گئے جو لوگ غلام احمد قادیانی کو نبی مانتے تھے وہ تو قادیانی یا مرزائی کہلائے اور جو اسے مجدد یا مصلح (یعنی دین کو زندہ کرنے والا یا اس کی اصلاح کرنے والا) کہتے تھے اور اسے نبی نہیں مانتے تھے وہ لاہوری مرزائی کہلائے۔

④ **معانی**: **کلام اللہ**: اللہ کا کلام یعنی قرآن۔ **حادث**: مخلوق' اللہ کے پیدا کئے ہیں۔ **قدیم**: اللہ کی طرح غیر مخلوق۔ **امت مرحوم**: مری ہوئی امت' یعنی مسلمان قوم جو کبھی عروج پر ہونے کی وجہ سے زندہ کہلاتی تھی اور آج زوال کی وجہ سے مردہ کہلاتی ہے۔

مطلب: آج کا مسلمان اس بحث میں بھی الجھا ہوا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ مخلوق ہیں یا غیر مخلوق یعنی یہ اللہ کی طرف سے پیدا کئے گئے ہیں یا اللہ کی طرح از خود موجود ہیں ان دو عقائد میں سے کس عقیدے میں مسلمان کی نجات ہے' اور کس عقیدے کو ماننے سے مردہ مسلمان قوم پھر سے زندہ ہو سکتی ہے۔

⑤ **معانی**: **دور**: زمانہ۔ **ترشے ہوئے**: گھڑے ہوئے۔ **الٰہیات**: اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے فلسفیانہ مسائل کا علم۔ **لات و منات**: کعبہ میں کفار کی طرف سے رکھے ہوئے بتوں میں سے دو بتوں کے نام۔

مطلب: کیا اس زمانے میں مسلمان کو اپنی حقیقت سے دور رکھنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اللہ سے متعلق منطقی اور فلسفیانہ بحثوں میں الجھا ہوا ہے۔ اور عملی اسلام سے بیگانہ ان اختلافی مسائل کے بتوں کی پرستش کر رہا ہے۔ یہ بحثیں اسے خدا سے حقیقی تعلق کے حوالے سے اسی طرح دور رکھے ہوئے ہیں جس طرح بت اس راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ مومن کا دل تو خدا کا گھر ہونا چاہیے لیکن اس نے اس کعبہ دل میں فضول بحثوں کے لات و منات رکھ کر خدا کو اس سے باہر کر رکھا ہے۔ یہ ہمارے لئے اے میرے رفقائے کار بڑی تسلی کی بات ہے۔

⑥ **معانی**: **بے گانہ**: بے خبر۔ **عالم کردار**: عملی جہان۔ **بساط**: شطرنج کھیلنے کا کپڑا جس پر مہرے رکھنے کے لئے خانے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ **مات**: شکست۔

مطلب: شیطان اپنے ساتھیوں کو حکم دیتا ہے کہ تم مسلمانوں کو عملی دنیا سے اسی طرح بے گانہ رکھو تاکہ زندگی کی شطرنج پر اس کے سارے مہرے شکست کھا جائیں اور وہ ہر میدان میں زوال پذیر رہے۔

⑦ **معانی**: **خیر**: خیریت' سلامتی۔ **قیامت**: وہ دن جب دنیا ختم ہو جائے گی۔ **مومن**: اہل ایمان' مسلمان۔ **اوروں کی خاطر**: دوسروں کے لئے۔ **جہان بے ثبات**: فانی دنیا۔

مطلب: ہماری خیریت اور سلامتی اسی میں ہے کہ مسلمان دوسروں کیلئے جیتا رہے اور اس دنیائے فانی کی نعمتیں' ترقی' خوشحالی اور حاکمیت چھوڑ کر قیامت تک ان کا غلام بنا رہے۔

⑧ **معانی**: **تصوف**: روحانیت کا علم' اصلاح باطن کا طریقہ۔ **تماشائے حیات**: زندگی کا دلچسپ اور قابل دید نظارہ۔ **خوب تر**: زیادہ اچھا' بہتر۔

مطلب: مسلمان کے لئے وہ شاعری اور وہ روحانی علم و عمل ہی زیادہ اچھا ہے جس کی بدولت وہ عملی زندگی سے بیگانہ اور زندگی کے دلچسپ نظاروں سے محروم رہے' اسلام ایسی شاعری بلکہ ایسے جملہ فنون

ـفہ و کثیفہ سے اور ایسی روحانیت کے طور طریقوں سے منع کرتا ہے جس سے وہ زندگی کی اصل حقیقت
ے بے گانہ ہو جائے۔ یہاں تصوف سے مراد مطلق تصوف یا اسلامی تصوف نہیں بلکہ ایسا تصوف ہے جو
ہبانیت کا ہم پلہ ہے۔)

معانی : ہر نفس : ہر سانس یعنی ہر لحہ۔ اس امت : مسلمان قوم۔ دیں : مذہب' مراد ہے مذہب
لام۔ حقیقت : اصلیت۔ احتساب کائنات : دنیا کا اور دنیا والوں کا محاسبہ کرنا یا باز پرس کرنا۔ بیداری :
اٹھنا۔

طلب : میں ہر لحہ اس مسلمان قوم کے جاگ اٹھنے سے ڈرتا ہوں جو اس وقت غفلت کی نیند سوئی ہوئی
ے۔ کیونکہ صرف اسی کا مذہب یعنی مذہب اسلام ہی وہ مذہب ہے جو پوری کائنات پر نظر رکھتا ہے اور
ھتا ہے کہ کہاں خرابی ہے اور کہاں اچھائی ہے۔ اور جہاں خرابی ہو اس کو دور کرتا ہے اور جہاں اچھائی
اسے اور پھیلاتا ہے۔ برائی سے روکتا ہے۔ نیکی کی تلقین کرتا ہے۔

معانی : ذکر و فکر : اللہ کا ذکر کرنا اور اس کی صفات میں غور کرنا۔ صبح گاہی : صبح کے وقت کا۔ پختہ تر :
ادہ پکا۔ مزاج : طبیعت۔ خانقاہی : رہبانیت۔

طلب : اللہ کا ذکر کرنا اور اس کی صفات میں غور کرنا اور پھر اپنی اور کائنات کی حقیقت سے آشنا ہونا
سلامی عبادت اور اسلامی تصوف کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جب یہ ذکر و فکر اسے عملی دنیا
ے بے گانہ کر دے تو یہی اس کے لئے زہر قاتل بن جاتا ہے۔ آج کے مسلمان چونکہ اس دوسری قسم
ے ذکر و فکر میں مشغول ہیں اور عملی زندگی سے بیگانہ ہو چکے ہیں اس لئے شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا
ہے کہ تم اسے صبح کے وقت کے اس ذکر و فکر میں مشغول اور مست رکھو جس سے اس کا رہبانی مزاج اور
ہو جائے اور وہ عملی دنیا سے غافل دوسروں کا محتاج اور غلام بنا رہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر وہ
کر و فکر کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو گیا تو ہمارے نظام کی دھجیاں بکھیر دے گا۔

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

و تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا   اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی' نہ بخارا
س سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل   وادی یہ ہماری ہے' وہ صحرا بھی ہمارا
یرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں   پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
اصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر   کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
فراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
حروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص   کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
یں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت   ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
نیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش   تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
للہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا   ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا — مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشا
اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے — شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا

(بلوچ ایک قبیلہ ہے جو برصغیر کے شمال کے ایک علاقہ بلوچستان میں آباد ہے۔ بلوچ اس قبیلے کا ایک فرد)

① **معانی:** گوارا: پسندیدہ۔ **بیاباں:** دشت۔ **دلی:** برصغیر کا ایک شہر۔ **بخارا:** وسطی ایشیا کا ایک شہر۔

مطلب: بڈھا بلوچ اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ دلی اور بخارا بڑے پر رونق شہر ہیں اور وہاں زندگی کی ہر قسم کی سہولتیں اور عشرت موجود ہے لیکن جو بات تیرے علاقہ بلوچستان میں ہے وہ ان شہروں میں کہاں ہے۔ علاقہ اگرچہ بیابان ہے۔ یہاں آبادی کم اور خشک علاقے اور پہاڑ زیادہ ہیں لیکن جو آزادی اور خوش گواری یہاں ہے وہ شہروں میں کہاں۔ خدا کرے کہ اس علاقہ کی آب و ہوا تجھ کو پسند رہے۔ (بڈھا بلوچ حقیقی نہیں ایک خیالی کردار ہے)۔

② **معانی:** **صفت:** مثل' مانند۔ **سیل رواں:** بہتا ہوا سیلاب۔ **سمت:** طرف۔ **وادی:** دو پہاڑوں کے درمیان کی جگہ۔ **صحرا:** جہاں سبزہ زار نہ ہو' ریت ہو۔

مطلب: بلوچستان کا علاقہ وسیع ہے۔ شہروں کی طرح محدود نہیں۔ یہاں پہاڑوں کے درمیان وادیاں بھی ہیں ریگستان بھی ہے تو جس طرف کو چاہے بہتے ہوئے سیلاب کی طرح نکل جا۔ تجھے کوئی روکنے والا نہیں۔

③ **معانی:** **غیرت:** اپنی عزت یا عزت نفس برقرار رکھنے کا جذبہ۔ **جہان تگ و دو:** یہ دنیا جہاں زندگی گزارنے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ **درویش:** خدا سے لو لگائے ہوئے دنیاوی سازوسامان سے بے گانہ شخص۔ **تاج سر دارا:** دارا کے سر کا تاج' دارا' ایران کا ایک بادشاہ گزرا ہے۔

مطلب: انسان کے لئے اصل سرمایہ دنیا کا سازوسامان اور آسائش و آرائش نہیں بلکہ اپنی عزت اور عزت نفس کو برقرار رکھنا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو خدا مست اور دنیا سے بے نیاز شخص کو دارا کا تاج پہناتی ہے۔ وہ بوریا نشین ہو کر بھی تخت نشین ہوتا ہے اس لئے تو اس علاقے میں دلی اور بخارا جیسی رونق نہ ہونے کو نہ دیکھ بلکہ یہ دیکھ کہ جو عزت نفس تو یہاں ملحوظ خاطر رکھ سکتا ہے وہ ان شہروں میں نہیں ہے۔

④ **معانی:** **کامل:** اللہ کا وہ بندہ جو درویشی میں کمال رکھتا ہے' مراد فقیر یا ولی یا درویش۔ **پوشیدہ ہنر:** چھپا ہوا فن' باطنی علم' علم درویشی۔ **خارا:** پتھر۔

مطلب: یہ چھپا ہوا فن یا باطنی علم کہ جس کی بدولت دارا کا تخت و تاج ایک درویش کے پاؤں کے نیچے ہوتا ہے اور بادشاہ اس کے در کے غلام بن جاتے ہیں کسی مرد کامل، کسی ولی کو ڈھونڈ کر اس سے حاصل کر کیونکہ میں نے سنا ہے کہ اس میں شیشے کو پتھر بنا دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ مراد ہے دنیاوی سازوسامان اور شان و شکوہ نہ رکھنے والے کو ایسی بے نیازانہ شان عطا کرتا ہے کہ دنیاوی جاہ و جلال والے بھی اس کی چوکھٹ پر سر جھکاتے ہیں۔

⑤ **معانی:** **افراد:** فرد کی جمع ایک شخص۔ **اقوام:** قوم کی جمع۔ **تقدیر:** قسمت۔ **ملت:** قوم یہاں مراد ہے مسلمان قوم۔ **مقدر:** نصیب' قسمت۔

لب: یہاں بڈھا بلوچ فرد اور جماعت کے تعلق کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قوموں کی قسمت ہ
یا برا ہونے ان کے اشخاص پر منحصر ہے۔ اگر فرد اچھے ہوں گے تو قوم بھی اچھی ہوگی اگر افراد برے
ں گے تو قوم بھی بری ہوگی۔ میں مسلمان قوم کے ایک ایک شخص کو اس قوم کے نصیب کا نشان سمجھتا
ں۔ اگر یہ ستارے بابرکت ہوں گے مراد ہے مسلمان فرداً فرداً اچھے ہوں گے تو مسلمان قوم بھی اچھی
ے۔

معانی: محروم: بے نصیب۔ دولت دریا: دریا کی دولت، موتی وغیرہ۔ غواص: غوطہ لگانے والا۔ کنارا
ا ساحل کو چھوڑنا۔

لب: دریا میں موتی حاصل کرنے کے لئے (غوطہ لگانے والا جو غوطہ خور) ساحل پر ہی بیٹھا رہتا ہے اور
یں غوطہ نہیں لگاتا وہ موتیوں کی دولت سے بے نصیب رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دنیا میں قوموں کی
ں حالی کا دارومدار ان کے افراد کی عملی میدان میں دوڑ دھوپ پر ہے۔ جس قوم کے افراد محنت کش،
ں اور باغیرت ہوتے ہیں وہ قوم ترقی پر فائز ہو جاتی ہے اور اگر اس کے برعکس ہو تو ان کی بے عملی اور
غیرتی قوم کو لے ڈوبتی ہے۔

معانی: دیں: مذہب اسلام۔ ملت: مسلمان قوم۔ تجارت: کاروبار۔ خسارہ: گھاٹا۔

لب: اگر اپنے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان (دوسروں کی غلامی سے) آزاد ہوتے ہیں تو اس کاروبار میں
سان کا گھاٹا ہے۔ کیونکہ اس کا اصل سرمایہ اس کا مذہب ہے۔ آج کل سیاست سے دین کو الگ رکھنے
سلمانوں میں ابلیسی نظام نے جو رجحان پیدا کر رکھا ہے اس شعر میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

معانی: معرکہ روح و بدن: روح اور جسم یا من اور تن میں جنگ۔ تہذیب: جدید تہذیب، مغرب کی
یب۔ درندہ: جنگل کا خونخوار جانور۔

طلب: مغربی تہذیب و ثقافت، علوم و فنون اور سیاسی و معاشرتی نظاموں نے انسانوں کو جنگل کے
خوار جانور بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہر کوئی بدن کی آسائش و آرائش کے درپے ہے اور روح اور اس کے
ضوں کو بھول چکا ہے۔ ایسا جسم جو روحانی قدروں کے بغیر ہو انسان نما حیوان کا ہی ہو سکتا ہے آج پھر
ح اور جسم میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اس کا علاج صرف اسلام کے پاس ہے۔ اگر پہلے مسلمان قوم خود
ر پھر ان کی پیروی میں اقوام دین اسلام کے بدن و روح دونوں کی پرورش کرنے والے نظام کو اپنا لیں تو
راد بھی حقانی اعتبار سے انسان رہ سکتے ہیں اور اقوام بھی درندوں کی بجائے انسانوں پر مشتمل ہو سکتی
ے۔

معانی: پامردی: استقلال۔ بھروسا: اعتبار۔ ابلیس: شیطان۔ یورپ کی مشینوں کا سہارا: یورپ
ی صنعتی ترقی کا اور ہر میدان میں مشینوں کے استعمال پر بھروسا۔

طلب: روح اور بدن کے اس معرکہ میں جس کا اوپر کے شعر میں ذکر ہوا ہے دو فریق آمنے سامنے
ں۔ ایک فریق اللہ ہے اور دوسرا شیطان۔ اللہ کو اہل ایمان کے استقلال پر بھروسا ہے کہ اگر انہوں نے
ں کے میدان میں مضبوطی سے اپنے پاؤں جما رکھے تو فتح روح کی ہوگی انسان کی ہوگی۔ اس کے مقابلے

ں اگر یورپ کی صنعتی ترقی والی اقوام چھائی رہیں تو پھر شیطان کی فتح ہو گی۔ بدن فربہ ہو جائے گا روح مٹ جائے گی۔ انسان نما درندے پیدا ہوتے رہیں گے انسان ختم ہو جائیں گے۔

⑩ **معانی**: **امم**: امت کی جمع' قومیں۔ **فراست**: دانائی' بصیرت۔ **تقدیر**: قسمت' نصیب۔

مطلب: قوموں کی تقدیر' نصیب یا قسمت میں کیا ہے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اگر کوئی مرد مومن ہو کوئی اللہ کا کامل مرد ہو تو اس کی بصیرت میں یہ صفت پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے ایک اشارے سے قوم کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ کوئی وقت تھا کہ مسلمان قوم میں ایسے بے شمار مرد کامل ہوتے تھے اب مسلمان اس مرد درویش یا مرد فقیر یا مرد مومن کو ترس گئے ہیں۔

(11) **معانی**: **اخلاص عمل**: عمل میں خلوص۔ **نیا گان کہن**: قدیم زمانے کے بزرگ۔ **شاہاں**: شاہ کی جمع' بادشاہ۔ **چہ عجب**: کیا عجب ہے۔ **بنوازند**: نواز دیں۔ **گدارا**: غریب کو' بھکاری کو۔

مطلب: اے عہد حاضر کے مسلمان! اے میرے بیٹے عمل میں اخلاص پیدا کر۔ اور یہ اخلاص عمل اپنے پرانے اور گزرے ہوئے بزرگوں سے مانگ۔ کیونکہ ان کا ہر عمل اللہ کے لئے ہوتا تھا۔ ذاتی اغراض کے لئے نہیں۔ اگر تیرے پاس بھی یہ اخلاص عمل آگیا تو پہلے کی طرح تو دنیا میں پھر سرفراز ہو سکتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ بادشاہ بھکاری کو نواز دیں اور اسے ہر احتیاج سے سرخرو کردیں مراد یہ ہے کہ اے مسلمان اگر تو پھر سے اپنے ماضی اور ماضی کے بزرگوں کی روایات کو اپنا لے تو سرفرازی پھر تیری قسمت بن سکتی ہے۔ (فارسی مصرع اقبال کا نہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کا ہے)۔

تصویر و مصور

تصویر

کہا تصویر نے تصویر گر سے نمائش ہے مری تیرے ہنر سے
ولیکن کس قدر نا منصفی ہے کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے

مصور

گراں ہے چشم بینا دیدہ ور پر جہاں بینی سے کیا گذری شرر پر
نظر درد و غم و سوز و تب و تاب تو اے ناداں قناعت کر خبر پر

تصویر

خبر' عقل و خرد کی ناتوانی نظر' دل کی حیات جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز

ں ہے اس زمانے کی تگ و تاز سزاوارِ حدیثِ لن ترانی

مصور

ہے میرے کمالاتِ ہنر سے نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
ے دیدار کی ہے اک یہی شرط کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

رف: یہ ایک تمثیلی نظم ہے جس میں تصویر اور مصور کے دو کردار علامتی اور استعاراتی انداز میں
ں کئے گئے ہیں۔ تصویر سے مراد آدمی ہے اور مصور سے مراد خدا۔ کوئی تصویر بھی ازخود موجود نہیں
ں بلکہ مصور کے بنانے سے بنتی ہے۔ آدمی کو بھی اس کے خالق خدا نے تخلیق کیا ہے یہ ازخود وجود میں،
ں آیا۔

تصویر

تا② **معانی: تصویر گر:** تصویر بنانے والا، مصور۔ **نمائش:** ظہور، وجود۔ **ہنر:** فن، قوت تخلیق۔
صفی: بے انصافی۔ **پوشیدہ:** چھپا ہوا۔

لب: تصویر (آدمی) نے اپنے بنانے والے مصور (خالق، خدا) سے کہا کہ میرا وجود تیرے فن تیری
ت تخلیق کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہ کس قدر بے انصافی کی بات ہے کہ تو جس نے مجھے تخلیق کیا ہے
ی نظر سے چھپا ہوا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تو مجھ پر اپنا آپ ظاہر کر دے تاکہ میں تجھے دیکھ
ں۔

مصور

معانی: گراں: بھاری۔ **چشم بینا:** دیکھنے والی آنکھ۔ **دیدہ ور:** دیکھنے والا۔ **جہاں بینی:** جہان کو دیکھنا۔
رر: چنگاری۔

طلب مصور (خدا) نے جواب دیا۔ دیکھنے والے کی آنکھ دیکھنے والے پر بھاری ہوتی ہے۔ تو نے دیکھا نہیں کہ
کاری نے جہان کو دیکھنے کی خواہش کی تھی لیکن ہوا کیا جونہی وہ آگ سے اوپر اٹھی فنا ہو گئی۔ اس لئے
لے انسان تیری یہ خواہش کہ تو مجھے دیکھے تجھ پر بھی بھاری ہو گی۔ اور ایسا کرنے سے تو فنا ہو جائے گا۔
ادیہ ہے کہ خدا کہتا ہے کہ میرا دیکھنا اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب تو خود کو نہیں پہچانے گا۔
معانی: نظر: دیکھنا، دیدار۔ **تب و تاب:** بے قراری، بے چینی۔ **سوز:** جلن، تپش۔ **قناعت:** صبر۔ **خبر**
۔ **ناداں:** بے وقوف۔

طلب: دیدار کی راہ بڑی کٹھن ہے اس میں طالب دیدار کو درد، غم، تپش اور بے قراری سے واسطہ پڑتا

ہے اس لئے تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تو صرف خبر پر صبر کیلئے یعنی تو میرے متعلق اتنی بات تک اپنے آپ کو محدود رکھ
جو پیغمبروں اور ان پر اتری ہوئی کتابوں کے ذریعہ تجھے معلوم ہوئی ہے
اس پر قناعت کرلے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے **"یومنون بالغیب"** (غیب پر ایمان لانا) کہتے ہیں۔

تصویر

① تا ② **معانی : خرد:** عقل۔ **ناتوانی:** کمزوری۔ **خبر:** علم ہونا۔ **نظر:** دیکھنا۔ **حیات جاودانی:** ہمیشہ کی زندگی۔ **اس زمانے:** موجودہ دور، عہد حاضر۔ **تگ و تاز:** دوڑ دھوپ۔ **سزاوار:** لائق۔ **حدیث لن ترانی:** لن ترانی کی کہانی۔ اس میں قرآن کریم کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں باری تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسے دیکھنے کی آرزو کے جواب میں کہا تھا۔ "لن ترانی" (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا)۔

مطلب: خدا کی بات سن کر آدمی کہتا ہے کہ تیری محض خبر رکھنا یعنی صرف بہ علم رکھنا کہ تو کہیں ہے عقل کی کمزوری کی دلیل ہے جب کہ تیرا دیدار (تجھے دیکھ لینا) میرے دل کی ہمیشہ کی زندگی کا باعث ہوگی۔ عہد حاضر دوڑ دھوپ کا زمانہ ہے۔ نئی نئی ایجادات کا عہد ہے۔ اس دور میں تیرا یہ کہنا کہ اے انسان تو مجھے نہیں دیکھ سکتا اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے تو ضرور مجھے اپنا دیدار کرا۔

مصور

① تا ② **معانی : کمالات ہنر:** فن کا عروج، فن کی انتہا۔ **نومید:** ناامید۔ **نقش گر:** تصویر بنانے والے۔ **دیدار:** دیکھنا۔ **پنہاں:** پوشیدہ۔

مطلب: آدمی کا جواب سن کر اور اس کی دیدار کی آرزو کی پختگی کو دیکھ کر مصور (خدا) کہتا ہے کہ میں نے اپنے ہنر اور فن تخلیق سے جتنے بھی نقش (تصویریں) بنائے ہیں ان سب میں سے تری تصویر بنانے پر میں نے اپنے فن کی انتہا کر دی ہے۔ تجھ سے بڑھ کر میں نے کوئی اور نقش کائنات میں تخلیق نہیں کیا میں نے تجھے اشرف المخلوقات بنایا ہے اس لئے تو اپنے بنانے والے سے یا اپنے خالق سے ناامید نہ ہو تو اسے ضرور دیکھ سکتا ہے لیکن اس کے لئے صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ تو اپنی نظر سے پوشیدہ نہ رہ۔ مراد ہے کہ پہلے اپنے آپ کو دیکھ اپنی حقیقت کو پہچان جب تو ایسا کرلے گا تو پھر تو مجھے دیکھ لے گا جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا کے مقولے کے تحت تجھے میرا دیدار میسر آجائے گا۔ لیکن ایسا عہد حاضر کی علمی ترقی کے ذریعے ممکن نہیں ہوگا اس کا طریقہ صرف اللہ کے کسی مرد کامل کی صحبت سے ہاتھ آئے گا۔ اس کے لئے طریقت اور معرفت کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

عالم برزخ

(موت اور قیامت برپا ہونے تک کا درمیانی زمانہ)

مردہ اپنی قبر سے

کیا شے ہے؟ کس امروز کا فردا ہے قیامت؟ — اے میرے شبستان کہن! کیا ہے قیامت؟

قبر

اے مردۂ صد سالہ! تجھے کیا نہیں معلوم؟ — ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت

مردہ

جس موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت — اس موت کے پھندے میں گرفتار نہیں میں
ہر چند کہ ہوں مردۂ صد سالہ ولیکن — ظلمت کدۂ خاک سے بیزار نہیں میں
ہو روح پھر اک بار سوارِ بدنِ زار — ایسی ہے قیامت تو خریدار نہیں میں

(مردہ اپنی قبر سے)

① **معانی:** **شے:** چیز۔ **امروز:** آج۔ **فردا:** آنے والی کل۔ **قیامت:** وہ دن جب دنیا فنا ہو جائے گی اور تمام مردے اپنی قبروں سے حساب کتاب دینے کے لئے نکل آئیں گے۔ **شبستان:** رات گزارنے کی جگہ ' خواب گاہ' رات کی انجمن۔ **کہن:** پرانا۔

مطلب: قیامت کیا چیز ہے اور یہ کس آج کی ہونے والی کل ہے۔ اے میری قبر اے میری پرانی خواب گاہ قیامت کیا ہے۔

قبر

معانی: **مردہ صد سالہ:** سو سالہ مردہ' پرانا۔ **پوشیدہ:** چھپا ہوا۔ **تقاضا:** ضرورت' لازی انجام۔

مطلب: اے سو سال سے مرے ہوئے مردے کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ ہر موت کے پیچھے اس کی جو ضرورت ہے یا ہر موت کا جو چھپا ہوا لازی نتیجہ ہے وہ قیامت ہے یعنی ہر مرنے والے نے ایک دن حساب کتاب دینے کے لئے اٹھنا ہے اس دن کا نام قیامت ہے یہ ایسا دن ہے جو ہر مرنے والے کو لانا ہوگا

پیش آتا ہے۔

مردہ

① **معانی:** **پوشیدہ:** چھپا ہوا۔ **پھندہ:** جال۔ **گرفتار:** پھنسا ہوا۔

مطلب: اے قبر جس موت کا چھپا ہوا لازمی نتیجہ یا ضرورت قیامت ہے میں اس جال میں پھنسا ہوا نہیں ہوں۔ میں وہ مردہ ہوں جو قیامت کے دن بھی اپنی قبر میں سویا رہے گا۔

② **معانی:** **ہر چند:** اگرچہ۔ **مردہ صد سالہ:** سو سال پرانا مردہ۔ **ظلمت کدہ خاک:** مٹی کے اندر تاریکیوں کا گھر۔ **بیزار:** اکتایا ہوا۔

مطلب: اگرچہ مجھے مرے ہوئے سو سال گزر چکے ہیں لیکن میں اپنے مٹی کے اس تاریک گھر سے جس کا نام قبر ہے اکتایا ہوا نہیں ہوں۔ میں قیامت کے دن بھی اپنے قبر کے گھر کو نہیں چھوڑوں گا۔

③ **معانی:** **سوار بدن زار:** کمزور اور مٹے ہوئے جسم پر سوار۔

مطلب: اگر قیامت اس کا نام ہے کہ مرے ہوئے جسموں میں پھر روح داخل کر کے ان کو زندہ کیا جائے گا تو ایسی قیامت سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا میں خریدار نہیں کیونکہ مجھے جو لطف قبر کے تاریک خانہ میں روح اور زندگی کے بغیر مل رہا ہے وہ زندہ ہو کر نہیں ملے گا۔ زندہ ہو کر تو زندگی کے کام کاج کا بوجھ پھر اٹھانا پڑے گا اور پھر سے عمل اختیار کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس یہاں نہ محنت ہے نہ مشقت ہے آرام ہی آرام ہے۔ مجھے دوبارہ زندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

صدائے غیب

نے نصیب مار و کژدم نے نصیب دام و دد ہے فقط محکوم قوموں کے لیے مرگِ ابد
بانگ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

① **معانی:** **نے:** نہیں۔ **نصیب:** قسمت۔ **مار:** سانپ۔ **کژدم:** بچھو۔ **محکوم:** غلام۔ **دام و دد:** درندے۔ **مرگ ابد:** ہمیشہ کی موت۔

مطلب: مردہ کی بات سن کر غیب سے ایک آواز آتی ہے کہ اے صد سالہ مردے تو زندہ نہیں ہونا چاہتا اور ہمیشہ کی موت سونا چاہتا ہے یہ تو سانپ 'بچھو' درندہ وغیرہ کی بھی قسمت میں نہیں ہے اور تو انسان ہو کر ہمیشہ کی موت سے محبت کر رہا ہے اور مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے کے عمل سے اکتایا ہوا ہے معلوم ہوتا ہے تو کسی غلام قوم کا فرد ہے اسی لئے دوبارہ زندہ ہونے سے بچ رہا ہے کیونکہ ایسی موت غلام کی ہو سکتی ہے آزاد کی نہیں۔

② **معانی:** **بانگ اسرافیل:** اسرافیل کی آواز' اسرافیل ایک فرشتہ ہے جو قیامت کے روز ایک آلہ بنام

صور میں سے بلند آواز پیدا کرے گا۔ جس کے سننے سے سارے مردے جی اٹھیں گے۔ تہی: خالی۔ جسد: جسم، بدن۔

مطلب: غلام کی زندگی بھی موت کے برابر ہوتی ہے۔ اس کا جسم روح سے خالی ہوتا ہے ان معنوں میں کہ وہ زندہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے جسم و روح پر اس کے آقا کا حکم چلتا ہے۔ وہ ایک زندہ جنازہ ہوتا ہے۔ جس مردہ کی زندگی کی یہ صورت ہو اس کو تو اسرافیل فرشتے کے صور پھونکنے کی آواز بھی زندہ نہیں کر سکے گی۔

③ **معانی:** فقط: صرف۔ ذی روح: روح رکھنے والا، مراد آدمی یا انسان۔ آغوش لحد: قبر کی آغوش۔ آغوش: گود۔ لحد: قبر۔

مطلب: صدائے غیب ایک قاعدہ ایک کلیہ ایک اصول بیان کرتی ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ جینا آزاد لوگوں کی قسمت میں لکھا گیا ہے۔ اگرچہ ہر روح والے ہر زندہ آدمی کو ایک نہ ایک دن مر کر قبر کی گود میں جانا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ غلام اس گود میں ہمیشہ کے لئے سویا رہے گا لیکن آزاد مر کر پھر جی اٹھے گا۔

قبر

(اپنے مردہ سے)

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟ — میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک

تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر — تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک

الحذر محکوم کی میت سے سو بار الحذر — اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

① **معانی:** بندہ محکوم: غلام آدمی۔ خاک: مٹی۔ سوزناک: جلن والی۔

مطلب: صدائے غیب سن کر اور مردے کی دوبارہ زندہ نہ ہونے کی خواہش کو دیکھ کر قبر چلا اٹھتی ہے کہ اے وہ شخص جو میری گود میں سویا ہوا ہے تو نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے کہ غلام ہو کر میری گود میں آرام کرنے کے لئے آگیا ہے۔ جب سے تو آیا ہے میری مٹی میں جلن پیدا ہو گئی ہے۔ یہ صرف اس لئے ہوئی ہے کہ تو زندگی میں غلام تھا۔

② **معانی:** میت: نعش۔ تاریک تر: زیادہ تاریک، زیادہ اندھیری۔ پردہ ناموس: عزت کا پردہ۔ چاک: پھٹنا۔

مطلب: تیری نعش سے وہ اندھیرا جو میرے اندر پہلے سے موجود تھا اور بڑھ گیا ہے۔ تیری نعش نے تو زمین کا پردہ عزت بھی پھاڑ دیا ہے۔ تیرے زمین میں آنے سے زمین کی عزت بھی برباد ہو گئی ہے۔

③ **معانی:** الحذر: ڈرو۔ محکوم: غلام۔ میت: نعش۔ سو بار: بہت زیادہ، ہر وقت۔ سرافیل: ایک فرشتہ کا نام جس کے ایک آلہ (صور) کے پھونکے جانے پر قیامت کے دن مردے زمین سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

مطلب: ڈرو محکوم کی نعش سے بار بار ڈرو۔ ہر وقت ڈرو اے قیامت کے روز صور پھونکنے والے فرشتہ

تو کہاں ہے۔ جلد صور پھونک تاکہ میری گود اس میت سے خالی ہو جائے۔ اے کائنات کے خدا تو اس مردے سے میری گود کو خالی کر دے اور اس کی جگہ کوئی پاک جان میرے سپرد کر۔ کوئی ایسی جان جو غلامی کی آلودگی سے پاک ہو۔

صدائے غیب

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود
زلزلے سے کوہ و در اڑتے ہیں مانندِ سحاب زلزلے سے وادیوں میں تازہ چشموں کی نمود
ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

① **معانی**: **نظامِ ہست و بود**: دنیا کا نظام۔ **بے پردہ اسرارِ وجود**: وجود کے بھید کا ظاہر ہونا۔ **وجود**: ہستی، زندگی۔ **آشوب**: ہنگامہ، شورش۔ **اسرار**: سرّ کی جمع، بھید۔ **برہم**: منتشر۔ **ہست و بود**: وہ دنیا جو اس وقت وجود رکھتی ہے اور پہلے عدم تھی اور پھر عدم ہو جائے گی۔

مطلب: اگرچہ قیامت برپا ہونے سے دنیا کا نظام منتشر ہو جائے گا لیکن اس ہنگامہ سے اس دنیا کے اور اس زندگی کے بھید ظاہر ہو جائیں گے۔ اور جو کچھ کسی نے اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب کچھ اس کے سامنے آجائے گا۔ اور پرانی زندگی کی جگہ نئی زندگی لے گی۔

② **معانی**: **زلزلہ**: بھونچال۔ **کوہ**: پہاڑ۔ **در**: کواڑ، دروازہ، مراد شہر یا آبادی یا پہاڑ کی گھاٹی۔ **سحاب**: بادل۔ **وادی**: دو پہاڑوں کے درمیان کا میدان۔ **نمود**: ظاہر۔

مطلب: صدائے غیب نے بھونچال کی مثال دے کر دنیا اور اس کے بعد کی زندگی کی صورت حال سمجھائی ہے اور کہا ہے کہ بھونچال سے جہاں پہاڑ، گھاٹیاں اور درّے اور آبادیاں تباہ ہو جاتی ہیں اور وہ بادل کی مانند اڑتی نظر آتی ہیں وہاں پہاڑوں سے چشمے بھی پھوٹ پڑتے ہیں اور ان سے ان کے درمیان کے میدان سیراب ہونے لگتے ہیں اور وہ ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ قیامت بے شک اس کائنات کو جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں برباد کر دے گی لیکن اس سے ایک نئی دنیا ایک نئے جہاں اور ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گا۔

③ **معانی**: **تعمیر**: آبادی۔ **لازم ہے**: ضروری ہے۔ **تخریب**: تباہی۔ **تمام**: مکمل، بالکل۔ **زندگانی**: زندگی۔ **کشود**: کھلنا، حل۔

مطلب: اصول یہ ہے کہ نئی آبادی کے لئے پرانی آبادی کو بالکل ختم کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی مشکلات کے حل کے لئے اس کائنات کو ایک نہ ایک دن ختم کرنا اور اس کی جگہ ایک نئی کائنات کو جگہ دینا ضروری ہے۔ قیامت برپا ہونے سے انسان کی موجودہ زندگی اور اس کی مشکلات ختم ہو جائیں گی اور اسے اس کی جگہ ایک نئی طرز کی زندگی مل جائے گی وہ جسے آخرت کی زندگی کہتے ہیں۔

زمین

یہ مرگ دوام! آہ یہ رزم حیات! ختم بھی ہو گی کبھی کشمکش کائنات
عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات
خوار ہوا کس قدر آدم یزداں صفات قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات
کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انساں کی رات؟

① معانی: مرگ دوام: ہمیشہ کی موت۔ رزم حیات: زندگی کی جنگ۔ آہ: افسوس ہے۔ کشمکش کائنات: کائنات میں جو کھینچا تانی ہے زندگی کی جو تگ و دو ہے۔

مطلب: قبر، مردہ اور صدائے غیب کی ساری باتیں سننے کے بعد زمین کہتی ہے کہ مجھے افسوس ہے اس موت پر جو ہمیشہ کے لئے ہوگی۔ جس میں مر کر جی اٹھنے کی بات نہیں ہو گی یعنی جو غلام کی زندگی ہے یعنی مجھے افسوس ہے اس زندگی کی جنگ پر بھی افسوس ہے جس میں کوئی شکست کھاتا ہے اور کوئی جیت جاتا ہے۔ دنیا کے اندر یہ جو کھینچا تانی تگ و دو کا عمل ہے یہ کسی دن ختم بھی ہو گا یا نہیں ہو گا مراد ہے اس کے خاتمے پر ہی میں مطمئن ہوں گی اور یہ خاتمہ قیامت برپا ہونے پر ہی ہوگا۔

② معانی: نجات: رہائی۔ عارف: خدا کی پہچان رکھنے والا، خاص آدمی۔ عامی: عام آدمی۔ بندہ: غلام۔ لات و منات: دو بتوں کے نام جو کفار نے اسلام سے پہلے کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔

مطلب: اس دور میں عشق اور جذبہ مغلوب ہو چکا ہے اور ہر طرف عقل کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ ایسی عقل جس نے غیر اللہ اور غیر یقینی کے طرح طرح کے بت تراش رکھے ہیں اور آدمی عام ہو یا خاص ہو خدا کی معرفت کا دعویٰ کرنے والا ہو یا اس کی پہچان سے غافل ہو سب اس عقل کے گھڑے ہوئے طرح طرح کے اور رنگ رنگ کے بتوں کے غلام بنے ہوئے ہیں اور اللہ کے غلام کہیں بھی نظر نہیں آتے نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں ہر طرف شیطنت پھیلی ہوئی ہے۔

③ معانی: خوار: ذلیل۔ کس قدر: کتنا۔ آدم یزداں صفات: خدا کی صفات رکھنے والا آدمی۔ آدم: آدمی۔ یزداں: خدا۔ صفات: صفت کی جمع۔ قلب: دل۔ نظر: نگاہ۔ گراں: بھاری، بوجھل۔ جہاں: دنیا۔ ثبات: پائداری، قائم رہنا۔

مطلب: اس دور میں مغرب کی تہذیب و ثقافت، علم و ہنر اور سیاسی داؤ پیچ کی بنا پر وہ آدمی جو خدا کی صفتوں کا مظہر کہا جاتا ہے جتنا ذلیل ہوا ہے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب اور خلیفہ کے طور پر زمین پر بھیجا تھا۔ اس میں اپنی صفتوں کے اظہار سے اسے جملہ مخلوق کا سردار اور ہر دوسری مخلوق سے افضل بنایا تھا۔ ظاہر ہے ایسا آدمی شیطان سے مات نہیں کھا سکتا لیکن آج کے دور کا آدمی اپنے مقام اور درجہ کو بھلا کر شیطان کے قدموں میں گرا ہوا ہے۔ اس نے اپنی شرافت اور بزرگی کو خود ہی روند ڈالا ہے۔ عہد حاضر کا یہ جہان جس میں آدمیت اور انسانیت کی اس حد تک تذلیل ہوئی ہے کہ شیطان بھی اس سے شرماتا ہے۔ اس قابل نہیں ہے کہ قائم رہے یہ ایک اچھے اور صحیح انسان کے دل اور نگاہ پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ نہ اس میں اس کے دل کی تسکین کی کوئی بات ہے اور نہ نگاہ کی تسلی کی۔ بلکہ صورت حال

اس ست اب ہے۔

④ **معانی**: سحر: صبح۔ حضرت: بزرگی کا کلمہ ہے۔ مراد ہے جناب، حضور۔

مطلب: وہ انسان جس کے حضور اور جس کی جناب میں کبھی فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اور جسے نائب خدا اور خلیفہ خدا کا مقام حاصل تھا اس دور میں اپنی حقیقت کو بھول کر ایسا شیطان صفت بن چکا ہے کہ اس کی زندگی کا جہان رات کی تاریکی کی طرح بے نور اور خوفناک بن چکا ہے۔ آخر اس کی دنیائے زندگی کی یہ رات کب ختم ہوگی کب وہ اسے صبح روشن میں تبدیل کرے گا۔ کب وہ اجلا ستھرا اور صحیح انسان بنے گا۔ کب اسے اس بات کا خیال آئے گا کہ وہ تو ہر مخلوق سے افضل ہے۔ ہر مخلوق یہاں تک کہ شیطان بھی اس کے تابع ہے۔ عہد حاضر کے علوم و فنون، عقل و دانش، تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت وغیرہ سے جو اہل مغرب نے ہمیں دی ہے یہ امید رکھنا کہ وہ انسانی زندگی کی تاریک رات کو روشن صبح میں تبدیل کر سکے گی فضول ہے۔ اس لئے ایسے جہان کے قائم رہنے سے جس میں انسان شیطنت کی تاریکی میں زندگی گزار رہا ہے اس کا نہ قائم رہنا ہی بہتر ہے یا پھر کوئی ایسا مرد مومن پھر پیدا ہو جائے جس کے ہاتھوں میں زمان و مکان کے گھوڑے کی لگام ہوتی ہے تاکہ وہ اسے اپنے فکر و عمل کے نقش سے پھر سے انسانوں کے رہنے کے قابل بنا دے۔

معزول شہنشاہ

(وہ شہنشاہ جسے بادشاہت سے ہٹایا گیا)

ہو مبارک اس شہنشاہِ نکو فرجام کو
جس کی قربانی سے اسرار ملوکیت ہیں فاش
شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت
جس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش
ہے یہ مشک آمیز افیوں ہم غلاموں کے لیئے
ساحر انگلیس! مارا خواجۂ دیگر تراش

تعارف: انگلستان کا ایک بادشاہ ایڈورڈ ہشتم تھا جس نے دسمبر 1936ء میں محض اس لئے اپنے تخت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا کہ اس وقت کا وزیر اعظم اور عیسائیوں کا پیر پادری اسے ایک مطلقہ امریکن خاتون مسز سمپسن سے شادی نہیں کرنے دینا چاہتا تھا۔ بادشاہ نے بادشاہت چھوڑنے کا اعلان کیا تو علامہ نے یہ نظم سپرد قلم کی جس میں انگلستان کی بادشاہت کا پول کھولتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس ملک میں بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں وہ محض دوسری اقوام کو مرعوب کرنے اور غلام رکھنے کے لئے علامت کے طور پر رکھا جاتا ہے۔

① **معانی**: نکو فرجام: نیک انجام، اچھا انجام۔ **قربانی**: کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینا۔ اسرار ملوکیت: بادشاہت کے راز۔ سر کی جمع

مطلب: اس نیک انجام بادشاہ ایڈروڈ ہشتم کو میری طرف سے مبارک ہو جس نے اپنے ایک مقصد کی خاطر تاج و تخت چھوڑ کر انگلستان میں رائج بادشاہت کے راز فاش کر دیئے ہیں۔

معانی: برطانوی مندر: انگلستان کا مندر' مراد ہے نظام حکومت۔ پجاری: پوجنے والے' نظام حکومت
تسلیم کرنے والے۔ پاش پاش: ٹکڑے ٹکڑے۔

طلب: جس طرح بت پرستوں کے مندر میں بتوں کو ان کے ماننے والے پوجتے ہیں اس طرح انگلستان
حکومتی نظام میں بادشاہ کو بھی بہ ظاہر بہت عزت دی جاتی ہے اور وزرا 'اہل مجلس' پیرپادری' عوام
رہ سب ان کے آگے سر جھکائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ایڈورڈ ہشتم کی تخت و تاج سے دست برداری
واقعہ نے یہ راز فاش کر دیا ہے کہ انگلستان میں بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسے حکومت اور مذہب
کارندے جب چاہیں تخت سے اتار سکتے ہیں۔

معانی: مشک آمیز: مشک ایک قیمتی خوشبودار چیز ہے جو ایک خاص قسم کے ہرن کی ناف سے نکالی جاتی
ے۔ مشک ملی ہوئی' خوشبودار۔ افیوں: ایک نشہ آور شے۔ ساحر: جادوگر۔ انگلیس: انگریز۔ مارا: ہمارے
ے۔ خواجہ دیگر: دوسرا آقا۔ تراش: گھڑ لیا' بنا لیا۔

طلب: بادشاہ کی تخت سے دستبرداری جن حالات میں ہوئی ہے اس سے انگلستان میں نظام بادشاہت کا
راز کھل کر سامنے آگیا ہے کہ وہاں بادشاہت کا نظام غلام قوموں کو پھانسنے اور قابو میں رکھنے کے لئے
م کیا گیا ہے یہ ایک ایسی نشہ آور چیز (افیون) کی مانند ہے جس میں مشک کی یا خوشبو کی ملاوٹ کر دی گئی
تاکہ کھانے والا' اسے افیون سمجھ کر چھوڑ نہ دے بلکہ کھا لے اور اس کے نشہ سے عالم غنودگی میں
ہے۔ مراد ہے عمل سے بے گانہ رہے اور ہم انگریزوں کی حاکمیت کو چیلنج نہ کر سکیں۔ تم نے دیکھا نہیں
ایک بادشاہ کے تخت و تاج سے دست بردار ہونے کے بعد انہوں نے فوراً شاہی خاندان کے ایک اور
کو جارج ششم کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا ہے۔ اگر بادشاہت کا خاتمہ ہی مقصود ہوتا تو پھر کسی اور کو
شاہ نہ بناتے۔

دوزخی کی مناجات

(دوزخ میں پڑے ہوئے ایک شخص کی خدا سے التجا)

ں دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری — رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد
جا بھی ہے بے سود' نمازیں بھی ہیں بے سود — قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد
ں گرچہ بلندی میں عماراتِ فلک بوس — ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد
ے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے — سیراب ہے پرویز' جگر تشنہ ہے فرہاد
علم' یہ حکمت' یہ سیاست' یہ تجارت — جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد
! ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز — سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

معانی: دیرِ کہن: پرانا جہان' دنیا۔ غرض مند: اپنے مطلب کو پیش نظر رکھنے والے۔ پجاری: پوجنے
لے۔ رنجیدہ: تکلیف اٹھانے والے۔

مطلب: دوزخ میں پڑا ہوا شخص خدا سے التجا کرتا ہوا کہتا ہے کہ یہ دنیا ایک ایسے مندر کی سی ہے جس میں خواہشات نفسانی اور طاقت کے بت رکھے ہوئے ہیں اور دنیا والے اپنے اپنے مطلب کے لئے ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ تجھے تو محض اس وقت یاد کرتے ہیں جب وہ ان بتوں کے ہاتھوں تکلیف میں ہوتے ہیں اور ان کے لئے سوائے تجھے پکارنے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

② **معانی:** **پوجا:** ہندوؤں یا غیر مسلموں کی عبادت۔ **نماز:** مسلمانوں کی عبادت۔ **بے سود:** بے فائدہ۔ **نالہ:** رونا۔

مطلب: اپنی نفسانی خواہشات اور حکمرانوں کی حاکمیت اور طاقت کے آگے جھکنے کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی عبادت ہو یا غیر مسلموں کی عبادت ہو دونوں بے فائدہ ہیں۔ ان غریبوں کی یعنی ان غیر اللہ سے مرعوب ہونے والوں کی قسمت میں رونا اور فریاد کرنا ہی لکھا ہے۔

③ **معانی:** **عمارات:** عمارتیں۔ **فلک بوس:** آسمان کو چومنے والی یعنی بہت اونچی۔ **حقیقت:** اصلیت۔ **ویرانہ آباد:** بہ ظاہر آباد لیکن اصل میں ویران۔

مطلب: ان خدا کو چھوڑ کر نفس اور طاقت کے بتوں کے آگے جھکنے والوں کے شہروں میں بڑی اونچی اونچی عمارات نظر آتی ہیں لیکن اصلیت میں وہ آبادی نما ویرانے ہیں کہ جن میں رہنے والے اہل یورپ کی غلامی کی وجہ سے تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

④ **معانی:** **تیشہ:** ہتھوڑا۔ **گردش تقدیر:** قسمت کا چکر۔ **سیراب:** پانی پینے والا۔ **جگر تشنہ:** جس کا جگر پیاسا ہو۔ **فرہاد:** ایران کے ایک شخص کا نام ہے جو ایک عورت شیریں پر عاشق تھا۔ **پرویز:** ایران کا ایک بادشاہ جس نے فرہاد کو پہاڑ سے نہر کھودنے پر لگا کر یا اسے فریب دے کر شیریں کو اپنے گھر ڈال لیا تھا۔

مطلب: علامہ نے اس شعر میں دوزخی کی زبان سے مزدور اور سرمایہ دار' کاشت کار اور زمیندار' غریب اور جاگیردار وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس دور کے مزدور اور کسان (جن کو اس نے فرہاد کہا ہے) پیاسے ہیں اور ان کی محنت سے فائدہ اٹھانے والے جاگیردار' نواب' بادشاہ اور زمیندار (جن کو اس نے پرویز کہا ہے) سیر ہو کر پانی پی رہے ہیں۔ محنت کوئی کر رہا ہے۔ اس سارے عمل کو اس نے ہتھوڑے کی قسمت کا چکر کہا ہے جس میں ہتھوڑا محنت کے نشان کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ہتھوڑا مزدور چلا کر پہاڑ سے نہر نکالتا ہے لیکن سیراب اس سے طاقت ور ہو رہا ہے۔

⑤ **معانی:** **فکر ملوکانہ:** بادشاہی سوچ۔ **ایجاد:** نئی چیز تخلیق کرنا۔

مطلب: اس دور میں اہل مغرب نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر پہلے مختلف ممالک پر قبضہ جمایا پھر ان میں علم' فلسفہ' سیاست اور تجارت کے ایسے طریقے رائج کئے جن کے ذریعے ان مفتوحہ علاقوں کے لوگ فاتحین کے دیئے ہوئے فریب میں مبتلا رہیں اور ان کی غلامی سے نہ نکل سکیں۔ یہ سب کچھ ان کی شاہانہ اور ملوکانہ سوچ کا نتیجہ ہے اور غلام قوم سمجھتی ہے کہ حاکموں نے ان کے لئے آسائشیں پیدا کی ہیں اور ترقی کے راستے مہیا کئے ہیں۔

⑥ **معانی:** **خطہ پر سوز:** جلا دینے والا خطہ' دوزخ۔

مطلب: دوزخ حالانکہ نہایت ہی تکلیف دہ جگہ ہے جس میں آدمی آگ میں جھلس رہا ہوتا ہے لیکن اہل مغرب نے دنیا کو تہذیب و ترقی کے نام پر اور غلام بنا کر جس قسم کا دوزخ بنا رکھا ہے اس سے تو اصل دوزخ ہی بہتر ہے۔ یہ یورپ کے تاجروں کی غلامی سے تو آزاد ہے۔ اس نظم میں علامہ نے اہل مغرب کی سیاسی' تہذیبی' ثقافتی اور تمدنی غلامی کو خلق خدا کے لئے ایک عظیم فتنہ اور المیہ قرار دیا ہے۔

مسعود مرحوم

یہ مہر و مہ' یہ ستارے' یہ آسمانِ کبود — کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود
خیالِ جادہ و منزل فسانہ و افسوں — کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود
رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی — وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا' مسعود
مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بیدردی — فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست — نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است — سعدیؒ

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمرِ گریز پا کیا ہے — کسے خبر کہ یہ نیرنگ و کیمیا کیا ہے؟
ہوا جو خاک سے پیدا' وہ خاک میں مستور — مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا؟ کیا ہے؟
غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال — خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے؟
دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز؟ — نہیں' تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے؟
جہاں کی روحِ رواں لا الہ الا ھو — مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے؟
قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے؟ — گناہگار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے؟

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم
طلسمہا شکند آں دلے کہ ما داریم

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات — کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا — ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم — خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملۂ موجودات
نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم — دو صد ہزار تجلی تلافیِ مافات
مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر — زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی — نہ تیری خاک لحد ہے' نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکِ داں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

تعارف: یہ نظم علامہ نے برصغیر کے مسلمانوں کے مشہور مصلح' راہنما اور ادیب سرسید احمد خان کے

پوتے اور جسٹس محمود مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر سر راس مسعود کی وفات پر لکھی تھی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم بھی رہے تھے۔ مرحوم علامہ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ علامہ ان کی وجہ سے ہی ریاست بھوپال میں جا کر شاہی مہمان کے طور پر کچھ عرصہ ٹھہرے تھے جب وہ وفات پا گئے تو علامہ نے یہ نظم ان کے مرثیہ کے طور پر لکھی تھی۔

① **معانی**: مہر: سورج۔ ماہ: چاند۔ چرخ کبود: نیلا آسمان۔ عدم: نیستی، نہ ہونا۔ وجود: ہستی، ہونا۔ عالم: جہان، دنیا۔

مطلب: یہ سورج، یہ چاند، یہ نیلا آسمان اور جہان کی دوسری اشیا بہ ظاہر تو اپنا وجود رکھتی ہیں۔ دیکھنے میں تو ہست ہیں یعنی ہیں لیکن حقیقت ان کی کیا ہے۔ کیا یہ عالم (جہان) واقعی موجود ہے یا ہمارے دیکھنے یا سمجھنے میں وجود رکھتا ہے اور حقیقت میں نیست ہے یعنی نہیں ہے۔

② **معانی**: جادہ: راستہ۔ منزل: پہنچنے کی جگہ۔ فسانہ: خیالی کہانی۔ افسوں: جادو۔ سراپا: بالکل۔ رحیل بے مقصود: بے مقصد سفر۔

مطلب: اس دنیا کے سفر میں ہر مسافر زندگی کے راستہ پر چلتا ہے اور ایک مقررہ منزل پر جا کر جسے موت کہتے ہیں اس کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ راستہ اور منزل کا خیال بے حقیقت کہانی اور جادو کی طرح ہے جس میں فریب نظر کی وجہ سے کوئی چیز موجود تو نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں نہیں ہوتی۔ جب یہ سب کچھ بے حقیقت ہے اور ہر شے کے سفر کا انجام موت ہی ہے تو پھر یہ زندگی انسان اور اس زندگی کا پیدائش سے موت تک کا سفر ایک بے مقصد سفر نظر آتا ہے۔

③ **معانی**: آہ: افسوس ہے۔ کمالات: انتہائی حد تک کی صفات، اعلیٰ صفات۔ احمد: سر سید احمد خان مرحوم جو برصغیر کے مسلمانوں کے عظیم رہنما اور مصلح تھے۔ محمود: جسٹس محمود جو سر سید احمد خان کے بیٹے اور سر راس مسعود کے باپ تھے۔

مطلب: افسوس ہے زمانے کے ہاتھوں نے جہاں اور چیزوں کو نیست و نابود کیا ہے جسٹس سر راس مسعود کو بھی موت کی آغوش میں دے دیا ہے وہ راس مسعود جو اپنے دادا سر سید احمد خان اور اپنے باپ جسٹس محمود خاں کی اعلیٰ صفات کی یادگار تھے یعنی جن میں اپنے باپ دادا کی انتہا درجے کی صفات موجود تھیں اور جن کو دیکھ کر ان کے باپ دادا یاد آتے تھے۔

④ **معانی**: زوال: کمی، پستی۔ علم و ہنر: علم اور فن۔ مرگ ناگہاں: اچانک موت۔ کارواں: قافلہ۔ متاع گراں بہا: بیش قیمت دولت۔ متاع: دولت۔

مطلب: سر راس مسعود زندگی کے قافلے کی بیش قیمت یعنی بہت بڑی قیمت رکھنے والی دولت کی مانند تھے۔ جس کو موت کے لٹیرے نے لوٹ لیا۔ ان کی اچانک موت سے اب علم اور فن پستی میں چلے جائیں گے۔ علم اور فن کے میدان میں ایسے صاحب کمال کا نہ ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اب یہ میدان بے رونق ہو جائے گا۔

⑤ **معانی**: اہل جہان: دنیا والے۔ بے دردی: درد کا نہ ہونا، خلش کا نہ ہونا۔ فغاں: فریاد۔ غم

ال: علی الصبح چہچہانے والا پرندہ۔ سرود: گانا۔

مطلب: یہ دنیا والے بھی کتنے بے رحم ہیں۔ کسی کے دکھ، تکلیف اور رنج کو دیکھ کر ان میں کوئی خلش نہیں ہوتی۔ ان کی مثال تو اس شخص کی سی ہے۔ جو علی الصبح باغ میں فریاد کرنے والے بلبل کی آواز گانا سمجھتا ہے حالانکہ وہ پرندہ اپنے غم، درد اور دکھ کی کہانی بیان کر رہا ہوتا ہے۔ دنیا والوں کی اس بے حسی پر علامہ کہتے ہیں کہ میں رو رہا ہوں۔

⑥ معانی: صبر: دکھ اور تکلیف کی برداشت۔ چارہ: علاج۔ غم دوست: دوست کی موت کا غم۔ معمائے موت: موت کا گورکھ دھندا۔ کشود: کھولنا، حل۔

مطلب: کسی کو غم زدہ دیکھ یا اسے کسی کی موت پر روتا دیکھ کر وہ لوگ جو اس غم کی کیفیت سے گزرے ہوئے نہیں ہوتے اس کو غم برداشت کرنے اور اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے کی نصیحت کیا کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس نصیحت سے غم زدہ کی تسکین نہیں ہوتی۔ کسی دوست کے بچھڑ جانے اور مرجانے کا غم اس نصیحت سے کم نہیں ہوتا موت کیا چیز ہے۔ یہ کیا عقدہ اور کیا گورکھ دھندا ہے صبر کی تلقین سے یہ بھی حل نہیں ہوتا۔ اس لئے مجھے صبر کے لئے نہ کہو۔ مجھ سے ایسا نہیں ہو سکے گا۔

⑦ معانی: دلے کہ: وہ دل جو۔ عاشق و صابر: عشق کرنے والا اور صبر کرنے والا۔ سنگ: پتھر۔ مگر: شاید۔ بود: ہوتا ہے۔ ز عشق: عشق سے۔ تا: تک۔ تا بہ صبوری: صبر تک۔ ہزار فرسنگ: ہزار کوس۔ است: ہے۔ ز: سے۔

مطلب: یہاں صبر اور غم کے تعلق کو مزید واضح کرنے کے لئے علامہ نے مشہور فارسی شاعر شیخ سعدی کا ایک شعر دیا ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ دل جو عاشق بھی ہو اور غم عشق میں صبر بھی کر سکتا ہو وہ پتھر تو ہو سکتا ہے دل نہیں ہو سکتا کیونکہ عشق اور صبر تک ہزار کوس کا فاصلہ ہے۔ دونوں کا یکجا جمع ہونا ممکن نہیں۔

⑧ معانی: نہ مجھ سے پوچھ: مجھ سے مت معلوم کر، مجھ سے مت سوال کر۔ عمر گریزپا: تیزی سے گزر جانے والی عمر۔ نیرنگ: شعبدہ۔ سیمیا: جادو کا ایک علم جس کے ذریعے سے ایک روح کو دوسرے جسم میں منتقل کر سکتے ہیں اور لوگوں کے سامنے ایسی اشیا لا سکتے ہیں جن کا کوئی وجود نہ ہو۔

مطلب: مجھ سے سوال نہ کر کہ یہ جلدی سے گزر جانے والی انسانی زندگی کیا ہے۔ کیونکہ میں اس کی حقیقت سے باخبر نہیں یہ تو کوئی شعبدہ اور جادو کا ایسا کھیل نظر آتا ہے جس میں نظر فریبی سے کام لے کر بے حقیقت چیز کو حقیقت کے رنگ میں دکھایا جاتا ہے۔

⑨ معانی: خاک: مٹی۔ مستور: چھپ جانا۔ فنا: ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا۔ غیبت صغریٰ: ایک مذہبی اصطلاح ہے جس سے مراد عارضی چھپنا ہے۔

مطلب: یہ تو صاف ظاہر ہے کہ جو آدمی مٹی سے پیدا ہوا ہے وہ مر کر مٹی میں چلا جاتا ہے لیکن اس کا یہ مٹی میں جا کر چھپ جانا کیا عارضی ہے یا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔

⑩ معانی: غبار راہ: راستے کی گرد۔ بخشا گیا ہے: عطا کیا گیا ہے۔ ذوق جمال: حسن کا ذوق۔ خرد: عقل۔ مدعا: مقصد۔

مطلب: بے شک آدمی راستے کی گرد کی مانند ہے کہ پیدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے لیکن اس کی یہ فنا عارضی ہے۔ خالق نے اس کے اندر اپنے خالق کے حسن کو دیکھنے کا ذوق رکھا ہوا ہے جو اسے موت کے بعد بھی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ عقل اس بات کو نہیں پا سکتی اور نہیں بتا سکتی کہ اس میں حسن ازلی کے دیدار کا جذبہ کیوں رکھا گیا ہے۔

(11) معانی: **آب و گل**: پانی اور مٹی۔ **اعجاز**: معجزہ دکھانا' ایسا کام کرنا جس کو سمجھنے سے اور کرنے سے انسانی عقل عاجز ہو۔ **حضرت انساں**: آدمی۔ **انتہا**: آخری حد' درجہ کمال۔

مطلب: آدمی کے اندر خالق نے دل اور نظر جیسی جو اشیا رکھی ہوئی ہیں کیا وہ بھی اسی پانی اور مٹی کے معجزے ہیں اگر ایسا نہیں ہے تو آدمی کا درجہ کمال یا حد کیا ہے مراد ہے دل و نظر مادی ذرات سے نہیں کسی اور شے سے تخلیق کیئے گئے ہیں۔

(12) معانی: **روح رواں**: جاری روح۔ **لا الہ الا ھو**: اس کے سوا یعنی اللہ کے سوا کوئی الہ یعنی معبود نہیں۔ **مسیح**: حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ **میخ**: لمبی کیل جو آدمی کو سولی پر چڑھاتے وقت اس کے ہاتھوں میں گاڑ دی جاتی ہے۔ **چلیپا**: سولی۔ **ماجرا کیا ہے**: کیا کہانی ہے۔

مطلب: اگر یہ بات درست ہے کہ اس جہان میں **لا الہ الا ھو** کی روح جاری ہے اور ہر شے اللہ کی صفات کی وجہ سے قائم ہے اور اس کا مظہر ہے تو پھر یہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب (سولی) پر لٹکایا گیا اور اس کے ہاتھوں میں کیلیں ٹھونک کر ان کو صلیب کی لکڑی کے ساتھ باندھا گیا یہ سب کچھ کیا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔

(13) معانی: **قصاص**: خون کا بدلہ۔ **خون تمنا**: آرزو کا خون' آرزو کا پورا نہ ہونا۔ **خوں بہا**: خون کی قیمت' جان کا معاوضہ۔

مطلب: اس دنیا میں آدمی کی ہزاروں آرزوؤں کا خون ہوتا ہے اور وہ پوری نہیں ہوتیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اور کون کرتا ہے۔ اس کے لیئے کس کو گناہ گار ٹھہرایا جائے۔ کس سے اس خون کا بدلہ مانگا جائے یا بدلہ نہیں تو قیمت وصول کی جائے۔

(14) معانی: **غمیں مشو**: غم مت کر۔ **بند جہاں**: جہان کی قید۔ **گرفتاریم**: ہم گرفتار ہیں۔ **طلسمہا**: طلسم کی جمع' معنی جادو۔ **شکند**: توڑ دیتا ہے۔ **آں دلے کہ**: وہ دل کہ۔ **آں**: وہ۔ **ما**: ہم۔ **داریم**: رکھتے ہیں۔

مطلب: مذکورہ بالا اشعار میں علامہ نے زندگی و موت کے متعلق جو استفہامی (سوالیہ) انداز میں گفتگو کی ہے اور اس معما کے عقل سے حل نہ ہونے کا ذکر کیا ہے وہاں آدمی کے مٹی سے بننے اور مٹی میں جانے کا ذکر بھی ہے۔ اس ذکر کے دوران جو اہم راز کی بات انہوں نے کی ہے وہ یہ ہے جسم آدمی تو بے شک مٹی کا ہے لیکن اس کے اندر جو دل اور نظر کی قوتیں اور صلاحیتیں رکھی گئی ہیں ان کا تعلق مٹی سے نہیں ہے۔ ان میں ذوق جمال پیدا کیا گیا ہے۔ اس ذوق کی وجہ سے دل اور نظر جب دونوں باطنی طور پر بینا (دیکھنے والے) بن جاتے ہیں تو وہ معما حل کر دیتے ہیں جس کا ذکر مذکورہ بالا اشعار میں ہوا ہے۔ اس پس منظر میں علامہ کہتے ہیں کہ اس کا غم مت کرو کہ ہم جہان کی قید اور پابندیوں میں گرفتار ہیں۔ وہ دل جو اللہ

تعالیٰ نے ہمارے جسم خاکی کے اندر رکھا ہے اگر ذوق جمال سے باطنی طور پر ہر شے کو دیکھنے والا بن جا۔ تو یہ جادو ٹوٹ جاتا ہے اور موت و حیات، جسم و روح، عقل و عشق، قلب و نظر وغیرہ کے جملہ معمے حل ہو جاتے ہیں۔

(15) **معانی**: **مقام خودی**: اپنی معرفت کا مرتبہ۔ **حیات**: زندگی۔ **عشق**: انتہائی محبت، آدمی کے دل کا ایک ایسا جذبہ جس کے تحت اسے سوائے اس شخص یا مقصد کے جس سے وہ محبت کرتا ہے کچھ نہیں سوجھتا۔ **ثبات**: استحکام، مضبوطی، پائداری۔

مطلب: اگر آدمی کے پاس ایسا دل ہے جو عشق سے زندہ ہے اور اس جذبہ کی بنا پر اسے اپنی معرفت یا اپنی پہچان حاصل ہے تو اسے معلوم ہے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ میری کیا قدر و قیمت ہے۔ مجھ میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا صفتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں ایسی صورت میں موت بھی زندگی کے برابر ہے موت کا مرحلہ تو صاحب خودی کے عشق کا امتحان ہوتا ہے جس سے اس کے جذبہ کے استحکام اور مضبوطی کا پتہ چلتا ہے اس کا عشق اگر مستحکم ہوگا اور اس کی وجہ سے اس کی خودی بھی اگر مضبوط ہوگی تو پھر وہ یہ امتحان دینے کے لئے تیار رہے گا اور اس سے گزر کر ایک نئی زندگی کی منزل میں داخل ہو جائے گا۔

(16) **معانی**: **خودی**: اپنی معرفت۔ **بے کرانہ**: جس کا کوئی کنارہ نہ ہو۔ **فراق**: جدائی۔ **مضطر**: بے قرار۔ **موج**: لہر۔ **نیل و فرات**: نیل ملک مصر کا ایک دریا اور فرات ملک عراق کا ایک دریا۔

مطلب: اگر تیری خودی زندہ ہے اور تجھے اپنی معرفت حاصل ہے تو تیری زندگی اس دریا کی مانند ہے جس کا کوئی کنارہ نہ ہو۔ اس لئے وہ موت جو دریائے زندگی کے ایک کنارہ کی صورت رکھتی ہے صاحب خودی کو پیش نہیں آتی اس کے لئے تو یہ عمل دریائے زندگی کو موت کے بعد کی زندگی کے دریاؤں کے ساتھ ملانے کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس کے خاتمے کے لئے۔ علامہ نے دنیا کی زندگی کو بطور دریا اور موت کے بعد کی زندگی کو نیل اور فرات کے دریاؤں کی علامتوں میں بیان کیا ہے۔

(17) **معانی**: **خودی**: اپنی پہچان۔ **مردہ**: مری ہوئی۔ **مانند**: مثل۔ **پیش**: سامنے۔ **کاہ**: تنکا۔ **نسیم**: نرم و لطیف ہوا۔ **سلطان**: بادشاہ۔ **جملہ**: تمام۔ **موجودات**: جو کچھ کائنات میں موجود ہے۔

مطلب: اگر تیری خودی مر چکی ہے تو تیری حیثیت اس گھاس کے تنکے کی طرح ہے جس کو نرم و لطیف ہوا بھی اڑا کر لے جاتی ہے ایسی صورت میں تو حوادث زمانہ کے آگے ٹھہر نہیں سکے گا موت بھی تجھے نگل جائے گی۔ اگر تیری خودی زندہ ہے تو پھر موت سمیت کائنات میں جو کچھ موجود ہے تیرے تابع ہوگا۔ تو ان پر حکمران ہو گا۔ موت تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور تو مر کر بھی زندہ رہے گا۔

(18) **معانی**: **نگاہ**: نظر۔ **تجلی**: جلوہ۔ **محروم**: بے نصیب۔ **دو صد ہزار تجلی**: دو سو ہزار تجلیاں۔ **تلافی مافات**: کوئی چیز یا بات جو فوت ہو گئی ہو اس کی جگہ کسی دوسری چیز یا بات کا آ جانا جو اس نقصان کو پورا کر دے۔ نقصان کا عوض یا بدلہ۔

مطلب: اگر تیری نظر ایک جلوہ سے بے نصیب رہی ہے تو فکر نہ کر اس نقصان کے بدلے میں سو ہزار تجلیاں موجود ہیں۔ ضرورت جذبہ طلب کے باقی رہنے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی تو ہر لمحہ ہر شے پر ہو رہی ہے۔ اگر تیری خودی زندہ ہو جائے تو اس کا نظارہ کرنا تیرے لئے مشکل نہیں ہے۔

(19) **معانی**: **بندہ ایمان**: صاحب ایمان۔ **ورائے سپہر**: آسمان سے آگے۔ **ثریا**: وہ چھ ستارے جو ایک گچھے کی شکل میں زمین سے بہت دور آسمان پر ہیں۔ **لات و منات**: اسلام سے پہلے کعبہ میں کفار کی طرف سے رکھے ہوئے بتوں میں سے دو بتوں کے نام۔

مطلب: جو شخص صحیح معنوں میں صاحب ایمان ہے اس کا مقام آسمان سے بہت آگے ہے۔ زمین سے لے کر آسمان کی بلندی پر چمکنے والے چھ ستاروں کے گچھے بنام ثریا کے درمیان جو کچھ ہے وہ اس کے لئے بتوں کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا دل اس میں نہیں اٹکتا۔ وہ زمین پر رہتے ہوئے آسمان سے آگے کسی جہان سے وابستہ ہوتا ہے۔

(20) **معانی**: **حریم ذات**: اللہ تعالیٰ کی منزل، وہ مقام الوہیت جو انسانی عقل سے ماورا ہے۔ اللہ کا گھر۔ **نشیمن ابدی**: ہمیشہ رہنے کی جگہ۔ **نشیمن**: آشیانہ۔ **تیرہ خاک لحد**: قبر کی تاریک مٹی۔ **تیرہ**: تاریک۔ **لحد**: قبر۔ **ابدی**: ہمیشہ۔ **جلوہ گاہ صفات**: اللہ تعالیٰ کی صفتوں کی جلوہ گاہ یعنی یہ کائنات جن میں یہ صفات جاری و ساری ہیں۔

مطلب: مومن کا ہمیشہ رہنے کا ٹھکانا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا گھر ہے نہ کہ قبر کی تاریک مٹی یا اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر کائنات۔ مراد ہے موت کا مقصود صرف ذات باری تعالیٰ ہے باقی جو کچھ ہے اس کے لئے بت کدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

(21) **معانی**: **خود آگہاں**: اپنے آپ سے آگاہ، اپنی حقیقت پہچاننے والے۔ **کہ ازیں**: کہ جو اس سے۔ **خاکدان**: مٹی کا گھر، انسانی جسم، دنیا۔ **بروں**: باہر۔ **جستند**: چھلانگ لگا گئے ہیں۔ **طلسم**: جادو۔ **مہر**: سورج۔ **سپہر**: آسمان۔ **بشکستند**: توڑ ڈالا۔

مطلب: وہ لوگ جو خود آگاہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے بعد اپنی معرفت حاصل کر لی ہے اور اس طرح اس مٹی اور کوڑا پھینکنے والی جگہ یعنی دنیا سے باہر نکل گئے ہیں۔ انہوں نے سورج، آسمان اور ستارہ کے جادو کو توڑ دیا ہے۔ یعنی ان سے بلند اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہو گئے ہیں اور غیر اللہ کی چمک دمک اور بلندی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ یہ لوگ زمین پر رہتے ہوئے اور عملی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہر اس چیز سے بلند و بالا رہتے ہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہونے سے روکتی ہے۔ وہ خاکی ہوتے ہوئے نوری نہاد اور بندہ ہوتے ہوئے مولا صفات ہوتے ہیں۔

آوازِ غیب

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک

ب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں — نے گرمیِ افکار، نہ اندیشۂ بے باک
روشن تو وہ ہوتی ہے، جہاں بیں نہیں ہوتی — جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

① **معانی:** **دمِ صبح:** صبح کے وقت۔ **صدر:** آواز۔ **عرشِ بریں:** بلند عرش۔ **عرش:** 'تخت' مراد ہے اللہ کا ت جو کہیں آسمانوں سے بھی آگے ہے۔ **جوہرِ ادراک:** ادراک کی قابلیت' ادراک انسان کے اندر وہ قوت ہے جس کی نورانیت کی روشنی میں کائنات سے ضروری باتوں کا علم حاصل کرتا ہے۔

مطلب: آسمانوں سے بھی کہیں آگے موجود اللہ تعالیٰ کے تخت کی جانب سے آج کے مسلمان کو غیب کی یک صدا صبح کے وقت پوچھتی ہے کہ اے مرد مسلمان تیرے اندر کائنات سے استفادہ کرنے کا جو جوہر یا وت کبھی موجود تھی۔ وہ آج کیوں نہیں ہے۔ وہ کس طرح کھوئی گئی ہے وہ علم اور شعور جس سے کبھی تو کائنات میں تصرف کرتا تھا اب تجھ میں کیوں موجود نہیں۔

② **معانی:** **کند ہونا:** چاقو' نشتر' تلوار وغیرہ کی دھار کا تیز نہ رہنا۔ **نشتر:** فصد کھولنے یا زخم چیرنے کا آلہ۔ **جگر چاک ہونا:** تسخیر کر لینا۔

مطلب: کبھی تحقیق کے میدان میں تو سرگرم عمل تھا اور تو زندگی کے مختلف شعبوں میں نئی نئی ایجادات ور تحقیقات کے کرشمے لوگوں کو دکھاتا تھا لیکن آج کیا ہوا۔ تحقیق کے اس نشتر کی دھار آج تیز کیوں نہیں ہے۔ آج تو اس میدان میں کیوں سرگرم عمل نہیں ہے۔ دوسری اقوام کائنات کی مختلف اشیا کی تسخیر میں اور تحقیق میں پیش پیش ہیں۔ چاند' سورج اور ستاروں تک کی طاقتوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں لیکن تجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ تجھ میں ان کو تسخیر کرنے اور ان کی قوتوں کو کام میں لانے کی استعداد کیوں موجود نہیں ہے۔

③ **معانی:** **خلافت:** اللہ کی طرف سے زمین پر خلیفہ یا اس کا نائب ہونا۔ **سزاوار:** لائق۔ **ظاہر و باطن:** جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہے یعنی دنیا اور جو کچھ ان سے چھپا ہوا ہے یعنی روحانی کائنات۔ **شعلہ:** آگ کی سوزش۔ **خس و خاشاک:** سوکھی ہوئی گھاس اور تنکے۔

مطلب: اے مسلمان اللہ نے تو تجھے کائنات کی ظاہری اور باطنی (دنیاوی اور دنیا سے پوشیدہ چیزوں کی) دونوں قسم کی خلافت عطا کی تھی اور تجھے دنیاوی و روحانی دونوں کائناتوں میں اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا اور تجھے اپنی نیابت کا اہل سمجھا تھا لیکن آج تجھے کیا ہوا بجائے اس کے کہ تو ان کائناتوں پر حکمران ہو تو ان کا غلام بن چکا ہے۔ کیا کسی نے دیکھا ہے کہ آگ کی سوزش اور تیز آنچ کو گھاس پھوس اور تنکے بجھا دیں۔ لیکن تیری صورت میں تو یہ ان ہونی ہو چکی ہے اور تو ہر شعبہ زندگی میں غلاموں کی سی بے بس زندگی بسر کر رہا ہے۔

④ **معانی:** **مہر:** سورج۔ **مہ:** چاند۔ **انجم:** ستارے۔ **محکوم:** تابع۔ **افلاک:** فلک کی جمع آسمان۔

مطلب: اللہ تعالیٰ نے تو تجھ میں اپنا نائب ہونے کی صورت میں ایسی قوتیں رکھی ہوئی ہیں کہ جن سے تو آسمانوں' سورج' چاند اور ستاروں کو اپنے بس میں کر سکتا ہے کیا بات ہے آج یہ اشیا تیری اس نگاہ سے

اور اس قوت سے کیوں نہیں کانپ رہیں اور کیوں وہ خدشہ محسوس نہیں کر رہیں جس کی بدولت کہ تو ان کو اپنا غلام بنا سکتا ہے اور ان کی قوتوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔

⑤ **معانی**: **رواں**: جاری۔ **نے**: نہیں۔ **گرمیِ افکار**: افکار فکر کی جمع ہے فکر کے معنی غور و خوض کی قوت' گرمی بمعنی حرارت' تپش۔ **رگ**: جسم کے اندر دھاگے کی مانند نالیاں جن میں خون دوڑتا ہے۔ **اندیشہ بے باک**: اندیشہ بمعنی سوچ بے باک بمعنی بے خوف' نڈر سوچ۔

مطلب: اگرچہ تو زندہ ہے اور تیری شریانوں میں خون دوڑ رہا ہے لیکن کیا بات ہے کہ نہ تیرے خیالات یا قوت متخیلہ میں کوئی حرارت ہے اور نہ تیری سوچ میں کوئی بے خوفی ہے۔

⑥ **معانی**: **جہاں بیں**: جہان کو دیکھنے والی مراد ہے معاملات جہان کی اصلیت کو پانے والی۔ **نگہ پاک**: پاکیزہ نظر' وہ نگاہ جو ان چیزوں کو دیکھنے سے رکی ہے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے' وہ نگاہ جو عشق حق سے پاک ہو جائے۔

مطلب: جس آنکھ کے پردوں کے پیچھے وہ نظر نہ ہو جو عشق حق میں ڈھل کر پاک ہو چکی ہو اور کائنات میں ان چیزوں کو دیکھنے سے رکی رہی ہو جن کو دیکھنے سے حق تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ وہ آنکھ نور کہلاتی ہے اور اس میں دیکھنے والی روشنی بھی ہوتی ہے لیکن وہ دنیا کے معاملات اور اونچ نیچ کی حقیقت کو پانے کے قابل نہیں ہوتی۔

⑦ **معانی**: **آئینہ ضمیری**: انسان کی وہ باطنی قوت جو اسے برائی سے روکتی ہے اور اچھائی پر قائم رکھتی ہے۔ **کشتہ**: مارا ہوا' فریب میں آیا ہوا۔

مطلب: اے مرد مسلمان کبھی تیرا ضمیر آئینے کی طرح ہوتا تھا اور تو اس میں اچھائی اور برائی کے فرق کو دیکھ کر ہمیشہ برائی سے بچا ہوا اور اچھائی پر مائل رہتا تھا لیکن اب یہ قوت جو تجھے برائی پر ٹوکے اور نیکی کی طرف تیرا رجوع رکھے تم میں موجود نہیں ہے اور اس بنا پر تو نیکی' اور اچھائی کو چھوڑ کر بدی اور برائی کی طرف مائل رہتا ہے اگر تیرا ضمیر زندہ ہوتا تو پھر تو بادشاہ' ملا اور پیر کا مارا ہوا اور ان کے فریب میں گرفتار نہ ہوتا۔ تجھے معلوم ہوتا کہ اصل شاہی' اصل ملائی اور اصل پیری کیا ہے۔ تو ان کے فریب میں آنے کی بجائے ان کا احتساب کرتا۔ خلق خدا کو لوٹنے والے ان جعل سازوں' پیشہ وروں اور جابروں سے خود بھی بچتا اور دوسروں کو بھی بچاتا۔

رباعیات

①

مری شاخِ امل کا ہے ثمر کیا تری تقدیر کی مجھ کو خبر کیا
کلی گل کی ہے محتاجِ کشود آج نسیمِ صبحِ فردا پر نظر کیا

معانی: **امل**: آرزو' امید۔ **تقدیر**: قسمت۔ **گل**: پھول۔ **محتاج کشود**: کھلنے کی محتاج۔ **نسیم صبح فردا**: آنے

والی کل کی صبح کی نرم و لطیف ہوا۔ **ثمر:** پھل۔ **خبر کیا:** کیا معلوم۔

مطلب: علامہ نے یہاں ایک اصول بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اس لئے انسان کو صرف آج کے حالات کو پیش نظر رکھ کر عمل اختیار کرنا چاہیئے اس بات کو علامتی انداز میں بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میری آرزو اور امید کے درخت کی شاخ پر پھل لگے گا بھی یا نہیں لگے گا اور اگر لگے گا تو کیسا لگے گا مجھے علم نہیں اسی طرح اے مخاطب تیری قسمت میں آگے چل کر کیا ہونے والا ہے اس کی بھی مجھے خبر نہیں۔ پھول کی کلی یا غنچہ تو آج کھلنے کا محتاج ہے۔ اسے تو آج نسیم کا (صبح کی نرم و لطیف ہوا کا) جھونکا چاہیئے جو اسے کھلا کر پھول بنا دے۔ اس کی نظر آنے والے کل کی صبح پر نہیں ہے۔ اگر آج اسے نسیم کا جھونکا میسر نہ آیا تو وہ شاخ پر مرجھا جائے گا۔ اس میں مسلمان کو تقدیر پر بھروسہ کرنے اور آنے والی کل کی امید پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے سے روکا ہے۔

②

فراغت دے اسے کارِ جہاں سے — کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش — گناہ تازہ تر لائے کہاں سے

معانی: فراغت: فرصت۔ **کار جہاں:** دنیا کا کام۔ **ہر نفس:** ہر لحہ۔ **پیری:** بڑھاپا۔ **کہنہ اندیش:** پرانی سوچ والا۔ **تازہ تر:** پہلے سے نئی' زیادہ تازہ۔

مطلب: اس رباعی میں علامہ نے شاعرانہ شوخی سے کام لیتے ہوئے خدا سے کہا ہے کہ شیطان جسے تو نے ہزاروں سال پہلے پیدا کیا تھا آج تک ہر لحہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر ان کو تجھ سے دور رکھ سکے لیکن اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے لیکن ابھی تک اسی پرانی سوچ میں مبتلا ہے۔ اس کے اندر نئی سوچ نہیں آ سکتی بہتر ہے کہ اب اسے لوگوں کو بہکانے کے اس کام سے فارغ کر دے۔ تا کہ وہ ہر لحہ کی آزمائش سے چھٹکارا پا لے۔ عہد حاضر کا آدمی تو خود سراپا شیطان بن چکا ہے۔ اب کوئی نئی سوچ والا شیطان پیدا کر جو اسے شیطنت کا نیا کاروبار سکھا سکے۔ مقصود اس رباعی کے مضمون سے یہی بتانا ہے کہ مغربی تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت نے آدمی میں ہر وہ برائی پیدا کر دی ہے جو شیطان اس میں پیدا کر سکتا تھا اس لئے اب اس پرانے شیطان کی ضرورت نہیں رہی۔

③

دگرگوں عالمِ شام و سحر کر — جہانِ خشک و تر زیر و زبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک — مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

معانی: دگرگوں: بدل دینا۔ **عالم شام و سحر:** صبح اور شام کا جہان مراد دنیا۔ **جہان خشک و تر:** خشکی اور تری کا جہان۔ **زیر و زبر:** الٹ پلٹ۔ **خدائی:** خدا ہونا۔ **داغ سے پاک رہے:** الزام سے پاک۔ **بے ذوق سجدے:** بے کیف سجدے۔ **حذر کر:** بچ' پرہیز کر۔

مطلب: خدا سے دعا کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ یہ جہان جس میں کافرانہ، غیر اسلامی اور غیر اخلاق ماحول پیدا ہو چکا ہے اس قابل ہے کہ اسے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اے خدا تو اس جہان کو بدل دے۔ اور اس کی جگہ ایک نیا جہان پیدا کر جو شیطانی اثرات سے پاک ہو۔ زمین پر خشکی اور تری ہر جگہ تجھ سے بیزاری کی وجہ سے فساد پیدا ہو چکا ہے اور آدمی اپنے اس مقصد کو جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا بھول چکا ہے اس لئے اس جہان کو زیر و زبر (الٹ پلٹ) کر دے اور ایک ایسا جہان پھر سے پیدا کر جس میں تیری حکمرانی ہو اور جس میں آدمی اپنی تخلیق کے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی بسر کر رہا ہو۔ اے خدا اس دور میں مسلمان جس کے پاس تیرا آخری پیغام ہے اور جس کی ذمہ داری لوگوں کو ظلمت سے نکال کر نور میں لانا ہے خود ظلمت میں بھٹک رہا ہے۔ آج کا مسلمان تیری عبادت کرتا' تیری نماز پڑھتا اور تجھے سجدے کرتا ہوا تو ضرور دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے سجدوں میں وہ سوز' وہ کیف' وہ سرور' وہ مستی اور وہ خلوص نہیں ہے جس کی بنا پر وہ غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے پرہیز کرتا تھا۔ آج وہ بہ ظاہر تیرے آگے جھکا ہوا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اپنے نفس کے بتوں کو سجدہ کر رہا ہوتا ہے۔ نماز جو تیرے کہنے کے مطابق فحاشی' بے حیائی' سرکشی' شیطنت او منکرات سے روکتی ہے اس پر یہ اثر مرتب نہیں کر رہی بلکہ وہ ان برائیوں میں ملوث نظر آتا ہے۔ اے خدا تو مجھ سے بطور مسلمان ایسے سجدوں کی طلب نہ کر تاکہ ان سے تیرے خدا ہونے کی' تیری خدائی کی اور تیری ہستی کی توہین نہ ہو۔ میں سر تیرے آگے اور دل تیرے غیر کے آگے جھکا کر تیری خدائی کو دھبہ لگا رہا ہوں۔ تو مجھ سے ایسے سجدے نہ مانگ۔

④

غریبی میں ہوں محسودِ امیری کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے' جس نے مسلماں کو سکھا دی سربزیری

معانی: محسود امیری: جس پر امیری حسد کرے۔ حذر: بچو' ڈرو۔ غیرت مند: عزت دار' خوددار۔ سر بزیری: کسی کے آگے جھکنا۔ درویشی / فقیری: ترک دنیا کرتے ہوئے خدا تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرنا۔

مطلب: فقیری اور درویشی دو قسم کی ہے ایک وہ جو آدمی کو بھکاری اور گدا بنا کر دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنے پر مجبور کرتی ہے اور دوسروں کا محتاج بنا دیتی ہے اور دوسری وہ جس میں وہ فقیر کو ہر در سے بے نیاز بنا کر صرف اللہ کے در پر رکھتی ہے۔ ایسا فقیر چونکہ صرف اللہ کے در کا مانگت ہوتا ہے اس لئے بادشاہ' امیر' منعم اور دوسرے سب اس کی چوکھٹ کے مانگت ہوتے ہیں۔ علامہ اس دوسری قسم کی فقیری کا ذکر کرتے ہوئے اس رباعی میں کہتے ہیں اگرچہ میرے پاس دولت دنیاوی نہیں ہے لیکن اس حالت غریبی میں بھی میری یہ شان ہے کہ دولت والے مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ انہیں اپنی امیری سے زیادہ میری فقیری بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اپنے فقر کی مثال دینے کے بعد علامہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم اس فقر اور درویشی سے بچو جس نے تم کو دوسروں کے آگے جھکنا اور ہاتھ پھیلانا سکھا دیا ہے۔ جس نے تمہاری عزت اور غیرت کو تم سے چھین لیا ہے۔

(5)

رد کی تنگ دامانی سے فریاد تجلی کی فراوانی سے فریاد
وارا ہے اسے نظارۂ غیر نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

عانی: **خرد:** عقل۔ **تنگ دامانی:** جھولی کا تنگ ہونا۔ **فریاد:** دہائی۔ **گوارا:** پسند۔ **فراوانی:** زیادہ ہونا۔

طلب: میں عقل کی جھولی کے تنگ ہونے پر دہائی دے رہا ہوں کہ وہ اس میں خدا تعالیٰ کے ان جلووں نہیں سمیٹ سکتی جو رنگا رنگ صورتوں میں کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ صوفیا کے نزدیک نات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے اسما اور صفات کا مظہر ہے۔ ہر ذرہ میں اس کی جلوہ نمائی ہے۔ دہائی ہے کہ سب جلووں کو دیکھنا عقل کے بس کی بات نہیں ہے یہ عقل کی اس تنگ نظری کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات غیر اللہ کے جلووں کو تو دیکھ لیتی ہے لیکن اللہ کے جلووں کا تماشا نہیں کر سکتی۔ یہ نگاہ کے نامسلمان نے کی دلیل ہے۔ اگر عقل کی نگاہ مسلمان ہوتی تو وہ ہر شئے میں خدا کا جلوہ دیکھ لیتی۔ اور غیر اللہ کے رے سے بچتی۔ ایسی نگاہ سے جو غیر اللہ کو تو دیکھ لے اور اللہ کو نہ دیکھ پائے فریاد ہے کیونکہ ایسی نگاہ کافر تو ہو سکتی ہے مسلمان کی نہیں۔ کافر کائنات کے ظاہری جلووں میں گم رہتا ہے جب کہ مسلمان ان دوں کے پیچھے ذات باری تعالیٰ کے اسماو صفات کی تجلیات کا نظارہ کرتا ہے اور ان کے ذریعے ذات سے لق پیدا کر لیتا ہے۔

(6)

ہا اقبال نے شیخِ حرم سے تہ محراب مسجد سو گیا کون؟
ا مسجد کی دیواروں سے آئی فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون

عانی: **شیخِ حرم:** حرم کا شیخ، مسجد کا امام۔ **محراب:** مسجد میں مغرب کی سمت کی ایک جگہ جہاں امام کھڑا ہو کر ز پڑھاتا ہے۔ **تہ محراب مسجد:** مسجد کی محراب کے نیچے۔ **فرنگی:** انگریز، اہل مغرب۔ **بتکدہ:** بتوں کا گھر۔ **کھو گیا:** گم ہو گیا۔

طلب: اس رباعی میں عہد حاضر کے مسلمانوں کے دو طبقوں کا ذکر ہے۔ ایک کا نمائندہ اقبال ہے جو ربی تہذیب و تمدن کا دلدادہ ہے اور دوسرے کا نمائندہ ملا ہے جو مسجد کی چار دیواری میں رہتا ہے۔ علامہ نے ان دونوں طبقوں کی برائی کی ہے اور کہا ہے کہ پہلا طبقہ دنیا میں اس قدر گم ہو گیا ہے کہ اسے دین کی ھ خبر نہیں اور دوسرا طبقہ دین میں اس قدر الجھ گیا ہے کہ دنیا چھوڑ بیٹھا ہے۔ اقبال نے جب مسجد کے ام (ملا) سے یہ کہا کہ مسجد کی محراب کے نیچے کون سو گیا ہے۔ یعنی دنیائے عمل سے بیگانہ ہو کر صرف ازیں پڑھنے پڑھانے اور دین کی باتیں کرنے میں کون لگا ہوا ہے تو اس سوال میں ہی یہ جواب پوشیدہ ہے کہ وہ ملا ہے۔ یہ سوال سن کر مسجد کی دیواروں سے آواز آئی کہ انگریزوں کے بت کدہ میں یعنی ان کے وم، تہذیب، تمدن، ثقافت وغیرہ کے بتوں کے آگے کون جھک گیا ہے اور کس نے دین اسلام کو عملاً چھوڑ ہے تو اس کا جواب بھی سوال کے اندر موجود ہے کہ وہ اقبال ہے۔ مراد ہے کہ عہد حاضر میں مسلمانوں

کے دونوں طبقوں کی حالت درست نہیں۔ حالت اس وقت درست ہو گی جب مسلمان دین و دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلے گا۔ دنیا کو دین کے تابع رکھتا ہوا اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا۔

⑦

کہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد
بتوں کو میری لادینی مبارک کہ ہے آج آتشِ اللہ ھو سرد

معانی: کہن: پرانے۔ ہنگامہ ہائے آرزو: آرزو کے ہنگامے۔ سرد: ٹھنڈے۔ لادینی: بے دینی، دین کا نہ ہونا۔ آتش اللہ ھو: اللہ ھو کی آگ۔ اللہ ھو: صوفیا کے ذکر کی ایک صورت ہے جس سے مراد ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں۔

مطلب: اس رباعی کے شروع میں علامہ کہتے ہیں کہ قدیم مسلمانوں میں (ہمارے اسلاف میں) اسلام کی سربلندی کے لئے جو آرزوئیں موجود تھیں اب ختم ہو گئی ہیں اور اس کی وجہ سے آج کے مسلمان کی رگوں میں وہ خون سرد ہو کر رہ گیا ہے جو اسے دین و دنیا دونوں میدانوں میں سرگرم عمل رکھتا تھا کبھی مسلمان اللہ ھو (وہ اللہ جس کے سوا کوئی اللہ یا معبود نہیں) کے ذکر سے غیر اللہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیا کرتا تھا اس کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، غرض کہ زندگی کا ہر پہلو اللہ کا نقش لئے ہوئے ہوتا تھا۔ آج یہ ذکر اس کے ہونٹوں پر بطور الفاظ کے تو کہیں ضرور ہو گا لیکن اس کی روح ان میں موجود نہیں ہے۔ اس لب آشنا اور دل نا آشنا ذکر کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمان کے سینے میں اللہ کی بجائے غیر اللہ نے جگہ بنا لی ہے۔ اس کے دل میں جہاں صرف خدا آباد ہونا چاہئے تھا، نفس کے بت سجے ہوئے ہیں اور وہ شب و روز ان کے آگے جھک رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ دین وہ دنیا دونوں میدانوں میں بازی ہار چکا ہے۔ بتوں کو مبارک ہو کہ وہ مسلمان جو تمہیں پاش پاش کرنے کے لئے تیار رہتا تھا خود تمہارے آگے جھکا ہوا ہے بتوں سے یہاں مراد مٹی اور پتھر کے بت نہیں بلکہ غیر اللہ کے بت مراد ہیں۔ وہ بت جنہیں ہمارا نفس ہر وقت جنتا رہتا ہے۔ حرص، شہوت، حسد، خیانت، محبت، دولت، نفاق، غیبت، چغلی، ملاوٹ، چوری، ڈکیتی، فساد، غرض کہ اس قسم کے سینکڑوں بت ہیں جو آج مسلمان کے نفس نے تراش کر اس کے کعبہ دل میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان بتوں کو آج کے اس مسلمان سے جو اللہ کی راہ سے بھٹک چکا ہے کوئی خطرہ نہیں۔

⑧

حدیثِ بندۂ مومن دل آویز جگر پر خوں، نفس روشن، نگہ تیز
میسر ہو کسے دیدار اس کا کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز

معانی: حدیث: داستان۔ بندۂ مومن: مومن بندہ، اللہ پر کامل ایمان رکھنے والا۔ دل آویز: دل لبھانے والی۔ میسر ہو: حاصل ہو۔ دیدار: زیارت کرنا، دیکھنا نصیب ہونا۔ رونق محفل: مجلس کی رونق۔ کم آمیز: کم ملنے جلنے والا یا بہت ملنے والا نفس: سانس۔ پر خوں: خون سے بھرا ہوا۔

مطلب: وہ شخص جو اللہ پر صحیح ایمان رکھتا ہے اور اس کی بنا پر علم و عمل کی دنیا میں ایسے مقام پر فائز ہے جو اللہ بس اور باقی ہوس کا مقام ہے وہ مومن کہلاتا ہے۔ مومن کی صفات تو بہت ہیں۔ اقبال نے بھی اپنے کلام میں مختلف جگہ بیان کی ہیں لیکن اس رباعی میں وہ کہتے ہیں کہ مومن کی زندگی کی کہانی بڑی دلچسپ اور دل لبھانے والی ہے۔ مومن کا جگر خون سے بھرا ہوا ہوتا ہے یعنی اس میں عشق حقیقی موجزن ہوتا ہے اور وہ حیات کے ہر میدان میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس کی ہر سانس روشن اور تیز ہوتی ہے۔ اس بنا پر وہ علم و عمل کی دنیا میں نیکی و بدی، خیر و شر، حق و باطل، شرک و توحید وغیرہ میں تمیز روا رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں اور کہیں ہوتے بھی ہیں تو ان کی زیارت کا شرف کم حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ محفل کی رونق ہوتے ہوئے بھی محفل سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ لوگ اگرچہ ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں لیکن وہ ان سے اس طرح میل جول نہیں رکھتے جس طرح دنیاوی تعلقات والے رکھتے ہیں بلکہ اس طرح ملتے ہیں کہ دل ان کا خدا کی طرف اور ہاتھ کام کی طرف ہوتا ہے۔ وہ راہبوں کی طرح دنیا سے کنارہ کش نہیں ہوتے لیکن دنیا اس طرح نبھاتے ہیں کہ اللہ بھی نہ بھولے اور دنیا بھی ان سے استفادہ کرتی رہے۔ ایسے مرد کو اقبالؒ نے اپنے کلام میں مرد مومن کے علاوہ مرد کامل، مرد فقیر، مرد درویش، وغیرہ کے نام بھی دیئے ہیں۔

⑨

تمیزِ خار و گل سے آشکارا نسیمِ صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

معانی: **تمیز خار و گل:** کانٹے اور پھول میں فرق۔ **نسیم صبح:** صبح کی نرم و لطیف ہوا۔ **آشکارا:** ظاہر۔ **خوئے حریری:** ریشم کے کپڑے کی سی نرم طبیعت۔

مطلب: صبح کی نرم و لطیف ہوا کے عمل کی وجہ سے گلاب کے پودے کی شاخوں پر پھول بھی کھلتے ہیں اور کانٹے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس عمل سے جہاں پھول میں نرمی پیدا ہوتی ہے کانٹے میں سختی اور چبھن کی صفات آجاتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ دونوں میں سختی آجائے یا دونوں میں نرمی پیدا ہو جائے۔ یہ تمیز نرم و سخت اس بات کی دلیل ہے کہ نسیم صبح اپنا عمل کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھتی ہے کہ پھول میں سختی اور کانٹے میں نرمی نہ آنے پائے۔ یہ تمیز روا رکھنا نسیم صبح کی سرشت اور افتاد طبع (ضمیر) میں داخل ہے۔ ضمیر تو ایک بے شعور شے ہے اس میں تمیز روا رکھنے کی یہ صلاحیت اس کے خالق (خدا) نے رکھی ہوئی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورج میں تپش اور چاند میں ٹھنڈک رکھی ہوئی ہے اسی طرح وہ نسیم صبح کے عمل سے پھول میں نرمی اور کانٹے میں سختی پیدا کراتا ہے اس کے پیچھے مصلحت یہ ہے کہ اگر کانٹا بھی نرم ہوتا اور اس میں چبھن نہ ہوتی تو پھول تک ہر کسی کا ہاتھ آسانی سے اور بلا تکلف پہنچ سکتا تھا لیکن اب ہر ہاتھ کو کانٹے کی چبھن سے بچ کر پھول تک رسائی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس مثال سے علامہ اقبالؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے جو دو الگ الگ طبقات پیدا کئے ہیں ان میں اس نے عورت کو پھول کی طرح نرم و نازک بنایا ہے اور مرد کو سخت۔ عورت کو عصمت و عفت کا پیکر اور مرد کو قوت اور

جوانمردی کا مجسمہ بنایا ہے۔ اس تمیز کی بنا پر زندگی میں دونوں کے دائرہ ہائے کار الگ الگ رکھے ہیں۔ مرد اگر اپنے دائرہ کار سے نکل کر عورت کے دائرہ کار میں آجائے اور عورت مرد کے دائرہ کار میں آجائے تو معاشرے میں خلل پیدا ہو جائے گا جیسا کہ فی زمانہ عورت کے مرد کے دائرہ کار میں آجانے کی وجہ سے پیدا ہو چکا ہے۔ پھول اور کانٹے کی مثال سے علامہ یہ بتانا بھی چاہتے ہیں کہ خیر اور اچھائی کو شر اور بدی سے بچانے کے لئے قوت ضروری ہے اگر ایسا نہیں ہو گا تو معاشرے پر بدی اور شر غالب آجائے گا اور اچھائی اور خیر مغلوب ہو جائے گی۔ یہ صورت حال بھی عہد حاضر میں پیدا ہو چکی ہے۔ قوموں کو غلام بنانے کے لئے اور ان کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ کے لئے تو ہر قسم کی قوت استعمال کی جا رہی ہے لیکن خیر اور نیکی کی حفاظت کے لئے جو قوت درکار ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ بعض حالات میں تو قوت بدی اور شر کے پھیلاؤ کے لئے استعمال کی جا رہی ہے۔

(10)

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نے گہر کا دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

معانی: فراق: جدائی۔ آشنائی: واقفیت، وصل۔ خود نمائی: اپنے آپ کو ظاہر کرنا۔ زیاں: نقصان۔ گہر: موتی۔ دلِ دریا: دریا کا اندر۔

مطلب: جدائی اور وصل کا ذکر نہ کر کیونکہ اصل زندگی اپنے آپ کو ظاہر کرنے میں ہے۔ اگر دریا میں سے موتی نکال کر الگ کر لیا جائے تو اس سے نہ دریا کا نقصان ہے نہ موتی کا۔ بلکہ اس الگ ہونے سے موتی کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس مثال سے علامہ روح اور جسم کے تعلق کی بات واضح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں آنے سے پہلے ہر آدمی روح کی شکل میں عالم ارواح میں ہوتا ہے جو کہیں لامکاں میں ہے۔ جب وہ ماں کے پیٹ سے بچہ کی شکل میں باہر آتا ہے تو وہ روح جو عالم ارواح میں اس سے متعلق ہوتی ہے اس کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح روح کو اپنی صلاحیتوں اور اپنی انا کے ظہور کا موقع مل جاتا ہے۔ اس عمل انتقال و فراق سے نہ عالم ارواح میں کوئی کمی آتی ہے اور نہ روح کا کوئی نقصان ہوتا ہے بلکہ الٹا روح کو فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ جسم آدمی میں آکر اپنی خودی کا ظہور کر سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ اپنی خودی سے ناآشنا کہیں عالم ارواح ہی میں پڑی رہتی۔

(11)

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

معانی: خودی: اپنی پہچان۔ عبث: فضول۔ شکوہ: شکایت۔ تقدیر یزداں: خدا کی تقدیر۔

مطلب: اے مرد مسلمان تیری زندگی کے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے یہ حرکت و عمل سے کیوں بے

کافرانہ ہو گئی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ تیری خودی ابھی تک مسلمان نہیں ہوئی۔ اسی بنا پر تو خدا کی تقدیر کی شکایت کر رہا ہے۔ یہ شکایت فضول ہے۔ خودی کو مسلمان کر تا کہ خدا تیری تقدیر کو تیری مرضی کے مطابق بنائے اور تیری زندگی میں حرکت و عمل پیدا ہو۔ اس رباعی میں ایک تو یہ بات کی گئی ہے کہ آدمی جب تک اپنی انا (اپنی پہچان) کی صلاحیتوں کو جان کر ان کو اجاگر نہیں کرتا اس وقت تک اس کی انا (خودی) کافر رہتی ہے۔ اس کو مسلمان کرنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ اطاعت الٰہی اور طاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اختیار کر کے نفس امارہ کو جو اسے کافر بنائے ہوئے ہے راستہ سے ہٹا دیا جائے۔ جب اس عمل سے اے مرد مسلمان! تیری خودی بھی مسلمان ہو جائے گی تو تیرے دریائے زندگی میں سعی و عمل کی لہریں بھی پیدا ہو جائیں گی اور تو تقدیر کا شکوہ کرنے کی بجائے اپنی تقدیر خود بنا سکے گا۔ یہ کہنا کہ خدا نے ہماری پیدائش کے ساتھ ہی ہماری تقدیر میں سب کچھ لکھ دیا ہے اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے مناسب نہیں یہ شکایت بے جا ہے۔ حقیقت تقدیر کی یہ ہے کہ جب آدمی صاحب ایمان ہونے کے بعد اپنی خودی کو پہچان کر اس کو بھی صاحب ایمان کر لیتا ہے اور زندگی کے ہر لحہ میں اور ہر موڑ پر اپنی مرضی کو اپنے خالق کی مرضی میں گم کر کے اس کی پوری عبودیت اختیار کر لیتا ہے تو پھر خدا اس کی تقدیر کو اس کی مرضی کے مطابق شکل دے دیتا ہے جیسا کہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں کی زندگیوں سے ظاہر ہے۔

(12)

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے جہاں روشن ہے نورِ لا الہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے

معانی: خرد: عقل۔ **لاالہ**: کلمہ طیبہ کی طرف اشارہ ہے جس کا مفہوم ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ **فقط**: صرف۔ **فروغ**: چمک دمک۔ مہر: سورج۔ مہ: چاند۔

مطلب: اگر ہم جہان کو چاند اور سورج کی اس گردش کے اعتبار سے دیکھیں جس کی وجہ سے اس میں شام اور صبح ہونے کا عمل جاری ہے تو جہان کا وجود مادہ کی وجہ سے نظر آئے گا۔ اگر جہان کو اس طرح دیکھنے والی عقل اپنی راہ چھوڑ کر وجدان کی راہ اختیار کرے اور دل کی نظر سے اسے دیکھے تو اس پر یہ راز کھل جائے گا کہ جہان سورج اور چاند کی وجہ سے روشن نہیں ہے بلکہ **لاالہ** (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کے نور سے روشن ہے۔ چاند ستاروں اور سورج کی روشنی بھی اسی نور سے پیدا ہوئی ہے۔ اس رباعی میں اقبال نے مادہ پرستوں کے اس نظریہ کو پیش کرتے ہوئے کہ جہان مادہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی نفی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جہان اللہ تعالیٰ کے نور کی وجہ سے موجود ہے۔ کائنات اور اس کی ہر شے کو اگر دل کی آنکھ وا کر کے دیکھا جائے گا تو ہمیں ہر ذرہ میں اس کے خالق اللہ تعالیٰ کے نور کا ظہور ملے گا۔ قرآن کریم کی آیت **اللہ نور السموت والارض** (اللہ زمینوں آسمانوں کا نور ہے) اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وجودی صوفیا کی طرح اقبال بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات اور اس کی کسی بھی شے کا وجود حقیقی نہیں بلکہ اعتباری ہے۔ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسما کے نور کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ اس لئے۔

اسے موجود تو کہہ سکتے ہیں اس کا وجود تسلیم نہیں کر سکتے۔ وجود صرف ایک ہے۔ اللہ کا جو بخود قائم ہے۔ کلمہ طیبہ میں لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ عبادت کے لائق صرف وہی ہے جو ازخود قائم ہے۔ جس کو کسی نے وجود نہیں دیا۔ باقی ہر شے چونکہ اس کے وجود کی وجہ سے وجود رکھتی ہے اور ازخود قائم نہیں اس لئے وہ اس قابل نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے یا اس کو رب تسلیم کیا جائے یا اسے خدا کی طرح کا ازخود قائم وجود تسلیم کیا جائے۔ یہی توحید اصلی ہے اگر دو وجود تسلیم کئے جائیں ایک خدا کا اور دوسرا کائنات کا تو شرک لازم ٹھہرے گا۔

(13)

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

معانی: مثل موج: لہر کی مانند۔ خودی: اپنی پہچان۔ فاش تر: زیادہ ظاہر۔

مطلب: خودی 'انا یا اپنی معرفت حاصل کرنے اور پھر اس کے درجہ و مرتبہ کو ظاہر سے ظاہر تر کرنے کے کئی مرحلے اور صورتیں ہیں۔ ان مراحل اور صورتوں کو علامہ نے ایک دریا کی علامت میں بند کیا ہے۔ انہوں نے دریا سے کائنات مرادلی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنی خودی کو اجاگر کرنے اور اس کے ظہور خارجی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ دریائے کائنات میں لہروں کی مانند ابھرو مراد ہے اس کے عناصر اور قوتوں کو مسخر کرو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس دریا کے اندر اتر کر دیکھو کہ اس میں کیا ہے اور اس سے استفادہ کرو۔ مراد ہے کہ اس کائنات کے ذرات کے پیچھے جو خالق کی صفات اور اسما کا نور موجود ہے اسے دیکھو۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کائنات سے بالاتر ہو کر جہان روح کی سیر کرو اور روح کی بالیدگی کے اسباب پیدا کرو۔ نفس کے خلاف جہاد کر کے دل کو غیر اللہ کے بتوں سے خالی کر دو۔ غرض کہ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ ہر طریقے سے اپنے اندر موجود خودی کی قوتوں کو خارج میں ظاہر کرے اور دریائے کائنات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو دریا کی مرضی اس پر مسلط ہو جائے گی اور وہ اپنی لہروں میں جس طرح پسند کرے گا اسے ڈبوتا رہے گا۔ آج مسلمان کے زوال کا یہی سبب ہے کہ اسے اپنی معرفت حاصل نہیں ہے اسے معلوم نہیں کہ وہ کن صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کیا جوہر رکھے ہیں اور اسے کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

تعارف: "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" کے عنوان سے لکھی جانے والی نظم میں جس طرح علامہ نے بڈھا بلوچ ایک خیالی کردار تخلیق کیا ہے اسی طرح مندرجہ بالا عنوان میں ملا ضیغم کے نام سے ایک فرضی شخص کا نام لیا گیا ہے جس کا تعلق برصغیر کے شمال کے ایک خوبصورت علاقہ کشمیر کی ایک وادی لولاب سے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی یادداشتوں کی ایک فرضی بیاض (کاپی یا ڈائری) بتائی گئی ہے جس میں درج

اس کے فرضی خیالات کو اقبالؒ نے ارمغان حجاز کی 19 نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ ان سب کا مقصود کشمیریوں کو کشمیری ہندو راجہ کی غلامی سے آزاد ہونے کی تلقین کرنے' ان کو آزادی کی قدر و قیمت بتانے اور ان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانے سے ہے۔

(1)

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادیِ لولاب
گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیِ لولاب
ہیں ساز پہ موقوف نواہائے جگر سوز ڈھیلے ہوں اگر تار تو بے کار ہے مضراب
اے وادیِ لولاب
ملاّ کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب
اے وادیِ لولاب
بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیِ لولاب

بند① معانی: سیماب: پارہ۔ مرغان سحر: صبح کے پرندے۔ بے تاب: بے قرار۔

مطلب: اس نظم میں وادی لولاب کو یا اس وادی کے باشندوں کو خطاب کرتے ہوئے علامہ ملاّ ضیغم لولابی کی زبان سے کہتے ہیں کہ اے لولاب کی وادی تو بہت خوبصورت ہے۔ تیرے چشموں کا پانی پارہ کی طرح صاف' شفاف' سفید اور تڑپتا ہوا ہے اور تیری فضاؤں میں صبح کے وقت چہچہانے والے پرندے ادھر سے ادھر اڑتے پھرتے ہیں۔

بند② معانی: صاحب ہنگامہ: ولولہ یا شورش رکھنے والا۔ منبر و محراب: مسجد کی دو جگہیں جن میں سے منبر پر بیٹھ کر خطیب خطبہ دیتا ہے اور محراب کے نیچے کھڑے ہو کر امام امامت کراتا ہے۔ دین: مذہب اسلام۔ بندہ مومن: صاحب ایمان۔

مطلب: اگر تیری مسجدوں کے خطیب اور امام اپنے دلوں میں دین کے لئے (اسلام کے لئے) صحیح تڑپ اور ولولہ نہیں رکھتے اور اگر مسجد کے منبروں اور محرابوں سے لوگوں میں آزادی اور جہاد کا ولولہ پیدا کرنے والی آوازیں نہیں اٹھتیں تو پھر ان کے دین کو دین کہنا غلط ہے۔ دین تو سعی و عمل اور آزادی کا سبق دیتا ہے۔ اے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والے شخص سمجھ لے کہ جس دین میں یہ باتیں نہیں ہیں وہ دین موت اور خواب کے برابر ہے۔ اے وادی لولاب خدا کرے تیرے علمائے دین میں اور تیرے اماموں اور خطیبوں میں دین کی صحیح سمجھ پیدا ہو جائے اور انہیں تیرے باشندوں تک اس کے صحیح ابلاغ کا خیال آ جائے۔

بند③ معانی: ساز: موسیقی کا آلہ۔ موقوف: منحصر۔ نواہا: نوا کی جمع۔ نوا: آواز۔ جگر سوز: جگر جلا

دینے والی۔ **مضراب**: ایک خاص قسم کا تار جسے انگلی میں پہن کر ساز کے تاروں کو چھیڑتے ہیں اور ان سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

مطلب: اس بند میں علامہ نے ساز اور اس سے متعلقہ علامتوں کے استعمال سے اپنا مفہوم واضح کیا ہے اور کہا ہے کہ اے وادی لولاب کے باشندو جس طرح کسی ساز کے ڈھیلے تاروں سے ان کو مضراب سے چھیڑنے کے باوجود جگر کو جلا دینے والے نغمے پیدا نہیں ہوتے اسی طرح جب تک تم اپنے اندر دین کے لئے صحیح جذبہ اور تڑپ پیدا نہیں کرو گے دین تم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے گا۔ یہ خطاب عام مسلمانوں کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور ان کے رہنماؤں خصوصاً علما اور صوفیا کے لئے بھی۔

بند ④ معانی: **ملاّ**: دین کا نمائندہ' شریعت کا نمائندہ۔ **صوفی**: روحانیت کا نمائندہ' طریقت کا نمائندہ۔ **نور فراست**: بصیرت کا نور' معاملات کی تہ اور انجام تک پہنچانے والی روشنی۔ **بے سوز**: جس میں حرارت نہ ہو۔ **میخانہ**: شراب خانہ۔ **مئے ناب**: خالص شراب۔

مطلب: اے وادی لولاب آج تیرے شریعت اور طریقت کے علم برداروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ شریعت کے حامل مولوی' ملاّ اور علما بصیرت کے اس نور سے بے بہرہ ہیں جس سے وہ مسلمانوں کو درپیش معاملات کی اصلیت کو پا سکیں اور انجام تک کو دیکھ سکیں۔ صوفی جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس وجدان کی شراب ہے اور یہ خالص شراب پی کر آدمی اللہ میں مست اور ہر دوسری مستی سے کنارہ کش ہو جاتا ہے وہ بھی رسم کے صوفی رہ گئے ہیں ان کے شراب خانہ میں اب وہ خالص شراب جس کو پی کر پینے والے کی روح میں حرارت پیدا ہو جائے باقی نہیں رہی۔

بند ⑤ معانی: **بیدار ہوں**: جاگ پڑیں' زندہ ہو جائیں۔ **فغاں سحری**: صبح کی فریاد۔ **درویش**: فقیر' روحانیت کا علم بردار۔ **نایاب ہے**: ملتا نہیں ہے۔

مطلب: مسلمان کو اور مسلمان کے معاشرے کو خالصتاً اللہ کے لئے وقف کر دینے اور اسے دنیاوی حرص و ہوس سے آزاد بنا دینے کا کام صرف درویش کرتا ہے۔ وہ جو خود "اللہ بس اور باقی ہوس" کے اصول کے تحت زندگی بسر کر رہا ہو اور وہ جو بخود فانی اور بحق باقی ہو اس کی صحبت کے فیض اور نگاہ کی تاثیر سے دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ دل زندہ ہونے سے مراد دلوں کی وہ زندگی نہیں جو ان کو ہمارے سینے میں دھڑکا رہی ہے بلکہ یہ ایک روحانی زندگی ہے جو ان کو غیر اللہ کے بتوں سے خالی کر کے ان میں اللہ کو بسا کر حاصل ہوتی ہے۔ مرد درویش کے صبح کے وہ نالے اور وہ فریادیں جو وہ ہر طرف اور ہر چیز سے منہ موڑ کر ذکر و فکر کی صورت میں کرتا ہے۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے والوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور ان میں ایک قسم کی روحانی تبدیلی پیدا کر کے ان میں انسانیت کی اور مسلمانی کی صحیح صفات پیدا کر دیتی ہیں۔ علامہ اس بات پر ملا ضیغم کی زبان سے افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ اب ایک مدت سے مسلمان قوم میں اس قسم کے درویش پیدا نہیں ہو رہے۔ باپ دادا کی روحانی وراثت کی بجائے دنیاوی وراثت کے اعتبار سے تو گدی نشین جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ پیشہ ور' جعل ساز' لوٹ کھسوٹ کرنے والے اور اپنی خانقاہوں کی دنیاوی رونق بڑھانے والے تو بہت ملیں گے۔ لیکن اللہ کا وہ درویش جو خالصتاً اللہ کے لئے جیتا اور مرتا تھا جو مظہر صفات الٰہی ہو کر بندہ مولا صفات بن چکا ہوتا تھا وہ جس کی مرضی اللہ کی مرضی میں گم ہوتی تھی اور اس بنا

ر اللہ اس کی مرضی کے مطابق ہر چیز استوار کر دیتا تھا وہ جس کے ہاتھوں میں زمانے کے گھوڑے کی باگ ور ہوتی تھی اور وہ اسے جدھر چاہے موڑنے کی اہلیت رکھتا تھا وہ جس کے بوریا سے تخت لرزا کرتے تھے ور وہ جس کی جھونپڑی کے آگے محل جھک جاتے تھے اب کہیں نظر نہیں آتا۔

(2)

موت ہے اک سخت تر جس کا غلامی ہے نام — مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام
شرعِ ملوکانہ میں جدتِ احکام دیکھ — صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام
ے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل — سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

① **معانی:** مکر و فنِ خواجگی: آقاؤں کا مکر اور فریب۔ کاش: خدا کرے ایسا ہوتا۔

مطلب: ایک موت تو وہ ہے جو طبعی ہے۔ جس میں آدمی کے بدن سے روح نکل جاتی ہے لیکن کسی اور عالم میں زندہ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور موت بھی ہے۔ اس دوسری موت میں روح تو بدن سے نہیں نکلتی۔ آدمی زندہ تو ہوتا ہے لیکن زندہ ہوتے ہوئے اس کی روح بدن میں مرجاتی ہے۔ روح کی اس موت کا نام ملا ضیغم کی زبان سے اقبال نے غلامی رکھا ہے۔ یہ اصل اور طبعی موت سے بھی بری اور سخت ہوتی ہے۔ اس میں غلام کی مرضی اس کے آقا کی مرضی میں گم رہتی ہے۔ وہ اپنے آقا کے تابع فرمان ہو کر وہی کچھ کرتا ہے جو اس کا آقا چاہتا ہے۔ غلامی سے آزاد ہونے کی آرزو اول تو غلام میں پیدا ہی نہیں ہوتی لیکن اگر ہو بھی جائے تو مرجاتی ہے یا خام رہتی ہے اس کے آقا اپنے مکر و فن اور حیلے بہانے سے اسے غلامی کے چکر سے نکلنے ہی نہیں دیتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ملوکیت کے جملہ مہرے جن میں بادشاہ، جاگیردار، بڑے زمیندار، سرمایہ دار وغیرہ سب آتے ہیں مکاری اور عیاری کے فن میں اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ وہ اپنے زیر فرمان اور ماتحت لوگوں کو اس فن کے جادو سے غلامی کی قید سے اسی طرح مانوس کر دیتے ہیں جس طرح قیدی پرندہ پنجرے سے مانوس ہو جاتا ہے اور اس کے پر مفلوج ہو کر اڑنے کے قابل نہیں رہتے۔

② **معانی:** شرعِ ملوکانہ: بادشاہت کے قوانین، بادشاہت کا مذہب۔ جدت: نیا پن۔ احکام: حکم کی جمع۔ صور: ایک آلہ جسے جب قیامت کے روز اسرافیل نامی ایک فرشتہ پھونکے گا تو سب مردے جی اٹھیں گے اور میدان قیامت (حشر) میں جمع ہو جائیں گے۔ حساب کتاب دینے اور جزا و سزا سننے کے لئے۔ غوغا: شور۔ حلال: جائز مذہبی طور پر۔ حرام: ناجائز مذہبی طور پر۔

مطلب: ملوکیت کے مذہب یا بادشاہت کے قانون کی بنیادی شق یہ ہے کہ غلاموں کو کسی طور پر غفلت سے جاگنے اور جاگ کر آزادی کے لئے راہ عمل پر گامزن ہونے کی اجازت نہ دی جائے چاہے اس میں فریب کاری یا قوت کے استعمال سے کام کیوں نہ لینا پڑے۔ اس صورتحال کو ملا ضیغم نے قیامت کی علامتوں میں سے ظاہر کیا ہے اور کہا ہے کہ اسرافیل فرشتے کے صور کا آلہ پھونکنے کا یہ نتیجہ ہو گا کہ اس کی آواز سن کر سب مردے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی مردہ صور کی آواز تو سن لے لیکن دوبارہ زندہ ہو کر میدان حشر میں نہ پہنچے لیکن بادشاہت نے اپنے

مذہب میں دیکھیئے کیا کیا حکم جاری کر رکھے ہیں۔ ان حکموں کے تحت صور پھونکنے تک کی بات تو جائز ہے لیکن صور کی آواز سن کر مردوں کے جی اٹھنے اور میدان حشر میں آجانے کی بات درست نہیں ہے۔ مراد یہ کہ یہاں تک تو درست ہے کہ غلام کے جی میں اگر آزاد ہونے کا خیال پیدا ہو جائے تو کوئی بات نہیں لیکن اس خیال کو کوئی شاہ قوت اور مکر و فریب سے کام لے کر عملی شکل میں نہ آنے دیا جائے۔

③ **معانی** : **مضمحل**: کمزور، ناتواں۔ **سینہ بے سوز**: وہ سینہ جس میں حرارت نہیں ہے۔ **خودی**: اپنی پہچان۔ **مقام**: جگہ۔

مطلب: اے وہ شخص جس کی روح غلامی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے کمزور اور ناتواں ہو چکی ہے اور جس کا سینہ عمل کی حرارت سے خالی ہو چکا ہے تجھے اپنی روح کو پھر سے زندہ کرنے اور مضبوط بنانے اور آزادی کی نعمت سے مالا مال ہونے کا طریقہ میں بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اپنے اندر خودی پیدا کرو۔ اپنی پہچان کرو اور اس حقیقت کو پا لو کہ میں تو آزاد پیدا ہوا ہوں۔ آزاد رہنا میرا حق ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے سوا ہر قسم کی غلامی میرے مرتبہ آدمیت اور شرف انسانیت کے خلاف ہے۔

(3)

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک — مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیِ ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ — ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

① **معانی**: **محکوم**: غلام۔ **مجبور**: جبر کے تحت۔ **فقیر**: غریب۔ **کل**: گزرا ہوا زمانہ۔ **اہل نظر**: نظر والے، بصیرت والے۔ **ایران صغیر**: چھوٹا ایران۔

مطلب: آج وہ کشمیر جسے اپنی شادابی اور خوش حالی کی وجہ سے گزشتہ زمانے میں دانائی اور بصیرت رکھنے والے اور بات کی تہ تک پہنچنے والی نظر رکھنے والے چھوٹا ایران کہتے تھے آج وہ ڈوگرا ہندو مہاراجہ کے ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے اس حالت کو پہنچ چکا ہے کہ یہاں کے مسلمان (جو غالب اکثریت میں ہیں) خوش حالی کی بجائے بدحالی سے دوچار ہیں۔ آزادی کی بجائے غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ملوکیت کے جبر کے تحت کراہ رہے ہیں۔ غربت، تنگ دستی اور محتاجی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ کے بعد کشمیر کے آزاد علاقے کو چند لاکھ کے عوض ایک ہندو ڈوگرہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور یہاں کے لوگوں کو اس کی غلامی میں دے دیا تھا۔

② **معانی**: **سینہ افلاک**: آسمانوں کا سینہ۔ **آہ سوزناک**: جلا دینے والی آہ۔ **مرعوب ہوتا ہے**: رعب اور دبدبہ سے خوف کھاتا ہے۔ **سلطان**: بادشاہ۔

مطلب: جب کوئی حق کا مرد (وہ شخص جو اللہ کے سوا کسی کو اپنا مالک نہ سمجھے) اللہ کو چھوڑ کر بادشاہوں

اور امیروں کو اپنا مالک سمجھنے لگتا ہے اور ان کے دبدبہ اور خوف کی وجہ سے ان کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو آسمانوں کے سینہ سے بھی جلا دینے والی آہ نکلتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔

③ **معانی**: داستاں: کہانی۔ **بیدردی**: ظلم۔ **ایام**: جمع یوم بمعنی دن مراد ہے زمانہ۔ **کوہ**: پہاڑ۔ **دامن** جھولی۔ **غم خانہ**: غم کا گھر۔ **دہقانِ پیر**: بوڑھا کسان۔

مطلب: ملا ضیغم کہتا ہے کہ اس کشمیر کے ساتھ جو کل تک آزاد اور خوش حال تھا زمانے نے کیا ظلم کیا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ کرنا ہو تو پہاڑ کے دامن میں بوڑھے کسان کے اس گھر کو دیکھ لو جہاں غربت' بھوک' تنگ دستی' بیماری وغیرہ کے سوا کچھ نہیں۔ اسے گھر نہیں غم کا گھر کہنا چاہیے۔ یہ صورت حال اس ہندو راجہ کی پیدا کی ہوئی ہے جس نے کوڑیوں کے مول کشمیر اور کشمیری قوم کو خرید کر اسے غلام بنا لیا تھا۔

④ **معانی**: آہ: افسوس کا کلمہ ہے۔ **قوم نجیب**: شریف' اصیل قوم۔ **چرب دست**: ہاتھوں سے نفیس کام کرنے والی' ہنرمند' دستکار۔ **تردماغ**: طباع' ذہین۔ **روز مکافات**: بدلے کا دن۔ **خدائے دیر گیر**: دیر سے گرفت کرنے والا خدا۔

مطلب: اس شریف النسل' ہنرمند اور ذہین قوم کی بدحالی کو دیکھ کر میرے سینے سے آہ نکلتی ہے۔ مجھے انتہائی دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔ اے گناہ اور جرم کرنے والوں کو ڈھیل دینے اور ان کی دیر سے گرفت کرنے والے خدا تو ان لوگوں کو کب پکڑے گا اور کب سزا دے گا جنھوں نے کشمیر اور کشمیریوں کو اس حال تک پہنچایا ہوا ہے۔ اے خدا بدلے کا وہ دن کب آئے گا۔

(4)

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو

پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

① **معانی**: لہو گرم ہونا: خون میں حرارت پیدا ہونا۔ **محکوم**: غلام۔ **جہان چار سو**: چار طرفوں والا جہان۔ **جہان رنگ و بو**: رنگ اور خوش بو والا جہان جو خوش نما بھی ہے اور فانی بھی۔

مطلب: جب غلام قوم غلامی کی بدحال زندگی گزارتے گزارتے تنگ آ جاتی ہے تو اس میں آزاد ہونے کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا ہے اور اس کے لہو میں آزادی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جان پر کھیل کر بھی اپنے آقاؤں کے مقابلے پر آ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مشرق، مغرب، شمال، جنوب وغیرہ کی چار طرفیں رکھنے والا اور رنگ اور خوشبو کی طرح کا خوشنما مگر جلد اڑ جانے والا جہان یعنی فانی اور عارضی جہان کانپنے لگتا ہے مراد ہے کہ ان کی ہمت اور عزم کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔

② **معانی**: ظن و تخمین: شک اور اندازہ۔ **ضمیر**: ذہنیت' افتاد' دل' ایک باطنی طاقت جو ہمیشہ آدمی کو برائی

سے روکتی ہے اور اچھائی کی طرف مائل رکھتی ہے۔ **چراغ آرزو**: خواہش کا دیا۔

مطلب: جب غلام قوم میں آزادی کی لہر دوڑ جاتی ہے تو اس کے افراد کے دل اور ذہنیتیں شک اور اندازہ کی کش مکش سے نکل کر زندگی کے حقائق پر یقین کرنے لگتی ہیں۔ اور آزاد ہونے کا جو دیا ان کے سینوں میں آرزو کی شکل میں جل اٹھتا ہے اس کی روشنی میں وہ زندگی کے ہر شعبہ کے راستہ کو روشن رکھتے ہیں اور اس پر چل کر اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

③ **معانی**: **چاک**: گریباں یا کسی اور جگہ کے کپڑے کا پھٹا ہوا حصہ۔ **سوزن**: سوئی۔ **تار رفو**: سینے کا دھاگہ۔

مطلب: وہ پھٹا ہوا گریبان جس کو عقل سی نہیں سکتی اسے عشق بغیر سوئی کے اور بغیر سینے کے دھاگے کے سی دیتا ہے۔ مراد ہے غلامی کے زمانے میں غلام کی زندگی جس طرح بدحالی کا شکار ہوتی ہے اور عقل اسے سو حیلے بہانے سے اس غلامی کی زندگی پر قناعت کرنے کے لئے جس طرح کہتی رہتی ہے یہ صورت حال اس وقت باقی نہیں رہتی جب غلام قوم کے افراد میں آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس میں عشق کی حد تک کی گرمی اور حرارت پیدا کر لیتے ہیں۔ انہیں اس وقت ایک ہی لگن ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے آزادی حاصل کرنے کی لگن چاہے اس کے لئے انہیں کوئی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

④ **معانی**: **ضربت پیہم**: مسلسل ضرب، لگاتار چوٹ۔ **پاش پاش**: ٹکڑے ٹکڑے، ریزہ ریزہ۔ **حاکمیت**: حاکم ہونا، آقا ہونا۔ **سنگیں دل**: پتھر دل، سخت دل۔ **آئینہ رو**: آئینہ کے چہرے والا، خوبصورت، حسین۔

مطلب: حاکمیت اور آقائیت کا وہ بت جس کا چہرہ تو حسین لیکن دل پتھر کا ہوتا ہے آخر غلام قوم کے افراد کی مسلسل ضرب اور چوٹ سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ غلامی کی زندگی میں غلاموں کو اپنے آقاؤں کا طرز عمل برا نہیں لگتا حالانکہ وہ سخت دل ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں لیکن جونہی ان میں آزادی کی آرزو مچلنے لگتی ہے اور اس کے حصول کے لئے ان کے خون میں حرارت پیدا ہوتی ہے تو ان کے سامنے اپنے آقاؤں کے اصل چہرے آ جاتے ہیں جن کو وہ اپنی لگاتار کوشش کے بعد اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں اور آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔

(5)

درّاج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں ... حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ درّاج

ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم ... مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور ... وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

① **معانی**: **درّاج**: تیتر۔ **پرواز**: اڑان۔ **شوکت شاہیں**: شاہین کی جمع۔ **صیاد**: شکاری۔ **شاہین**: ایک سفید رنگ کا پرندہ جو کمزور پرندوں کا شکار کرتا ہے۔

مطلب: اس شعر میں درّاج (تیتر) شاہین (باز) اور صیاد (شکاری) کی علامتوں میں کشمیری عوام کی آزادی

ے لئے جدوجہد کرنے کی بات کی گئی ہے۔ وہ کشمیری جو صدیوں سے تیتر کی یعنی کمزور قوم کی غلامانہ زندگی
گزر رہے تھے اور ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم و استبداد کا شکار بنے ہوئے تھے اب ان میں آزادی کی تڑپ
ا ہونے پر شاہین جیسی جرأت اور طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ کل تک جو شکاری کا شکار ہو رہے تھے آج اپنی
ت' جرأت اور عزم آزادی کی بنا پر شکاری کو پریشان کر رہے ہیں اور شکاری ان کی پرواز دیکھ کر اس
ش و پیچ میں ہے کہ یہ تیتر ہیں یا باز ہیں۔ مراد ہے کہ 1930 میں کشمیریوں نے ڈوگرہ حکمرانوں سے
زادی حاصل کرنے کی جو جرأت مندانہ تحریک شروع کی تھی اس کو دیکھ کر حکمران حیرت زدہ رہ گئے
ں اور سوچ رہے ہیں کہ کل تک جو قوم کمزور اور غلام تھی آج اس میں آزاد ہونے کی تڑپ' ہمت اور
رأت کہاں سے آ گئی ہے۔

② **معانی : افکار:** فکر کی جمع' سوچ۔ **تلاطم:** دریا یا سمندر میں طغیانی پیدا ہونا' لہروں کا جوش میں ایک
سرے سے ٹکرانا' تھپیڑے کھانا۔ **فردائے قیامت:** کل آنے والی قیامت۔ **نمود:** ظہور۔

مطلب: یہ صرف کشمیریوں ہی کی بات نہیں' سارے مشرق میں اہل مغرب کی صدیوں کی غلامی کے
اف زوردار تحریکیں پیدا ہو چکی ہیں اور مختلف ممالک کے غلامی کے سمندروں میں طغیانی آ چکی ہے جن
ی لہریں آزاد ہونے کے لئے ابھر رہی ہیں۔ آج سارے مشرق میں آنے والی قیامت کا ظہور ہو رہا ہے۔
راد ہے جس طرح قیامت کے روز مردے اپنی قبروں میں جاگ اٹھیں گے اسی طرح مشرقی اقوام بھی جو
ندیوں سے غفلت کی نیند سوئی ہوئی تھیں اور اپنی غلامی کی زندگی پر رضامند ہو کر مردہ ہو چکی تھیں آج
اگ رہی ہیں اور اپنی آزادی کے لئے اپنے آقاؤں سے ٹکرانے کا ان میں جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔

③ **معانی : فطرت :** قدرت' سرشت' خلقت۔ **تقاضاؤں :** تقاضا کی جمع' اصرار' طلب' خواہش'
ضرورت۔ **حشر:** وہ دن جب مردے جی کر اٹھیں گے اور حساب کتاب دینے اور جزا و سزا سننے کے لئے ایک جگہ
مع ہوں گے' قیامت کا دن۔ **بانگ سرافیل:** اسرافیل فرشتے کی آواز قیامت کے دن اسرافیل صور نامی ایک
الہ میں آواز پیدا کرے گا جس کو سن کر تمام مردے اپنی اپنی قبروں اور جگہوں سے زندہ ہو کر میدان حشر میں جمع
و جائیں گے۔ **محتاج:** ضرورت مند۔

مطلب: قدرت کی طلب اور آدمی کی اپنی خلقت اور سرشت کا اصرار یہ ہے کہ ایک آدمی کسی
دوسرے آدمی کا غلام نہ ہو۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کتا کتے کے سامنے سر خم نہیں کرتا۔ لو بھڑ جاتا ہے
آدمی تو اشرف مخلوق ہے وہ کیوں دوسرے کے سامنے سر خم کرے۔ آزاد رہنا اس کا پیدائشی حق ہے۔
آج مشرق کے غلام لوگ اسی پیدائشی حق کو حاصل کرنے کے لئے مغرب کے آقاؤں کے خلاف اٹھ
کھڑے ہوئے ہیں۔ ان غلاموں کی مثال تو ان مردوں کی سی ہو گئی تھی جن کو قیامت کے دن سرافیل فرشتے کے
صور پھونکنے کی آواز بھی شاید نہ اٹھا سکتی لیکن آج وہ صور کی اس آواز سے پہلے ہی اپنی مردہ حالت کو
تبدیل کر چکے ہیں۔ اور قیامت آنے سے پہلے ہی حشر کی سی زندگی کا نمونہ پیش کر چکے ہیں۔ مراد ہے مشرق کا غلام وہ اپنی
غفلت کی نیند سے بیدار ہو چکا ہے اور اپنی غلامی کی مردہ حالت کو تبدیل کر کے پھر سے آزادی کی زندگی
کے حصول کے لئے تڑپ رہا ہے اور اس کے لئے کوشش کر رہا ہے۔

⑥

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات ہرچند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خودگیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست' خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

① **معانی** : **رند** : شرابی' دنیادار' آزاد منش۔ **کمالات** : کمال کی جمع' کسی فن یا ہنر میں کمال حاصل کرنا۔ **کرامات** : کرامت کی جمع' کسی بزرگ سے ایسے فعل کا سرزد ہونا جو فطرت اور عقل سے ماورا ہو' یہ جادو نہیں ہوتا۔

مطلب : وہ رند جو صوفی کی ضد ہے اور جو آزاد منش اور شرابی ہے وہ بھی جانتا ہے کہ ایک صوفی اپنے اندر فن تصوف کے کون کون سے کمالات رکھتا ہے چاہے وہ اس کی کرامات سے واقف نہ بھی ہو۔ اور اسے یہ معلوم نہ بھی ہو کہ اس سے عقل سے ماورا اور فطرت سے فوق کون کون سے فعل سرزد ہوتے ہیں۔

② **معانی** : **خودگیر** : ہر بات میں خود کفیل۔ **خودداری** : اپنی عزت خود بحال رکھنے کا عمل' متانت' سنجیدگی' عزت نفس۔ **گلبانگ** : خوش گوار آواز۔ **انا الحق** : میں حق ہوں' ایک صوفی منصور نے یہ کہا تھا۔ **سالک** : سلوک طے کرنے والا' تصوف کا راستہ چلنے والا' صوفی' درویش' ولی۔ **مقامات** : مقام کی جمع' تصوف کے راستے کی منزلیں۔

مطلب : بے شک کوئی صوفی اپنے اندر تصوف و ولایت کے فن کے بہت کمالات رکھتا ہو لیکن اگر وہ غلام ہے تو یہ کمالات بے فائدہ ہیں کیونکہ غلام ہوتے ہوئے اس کا اپنا وجود' اس کا اپنا ضمیر اور اس کی اپنی مرضی اس کے آقا کی ہو جاتی ہے۔ اگر سالک (تصوف کی راہ پر چلنے والا صوفی) آزاد ہے تو کمالات و کرامات کے ہوتے ہوئے وہ کسی کا محتاج نہیں ہو گا۔ ہر ایک سے بے نیاز صرف اللہ کا نیازمند ہو گا۔ عزت نفس کا حامل ہو گا۔ کسی کے آگے نہ جھکے گا' نہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرے گا۔ نہ دوسروں کی روزی پر پلے گا۔ وہ "میں حق ہوں" کا نعرہ بلند کرے گا' اور پکارے گا کہ میرا وجود فنا ہو کر حق باقی رہ گیا ہے۔ یہ وہ نعرہ تھا جو منصور نامی ایک صوفی نے اس وقت لگایا تھا جب وہ فنا اور بقا کے اس مقام پر پہنچا تھا جہاں وہ خود فانی ہو کر حق باقی رہ گیا تھا۔ سالک کے راستے کی منزلوں یا مقامات میں سے ملا ضیغم کی زبان سے علامہ نے صرف تین کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور مقامات بھی ہوتے ہیں۔

③ **معانی** : **محکوم** : غلام۔ **سالک** : سلوک یا تصوف کی منزلیں طے کرنے والا' صوفی' ولی' درویش۔ **ہمہ اوست** : سب کچھ وہی ہے' تصوف کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات اور اس کا ہر ذرہ اپنے خالق (خدا) کا مظہر ہے۔ ہر ذرے میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہے۔ **مرقد** : قبر۔ **مرگ مفاجات** : ناگہانی موت۔ **مردہ** : مرا ہوا' بے حس۔

مطلب : ہمہ اوست کا عقیدہ کہ سب کچھ وہی ہے مراد ہے سب ذرات کائنات اور اشیائے کائنات میں اللہ کی صفات جاری و ساری ہیں اور اس عمل کی بنا پر ان کا وجود دکھائی دیتا ہے اگر تو یہ آزاد کا عقیدہ ہے تو یہ

ں کے اور مخلوق خدا کے لئے فائدہ والا ہے۔ اس عقیدے کی بنا پر لوگ خود کو مقام فنا پر سمجھیں گے اور نذ کو باقی خیال کریں گے جس کی بنا پر وہ سوائے اللہ کے کسی کے آگے نہیں جھکیں گے کسی کے آگے ست سوال دراز نہیں کریں گے۔ کسی کے محتاج نہیں ہوں گے لیکن یہی عقیدہ اگر کسی غلام قوم ے صوفی کا ہو تو یہ اسے اللہ کی بجائے اپنے دنیاوی آقا کو سب کچھ ماننے اور اپنی ہستی کی اس کے آگے نفی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسطرح اس کی خودی، خودداری اور عزت نفس ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک ایسے شخص کی مند ہو جاتا ہے جس پر ناگہانی (اچانک) موت آگئی ہے۔ وہ خود اپنی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ موت اس کے جسم کی موت نہیں ہوتی اس کی شخصیت کی موت ہوتی ہے۔ اس موت کے بعد یہی شخصیت مردہ اس ی قبر بن جاتی ہے۔ اور وہ اس میں مردوں کی سی بے بس زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(7)

ل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
رے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
یاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری
چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من — کہ بردآں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

① **معانی**: خانقاہ: درویشوں کے رہنے کی جگہ جہاں لوگوں کی روحانی تربیت کی جاتی ہے۔ **شبیر**: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے نواسے کا نام، حضرت حسینؓ۔ **رسمِ شبیری**: جو رسم حضرت حسینؓ نے کربلا یں ادا کی اور باطل کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ **فقرِ خانقاہی**: خانقاہ تک محدود فقیری، جو عملی دنیا سے بے گانہ ہو۔ اندوہ: رنج، ملال۔ **دلگیری**: صدمہ، دل پر صدمہ اور رنج کی کیفیت۔ **فقط**: صرف۔

مطلب: علامہ عہد حاضر کے ان فقیروں، درویشوں، اور صوفیوں کو جنہوں نے اپنے آپ کو اپنی خانقاہوں تک محدود کر رکھا ہے اور عملی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھتے کہا ہے کہ تمہاری یہ خانقاہی زندگی رہبانیت کے برابر ہے۔ تم اپنی خانقاہوں سے نکلو اور عملی میدان میں آکر امت مسلمہ کے مسائل کا حل تلاش کرو۔ ان کو غلامی کی زنجیریں کاٹنے کا مشورہ بھی دو اور اس کے کاٹنے میں ان کی مدد بھی کرو۔ ان کو جابر طاقتوں کے سامنے سر اٹھانے کے لئے بھی کہو اور خود بھی اس عمل میں حصہ لو۔ جس طرح حضرت امام حسینؓ نے اپنے وقت کے جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہا تھا اور حق کی سربلندی کے لئے کربلا کے میدان میں اپنی، اپنے رفقائے کار اور اہل خاندان کی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا تم بھی ان کے نقش قدم پر چل کر وقت کی طاغوتی اور جابر قوتوں کے خلاف محاذ قائم کرو چاہے اس میں جانیں بھی قربان کیوں نہ کرنی پڑیں۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے اور خود کو خانقاہی رسوم اور عبادات کے ادا کرنے تک ہی محدود رکھو گے تو یاد رکھو تمہاری یہ زندگی رنج و ملال اور صدمہ و غم کی زندگی کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔ یہ رہبانیت کی زندگی ہوگی جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

② **معانی**: **بوئے رہبانی**: ترک دنیا کی بو۔ رہبانی: ترک دنیا۔ **امت**: قوم۔ **عالمِ پیری**: بڑھاپے کی حالت، اخیر عمر کا زمانہ۔

مطلب: اے وہ صوفی جس نے خود کو عملی دنیا سے بے گانہ کر رکھا ہے تو جو مذہبی خیالات اور ادبی (متعلق بہ فن شعر وغیرہ) افکار پیش کر رہا ہے مجھے اس میں سے ترک دنیا اور بے عملی کی بو آ رہی ہے۔ جب کسی قوم کی موت آئی ہوئی ہوتی ہے تو اس کا اور اس کے بزرگوں کا یہی حال ہوتا ہے جس طرح کسی شخص پر بڑھاپا آ جاتا ہے اور اس کی یہ اخیر عمر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اب وہ مرنے والا ہے اسی طرح اے صوفی تیری بے عملی اور ترک دنیا سکھانے والی زندگی اور خیالات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ تو اور تیری قوم بھی مرنے کے قریب ہے۔ خانقاہ کی محدود اور بے عمل زندگی کو چھوڑ خود بھی مرنے سے بچ اور اپنی قوم کو بھی مرنے سے بچا۔ یہاں مرنے سے مراد' بے حس ہونا' عمل سے بے گانہ ہونا' غلام بن کر زندگی بسر کرنا اور جبر و جور کی قوتوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا وغیرہ سے ہے۔

③ **معانی**: **شیاطین**: شیطان کی جمع۔ **ملوکیت**: بادشاہت' آقائیت۔ **نخچیر**: شکار۔ **ذوق نخچیری**: شکار ہو جانے کی لذت۔

مطلب: ملوکیت کا نظام دنیا میں شیطان کا پیدا کردہ ہے۔ اس نظام میں بادشاہ اور اس کو تقویت بخشنے اور خود کو اس کے سایہ میں محفوظ سمجھنے والی جاگیرداری' زمینداری' وڈیرہ پن اور سرمایہ داری کی قوتیں سرگرم عمل ہو کر لوگوں کو اپنا محتاج' دست نگر اور غلام بنا لیتی ہیں۔ یہ طبقے لوگوں کو اپنی غلامی پر رضامند اور خوش رکھنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانوں اور مکر و فریب سے کام لیتے ہیں اور ان کی عزت و ناموس اور خودداری و خود گیری کی صلاحیتوں اور قوتوں کو اس انداز سے سلا دیتے ہیں کہ وہ اس میں خوش نظر آتے ہیں۔ علامہ نے اس کیفیت کو شکار اور شکاری کی علامتوں سے سمجھایا ہے اور بتایا ہے کہ ان شکاریوں کے پاس کچھ ایسا جادو ہوتا ہے کہ شکار خود شکار ہونے کے لئے تیار رہتا ہے اور اپنے شکار ہونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

④ **معانی**: **چہ**: کیا۔ **گذشتند**: گزرے ہیں۔ **از**: سے۔ **نوائے صبحگاہ من**: میری صبح کے وقت کی آواز۔ **من**: میری۔ **نوا**: آواز۔ **صبحگاہ**: صبح کا وقت۔ **برد**: لے گیا۔ **سیہ چشمان**: کالی آنکھوں والے۔

مطلب: میری صبح کے وقت کی آواز سے اہل کشمیر اس طرح بے پروا ہو کر گزرے ہیں کہ جیسے ان کی سیہ آنکھوں سے کوئی وہ شور و مستی لے گیا ہو جس سے وہ دوسروں پر جادو کر سکتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ یہی کشمیری جو آج غلامی اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ کبھی آزاد تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں نہ صرف سرفراز تھے بلکہ دوسرے بھی ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اب صورت حال یہاں تک بگڑ چکی ہے اور وہ بے حس ہو کر غلامی کی زندگی سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری کے ذریعے ان کو آزادی' حرکت' اور عمل کا جو پیغام دیا ہے اس سے وہ بالکل بے پروا ہیں۔ ان کے کانوں میں غلامی کے سروں کا رس بھر چکا ہے۔ وہ میری غلامی کی زنجیریں کاٹ دینے والی آواز پر کان کیوں دھریں گے۔

(8)

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر ۔۔۔ دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے ۔۔۔ دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند
جس خاکِ کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار ۔۔۔ ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

① **معانی:** فقط: صرف۔ جذبہ بلند: بلند جذبہ۔

مطلب: اے کشمیر کے باشندے' اے مرد مسلمان اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ دل ایک خون کو رواں رکھنے والا آلہ ہے اور لہو کی بوند ہے تو تو سمجھتا رہ مگر ایسا نہیں ہے۔ تیرے سینے میں جو دل ہے وہ صرف خون کی ایک بوند کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے اندر جو بلند جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کا نام ہے۔ دل کو گوشت کا لوتھڑا سمجھنا تیری نا سمجھی کی دلیل ہے۔ دل دراصل ایک غیر مادی جوہر ہے ایک نورانی لطیفہ ہے۔ تو دل کے گوشت کے لوتھڑے میں اس جوہر اور نورانی لطیفہ کو تلاش کر اور کسی مرد درویش کی صحبت میں جا کر اس سے اور اس کی تلاش کے فن سے آگاہی حاصل کر۔ جب یہ نورانی لطیفہ والا دل تجھ میں پیدا ہو جائے گا تو کائنات تیرے آگے سرِ خم کرنے لگے گی۔

② **معانی:** گردشِ مہ و ستارہ: چاند اور ستارہ کی گردش۔ ناگوار: ناپسند۔ سحر: صبح۔ نقشبند: نقش بنانے والا۔

مطلب: ظاہری اور مادی دنیا میں صبح و شام کا آنا' موسموں کا بدلنا وغیرہ بے شک چاند ستاروں کی گردش (گھومنے' چکر کاٹنے) سے ہوتا ہے لیکن روحانی دنیا ان قوانین قدرت کی پابند نہیں ہے اس کی اپنی دنیا ہے۔ اس کے اپنے موسم اور اپنی صبحیں اور شامیں ہیں یہ سب کچھ انسانی دل اور اس کی ان کیفیتوں سے پیدا ہوتا ہے جو تصوف کے نظام اور صوفیا کی صحبت و نگاہ سے ابھرتی ہیں۔ جس انسان کے سینے میں ایسا دل پیدا ہو جاتا ہے وہ مر کر بھی نہیں مرتا۔ اور وہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارنے پر آمادہ رہتا ہے۔ غلامی اور محتاجی اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔

③ **معانی:** خاک: مٹی' جسم۔ ضمیر: دل۔ آتش: آگ۔ چنار: کشمیر کی وادی میں اگنے والے درخت جن کے پھول آگ کی طرح روشن ہوتے ہیں۔ سرد ہو: ٹھنڈی ہو۔ خاک ارجمند: مبارک مٹی۔

مطلب: جس مٹی میں' جس انسانی جسم میں ایسا دل پیدا ہو جاتا ہے کہ اس میں چنار کے سرخ پھولوں کے رنگ کی سی حرارت اور تپش پیدا ہو چکی ہو اس دل کی آگ' اس کے مبارک جسم میں کبھی ٹھنڈی نہیں ہو سکتی وہ دل جس کا پہلے دو شعروں میں ذکر ہے اپنے اندر عشق کی ایسی آگ پیدا کر لیتا ہے جس کو کوئی دنیاوی لالچ' کوئی طاغوتی طاقت' کوئی جبر' کوئی ظلم اور کوئی احتیاج اس سے نکال باہر نہیں کر سکتی۔ اے چنار کے درختوں والی وادیوں اور پہاڑوں میں رہنے والے کشمیری اپنے اندر ایسا دل پیدا کر۔

(9)

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گل نہ کام آیا مُلّا کو علمِ کتابی
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں غزلخواں ہوا پیرکِ اندرابی
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی
سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی
نہیں زندگی سلسلہ روز و شب کا نہیں زندگی مستی و نیم خوابی
حیات است در آتشِ خود طپیدن خوش آں دم کہ ایں نکتہ را بازیابی
اگر ز آتش دل شرارے بگیری تواں کرد زیرِ فلک آفتابی

① **معانی**: **چمن**: باغ۔ **کتب خانہ گل**: پھولوں کا کتاب گھر۔ **ملا**: دینی عالم۔ **علم کتابی**: کتاب کا علم۔

مطلب: جب باغ میں پھولوں کا کتاب گھر کھل گیا تو عالم دین اپنی کتابوں کا علم بھول گیا۔ مراد ہے جو کچھ فطرت کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے کتابوں سے نہیں۔

② **معانی**: **متانت شکن**: سنجیدگی توڑنے والی۔ **ہوائے بہاراں**: بہار کی ہوا۔ **غزل خواں**: غزل پڑھنے والا۔ **پیرک اندرابی**: وسطی ایشیا کے ایک شہر بلخ کے قریب ایک قصبہ ہے جس کا نام اندراب ہے۔ وادی لولاب میں جو سادات بستے ہیں ان میں سے اکثر اس جگہ سے نقل مکانی کر کے بھی کشمیر میں آئے تھے۔ یہ لوگ حسب و نسب اور علم و ادب کے اعتبار سے آج بھی ممتاز ہیں۔

مطلب: بہار کی ایسی ہوا چلی ہے جس نے سنجیدہ لوگوں کو بھی متانت کے خول سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ اندراب قصبے سے آنے والے سادات خاندان سے تعلق رکھنے والے بزرگ بھی شعر خوانی اور غزل خوانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔

③ **معانی**: **لالہ آتشیں پیرہن**: سرخ لباس پہنے ہوئے لالہ کا پھول۔ **آتشیں**: آگ کی طرح کا۔ **پیرہن**: لباس۔ **لالہ**: ایک سرخ رنگ کا پھول۔ **اسرار جاں**: جان کے بھید۔ **بے حجابی**: بے پردگی، بے پردہ ہونا۔

مطلب: آگ کی طرح کا سرخ لباس پہنے ہوئے لالہ کے پھول نے کہا کہ میں جان کے بھیدوں کو کھولنے والا ہوں۔ لالہ کے پھول کو علامہ نے اپنے کلام میں عشق کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا ہے اس لئے یہاں یہ مراد ہے کہ نہ علم اور نہ کتاب، انسانی جان کے بھید کو کھول سکتی ہے۔ اگر کھول سکتی ہے تو عشق کی طاقت کھول سکتی ہے۔ دیکھو (جیسا کہ پہلے دو شعروں میں کہا گیا ہے) ملّا کا علم کتابی اس وقت دھرا کا دھرا رہ گیا جب چمن میں ہر طرف پھولوں کی کتابیں کھل گئیں۔ اور اندراب کے سادات بھی اپنی متانت چھوڑ کر غزل خوانی کرنے لگے۔ موسم گل اور ہوائے بہار نے ان کے دلوں کی کیفیا بھی بدل دیں جو شخص بھی فطرت کے قریب ہوتا ہے اور اس کا مطالعہ کرتا ہے وہ کتابی علم پر بھروسہ نہیں کرتا۔ زندگی کی حقیقت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اندر عشق کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

④ **معانی**: **خواب لحد**: قبر کی نیند۔ **نہاں**: چھپی ہوئی۔ **تعمیر**: بنانا۔ **خرابی**: بگڑنا۔

مطلب: جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ زندگی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور اس کا انجام صرف قبر کی

چاردیواری میں سونے تک ہے سمجھ لیجئے کہ اس کی قلبی و ذہنی اور فکری و خیالی بناوٹ میں کوئی خرابی ہے۔ زندگی قبر تک کی منزل کا نام نہیں بلکہ یہ اس سے آگے بھی رواں دواں رہتی ہے لیکن اس راز کو وہی پا سکتا ہے جس کا دل عشق سے زندہ ہو اور جس کی روح غلامی سے مردہ نہ ہو چکی ہو۔

⑤ **معانی**: **سلسلہ روز و شب**: دن اور رات کا سلسلہ۔ **نیم خوابی**: آدھی نیند' اونگھ۔

مطلب: دن اور رات کے سلسلے کا نام زندگی نہیں ہے کہ صبح ہوئی شام ہوئی اور اس طرح زندگی تمام ہوئی۔ زندگی خدا سے اور اپنی اصلیت سے غافل ہو کر عیش و عشرت میں کھو جانے اور اسے سو کر گزار دینے کا بھی نام نہیں ہے۔

⑥ **معانی**: **حیات**: زندگی۔ **است**: ہے۔ **در**: میں۔ **آتش خود**: اپنی آگ۔ **تپیدن**: تڑپنا۔ **خوش آں دم**: کتنا اچھا ہو گا وہ وقت۔ **ایں**: یہ' اس۔ **نکتہ**: باریک بات۔ **را**: کو۔ **بازیابی**: پھر سے حاصل کر لے۔

مطلب: زندگی اپنی آگ میں تڑپنے کا نام ہے۔ مبارک ہو تیرے لئے وہ لحہ جب تو اس باریک بات کو پھر سے سمجھ لے۔ اپنی آگ میں جلنے سے مراد اپنے اندر عشق کا جذبہ پیدا کرنے سے ہے۔ زندگی کا راز اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک عشق راہنمائی نہ کرے۔ علم' کتابیں' منطق اور فلسفہ اس کی تفہیم اور اس کے بھید کو پانے میں مدد نہیں دے سکتا۔

⑦ **معانی**: **ز**: سے۔ **آتش دل**: دل کی آگ۔ **شرارے**: ایک چنگاری۔ **بگیری**: حاصل کر لے۔ **تواں کرد**: کر سکتے ہیں۔ **زیر فلک**: آسمان کے نیچے۔ **آفتابی**: سورج کا طلوع ہونا' روشنی ہونا۔

مطلب: اگر تو دل کی آگ سے ایک چنگاری حاصل کر لے یعنی اپنے اندر ایسا دل پیدا کر لے جس میں عشق کی آگ ہو اور اس آگ سے غیر اللہ کے خس و خاشاک کو جلا کر اپنے دل میں اللہ کو بسا لے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تو آسمان کے نیچے یعنی دنیا میں یا زمین پر آفتاب طلوع کر سکتا ہے۔ مراد ہے خود بھی روشن ہو سکتا ہے اور اہل جہان کو بھی روشنی دے سکتا ہے۔ زندگی کی حقیقت اور صحیح نصب العین کی روشنی۔

(10)

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے' یہ خواجۂ افلاک

① **معانی**: **رگ**: دھاگے کی قسم کی جسم کے اندر لمبی لمبی نالیاں۔ **سنگ**: پتھر۔ **تاک**: انگور کی بیل۔ **محکوم**: غلام۔

مطلب: آزاد قوم کے فرد اور غلام قوم کے فرد کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے علامہ بزبان ملا ضیغم کہتے

ہیں کہ آزاد شخص کی رگیں پتھر کی رگوں کی طرح مضبوط ہوتی ہیں اور غلام شخص کی رگیں انگور کی بیل کی رگوں کی طرح نرم ہوتی ہیں۔ آزاد آدمی میں ہمت' عزم' حوصلہ' طاقت' عمل وغیرہ کی صلاحیتیں ہوتی ہیں اس کے برعکس غلام آدمی میں بے ہمتی بے عزمی' بے حوصلگی' بے طاقتی اور بے عملی ہوتی ہے۔

② **معانی** : **محکوم** : غلام۔ **مردہ** : مرا ہوا۔ **افسردہ** : بجھا ہوا۔ **نوامید** : ناامید۔ **پرسوز** : حرارت سے بھرا ہوا۔ **طربناک** : خوشی سے بھرا ہوا' شگفتہ۔

مطلب : آزاد آدمی اور غلام آدمی کی زندگی اور ماحول میں جو فرق ہے اس کا مزید ذکر کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ غلام کا دل مرا ہوا' بجھا ہوا اور ہمیشہ ناامیدی کی حالت میں رہنے والا ہوتا ہے۔ جب کہ آزاد آدمی کا دل زندہ' حرارت سے بھرا ہوا اور خوشی سے شگفتہ ہوتا ہے۔

③ **معانی** : **نفس** : سانس۔ **فقط** : صرف۔ **سرمایہ** : دولت۔ **دیدہ** : آنکھ۔ **دیدہ نمناک** : آنسوؤں سے پر آنکھ۔

مطلب : آزاد کی زندگی کی دولت روشن و منور دل اور گرم سانس ہوتی ہے۔ یعنی اس کا دل اپنی آزادی کی روشنی میں زندگی کی صحیح راہ دیکھتا ہے اور عزم و ہمت سے ترقی اور عروج کی منزلوں کی طرف چلتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس غلام کی زندگی کی دولت آنسو برسانے والی آنکھ ہوتی ہے۔ یعنی وہ زندگی کی جملہ اقدار اور آسائشوں سے محروم بے مقصد زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ ایسی بے مقصد زندگی جس میں سوائے غم اور رنج کے کچھ نہیں ہوتا۔

④ **معانی** : **محکوم** : غلام۔ **بے گانہ** : خالی' عاری۔ **اخلاص** : خلوص۔ **مروت** : اچھا سلوک۔ **منطق** : فلسفہ۔ **چالاک** : ہوشیار۔

مطلب : محکوم اگرچہ فلسفیانہ قسم کی دلیلیں لانے میں بڑا ہوشیار ہوتا ہے لیکن وہ خلوص اور حسن سلوک کی اعلیٰ قدروں سے محروم ہوتا ہے۔ آزاد کو تو دنیا میں ہزار کام کرنے کے ہیں لیکن غلام عملی دنیا سے بے گانہ محض فضول بحثوں میں الجھا رہتا ہے۔

⑤ **معانی** : **محکوم** : غلام۔ **ہمدوش** : برابر۔ **بندہ افلاک** : آسمانوں کا غلام۔ **خواجہ افلاک** : آسمانوں کا آقا۔

مطلب : قدیم فلسفیوں نے آسمانوں کو زندہ اور کائنات پر حکمران کہا ہے۔ مصر' یونان' عراق وغیرہ کے فلسفی یہی کہتے تھے کہ آسمانوں کی گردش آدمی کی زندگی پر اثر کرتی ہے۔ اور دنیا میں انفرادی اور اجتماعی تبدیلیاں اسی گردش کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں لیکن اسلام اس عقیدہ کو نہیں مانتا وہ آدمی کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ آزاد شخص بھی آسمان کی بالادستی اور حکمرانی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے مضبوط ارادے' عالی ہمتی اور گرم عملی کی بدولت اس کو زیر کر لیتا ہے لیکن غلام آدمی کی زندگی اس کی افسردہ دلی' پژمردہ ہمتی اور بے عملی کی وجہ سے ضرور آسمانوں کی گردش کے تابع ہوتی ہے۔ آزاد زمان و مکان پر حکمران ہوتا ہے اور اس کے گھوڑے کو اپنی مرضی کے مطابق جدھر چاہے موڑ سکتا ہے لیکن غلام پر زمان و مکان سوار ہوتے ہیں اور وہ بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں ان کے فرمان کے تحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

(11)

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ — کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ
یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے — کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ
طلسمِ بے خبری، کافری و دینداری — حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ
نصیبِ خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش — کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانہ کی آنکھ سے کب تک — گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یک دانہ

① **معانی: تمام:** سب۔ **عارف:** خدا کی پہچان کرنے والے۔ **عامی:** عام آدمی۔ **خودی:** اپنی پہچان کرنا۔ **بے گانہ:** خالی۔ **مسجد:** مسلمانوں کی عبادت کی جگہ۔ **میخانہ:** شراب خانہ، وہ جگہ جہاں شراب پی جاتی ہے۔

مطلب: علامہ نے اس شعر میں عہد حاضر کے کشمیری مسلمانوں کو خصوصاً اور دنیا کے سارے مسلمانوں کو عموماً پیش نظر رکھتے ہوئے کہا ہے کہ آج کے مسلمان چاہے ان میں خدا تک پہنچنے کا دعویٰ کرنے والے صوفی و عالم کیوں نہ ہوں اپنی معرفت اور اپنے خدا کی معرفت سے بے گانہ ہیں۔ عام مسلمان آدمی کی بات چھوڑیئے جب خواص کا یہ حال ہے تو مسلمان بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم اگر ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس میں حیرانی کیا ہے۔ اگر مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ اللہ نے ان کا کیا مرتبہ بنایا ہے اور ان کے ذمہ دنیا کو ہدایت پر رکھنے کے لئے کیا فرائض عائد ہیں تو وہ ان کے پیش نظر اپنی زندگیوں کو ڈھالتے ہوئے غلامی کی بجائے حکمرانی کا فریضہ ادا کر رہے ہوتے۔ آج کے مسلمان نے مسجد کو شراب خانہ بنا رکھا ہے۔ مراد یہ نہیں کہ واقعی وہاں شراب بکتی اور پی جاتی ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ مسلمان نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ کے احکام کو چھوڑ کر غیر اللہ کے احکام کو نافذ کر رکھا ہے۔ جن مسلمانوں کو قرآن و شریعت کی روشنی میں زندگی بسر کرتے ہوئے دوسروں کی راہنمائی کرنی چاہیے تھی آج وہ خود دوسروں کی راہنمائی میں زندگی گزار رہے ہیں اور اس طرح مسلمان ہوتے ہوئے اسلامی کی بجائے غیر اسلامی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔

② **معانی: راز:** بھید۔ **میر واعظ:** وعظ سے مراد دینی پند و نصیحت واعظ، وعظ کرنے والا، میر واعظ، بڑا واعظ۔ **حرم:** کعبہ۔ **چراغ حرم:** کعبہ کا دیا، شمع۔ **پروانہ:** پتنگا۔

مطلب: کشمیری دینی حلقہ میں وعظ کرنے والوں میں بڑے واعظ کا لقب چونکہ میر واعظ ہے اس لئے اس شعر میں کشمیر کے بڑے واعظ کے حوالے سے خصوصاً اور ہر جگہ کے مسلمان واعظوں کے متعلق عموماً یہ بات کہی گئی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو راز کی یہ بات نہیں بتائی کہ کعبہ خود اپنے چراغ کا پتنگا ہے۔ یہاں کعبہ کنایہ یا اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف اور چراغ حرم کنایہ یا اشارہ ہے اللہ سے محبت کرنے والے مسلمانوں کی طرف۔ قرآن و حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ جو مسلمان اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ یہ ایسی پتہ کی بات ہے جس کو اگر ہمارے واعظ ہمیں بتاتے تو ہم اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی محبت میں گرفتار نہ ہوتے اور اس کے نتیجے میں غلامی کی زندگی بسر نہ کرتے اور ذلیل و خوار نہ ہوتے۔

③ **معانی: طلسم:** جادو۔ **بے خبری:** بے علمی۔ **کافری:** خدا کا انکار کرنا، غیر اسلامی۔ **دینداری:** خدا کا

اقرار کرنا' اسلامی۔ حدیث: کہانی' داستان۔ شیخ: مسلمانوں کا مذہبی راہنما۔ برہمن: ہندوؤں کا مذہبی راہنما۔ فسوں: جادو۔ افسانہ: خیالی کہانی۔

مطلب: آج کل کے مسلمان علما بے علمی کے جادو میں گرفتار معلوم ہوتے ہیں اور دین اور بے دینی میں واضح تمیز سے ناواقف دکھائی دیتے ہیں۔ شیخ اور برہمن (مسلمان دینی راہنما اور کافر دینی راہنما) میں فرق کی داستان جادو کی اور خیالی کہانی کی سی رہ گئی ہے۔ مسلمان علما دین کی صحیح روح سے بے خبری اور بے علمی کی بدولت مسلمانوں کو کافر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ خود کافرانہ روایات کے پرستار نظر آتے ہیں۔

④ **معانی:** نصیب ہو: قسمت میں ہو۔ خطہ: علاقہ' یہاں مراد کشمیر کا علاقہ۔ بندہ درویش: فقیر' ولی۔ فقر: درویشی' ولایت۔ انداز: اسلوب' طریقہ۔ کلیمانہ: حضرت موسیٰؑ کی طرح اللہ تعالیٰ سے کلام کرنا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے ملا ضیغم لولابی کی زبان سے آرزو کی ہے اور اللہ سے دعا مانگی ہے کہ یا رب کشمیر کے علاقہ میں کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کا زمانے کے فرعون سے ٹکر لینے والا درویش بھیج جو کشمیریوں کو ڈوگرہ راج سے اسی طرح نجات دلائے جس طرح حضرت موسیٰ کلیم اللہ (اللہ سے کلام کرنے والے) نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی تھی۔ ظاہر ہے مسلمان درویش' جو بخود فانی اور بحق باقی ہوتا ہے۔ پیغمبر تو نہیں ہوتا لیکن پیغمبروں کے علم اور روایات کا وارث ہونے کی بنا پر اس کی زندگی کا انداز پیغمبرانہ ہوتا ہے۔

⑤ **معانی:** گہر: موتی۔ آب: پانی۔ ولر: کشمیر کی ایک جھیل کا نام' تمام اسب۔ یکدانہ: نہایت قیمتی' ایک جیسے بے مثل۔

مطلب: کشمیر کے دارالحکومت سرینگر کے قریب ولر نامی جو جھیل ہے اس کے سارے موتی سڈول' ہموار اور بے مثل ہیں۔ ان کی صحیح شناخت اور ان کی صحیح قیمت زمانے کے جوہریوں سے کب تک چھپی رہے گی۔ یہاں جھیل ولر کنایہ ہے خطہ کشمیر کی طرف اور گہر کنایہ ہے کشمیریوں کی طرف جو بے مثل موتیوں کی طرح اپنے اندر بہت سی خوبیاں اور صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن غلامی کی وجہ سے ان کی یہ صلاحیتیں بروئے کار نہیں آ رہیں اور ان کی خوبیاں اجاگر نہیں ہو رہی ہیں۔ خدا کرے انہیں آزادی کی فضا میں سانس لینا نصیب ہو تاکہ ان کے پوشیدہ جوہر دنیا والوں کے سامنے آ سکیں۔

(12)

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے — بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویم فردا ہے باطل — گرے آسماں سے پرانے ستارے
ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے — کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے — نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک — خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

① **معانی:** دگرگوں: انقلاب سے دوچار ہونا۔ جہاں: دنیا۔ زورِ عمل: عمل کی طاقت۔ زندہ قوم: جو قوم آزاد اور باعمل ہے۔ معرکے مارنا: مشکلات پر قابو پانا' فتوحات کرنا' تسخیر کرنا۔

مطلب: علامہ غلام کشمیری مسلمانوں کو بتا رہے ہیں کہ اپنی حالت کو بدلنے کے لئے اپنے اندر عمل کی قوت پیدا کرنی چاہیے۔ جو قومیں عمل کی وجہ سے آزاد اور دوسروں پر فوقیت و غلبہ رکھتی ہیں انہوں نے عمل کی بدولت دنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا کئے ہیں۔ دنیا کو اور اس کی پوشیدہ طاقتوں کو تسخیر کر کے انہوں نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ بڑی بڑی فتوحات کی ہیں نت نئی ایجادات دنیا کے سامنے لائے ہیں۔ اس لئے تمہیں بھی پہلے اپنے اندر ان کی طرح کا زور عمل پیدا کرنا چاہیے۔ جب تم بدل جاؤ گے۔ تمہارے حالات بدل جائیں گے۔

② **معانی**: **منجم**: ستاروں کا علم جاننے والا' ستاروں کے علم کے ذریعے پیشین گوئی کرنے والا' نجومی۔ **تقویم فردا**: آنے والی کل کے متعلق بتانے والی جنتری۔ **تقویم**: ستاروں کا حساب کتاب بتانے والی کتاب۔ **فردا**: آنے والی کل۔ **باطل**: جھوٹ۔

مطلب: زندہ قومیں نجومیوں کی ان پیشین گوئیوں پر بھروسہ نہیں کرتیں جو وہ ستاروں کے برجوں اور چالوں کے علم کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان پر یقین کرنا غلام اور بے عمل قوموں کا شیوہ ہے کہ اس طرح وہ آئندہ کے اندازوں پر یقین کر کے اس امید پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھی رہتی ہیں کہ نجومی کے کہنے کے مطابق بھلا وقت آنے والا ہے۔ آزاد قومیں ان نجومیوں کی پیشین گوئیوں کو جھوٹ قرار دیتے ہوئے عمل کی راہ پر گامزن رہتی ہیں اور اپنی طاقت' ہمت اور حوصلے سے اپنی حالت کو بدل دیتی ہیں۔ وہ آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو اپنی قسمت کے بدلنے یا نہ بدلنے والے نہیں سمجھتیں اور اس لحاظ سے آسمانوں پر ان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتیں اور نجومیوں کی مستقبل کے متعلق خبریں بتانے والی کتاب کو جھوٹ کا ایک پلندہ جانتی ہیں۔

③ **معانی**: **ضمیر**: دل' اندرون۔ **آتشیں**: آگ سے بھری ہوئی۔

مطلب: جہان کا دل آگ سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ بعض اوقات آسمان کی بجائے دریاؤں سے ستارے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انقلاب کی اس قوت کی وجہ سے جو جہان کی ذات میں آگ کی طرح پوشیدہ ہے ایسے ایسے معرکے اور کارنامے ظاہر ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

④ **معانی**: **فراغت**: فرصت۔ **زلزلہ**: بھونچال۔ **نمایاں**: ظاہر۔ **فطرت**: قدرت۔

مطلب: علامہ نے مسلمانوں کو بھونچال کی مثال دے کر انقلاب برپا کرنے کی طرف رغبت دلائی ہے اور کہا ہے دیکھو زمین کے اندر زلزلے پوشیدہ ہیں اور زمین ان سے کسی وقت خالی نہیں رہتی۔ جب کہیں الٹ پلٹ کرنا ہو تو زلزلے جاگ اٹھتے ہیں اور زمین کی حالت کو دگرگوں کر دیتے ہیں۔ تبدیل کر دیتے ہیں۔ زلزلوں کے اس عمل سے قدرت تمہیں یہ اشارہ دے رہی ہے کہ زلزلوں کی طرح کی قوت انقلاب تمہارے اندر بھی موجود ہے۔ اس قوت سے کام لو اور اپنی غلامی کے جہان کو تہ و بالا کر کے آزادی کی نئی دنیا بساؤ۔

⑤ **معانی**: **ہمالہ کے چشمے**: وہ چشمے جو ہمالہ پہاڑ میں ہیں۔ **خضر**: ایک شخص جو بھولے بھٹکوں کی راہنمائی کرنے اور ڈوبتے بیڑوں کو پار لگانے کے لئے بیابانوں اور دریاؤں میں رہتا ہے۔ **ولر**: جھیل ولر جو کشمیر کے دارالحکومت سری نگر کے پاس ہے۔

مطلب : آخر میں علامہ کہتے ہیں کہ جھیل ولر کے کنارے کھڑا خضر یہ سوچ رہا ہے کہ جب ہر جگہ انقلاب برپا ہو رہا ہے ہمالہ کے دامن میں آباد کشمیر کے خطے کی جھیل ولر کا پانی اور اس میں موجود چشموں کا پانی کب اپنے اندر حرارت پیدا کر کے ابلے گا۔ مراد یہ ہے کہ اہل کشمیر جو اس وقت غلامی میں جکڑے ہوئے بے بسی اور بے چارگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں دیکھئے ان کے اندر غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونے کا جذبہ اور انقلاب برپا کرنے کا خیال کب پیدا ہوتا ہے۔

(13)

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی — معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال — یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال — کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن — قبولِ حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے — ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

① **معانی** : صبح و شام: ہر روز، ہر لحہ۔ تقدیر: قسمت۔ نشاں: پتہ۔

مطلب: جو قومیں زندہ ہوتی ہیں ان کا پتہ یہ ہے کہ ہر لحہ ان کی قسمت بدلتی رہتی ہے۔ وہ عمل کی راہ پر گامزن ہو کر اور اپنی مخالف قوتوں کو زیر کر کے ہر لحہ آگے بڑھتی رہتی ہیں ان کا ہر لحہ پہلے لحہ سے بہتر ہوتا ہے۔

② **معانی** : صدق: سچائی، دیانت۔ کمال: انتہا۔ مروت: انسانوں کا آپس میں حسن سلوک، ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنا اور ہمدردی سے پیش آنا۔ فطرت: قدرت۔ تقصیر: غلطی، لغزش، کوتاہی۔

مطلب: زندہ قوموں کی ایک اور نشانی یہ ہے کہ اس کے افراد سچائی، دیانت، آپس کے حسن سلوک اور ہمدردی اور آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی چاہنے کے جذبوں اور اصولوں کو انتہائی حد تک نبھاتے ہیں۔ زندگی کے کسی شعبہ میں خیانت نہیں کرتے اور آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے کے حقوق غصب کرنے سے بچتے ہیں۔ ان کی نیت کی اس صفائی کو دیکھتے ہوئے قدرت بھی ان کی ایسی خطائیں، لغزشیں اور غلطیاں معاف کر دیتی ہے جو سہواً یا اتفاقاً ان سے سرزد ہو جاتی ہیں۔

③ **معانی** : قلندرانہ: قلندر کی طرح کی، قلندر وہ شخص ہوتا ہے جو غیر اللہ سے ہر تعلق ختم کر کے صرف خدا کی ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور خدا کے بھروسے پر جو کچھ اس کے جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے۔ ادا: طرز عمل۔ جلال: دبدبہ، شوکت۔ امت: قوم۔ برہنہ: ننگی۔ شمشیر: تلوار۔

مطلب: زندہ قوموں کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ ان کے افراد اپنے طرز عمل میں اور اپنے رویہ میں قلندر جیسا بے نیازانہ حسن رکھتے ہیں۔ وہ ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اپنی اور اپنی قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی شوکت اور دبدبے کی دھاک اسی طرح اہل عالم پر بیٹھ جاتی ہے

جس طرح قدیم یونان کے بادشاہ سکندر اعظم نے اپنے وقت میں دنیا والوں پر بٹھائی تھی۔ مراد ہے ان میں جمال اور جلال دونوں رخ موجود ہوتے ہیں۔ وہ امن کے زمانے میں اور آپس میں سلوک کے حساب سے سراپا حسن ہوتے ہیں۔ نرمی اور ملائمت سے کام لیتے ہیں۔ جب مخالفوں اور دشمنوں پر رعب بٹھانے کا وقت آئے تو وہ سکندر کی طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسی قومیں جن کے افراد کی دو صفات کا ابھی ذکر کیا گیا ہے دنیا میں ننگی تلوار کی مانند ہوتی ہیں۔ ان کی آزادی اور ترقی کے راستے میں جو رکاوٹ بھی آتی ہے اسے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتی رہتی ہیں۔

④ **معانی: خودی:** اپنی پہچان۔ **مرد خود آگاہ:** اپنی پہچان کر چکنے والا آدمی۔ **جمال:** حسن۔ **جلال:** شوکت' دبدبہ۔ **تفسیر:** شرح۔

مطلب: اس شعر میں اقبال اپنے کلام کے بنیادی مضمون خودی کی طرف آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب آدمی اپنی پہچان کر کے اور اپنے جوہر بنیادی کو بروئے کار لا کر اپنی صلاحیتوں اور مقام سے آگاہ ہو جاتا ہے تو اس میں جمال (حسن) اور جلال (شوکت' دبدبہ) کی شانیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حسن سے مراد یہاں چہرے کا حسن نہیں بلکہ شخصیت اور کردار کا حسن ہے۔ شوکت اور دبدبہ سے بھی مراد مال و دولت اور دنیاوی جاہ و حشم کا رعب نہیں ہے بلکہ درویشی' فقر اور ایمان کی وہ شوکت ہے جس کے آگے ہر شوکت ہیچ ہے اور یہ شان و شکوہ غریبی میں بھی ہوتا ہے اور امیری میں بھی۔ غریبی میں یہ اللہ کے سوا ہر کسی سے بے نیازی اور امیری میں فقیری رویہ زندگی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ خودی ایک کتاب کی مانند ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی شرح ہے۔ خودی ہو گی تو آدمی میں وہ حسن اور وہ شوکت پیدا ہو گی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اگر یہ نہیں تو چہرے کا اڑ جانے والا رنگ اور حسن اور اقتدار عہدہ اور مال و دولت کا جھوٹا دبدبہ تو آدمی میں ہو سکتا ہے اصل حسن اور اصل شوکت جس سے آدمی میں شان آدمیت پیدا ہوتی ہے اور جس سے اس کا شرف قائم رہتا ہے اس میں نہیں ہوتی۔ اپنے اندر اس دو رخی شان کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو اپنی معرفت حاصل ہو۔ اسے اپنی پہچان ہو جائے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ اپنے آپ سے آگاہ ہونے والا ایسا شخص حقیقی مرد ہوتا ہے ورنہ وہ جنس کے اعتبار سے تو مرد ہو سکتا ہے' حقیقت میں مخنث سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

⑤ **معانی: شکوہ:** شان' شوکت' دبدبہ۔ **عید:** مسلمانوں کا مذہبی تہوار جو روزوں کے اختتام اور حج کی ادائیگی کے موقع پر دو دفعہ آتا ہے۔ **قبول:** مقبول ہونا۔ **حق:** خدا۔ **فقط:** صرف۔ **مرد حر:** آزاد مرد۔ **تکبیر:** نعرہ اللہ اکبر۔

مطلب: اس شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ دوسری اقوام جو اس وقت روئے زمین پر غلبہ رکھتی ہیں اس وجہ سے سربلند ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں انہوں نے علم تسخیر کائنات اور اجتماع قوت و کردار کے سبب شان اور شکوہ پیدا کر لیا ہے۔ لیکن مسلمان قوم نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اس لئے وہ مغلوب ہے۔ حالانکہ قرآن کا وعدہ ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تم ہی دوسروں پر فوقیت رکھو گے۔ تم ہی اعلیٰ ہو گے۔ مسلمان کے اعلیٰ اور فوق نہ ہونے سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ نام کا مسلمان ہے اور اس میں ایمان کا وہ جذبہ نہیں جو اسے مومن بنا کر دنیا میں فوق بنا سکتا ہے۔ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہم عید اور حج کے موقع پر بہت بڑا اجتماع کر لیتے' رنگ برنگ کے کپڑے پہن لینے اور قربانی کے بکرے ذبح کرنے کو اپنی شان

سمجھتے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں بے شک یہ بھی اظہار شان کا ایک طریقہ ہے لیکن اگر مسلمان آزاد نہ ہو اور ہر شعبہ زندگی میں دوسروں کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہو تو پھر یہ شان جھوٹی اور باطل ہے۔ ایسے موقعوں پر یا کسی اور مناسب وقت میں تکبیر کے نعرے لگانا کہ اللہ سب سے بڑا ہے خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں کیونکہ اگر اللہ ہی واقعی ہر شے سے بڑا ہے تو پھر اے مرد مسلمان تو نے دوسروں کی آقائیت کو کیوں تسلیم کر رکھا ہے۔ تو کس لئے غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیوں خدا کو چھوڑ کر غیر خدا کا محتاج ہے۔ کیوں اللہ کی بجائے نفس کے بتوں کے آگے جھکا ہوا ہے۔ تیری نماز' تیری اذان' تیرے حج' تیری عید' تیرے جلسے اور تیرے جلوس میں یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ اللہ اکبر ہے محض نمائشی ہے رسمی ہے۔ جس دن واقعی تو نے اللہ کو اکبر تسلیم کر لیا تو اپنے اسلاف کی طرح تو دنیا میں پھر سربلند ہو جائے گا۔

⑥ **معانی :** **حکیم** : حکمت والا' عقل والا' فلسفی۔ **میری نوا** : میری آواز' میری شاعری۔ **راز** : بھید۔ **کیا جانے** : نہیں جان سکتا۔ **ورائے عقل** : عقل سے اوپر۔ **اہل جنوں** : جنوں والے۔ **تدبیر** : منصوبہ' کوشش۔

مطلب : میں نے اپنی شاعری کے ذریعے جو صدا بلند کی ہے جو پیغام خصوصاً وہ پیغام جس کا ذکر مندرجہ بالا اشعار میں ہے مسلمانوں کو خصوصاً اور اہل دنیا کو عموماً دیا ہے اس کی حقیقت کو عقل پرست یا روشن دماغ والے نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ میری باتوں اور پیغام کی تفہیم (سمجھنے) کا تعلق شدت عشق سے ہے اور جو بات عشق کہتا اور سمجھتا ہے اس کو عقل نہ کہہ سکتی ہے اور نہ سمجھ سکتی ہے۔ عشق سے مراد وہ عشق نہیں جس میں ہوس اور جنس ہوتی ہے۔ بلکہ یہ اس سے الگ ایک جذبہ ہے جس کے تحت عاشق اپنی مرضی کو اپنے سے برتر ہستی کی مرضی میں گم کر دیتا ہے اور اپنے قول و فعل' حرکات و سکنات فکر و عمل وغیرہ میں اس برتر ہستی کو کارفرما پاتا ہے اور اس کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہ ہستی اللہ کی ذات' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان اور ان کی صفات کے آئینہ دار کسی مرشد' پیر یا ولی کی ذات ہوتی ہے۔ علامہ کے کلام میں اس عشق سے مراد عموماً عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے۔ یہی عشق جب اتنی شدت اختیار کر لے کہ عاشق کو ہمہ وقت اپنے محبوب کی لگن لگی رہے اور یہ دھن اس پر اس طرح سوار ہو کہ اس سے سوا اسے کچھ سوجھے ہی نہیں جنوں کہلاتا ہے۔

(14)

چہ کافرانہ قمارِ حیات می بازی ۔۔۔ کہ با زمانہ بسازی بخود نمی سازی
دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم ۔۔۔ دلِ جنید و نگاہ غزالی و رازی
بحکمِ مفتیِ اعظم کہ فطرتِ ازلیست ۔۔۔ بدینِ صعوہ حرام است کارِ شہبازی
ہماں فقیہِ ازل گفت جرہ شاہیں را ۔۔۔ باسماں گروی یا زمیں نہ پروازی
منم کہ توبہ نہ کردم ز فاش گوئی ہا ۔۔۔ ز بیم ایں کہ بسلطاں کنند غمازی
بدستِ ما نہ سمرقند و نے بخارا ایست ۔۔۔ دعا بگو ز فقیراں بہ ترک شیرازی

① **معانی** : چہ : کیا۔ **کافرانہ** : کافروں کی طرح۔ **قمار حیات** : زندگی کا جوا۔ **می بازی** : کھیلتا ہے۔ **بازمانہ** :

زمانے کے ساتھ۔ **بسازی:** بنا کر رکھتا ہے۔ **بخود:** اپنے آپ سے۔ **نمی سازی:** بنا کر نہیں رکھتا۔

مطلب: اے مسلمان تو زندگی کا جو اکس کافرانہ انداز میں کھیل رہا ہے۔ تو زمانے کے ساتھ تو بنا کر رکھتا ہے لیکن اپنے ساتھ بنا کر نہیں رکھتا۔ دنیا میں گم ہو کر رہ جانا تو کافروں کا انداز زندگی ہے مسلمان کو تو خود میں گم ہو کر اور اپنی پہچان کر کے دنیا کو اپنے اندر گم کر لینے کا انداز اپنانا چاہیے۔ دنیا تو مومن کی غلام ہوتی ہے۔ نہ کہ آقا۔

② **معانی:** دگر: دوبارہ' اب۔ **بمدرسہ ہائے حرم:** حرم کے مدرسے میں۔ **نمی بینم:** میں نہیں دیکھ رہا۔ **جنید:** مشہور مسلمان ولی گزرے ہیں جنہوں نے 910ء میں بغداد میں وفات پائی ہے۔ **غزالی اور رازی:** قدیم زمانے کے دو مشہور مسلمان فلسفی۔ غزالی کا سن وفات 505ھ اور رازی کا 906ھ ہے۔

مطلب: ایک وقت تھا کہ مسلمانوں میں حضرت جنید بغدادی" جیسے عظیم المرتبت صوفی اور ولی اور امام رازی اور امام غزالی جیسے مشہور متکلم' حکیم اور فلسفی پیدا ہوتے تھے جو مسلمانوں کی باطنی اور ظاہری زندگیوں میں اسلام کی روح پھونکتے رہتے تھے۔ ان کے ذہن و قلب دونوں کو اسلامی افکار و جذبات سے منقش و منور کرتے رہتے تھے لیکن ان کے بعد خصوصاً عہد حاضر میں ہم اسلامی مدرسے اور خانقاہیں تو دیکھتے ہیں مگر ان سے ان جیسے یعنی جنید، غزالی اور رازی لوگ پیدا نہیں ہو رہے ۔

③ **معانی:** **بحکم:** حکم سے۔ **مفتی اعظم:** بڑا مفتی۔ **فطرت ازیست:** ازلی فطرت ہے۔ **بدین صلوہ:** صلوہ کے دین میں۔ **صلوہ:** ممولہ چڑیا۔ **حرام:** ناجائز۔ **ازل:** شروع زمانہ۔ **است:** ہے۔ **فطرت:** قدرت یا ضابطہ قوانین الہیہ۔ **دین:** مذہب' ضابطہ حیات۔

مطلب: قدرت کے مفتی اعظم (بڑے مفتی) کا یہ فتویٰ ہے کہ قدرت کے قوانین میں ازل سے (ہمیشہ سے) یہ بات موجود ہے کہ ممولہ کے ضابطہ حیات میں شہباز کے سے کام اختیار کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ لیکن مرد مسلمان یہ فتویٰ تسلیم نہیں کرتا۔ قدرت کے قوانین میں بے شک ممولے کو ہمیشہ کمزور اور شہباز کو ہمیشہ طاقت ور اور ممولے کو ہمیشہ شکار اور شہباز کو ہمیشہ شکاری مانا جاتا ہے لیکن مومن جو قدرت کا غلام نہیں بلکہ قدرت اس کی غلام ہے۔ اس کو تسلیم نہیں کرتا وہ کبھی ممولہ بن کر شہباز کا شکار نہیں بن سکتا۔ بلکہ اگر کہیں ایسا موقع آیا بھی ہے کہ کسی وجہ سے وہ دنیاوی ساز و سامان کے لحاظ سے کمزور ہو گیا ہے تو وہ ایمان کی قوت کے بل بوتے پر طاقت وروں سے ٹکرا گیا ہے اور اپنے شکاری کو شکار کر گیا ہے۔ دنیاوی طاقت کا بھروسہ کافر کو ہوتا ہے لیکن مومن کو اپنے ایمان پر یقین ہوتا ہے اور اس جذبہ کے تحت وہ بے تیغ بھی لڑ جاتا ہے۔

④ **معانی:** **ہماں:** اسی طرح۔ **فقیہہ ازل:** ازل کے فقیہہ نے' قدرت کے ان قوانین کے قانون دان نے۔ **گفت:** کہا۔ **جرہ شاہیں:** باز کی ایک قسم۔ **را:** کو۔ **باسماں:** آسمان پر۔ **گردی:** گھوم رہا ہے۔ **با زمیں:** زمین پر۔ **نہ پردازی:** نہیں اڑتا' زمین سے بنا کر نہیں رکھتا۔

مطلب: جس طرح قوانین قدرت کے مفتی کا یہ فتویٰ ہے کہ ممولہ کو باز کے شکار کے طور پر پیدا کیا گیا ہے اسی طرح قدرت کی فقہ میں (قوانین کی کتاب میں) ازل کے فقیہہ (فقہ کے مسائل و قوانین جاننے والے) نے یہ بات بھی لکھ دی ہے کہ اعلیٰ درجہ کے باز کا کام صرف آسمانوں پر اڑتے رہنا اور فضا میں

کمزور پرندوں کا شکار کرتا ہے نہ کہ زمین پر اتر کر ان کا شکار کرتا یا گدھوں کی طرح آ کر مردار کھانا ہے اس میں بھی مسلمان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ تو بھی اعلیٰ شاہین کی طرح اپنے زور بازو سے کمایا ہوا طیب اور حلال رزق کھا نہ کہ دوسروں کا محتاج ہو کر گدھوں اور گیدڑوں جیسی حرام اور مردار خوراک سے پیٹ بھر۔ ایسا کرنا تیرے شاہین کی طرح آزاد فضا میں سانس لینے اور کسی دوسرے کا محتاج نہ ہونے کے لئے ضروری ہے۔

⑤ **معانی**: **منم**: میں وہ ہوں۔ **توبہ نہ کردم**: میں نے توبہ نہیں کی۔ **کردم**: میں نے نہیں کی۔ **فاش گوئی**: کھل کر اور صاف صاف بات کرنا۔ **ز**: سے۔ **بہ بیم**: ڈر سے۔ **بہ**: سے۔ **بیم**: ڈر۔ **ایں**: یہ۔ **بہ سلطاں**: بادشاہ سے۔ **کنند**: کریں گے۔ **غمازی**: چغل خوری۔

مطلب: میں نے اس ڈر سے کہ لوگ بادشاہ وقت سے میری چغلی کھائیں گے صاف صاف اور کھل کر حق کی بات کہنا نہیں چھوڑی اور جابروں اور ظالموں کے سامنے کلمہ حق کہنے سے گریز نہیں کیا لوگوں نے مجھے کہا کہ سچائی کا یہ رویہ اختیار نہ کرو لیکن میں باز نہیں آیا اور اپنی شاعری میں بھرپور انداز سے اور بے خوف ہو کر مسلمان کو باطل کی قوت کے خلاف ڈٹ جانے کے لئے کہتا رہا۔

⑥ **معانی**: **بدست ما**: ہمارے ہاتھ میں۔ **دست**: ہاتھ۔ **ما**: ہمارے۔ **نے**: نہ۔ **ایست**: ہے۔ **سمرقند و بخارا**: وسطی ایشیا کے دو شہر۔ **بگو**: کہہ۔ **ز**: سے۔ **فقیراں** فقر کی جمع وہ جو کچھ بنیادی سامان نہیں رکھتا۔ **بہ**: سے۔ **بہ ترک شیرازی**: شیراز کے ترک سے۔ شیراز ایران کا ایک شہر' ترک' سے کنایہ ہے معشوق کی طرف۔

مطلب: خواجہ حافظ شیرازی نے جو فارسی کے ایک مشہور شاعر گزرے ہیں اپنے ایک شعر میں کہا تھا کہ اگر شیراز کا ترک (معشوق) میرے دل کو قبضہ میں کر لے تو میں اس کے سیاہ تل کے بدلے میں اسے سمرقند اور بخارا کے شہر بخش دوں گا یا اس کے صدقے میں خیرات کر دوں گا۔ علامہ اقبال نے اس شعر کے مضمون سے یہ مضمون نکالا ہے کہ اگرچہ میرے ہاتھ میں سمرقند اور بخارا جیسے شہر نہیں ہیں کہ میں اپنے معشوق کو دے دوں یا اس پر سے قربان کر دوں۔ میں تو ایک فقیر آدمی ہوں جس کے پاس بوریا اور گدڑی بھی نہیں ہے۔ میں تو اس کے حق میں صرف دعا کر سکتا ہوں۔ اگر معشوق سے مراد مسلمان قوم لی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ پھر سے مسلمان قوم کو سرفرازی عطا کرے۔ اور وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر پہلے کی طرح پھر سے دنیا پر حکمران ہو جائے۔

(15)

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ' ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ' یہاں بدلتا نہیں زمانہ

کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا باندازِ محرمانہ
سکندری ہو' قلندری ہو' یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی
انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے' فضائے گردوں ہے بے کرانہ

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

ی اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رلایا ۔ کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

① **معانی: ضمیر:** دل' ذہنیت۔ **تاجرانہ:** تجارت کرنے والوں کی طرح کی۔ **راہبانہ:** راہبوں کی طرح کی' ترک دنیا کی۔ **دگرگوں:** بدل جانا۔ **لحظہ لحظہ:** لمحہ لمحہ۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے ملّا ضیغم کی زبان سے عہد حاضر کی اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ مغرب (یورپ) والوں کی ذہنیت تاجروں کی سی ہے جو ہر وقت دولت کمانے میں لگے رہتے ہیں اور اس کے لئے خدا کو بھول کر دنیا کو پورے طور پر گلے لگائے ہوئے۔ ان کے برعکس مشرق والے دنیا کو ترک کر کے بے بسی اور بے کسی کی زندگی گزارنے پر آمادہ ہیں۔ دنیا سے دلچسپی کی بنا پر یورپ والے ہر لحہ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کا ہر دوسرا لحہ پہلے لمحے سے بہتر ہوتا ہے لیکن مشرق والوں پر جمود طاری ہے وہ جس بدحالی میں ہیں اس سے نکلنے کی نہیں سوچتے۔ علامہ کا یہاں یہ بھی مقصود ہے کہ جب مغرب والے دنیا کے اور مشرق والے ترک دنیا کے بتوں کے پجاری بنے ہوئے ہیں تو دونوں کی زندگیاں قوانین الٰہیہ کے خلاف ہیں۔ پہلے مادہ پرست اور دوسرے رہبانیت پرست بن گئے ہیں۔ اے مسلمان اصل ضابطہ حیات تیرے پاس ہے جس میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی کے طریقے موجود ہیں۔ مسلمان نہ دنیا کو اپنے اوپر مسلط کرتا ہے اور نہ دنیا سے کنارہ کش ہوتا ہے بلکہ دنیا کو اپنے دین کے تابع رکھ کر زندگی گزارتا ہے اور یہی مقصود فطرت اور منشائے اسلام ہے جو کہ فطری مذہب ہے۔

② **معانی: کنار دریا:** دریا کے کنارے۔ **خضر:** اللہ کا ایک زندہ ولی جو بیابانوں دریاؤں اور سمندروں میں رہتا ہے اور بھولے بھٹکوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ **باندازِ محرمانہ:** دوستانہ طریقے سے۔ **سکندری:** سکندر کی طرح کی طاقت کا ہونا' سکندر یونان کا مشہور فاتح تھا۔ **قلندری:** قلندر کی طرح کی دنیا سے بے نیازی۔ **ساحرانہ:** جادوگری کے۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے سکندری اور قلندری کو اصل مفہوم کی بجائے کنائے کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ سکندری (بادشاہت) اور قلندری (روحانیت) دونوں جادوگری کے طریقے ہیں جن کے ذریعے بادشاہ اور درویش بھولے بھالے اور سادہ دل بندگان خدا کو اپنے اپنے فریب میں مبتلا کر کے ان کو غلامی اور مسکینی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں درویشوں سے مراد دنیا کو ترک دینے والے درویش ہیں۔ اقبال نے اس شعر میں بزبان ملّا ضیغم شاعرانہ انداز میں بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات مجھے باطن کا علم رکھنے والے ولی خضر نے دریا کے کنارے ایک ملاقات میں بتائی ہے۔ اس لئے جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سچ اور حقیقت ہے۔

③ **معانی: حریف:** مدمقابل' دشمن۔ **خدایانِ خانقاہی:** خانقاہ کے خدا' مزاروں کے گدی نشین۔ **شق:** ٹوٹ جائے۔ **سنگ آستانہ:** دہلیز کا پتھر۔

مطلب: وہ لوگ جو خانقاہوں' مزاروں اور درگاہوں پر اپنے بزرگوں کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں اور روحانی' اخلاقی اور انسانی ہر اعتبار سے نااہل ہیں۔ وہ اپنے مریدوں کو راہ ہدایت پر رکھنے اور اللہ سے وابستہ کرنے کی بجائے ان کو لوٹ رہے ہیں۔ پیری اور مریدی کو انہوں نے پیشہ بنا رکھا ہے وہ اپنے بزرگوں کی روحانی وراثت کے بالکل اہل نہیں ہیں۔ میں چونکہ یہ حقیقت بھولے بھالے اور سادہ دل

مسلمانوں پر واضح کر رہا ہوں اور ان کو ان نااہل گدی نشینوں اور جاہل پیروں کے فریب کے جال میں آنے سے روک رہا ہوں۔ اس لئے آج کے پیر اور گدی نشین مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ میرے پیغام کی وجہ سے ان کی دہلیز کا پتھر (جس پر لوگ عقیدت سے سر رکھتے ہیں) ریزہ ریزہ نہ ہو جائے مراد ہے ان کی جھوٹی پیری کا پول نہ کھل جائے اور اس طرح ان کے عقیدت مند ان سے باغی نہ ہو جائیں اور انہیں اپنی لوٹ کھسوٹ اور جھوٹی عزت و جاہ سے محروم نہ ہونا پڑے اور اس طرح ان کی عیش و عشرت کی زندگی میں خلل نہ آ جائے۔

④ **معانی : علم و عرفاں:** ظاہری علم اور باطنی علم۔ **رمز آشکارا:** صاف جانے آنے والا بھید یا باریک بات۔ **گردوں:** آسماں۔ **بے کرانہ:** جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

مطلب: غلام قوموں کے علم ظاہری (دنیاوی علم) اور علم باطنی (روحانی علم) کا یہ بھید کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لیتی ہیں کہ اگر ہمیں دنیاوی حکومت اور سرفرازی حاصل نہیں ہے تو کیا ہوا آسمان کی فضا تو ایسی ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ اس میں زندگی بسر کر لیں گے۔ وہ خیالی پلاؤ پکا کر اپنی محکومی کا جواز نکال لیتی ہیں۔ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ غلام قومیں دنیا کی حکمرانی اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے دنیاوی فوائد کے حصول کی بجائے یہ کہہ کر اپنی تسکین کر لیتی ہیں کہ ظاہری دنیا نہ سہی روحانی دنیا ہی سہی۔ ہم ادھر خود کو مشغول کر لیں گے اور اس طرح وہ تارک الدنیا ہو کر گزر اوقات کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین بنا لیتی ہیں۔

⑤ **معانی : خبر نہیں:** معلوم نہیں۔ **خدا فریبی:** خدا کو فریب دینا۔ **خود فریبی:** اپنے آپ کو فریب دینا۔ **فارغ ہونا:** الگ ہو جانا۔ **تقدیر:** قسمت۔

مطلب: عہد حاضر کے مسلمانوں میں تقدیر (قسمت، نصیب) کا یہ غلط مفہوم پیدا ہو چکا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ خدا نے ان کی قسمت میں پہلے سے لکھ دیا ہے۔ اس لئے ہمیں کوشش اور عمل سے اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو وہ خود ہی اسے بدل دے گا۔ اس غلط عقیدہ کی وجہ سے وہ عمل سے کنارہ کش ہو چکا ہے۔ اب میں اس عقیدے کا کیا نام رکھوں۔ اسے اپنے آپ کو فریب دینے والا عقیدہ کہوں یا خدا کو فریب دینے والا عقیدہ کہوں اصل میں یہ دونوں کو فریب دے رہے ہیں۔ خدا کو اس کی پیدا کردہ تقدیر کا غلط مفہوم دے کر اور خود کو اس بنا پر بے عملی سے دوچار کر کے۔

⑥ **معانی : اسیری:** قید۔ **شاخ گل:** پھول کی ٹہنی۔ **صیاد:** شکاری۔ **پرسوز نغمہ خواں:** جس کے نغموں میں سوز ہو، حرارت ہو۔ **گراں:** بھاری۔ **آشیانہ:** گھونسلہ، نشیمن۔

مطلب: اس شعر میں باغ اور اس سے متعلقات چند علامات کے ذریعے شاعر نے اپنا مطلب واضح کیا ہے اور کہا ہے کہ شکاری نے مجھ بلبل کو گلاب کی ٹہنی سے پکڑ کر جب پنجرے میں قید کر لیا تو گلاب کے پھولوں نے قید کرنے والے کو یہ کہہ کر رلا دیا کہ اس بلبل کا گھونسلہ ہماری ٹہنی پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ مراد ہے کہ جب قوم کے راہنما کو اس کی حق گوئی پر حکومت وقت گرفتار کر لیتی ہے تو اس قوم کے لوگ واویلا کرتے ہیں جس کا نتیجہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ حکومت خود بھی اس کو رہا کرنے پر سوچنے لگتی ہے۔ اس میں کشمیر میں ڈوگرہ راج کے خلاف جدوجہد کرنے والوں اور ان کے راہنماؤں کی پکڑ دھکڑ اور پھر بعض

اوقات رعایا کے مطالبہ پر اس کو خوش کرنے کے لئے حکومت کے ان کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

(16)

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی — تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا — دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا — دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ
امید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی — رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ

① **معانی :** حاجت : ضرورت۔ خطہ گل : پھولوں کا علاقہ ' وادی کشمیر مراد ہے۔ پرخوں : خون سے بھرا ہوا۔ لالہ : لالے کا پھول جو خون کے رنگ کی طرح سرخ ہوتا ہے۔

مطلب : ریاست کشمیر میں ہندو ڈوگرہ راج نے مسلمانوں کو جس بدحالی سے دوچار کر رکھا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اے میرے پھولوں سے سجے ہوئے علاقے تجھے اپنی داستان بیان کرنے اور اس داستان کی تفصیل سے مجھے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے ہی واقف ہوں۔ اور تیری بدحالی اور زبوں حالی دیکھ کر اور سن کر میرا دل لالے کے پھول کی طرح خون سے بھرا ہوا ہے۔ مجھ پر انتہائی غم اور بے چینی کی حالت طاری ہے۔

② **معانی :** تقدیر : قسمت۔ مکافات عمل : عمل کا بدلہ۔ خدایان ہمالہ : ہمالہ کے آقا۔ ہمالہ : برصغیر کے شمال میں ایک بلند پہاڑ کا نام۔

مطلب : خدایان ہمالہ سے ایک تو مراد وہ رشی ' سادھو وغیرہ ہیں جو ہمالہ کے پہاڑوں میں رہتے ہیں اور ہندو ان کو اپنے روحانی پیشوا سمجھتے ہیں۔ دوسری مراد کشمیر کے حکمرانوں سے ہے جو ہندو دھرم سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ کشمیر کا علاقہ چونکہ ہمالہ پہاڑ کے سلسلے میں واقع ہے اس لئے خدایان ہمالہ سے مراد کشمیر کے حکمران بھی ہو سکتے ہیں۔ دونوں کا تعلق تقدیر کے ہندووانہ تصور سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آدمی کی تقدیر اس کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔ اس عقیدہ کے تحت ہندو دھرم کے راہنما یا کشمیر کا ہندو راجہ دونوں کشمیر کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر عمل سے بے گانہ رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اگر وہ غلام ہیں ' پس ماندہ اور بدحال ہیں تو یہ ان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے اور چونکہ جیسی کرنی ویسی بھرنی ایک اٹل اصول ہے اس لئے تم اپنی مجبور اور غلام زندگی پر قناعت کرو۔

③ **معانی :** سرما : سردی۔ عریاں : ننگا۔ دوشالہ : ایک قسم کی اونی چادر یا کمبل۔

مطلب : اس شعر میں شاعر نے کشمیری مسلمانوں کی اس غربت اور بدحالی کی طرف اشارہ کیا ہے جو کشمیر کے ہندو حکمرانوں کے کشمیر کے جملہ وسائل کو اپنی اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے استعمال کرنے اور کشمیریوں کو ان سے محروم رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ بدحالی کی سینکڑوں مثالوں میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ وہ کشمیری ہنرمند جو گرم چادریں اور اونی کمبل تیار کرتا ہے وہ امیروں کے تن

ڈھانپنے کے کام آتے ہیں اور وہ خود اس قابل نہیں ہوتا ہے کہ سخت سردی کے موسم میں اپنے اور اپنے بچوں کے لئے سردی سے بچنے کے لئے گرم کپڑے مہیا کر سکے۔

④ **معانی**: وفا: دوستی رکھنا۔ رم: دوڑنا۔ **طبیعت**: افتاد، مزاج۔ **غزالہ**: ہرن کی طرح کا۔

مطلب: یہاں شاعر ایک اصول بیان کرتا ہے کہ دولت ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ جس طرح ہرن آدمی کو یا شکاری کو دیکھ کر بھاگ نکلتا ہے اس طرح دولت بھی بعض ناساز گار حالات پیدا ہو جانے پر آدمی سے چلی جاتی ہے۔ دنیا اور اس کی دولت کسی سے مستقل دوستی نہیں رکھتی اس لئے اے کشمیری مسلمان ناامید نہ ہو اگر آج تو اپنے حکمرانوں کی وجہ سے بدحالی کا شکار ہے تو کل حکمران بدحال ہو سکتے ہیں اور حکومت و دولت تیرے پاس آ سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ تو اس بات پر یقین رکھے اور اپنی حالت بدلنے کی کوشش کرے۔

(17)

خود آگاہی نے سکھلا دی ہے جس کو تن فراموشی ‏ ‏ ‏ حرام آئی ہے اس مردِ مجاہد پر زرہ پوشی

① **معانی**: **خود آگاہی**: خود سے آگاہ ہونا، اپنی معرفت حاصل کر لینا۔ **تن فراموشی**: جسم کو بھول جانا۔ حرام: ناجائز۔ **مردِ مجاہد**: جہاد کرنے والا مرد۔ **زرہ پوشی**: لوہے کا لباس جو جنگ کے وقت سپاہی پہنتے ہیں

مطلب: وہ مردِ مسلمان جو اپنی معرفت حاصل کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کا جسم اس کا اپنا نہیں بلکہ اس ہستی کا ہے جس کی صفات کا وہ مظہر ہے تو پھر وہ تن کو بچانے کی فکر کی بجائے اسے اس کے اصل مالک کی رضا اور خوشنودی کے لئے اس پر قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے اسباب کے ہونے کو بھی نہیں دیکھتا۔ وقت آنے پر بے تیغ بھی لڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے جسم کو بچانے کے لئے زرہ (لوہے کے لباس) سے بھی کام نہیں لیتا کیونکہ اسے جسم کی نہیں اللہ کی رضا کی فکر ہوتی ہے۔

(18)

آں عزمِ بلند آور آں سوزِ جگر آور ‏ ‏ ‏ شمشیرِ پدر خواہی بازوئے پدر آور

① **معانی**: آں: وہ۔ **عزمِ بلند**: بلند ارادہ۔ آور: لا۔ **سوزِ جگر**: جگر کی حرارت۔ **شمشیرِ پدر**: باپ کی تلوار۔ پدر: باپ۔ **خواہی**: تو چاہتا ہے۔ **بازوئے پدر**: باپ کا بازو۔

مطلب: اس شعر میں علامہ نے بزبان ملاّ ضیغم کشمیر کے غلام مسلمانوں کو آزاد رہنے کا ایک گر بتایا ہے اور کہا ہے کہ اگر تم اپنے باپ کی تلوار چاہتے ہو تو اپنے باپ کا سا مضبوط بازو، بلند ارادہ اور حرارت جگر بھی پیدا کرو۔ اپنے آبا و اجداد کی مانند آزاد زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تم میں آزادی حاصل کرنے کا بلند ارادہ پیدا ہو پھر اس بلند ارادے کو عملی شکل دینے کے لئے تم میں تپش، اور عشق کا جذبہ کارفرما ہو۔

جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے گی تو پھر تم اس قابل ہو سکو گے کہ اپنے باپ دادا کی طرح جہاد کر کے اور تلوار کو قوت کے ذریعے اپنی قسمت بدل ڈالو اور غلامی کی زنجیریں کاٹ کر آزاد ہو جاؤ۔ محض خالی نعروں تقریروں، جلسوں، جلوسوں اور مطالبوں سے تیرا آزاد ہونا ممکن نہیں۔

(19)

غریبِ شہر ہوں میں، سن تو لے مری فریاد
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز
جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ بر سنگ میخورد دگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

صدائے تیشہ: یہ شعر مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمتہ کے مشہور بیاض خریطۂ جواہر میں ہے۔

① **معانی:** غریب شہر: شہر میں اجنبی۔ فریاد: نالہ، آہ و زاری۔ قیامتیں آباد ہونا: انتہائی اضطراب پیدا ہونا۔

مطلب: اس شعر میں ملاّ ضیغم لولابی کی زبان سے علامہ اقبال نے اہل کشمیر کو یہ کہا ہے کہ میں تمہارے لئے اجنبی ہوں۔ اجنبی اس اعتبار سے کہ میرے آباء و اجداد مدت ہوئی کشمیر سے نقل مکانی کر کے برصغیر کے شمالی صوبہ پنجاب میں آباد ہو گئے تھے اور میرا اب تعلق تمہیں کشمیر کی بجائے پنجاب سے نظر آئے گا لیکن میرا دل اب بھی تمہارے ساتھ دھڑکتا ہے۔ اس لئے تم میری نالہ کشی اور میری آہ و زاری سے جو میں اپنی شاعری کے ذریعے کر رہا ہوں اجنبی نہ رہو اس پر کان دھرو۔ اور دیکھو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جب تم میرے ان نالوں اور فریادوں پر کان دھرو گے جو میں نے اپنی شاعری کے ذریعے کی ہیں تو تمہارے سینے میں بھی وہ اضطراب پیدا ہو جائے گا جو میرے سینے میں ہے۔ اور اس طرح تم اپنی قسمت کو بدلنے اور آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کی آرزو کرنے لگو گے۔

② **معانی:** نوائے غم آلود: غم سے بھری ہوئی آواز۔ متاع عزیز: قیمتی دولت۔ دولت دل ناشاد: ایسے دل کی دولت جو غم زدہ ہو۔ جہاں: دنیا۔

مطلب: وہ دل جو اپنی بجائے دوسروں کا اور اپنی قوم کا غم کھاتا ہو دنیا میں عام نہیں ہے۔ وہ کسی کسی کے پاس ہوتا ہے۔ اللہ نے مجھے ایسا دل دیا ہے جو قوم کے غم سے بھرا ہوا ہے۔ اس دل سے جو آواز پیدا ہو رہی ہے اور جسے میں اپنی شاعری کی صورت میں تم تک پہنچا رہا ہوں بہت قیمتی دولت ہے۔ اے کشمیر کے مسلمان اسے سمیٹ لے۔ اور اس سے اپنے دل کی کیفیات بدل لے۔

③ **معانی:** گلہ: شکایت۔ زمانہ: دنیا، اہل دنیا۔ کور ذوقی: ذوق کا اندھا ہونا۔ محنت: سرگرمی، ریاضت۔ فرہاد: ایران کا ایک شخص جو شیریں نامی ایک عورت پر عاشق تھا۔ اس وقت کا بادشاہ پرویز بھی شیریں کو اپنے گھر ڈالنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے فرہاد کے خاتمے اور اس سے شیریں کو چھین لینے کی یہ تدبیر کی کہ اسے کہا کہ اگر تو پہاڑ سے جس کا نام بیستون تھا پانی کی نہر کھود کر لے آئے گا تو شیریں مل جائے گی۔ فرہاد نے اس وعدہ پر پہاڑ کھودنا

شروع کر دیا لیکن شیریں کی موت کی اس جھوٹی خبر کو سن کر جو پرویز نے اڑائی تھی وہ اپنے سر پر تیشہ مار کر مر گیا۔
اس طرح شیریں پرویز کی ہو گئی۔

مطلب: اپنی سالہاسال کی بہ زبان تلامیذم اپنی محنت کا پھل نہ پا کر جو علامہ نے اپنی شاعری کی صورت میں مسلمان قوم کو جگانے کے لئے کی تھی وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ مجھے دنیا والوں کے اندھے ذوق سے شکایت ہے۔ اگر ان میں ذوق ہوتا تو میری شاعری پر ضرور کان دھرتے۔ وہ تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے شاعری کے ذریعے جو مشقت اٹھائی ہے وہ بھی فرہاد کی طرح کی غرض مند ہے۔ حالانکہ فرہاد نے ایک عورت کو حاصل کرنے کے لئے اور نفسانی غرض کی خاطر محنت کی تھی۔ میری محنت میں تو غرض کی کوئی آلائش نہیں۔ اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ میں نے تو یہ سب کچھ ان کے مفاد کے لئے کیا ہے۔ لیکن وہ ہیں کہ اس پر کان نہیں دھر رہے۔ اگر کان دھرتے اور میرے پیغام پر عمل کرتے تو میں سمجھ لیتا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا ہے۔

④ **معانی:** صدائے تیشہ: ہتھوڑے کی آواز۔ تیشہ: ہتھوڑا۔ بر: پر۔ سنگ: پتھر۔ می خورد: لگتی ہے، کھاتی ہے۔ دگر: اور۔ است: ہے۔ خبر بگیر: معلوم ہو۔ آواز تیشہ و جگر: ہتھوڑے اور جگر کی آواز۔

مطلب: یہ شعر برصغیر کے مشہور فارسی شاعر اور نقشبندیہ بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا ہے جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد کی مغلیہ دور زوال کی دلی میں رہتے تھے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ وہ آواز جو ہتھوڑے کے پتھر پر پڑنے سے نکلتی ہے اور ہے اور جو جگر پر پڑنے سے نکلتی ہے وہ اور ہے۔ علامہ نے اس شعر کے مضمون کے حوالے سے کہا ہے کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تم فرہاد کی محنت کو اور میری محنت کو ایک جیسا سمجھتے ہو۔ فرہاد نے تو پتھر پر ضربیں لگائی تھیں میں جگر پر لگا رہا ہوں۔ فرہاد نے تو ایک عورت کے حصول کے لئے تیشہ چلایا تھا میں قوم کو جگانے کے لئے شعر کہہ رہا ہوں۔ اے کاش میری قوم اس فرق کو سمجھے اور میرے کلام اور اس میں دیئے گئے پیغام کی طرف دھیان دے۔

سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد دکن کے نام

"یوم اقبال" کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور 'تواضع' موصول ہونے پر

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

تعارف: دکن برصغیر کے جنوب میں دور انگریزی میں ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ جس کا نواب نظام الملک کہلاتا تھا۔ علامہ کے فوت ہونے کے چند ماہ پہلے جب پورے متحدہ ہندوستان میں یوم اقبال منایا گیا دکن کے صدر (یا وزیر اعظم حیدری نے ایک ہزار روپے کا چیک علامہ کو بھیجا تھا اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ یہ چیک میں نے ریاست کے سرکاری توشہ خانے سے اپنی ذاتی کوشش کے بعد بھجوایا ہے۔ علامہ نے یہ خط

پڑھ کر چیک واپس کر دیا اور اپنے تاثرات کو اس نظم میں قلم بند کیا۔

① **معانی : فرماں:** حکم۔ **شکوہ:** شوکت۔ **پرویز:** ایران کا ایک بادشاہ۔ **قلندر:** وہ درویش جو اللہ کے سوا ہر کسی سے بے نیاز ہو۔ **ملوکانہ صفات:** شاہانہ صفتیں۔

مطلب: یہ اللہ کا حکم تھا کہ ایران کے بادشاہ پرویز جیسا دبدبہ اور شوکت اس درویش کو عطا کیا جائے جو سب کے سوا ہر ایک سے بے نیاز ہے جو بہ ظاہر تو فقر و فاقہ میں مبتلا ہے لیکن بہ باطن اپنے اندر شاہانہ صفات رکھتا ہے۔ یہاں اس درویش سے مراد علامہ خود ہیں۔

② **معانی : شہنشاہی کر:** بادشاہوں اور امیروں کی طرح روپیہ خرچ کر۔ **حسن تدبیر:** منصوبہ کی خوبصورتی۔ **آنی:** جو لمحہ بھر کے لئے ہے۔ **فانی:** جو مٹ جانے والا ہے۔ **ثبات دے:** دوام بخش، ہمیشگی عطا کر۔

مطلب: خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ رقم میں جو بھیج رہا ہوں اسے اچھی منصوبہ بندی سے اگر خرچ کرو گے تو یہ تمہارے لئے وقتی فائدہ اور آسائش مہیا کرنے کے علاوہ کافی دیر تک کار آمد بھی ہوگا۔ اور تم اس سے امیروں اور بادشاہوں کی طرح کی عیش کی زندگی بسر کر سکو گے۔

③ **معانی : بار امانت:** امانت کا بوجھ۔ **سر دوش:** کندھے پر۔ **کام درویش:** درویش کے حلق، غریب کے منہ۔ **تلخ:** کڑوی۔ **مانند:** مثل۔ **نبات:** مصری، شکر۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں میں چونکہ درویش شخص ہوں اور غیروں کی کڑوی چیزوں کو شکر سمجھ کر حلق میں اتار لیتا ہوں اس لئے میرے لئے یہ بھی ممکن ہو سکتا تھا کہ میں یہ تلخ حقیقت بھی قبول کر لیتا اور بھیجے ہوئے چیک کو قبول کر لیتا لیکن سر اکبر حیدری کا یہ لکھنا کہ یہ رقم سرکاری خزانہ سے میری کوشش کی وجہ سے بھیجی جا رہی ہے مجھے پسند نہ آئی۔ اور میرے کندھوں نے احسان کے اس بوجھ کو برداشت نہیں کیا۔

④ **معانی : غیرت فقر:** فقر کی خودداری، فقر بمعنی درویشی۔ **خدائی:** حکومت، حکمرانی۔ **زکات:** ایک مذہبی اسلامی ٹیکس جو امیروں سے لے کر غریبوں کو دیا جاتا ہے، اصل تلفظ زکوٰۃ ہے۔

مطلب: علامہ کہتے ہیں سر اکبر حیدری کا اپنے خط میں یہ لکھنا کہ یہ رقم میری بطور صدر ریاست کوشش کی وجہ سے آپ کو بھیجی جا رہی ہے میرے لئے کسی امیر سے ضرورت مند اور غریب ہونے کے اعتبار سے زکوٰۃ لینے کے برابر تھی۔ اس لئے یہ میری درویشی کی خودداری کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ کیونکہ درویش تو فقر و فاقہ کی حالت میں بھی منعموں، امیروں اور شاہوں سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارتا ہے۔

حسین احمد

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

تعارف: ہندوستان مختلف زبانیں اور مذاہب رکھنے والے لوگوں کا ملک تھا۔ اس میں دو بڑی قومیں ہندو

اور مسلمان آباد تھیں۔ جب انڈین نیشنل کانگرس نے ہندوستان کی آزادی کا نعرہ لگایا تو ابتدا میں مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جس سے مسلمانوں کو خدشہ پیدا ہو گیا کہ ہندو اپنی بھاری اکثریت کی بنا پر ہمیشہ کے لئے حکمران رہیں گے اور مسلمان قوم انگریز کی بجائے ہندو کی غلامی میں آ جائے گی۔ چنانچہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ہندو اور مسلمان چونکہ دو الگ الگ قومیں ہیں اس لئے ان علاقوں اور صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں پاکستان کے نام سے ایک الگ آزاد مملکت قائم کی جائے۔ جس میں مسلمان اپنی مرضی اور اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ مسلمانوں کی ان جماعتوں نے جو اس وقت انڈین نیشنل کانگرس کا ساتھ دے رہی تھیں مسلم لیگ کے اس مطالبہ کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ اور کہا کہ یہ غلط ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ یہاں صرف ایک ہی متحدہ قوم بستی ہے جس کا نام ہندوستانی قوم ہے۔ ان جماعتوں نے جن میں جمعیتہ العلمائے ہند پیش پیش تھی مسلم لیگ کے تقسیم ہند کے مطالبہ کی سخت مخالفت کی اور متحدہ قومیت کا نعرہ لگا کر ہندوستان کو متحد رکھنے کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اسی جماعت کے علماء میں سے ایک کا نام مولانا حسین احمد مدنی تھا جو دیوبند (متحدہ ہندوستان کے ایک شہر) کے مدرسے میں شیخ الحدیث تھے۔ انہوں نے جب ایسی تقریریں شروع کیں جن میں مذہب کی بجائے وطن کو قوم کی بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ اور متحدہ قومیت کا پرچار کر کے پورے ہندوستان کی حکومت ہندو کانگرس کو دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا تو علامہ اقبال کو اس پر بڑا صدمہ پہنچا۔ اس وقت ان کے جو تاثرات تھے ان کو انہوں نے فارسی کے ان تین شعروں میں قلم بند کیا ہے۔

① **معانی : عجم**: وہ علاقہ (یا وہ لوگ) جو عربی نہیں ہے۔ عربوں کو دین کا نمائندہ سمجھا گیا ہے کیونکہ اسلام عرب سے ہر طرف پھیلا ہے۔ **ہنوز**: ابھی تک۔ **نہ داند**: نہیں جانتا۔ **رموز دیں**: دین اسلام کی رمزیں۔ **ز**: سے۔ **دیوبند**: متحدہ ہندوستان کے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کا ایک قصبہ جہاں ایک دینی مدرسہ تھا۔ **حسین احمد**: دیوبند کے دینی مدرسہ کے ایک عالم جو حدیث کا درس دیتے تھے۔ **ایں**: یہ۔ **چہ**: کیا۔ **بوالعجبی**: تعجب والی بات۔ **است**: ہے۔

مطلب: معلوم ہوتا ہے ملک عرب سے باہر کا علاقہ ابھی تک دین اسلام کی حقیقی رمز (بھید) کو نہیں پا سکا اگر پا چکا ہوتا تو دیوبند کے اسلامی مدرسے کے شیخ الحدیث حسین احمد مدنی یہ تعجب والی بات نہ کرتے کہ ملت کا تعلق وطن سے ہے مذہب سے نہیں۔ یہ ان کے منہ سے کیا حیران کن بات نکلی ہے۔

② **معانی : سرود**: گیت' دلکش تقریر۔ **بر سر منبر**: منبر پر سے۔ **بر سر**: سر پر' اوپر۔ **ملت**: مسلمان قوم۔ **از وطن**: وطن سے۔ **از**: سے۔ **است**: ہے۔ **چہ**: کیا' کتنا۔ **بے خبر**: بے علم۔ **زمقام محمدؐ عربی**: محمد عربیؐ کے مقام سے۔ **است**: ہے۔ **منبر**: مسجد میں لکڑی یا اینٹوں کی دو تین سیڑھیوں والی وہ جگہ جس پر کھڑے ہو کر خطیب خطبہ دیتا ہے۔ وعظ کرتا ہے۔

مطلب: مولانا حسین احمد مدنی نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر' جہاں سے حق کی آواز سربلند ہونی چاہیے تھی یہ باطلی تقریر بڑے دلکش انداز میں اور جھوم جھوم کر کی کہ مسلمان قوم کی قومیت کی بنیاد وطن ہے نہ کہ اس کا دین یا توحید الٰہی حالانکہ نہیں تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جہاں جہاں بھی کلمہ گو آباد ہیں وہ سب رنگ' نسل' وطن اور علاقہ کے اختلاف کے ایک وحدت یا ایک قوم ہیں لیکن انہوں نے وطن کو قومیت کا نظریہ قرار دے

کر یہ تسلیم کیا اور دوسروں کو تسلیم کرنے کے لئے کہا کہ ہر ملک کے مسلمان اپنے اپنے وطن کے اعتبار سے الگ الگ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بھی ہندوستانی قوم کا حصہ ہیں اس لئے انہیں ہندو کانگرس کا یہ نظریہ تسلیم کر لینا چاہئے کیونکہ یہاں کے مسلمان ہندوؤں سے الگ نہیں ہیں بلکہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کا جز ہیں۔ اس لئے انہیں اپنے لئے الگ وطن (پاکستان کے نام سے) حاصل کرنے کا مطالبہ چھوڑ دینا چاہئے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر حکومت اور ملک کا کاروبار چلانا چاہئے۔ اگر وہ اتنا سوچ لیتے کہ ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جو جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو گی اس میں ہندو 85 فیصد تک ہوں گے اور مسلمان صرف 15 فی صد۔ جس کے نتیجے میں ہندو اکثریت ہمیشہ کے لئے جملہ مسلمانوں پر چاہے وہ اقلیتی علاقوں سے تعلق رکھتے ہوں اور چاہے اکثریت کے علاقہ میں رہتے ہوں مسلط رہے گی۔

③ **معانی**: بہ: تک۔ **مصطفیٰ**: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ **برساں**: پہنچا۔ **خویش را**: اپنے آپ کو۔ **بولہبی**: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف' ان کا ایک چچا جس نے اپنی زندگی میں طرح طرح سے ان کو تنگ کیا اور اسلام کی بجائے مشرکانہ نظام کی حمایت کرتا رہا۔

مطلب: اس شعر میں علامہ مولانا حسین احمد مدنی کو اور جملہ مسلمانان عالم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اپنے آپ کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاؤ۔ مراد ہے اپنی زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ خفی ہو یا جلی ہو چاہے وہ ظاہر ہو یا باطن ہو سب میں قرآن و سنت کے ذریعے دئے گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام کو پیش نظر رکھو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے اور اس سے ہٹ کر فکر و عمل کی کوئی دنیا بساؤ گے تو چاہے وہ دنیاوی اعتبار سے اور ظاہراً کتنی ہی دلکش کیوں نظر نہ آتی ہو بولہب کی دنیا ہو گی۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا نہیں ہو گی۔ باطلی فضا رکھے گی حق کی فضا نہیں۔ مسلمان قوم کیا ہے اس کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے بھی ہمیں قدیم و جدید دنیا میں پیش کئے گئے مشرکانہ اور باطلی نظام ہائے فکر کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اس نظام فکر کو اختیار کرنا چاہئے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے رکھا ہے اور جس میں مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد جغرافیائی وطن یا علاقہ، زبان، رنگ، نسل، خون وغیرہ پر نہیں بلکہ کلمہ توحید پر رکھی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اللہ کی توحید اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرنے والا مسلمان چاہے رنگ' نسل' خون' زبان' وطن وغیرہ کے تعلق سے کہیں کیوں نہ بستا ہو ایک قوم کا فرد ہے۔

حضرت انسان

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی

یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

یہی فرزند آدم ہے کہ جس کے اشکِ خونیں سے
کیا ہے حضرت یزداں نے دریاؤں کو طوفانی

فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے

مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے

حضرت کے معنی جناب یا حضور ہیں۔ مراد ہوئی جناب انساں یا انسان کے حضور میں۔

① **معانی**: **دانش**: علم' عقل' دانائی۔ **بینش**: بصیرت' عقل باطنی۔ **کس درجہ**: کس حد تک۔ **ارزانی**: سستا ہونا۔ **نورانی**: نور کا۔ **عالم**: جہان' کائنات۔

مطلب: اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل ظاہری بھی دی ہے اور عقل باطنی بھی۔ یہ دونوں صفتیں کثرت اور بہتات سے انسانوں میں موجود ہیں۔ ظاہری عقل سے وہ کائنات کی ظاہری ساخت کا علم حاصل کرتا ہے اور باطنی عقل یا بصیرت سے وہ کائنات کی باطنی ساخت کا راز پا لیتا ہے۔ ان دونوں قوتوں کے استعمال سے وہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ یہ کائنات کبھی عدم تھی۔ موجود نہیں تھی پھر اللہ تعالیٰ نے کن (ہو جا) فیکون (پس ہو گئی) کے عمل سے اسے وجود بخش دیا۔ اسے اس بات کا بھی پتہ ہے کہ اس کائنات کے باطن میں اللہ تعالیٰ کے اسا صفات جلوہ گر ہیں۔ کائنات کا وجود ہی ان کی بدولت ہے۔ اگر یہ اسما اور صفات اپنی جلوہ گری بند کر دیں تو کائنات پھر عدم ہو جائے گی۔ اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ حقیقی وجود اللہ تعالیٰ کا ہے۔ کائنات کا وجود اللہ کے وجود کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اس کو وجود تسلیم نہیں کر سکتے۔ اسے موجود کہہ سکتے ہیں۔ کائنات کے ذرہ ذرہ کا وجود اللہ تعالیٰ کے نور کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اس کا ہر ذرہ نورانی (نور لئے ہوئے ہے) اس نور کو عقل ظاہری تو نہیں عقل باطنی دیکھ سکتی ہے۔

② **معانی**: **باریک**: پتلا نازک۔ **فطرت**: قدرت۔ **حجاب**: پردہ۔ **نمایاں**: ظاہر۔ **فرشتہ**: اللہ تعالیٰ کی ایک نورانی مخلوق۔ **تبسم ہائے پنہانی**: چھپی ہوئی مسکراہٹیں۔ **پنہانی**: چھپی ہوئی۔ **تبسم**: مسکراہٹ۔

مطلب: انسان اگر باطنی عقل سے یا بصیرت سے کام لے تو وہ دیکھ لے گا کہ قدرت نے کائنات پر جو ظاہری پردہ ڈالا ہوا ہے وہ بہت پتلا اور نازک ہے وہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے فرشتوں کی جو کہیں آسمانوں سے پرے عرش عظیم کے قریب رہتے ہیں' مسکراہٹیں نظر آ سکتی ہیں۔ مراد ہے کہ انسان جہاں اپنی ظاہری عقل سے ظاہری کائنات اور اس کی اشیا کا علم حاصل کرتا ہے اسے اپنی باطنی عقل اور بصیرت سے کائنات اور اس کی اشیا کی حقیقت بھی جان سکتا ہے۔

③ **معانی**: **دعوت دیدار**: نظارے کی دعوت۔ **فرزند آدم**: آدم کا بیٹا' انسان۔ **مستور**: چھپی ہوئی۔ **ذوق**: لذت۔ **عریانی**: ننگا ہونا' ظاہر ہونا۔

مطلب: کائنات اور اس کی ہر شے کے دو رخ ہیں۔ ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ ظاہری رخ کو تو ظاہری آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن باطنی رخ دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے انسان کو باطنی آنکھیں یا دل کی آنکھیں پیدا کرنی چاہئیں۔ یہ آنکھیں علم ظاہری سے نہیں باطنی علم سے پیدا ہوتی ہیں جسے روحانیت کا علم بھی کہتے ہیں۔ کائنات میں جو کچھ پوشیدہ ہے جو کچھ اس کے پس پردہ ہے وہ ظاہر ہونے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ وہ خود اپنے نظارے کی دعوت دیتا ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لئے

ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر باطنی آنکھ پیدا کرے۔

④ **معانی :** **فرزند آدم:** آدم کا بیٹا۔ **اشک خونیں:** خون سے بھرے ہوئے آنسو۔ **حضرت یزداں:** خدا۔ **طوفانی:** طوفان سے بھرے ہوئے، جن میں طغیانی آئی ہو۔

مطلب: دنیا کے دریاؤں میں اگر طغیانی آئی ہوئی ہے تو وہ انسان کے خون سے بھرے ہوئے آنسوؤں کی وجہ سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ خدا نے تو کائنات اور اس کی جملہ اشیا کو تخلیق کر دیا لیکن اس میں جو رونق اور جو ہنگامہ ہے وہ انسان کی وجہ سے ہے۔ اگر انسان کو جنت سے دیس نکالا نہ ملتا اور وہ اس کی جدائی میں روتا ہوا اس زمین پر آکر آباد نہ ہوتا تو زمین پر سب کچھ ہوتے ہوئے وہ اپنے جملہ ہنگاموں اور رونقوں سے محروم رہتی۔ اس میں پہاڑ، بیابان، دریا، صحرا، جنگل وغیرہ تو ہوتے لیکن اپنے خون پسینہ کو ایک کر کے اور اپنی محنت اور جانفشانی سے جس نے ان کو آبادیوں، ان کی رنگ رنگ کی رونقوں، گلزاروں، سبزہ زاروں، کھیتوں اور باغوں میں بدل دیا ہے وہ صرف انسان ہے۔ اس نے اپنی قوت تسخیر سے کام لے کر چاند، سورج، ستاروں، جانوروں، دریاؤں اور آبشاروں سے ایسے ایسے کام لئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ انسان جملہ مخلوق سے اشرف ہونے کی بنا پر اپنے اندر ایسی تسخیر کن اور ایجاد کن صلاحیتیں اور صفات رکھتا ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہیں۔

⑤ **معانی :** **فلک:** آسمان۔ **کیا خبر:** کیا معلوم۔ **یہ خاکدان:** یہ مٹی کا گھر، آدمی کا مٹی کا جسم۔ **نشیمن:** آشیانہ، گھر۔ **غرض:** مقصود۔ **انجم:** ستارے۔ **شبستاں:** رات بسر کرنے کی جگہ۔ **نگہبانی:** حفاظت۔

مطلب: آسمان کو کیا معلوم کہ آدمی کا مٹی سے بنا ہوا جسم کس کا گھر ہے۔ اس کی تاریکیوں میں کس کی وجہ سے رونق اور روشنی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں پر رونق ہوں۔ مجھ پر ستارے، چاند اور سورج چمکتے ہیں۔ حالانکہ جو رونق ہستی آدمی کے تاریک مٹی کے جسم میں جلوہ گر ہے وہ اس پر نہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ مومن کا دل وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی سمائی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم اس دل کو واقعی دل بنا لیں تو یہ عرش اعظم بن جاتا ہے۔ خانہ کعبہ ہو جاتا ہے۔ جس میں سے غیر اللہ کا ہر بت نکل جاتا ہے اور صرف اللہ آباد ہو جاتا ہے۔ آسمان کو اپنے جن ستاروں کی روشنی پر ناز ہے وہ تو ایسے دل شناس، اور خدا آگاہ مومن کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

⑥ **معانی :** **مقصود کل:** کل اشیا کی غائت، ساری کائنات کا مطلوب۔ **میں ہوں:** یعنی میں آدمی ہوں۔ **ماورا:** بالا، اوپر۔ **ہنگامہ ہائے نوبنو:** نئے نئے ہنگامے۔ **انتہا:** اخیر، حد۔

مطلب: اگر یہ حقیقت ہے کہ کل کائنات اور اس کی ساری اشیا کا مطلوب میں آدمی ہی ہوں۔ اور ہر چیز میری خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے تو پھر مجھ سے بالا تو کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ میں ہی ہر شے پر اشرف اور ہر شے سے اعلیٰ ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ میں اپنی صلاحیتوں اور صفات سے آگاہ ہو کر اور اپنی خودی کو پہچان کر ایسا مقام حاصل کر لوں۔ اگر یہ صورت حال مجھ میں پیدا نہ ہو گی تو پھر ہر شے مجھ پر غالب آ جائے گی اور میں مغلوب رہوں گا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب اور اپنا خلیفہ اور اس اعتبار سے اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے۔ اگر میں اپنی خودی سے آگاہ ہو جاؤں گا تو ہر شے میری مغلوب ہو جائے گی۔ یہ نت نئے ہنگامے جو اس کائنات میں خود سے آگاہ ہونے کے بعد مجھ سے سرزد ہو رہے ہیں ان کی آخر حد کونسی ہے۔

ان کی سہ یہی ہے کہ میں خدا تو نہیں ں کی صفات اور اسما کا مظہر بن سکتا ہوں۔ اور زمان و مکان کو اپنے قابو میں کر سکتا ہوں۔

ہماری نئی کتب

صوفیانہ پنجابی شاعری

(اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ)

ہیر وارث شاہ	ڈاکٹر حمید اللہ شاہ ہاشمی	بلا جلد	180/-	جلد	300/-
کافیاں خواجہ غلام فرید	ڈاکٹر حمید اللہ ہاشمی	"	180/-	"	300/-
کافیاں حضرت بابا فرید	ڈاکٹر حمید اللہ ہاشمی	"	90/-	"	150/-
کلیات بلھے شاہ	میاں ظفر مقبول	"	180/-	"	300/-
کافیاں شاہ حسین	میاں ظفر مقبول	"	90/-	"	150/-
کلام ابیات سلطان باہو	محمد اقبال	"	90/-	"	150/-
سیف الملوک	میاں ظفر مقبول	"	360/-	"	540/-



ہومیوپیتھک

آج ہی طلب فرمائیں

گائیڈ ٹو فیملی ہیلتھ

ان صفحات میں آپ پائیں گے

ہومیوپیتھی کی آسان، عام فہم اور واضح الفاظ میں مکمل تشریح
علامات کا آسان تسلسل، جسے آپ دیکھتے نہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں۔
نظام جسم انسانی کی تفصیل پر سگریٹ نوشی، خون کے اونچے دباؤ پر
حروف تہجی کے اعتبار سے موضوعات کی مفصل فہرست، آپ اپنا مسئلہ اور اس کا حل پل بھر میں تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ اپنا علاج خود کر سکتے
بچوں کے امراض، چوٹ، انیمیا، ہنگامی حالات وغیرہ پر خصوصی ابواب۔
انسان کے جسم و دماغ کے تقریباً" تمام امراض کا تذکرہ۔ اکڑن، بے خوابی، بدہضمی، السر، دمہ، چوٹ، آرتھرائیٹس، انفلوئزا، قے، اگزیما، اینٹھن، انیمیا، کنجکٹی وائٹس، قبض، کھانسی، گلے کا درد، جلن، ٹرے کوما، لو، تھکاوٹ، کمزوری دل کا دورہ، پائیریا، یرقان، پیچش، پھوڑا، بلغم اور سینکڑوں دیگر موضوعات۔
درجنوں رنگین تصاویر، انوکھا لے آؤٹ اور لاجواب ڈیزائننگ

قیمت =/360 روپے

شیخ محمد بشیر اینڈ سنز

تعویذات وعملیات پر چند بہترین کتب

شمعِ شبستان رضا (اردو) اعلیٰ سات حصے یکجا	اقبال احمد نوری	225/-
شمعِ شبستان رضا (عام)	اقبال احمد نوری	120/-
شمعِ رضا	مولوی اوّل	300/-
دعوتِ موکلات	سید محبوب علی شاہ	60/-
معدنِ عملیات وسادات	سید محبوب علی شاہ	75/-
سلوکِ معرفت	سید محبوب علی شاہ	75/-
تسخیرِ جنات	سید محبوب علی شاہ	75/-
لوحِ سلیمانی	سید محبوب علی شاہ	90/-
تعویذ عالم	مولانا حافظ محمد ممتاز الرحمٰن	90/-
اعجازِ سلیمانی	ابنِ اسلام	90/-
شرح شمس المعارف	شیخ احمد عباس علی بونی	300/-
دل پسند عملیات وتعویذات (من موہنی)	محمد یٰسین دلپسند	90/-
بُری عادتیں	حکیم محمد مختار علیگ	90/-
عملیات تاج خوش خیال		60/-
کلید اسرار		90/-
صراط المستقیم حکمت العم	صوفی ابرار اللہ شاہ	120/-
عملیات غفرانی		60/-
عملیات اعجاز یوسفی		60/-
تاریخ ولادت کے مولود پر اثرات	اوّل شاہ	75/-
گنجینۂ اسرار عملیات		90/-
استخارہ شیخ محی الدین العربی		60/-
حقیت الفقراء	حضرت مادھو لال حسین	75/-
احسن الاعمال		90/-
کلید جفر	زاہد حسین عابد	90/-
اشراق الرمل	قاضی زاہد حسین عامل	90/-
آفتاب رمل	سید دلدار حسین	90/-
رہنمائے علم الاعداد	ملک کریم بخش	120/-

سابقہ حل شدہ پرچے

ایم اے اسلامیات	محمد علیم
اردو	غلام عباس ماہو
معاشیات	محمد عالم عدیل
سیاسیات	محمد عالم عدیل
ہسٹری	آفتاب عالم
عربی	محمد یاسین قصوری
فارسی	اصغر علی شاہ جعفری
پنجابی	محمد مختار جاوید
انگلش	محمد عالم عدیل
فاضل اردو	محمد عالم عدیل
فاضل عربی	حافظ اسد اصغر
فاضل طب و جراحت	محمد نصیر الدین
فاضل پنجابی	میاں ظفر مقبول

شیخ محمد بشیر اینڈ سنز

ملک جلال الدین ہسپتال بلڈنگ، سرکلر روڈ،

چوک اردو بازار، لاہور

خاص خاص چند اہم طبی کتابیں

اناٹومی (تشریح الابدان) علامہ مسعود حفیظ رفائی	پیتھالوجی (ماہیت الامراض) ڈاکٹر غلام حیدر نیازی	صحت اور حفظان صحت تعلیمات نبوی کی روشنی میں	علم الصیدلہ حکیم وسیم احمد اعظمی
علم الادویہ مرتب محمد وسیم	فزیالوجی (منافع الاعضاء) علامہ مسعود حفیظ رفائی	کامیاب حفظان صحت علامہ مسعود حفیظ	تحفظی سماجی طب ڈاکٹر عبدالمبین خان
کلیات ادویہ حکیم وسیم احمد اعظمی	لقمانی گائیڈ لقمان دوراں حکیم عبدالرحیم جلیل	ماہیت الامراض باتصویر علامہ مسعود حفیظ رفائی	تجربات بوعلی سینا تحفۃ العاشقین
مجربات لقمانی حکیم عبدالرحیم جلیل	مختصر کلیات جدید القانون فی الطب کا خلاصہ	مدوالفری (علم الولادت) علامہ مسعود حفیظ	مقدمہ علم الادویہ احتشام الحق قریشی
نیو میڈیکل ڈکشنری انگریزی سے انگریزی و اردو	امراض اذن و انف و حلق حکیم وسیم احمد اعظمی ترجمے کے ساتھ	امراض اطفال حکیم وسیم احمد اعظمی	امراض نسواں حکیم وسیم احمد اعظمی
امراض نسواں اطفال گائیڈ۔ ڈاکٹر عبدالجبار	بیاض اجمل حکیم اجمل خاں مرحوم	بیاض کبیر کامل سیٹ تین جلدیں حکیم کبیرالدین مرحوم	ترجمہ شرح اسباب اول تا چہارم کامل کبیرالدین
جدید رہنمائے علاج ڈاکٹر عبدالجبار	جدید رہنمائے ادویہ ڈاکٹر عبدالجبار	جنسیات کی پہلی کتاب حکیم محمد یوسف حسن	حاذق حکیم اجمل خاں مرحوم مجلد
مخزن المفردات (کتاب الادویہ) حکیم کبیرالدین	علم الامراض ڈاکٹر محمد غفران نیٹ	قرابادین اعظم حکیم اعظم خاں	جنسیات دوشیزہ حکیم یوسف حسن
کتاب السموم حکیم خواجہ رضوان	جنسیات مجلس خلوت حکیم یوسف حسن	کتاب المرکبات و مخزن المفردات حکیم غلام جیلانی	بستان المفردات پیر عبدالحلیم
کنز التشخیص محمد رفیق حجازی	حمیات قانون اول و دوم حکیم کبیرالدین	میزان الطب حکیم محمد اکبر	اصول طب کمال الدین ہمدانی
مخزن الجواہر حکیم غلام جیلانی	تاریخ طب و اطبائے قدیم علی حیدر جعفری	معالجات امراض اطفال علی حیدر جعفری	رموز الاطباء اول دوم حکیم فیروزالدین

ادارہ کی دیگر کتب

